THE BOOK WAS DRENCHED

UNIVERSAL
LIBRARY

OU_224190

UNIVERSAL
LIBRARY

Osmania University Library

Call No ۸۹۱٫۵ ۳۲۰۵ — ک ۲۵

Accession No

Author

Title کل جہاں

This book should be returned on or before the date last marked below

آج اور کل

نعرو شاعرؔ

اگست ۱۹۳۳ء

ڈالڈا وناسپتی
آپ کی قیمت خرید کا بہترین معاوضہ کیوں ہے؟

ہر ایک عورت یہی کہتی ہے:
"ڈالڈا خریدیئے اور پیسے بچایئے،
کھانے بھی زیادہ مزیدار پکایئے"





ہر ایک سمجھ دار عورت ہمیشہ ڈالڈا ہی خریدتی ہے۔ ہماری روزانہ غذا میں ڈاکٹر جس کھانا پکانے کی چکنائی پر زور دیتے ہیں، ڈالڈا اسی قسم کی ہے اور کم خرچ بھی ہے۔ آج ہی ڈالڈا کا ایک مہر بند ڈبہ خریدیئے اور دیکھئے کہ یہ کتنی دیر کام آتا ہے اور اس سے کھانے بھی کتنے مزیدار بنتے ہیں!

کھانا پکانے پر بچت کیسے کی جائے؟
مفت صلاح کیلئے آج ہی یا کبھی بھی اس پتہ پر لکھئے۔
دی ڈالڈا ایڈوائزری سروس
پوسٹ بکس نمبر ۳۵۳، بمبئی ۱



ڈالڈا

۱ پاؤنڈ، ۵ پاؤنڈ، ۲ پاؤنڈ اور ایک پاؤنڈ کے ڈبوں میں دستیاب ہے

MVM. 192-X52 UD

"یہ سچ ہے . . .

. . . لکس ٹائلیٹ صابن سے

آپ بھی زیادہ حسین بن سکتی ہیں"

— ریبیکا رائے



ریبیکا رائے کہتی ہیں "میں اپنے حسن کو نکھارنے کے لئے روزانہ لکس ٹائلیٹ صابن استعمال کرتی ہوں۔ اس کی خوشبو مجھے بہت پسند ہے۔ اس کے جھاگ سے میری جلد صاف اور شفاف ہو جاتی ہے۔"



لکس

ٹائلیٹ صابن

فلمی ستاروں کا

حسن بخش صابن

کتنا سفید، کتنا خالص، کتنا خوشبودار

LTS. 376-X80 UD

اُردو کا مقبولِ عوام مصوّر ماہنامہ

آج کل

دہلی

شعر و شاعری نمبر

ایڈیٹر:- جوش ملیح آبادی

اسسٹنٹ ایڈیٹر:- بال مکند عرش ملسیانی
جگن ناتھ آزاد

جلد ۱۲ ——— نمبر ۱

سالانہ چندہ:- ——— ہندوستان میں:- چھ روپے
پاکستان میں:- چھ روپے

غیر ممالک سے:- ——— نو شلنگ یا ایک ڈالر

فی پرچہ:- ——— ہندوستان میں:- آٹھ آنے
پاکستان میں:- آٹھ آنے

اگست ۱۹۵۳ء

سرورق:- ڈاکٹر مابندر ناتھ ٹیگور

پبلیکیشنز ڈویژن - پوسٹ بکس ۲۰۱۱ - دہلی

ترتیب

کالی ماتا کے چہرہ نویس	اظہر علی فاروقی	۴
آتشِ خاموش	علی عباس حسینی	۷
نئی ہندی شاعری	دیوندر ستیارتھی	۱۱
نئی پنجابی شاعری	کرتار سنگھ دگل	۱۷
جدید کشمیری شاعری	پربھتی ناتھ دیپ	۲۰
ہندی شاعری میں جدید رجحانات	ہنس راج رہبر	۲۵
تمنیں	نوہر یا رام درد	۳۱
نئے دور میں جدید تلنگی شاعری	کے، گوپال کرشنا راؤ	۳۲
گل کدہ		۴۱
آغاز انجام	جوش ملیح آبادی	۴۲
غزل	فراق گورکھپوری	۴۳
ایورسٹ کی پریوں کا کورس	عرش ملسیانی	۴۴
قطعات	جان نثار اختر	۴۶
گم شدہ نظموں کے نام	فضا ابن فیضی	۴۷
عظمتِ آدم	جگن ناتھ آزاد	۴۸
شکستِ ہمالہ	سکندر علی وجد	۴۹
راج ہنس	عباس بیگ محشر	۴۹
تاج محل	سبشہ یار	۵۰
غزل	سروپ نارائن رازدان امین	۵۱
باغ شالامار کشمیر	شہ زور کاشمیری	۵۱
غزل	فسٹور واحدی	۵۲
غزل	ایم اے حفیظ	۵۲
مختلف زبانوں کا ادب	نوین، نرالا، شاہ، سندرم، راجو بیتابی، داسن، چکرورتی، بودھ، انل چودھری، قوی، دگل، راہی، گدر، نائک	۵۳
نئی کتابیں اور رسالے	ع - م	۶۳
رفتارِ زمانہ	———	۶۷

بچوں کا آج کل

بھارت کے نونہال	محمود پرویز کاکوی	۶۹
موسل کا بیاہ	انیس احمد فاروقی	۷۰
مٹھائی کا بھوت	زکی انور	۷۲
بیربل کی عقلمندی	سلیم بشیر علی	۷۶

اظہر علی فاروقی

"کالی ماتا" کے چرنوں میں

بنگلا چنڈی کا دیہ

قریب قریب سبھی علاقائی زبانوں کی شاعری نے مذہب کی گود میں جنم لیا مگر بنگلا شاعری ایک امتیازی خصوصیت رکھتی ہے کہ بہت لمبے عرصے تک اس میں مذہبیات کے سوا کوئی دوسری چیز نہیں ملتی۔ منسا منگل کی طرح چنڈی کا دیہ بھی اسی کا ایک انگ ہے اور اس سلسلے کی دوسری کڑی۔

چنڈی کا دیہ میں جس چنڈی کا ذکر آتا ہے وہ مارکنڈے پُران کی چنڈی سے بہت کچھ الگ روپ رکھتی ہے اور دونوں شخصیتیں کچھ ایسی غلط ملط کر دی گئی ہیں کہ ہمارے لیے یہ بتانا بھی دوبھر ہو گیا کہ آیا چنڈی کی شخصیت آریائی ہے یا غیر آریائی۔

کچھ ماہرینِ مذہبیات کا خیال ہے کہ منسا کی طرح چنڈی کی شخصیت بھی دراوڑی مذہبیات کا ایک شاخسانہ ہے۔ جس نے آگے چل کر آریائی بہروپ دھارن کر لیا۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ رودن دیوی آنا پرنا Anna Perenna اور بھارتی دیوی اَن پورنا کا ایک روپ ہے۔ رودن دیوی کا میلہ ۱۵ مارچ کو ہوا کرتا تھا۔ وہ ایک چٹان پر کھڑے ہو کر لوگوں کو روٹیاں تقسیم کیا کرتی تھی۔ ڈاکٹر ای وانس (Evans) کی ایک حالیہ تحقیق کی رو سے اس پر اس طرح روشنی پڑتی ہے کہ انہوں نے ایک بھارتی دیوی کا پتہ تلاش کیا، جو لگ بھگ ۳ ہزار سال قبل مسیح کا ہے۔ ایک دیوی شیر پر سوار ہے اور یہی چنڈی دیوی ہیں کیونکہ ہندو دیومالا میں شیراں کی سواری ہے اور اسی سے ملتا جلتا بیان مارکنڈے پُران میں بھی پایا جاتا ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ چنڈی دیوی کی بھگتی ہمارے دیش میں لگ بھگ ۵ ہزار سال سے چلی آتی ہے اور اس کا تعلق بھی شکتی (قدریہ فرقہ) سے ہے۔

یہ موضوع بھی بنگلا میں بے پناہ مقبولیت رکھتا ہے۔ اور اس کی مقبولیت ہمہ گیر ہے۔ چنڈی کا دیہ میں ایک کے بجائے دو داستانیں نظم کی گئی ہیں۔ دونوں کا مقصد صرف یہ ہے کہ کس طرح کالی کیتو شکاری اور شری منت چنڈی کی پرستاری اور بھگتی کرنے سے فائز المرام، خوش حال اور کامیاب رہی اور دھن پتی اودیوگ راج (ملک التجار) کو چنڈی دیوی کی توہین کرنے سے کیا کیا مصیبتیں جھیلنا پڑیں ایک داستان اس طرح پر ہے۔

"دھن پتی اجانی ضلع بردوان کا ایک بڑا امیر کبیر خوبرو اور حسین سوداگر ہے اس کی شادی لہنا دیوی سے ہوئی جو خود بڑی حسین اور خوبصورت ہے۔ دھن پتی کو کبوتر بازی کا بڑا شوق ہے۔ ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ اس کا ایک کبوتر گھر نہیں لوٹا جس کی تلاش میں وہ نکلا۔ چلتے چلتے وہ اچھانگر کی پہاڑیوں پر پہنچا اور وہاں پتہ لگا کہ بہری کا ستایا ہوا ایک کبوتر کھلنا کے دامن میں آ کر چھپا تھا۔ کھلنا اور دھن پتی کی ملاقات ہوتی ہے۔ کھلنا کا حسن حور کو مات کرتا ہے اس کی مسکراہٹ پھول برساتی ہے اور دھن پتی اس پر فریفتہ ہو جاتا ہے۔ بڑے جھگڑوں کے بعد کھلنا کی ماں اس کی شادی کرنے پر راضی ہو جاتی ہے اور دھن پتی اسے بیاہ کر اپنے گھر لاتا ہے۔ لہنا اپنی جگہ پر بڑی عیار اور حاسد عورت ہونے کے باوجود کھلنا کے ساتھ بڑا اچھا برتاؤ کرتی ہے اور دونوں بڑے سکھ چین سے رہتے ہیں۔

اب کہانی کا رخ یہاں سے بدلتا ہے اجانی کے راجا کرم کیشری نے ایک شکاری (توتا) اور ایک ساری (مینا) خریدی جو انسان کی طرح بات چیت کرتی تھی۔ اس کے لئے سونے کا خوبصورت پنجرا بنوانا تھا اور اس کام کے لئے دھن پتی ہی ایک موزوں انسان سمجھا گیا۔ اس طرح وہ پنجرا بنوانے کے لئے گوڑ راج جاتا ہے جہاں سونے اور چاندی کے دستکار رہتے تھے۔

دھن پتی کی غیبت میں دُربالا کو کھلنا اور لہنا کی پُرسکون زندگی سونی سونی سی محسوس ہوئی وہ نوکرانی تھی اور اس بات کی قائل کہ جب تک گھر میں ذنگا فساد نہ ہو اس کا بھلا نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ اس نے لہنا کو ورغلانا شروع کیا اور ایک دن ایک کٹنی کو جادو ٹونا کرنے کے لئے بُلا لائی۔ اس نے بہت کچھ بتایا مگر آخر میں کہا سچی سیوا اور پریم ہی بسی کرن منتر ہے۔ اس پر لہنا بگڑ گئی اور اُسے بھگا دیا۔ دُربالا بلا کی فتنہ انگیز اور مکار تھی اس نے صلاح دی کہ دھن پتی کی طرف سے ایک خط اس طرح لکھا جائے کہ کھلنا کے ساتھ اس کی شادی دیوتاؤں کو پسند نہیں آئی، اسی لئے تو شادی ہوتے ہی اسے پردیس جانا اور گھر چھوڑنا پڑا۔ تم کو چاہئے کہ اسے بھیڑیں چرانے کے لئے بھیج دیا کرو، اور موٹا جھوٹا کھانے کو دے دیا کرو۔ خط لکھا گیا اور کھلنا کو دے دیا گیا۔ پہلے تو کھلنا کو اعتبار نہ ہوا۔ مگر دُربالا اور لہنا نے اسے بھیڑیں چرانے کو بھیجا ہی۔ وہ بیچارہ روز بھیڑیں چرانے جاتی اور دن رات روتی کھکھوتی رہتی ایک دن "سارو شنی" نامی بھیڑ کو بھیڑیا اٹھائے گیا اور کھلنا مارے ڈر کے گھر نہیں لوٹی۔ جب شام ہوئی تو کیا دیکھتی ہے کہ پانچ لڑکیاں دیپک جلائے کسی کی پوجا کر رہی ہیں۔ کھلنا دبے پاؤں ان کے پاس گئی اور اپنی درد بھری کہانی سنائی۔ انہوں نے بتایا چنڈی دیوی کی پوجا کرو سب دکھ درد دور ہوں گے۔ کھلنا چنڈی نام جپنے لگی اور رات پھل پھلاری اور کندموں کھا کر کاٹ دی۔ اُدھر لہنا ڈر کے مارے کانپنے لگی تو کرچا کر چھوڑے کہ جیسے ہو کھلنا کو تلاش کر کے لائیں۔ آخر کار لہنا نے شرمندگی کا اظہار کیا معافی مانگی اور کھلنا پھر واپس آ گئی۔ اس درمیان میں دھن پتی بھی مہم سے واپس آ گیا۔ اُجانی کا راجا خوبصورت پنچھیوں کو دیکھ کر بڑا خوش ہوا۔ بہت تعریف کی اور انعام و اکرام دیا۔ دھن پتی اپنے گھر پہنچا۔ کھلنا نے رو رو کر اپنی مصیبتیں سنائیں مگر لہنا کی شرمساری نے سب معاملہ رفع دفع کر دیا اور تینوں سکھ چین سے رہنے لگے۔ یہ سکھ چین انتی آسانی سے نصیب نہیں ہوا بلکہ شکی سماج نے کھلنا کی لاج کسوٹی پر بُری طرح پرکھنے کے بعد انہیں یہ موقع دیا۔ داستان میں یہ ٹکڑا بڑا دردناک اور ساتھ ہی ساتھ شرمناک ہے کہ کس طرح کھلنا ساتھ سے ڈھائی جاتی ہے۔ دکھتی ہوئی سلاخ سے داغی جاتی ہے۔ لاکھ کے گھر میں جلائی جاتی ہے مگر وہ ستیہ دیتی سب سے بچ جاتی ہے۔

داستان ایک بار پھر پلٹا کھاتی ہے۔ دھن پتی سوداگری کی غرض سے ایک بحری سفر کرنے کا ارادہ کرتا ہے۔ شبھ ساعت اور دن پوچھ کر تیاریاں ہوتی ہیں کہ ایک دن وہ کھلنا کو چنڈی پوجا کرتے دیکھ لیتا ہے اور پوجا کے پھول یہ کہہ کر ٹھکرا دیتا ہے کہ یہ کیا ڈھونگ رچا ہے۔ بہرحال وہ روانہ ہو جاتا ہے۔ مگر کھلنا اسے ایک اشگون سمجھتی ہے اور بے چین ہوتی ہے کہ کہیں کوئی حادثہ نہ اٹھ کھڑا ہو۔ آخر کار یہی ہوتا ہے جب وہ سراندیپ پہنچتا ہے اور وہاں سے راجہ شالی واہن سے اس حیرت زا منظر کا ذکر کرتا ہے جو اس نے اثنائے سفر میں دیکھا تھا کہ "نیلگوں سطح آب پر کنول کے خوشما پھول کھلے ہیں جن پر ایک خوبصورت مثال عورت بیٹھی ہے، اور حیرت تو اس پر ہوتی ہے کہ وہ نازک بدن اپنے ہاتھ سے گراں ڈیل ہاتھی پکڑے ہے اور دوسرے ہاتھ میں کنول کی ٹہنی ہے۔ جسے وہ اس کے منہ میں ڈال رہی ہے"۔ راجا شالی واہن اس کی تصدیق کے لئے روانہ ہو جاتا ہے مگر وہاں کچھ نہ پا کر دھن پتی کو کارا گار میں ڈال دیتا ہے۔

کھلنا کے ایک لڑکا پیدا ہوتا ہے چاند سے زیادہ خوبصورت اور سورج مکھی سے زیادہ ہنس مکھ جس کا نام شری منت ہے۔ بارہ سال گزر جاتے ہیں اور کھلنا ہے کہ انتظار کی گھڑیاں گنتی رہتی ہے۔ ایک دن ایسا ہوتا ہے، کہ شری منت کاگر و سارے لڑکوں کے سامنے کہہ دیتا ہے کہ شری منت ابھاگا ہے کہ جس دن سے پیدا ہوا اس کا باپ لوٹ کر نہیں آیا۔ شری منت اصرار کرتا ہے کہ وہ باپ کی تلاش میں نکلے گا۔ ماں مجبور ہو کر اسے اجازت دیتی ہے اور وہ سراندیپ پہنچتا ہے اور وہاں کے راجا شالی واہن سے اس حیرت زا منظر کا ذکر کرتا ہے۔ جس کا ذکر اس کے باپ نے کیا تھا۔ راجا شالی واہن ہنستا ہے اور کہتا ہے کہ یہ دوسرا پاگل آیا۔ راجا کہتا ہے اگر ایسا ہوا تو وہ اپنی لڑکی اس سے بیاہ دے گا اور آدھا راج جہیز میں دے دیگا اور اگر نہ ہوا تو اسے پھانسی ہوگی۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ شری منت کو پھانسی دینے کی طیاری ہوتی ہے تو وہ چنڈی ماں کی پوجا کو تلتا ہے اور درد بھرے دل سے اسے پکارتا ہے۔ چنڈی ماں اس کے سامنے آ جاتی ہیں اور اسے گود میں لے لیتی ہیں۔ جب راجہ کو یہ خبر ہوتی ہے تو وہ خود حاضر ہوتا ہے اور دیکھ کر حیرت زدہ رہ جاتا ہے کہ یہ سب چنڈی ماں

کا چنکارا تھا۔ وہ پیروں پر گر جاتا ہے۔ چنڈی ماں اسے وہ منتر دکھا دیتی ہیں اور شالی واہن اپنی لڑکی شری منت سے بیاہ دیتا ہے۔

شری منت کا رنگ سے اس آدمی کو نکالنے کا حکم دیتا ہے جو صینتوں سے اتنا بدل گیا ہے کہ پہچانا نہیں جاتا۔ آنکھیں اندھی ہو گئیں۔ بدن پھوٹ نکلا اور لنگڑا ہو گیا تھا، مگر چنڈی ماں کی کرامات سے وہ پھر اپنے اصلی روپ میں آجاتا ہے اور شری منت اس کے چرنوں میں گر جاتا ہے مگر شری منت اپنی ماں کا دیا ہوا خط اسے دکھاتا ہے تو دھن پتی اسے گلے لگا لیتا ہے۔ اس طرح چنڈی ماں کے چنکارے سے بچھڑے مل جاتے ہیں اور کہا جاتا کہ بڑے دن ایک بار پھر دور ہو جاتے ہیں۔

اس طرح کال کیتو شکاری والی داستان ہے۔ ان دونوں داستانوں میں بھی نسا منگل کی "چاند سوداگر" کی داستان کی طرح قدیم داستانوں کے امتیازی خصوصیات پائے جاتے ہیں۔ چنڈی کا دیہ کی داستان کے کرتے تو اردو زبان کی داستانوں میں صاف طور پر پائے جاتے ہیں مثلاً وزیر زادے کا مثقال والے لعل کی تلاش میں اپنے باپ (وزیر) کی رہائی کے لئے مردانہ بھیس میں نکلنا۔ اور یہاں کا طعنہ یہاں شری منت کا باپ کی تلاش میں نکلنا اور گرو کا طعنہ بالکل ایک عنصر ہے۔ "دُر بالا کا کیر کٹرا اور اس لوڑھی گنی کا کیر کٹر کتنی مماثلت رکھتا ہے جس نے دوسرے درویش کی سیر میں ایک مقام پر آکر کہا "تیری نیتھ" سہاگ اور گماؤ سلامت رہے۔"

مادھو جا دیہ نے اپنے چنڈی منگل میں "شری منت" کی تعلیم و تربیت کا جو نقشہ کھینچا ہے وہ ہو بہو وہی ہے جو میر امن نے اقلیسم نیمروز کے بادشاہ زادے کا بتایا ہے یا جس کی جھلکیاں ہمیں مثنوی سحر البیان میں شاہزادہ بے نظیر کی تعلیم و تربیت کے سلسلے میں دکھائی دیتی ہیں۔

معانی و منطق بیان و ادب	پڑھا اس نے منقول و معقول سب
لگا ہیئت و ہندسہ تا نجوم	زمین آسمان میں پڑی اس کی دھوم
کیے علم لوکِ زباں حرف حرف	اسی نحو سے اس نے کی عمر صرف
عطارد کو آنے لگی اس کی رس	ہوا سادہ لوحی میں وہ خوش نویس

فسانۂ عجائب میں تو اپنی چرب زبانی سے شاہزادے کو گرویدہ کر لیتا ہے چنڈی کا دیہ میں حیوان "کال کیتو" کو پالیٹکس کی باتیں بتلاتے ہیں۔

یہ داستانیں محض مذہبی یا نیم مذہبی روایاتی داستانیں ہی نہیں ہیں بلکہ یہ داستانیں اپنے وقت کی سماجی، معاشرتی اور معیشتی حالات کو روشنی میں لاتی ہیں۔ مکندرام کنکن کی چنڈی منگل جو ۱۵۸۹ میں منظر عام پر آئی۔ اس کی بیّن ڈیسل ہے۔ پروفیسر ای۔ بی کوبل جنہوں نے ... ۲۵ اشعار میں سے تقریباً تین چوتھائی کا ترجمہ انگریزی میں کیا۔ ان کی رائے ہے کہ جس طرح ملٹن کی "پین ڈی مونیم" تمثیلی طور پر چارلس اول کے دوران حکومت کی سول و اور پر روشنی ڈالتی ہے بالکل اسی طرح مکندرام کنکن کی تصنیف ان حالات اور کیفیات پر روشنی ڈالتی ہے جو مغل عہد حکومت نے بنگال میں پیدا کئے تھے۔ صحرائی حیوانات چنڈی دیوی سے اپنے انکسار اور عجز کے ساتھ کال کیتو شکاری کے تیروں کی شکایت کرتے ہیں کہ وہ نہ تو جاگیردار ہیں اور نہ چودھری۔ نہ ان کے پاس دولت ہے اور نہ زمینیں۔ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ کس طرح ہندو جاگیردار مغل عاملوں اور صوبہ داروں کے سامنے ہیچ اور پوچ سمجھے جاتے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ خود اپنی سوسائٹی کی پستی کی طرف بھی اشارہ کرتا ہے۔ گاؤں کا پروہت ایک دروازے سے دان لیتا ہے اور دوسرے دروازے کو کھٹکھٹاتا ہے جس طرح شہد کی مکھی ایک پھول چوس کر دوسرے پھول پر اُڑ جاتی ہے"۔

کال کیتو، شری منت کی ولادت کے نقشے ہوں۔ دھن پتی کے باپ کے شرادھ کا جلسہ ہو۔ مراری شیل صراف کی دکان پر جمگھٹا ہو۔ شالی واہن کا دربار ہو۔ سب ہی کچھ نہ کچھ اپنے دور کی معاشرت۔ سماج اور عائلانہ زندگی کے رقعے ہیں۔

مکندرام کنکن کی زبان اور اسلوب سادگی کے باوجود بے حد دلکش اور دلنشین ہے۔ چنڈی کا دیہ میں یہ کارنامہ بہترین قسم کا شعر و ادب پیش کرتا ہے

مکندرام کے علاوہ چنڈی کا دیہ اور بہت سے دوسرے شاعروں کا ہے جسے عوام بوجاکے موقعے پر بڑے جوشیلے انداز اور دلکش لب و لہجہ میں خود گاتے ہیں یا پانچالیوں سے سنتے ہیں۔ جنار دن، مانک چند دت (حسین نتاہی دور) مدن دت، کمارام سین (۱۵۴۷) دیوی داس سین، نیبو رائن دیو، کرم علی، کیرتی چندر داس، بلی رام کوی مکندرام سے زیادہ مشہور اور مقبول ہیں۔

علی عباس حسینی

"آتشِ خاموش"

خواجہ غلام السیدین اور ڈاکٹر عابد حسین ہماری علمی دنیا کے آفتاب و ماہتاب ہیں۔ مسلمہ عابد حسین نے انھیں متنوس سے کسب ضیاء کی ہے۔ وہ خواجہ صاحب کی بہن اور ڈاکٹر صاحب کی بیوی ہیں۔ انھوں نے ساری عمر بچوں کی تربیت و تعلیم میں صرف کی ہے۔ اور وہ ربع صدی سے جامعہ ملیہ دلی میں قومی نونہالوں کی پرورش و پرداخت میں مصروف ہیں۔ ان کا خاندان ریفارمروں، معلموں اور مصلحوں کا خاندان ہے۔ خواجہ الطاف حسین حالی نے اصلاحِ قوم و ادب کی جو شمع فروزاں کی تھی وہ اب تک اس گھر کے ہر فرد کے سینے میں روشن ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بیگم صالحہ بھی جو کچھ لکھتی ہیں — اور وہ ایک درجن کتابوں کی مصنفہ ہیں —— اس میں اصلاحی جھلک ضرور موجود ہوتی ہے۔

ان کے نئے ناول "آتشِ خاموش" کے پس منظر میں یہی جذبات، احساسات اور تعلیمات ہیں۔ یہ ناول ایک ایسے اسکول کی روداد سناتا ہے جو بچوں کی صحیح تربیت کا گہوارہ ہے۔ اس اسکول میں غریب و نادار چار لڑکیوں سے لے کر بائی اسکول کے درجوں تک کی تعلیم دی جاتی ہے۔ اسے ڈاکٹر جاوید نے قائم کیا ہے اور وہ اسے خونِ دل سے سینچ سینچ کر پروان چڑھانے کی سعیِ مشکور میں مشغول ہے۔ اس نے اپنے گھر و مخلص کام کرنے والوں کا ایک گروہ اکٹھا کر لیا ہے۔ انھیں میں ڈاکٹر انجم انصاری بھی ہے جو ابھی ولایت سے تعلیم پوری کر کے لوٹی ہے اور اس کی پہلی ملاقات اسی سے ہوتی ہے۔ انجم نے بی اے بی ٹی بھی، جس نے علوم کے ساتھ ساتھ مسلمہ پر نیرسی علی گڑھ میں حاصل کئے ہیں۔ مدرسین کے خاصہ اعلیٰ اوصاف میں اور ان کی سیرتوں اور ان کے کردار ان لوگوں کے ہیں جن کی نظریں بلند معیاروں سے ایک انچ کے لئے بھی نہیں ہٹتی ہیں لیکن ماسٹروں کی بیویاں جاہل ہیں۔ ان کے لباس اور رجحانات بالکل اوسط طبقے کی ان مستورات کے ہیں جو توہمات اور قدامت پسندی کا شکار رہیں۔ مزاجوں کے اس تضاد میں، یعنی مہیا پیش بھی شریک ہو گئی۔ ڈاکٹر یوسف ڈاکٹر انجم کے خواستگار رہیں۔ اور وہ شادی شدہ جاوید کی فدائی۔ ان میں باتوں سے اُلجھاوے پڑتے ہیں، آپس میں کشمکش ہوتی ہے۔ ضمیر و دل میں جنگ رہتی ہے اور گوشۂ مشق، لغزشوں سے بچا لیتا ہے مگر جنس انتقام لیتی ہے اور انجم تپ دق کی بیماری کا شکار ہو کر مر جاتی ہے۔

ڈاکٹر جاوید ایک مثالی کردار ہے۔ وہ سن کا پکا، بات کا پوڑھا، بچوں کی خدمت اور اسکول چلانے کی لگن میں ذاتی افکار اور خواہشات کو بھول جاتا ہے۔ پھر بھی انجم کی پاکیزہ محبت، لاوے کی طرح اندر ہی اندر پکتی رہتی ہے۔ ڈاکٹر یوسف ہم لوگوں جیسا خاطی انسان ہے۔ اس میں کمزوریاں ہیں، عیوب ہیں، اس میں رشک و حسد کا مادہ بھی ہے اور وہ افلاطونی محبت کا بھی قائل نہیں۔ لیکن انجم کے لئے اس کی محبت بے پناہ اور وارفتہ ہے۔ اس میں کوئی جھوٹی وفا شعاری ہے۔ انجم کا کردار جاوید کی سیرت کا زنانہ روپ ہے۔ کفو ہم جنس با ہم جنس پرواز۔ لوہے کو لوہے نے کاٹا۔ دونوں کو ایک دوسرے سے محبت ہونا ہی چاہیئے تھی اور اسے آتشِ خاموش بننا ہی چاہیئے تھا۔

جنس پر بے جا احتساب کی شدت نے یوسف کی پیش گوئی پوری کر دی۔ اعصاب نے جواب دے دیا اور انجم نے جذباتی نہ ہونے کے باوجود جاوید کے قدموں پر اپنی نفس سپر ڈال دی۔

انجم کی بہن ناہید۔ ادا اس کی پہلی نادرہ ایسی تعلیم یافتہ عورتوں میں سے ہیں جو تاحیل کی زندگی بسر کرنے پر بھی اپنے بلند معیاروں کو نہیں بھولی ہیں اور ہماری تعلیم یافتہ بچیوں کو آئیڈیل بننے کی ہر طرح مستحق ہیں۔ مصنفہ نسخ کردار وں میں بیگم حیا اس اور جاوید کی ساس اس طرح کی غیر تعلیم یافتہ زنانہ بسیاں ہیں جو عام طور سے سسرالی گھرانوں میں پائی جاتی ہیں۔ مصنفہ نے ان کی مرقع کشی میں بلا کی تجزیہ نگاری سے کام لیا ہے۔

ظلم ہوگا اگر اس سلسلے میں ان شیخ جی کا ذکر نہ کیا جائے جنہوں نے اس خاندان کی "خدمت اور صحبت" میں سیاہ بال سفید اور جوان جسم بوڑھا کیا تھا۔ یہ اس طرح کے وفادار ملازموں میں سے ہیں جو عمر بھر حق نمک ادا کرتے رہتے ہیں اور جو بیت تر طبقے سے ہونے کے باوجود اپنی محنت، وفا شعاری اور رفاقت کی وجہ سے آقاؤں کے خاندان کے فرد بن جاتے ہیں۔ زمانے کی چیرہ دستیوں نے اب ایسے ملازم عنقا بنا دئے ہیں۔ لیکن جن گھروں میں یہ نعمتیں موجود ہیں وہ قابلِ تنظیم ہیں۔

ناول بھر میں ایک شوخ سیرت معصومہ ہے۔ بیگم صالحہ کے قلم میں اگر حرارت ہوتی تو وہ جنسیات کی ایک داستان بن سکتی تھی۔ مگر مصنفہ تو بڑے تحفظ سے خون کی ہیں انھوں نے معصومہ کی صرف ایک جھلک دکھائی اور اسے ہمیشہ کے لیے روپوش کر دیا۔

بیگم صالحہ نے اس ناول میں ان تمام تعلیمی و معاشرتی مسائل سے بحث کی ہے جو اوسط طبقے کے مسلمانوں کے خاص موضوع غور و بحث ہیں۔ اس چھوٹے سے اسکول کے مسلموں کی زندگی ایک پورے طبقے کے خیالوں، خواہشوں اور حوصلوں کا مرقع ہے۔ مصنفہ نے اس محدود دائرے کے ہر فرد کو خورد بین سے دیکھا ہے اور ہر فرد نے اپنے کردار کی خوشی و غم، رنجوری و راحت، محبت و رشک، قدامت پرستی و ترقی پسندی کی بڑی کامیاب تمثیل و تفسیر کی ہے۔

پورا ناول بڑی حد تک سوانحی ہے اور اس کے کردار ایسی زندہ شخصیتوں سے لئے گئے ہیں جن کا مصنفہ اپنے گرد و پیش مطالعہ کرتی رہتی ہیں۔

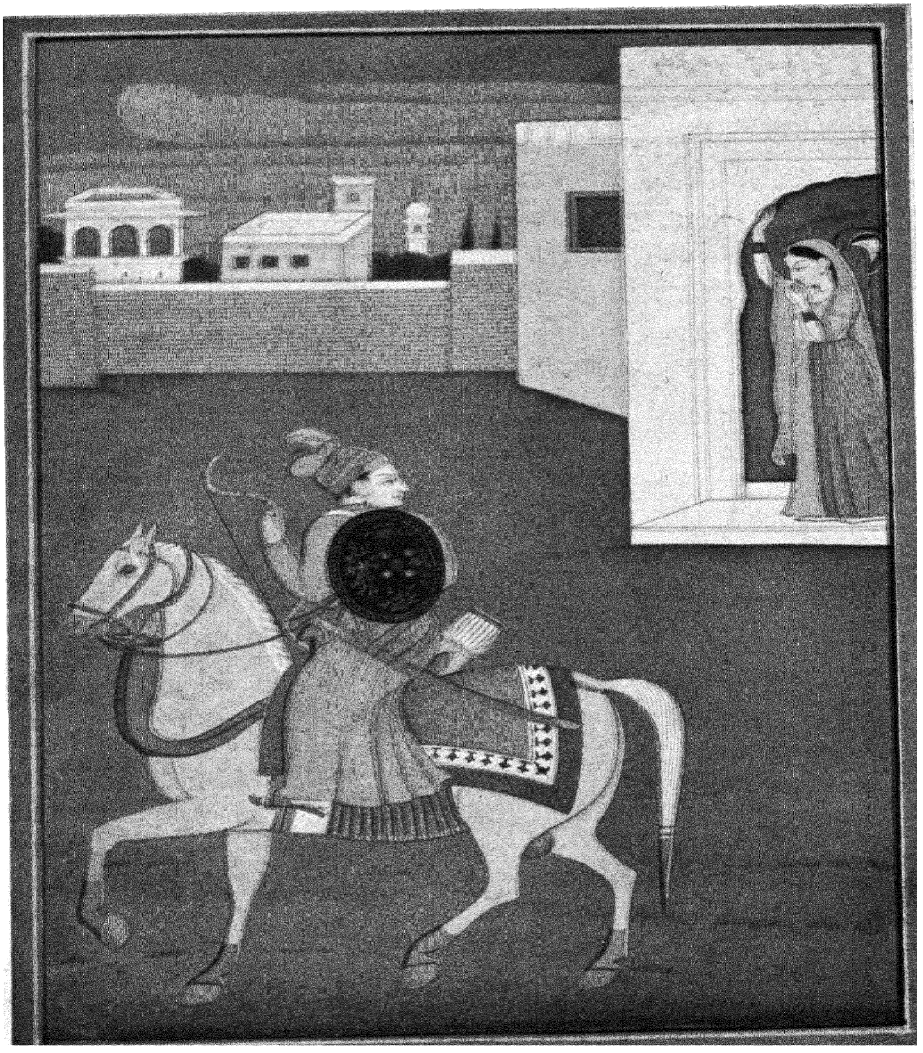
مصنفہ اس تصنیف پر قابلِ مبارک باد ہیں اس لئے اور بھی کہ مختلف فنی خوبیوں کے علاوہ یہ پہلا ناول ہے جس میں تعلیم یافتہ نوجوان محض جنسیات کا دیوانہ نہیں دکھائی دیتا بلکہ وہ ان اعلیٰ مقاصد کے حصول میں منہمک و مشغول ہے جو علم کی برکت و نعمت ہے۔

ڈاکٹر رادھا کرشنن کی تقریر

اپنے کانووکیشن ایڈریس میں ڈاکٹر رادھا کرشنن نے انسانی آزادی، اخلاق اور جمہوریت کی پُر زور حمایت کرتے ہوئے کہا کہ تہذیب و تمدن کا راز اختیار حکومت سے فلسفی کے احساسِ آزادی میں پوشیدہ ہے۔ انسانی رُوح کی آزادی ہی تاریخ انسانی کی قوت محرکہ رہی ہے۔ بڑی بڑی تہذیبوں کی نشو و نما ہوئی اور وہ ناپید ہوگئیں۔ یہ سچائی، اور آزادی کے اصول پر اُبھریں اور ان سے انحراف کے باعث ختم ہوگئیں۔

اُنھوں نے کہا کہ یونیورسٹیاں آزادی اور سچائی کی نگہبان ہوتی ہیں۔ ان کے سامنے ایک خاص مشن ہے۔ ان کا فرض اعتدال اور صحیح چال چلن کی تعلیم دینا ہے۔ آج دُنیا بہت تیزی سے آگے بڑھ رہی ہے اور ٹیکنالوجی میں تو خطرناک حد تک ترقی کر چکی ہے۔ لیکن دُنیا نے انسانی نفسیات کے متعلق کچھ بھی ترقی نہیں کی۔

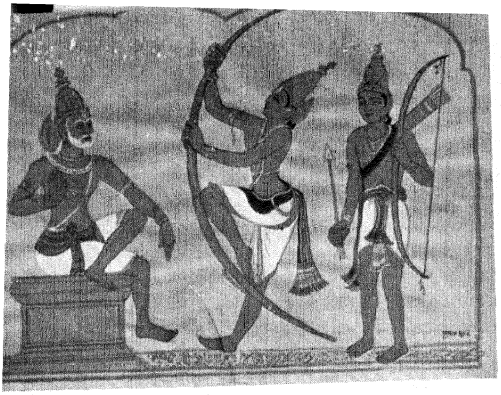
ڈاکٹر رادھا کرشنن نے حاضرین جلسہ کو نصیحت کی کہ وہ اپنی خواہشات پر قابو پائیں اپنے جذبات کو مہذب بنائیں اور اپنے چال چلن میں ضبط و نظم پیدا کریں۔ مذہب اور جمہوریت کی اخلاقی بنیاد یکساں ہے۔ انسانی زندگی کی سب سے بڑی حقیقت اس کے مقدس ہونے کا امکان ہے۔ انسانی ترقی کے لئے ضروری مواقع فراہم کرنے کی ذمہ داری سماج پر عائد ہوتی ہے۔ اور اس طرح کا کام صرف جمہوری سوسائٹی ہی انجام دے سکتی ہے۔ جمہوریت کوئی سیاسی تنظیم نہیں ہے بلکہ وہ تو آتما کی پکار ہے۔ کوئی آدمی خطا و قصور سے خالی نہیں ہے۔ بنی نوع انسان میں اتحاد پیدا کیا جا سکتا ہے اور یہ اتحاد پیدا کرنا ہی پڑے گا۔ اتفاق اور اتحاد ہی سچائی کا راستہ ہے۔



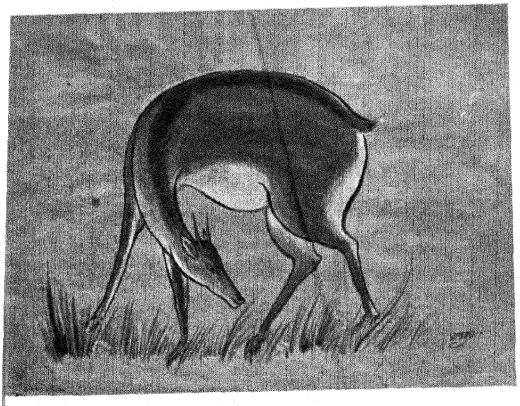
راگ ودھن

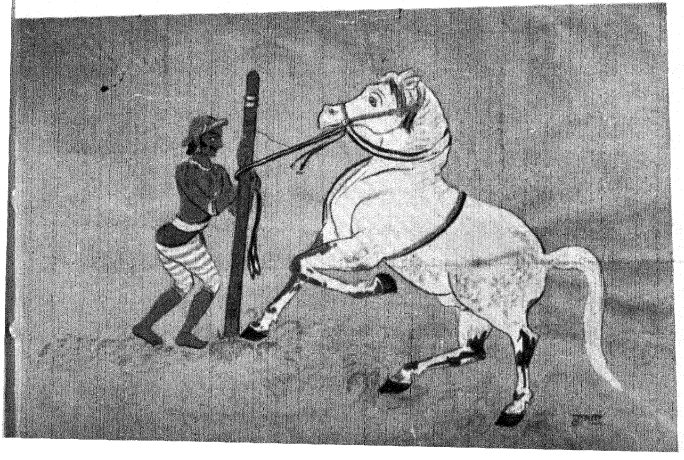
(راجپوت نقاشي کا ایک نمونہ)

حال هي میں بھارت سرکار کي وزارت تعلیم نے نیشنل آرٹ گیلري کے لئے ۸۰ راگ مالا تصویریں حاصل کي هیں - یہ تصویر اسي گراں قدر ذخیرے میں سے لي گئي هے - اس تصویر میں جو سادہ هونے کے باوجود تاثر سے لبریز هے ایک سپاهي جنگ کو جا رها هے - اندر ڈیوڑهي میں سبز ساڑهي میں ملبوس خاتون اس جدائي پر اپنے آنسو پونچھ رهي هے -









نقاشی کے چند نمونے

پر دائیں طرف :-
ایک مردنگ بجانے والا

پر بائیں طرف :-
کمان کی شکست

بیں طرف درمیان میں :-
ہرن

بیں طرف نیچے :-
گھوڑے کو سدھایا جا رہا ہے

عمل :- کرشنا کھشتری

دیوندر ستیارتھی

نئی ہندی شاعری

جس طرح ہر زبان کی شاعری مختلف ارتقائی مدارج طے کرتی رہی ہے، اسی طرح یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ ہر دور میں زبان بھی بدلتی رہتی ہے۔ تلسی داس اور کبیر ہندی کے بڑے شاعر تسلیم کئے جاتے ہیں۔ لیکن دونوں کی شاعری کے مطالعے سے یہ بات عیاں ہے کہ تلسی داس کی وہ زبان نہ تھی جو کبیر کی تھی۔ اسی طرح ودیاپتی اور سُور داس ہندی کے شاعر مانے جاتے ہیں لیکن ودیاپتی مقامی کا شاعر تھا اور سُور داس کے یہاں برج بھاشا اپنے جوبن پر نظر آتی ہے۔ لیکن ہندی شاعری اپنے ارتقاء میں زبان کے اعتبار سے ایک بہت بڑی منزل طے کرنے میں کامیاب ہوئی۔ جب شاعری کی زبان کھڑی بولی مستعار پائی۔ یہی ہندی ادب کی تاریخ میں دویدی یُگ کی ابتدا مانی جاتی ہے۔ اس تحریک کے رہنما مہاویر پرساد دویدی تھے بیسویں صدی کا آغاز ہندی شاعری میں شاعری کی ایک نئی تاریخ سے ہُوا۔ نثر اور شعر کے لئے زبان کو ایک دوسرے کے قریب تر لایا جائے۔ یہی اس دَور کے شاعروں اور ادیبوں کی دلی کوشش تھی۔ اس دَور کے سب سے بڑے شاعر میتھلی شرن گپت ہیں جن کی "بھارت بھارتی" کو بہت شہرت حاصل ہوئی۔ اس دور کے شاعروں نے ایک چوتھائی صدی تک ہندی شاعری کو نئے راستے پر گامزن کیا شعر کے لئے کھڑی بولی کو خوب سنوارا، خوب نکھارا۔ اس دور کی شاعری قومیت کے جذبے سے بے حد متاثر تھی۔ "بھارت بھارتی" میں ہندی کی قومی شاعری نے نقطۂ عروج تلاش کیا۔ اس سے اگلا دَور جو ۱۹۲۵ء سے ۱۹۳۵ء تک خوب مقبول رہا، چھایاواد یُگ کے نام سے مشہور ہُوا۔ اس یُگ کی باگ ڈور چار شاعروں کے ہاتھ میں رہی۔ جے شنکر پرساد، سمترانندن پنت، سورج کانت ترپاٹھی نرالا اور مہادیوی ورما۔ چھایاوادی ہندی شاعری یاس اور تڑپ کی شاعری تھی۔ اس میں پیش فلاکی بوجھ تلے دبا ہُوا شاعر تخیل کی اڑان بھرتے ہوئے سندر سپنے دیکھنے کا جتن کرتا تھا۔ اس دَور میں ہندی شاعری کی زبان پہلے سے بہت مختلف ہوتی گئی۔ کچھ لوگ چھایاواد کو رومانی دَور کے مترادف سمجھتے ہیں۔ کیونکہ یہاں ایسے مقامات بہت آتے ہیں جہاں شاعر کو اندھیرے کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔ زمین آنسوؤں سے بھیگ جاتی ہے۔ لیکن جہاں تک زبان کا تعلق ہے، ہم دیکھتے ہیں کہ اس دَور کی ہندی شاعری نے زبان کی مٹھاس کو زیادہ سے زیادہ اپنایا۔ شکایت کا منحنا اس دَور کی شاعری کو امتیازی حیثیت دیتا ہے۔ ۱۹۳۵ء کے بعد ہندی شاعری پر گپتی واد یعنی ترقی پسندی سے روشناس ہوئی۔ لطف کی بات یہ ہوئی کہ سمترانندن پنت جو چھایاواد کے بہت بڑے شاعر تھے اپنی "گرامیا" اور یگ بانی کے ساتھ ترقی پسند شاعر کے رُوپ میں ظاہر ہوئے۔ نرالا نے بھی 'کرمتا' ایسی نظم لکھ کر نئے دَور کا استقبال کیا ہم دیکھتے ہیں کہ شاعر گلاب پر طنز کستا ہے بڑی ندّت اور جرأت سے شاعر موجودہ سماجی نظام پر ہنستا ہے، اس کا مذاق اڑاتا ہے۔ پنت سے بھی کہیں زیادہ مہیا کی سے نرالا نے ایک نئے سماج کا تصور پیش کیا۔ "گرامیا" کا پنت ہندستانی عورت کی قابل رحم حالت کی تصویر پیش کرتا ہے اور دیہاتی زندگی کو اپنی تمام تر خوب صورتی اور دلکشی کے ساتھ بڑی کامیابی سے ہماری آنکھوں کے سامنے اُجاگر کر دیتا ہے۔

جب چھایاواد کا دَور دھندلے کی کی طرح ٹمٹما رہا تھا اور پرگتی واد کا آغاز ہو چکا تھا۔ ہندی شاعری کی رنگ بھومی پر ایک اور شاعر نے صحیح معنوں میں اپنا سُر الاپنا شروع کیا۔ یہ تھے ہری ونش رائے بچن۔ ایک فن کار کا سا انداز لئے یہ شاعر اپنا راگ الاپنے لگا اور سب کے دیکھتے دیکھتے مقبول ہو گیا۔ بچن کا شمار نئی ہندی شاعری میں ایک سنگِ میل مانا جاتا ہے۔ ہمارے دیکھتے دیکھتے بچن کا چراغ بجھنے لگا۔ زبان ایسی جسے ہر کوئی آسانی سے سمجھ لے، انداز بیاں ایک نیا ڈیزائن لئے ہوئے لیکن اس شاعر کے کلام میں نقص یہ آن پڑا۔ کہ یہ محض ڈیزائن ہی ڈیزائن نظر آنے لگا۔ کچھ لوگ ابھی تک بچن سے نئی جیتی جاگتی شاعری کی اُمید رکھتے ہیں۔ وہ بچن کے دوسرے درجے کے کلام میں بھی اوّل درجے کا کلام تلاش کرنے کا جتن کرتے ہیں۔ عین ممکن ہے کہ بچن ایک نئی کروٹ لے سکیں۔

۱۹۳۷ء میں سچدانند ہیرانند وتسائن نے، جو ہندی ادب میں "اگیئے"

کے نام سے مشہور ہیں۔ ہندی شاعری کو ایک نئے مُدرے روشناس کرایا۔

"اگنے" کی یہ کوشش سات شاعروں کی نظموں کے ایک مجموعے کے رُوپ میں ظاہر ہوئی۔ اس مجموعے کا نام "تار سپتک" ہے۔ ان شاعروں میں "اگنے" خود بھی شامل ہیں۔ اس مجموعے کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ ہر شاعر نے اپنے کلام کے بارے میں ایک بیان دیا ہے۔ مقدمہ میں "اگنے" نے جو تار سپتک کے مُدیر ہیں، ایک دیباچہ لکھا ہے۔ "تار سپتک کے اس دیباچے میں اگنے نے اس مجموعے کے شاعروں کا ذکر کرتے ہوئے لکھا تھا:۔

"شاعری کے ساتھ ایک محقق کا نظریہ اضافی برابری کے سُونڈ میں باندھتا ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس مجموعے کی سب نظمیں پریوگ شیلتا کے نمونے ہیں۔ یا کہ ان شاعروں کی نظمیں قدامت سے اچھوتی ہیں یا کہ یہی شاعر سب پریوگ شیل ہیں اور باقی سب گھاس چھیلنے والے[1]"

'پریوگ' کا مطلب ہے تجربہ اور 'پریوگ شیل شاعر' تکنیک کے نئے نئے تجربے کرتا ہے یا نئے تجربوں سے نئی شاعری کو روشناس کرانے کا دعویٰ کرتا ہے۔

اب یہ سوال اُٹھتا ہے کہ یہ نئے تجربے کیا ہیں اور ان کا رنگ ڈھنگ کیسا ہے۔ گنجان کتھا بودھ انیہ چندر، بھارت بھوشن اگروال، گجانن مادھو مُکتی بودھ، رام بلاس شرما اور اگنے — یہ ہیں تار سپتک کے شاعر۔ اپنے اور تار سپتک کے دوسرے شاعروں کے بارے میں اگنے نے اپنے دیباچے میں کھلے الفاظ میں یہ اعلان کر دیا تھا۔

"اس مجموعے میں پیش کئے گئے شاعروں میں سے کوئی ایسا نہیں جس کی شاعری محض اُس کے نام کے سہارے کھڑی ہو سکے۔ سبھی اس کے لئے لیا رہیں کہ ابھی کسوٹی ہو۔ کیونکہ سبھی ابھی تک اُس 'پرم تتو' کی تلاش میں ہیں جسے پا لینے پر کسوٹی کی ضرورت نہیں رہتی بلکہ جو کسوٹی کی ہی کسوٹی بن جاتا ہے[2]"

ویسے تو ہر زبان کی شاعری میں ہر دَور میں نئے تجربے کئے گئے ہیں لیکن اگنے نے شاعری کے جس 'پرم تتو' یا اعلیٰ عنصر کا ذکر کیا ہے وہ کیا ہے۔ اُس کے بارے میں بات صاف نہیں ہو پائی۔ لیکن کل ملا کر تار سپتک کے مطالعے سے ہم اِس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ یہ شاعر محض تکنیک کے پیچھے بھاگ رہے ہیں۔ موضوع کے اعتبار سے سب کا ایک نظریہ نہیں ہے۔ وہ کیا کہنا چاہتے ہیں، اس بات کی اہمیت اتنی پردا نہیں جتنی اس بات کی، کہ وہ کیسے اپنی بات کو کہنے کی جرأت کریں۔ زبان کے اعتبار سے بھی یہ شاعر بہت اُلجھے ہوئے ہیں جیسے اُن کے اپنے ذہن بھی اُن کی بات صاف نہ ہو۔ کہیں کہیں زبان بہت آسان نظر آتی ہے، لیکن موضوع ایک پہیلی بن کر رہ گیا ہے۔ کوئی ایک بات کہتے نہیں بنتی۔ شاعر کے دماغ میں جیسے بہت سی باتوں کی بھیڑ لگی ہے۔ لیکن کہیں کہیں بڑی تازگی نظر آتی ہے۔ "آج ہیں کیسر رنگ رنگے ہیں" — یہ ہے ایک نظم کا موضوع، جس کا یہاں جائزہ لیا جا سکتا ہے۔

آج ہیں کیسر رنگ رنگے ہیں
رنگت بدام بھی پھاگن کی کھلی پیلی کلی سی
کیسر کے دستوں میں چھپا، تن
سونے کی چھاہ[3] سا
بولتی آنکھوں میں
پہلے بہنت کے پھولی کا رنگ ہے۔
گورے کپولوں[4] پہ ہولے سے آجاتی
پہلے ہی پیار کے
رنگین چمپئی[5] کی سی للائی[6]
آج ہیں کیسر رنگ رنگے —
جوہ[7] دوار[8] نگر میں
جن کے دِیئے[9] رنگوں میں ہے رنگ گئی
پونو[10] کی چنچل چاندنی

جیون میں پھر بھی مٹھاس ہے
گیت کی آخری میٹھی کیسر سی
پیار بھی ڈوبے گا گوری سی باہوں میں

---

[1] تار سپتک صفحہ ۶ [2] تار سپتک صفحہ ۷

[1] رنگی ہوئی [2] لباس [3] چھاؤں [4] گالوں [5] پرسہ [6] لالی
[7] گھر [8] دروازہ [9] مخلتے [10] پُونم

اور ہونٹوں[1] میں، آنکھوں میں
پھولوں میں ڈوبی جیوں[2]
پھولوں کی ریشمی ریشمی چھاتیں
آج ہیں کیسر رنگے بن

(گرجا کمار ماتھر)

پرجاکرپا چوے نے "بیسویں صدی" کے موضوع سے ایک نظم پیش کی ہے جو یوں شروع ہوتی ہے:

بیسویں صدی نے ہمیں کیا دیا؟
موٹر، ریل، ونان[3]، کرانتیاں[4]
بے تار، سواک چرپٹ[5]
کاغذ مدرا[6] آرتھک سنکٹ[7]
گتی اتی شے تا[8] ویگ آشرتا[9]

رام بلاس سرما نے "سیتم شوم سندرم" کے عنوان سے ایک نظم کہی ہے جس میں بظاہر قدامت پسندوں کے اس نظریے کا مذاق اڑایا گیا ہے کہ ادب کی تین خصوصیتیں ہونی چاہئیں۔ یعنی یہ ضروری ہے کہ ادب سیتم (حقیقت پر مبنی) ہو، شوم (افادی) ہو اور سندرم (خوبصورت) ہو۔ دیس کے بٹوارے سے پہلے ملک کی حالت کا نقشہ پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے جب ابھی جنگ ختم نہیں ہوئی تھی۔ یہ نظم یہاں پیش کرنے سے پیشتر یہ کہنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس نظم کے شاعر وہی ڈاکٹر رام بلاس سرما ہیں جو ترقی پسند تحریک کے ایک رہنما ہیں۔ جہاں اُن کی دوسری نظموں کی زبان کہیں دوسرے شاعروں کی طرح سنسکرت کے الفاظ سے لدی ہوئی ہے تو کہیں اُس پر دیہاتی زبان کی چھاپ بھی موجود ہے۔ وہاں اس نظم کی زبان ہندوستانی کا ایک اچھا نمونہ کہی جاسکتی ہے۔

ہاتھی گھوڑا پالکی
جے کنھیا لال کی
ہندو مسلمان کی
جے شیر بھگوان کی

جناح، پاکستان کی
ٹوجو اور جاپان کی
لو بندے ماترم!
سیتم شوم سندرم!

ہندوستان ہمارا ہے
پرانوں سے بھی پیارا ہے
اس کی رکھشا کون کرے؟
سنیت منیت میں کون مرے؟
پاکستان ہمارا ہے
پرانوں سے بھی پیارا ہے
گجر نے دو جاپانی بم!
سیتم شوم سندرم!

شدھ کلا کے پارکھی
کہتے ہیں اُس پار کی
اس دنیا کی کون کہے؟
بھوسا گر میں کون ہے؟
جے ہو رادھا رانی کی
یا جس نے من مانی کی
رادھا یا اُو رادھا سے
چھپ کر اپنے دادا سے
کیسی بڑھیا چال کی
بہاری گوپال کی
اُن کے بھگتوں میں سے ہم!
سیتم شوم سندرم

جے ہو سدا بہار کی
شاعر یا عیار کی
تربت میں بھی آہٹ سے
اُٹھ کر بیٹھ گیا جھٹ سے
گل اور بلبل کی اولاد

---

[1] ہونٹوں [2] جیسے [3] ہوائی جہاز [4] انقلاب [5] بولتی فلمیں [6] کاغذ کے کرنسی نوٹ۔ [7] اقتصادی مصیبتیں [8] تیز رفتاری [9] تیز رفتاری سے چلنے کی ہوس۔

کرتا رہتا ہے فسریاد
دیکھی دیکھی سر میں زاد
انقلاب زندہ باد!
غم سے بھرا آتا ہے دل
دل وہ بھی شاعر کا دل

جس میں شدھ بھرا ہے غم
سیتم شوم سندرم

ہندی ہم چالیس کروڑ
کیوں بیٹھے ہیں ساہس چھوڑ
دیس ہمارا ہندوستان
لاکھوں ہی مزدور کسان
اس دھرتی پر بسنے والے
اس کے ہت مرمٹنے والے
کیا بھاگیں گے تابڑ توڑ
ہندی ہم چالیس کروڑ
یہ آزادی کا میدان
جیتیں گے مزدور کسان
ایک یہی ہے راہ سگم
سیتم شوم سندرم

آج بڑھیں گے ساتھ قدم
نغمے دھیمے ہوں گے ہم
گرنے دو جاپانی بم
بولو بندے ماترم!

جہاں یہ نظم بہت ہلکی پھلکی ہے وہاں یہ شکایت بھی کی جا سکتی ہے کہ شاعر نے جم کر کوئی بات کہنے کا جتن نہیں کیا اور یقیناً یہ نظم اُس قسم کی نظم نہیں ہے جو وقت کی حدود پر فتح پا سکے جو ہر دور میں نئی معلوم ہو سکے۔

خود اگنے کی ایک نظم "جادو" کی اس "بلی" شروع ہوتی ہے،

ہم کہ تھے سب سے گئے بیتے ہیں بول بتیل کے
مگدھ ان چھپ رہ گئے ہیں نیتر پال کے
اُس میں بیکل، اچل ہیں بات چل دل کے
نیتی مانو بند ہو گئی ہے وہ اس میں پل کے

اگنے کی زبان بہت اُلجھی ہوئی ہے۔ لیکن کہیں کہیں بات سمجھ میں بھی آ جاتی ہے۔ "چار کا گجر" کا شروع کا بول ہے:

چار کا گجر کہیں کھڑکا
رات میں اُچٹ گئی نیند میری سہسا

یا "بدلی کے بعد" کا شروع کا بول

تین دن بدلی کے گئے "آج سہسا
کھل سی گئی ہیں وہ پہاڑیوں کی سنیر بنیاں

"آج میں پہچانتا ہوں" اگنے کی اچھی نظم ہے۔ اس کے شروع کا بول لیجیے:

آج میں پہچانتا ہوں رشتیاں نکشتر
گرہوں کی گتی، گرہوں کے کچھ اپدوش بھی

یہ کیسے تجربے ہیں جو ہندی کی پریوگ شیل شاعری میں کیے جا رہے ہیں۔ قاری خود دیکھ سکتا ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ہندی شاعری کا یہ دور بہت اکھڑا اکھڑا سا معلوم ہوتا ہے۔ شاعر جم کر کوئی بات نہیں کہتا۔ جیسے وہ کچھ بھر کے ہی کوئی جتن کر رہا ہو۔ شاعری کی یہ تکنیک بھی ایک دم بدیسی معلوم ہوتی ہے جہاں پرانی ہندی شاعری میں رس کا بول بالا ہے، وہیں یگ کی شاعری میں قومیت کی آواز اُبھرتی ہے، چھایا واد یگ کی ہندی شاعری میں جہاں شاعر اپنی تڑپ سے قاری کو تڑپا دیتا ہے وہاں پریوگ شیل ہندی شاعری کی بنیاد ہی غلط معلوم ہوتی ہے۔

"تار سپتک" کی اشاعت کے بعد معلوم ہوتا تھا کہ پریوگ شیل ہندی شاعری دب سی گئی ہے۔ بلکہ اُس زمانے میں لوگوں نے اسے پریوگ شیل کہنے یا ان شاعروں کے دعویٰ کو ماننے کی طرف زیادہ توجہ بھی نہ دی تھی۔ لیکن تار سپتک کی اشاعت

لہ حوصلہ لہ آسان سے فعتاب

لہ ایک درخت کا نام لہ قسمت گویا ایک لے کے پھیلاؤ میں بندھ گئی ہے
سے اچانک ۴ے قطاریں۔ ۵ے شرارتیں۔

کے سات برس بعد جب اگنے نے "دوسرا سپتک" پیش کیا اور سات نئے پریوگ شیل ہندی شاعروں کے کلام سے ہندی ادب کو تعارف کرایا۔

بھوانی پرساد مشر، شکنتلا ماتھر (شریمتی گجانن ماتھر)، ہری نارائن ویاس، شمشیر بہادر سنگھ، رگھوویر سہائے، نریش کمار مہتہ اور دھرم ویر بھارتی۔ "دوسرا سپتک" میں بھی ان ساتوں شاعروں نے اپنی تکنیک وغیرہ کے بارے میں الگ الگ بیان دیا ہے۔ اگنے نے اس کے دیباچے میں ایک جگہ لکھا ہے:

"جو لوگ پریوگ کی برائی کرنے کے لئے روایت کی دہائی دیتے ہیں وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ روایت اکم سے کم شاعر کے لئے کوئی ایسی پوٹلی باندھ کر رکھی ہوئی چیز نہیں ہے جسے وہ اٹھا کر سر پر لادے اور چل نکلے"[1]

آگے چل کر اگنے دوسرا سپتک کے شاعروں کے بارے میں لکھتے ہیں:

"اگرچہ سب شاعروں کی زبان کا نکھار اور اظہار بیان کی صفائی ایک سی نہیں ہے اور اٹ پٹے پن کی جھانکی کم و بیش مقدار میں ہر ایک میں ملے گی۔ پھر بھی سبھی کو ایسی چیز حاصل ہوئی ہے جو 'پریوگ' کو حق بجانب ٹھہراتی ہے۔ 'پریوگ کے لئے پریوگ' ان میں سے بھی کسی نے نہیں کیا ہے۔ لیکن نئے مسئلوں اور نئی ذمہ داریوں کا تقاضا سب نے محسوس کیا ہے اور اس سے سبھی کو نیا اعجاز حاصل ہوا ہے، دوسرا سپتک نئی ہندی شاعری کو یقینی طور پر ایک قدم آگے لے جاتا ہے"[2]

'دوسرا سپتک' پر ہندی ادب میں بہت سے نقادوں نے اپنی رائے دی ہے۔ بھوانی پرشاد مشر نے "گیت فروش" کے عنوان سے ایک نظم لکھی ہے جو یوں شروع ہوتی ہے:

جی ہاں حضور! میں گیت بیچتا ہوں
میں طرح طرح کے
گیت بیچتا ہوں
میں سبھی قسم کے
گیت بیچتا ہوں

شکنتلا ماتھر نے اپنے شوہر گجانن ماتھر کی "کیسر رنگ رنگے بن" کی پیروڈی کے طور پر لکھا ہے، کیسر رنگ رنگے "انگنی"۔ اُن کی نظم "لیڈر کا فرمانا" یوں شروع ہوتی ہے۔

سجا ہے
ریشم کے پردوں سے ڈرائنگ روم
سوڈے سے فینل سے
اور گرم پانی سے
دھل رہے ہیں باتھ روم

'دوسرا سپتک' کے شاعروں میں شمشیر بہادر سنگھ، نریش کمار مہتہ اور دھرم ویر بھارتی کی نظمیں خاص اہمیت رکھتی ہیں۔ نریش کمار مہتہ نے "سمیہ دیوتا" کے عنوان سے ایک لمبی نظم پیش کی ہے۔ ایک جگہ وہ کہتے ہیں۔

صدیوں سے جو بند پڑے تھے برف اور ہم کے دروازے
نئی ہوا کے جھونکوں سے کانپ رہے ہیں ٹوٹ رہے ہیں

"سمیہ دیوتا" میں شاعر کی آنکھ دنیا کے نقشے پر مختلف ملکوں اور سرزمینوں پر تیرتی چلی جاتی ہے۔ فرانس کا ذکر شاعر نے یوں کیا ہے:

کسی فرنچ یوتی سا پیرس چمکیلی کرنوں کا گاؤن پہنے سب سے
پوچھ رہا ہے
کل کی باسی چھایا میرے کنول میں تو شیش نہیں ہے؟

پھر جرمنی کا ذکر شاعر یوں کرتا ہے

وہ برلن کا شہر آج نازی پاگل رمایدھ چوٹ پی چکا سوم
کے پرلے میں ہی
آگ لگا کر

پھر شاعر نظم کا آخری بول یوں الاپتا ہے:

میری دھرتی لپیٹ دی گئی ہے
اور سچ کی پیشانی کے چراگاہ پر دوڑ رہی ہیں طوفانوں کی
نئی ہوائیں۔

نئی ہندی شاعری آج پریوگ شیل شاعروں کے ہاتھوں میں آگے بڑھ رہی ہے۔ یہ بات تو صاف ہے، لیکن دیکھنا تو یہ ہے کہ ان لوگوں کے تجربوں کی

---

[1] دوسرا سپتک صفحہ ۷ [2] دوسرا سپتک صفحہ ۱۴

کمند کہاں تک پہنچتی ہے۔

ویسے دیکھا جائے تو پرانے شاعروں میں ابھی چند یہ کار دستیاں موجود ہیں۔ میتھلی شرن گپت، بال کرشن شرما نوین، رام دھاری سنگھ دنکر آج بھی اپنے اپنے رنگ کے مستند اور نمائندہ شاعر ہیں۔ سمترانندن پنت اور نرالا بھی بدستور لکھ رہے ہیں۔ پنت اپنے راستے سے ہٹ کر پھر پیچھے کو لوٹ گئے ہیں ـــــ یہ رائے بہت سے نقادوں کی ہے۔ شو منگل سنگھ سمن، ناگارجن، تروچن شاستری، اشیل، شنکر شیلیندر وغیرہ کی نظموں میں ترقی پسند شاعری کی آواز آج بھی ابھرتی ہے۔ لیکن یہ سب ہوتے ہوئے بھی پروگریسیو ہندی شاعری کا چہرہ چاہم ہے۔ جو لوگ اس شاعری کی برائی بھی کرتے ہیں۔ وہ بھی اسے سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

ٹھاکر پرساد سنگھ نے کچھ سنتھالی لوک گیتوں کو ہندی شاعری میں ڈھالنے کا جتن کیا ہے اور بالکل نئے شاعروں میں کیدار ناتھ سنگھ کا نام لئے بنا ہم نئی ہندی شاعری کے اس جائزے کو مکمل نہیں سمجھ سکتے۔ کیدار ناتھ سنگھ شاعری میں نئے کو بہت بڑا درجہ دیتا ہے۔ دوسرے سپتک کے بعد جب تیسرا سپتک ہندی ادب کی جھنیٹ کیا جائے گا، اُس میں کیدار ناتھ سنگھ شاید سب سے پہلا شاعر ہوگا۔

کیدار ناتھ سنگھ کا "بھاگن کا گیت" نئی ہندی شاعری کا ایک شاہکار ہے گیتوں سے بھرے دن بھاگن کے یہ، گائے جانے کو جی کرتا۔

یہ باندھے نہیں بندھتے، یا نہیں
یہ جاتیں کھلی کی کھلی
یہ تولے نہیں تلتے، ان پر ـــ
یہ آنکھیں تلی کی تلی
یہ کوئل کے بول، اڑا کرتے، انھیں تھامے ہتھیار رہتا ـــ دل

یوں معلوم ہوتا ہے نئے شاعر کی پکڑ میں نہیں آرہا اور وہ اسے پکڑنے کے لئے بے قرار ہے۔ نئے کی تلاش میں ہی دراصل نئی ہندی شاعری کا مستقبل چھپا ہوا ہے۔

ڈاک اور تار

۱۹۵۱-۵۲ء میں ڈاک اور تار کے شعبے کی سرگرمیوں کی باتصویر رپورٹ کتابی صورت میں شائع کی گئی ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ پچھلے سال نہ صرف ڈاک، تار، ٹیلیفون اور وائرلیس کی سروسوں میں کارکردگی کے اعلیٰ معیار کو قائم رکھنے کی کوشش کی گئی، بلکہ انھیں توسیع دینے کے پروگرام پر بھی عمل کیا گیا۔ مختلف دیہات میں پانچ ہزار سے زیادہ نئے ڈاکخانے کھولے گئے۔ پیشتر ازیں کسی ایک سال میں اتنی تعداد میں نئے ڈاکخانے قائم نہیں کئے گئے۔ رپورٹ مذکور کے مطابق ۳۱۔ مارچ ۱۹۵۲ء کو بھارت میں ڈاک خانوں کی مجموعی تعداد ۸۰۴۰۲ تھی، جبکہ ملک کی تقسیم کے پہلے سال کے آخر میں بھارت میں کل ۴۴۳۳ ڈاک خانے کام کر رہے تھے۔ ٹیلیفون اور تار کے سلسلوں کی تعداد میں بھی اضافہ ہوا ہے اور تقسیم کے بعد ڈاک اور تار کے شعبے کی آمدنی ڈیڑھ گنا ہوگئی ہے۔ ۱۹۵۱-۵۲ء میں ڈاک، تار اور ٹیلیفون کے محاصل ۳۹ کروڑ روپے تھے جب کہ ۱۹۴۷-۴۸ء میں یہ رقم صرف ۲۶ کروڑ روپے تھی۔ علاوہ ازیں ان تینوں سروسوں کے معیار میں نمایاں بہتری ہوئی ہے۔

رپورٹ کے آخر میں یہ بتایا گیا ہے کہ زیر جائزہ سال میں، روس، مصر اور آئس لینڈ کے ساتھ وائرلیس ٹیلی گراف سروس کا سلسلہ جاری کرنے کے علاوہ بھارت اور مصر و ایران کے درمیان براہِ راست ریڈیو ٹیلیفون سروس کا آغاز کیا گیا۔ لندن کے ذریعے ۳۳ ملکوں کے ساتھ ریڈیو ٹیلیفون کے انتظامات مکمل کئے گئے۔

کرتار سنگھ دُگل

نئی پنجابی شاعری

ہندوستان کی نئی زبانوں میں پنجابی زبان اپنی شاعری کی وراثت پر فخر کر سکتی ہے۔ پنجابی شاعری شیخ فرید شکر گنج۔ گورو نانک۔ شاہ حسین اور بُلّھے شاہ ایسے خدا رسیدہ فقیروں، سنتوں اور صوفیوں کے ہاتھوں پروان چڑھی۔ گورو نانک کی شاعری میں ہر اعتبار سے بہترین شاعری کے نمونے ملتے ہیں۔ ہیئت اور تکنیک کے لحاظ سے ہم نے جتنے بھی مشکل اور نئے تجربے کئے ہیں اُن کے بہترین نمونے پہلے ہی سے گورو نانک کی شاعری میں موجود ہیں۔ جذبات کے اظہار کے مطابق نظم کی سطروں کا پھیلنا سکڑنا بول چال کے ڈھنگ کے وزن، شدّت بیان ایک موضوع سے دوسرے موضوع تک پڑھنے والے کو طیار کئے بغیر ہی چلے جانا۔ یہ سب خصوصیات گورو نانک کی شاعری میں نظر آتی ہیں۔ ایک مدت سے پنجابی ادیب یہ بات تسلیم کرتے آئے ہیں کہ فقیروں، سنتوں۔ صوفیوں اور عاشقوں کے بول شعر کا درجہ رکھتے ہیں۔ چاہے ان میں روائتی شاعری کی سی شوخی نظر آئے یا نہ آئے۔ چاہے وہ شاعری کے وزنوں میں بندھتے ہیں یا نہیں۔

پنجاب کی سرزمین ہمیشہ سے سنتوں۔ صوفیوں اور عاشقوں کو جنم دیتی آئی ہے۔ پنجاب کے پہاڑوں، میدانوں۔ ہرے بھرے کھیتوں اور دریاؤں کا ماحول کچھ نشیلا سا ہے۔ اور اُس نے پنجابی شاعری کو کسی نہ کسی انداز سے ہمیشہ متاثر کیا ہے۔ پنجاب کے دریائے چناب کے بارے میں ایک پنجابی شاعر کا یہ قول کہ "اس کا پانی آگ لگا دیتا ہے"! ایک اہم صورتِ حال کو واضح کرتا ہے۔ آخر چناب کے کنارے ہی ہیر رانجھا، سوہنی مہیوال اور مرزا صاحباں کے پریم ناتک کھیلے گئے۔ وارث شاہ نے بھی اسی دریا کے کنارے ہیر اور رانجھے کے پیار کو اپنی شاعری میں زندہ کر دکھایا۔

ویسے جسے ہم نئی پنجابی شاعری کہتے ہیں، اُس کا سب سے پہلا شاعر بھائی ویر سنگھ کو تسلیم کیا جاتا ہے۔ پنجابی زبان کو ایک مدت کے بعد ایک ایسا شاعر نصیب ہوا جسے اپنی روایتوں کی سب سے زیادہ پہچان تھی اور جسے وقت کے تقاضے کا بھی اتنا علم تھا کہ جہاں اُس نے روائتی رنگ کی شاعری کے نمونے پیش کئے وہاں کئی بے خوف اور نئے تجربے بھی کئے۔ بھائی ویر سنگھ میں جہاں بُلّھے شاہ جیسا صوفیانہ انداز ملتا ہے اور باعی اور بیت کی پُرانی بحروں کو بڑی کامیابی کے ساتھ نبھایا گیا ہے۔ وہاں رانا صورت سنگھ" جیسا چھاکا دیہ نظم معرّا بھی پیش کیا ہے۔ انگریزی شاعری کے نئے رجحانات کے پیشِ نظر اس شاعر نے چھوٹے چھوٹے وزنوں کا استعمال بھی بڑی خوبی سے کیا ہے۔ بھائی ویر سنگھ کی شاعری کی سب سے بڑی خوبی ہے شاعر کا خلوص جس موضوع کا اس شاعر کو تجربہ نہیں ہے، یا جس موضوع کے بارے میں کچھ اس شاعر کے دل کے تار نہیں ہلے اس موضوع پر اُس نے کبھی قلم نہیں اُٹھایا۔ اگرچہ بھائی ویر سنگھ پنجاب میں سنگھ سبھا تحریک" کے رہنماؤں سے تعلق رکھتا تھا اس کی شاعری اُن دنوں اپنے عروج پر تھی، جب پنجاب میں اکالی تحریک نے ہر ایک پنجابی فن کار اور ہر ایک اہلِ دل کو متاثر کیا تھا۔ لیکن اس شاعر کے آدھی درجن سے زیادہ نظموں کے مجموعوں میں کہیں بھی اُن تحریکوں کا ذکر نہیں ملتا۔ کہیں بھی یہ شاعر اپنی نظموں میں اس قسم کی آواز بلند نہیں کرتا: "اے فرنگی! اب ہم تمہارے غلام نہیں رہیں گے"! ویر سنگھ بار بار اپنے باغیچے کے باغبان کا ذکر کرتا ہے لیکن اُسے پھولوں کی نہیں اپنے دیس کے کسان کی یاد نہیں آتی۔ ویر سنگھ گلِ داؤدی کی تعریف کرتا ہے کشمیر کے چناروں سے بچھڑتے ہوئے اُسے رنج ہوتا ہے۔ لیکن گیہوں کی نئی بالیاں کہیں بھی اُسے سرشار نہیں کرتیں۔ پکتے ہوئے گیہوں کا کون سا

رنگ کہیں بھی اُس کی نگاہ کو خیرہ نہیں کرتا۔ ویر سنگھ اپنی شاعری کے اعتبار سے ایک سکھ شاعر ہے۔ اپنی شاعری میں وہ جو کچھ بھی کہتا ہے سکھ دھرم کے اصولوں کو مدِ نظر رکھ کر کہتا ہے، اور یہ بات اُس نے کئی جگہ تسلیم کی ہے کہ اُس کے نزدیک شاعری سکھ فلسفے کو سمجھانے۔ اُس کی خوبیوں کو واضح کرنے اور سکھ جذبات کے اظہار تک ہی اہمیت رکھتی ہے، اور شاید یہی وجہ ہے کہ نئے نقادوں کی نظر میں ویر سنگھ کی شاعری کی اہمیت موضوع سے کہیں زیادہ ہیئت کے پیشِ نظر ہے۔ یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ بھائی ویر سنگھ نے آج سے پچیس برس پہلے اس پائے کا کلام پیش کیا تھا۔

سُپنے میں تم ہم سے ملے
ہم نے جھٹ تمھیں گلے لگا لیا
تم ٹھہرے نرے نُور۔ تم ہمارے ہاتھ نہ آئے۔
ہماری کلائی کانپتی رہ گئی

پروفیسر پورن سنگھ کو پنجابی شاعروں کی صف میں لانے کا شرف بھی بھائی ویر سنگھ کو ہے۔ پورن سنگھ ایک سکھ سائنس دان تھے۔ جو اعلیٰ تعلیم کے لئے جاپان گئے تھے، اور وہاں دیدانتی ہو گئے۔ جب وہ پنجاب لوٹے بھائی ویر سنگھ کی صحبت میں پھر سے سکھ بن گئے، اور انھوں نے خود کو پنجابی زبان اور ادب کی خدمت میں لگا دیا۔ پورن سنگھ ایک جذباتی شاعر تھا۔ اُس کی تخلیقات میں پنجابی شاعری نے ایک نیا قدم اٹھایا۔ پہلی بار اُس نے پنجابی زبان کو آزاد نظم سے روشناس کرایا۔ یہ "کھلے گونگھٹ" اور "کھلے میدان" یہ ہیں پورن سنگھ کی آزاد نظموں کے دو مجموعے۔ آج تک ان نظموں کا مطالعہ کرتے ہوئے یہ محسوس نہیں ہوتا۔ کہ یہ وزن قافیے اور ردیف کے محتاج ہیں ایک شدید بہاؤ ہے جس کے ساتھ پورن سنگھ کی شاعری پڑھنے والے کو اپنے ہمراہ لئے چلتی ہے۔ پورن سنگھ کے کلام سے جیسے دھرتی کی سگندھ آتی ہے وہ کیکر کے پھولوں کا ذکر کرتا ہے۔ کھیتوں میں چرتے ہوئے مویشیوں کا ذکر کرتا ہے۔ بے پروا کسانوں کا ذکر کرتا ہے۔ یوں اس شاعر نے پنجابی شاعری کو حقیقی زندگی کے قریب لا کر کھڑا کر دیا گو وہ ایک مفکر بھی ہے۔ "کھلے گونگھٹ" میں اُس کی شاعری کا تر کہیں کہیں بہت سنجیدہ ہے لیکن اُس کا انداز بیان اتنا مؤثر ہے کہ کہیں بھی اُس کی چال ڈگمگاتی نہیں۔ اُس نے پورن بھگت کے قصے کو آزاد نظم میں پیش کیا۔ میرے خیال میں پورن سنگھ ابھی تک نئے پنجابی شاعروں میں پیش پیش ہے۔ اگر وہ اتنی کم عمر میں نہ چل بستا تو اُس سے پنجابی شاعری کی بہت سی اُمیدیں وابستہ ہو سکتی تھیں۔

جذبے کی شدت، خیال کی سنجیدگی اور روحانیت سے لگاؤ رکھنے کی وجہ سے پرتم سنگھ سفیر سب سے زیادہ پروفیسر پورن سنگھ کے نزدیک ہے۔ سفیر کو اپنے کلام میں پورن سنگھ سے زیادہ ہیئت اور تکنیک کا دھیان رہتا ہے۔ لیکن جہاں خیال گہرا ہونے لگتا ہے وہاں پورن سنگھ کی طرح سفیر کی چال محض دھیمی ہی نہیں پڑ جاتی۔ بلکہ شدتِ فکر کے باعث یہ شاعر رویا رویا سا نظر آنے لگتا ہے اور پھر وہ جیسے بھاگ نکلتا ہے اور جیسے کہ زبان اُس کا ساتھ نہیں دے پاتی۔ ایک چوٹی سے دوسری چوٹی تک۔ ایک گہرائی سے دوسری گہرائی تک وہ اُڑتا جاتا ہے پھسلتا جاتا ہے سفیر جیسے اپنے موضوع کے ساتھ آنکھ مچولی کھیلتا ہے۔ جو کچھ وہ کہنا چاہتا ہے اُسے وہ کہہ بھی رہا ہوتا ہے اور وہ موضوع اُس کی پکڑ سے کچھ باہر بھی نظر آتا ہے۔ مغرب کے شاعروں کی سی زندگی پر بے اعتباری، قدرت کے انصاف میں شبہ جُسن میں گناہ کا احساس۔ حق کے لئے اس دنیا میں بے کار تلاش ——— اس طرح کی آوازیں بار بار سفیر کی کویتا میں سنائی دیتی ہیں۔

کسی کنواری کے کاجل سے رنگے ہوئے نین؛
پریت کی جھالکیاں جن میں لٹک رہی ہیں
جو سات آٹھ بار رچناب کو پار کر چکی ہے
فاختہ کی طرح اپنا مکھڑا بنا کر
وہ ایک وہ لہنا کا آنچل تھام لیتی ہے

جہاں ویر سنگھ نے آج کل پنجابی میں اپنا کلام کہنا بند کر رکھا ہے۔ وہاں نام چاتک اور گیانی گوربکھ سنگھ مسافر دو ایسے پرانے استاد ہیں جو ابھی تک باقاعدہ لکھ رہے ہیں۔ اور جہاں تک بن پڑتا ہے وہ نئی شاعری کے ساتھ قدم ملا کر چلتے ہیں۔ جہاں چاتک پرانے موضوعات کو نئے انداز میں پیش کرتا ہے وہاں مسافر نئے نئے موضوعات کو بھی اپنا تا ہے۔ چاتک کی شاعری میں زبان کی چاشنی۔ محاورے کی سادگی، بیان کی فنکاری۔

لہ مقالہ نگار کا یہ خیال صحیح نہیں کہ آزاد نظم قافیے اور ردیف کے ساتھ وزن کی قید سے بھی آزاد ہوتی ہے۔ (ادارہ)

ہیئت کی ہواری ـــــــ یہ ایسی خصوصیات ہیں جو ابھی تک اُس کی شاعری کو نئے شاعروں کے کلام کے پیشِ نظر الگ نوعیت عطا کرتی ہیں۔ مسافر کی شاعری میں ایک دبی دبی سی دھیمی دھیمی سی چوٹ۔ ظلم اور انیائے پر ایک جبرت۔ دنیا کی مکاری اور لوٹ کھسوٹ کی خلاف ایک سنجیدہ سا اشارہ یہ کچھ ایسی خوبیاں ہیں جن پر کوئی بھی نیا شاعر فخر کر سکتا ہے۔ چاترک سماجی برائیوں کا پردہ فاش کرتا ہے تو مسافر سیاسی فتنہ پردازیوں کا ذکر کرتا ہے۔ چاترک کسان کے کھیتوں کا ذکر کرتا ہے۔ اس کے بیلوں کا ذکر کرتا ہے اُس کی سادہ خوش حال زندگی کا ذکر کرتا ہے مسافر اپنے کلام میں کسان کی لوٹ کھسوٹ کا۔ مزدور کے ساتھ ناانصافی کا۔ درمیانے طبقے کے لوگوں کے گھٹیا پن اور رذالت کا نقشہ پیش کرتا ہے۔ مسافر اپنی ایک نظم میں نئی دلی کے کتے کی تصویر یوں پیش کرتے ہیں۔

ایک مالک!
ایک مالکن!
دونوں کے درمیان
نئی کار کے گدّے پر
بیٹھا اپنا منہ گھسا رہا ہے
کبھی مالک کے منہ کے ساتھ
کبھی مالکن کی ٹھڈی کو
چاٹتا ہے چومتا ہے
خوش ہوتا ہے
اٹھکھیلیاں کرتا ہے
جسم کو جھٹکتا ہے
دُم ہلاتا ہے
کھڑکی سے باہر جھانک کر
جیٹھ کی دھوپ میں
سڑک پر پیدل
چلتے ہوئے
چہروں کو دیکھ کر
اُن کے دلوں کو پڑھ رہا ہے

حال کی نئی پنجابی شاعری میں پروفیسر موہن سنگھ اور امرتا پریتم دو مشہور نام ہیں۔ اُن کی شاعری پر مغرب کی چھاپ ہے۔ کسی حد تک یہ بھی شاعری کے نئے رجحانات نے اُنھیں اُکسایا اور کسی حد تک اس شاعر اور اس شاعرہ نے ایک دوسرے کو اُبھارا ہے۔ موہن سنگھ کی عظمت اس بات میں ہے کہ مغرب کی بہترین روائتوں میں پرورش پانے کے باوجود وہ اپنے یگانہ پن اور اپنے طبعزاد انداز کلام کو قائم رکھ سکا ہے اور امرتا پریتم کی سمجھ بوجھ اس بات میں ہے کہ وہ موہن سنگھ سے ایک اشارہ لیتی ہے۔ لیکن زبان اُس کی اپنی ہے۔ اس کا اندازِ بیان اُس کا اپنا ہے۔ اُس کے تخیل سے بننے والی تصویریں اُس کی اپنی ہیں۔ اُس کی شاعری ایک عورت کی شاعری ہے۔ اُس کے موضوعات ایک عورت کے موضوعات ہیں۔ اُس کا نظریہ ایک عورت کا نظریہ ہے۔ موہن سنگھ کسان کو جھنجھوڑتا ہے۔ امرتا پریتم گیہوں کا ذکر کرتی ہے۔ موہن سنگھ مزدوروں کی مشکلات کے بارے میں آواز بلند کرتا ہے امرتا مزدوروں کے گیت رچتی ہے۔ اُن کے ساتھ مزدور مردوں کی طرف سے جو بے انصافی ہوتی ہے اُس کا کارن ڈھونڈھتی ہے۔ نئی پنجابی شاعری میں موہن سنگھ اور امرتا پریتم نے سب سے زیادہ گیت لکھے ہیں۔ ہلکے پھلکے گیت جو گائے جا سکتے ہیں۔ جو گلی گلی لوگوں کی زبان پر چڑھ جاتے ہیں۔ موہن سنگھ کی آج کل کی شاعری میں سیاسی عنصر حاوی ہوتا ہے۔ کئی بار وہ سیاسی قدروں کا ذکر اپنی محبوبہ کے پیار کے پردے میں کرتا نظر آتا ہے۔

تمہارے سینے کے نازک گھونسلے میں
اب میرا دم گھٹا جا رہا ہے
جن راستوں کو تمہاروں نے ڈس لیا۔
ان راستوں پر اب میں اپنے پر جھٹکنا چاہتا ہوں

موہن سنگھ اور امرتا پریتم کے بعد اوتار سنگھ آزاد۔ سورندر سنگھ ـــــــ نرولہ کچھ ایسے نام ہیں جن کی شاعری میں عظیم شاعری بننے کے سارے وصف موجود ہیں۔

نئی پنجابی شاعری آج بڑے سیانے اور ہونہار ہاتھوں میں ہے۔ جن راستوں پر آج کا پنجابی شاعر چل رہا ہے وہ صحیح ہیں اور اس بات کے امانت دار ہیں کہ اس شاعری کا مستقبل ایسا نہ ہوگا جس پر کسی کو شرمندہ ہونا پڑے۔

جدید کشمیری شاعری

جدید کشمیری شاعری نوعمر ہوتے ہوئے بھی آج اتنی ہی باشعور اور بیدار ہے جتنی ہند کی کسی اور جدید زبان کی شاعری۔ ایسا لگتا ہے کہ اس تقریباً بیس سال میں اس نے وہ تمام منزلیں طے کر ڈالی ہیں جن سے گزرنے میں اردو اور ہندی ادب کو نصف صدی سے زیادہ زمانہ صرف ہوا ہے۔

آج سے کوئی تیس سال پہلے کشمیری شاعری میں ٹھہراؤ سا آ گیا تھا۔ فارسی کے عالم اور سنسکرت کے پنڈت تو اس سے بے رُخی برت ہی رہے تھے۔ پڑھے لکھے نوجوان بھی اس پر ناک بھوں چڑھاتے رہتے۔ عوام میں بے شک اس کے صوفیانہ جذبات مقبول تھے۔ لیکن لل دیدؔ، نند رشیؔ، محمود گامیؔ، پرمانندؔ، شمس فقیرؔ، مقبولؔ، ظریفؔ اور کرشن راز دان کے انسان نواز نغموں کا روح پرور دھارا سوکھ سا گیا تھا، اور حبہ خاتونؔ، اون مال اور رسول میر کے پُرسوز تغزل کی گونج بھی مٹتی جا رہی تھی۔ معمولی درجے کے غزل گو تو پرانی لکیر ہی پیٹے جا رہے تھے۔ دنیا کی بے ثباتی کا رونا رونے والی تنگ بندیوں میں کبھی کبھار ہی سرور سرمدی کی ایک آدھ تان سنائی پڑتی تھی۔ کچھ چلے جذبات، بے ہنگم لفاظی اور بے کیف ابہام پرستی کا ہی بول بالا تھا۔

ایسی صورتِ حال اتفاقیہ نہیں تھی۔ اُن دنوں ریذیڈنٹ شاہی کے چھل بَل سے ریاست کی فضا اُداس تھی۔ دیسی ریاستوں کے دوسرے شکنجے میں کسی ہوئی جنتا کا سیاسی شعور بے ہوش پڑا تھا۔ صدیوں کی غلامی نے اسے نکما کر دیا تھا کہ اپنی پست حالی کا احساس بھی اس کے لئے ناممکن ہو گیا تھا۔ لُوٹ کھسوٹ کی چکی میں پس کر بھی وہ اپنے آس پاس کا جائزہ نہیں لیتی تھی، بلکہ بدقسمتی کو ہی کوستی رہتی اور اس پار کے آسرے کی دہائی دیتی رہتی تھی۔

لیکن جب ۱۹۳۱ء میں کشمیریوں کا سیاسی شعور انگڑائی لینے لگا تو برسوں کی اندھا دھند ہلچل ایک سیاسی تحریک کے روپ میں منظم ہونے لگی 'ضیرِ کشمیر' کی روشن دماغ قیادت میں اس تحریک نے مذہب و ملت کے تعصبات سے دامن چھڑا لیا اور جمہوری جد و جہد کے لئے قوم پرستی کی ڈگر اپنا لی۔ جوں جوں عوام کے قریب آتی گئی، منزل بمنزل بڑھتی چلی گئی اور کشمیر کی سماجی، سیاسی، تہذیبی اور ادبی زندگی کو متاثر کرتی گئی۔

کشمیر کی تحریکِ حریت کا یہ پس منظر جدید کشمیری شاعری میں خوب نمودار ہوا ہے۔ چنانچہ اس کے مطابق ہی دورِ جدید کو تین حصّوں میں بانٹا جا سکتا ہے۔

۱۔ ۱۹۳۸ء سے پہلے

۲۔ ۱۹۳۸ء سے ۱۹۴۷ء تک اور

۳۔ ۱۹۴۷ء کے بعد

۱۹۳۸ء سے پہلے تو پیرزادہ غلام احمد مہجور ہی کا دور دورہ رہا اصل میں جدید کشمیری شاعری کا افتتاح انہیں کے ہاتھوں ہوا۔ انہوں نے آڑے وقت میں کشمیری شاعری کی غنائیہ روایات کو ایک نئی آب و تاب کے ساتھ آگے بڑھایا۔ اور اپنی غزلوں سے پڑھے لکھے نوجوانوں کو مسحور کر کے کشمیری ادب کی طرف مائل کر دیا۔ شروع شروع میں وہ حبہ خاتون مقبول اور رسول میر سے متاثر رہ کر ہی حُسن و عشق کے مدبھرے راگ الاپتا رہا۔

"اگر وہ دلبر کدورت چھوڑ کر میری طرف آنکھ اُٹھائے
تو میں ساون کی چمیلی کی طرح کھل اُٹھوں میرا جوبن آپے سے باہر ہو جائے
کام دیو ڈل کی سیر کر رہا ہے۔ سُنا ہے رات کو رنالہ تیل مل جائیگا
میں پانی کے اندر کنول کی طرح اس کے درشن کا انتظار نہ کروں؟..."

لیکن بہت جلد —

"پیار کے ساز پر تازہ لے کر مہجور کی غزلیں اُمڈتی آئیں"۔ گل بلبل کے استعاروں میں اس نے ایک نئی اشاریت کی دلکشی سمو دی اور اپنے وطن کو غفلت کی نیند سے جگاتے ہوئے گایا۔

سویرے سویرے بیدار ہو جا، اے گل بوستاں!
بُلبل کے افسانے سُن
پو پھٹی، کھول دے مستانہ آنکھیں، بُلبل کے افسانے سُن!

ایک قومی ترانے میں اس نے گل و بلبل کی اس اشاریت کو اور بھی ہمہ گیر بنا دیا۔

"بُلبل پھُولوں سے کہہ رہی ہے، ایک گلشن ہے ہمارا وطن، ہمارا وطن ہی گلشن ہے!
بُلبلیں پھولوں پر فدا ہو رہی ہیں، بھونرے نرگسوں پر جان دے رہے ہیں۔
کشمیری حبِ وطن کی شراب پی کر مست ہے ...."

گریست کو (کسان کماری) میں مہجور نے گاؤں کی آزاد فضاؤں میں پلنے والے بے ساختہ حسن کی جو متحرک تصویر پیش کی ہے، وہ نہایت دلکش ہے۔ خاص طور پر شاعر کے یہ جذبات ہمارے دل میں گدگدی اٹھتے ہیں۔

تیرا اور خوجہ مستورات کا مقابلہ ہی کیا
تو تو گلوں کی صحبت میں خوش ہے
اور خوجہ مستورات در دریچے بند کر کے (اندھی) پڑی رہتی ہیں۔
او کسان کماری، او نازنین، او سندری!

'کاشرِ زنانہ' (کشمیری عورت) میں اس نے صدیوں سے خاموش کشمیری عورت کی بے بسی کا شکوہ سُنایا، اور ایسا لگتا ہے کہ اس میں صدیوں سے محکوم کشمیر کا دکھی دل چیخ اٹھا ہے۔

"سکھی، میں اپنی قسمت کے لکھے کو کیا کروں؟
میرے 'جوہن راج' کو مجھ سے محبت نہیں!
آن چاہے، ان ڈھونڈے میرا جنم ہوا
میرے جنم سے گھر والے دلگیر ہو گئے۔
میں یہاں کدھر آئی، پیدا ہی کیوں ہوئی
میرے 'جوہن راج' کو مجھ سے محبت نہیں!

۱۹۳۸ء میں ذمہ دار نظام حکومت کی مانگ کرتے ہوئے عوام نے حکومت سے ٹکر لی تو مہجور کے رومانوی جذبات تلخ حقیقتوں سے ہم کلام ہونے لگے۔ چنانچہ اُس نے سیاسی بیداری اور انقلاب کا ایک پُرجوش پیغام گایا۔

آرے باغباں آ، نو بہار کی شان پیدا کر۔
چمن ویراں ہے، شبنم آنسو بہا رہی ہے، گل جامہ چاک اور پریشاں ہیں،
گلوں اور بلبلوں کے اندر نئی روح پھونک تو دے!
گلوں کی بستی کو جگانا ہے تو زیر و بم کو رہنے دے
بھونچال لا، آندھی کو بلا، زور سے گرج، طوفان اٹھا!

فرقہ وارانہ بھائی چارے پر اس نے بہت زور دیا۔ سامراج شاہی کی چالوں سے وہ واقف ہو چکا تھا۔ اس لئے کشمیریوں کو اس نے مشورہ دیا کہ اپنے اصلی دشمن کو پہچان لیں، اور مل جل کر ملک کی کشتی کو کھینے چلیں۔ اس کا یہ پختہ یقین تھا کہ

جاڑا بیت ہی جائیگا، برف پگھل ہی جائیگی، بہار پھر سے آئیگی۔
مہجور تو پریم کا ساز طیار رکھ
گل اپنے آپ ہی کھل اُٹھیں گے، تو ذرا بہانہ تو بن!
اور تب — آہستہ آہستہ دارِ دل (جیسے شکاری پرندے) نابود ہونے جائینگے
بلبل اور کستور (مچھی) سرود بجائینگے
باغ ہمارا سورگ سے ٹکر لے گا!"

آزادی کی جدوجہد میں جو کھم اُٹھانے والوں کو اس نے ڈھارس بندھائی کہ۔

"خزاں کے طوفاں کو پھولوں کی ٹہنیاں سہہ لینگی
کسی دن بہار آجائے گی تو باز پرس کریگی۔
وہی کھل اٹھیگا جو جھنجھاوں سے جی نہیں چرائیگا!
(کیونکہ) پہاڑوں کی اونچی چوٹیاں (نئی سحر کے نور سے) جگمگا اٹھی ہیں!

اسی طرح نئے دور کی جھلکیاں پیش کرتے ہوئے مہجور نے ایک لمبی نظم (نیو کشمیر یعنی نیا کشمیر) میں جمہوری نقوش خوب ابھارے ہیں مثلاً

تھوہر (کی سی زہریلی کانٹے دار جھاڑیوں) کو دیودار کا پیوند دیا جائیگا۔
بید کی لکڑی کو چندن کی عمر (پائیداری) عطا کی جائیگی
سب کے سب یکساں ہونگے!

یا — مذہب داروں کے مختیار کھول دئے جائینگے ۔
تاکہ آج سے وہ ایک دوسرے کا کام تمام نہ کرسکیں
مذہب تو ایک نشان بن کے رہ جائیگا !"

اُن دنوں مہجور نے اجتماعی رجائیت کے جو نغمے گائے ان میں کشمیری شاعری ایک نئی لے سے آشنا ہوگئی ۔ صبح چھم ..... غزل اس سلسلے میں خاص طور پر قابل ذکر ہے ۔ کیونکہ اس میں انفرادیت اور اجتماعیت کا حسین تال میل ملتا ہے ۔

(میرے لئے) صبح ہے، باغ ہے، مستانہ دل ہے، تازہ جوبن ہے
مجھے بہار کی داد دینا ہے ۔ شوق سے گلزار کا لطف اُٹھانا ہے!
باغ کی بیلیں مرجھا گئی ہیں، چشمے کا پانی سوکھتا ہی جا رہا ہے ۔
مجھے ابر بن کر آسمان پر چڑھنا ہے اور باراں بن کر برسنا ہے"!
کشمیر ہی مشرق کو (خواب گراں سے بیدار کردیگا، وقت پر جگا دیگا ۔
یہ پیغام مجھے کشمیریوں کے کانوں تک پہنچانا ہے"!

شروع شروع میں تو تنہا مہجور ہی کشمیری شاعری کے فرسودہ روایات کے خلاف جہاد کرتا رہا ۔ لیکن بہت جلد اسے ایک قابل معاون مل گیا ۱۹۳۰ء کے لگ بھگ عبدالاحد آزاد بھی تصوف کی ڈگر چھوڑ کر قومی، سماجی اور سیاسی موضوعوں پر زور دار شاعری کرنے لگا ۔ اس کی رفتار اتنی تیز رہی کہ ۱۹۴۳ء میں خود مہجور نے اُسے ہی نئے دور کی ترجمانی کا وکیل ٹھہرایا ۱۹۳۹ء میں اقبال کے نالۂ ابلیس سے متاثر ہو کر اُس نے شکوۂ ابلیس لکھا جس میں انسانی سماج کو بدلنے کی ضرورت کا احساس پوری شدت سے اجاگر ہوا ۔

آزاد نے ہر طرح کی جغرافیائی، ملی، قومی اور فرقہ وارانہ تنگ نظریوں کے خلاف آواز اٹھا کر تمام انسانی سماج کو اپنی شاعری کا محبوب موضوع بنایا ۔ انسانیت ہی اس کا آدرش رہی ۔ انسانیت ہی معبود ۔ اسے یہ بھی گوارا نہ تھا ۔ کہ وطن پرستی، انسان دوستی کی راہ میں حائل ہو جائے ۔ اس کا نظریہ تھا کہ ۔

ان مذہب داریوں میں بڑے بڑے مطلب چھپے رہتے ہیں ۔
ان غم خواریوں میں ستمگاری ہی پلتی ہے ۔
وطن داری بھی جب دوئی کا درس دینے لگے تو یہ بھی کئی بیماریوں میں سے ایک بیماری ہے !

صبح وطن پرستی نے اسے یہ سوچنے پر مجبور کر دیا ہے کہ ۔

کلھن، خنی اور صرفی کو جس آب نے سیراب کیا ۔
وہی آب ہمارے لئے زہر ہلاہل کیوں ہو ؟
اور انسانی سماج میں معاشی اونچ نیچ دیکھ کر اُس کے دل کی گہرائی سے آواز آئی
ایک ہے جو اشرفیوں میں کھیل رہا ہے، "آہ" دوسرے کے پاس کوڑی بھی نہیں
میرے اختیار میں ہوتا تو — اور ہی بات ہوتی !"

بہت جلد اس نے محسوس کر لیا کہ انسانی سماج کو صحت مند اور خوشحال بنانے کے لئے انقلاب ناگزیر ہے ۔ اور انقلاب کا ترانہ اُمڈ آیا —

"رنگ اور نسل سے پرانی چیز کبھی نئی بھی ہو سکتی ہے ؟
خزاں کے بادلوں کی کڑک سے کبھی دردستان بھی کھل اُٹھا ہے ؟
غازہ اور خضاب سے کبھی شباب بھی تازہ ہو سکتا ہے ۔
انقلاب لا، انقلاب

اور انقلاب کی یہ راگنی آزاد کے 'دریا' میں اور بھی زور شور سے گرج اٹھی یہ لمبی نظم کشمیری شاعری کا ایک انمول رتن ہے ۔ اس میں دریا کی زبانی آزاد کشمیری ہی بول اُٹھا ہے کہ —

اونچ نیچ اور حد بندیاں دیکھ کر میں آپے سے باہر ہو جاتا ہوں ۔
دوڑا پھرتا ہوں، جان لڑاتا ہوں وحدت اور مساوات کی تلاش میں
جبھی تو میں پانی ہوتے ہوئے بھی آتش زیر پا ہوں، مانو قوت (کی
لکڑی) کے دہکتے ہوئے انگاروں پر پڑا ہوں ۔
مجھے تو زندگی کا لطف سفروں اور منزلوں میں آتا ہے"!

غیر طبقاتی سماج کی تعمیر کے لئے جد وجہد کرنے والوں کو اس نے یقین دلایا ۔

"آنے دو گرمی کے موسم کو، یخ کے ان محلوں کی بنیادیں ہل اُٹھیں گی
بہار کے بادلوں کی گرج برفیلے پربتوں کو پاش پاش کر دیگی !"

اس طرح آزاد نے کشمیری شاعری میں ایک بین الاقوامی سُر چھیڑا ۔ اس کے ساتھیوں میں اُن دنوں فانی، کافر، ناز اور عاشی نے بھی مجبور اور مظلوم عوام کی وکالت کی ۔ اور تو اور ماسٹر جی (ماسٹر زندہ کول) کے سے کہنہ مشق شاعر نے بھی اپنی فلسفیانہ شاعری میں اس نئی گونج کو سمیٹ لیا چنانچہ کرناو تارکھ نا (اوپر (کشتی میں ہمیں لے چلو ناپار) میں وقت کی ندی کے پار اس مساواتی سماج کی روشن اور حسین دنیا میں پہنچنے کی خواہش ظاہر کی ۔ عاشی نے خاص طور پر مزدوروں کے دُکھ درد کو ہی اپنا موضوع سخن

بنایا۔ غریبی کی دلدوز داستان سُنا کر اس نے لُوٹ کھسوٹ کے شکار محنت کش کو تسکین دی۔

انقلاب کے نعرے سے ظالم گیدڑوں کی طرح دم دبا کر بھاگ جائینگے
لعل نمودار ہو جائینگے، چٹانیں راکھ ہو جائینگی۔

کرپس مشن کی ناکامی پر ہندیں جو "انڈیا چھوڑ دو" تحریک چھڑ گئی، کشمیر کی سیاسی فضا میں بھی اس سے ارتعاش پیدا ہو گیا، اور کشمیری شاعری میں بھی اس کی گونج سنائی دی۔ حالات سے مجبور ہو کر جب کشمیری عوام نے ۱۹۴۶ء میں "کشمیر چھوڑ دو" تحریک چھیڑ دی تو شاعروں نے بھی اس کا ساتھ دیا۔ مہجور نے پہلے بوزے تھو زانس سیت نظم میں پُرانے نظام کو للکارا۔

دو ایک دن اور اپنے ساز و سامان سے لطف اٹھا،
بعد میں تجھے طوفان سے کام پڑیگا
تیرے اِن دیوان خانوں میں عوام بس جائینگے
پتے کی بات سن، زمانے سے ہم آہنگ ہو!

عاصی نے ہُل والے جھنڈے کا گیت گایا اور عارف نے "نگر کار وان سون بردھ، بردھ پکان گو (گر ہمارا کارواں آگے ہی آگے بڑھتا گیا!) عنوان سے ایک لمبی نظم میں اس تحریک کا "جہاد نامہ" لکھا۔ یہ نظم بھی جدید کشمیری شاعری میں ایک نئی چیز تھی۔ جدوجہد کی شدت کے ساتھ ساتھ اس میں ارادے کی مضبوطی کا بہت حسین بیان ملتا ہے۔ اس سے پہلے اُس نے "مزدورین" (مزدوروں) نام کی ایک لمبی نظم لکھی تھی جس میں اس نے ایک ایسی دُھن کے جوان دل کی اُجڑی بہاروں کا پُر درد شکایت سمو دیا جو ریشم خانے میں کام کرنے پر مجبور ہے۔ ایسے ہی دُھنے (نشال) کی زبانی اس نے کاسبوں کی بے بسی کا درد بھرا حال سُنایا۔

بچوں کو خالی پیٹ سُلا سُلا کر ریشے صاف کرنے لگی ہے بھوکی بڑھیا
چراغ ہیں خونِ جگر ڈال کر۔
دو شیر اٹھی پیٹ بھرنے کی آس میں آنکھوں کی حیوت بھی کھو بیٹھیں
اپنے (بکھڑے کے) گل انار کا رنگ بھی پیلا کر ڈالا۔
میرے دل کے داغ کسی کو دکھائے تو نہیں"؟

۱۹۴۷ء میں قبائلی حملے نے کشمیر میں اودھم مچایا تو دشمن کے خلاف مورچہ کھڑا کرنے میں کشمیری شاعری بھی پیش پیش رہی۔ انقلاب کے اس عبوری دور نے کئی نئے شاعروں کو جنم دیا۔ جن میں "نادم" روشن اور عارض سب سے زیادہ کامیاب رہے۔ نادم اور روشن نے موضوع اور ہیئت دونوں میں کئی معنی خیز تجربے کئے۔ اور کشمیری شاعری کے امکانات کو خاصا وسیع کر دیا۔

نادم نے انقلاب اور تعمیر نو کے بے باک نغمے گا کر کشمیری عوام کو اندرونی اور بیرونی سبھی طرح کے خطروں سے آگاہ کیا۔ اور ایک نئے سماج کی تعمیر کے لئے کمربستہ ہونے کی تحریک کی۔ سماج کے پسے ہوئے طبقے سے اس کی ہمدردی محض جذباتی اُبھار نہیں، بلکہ گہرے احساس سے اُمڈ آئی ہے۔ اس کے اشعار آپ ہی ہمیں بتاتے ہیں کہ۔

پنیری کا بچپن اور کیاری کا جوبن لئے ہم کھلیانوں میں پیدا ہو گئے
چٹانوں کے اوپر گڈریوں کی زبانوں پر
شکاروں، ڈونگوں اور کشتیوں کے ہونٹوں پر..... ڈلوں اور
مانسبلوں میں....
دھان کوٹنے والی کے موسل کی لے میں
شست شست کی گنگناہٹ سے گونجتی ہوئی چھان پھٹک میں
ہمارا جنم ہوا!
روٹی (کاٹنے والی) کے کول انار چڑھاؤ کے ساتھ ہم گا اُٹھتے ہیں۔
جلاہے کے ہر دھاگے کی نظر کن پر ہم ناچ اٹھتے ہیں....
دھنیا کی دھنکی کے ساتھ ہمارا دن کٹتا ہے....
اور اس کے تانت کی تال پر ہمارا جوبن جھوم اُٹھتا ہے!...."

زرعی اصلاحات کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کی ضرورت کو اس نے ایک سنگیت روپک میں واضح کیا اور کسان سے خطاب کیا کہ وہ جو ہر سال اپنے ہل (کے پھال) کی نوک سے دھرتی ماتا کا نیا بھاگ لکھتا ہے، آج اپنا بھاگ اکھاڑ کر ایک نیا بھاگ لکھ دے! جنگ کے خلاف جہاد اور امن تحریک کی حمایت کا جدید کشمیری شاعری میں جو زور ہے اس کے پیچھے کشمیریوں کی وہ جمہوری امنگ ہی کام کر رہی ہے جسے نادم نے یوں ادا کیا ہے۔

آج میں چل پڑوں گا، راستہ بناؤنگا

اونچ نیچ کو ہموار کر دونگا!
میں چل پڑوں گا، تیز نیا قلم اور کٹار لئے
دشمنوں اور بٹ ماروں کے لئے 'مُنافعت' لئے میں گھوموں گا۔
ہتھوڑا، قلم، اور ہنسیا لئے
روشن روئیں سے پسینہ بہا کر
میں اپنے اِس نندن بن کو
اس بچپن کے میت کو
ہنلا دونگا!
اور ـــــ گڑھوں اور کھائیوں کو
کھڈوں اور بلوں کو
اُجالے سے بھر دونگا! ...
جب کہیں میں گاؤں گا آج نہیں گاؤں گا!

نادم کے اشعار میں زندگی کی تلخ حقیقتوں کے جتنے بھی بیان ملتے ہیں ان میں کہیں بھی یاسیت یا قنوطیت کی آہٹ نہیں سُنائی دیتی۔ انسانیت کے شاندار مستقبل پر اس کا یقین اٹل ہے۔ اور زندگی سے اسے پیار ہے زندگی کے ساز و سامان سے پیار ہے، لیکن اسے اس بات کا بھی احساس ہے کہ زندگی کو ابھی موافق آب و ہوا میسر نہیں۔ انسان ابھی جینے کے بنیادی لوازم سے بے بہرہ ہے۔ 'ڈل کی ہانجن کے گیت' میں اس نے انسان کی اس ناداری کا ایک جیتا جاگتا منظر کھینچا ہے۔ اپنی بے بسی کا دُکھڑا سناتی ہوئی ہانجن کہتی ہے ـــــ

کیا سُناؤں، پچھلے پیر کو میں نے بچہ جنا
سکت تو تھی نہیں، بے بس ہو گھر سے نکلی
اس دودھ منہے (شیر خوار) کو چھاتی سے الگ کر کے چلی آئی۔
آری آ، آری آ، آری آ، آ
جیسے بہرے کانوں میں ننھے کے رونے کی آواز آ رہی ہو
جیسے میری چھاتی کسی کی سسکیاں محسوس کر رہی ہو
آج اِدبُوا، مجھے گھر پلٹنے کی بے کلی ہے
آری آ، آری آ، آری آ ـــ آ

عوام کی اس ناداری سے بوکھلا کر ہی نور محمد روشن گرج اُٹھا ہے۔

بھلا کوئی زردار اب بھی میری پیٹھ پر سوار رہے گا۔
مزدور کے علاوہ بھی کوئی سردار رہ پائے گا۔
میں ایک نئے نظام، ایک نئے زمانے کا آغاز کرونگا،
ایک نیا انسان بناؤنگا، ایک نیا جہان تعمیر کرونگا!"

اس نئے نظام کی تعمیر میں روڑے اٹکانے والے کسی بھی سماج دشمن کو آج کا کشمیری شاعر معاف نہیں کر سکتا۔ غلام نبی عارض اسے تنبیہہ کرتا ہے کہ

ظالم، چور، ٹھگ، سرمایہ دار اور رشوت خور
یہ سبھی وقت کے انقلاب میں ویسے ہی بھُن جائینگے جیسے بھڑ بھونجے کی بھٹی میں کھیلیں!

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ قبائلی حملے کے بعد کشمیری شاعری نے کئی کروٹیں لیں، پہلے دو ایک سال تو اس میں دشمن کے خلاف تہذیبی مورچہ کھڑا کرنے کی ضرورت اور نئی آزادی کے تحفظ کی اُمنگ ہی کو سمجھا گیا۔ لیکن پچھلے تین چار سال سے اقتصادی جمہوریت اور عالمگیر امن کے قیام پر ہی زیادہ زور دیا جاتا رہا ہے۔ 'زمین کسان کی' تحریک نے بھی نئی شاعری میں پُرزور حمایت پائی ہے اور اس کے ساتھ ہی محنت کشوں کی زندگی کے گوناگوں پہلوؤں کو حقیقت پسندانہ نگاہوں سے دیکھنے اور فنکارانہ انداز میں جھلکانے کی بہت کامیاب کوششیں کی گئی ہیں۔ آزاد بحر میں نادم، روشن اور راہی نے نئے زمانے کے نئے تقاضوں کو پیش کیا ہی ہے۔ پریمی نے خاص طور پر لوک گیت کی تکنیک کا سہارا لے کر کسانوں اور مزدوروں کے سُکھ دُکھ کی جیتی جاگتی تصویریں اُبھاری ہیں، پودے لگانا، گوڈی کرنا، زعفران چننا، ریڑا چلانا جیسے موضوعوں پر بیسیوں لوک گیتوں، ناچ گیتوں اور لوریوں میں اُس نے نئے زمانے کی دھڑکنیں سنائی ہیں۔ پنیری لگانے والی دوشیزائیں ایک دوسرے کا حوصلہ بڑھاتی ہوئی گاتی ہیں ـــ

اُٹھ ری نرگس، اُٹھ ری، پنیری لگا
دھان کے پودے سب کے سب ہاتھ اٹھائے تجھے آسیس دے رہے ہیں ـــ
تو بھی ایسے ہی کھل اُٹھ! ..."

نئی کشمیری شاعری ایک نئی بہار کی نقیب ہے۔

ہندی شاعری میں جدید رجحانات

اردو شاعری کی طرح ہندی شاعری کا نیا دور ۱۸۵۷ء کے آس پاس سے شروع ہوتا ہے اور اس ستر اسی سال کے زمانے کو (۱) بھارتیندو جُگ (۲) دوی ویدی جُگ (۳) پرساد جُگ اور (۴) پرگتی شیل جُگ یعنی ترقی پسند ادوار میں تقسیم کیا جاتا ہے۔

پہلا دور یعنی بھارتیندو جُگ بھارتیندو ہریش چندر کے نام سے منسوب ہے۔ اس دور میں بھارتیندو ہریش چندر کے علاوہ پرتاپ نارائن مشر، بال مکند گپت اور بدری نارائن چودھری کو بھی نمایاں حیثیت حاصل ہے۔ لیکن اس دور کی رہنمائی کا حق بھارتیندو ہریش چندر کو ہی پہنچتا ہے کیونکہ وہ اس دور کے سب سے زیادہ باشعور شاعر اور ادیب تھے اور اُن کی تخلیقی صلاحیتیں بھی دوسروں سے زیادہ تھیں۔ بھارتیندو ہریش چندر الطاف حسین حالی کے ہم عصر تھے۔ اُن کی پیدائش ۱۸۵۰ء میں ہوئی تھی۔ اس لئے ہندی شاعری کے جدید دور کا شمار عام طور پر ۱۸۵۰ء ہی سے کیا جاتا ہے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ یہ شمار تاریخی اعتبار سے درست نہیں ہے۔ غدر[1] کے بعد کافی دنوں تک ہندی شاعری میں ریتی کال کا ہی بول بالا تھا۔ انیسویں صدی کے آخری سالوں میں جب ہماری سماجی زندگی میں بیوپاری اور صنعتی عناصر کی مقدار کافی بڑھ گئی، اور درمیانے طبقے کے پڑھے لکھے نوجوانوں نے مغربی سائنٹفک خیالات کو اپنانا شروع کیا۔ تو پرانے اور قدامت پسند نظریوں کے خلاف بغاوت کا جذبہ پیدا ہوا، اور سیاست میں حُب الوطنی کی تحریک کے ساتھ ساتھ سماجی اصلاح کی تحریک بھی شروع ہوئی۔ ویسے کے ادب اور کلچر پر ان تحریکوں کا اثر پڑنا لازمی تھا۔ اردو میں سرسید احمد اور مولانا حالی نے سماجی اور قومی مسائل کی طرف قوم کی توجہ مبذول کی۔ اردو شاعری کو خیالی

[1] یا جنگِ آزادی (ادارہ)

صنم پرستی" کی دلدل سے نکال کر افادیت اور قوم پرستی کی راہ پر لگایا ہندی میں بھارتیندو ہریش چندر، بال مکند گپت اور بدری نارائن چودھری نے وہی فرض سرانجام دیا۔ ڈاکٹر رگھوپتی نے اس ادبی تحریک کے متعلق ڈاکٹر واشتے کے حوالے سے لکھا ہے۔ انیسویں صدی کے نصف آخر کے ہندی ادیبوں اور شاعروں نے اپنی تخلیقات میں نئے ہندوستان کے سیاسی اور اقتصادی جذبات کا اظہار کر کے اپنے گرد و پیش کے دھرم اور سماج کے انحطاط اور زوال پر خون کے آنسو بہائے اور مستقبل میں ترقی اور اصلاح کی طرف اشارہ کیا۔"

ظاہر ہے کہ یہ اصلاح پسندی کی تحریک تھی۔ پرانے رسم و رواج اور قدامت پسندی سے رشتہ توڑ لینے کے عوض اُن میں اصلاح چاہتے تھے۔ آگے کی طرف کم ماضی کی طرف زیادہ دیکھتے تھے۔ اس لئے اس دَور کی ادبی اور سماجی تحریک کو رومانی عقلیت یا بُدھی واد کا نام دیا جاتا ہے۔

بُدھی واد کا یہ دور پرانے زمانے سے یقیناً مختلف تھا۔ ریتی کال میں شاعری کا رشتہ زندگی سے ٹوٹ گیا تھا۔ اس دور میں موضوع، زبان اور چھند (بحر) سب کچھ پرانا تھا۔ لیکن بھکتی کال کی طرح شاعری کا پھر زندگی کے ساتھ تعلق قائم ہوا اور عوام کی دلچسپی کا موضوع بننے لگی شاعری میں نہ صرف نئے خیالات ادا کئے جانے لگے۔ بلکہ پرانی بحروں کی جگہ مروّج بحروں مثلاً کجلی۔ برہ، ریختہ اور ملار استعمال ہونے لگیں، اور زبان بھی پہلے سے آسان اور جاندار ہو گئی۔ اس سلسلے میں تین نارائن اور رگھون ناتھ قابلِ ذکر ہیں۔

لیکن اب تک شاعری برج بھاشا میں ہوتی تھی۔ بھارتیندو ہریش چندر نے بھی زیادہ تر برج بھاشا میں ہی شاعری کی ہے۔ لیکن وہ پہلے کوی ہیں جنھوں نے کھڑی بولی (جدید ہندی) اور اردو بحروں کا استعمال کیا ہے۔ بات بدلتی ہے تو بات کہنے کا ڈھنگ بھی بدلتا ہے۔

اس لئے یہ تبدیلی ضروری تھی۔ دیس کے نئے ماحول میں حب الوطنی کے جذبات پرورش پا رہے تھے اور ان جذبات کی تہ میں اقتصادی لوٹ کھسوٹ کے خلاف احتجاج کا جذبہ کار فرما تھا۔ بھارتیندو ہریشچندر نے لکھا ہے ؎

انگریز راج سُکھ ساج سجے سب بھاری
پے دھن بدیس چلی جات یہے اتی خواری

اس دور میں قومیت اور حب وطنی کا احساس پیدا ہو گیا تھا اور تبدیلی کی ضرورت محسوس کی جا رہی تھی لیکن یہ جذبہ اپنی ابتدائی حالت میں تھا۔ دیس کی زبوں حالی کا رونا ہی رویا جاتا تھا جیسا کہ بھارتیندو "بھارت دُردشا" تک سے ظاہر ہے۔ عمل اور تحریک کا فقدان تھا۔ دوسرے دور میں حب وطنی کا جذبہ اُبھر کر سامنے آتا ہے۔ آزادی اور سماج سدھار کی تحریکیں منظم شکل اختیار کرتی ہیں، اور بڑی تیزی سے آگے بڑھتی ہیں۔ ہماری زندگی کے ہر پہلو پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ چنانچہ ان کا ادب اور شاعری پر بھی اثر انداز ہونا ضروری تھا۔ ہندی میں اس دور کی رہنمائی کا حق مہاویر پرشاد دوی ویدی کو پہنچتا ہے۔ وہ ۱۹۰۳ء میں "سرستی" کے ایڈیٹر بنے اور انھوں نے ادب میں اصلاح کی تحریک کو بڑے زور شور سے چلایا۔ حب وطنی کے جذبات کی پرورش اور نشوونما کی شاعری کے افادی پہلو پر زور دیا۔ انھوں نے ہندی شاعروں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا:

"پرانے ڈھرے پر تسمر نگاری کو تیاگنا و دیا بدّھی اور پرتبھا (فن کارانہ صلاحیت) کا وچار (تعیش پسندی) ہے۔ استعارے، تشبیہوں اور معشوق کی نزاکتوں کا بیان بے کار ہے۔ شاعروں کو اپنی اپنی طبیعت کے مطابق موضوع منتخب کر کے بڑی نہیں تو چھوٹی چھوٹی نظمیں لکھنا چاہیئے۔"

لگ بھگ یہی بات مقدمۂ شعر و شاعری میں حالی نے اردو شاعروں سے کہی ہے۔ اجارہ مہاویر پرشاد دوی ویدی کے سچے شاگرد شری متھلی شرن گپت نے اپنی زبان میں یوں پیش کیا ہے ؎

کیوں منور نجن نہ کوی کا کرم ہونا چاہیئے
اس میں اوچت اپدیش کا بھی مرم ہونا چاہیئے

یعنی صرف دل بہلاوا ہی شاعر کا فرض نہ ہو۔ اس کی شاعری کا مقصد کوئی پیغام دینا ہے۔

سماج میں نئے دور کی تعمیر کا کام ہمیشہ شاعروں، ادیبوں، دور اندیشوں اور دانش وروں کے ذریعے سے انجام پاتا ہے۔ یہ ہماری قومی بیداری کا زمانہ تھا۔ انیسویں صدی کے اخیر تک کارخانہ داری نے کافی ترقی کر لی تھی۔ کپڑے کی صنعت میں غیر معمولی اضافہ ہوا تھا اور سودیشی کا رواج بڑھ رہا تھا۔ یہ سیاسی اور اقتصادی تبدیلی ہندی شاعری پر براہ راست اثر انداز ہو رہی تھی۔ ملاحظہ فرمایئے۔

دیس دشا پر پیارے بھائی — آؤ کتنی بار رُ لا ئی
سودیشی بستر کا سویکار کیجئے — دینے اتنی ہماری مان لیجے
شیشٹھ کر کے بدیشی بستر تیاگو — نجاؤ پاس اس سے دُور بھاگو

(سرستی۔ جولائی ۱۹۰۳ء)

اور متھلی شرن گپت لکھتے ہیں ؎

ہم او تھان کا گیان ہی مول ہے — اسے بھول جانا بڑی بھول ہے

یہ عقلیت کا دور تھا۔ اس لئے نئے خیالات قبول کئے جا رہے تھے اور قوت عمل کو اُبھارا جا رہا تھا۔ اجودھیا سنگھ ہری اودھ لکھتے ہیں۔

چار ڈگ ہم نے بھرے تو کیا ہوا — ہے پڑا سیدان کوسوں کا ابھی
کام جو ہے آج کے دن تک ہوا — ہے نہ ہونے کے برابر وہ ابھی

قومی تحریک میں مذہبی عناصر غالب تھے اور ہمارے نئے شعور میں بھی عبادت پرستی اور اوتار پرستی کے تصور کار فرما تھے۔ اس لئے پرانے دیوتاؤں کی جگہ بھارت ماتا کی پوجا کا رجحان ہو رہا تھا۔ پرانی کتھاؤں کو نئے علامات کے ساتھ پیش کیا جا رہا تھا۔ مثلاً بھاگوت کی پرانی کتھا کے مطابق بھارت ماتا درد پدی ہوئی۔ انگریز کنس۔ اس کے حالی موالی دوشاسن یگانہ چنگیز کرشن اور باقی دیس بھگت پانڈو اور آزادی کی لڑائی کو مہا بھارت کی لڑائی مان لی گئی ؎

درد پدی، مہا بھارت ماں کا چیر
بڑھانے دوڑے یہ مہاراج
مان لیں تو پہنانے لگوں
مور پنکھوں کا پیارا تاج

اُدھر وہ دوشاسن کے بندھو
یدھ بھکشا کی جھولی ہاتھ
اِدھر یہ دھرم بندھو نے سندھو انتھا پند
شستر لو، کہتے ہیں "دو ساتھ"

۱؎ قسم ۲؎ ترقی ۳؎ بنیاد

آزادی کی تحریک کے ساتھ انسانیت پرستی کے رجحان کا پروش پانا بھی لازمی بات تھی۔ شری دھر پاٹھک ہندی شاعری میں سب سے پہلے شاعر ہیں جنھوں نے تو ہمت کا نغمہ بلند کیا۔ ان میں انسانیت پرستی کا جذبہ بھی بدرجۂ اتم پایا جاتا ہے۔ وہ اینٹ پتھر کے دیوتاؤں کی جگہ خود انسان کو دیوتا مان کر لکھتے ہیں ؎

کرتے ہو کس اشٹ[1] دیو کا آنکھ مو ند کر دھیان
تیس کوٹی[2] لوگوں میں دیکھو تیس کوٹی بھگوان

ہندو مسلم اتحاد بھی اس دور کا ایک مسئلہ تھا۔ دیوی پرساد دیوان لکھتے ہیں ؎

ہائے ہند افسوس زمانہ کیسا آیا — جس نے کر کے ستم بھائیوں کو لڑوایا
مسلمانو! ہندوؤ! وہی ہیں تو می[3] تن[4] — جدا جدا جو کرے پھاڑ کر چولی دامن

ایک بات قابلِ غور ہے کہ آزادی کی تحریک جوں جوں زور پکڑ رہی تھی۔ ہندو مسلم اتحاد کا جذبہ زور پکڑ رہا تھا۔ اسی نقار سے ہندی میں اردو کے الفاظ کے استعمال کا رواج زیادہ بڑھ رہا تھا۔ یہ بات اس دور کے تمام کویوں میں مشترک ہے جس سے ظاہر ہے کہ عوامی تحریکیں ہی عوامی کلچر کو ایک دوسرے کے نزدیک لانے کا فرض سرانجام دیتی ہیں۔

ہندوستان کی زیادہ تر آبادی کسانوں پر مشتمل ہے۔ غیر ملکی حکومت میں انھیں ہی لوٹ کھسوٹ کا سب سے زیادہ شکار رہنا پڑا تھا اور انھیں کی حالت سب سے زیادہ خراب تھی۔ ہندی کے اکثر شاعروں کا کسانوں سے براہِ راست تعلق تھا۔ خود مستقل شرن گپت گاؤں میں رہتے تھے اور آج تک رہتے ہیں۔ اُن کی کتاب "بھارت بانی" میں کسانوں کی سچی اور صحیح تصویر پیش کی گئی ہے۔ اس کے علاوہ کسانوں کے بارے میں دوسرے شاعروں کی نظمیں بھی سرسوتی میں چھپتی رہتی تھیں ؎

کرتے نہیں کرشک[5] پر لیشرم[6] اور وہ کیسے کریں؟
کرم[7] وہی ہے جب ساتھ تب کیوں وہ برتھا شرم[8] کریں
بنتا ہے دن رات ہمارا رُدھر[9] پسینہ
جاتا ہے سر[10] و سو پر بھی سُود میں چھینا

ہا! ہا کھانا اور سرو[11] دا آنسو پینا!
نہیں چاہیئے ناتھ ہمیں اب جینا!

قومی تحریک کے ساتھ آریہ سماج اور برہمو سماج کی مذہبی تحریکیں بھی چل رہی تھیں۔ ہندی شاعروں میں ان تحریکوں خصوصاً آریہ سماج کا بھی اثر تھا۔ ناتھو رام شرما شنکر اس دور کے مشہور آریہ سماجی کوی ہیں۔ انھیں ہم وطنوں کی مغرب پرستی اور فیشن پرستی ایک آنکھ نہیں بھاتی۔ طنز اور مزاح کو دیکھتے ہوئے شنکر کو ہندی شاعری کا اکبر کہا جا سکتا ہے۔ لیکن ان میں اکبر کی گہرائی اور آرٹ نہیں ہے۔ تاہم وہ کافی مقبول شاعر تھے۔ کلام کا نمونہ ملاحظہ ہو ؎

ایش گرجا کو چھوڑ ایشوع گرجا میں جائیں گے
شنکر سلونے مین مسٹر کہلائیں گے
بوٹ پتلون کوٹ کفر ٹوپی ڈاٹ
جاکٹ کی پاکٹ میں واچ لٹکائیں گے
گھر میں گے گھنڈی بنے رنڈی کا پکڑا تو
پئیں گے وہسکی میٹ ہوٹل میں کھائیں گے
فارسی کی دھارسی اُڑائیں انگریزی پڑھ
مانو یونا گری کا نام ہی اُڑا ئیں گے

سیاسی اور اقتصادی تحریکیں ادب اور کلچر پر براہِ راست اثر انداز ہوتی ہیں۔ بیسویں صدی کا ہندوستان انیسویں صدی کے ہندوستان سے مختلف تھا۔ ہمارے سماج کا بنیادی ڈھانچہ جاگیردارانہ تھا لیکن صنعتی ترقی کے باعث بیوپاری کا رخانہ دار اور مزدور بھی کافی مقدار میں پیدا ہو گئے تھے، اور انگریزی تعلیم کا پرچار بھی بڑھا تھا۔ یہ لوگ پرانے سماج اور اس کی جاگیردارانہ قدروں سے مطمئن نہیں تھے یہی طبقہ ہماری تحریکِ آزادی اور نئے شعور کا ہراول دستہ تھا اور پورے صدق اور خلوص کے ساتھ سماج سیاست اور کلچر میں تبدیلی کا خواہش مند تھا۔ لیکن اس کی پرورش بھی جاگیردارانہ سماج میں ہوئی تھی۔ یہ بھی بنیادی طور پر عیش پسند تھا اور دیس کی ترقی کے لئے بہت حد تک احیا پرستی کا قائل تھا۔ یہ سب رجحانات اس وقت کی سیاست میں موجود تھے۔ آزادی کا جذبہ اپنی ابتدائی منزل پر آدرش ہی کی صورت رکھتا تھا۔

---

[1] سات [2] کروڑ [3] کسان [4] تن [5] کسان [6] شرم [7] محنت [8] شرم [9] خون [10] سب کچھ [11] دکھ

اس کے تمام سیاسی اور انقلابی پہلو اجاگر نہیں ہوئے تھے۔ یہ تمام رجحانات جو ہماری سیاسی اور سماجی تحریکوں میں موجود تھے ہندی شاعری میں بھی پائے جاتے ہیں۔ میتھلی شرن گپت اس دور کے نمائندہ شاعر ہیں۔ اُن کے کلام میں ہماری تحریک کی تمام خوبیاں اور کمزوریاں موجود ہیں۔ انھوں نے حالی کی مسدس کے تتبع میں "بھارت بھارتی" کی تصنیف کی جس طرح حالی نے اپنی "مسدس" میں مسلمانوں کو باعمل بننے کی تلقین کی ہے اسی طرح گپت جی نے ہندوؤں کو عمل کا پیغام دیا ہے، اور انھیں بتایا ہے کہ تم رام، کرشن بھیم، اور ارجن کی اولاد ہو، تمھیں یہ کاہلی زیب نہیں دیتی۔ گپت جی کی اس بھاکا دیہ میں جہاں دیش بھگتی کا جذبہ کارفرما ہے وہاں یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اس میں احیا پرستی اور عنیت پسندی کے عناصر بھی کافی مقدار میں موجود ہیں۔ نند دلارے واجپئی نے تو اس نظم پر فرقہ واری کا الزام عاید کیا ہے۔ ان کے اس قول میں ہمیں صرف اتنی ہی صداقت نظر آتی ہے کہ فرقہ پرستی کی جڑیں عنیت پرستی میں موجود رہتی ہیں ورنہ میتھلی شرن گپت فرقہ پرستی سے بہت بلند ہیں۔

چونکہ حب وطن کی سیاسی تحریک آزادی کے سطحی جذبے پر منحصر تھی اور نئے شعور نے قدامت پسندی سے اپنا رشتہ منقطع نہیں کیا تھا۔ اس لئے آزادی کی تحریک میں ایک قسم کی جذباتیت راہ پا گئی تھی وہی جذباتیت اس دور کی ہندی شاعری میں بھی موجود ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ودیا وید ی بگ کی شاعری عام طور پر سطحی اور سپاٹ ہے۔

یہ ایک عبوری دور تھا۔ اس دور میں سطحیت اور جذباتیت ناگزیر تھی، اس دور میں پہلی عالم گیر جنگ شروع ہوئی۔ جنگ نے ہمارے سماج کی بنیادوں کو ہلا دیا۔ سیاسی تحریک جو درمیانہ طبقے کے پڑھے لکھے نوجوانوں اور دانشوروں تک محدود تھی اب عوام میں پھیل گئی اور جنگ کے بعد اس میں حیرت انگیز انقلابی ابھار پیدا ہوئے اس ابھار کے ساتھ ہی ہندی شاعری میں ایک نئے دور کا آغاز ہوا اور اس دور کے ساتھ ہی رہسیہ واد اور چھایا واد کی تحریک شروع ہوئی۔ اس دور کے متعلق نقادوں میں اختلاف رائے پایا جاتا ہے۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ اس دور کا شاعر پھر ایک بار زندگی اور زندگی کے مسائل سے بے نیاز ہو کر تخیل پرست ہو گیا اور اُس نے فن کی افادیت کو بالکل نظر انداز کر دیا۔ اچاریہ رام چندر شکل رہسیہ واد اور چھایا واد کی اس تحریک کو مغربی شاعری کا تتبع خیال کرتے ہوئے ہندی ساہتیہ کے اتہاس میں لکھتے ہیں۔

"پرانے عیسائی سنتوں کے چھایا لباس Pompsmata اور ریورین شاعری میں تبدیل شدہ رہسیا نی مثالیت اور چھایا تمک ٹیکنک Symbolism کی پیروی میں کی جانے والی شاعری چھایا واد کہی جانے لگی۔ یہ واد "کیا چلا ایک بنے بنائے راستے کا دروازہ کھل گیا اور ہندی کے کچھ نئے شاعر اُدھر ایک دم جھک گئے۔"

اور مہادیوی ورما اور سمترانندن پنت کے مجموعۂ کلام کے بارے میں لکھا ہے۔

"ویناء اور پلّب" دونوں میں انگریزی شاعری سے لئے ہوئے جذبات اور انگریزی زبان کے استعارے کثرت سے ملتے ہیں۔"

لیکن پرکاش چندر گپت اور نرمل ورما کو اس رائے سے اختلاف ہے۔ پرکاش چندر گپت "جدید ہندی ادب کے ارتقاء" کے عنوان سے اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں۔

"چھایا واد کا دور صحیح صادق کی سپیدی اور سایوں سے جھلملا رہا ہے اس دور میں کچھ کھو جنے کا رجحان پایا جاتا ہے۔ اُس کے سُر میں ایک درد ایک کرب ہے۔ جسے ہم ۱۹۱۸ء سے ۱۹۳۶ء تک کی تحریکوں کے پس منظر ہی میں سمجھ سکتے ہیں۔ چھایا واد سب کی تاریکی کے دامن میں چھپے ہوئے محبوب کو کھوجتا ہے۔ سویرے کی سنہری کرنوں سے کھیلتے ہوئے اُسے دیکھتا ہے لیکن اُسے باندھ کر روک نہیں سکتا۔ وہ اپنے اس کرب کا اظہار شاعری میں کرتا ہے ؎

پتھ بھولے بتا دی رین
میں پر یہ پہچانی نہیں[1]
تمھیں باندھ پاتی سپنے میں

خیال کی یہ طرز ادا ہمیں انگریزی اور بنگالی شعراء کے تخیل کی یاد دلاتی ہے۔ لیکن جدید زندگی کے خلاف شاعر کا یہ فطری ردِ عمل ہے۔ اس شاعری کو ہم رومانی کہتے ہیں۔ کیوں کہ اس میں حقیقی زندگی سے بے نیازی اور خیالی دنیا کے متعلق کشش پائی جاتی ہے۔ یہ فکرِ سخن زندگی میں چھپے ہوئے حُسن کو کھوج نکالنا چاہتا ہے۔" (آلوچنا اتہاس انک)

---

[1] یہ مہادیوی ورما کی کوتا کے پد ہیں جن کا مطلب ہے میں نے راستہ دیکھتے دیکھتے رات گزار دی لیکن پیارے نے مجھے پہچانا نہیں۔

آلوچا کے اس اجتماع میں نریندر شرما اپنے مضمون "دو بھائی دیوؤں کے بیچ ہندی کوتا" میں رقم طراز ہیں۔

"چھایا واد کے روحانی پہلو کے درشن تو ہمیں پنڈت شری دھر پاٹھک کی "سورگیہ ویٹا" اور شری متھلی شرن گپت کی جھنکار "منگل گھٹ" اور بیتا لک کے کئی گیتوں میں ہو چکے ہیں۔ لیکن وہ روحانی پہلو ہی چھایا واد نہیں ہے۔ چھایا وادی شاعری درحقیقت انفرادیت پسندی کی شاعری ہے جس میں قرونِ وسطیٰ کی روایات میں جکڑے ہوئے سماج کے خلاف فرد نے اپنی انفرادیت کو بلند کیا ہے۔ پہلی جنگِ عظیم کے بعد کی ہندی شاعری قوم، قومیت یا قومی سوال اور قابلِ احترام شخصیتوں کے سکھ دکھ کی شاعری نہیں بلکہ فرد کے دکھ سکھ کی کہانی ہے۔ موضوع کی تلاش میں شاعر باہر نہیں اپنے ہی اندر جھانکتا ہے۔"

اس اقتباس سے ظاہر ہے کہ اس دور کی شاعری خارجی کم اور داخلی زیادہ ہے۔ اس بارے میں چاہے لاکھ اختلاف رائے ہو لیکن اس بات پر سب متفق ہیں کہ رہسیہ واد اور چھایا واد کی شاعری دوی ویدی دور کی شاعری کی طرح سپاٹ نہیں ہے۔ ان شاعروں کے اظہارِ خیال میں ندرت ہے، اور جذبات میں گہرائی ہے بعض نقاد اسی بات سے یہ نتیجہ ماخذ کرتے ہیں کہ انفرادیت پسندی کی یہ تحریک اپنے سے پہلے کی سطحیت اور جذباتیت کا ردِ عمل تھی۔ ہمارے خیال میں یہ نظریہ درست نہیں کیونکہ کوئی بھی ادبی رجحان اپنے سے پہلے کے اسلوب اور ہیئت کا ردِ عمل نہیں ہوتا۔ اس کی تہ میں کہیں زیادہ گہری سیاسی اور سماجی حقیقتیں کارفرما ہوتی ہیں۔ اس سب کے مفصل تجزیہ کی یہاں گنجائش نہیں۔ مندرجہ بالا اقتباسات سے اس پہلو کی کافی وضاحت ہو جاتی ہے بلاشبہ یہ انفرادیت پسندی کا دور تھا اور نئے انقلابی ابھار نے قدامت پسند سماج کے خلاف انسان کی باغی انفرادیت کو ابھارا تھا۔ چونکہ اس مرحلے پر بھی ہماری سیاسی تحریک کا ابتدائی نقاطِ حل نہیں ہوا، اور انقلابی طاقتوں کو سائنٹیفک رہنمائی میسر نہیں آئی۔ اس وقت بھی جو ہندو مسلم اتحاد قائم ہوا اور جو سیاسی تحریک شروع ہوئی وہ مذہبی بنیادوں پر قائم تھی۔ قرونِ وسطیٰ کی پوسیدہ روایات اور قدامت پسندی پر ذرا بھی آنچ نہیں آئی۔ لہٰذا فرد کی انفرادیت بھی اپنے ہی خول میں بند رہی۔ انقلابی کردار حاصل کرنے کے عوض، بہتر روحانیت اور رومانیت کی بڑھاوتری ہی رہی۔ اس نے دیکھا کہ جن نجی

بندھنوں کے خلاف بغاوت کا علم بلند کیا تھا۔ وہ ٹوٹے نہیں بلکہ خود بخود سماج سے کٹ کر الگ پڑا تڑپ رہا ہے۔ اس دردناک کیفیت کا اظہار اس دور کے نمائندہ شاعر جے شنکر پرشاد نے "مایا نی" کے ہیرو منو کی زبانی اس طرح کیا ہے ؎

اس وجن[1] پرانت میں بلکھ رہی ہیری پکار اُتر نہ ملا
تُو بھلسا تا دوڑ رہا کب مجھ سے کوئی پھول کھلا
میں سونپن[2] اجڑا کانپتا[3] لوک میں کر خواہش[4]

خارجی حقیقتوں میں جب کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی تو تخیل[5] کی نئی نئی خواب دیکھنا ہی ایک کام رہ گیا جس انسان یعنی منو نے ایڈا یعنی عقل سے رشتہ جوڑا تھا آخر میں اس نے شردھا کی شرن قبول کر کے اپنی شکست کا اعتراف کیا۔

جے شنکر پرشاد کے علاوہ سوریہ کانت ترپاٹھی نرالا، مہادیوی ورما، ڈاکٹر ہری ونش بچن، آنچل اور دوسرے نئے کوی بھی اس دور میں شمار ہونے لگے یقیناً یہ لوگ بھی انفرادیت پسند تھے۔ جیسا کہ انفرادیت پسندی کا خاصہ ہے۔ اس دور میں اسلوب اور ہیئت کے نئے تجربے بھی ہوئے۔ جتنا اس تحریک کا جھکاؤ مغربی شاعری کی طرف ہوتا گیا اتنا ہی سامراجی کلچر کے زوال پذیر عناصر اس میں شامل ہوتے رہے۔

۱۹۲۹ء میں جب بین الاقوامی اقتصادی بحران شروع ہوا اور ہمارے دیس میں نیا اجتماعی اور انقلابی ابھار پیدا ہوا تو انفرادیت پسندی کی یہ رومانی تحریک دو مختلف گروہوں میں بٹ گئی۔

(۱) ایک گروہ خالص انفرادیت پسندوں کا تھا جو فرائڈ اور آڈلر کا پیرو کار تھا جن میں خارجی حالات کے خلاف جدوجہد کی ہمت نہیں تھی اس لئے یہ لوگ سیاست پسند تھے۔ انھوں نے جدوجہد ترک کر کے فراریت کا رستہ قبول کیا۔ اگلے آج اس فراریت پسند گروہ کا سرغنہ ہے جو اپنی

---

[1] ویرانے [2] خواب [3] تخیل کی دنیا [4] رہائش [5] کامایانی جے شنکر پرشاد کا مہاکاویہ ہے جس میں منو، ایڈا اور شردھا علامتی کردار ہے۔ منو انسان کا، ایڈا عقل کا، شردھا عقیدت کا سمبل ہے۔

انفرادیت کے خول میں زیادہ سے زیادہ بند ہوتا جا رہا ہے اور ادب برائے ادب کے نظریئے کا قائل ہے۔ آگے کی ہندی میں وہی پوزیشن ہے جو امریکہ میں ایذرا پاؤنڈ کی۔

دونوں ایک ہی ادبی رجحان کی نمائندگی کرتے ہیں۔ آڈن۔ سارتر سے اور ٹی۔ ایس ایلیٹ کو آدرش مانتے ہیں۔

دوسرے گروہ کے شاعر لوگوں نرمیندر، نرما اپنی انفرادیت کو تنہا نہ سمجھنے لگے۔ اور سمجھنے لگے کہ ایک چنا بھاڑ کو کبھی نہیں پھوڑ سکتا۔ پھر ایک ہاتھ سے تالی بجتی ہے یہ بساط ہی کیا ہے۔ یہ لوگ اپنے خول سے نکل کر باہر آئے اور انھوں نے سماجی اور سیاسی مسائل کو شاعری کا موضوع بنایا۔ چھایا وادی دور کے انفرادیت پسندوں میں سوریہ کانت نرالا ایک زبردست شخصیت کا مالک ہے۔ اس کی انفرادیت ہر قسم کے تصنع سے مبرا ہے۔ اس لئے اس کا سُر ہمیشہ دوسروں سے الگ رہا ہے۔ تمام نقاد اور ہندی داں طبقہ اس کی شاعرانہ عظمت اور فن کارانہ صلاحیتوں کا قائل ہے۔ اس میں آورد کا شائبہ نہیں وہ اپنی بات بے ساختہ کہتا ہے چنانچہ نرالا ہی اس نئے دور کے نئے شعور کی نمائندگی کرتا ہوا آگے بڑھتا ہے۔ وہ ایک عرب کلیم (کشن پرشاد) سے صدیوں سے بندوں کے سر چشموں کو کھول دینا چاہتا ہے۔ وہ بیس کے عوام کو نئی بیداری کا پیغام ان الفاظ میں دیتا ہے ؎

جاگو پھر ایک بار — آگے اڑن اُنچل میں روشنی

گیا دن — آئی رات — مندری رات کھلا دن
ایسے ہی سنسار کے — بیتے دن پکش[1] ماس
ورش کتنے ہی ہزار — جاگو پھر ایک بار

اور سمترانندن پنت بھی اپنے تخیل کی دنیا سے باہر جھانک کر دیکھتا ہے اور وہ اپنی نئی تصنیف "گیت وانی" میں بول اُٹھتا ہے ؎

اس دھرتی کے روم روم میں — بھری آج سندرتا[2]

شاعر کو پھر دھرتی کے ذرّے ذرّے میں حسن دکھائی دینے لگا اور اُسے کسان کی دنیا کی تلاش نہیں رہی۔ کسانوں، مزدوروں نے سیاسی تحریک میں نمایاں حصّہ لیا تھا اور اُن کی انقلابی اہمیت کو محسوس کیا جا رہا تھا۔ پنڈت جواہر لال نہرو کانگریس میں اس نئے شعور کی رہنمائی کر رہے تھے اور مارکسی نظریئے سیاست، ادب،

---

[1] شفق [2] سورج [3] بگھوڑے اور پھینے [4] فطرتی حسن

کلچر اور زندگی کے ہر پہلو پر اثر انداز ہو رہے تھے۔ نرالا۔ پنت۔ بال کرشن شرما نرپ اور دنکر وغیرہ کتنے ہی شاعر اس نئے شعور کے ترجمان بن کر سامنے آئے۔ ۱۹۳۹ء میں جب یورپین کی خانہ جنگی میں فاسسٹی طاقتوں کا مقابلہ کرنے کے لئے یورپ میں ادب کی ترقی پسند تحریک کی داغ بیل پڑی تو ہندوستان میں بھی اس نئے ادبی شعور نے منظم شکل اختیار کی اور انجمن ترقی پسند مصنفین کی بنیاد پڑی۔ ہندی شاعری پر اس تحریک کا اثر اتنا نمایاں ہے کہ ۱۹۳۷ء کے بعد ہندی شاعری کا جو نیا دور شروع ہوا۔ وہ پرگتی وادی جگ یعنی ترقی پسندی کا دور کہلاتا ہے۔

اس دور کی کئی خصوصیتیں ہیں اور ہندی شاعری کا یہ دور اپنے سے پہلے کے تمام ادوار سے کئی باتوں میں مختلف ہے۔ مثلاً اس دور میں روایت پسندی اور اسمبل ازم کا رجحان ختم ہو گیا، اور شاعری کا رشتہ زندگی سے اور محنت کش طبقے کے ساتھ جُڑ گیا۔ نرالا، پنت، نریں، ونکر اور سمدھ اکماری چوہان نے کسانوں، مزدوروں اور قومی جد وجہد کے بارے میں بہت ہی خوبصورت نظمیں تخلیق کیں۔ چونکہ ہندی شاعری ہمیشہ سنسکرت ادب سے متاثر رہی ہے اور گذشتہ تمام تحریکوں میں احیا پرستی کا جذبہ بھی کارفرما رہا ہے۔ اس لئے شاعر اپنی نظموں کا موضوع شاستروں اور پرانوں کی کتھاؤں میں تلاش کرتے تھے۔ لیکن اس دور کے شاعروں نے اپنے ہی دور کی زندگی کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا۔ پھر اس دور کی ایک سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس دور کے شاعروں نے جاگیردارانہ سماجی قدروں اور بوسیدہ روایات کا دامن جھٹک دیا ہے۔ ان کا نظریہ سائنٹیفک ہے اور ان کی تخیل میں انسان دوستی کا جذبہ رچ بس گیا ہے۔ انھوں نے انا اور خودی کے مجہول تصور کو ترک کر کے مظلوم اور محکوم عوام سے اپنا رشتہ جوڑ لیا ہے۔ جب نرالا ایک مزدور عورت کو مصروف کار دیکھ کر کہتا ہے۔

وہ توڑتی پتھر الہ آباد کے پتھ پر

تو جہاں شاعر اس کی غریبی کے خلاف احتجاج کرتا ہے وہاں اس کی محنت کا یہ تعمیری پہلو بھی اس کی نظروں سے اوجھل نہیں رہتا کہ وہ پتھر توڑ توڑ کر ایک نیا راستہ بنا رہی ہے۔

یہ دور ۱۹۳۶ء سے لے کر اب تک یعنی بائیس سال کی طویل مدت پر پھیلا ہوا ہے۔ سماجی اور سیاسی تحریکوں کے پس منظر میں اگر پورے دور کی شاعری کا جائزہ لیا جائے تو اچھی خاصی ضخیم کتاب تیار ہو سکتی ہے۔ اس تحریک میں خوبیاں ہی نہیں خامیاں بھی ہیں اور تضاد بھی ہیں۔ اس زمانے میں ہماری قومی سیاست میں

اور بین الاقوامی سیاست میں جو اتار چڑھاؤ آئے ہیں اُن کا اثر پڑتا رہا ہے اور پڑتا رہے گا۔ کئی شاعر اس تحریک کے ساتھ آئے اور کئی ساتھ چھوڑ گئے۔ لیکن نہ صرف شاعری بلکہ ادب کے ہر پہلو پر یہی تحریک حاوی ہے۔ زمانے کے نئے شعور اور نئے کلچر کی اس تحریک سے امیدیں وابستہ ہیں۔ نرالا نذر الاسلام کی طرح باغی ہو گئے ہیں اُن کا کوئی پرسانِ حال نہیں ہے نئی پود کے بہت سے نوجوان شاعر اس تحریک کے ساتھ وابستہ ہیں جن میں ناگرا رجن، کیدار ناتھ اگروال۔ ترلوچن شاستری، شونگلم سنگھ سمن، گرجا کمار ماتھر، بھارت بھوشن اور انچل قابلِ ذکر ہیں۔ اس کے علاوہ کوڑیوں جن کو ہی یعنی عوامی شاعر ہیں جو مختلف صوبوں کے دیہات میں رہتے ہیں وہ کسانوں کے بیٹے ہیں اور کسانوں کی تحریکوں کے ساتھ ان کی شاعری کا ارتقا رہا ہے اور وہ جس علاقے میں رہتے ہیں اسی علاقے کی ٹھیٹھ دیہاتی زبان میں لکھتے ہیں۔ مثلاً علی گڑھ کے علاقے میں ناگر موڈھ اور صاحب سنگھ جہرا کسانوں کے محبوب شاعر ہیں۔ وہ گزشتہ بیس سال سے کسان اندولنوں کے ساتھ ہیں، اور علاقے کی دیہاتی زبان برج بھاشا میں کوتا کرتے ہیں۔ اور بحریں بھی ایسی استعمال کرتے ہیں جو دیہاتوں میں پہلے سے رواج ہیں ــــ یہ گزشتہ سو سال کی جدید ہندی شاعری کا مختصر جائزہ ہے ہمیں صرف مختلف رجحانات کی طرف اشارہ کرنا تھا۔ اس لئے ہر دور کے سرکردہ شاعروں کا تذکرہ اور اُن کے کلام کا نمونہ پیش کرنے کی گنجائش نہیں تھی

نوہر یا رام درد

تخمیس

بر غزل حضرتِ جوشؔ ملسیانی

بنایا خوش دلوں کو دہر میں اندوہ گیں تو نے — ملائے خاک میں صدہا سکاں تو نے مکیں تو نے
ستم ڈھائے ہیں دنیا میں ہزاروں بالیقیں تو نے — فلک سے کم نہیں فتنے اُٹھائے اے زمیں تو نے
دہانِ گور میں پھینکے ہیں لاکھوں مہ جبیں تو نے

مجھے سیلِ حوادث سے بچا دے گا تو جانوں گا — مری سوئی ہوئی قسمت جگا دے گا تو جانوں گا
مجھے اس قعرِ پستی سے اُٹھا دے گا تو جانوں گا — مری بگڑی کو بھی یارب بنا دے گا تو جانوں گا
بنانے کو بنایا آسماں تو نے زمیں تو نے

دلِ سوزاں سے نکلی ہیں قیامت ہی اُٹھا دیں گی — ستم ہائے فراواں کا مزہ تجھ کو چکھا دیں گی
سمجھ لینا کسی دن تیری بنیادیں ہلا دیں گی — مری آہیں تجھے صدہا نئے عالم دکھا دیں گی
ابھی دنیا کہاں دیکھی ہے اے چرخِ بریں تو نے

دکھا کر اپنا جلوہ حسرتِ دیدار پیدا کی — خلش دل میں مرے تو نے بتِ عیار پیدا کی
کبھی اقرار میں بھی صورتِ انکار پیدا کی — نیاز و ناز کے عالم نے یہ تکرار پیدا کی
اسی مکتب میں سیکھی آ کے یاں میں نے نہیں تو نے

کیا کس نے زمانے بھر میں میرے عشق کا چرچا — یہ کس ظالم کی اُلفت میں ہُوا میں کو بکو رسوا
اُجاڑی کس ستم گر نے سکونِ قلب کی دُنیا — نہ پوچھ اے داورِ محشر کہ ظالم کون تھا ایسا
وہی جس کو بنایا تھا حسین و نازنیں تو نے

کے، گوپال کرشنا راؤ

نئے دور میں جدید تلنگی شاعری

تلنگی ادب میں گیارھویں صدی سے بیسویں صدی تک شاعری نے مختلف رنگ روپ میں نشو و نما پائی۔ ہر زبان اور ادب میں ایک تاریک دور ہوتا ہے جو آنے والے انقلابی دور کا عکس ہوتا ہے۔ تلنگی شاعری میں اٹھارھویں اور انیسویں صدی ایک تاریک دور رہے۔ اس کے بعد ہی یعنی بیسویں صدی کے اوائل سے نیا دور شروع ہوتا ہے، اور اس نئی ادبی زندگی کے بانی ویریشالنگم اور ترو پتی کو[1] ہیں۔ ویریشالنگم کی حیثیت ایک ادیب سے بھی بالاتر ہے۔ اُن کا جدید شاعری میں کم حصّہ ہے۔ ترو پتی کو اُس زمانے کے بہت بڑے شاعر تھے۔ یہ قدیم طرز کے شعرا میں آخری اور جدید طرز کے شعرا میں پہلے مانے جاتے ہیں۔ انھیں سے جدید شاعری شروع ہوتی ہے۔ اسی زمانے میں رومانیت کی ابتدا ہوئی ہے۔ دراصل رومانیت کی ادبی تحریک مغربی ممالک کی پیداوار ہے — آندھرا میں مغربی حکومت اور مغربی طرزِ تعلیم اور تہذیب کے زیرِ اثر چند نوجوانوں نے نئے طرز کی شاعری شروع کی۔ ان نوجوانوں پر رومانیت کا اثر بہت پڑا۔ رومانی دور کے اکثر شعراء ترو پتی کو اپنے شاگرد ہیں۔ جدید شاعری کی ابتدا انگریزی نظموں کے ترجموں سے ہوئی۔

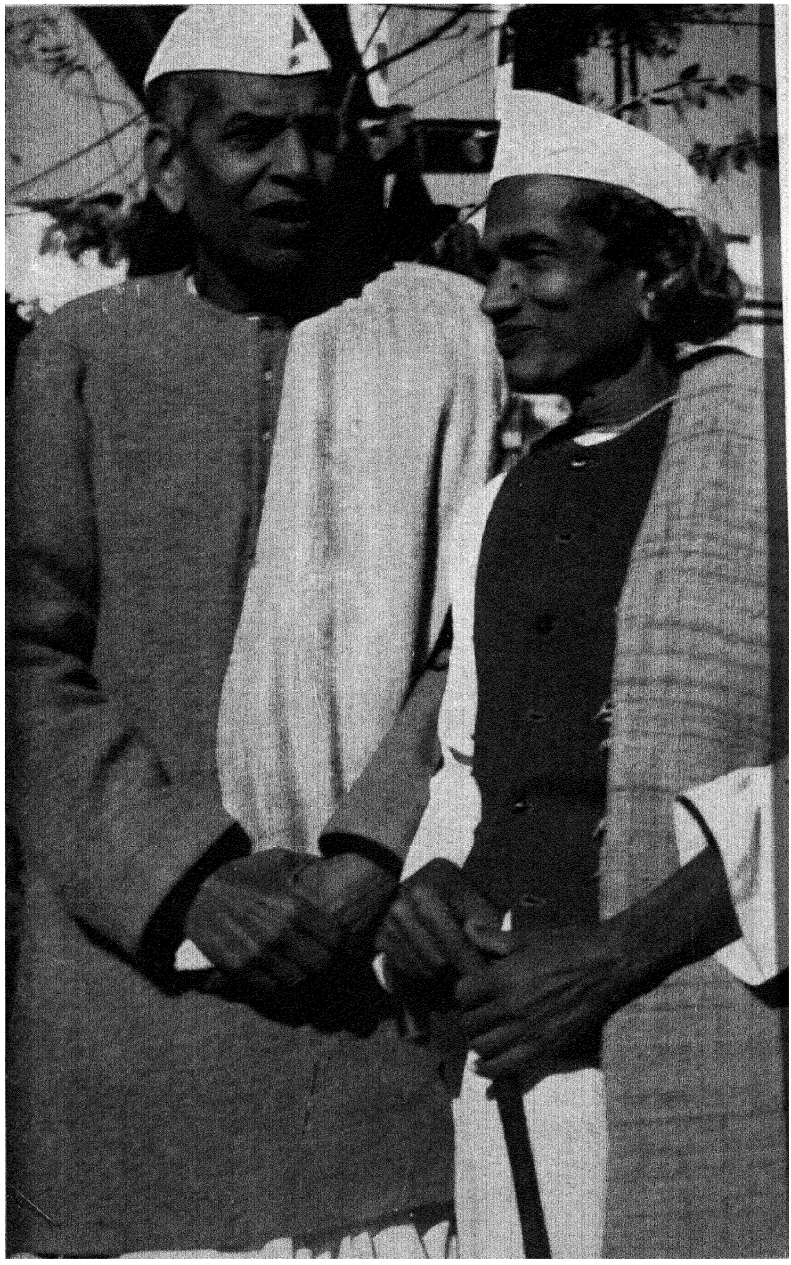
رومانی دور کے بانیوں میں آچاریہ رائے پرولو سبا راؤ اور گروزاڈہ اپا راؤ قابلِ ذکر ہیں — آچاریہ سبا راؤ کی ادبی زندگی ہربرٹ کے ترجمے سے شروع ہوتی ہے اور اپا راؤ متیالا سراملو نے گیتوں کا ترجمہ شائع کرکے نئے ادب کی بنیاد ڈالی۔ نئے دور کے بانیوں کی حیثیت سے ان دونوں کے متعلق کسی کو کوئی اختلاف الرائے نہیں ہے۔

ان ہی کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے اور اپنی انفرادی حیثیت کو برقرار رکھتے ہوئے کئی شعرا نے نئے ادب کی شان بڑھادی۔ ان شعراء کے کلام کا مجموعہ ہی رومانی دور کی شاعری ہے۔ ان میں وشوناتھ ستیانارائنا — اوڈی پاپی راجو۔ انتاکرشنا شرما۔ پوراجو اپا راؤ۔ نندوری سبا راؤ۔ سوامی سیدا شنکر شاستری۔ دوری رام ریڈی۔ سی۔ آر۔ ریڈی اور جاشوا وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔

نئے دور کے شعراء کے اس طبقے کو اعتدال پسند طبقہ کہنا مناسب معلوم ہوتا ہے کیونکہ مغربی تعلیم کے اثر کے باوجود یہ ہر مغربی چیز کے عاشق نہیں ہیں۔ اور نہ اتنے قدامت پسند ہیں کہ جدید طرز کو بالکل ہی ٹھکرادیں۔ انھوں نے رومانی اثر کو مان لیا اور اس رومانیت کو اپنے وسیع خیالات سے نیا رنگ دیا۔ یہ پرانے اسکول کے شعراء اور اُن کے کلام کا احترام کرتے ہیں۔ اس نئے دور کے شعراء کے کلام کا ایک سرسری اور تنقیدی مطالعہ کرنے کے بعد جدید شاعری کی خصوصیات کو مختصر طور پر یوں کہا جا سکتا ہے کہ شعراء اپنے جذبات اور خیالات کو پُر اثر الفاظ میں بیان کرنے لگے۔ جذبات کی شدت اور تخیل کی بلندی سے ان کے کلام نے پسندِ خاص اور قبولِ عام کی سند حاصل کی۔ بعض موقعوں پر ان کا اندازِ بیان سلیس اور صاف ہوتا ہے اور بعض وقت حکیمانہ اور اخلاقی۔ کبھی کبھی ان کا کلام قدیم شعراء کے طرز کو یاد دلاتا ہے۔ اس دور کے شعراء نے زمانۂ قدیم کی رنگیں بیانی اور مبالغہ آمیز حسن و عشق کے فلسفے میں نیا رنگ بھر دیا ہے۔ ان کے نزدیک عورت صرف جذبات کو اُبھارنے والی اور جسمانی کشش رکھنے والی معشوقہ نہیں وہ ماں کی طرح محبت کا پیغام دیتی ہے۔ نئے ادب میں عورت کے حسن اور معشوقہ کی محبت کا فلسفہ وسیع ترہے۔ ماضی کے رنگین تاریخی دور کی عظمت

---

[1] ترو پتی شاستری اور وینکٹا شاستری یہ دونوں مل کر شاعری کرتے تھے آندھرا میں ترو پتی کو لو کے نام سے مشہور ہیں۔

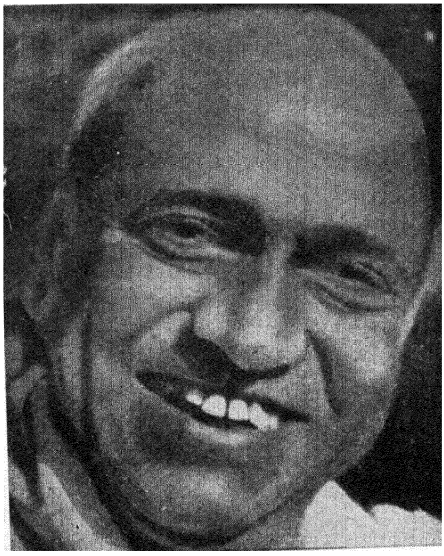


راشٹرپتی کوی
میتھلی شرن گپت
اور سیارام شرن گپت
(ہندی)

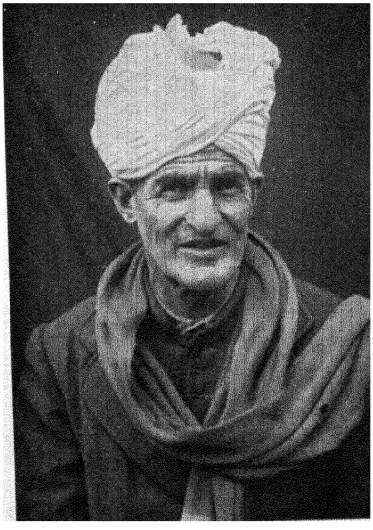
فوٹو:۔ دیویندر ستیا
(کاپی رائیٹ)



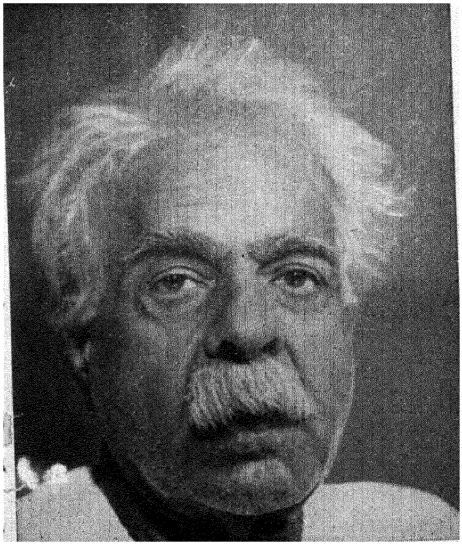
سبرهمن بهارتي (تامل)



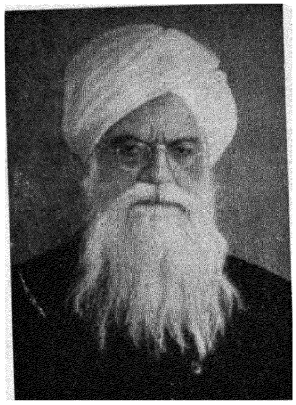
ولاتول ناوائن مينن (ملايالم)



مهجور (كشمير)



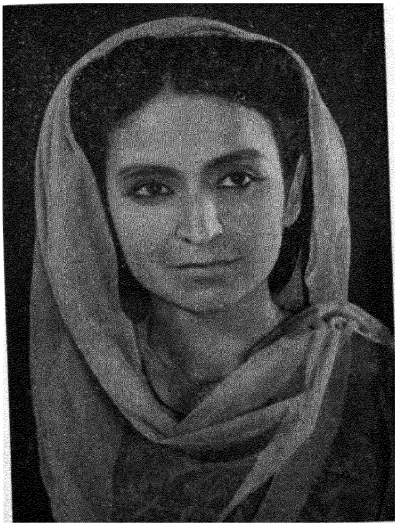
گوونديپ (كنڑ)



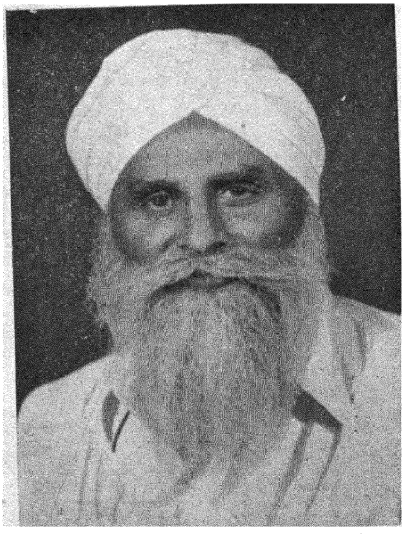
بھائي ويرسنگھ (پنجابي)



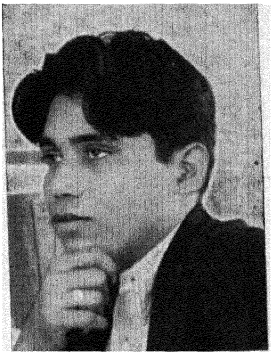
موھن سنگھ (پنجابي)



امرتا پريتم (پنجابي)

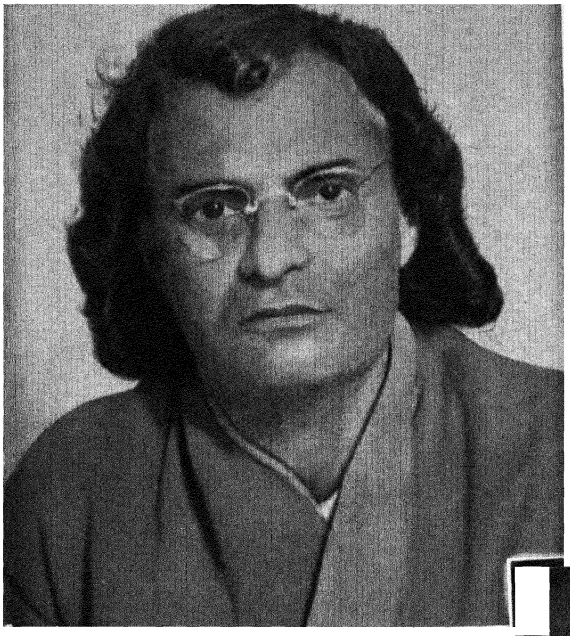


گورمکھ سنگھ مسافر (پنجابي)

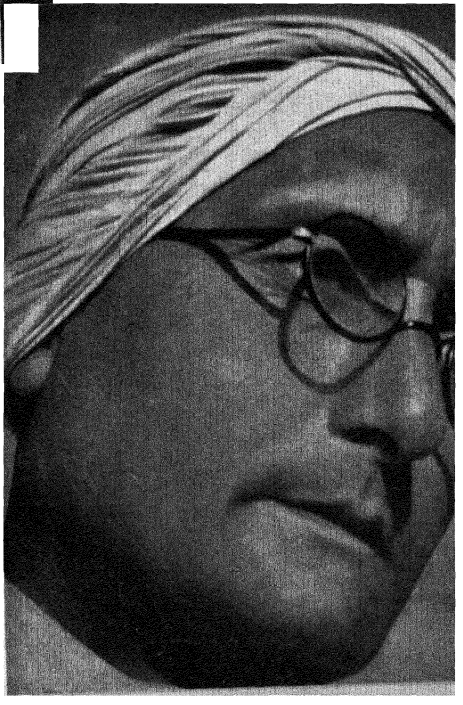


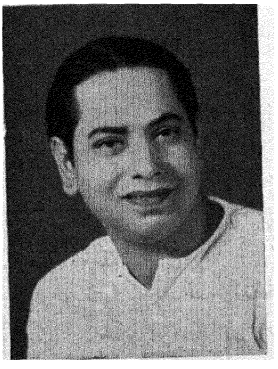
شو منگل سنگھ سمن

سويه کانت ترپاٹھي د نرالا ء (هندي)
فوٹو:- ديويندر ستيارٹھي (کاپي رائٹ)



سمترا نندن پنت (هندي)





بھوانی پرساد مشر (هندي)

اور شان و شوکت کو موضوع بنا کر عظمت میں سوئی ہوئی آندھرا قوم کو اُنھوں نے جگا دیا۔ انسانی ہمدردی، قومی اتحاد اور محبت کا اظہار جو انھوں نے اپنے کلام میں پیش کیا وہ بڑا اثر ہے۔ قومی تحریک اور آزادیٔ ہند کی تحریک سے اپنا دلی لگاؤ اور ہمدردی ظاہر کی۔ چند شعراء نے عمر خیام کے فلسفۂ زندگی کو اپنے کلام میں بھر دیا۔ قدرتی مناظر و سادہ زندگی اور پست طبقے کی زندگی کا انھوں نے صحیح نقشہ کھینچا ہے۔ گاندھی ازم اور بدھ ازم کے اعلیٰ اصول سچائی اور اہمیت کو شعراء نے اپنے کلام کا موضوع بنایا۔ نظموں اور گیتوں کا وزن قدیم اور جدید دونوں طرز کا ہے۔

ان چند گنی چنی خصوصیات کی بنیاد پر ہم نے اس کو نیا دور یا رومانی دور کہا ہے۔ ادبی دنیا میں یہ رومانی دور رنگین دور کہلاتا ہے۔ اس مختصر سے مضمون میں ناممکن ہوگا کہ تمام شعراء اور اُن کے کلام پر رومانی دور کے اثر کا تفصیل سے ذکر کروں۔ صرف چند شعراء اور اُن کے کلام کا ذکر کرتے ہوئے بتلانے کی کوشش کروں گا کہ اُن پر جو رومانی اثر کی جھلک ہے مختصر طور پر کیا ہے۔

آچاریہ سباراؤ دورِ جدید کے بہت بڑے شاعر ہیں۔ انھوں نے اپنی زندگی ہر مٹ کے ترجمے لکھنا سے شروع کی۔ مغربی اور مشرقی ادب کی نزاکت اُن کے کلام میں واضح طور پر نظر آتی ہے۔ سنسکرت ادب کا انھوں نے گہرا مطالعہ کیا ہے۔ آپ کو شانتی نکیتن میں شاعرِ اعظم ٹیگور کے شاگرد ہونے کا فخر حاصل ہے۔ نئے ادب میں مختلف رنگ بھرنے میں آپ کا بڑا حصہ ہے حُسن اور عشق کے فلسفے کو نئے ڈھنگ میں پیش کرنے والوں میں یہ تنہا ہیں۔ ان کی تصانیف سوپنا کا رمو اور تورنا کنکنا مو اسی فلسفے کی ایک جھلک ہیں۔ یہ وہی شاعر ہیں جنھوں نے آندھراؤں کی قدیم عظمت کی یاد دلائی۔ اُن کے گیت قومی گیت کی حیثیت رکھتے ہیں، اور وہ مقبول ترین ہیں۔ اعلیٰ تخیل اور شیریں زبان کے لحاظ سے اُن کی نظمیں لاجواب ہیں۔ حسین ترین الفاظ اور لطیف تشبیہیں استعمال کرنے میں اُن کا درجہ اوّل ہے۔ حبِّ وطن کے جذبات ان گیتوں میں بھرے ہوئے ہیں۔ ایک گیت میں وہ کہتے ہیں۔

"اُس دن جب کہ بدھ مت کے پیروؤں نے امراوتی میں جامعہ قائم کی۔ اُس دن جب کہ وجیانگر کے شاہراہوں میں شاعری کے سنڈے قائم کئے گئے۔ جو عظمت اور شان آندھراؤں کو حاصل ہوئی تھی اُس کو پھر آج آندھراؤں میں بکھیرو"

اُن کی نظر میں آندھرا ماتا ایک مقدس دیوتا ہے۔ وہ اُس کے پجاری ہیں۔ پھر بھی وہ اتنے تنگ دل نہیں کہ بھارت کو بھول جائیں — چنانچہ نظم "جنم بھومی" میں کہتے ہیں۔

"اے بھارت ماتا کے سپوتو! تم اپنی ماتا کو نہ بھولو اور اپنی قوم کی عظمت کو نہ بھولو۔ نہ معلوم پرانے جنم میں تم نے کن دیوتاؤں کی پوجا کی۔ نہ معلوم کن پھولوں سے محبت پیدا کی کہ اس جنم میں اس روپ میں پیدا ہوئے ایسی زمین کہیں نہیں ہے اور ایسے انسان کہیں نہیں ہیں۔ تم جس زمین پر قدم رکھو یا جس دنیا میں سفر کرو یا جس اونچی کرسی پر بیٹھو، تم نہ بھولنا کہ تم ہندوستانی ہو۔ شرمندہ نہ ہو اور تم وہی گیت گاؤ۔"

اس طرح کے قومی جذبات سے بھری ہوئی نظمیں اور گیت ہیں۔ آندھرا کی تہذیب و تمدن اور طرزِ زندگی کی جھلک ان کے بعض گیتوں میں صاف طور پر نظر آتی ہے "تل مسکرات" اور "آگادی" اسی قسم کی نظمیں ہیں۔ آندھر قوم کے محاوروں اور ہندو کے اکثر سُوپتروں پر بھی انھوں نے چند نظمیں لکھیں۔ مثلاً "اکٹر اد ھاکرشنا" "نرو جنی دیوی" "سی۔ آر ریڈی" "جہانتاجی" اور "اکٹر ٹیگور" سباراؤ نے قدرتی مناظر پر بھی نظمیں لکھی ہیں۔ یہ ادبی زندگی کے لئے نیا پیغام لے آئے ہیں۔ اس لئے یہ جہاکوی کہلاتے ہیں۔ آج بھی وہ قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ ان کی تصانیف میں قابل ذکر یہ ہیں۔ سوپنا کمارمو اور تورنا کنکنا مو — آندھرا ولی، جڑا کچلو، سینہا لتا اور رمیا لوکو۔ رمیا لوکو نئے ادب کی روح اور اس کے اصول کا آئینہ ہے شاعر نے اس میں "قدیم اور جدید شاعری کے اصول جس، عشق کا فلسفہ، زبان اور اُس کی وسعت، ادب اور زندگی، عاشق اور معشوق، جذبات، اور ایسے مختلف ادبی موضوعوں پر اپنا تنقیدی نقطۂ نظر پیش کیا ہے۔ خصوصیت یہ ہے کہ یہ کتاب بھی نظم میں لکھی گئی ہے جو لاجواب ہے۔ تلنگو زبان اور اس کی اہمیت پر بحث کرتے ہوئے مادری زبان سے اپنی محبت کا اظہار اس طرح کرتے ہیں۔

"پچھلے جنم میں نہ معلوم میں نے کن پھولوں سے ایشور کی پوجا کی ہوگی۔

کہ میں اس جنم میں اس دیس میں پیدا ہوا ہوں۔ اگر میرے لئے دوسرا جنم ہے تو میری دلی خواہش ہے کہ میں پھر سے آندھرا میں جنم لوں۔ تلگو اتنی شیریں زبان ہے۔"

انسانی زندگی اور ادب پر بحث کرتے ہوئے زبان کی وسعت پر دلائل پیش کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ زبان میں غیر زبان کے الفاظ کا استعمال ہونا اُس زبان کی کمزوری نہیں ہے۔ اس سے اس کی اہمیت یا وقعت نہیں گھٹتی۔ اس اصول کو سمجھانے کے لئے وہ پھر کہتے ہیں۔

"بھانے ہر قسم کی گھاس کھاتی ہے اور مختلف بادلیوں اور کنوؤں کا پانی پیتی ہے۔ اُسی کا نچوڑ دودھ ہے جس میں کوئی فرق نہیں، وہ تو امرت ہے۔"

ان کی نظر میں زبانوں میں الفاظ کے میل جول کا راز یہی ہے۔ حُسن و عشق کے فلسفے پر روشنی ڈالتے ہوئے وہ کہتے ہیں کہ۔

"جذبات میں عشق ہی اصل جذبہ ہے۔ قدیم طرز کے شعراء نے عشق و وصل کو مانا ہے لیکن میں عشق و ہجر کو مانتا ہوں۔"

اسی فلسفے کی تفصیلی بحث گوپنا کمار میں ایک نوجوان عورت کے پیغام محبت میں پائی جاتی ہے۔ عاشق اور معشوقہ اور ان کی محبت کے نظریئے کو وہ یوں سمجھاتے ہیں کہ۔

"ہنستے پھول پر جب مست بھنورا آ بیٹھا تو ایک شاعر نے اُن کو عاشق اور معشوق کہا۔ اسی نظارے کو دیکھ کر دوسرے شاعر نے ماں اور بیٹی کہا۔"

یہاں "دوسرے شاعر" کے معنی نئے دور کے شاعر ہیں۔ وہ اپنے کو ان میں شامل کرتے ہیں۔ اُن کے فلسفے کو سمجھانے کے لئے یہاں گنجائش کم ہے۔ صرف یہ کہنا کافی ہے کہ یہی اُن کے فلسفے کا نچوڑ ہے۔

دورِ جدید کے شعراء میں وشوا ناتھ ستیانارائنا اپنی نظیر آپ ہیں۔ آچاریہ سبا راؤ صرف شاعر ہیں لیکن یہ نہ صرف شاعر بلکہ ادب کے مختلف شعبوں میں مہارت رکھتے ہیں۔ یہ افسانہ نگار اور ڈرامہ نویس ہیں۔ قدیم اور جدید طرز میں شعر کہتے ہیں۔ سلیس اور کٹھن زبان میں بھی مساوی طور پر اپنے جذبات کا اظہار کرتے ہیں۔ ان کا انداز بیان کبھی کلاسیکل ہوتا ہے تو کبھی جدید۔ انھیں زبان پر پوری قدرت حاصل ہے۔ اُن کے جذبات اُن کے بیان میں چھپنے نہیں پاتے مشکل سے مشکل وزن بھی دریا کی طرح اُن کی شاعری میں بہہ جاتے ہیں۔ اسی لئے یہ شعراء میں ممتاز حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ کوی سمراٹ یا ملک الشعراء کہلاتے ہیں۔ آندھرا میں قومی شاعر کی حیثیت سے دیکھے جاتے ہیں۔ یہ بھی آندھرا قوم کی عظمت کو زندہ کرنے میں پیش پیش رہے بعض نظموں میں یہ قومی جذبہ پُرجوش ہو گیا ہے۔ نظم "آندھرا پورشم" میں کہتے ہیں۔

"آندھرا جاؤں کے دربار اور دفاتر میں آج بند پڑے سورج ہیں۔ آندھراؤں کے مست ہاتھی جہاں پھرتے تھے وہاں آج خودرو پودے اُگ چکے ہیں۔ آندھرا قوم کی عظمت کو دیکھ کر مست ہونے والا آسمان آج منہ کالا کئے کھڑا ہے۔"

رادھا کرشنا کی محبت کو بہت ہی کلاسیکل انداز میں پیش کیا ہے۔ وزن اور انداز بیان میں اور الفاظ کے استعمال میں شاعر کو جو کمال حاصل ہے اس سے ظاہر ہے۔ جذبہ محبت کا اظہار بھی نرالا ہے۔ نیظم شرنگار ودیہی کہلاتی ہے، اور نئے ادب میں اپنی نظیر آپ ہے۔

قدرتی مناظر کو نئے رنگ میں پیش کرنے والے شعراء میں یہ اوّل ہیں۔ انھوں نے کالی داس کے سنسکرت رتو سنگھا کا تلگو میں ترجمہ کیا، اور اس میں اپنا رنگ بھر دیا۔ انسانی جذبات اور فطرت کو دریا کے مناظر سے جوڑ کر آپ نے جو گیت گائے ہیں اُن کی مثال دورِ جدید کی شاعری میں کہیں نہیں ملتی۔ یہ کرشنا ناٹو کے نام سے مشہور ہیں۔ دریا کے پانی کا بہاؤ اور اُس کے نت نئے راستے۔ اس کی شوخی بھری ادائیں شرارت آمیز انداز کنیزا کے روپ میں اس نازک انداز سے شاعر نے پیش کیا ہے کہ سننے والا مست ہوتا ہے۔ اس شاعر کو موسیقی میں جو دخل ہے وہ اس گیت میں پوری طرح ظاہر ہو جاتا ہے۔ اس میں الفاظ کی موسیقی ہے۔ تخیل اور نزاکت بیان قابل تعریف ہے۔ ایک ہزار سال کے تلگو ادب میں اس طرز کے نظم لکھنے والوں میں رام راج بھوشن ہی ہیں۔ پُران کا تعلق بھی قدیم ادب سے ہے۔ اور نئے ادب کی تاریخ میں یہ ملک الشعراء وشوا ناتھ ستیانارائن ہیں۔ اسی سے اندازہ ہو سکے گا کہ یہ ملک الشعرا کیوں کہلاتا ہے۔

اس شاعر کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ اس کی تصانیف میں وہ ناول ہو یا افسانہ یا نظم، دھرم کی جھلک نظر آتی ہے۔ مذہب اور

سال نامہ آج کل دہلی

زندگی کے تلخ تجربے میں وہ بہت سی مصیبتوں کا شکار ہو گیا اور اسی عالم فکر میں اس دنیا سے چل بسا۔ اس کے گیت مقبول عام ہیں۔

جدید شاعری پر تنقیدی نظر ڈالنے والوں کو سیوسنکر اشاستری کو بھولنا ناممکن ہو جائے گا۔ یہ اپنی نظیر آپ ہیں۔ ان کی شاعری قدیم طرز میں اور عجیب انداز میں لکھی گئی ہے۔ گیت میں ڈراما لکھنا اُن کا کمال ہے۔ اس فن میں بہت ماہر ہیں اور اسی نقطۂ نظر سے بہت بڑے شاعر ہیں۔

یہ ہیں دورِ جدید کے چند معمار۔ ان میں سے ہر ایک نے اپنی انفرادی ہر شاعری پر لگا دی ہے۔ اب اُن کے نقشِ قدم پر چلنے والوں میں یوں تو بہت سے شعرا ہیں لیکن میں یہاں اُن کا تفصیل سے ذکر نہیں کر سکتا۔ صرف شاعر جاشور کے متعلق چند باتیں کہہ کر اس مضمون کو ختم کر دوں گا۔

جدید شاعری میں جاشور کو بھی ایک خاص درجہ حاصل ہے۔ ان کی شاعری مقبول عام ہے۔ ان کی چند تصانیف طرز بیان اور بلندیٔ خیال کا بہترین نمونہ ہیں۔ جن میں قابل ذکر "فردوسی" "گیلم" اور "ممتاز محل" ہیں۔

شاعر نے فردوسی لکھ کر اچھی شہرت حاصل کی ہے۔ ان کی شاعری میں انداز بیان بامحاورہ ہوتا ہے معمولی سے اشعار میں وہ عمیق فلسفۂ زندگی کو پیش کرتے ہیں۔ "ممتاز محل" میں ممتاز کے خواب میں اُس کو محسوس ہوتا ہے کہ وہ مرنے والی ہے۔ وہ جہاں پناہ سے عرض کرتی ہے کہ جہاں پناہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میں اس دنیا سے کوچ کرنے والی ہوں۔ لیکن آپ اس کی فکر نہ کیجئے۔ پیدا ہونا اور مرنا زندگی کی علامتیں ہیں۔ ہر شخص کو مرنا ہی ہے۔ اسی موقع پر ممتاز پھر سے کہتی ہے اور یہ فلسفہ واضح کرتی ہے۔

"جہاں پناہ! یہ دنیا ایک مسافر خانہ ہے۔ دُکھ اور سُکھ کی زندگی جھیلنے کے لئے میں نے اس روپ میں آپ کے ساتھی کی حیثیت سے سفر کیا۔ ویسے ساتھی تمہارے ساتھ ہمیشہ نہیں رہیں گے۔ یہاں کے حالات تمام خراب ہیں"

"ہم تاجر کی حیثیت رکھتے ہیں۔ سمندری جہازیں سفر کرنے والے ہیں۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ تمام ایک ہی بندرگاہ پر اُتر جائیں۔ کوئی کہیں اُترتا ہے اور کوئی دوسری جگہ جس تاجر کا کام (یعنی اپنے سامان فروخت کرنے کا معاملہ) جہاں ختم ہوتا ہے وہیں اُتر جاتا ہے۔ میرا کام ختم ہو گیا اور میں جا رہی ہوں"

اس کے کوچ کرنے کے بعد جہاں پناہ بہت فکر کرتے ہیں اور اس کی یاد میں تاج محل بنواتے ہیں۔ اس موقع پر شاعر کہتا ہے (جہاں پناہ کے روپ میں)

"دے کر خوش کرتا ہے اور پھر واپس لیتا ہے۔ ایسی عادت خدا نے کیوں ڈالی معلوم نہیں ہوتا"

یہ ہیں اُن کے جذبات اور اُن کا فلسفۂ زندگی۔

عمر خیام کے فلسفۂ زندگی کی ترجمانی کرنے والوں میں دوری رام ریڈی۔ حیدرآباد کے چیف منسٹر پی رام کرشنا راؤ۔ بھی سندر رام شاستری۔ آچاریہ سبا راؤ وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ ان سب تو جوہوں میں پی۔ رام کرشنا راؤ کا انداز بیان قدیم طرز کا معلوم ہوتا ہے، اور دوری رام ریڈی کا مدھر طرز کا، رام ریڈی کے "پانا شالہ" میں جو عمر خیام کی رباعیات کا ترجمہ ہے۔ نئے دور کی خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ ان کا طرز بیان بھی حاکمانہ ہے۔

یہ ہیں جدید دور کی شاعری کے چند معمار۔ اس کے بعد ہی سے ترقی پسند شاعری شروع ہوتی ہے، جو میرے مضمون کے دائرے سے باہر ہے۔ اس وقت رومانی طرز کی شاعری اور ترقی پسند شاعری متوازی راستوں پر چل رہی ہیں۔ نہ معلوم یہ ایسے ہی آئیں گی یا کہیں جا کر ملیں گی۔ اس کا فیصلہ ادب کی رفتار ہی کرے گی۔

معلومات اور اعداد

۱۔ بھارت میں ۱۵۔ اگست ۱۹۴۷ء سے ۳۱ دسمبر ۱۹۵۲ء تک ۲۱ کروڑ چھیاسٹھ لاکھ روپے کے غیر ملکی سرمایہ کے اجرا کی اجازت دی گئی۔

۲۔ یکم جنوری ۱۹۵۲ء سے بھارت سرکار ریاسی لائٹ ریلوے کو بھی اپنے زیر انتظام لے لے گی۔ اس کے بعد بھارت کی ۳۴ ہزار میل لمبی ریلوں میں سے صرف ۵۵۳ میل لمبی ریلوے لائن غیر سرکاری ملکیت میں باقی رہ جائے گی۔

۳۔ ۱۹۵۲-۵۳ء میں بھارت سرکار کو ان رہائشی عمارتوں سے تقریباً ۸۵ لاکھ کرایہ وصول ہوا ہے جو سنٹرل پبلک ورکس ڈیپارٹمنٹ کے زیر انتظام ہیں۔

گُل کدہ

تیرے اکتارے میں جو اکیلا تار ہے اُسے اطمینانِ قلب سے بجاتا رہ

تیری پھلواری میں جو ایک پھول ہے اُسی سے اپنی ڈلیا سجالے

اپنی منزل پر کیف انگیز عالم میں رُک جا

تیرے مالک نے تجھے جو کوڑی دی ہے اسی کو ہنستا ہُوا لے لے

لوگوں کی بات پہ کان نہ دے۔ ہزار دل کششوں سے کھنچا ہُوا مارا مارا نہ پھر

تیرے من کو ہر وقت احساس رہے کہ حقیقت خود تیرے من میں موجود ہے

ٹیگور

جوش ملیح آبادی

آغازِ انجام

ہستی کو تسلسل سے نہ سونے دیجے
جو شہرِ طرب دل میں ہُوا ہے آباد
مُنہ آنسوؤں سے کبھی تو دھونے دیجے
اس شہر میں قحطِ غم نہ ہونے دیجے

زندگی، کون سی ہے یہ منزل؟ — نہ شرارے، نہ گُل، نہ سوز، نہ ساز — اب نہ وُہ دوستانِ جاں پرور — اب نہ وُہ گُل رخانِ بندہ نواز

اب وُہ ارمان سبز با نو ہیں — کل جو تھے سربلند و سرافراز — دُھوؤں کا رباب ہے خاموش

خون آلودہ اب ہیں وہ لمحے — جن کی رنگینیاں تھیں مایۂ ناز — زندگی کا مزاج ہے ناساز

کوئی رادھا ہے اب، نہ کوئی کرشن — کوئی محمود ہے، نہ کوئی ایاز — روئے افکار، جانبِ پستی — زنگِ رخسار، مائلِ پرواز

زندگی میں جو رنگ بھرتے تھے — اب وُہ احباب ہیں، نہ وُہ دم ساز — سامنے ایک آہنی دیوار — پُشت پر دُور تک نشیب و فراز

ہر نفس جو قریب رہتے تھے — دُور جا کر بسے ہیں وُہ ہم راز — گامزن سوئے ظلمتِ انجام — کاروانِ شگفتۂ آغاز

اب نہ نرکانِ مونس و ہمدم — اب نہ یارانِ خوش دل و جاں باز — روئے بربود ساز و برگِ دورِ نشاط — مثلِ صد تودہ ہائے سوز و گداز

اب نہ وُہ سایہ ہائے سرو و چنار — اب نہ وُہ لالہ ہائے پا انداز — نوحہ زن، مثلِ شامِ گورستاں — عہدِ رنگیں کی صبحِ زمزمہ ساز

اب نہ رُوئے صنم میں وُہ جادو — اب نہ بُوئے سمن میں وُہ اعجاز — گریہ کیا، چہ چہوں میں بھی غلطاں — زندگی کی تھکی ہُوئی آواز

اب نہ وُہ گلستانِ رُوئے نکو — اب نہ وُہ سائے بانِ زلفِ دراز — حیف بر قہقہ ہائے شام و سحر

اب نہ وُہ محشرانِ مہر قروش — اب نہ وہ مہ وشانِ عشوہ طراز — وائے بر فتنہ ہائے عمرِ دراز

غزل

میں نے مانا حسن میں ناز و تزاکت چاہیئے
قول دل کا ہے کہ محبوبانہ سیرت چاہیئے

اُس کو پا کر بھی اُسے پانے کی حسرت چاہیئے
وصل میں بھی چاشنیٔ دردِ فرقت چاہیئے

حضرتِ ناصح ہمیں ہمدرد یاں درکار ہیں
تُم یہ سمجھے درد والوں کو نصیحت چاہیئے

اے مذاہب کے خدا تیری مشیّت جو بھی ہو
عشق کو دیگر خدا دیگر مشیّت چاہیئے

ورنہ بزمِ ناز اک حیرت کدہ بن جائے گی
حُسنِ بے پایاں میں اندازِ کفایت چاہیئے

قادرِ مطلق نے جو کچھ بھی مقدّر کر دیا
وہ مقدّر بھی بدل سکتا ہے ہمّت چاہیئے

ہے سجیلا پن، رسیلا پن، کٹیلا پن وہی
ساغرِ مے میں تری آنکھوں کی نیّت چاہیئے

آپ نے مہر و مروّت سے نوازا ہر طرح
شکریہ اس کا مگر مجھ کو محبّت چاہیئے

شیخ صاحب سب کی نظروں میں فرشتے ہیں ہی
حق تو یہ ہے آدمی میں آدمیت چاہیئے

اس جہاں کو رشکِ جنّت ہم کریں گے ایک دن
جن کا یہ ایماں نہیں ایسوں کو جنّت چاہیئے

سیرِ عالم کر کے بھی کورے کے کورے رہ گئے
دیکھنے سے کچھ نہیں ہوتا بصیرت چاہیئے

ایک دُنیا پہ فریبِ نازِ جس کا چل گیا
اُس نظر کے جھوٹ میں بھی کچھ صداقت چاہیئے

گھول دیں گے ہلِ دل رازِ ازل رازِ ابد
اک نظر کی گردشِ دوراں میں فرصت چاہیئے

گو ہیں اُن معصوم آنکھوں میں ہزاروں خوبیاں
کچھ شرارت بھی مگر حسبِ ضرورت چاہیئے

اجنبیت جن کی فطرت بے رُخی جن کا شعار
کچھ نہ کچھ ایسوں سے بھی صاحب سلامت چاہیئے

عزّت و شہرت سبھی کچھ مجھ کو حاصل ہے فراق
دوست بھی ملنے کو مل سکتا ہے قسمت چاہیئے

عرش ملسیانی

ایورسٹ کی پریوں کا کورس

(تین سنگھ اور ہلیری کی کامیابی پر)

حسنِ تدبیر سے با عزمِ جواں آ پہنچا
ہاتھ میں تھام کے ہمت کی عناں آ پہنچا
بہرِ تعمیرِ حیاتِ گذراں آ پہنچا
رجزِ حوصلہ پر رقص کناں آ پہنچا
آخرِ کار سرِ کوہِ گراں آ پہنچا
ابنِ آدم کو تو دیکھو کہ کہاں آ پہنچا

ایورسٹ اس کے ہوئی زیرِ قدم کیا کہنا
دستِ انساں میں ہیں خود لوح و قلم کیا کہنا
اوجِ بیداریٔ تقدیرِ اُمم کیا کہنا
رازدارِ دلِ بیدارِ جہاں آ پہنچا
آخرِ کار سرِ کوہِ گراں آ پہنچا
ابنِ آدم کو تو دیکھو کہ کہاں آ پہنچا

جن ڈھلانوں پہ سنبھلنے کی بھی فرصت نہ ملے
جن فضاؤں میں ٹھہرنے کی بھی مہلت نہ ملے
جس بلندی پہ تنفس کی اجازت نہ ملے
اس بلندی پہ بھی با تاب و تواں آ پہنچا
آخرِ کار سرِ کوہِ گراں آ پہنچا
ابنِ آدم کو تو دیکھو کہ کہاں آ پہنچا

جس جگہ اُڑ ہی نہیں سکتا کسی کا پرچم
جس جگہ گڑ ہی نہیں سکتے ملائک کے عَلَم
جس جگہ جم نہیں سکتے کسی نوری کے قدم
اُس جگہ آدمِ خاکی کا نشاں آ پہنچا
آخرِ کار سرِ کوہِ گراں آ پہنچا
ابنِ آدم کو تو دیکھو کہ کہاں آ پہنچا

اگست ۱۹۵۳ء

اب تو رُکنے کی نہیں اس کی کبھی طبعِ بلند
اور اُڑائے گی اسے ہمّتِ دشوار پسند
اس بلندی سے یہ ڈالے گا ستاروں پہ کمند
اس سے کیا دُور رہے گا جو یہاں آ پہنچا

آخرِ کار سرِ کوہِ گراں آ پہنچا
ابنِ آدم کو تو دیکھو کہ کہاں آ پہنچا

بن کے اک شعبدۂ اوجِ خیالِ انساں
صورتِ معجزۂ شانِ جلالِ انساں
ثبت کرنے کے لئے مُہرِ کمالِ انساں
اک یقیں بن کے وہ قرنوں کا گماں آ پہنچا

آخرِ کار سرِ کوہِ گراں آ پہنچا
ابنِ آدم کو تو دیکھو کہ کہاں آ پہنچا

ہیچ ہے اس کے لئے اب تو ثوابت کا حصار
عرش تک جائے گی اب ہمّتِ سیّارہ شکار
روک سکتی ہی نہیں اب اسے کوئی دیوار
موت کے در سے نکل کر جو یہاں آ پہنچا

آخرِ کار سرِ کوہِ گراں آ پہنچا
ابنِ آدم کو تو دیکھو کہ کہاں آ پہنچا

ارتقا زادہ، فرشتوں کی کرامت کا امیں
شوق کا گوہرِ تابندہ، جسارت کا نگیں
غازۂ رُوئے عمل، پرتوِ انوارِ یقیں
نقشِ رنگینیٔ گلزارِ جہاں آ پہنچا

آخرِ کار سرِ کوہِ گراں آ پہنچا
ابنِ آدم کو تو دیکھو کہ کہاں آ پہنچا

ہو کے بیدار لیا اُس نے ہے اب خمیازہ
شوق بھی تازہ ہے اب اس کا عمل بھی تازہ
گرمیٔ ذوقِ یقیں اس میں ہے بے اندازہ
برف زاروں میں بھی یہ شعلہ بجاں آ پہنچا

آخرِ کار سرِ کوہِ گراں آ پہنچا
ابنِ آدم کو تو دیکھو کہ کہاں آ پہنچا

آسمانوں کو سُناتا ہے زمیں کا پیغام
فرش والا ہے مگر آج تو ہے عرش مقام
خیر مقدم میں پڑھیں اس کے درود و سلام
آدمی تا درِ گلزارِ جناں آ پہنچا

آخرِ کار سرِ کوہِ گراں آ پہنچا
ابنِ آدم کو تو دیکھو کہ کہاں آ پہنچا

اگست ۱۹۵۳ء

قطعات

آج مدّت کے بعد ہونٹوں پر
اس کو نغمہ تو کہہ نہیں سکتا

کوئی مبہم سا گیت آیا ہے
یہ تو نغمے کا ایک سایا ہے

حسن کا عطر، جسم کا صندل
بعض اوقات سوچتا ہوں میں

عارضوں کے گلاب، زلف کا عود
ایک خوشبو ہے صرف تیرا وجود

چند لمحوں کو تیرے آنے سے
دھوپ میں گرم کوہساروں کی

تپشِ دل نے کیا سکوں پایا
ابر کا جیسے دوڑتا سایا

کھو گئے دل میں کتنے ہنگامے
آج اس پُرسکوت وادی میں

کتنے غم، شادمانیاں کتنی
پُر فشاں ہیں کہانیاں کتنی

ابر میں چھپ گیا ہے آدھا چاند
جیسے کھڑکی کا ایک پٹ کھولے

چاندنی چھن رہی ہے شاخوں سے
جھانکتا ہو کوئی سلاخوں سے

یہ مجسّم شکستگی مری روح
اُف مرے گرد یہ تری باہیں

اور باقی ہے کچھ نفس کا کھیل
ٹوٹتی شاخ پر لپٹتی بیل

دُور وادی میں یہ ندی انجم
صبح کے اس حسیں دھندلکے میں

کتنے میٹھے سروں میں گاتی ہے
کیا یہیں بھیرویں نہاتی ہے

اک نئی نظم کہہ رہا ہوں میں
کس محبّت سے تک رہی ہے مجھے

اپنے جذبات کی حسیں تصویر
دُور رکھی ہوئی تری تصویر

یوں اُس کے حسیں عارضوں پر
جیسے کوئی آڑ میں بلائے

پلکوں کے جھک رہے ہیں سائے

فضا ابنِ فیضی

گم شدہ نظموں کے نام

یہ کس نے شمعِ مروّت کو دود خیز کیا
یہ کس نے توڑ دیا میرے دل کے چھالے کو
یہ کس نے نور کو ظلمت کی سمت موڑ دیا
یہ کس کی دھوپ نے غنچوں کے روپ کمھلائے
یہ کس نے قافلۂ بوئے گل کو لوٹ لیا
یہ کس نے بھر دیئے نشتر سے پھول کے سینے
یہ کس نے کانٹوں سے ساذِ بہار چھیڑ دئے
تجلیوں کے سفینے ڈبو دئے کس نے
ملا دی کس نے سیاہی شفق کی لہروں میں
یہ کس نے چاند کے سینے میں کر دئے ناسور
یہ کس نے پر کھا عیارِ حرف پہ نیلم کو
یہ کس نے ڈال دی گرد خزاں شگوفوں پر
ڈبو دیا مجھے کس نے یہ قلزمِ سم میں
یہ کس نے ساغرِ افکار کو اچھال دیا
بنائی کس نے مرے دل کے آنسوؤں سے شراب
یہ کس نے طاق میں اپنے سجائے میرے سبو
یہ کس نے میرے لہو سے سجائی اپنی شام
یہ کس نے طائرِ طوبےٰ کو زیرِ دام کیا
یہ کس نے میرے تخیل کی بجلیاں چن لیں
یہ کون پی گیا میرے قلم کی شبنم کو
نفس کا طرزِ تکلم چرا لیا کس نے
سحر حلا کی جہانِ خیال کو جس نے
مگر یہ حادثے پیغامِ اضطراب نہیں

یہ کس نے نشترِ بیداد مجھ پہ تیز کیا
کیا ہے کس نے اندھیرا مرے اجالے کو
یہ کس نے آئینۂ آفتاب توڑ دیا
یہ کس کی ضرب نے ساغر کے ہونٹ تھرّائے
یہ کس نے دولتِ مینا و مل کو لوٹ لیا
یہ کس نے توڑ دئے شبنموں کے آئینے
یہ کس نے ٹانکے مرے زخم کے اُدھیڑ دئے
رگِ گلاب میں خنجر چبھو دئے کس نے
یہ کس نے جھونک دی خاک آئینے کی آنکھوں میں
یہ کس نے نذر کی خورشید کو شبِ دیجور
یہ کس نے دھوپ دکھائی نگارِ شبنم کو
سیاہی کس نے ملی نقرئی حروفوں پر
یہ کس نے پھینک دیا خلد کو جہنم میں
یہ کس نے میرے تخیل پہ ڈاکہ ڈال دیا
یہ کس نے لکھی مرے خونِ دل سے اپنی کتاب
کیے یہ کس نے مرے دل کے آنسوؤں سے وضو
بھرے یہ کس نے مرے آنسوؤں سے اپنے جام
یہ کس نے آج فرشتے سے انتقام لیا
دلِ غمیں کی مرے کس نے دھڑکنیں سن لیں
یہ کون لے اڑا زخمِ جگر کے مرہم کو
نظر کا رنگِ تبسم اڑا لیا کس نے
وہ آفتاب گریباں میں رکھ لیا کس نے
مقامِ تبصرۂ و نقد و احتساب نہیں

ابھی نصیب میں نقصان و سود ہیں کتنے
جہانِ شعر و سخن بے نمود ہیں کتنے

(ادارہ) ۹

جگن ناتھ آزاد

عظمتِ آدم

(ہمالہ کی بلند ترین چوٹی کے سر ہونے پر)

آخر تجھے ہی چھو لیا آدم کے قدم نے
حیرت میں غرق ہے کہ کہاں جا کے رُکے گی

اے کوہِ ہمالہ کی فلک بوس بلندی
انساں کے عزائم کی یہ دشوار پسندی

بڑھتا ہی گیا منزلِ مقصود کی جانب
انساں کے احساس کا جذبہ کا ہُوا شعلہ

وہ عزم کہ طوفاں کا جگر چیر کے نکلا
ظلمات کو مانندِ سحر چیر کے نکلا

انساں ہمالہ پہ ہُوا محوِ عمل جب
وہ کوہِ ہمالہ کی بلندی کی محافظ

ساکن ہوئے طوفان ہوائیں ہوئیں خاموش
پُر شور و سیہ مست گھٹائیں ہوئیں خاموش

آ ہی گئی اُس برف میں اک خوئے حریری
رستہ سا بنا ہی دیا خود اُس نے سمٹ کر

وہ برف کہ ٹوکے ہُوئے آدم کو کھڑی تھی
وہ کھائی کہ روکے ہوئے رستے کو پڑی تھی

وہ کوہ کی رفعت ہو کہ ہو بحر کا وہ عمق
جھک جاتے ہیں کہسار سمٹ جاتے ہیں طوفاں

طوفاں و جنوں خیز ہوا ہو کہ گھٹا ہو
اک پختگیٔ عزم اگر راہ نما ہو

اے عزمِ بشر راہ تری روک سکا کون
اب تیری کمندوں کی رسائی سے نہیں دُور

ہے آج ترے پاؤں تلے کوہِ ہمالہ
مریخ کا حلقہ ہو کہ ہو چاند کا ہالہ

وُہ کوہ کی دُنیا کہ بہت دُور تھی اب تک
جو خندہ زن انساں کی ہمت پہ رہی تھی

انساں نے وہیں آج کیا جا کے بسیرا
گاڑا وہیں انساں کے عزائم نے پھریرا

اک کوہ نہیں چار عناصر کی طرف سے
تن سنگھ کی ہے یہ نہ ہلیری کی ہے نُصرت

سو بار سلام آج تجھے عظمتِ آدم !
آزاد ! یہ نُصرت ہے فقط نُصرتِ آدم

سکندر علی وجد

شکستِ ہمالہ

جنونِ عقل کی تدبیر فتح مند ہے آج
ہمالیہ سے بھی انسان سربلند ہے آج
توہمات کی منزل یہ بزمِ جن و پری
ازل سے آمدِ آدم کے انتظار میں تھی
وہاں پہنچ کے بشر نے دیا پیامِ سحر
پہنچ سکی نہ جہاں تک شعاعِ شمس و قمر
اُٹھائے پرچمِ عزم و شباب جا پہنچے
فرازِ کوہ پہ دو آفتاب[1] جا پہنچے
مثالِ کاہکشاں فخر سے چمک اُٹھے
تمام نقشِ قدم پیشِ رو شہیدوں کے
جبینِ خاکِ فلک بوس جگمگاتی ہے
نئے اُفق سے نئی صبح مسکراتی ہے
بساطِ ارض کہن بہرِ رخشِ فکر ہے تنگ
اُڑا ہوا ہے ابھی سے مہ و نجوم کا رنگ

[1] تن سنگھ اور ہلیری

عباس بیگ محشر

راج ہنس

یہ آبجو کے کناروں پہ نرکلوں کی قطار — ندی ہے بیچ میں دونوں طرف بہار ہی بہار
ہیں نرم شاخوں پہ پیلوں کے اس طرح سائے — کہ جیسے عشق کی بانہوں میں حسن گھر جائے
کہیں کہیں سے نقابِ زمرّدیں ہٹ کر — کلوں کی آتشِ رخسار آرہی ہے نظر
ہے اُن کے عکس سے یوں گلفشاں ندی کا کنار — بھرے شباب میں جس طرح زندگی کا نکھار
ٹھہر ٹھہر کے جو ہلکی ہوا کے جھونکے آئے — کہیں کہیں پہ حجابِ زمرّدیں تھرّائے
شرابِ ریز نظارے سے مست ہیں آنکھیں — نظر پسند بہاروں سے مست ہیں آنکھیں
سحر کے نُور کی جلوہ گری نکل آئی — حجابِ سبز ہٹا کر پری نکل آئی
یہ راج ہنس یہ حُسنِ متین کی تنویر — یہ بُت تراشیٔ قدرت کی مرمریں تصویر
کھنچی کمان سی گردن، تنا ہوا سینہ — حسین عکس سے روشن ندی کا آئینہ
غرور توڑ رہا ہے شریر موجوں کا — پلٹ کے ہوتا ہے واپس جو تیز موجوں کا

سرورِ فتح میں لیتا ہے بازوؤں کو کام
لُٹا رہا ہے گہر و شاد کام و مست خرام

اعلانِ نون ؛ (اماوس)

شہریار

تاج محل

باشگاہ دانشگاہ تہران
۱۹ اسفند ماہ ۱۳۳۱

حضرت مدیر محترم مجلہ آج کل دہلی

بانیو سیلہ زحمت افزا میشود

این نظمیست کہ پس از دیدن تاج محل در زبان اردو نوشتم۔ ہیچ ادعائے ندارم کہ بتوانم دریں زبان مثل اہل زبان چیزی بنویسم اما بایستی چیزی نوشت۔ بایستی کاری کرد۔ ممکن است قدری لائق اعتنا باشد۔ موقع را غنیمت شمردہ بندہ تبرکاً

عبد نوذر را تقدیم می دارم .....

باقرات فائقہ

شہریار

ای زمیں کے تختِ پر تاجِ سرِ عرشِ بریں — آگرہ کے طور پر اک جلوۂ جاں آفریں
مطلعِ خورشیدِ حُسن و عشق ہے تیری جبیں — چومتے ہیں تیرے قدموں کو فلک کے نازنیں

اک کنول کا پھول ہے سارے جہان کی جھیل میں
عشق کی ہے شمعِ روشن حُسن کی قندیل میں

گلشنِ فردوس کے ہر پھول کا ارماں ہے تو — خلدِ حسن کا مطلعِ اول ہویدہ دیواں ہے تو
سطوتِ شاہانِ ہند و سندھ کا ایواں ہے تو — مذہبِ تعمیر خشت و سنگ کا قرآں ہے تو

ای تجلی زارِ ہستی خواب گاہِ ارجمند
تیرے آگے پست ہے ہر رفعتِ چرخِ بلند

شہرِ یاں پروانہ مسوزاں ترا شمعِ جمال — قصرِ شیریں تیں نیرا میلیا اوجِ کمال
دم بخود ہے ترے آگے آج صنعت کی مجال — جانے کیسے بن گئی تصویرِ فردوسِ خیال

تاج عواصِ نظر کو درطۂ حیرت ہے تو
ماہِ کامل کے نفس میں گرمیٔ الفت ہے تو

جلوہ گر ہے الفتِ خرم قبای نور میں — ہے دلِ پروانہ شمعِ روشن کا فور میں
آرزوِ پروانگی کی ہے چراغِ طور میں — خود کو رب الحسن کہدے جذبۂ منصور میں

یاں نگاہوں کو پلائی جا یونہی صہبای حُسن
تو قیامت تک رہے ساقی جہاں آرای حُسن

مرمریں گنبد تمر زریں کلس ہے آفتاب — باغِ جنت کا چمن نہریں تری کوثر کا خواب
جالیاں تیری رواقِ فطرت کی ہیں رنگیں نقاب — بیل بوٹوں کی رگوں میں خونِ طوبیٰ کا شباب

معنی زیبا ہے تو تخلیق کی تحریر کا
ہے ستارہ جنت الفردوس کی تقدیر کا

ای خدائی حُسن کے یوسف جبیں پیغامبر — جگمگاتے ہیں تری قسمت میں شمس و قمر
دردمندوں کو دمِ عیسیٰ تری شام و سحر — حج اکبر دید تیری کعبۂ ذوقِ نظر

تو لبِ جمنا پہ ہے اک نغمہ سازِ حیات
رقص پر ہا ہے تری میٹھے سروں پر کائنات

شب کو دن کے کارواں کی تیرے آئینہ پہ گرد — جھاڑتا ہے اپنی پلکوں سے سرگردوں نمود
تو وہ گوہر ہے جس کا سپہر لاجورد — آستاں پر تیرے پندارِ ارم کا رنگ زرد

نازشِ خوبی پہ رقصانِ سحر کا طاؤس ہے
ضو فشاں آفاق پر افلاک کا فانوس ہے

غزل

وہ حُسنِ پردہ نشیں۔ زیبِ بام ہو نہ سکا
نگاہِ خاص کا مرکز تھا۔ عام ہو نہ سکا

نگاہِ شوق میں ہے کیف بارِ ہر گلِ تر
سرور سے کبھی محدودِ جام ہو نہ سکا

جو گمرہانِ جنوں کو ہے ہر قدم پہ نصیب
وہ اہلِ ہوش کو حاصل مقام ہو نہ سکا

نکالے بال و پر آخر۔ نہ رہ سکا تہِ خاک
پرندِ دانہ گرفتارِ دام ہو نہ سکا

فزوں ہے مرتبۂ عشق اس قدر کہ ایاز
غلام ہوتے ہوئے بھی غلام ہو نہ سکا

گریز پا ہے ازل سے یہ کاروانِ حیات
عدم سے اس طرف اس کا مقام ہو نہ سکا

درائے منزلِ محبوب تازیانہ ہوئی
سمندِ شوق میرا سُست گام ہو نہ سکا

صراطِ عشق پہ رکھتے ہیں سرفروش قدم
ہوس پرستوں سے امین یہ کام ہو نہ سکا

باغِ شالامار کشمیر

(طلوعِ شمس سے پہلے)

اٹھنے اٹھتے چھوڑ رہی ہے دور کہسار کو نیند — آ رہی ہے رات بھر جاگے ہوئے تاروں کو نیند

رنگ و بو کے معبدوں میں طائرانِ خوشنوا — گا رہے ہیں خالقِ کونین کی حمد و ثنا

نرمہتوں پر کے ٹہنی جا رہی ہے رات کی — ہو رہی ہیں ہر شجر سے بارشیں نغمات کی

ظلمتوں کے ہو رہے ہیں نور سے رازو نیاز — نورِ طوفانِ تجلی، ظلمتیں یکسر گداز

اوٹ سے اشجارِ اخضر کی فضائے عنبریں — کر رہی ہے شرق کی جانب نگاہِ واپسیں

ہے ضیا افروز گلشن تابشِ جوشِ نمو — ہر طرف موّاج ہے طوفانِ کیفِ رنگ و بو

ہے صبا سبز پہ گوہر پاش آبِ تاب سے — اوڑھ جگاتی ہے حسینانِ چمن کو خواب سے

نرمہتوں کی چلمنیں ہیں گلستاں کے چار سو — ناز سے کلیاں پہنتی ہیں لباسِ رنگ و بو

اک لطافت قلب کی تڑپا رہی ہے جھوم کر — اک طراوت روح کو گرما رہی ہے جھوم کر

بلبلوں کے چہچہوں سے باغ ہے اک نغمہ زار — اور گلوں کے قہقہوں سے ہیں ہوائیں مشکبار

سرد ہے صہبا چکاں ہے اور نغمہ بار ہے
روح افزا اور دلکش صبحِ شالامار ہے

نشور واحدی

غزل

حسن جتنا ہی سادہ ہوتا ہے — گیسوئے ناکشادہ ہوتا ہے

جب کبھی شغل بادہ ہوتا ہے — ایک عالم زیادہ ہوتا ہے

عشق اک ربطِ سادہ ہوتا ہے — محشرِ بے ارادہ ہوتا ہے

جب وہ آتے ہیں زندگی کے قریب — دل بھی دُور اُفتادہ ہوتا ہے

حُسن ہوتا ہے سادہ و رنگیں — عشق رنگیں و سادہ ہوتا ہے

کیا خبر یہ فشردۂ انگور — کتنا خوں ہو کے بادہ ہوتا ہے

مرگ کرتی ہے جبکہ دربانی — زیست کا در کشادہ ہوتا ہے

اُن کا جلوہ نہ دُور ہے نہ قریب — نور ہے کم زیادہ ہوتا ہے

راہِ احساس بے کسی مت پوچھ — کوئی منزل نہ جادہ ہوتا ہے

گنگناتا ہوں فرصتوں میں نشور
شعر تنہائی زادہ ہوتا ہے

ایم اے حفیظ

غزل

پردۂ لطف میں یہ مشقِ ستم کیا کہیئے — ہائے ظالم ترا اندازِ کرم کیا کہیئے

رنگ لائی ہے مری سوزشِ غم کیا کہیئے — حُسن کی آنکھ بھی رہنے لگی نم کیا کہیئے

کس محبت سے شوخ نے پھونکا ہے آ افسونِ دوست — جھلملانے لگی کیوں شمعِ حرم کیا کہیئے

جاں نوازی کے تری اے غمِ محبوب نثار — کھل گیا آج مسرت کا بھرم کیا کہیئے

زُلفِ برہم تجھے معلوم نہیں ہے شاید — یوں بھی چھاتا ہے کبھی ابرِ کرم کیا کہیئے

اللہ اللہ تری دُوزنگاہی اے دل — قبلِ آغاز سے انجام کا غم کیا کہیئے

عہدِ حاضر کی مسیحا نفسی کیا کہنا — زندگی بن گئی تصویرِ الم کیا کہیئے

یہ بھی اک چال ہے تسخیرِ محبت کیلئے — ورنہ آپ اور مرے سر کی قسم کیا کہیئے

ہو نہ ہو آ ہی گئی منزلِ محبوب حفیظ
خود بخود کیوں رُکے جاتے ہیں قدم کیا کہیئے

ہندی

سو جانے دو

سو جانے دو اب نہ جھاؤ اس جاگرتی کے مشعل[1]
آنکھ میچنے دو ہونے دو چیتنتا اوجھل[2]
یہ سنگیت[3] یہ گیان[4] بھاؤ ہے بھولے جیسے کی بھول[5]
مجھے اوڑھا دو آج اچیتن[6] کا وہ شام دکول[7]
آج کھل رہے میرے آنگن گھنی نیند کے پھول
سو جانے دو میری انتی[8] وتی کرو قبول

یہ دھوما دیوت[9] رگ منڈل[10] ہے سویا بھی تان
سکھی سانجھ[11] کی بیلا[12] تر دھی سوئے اگیان[13]
نشچیتنا[14] کرنے آئی آج مدر رس[15] پان
نیند نیند سب اور نیند نے تانا سپن[16] وتان
اری آج لینے دو انجلی بھر بھر نمد اوسان[17]
سو جانے دو اب نہ سناؤ جاگرتی کے گن گان

بھینے بھینے نور پہنے شام چدریا[18] اوڑھ
دھیے دھیے نندیا[19] آئی چیتنتا گئی توڑ[20]
سنت[21] جاگرن کی دکھدائی کسک ہوئی کچھ لوک[22]
اب تو کرپا کرو نہ مجھ پہ بھر دو داس کا کوپ[23]

---

[1] کانٹے [2] سنگھرش [3] جڑ سے اکھاڑ پھینکنا [4] اسم [5] گیان کا احساس [6] دل [7] تخت، الشعور [8] دوپٹہ [9] درخواست [10] دھوئیں سے گھرا ہوا [11] چاروں طرف [12] شام [13] رقت [14] درخت [15] لاعلمی [16] بدہوشی [17] سے پلانا [18] خوابوں کا شامیانہ [19] نیند کا مان [20] پازیب [21] کالی چادر [22] شعور [23] خاصیت [24] لگاتار جاگتے رہنا [25] غائب [26] تیز نظر [27] غصہ

اس اندھیالی میں چمکاؤ تم نہ بجھو کی ایکھ[24]
نیند گگن میں مت چھنکاؤ سجنی یہ اوٹی ویک[25]

جھپکی لگتے ہی جگ جاتی ہے سپنے کی بھرانتی[26]
یہ کپٹ[27] وشراتی[28] بن گئی ہائے ہردے کی کرانتی
پلک لگے، جگ نے سمجھا میں سویا ہوں انجان
پر میں جانوں ہوں کہ نیند کا کیسا ہے ودھان
کس کا دوش؟ تمہارا ہے یا میرا؟ بولو پران
اری نیند میں بھی نک تک کیوں مادو ہو سمرتی باتی[29]

(بال کرشن شرما نوین)

کوی کے اگنی پران

میرا پھول نہ کملا پائے
جل اُنچ کر مولی[30] سینچ کر
لوٹے تم تروتر[31] کے سائے

تلے مور ناچے ڈالی پر
چمکے کھگ[32] پرانوں سے کھل کر
نبھر چاند[33] کے سُر منڈلائے

لوٹی گرام[34] دھوپن گھٹ سے
دگا چیرا[35] اپنے پٹ سے
بندھی ناؤ ملتی ہے تٹ سے
کوی کے اگنی پران اکتائے

(سودیہ کانت ترپاٹھی نرالا)

---

[28] بلی [29] اعلیٰ [30] دھوکا [31] معمولی [32] نیند [33] آرام [34] یا دکے تیر [35] ہاتھ میں پانی لے کر [36] جڑ میں پانی دے کر [37] درخت [38] پرندے [39] آسکاش [40] راجوں مہاراجوں کی تعریف کرنے والے شاعر [41] گاؤں کی عورت [42] فن کار

گجراتی

آخری دن

جس گھر میں کبھی چہل پہل تھی، اس کے سُونے پھول بھرے آنگن میں
آخری عمر کی چھوٹی سی گٹھڑی رکھ دی
تبھی کمرے کے وقت کے اداس سُورج کی
پہلی کرن گگن پر چمکی، اطراف حرکت سے جاگے

پڑوس کے بچے ہوئے بڑوں نے میری خیریت دریافت کی
خاندانی عورتوں نے میری طرف دیکھا اور کام میں لگ گئیں
تعجب سے بچوں نے آگھیرا
کتا ایک لمحے کے لئے بھونکا اور پھر میرا پیر سونگھنے لگا

تالے کھلے، کواڑ ذرا سے چیخے
جن کے اعضا ساکن حالت میں جڑے ہوئے تھے
تب اندر سے باسی سیلی ہوا راستہ پاکر
باہر لپکی جیسے کوئی پریت آزاد ہوا ہو
میں گھر میں گھسا تو اندھیرے نے پل بھر کو مجھے گھیر لیا
پھر شعاع کی چمک میں میں نے پرانے برتن دیکھے

(راجندر شاہ)

گجراتی

۷-۱۲ کی لوکل

جن کو منٹوں کی گنتی نہیں کرنی
نہ جنہیں گھنٹوں کے حساب سے پیسے ملتے ہیں
اور جن کے دن آگے پیچھے ہوئے بنا ہی بیت جاتے ہیں۔
جن کی ساری زندگی ہوا کی ٹھوکر کھانے پتوں سی ہے۔
جنہیں ہوا کھینچتی ہے یہاں وہاں، اونچے نیچے، سب طرف
یہ دیہاتی لوگ ایسے ہیں۔

بنگڑی چوڑی والے، مرونا چاقو قینچی
نیلام کرنے والے اور فیشن کے بچاری
تیل سے شرابور بالوں والے، صاف مُنڈے چہروں والے
نئے کلف لگے دستروں والے، بانکے کئی گاؤں سے
آئے ہوئے۔
اور کئی آدمی دس دن سے داڑھی بڑھائے ہوئے ہیں
کوٹ کے میلے کالروں والے پھٹے ہوئے کفوں والے تیلی
پرانی گھسی ہوئی اور مچلی ہوئی دھوتیوں والے بنئے
اور یہ ہیں ساؤری کے انگرکھے پہنے ہوئے کنڑی اور
کولی۔
بغل میں لاٹھی ٹیکے کھڑے ہیں۔
سر پر اور کمر میں میلے پگڑ اور کمر کے پٹکے لپیٹے
ہیں۔
بھوی ساگر کو پار کرنے کے لئے نو کاؤں (کشتیوں) ایسے
جوتے پہنے ہیں

تیرہ سات کے ٹائم کی ہمیشہ پچھڑ کر آنے والی
یہ گاڑی آج وقت پر آتی ہے دور سے
چھوٹا سا ایک کالا دھبہ اور سر پر ایک کلغی سی
دھیرے دھیرے بڑھتی ہے اور پھر ایک پہاڑ سا
گاؤں کے بھوکے کسانوں کے بڑھتے قرض سا
پل میں پلیٹ فارم پر دوڑتی ہوئی بڑھتی آتی ہے

(سندرم)

تلیگو

گوداوری کی طغیانی

خوشی سے پھولے نہ سما کر گوداوری اچھل پڑی اُمنڈ بہی
ٹیلوں پہاڑوں پر سے گزر گئی
جنگلوں اور غاروں کو ڈبو دیا
کہکشاں سے ہاتھ ملا بیٹھی
اس نے سبھی جنگلی درخت اپنی زلفوں میں گوندھ لیے
گاؤں اور بستیوں کی مالا پرو کر اپنے گلے میں پہن لی
اپنے تیز دھاروں انوکھی چال اور بھنوروں کے گمان میں پھول کر
جنگلی ڈرامہ کرتے ہوئے
اس نے فتح کے کتنے ہی ناقوس بجائے
شنکرائی راگ الاپتی ہوئی چل پڑی
انسان کی سبھی کارگزاریاں سر جھکائے کانپتی رہ گئیں
اپنا بزرگانہ ہاتھ اٹھا کر سب کو آشیرواد دیتی ہوئی سمندر کی طرف چل دی۔
گوداوری اُمنگ اُٹھی گوداوری اُمنڈ بہی

(اڈدی باپی راجو)

کنڑ

چڑیا اُڑ رہی ہے

رات کے گزر جانے پر دن نکل آتا ہے
دن کے آتے ہی
سب طرف کوسوں دُور تک
افق کے اُس پار سے سورج پلکیں جھپکانے لگتا ہے
ابھی جو چڑیا اُڑ رہی ہے اسے تم نے دیکھا۔

نیلے آسمان کی طرح اس کا رنگ ہے
اس کے پنکھ ایسے پھڑپھڑا رہے ہیں۔
جیسے آسمان کے پر نکل آئے ہوں
اپنے پنکھوں میں کروں کی مالا پہن کر
اور سُورج اور چاند ہی کو اس نے اپنی آنکھیں بنا لیا ہے
ابھی جو چڑیا اُڑ رہی ہے اُسے تم نے دیکھا

حکومتوں اور سلطنتوں کی چوٹیوں کو گراتی ہوئی
کروں کو خاک میں ملاتی ہوئی
حکمرانوں کے سر کو
چُور چُور کرتی ہوئی
ابھی جو چڑیا اُڑ رہی ہے اُسے تم نے دیکھا

اس نے دُور دُور کا فرق مٹا دیا
بہت سی بحثوں کو سلجھا دیا
اُس کے پنکھ پھیلے ہوئے ہیں گویا سب جگہ نئی جاگرتی پھیل گئی ہے۔
نئے دَور کے ننھے مُنے بچوں کو دُعا دیتی ہوئی
ابھی جو چڑیا اُڑ رہی ہے اسے تم نے دیکھا

اُس نے اُفق تک پہنچ کر اس پار
اپنی چونچ پھیلا دی ہے
جیسے کائنات کو چھوڑ ڈالنے کے لیے وہ گھات لگائے بیٹھی ہو۔
کون جانے اس کا کیا داؤں ہے
ابھی جو چڑیا اُڑ رہی ہے اُسے تم نے دیکھا

(دنا تریہ رام چندر ہیندرے)

دو مصرعے

او دھرم ناؤ کے سوار
تم قربانی کے جانور ہو۔ تم خونی کے شکار ہو

(بھارتی داسن)

جوہی ہنس دی

شام کو جب میں باغ کی طرف گیا
ٹھنڈی ہوا آئی
ہوا میں خوشبو تھی
میں ہوا کی طرف گھوم گیا
باغ میں جا کر دیکھا
ہرے لباس میں ملبوس
جوہی کی بیل پڑی تھی
ایک دم جوہی ہنس دی اور میں جھوم اٹھا

(بھارتی داسن)

بنگالی

نیا سال

آج بھی وہی ٹوٹا ہوا باڑہ، خالی کھیت، مٹی کھسکا ہوا چھپر
اور کتنے دن؟
اے ایشور! اس طرح ترس ترس کر کھانا، بوجھ ڈھونا، دکھ سہنا
یہ اور کتنے دن؟
ہائے ہائے کر رہا ہے سونا گھر
کھیتوں میں فصل نہیں۔ بستیاں خوشی سے خالی۔ بندرگاہ شمشان بنی ہے۔
ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے سنسار کے سارے آنگن میں ایک قبرستان بچھا ہوا ہے
وہ کہتے ہیں کہ ایک دنیا ختم ہو گئی
اکال ختم ہو گیا
لڑائی ختم ہو گئی
ہائے ایشور، ایسا ہی ہو
دوپہر کے وقت آنگن میں بیٹھ کر سوت کاتتا ہوں
من تھکا ہوا ہے۔ دل جیسے خالی ہو
بار بار وہی ننھے منے یاد آ رہے ہیں
ڈومنوں کی وہ اتنی سی لڑکی جو ماڑھ مانگ کر مر گئی
وسنتی کا جوان لڑکا بیوی کو چھوڑ کر لڑائی میں گیا
پھر لوٹ کر نہیں آیا
رتن سردار کو کسان اندولن میں جیل بھیجا گیا
ہائے ایشور، یہ ظلم کب تک ہوتا رہے گا؟
آکاش میں ہے روئی کی طرح سے سپید دھوپ
نیچے ہے سونا جہاں کبھی گائیں رہتی تھیں
کھیت میں نہیں ہے دھان
کھو گیا ہے پیوند لگے جیون کا آنچل
ہائے ہائے ری قسمت
رونے کا سودا سے کر کب تک کام چلے گا
آج چیت کے خاتمے پر
ایک اور برس کا ٹوٹ کر گر گیا
پرجگالی سے تھکے ہوئے اس ڈورے جیون کا سوا (ذائقہ)
کہاں ٹوٹا!
پرانے درد دوں کی رات کی پو ابھی نہیں پٹی، گھاؤ نہیں سوکھا
ہائے ہائے ری قسمت
آج بھی ہے وہی ٹوٹا ہوا باڑہ۔ سونا کھیت اور مٹی کھسکا ہوا چھپر
اور کتنے دن؟

(جگن ناتھ چکرورتی)

نئی پگ ڈنڈی

نئی پگ ڈنڈی
نیا گھاٹ
نئے افق، بڑے بے پایاں
گہرے دبا کر
پورا کھولنا
نئے جھرنوں کی راہ چھوٹتی ہے
جڑ میں سے
رس اوپر پھوٹ نکلتا ہے
ایک لمحے میں گلاب اوپر ہنسنے لگتے ہیں
یہ تیری نشانی
دل میں رکھتا ہوں سنبھال کر
اور جلدی جلدی چلتا ہوں پہاڑی پگ ڈنڈی

(شرت چندر مکتی بودھ)

پیاس

جب جی کو پیاس لگتی ہے
تب اَن گنت تاروں کو چھو کر آنے والی ہوا کو پی لیتا ہوں
سُکھ کے دُکھ کے گرم یا ٹھنڈے سانس
آشا اور نراشا کے نہ دینے والے یقین سے
مل کر پُرنم ہوا بنتی ہے

جب جی کو پیاس لگتی ہے
تب پیاروں کی محبت کی یا دپی لیتا ہوں
جب بچے کے ہونٹوں پر ماں کی چھاتیاں لگتی ہیں
بھاری پلکوں میں نظر ذرا اوجھل ہو جاتی ہے
جب بغل گیر ہونے کے بعد ہاتھ ڈھیلے پڑ جاتے ہیں
تب مجھے مکمل تسکین مل جاتی ہے

(آتمارام راؤجی دیش پانڈے نامل)

آسامی

بوہاگی کا بیاہ

سبھی آنند سے چہک اُٹھے ہیں
کیونکہ آج بوہاگی کا بیاہ ہے
خوبصورت دوشیزہ قدرت کی لاڈلی کا بیاہ

جب بھونرے نے
خبر گوسجائی
درخت اور بیلیں
جھوم اُٹھیں

شالؔ[1] مل۔ پلاشؔ[2]، اشوکؔ[3] اور سنڈارؔ[4] نے
پُرانے لباس اُتار ڈالے
اور اپنے کو سجا لیا
رنگ برنگے کپڑوں سے

چندن میں بس کر آنے والی ہوا ——— وہ خوشبو لانے والی
چین سے نہیں بیٹھتی
زرِ گل چھڑک رہی ہے
اپنی مہکوں کی پٹاری سے

جواہرات سے جڑی ہوئی چاندنی تنی ہے
آکاش میں
نیچے دھرتی ماتا ہری قالین
بچھا رہی ہے

صبح کی دیوی نے
سندور سے مانگ بھر لی
دولہن کے حسین اور ملائم گالوں کو رنگ دیا
الگ الگ پھولوں کی خوبصورتی سے

بسنت کے روپ میں کام دیو آ رہا ہے
دولہا بن کر
پریم کی متعدد آوازیں
ماحول میں گونج رہی ہیں

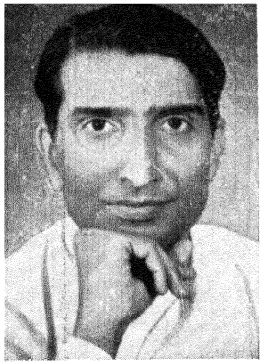
نئے انکُر اپنے پتّوں کے پنکھے جھل رہے ہیں
اور کوئل کو شادی کے گیت کی
دعوت دے رہے ہیں

چاروں طرف مسرّت لہرا رہی ہے
کائنات کے ذرّے ذرّے میں
زندگی کے سنسار میں
ماتا کے سنسار میں

(رگوناتھ چودھری)

---

[1] [2] [3] [4] درختوں کے نام ہیں



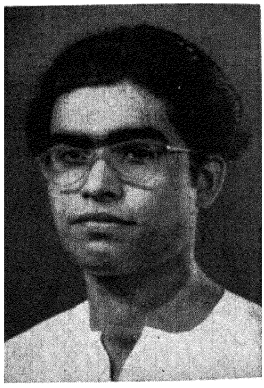
راجيندر شاه (گجراتي)



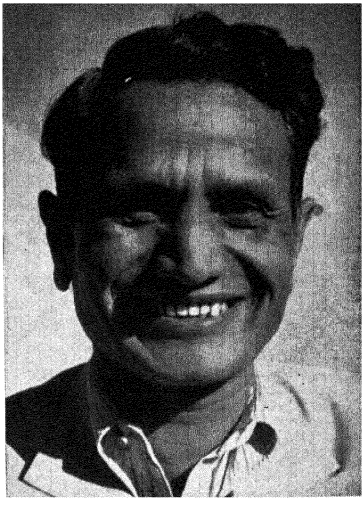
ديوولپلي كرشنا شاستري (تلگو)



آدوي باپي راجو (تلگو)



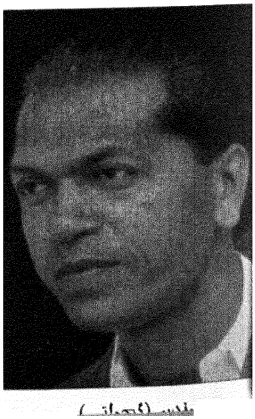
پريه كانت منيار (گجراتي)

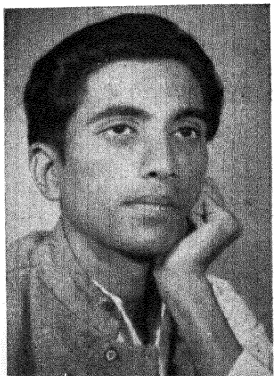


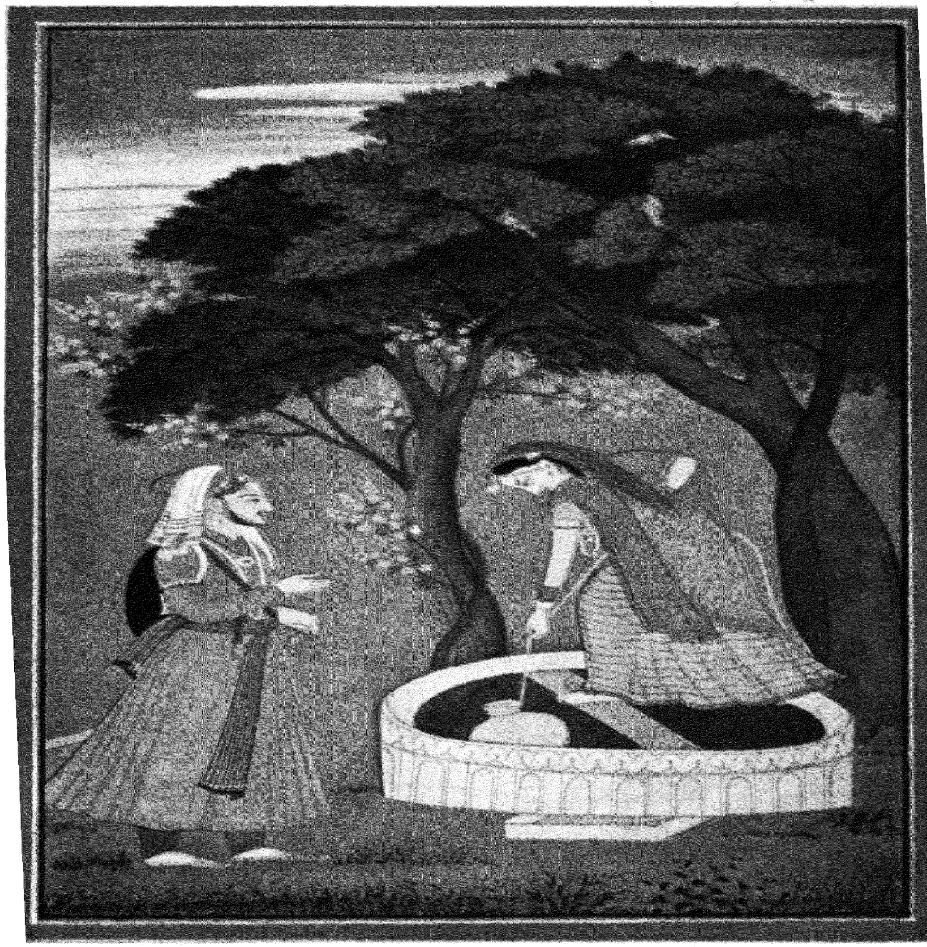
انل (مراٹھی)
فوٹو :- ديويندر ستيارتهي (كاپي رائٹ)



جويير چند مهگهاني (گجراتي)







راک دمبھ

(راجپوت نقاشي کا ایک آور نمونہ)

یہ تصویر راجپوت نقاشي کے ایک جانے پہچانے موضوع کو پیش کر رہی ہے - اس موضوع سے مغلوں کو بھي دلچسپي تھي کیونکہ اس میں محلوں کي چار دیواري میں بسنے والي مغل زندگي کي تصویر دیہاتي پس منظر میں پیش کي گئي ہے - دیہاتي لڑکي سے پاني پلانے کي درخواست اُس رومان کي ابتدا ہے جو آئندہ دو زندگیوں پر اثر انداز ہوگا -

ملیالم

اور کچھ نہیں

پیرار ندی کے کن سے کلامنڈل کے مغرب میں
دھوپ سے جھلسے میدان ہیں
کیچڑ کے ڈھیر جہاں تہاں نظر آ رہے تھے
چیتھڑے پیٹے بہت سے کنگال آ پہنچے تھے
یہ لوگ دوسو کے قریب ہوں گے
سامنے کا ویران میدان اُن کے لئے مشترکہ گھر بن گیا
تین چار ہفتے بس یونہی بیت گئے
دن تو کسی طرح درختوں کی چھایا میں لیٹے لیٹے بیت جاتا تھا
رات بھی آ ہی جاتی تھی، جب یہ لوگ ننگی دھرتی پر پڑے پڑے
میلی کچیلی چادروں سے سر نکال کر
بھوک کے مارے بلبلا اٹھتے تھے
"کالی چڑی والے لوگ تمہارا ہی تو سایہ ہیں
اے دولت کے نشے میں چور لوگو!"
کون ہیں یہ لوگ؟ یہ بوڑھے یہ جوان
قحط کے مارے لوگ اپنے اپنے گاؤں چھوڑ کر چلے آ رہے تھے
بھلے ہی انسان نے اپنی ذہانت سے
قدرت کو جیت لیا
پر بلبلا رہے ہیں اُس کے بھائی
ٹھنڈے پانی کے ایک گھونٹ کو
بڑی مشکل سے مائیں دے پاتیں
بھوکے بچوں کو روٹی کا ٹکڑا
پر یوں کہیں بھوک مٹتی ہے، بچے بار بار رو پڑتے
ہم پوچھ رہے ہیں اونچے کلامنڈل سے
اب اور کیا پوچھنا باقی ہے پوچھتے ہیں ہم
"جب تک دنیا میں بھوکے پیٹ باقی ہیں
تب تک تمہاری ایک ہی کلا کیسے آگے جا سکتی ہے؟"

(وَلّ تول)

پنجابی

دُور، بہت دُور

دُور بہت دُور ہم کوئی چیز کھو آئے ہیں
بھلے ہی کوئی غیروں سے پوچھ دیکھتے کہ ہم کتنا کچھ لُٹا آئے ہیں۔

بہت دور ہم نے ایک کھیل رچایا تھا
ابھی اسے شروع ہی تو کیا تھا کہ ہم اسے بیچ میں چھوڑ آئے ہیں

دور بہت دور ہم نے ایک سپنا دیکھا تھا
ہم سپنا ہی دیکھتے رہے اور نیند گنوا آئے ہیں

ہم نے آنکھوں کے کُل آنسو انڈیل کر دو آنکھوں سے پیار کیا تھا
اُنھیں چھوڑنے پر آئے تو ریت پر ہی سوتا چھوڑ آئے

ہمارے کان میں آواز آ رہی ہے کہ کوئی رنگینان میں جل رہا ہے!
یہ ہمارے ہوتے ہمیں کس طرح دھوکہ دے کر اُٹھا لائے:

ہمیں ابھی تک اطمینان نہیں، ہم ابھی تک بھلا نہیں سکے
ہمارا دامن ابھی تک پاک ہے اور ہمیں بار بار یاد دلا رہا ہے۔

(کرتار سنگھ دھل)

لے پنجوں کی قوم کے لوگ جو اُسے اُس کی محبوبہ ستی کو ریت پر سوتا چھوڑ کر اُٹھا لے گئے تھے۔

کشمیری

بہار آگئی پیار سے پھر مٹکتی

محبت میں مٹکتی ہوئی پھر بہار آگئی
چمن میں گلوں اور بلبلوں کی عزت افزائی کرتی
بہار آگئی اونچ نیچ میں، جنگل اور کہسار میں حیات کی فراوانی
بانٹتی ہوئی
نئی تمناؤں کو جوبن کے بھید سناتی اور مستی کے گیت گر پلاتی

بہار آگئی جھرنوں، سوتوں اور چشموں کے اندر نوجوانی کو نئے
سُر میں پکارتی، نیا سوز سناتی۔
نئے انداز سے کومل پاؤں دھرتی ہوئی

بہار آگئی صبا پر سوار ہو کر، بڑے چاؤ سے حُسن کو دُلارتی ہوئی،
ناز و ادا سے کشتیوں میں سیر کرتی ہوئی
بلوروں سے کھیلتی ہوئی آج بہار آگئی پیار سے پھر مٹکتی

بہار آگئی اک نیا جوش لے کر۔ ہوش کے باغوں میں
بہار آگئی نئے بول سناتی ہوئی محبت کے جھروکوں پر بیٹھ کر، اُداسی
کے جالوں کو ہٹاتی ہوئی
بہار آگئی آج پھر غم مٹا، نور جھلکا خوشی کا
زیر و بم حرکت میں آگیا، خوشی کی آگ جگمگانے لگی

بہار آگئی، دل 'بادام واری' (بادام کے شگوفے کا جشن منانے)
چل دیے۔
نشاط کے خیال نے شوق کی گرہیں کھول دیں
'ڈل' لہریں مارنے لگا، 'شالہ مار' کے انتظار میں حُسن اپنی شیریں
مستی لے چل اٹھا

اور ساون، آنکھ بچائے، اٹکھیلیاں کرتا ہوا 'چشمۂ شاہی'
کی سمت جا لپکا

آج پربتوں نے نئے لباس پہنے ہیں، آسمان پر نئی زندگی کی نئی نیلا
نکھار اٹھی ہے
آج کشمیر کی نس نس میں نئی زندگی کا لہو رواں دواں ہے
اس لئے آج شاعر نئے ساغروں سے زندگی کا نیا رس پیے جا رہا ہے۔
اس لئے آج راہی زندگی کے نت نئے ترانے گا اٹھا ہے! ۔۔۔۔۔

(ایک لمبی نظم سے)

(راہی)

اُڑیا

غریبی

اے غریبی تو نے میرے سر پہ کانٹوں کا تاج رکھا ہے
تن پہ کانٹوں کا زرہ بکتر پہنایا ہے
عیسیٰ کی طرح ہُو بہُو ان جسم لئے
بڑے جوش سے میں آگے بڑھوں گا
اے بے درد غریبی تو مجھے زہر دیتی ہے
جسے آج دنیا میں کوئی بھی پینا نہیں چاہتا
پھر بھی نیلی کنٹھ شِو کے مانند
آج میں اسے بے جھجک پی جاؤں گا
اے شکنجے میں کسنے والی غریبی
تو مجھے خوفناک ایذائیں پہنچا رہی ہے
میری جوانی بھی چُرا لیتی ہے
لیکن میں پُروے مانند جوانی کی امٹ خوشی میں
اپنے تن میں تکلیفوں کو جھیل لوں گا
ہونٹوں پر مسکان لا کر جسم میں طاقت لا کر
میں زندگی کی لڑائی میں کامیاب ہوں گا

(رادھا موہن گڈنائک)

نئی کتابیں اور رسالے

تنقید اور عملی تنقید۔ سید احتشام حسین کے تنقیدی اور ادبی مضامین کا یہ چوتھا مجموعہ آزاد کتاب گھر کلاں محل دہلی سے شائع ہوا ہے۔ ضخامت ۲۸۰ صفحے تقطیع ۲۰×۳۰/۱۶ کتابت، طباعت، کاغذ عمدہ۔ کتاب مجلد ہے اور مجلد پشت سے آرام" ہے قیمت تین روپے بارہ آنے فی جلد۔ احتشام حسین اب اردو تنقید کے امام مانے جاتے ہیں۔ زیر تبصرہ کتاب میں ان کے پندرہ مضامین شامل ہیں جو اس سے قبل رسائل میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ چنانچہ "ادب میں طنز کی جگہ"، اور "پریم چند کی ترقی پسندی خود آج کل ہی میں چھپ چکے ہیں۔ "غالب کا تفکر" غالبیات میں ایک اضافہ ہے "سودا جعفری دور مان سے انقلاب تک" ایک اچھا جائزہ ہے۔ اس مجموعے میں نظریاتی مباحث پر زیادہ مضامین نہیں لیکن مصنف کے قول کے مطابق اس کا مطلب یہ نہیں کہ ان کی نگاہ میں نظریاتی مباحث کی اہمیت کم ہو گئی ہے صحیح اور سائنٹیفک اصول نقد پر یہ مضامین پورے اترتے ہیں۔ یہ امر باعث اطمینان ہے کہ مصنف کے قیمتی مضامین جو ادھر ادھر منتشر پڑے تھے یکجا ہو گئے۔

نقد اقبال از میکش اکبر آبادی ضخامت ۳۱۶ صفحے تقطیع ۲۰×۳۰/۱۶ کاغذ کتابت طباعت عمدہ ملنے کا پتہ میکش اکبر آبادی میوہ کٹرہ آگرہ یا حکیم مرزا احسان علی بیگ صاحب نزد نگاری بازار راولپنڈی۔ قیمت تین روپے

حضرت میکش اکبر آبادی جنہیں ان کے ملنے والے قبلہ شاہ صاحب کے نام سے پکارتے ہیں بلکہ بعض اوقات علمی تنخی طب کی ضرورت ہو تو "وحدت الوجودیے صاحب" کے نام سے بھی انھیں یاد کرتے ہیں بڑے دلچسپ انسان ہیں۔ ان تمام دلچسپیوں سے قطع نظر آپ کا ذوق شعر بہت پاکیزہ اور فلسفے کا مطالعہ بہت گہرا ہے۔ یہ علمی کتاب بڑی محنت اور برسوں کے مطالعے کے بعد آپ نے پیش کی ہے۔ چنانچہ وہ خود لکھتے ہیں۔

"مطالعے کے دوران میں مجھے محسوس ہوا کہ اقبال کے تبصرہ نگاروں اور شارحین میں باہم شرح و تفسیر کا جو اختلاف ہے اس کا سرچشمہ علامہ ہی کا کلام ہے۔ میں نے مناسب سمجھا کہ اس مشکل کو ملک کے سامنے پیش کروں۔ کیونکہ ابھی ایسے اہم مسائل موجود ہیں جنہیں علامہ سے بے واسطہ استفادہ حاصل کرنے کا موقع ملا ہے۔ میں نے اپنے شکوک رسالہ "آج کل" دہلی کی وساطت سے ظاہر کئے ہیں۔ (آج کل۔ یکم فروری، ۱۵ فروری یکم اپریل۔ ۱۵ مئی۔ ۱۵ جون۔ ۱۵ ستمبر، یکم اکتوبر ۱۹۴۶ء) میرے شکوک کا جواب ڈاکٹر تاثیر اور بعض دوسرے احباب نے دے کر مجھے ممنون کیا۔ اگرچہ مجھے ان جوابات سے تسکین نہ ہوئی۔ مگر میرا دل اس پر بھی آمادہ نہ ہو سکا کہ علامہ اقبال کے خیالات میں اتنا صریح تضاد تسلیم کر لیا جائے اور آخر میں نے خود ہی اس مشکل کو حل کرنے کی ہمت کی۔ دوران مطالعہ علامہ کے بعض مکتوبات سے مجھے علامہ کی اس خواہش کا علم بھی ہوا کہ اسلامی تصوف میں غیر اسلامی تصوف کی آمیزش تلاش کی جانی چاہیئے۔ یہ تصنیف میری اور علامہ کی ان خواہشات و مقاصد کی تکمیل کی عملی شکل ہے۔"

اس علمی کتاب میں وحدۃ الوجود، مادہ اور کائنات، تناسخ، خودی، نظریہ ارتقا اور رہبانیات وغیرہ موضوعات پر تفصیل سے فلسفیانہ بحث کی گئی ہے لطف یہ ہے کہ اقبال، محمود شبستری، بو علی قلندر کے مطالعے کے ساتھ ابن عربی اور شنکر کے نظریات کا بھی آپ نے بہ نظر غائر مطالعہ فرمایا ہے اور اس علاوہ مغرب کے فلسفیوں، اسپنوزا وغیرہ کے نظریات کو پڑھنے کی طرح

پڑھا ہے۔ اس کتاب میں ان سب کے حوالوں سے انھیں کے اصول و نظائر پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ اپ نی شد، شنکر کا ویدانت، مایا اور اس کا سبب کرم اور آواگون، گیتا، بدھ مت کے عنوانات سے جو باب اس کتاب میں ہیں وہ مصنف کی تصوف پسندی اور اس کے ساتھ ساتھ فلسفی مزاج کی شہادت دیتے ہیں یہ کتاب علمی ذوق رکھنے والوں کے لئے ایک بے بہا تحفہ ہے اور اس دور میں جب کہ ہر لہو الہوس اہل نظر کا مقابل ہے ایسی کتاب کا شائع ہونا غنیمت ہے شاہ صاحب قبلہ کا زید خشک اس کتاب کو دلچسپ بنانے میں معاون ہوا ہے۔ کیونکہ موضوع کچھ ایسا ہی تھا جسے کوئی نام نہاد ادیب ہی نیا بتا۔

دستِ صبا فیض احمد فیض کے کلام کا مجموعہ۔ آزاد کتاب گھر محلاں محل دہلی ۶۔ قیمت ۲ روپے ۴ آنے فی جلد۔ کتابت طباعت۔ کاغذ عمدہ۔ جلد، جلد پوش تسلی بخش۔

جدید اردو شاعری کے حالیہ معماروں میں فیض اور راشد کا نام عام طور پر لیا جاتا ہے "نقشِ فریادی" چھپی تو فیض کی شاعری کا چرچا اور زور سے ہوا۔ آج کل وہ زندان کی صعوبتیں برداشت کر رہے ہیں حقیقت یہ ہے کہ فیض کو جتنا اُس کا حق ہے اس سے بہت زیادہ ملا ہے فیض اپنی رومانی اُفتادِ طبع کے باوجود چار و ناچار سیاست کا شکار ہو گئے۔ چنانچہ دستِ صبا میں وہ ہر جگہ اپنے زندانی ہونے کا ثبوت پیش کرتے ہیں۔

انصاف ہے کہ حکمِ عقوبت سے پیشتر — اک بار سوئے دامنِ یوسف تو دیکھیے

یاں جرم و داد دیکھیے کس پہ ہو ثابت — وہ سارے خطا کار سرِ دار کھڑے ہیں

یہی جنوں کا یہی طوق و دار کا موسم — یہی ہے جبر یہی اختیار کا موسم

جنھیں خبر تھی کہ شرطِ نوا گری کیا ہے — وہ خوش نوا کہ قید و بند کیا کرتے

اور یہ سب کچھ اس لئے کہ ان کے نزدیک حیاتِ انسانی کی اجتماعی جد و جہد کا ادراک اور اس جد و جہد میں حسبِ توفیق شرکت زندگی کا تقاضا ہی نہیں فن کا بھی تقاضا ہے۔ اس کتاب میں فیض کی بعض نظمیں بہت اچھی ہیں اور بعض بہت کمزور۔ زبان و بیان کے جھول اکثر کھٹکتے ہیں۔

بشرطِ فرصت کسی آئندہ شمارے میں اس پر بحث کی جائے گی۔

مصنف عبداللطیف اعظمی بی اے جامعہ۔

شبلی کا مرتبہ اُردو ادب میں ملنے کا پتہ مصنف۔ جامعہ نگر دہلی۔ قیمت تین روپے فی جلد۔ کاغذ اور کتابت عمدہ۔ طباعت، دیدہ زیب۔ کتاب مجلد ہے۔

ڈاکٹر سید عابد حسین نے پیش لفظ میں لکھا ہے کہ اعظمی صاحب شبلی کے بے لاگ نقاد ہی نہیں، بلکہ پُر جوش معترف ہیں۔ اس لئے اگر شبلی اور اُن کے معاصرین میں مقابلہ کرتے وقت اُن کی تحریریں وکالت کی جھلک نظر آئے تو وہ معذور ہیں۔ پھر بھی کتاب اپنے موضوع اور لکھنے والے کے خلوص کی وجہ سے دلچسپی اور افادے سے خالی نہیں ہے" کتاب کے آخر میں ایک مفید انڈکس بھی ہے۔ کتاب میں جگہ جگہ دلچسپ حوالے ملتے ہیں جن سے شبلی کی شخصیت اور اُس کا اردو میں مرتبہ نمایاں ہوتا ہے۔

ظ۔ انصاری صاحب کے وَرق وَرق نثری ٹکڑوں کا یہ

ورق ورق مجموعہ رائٹرس اکاڈیمی ۵۹ محمد علی روڈ بمبئی ۳ نے شائع کیا ہے ضخامت ۲۰×۳۰/۱۶ کے ۱۸۴ صفحے۔ قیمت کتاب پر درج نہیں۔ یہ نثری اوراق بڑے دلچسپ ہیں۔ اکثر قاری کو ٹوکنا پڑتا ہے اور بعض اوقات کسی سطر کا عطا کردہ فکریہ لمحہ نشاطِ روح کا خالق بھی ہوتا ہے۔ ان میں فسانویت بھی ہے۔ ڈرامائی انداز بھی۔ شعریت بھی ہے اور طنز بھی۔

رام کرشن مضطر جو غرفِ عام میں مضطر لکھنوی کے

حیات و کائنات نام سے مشہور ہیں اس مجموعۂ کلام کے خالق ہیں۔ کتاب کا نام اتنا بر محل ہے کہ حیات، اور کائنات، بیشتر اوراق پر نفسِ نفیس جلوہ فرما ہیں۔ قریب قریب ۱۳۰ بار حیات اور ۶۰ بار کائنات کا لفظ اس مجموعے میں آپ کو ملے گا۔ کتاب ۲۰×۳۰/۱۶ کے ۲۱۰ صفحوں پر مشتمل ہے۔ قیمت کتاب پر کہیں درج نہیں — پیش لفظ جوش ملیح آبادی نے لکھا ہے مضطر خوش گو شاعر ہیں۔ غزل، نظم۔ رباعی وغیرہ سبھی کچھ آپ کہتے ہیں۔ دو شعر ملاحظہ فرمائیے۔

اگرچہ ترکِ ملاقات کو زمانہ ہوا — تو اب بھی میرے تصور میں رقص کرتی ہے
ترے جمال کی دوشیزگی درخشانی — مری اُداس نگاہوں میں رنگ بھرتی ہے

ہمیں اُمید ہے کہ یہ مجموعہ مضطر صاحب کے آئندہ کئی مجموعوں کا

مقدمہ انجمن ادب شعر و ادب سے دلچسپی رکھنے والوں میں مقبول ہوگا۔

شعرستان تذکرہ شعرائے پاکستان۔ مرتبہ نعمان تاثیر، مظہر صدیقی۔ ملنے کا پتہ مکتبۂ پرچم حسن علی آفندی روڈ کراچی۔ کتاب ۲۲×۳۶/۱۶ کے ۴۱۶ صفحوں پر مشتمل ہے۔ کاغذ کتاب گوارا۔ جلد دیدہ زیب۔ قیمت تین روپے آٹھ آنے۔ تذکرے میں ۲۲۵ چھوٹے بڑے شعراء کے حالات اور نمونۂ کلام درج ہے بیشتر کی تصاویر بھی شاملِ اشاعت ہیں۔

زلفوں کے سائے میں ایک جینی ناولٹ کا ترجمہ از ظ۔ انصاری۔ ناشر مکتبۂ شاہراہ دہلی۔ قیمت عہ فی جلد یہ ناولٹ ۱۹۵۱ء کے آخر میں پیکنگ سے شائع ہوا تھا

It Happened At Willow Castle

دیا بجھ گیا مصنف کرتار سنگھ دُگل۔ ناشر مکتبۂ شاہراہ دہلی قیمت عہ کتابت، طباعت وغیرہ عمدہ۔

بخشی غلام محمد نائب وزیر اعظم حکومت جموں و کشمیر نے پیش لفظ میں اس ڈرامے کے پس منظر اور ماحول پر روشنی ڈالی ہے۔ دُگل کے افسانے اور ڈرامے معیاری ہوتے ہیں۔ ان میں زندگی اور اس سے متعلق مسائل کا ذکر کچھ ایسے انداز میں ملتا ہے کہ کہانی میں کسی قسم کے تصنع کا شک نہیں ہونے پاتا۔ کشمیری زندگی کا یہ آئینہ بھی اپنے اندر فن کاری کی جلائے ہوئے ہے۔

شعری ادب ۱۹۵۱ء مطبوعہ قصر اردو، اردو بازار دہلی۔ انتخاب کرنے والے۔ فکر تونسوی۔ نریش کمار شاد ظفر ادیب۔ غنیمت ہے کہ ۱۹۵۱ء کا شعری ادب ۱۹۵۳ء میں شائع ہوگیا۔ کاغذ، کتابت، طباعت اوسط درجے کی ہے نظمیں اور غزلیں جو اس انتخاب میں شامل ہیں بیشتر معیاری ہیں۔ انتخاب کرتے وقت کسی خاص طبقے یا گروہ کو اُچھالنے کی کوشش نہیں کی گئی اور یہ بات اس زمانے میں بہت ہی غنیمت ہے۔ قیمت ایک روپیہ چار آنے۔

تحفۂ حسن منظوم کہانیاں از مولانا احسن مارہروی مرحوم اس کتاب میں چھوٹے بچوں اور بچیوں کے لئے مشہور اور روزمرہ کی کہاوتوں اور مثلوں کو اخلاقی پیرائے میں نظم کرکے اُن کے استعمال کا موقع بتایا گیا ہے۔ قیمت ۱۲ ملنے کا پتہ۔ کاشانۂ اردو ۱۸۸۔ پی۔ پاکستان ہاؤسنگ سوسائٹی۔ کراچی ۵

سُرخ ستارے از خواجہ مبارک الدین ادیب۔ مطبوعہ مکتبۂ پرچم کراچی قیمت دو روپے۔ اس کتاب میں ادیب کے ۱۳ افسانے شامل ہیں۔ کتاب حُسنِ ظاہر کے لحاظ سے قابلِ قدر ہے حُسنِ باطن ان افسانوں کو پڑھ کر قاری پر خود روشن ہو جائے گا۔

رسالے

دلّی کالج اُردو میگزین مرتبہ، خواجہ احمد فاروقی و گوپی چند نارنگ خواجہ احمد فاروقی صدر شعبۂ اردو دلّی کالج

قدیم دلّی کالج نمبر کے نام سے کون اردو دوست واقف نہیں۔ یہ نمبر اُن کے پاکیزہ ذوقِ ادب، تجسس و تفحص اور محنتِ شاقہ کا آئینہ دار ہے۔ اس میں قدیم دلّی کالج سے متعلق بڑے گرامی قدر اور سیر حاصل مضامین شامل ہیں جن سے نہ صرف کالج کی تاریخ پر روشنی پڑتی ہے بلکہ اردو زبان و ادب اور اُس کے مشاہیر مثلاً ڈاکٹر نذیر احمد۔ خواجہ الطاف حسین حالی۔ مولوی ذکاء اللہ۔ مولوی امام بخش صہبائی۔ ماسٹر پیارے لال آشوب اور ماسٹر رام چندر کے متعلق مفید معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ ادارہ اس ادبی تخلیق کے لئے مبارک باد کا مستحق ہے۔

اعتمادیہ اینگلو عربک ہائر سکنڈری اسکول دہلی کا سالانہ میگزین۔ مرتبہ مہدی عباس حسینی و غلام احمد فرقت۔ ضخامت ۱۰۴ صفحات۔ اس رسالے میں انگریزی، اردو اور ہندی تینوں زبانوں کے مضامین شامل ہیں۔ مضامین، تصاویر اور گٹ اپ کی دیدہ زیبی کے لئے مرتبین لائقِ تحسین ہیں۔ انگریزی میں مرزا محمود بیگ پرنسپل دلّی کالج اور مہدی عباس حسینی کے مضامین اور اردو میں غلام احمد فرقت کا مضمون اور شمیم کرہانی کی نظمیں قابلِ داد ہیں۔

مجلّۂ عثمانیہ عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد دکن کے طلبا کا اردو شمارہ جسے ابوالفضل سیّد محمود قادری اور ظفر عالم گیر نے مرتب کیا ہے۔ اس رسالے کو پروفیسر عبدالقادر سروری کے علم و بصیرت

اور ماہرِ نقد کی سرپرستی حاصل ہے۔ لہٰذا اس کے مضامین میں نہ صرف تنوع اور افادیت پائی جاتی ہے بلکہ صحیح ذوقِ تخلیق و تنقید کی آئینہ داری بھی ہے۔ آخر میں ڈاکٹر عبدالقادر سروری کا ایک سیر حاصل مضمون ہے جس میں مجلۂ عثمانیہ کی اردو خدمات کا تذکرہ ہے اور اس مجلے کے مختلف شماروں میں چھپنے والے اہم مضامین کی ایک فہرست بھی شامل ہے۔ رسالے کا حسنِ طباعت اور کتابت اپنی دیرینہ روایات کا حامل ہے۔

شعلہ و شبنم آغا شاعر نمبر مرتبہ گوپی ناتھ امن دہلوی۔ اس شمارے کا پہلا حصہ مستند اہلِ قلم اور شعراء مثلاً علامہ کیفی دہلوی۔ خواجہ حسن نظامی۔ جوش ملیح آبادی۔ نیاز فتحپوری اور جوش ملسیانی کے ذاتی تاثرات کا آئینہ دار ہے۔ اس کے علاوہ وقارِ عظیم اور گوری شنکر لال کے تنقیدی مضامین شامل ہیں۔ آخر میں آغا شاعر کے کلام اور مضامین کا ایک انتخاب شامل ہے۔ یہ شمارہ آغا شاعر کے متعلق بہت ہی قیمتی اور مجموعہ معلومات کا حامل ہے۔

ولیو تاگر (ہندی) ہندی پارلیمنٹ کے ہندی پبلیشنز کا یہ رسالہ جسے ڈاکٹر نگیندر اور شری واتسیان نے ترتیب دیا ہے۔ ہندی کو دوسری ہندوستانی زبانوں سے نزدیک لانے اور روشناس کرانے کی ایک مستحسن کوشش ہے۔ بارہ علاقائی زبانوں کے مستند ادیب جن میں جوش ملیح آبادی بھی شامل ہیں اس رسالے کے مشیر ہیں۔ جس میں دوسری زبانوں کے مضامین اور نظمیں ہندی رسم الخط میں چھاپی جاتی ہیں۔ حسنِ ظاہر کے لحاظ سے رسالے کا معیار اعلیٰ ہے

چندہ سالانہ چھ روپے۔ ملنے کا پتہ۔ آتما رام اینڈ سنز کشمیری گیٹ دہلی

تحریک پبلشرز نیشنل اکاڈیمی۔ ۹ انصاری مارکیٹ دریا گنج دہلی۔ چندہ سالانہ چار روپے۔ مدیر۔ گوپال متل

گوپال متل ایک تجربہ کار جرنلسٹ، خوش گو شاعر اور ذہین ادیب ہیں، رسالے کا ادبی معیار قابلِ اطمینان ہے۔ ادب و سیاست میں نزاعی موضوعات پر مدیر رسالہ خود بھی بے جھجک لکھتے ہیں، اور دوسروں کے مضامین بھی شائع ہوتے ہیں۔ کہیں کہیں بحث و تمحیص کا نشتر تیز ہو جاتا ہے، اور لہجے میں اعتدال کی کمی محسوس ہوتی ہے۔ اگر یہی دو رسالے ہو جائیں تو رسالہ اپنے رنگ کا واحد اچھا رسالہ ہو جائے۔ چار شمارے اس رسالے کے شائع ہو چکے ہیں۔ اور ابھی تک تو یہ باقاعدگی سے شائع ہو رہا ہے کاغذ، کتابت اور طباعت اچھی ہے۔

موصولات

۱۔ نشیمن کلکتہ مدیر ظہیر ہاشمی۔ ملنے کا پتہ۔ اردو سوسائٹی مٹیا برج۔ کلکتہ

۲۔ صبح نو۔ پورنیا مدیر وفا ملک پوری۔ سالانہ چندہ چھ روپیہ ملنے کا پتہ۔ کاشانہ وفا، پورنیا سٹی۔ بہار

۳۔ درویش۔ لاہور مدیر۔ صوفی وارثی دہلوی ملنے کا پتہ۔ وارث کدہ۔ ڈی۔ اے وی ہوسٹل۔ لوئر مال لاہور۔ چندہ سالانہ چار روپے آٹھ آنے

معلومات و اعداد

۱۔ بھارت نے کولمبو پلان کے تحت اسّی لاکھ پونڈ کی ٹیکنیکل کو آپریشن اسکیم میں ساڑھے سات لاکھ پونڈ یا تقریباً ایک کروڑ روپیہ دیا ہے۔

۲۔ بھارت کی کل آبادی میں سے ۹ کروڑ ساٹھ لاکھ کی آبادی عام راشن بندی میں شامل ہے۔ اس تعداد میں سے دو کروڑ اسّی لاکھ افراد باضابطہ راشن بندی کے تحت ہیں جو ۲۵ شہروں میں رائج ہے۔

۳۔ ۱۹۵۲ء تک بھارت کا ڈاک اور تار کا محکمہ پندرہ لاکھ میل لمبے وائر کنڈکٹر استعمال کر رہا تھا جو کرۂ ارض کے اردگرد ساٹھ مرتبہ لپیٹے جا سکتے ہیں۔

۴۔ ۱۹۵۲ء میں بھارت سرکار کے ملازمین کی طرف سے جنرل پراویڈنٹ فنڈ میں جمع کردہ محبوعی رقم چار کروڑ ۳۰ لاکھ روپیہ ہے۔

۵۔ چترنجن میں انجن سازی کے کارخانے میں انجن بنانے پر ۱۹۵۱ء میں ایک کروڑ تیس لاکھ روپیہ اور ۱۹۵۲ء میں دو کروڑ ۶۰ لاکھ روپیہ خرچ ہوا۔

رفتارِ زمانہ

لنڈن میں شری نہرو کی تقریر

لنڈن میں انڈیا لیگ کے زیر اہتمام ایک جلسے میں تقریر کرتے ہوئے بھارت کے پردھان منتری شری جواہر لال نہرو نے کہا کہ اب دنیا کو یہ بات ذہن نشین رکھنی چاہیئے کہ ایشیا میں ایک نئی طاقت اور امنگ پیدا ہو رہی ہے جسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ دوسری اقوام کو چاہیئے کہ وہ اس تبدیلی کو محسوس کریں اور ایشیا کے ساتھ اپنے پچھلے رویّے کو بدلیں۔ وہ اگر ایشیائی قوموں کے ساتھ دوستانہ تعلقات قائم نہیں رکھ سکتیں تو کم از کم اپنا رویّہ مخالفانہ نہ رکھیں۔ چین کا ذکر کرتے ہوئے نہرو جی نے کہا کہ ایک متحدہ اور مستحکم چین کا وجود میں آنا موجودہ زمانے کے اہم ترین واقعات میں سے ہے جس کے اثرات کو کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ آپ نے مزید کہا کہ کمیونزم کو نظر انداز کیا جا سکتا ہے لیکن چین کی متحد اور مستحکم حیثیت کے وجود سے انکار فضول ہے کیوں کہ کسی کے انکار سے اس کا وجود ختم نہیں ہو جاتا۔ پس ماندہ قوموں کو مشورہ دیتے ہوئے نہرو جی نے کہا کہ اپنی جنگ آزادی میں وہ مہاتما گاندھی کے تجربات سے فائدہ اٹھائیں۔ گاندھی جی کے طریقوں کو اپنانا نہ صرف مخالف کے مقابلے کے لئے مفید ہے بلکہ خود کو اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے میں بھی مدد دیتا ہے ٹیلی ویژن پر انٹرویو دیتے ہوئے نہرو جی نے کہا کہ بھارت کو اندرونی طور پر کمیونزم سے کوئی خطرہ نہیں۔ آپ نے یہ بھی کہا کہ چار بڑوں کی ملاقات کے لئے یہ وقت نہایت موزوں ہے۔

بھارت میں خوراک کی تسلی بخش حالت

بھارت کے وزیر خوراک شری رفیع احمد قدوائی نے کلکتے میں ایک انٹرویو کے دوران میں بتایا کہ اس سال بھارت میں چاول کی حالت اس حد تک قابل اطمینان اور تسلی بخش ہے کہ ہمیں تھائی لینڈ اور چین کی چاول مہیا کرنے کی پیش کش کو شکریے کے ساتھ واپس کرنا پڑا۔ آپ نے کہا کہ اس سال بھارت کو کسی ملک سے چاول درآمد کرنے کی ضرورت نہیں اور تقریباً یہی بات آئندہ سال کے بارے میں کہی جا سکتی ہے۔ قدوائی صاحب نے یہ بھی بتایا کہ اس سال ہم نے صرف ڈیڑھ لاکھ ٹن چاول درآمد کیا جب کہ گزشتہ برس ہم کو آٹھ لاکھ ٹن چاول باہر سے منگوانا پڑا تھا۔

شیخ عبداللہ کی تقریر

ریاست جموں و کشمیر کے وزیر اعظم شیخ محمد عبداللہ نے ریاستی فوج کے ایک یونٹ کو خطاب کرتے ہوئے کہا کہ اگر آج تھکی ہاری دنیا کو اُمید کی کوئی کرن دکھائی دے رہی ہے تو اس کی بڑی وجہ بھارت کی وہ کوششیں ہیں جو اس نے اپنے پردھان منتری کی رہنمائی میں کی ہیں۔ آپ نے کہا کہ بھارت نے اپنی خارجی اور داخلی پالیسی کی تعمیر میں گاندھی جی کی تعلیمات کو پیش نظر رکھا ہے اور اسی وجہ سے بھارت ایک اونچے درجے پر پہنچ گیا ہے۔ عید کے موقعہ پر ایک بھاری اجتماع کے سامنے تقریر کرتے ہوئے شیخ صاحب نے کہا کہ کشمیر کے عوام کی مرضی کے بغیر کشمیر کے متعلق کوئی فیصلہ نہیں کیا جا سکتا۔ کشمیر کے چالیس لاکھ باشندے بھیڑ بکریاں نہیں ہیں جن کو فروخت کیا جا سکے۔ آپ نے یہ بھی کہا کہ ہماری مرضی کے بغیر ریاست کو تقسیم بھی نہیں کیا جا سکتا۔ شری جواہر لال نہرو کی جمہوریت پسندی کی تعریف کرتے ہوئے شیخ صاحب نے کہا کہ ہمیں ان پر پورا بھروسہ ہے اور وہ ہماری مرضی کے بغیر کوئی بھی فیصلہ نہیں کریں گے۔

بھارت اور پاکستان میں دوستانہ تعلقات

پاکستان میں بھارت کے ہائی کمشنر ڈاکٹر موہن سہنانے کو کئی میں نمائندہ اخبار کو ایک انٹرویو دیتے ہوئے کہا کہ اقلیتوں کو ہمیشہ اس ملک کی ترقی اور خوش حالی کے لئے کوشاں رہنا چاہیئے جس سے ان کا تعلق ہو اور جہاں ان کو حقوق شہریت حاصل ہوں۔ پاکستان کی اقلیتوں کو مشورہ دیتے ہوئے ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ انہیں اپنے ملک کی ترقی کا ہمیشہ خیال رکھنا چاہیئے۔ انٹرویو کے دوران میں ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ بھارت اور پاکستان میں بہت جلد دوستانہ تعلقات قائم ہو جائیں گے۔

مصر میں جمہوریت

مصر میں شہنشاہیت کا مکمل طور پر خاتمہ ہو گیا ہے اور اسے ایک ری پبلک قرار دیا گیا ہے۔ جنرل نجیب اس کے پہلے صدر اور وزیر اعظم مقرر ہوئے ہیں اور جلد ہی مصر بھر میں نئے انتخابات کرائے جائیں گے۔

مشرقی جرمنی میں گڑبڑ

روسی مقبوضہ برلن میں مزدوروں اور روسی فوج کے درمیان تصادم میں روسی سپاہیوں کی گولی سے دو اشخاص ہلاک اور کئی زخمی ہوئے۔ ہڑتالیوں نے پولیس پر پتھراؤ کیا اور سرکاری عمارتوں کی کھڑکیاں توڑ ڈالیں۔ مشرقی برلن کے روسی کمانڈر نے مارشل لا کا اعلان کرتے ہوئے تمام جلسے جلوسوں اور مظاہروں یا تین اشخاص کے ایک جگہ جمع ہونے کی ممانعت کر دی ہے۔

صلح کی راہ میں سنگمین ری کی رکاوٹ

سیول کے فوجی اور سیاسی حلقوں کا خیال ہے کہ جنوبی کوریا کے صدر سنگ مین ری نے کمیونسٹ دشمن جنگی قیدیوں کو رہا کر کے عارضی صلح کے راستے میں ایک بہت بڑی رکاوٹ حائل کر دی ہے اور اس امر کا زبردست خطرہ ہے کہ تمام محاذوں پر کہیں از سر نو جنگ نہ شروع ہو جائے۔ اس سلسلے میں اگر کوئی زبردست اقدام نہ کیا گیا تو صورت حال نازک ہو جائے گی۔

بھارت اور لنکا میں بات چیت

بھارتیوں کے حقوق شہریت کے متعلق بھارت اور لنکا کے درمیان جو گفتگو جاری ہے وہ ابھی ختم نہیں ہوئی۔ دونوں حکومتوں کے نمائندے بہت جلد پھر باہمی بات چیت کر کے کسی فیصلے پر پہنچنے کی کوشش کریں گے۔ واضح رہے کہ اس سلسلے میں بھارت اور لنکا کے وزرائے اعظم کی لنڈن میں دو کانفرنسیں ہو چکی ہیں۔

پنج سالہ پلان کی نمایاں کامیابی

پنج سالہ پلان کے پہلے دو سال میں صنعت کے سرکاری اور غیر سرکاری شعبوں میں نمایاں ترقی ہوئی ہے۔ غیر سرکاری شعبے میں سوتی کپڑے کی صنعت سیمنٹ، فولاد اور لوہے کی صنعت کے علاوہ متعدد اہم اسکیموں پر بھی عملدرآمد ہوا ہے جن میں انڈین آئرن اینڈ اسٹیل کمپنی لمیٹڈ اور ٹاٹا آئرن اینڈ اسٹیل کمپنی لمیٹڈ کی پیداواری صلاحیتوں میں توسیع، المونیم اور سوڈا ایش کی پیداوار میں اضافہ اور پٹرولیم صاف کرنے کے کارخانے قائم کرنے کے سلسلے میں اقدامات قابل ذکر ہیں۔

صنعت کے سرکاری شعبے کے اکثر کارخانوں میں پیداوار کا کام جاری ہو گیا ہے۔ ان میں سندری میں کیمیاوی کھاد کا کارخانہ، چترنجن میں انجن سازی کا کارخانہ اور ٹیلیفون طیار کرنے کے کارخانے قابل ذکر ہیں۔ اس کے علاوہ ۱۹۵۲ء میں ہندوستان شپ یارڈ لمیٹڈ نے تین بحری جہاز بھی بنائے ہیں اور اب تک کل ۱۰ جہاز طیار کر چکا ہے۔

پنج سالہ پلان کے تحت آبپاشی اور بجلی کی اسکیموں کے لئے پہلے دو سال میں دو ارب چھ کروڑ روپے کے اخراجات طے پائے تھے مگر ان پر ایک ارب نوے کروڑ روپیہ خرچ ہوا ہے۔ آبپاشی کا رقبہ مقررہ رقبے سے کسی قدر کم رہا مگر بجلی کی پیداوار مقررہ مقدار سے بھی بڑھ گئی ہے

پنج سالہ پلان میں اکثر ایسی اسکیمیں شامل ہیں جو بیشتر از بیں ہی زیر تعمیر ہیں۔ چنانچہ آبپاشی اور بجلی کی پیداوار کے سلسلے میں ۷ ارب ۷۵ کروڑ روپے کی اسکیمیں زیر تکمیل ہیں اور ان پر آخر مارچ ۱۹۵۱ء تک ایک ارب ۵۳ کروڑ خرچ بھی ہو چکا ہے۔ کام کی تکمیل پر نظر ڈالنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ ۱۹۵۲-۵۳ء تک دو لاکھ ۳۹ ہزار کلوواٹ بجلی پیدا کرنے کے لئے مشینیں نصب کرنے کی توقع تھی مگر امید کے خلاف تین لاکھ پندرہ ہزار کلوواٹ بجلی پیدا کرنے کے لئے مشینوں کے انتظامات ہو گئے ہیں اسی طرح ۱۹۵۲-۵۳ء تک آبپاشی کے لئے دس لاکھ ۸۹ ہزار ایکڑ رقبہ مقرر ہوا تھا مگر دس لاکھ ۴۲ ہزار ایکڑ رقبہ زمین پر آبپاشی ہوئی ہے۔

جہاں تک زرعی پیداوار میں اضافے کا تعلق ہے پہلے دو سال میں پٹ سن کپاس اور گنے کی پیداوار میں اضافہ ہوا ہے۔ اناج کی پیداوار کے بارے میں صحیح اعداد و شمار ابھی تک ریاستی سرکاروں سے موصول نہیں ہوئے تاہم وزارت خوراک و زراعت کے عارضی تخمینے کے مطابق ۱۹۵۱-۵۲ء میں زیادہ اناج اگانے کی اسکیموں کے تحت غلے کی پیداوار میں ۸ لاکھ ۸۰ ہزار ٹن کا اضافہ ہوا۔ آبپاشی کی بڑی اسکیموں کے نتیجے کے طور پر مزید ۲ لاکھ ۷۰ ہزار ٹن کے اضافے کا اندازہ لگایا گیا ہے۔ اسی دوران میں زیر آبپاشی رقبے میں آٹھ لاکھ ایکڑ کا اضافہ ہوا ہے۔ علاوہ ازیں آبپاشی کی چھوٹی اسکیموں پر عمل شروع کیا گیا ہے۔ ٹیوب ویل لگائے گئے ہیں اور مرکزی ٹریکٹر آرگنائزیشن نے تقریباً ۴ لاکھ ۱۴ ہزار ایکڑ بنجر زمینوں کو قابل کاشت بنایا ہے۔

Regd No. E P – 689



بچوں کا آج کل



محمود پرویز کاکوی

بھارت کے نونہالو

بھارت کے تم جواں ہو مشرق کے پاسباں ہو
تم ماہ و کہکشاں ہو مانندِ کارواں ہو
آگے قدم بڑھاؤ
بھارت کے نونہالو

تم امن کے سپاہی غارت گرِ تباہی
سب دیتے ہیں گواہی لرزاں ہے تاجِ شاہی
آگے قدم بڑھاؤ
بھارت کے نونہالو

تم دیش کی ہو زینت تم سے ہے ساری عزت
تم سے وطن کو اُلفت تم سے وطن کی عظمت
آگے قدم بڑھاؤ
بھارت کے نونہالو

پُرجوش گیت گاؤ احوالِ دل سُناؤ
رستے پہ سب کو لاؤ بچھڑوں کو اب بلاؤ
آگے قدم بڑھاؤ
بھارت کے نونہالو

انیس احمد فاروقی

موسل کا باجہ

ایک خان صاحب دن بھر نوکری کی کھوج میں مارے مارے پھرتے تھے، مگر کوئی بے چارے کو گھاس بھی نہ ڈالتا تھا۔ کیوں کہ اول تو خان بھائی کا غصّہ اس بلا کا تھا۔ کہ ناک پر مکھی نہ بیٹھنے دیتے تھے۔ دوسرے بے چارے اَن پڑھ تھے۔ کوئی ہنر یا دستکاری بھی نہ جانتے تھے۔



آخر جب نوکری نہ ملنے سے بہت تنگ آگئے تو بیوی بچّوں کو دلاسا دے کر وطن سے نکلے اور سوچا کہ پردیس میں کمائیں گے۔

چلتے چلتے ایک شہر میں پہنچے۔ جس کا نام دیوگڑھ تھا۔ خاں صاحب کو شہر کے لوگوں سے معلوم ہوا کہ یہاں کا راجہ بہت سخی اور غریب پرور ہے۔ اس کے دربار میں جو بھی جاتا ہے خالی ہاتھوں نہیں پلٹتا۔

یہ سُن کر خان صاحب کی آس بندھی وہ صبح ہی محل کے دروازے پر پہنچ گئے۔ لیکن چوبداروں نے انہیں اندر جانے سے روکا۔ اس پر خاں صاحب بگڑ گئے اور بھوکے شیر کی طرح چوبداروں پر جھپٹ پڑے۔ لاتوں، گھونسوں اور کلّوں سے پہرے داروں کی خوب ہی مرمّت کی۔

چوب داروں کے غل غپاڑے کو سن کر اور بھی سپاہی آگئے اور انہوں نے خاں صاحب کو گرفتار کر کے راجہ کے سامنے پیش کیا۔

راجے نے خان صاحب سے پوچھا کہ تم نے ہمارے محل کے دروازے پر پہرہ دینے والوں کو کیوں مارا؟

خان صاحب نے کہا

"ہم پانچ سال سے نوکری کی تلاش میں پھر رہا ہے۔ ہمارا بیوی بچّے بھوکا مرتا ہے۔ ہم آپ کے پاس نوکر ہونے آتا مانگتا تھا۔ اس بدبخت نے ہم کو روکا۔ ہم نے اس کو مارا"۔

راجہ یہ سُن کر بہت متاثر ہوا۔ اس نے دریافت کیا کہ تم کیا نوکری کر سکتے ہو؟ خان صاحب نے کہا کہ "ہم سب کام کر سکتا ہے"۔

راجے نے فوجیوں سے کہا کہ خان صاحب کو چھوڑ دیا جائے۔ اور تیسرے دن خان صاحب کو محل میں آنے کا حکم دیا۔

خان صاحب جان بچا کر گھر تو آ گئے اب اُن کو یہ فکر پڑی کہ راجے کے یہاں اگر نوکر ہو بھی گئے تو کام کیا کریں گے۔

پوچھ تاچھ کرنے پر لوگوں نے بتایا کہ راجے کو گانا سننے کا بہت شوق ہے اور روزانہ صبح کو اس کے محل میں گویّے جاتے ہیں۔ خان صاحب ان گویّوں کے پاس گئے اور ان سے کہا کہ تم ہمیں بھی راجے کے محل میں اپنے ساتھ لے چلو۔ ہمیں راجہ سے جو کچھ انعام ملے گا آدھا تمہیں دے دیں گے۔ گانے والے اس شرط پر راضی ہو گئے۔

اگلے دن خان صاحب (خدا جھوٹ نہ بلوائے تو) پندرہ سیر کا ایک ڈنڈا بغل میں دبا کر گویّوں کے ساتھ راجے کے محل میں پہنچے۔ اور سب سے پیچھے بیٹھ گئے۔ جب گویّے گانا گا چکے تو راجے نے ان سے پوچھا کہ تم بھی کچھ گانا بجانا جانتے ہو۔

خان صاحب جلے تو بیٹھے ہی تھے تڑاخ سے بولے۔

"ہم اپنا موسل بجاتا ہے"۔

راجے نے حیرت سے کہا۔

"یہ کون سا باجہ ہوتا ہے۔ ہم نے آج تک نہیں سُنا"۔

خان صاحب نے گویّوں کو اشارہ کیا کہ وہ خوب زور شور سے بے سُرا باجہ بجائیں۔ اور طبلچی سے بھی کہہ دیا کہ ایسی تھاپ لگاؤ جو کان پڑی آواز سنائی نہ دے۔

سب گویّوں نے خوب اودھم مچایا اور خان صاحب خالی خُولی انگلیاں اس موسل پر پھیرتے رہے۔

راجے کو اس بے ڈھنگے گانے میں اچھی خاصی تفریح محسوس ہوئی۔ اور اس نے خان صاحب کو سَو روپے بطور انعام دئے۔

جب گا بجا کر باہر نکلے تو گویّوں نے اپنا آدھا حصّہ مانگا خان صاحب نے کہا کہ "واہ۔ موسل ہمارا بجا ہے، روپیہ تم کو کس بات کا دیں۔ جاؤ ہم تم کو کچھ نہیں دے گا۔

گویّوں کو خان صاحب کی عہد شکنی کا افسوس تو بہت ہوا۔ مگر انہوں نے آپس میں صلاح کی کہ کل کو بھی خان صاحب راجے کے محل میں جائیں گے۔ اگر راجے نے ان سے پھر فرمائش کی تو ہم لوگ ان کے ساتھ نہیں بجائیں گے۔ دیکھیں پھر ان کا موسل اکیلا کیسے بجے گا؟

دوسرے دن خان صاحب پہنچے تو راجہ نے پھر موسل بجانے کا حکم دیا۔



خان صاحب نے مراثیوں کو اشارہ کیا لیکن مراثیوں نے کہا کہ خان صاحب آج تم اپنا موسل اکیلا ہی بجاؤ۔

خان صاحب بہت سٹ پٹائے اور بولے کہ یہ اکیلا تو نہیں بجے گا۔

تھوڑی دیر انتظار کرنے کے بعد راجے نے پھر خان صاحب سے کہا۔ کہ کیا دیکھ رہے ہو۔ بجاتے کیوں نہیں۔

خان صاحب اپنا موسل لے کر گویّوں پر برس پڑے اور کہتے جاتے تھے۔ اکیلا تو یہ ایسے ہی بجے گا صاحب۔

اکیلا تو یہ اس طرح ہی بجے گا ــــ صاحب ــــ!

زکی انور

مٹھائی کا بھوت

یہ اُن دنوں کی بات ہے جب ہم بچے تھے۔ میں تھا، میرا چھوٹا بھائی پرویز تھا اور میری چھوٹی بہن نازو تھی۔ ہم تینوں کو چوری کی عادت تھی۔ ہم کوئی بڑی چوریاں نہیں کیا کرتے تھے۔ نہ ہی ہم پیسے یا اور کوئی چیز چرایا کرتے تھے جو عام طور پر چور چُرایا کرتے ہیں۔ ہم صرف میٹھی میٹھی چوریاں کرتے تھے۔ ہم نعمت خانے سے مٹھائیوں کے علاوہ اور کچھ نہیں چُراتے تھے۔

پھر بھی امّی جان بگڑا ہی کرتی تھیں۔ وہ کہتیں جیسے ہیرے کی چوری ویسی گھیرے کی چوری چوری بہرحال چوری ہی ہے روپے پیسے چرائے جائیں یا مٹھائی۔

میں اپنے چھوٹے بھائی اور چھوٹی بہن سے کچھ زیادہ باتونی تھا۔ میں کہتا۔

"امّی چوری تو جب ہوتی کہ ہم کسی دوسرے کے گھر جا کر اس کے نعمت خانے سے مٹھائیاں چُراتے ہمارے گھر کے اپنے نعمت خانے میں جو کچھ ہے وہ تو ہمارا ہے ہی جس وقت جی چاہتا ہے ہم کھا لیتے ہیں۔ زیادہ مٹھائیاں کھا لینے پر آپ غصّے ہوں گی اس لئے ہم چپکے سے نکال کر کھا لیتے ہیں"۔

امّی جان کہتیں۔

اسی چپکے سے نکال کر کھا لینے کا نام چوری ہے۔ تم لوگ چور ہو پولیس آئے گی اور پکڑ کر لے جائے گی پھر میں نہ جانوں بابا"۔

ان دنوں ہندوستان آزاد نہیں ہوا تھا۔ تمام آزادی کی لڑائیاں لڑی جا رہی تھیں اور ہمارے ماسٹر جی ہمیں ہمیشہ سمجھایا کرتے تھے کہ۔ تم بچوں کو بھی ان لال پگڑی والوں سے نہیں ڈرنا چاہئے۔ یہ لوگ انگریزوں کے سپاہی ہیں۔ انگریزوں کے سپاہی ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ ہم ہندوستانیوں کے اپنے سپاہی اُن سے کہیں زیادہ طاقت ور ہیں۔



چنانچہ میں امّی جان سے ہنس کر کہتا، امّی جان ہنس دیتیں پھر سمجھا کر کہنے لگتیں۔

"نہیں بیٹا چیزیں چُرا کر نہیں کھانی چاہئیں۔ ایسا کرنے سے گناہ ہوتا ہے۔

اس وقت مجھے اپنے اسکول کے دوست، سریش کی بات یاد آجاتی اور میں جلدی سے کہنے لگتا۔

"واہ امی جان! آپ کہتی ہیں چیزیں چُرا کر کھانے سے گناہ ہوتا ہے اور اتنے بڑے کرشن جی مکھن چرا کر کھایا کرتے تھے"۔

پہلے تو امّی جان لاجواب سی ہو کر چپ ہو جاتیں۔ پھر کہتیں۔

یہ غلط بات مشہور ہے بیٹا! کرشن جی بڑے اچھے بچے تھے وہ بہت ہی عقل مند تھے وہ بھلا مکھن کیوں چرانے لگے"۔

"واہ امّی جان" — میں جلدی سے کہتا۔ عقل مند بچے ہی تو جب جی چاہتا ہے چپکے سے کچھ نکال کر کھا لیتے ہیں۔ بے وقوف بچے تو رو رو کر مانگتے ہیں اور پھر روتے روتے سو جاتے ہیں۔

بے چاری امّی جان جیسے ہار جاتیں۔ اور تھک ہار کر کہتیں۔

"بیٹا تم نہیں جانتے۔ بھوت لوگ مٹھائیوں کے بڑے شوقین ہوتے ہیں۔ وہ مٹھائیاں کھاتے تو نہیں مگر بیٹھے سونگھتے رہتے ہیں۔ اور جو بچے نعمت خانے سے چرا کر مٹھائی کھاتے ہیں اُن کے تو بس وہ سر پر سوار ہو جاتے ہیں"۔

پرویز اور نازو تو سہم سے جاتے مگر میں کھل کھلا کر ہنس پڑتا میرے ماسٹر جی نے مجھے پہلے ہی سے خوب اچھی طرح سمجھا دیا تھا کہ یہ بھوت پریت، جن دیو اور پری وغیرہ صرف گپ ہی گپ ہیں سچ مچ یہ سب کچھ بھی نہیں۔

بعد میں پرویز اور نازو کو میں اچھی طرح سمجھا دیتا کہ یہ سب کچھ امّی جان نے محض ڈرانے کے لئے کہہ دیا ہے۔

اور ہماری میٹھی میٹھی چوریاں پھر بدستور شروع ہو جاتیں۔

ایک مرتبہ ہمارے ہاں موٹر خالہ آئیں۔ موٹر خالہ میری امّی جان کی سہیلی تھیں اور ہم انہیں موٹر خالہ اس لئے کہتے تھے کہ اُن کے پاس ایک خوب صورت سی چھوٹی موٹی موٹر کار تھی۔ ویسے موٹر خالہ کا نام تو کچھ اور تھا۔ مگر کسی بڑے آدمی کا نام لینا بُری بات جو ہے۔ اسی لئے امّی جان نے ہمیں سمجھا دیا تھا کہ انہیں موٹر والی خالہ جان کہا کرو۔ اتنی لمبی چوڑی بات۔ موٹر والی خالہ جان کہنا تو ذرا مشکل کی بات تھی چنانچہ ہم انہیں صرف موٹر خالہ ہی کہتے تھے۔

موٹر خالہ کی ایک بچی تھی جو نازو سے کچھ بڑی تھی۔ اس کا نام عشرت تھا۔ اسے سب لوگ عشو کہتے تھے۔ عشو بڑی شریر تھی۔ لوگ مجھے بھی شریر ہی سمجھا کرتے تھے مگر میں محسوس کرتا تھا کہ عشو مجھ سے چھوٹی ہوتے ہوئے بھی شرارت میں مجھ سے پانچ چھ قدم آگے تھی۔ وہ جب بھی آتی چوری میں ہمارے ساتھ ہو جاتی۔ لیکن مزے دار بات تو یہ تھی کہ وہ چوروں کی سردار بن جاتی اور خود تو نعمت خانے کو ہاتھ تک نہیں لگاتی مگر چوری کی ہوئی مٹھائیوں میں ہماری برابر کی حصے دار بن جاتی۔



اس مرتبہ جب وہ آئی تو دوسرے ہی تیسرے دن وہ ہماری ساتھی بننے آئی اور میرے کچھ کہے بغیر خود ہی بولی۔

"گھبراؤ نہیں، اور اب کے میں بھی چوری کروں گی۔ مفت کا حصّہ نہیں لوں گی یہ بُری بات ہے"۔

"ہاں" — میں نے سینہ تان کر کہا۔ یہی تو میں تم سے کہنے والا تھا دیکھو میں مرد ہوں، سردار میں بنوں گا۔ میں چپ چاپ باہر بیٹھک میں رہتا ہوں۔ تم لوگ اچھی اچھی مٹھائیاں لے کر میرے پاس آؤ"۔

میں باہر بیٹھک میں جا بیٹھا اور وہ تینوں پرویز، عشرت اور نازو نعمت خانے والے کمرے میں گھس گئے۔

تھوڑی ہی دیر میں پروین میرے پاس بھاگا ہوا آیا۔ اُس کے چہرے پر ہوائیاں چھوٹ رہی تھی اور وہ بہت زیادہ گھبرایا ہوا تھا۔ اس نے ہکلاتے ہوئے کہا۔

"عشرت باجی بے ہوش ہو گئی ہیں جلدی سے چلئے۔"

میں بھاگا ہوا آیا۔ دیکھا کہ عشرت نعمت خانے کے پاس بے ہوش پڑی ہے۔ اور نازو دُور کھڑی اسے گھبراہٹ کے ساتھ دیکھ رہی ہے۔ نازو کے پوچھنے پر معلوم ہوا کہ ابھی عشرت نے نعمت خانے سے ایک رس گلا نکالا ہی تھا کہ وہ آہستہ سے چیخی اور چیخ کر زمین پر گر گئی۔



میں نے سوچا اگر یہ سب کچھ امّی جان یا موٹر خالہ کو معلوم ہو گیا تو مصیبت آ جائے گی، نہ جانے عشرت کو کیا ہو گیا ہے۔ میں اسے گود میں اُٹھا کر پیچھے کے دروازے سے باہر بیٹھک میں لے آیا۔ تھوڑا پانی مُنہ پر ڈالنے سے اس نے آنکھیں کھول دیں اور یکایک اپنے بال نوچنے لگی اور زور سے قہقہہ لگانے لگی۔ ہم سب کے سب بہت زیادہ خوف زدہ ہو گئے۔ عشرت سادھوؤں کی طرح بیٹھ گئی۔ اور بڑی شان سے بکنے لگی۔

تم لوگ مجھے جانتے ہو؟ میں تم میں سے ہر ایک کو نشکر گا کر مٹھائی کی طرح کھا جاؤں گا۔ میں مٹھائی کا بھوت ہوں۔ اتنے دنوں سے میں پردیس چلا گیا تھا اور تم لوگ یہاں چوری کر کر کے خوب شیر ہو گئے تھے۔ اب ذرا کم بختو تم نعمت خانے میں ہاتھ بھی لگا کر دیکھ لو نہ تم میں سے ایک ایک کو کھا ڈالا تو پھر میرا نام بھوت نہیں۔ آج تو میں اس بچّی کو کھاؤں گا۔ اچھی موٹی تازی بچی ہے خوب پیٹ بھر جائے گا ہاں۔ ہا ہا ہا۔ عشرت پھر اپنے بال نوچنے لگی اور قہقہہ لگانے لگی۔ میں بڑی ہمّت کر کے اُس کے پاس گیا۔ مگر اُس نے مجھے یوں آنکھیں اور مُنہ پھاڑ کر دیکھا کہ میرے ہوش گم ہو گئے۔ پھر عشرت فرش پر لوٹ گئی اور ہاتھ کھینچنے لگی اور زور زور سے چیخنے لگی۔ اس کے چیخنے کی آواز سُن کر امّی جان اور موٹر خالہ آ پہنچیں اور ہم تو سب کے سب ڈر کر یوں تھر تھرانے لگے کہ جیسے ہم پر بھی بھوت سوار ہو رہے ہوں۔

موٹر خالہ نے عشرت کی ایسی حالت دیکھ کر "میری عشو" کہہ کر اپنا سینہ پیٹ لیا۔ اور امّی جان کچھ ڈرتے ڈرتے عشرت کے پاس جا کر بیٹھ گئیں اور بولیں۔

"تم کون ہو؟"

"میں بھوت ہوں، مٹھائی کا بھوت۔ میں یہیں نعمت خانے والے کمرے میں رہتا ہوں۔ میں پردیس چلا گیا تھا اور ادھر اس گھر کے بچّوں نے مٹھائی چوری کرنے کی خوب عادت پکڑ لی ہے۔ اب میں سب کو ایک ایک کر کے کھا جاؤں گا۔ آج میں اس بچّی کو کھاؤں گا۔ ہا ہا ہا ہا" عشرت پھر قہقہہ لگانے لگی۔

"اے بھوت مہاراج آج کے لئے میری بچّی کو معاف کر دو۔" موٹر خالہ گڑگڑائیں۔

"ہاں بھوت صاحب! امی جان کہنے لگیں۔ یہ بچّی بے چاری نادان ہے اسے کچھ معلوم نہیں اسے معاف کر دیجئے۔

"نہیں نہیں نہیں، عشرت زور سے چیخی"۔ میں کسی کو معاف نہیں کر سکتی آپ سفارش کریں گی تو اچھا نہیں ہوگا اب ایک لفظ بھی زبان سے نہ نکالو ہاں ــــ"

"نہیں صاحب پہلا قصور ہے بے چاری کو معاف کر دیجئے۔ امّی جان نے پھر کہا اور عشرت بالکل پاگل کی طرح امّی جان سے لپٹ گئی اور انہیں اِدھر اُدھر سے جھنجوڑنے لگی۔ امّی جان ہولے ہولے چیخنے لگیں اور ہم سب مل کر رونے لگے۔

موٹر خالہ آہستہ آہستہ عشرت اور امّی کے پاس پہنچیں اور کچھ پڑھ پڑھ کے عشرت پر پھونکنے لگیں۔ جیسے جیسے وہ پڑھ پڑھ کر عشرت پر پھونکتی جاتی تھیں عشرت کا امّی جان کو جھنجوڑنا کم ہوتا جاتا تھا۔ اور کافی دیر تک جب موٹر خالہ اس پر پڑھ پڑھ کر پھونکتی رہیں تو عشرت بالکل بے سدھ سی ہو گئی اور ایک بار پھر بے ہوش ہو گئی۔ اور اب کے جب منہ پر پانی کے چھینٹے دے کر اسے ہوش میں لایا گیا تو وہ انگڑائی لیتی ہوئی اُٹھ بیٹھی پھر بولی۔

اُف میرا سارا بدن زخم کی طرح دُکھ رہا ہے۔ کتنا خوفناک خواب میں دیکھ رہی تھی ارے باپ سوچ کر اب تک ڈر لگتا ہے"۔

"ڈرو نہیں عشو! امّی جان نے کہا اب تم بالکل ٹھیک ہو۔ بتاؤ تو بھلا کونسا خواب تم دیکھ رہی تھیں"؟

"خالہ جان! عشرت کہنے لگی میں دیکھ رہی تھی کہ کسی بہت بڑے اور موٹے تازے عجیب ڈراؤنی شکل کے آدمی نے مجھے بازوؤں میں جکڑ لیا ہے۔ اور اپنے بڑے بڑے بے شکل دانت نکالے مجھے کھا جانے کو کہہ رہا ہے۔ اُف اب تک ڈر لگ رہا ہے۔

امّی جان نے اُسے سب کچھ بتا دیا کہ وہ مٹھائی کا بھوت تھا۔ اور یہ بھی بتا دیا کہ عشرت کی حالت کتنی نازک ہو گئی تھی۔

اس دن کے بعد سے مٹھائیوں کی چوری تو دُور کی بات ہے ہم میں سے کسی میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ نعمت خانے والے کمرے کے پاس سے ہو کر گزریں۔ یہاں تک کہ نعمت خانے میں رکھی ہوئی مٹھائی کچھ دنوں تک امّی جان کے دینے پر بھی ہم نہیں کھاتے تھے۔ ہم نے توبہ کر لی تھی کہ اب کبھی چوری نہیں کریں گے۔

بعد کو جب میں جوان ہوا اور پڑھ لکھ کر فارغ ہو گیا تو اتفاق سے میری شادی عشرت ہی سے ہو گئی۔ میرے گھر میں میرے اپنے بچے تو ابھی نہیں تھے۔ مگر بڑی بہنوں کے بچے تھے اور وہ بچے بھی تم سب بچّوں کی طرح اور خود میری طرح میٹھی میٹھی چوریاں کیا کرتے تھے۔ مگر جب تک میں عشرت پر بھوت کے حملے کا واقعہ بھول چکا تھا۔ ورنہ انہیں بھی عشرت کا واقعہ سُنا کر چوری سے ڈرا دیتا۔

ایک دن میں دفتر سے لوٹا تو اپنے کمرے میں عشرت بیگم میرے ایک دوست کی بچّی کو پاس بٹھائے کہہ رہی تھیں۔

".... رس گلے کو ہاتھ لگاتے ہی تم چیخ مار کر زمین پر گر جانا سمجھیں! اور جب پانی کے چھینٹے دے کر تمہیں ہوش میں لایا جائے تو تم یکایک زور زور سے ہنسنے لگنا اور پھر زور زور سے کہنا۔ تم لوگ مجھے جانتے ہو؟ میں تم میں سے ہر ایک کو شکر لگا کر مٹھائی کی طرح کھا جاؤں گا۔ میں مٹھائی کا بھوت ہوں سمجھیں ــــ"

مجھے بے اختیار ہنسی آ گئی۔ اور تب مجھے معلوم ہوا کہ آج سے پندرہ سال پہلے امّی جان نے عشرت کو یہی سب کچھ سمجھا کر ہمیں بھوت سے ڈرایا تھا۔ اور شریر عشرت نے کتنی ہوشیاری اور چالاکی سے اپنا پارٹ ادا کیا تھا کہ ہمیں شمت خانے والے کمرے کے پاس سے گزرنے میں بھی ایسا لگتا تھا کہ مٹھائی کا بھوت منہ پھاڑے کھڑا ہے۔

سلیم مبشر علی

بیربل کی عقلمندی

بچو! تم نے بیربل کا نام ضرور سُنا ہوگا اور اس کے لطیفے بھی سُنے ہوں گے۔ آج ہم تمہیں اس کی عقل مندی کا ایک اور قصّہ سُناتے ہیں۔ یہ واقعہ اس وقت کا ہے جب بیربل کی رسائی اکبر بادشاہ کے دربار تک نہیں ہوئی تھی۔ اور وہ اپنے باپ کے ساتھ آگرے میں رہتا تھا۔ اکبر بادشاہ نے ایک دن اپنے نوکر سے پان مانگا۔ اتفاق کی بات کہ پان میں چُونا زیادہ لگ گیا اور بادشاہ کا مُنہ کٹ گیا۔ نوکر کو ہدایت کی گئی کہ آیندہ ایسا نہ کرے۔ دراصل اس نوکر کے خلاف محل کی کچھ کنیزیں تھیں اور وہ اس قسم کی حرکت کرتی تھیں۔ بیچارا نوکر مفت میں ڈانٹا جاتا تھا۔ چند دن کے بعد بادشاہ نے پھر پان مانگا۔ اور نوکر سے یہی غلطی دوبارہ ہوئی۔ اس پر اکبر بادشاہ بہت ناراض ہوا اور نوکر سے ایک سیر چُونا بازار سے لانے کے لئے کہا۔ نوکر جس دکان پر پہنچا وہاں بیربل بھی موجود تھا۔ بیربل نے جو بادشاہ کا نام سُنا اور ایک سیر چونے کی فرمائش دیکھی فوراً معاملے کی تہہ تک پہنچ گیا۔

بیربل۔ اچھا یہ بتاؤ کہ تم سے آج کوئی قصور تو نہیں ہوا ہے؟

نوکر۔ جی نہیں! آج تو کوئی قصور نہیں ہوا ہے۔ البتہ چند دن ہوئے کہ بادشاہ نے مجھ سے پان مانگا تھا اور پان میں چونا زیادہ لگ گیا تھا۔

بیربل۔ اس سے بادشاہ کو تکلیف ہوئی ہوگی۔

نوکر۔ بادشاہ کا مُنہ کٹ گیا تھا۔ اور مجھ کو ہدایت کر دی گئی تھی کہ آیندہ ایسا نہ کیا جائے۔

بیربل۔ اچھا تو اب تم ایک کام کرو۔ اور وہ یہ کہ ایک سیر گھی کچا پی جاؤ۔ اور اس کے بعد چُونا لے کر بادشاہ کے سامنے جاؤ۔

نوکر۔ کیوں ایسا کرنے سے کیا ہوگا؟

بیربل۔ تم مجھ سے کل پھر ملنا۔ اس وقت تم کو بتاؤں گا۔

نوکر چُونا لے کر بادشاہ کے سامنے حاضر ہوا۔ بادشاہ نے وزیر کو حکم دیا کہ نوکر کو یہ سب چُونا کھلایا جائے۔ بادشاہ کا حکم کیسے ٹل سکتا تھا۔ بیچارے نوکر نے کسی نہ کسی طرح سب چُونا کھا لیا۔ چونکہ وہ سیر بھر کچا گھی بیربل کے کہنے سے پی کر آیا تھا اس کو فوراً قے ہو گئی اور وہ بچ گیا۔ اس کی طبیعت خراب تھی وہ گھر چلا گیا اور دو تین دن کے بعد جب بالکل اچھا ہو گیا تو بیربل کے یہاں پہنچا۔

بیربل۔ بتاؤ۔ تم پر کیا گزری۔ تم بچ گئے۔

نوکر۔ آپ کی عقلمندی کی داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ دراصل میری جان آپ کی وجہ سے بچی۔

بیربل۔ اب تم بادشاہ کے پاس جاؤ اور معافی مانگو۔ وہ تم کو معاف کر دیں گے

نوکر بادشاہ کے محل میں حاضر ہوا۔ بادشاہ اس کو دیکھ کر متعجب ہوا۔

نوکر۔ حضور میری خطا اب معاف کر دی جائے آیندہ پان میں چونا زیادہ نہ لگاؤں گا۔

بادشاہ۔ تم اتنا چُونا کھانے کے بعد بچ کس طرح سے گئے۔

نوکر۔ حضور! میں نے بیربل کے کہنے سے ایک سیر کچا گھی پی لیا تھا اس لئے مجھ کو قے ہو گئی اور میں بچ گیا۔

بادشاہ۔ تمہارا قصور معاف کیا جاتا ہے۔ جاؤ محل سرا میں اپنا کام کرو اور کل دربار میں بیربل کو ہمارے سامنے پیش کرنا۔

اور اس طرح بیربل کی رسائی بادشاہ تک ہو گئی۔

آج کل

Osmania University Library,
HYDERABAD (DECCAN)

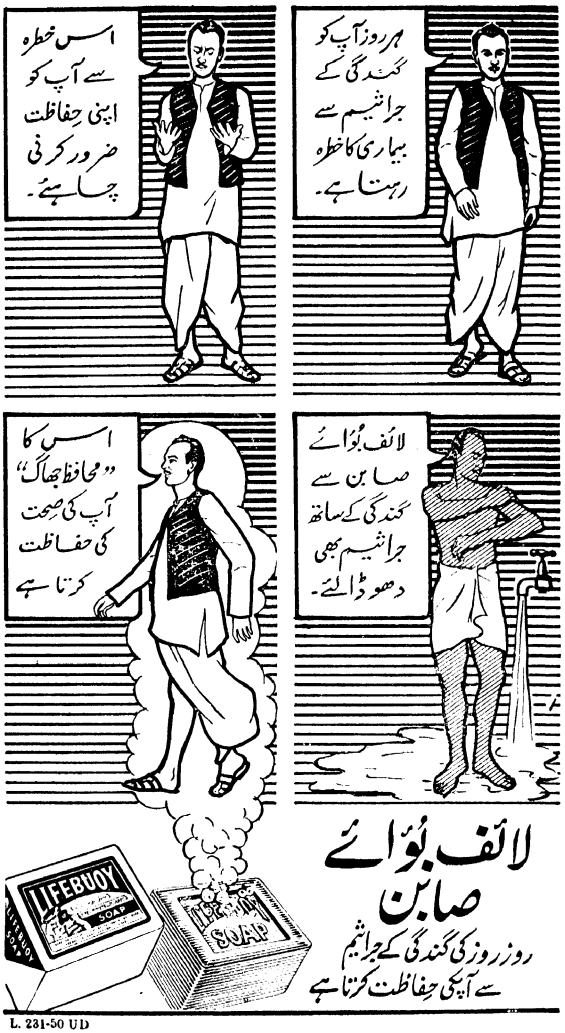
اس شمارے میں

آل احمد سرور، کنہیالال کپور
میکش اکبرآبادی، تلوک چند محروم
وِدیا شنکر اور روشن صدیقی

ستمبر ۱۹۵۳ء

سر راس مسعود
اٹھائیسویں




ہر روز آپ کو
گندگی کے
جراثیم سے
بیماری کا خطرہ
رہتا ہے۔
اس خطرہ
سے آپ کو
اپنی حفاظت
ضرور کرنی
چاہیئے۔
لائف بُوائے
صابن سے
گندگی کے ساتھ
جراثیم بھی
دھو ڈالئے۔
اس کا
"محافظ جھاگ"
آپ کی صحت
کی حفاظت
کرتا ہے
LIFEBUOY
SOAP
لائف بُوائے
صابن
روز روز کی گندگی کے جراثیم
سے آپکی حفاظت کرتا ہے

L. 231-50 UD



مجھے یقین ہے...

...آپ بھی لکس
ٹائلیٹ صابن سے
زیادہ خوبصورت
بن سکتی ہیں"

— ملیہ سرکار

ملیہ سرکار کہتی ہیں: "لکس ٹائلیٹ صابن کے بالائی دار جھاگ سے میری جلد پہلے سے کتنی اچھی ہوگئی ہے۔ اس سفید اور خالص صابن کے روزانہ استعمال سے میری جلد ریشم کی طرح ملایم رہتی ہے"

لکس
ٹائلیٹ صابن

فلمی ستاروں کا
حسن بخش صابن



ترتیب

غزل	آلِ احمد سرور	۴
مہاراجہ بہادر کشن پرشاد	میکش اکبرآبادی	۵
حماقت	کنہیا لال کپور	۱۰
غزل	تلوک چند محروم	۱۴
ایاغِ تازہ	روش صدیقی	۱۴
دہلی سے جنیوا تک	وید یاشنکر	۱۵
فانی کا فلسفۂ غم وحشت	نظیر احمد صدیقی	۱۹
آقائیین کاظم زادہ ایرانشہر	اطہر حسین جعفری	۲۷
اردو ڈرامے کا تدریجی ارتقاء	درد گور کھپوری	۳۳
غزل	اعجاز صدیقی	۳۹
برسات	بیتاب بریلوی	۳۹
جلوۂ عالم	تمکین کاظمی	۳۹
ذوقِ فکر	محمد منشاء الرحمٰن خاں منشاء، نریش کمار شاد، ارشد کاکوی، افقر موہانی وارثی، طالب جے پوری، احسن لطیف طیائی	۴۵
ہنٹا قبان پر ایک طائرانہ نظر	اقبال صدیقی	۴۶
ڈاکٹر طٰہٰ حسین	ڈونالڈ رابنسن	۴۹
چہرہ بدن	——	۵۲
تاج محل	——	۵۳
پنج سالہ پلان	——	۵۴
رفتارِ زمانہ	——	۵۸

بچوں کا آج کل

کیا خوب آدمی تھے ـــ تیغ چلی بھی	اطہر پرویز	۶۱
اچھی امّی خدا مسکرا دیجئے	حامد الانصار	۶۳
فرض	ذکیہ نکہت	۶۴
تین سنگھ	——	۶۵
جیمز گارفیلڈ	جگت سنگھ	۶۶
دل چسپ	——	۶۸

سرورق:- قاہرہ میں پنڈت جواہر لال نہرو اور سر محمد علی وزیر اعظم پاکستان مصافحہ کر رہے ہیں۔ درمیان میں جنرل نجیب مصر کے پریزیڈنٹ کھڑے ہیں

اُردو کا مقبول عوام مصور ماہنامہ

آج کل

دہلی

ایڈیٹر:- —— جوش ملیح آبادی

اسسٹنٹ ایڈیٹر:- —— بال مکند عرش ملسیانی

جگن ناتھ آزاد

جلد ۱۲ —— نمبر ۲

سالانہ چندہ:- ہندوستان میں:- چھ روپے / پاکستان میں:- چھ روپے

غیر ممالک سے:- فی شمارہ یا ایک ڈالر

فی پرچہ:- ہندوستان میں آٹھ آنے / پاکستان میں آٹھ آنے

ستمبر ۱۹۵۳ء

پبلیکیشنز ڈویژن پوسٹ بکس ۲۰۱۱ - دہلی



دن بہ دن

زیادہ ملایم و زیادہ دِلکش جِلد

رکسونا کا کیڈِل آپ کے لئے بھی یہ کمال کرے گا

اپنی جِلد پر رکسونا کا کیڈِل آمیز جھاگ ملئے، پھر دھو ڈالئے،
آپ خود ہی محسوس کریں گی کہ آپ کی جِلد
دن بہ دن زیادہ ملایم اور صاف ہوتی جا رہی ہے۔



رکسونا

کیڈِل آمیز واحد صابن

*جِلد کو ملایم کرنے اور مقوی جِلد تیلوں
کے ایک خاص مرکب کا مفکیتی نام

رکسونا پروپرائٹری لمیٹیڈ کمپنی ہندوستان میں بنایا گیا

RP. 101-50 UD

آلِ احمد سرور

غزل

سرور صاحب پر آج کل سفر کھنے کا موڈ طاری ہے۔ ہمیں مسرت ہے کہ آپ کی یہ سرکتہ الآرا غزل ہم آج کل میں شائع کر رہے ہیں۔ ادارے کو اپنی اس خوش وقتی پر نازنا ہے ع بیس از مدت گزرافتاد بر ما کار ولنے را (ادارہ)

غم دُنیا سے ایسی پائمالی ہوتی جاتی ہے
تری صُورت بھی تصویرِ خیالی ہوتی جاتی ہے

کبھی سر اُن کے قدموں میں، کبھی ہاتھ اُن کے دامن پر
طبیعت اِن دنوں کچھ لا اُبالی ہوتی جاتی ہے

نگاہیں منتظر تھیں کب کرن پھوٹے سحر جاگے
مگر یہ رات تو کچھ اور کالی ہوتی جاتی ہے

نہ زُلفوں کے فدائی ہیں نہ زنجیروں کے شیدائی
یہ دُنیا اب تو دیوانوں سے خالی ہوتی جاتی ہے

نہ جانے بڑھ گئے ہیں کتنے خم گیسوئے جاناں کے
مسلّم اب مری آشفتہ حالی ہوتی جاتی ہے

مری تشنہ لبی، کیا میری مینا میں چھلک آئی
وہ پیہم بھرتے جاتے ہیں، یہ خالی ہوتی جاتی ہے

مرا سارا لہو جس کی حنا بندی میں کام آیا
خدایا اب وہ جنّت بھی خیالی ہوتی جاتی ہے

کب اتنا ہوش بدمستوں کو ہے جشنِ بہاراں میں
بساطِ رنگ و بُو کی پائمالی ہوتی جاتی ہے

نظر میں اُس کی جوں جوں شوخیوں کا رنگ آتا ہے
سرورؔ اُتنی ہی صورت بھولی بھالی ہوتی جاتی ہے

میکش اکبرآبادی

مہاراجہ بلوان سنگھ بہادر

متخلص بہ راجہ

مرزا غالب سے مجھے صرف عقیدت ہی نہیں بلکہ محبت بھی ہے۔ محبت کے اسباب میں اگر ان کا تجزیہ کیا جائے تو مرزا کی شاعرانہ عظمت کے علاوہ ان کی وہ شخصیت بھی شامل ہے جو یادگار غالب کے مصنف نے اپنے قلم سے بنائی ہے اور مجھے محبت تو دراصل اُن سے اس لئے بھی ہے کہ وہ میرے وطن کے تھے جس طرح نالائق اور بے کمال اولاد اپنے بزرگوں کے کمال پر فخر کیا کرتی ہے، اسی طرح میں بھی میرتقی، نظیر اور غالب پر فخر کیا کرتا ہوں۔

فروری ۵۳ء کے آج کل میں مختار الدین صاحب آرزو کے مقالے "مرزا غالب سے ایک ملاقات" میں میں نے پڑھا کہ غالب نے میرے جدِّ بزرگوار سید منور علی شاہ صاحب کی مجالس کا ذکر کیا ہے تو مجھے اس تصور سے بڑی خوشی ہوئی کہ کبھی غالب بھی یہاں آتے ہوں گے جہاں میں رہتا ہوں، اور اسی سلسلے میں مجھے اس کمی کا شدید احساس ہوا کہ میں نے کبھی مرزا غالب کا مکان اندر سے نہیں دیکھا۔ اندر کے حصّے کے فوٹو بھی کسی تذکرے میں نظر سے نہیں گزرے۔ صدر دروازے کے اوپر کی سہ دری کا فوٹو غالباً مالک رام صاحب کے تذکرے میں ضرور دیکھا ہے اور یہ حصّہ تو جب بھی اُس طرف سے گزرنا ہوتا ہے نظر آ ہی جاتا ہے۔

مرزا غالب کے مکان کے مختلف فوٹو لے کر ہم لوگ واپس آ رہے تھے کہ راستے میں راجہ کاشی کی حویلی نظر پڑی جس کا بلند اور کئی منزلہ پھاٹک اور اس کے اوپر کے کمرے ابھی سلامت ہیں لیکن اس کا ایک بازو بالکل منہدم ہو گیا ہے۔ یہ حصّہ دیکھنے سے ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے شتر مرغ کا ایک بازو ٹوٹ گیا ہو اور وہ سہ اپنکھ پھیلائے اپنی لامبی گردن اونچی کئے کھڑا ہو۔ میں سوچتا رہا کہ اس حویلی کے بازو میں ایک احاطہ تھا۔ اس میں باغ تھا، پیڑوں کی ٹہنیاں احاطے سے باہر لٹکتی رہتی تھیں۔ پھاٹک میں نوکر چاکر اور پہرے دار رہتے تھے۔ آخر وہ سب کیا ہوئے۔ نہ صفائی ہے نہ مرمت ہے نہ رونق اور چہل پہل ہے، کیا سارا آگرہ ہی بدل گیا یا کمینوں کے ساتھ مکان بھی بدل گئے۔ پھاٹک میں دیواروں پر، منڈیروں پر، کواڑوں پر سندھی عورتوں کے پاجامے، کرتے اور جانے کیا کیا پڑے سُوکھ رہے تھے۔ باہر گندے پانی، کیچڑ اور کوڑے کے ڈھیر تھے۔ یہ راجہ کاشی کی حویلی ہے۔ جہاں رات دن جلسے جشن اور مشاعرے ہوتے تھے۔ نظیر اکبرآبادی۔ حاتم علی مہر خلیفہ گلزار علی اسیر۔ مرزا عنایت علی ماہ جیسے اہل کمال کے جھمگٹ رہتے تھے۔ میں نے اپنے ہمراہیوں (مسٹر ٹامس آستھم اور معظم علی شاہ) سے کہا اس حویلی کا فوٹو اور لے لیجئے۔ مگر کیمروں کی شدت درست بھی نہ کی جا سکی تھی کہ سندھی لڑکوں اور راہگیروں کی بھیڑ لگ گئی۔ مختلف سوالات اور شکوک کئے جانے لگے۔ آخر ساتھ سے فوٹو نہ لیا جا سکا، اور ایک طرف جا کر ایک سمت سے فوٹو لیا گیا۔

راجہ صاحب کا "دالِ خمخانۂ جاوید" "سخنِ شعرا" اور "ہندو ادیب" میں مختصراً ملتا ہے "خم خانۂ جاوید" میں لالہ سری رام صاحب نے قدرے تفصیل سے لکھا ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

"راجہ رئیس باتمکین مہاراجہ بلوان سنگھ بہادر خلف ارشد مہاراجہ جیت سنگھ، تاریخ میں ان کا حال اس طرح درج ہے کہ جب راجہ جیت سنگھ کے والد راجہ بلونت سنگھ نے وفات پائی، نواب شجاع الدولہ نے تمام عہدوں کے خلاف چاہا کہ علاقہ بنارس پر اپنا دخل کر لیں۔ لیکن سرکار انگلشیہ نے قدیم شرائط کی پابندی محوظ خاطر رکھ کر راجہ جیت سنگھ کو مسندِ موروثی پر متمکن کر دیا۔ راجہ موصوف حسب قرارداد سابقہ سالانہ زرخراج معینہ ادا کرتے رہے۔ لیکن ۱۷۷۵ء میں سرکار انگریزی نے کچھ فوج کشی حلب کی اور اخذ زر بھی کرنا چاہا۔ راجہ نے ان امور کو اپنے مقدور سے خارج پا کر عذر کئے جو مسموع نہ ہوئے اور وارن ہیسٹنگز گورنر جنرل خود اس معاملے

کے تعینے کے لئے بنارس آئے اور راجہ کی گرفتاری کا قصد کیا۔ اس سے تہلکۂ عظیم مچ گیا اور چار و ناچار جانبین سے فوج کشی کی نوبت آئی۔ آخرالامر والیٔ بنارس راجہ چیت سنگھ نے ۱۷۸۱ء میں شکست پاکر گوالیار کو پناہ گاہ مقرر کیا تو عالی جاہ نے بطریقۂ مہمان داری کا سلوک کرکے پانچ لاکھ سالانہ کی جاگیر علیحدہ کر دی۔ بعد وفات مہاراجہ چیت سنگھ مہاراجہ بلوان سنگھ چالیس سال تک آگرے میں تشریف فرما رہے۔ نظیر اور مرزا حاتم علی مہر کے شاگرد تھے بڑے قادر الکلام، مشاق ذکی اور طباع سخنور تھے۔ تلاش مضامین نو کی طرف میل خاص تھا اور اس کے ساتھ ہی زبان کی صفائی کا اس قدر خیال تھا کہ کیا مجال کہ اسلوب بیان میں ذرا بھی دقت یا اجنبیت پیدا ہو۔ مشکل زمینوں میں خوب خوب شعر نکالتے تھے۔ شاعروں کے بڑے قدر دان تھے۔ ہمیشہ دولت خانے پر مشاعرے ہوا کرتے تھے۔ اور شعرا سے ہر طرح سلوک ہوتے تھے۔ قوم کے تر کر ما برہمن تھے۔ ان کے مورث اعلیٰ راجہ منسا رام کو محمد شاہ نے پندرہ لاکھ سالانہ خراج پر علاقہ جات جون پور، غازی پور، بنارس کا صوبہ دیا تھا۔ سرکار انگلشیہ سے دو ہزار روپیہ ماہوار پنشن مقرر تھی۔ ۱۷۹۹ء سال پیدائش تھا۔ صاحب دیوان (مسمّی بگلِ ریاض مطبوعہ عظیم الاخبار پریس آگرہ ۱۲۷۰ھ ہجری تھے ایک کتاب موسوم بہ چترچندر کا بھی ان سے یادگار ہے۔ دیوان نہیں ملا۔ البتہ تلاش سے بیس پچیس غزلیں بہم پہنچیں۔

(خزانۂ جاوید جلد سوم ص۲۹۵)

حسنِ اتفاق سے راجہ صاحب کے متعلق ہمیں اُن کا خود نوشت حال ایک مشاعرے کے گلدستے[1] میں ملتا ہے۔ یہ مشاعرہ ۱۶ اکتوبر ۱۸۶۹ء کو راجہ صاحب کی حویلی ہی میں ہوا تھا۔ اس کے بانی منشی نیاز علی پریشان تھے جو مرزا حاتم علی بیگ مہر کے شاگرد تھے۔ اردو کا مصرع مرزا مہر ہی نے دیا تھا اس مشاعرے میں راجہ صاحب کے علاوہ خلیفہ گلزار علی امیر خلف نظیر اکبرآبادی اور مرزا مہر اور آگرے کے تمام شعرا شریک تھے۔ اس خود نوشت میں راجہ صاحب نے خود کو مرزا مہر کا شاگرد نہیں لکھا ہے معلوم نہیں تذکرہ نویسوں نے یہ روایت کہاں سے لی۔ اس تحریر سے ہمیں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ راجہ صاحب کے اس مطبوعہ دیوان کے علاوہ جس کا ذکر خزانۂ جاوید میں ہے دو دیوان اور بھی تھے جو غالباً طبع نہ ہوئے اور اس کے علاوہ ایک مثنوی ایک بیاضِ سلام اور دو کتابیں ہندی کی اور بھی راجہ صاحب نے تصنیف فرمائی تھیں۔ اب راجہ صاحب کی زبان سے ان کا حال سنئے۔

حال سے پہلے راجہ کا نام وغیرہ اس طرح درج کیا گیا ہے کیونکہ مشاعرے کے سلسلے میں اعلان کیا گیا تھا کہ ہر شاعر اپنا نام مع قومیت کے لکھے۔ استاد کا نام اور تخلص لکھے۔ اپنی عمر، سکونت اور شاعری کی مدت اور تصانیف کی تفصیل لکھے۔

"مہاراجہ بلوان سنگھ بہادر راجہ کاشی۔ گوتم برہمن، خلف مہاراجہ چیت سنگھ بہادر، راجہ کاشی تخلص راجہ در اُردو و دوزبان بھاکا کاشی راج۔ شاگرد میاں نظیر در علم فارسی و شاگرد لالہ بھٹ در ہندی۔ عمر ۷۰ سال۔ مدتِ شاعری ۳۰ سال۔ سکونت قدیم بنارس سکونت حال آگرہ۔

تصنیفات۔ سہ دیوان و یک مثنوی و یک بیاضِ سلام و مرثیہ و یک کتاب بھاکا موسوم بہ "چترچندر" و کتاب دیگر بزبان بھاکا موسوم بہ "رس سمدر"

حال "جناب مہاراجہ چیت سنگھ بہادر بکینٹ باشی راجہ بنارس سے بلاسبب لارڈ ہیسٹنگز صاحب بہادر گورنر جنرل برسرِ فساد ہوئے اور مہاراجہ موصوف ریاست ترک کرکے مع فوج ہمراہی گوالیار میں آئے اور بعد ملاقات ہونے مہاراج مادھوجی سندھیا بہادر والیٔ گوالیار کے سندھیا ممدوح نے پانچ لاکھ روپیہ کی جاگیر پان کھانے کے لئے مقرر کی۔ یعنی قلعہ و پرگنہ رتوا اور موہ وغیرہ۔ سو وہ جاگیر جب کہ جنرل لیک صاحب بہادر نے گوالیار فتح کیا اُس وقت میں یہ حکم دیا کہ ہم کو معلوم نہ تھا، اس باعث سے تمہاری جاگیر

---

[1] اس مشاعرے کی خصوصیت یہ تھی کہ ہر شاعر نے غزل کے ساتھ اپنا حال بھی لکھا ہے۔ اس مشاعرے کا ذکر گارساں دتاسی نے بھی کیا ہے۔ اصل گلدستہ مفتی انتظام اللہ صاحب (پاکستان) کے پاس ہوگا۔ مگر ہمیں پروفیسر مولانا حامد حسن صاحب قادری کا شکر گزار ہونا چاہیئے کہ موصوف نے اس کا خلاصہ "نقد و نظر" میں دے کر اس ذکر کو بقائے جاوید بخش دی

سند میں راناکیرت سنگھ صاحب والیِ گوبد کے مندرج ہوگئی ہے۔ تم کو چاہیئے کہ اُن کو دخل دے دو۔ بموجب حکم سرکار کے ان کو دخل دے دیا گیا اور یہ فرمایا کہ بالعوض اس کے دوسری جاگیر تم کو سرکار سے مرحمت ہوگی بعد چند روز کے صاحب ممدوح نے کہلا بھیجا کہ پانچ لاکھ روپیہ کی سند جاگیر دھول پور سے تمہارے نام آگئی ہے لیکن وہ سند ہمارے پاس تک نہیں آنے پائی، کہ اس اثنا میں موصوف ولایت چلے گئے۔ بعد چند سال کے مہاراجہ جیت سنگھ بہادر نے انتقال فرمایا۔ اسی تاریخ سے ہماری والدہ کے نام سے واسطے پرورش خاندان مہاراجہ صاحب کے دو ہزار روپیہ ماہواری سرکار دولت مدار انگریزی سے متعین ہوا اور بعد وفات والدہ ماجدہ ہماری کے وہی دو ہزار روپے ہمارے نام مقرر ہوئے چنانچہ وہ آج تک جاری ہیں۔ اور بسبب خیر خواہیِ ایامِ غدر زیادہ تر موردِ عنایاتِ سرکار ہوں۔"

اس کے علاوہ راجہ صاحب نے اپنی مثنوی میں جس کا مفصل ذکر آگے آرہا ہے اپنا تعارف اس طرح کرایا ہے۔

پہلے کچھ اپنا حال ہو تحریر — تا یہ ظاہر ہو کون ہے یہ حقیر
شکرِ خالق کروں نہ کیوں ہر دم — ذرۂ آفتاب تابانم
مجھ کو اُس قوم میں کیا پیدا — ہند میں جو ہیں اشرف اعلیٰ
شکرِ خالق کا کس زباں سے کروں — یعنی گوتم برہمنوں میں ہوں
جد و آبا ہوئے ہیں والیِ ملک — رہے سہتے رئیسِ عالیِ ملک
یعنی راجوں میں راجہ کاشی — مرتبہ اُن کا کیوں نہ ہو عالی
راجہ بلونڈ سنگھ عالی قدر — جدِ امجد تھے میرے زینت بخش
پسر راجہ جیت سنگھ ہوں میں — جگرِ راجہ جیت سنگھ ہوں میں
عجز لیکن ہے یاں طبیعت میں — خاکساری ہے اپنی طینت میں
جد و آبا پہ افتخار نہیں — جاہ و حشمت کا اعتبار نہیں
کیجیے کوئی اس طرح کا کام — جس سے باقی رہے جہاں میں نام

اور راجہ صاحب کا نام حقیقت میں اسی کام سے باقی ہے۔ راجہ صاحب کا دیوان اور مثنوی میرے خاندانی کتب خانے میں محفوظ ہے۔ دیوان کا نام گلِ ریاض نہیں ہے بلکہ "گلِ ریاضِ راجہ" ہے، راجہ کا لفظ کاتب نے اس طرح لکھا ہے کہ سرسری نظر اس سے گزر جاتی ہے۔ یہ نام تاریخی ہے جس سے ۱۲۶۰ھ نکلتا ہے جو ۱۸۵۳ء سے مطابق ہے۔ دیوان ۱۲۶۰ھ میں مطبع عظیم الاخبار آگرہ محمد حیدر علی خاں کے اہتمام اور مرزا عنایت علی بیگ ماہ کی تصحیح سے چھپا ہے۔ ماہ مرزا ہر شیخ ناسخ کے اور مرزا ماہ خواجہ آتش کے شاگرد تھے۔ راجہ صاحب کے دیوان میں دو سو چھتر غزلیں، کچھ متفرق مطلعے اور شعر پانچ چوربا عیاں اور قطعے، ایک تضمین خواجہ آتش کی غزل پر ایک تضمین شیخ ناسخ کی غزل پر ایک خود اپنی غزل پر ایک مسدس اور ایک ترجیع بند ہے۔ آخر میں مرزا ہر، مرزا ماہ خلیفہ گلزار علی اسیر دوسرے شعراء کی تاریخیں اور تقریظیں ہیں۔

راجہ صاحب کے کلام پر آپ مصنف مخزنِ جاوید کی رائے ملاحظہ فرما چکے ہیں جو اگرچہ بہت مختصر ہے۔ مگر جامع بھی ہے۔ جبھرے کی طوالت سے قطع نظر کرکے راجہ صاحب کی چند مکمل زمینوں کے مطلعے اور چند شعر پیش کئے جاتے ہیں جس سے شاعر کی کہنہ مشقی قادر الکلامی اور مہارتِ فن کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

دیوان اُس زمانے کے دستور کے مطابق حمد و نعت سے شروع ہوا ہے۔ حمد کے تیور ملاحظہ ہوں۔

حُسنِ صنم سے نورِ خدا جلوہ گر ہوا — سنگِ بتاں سے طور میں روشن شرر ہوا
انگشتِ احمدی سے جو شق القمر ہوا — وہ مطلعِ بیاضِ دلِ نوحہ گر ہوا
کیا مدح یا تراب سے مجھ میں اثر ہوا — مٹی کو میری رتبہ کحل البصر ہوا

یہاں یہ ذکر بے موقع نہ ہوگا کہ راجہ صاحب کو حضرت علی علیہ السلام سے بے پناہ عقیدت ہے، اُن کے دیوان اور مثنوی میں جگہ جگہ حضرت کی مدح ملتی ہے۔

مشکل زمینوں کے کچھ مطلعے ملاحظہ ہوں۔

روشنیٔ داغِ دل کرتی اگر تعبیرِ صبح — تیرگی گورِ بتی مطلعِ خورشیدِ صبح
تارے ہیں موتیا تو روشن کہکشانِ چرخ — ہے چاندنی ہے بھر گل زعفرانِ چرخ
دہر سے آئینے نے دکھائے جلال چار — اب چار چشم ہو کے دکھا تو غزال چار
غضب ہے صبح کا عالم جبھی کے منہ پہ — ہوائی اُڑنے لگی ماہتاب کے منہ پر
یہ کس کی زلف کا آیا خیال شام کے وقت — کہ پڑ گیا مری آنکھوں میں بال شام کے وقت
مرغِ باغِ ش پہ بلبلِ گلزار کے پر — کچھ بھی کام آئے نہ اس طائرِ بے کار کے
کیوں تو ڈوبوں بحرِ جنوں میں کسی تدبیر کے بغیر — کٹ جائے گی گھس گھس کے پتھر تیشے بغیر

دیر میں جھاڑ دی کعبے کے بُتوں نے پتھر　　خاک چھانی کبھی ہم نے کبھی روئے پتھر

دیوان میں غزلوں کی اکثریت اسی قسم کی مشکل زمینوں میں ہے اور طرفہ یہ کہ غزلوں میں عموماً ۱۸۔ ۱۹ اشعر سے کم نہیں ہیں۔ چند شعر اور مختلف غزلوں میں سے ملاحظہ فرمائیے۔

یہی گرد رد کا عالم رہے گا　　جئے گا تیرا شیدائی کہاں تک

پڑا جو کان کے بالے کا عکس عارض پر　　چمکتی آئی نظر ہم کو آفتاب میں برق

جنوں کی ساری علامت ہے تیز و تیشی میں　　اُدھر کو پھروں ہی دیکھا جدھر خیالِ بتاں

پھٹک سے اب نہیں دوا کا کام　　ہو گیا تیرے مبتلا کا کام

کس رات ایک قصہ نہ ہم نے سنا تمام　　اب تک مگر فسانۂ گیسو ہے ناتمام

نکہت کی طرح سیرِ گلزار جہاں ہوں　　دم لے ابھی باد سحری اور کوئی دم

ذکر آیا مرا تو کہنے لگے　　اس کا بلوانا کچھ ضرور نہیں

بھولی باتوں پہ اس کی مرتا ہوں　　حُسن ایسا، مگر غرور نہیں

کیوں نشے میں بہکتا ہے راجہ　　ماہ ہے ساغرِ بلور نہیں

شرارے اُڑنے لگے رنگ گل ہے اے بلبل　　چمن کی خیر نہیں آشیاں کی خیر نہیں

اس کے جی میں جو ہے نیکی تو ہیں بدظن کتنے　　ایک وہ دوست ہوا ہو گئے دشمن کتنے

ہے عالم فانی یہ جہاں کس کا کریں غم　　یاں نام و نشاں عرش نہ ہیں فرش نہ ہیں گے

دوسری تصنیف راجہ صاحب کی یہ مثنوی ہے جس کا تاریخی نام "داستانِ گل بکاؤلی" ۱۲۷۶ھ ہے (مطابق ۱۸۵۹ء) یہ مثنوی مارچ ۱۸۶۱ء میں مطبع حیدری واقع کٹرہ حاجی محمد محسن میں مرزا علی حسین کے اہتمام سے چھپی ہے۔ اس مثنوی میں ۱۳۷۴ شعر ہیں۔ زبان شستہ اور صاف ہے اور غزلوں کی طرح یہاں بھی راجہ کی کہنہ مشقی اور قادر الکلامی نمایاں ہے۔ حمد و نعت اور حضرت علی علیہ السلام کی منقبت کے چند شعروں کے بعد اپنا حال ہے جو اوپر گزر چکا ہے۔ اس کے بعد آغاز داستان ہے۔ داستان کی نوعیت گل بکاؤلی کی سی ہے۔ یعنی ایک بادشاہ خواب میں ایک باغ اور اس میں مرغِ زریں کو دیکھتا ہے۔ بیدار ہونے پر اس کے اشتیاق میں بے قرار ہوتا ہے اور حکم دیتا ہے کہ کسی طرح مرغِ زریں کو حاصل کیا جائے دربار یا یہ میں سے کوئی بھی تعمیلِ حکم کی ہمت نہیں کرتا۔ آخر بادشاہ کے سات لڑکے اس کام کا بیڑا اٹھاتے ہیں اور آخر میں سب سے چھوٹا بیٹا دیوؤں اور پریوں کے پہروں میں سے گزرتا ہوا مرغ کا پنجرہ حاصل کر لیتا ہے اور اسی کے ساتھ اس کی مالکہ سے جو ایک پری ہے اس کی شادی ہو جاتی ہے۔

اس مثنوی کا دوسری مثنویوں سے موازنہ اور محاکمہ میرا مقصود نہیں ہے۔ آپ کے مطالعے میں مشہور مثنویوں کے وہ مراقبے آئے ہوں گے، جہاں شاعر باغ کا نقشہ، محبوب کا سراپا اور جشن کا مرقع کھینچتا ہے۔ درحقیقت یہی چند مقام ایسے ہیں جہاں شعرا اپنا زورِ طبع دکھاتے آئے ہیں۔ راجہ صاحب کی مثنوی میں سے دو ایسے ہی مقامات کا اقتباس ملاحظہ فرمائیے۔

پریوں اور حسینوں کے سراپا آپ نے بہت ملاحظہ فرمائے ہوں گے۔ راجہ صاحب نے بھی حسینوں کا سراپا کئی جگہ لکھا ہے۔ مگر ان کے قلم سے کھنچی ہوئی ایک دیوبنی کی تصویر دیکھئے۔ سر سے لے کر پاؤں تک کوئی جگہ بھی نظر انداز نہیں کی گئی ہے۔

پہلے گھوڑے کو کھا گئی باہر　　پیچھے کو دی وہ باغ کے اندر

کالی رنگت تمام جسم پہ بال　　دانت باہر ہوں سے آنکھیں لال

سرا پاک گنبد دوار　　بال بھی کمبلوں کا ایک انبار

مانگ بھی یوں نمود تھی سر کی　　صاف جیسے سڑک جلیسر کی

حال چوٹی کا کیا کروں میں بیاں　　جس طرح آگ پوٹ کا ہو دھواں

اُس کے چہرے پہ دونوں زلفیں یوں　　جیسے دو لٹھے آبنوس کے ہوں

چوڑی چکلی تھی ایسی پیشانی　　جس طرح اُلٹی ناؤ کی ہو تلی

ابروئیں نقشہ آرے کا بالکل　　ناک جس طرح جون پور کا پل

آنکھیں دونوں الاؤ کی صورت　　حدقے اُن کے کڑھاؤ کی صورت

اُبھرے اُبھرے تھے اس طرح وہ گال　　جیسے پانی سے پھول جائے پھپھال

تھے نجس ایسے اس کے دونوں کان　　جیسے تیلی کی ہو کثیف دوکان

ہونٹ دونوں تھے اس قدر پھیلے　　دو کڑاؤ ہوں جیسے دریا کے

تھا دہن اُس کا گویا کرۂ نار　　دیر دوزخ کی شکل آتش بار

چوکا دانتوں کا چونکا تھوں کا　　ہو خلال اس میں تو درختوں کا

تھی درازی یہ اس کے دانتوں کی　　جن میں دندانِ فیل ایک کچلی

ایک چھے کا چرسہ مذہبیں دریاں　　دیکھ کر جس کو عقل ہو حیراں

اور بھوپال تال چاہِ ذقن　　خال تھا یا کہ اژدہے کا ہو پھن

کالی کالی تھی لمبی وہ گردن　　جس طرح سے سڑک کا ہو سیلن

اڑنے بھینسے وہ دونوں شانے تھے　　ایسے شانے اسی کو پانے تھے

بازو ایسے نظر نہ آئے کہیں　　مچھلیاں دونوں وہ مگر مچھ تھیں

اس کی کہنی سے تا بہ پنجۂ دست — شکلِ خرطومِ شخصِ فیلِ مست
پنجے ہاتھوں کے دونوں تھالیسے — پنج شاخہ بجھا ہوا جیسے
نئی پھبتی یہ اور مجھ سے سُن — پاٹ چکی کا تھا ہر اک ناخن
اسٹی اٹھی تھی اس طرح چھٹی — دس منی جیسے تیل کی کپی
سینہ وہ مخزنِ کدورت تھا — جس پہ نو محلے کی پرت فدا
ایسا بیڈول چوڑا چکلا پیٹ — لے وہ دو چار شہر جس میں لپیٹ
شک نہیں ہے اگر کرو انصاف — تو حکیموں[1] کی ہتی گرامیا ناف
یہاں شاعر کمر کو کیوں چھوڑے — کوہِ البرز کی کمر توڑے
وصف پیڑو کا یہ ہے البتہ — دمدمہ تھا قریب کلکتہ
رانیں لوہے کے پل کا پیا تھیں — تھی لگان ایک نا ڈاک کے قریں

.. .. — .. ..

پنڈلیاں لمبی لمبی وہ دم جست — کہ دھوریرا ہو مادھو اس کا پست
ایڑیاں پنجے اور وہ کفِ پا — خاتمہ جن پہ ہے نجاست کا
کیوں نہ ہو بیچ اس کے آگے تاڑ — قد و قامت سپہر کی اڑ واڑ

اسی طرح ایک سراپا شاہزادے کا، ایک جوگن کا اور ایک نور پری کا ہے۔ باغ کی تفصیلات جشن اور دوسرے مناظر کی مفصل عکاسی کی گئی ہے۔ مضمون طویل ہو گیا۔ مگر دیوتا کے سراپا سے اگر طبیعت بدمزہ ہو گئی ہو تو یہ نور پری کا سراپا مزاج کو اعتدال پر لے آئے گا۔

سر تو سرمایۂ غرور و خیال — اس پہ اندھیرا اور سر کے بال
سیدھی سیدھی وہ مانگ کی تھی لکیر — اک جہاں جس لکیر پر ہو فقیر
لمبی چوٹی کا تو بہانہ تھا — دلِ عاشق کو تا ذیانہ تھا
کہیں سودائیانِ سنجیدہ — کہ بلائیں کئی ہیں پیچیدہ
زلفیں چھوٹی ہوئی وہ شانوں تک — مارِ ضحاک کا ہو جن پر شک

[1] حکیموں کی گرامیا آگرے کے حکیموں کا ایک مشہور محلہ ہے

سر کو چھوڑے جو دیکھے پیشانی — سرب کہیں یوں تھی موت ہیش آنی
صاف دل کے یہی ہو نشیں — جو ہر آئینہ نہ ہے چینِ جبیں
جھلک کے ملتا ہے ابروؤں سے ہلال — اک اشارے میں ان کے سو بنتی چال
چشمِ بد دور آنکھ جادو کی — مژہ ٹٹی شکار آہو کی
کان وہ جن میں کوئی پھونک گیا — نہیں امکان ہو کوئی تم سا
کیوں نہ خود بینی اس کے ہمدم ہو — ناک وہ جس سے ناک میں دم ہو
کیا کہوں کس طرح کے تھے عارض — گل نے دیکھا تو تپ ہوئی عارض
نہیں ہرگز دہن میں جائے سخن — گو لگو کا مقام ہے تو دہن
کیا کہوں صفِ لب میں ندا میں — اسے لو بعلی گرمیِ بدخشاں میں
عشق چاہِ ذقن میں ڈانواں ڈول — ماہِ کنعاں کی طرح غول کے غول
گردن اس طرح کی صراحی دار — دخترِ رز کی جس پہ جان نثار
کس سے ہم دوش ہوئے وہ مہ چہر — سچ تو یہ ہے بقول مرزا ہجر

.. .. — .. ..

.. .. — .. ..

سینہ آئینۂ شباب نما — کچھ کچھ اس میں اُبھار کا نقشا
حسنِ جوبن کا گات میں اس کی — پنجۂ ہر گھات میں اس کی
شکمِ صاف ناف موئے کمر — سطحِ دریائے حسن موجِ بھنور
اب ہے آگے مقامِ ضبطِ نفس — قلمِ لو لہوس ٹھہر بس بس

.. .. — .. ..

.. .. — .. ..

ساقِ پا دونوں شمع کافوری — پائے رنگیں تو نارہ نوری
پاؤں بھی وہ کہ جن کو دیکھ کے غم — کہیں ہم تو نہ چھوڑیں گے قدم
ان میں پامال کرنے کے گن تھے — سخت دل عاشقوں کے ناخن تھے
سر سے پا تک تھی نور سے معمور — مصرعِ انوری قدیر پُر نور

کنہیالال کپور

حماقت

جب کالج میں پڑھتے تھے اور دوستوں اور رشتہ داروں کی ازدواجی زندگی کو قریب سے دیکھتے تھے تو سوچا کرتے تھے کہ زندگی میں بڑی سے بڑی حماقت کرلیں گے لیکن شادی نہیں کریں گے۔ یہ خیال اور بھی مستحکم ہوجاتا۔ جب آئے دن بڑے بھائی صاحب اور بھاوج میں نوک جھونک سننے کا موقعہ ملتا۔ آج بھاوج اس لئے ناراض ہیں کہ بھائی صاحب پانچ بجے کی بجائے سات بجے دفتر سے واپس آئے۔ آج اس لئے بگڑ رہی ہیں کہ وہ اکیلے سنیما دیکھنے کیوں گئے تھے اور کبھی اس بات پر جھگڑا ہو رہا ہے کہ وہ عورتوں کو مردوں کی بہ نسبت بیوقوف سمجھتے ہیں۔

جب کبھی بھاوج اپنی سہیلیوں کے ساتھ کسی جلسے میں شرکت کرنے جاتیں اور مُنّے کو سنبھالنے کا فرض بھائی صاحب کے ذمہ ہوتا اُس وقت اُن کی حالت نہایت قابلِ رحم ہوتی۔ مُنّا ہے کہ بے تحاشا چلّائے جا رہا ہے وہ اُسے چُپ کرانے کے لئے لاکھ جتن کر رہے ہیں۔ مگر مُنّا کم بخت مانتا ہی نہیں۔ "مُنّے! وہ دیکھو — وہ — طوطا — کتنا اچھا طوطا ہے، ہیں مُنّے؟ دیکھو۔ اِس کی چونچ کتنی اچھی ہے ۔۔۔۔۔۔ اچھا بابا اچھا۔ طوطا پسند نہیں؟ وہ چڑیا دیکھو۔ کتنی خوبصورت ہے۔ چُوں چُوں کرتی ہے۔ کرتی ہے نا؟ کتنی اچھی چڑیا ہے۔ چھوٹی سی! چوں چوں کرتی ہے، چُوں چُوں۔ چُوں چُوں۔ دیکھو مُنّے دیکھو"

لیکن مُنّا نہ طوطے کی طرف دیکھتا نہ چڑیا کی طرف بلکہ منہ بنائے لگاتار روئے چلا جاتا۔ مُنّے کہ بھائی صاحب کو غصّہ آجاتا۔ اور وہ چیخ کر کہتے "چپ بھی کرتا ہے یا نہیں، لگاؤں ایک تھپڑ"۔ تھپڑ کا نام سنتے ہی مُنّا اتنے زور سے رونے لگتا جیسے بیک وقت اُسے کئی بھبوؤں نے کاٹ کھایا ہو۔ ایسے اور اِس قسم کے مناظر دیکھ کر ہم دعا مانگا کرتے تھے کہ خدا شادی سے ہر شخص کو محفوظ رکھے۔

ایم۔ اے کرنے کے بعد کالج میں ملازمت مل گئی تھی۔ کوچہ چابک ماراں کے نکڑ پر ایک چھوٹا سا کمرہ کرائے پر لے رکھا تھا۔ اس میں ایک معمولی درجے کا صوفا تھا۔ دو تین کرسیاں، چند دلچسپ کتابیں۔ ایک پالتو کتا اور ایک وائلن۔ پڑھتے پڑھتے اُکتا گئے تو کتّے سے کھیلنے لگے۔ کتّے کی شرارتوں سے تنگ آگئے تو وائلن بجانا شروع کر دیا۔ کھانا ایک متوسّط درجے کے ہوٹل سے کھاتے تھے اور ہر چند کہ وہ اِس قسم کا ہوتا تھا کہ بسا اوقات محسوس ہوا جیسے ہم کھانے کو نہیں، کھانا ہمیں کھائے جا رہا ہے۔ پھر بھی خدا کا شکر بجا لاتے تھے کہ اُس کھانے سے بہتر ہے، جو ہزاروں بیویاں آئے دن اپنے خاوندوں کو کھلاتی ہیں۔

بڑے آرام سے زندگی گزر رہی تھی، مگر وہ جو کسی نے کہا ہے کہ چرخِ کج رفتار کسی کو چین سے رہنے نہیں دیتا، وہی معاملہ ہوا۔ ہمارے خاندان میں ایک بزرگ تھے جنھیں ہر کنوارے آدمی سے چڑ تھی، اُن کا تکیۂ کلام تھا "اکیلے آدمی کی بھی کیا زندگی ہے!" عقیدہ اُن کا یہ تھا کہ اگر انسان دو تین شادیاں نہ کرسکے تو کم از کم ایک تو ضرور کرے۔ یہ بزرگ ہاتھ دھو کر ہمارے پیچھے پڑ گئے۔ وقت بے وقت اُنھوں نے ہمیں یہ ذہن نشین کرانا شروع کر دیا کہ شادی نہ کرکے ہم ایک گناہِ عظیم کا ارتکاب کر رہے ہیں۔ جب کبھی ملتے کسی فلسفی یا سربرہرے کا حوالہ دے کر فرماتے "حکیم چن چاؤ خوں نے لکھا ہے کہ جو شخص شادی نہیں کرتا وہ فرشتہ ہے یا پاگل۔ امریکہ کے ایک ماہرِ نفسیات کا کہنا ہے کہ وہ شخص زندگی میں کبھی باپ نہیں کہلا سکتا جس نے شادی نہیں کی"

ہم متانت سے عرض کرتے "بہرحال ہمارا شادی کرنے کا ارادہ نہیں۔ کیونکہ ہم شادی کو اچھی خاصی مصیبت سمجھتے ہیں"

ہفتہ عشرہ کے بعد بزرگ سے پھر ملاقات ہوتی اور وہ چھوٹتے ہی

شادی کا ذکر چھڑ دیتے "میرے ایک دوست ریٹائرڈ مجسٹریٹ ہیں، اُن کی لڑکی ایم، اے پاس ہے۔ نہایت شریف لڑکی ہے۔ رنگ ذرا سانولا ہے۔ لیکن جہیز معقول ملے گا۔"

"میرے ایک دوست کے دوست ٹھیکیدار ہیں۔ اُن کی بھتیجی بی اے بی ٹی ہے۔ گورنمنٹ اسکول میں پڑھاتی ہے۔ پاؤں میں معمولی سا نقص ہے۔ جہیز میں کم از کم تیس ہزار۔" ہم ان کی بات کاٹ کر کہتے "ہمیں بیوی کی ضرورت ہے نہ جہیز کی۔ آپ کسی اور سے بات کریجئے۔" بزرگ برابر فرمائے جاتے "آپ کو دونوں کی ضرورت ہے۔ لیکن خدا جانے آپ کی عقل پر کیسا پردہ پڑ گیا ہے کہ آپ ایک کی بھی ضرورت محسوس نہیں کرتے۔"

ایک دن ہم بیمار پڑ گئے۔ بزرگ تیمارداری کو آئے۔ اُس دن انھوں نے "شادی کی ضرورت" پر کچھ ایسے مؤثر انداز میں لیکچر دیا کہ ہمیں اُن پر ایمان لانا ہی پڑا۔ کہنے لگے "دیکھا، یہ حال ہوتا ہے غیر شادی شدہ کا۔ درد سے کراہ رہے ہیں، اور کوئی پوچھنے والا نہیں۔ خدانخواستہ اگر یوں ہی لیٹے لیٹے آپ پر نزع کی حالت طاری ہو جائے تو آپ وصیت بھی نہ کر سکیں گے۔ بیوی پاس ہوتی تو کم از کم آپ کی وصیت تو لکھ لیتی۔ سچ کہا ہے حکیم فیلی فیلی دراز نے "اکیلے آدمی کی بھی کیا زندگی ہے۔" ذرا اپنے کمرے کا نقشہ ملاحظہ فرمائیے۔ کتابیں بے ترتیبی سے بکھری پڑی ہیں۔ کچھ کا غلاف حد سے زیادہ میلا ہے۔ کرسیاں گرد سے اَٹی پڑی ہیں۔ فرش کا بُرا حال ہے۔ بیوی ہوتی تو بخدا اس گھر کا نقشہ ہی دوسرا ہوتا۔"

دو ہفتے بیمار رہنے کے بعد جب تندرست ہوئے تو ہم واقعی محسوس کرنے لگے کہ اکیلے آدمی کی واقعی کوئی زندگی نہیں۔ چنانچہ اب جو بزرگ سے ملاقات ہوئی اور اُنھوں نے حسبِ معمول کہا "میرے ایک دوست ریٹائرڈ ہیڈ ماسٹر ہیں۔ اُن کی لڑکی ایف اے فیل ہے بڑی ذہین لڑکی ہے۔ قد ذرا ۔۔۔۔" تو ہم نے فوراً کہا "قطع کلام معاف، ہمیں منظور ہے۔"

بزرگ نے کرسی میں اُچھلتے ہوئے فرمایا "بخدا زندگی میں پہلی بار تم نے عقل سے کام لیا ہے۔"

شادی ہو گئی، اور گھر کا نقشہ بدلا جانے لگا۔ پرانے صوفے کی جگہ جہیز میں آئے ہوئے نئے صوفے نے لی۔ ٹوٹی ہوئی کرسیاں نیلام گھر بھجوا دی گئیں۔ آتش دان پر پہلی بار گلدستے رکھے گئے۔ ردی کے ڈھیر باہر پھنکوا دیئے گئے۔ فرش کو مل مل کر دھویا گیا۔ غرضیکہ در و دیوار کی صورت بدل ڈالی گئی۔ اس نئے ماحول میں مسرت اور سکون کا ایسا دلکش احساس تھا کہ ہمیں اپنے آپ پر رشک آنے لگا۔ شروع شروع میں شریمتی جی اس سلیقے اور نزاکت سے پیش آئیں کہ آدرش ہندو بیویوں کی یاد تازہ ہو گئی۔ اگر نہانے کے لئے پانی طلب کیا تو فوراً گرم پانی مہیا کیا گیا۔ اگر صرف چائے کا مطالبہ کیا تو چائے اور ٹوسٹ حاضر کئے گئے۔ اگر پاؤں دبانے کو کہا تو وہ پاؤں کے ساتھ سر بھی دبانے لگیں۔ مگر جوں جوں وقت گزرتا گیا معلوم ہوا کہ شریمتی جی وہ نہیں جو نظر آتی ہیں۔ تین چار ماہ کے بعد محسوس ہوا کہ

زمانے کے انداز بدلے گئے نیا دور ہے ساز بدلے گئے

شریمتی جی بات بات پر سیخ پا ہونے لگیں۔ ایک دن ہم صبح کے وقت واش بیسن پر کھڑے تھے کہ انھوں نے ساتھ والے کمرے سے چلّا کر کہا "بند بھی کیجئے یہ ٹرٹر ٹرٹر۔ سنتے سنتے کان بھی پک گئے۔" ہم نے عرض کیا یہ ٹرٹر نہیں، بھیرویں کا الاپ ہو رہا ہے۔" وہ ہمارے قریب آ کر بولیں "ہونگا بھیرویں کا الاپ، لیکن اِسے ختم کیجئے۔ مجھے اس شور و غل سے وحشت ہونے لگتی ہے۔" دو ایک دن کے بعد ایک نیا جھگڑا کھڑا ہو گیا۔ شریمتی جی کہنے لگیں "آپ کے اس نگوڑے کتّے نے ہماری بلّی کا دم ناک میں کر رکھا ہے۔ ایک منٹ چین نہیں لینے دیتا۔ اِسے یا تو خود کہیں چھوڑ آیئے ورنہ میں اسے گھر سے نکال باہر کروں گی۔"

ہم نے بڑی عاجزی سے کہا "شریمتی جی! ہم نے مانا کہ آپ کو اپنی بلّی بہت عزیز ہے کہ آپ اُسے بیکے سے ساتھ لائی تھیں۔ لیکن یہ بھی تو سوچئے کہ ہمارا کتّا بھی ہمیں کم عزیز نہیں۔"

"عزیز ہے، تو اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ ہماری بلّی پر ناجائز رعب جماتا پھرے۔" انھوں نے چمک کر کہا۔

ہم نے شرارتاً عرض کیا "آپ ہم پر رعب جماتی ہیں، اگر ہمارے کتّے نے آپ کی بلّی پر رعب جما لیا تو کیا مضائقہ ہے۔"

اُنھوں نے مزاح کے پہلو کو نظر انداز فرماتے ہوئے جواب دیا، "مجھے اُس کی حرکتیں بالکل پسند نہیں۔ خیریت اسی میں ہے کہ اسے کہیں چھوڑ آئیے۔"

ایک عجیب بات جو شریمتی جی میں دیکھی، یہ تھی کہ اُنھیں ہر اُس چیز سے نفرت تھی جو ہمیں پسند تھی۔ اگر ہمیں مطالعہ مرغوب تھا تو اُنھیں کشیدہ کاری۔ اگر ہم شیکسپیئر پر جان دیتے تھے تو وہ کالی داس پر۔ خاصکر شریمتی جی کو ہمارے "مضامین" سے خدا واسطے کا بیر تھا۔ گھنٹوں کی مغز پچی کے بعد جب ہم ایک اچھا مضمون لکھتے اور داد طلب نگاہوں سے اُن سے سننے کی فرمائش کرتے تو وہ ناک بھوں چڑھا کر کہتیں "مضمون پھر کبھی سنا یئے گا۔ پہلے ہماری بلی کو وٹرنیری ہسپتال لے جائیے۔ بیچاری کو کل سے کھانسی ہو رہی ہے۔"

خیر یہ تو سب زمانۂ ماضی کی باتیں ہیں۔ اب جب کہ ہماری شادی کو بیس برس ہو گئے ہیں اور ہم نصف درجن بچوں کے والد بزرگوار ہیں حالت اور بھی ناگفتہ ہے۔ ہم نے سمجھا تھا کہ کچھ مدّت کے بعد شریمتی جی کے مزاج میں سنجیدگی آجائے گی۔ لیکن معلوم ہوا کہ یہ محض ہمارا وہم تھا۔

ان دنوں یہ کیفیت ہے کہ شاید ہی کوئی دن ہوتا ہوگا جب ایک آدھ جھڑپ نہیں ہوتی اور کئی بار تو ایک ہی دن میں کئی جھڑپیں ہو جاتی ہیں۔

ہم تھکے ماندے شام کے چار بجے کالج سے واپس آئے۔ شریمتی جی ایک جاسوسی ناول پڑھ رہی تھیں۔ ہم نے بڑی مدھم آواز میں کہا "بہت پڑھ لیا اب اُٹھیے۔ چائے کا انتظام کیجیے۔" اُنھوں نے سُنی اَن سُنی کرتے ہوئے ناول کا مطالعہ جاری رکھا۔ ایک آدھ منٹ کے بعد ہم نے پھر کہا "چھوڑیئے اب اِسے۔ پھر کسی وقت پڑھ لیجئے گا۔" اِس بار اُنھوں نے خشم آلود نگاہوں سے ہماری طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا "واہ! واہ! آپ بھی کمال کرتے ہیں۔ ابھی ابھی تو کہانی کا لطف آنے لگا ہے۔ چھوڑ کیسے دوں؟"

"آخر لطف آنے لگا ہے ہوتا ہی کیا ہے ان ناولوں میں"

"واہ! ہوتا کیوں نہیں۔ ڈاکو پانچوں قتل کر کے بھاگ گیا ہے۔ پولیس جیپ میں بیٹھ کر تعاقب کر رہی ہے۔ سارے شہر میں کہرام مچا ہوا ہے، اور آپ کہتے ہیں یہ ہی کچھ نہیں رہا"

چند منٹ بعد ہم نے پھر اُن کی توجہ چائے کی طرف دلائی، وہ بدستور ناول پڑھتی رہیں۔ آخر تنگ ہو کر ہم نے کہا "خود غرضی کی حد ہو گئی۔ یہاں چائے بغیر دم نکلا جا رہا ہے، اگر ہے کسی کو خیال؟"

"جی ہاں۔ اور آپ کم خود غرض ہیں نا" انھوں نے طنز کا بھرپور وار کرتے ہوئے کہا "یاد ہے، پرسوں کہا تھا، سنیما لے چلئے اور ٹکا سا جواب دیا تھا "مجھے مسز نلنی کی پارٹی پر جانا ہے"

"ہاں ہاں کہا تھا۔ مگر ہم مسز نلنی کی پارٹی سے کیسے غیر حاضر ہو سکتے تھے"

"ٹھیک ہے، تو پھر جائیے نا مسز نلنی کے ہاں۔ آج بھی اُسی سے چائے پی لیجئے"

چائے کے عوض ہم لہو کے گھونٹ پی کر رہ گئے۔

کسی رات ذرا دیر سے گھر لوٹے۔ انھوں نے بچوں کی موجودگی میں ہی ہمارا کورٹ مارشل شروع کر دیا۔

"شکر ہے، آپ کو گھر کی بھی یاد آئی۔ ذرا دیر سے آنا تھا، ابھی تو گیارہ ہی بجے ہیں"

ہم نے اپنی صفائی میں ایک آدھ معقول عذر پیش کیا، اُنھوں نے بالکل اس کی پروا نہ کرتے ہوئے کہا

"جی ہاں گھر جائے جہنم میں، آپ کو آئے دن جلسوں اور کانفرنسوں سے کام۔ کوئی نہ بھی مدعو کرے، جائیں گے ضرور۔ وقت جو برباد کرنا ہوا"

"دیکھئے آپ زیادتی کر رہی ہیں۔ مجھے اس جلسے کی صدارت کرنا تھی"

"جی ہاں، بھلا آپ کے علاوہ انھیں اور کوئی صدر کہاں ملے گا۔ قابل ترین آدمی جو ٹھہرے آپ"

"قابل ہوں یا نا اہل، جب کوئی مدعو کرے جانا ہی پڑتا ہے"

"تو کون کہتا ہے نہ جائیے، آپ کو ڈر کس کا ہے"

"ڈر نہ ہوتا تو واپس گھر کیوں آتے"

"بڑا احسان کیا ہے۔ پھر چلے جائیے۔ کسی اور جلسے کی کرسیٔ صدارت انتظار کر رہی ہوگی"

"آپ تو خواہ مخواہ ناراض ہوتی ہیں"

"جی ہاں، یہ میری پرانی عادت ہے"

"یہ میں نے کب کہا۔ میرا مطلب ہے۔ آپ کی طبیعت ۔۔۔۔"

"جی ہاں میری طبیعت بہت بُری ہے قسمت اِس سے بھی بُری ہے"

"آپ پھر قسمت کا رونا لے بیٹھیں۔ آخر ہو کیا گیا؟"

"کچھ بھی نہیں ہوا۔ میں تو پوری پاگل ہوں"

"میں نے آپ کو پاگل تو نہیں کہا"

"نہیں کہا تو اب کہہ لیجئے۔ یہ حسرت بھی کیوں رہ جائے"

نتیجہ اس بحث کا یہ ہوا کہ اُنھوں نے بڑی بے دلی سے کھانا پیش کیا۔ ہم نے دو چار لقمے زہر مار کئے اور چپ چاپ سونے کے کمرے میں چلے گئے۔

کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ سیر و تفریح سے گھر لوٹے اور عجیب نظارے دیکھنے کو ملے۔ بڑے لڑکے نے چھوٹے کو بڑی بے رحمی سے پیٹا ہے، وہ دھاڑیں مار مار کر رو رہا ہے۔ چھوٹی ممّی کو بخار ہے درد سے کراہ رہی ہے۔ سب سے چھوٹا منّا دودھ کے لئے چلّا رہا ہے۔ شریمتی جی غیظ و غضب کی حالت میں اپنا غصّہ کبھی ایک اور کبھی دوسرے بچے پر اُتار رہی ہیں۔ اور ساتھ ساتھ ایسی بد دعائیں دے رہی ہیں کہ اگر وہ قبول ہو جائیں تو گھر میں اُن کے سوا کوئی زندہ نہ رہے۔

یہ نظارے دیکھ کر جی چاہتا ہے کہ گھر بار چھوڑ کر بھاگ جائیں اور ایک وفد پھر کوچہ بلی ماران کے نکڑ والے مکان میں جا بسیں۔ جہاں اپنے سوا کوئی نہ ہو۔ بس ایک معمولی صوفا۔ دو تین کرسیاں، چند دبکے کتابیں۔ ایک کتا اور ایک دالمن۔ پڑھتے پڑھتے اکتا جائیں تو کتے سے کھیلنے لگیں۔ کتے کی شرارتوں سے تنگ آ جائیں تو دالمن بجانا شروع کر دیں۔

ایک نیا پودا

آسام اور سکم کے جنگلات میں ایک پودا دریافت کیا گیا ہے جس کی جڑوں میں بہت عمدہ خوشبو ہوتی ہے۔ اس پودے کا نام کچھو گندلی ہے اور یہ خصوصاً بنگال میں دواؤں میں کام آتا ہے۔ اس کے تنکے پینے کے تمباکو، نسوار اور زردہ بنانے میں استعمال کئے جاتے ہیں۔

اس پودے کے خوشبودار جز کو زیادہ کارآمد بنانے کی غرض سے فارسٹ ریسرچ انسٹی ٹیوٹ دہرہ دون کی لیبارٹری میں تحقیق کی گئی۔ اس تحقیق سے یہ معلوم ہوا ہے کہ اس سے بھاپ کے ایک طریقے کے ذریعے ایک ہلکے زرد رنگ کا صاف شفاف تیل نکالا جاتا ہے۔ اس کی خوشبو بھینی اور موسم بہار کے سوسن کی خوشبو سے ملتی جلتی ہوتی ہے۔ پودے کی خشک جڑوں سے پانچ فی صدی کے قریب کارآمد تیل نکلتا ہے۔ اس تیل کی کیمیائی خاصیت کی تحقیقات سے یہ ظاہر ہوا ہے کہ یہ تیل عطریات کے لئے ایک سستا اور مفید جز ثابت ہو سکتا ہے۔

سائنس اور تحقیقاتی کونسل کے ماہانہ ہندی بلیٹن "وگیان پرگتی" کی ماہ جون ۱۹۵۳ء کی اشاعت میں یہ تیل نکالنے کا طریقہ اور اس کے اجزائے متعلق پوری پوری تفصیل شائع کی گئی ہے۔

روس میں بھارتی فن کی نمائش

روسی فن کاروں کی یونین کی دعوت پر روس میں بھارتی فن کی نمائش منعقد کرنے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ یہ نمائش بھارت سرکار کے زیر اہتمام منعقد کی جا رہی ہے اور اس میں بھارتی فن کے جو نمونے پیش کئے جائیں گے اُن کا انتخاب آل انڈیا فائن آرٹس اینڈ کرافٹس سوسائٹی نے کیا ہے۔ سوسائٹی مذکور کے آنریری جنرل سکرٹری شری برداکانت، شری این سی بھٹاچاریہ۔ شری کے، کے ہیبر اور شری کے، کے سین، بھارتی فن کار اور نمائش منتظمین روس میں یونین آف سوویٹ آرٹسٹس کے مہمان ہوں گے۔

نمائش میں پیش کرنے کے لئے سنگ تراشی کے ۱۰ نمونوں، راجپوتوں اور مغلوں کے زمانے کی ۲۰ تصاویر، جدید مصوری کی مختلف اقسام کے ۲۵ نمونوں۔ قدیم فن مصوری کی نمائندگی کرنے والی ایک سو نگینی تصاویر اور پارچہ بافی۔ سنگ تراشی اور لکڑی اور ہاتھی دانت پر کندہ کاری کے مختلف نمونوں کی ساٹھ تصویروں کا انتخاب کیا گیا ہے۔

یہ نمائش اڑھائی مہینے روس میں رہے گی اور تین اہم مقامات پر دکھائی جائے گی۔ اس کے بعد وسط اکتوبر میں یہ نمائش دو ہفتوں کیلئے ہلسنکی (فن لینڈ) میں اور پھر سٹاک ہالم (سویڈن) میں دکھائی جائے گی۔

مذکورہ فنی نمونوں کو واپس بھارت لانے سے پیشتر کچھ یورپ کے دوسرے ملکوں میں بھی ان کی نمائش کی جائے گی۔

غزل

زوالِ حُسن کو حُسنِ نگاہ کیا جانے
خزاں قدم بقدم ہے، بہار کیا جانے

لکھا ہے اُس کے مقدر میں اضطرابِ دوام
قرار کیا ہے، دلِ بے قرار کیا جانے

نصیبِ احتِ قربِ دوام ہو جس کو
وہ لذّتِ خلشِ انتظار کیا جانے

سمجھ رہے ہیں جسے سب گناہگار یہاں
اُسی پہ ہو کرمِ کردگار، کیا جانے

کئے پہ اپنے ہو خود منفعل بشرِ آخر
یہی ہو جبر، یہی اختیار، کیا جانے

تڑپ رہا ہوں میں اپنے گناہ گن گن کر
اسی کا نام ہو روزِ شمار، کیا جانے

کہاں یہ مے غریباں کہاں قدحِ وطن
یہ فرق گردشِ لیل و نہار کیا جانے

جو باؤں توڑ کے بیٹھے ہیں راہِ منزل میں
وہ کب اُٹھیں گے، کوئی شہسوار کیا جانے

بہ ایں کمالِ خرد کیوں ہے مائلِ الحاد
مقامِ جوش کو محرومِ زار کیا جانے

ایاغِ تازہ

ہم آج کیا غمِ دوراں کی بات ٹالیں گے
تجھے بھی اے غمِ جاناں کبھی بھلا لیں گے

ہے خاک پائے غریباں جبیں فروزِ حیات
مہ و نجوم زمیں پر کمند ڈالیں گے

یہ حادثہ کہ جو اک اک قدم پہ حائل ہیں
خود ایک دن تیرے قدموں کا آسرا لیں گے

ہزار ہوں وہ مرے شوقِ دید کے مانوس
کبھی نگاہ ملے گی تو سر جھکا لیں گے

یہ راہِ غم، رہِ دشوار ہی سہی اے دوست
تو کیا قدم رہِ دشوار سے ہٹا لیں گے

بلا جھپیں تری آنکھوں میں زندگی سرغ
وہ جامِ مرگ بھی ہنستے ہوئے اٹھا لیں گے

رہِ وفا میں ہے کچھ اور لغزشوں کا مقام
قدم بہک ہی گیا ہے تو کیا سنبھالیں گے

یہ بادہ خوار ہیں ننگِ شرابِ ساقی
پئیں گے آج تو کل کے لئے بچا لیں گے

بہت غیور ہیں آشفتگانِ لفِ نگاہ
ضرور گردشِ دوراں کے بل نکالیں گے

ایاغِ تازہ ہے جن کے لئے ہر ایک نفس
وہ کیا شراب کو جام و سبو میں ڈھالیں گے

زمانہ چیں بہ جبیں ہے تو بات کیا ہے روش
ہم اس عتاب پہ کچھ اور مسکرا لیں گے

وِدیا شنکر

دہلی سے جنیوا تک

یہ خط وِدیا شنکر صاحب آئی، سی، ایس جوائنٹ سیکرٹری ڈیفنس نے اپنے بچّوں کو جنیوا جاتے ہوئے تحریر کیا تھا۔
یہ خط انگریزی میں ہے اور ایسی اچھی ماہرانہ دادِ بیانہ انگریزی میں ہے کہ اس کا ترجمہ کرنے میں بہت دشواری کا سامنا کرنا پڑا۔
قارئین اس خط کی لوک پلک سے اندازہ کر سکتے ہیں کہ اگر زمانہ وِدیا شنکر صاحب کو فرصت دیتا تو ایک انشا پرداز اور ادیب کی حیثیت سے آج اُن کا آوازۂ شہرت کس قدر بلند ہوتا۔

جوشؔ

میں تمہیں اِس خط میں اپنے جنیوا کے سفر کی پوری رُوداد سناؤں گا۔

جب میں دہلی سے چلا تو ذرا بھی یہ محسوس نہ ہُوا کہ میں دیس سے کہیں باہر جا رہا ہوں۔ ہند کی مقدّس سرزمین ابھی تک میری نظر سے کِس ہو رہی تھی، میں اپنے وطن کی ہَوا میں سانس لے رہا تھا اور وطن کی شاداب فضا میں میرا مشامِ جاں مہک رہا تھا۔ تقریباً چار گھنٹے کی پرواز کے بعد جس میں آرام ہی آرام تھا، میں نے بمبئی کی سرزمین پر قدم رکھّا۔ یہ سرزمین بھی میرے لئے اُتنی ہی مانوس ہے کہ پل بھر کے لئے بھی دل میں کسی غیر معمولی خیال کی تحریک نہیں ہوئی۔ مجھے بمبئی ایک بچھڑے ہوئے رفیقِ دیرینہ کے مانند نظر آئی، ایسا محسوس ہُوا گویا بمبئی مجھ پر فدا ہے میں فدائے بمبئی!

جب میں جنیوا روانہ ہونے کے لئے دوبارہ ہوائی مستقر پر آیا تو میرے کان میں بھانت بھانت کی بولیاں گونجنے لگیں اور ایک اَفسانوی فضا کا عالم میرا منتظر مقدم کرتا ہُوا نظر آیا۔ ایک پہاڑی جنگل جو اپنے دوش پر دفاتر کو لئے ہوائی مستقر کے وجود کا جواز پیش کر رہا تھا، گرد و پیش کی فضا کو اجنبیت کی کیفیت بخش رہا تھا۔ لیکن آگے جو کچھ میری قسمت میں لکھا تھا وُہ اس سے کہیں بڑھ کر بدمزگی کا باعث تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ میرے وزن کے متعلق کسی کو کوئی فکر دامن گیر نہیں ہوئی ورنہ سوئی گو چلتے اور ۱۱۳ پاؤنڈ پر ٹپ ہوتے دیکھ کر، میں کٹ کر رہ جاتا، جی ہاں، گوشت پوست اور ہڈیوں کا ایک انسان جو آدمیوں کی طرح اپنے متعلق بھی ایک عام انسان ہونے کا دعویٰ کرتا ہے! مگر انھوں نے مجھے چھوڑ دینے کے بعد میری ہر چیز کو خوب خوب میزان پر کسا، سوٹ کیس، ہینڈ بیگ، اٹیچی کیس، اٹاچی، کتابیں، غرض کہ سبھی چیزیں کانٹے کے ہتّے چڑھ گئیں عملے کے تمام لوگ چاق و چوبند اور خوش خلق تھے۔ ہوائی مستقر کے افسر کے طفیل جو مجھے جانتا تھا، ہاں میرا نام مجھ سے پہلے پہونچ چکا تھا۔ کسٹم ہوائی مستقر، ٹی، ڈبلو، اے کے عملے کے سبھی لوگ میرے متعلق ہر تفصیل سے آگاہ تھے۔ ٹی، ڈبلو، اے کی کھڑکی سے فارغ ہو کر میں نے کسٹم والوں کے ساتھ کی طرف قدم اُٹھائے، جہاں کی لمبی لمبی پنچوں کو دیکھ کر یہ گمان ہوتا تھا کہ یہ مقام انسانوں کا نہیں بلکہ بھیڑوں کے گلّے کا علاقہ ہے۔ ہمارے سامان کے متعلق کسی کو بھی کوئی تشویش نہیں ہوئی۔ لیکن ہاں کرنسی کے متعلق یہ چاہا گیا کہ ایک ایک پائی کی مد واضح کی جائے۔ اس کے بعد بھی معائنے کے مرحلے کو طے کرنا تھا۔ میں نے تمام ضروری اور مطلوب سرٹیفکیٹوں سے خوب مسلّح تھا، چنانچہ میں نے اُنھیں وہ کتابچہ دکھایا جس میں وہ سرٹیفکیٹ منسلک تھے۔ جہاں تک ٹیکہ کے معائنے کا تعلق تھا، میں بات دکھانے سے بچ گیا، لیکن سلیقہ افسر نے اس پر اصرار کیا کہ وہ گوپال سوامی کو بہ نفسِ نفیس دیکھیں گے۔ میں انھیں وہاں تک لے گیا جہاں سوامی جی مستقر پر تمام قابلِ ذکر شخصیتوں کے گھیرے میں کھڑے ہوئے تھے۔ مجھے نہیں معلوم کہ سلیقہ افسر نے اُنھیں دیکھ کر کیا سوچا، ہاں میں نے تو یہ دیکھا کہ آنکھیں بھاڑ بھاڑ کر اُس نے گوپال سوامی کو دیکھا اور پھر صحتِ عامّہ کا یہ امین، واپس ہوائی مستقر پر ہم سے جُدا ہو گیا۔

اب میری آنکھوں کے سامنے وہ طیّارہ تھا، جس کے پروں کے سائے

میں مجھے پرواز کرنا تھا۔ اس کا نام اسٹار آف اری زونا تھا۔ اونچی برتھ اور چار انجنوں کا یہ طیارہ اچھا خاصا رعب داب کا مجسمہ نظر آرہا تھا اور اس محدود وقفے ارض پر جو شیڈ کے دروازے میں سے نظر آرہا تھا۔ وہ چھایا ہوا سا معلوم ہورہا تھا۔ حسب معمول جہاز کی روانگی کا اعلان ہوا اور ہم اس میں داخل ہونے کے لئے صف میں آگئے۔ نشستوں پر ہمارے ناموں کے لیبل لگے ہوئے تھے۔ ہم آرام سے اپنی اپنی جگہ بیٹھ گئے۔ اب ہم اپنے سازو سامان سمیت طیارے کے سپرد ہوچکے تھے۔ چند منٹ ہدایات کی نذر ہوئے پھر انجن میں گھڑگھڑاہٹ شروع ہوئی، انجن کی گھڑگھڑاہٹ میں ہم آہنگی پیدا کی گئی اور جب زمبش میں آگیا۔ میدان میں اپنے کو صحیح حالت میں لاکر جہاز نے اوپر کی طرف بھرا بھرا یہاں تک کہ دھرتی ماتا اس کی متحمل نہ ہوسکی، اس نے جہاز سے کنارہ کشی کرلی اور جہاز سطح زمین سے اوپر پرواز کرنے لگا۔ شروع شروع میں بتدریج اور پھر اچانک ہم بلندیوں کی طرف چڑھنے لگے حتیٰ کہ ہم کچھ دیر بعد سطح بحر سے کئی ہزار فٹ کی بلندیوں پر پرواز کرنے لگے۔

نشیب میں سمندر کا رنگ اور زیادہ نیلا ہوتا گیا اور بالآخر جب ہم دائرہ نظر، خط افق کے آخری نقطے پر پہونچے، جہاں سے دکن کی شہزادی بمبئی عالم اضمحلال میں، اپنے پاؤں پسارے نیم غنودگی کے نشے میں چور لیٹی ہوئی نظر آرہی تھی تو بائرن کی نظم چائلڈ ہیرلڈ کے یہ الفاظ ایک بیک میرے ذہن کی سطح پر ابھر آئے

" ——— الوداع، الوداع

میرا سایہ (طائر موہوم) نیلی فضا کے پار گم ہورہا ہے"

ہاں، ایک سایہ، ایک طائر موہوم، تین سو میل فی گھنٹہ کی رفتار سے فضائے نیلگوں میں گم ہورہا تھا۔ لیکن فضائے نیلگوں کی کیا شان تھی! نشیب میں بحیرۂ عرب کا عمیق آب نیلگوں، بلندی پر بہر سو مسحور چرخ نیلوفری ——! ان کے مابین بادلوں کی دبیز تہ جو لطافت کو ثقافت اور عالم علوی کو عالم سفلی سے جدا کرتی ہے۔ نیلے رنگ کی جھلک، ہماری پرواز کی بلندی اور آفتاب کی کرنوں کی بازیگری سے اپنی کیفیت بدلتی رہتی تھی لیکن از اوّل تا آخر یہ سماں حیات جاوداں کی طرح بیکراں، زماں و مکاں کی طرح بے حد و بے پایاں اور قضا و قدر کی طرح ناقابل فہم و بیاں نظر آرہا تھا۔ پھر عجب کیا ہے جو چین و ہپری کی قدیم فلسفیانہ کہانیوں نے سمندروں کو اوہام کی کشش و دلفریبی ودیعت کردی تھی اور قدیم علم الاصنام نے دور افتادہ آسمانوں کو دیوتاؤں کا مسکن بنادیا تھا!

تقریباً تین گھنٹے کی پرواز کے بعد ہمیں پھر زمین نظر آئی۔ ریگستان عرب کی بنجر سرزمین سمندر کی جانب بات بڑھا رہی تھی اور جزیرہ نما کا وہ حصہ جو راس بن رہا تھا، طوفان بدوش لہروں کا پیہم تقبل کرنے کی وجہ سے ناکام کا منظر پیش کررہا تھا جو تاریخ کے اوراق کے مطابق کینیوٹ پیش کرچکا تھا غضب ناکی کے عالم میں موجیں اس ڈھٹائی اور دیدہ دلیری پر کف دہاں ہورہی تھیں اور اس حملے کی تاب نہ لاکر زمین بتدریج غیر محسوس طریقے پر پسپا ہورہی تھی۔ تھوڑی دیر میں ہم نے پھر سنگریزوں اور چرخ نیلی فام کے مابین بلندیوں پر مراجعت کی اور تب ایک گھنٹے کے بعد پھر کہیں ایک چھوٹے سے جزیرے کے دھندلے نقوش نظر آئے، جہاں قدرے بلند سطح پر ہوائی گیری کے لئے ایک گاؤں آباد تھا۔ ایک گھنٹے کے بعد تیل کے چشموں والے جزائر بحرین آئے جو خوشحالی اور روشن تہذیب کا سرمایہ زیر بغل لئے ہوئے تھے۔

پندرہ منٹ کے اندر ہم اپنی بلندیوں سے بھی زائد بلندیوں پر سے بتدریج اترتے اترتے اپنی پہلی منزل شہر بحرین پہنچ گئے۔ یہ شہر تین طرف سمندر سے گھرا ہوا ہے اور عرب کے اس ریگ زار میں تیل کے چشمے میلوں تک پھیلے ہوئے ہیں۔ جب جہاز نیچے آیا تو اندازہ ہوا کہ بلندیوں میں مزہ کیا ہے۔ کیونکہ نیچے ہوا گرم اور امس کی کیفیت تھی۔ شاخوں کی حدت اس پر طیارے کی کول تاروالی سڑک سے نکلتی ہوئی گرمی میں اضافہ۔ نام نہاد ایرکنڈیشنڈ آرام گاہ، باہر کی بہ نسبت زیادہ اذیت دہ تھی کیونکہ باہر کم از کم یہ تو تھا کہ سمندری ہوا کا جھونکا لگا ہے لگا ہے، چہرے کو چھو کر گزر جاتا تھا۔ بحرین ہوا کی خوش حالی کے کیسے ہیں امریکی علیہ ہے! ہر چیز کو یکانگی بناد پینے کا خبط ہر جگہ عیاں تھا۔ مشینی کام کاج کے مقابل انسانی محنت کی آماجگاہ بہت مدھم تھی۔

ہم سب نے اطمینان کی سانس لی جب لاؤڈ اسپیکر پر پانچ منٹ کے اندر جہاز کے روانہ ہوجانے کی اطلاع ملی۔ ہم جہاز میں داخل ہونے کے لئے صف میں آگئے۔ اس میں چڑھنے کے معنی ہیں زینوں کے ایک سلسلے کو عبور کرنا۔ ابھی ہم بمشکل ہی اپنی اپنی نشستوں پر آرام سے بیٹھے تھے کہ ایک بدوی شیخ اپنے خاندان کو لئے جو سولہ افراد پر مشتمل تھا جہاز میں داخل ہوا۔

یہ خاندان مالتھس کے نظریۂ آبادی پر بہترین صداقت ثبت کر رہا تھا ——
شیخ کے دو بھائی، چھ بیویاں، باقی بچے —— سب بصرہ جا رہے تھے۔ انجنوں کی گھن گھناہٹ کے ساتھ پھر ہماری پرواز شروع ہوئی۔ سورج کی روشنی اور شعاعوں کا دم خم کم ہو چلا تھا اور نصف گھنٹے کے اندر ہی تاریکی نے ہمیں اپنے گھیرے میں لے لیا۔ یہ تاریکی قدرے ٹمٹماتے ہوئے ستاروں اور اس لامحدود مکاں کے ایک گوشے کے اندر سے چاند کی دھندلی روشنی کے طفیل کم ہو جاتی تھی ہماری دوسری منزل بصرہ کا سفر ڈیڑھ گھنٹے کا تھا۔ تاریکی میں پرواز کرنا ایک پُراسرار تجربہ تھا۔ مکاں کا تصور اس وقت بعید تھا۔ ہم ایسے نظر آتے ہے تھے گویا ایک "منقش سمندر کے اُوپر ایک منقش جہاز" رواں ہے، یہ نہیں معلوم دیتا تھا کہ ہم متحرک فضا میں متحرک مسافر ہیں۔ اس وقت آبادان کی روشنیاں ہماری داہنی جانب تھیں اور نیچے شط العرب کا دہانہ۔ اس سے گزر کر جدِ نگاہ کے پاس ایک مبہم سی لکیر دکھائی دی، یہ لکیر رفتہ رفتہ صاف ہوتی گئی اور بالآخر روشنی اور چمک دمک کے طوفانوں میں تبدیل ہو گئی۔ یہ بصرہ تھا۔ اُوپر سے یہ پرستان کے مانند نظر آ رہا تھا۔ اسے دیکھ کر ذہن میں سینکڑوں الف لیلیٰ کی داستانیں گونجنے لگیں اور میری نظر کے سامنے جادو کا قالین، خلفاء کی بلانوشیاں اور پس پردہ شیوخ کے حرمین کے رومان اور ہزار ہا راز رقص کرنے لگے۔ آخر جہاز زمین پر اُترا اور ہم اس میں سے باہر آ کر کھلی ہوئی فضا کے ایک کیفے میں داخل ہو گئے۔ اس کے سبز روشنی نے ہمیں صرف رات کے اُداس اندھیرے ہی سے نجات نہیں دلائی بلکہ اُس نے طیارے کی دوڑ جگر کی سمنوم سیاہی، اُس کی عمارتوں کے کھوکھلے خط و خال اور ریگستان کی اُس سفید ریت سے بھی پیچھا چھڑا دیا جسے ہم اِدھر برابر دیکھتے رہے تھے۔

نصف گھنٹے کے بعد، پھر لاؤڈ اسپیکر پر جہاز کی روانگی کا اعلان ہوا اور ہم پھر اپنے طیارے کی جانب روانہ ہوئے۔ اب طیارے میں بدھی شیخ اور اُس کے سیاہ برقع حرم کی کمی ہو گئی تھی لیکن ایک ہجوم کا اضافہ ہو گیا تھا جس میں شیخی باز نیکی شامل تھے جنہیں موجودہ امریکہ کا بدگشت کہنا زیادہ مناسب ہے انھیں میں اُن کے ڈھنڈورچی بھی تھے۔ قاہرہ کا سفر ساڑھے تین گھنٹے کا تھا۔ اس وقت نو بج چکے تھے اور دن بھر کے سفر کے کارن ہم سب بہت تھک گئے تھے۔ نہیں تھا کہ کسی چیز پر بھی نظر

ڈالوں، اس کے علاوہ اب کچھ نظر کے سامنے تھا بھی نہیں جو ہماری توجہ کو کھینچتا کیونکہ اُوپر بہر سو ایک بیکراں تاریکی مسلط تھی اور نیچے ایک بے کنار صحرا۔ ہم ساڑھے گیارہ بجے کے قریب قاہرہ کے ہوائی اڈے پر پہنچے۔ ہوائی مستقر صحرائی ریت پر قائم کیا گیا ہے۔ لیکن روشنی کی ایک لمبی قطار اس کی طرف آنے والی سڑک کا راستہ دکھاتی ہے اور روشنی کے اسی ہجوم میں ہوائی مستقر، شہر کی سڑکوں اور مکانوں کے خطوط خاصے صاف دکھائی دیتے ہیں۔

ہم نے قاہرہ میں ڈیڑھ گھنٹے قیام کیا اور یہ وقت ہم نے اس جدید عمارت کے کیفے میں گزارا۔ گرمی تو یہاں بھی تھی لیکن اتنی تکلیف دہ نہیں تھی جتنی بصرے میں تھی اور ایسی ناقابلِ برداشت جیسی دہرین میں۔ بڑے فرشی پنکھے اور سمندر کی لطیف ہوا ہمارے آرام میں اضافہ کر رہی تھی۔ یہاں بیشتر وقت میں نے ایک دوست کے ساتھ گزارا جو ہمارے سفارت خانے ہی کا ایک رکن تھا، ہم نے فاروق کے متعلق باتیں کیں، نجیب کا ذکر کیا، مصر کے جنگی ہتھیاروں کے سکینڈل کے باب میں گفتگو کی، اپنی باہمی دلچسپی کی باتیں چھیڑیں جو دو افسروں کی ملاقات کے وقت ناگزیر ہوتی ہیں اور اس کے بعد پھر وہی اعلانِ سفر اور ہمارا طیارہ ایتھنز کی طرف روانہ ہو گیا۔

طیارے نے پندرہ ہزار فٹ کی بلندی پر پرواز کر کے بحیرۂ روم کو گہری تاریکی میں عبور کیا۔ صرف طیارے کی سُرخ روشنی اور اُس کے برفانی خطوط کسی حد تک گرد و پیش کی بھیانک اُداسی کو زائل کر رہے تھے، تمام راہ میں، ہر شخص سکون سے آشنا تھا۔ اور خالق وظلوں کے دشتے اُستہ، حتیٰ کہ وہ مہیم شخص بھی سکون کے عالمی میں محو خواب تھا جو مجھ سے قطار میں پرے اپنا منہ کھولے اس زور سے خرّاٹے لے رہا تھا گویا کہ وہ "دیو دلیس" پھٹ رہا ہو۔ خوش قسمتی سے اُس کی ناک اُس کے منہ کی نہیں کر رہی تھی، جس سے طیارے کے سکون میں کوئی خلل واقع نہیں ایتھنز ہم صبح ساڑھے چار بجے پہونچے۔ یہ ایک حسین منظر تھا۔ پہاڑ نشیب میں اُترتی ہوئی روشنی کی قطاریں، تہہ کار نقشہ کا مقابل پانی بلندو پر تلاطم پر پھیلے ہوئے تھا، ایک پر روشنی کا عکس تھا، دوسرے کو منعکس کر رہی تھی۔ طیارہ زمین پر اس طرح اُترا گویا اُس پر پھسل ہم اُترے اور باہر آ کر ہم نے کافی (قہوہ) کا ایک ایک پیالہ پیا۔ ۴۵ منٹ کے بعد ہم پھر جہاز پر سوار ہوئے لیکن ہمیں اندر نصف گھنٹہ اور انتظار

بیٹھنا پڑا کیونکہ ٹی، ڈبلیو، اے کے ایک مسٹنڈے افسر نے نصف گھنٹے سونے کا حکم مصمم کر لیا تھا، ہم ایک دوسرے کا منہ دیکھتے رہے بستم بالائے ستم وہ کندۂ ناتراش نو دولتیے امریکنوں کی طرح شرمندگی کا ایک لفظ بھی یا معذرت کا حرف بولے بغیر اپنی نشست پر جا کر بیٹھ گیا۔

خیر اب ہم نے روم کا رُخ کیا جس کی یہاں سے مسافت تین گھنٹے کی تھی۔ پو پھٹنے کی روشنی نمودار ہونا شروع ہو گئی تھی۔ بحرِ آئی اونین کے عجیب و غریب رنگ نے ——— اور نیلا رنگ بحیرۂ عرب کے ہلکے سرخی مائل نیلے سے کتنا مختلف تھا ——— ہماری مدت پرواز کے پیشتر وقت کو اپنے اندر جذب کر لیا۔ اس کے بعد ہماری پرواز اٹلی کے جزیرہ نما پر ہوئی اور ہم اپینائن کے سلسلۂ کوہ کو عبور کیا۔ یہ نظارہ بہت عجیب و غریب تھا۔ پہاڑ کی ڈھلان پر آباد دیہات، وادیوں کے سبزہ زار جن میں ندیاں پیچ و خم کھاتی ہوئی اپنی منزل طے کرتی ہیں اور صبح کے ہنگامِ کہر کے اندر سے جھانکتے ہوئے پہاڑ کی چوٹیوں نے مجھے شیلے کے یہ مصرعے یاد دلا دیئے ؎

ہیں جزائر بہت، بہاروں کے
جب کے اس بڑے علاقے میں

پھر ہم نے شمال کا رُخ کیا اور اٹلی کے مغربی ساحل کے کنارے کنارے پرواز کی۔ دُور دھندلی صورت میں ہم نے ایٹینا کو دیکھا جس میں سے دھواں کا ایک بادل نکل رہا تھا۔ اس کے مقابل چہرے پر دہشت کے آثار لئے ہوئے ویسیس استادہ تھا۔ جب میں نے نیچے آباد شہر کے متعلق غور کیا تو میری آنکھ نے پامپیائی کی تباہی کے دُھندلے نقوش اُبھار کر ——— کے بُجھے ہوئے خرابوں کے خاموش گواہ۔ تھوڑی دیر میں نیپلز کا خلیج نظر پڑی جو بحیرۂ روم کے مقابل سر پر تاج رکھے ہوئے شان سے تھی۔ پندرہ منٹ ہی گزرے ہوں گے کہ ہم روم کی کھجوری تفریح گاہ پر جہاں لوگ غسل کرنے کے لئے آیا کرتے ہیں۔ اب بادلوں کی بھول بھلیاں میں ہم نے اُترنا شروع کیا۔ جہاز لڑکھڑایا، اُس نے جھٹکے کھائے بادلوں کو چیرتا ہوا گزر گیا اور بفضلِ خدا ہم روم کے خوبصورت ہوائی مستقر پر تھے۔ اب ہماری نظروں کے سامنے روم کی سات پہاڑیوں کا دلفریب نظارہ تھا۔

صرف نصف گھنٹہ میں اور پھر روانگی۔ بادل ہماری بصارت میں حائل ہو رہے تھے۔ چنانچہ ہم پیاسے گزرے تو اُس کے خمدار مینار کو نہ دیکھ سکے۔ ہم نے سُنا ہے کہ وہ پان سو سال سے اسی حالت میں قائم ہے۔ اس کے بعد ہم جنیوا کی خوبصورت جھیل وادیٔ پو کی بالائی سطح اور شمالی اٹلی کی زیتون سے ڈھکی پہاڑیوں پر پہونچے۔ ہم نے تیرہ ہزار پر پرواز کی اور تب ہماری آنکھیں سوئیٹزرلینڈ، فرانس، اور اٹلی کے سلسلۂ کوہ کی تکنت اور دید بے سے رُوشناس ہوئیں اور ہم نے کوہ اور اٹلی کی دُوسری جھیلوں کا نظارہ کیا۔ ہم ان مناظر کو دیکھ کر دم بخود تھے لیکن ماؤنٹ بلانک کا شاندار منظر سب سے بڑھ کر تھا۔ پائلٹ نے امریکی تخیل کے زیرِ نظر اصل راستے سے کنارہ کرتے ہوئے پہاڑ کی چوٹی کے قریب ایک چکر لگایا۔ آہستہ آہستہ جہاز نے برفانی چوٹی پر سبک پرواز کی اور اب ہمارے سامنے گلیشیر (برف کی چٹانیں) کا صاف منظر تھا۔ دلوں میں ہیبت پیدا کرنے والی گلیشیرل کی دراڑیں، برف کے لبادے میں ملبوس ناہموار عریاں چٹانیں اور پہاڑوں کی بلندی سے نشیب میں سرسبز و شاداب وادیوں کی طرف مڑتی ہوئی ڈھلانیں یہاں سے بخوبی نظر آ رہی تھیں۔ یہ تجربہ زندگی بھر کا چھوڑ تھا اور اس وقت مجھے اپنے کیمرے کی شدید کمی محسوس ہوئی جس کی مدد سے شاید میں فردوس بداماں مطہر مناظر کے چند اُڑتے ہوئے لمحات کو قید کر سکتا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد ہم لاک لیوان کی سطح پر جہاں جنیوا واقع ہے، اُتر رہے تھے۔ آخر وہ وقت بھی آ گیا اور ہم نے جنیوا کے ہوائی مستقر پر قدم رکھا جہاں ہمارے استقبال کے لئے اخباری نمائندے ہمارے سفیر (ہمارا پیارا آصف) اُن کے عملے کے افراد اور دوسرے معززین حضرات منتظر تھے۔

یہاں ہمارے سفر کی رُوداد اختتام پر پہونچ جاتی ہے، جس کی تفصیل بیان کرنے کا وعدہ میں نے اپنے پہلے خط میں کیا تھا۔ یہ رُوداد میں نے اس عالم میں سپردِ قلم کی جب میں دُوسری مصروفیتوں میں گھرا ہوا تھا۔ لیکن میرا خیال ہے کہ میں نے تمہارے سامنے اپنے تجربات کو نچوڑ کر اُس کا رس رکھ دیا ہے اور یہ رس تمہیں بدرجہ اتم مرغوب ہوگا ——— زیادہ پیار

تمہارا

ظہیر احمد صدیقی

فانی کا فلسفۂ غم و عشق

وہ کہتے ہیں کہ ہے ٹوٹے ہوئے دل پر کرم میرا
مگر منجملۂ آداب غم خواری ہے غم میرا

جب ایک شاعر کو پے در پے مایوسیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ جب اس کی ہر امید ناکامیوں میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ جب اس کی زندگی موت بن جاتی ہے۔ جب اس کا غم زندگی کی مسرتوں سے کنارہ کشی اختیار کر لیتا ہے۔ جب اس کی قوتِ عمل شکست خوردہ ذہنیت میں جذب ہو کر رہ جاتی ہے۔ اس وقت عام طور سے انسان زندگی سے فرار اختیار کرتا ہے۔ اس وقت اس کو پناہ یا تو لذت پرستی میں ملتی ہے یا تقدیر پرستی میں یہ فرار آگے بڑھ کے متعدد شکلیں اختیار کر لیتا ہے۔ مثلاً

(۱) رنجیتی: - جس میں جسمانی لذتوں کا تلخ مزے سے کر بیان کیا جاتا ہے اس کا مطمحِ نظر جنسیات سے آگے بڑھ ہی نہیں سکتا۔ وہ اپنے غم کو یا ماحول کے غم کو ان لذتوں میں فراموش کر دینا چاہتا ہے وہ محبوب کے رنگ و بو اور لمس سے حظ اٹھاتا ہے۔ مگر یہ شاعری کی وہ ادنیٰ مثال ہے جس نے شاعری پر ہمیشہ کے لئے ایک بدنما دھبہ لگا دیا۔

(۲) ہجو: - جس نے اپنے غم کا بدلا دوسروں کا مضحکہ اڑانے سے کرنا چاہا۔ دوسروں کی کمزوریوں پر قہقہہ لگانا اور ان سے لطف اندوز ہونا یہ ہجو کا طغرائے امتیاز ہے۔ دوسروں کے زخموں کو کرید کرید کے اپنی لذتِ انتقام کا اہتمام کرنا اور ان کی کمزوریوں سے بے جا فائدہ اٹھانا یہ سب زندگی کے فرار کے واسطے پناہ گاہیں تھیں۔

(۳) تصوف: - میری مراد صرف اس تصوف سے ہے جس نے انسان کو "لا" کی حزنوں میں بھٹکا دیا اور وہ ہر چیز کو تقدیر پرستی سے تعبیر کرنے لگا اس سے اتنا ضرور ہوا کہ اس سے انسان کی سنجیدگی تو برقرار رہی مگر سعیِ "لا" میں اتنی لذت محسوس ہوئی کہ "الا" کی منزل کا خیال ہی نہ گزرا جہاں انسان کو تپا کر کندن بنایا جاتا ہے۔

وہ لوگ جنہوں نے رنجیتی کو اپنی پناہ کا ذریعہ بنایا اور جسمانی لذتوں میں اپنے کو فراموش کر دیا رنگین اور انتشار ہیں۔ وہ لوگ جنہوں نے دوسروں کی کمزوریوں پر قہقہے لگائے اور دوسروں کی تکلیف پر مسرت کا اظہار کیا ہیں۔ وہ لوگ جو تصوف کے پر پیچ وادیوں میں کھو گئے اور تقدیر پرستی پر ہو گئے تہ ہیں۔ مگر اس شاہراہ پر ایک ہستی اور گامزن نظر آتی ہے جس نے محبت بھی کی تو اتنی ارفع و اعلیٰ کہ مجاز کے ڈانڈے حقیقت سے ملا دیئے جس نے تصوف بھی اختیار کیا تو پناہ کی خاطر نہیں بلکہ "لا" کو "الا" سے ملانے کے لئے۔ وہ صرف "لا" کے سراب میں نہیں کھو گیا بلکہ اس نے "الا" کی حقیقت کو بھی پا لیا۔ اور یہ فانی کی ذات ہے۔ غم پرست عموماً تیرہ ہوتے ہیں۔ مگر اس سلسلے میں یہ بات بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ ان تینوں سے الگ ہے۔ اول تو وہ لوگ ہیں جن کا ذہن مستقل طور آماج گاہ نہیں۔ جب حالاتِ زمانہ کے زیر اثر ان لوگوں پر غم کی کر ہوتی ہے تو ان کے افعال اور اعمال سے اضطراری کیفیت اور ہوتی ہے لیکن جب وہ اس دور سے گزر جاتے ہیں تو خوشی اور مسر بھی اسی طرح ہوتا ہے کہ خود فراموشی کی سی حالت طاری ہو جاتی ہے کے لوگوں میں شیلی کا نام قابل ذکر ہے۔ ایک وقت میں اس کو ہر شا اور شادمانی چھائی ہوئی نظر آتی ہے اور اس خوشی و کیف کے عا فراموش کر دیتا ہے کہ یہ مسرت عارضی بھی ہو سکتی ہے۔ دوسرے اس پر غم و الم کا غلبہ ہوتا ہے تو وہی شے جو روشن تھی تیرہ و تار اس وقت وہ بھول جاتا ہے کہ ان نا امیدیوں میں کبھی امید کی کر ہو سکتی ہے۔ دوسرے وہ لوگ ہیں جو اپنے غم پرستی کے اظہار اور تبختر سے کام لیتے ہیں۔ نہ شی اور اس کے مظاہر پر حقارت کی

ں۔ ان لوگوں کی ذہنیت سطحی اور اوچھی ہوتی ہے۔ درحقیقت یہ مسلک ان
دں کا ہے جو عنفوانِ شباب میں تشائم کی طرف رجحان رکھتے ہیں۔ ہمارے نئے
ں اور شاعروں میں ایسی بے شمار مثالیں مل سکتی ہیں۔ تیسرے ان لوگوں
آتا ہے جو غم کو عین حقیقت قرار دیتے ہیں۔ اور مسرت کے وجود کو معتبر
ں سمجھتے۔ اس مسلک کو اختیار کرنے کے لئے فلسفیانہ ژرف نگاہی کی
درت ہے اور اردو میں جن لوگوں نے اس کو اختیار کرنے کی گاہے بگاہے
شش کی وہ تصنع و بناوٹ میں مبتلا ہو گئے۔ اس کے برخلاف فانی غم و مسرت
نوں کے وجود کا اقرار کرتا ہے مگر از روئے مصلحت اول الذکر کو موخر الذکر
ترجیح دیتا ہے۔ اس کی وجہ خود فانی کی زبان سے سنئے!

ھی گذشتنی ہے خوشی بھی گذشتنی کہ غم کو اختیار کہ گذرے تو غم نہ ہو
یا دوسری توجیہہ پیش کرتے ہیں۔ ؎

غم کے ٹھوکے کچھ ہوں بلا سے آگے جگا تو جاتے ہیں

ی "بیداری" کے واسطے وہ غم اختیار کرتا ہے۔ وہ غم کو اس لئے ترجیح دیتا
کہ اس کے گزرنے کے بعد مسرت ہوگی مگر مسرت کے گذرنے کے بعد شاید
کا متحمل نہ ہو سکے۔ یہ فلسفۂ غم فانی کی زندگی اور شاعری پر حاوی نظر
ے وہ اس سے ایک انچ ہٹنے کے لئے تیار نہیں۔ وہ "غم دوراں" کو
نان" بنا لینا جانتے ہیں تو پھر اس سے فرار کیا معنی۔ وہ بڑھتے ہیں
لے سے لگا لیتے ہیں۔

انی کے فلسفۂ غم کے متعلق لوگ مختلف الخیال نظر آتے ہیں کسی
ہے کہ شخصی ناکامیوں نے اس کی "نوا کو اضردہ" بنا دیا۔ کسی کا
ہ قسام ازلی ہی کے یہاں سے درد مند دل لے کر آیا۔ کسی نے ماحول
دی کو اس کے غم کا ذمہ دار ٹھہرایا۔ کسی نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ
درنج میں دوسروں کے گریبان پر بس نہ چلا تو اپنے ہی گلے کو گھونٹنے
یا ہو گیا۔ جو کچھ بھی ہو ہم کو سب سے پہلے ان کے اس آخری دور
ے قبل جہاں وہ زندگی کو موت سے تعبیر کرتے ہیں۔ جہاں ہر چیز ان
بے ذوق نظر آتی ہے ان کی ابتدائی شاعری پر ایک اجمالی نظر

ر مرحوم کا شعر ہے۔

یرگذار کو آسان بنا دیا ہوا اسے غم جاناں بنا دیا

ڈالنی ہوگی۔ تاکہ ان کی شاعری کے تمام ادوار ذہن نشین ہو جائیں۔

فانی کی شاعری کا پہلا دور وہ ہے جبکہ ہر طرف داغ کی زباندانی کی شہرت تھی اور ہر شاعر داغ کے رنگ میں شعر کہنا اپنے لئے باعث فخر خیال کرتا تھا حتیٰ کہ اقبال جیسا انفرادیت پسند شاعر یہ کہنے پر مجبور نظر آتا ہے۔

نہ آتے ہمیں اس میں تکرار کیا تھی مگر وعدہ کرتے ہوئے عار کیا تھی
بھری بزم میں راز کی بات کہہ دی بڑا بے ادب ہوں سزا چاہتا ہوں

ایسی حالت میں ظاہر ہے کہ فانی کیوں کر اس ماحول سے الگ رہ سکتے تھے۔ چنانچہ فانی کی وہ غزل ملاحظہ ہو۔

جب یہ کہا کہ بیوفا کیا نہیں تجھ پہ میں فدا
کیا ہے یہ ماجرا غلط کہنے لگے کہ ہاں غلط

وہی داغ کا انداز اور وہی زبان۔ ذرا ان اشعار کو داغ سے منسوب کر کے دیکھئے خود ان کے شاگرد دھوکہ نہ کھا جائیں تو کہئے۔

اپنی جنت مجھے دکھلا نہ سکا تو واعظ کوچۂ یار میں چل دیکھ لے جنت میری
شکوۂ ہجر پہ سر کاٹ کے فرماتے ہیں اب کروگے کبھی اس منہ سے شکایت میری

لکھ چکے ہم جا چکا خط گریہ حالت رہی ہاتھ میں آیا قلم اور شوق کا دفتر کھلا

غرض اس قسم کی کافی مثالیں مل سکتی ہیں۔ مگر فانی کا یہ دور جلد ہی گزر گیا اس میں شک نہیں کہ فانی کی یہ نقالی کافی حد تک داغ کی اصلیت سے ہم آہنگ ہو گئی ہے اور اگر اسی رنگ میں شعر کہتے تو ان کے کامیاب مقلد ہوتے مگر قدرت کو ان سے اس سے ضروری اور اہم خدمت لینی تھی۔ اس لئے جلد ہی اس کوچے سے نکل گئے اور اپنی شاعری کے دوسرے دور میں قدم رکھا۔

داغ کے کوچے سے نکلے تو جذبات میں شدت پیدا ہو چکی تھی۔ زمانے کی ٹھوکروں نے دل کو دردمند بنا دیا تھا۔ داغ کی معاملہ بندی اور زبان کے چٹخارے کی جگہ میر کے سوز و گداز نے لے لی۔ اب شعر صرف برائے گفتن نہیں تھا۔ بلکہ وہ غم کی شدت اور جذبات کی فراوانی کو محسوس کرنے لگے تھے۔ اس جذبات کی گہرائی کے ساتھ داغ کی زبان موجود تھی۔ چنانچہ ان کی مشہور غزل

آلِ سوزِ غم ہائے نہانی دیکھتے جاؤ بھڑک اٹھی ہے شمع زندگانی دیکھتے جاؤ

اس غزل میں میر کا سوز اور داغ کی زبان کی بڑی اچھی مثال موجود ہے میر کے لباس میں اگر فانی کو دیکھنا چاہیں تو چند متفرق اشعار ملاحظہ ہو۔

کسے کہ کار [illegible] دوز ۱۱۔ ۳

بہت حسرت پہ پٹتی ہیں آرزوئیں کوئی ناکام جاتا ہے جہاں سے
ہاں کوئی جادو جگاؤ آنکھ سے پھر کوئی جلتا ہوا منتر چلے
کس خوشی سے ہم چلے سوئے لحد بعد مدت جیسے کوئی گھر چلے

زمانے کے حوادث کا مقابلہ کرتے کرتے انسان پر ایک وہ وقت بھی آتا ہے جب وہ یہ کہنے پر مجبور ہوتا ہے - ؎

مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہوگئیں

یہ فانی کا تیسرا دور ہے جب وہ داغ کے رنگ کو خیرباد کہہ دیتے ہیں - میر کی طرح صرف محسوس کرکے بیان ہی نہیں کر دیتے بلکہ غالب کی طرح اپنے اس غم پر سوچتے ہوئے بھی نظر آتے ہیں - طبیعت میں درد تھا اس کو ان کے مطالعہ نے تقویت دی - نتیجہ یہ ہوا کہ ان کا غم عام سطح سے ہٹ کر اس منزل پر آگیا جہاں صرف غالب کی رفعت پرواز ہی اس سے آگے تھی ورنہ اور کوئی نہ تھا - اس دور میں فانی نے غالب کا تتبع کیا اور اس کامیابی کے ساتھ کہ غالب سے اگر آگے نہ بڑھ سکے تو پیچھے بھی نہیں رہے - غالب کا مشہور شعر ہے

ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا

فانی کہتے ہیں -

مذاقِ تلخ پسندی نہ پوچھ اس دل کا بغیر مرگ جسے زیست کا مزا نہ ملا

غالب :-

دونوں جہان دے کے وہ سمجھے یہ خوش رہا یاں آپڑی یہ شرم کہ تکرار کیا کریں

فانی :-

میری ہوس کو عیش دو عالم بھی تھا قبول تیرا کرم کہ تو نے دیا دل دکھا ہوا

غالب دنیا کو اس قدر بے اعتبار قرار دیتے ہیں اور فیصلہ سنا دیتے ہیں

ہستی کے مت فریب میں آجائیو اسد عالم تمام حلقۂ دام خیال ہے

مگر فانی اس نازک موقع پر انتہائی احتیاط سے قدم آگے بڑھاتے ہیں

نہ ابتدا کی خبر کچھ نہ انتہا معلوم رہا یہ وہم کہ ہم ہیں سو وہ بھی کیا معلوم

اس موقعے پر کلیم الدین کی رائے شاید بے محل نہ ہوگی - وہ لکھتے ہیں[1] - میرا یہ مطلب نہیں کہ فانی محض غالب کے پیرو ہیں - انہیں حسرت کی طرح یہ بھی ایک مستقل رنگ کے مالک ہیں اور ان کے اشعار انفرادی شان رکھتے ہیں - جو

---

[1] اردو شاعری پر ایک نظر

تک زبان کا تعلق ہے یہ غالب سے ایک حد تک برتر ہیں"۔

اگر فانی کی شاعری کا دور یہیں پر ختم ہو جاتا تو بھی شاید ان کے صف اول میں آنے پر کسی کو اعتراض نہ ہوتا مگر فانی کی جدت طبع کچھ اور دکھانا تھا - ان کو اس تقلیدی زندگی سے گزر کر خود اپنی منزل پر پہنچنا تھا - جہاں صرف وہی نظر آتے ہیں - ان کی انفرادیت کو گوارا نہیں کر سکتا - وہاں کوئی دوسرا پہنچ کے وہ اس بلندی پر جاکر صدا دیتا ہے جہاں بعض اوقات غالب بھی پیچھے رہ جاتے ہیں اس کا غم درد کائنات (Welt Schmarz) بن جاتا ہے - یہ وہ منزل ہے جہاں غم پرستی اور تشاؤم کی حدیں مل جاتی ہیں - ورنہ منطقی زاویۂ نظر سے دیکھا جائے تو غم اور تشاؤم کی حدیں جدا جدا ہیں لازم و ملزوم نہیں - یہ فانی کی انفرادیت کا دور ہے - چند اشعار ملاحظہ کیجئے -

اک عالم دل ہے دیہی دنیا ہی فردوس ہر شے نظر آتی ہے نظر آئی ہوئی سی
پھولوں سے تعلق تو اب بھی ہو مگر اتنا جب ذکر بہار آیا سمجھے کہ بہار آئی
خود تجلی کو نہیں اذن حضوری فانی آئینے ان کے مقابل نہیں ہونے پاتے
میری نظر میں تو بے واسطہ دید ہے تو میں بہ عنوان تجلی بھی تجھے یاد نہیں

ان اوراق کی وضاحت سے یہ چیز روشن ہو گئی ہوگی کہ فانی کو شاعری کے کن مراحل سے گزرنا پڑا -

فانی کے یہاں غم کس پہلو سے آیا - غم نے آخر وہ کونسا راستہ اختیار کیا جو اس کو فانی کے کلام تک بار ملا - یہ سوال دلچسپ ہونے کے ساتھ پیچیدہ بھی ہے - غم ایک تو وہ ہے جو فلسفے کی راہ سے آتا ہے جیسے شوپنہار کے یہاں ہے - ایک وہ غم ہے جس کے ذریعے سے فلسفیانہ تفکر تک پہنچتے ہیں جیسے ہارڈی وغیرہ - مگر فانی کا غم دراصل اس کی آپ بیتی ہے جس کو وہ فلسفیانہ رنگ دیتا ہے - اور جو غم کی شکل اختیار کرتی ہے - اس لئے شوپنہار اور ہارڈی کے غم سے مختلف ہے - غم پر آنسو بہانا ایک فطری امر ہے جب فانی کو غم سے واسطہ پڑا تو ان کے وہ اوصاف جن پر اس وقت تک تقلید کی رنگ چھائی ہوئی تھی ایک ساتھ جلا پا گئے - غم پر جتنا سوچا جائے گا اسی قدر غم کی شدت کا احساس ہوگا - اس پر ان کا مطالعہ - جس نے غم کے راستے کو اور صاف کر دیا - قاضی عبدالغفار صاحب نے ایک جگہ فانی کی زبان سے غم کی شرح اس طور سے کی ہے "زندگی شعر ہے - مگر زندگی کا ہر جذبہ اور ہر ہیجان شعر نہیں! —— صرف غم شعر ہے - تازہ پھولی کا حسن شعر کا ایک ارتقائی مقام

ہے۔ اس نے کہا۔ قہقہوں میں شعر اگر ہے تو بہت کم۔ البتہ اس کی ساری دنیا ایک آنسو میں ہے۔ ایک زخم میں ہے اور وہ زخم جس قدر زیادہ ناقابلِ علاج ہو شعر اتنا ہی زیادہ بلند اور بلیغ ہو جاتا ہے۔ "فانی کو اہلِ غم سمجھنے کا ایک سبب یہ ہے کہ ان کے یہاں خوشی کے لمحات یا تو آتے ہی نہیں یا اگر آتے ہیں تو چند لمحوں کے واسطے جن کے بعد پھر یاس و حرماں کی تاریکی شروع ہو جاتی ہے۔ میں اس کو ان کی استقامت سے تعبیر کرتا ہوں۔ اس کو جب خوشی کے لمحے آکر گدگدانے کی کوشش بھی کرتے ہیں تو وہ کہتا ہے۔

کیا جام مئے ہوش ربا دیتا ہے　　کیا مژدۂ رنج ہر بلا دیتا ہے
ہر قطرۂ مے ہے خونِ صد عیش و نشاط　　تے دے کے فریبِ عیش کیا دیتا ہے

وہ جانتا ہے کہ اس کو جو کچھ دیا جا رہا ہے وہ حقیقت میں "عیش نہیں ہے بلکہ "فریبِ عیش" ہے۔ ایک رباعی اور سنئے!

غم عینِ نشاط و راز تخلیقِ نشاط　　غم حجتِ انبساط و تصدیقِ نشاط
غم کا ہے تبسم جسے کہتے ہیں وجود　　ہستی کو ہے غم کے دم سے توفیقِ نشاط

وہ "کلیوں" کو تبسم دیکھتے ہیں تو ان کو متنبہ کرتے ہیں۔

اگلے برس کے پھولوں کا کیا حال انہیں معلوم نہیں
کلیوں کا یہ طرزِ تبسم۔ یہ شادابی کیسا کہئے

یہی غم جب آگے بڑھتا ہے تو یاس کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ ان کو اپنی بدنصیبی کا کامل یقین ہے۔ وہ زندگی اور موت میں کوئی فرق نہیں سمجھتے جب ان کو زندگی اور موت دونوں ایک شکل میں نظر آتی ہیں تو وہ اللہ تعالیٰ سے بھی التجا کرتے ہیں۔

فانی کی زندگی بھی کیا زندگی تھی یارب　　موت اور زندگی میں کچھ فرق چاہئے تھا

یاس اور نا امیدی کی سیکڑوں مثالیں فانی کے یہاں مل جائیں گی۔ ان میں سے چند ملاحظہ ہوں۔

بہت سر پیٹتی ہیں آرزوئیں　　کوئی ناکام جاتا ہے جہاں سے

لہ میر کا بے پناہ شعر ہے:۔

کہا میں نے کتنا ہے گل کا ثبات　　کلی نے یہ سن کر تبسم کیا

محشر بدایونی کا شعر ہے:۔

چمن مرد گی گل پہ ہنسی جب کوئی کلی　　آواز دی خزاں نے کہ تو بھی نظر میں ہے

برق کو اب کیا غرض کیا رہ گیا کیا جل گیا　　جل گیا خرمن میں جو کچھ تھا ہماری تقدیر کا
شوق سے ناکامی کی بدولت کوچۂ دل ہی چھوٹ گیا
ساری امیدیں ٹوٹ گئیں دل بیٹھ گیا۔ جی چھوٹ گیا

فانی کے یہاں وہ قنوطیت نہیں ہے جو لکھنوی شعراء کے یہاں ملے گی ان کی شاعری کافور، "لحد" "تربت" اور "کفن" کی شاعری نہیں ہے۔ اگر ان کا ذکر بھی آیا ہے تو اس انداز سے نہیں جو ہمارے لکھنوی شعراء کا طغرائے امتیاز ہے۔ فانی کی شاعری یاسِ غم میں ایک قسم کا وجدان ہے جو غالب کے یہاں ملے گا یاس تو درد ہی نہیں حق تو یہ ہے دوا بھی ہے　　فانی نا امیدی کو موت کا آسرا دیا
غم امید کے صدقے وہ اضمحلال رگیں ہوں　　بہار آنے سے پہلے ہی جو چھا جائے گلستاں پر
کچھ امید کرم میں گزری عمر　　کچھ امید کرم میں گزرے گی
پھولوں سے تعلق تو اب بھی ہے مگر اتنا　　جب ذکرِ بہار آیا سمجھے کہ بہار آئی
بنایا تھا نشیمن شاخِ گل پر کس گھڑی یا رب　　بجھی جاتی ہے ہر برقِ بلا شاخِ نشیمن پر

ایک جگہ فانی نے ایذا پسندی کی حد کر دی ہے۔ فرماتے ہیں۔

بچھ گئے راہِ یار میں کانٹے　　کس کو عذر برہنہ پائی ہے

حقیقت تو یہ ہے کہ فانی کا یہ شعر سینکڑوں دیوانوں پر بھاری ہے۔ اسی خیال کو مختلف شعراء نے بھی ادا کیا ہے مگر ع

حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

غالب کا شعر ہے۔

ان آبلوں سے پاؤں کے گھبرا گیا تھا دل　　جی خوش ہوا ہے راہ کو پُرخار دیکھ کر

اقبال نے اس کو ذرا فلسفیانہ انداز سے پیش کیا ہے جس میں فلسفہ زیادہ اور شعریت کم ہو گئی ہے

ہیں عقدہ کشا یہ خار صحرا　　کم کر گلۂ برہنہ پائی

ماسٹر ظفر بدایونی کا شعر ہے۔

مجھے تو چارہ گرِ زخمِ کش آزار رہنے دے　　نکالیں خار تلوؤں کے تو نوکِ خار رہنے دے

تہور بدایونی کا شعر ہے اور خوب ہے۔

یہ مانو میں خلش اے چارہ گر تلوؤں کے چھالے ہیں　　کہ پھر پھوٹ کر بہلے ہیں جب کانٹے نکالے ہیں

اہلِ سخن سے یہ حسن پوشیدہ نہیں کہ فانی نے ایذا پسندی کو فلسفیانہ انداز میں پیش کرنے کے باوجود اس کی شعریت کو برقرار رکھا ہے۔

جب غم و حرماں اور ایذا پسندی کی یہ حالت ہو تو دنیا کی ہر شے ان

کو تاریک ہی نظر آئے گی۔ چنانچہ جب وہ کشمیر کی حسین وادیوں کو دیکھتے ہیں تو ان کو اس میں بھی "دوزخ میں سموئی ہوئی جنت" نظر آتی ہے۔

پھولوں کی نظر نواز رنگت دیکھی　　مخلوق کی دل گداز حالت دیکھی
قدرت کا کرشمہ نظر آیا کشمیر　　دوزخ میں سموئی ہوئی جنت دیکھی

ایک جگہ اور فرماتے ہیں۔

اس باغ میں جو کلی نظر آتی ہے　　تصویر فسردگی نظر آتی ہے
کشمیر میں ہر حسین صورت فانی　　مٹی میں ملی ہوئی نظر آتی ہے

میرا خیال ہے کہ کشمیر کے متعلق اس قسم کے تاثرات صرف ان کی غم زدہ طبیعت ہی کا تقاضا نہ تھے بلکہ ان کے اندر انسانی غم کا وہ احساس بھی تھا جو ان کو کشمیر کی مفلسی کی طرف بار بار متوجہ کر رہا تھا۔ ناممکن ہے کوئی شخص اس خطۂ جنت نظیر میں جائے اور وہاں مفلسی اور خستہ حالی سے متاثر نہ ہو۔ برسوں کے ڈوگرا راج نے وہاں کے عوام کو آنا پست کر دیا ہے کہ اس جنت میں بھی جہنم کی لپٹیں محسوس ہوتی ہیں۔ میرا ایک قطعہ ہے۔

بارِ ہیبت شکن و رنج و مشقت کے تلے　　آہ کشمیر! ترے حسن دل آرا کی نمود
جیسے اک گوہرِ خوش آب مگر خاک نشیں　　جیسے اک شیشۂ نایاب مگر زنگ آلود

فانی کی طرح دکھا ہوا دل شاعری کی تاریخ میں صرف میر صاحب کا نظر آتا ہے۔ فانی کی ناکامیوں نے فانی کے غم کو بنا سنوار کر ایک نئے روپ میں پیش کیا۔ جہاں غم میں شدت تو ہے مگر تلخی نہیں۔ "نہاں غم" کو انہوں نے نئے آداب Etiquette سے سنوارا۔ نئے تکلفات سے نکھارا۔ بقول احتشام حسین صاحب۔ اگر ان کا غم عارضی یا سطحی ہوتا تو چند روز کے جذبات کی فراوانی کے بعد وہ ہمیشہ کے واسطے بجھ جاتا مگر "جب غم زندگی بن جائے۔ جب زندگی جاوید کی خواہش بھی عزیز نہ رہے۔ اس وقت موت سے زیادہ خوبصورت کوئی چیز نہیں۔ اس کی تاریکی روشنی پیدا کر سکتی ہے"۔ ان کی آواز میں "بلند آہنگی" ہے مگر یہ بلند آہنگی کانوں کو ناگوار نہیں گزرتی بلکہ "خوش آہنگی" کے سبب سے اس میں سرور پیدا ہو جاتا ہے۔ اس کی مثال ایسے درد بھرے مصرعے کی سی ہے جو کسی تاریک ستائے میں ساز پر گایا جا رہا ہے۔ جو سنتا ہے وہ اس کو اپنے دکھ بھرے دل کی صدا خیال کرتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ جب فانی "دو تین ہچکیوں میں دم نزع" زندگی کی داستان بیان کرتا ہے تو زندگی کی حقیقت اور اس کی بساط کا اندازہ ہوتا ہے۔

دو تین ہچکیوں میں دم نزع کہہ گیا　　شرحِ درازِ زندگیٔ مختصر کو میں[1]

فانی کا غم مریضانہ غم نہیں ہے بلکہ اس میں غم کا عرفان بھی موجود ہے یہ عرفانِ غم کی ہیئت بدل دیتا ہے۔ وہی مکروہ اور بدنما موت جو مہیب معلوم ہوتی تھی فانی کے یہاں آکر حسین ہو گئی۔

ادا سے آڑھیں خنجر کے منہ چھپائے ہوئے　　وہ لائے میری قضا کو دلہن بنائے ہوئے

ان کے یہاں پناہ گزیں کا جذبہ نہیں ہے بلکہ وہ زہر کو زہر سمجھ کر پیتے ہیں۔ وہ اس کے بھی روادار نہیں کہ زہر میں دوا ملائی جائے۔ ع

بس اب تو زہر ہی دے زہر میں دوا نہ ملا

بقول سرور صاحب "فانی کے یہاں غم کا عرفان ملتا ہے جو غم اور موت دونوں کو گوارا بنا دیتا ہے یہی وجہ ہے کہ وہ موت سے گریزاں نہیں ہوتے بلکہ خیر مقدم کرتے ہوئے نظر آتے ہیں"۔ وہ پناہ کی خاطر غم اختیار نہیں کرتے بلکہ غم اور شاعری کو ہم آہنگ بناتے ہیں۔ یہ ہم آہنگی "عروق مردہ" میں "خونِ زندگی" دوڑنے کا بھی سبب ہو جاتی ہے۔ فانی کے یہاں کوئی جدوجہد کا پیغام نہیں ملتا مگر پھر بھی ان کے غم میں ایک تڑپ ہے۔ وہ تڑپ ہے جو اکثر ہم کو اقبال کے کلام میں ملتی ہے۔ فانی کا یقین ہے کہ "جس دنیا میں شاعر کا ظہور ہوتا ہے وہ دنیا اس کی اپنی دنیا سے بہت پیچھے ہوا کرتی ہے۔ شاعر کو ناصح یا واعظ نہیں ہونا چاہیئے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اقبال کی عظمت کے زیادہ معترف نہیں تھے۔ ان کے اقبال کے کلام میں خصوصیت کے ساتھ صرف ایک شعر پسند تھا۔

چناں پیچ بر جریم او کشیدم نغمۂ دردے　　کہ دادم محرماں را لذت سوز جدائی ہا

جس "تڑپ" کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے اس کے لئے اقبال کا شعر سنیے

تڑپ صحن چمن میں آشیاں میں شاخساروں میں
جدا پارے سے ہو سکتی نہیں تقدیر سیمابی

فانی بھی "راحت کا مفہوم" "تڑپ ہی میں دیکھتے ہیں

راحت کا مفہوم یہی ہے جہدِ طلب سے باز نہ آ
بڑھنے دے دل کی بے چینی تڑپے جا آرام نہ لے

---

[1] فراق گورکھپوری

اسی غزل میں فرماتے ہیں ۔

دل تو دل ہے دل کو چین آ جانا تو آسان نہیں
درد وہ ہے جو دل میں اٹھ کر آپ ہی آرام نہ لے

اقبال مردِ مومن کی تعریف ان الفاظ میں کرتے تو ہیں۔

نشانِ مردِ مومن با تو گویم — چو مرگ آید تبسم بر لب اوست

اس کی بدلی ہوئی شکل فانی کے یہاں ملتی ہے

وہ کہتے ہیں کہ ہے ٹوٹے ہوئے دل پر کرم میرا
مگر مضمحلہ آداب غم خواری ہے غم میرا

حدیث قدسی میں فرمایا گیا ہے "انا عند المنکسرۃ قلوبھم" یہ غم ہی کا فیضان ہے کہ اس نے اقبال کو خودی بخشی اور فانی کو بے خودی ۔ مگر کبھی کبھی فانی بھی خودی کے میدان میں سربلند نظر آتے ہیں ۔

تسلیم ہیں مجھے بھی تری بے نیازیاں — یہ کیا کہوں کہ میری تمنا غیور ہے
دنیا دلی بلا جانے مہنگی ہے یا سستی ہے — موت ملے تو مفت نہ لوں ہستی کی کیا ہستی ہے
نازم بہ تکیہ کردنِ فانی بہ لطف دوست — اے وا غیور مردن دمخمور زیستن

کبھی وہ بڑھ کر "عصمتِ کامل" کے جلووں کو بھی اپنے "عجزِ گناہ" کا حاصل خیال کرتے ہیں ۔

عجزِ گناہ کے دم تک ہیں عصمت کامل کے جلوے
پستی ہے تو بلندی ہے راز بلندی پستی ہے

رنج و آلام کی گھٹائیں برابر گھٹتی چلی آ رہی ہیں ۔ امید کے راستے مسدود ہو چکے ہیں ۔ ان مصیبتوں اور پریشانیوں سے گھبرا کے انسان چیخ اٹھتا ہے تو یہ فطرت انسانی کا تقاضا ہے ۔

آہ کے گلہ گزار ہم ہیں تو مگر خطا معاف — آٹھ پہر کے درد نے دل ہی تو ہے دکھا دیا

وہ غموں سے نہیں گھبراتا بلکہ اس کی تمنا کرتا ہے ۔

جتنے غم چاہے دیئے جا مجھے یا رب لیکن — ہر نئے غم کے لئے تازہ جگر پیدا کر

یہ کہنا غلط ہے کہ فانی ہمیشہ موت ہی کی دعائیں مانگتے تھے ۔ بلکہ ایسے لمحات بھی دیکھنے میں آتے ہیں جب فانی اپنے "نخلِ تمنا" میں ثمر کے بھی خواہش مند ہیں ۔

یا اسے کر کسی بجلی کے حوالے یا رب — یا مرے نخلِ تمنا میں ثمر پیدا کر

کبھی وہ "قسمت کے حرف" مٹانے کے بھی آرزو مند ہوتے ہیں مگر "شوخیٔ تدبیر" دیکھ کر رک جاتے ہیں ۔ کبھی وہ تدابیر تو اچھی کرتے ہیں مگر تقدیر پانسہ پلٹ دیتی ہے ۔

دیکھ فانی وہ تری تدبیر کی حیثیت نہ ہو — اک جنازہ جا رہا ہے دوش پر تقدیر کے

کون کہتا ہے کہ فانی غم و یاس کی شدت میں تمام سہارے توڑ دیتا ہے ۔ وہ "موجوں کی سیاست" سے نہ گھبرانے والا شاعر "گرداب کی تہ" میں ساحل بھی دیکھ لیتا ہے ۔ وہ جب ابرِ کرم میں تاخیر دیکھتا ہے تو عاجزی سے عرض کرتا ہے ۔

یا رب تیری رحمت سے مایوس نہیں فانی — لیکن تری رحمت کی تاخیر کو کیا کہئے

خدا پر بھروسہ کی یہ شان ہے ۔

فانی غم ناخدا نہ کرنا — کشتی کہ مری خدا بہت ہے
اچھا یقیں نہیں ہے تو کشتی ڈبو کے دیکھ — اک تو ہی ناخدا نہیں ظالم! خدا بھی ہے
صبر شایانِ محبت تو نہیں ہے لیکن — شکر اگر بن نہ پڑے شکوۂ بیداد نہ کر

وہ موت کی تمنا بھی کرنا چاہتے ہیں مگر اس خیال سے رک جاتے ہیں کہ "ان کی مرضی" کا سوال درپیش ہے ۔

کیا کروں نازک بہت ہے ان کی مرضی کا سوال
ورنہ فانی اس جئے جانے سے کچھ حاصل نہیں

یہاں پر ایک دلچسپ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ کہیں فانی غم سے گریزاں نظر آتے ہیں اور کہیں اس کو "سینے سے لگانے" کے لئے طیار ہو جاتے ہیں ۔ ایک لمحے میں وہ "مسکرانے" کی تعلیم دیتے ہیں اور دوسرے میں ان کو دنیا تنگ و تاریک نظر آتی ہے ۔ آخر اس کا سبب کیا ہے ؟ اس سوال کے جواب میں **فطرت کا ایک اصول یاد رکھنا چاہئے کہ کبھی کبھی مریض کی زندگی میں بھی جو اپنی زندگی سے بالکل ناامید ہو جاتا ہے ایک وقت ایسا آتا ہے جب** وہ مسکرا اٹھتا ہے ۔ خود زندگی سے کتنا ہی ناامید کیوں نہ ہو گیا ہو مگر دوسروں کو زندگی کی اہمیت بتاتا ہے اس کو برتنے اور سلیقے سے گزارنے کا سبق دیتا ہے ۔ یہی حال فانی کا ہے ۔ وہ بھی انسان تھے اور انسانی فطرت کے تقاضوں سے بے تعلق نہیں ہو سکتے تھے ۔ یہی سبب ہے کہ جب دنیا کی تیرہ و تار زندگی سے گھبراتے ہیں تو زبان پر بے اختیار آ جاتا ہے ۔

گزرے گی اب نہ غم کا مدارا کئے بغیر — بنتی نہیں اجل سے تقاضا کئے بغیر

مگر ان کے یہاں غم سے گریز کی جو کیفیت ملتی ہے وہ صرف اس قدر ہے

اعجاز صدیقی

غزل

بات تو جب ہے، سب ہیں جمع انھیں کوئی تشنہ کام نہیں
فیض تو ہے ساقی کا جاری، لیکن فیضِ عام نہیں

ہم نہیں کہتے، لب پر اُن کے کوئی نیا پیغام نہیں
مختاروں کے نام تو ہے یہ، مجبوروں کے نام نہیں

کون ہے حُسنِ بے پروا کا جس کی زباں پر نام نہیں
ذکرِ محبت عام ہے جتنا، ذوقِ محبت عام نہیں

اِس سے زیادہ کیا ہوگی بیچارگیِ مرگِ انساں
لاشیں ہی لاشیں ہیں ہر سُو اور بپا کہرام نہیں

دھوپ ہے منعم کے ایواں میں، خانۂ دہقاں میں ظلمت
صبح بھی اِس کو کہہ نہیں سکتے، خیر اگر یہ شام نہیں

بے رنگیٔ گلشن کی دیں گلچیں ہی کو تہمت کیا
خاروں پر، غنچوں پر، گُل پر، کس کس پر الزام نہیں

اِس ڈالی پر اُس ڈالی پر تنکے چُنتا پھرتا ہوں
میرے چمن میں بھی تو مجھ کو اے اعجاز آرام نہیں

بیتاب بریلوی

برسات

جھجکتی لڑکھڑاتی ناز فرماتی ہوئی آئی
جہانِ رنگ و بُو میں کیف برساتی ہوئی آئی

گرجتی کھل کھلاتی ناچتی گاتی ہوئی آئی
ٹھٹھرتی سرسراتی سر پہ سنڈلاتی ہوئی آئی

مچلتی جھومتی موجوں میں لہراتی ہوئی آئی
چھلکتی مستیوں کے جام چھلکاتی ہوئی آئی

تھرکتی تھرتھراتی ٹھوکریں کھاتی ہوئی آئی
سمٹتی سٹپٹاتی راہ کتراتی ہوئی آئی

بھڑکتی روپ بھرتی رنگ دکھلاتی ہوئی آئی
سنہری بجلیاں بالوں میں چمکاتی ہوئی آئی

اُلجھتی گدگداتی پاؤں پھیلاتی ہوئی آئی
گلوں کو چھیڑتی غنچوں سے اٹھلاتی ہوئی آئی

ٹھٹکتی چھاؤں میں تاروں کی شرماتی ہوئی آئی
جھڑی پہروں لگاتی پھول برساتی ہوئی آئی

بہکتی مسکراتی کھل کے بل کھاتی ہوئی آئی
وہ آئی نکہتوں کا مینہ برساتی ہوئی آئی

فروغِ حسن کے جلووں کو ٹھکراتی ہوئی آئی
کنارِ آب و گل میں آگ بھڑکاتی ہوئی آئی

جواں بن کر جوانوں سے بھی اِتراتی ہوئی آئی
کھنکتے ساغروں میں بادہ چھلکاتی ہوئی آئی

وہ آئی لب پہ غنچوں کے ہنسی چمنستاں میں
مگر برسات کا عالم ہے پیدا چشمِ گریاں میں

تمکین کاظمی

جانِ عالم

واجد علی شاہ جن کا لقب جانِ عالم تھا، نہایت زندہ دل، بذلہ سنج، جدت پسند شاعر اور ماہر موسیقی تھے۔ اختر تخلص کرتے تھے، اور بڑے اچھے شاعر تھے۔ موسیقی پر بھی ان کی کئی ایک تصانیف موجود ہیں۔ اندر سبھا انھیں کی جدت پسندی کا نتیجہ تھی۔ جو خود انھوں نے نظم کرائی اور نہ صرف اپنی نگرانی میں اس کو اسٹیج کرایا بلکہ خود بھی اس میں ایک کردار (گلفام) کا رول ادا کیا۔

جانِ عالم کے دربار میں سینکڑوں شاعر جمع تھے اور سب پر طرّہ یہ کہ اُن کے محل کی ستر منکوحہ اور متعات میں زیادہ تر شاعرہ اور موسیقی داں تھیں۔ مختلف تذکروں اور کتابوں میں اُن خواتین کے حالات اور کلام کے نمونے نظر آتے ہیں جنھیں اکٹھا کر کے اس فیچر کی صورت میں پیش کیا جا رہا ہے، اس کے تمام کردار حقیقی، نام صحیح اور شعر انھیں خواتین کے ہیں۔

موسیقی داں بیگمات اپنا کلام گا کر سناتی ہیں تو موسیقی نہ جاننے والی بیگمات صرف لے میں اور تحت لفظ سناتی ہیں۔ جانِ عالم حکمرانانِ ہند میں پہلے شخص ہیں جن کے اطراف اتنی شاعرات کا جمگھٹ رہتا تھا

کردار

(۱) جانِ عالم، واجد علی شاہ، شاہِ اودھ
(۲) فاطمہ بیگم، جانِ عالم کی منکوحہ
(۳) عشرت محل، 〃 〃
(۴) قمر، ماہ طلعت حیدر بیگم 〃
(۵) مہ لقا محل، نواب سلطان جہاں بیگم
(۶) سکندر محل، جنیۃ السلطان، مکرمۃ الزمانی
(۷) بدر، نواب بدر عالم
(۸) امراؤ، حضور السلطان نواب امراؤ بیگم
(۹) مہدی، نواب مہدی بیگم
(۱۰) نوروز، نواب نوروز محل
(۱۱) عالم، نواب بادشاہ محل منکوحۂ خاص (صاحبِ مثنوی عالم سلطان)
(۱۲) حور، جانِ جہاں، نواب حور محل
(۱۳) بیگم، نواب مشک محل
(۱۴) صدر، نواب صدر محل (صاحبِ دیوان موسوم بہ بادشاہ نامہ سلطان)
(۱۵) شیدا، نواب شیدا بیگم
(۱۶) خورشید محل، وزیر
(۱۷) داروغہ خانم جان
(۱۸) فیروز (خواجہ سرا)

مقام بارہ دری جانِ عالم لکھنؤ۔ زمانہ غدر سے پہلے۔

جانِ عالم

(کوئی گانے والی دیسی سازوں پر پکا گانا گا رہی ہے۔ گانا سنتے سنتے جانِ عالم باتیں کرنے لگتے ہیں۔ بہت ہی موٹی گرجدار آواز۔ لہجہ نہایت ہی سلیس اور ملایم ہے۔

جانِ عالم۔ بادشاہ محل، آپ پرسوں کی اندر سبھا میں نہ تھیں، بڑی موہنی سبھا تھی۔

بادشاہ محل۔ جانِ عالم! میں نے بھی تعریف سنی ہے۔ جانِ عالم جس کام میں دخل لیں وہ موہنی کیسے نہ ہو؟

جانِ عالم۔ ہم آپ کی خاطر پھر سبھا کریں گے۔ کہئے کب رکھی جائے؟

بادشاہ محل ۔ آپ جب چاہیں کہیں، بندی حاضر ہے۔

جانِ عالم ۔ پرسوں پورن ماشی ہے ۔ بھرپور چاندنی رہے گی بسبھا کا لطف آئے گا، کیوں صدر محل۔

صدر محل ۔ حضور کی مرضی، مگر اس بدرِ کامل کی رات کوئی اور بات ہوتی تو بہتر ہوتا بسبھا تو ہوتی ہی رہتی ہے۔

جانِ عالم ۔ تمھیں بتاؤ! پھر کیا ہو؟

صدر محل ۔ میں کیا عرض کروں ۔ حضور ہی کوئی بات سوچیں۔

جانِ عالم ۔ بدر عالم بیگم! تم بتاؤ بدرِ کامل کی رات کیا ہو؟

بدرِ عالم ۔ حضور کے آگے بندی کیا عرض کر سکتی ہے حضور نے کوئی بات سوچ ہی لی ہوگی۔

جانِ عالم ۔ ہاں ایک بات سمجھ میں آگئی ہے، سب صاحبان تیار رہوں تو سیر رہے گی۔

بدرِ عالم ۔ ارشاد ہو، سارا محل حضور کے حکم پر جان و دل سے تیار ہے۔

جانِ عالم ۔ آج تک کبھی زنانہ مشاعرہ نہیں سنا، اللہ رکھے تم سب لوگ شعر کہتی ہو۔ کیوں نہ ایک مشاعرہ ہو جائے۔

بدرِ عالم ۔ سبحان اللہ! چشمِ بد دور، حضور نے نئی بات سوچی ہے۔

جانِ عالم ۔ بادشاہ محل! آپ کا کیا خیال ہے۔

بادشاہ محل ۔ حضور کا خیال اچھوتا ہے، بڑی سیر رہے گی۔ آج معرع دے دیجیے۔

جانِ عالم ۔ کیوں صدر محل؟ آپ کا کیا خیال ہے؟

صدر محل ۔ حضور نے انوکھی بات سوچی، بڑی دلچسپی ہوگی۔

جانِ عالم ۔ مگر طرح کی پابندی کیا ضرور ہے۔ ہر صاحب تازہ کلام کہہ کر سنائیں! کیوں بادشاہ محل۔

بادشاہ محل ۔ جانِ عالم درست فرماتے ہیں ۔ طرح کی پابندی واقعی بے گا ہے، سب کو تازہ کلام سنانے کا حکم کافی ہے۔ اس میں ایک نرالا پن بھی ہے۔

جانِ عالم ۔ مگر ایک بات کی پابندی رہے گی کہ کوئی صاحب پرانا کلام نہ سنائیں، کم ہو یا زیادہ، تازہ کلام ہو۔

بادشاہ محل ۔ جانِ عالم! بندی بھی یہی عرض کرنے والی تھی۔

جانِ عالم ۔ سب صاحبان سن لیں۔ پرسوں رات مشاعرہ ہوگا۔ تازہ کلام سُنایا جائے گا۔

ایک آواز ۔ حضور! اجازت ہو تو بندی کچھ عرض کرے۔

جانِ عالم ۔ ہاں ہاں، حور محل کہو۔

حور محل ۔ حضور! ہر صاحب اپنا کلام سازپر گائیں تو بہتر ہوگا۔

جانِ عالم ۔ نہیں یہ ٹھیک نہیں۔ مشاعرہ نہیں رہے گا یکسانیت سبھا ہو جائے گی۔ کیوں بادشاہ محل۔

بادشاہ محل ۔ جانِ عالم کا ارشاد بجا ہے، علاوہ ازیں مجھ ایسی چند گانا جاننے والی نہیں ہیں۔ اس لئے یہ ٹھیک بھی نہ ہوگا۔

جانِ عالم ۔ بھئی سازندے نہ ہوں گے۔ مگر جو گانا جانتی ہیں، گا کر سنائیں گی، اور جو جس طرح سنانا چاہیں گی سنائیں گی۔

(یا ہو دری میں سب شاعرات جمع ہیں۔ آپس میں چھیڑ چھاڑ، ہنسی مذاق ہو رہا ہے، قہقہوں کی آواز بلند ہے)

ایک آواز ۔ بھلا سناؤ تو کیا پڑھو گی؟

جواب ۔ نہیں ہم نہیں سنائیں گے۔

آواز ۔ اللہ اللہ! اب ہماری بات تک نہیں مانتیں؟

جواب ۔ گھڑی بھر کی تو بات ہے، ذرا صبر کرو۔ جانِ عالم تشریف لائیں تو سن لینا۔

آواز ۔ نہیں ہم نہیں سنیں گے۔

جواب ۔ اے ہے! تم تو خفا ہو گئیں۔ اچھی یہ بھی کوئی بات تھی۔

(ادھر یہ گفتگو ہوتی رہتی ہے اور اُدھر سے ہنسی قہقہوں کی آوازیں آتی رہتی ہیں، اتنے میں شہنائی کی آواز سنائی دیتی ہے جو دور سے نزدیک ہوتی جاتی ہے۔ (دھن شاہانہ) بسم اللہ بسم اللہ کی آوازیں بلند ہوتی ہیں، اور جانِ عالم ہوادار سے اُترتے ہیں)

جانِ عالم ۔ سب صاحبان آگئیں؟ داروغہ خانم جان! شمع لاؤ۔ تم ہر ایک کے سامنے شمع رکھو گی اور فیروز مشاعرے کے طریقے سے نام پکارے گا۔

خانم جان ۔ جہاں پناہ بالکل ایسا ہی ہوگا۔

فیروز ۔ جہاں پناہ! بیگمات من مانے بیٹھی ہوئی ہیں۔ نام کس ترتیب سے پکارے جائیں گے۔

جانِ عالم ۔ ترتیب کیسی؟

فیروز ۔ جہاں پناہ! کسی کا نام آگے پکارا جائے اور کسی کا پیچھے تو غلام پر ناراض ہوگی۔

جانِ عالم ۔ (قہقہہ لگاکر) شمع اِدھر سے گھومے گی جس طرح یہ صاحبان بیٹھی ہوئی ہیں اسی ترتیب سے نام آئے گا۔ پھر تو کوئی صاحب خفا نہ ہوں گی؟

(زنانی قہقہے بلند ہوتے ہیں)

جانِ عالم ۔ ہاں! بسم اللہ! شروع کرو۔

فیروز ۔ (تعارف کراتا ہے) نواب فاطمہ بیگم اپنا کلام سناتی ہیں۔

فاطمہ بیگم ۔ حضور! بندی نے یوں تو دو دن میں بیسیوں شعر کہتے ہیں، مگر ایک ہی شعر سناتی ہوں۔

(لے کے ساتھ خفیف سے ترنم میں)

پھر وہ چرچے ہوں پھر وہی باتیں　　دن ہوں عشرت کے عیش کی راتیں

جانِ عالم ۔ خوب، بہت خوب!

(دوسری خواتین بھی داد دیتی ہیں، واہ واہ سبحان اللہ کی آوازیں بلند ہوتی ہیں)

فیروز ۔ اب نواب عشرت محل کو سنئے۔

عشرت محل ۔ بندی صرف دو ہی غزلیں کہہ سکی۔ ہر ایک غزل کا ایک ایک شعر سناتی ہوں (تحت لفظ سناتی ہے)

گرمیٔ عشق مانعِ نشو و نما ہوئی　　میں وہ نہال تھا کہ اُگا اور جل گیا

جانِ عالم ۔ بہت خوب، کیا کہنے۔

ایک آواز ۔ حضور! عشرت محل مرزا نوشہ کی شاگرد ہو گئی ہیں۔

جانِ عالم ۔ ہاں صاحب! معلوم تو ایسا ہی ہوتا ہے۔ مانع نشو و نما کی ترکیب تو یہی بتاتی ہے۔

عشرت محل ۔ حضور! بندی فارسی شعر، زیادہ کہتی ہے، اس لئے اردو کہنے لگتی ہے تو روزمرہ اجنبی معلوم ہوتا ہے۔ یہ سنئے

شعلۂ عشق لگا آگ نہ گھر میں میرے　　یہ تو اللہ کا گھر ہے کسی دشمن کا نہیں

جانِ عالم ۔ اے سبحان اللہ! کیا بات پیدا کی ہے۔

(دوسری خواتین بھی داد دیتی ہیں)

فیروز ۔ ماہ طلعت نواب حیدری بیگم قمر اپنے شعر پیش کرتی ہیں۔

قمر ۔ (لے کے ساتھ خفیف ترنم میں)

گلِ سوداغنگفتہ ہیں فیضِ انکسار سے　　نسیم آہ کا جھونکا یہاں بادِ بہاری ہے

نہ پوچھو ہم نشیں ہم سے شرفیت کی بتائی　　الم ہے درد حسرت ہے فغانِ آہ و زاری ہے

گرے اتنے ستارے کفش سے تیرے تڑپ کر　　روش گلزار کی ہر ایک فرشِ زرنگاری ہے

جانِ عالم ۔ بہت خوب! بڑے نفیس شعر ہوئے ہیں اور کوئی شعر؟

قمر ۔ ہو گئی نیند بھی ہمسایہ کوتاہ حرام　　میں نے نالہ جو کیا رات سرِ شام کیا

جانِ عالم ۔ ماشاء اللہ واہ وا،

(دوسری خواتین بھی داد دیتی ہیں)

فیروز ۔ محبوب محل نواب سلطان جہاں کی غزل سماعت کیجئے۔

محبوب ۔ (پاٹ دار آواز میں پوری طرح گاکر)

اُٹھا سکی نہ مصیبت فراقِ یار میں روح　　نکل گئی تنِ لاغر سے اضطرار میں روح

ہزار مرتبہ تجھ پر سے میں فدا کرتی　　اگر یہ ہوتی مرے پیارے اختیار میں روح

جو آنا ہو تجھے مدِ نظر تو آ ظالم　　نکل نہ جائے کہیں تیرے انتظار میں روح

اُسی کے حکم سے ہے موت زندگی محبوب　　حقیقتاً ہے دلا دستِ کردگار میں روح

جانِ عالم ۔ واللہ محبوب محل! غضب کے شعر ہیں، داد نہیں دی جاسکتی۔

(دوسری خواتین بھی داد دیتی ہیں)

فیروز ۔ جنت السلطان مکرمۃ الزمانی نواب سکندر محل کے اشعار سنئے۔

سکندر محل ۔ حضور بندی ایک مثنوی کہہ رہی ہے۔ آج اسی کے چند شعر اور کہہ لئے ہیں، سماعت فرمایئے۔ (گاتی ہے)

نہیں آتا ہے اب قرار مجھے　　تیرا رہتا ہے انتظار مجھے

حال اپنا میں کیا کروں اظہار　　بس ترا دھیان مجھ کو ہے ہر بار

دن کو رہتا ہے اضطراب مجھے　　شب کو آتا نہیں ہے خواب مجھے

ہر گھڑی حال غیر ہے جانی　　خانہ اب بجنسہٖ ہے ویرانی

جانِ عالم ۔ اے سبحان اللہ! کمال کیا ہے واہ۔ (اور خواجین کی داد)

فیروز ۔ نواب بدرِ عالم کے شعر سنئے۔

بدرِ عالم ۔ حضور بندی نے بھی ایک مثنوی شروع کی ہے۔ اسی کے یہ شعر ہیں۔

(بلند آواز پکا گلا، باقاعدہ گا کر پڑھتی ہے)

ایک دو میں سے حال ہو جائے — وصل ہو یا وصال ہو جائے
دن گزر کر جو شام ہوتی ہے — ایک منزل تمام ہوتی ہے
لالۂ باغ میں تو چار ہیں داغ — ایک دل پر مرے ہزار ہیں داغ

جانِ عالم ۔ ماشاء اللہ کیا کہنے اور سناؤ صاحب۔

بدرِ عالم ۔ حضور! اب دوسری مغنی کے شعر سنئے۔

سناتا ہے بہت درد جدائی — دُہائی ہے دہائی ہے دہائی
بلائے ہجر میں جب سے پھنسی ہوں — میں انگاروں کے اوپر لوٹتی ہوں

جانِ عالم ۔ ارے صاحب! بس کرو، اس سے زیادہ سننے کی تاب نہیں فراقیہ اشعار تو تم غضب کے کہتی ہو۔

(دوسری عورتیں بھی داد دیتی ہیں)

فیروز ۔ حضور السلطان نواب امراؤ بیگم اپنا کلام سناتی ہیں۔

امراؤ بیگم ۔ حضور جب سے دشمنوں کے نرغے میں پھنسے ہیں بندی کو چین نہیں ہے۔ یہ دعائیہ اشعار میرے دل کی حالت ظاہر کرتے ہیں۔

(سیدھی سادھی طرز میں ترنم کے ساتھ سناتی ہے)

خدا دُور تم سے کرے یہ الم — نہ ہووے کسی بات کا تم کو غم
حکومت اسی طرح پھرتم کو دے — قیامت تلک ملک قائم رہے
جہاں میں نہ تم کو کبھی ہو ملال — محب شاد ہوویں عدُو پائمال

جانِ عالم آمین، آمین۔ واہ واہ صاحب کیا شعر کہے ہیں۔

(اور خواتین بھی داد دیتی ہیں)

فیروز ۔ نواب مہدی بیگم اپنے شعر سناتی ہیں۔

مہدی بیگم ۔ حضور! یوں تو بندی روزانہ دو ایک غزلیں کہہ لیتی ہے۔ مگر مشاعرے میں سنانے کے قابل یہی ایک شعر کہہ سکی۔

(لَے کے ساتھ)

کیا کہوں کچھ کہا نہیں جاتا — ہائے چپ بھی رہا نہیں جاتا

جانِ عالم ۔ بھئی واہ! ہزاروں غزلوں پر یہ ایک شعر بھاری ہے۔ کیا شعر ہوا ہے۔ (دوسری عورتیں بھی داد دیتی ہیں۔

فیروز ۔ نواب خورشید محل وزیر کے اشعار کی داد دیجئے۔

وزیر ۔ (باقاعدہ گا کر سناتی ہے)

مرے گل پیرہن سلطانِ عالم — مرے غنچہ دہن سلطانِ عالم
تو ہی ہے خسرو ملک معانی — مرے شیریں سخن سلطانِ عالم
نہ پھٹکے پاس تیرے تا قیامت — غم و رنج و محن سلطانِ عالم

جانِ عالم ۔ خوب، بہت خوب، کیا بات ہے۔ واہ وا،

(عورتیں بھی واہ واکا شور مچاتی ہیں)

فیروز ۔ نواب نور محل کا کلام پیش ہے۔

نور ۔ بندی نے حسب حال ایک شعر عرض کیا ہے سماعت فرمایئے۔

(نہایت درد ناک آواز میں لے کے ساتھ)

دل بہت بے قرار ہے صاحب — رات دن انتظار ہے صاحب

جانِ عالم ۔ کمال کیا ہے۔ ہم سمجھ رہے ہیں، خوب شعر کہا ہے۔

(دوسری عورتوں کی داد کی آوازیں)

فیروز ۔ صاحبان! سنبھل جایئے، نواب بادشاہ محل عالم اپنے کلام سے مسرور فرماتی ہیں۔

عالم ۔ جانِ عالم! یہ غزل میں نے ابھی ابھی کہی ہے۔ سنئے!

(ہلکے ترنم کے ساتھ باوقار متانت سے خفیف سی لے میں)

وہ گُلِ تر مرے گھر آئے اگر آج کی رات — ہو عیاں نخلِ تمنا میں ثمر آج کی رات
کروں نظارۂ دلدار بخوبی یارب — اتنی مہلت دے مجھے وہ جگر آج کی رات
گھر چمک جائے ابھی بُرجِ قمر کی صورت — جلوہ گر ہو جو مرا رشکِ قمر آج کی رات
کل شفا ہو گی جو تو آئے گا آرشک مسیح — تیرے بیمار پہ بھاری ہے مگر آج کی رات
ہے شبِ وصل مگر دل میں ہے یہ ڈھرکا عالم — بول اُٹھے نہ کہیں مرغِ سحر آج کی رات

جانِ عالم ۔ کمال کیا ہے بادشاہ محل آپ نے، کیا مرصع غزل ہوئی ہے۔ سبحان اللہ!

(ایک ایک خاتون علیحدہ علیحدہ داد دیتی ہے)

فیروز ۔ جانِ جہاں نواب حور محل اپنی غزل سے شاد کرتی ہیں۔

حور محل ۔ حضور نے پرسوں جو غزل سنائی تھی اسی زمین میں بندی نے بھی غزل عرض کی ہے۔ سماعت فرمایئے۔

(نہایت درد ناک آواز میں خفیف سے ترنم کے ساتھ سناتی ہے)

دیکھ لیں پھر ترے رخسارہ پیارے پیارے — آ سرِ بام کہ ہو جائیں نظارے پیارے
شوخیاں بھی نگاہوں کی دکھا دو ہم کو — پھر اسی طور ہوں چوری سے اشارے پیارے

اب کہاں ہوش جو نگاہ سے پشیانی کا ہم تو شیدا ہوئے مدت سے تمہارے پیارے
جی میں ارمان ہزاروں ہیں مگر صدقے تمہارے کہہ نہیں سکتی ہوں کچھ شرم کے مارے پیارے

جانِ عالم۔ واہ وا، حرمحل خوب غزل کہی ہے ماشاء اللہ

(سب عورتیں داد دیتی ہیں)

فیروز۔ نواب شیدا محل کے کلام سے لطف اُٹھایئے۔

شیدا بیگم۔ (بچے گلے سے نہایت متانت کے ساتھ باقاعدہ گاتی ہے)

ساقیِ ہر چمنِ باغ ہو ابر بہار رہو! پہلو میں تم ہمارے یہ عربدہ وقار ہو
ساون کا تو مہینہ ہو اور دن ہو ملہار ہو اور ننھی ننھی بوندوں کی پڑتی ہو ار ہو
جھولا پڑا ہوا ہو کسی شاخِ نخل پر اک سمت خوش گلو کوئی گاتا ملار ہو
کوئل کہو کہو کی صدا دے ہر ایک ہاں ٹپکا لگا ہو انبہ کا فصلِ بہار ہو
اس وقت بول اٹھے جو پپیہا کہ پی کہاں اک تیر عاشقوں کے کلیجے کے پار ہو
مہندی ہو ہاتھ پاؤں میں اپنے پچی پچی اور عطر میں بسا ہوا ہر تار تار ہو
جوبن وہ تم پہ ہم پہ ہو اس وقت زور کا جو وہ پری بھی آن کے جس پر نثار ہو

جانِ عالم۔ سبحان اللہ، ماشاء اللہ! کیا سماں باندھا ہے۔

(تمام خواتین داد دیتی ہیں)

فیروز۔ نواب رشکِ محل اپنی پختی سناتی ہیں۔

رشکِ محل۔ حضور جانتے ہیں، بندی صرف پختی کہتی ہے۔ آج ہی یہ غزل ہوئی ہے۔ ملاحظہ فرمایئے۔

(صرف نے سے پڑھتی ہے)

ہے منظور باجی ستانا تمہارا گلا کرتی ہے جو دوگانا تمہارا
نہ بھیجوں گی سسرال میں تم کو نہانے نہیں مجھ کو دو بھر ہے کھانا تمہارا
میری کنگھی چوٹی کی لیتی خبر ہو یہ احسان ہے سر پر دوگانا تمہارا
ہوا بال بیکا جو مرزا ہمارا تو پھر سنگ ہے اور شانا تمہارا

جانِ عالم۔ کیا خوب! سبحان اللہ! کیا روزمرہ ہے! کیسی صاف ستھری زبان ہے۔

فیروز۔ اب نواب صدرِ محل اپنی غزل سناتی ہیں، دل تھام کر بیٹھئے۔

صدرِ محل۔ جانِ عالم! میں نے اپنا دیوان "بادشاہ نامہ" مکمل کرنے کے بعد سے شعر کہنا چھوڑ دیا ہے۔ آج محض آپ کے حکم کی تعمیل میں یہ غزل میں نے کہی ہے۔ ملاحظہ ہو۔

(نہایت دردناک آواز میں پورے طور پر گاتی ہے)

جوشِ جنوں میں رات دن سب سے رہا الگ الگ
میں ہوں جدا الگ الگ، لوگ جدا الگ الگ
میں نے بلائیں لینے کو ہاتھ بڑھائے جس گھڑی
منہ کو پھرا کے یار نے مجھ سے کہا، الگ الگ
شمع جلانے آئے ہیں آج وہ میری قبر پر!
چلیو خدا کے واسطے بادِ صبا الگ الگ
خاک ہو زندگی بھلا تیرے مریضِ عشق کی
میں ہوں دوا سے دور دور مجھ سے دوا الگ الگ
بھر میں خوب خاک اُڑی اُن کو ہوا نہ کچھ اثر
نالے گئے الگ الگ، آہ رسا الگ الگ
حسرت و آرزوئے وصل، درد و مصیبتِ فراق
سب کا ہے لطف الگ الگ سب کا مزا الگ الگ
صدر وہ کم نصیب ہوں ہجر میں گر اُٹھاؤں ہاتھ
باب قبول سے رہے میری دعا الگ الگ

جانِ عالم۔ غضب کی غزل کہی ہے صدرِ محل آپ نے، صاحب یہ غزل سارے دیوان پر بھاری ہے۔ کیا کہنا۔ (تمام خواتین داد دیتی ہیں)

فیروز۔ اب ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

ایک آواز۔ (بات کاٹ کر) ہیں اب کسی میں غزل سنانے کی ہمت نہیں رہی۔ صدرِ محل نے سب کے دانت کھٹے کر دیئے۔

جانِ عالم۔ ہاں صاحب سچ بات ہے، اچھا اب مشاعرہ برخاست ہو۔

ذکر و فکر

اظہارِ حقیقت

محمد شاہ الرحمٰن خاں غفار

سینے میں داغِ عشق فروزاں ہے تو نہیں
خونِ دل و جگر جو ہوا اب تو کیا ہوا

یہ اور بات ہے کہ پڑے ہیں یہ خاک میں
یوں دیکھنے میں لاکھ یہ دھندلے سہی مگر

ذوقِ یقیں کا فیض ہو یا برکتِ عمل
رنگِ چمن گواہ ہے کہ اب کی بہار میں

انساں کی عظمتیں ہمیں تسلیم ہیں مگر
انساں ہی ننگِ عظمتِ انساں ہوئے تو ہیں

رنگینیٔ حیات کے ساماں بنے تو ہیں
ہم فیضیاب شوقِ فراواں کئے تو ہیں

ذرّے بھی رشکِ مہرِ درخشاں بنے تو ہیں
آثارِ صبحِ زیست نمایاں ہوئے تو ہیں

ہم اپنی قسمتوں کے نگہباں ہوئے تو ہیں
کچھ معجزاتِ حشر بداماں ہوئے تو ہیں

اتنا شرف بھی کس کو ملا اے بہارِ ناز
تیرے شہیدِ نازشِ دوراں ہوئے تو ہیں

غزل

زیبش کاکاشاد

جب تیرے سوگوار کا دل ٹوٹ جائے گا
غمہائے روزگار کا دل ٹوٹ جائے گا

اے سوزِ عشق ضبط و تحمل سے کام لے
اک حسنِ شرمسار کا دل ٹوٹ جائے گا

یہ سوچ کر ہی ہنس نہ سکے ہم شکستہ دل
یارانِ غمگسار کا دل ٹوٹ جائے گا

تجھ کو اُداس دیکھ کر اے جانِ سرخوشی
شادابیٔ بہار کا دل ٹوٹ جائے گا

کشتی کو ڈوبنے سے بچانا تو سہل ہے
طوفان کے وقار کا دل ٹوٹ جائے گا

اس درجہ التفات سے اے رحمتِ تمام
مجھ سے گناہگار کا دل ٹوٹ جائے گا

غزل

ارشد کاکوی

چمن کو موسمِ گل میں خزاں کی یاد آئے
کسے ہوس تھی کہ اس طرح سے بہا آئے

کھلا یہ رازِ جب آئے وہ بال بکھرائے
کہ روشنی سے زیادہ حسین ہیں سائے

جسے نصیب نہیں ہے ترا تغافل بھی
وہ رہ نوردِ محبت بھلا کہاں جائے

یہ زندگی ہے تو اس زندگی سے موت اچھی
یہ روشنی ہے تو اس روشنی سے باز آئے

ترے خیال کی ضو پاشیاں معاذ اللہ
خدا کرے مہ و انجم کی لاج رہ جائے

تصوّرات کی منّت گلی خدا کی پناہ
طرح طرح سے انھیں جا کے ہم سنوار آئے

غمِ نشاطِ دلِ الم کا کیا کہنا
یہ تجربے ہیں مری زندگی کے سرمائے

ر؟ (ادارہ)

حقائق و معارف

افقر موہانی وارثی

جو سجدہ بے نیازِ آستاں معلوم ہوتا ہے
وہی بس حاصلِ عمرِ رواں معلوم ہوتا ہے

میں دل ہوں وہ جو نذرِ تمنا ہو اور وہ ایسی میں جگہ ہے
کہاں جلوہ ہے اُن کا اور کہاں معلوم ہوتا ہے

ہماری استانِ عشق میں محنت ہو کچھ ایسی
کہ پیرِ فسانہ جزوِ داستاں معلوم ہوتا ہے

چمن کے رہنے والے دیکھ کر مجھ کو یہ کہتے ہیں
کہ یہ کوئی خرابِ آشیاں معلوم ہوتا ہے

بتائیں کیا تجھے گونجا نشینِ دل پوچھنے والے
بہت کم عرصۂ کون و مکاں معلوم ہوتا ہے

مجھے بھی آشیاں کے ساتھ پھونکا برق نے مگر
تجھے اب کچھ سکوں اے آسماں معلوم ہوتا ہے

غمِ دنیا سے جیتے جی رہائی ہو چکی افقر
یہ غم خمیازۂ عمرِ رواں معلوم ہوتا ہے

غمِ دل

طالب چھپروی

دل کو کچھ غم ہی نہیں پھر بھی میسّر نہیں
چاندنی ہے مری دنیا میں مگر تو نہیں

جبر ہے اس کے لئے اپنے عزائم کا قسم
ورنہ انساں کسی حال میں مجبور نہیں

تیری محفل کو اسی نے تو سنوارا تھا کبھی
آج جس کا تری محفل ہی میں گھر تو نہیں

رنگ لائی ہے مقدر کی سیاہی اے دوست
اب مری چاندنی راتوں میں بھی وہ نور نہیں

زندگی چاہوں تو بے لطف عطا ہوتی ہے
موت مانگوں تو انھیں موت بھی منظور نہیں

راس آیا نہ وطن جس کو وہ ہوں خاکِ خراب
اور غربت میں بھی یہ حال کہ مسرور نہیں

یہ الٰہی کے جاں سوز نظارے طالب
حاصلِ طورِ تو ہیں روکشِ جلوہ پور نہیں

فکر و نظر (رباعیات)

احسن طباطبائی

غم سہنے کی ہمّت بھی نہیں ہے باقی
فریاد کی حسرت بھی نہیں ہے باقی

آلام نہ کم ہوئے بہت صبر کیا
اب صبر کی طاقت بھی نہیں ہے باقی

دم بھر کو میسّر مجھے مہلت ہی نہیں
ممکن غمِ ہستی سے فراغت ہی نہیں

فریاد ہے ذوقِ شعر دینے والے
کیا شعر کہوں فکر کی فرصت ہی نہیں

بگڑا رہتا ہے گو مقدّر اکثر
کھلتے نہیں تدبیر کے جوہر اکثر

لیکن یہ حزیں وزارِ انساں احسن
لے لیتا ہے تقدیر سے ٹکّر اکثر

اقبال صدیقی

مُنڈا زبان پر ایک طائرانہ نظر

منڈا زبان و ادب پر سلسلۂ گفتگو شروع کرنے سے پہلے یہ ضروری ہے کہ منڈا فرقہ کے متعلق ایک سطحی علم فراہم کر لیا جائے۔ کیوں کہ بغیر اس کے زبان مذکور کی خصوصیات و لطائف سے روشناس ہونا ناممکن ہے۔ بہار راج کے چھوٹا ناگ پور کمشنری کا نام تو آپ نے ضرور سنا ہوگا۔ اور یہ بھی ضرور ہی سنا ہوگا کہ معدنی اعتبار سے چھوٹا ناگ پور ہندوستان کا اہم ترین خطہ ہے۔ منڈا فرقہ اسی مالا مال چھوٹا ناگ پور کی غریب آدمی یا سی آبادی کی ممتاز ترین غریب شاخ ہے۔

منڈاؤں کے حسب و نسب کے متعلق ماہرین نے مختلف خیالات ظاہر کئے ہیں۔ اس ضمن میں دو نظریئے قابلِ ذکر ہیں

بعض لوگ کہتے ہیں کہ منڈا منگولین نسل سے متعلق ہیں اور بعضوں کا خیال ہے کہ یہ دراوڑوں کی اولاد ہیں۔

یہ دونوں نتائج علم نسلیات اور علم تحقیقات زبان کی تفتیشات سے برآمد ہوتے ہیں۔ لیکن یہ دونوں نتائج اب غلط قرار دیئے جا چکے ہیں۔ ڈاکٹر گوہا کا کہنا ہے کہ منڈاؤں کا دراوڑوں سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اُن اوں فرقے پر دراوڑوں کے کچھ چھاپ ملتے ہیں۔ لیکن وہ اس لئے کہ قدیم اراؤں نے دراوڑوں کی صحبت کا اثر قبول کیا تھا جس طرح عصرِ حاضر میں قریباً ساری دنیا نے انگریزی زبان و لباس کو قبول کر لیا ہے۔ لیکن دراوڑوں اور اراؤں کے مابین اس کے علاوہ اور کوئی رشتہ نہیں کہ اراؤں نے دراوڑوں کی چند باتیں اپنا لیں۔ مگر منڈاؤں اور دراوڑوں کے مابین تو یہ چند باتیں" بھی مشترک نہیں ہیں۔ لہٰذا یہ خیال قطعی غلط ہے کہ منڈا دراوڑوں کی اولاد ہیں۔

دوسرا جدید کی قرار شدہ رائے یہ ہے کہ منڈا جنوبی مشرقی ایشیا کے آسٹرائیڈ نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ خیال علم زبان کی بنیاد پر مستوی کیا گیا ہے۔ آسٹرائیڈ نسل کی دو شاخیں ہیں۔

(۱) جزیروں میں رہنے والے آسٹرائیڈ جن میں انڈونیشیائی لوگ شامل ہیں۔

(۲) اندرون ممالک میں رہنے والے آسٹرائیڈ ۔۔ جو برمی، ہند چینی اور سیامی وغیرہ لوگوں پر مشتمل ہیں۔

منڈا مندرجہ بالا دوسری شاخ یعنی آسٹرک بڑی لوگوں کی ایک چھوٹی شاخ ہیں۔ ان کا ایک دوسرے سے دور دراز ہو جانا کوئی قابلِ حیرت بات نہیں ہے۔ سطحِ زمین پر جو تغیرات رونما ہوتے ہیں وہ اس قسم کے تحیرات پیدا کر جاتے ہیں۔ علم طبقات الارض بتاتا ہے کہ Hercynian Revolution سے پیشتر خلیج بنگال و بحرۂ عرب کا وجود نہیں تھا۔ آسٹریلیا، برما، جنوبی ہندوستان۔ عرب، جنوبی افریقہ وغیرہ ایک ہی سطحِ زمین تھے جنھیں Gondwanaland کہا جاتا تھا۔ Hercynian انقلاب کے بعد یہ حصے ایک دوسرے سے الگ ہو گئے۔ ساتھ ہی اس عظیم گونڈوانا لینڈ کی آبادی بھی منتشر ہو گئی۔ اور زمانۂ دراز میں ان کی زبانیں، ان کے معاشرات وغیرہ بھی ایک دوسرے سے اجنبی سے ہو گئے۔ چنانچہ منڈاؤں کی زبان وغیرہ بھی ان کے اپنے لوگوں سے مختلف ہو گئی۔

اور اب منڈاؤں کی زبان پر ــــــ

ایک زندہ زبان کی سب سے بڑی نشانی یہ ہے کہ وہ سرخی باؤں سے صحت مند اور حسین اثرات قبول کرنے کے لئے وہ ہر وقت آمادہ رہتی ہے۔ اردو زبان ہی کو لیجئے اس میں کتنے غیر اردو الفاظ شامل ہیں۔ ہزاروں کی تعداد میں۔ خوش قسمتی سے منڈا زبان بھی بے حد فراخ دل اور ترقی پسند واقع ہوئی ہے۔ اس زبان نے ہندوستان کی دیگر زبانوں

کی طرح عربی، فارسی سنسکرت پراکرت کے اثرات قبول کئے ہیں۔ مثال کے طور پر چند الفاظ درج ذیل ہیں۔

منڈا	سنسکرت	معنی
دَارُو	دَارُو	لکڑی
تُلا	تُلا	ترازو
پالنک	پالنگ	پلنگ
سَار	شَر	تیر
کَول	کسلی	کیلا
سَمُوم	سُوَرن	سونا
کومپارٹ	کومپارٹ	بڑا

اس میں کوئی شک نہیں کہ دیگر زبانوں کے بعض الفاظ جو منڈا زبان میں مقام پا چکے ہیں اپنا تلفظ تبدیل کر چکے ہیں اور ان کی موجودہ شکل میں انھیں پہچاننا قدرے دشوار معلوم ہوتا ہے۔ پھر بھی بغور دیکھنے پر ان کی حقیقت روشن ہو جاتی ہے۔

قدیم منڈا کھ۔ گھ۔ دھ وغیرہ الفاظ استعمال نہیں کرتے تھے۔ ہو (Ho) لوگوں کو اب بھی ان آوازوں سے بیر ہے۔ مثلاً ہو (Ho) لوگ دودھ کو دودھ۔ چھڑی کو چڑی، مٹھائی کو مٹی بولتے بولتے ہیں۔ منڈاؤں کو ان الفاظ سے بیر تو نہیں تھا لیکن اب وہ رفتہ رفتہ (ہ) چھوڑتے چلے جا رہے ہیں۔ خصوصاً شہروں کی منڈا زبان (رانچی وغیرہ) مقابلتاً سپاٹ ہوتی جا رہی ہے۔ مشکل اور غیر سہل تلفظ کی بجائے وہ "ترقی پسند" تلفظ رائج کرتے جا رہے ہیں۔ مثلاً

قدیم تلفظ	موجودہ تلفظ	معنی
دَاہَ	دا	پانی
سیتا	سیتا	کتا
کوتہ	کوتا	کہاں

منڈا زبان کے تلفظ پر بنگلہ تلفظ کے اثرات بھی نظر آتے ہیں مثلاً

منڈا	بنگلہ	معنی
ردکوم ردکوم	ردکوم ردکوم	قسم قسم
اُونیک	اُونیک	بے شمار

منڈا گرامر

دنیا کی ساری زبانوں میں عربی اور سنسکرت کے قواعد بہت ہی سخت مانے جاتے ہیں۔ منڈا زبان کے قواعد بھی بڑے نازک اور سخت ہیں۔ اس کی لغزشوں کی گنجائش بالکل نہیں ہے۔ ایک چھوٹا منڈا بچہ بھی بالکل صحیح زبان بولتا ہے۔ اس کے قواعد سنسکرت سے ملتے جلتے ہیں۔

(۱) سنسکرت کی طرح منڈا قواعد میں تین صیغے ہوتے ہیں۔

(۲) دونوں ہی میں تین جنس ہوتے ہیں۔

(۳) جنس کے لحاظ سے منڈا افعال کے فعل نہیں بدلتے جیسا کہ اردو میں ہے۔ ی کے بدل جاتے ہیں۔ مثلاً

کوڑی ہُون سینُوتانئے ـــــ لڑکی جاتی ہے

کوڑا ہُون سینُوتانئے ـــــ لڑکا جاتا ہے

(۴) دونوں زبانوں میں مرکب الفاظ مستعمل ہیں۔ مثلاً

راجہ ہُون ـــــ راجہ کا لڑکا

کیجُوہ اُوڑا ـــــ کھپریلی مکان

بیرُوم ہون ـــــ بکری کا بچہ

منڈا ادب

منڈا زبان کا تصنیفی ادب بہت ہی کم یاب ہے۔ بیشتر قصباتی گیتوں اور قصباتی کہانیوں میں ہی بکھرا ہوا ہے۔ ضرورت ہے کہ ان بیش بہا بکھرے موتیوں کو کتابوں کی مالا میں گوندھ دیا جائے۔ بعض اہل ذوق نے اس جانب توجہ کی ہے۔

منڈا گیت Munda Songs K. N. Archer کے نام سے ایک مجموعہ شائع کیا ہے۔ یہ مجموعہ منڈا گیتوں کا نمائندہ تو نہیں کہا جا سکتا۔ البتہ یہ ایک شاندار اور قابلِ آفریں کوشش ہے۔

رومن کیتھولک پادریوں نے اس زبان پر دو زبردست احسانات کئے ہیں۔ ایک تو یہ کہ انھوں نے منڈا گرامر مرتب کی ہے اور دوسری یہ کہ

Mundarika Encyclopaedia نامی ایک بیش بہا کتاب تصنیف کی ہے۔ اور سب سے دلچسپ بات تو یہ ہے کہ انھوں نے مقدس انجیل کا ترجمہ منڈا زبان میں کیا ہے۔

لوتھرین مشن کے نمائندوں نے ان دنوں ایک ماہنامہ جاری

کیا ہے "جاگر ساڈا" (کہنے کی بات) یہ ایک مستحسن قدم ہے۔ ان کے علاوہ چند چھوٹی چھوٹی تصنیفات بھی ہیں۔ مثلاً پروفیسر ہیورٹ کے وہ پمفلٹ جو انھوں نے تعلیم بالغان کے بورڈ کو ۱۹۳۷ء کی وزارت میں پیش کئے تھے۔ اور پھر موجودہ حکومت کی طرف سے شائع کردہ جنگل کے قوانین۔

اردو میں منڈا ادب کے تذکرے قطعی نایاب ہیں۔ ہندی والوں نے ادھر کچھ لکھنا شروع کیا ہے لیکن تراجم نظر سے گذرے بھی ہیں۔ ان کے متعلق یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ آخری تراجم ہیں۔ ہاں یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ ان کی کوششیں قابلِ مبارک باد ہیں۔ انھوں نے ایک بھولے بسرے کلچر کو روشنی میں لانے کی کوشش کی ہے۔ انھوں نے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ چھوٹا ناگپور کی سنگلاخ دھرتی سے بھی یہاں کے آبشاروں کی طرح نرم و ملائم ادب کے سوتے پھوٹے ہیں۔ اس سلسلے میں منڈا گیتوں کے اس شاندار مجموعے کا تذکرہ کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے جو زیرِ تبصرہ ہے۔ اس کا سہرا میرے دوست جگدیش ترگنایت کے سر ہے۔ یہ اپنی قسم کی واحد شے ہوگی جس میں منڈا زبان کے ہر قسم کے حسین و دل کش گیت ہوں گے۔ کاش اردو والے بھی اس میدان میں اُترتے۔

منڈا ادب دراصل ایک مستقل مضمون کا محتاج ہے۔ میں اُمید کرتا ہوں کہ مستقبل قریب میں قارئین کرام کی خدمت میں منڈا ادب کو اس کے نت نئے رنگ میں پیش کروں گا۔ سردست دو گیتوں پر اکتفا کرتا ہوں۔ اس مختصر مضمون میں تفصیلات کی گنجائش بھی نہیں ہے۔

(۱) ۔ ایک نوخیز دوشیزہ "ڈاری" سے پانی لینے کے لئے چلی جا رہی ہے اسے دیکھ کر ایک منچلا تڑپ اُٹھتا ہے اور کہتا ہے ۔

ڈانڈا سوسئے لے کینیا
پھولئی تینگیم چیا جینا
پھولائم دونا
مئی تا نیرل ساڈی تان
مئی نم لنڈا تانے گے
بورے دُو سُو تم بنڈا
بنڈا چینئن ہا ساچاؤ
بینا تنڈا آم نا
مئی نا جیئرب جیئرب تان
مئی نا نم لنڈا تانے گے
مینگ رے دو نیلے ساڈی
ساڈی نڈام اُو رے تن گے
لے لوتن منا.... آ.....
مئی نا کدل دارو لیکا
مئی نم لنڈا تانے گے

ترجمہ :-

(تمہاری) بالی عمر یا ہے۔ (تم اپنے روپ کے) نشے میں پھول رہی ہو۔ تمہارے پیر کی انگوٹھی سے مدھر آواز نکل رہی ہے۔ (اُو) میاں۔ لڑکی۔ تم ہنس رہی ہو۔ (تمہارے) سر پر سوت کا بنڈا ہے۔ اور بنڈا کے اوپر مٹی کا گھڑا۔ تم چلی جا رہی ہو۔ (اور تمہاری انگوٹھی سے) جیئرب جیئرب کی آواز نکل رہی ہے۔ میاں تم مسکرا رہی ہو (تمہاری) کمر میں نیلے رنگ کی ساڑی ہے (جو) زمین تک لہرا رہی ہے۔ تم کیلے کے درخت کی طرح نظر آ رہی ہو۔ اُو میاں تم مسکرا رہی ہو۔

(۲) ۔ وہ کہیں سے بنسری کی مدھر تانیں سنائی دے رہی ہیں۔ محبوبہ کا "نرم کر کیجو" ڈول رہا ہے۔ وہ سنگھار کر کے تیار ہو چکی ہے لیکن وہ کس کام کا بہانہ کر کے باہر جائے ؟

بسا ٹاپی، پیتل ٹاپی — ہوڑ مورے دو تیتے جاگی
تیری ری ری ری ..... تیری ری ری
بسا ٹاپی، پیتل ٹاپی — ہوڑ مورے دو تیتے جاگی
تیری ری ری .... تیری ری ری — رُو تُو دو رے ساڑی تان
پیتری رے دُو چکن کاپی — اُو ڑا رے دو ہنر ہو نجر
تیری ری ری رُو تو دو رے ساڑی تان

ترجمہ :-

"مٹی کے دیا (سے) پیتل کے دیا (سے لے کر اپنے) جسم میں (تیل) مالش کر چکی ۔ (اپنا سنگھار کر چکی) بانسری تیری ری ری بج رہی ہے ۔۔۔ (وہ سوچ رہی ہے کہ) گھر میں ساس سسر ہیں۔ میدان میں کونسا کام ہے۔ (جس کا بہانہ کر کے باہر نکلوں) اُدھر بانسری تیری ری ری بج رہی ہے۔

ڈونالڈ رابنسن

ڈاکٹر طٰہٰ حسینؔ

(مصرِ جدید کا ایک نابینا رہنما)

مصرِ جدید کے اس نامور عالم ڈاکٹر طٰہٰ حسینؔ کو ملک سے جہالت اور قدامت پسندی دور کرنے کے لئے بڑی ٹیڑھی راہوں سے گذرنا پڑا۔ لیکن جدوجہد کی ان راہوں میں قدم رکھتے ہوئے انھوں نے کبھی کوئی جھجک محسوس نہیں کی۔ سماجی مقاطعہ، ناقے اور سزا کا خوف ان کو اپنی منزلِ مقصود سے کبھی ہٹا نہ سکے۔ آخر کار انھوں نے اپنی طویل جدوجہد میں شاندار کامیابی حاصل کی۔ چنانچہ یہ ان ہی کی ان تھک کوششوں کا نتیجہ تھا کہ سن ۱۹۵۰ء سے مصر میں مفت ابتدائی تعلیم کا آغاز ہوا۔ تاریخ جدید میں یہ پہلا موقعہ تھا کہ کسی عرب ملک میں بلا امتیاز امیر و غریب تمام لڑکوں کو تعلیمی سہولتیں دی گئیں۔ ڈاکٹر حسین نے صرف اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ انھوں نے تمام عرب قوم کو بھی مفت ابتدائی تعلیم کی طرف قدم بڑھانے کا موقعہ دیا۔ اور مصر کی یونیورسٹیوں کو اس قابل بنایا کہ آج اُن کا شمار دنیا کی بہترین یونیورسٹیوں میں ہوتا ہے۔ اپنے مدلل مضامین کے ذریعے سے انھوں نے عرب کے بے بنیاد روایتی عقیدوں کو دور کیا۔ اور عوام کو سابقہ اسلامی عظمت اور تہذیب و تمدن سے دوبارہ روشناس کراتے ہوئے ملک کو ایک آزاد جمہوریت کا پیغام دیا۔ یہ تعجب کا مقام ہے کہ انھوں نے یہ سب کچھ آنکھوں کی روشنی نذر کرتے ہوئے کیا۔

ڈاکٹر حسینؔ مصر کے ایک شہر منیا گھا میں سنہ ۱۸۸۹ء میں پیدا ہوئے۔ وہ تین برس ہی کے تھے کہ بیماری نے اُن کی بینائی چھین لی۔ اپنی سوانح حیات میں انھوں نے ان پریشانیوں کا کچھ ذکر کیا ہے جن سے وہ اندھے ہونے کے بعد دوچار ہوئے۔ وہ لکھتے ہیں کہ گو ان کی ماں اُن کی ہمدرد تھیں اور اُن کا ہر طرح خیال رکھا کرتی تھیں لیکن کبھی کبھی وہ اُن کے ساتھ بے توجہی اور سختی سے بھی پیش آتی تھیں۔ اور وہ محسوس کرتے تھے کہ جس کام کے کرنے سے وہ منع کئے جاتے ہیں۔ وہی کام اُن کے دیگر بھائی اور بہن ماں کی اجازت سے انجام دیتے ہیں۔ مترجم شروع میں اس خیال نے اُن کے دل میں خاطفی کے جذبات پیدا کئے لیکن بعد میں یہی خیال ایک خاموش اندرونی غم میں تبدیل ہو گیا۔ ان کو پڑھنے کا بے حد شوق تھا لیکن اندھے پن کی وجہ سے مجبور تھے۔ ان کے دوسرے تمام بھائی مدرسے میں تعلیم حاصل کر رہے تھے اور ان کو مدرسے جاتے دیکھ کر ان کے دل میں بھی پڑھنے کا خیال کروٹیں لینے لگا۔ آخر کار بڑی کوششوں سے اپنے بھائی کا سہارا لے کر یہ بھی مدرسے جانے لگے۔ اور بہت جلد پورے قرآن کو حفظ کر کے انھوں نے مدرسے میں اپنی ذہانت کا سکہ بٹھا دیا۔

ڈاکٹر حسین ابتدائی تعلیم کی تکمیل کے بعد اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لئے قاہرہ پہنچے اور جامعہ ازہر میں شریک ہو گئے۔ اپنی سوانح حیات میں وہ لکھتے ہیں کہ قاہرہ کے گلی کوچوں میں پھرتے ہوئے ابتداءً اُن پر عجیب کیفیت طاری ہو جاتی تھی۔ ایک مرتبہ وہ اپنے پروفیسر کے ہاں عشائیہ پر موجود تھے۔ گو وہ دیکھ نہیں سکتے تھے لیکن ان کو یقین تھا کہ تمام مہمان ان کو گھور رہے ہیں۔ چنانچہ خوف و دہشت کے ان ملے جلے جذبات نے ان کو اتنا بدحواس کر دیا کہ کھاتے وقت ان کے ہاتھ تھرتھرانے لگے۔ جس کی وجہ سے ہاتھ سے شوربے کا برتن چھوٹ گیا اور سارا شوربہ بدن پر آ رہا۔

جامعہ ازہر کی نمائشی قدامت پسندی کو وہ زیادہ مدت تک برداشت نہ کر سکے اور اسی مخالفت میں انھوں نے اس جامعہ کو چھوڑ کر دوسری "آزاد مصری جامعہ" میں شرکت کر لی اور سنہ ۱۹۱۴ء میں "بیسویں صدی کے عرب شاعر ابوالعلاء" پر مقالہ لکھ کر اس جامعہ میں پہلی مرتبہ پی ایچ ڈی کی سند حاصل کی۔ اس مقالے نے ارباب جامعہ کو اس قدر متاثر کیا کہ انھوں نے پیرس کی "سربون یونیورسٹی" میں اپنے خرچ سے ان کو تعلیم دلوائی۔ سن ۱۹۱۸ء میں انھوں نے یہاں سے بھی پی ایچ ڈی کی سند حاصل کی۔

پیرس میں قیام کے دوران میں جبکہ وہ تعلیم پا رہے تھے انھیں یونیورسٹی کی سوزن بریسو نامی ایک طالبہ سے محبت ہو گئی جس کو سنہ ۱۹۱۷ء میں انھوں نے اپنی رفیقۂ حیات بنایا۔ سوزن جس کو حسینؔ ایک فرشتہ تصور کرتے ہیں اُن کے سارے

کام انجام دیتی ہیں۔ وہ ان کو کتابیں پڑھ کر سناتی ہیں۔ ان کے مضامین لکھتی ہیں اور ان کی لکھائی ہوئی تقاریر کو خود پڑھ کر سنایا کرتی ہیں۔

پیرس سے واپسی کے بعد ڈاکٹر حسین مصری یونیورسٹی میں عربی کے پروفیسر ہوئے اور انھوں نے عربی طریقۂ تعلیم کو سائنٹفک طور پر ڈھالنے کی کوشش کی۔ عربی ثقافت کے بارے میں وہ ہمیشہ اس بات پر زور دیتے تھے کہ حقائق کا پتہ لگانے کے لئے ان روایات کو جو ابھی تک عربی تہذیب کا محافظ تصور کی جاتی ہیں، ختم کر دیا جائے۔ چنانچہ عرب کلچر کا خائر مطالعہ کرنے کے بعد انھوں نے سنہ ۱۹۲۷ء میں قدیم اسلامی ادب پر ایک کتاب لکھی جس میں وہ لکھتے ہیں کہ عربی ثقافت کا نیا دور ترحلہ ناقابل یقین ہے۔ لیکن انھیں اس کتاب اور اس خیالات کی وجہ سے کافی مصیبتیں اٹھانا پڑیں۔ کیونکہ جو شیخ عرب اب تک عربی زبان کو مذہب اسلام کی طرح بے عیب اور متبرک سمجھتے تھے۔ اور اس نظریے کے تحت بعض جماعتوں نے تو ان کو اور ان کی کتاب کو ختم کرنے کی بھی کوشش کی۔

ڈاکٹر حسین نے اپنے کو صرف اس حد تک محدود نہیں کیا۔ انھوں نے سیاسی میدان میں بھی آزاد جمہوریت کے لئے کافی جد جہد کی ہے۔ سنہ ۱۹۳۰ء میں مصر میں جب قدامت پسند حکومت وجود میں آئی اور تعلیمی آزادی پر پابندیاں عاید کی جانے لگیں تو انھوں نے اس کی کھلی مخالفت شروع کر دی جس کی وجہ سے ان کو یونیورسٹی سے ہٹا دیا گیا اور ۴ سال تک طرح طرح کی تکلیفیں دی گئیں۔ لیکن سنہ ۱۹۳۶ء میں جب سابقہ آزادی پھر سے حاصل ہوئی تو انھیں سابقہ خدمت پر صدر شعبہ فنون کی حیثیت سے بحال کر دیا گیا۔ اور حالات کے خلاف ان کی جد جہد میں تیزی سے اضافہ ہوا۔ چنانچہ انھوں نے مفت ابتدائی تعلیم کی تجویز پر غور کرنا شروع کیا۔ مفت ابتدائی تعلیم کی اسکیم سب سے پہلے عربوں ہی نے روبعمل لائی۔ زمانۂ وسطیٰ کی تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ اس وقت ان کے ہاں مفت طریقۂ تعلیم کا رواج تھا۔ لیکن بعد میں یہ طریقہ ختم ہو گیا۔ جس کو اب ڈاکٹر حسین دوبارہ رائج کرنا چاہتے تھے وہ اس خیال کے مخالف تھے کہ حکومت ایسی ہو تنہیں فراہم نہیں کر سکتی۔ اپنے خیال کی تشریح کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں کہ تعلیم ایک ایسی روشنی اور تازگی بخش ہوا ہے جس کو حاصل کرنے کا ہر شخص مستحق ہے اور کوئی سماج اس کے اس حق کو نہیں چھین سکتا۔

ڈاکٹر حسین نے ۴۰ بہترین کتابیں لکھی ہیں جن میں زیادہ تر قدیم و جدید عربی ادب سے متعلق ہیں اور کچھ کتابیں دیگر ممالک کے ادب کے بارے میں ہیں۔ اپنی کتاب "مصری ثقافت کا مستقبل" میں ثقافتی اور تعلیمی اصلاحات کے پروگرام کی کے مشورے سے ثانوی تعلیم مفت کر دی گئی۔ اس مدت میں وہ سنہ ۱۹۴۲ء میں اسکندریہ یونیورسٹی کی بنیاد ڈال چکے تھے جس کے وہ ریکٹر منتخب ہوئے۔ "مصری یونیورسٹی کی طرح انھوں نے اس یونیورسٹی کو بھی اعلیٰ یونیورسٹیوں کی صف میں لا کھڑا کیا۔ اپنے عہدے سے قائمہ اٹھاتے ہوئے انھوں نے تمام عرب ممالک کو نازیوں کے خلاف متحد کرنے کی بھی کوشش کی۔

سنہ ۱۹۴۵ء میں مصر کی سیاست نے پھر پلٹا کھایا اور دوبارہ قدامت پسند حکومت قائم ہوئی۔ نتیجتاً ان کو یونیورسٹی اور وزارت تعلیم میں مشیر کے عہدوں سے سبکدوش ہونا پڑا۔ حالات اتنے بگڑ گئے اور حکومت ان کی اس قدر مخالف ہو گئی کہ لوگوں کو ان سے ملتے ہوئے تامل ہوتا تھا۔ لیکن ان کی جد جہد میں کوئی کمی نہیں ہوئی اور جمہوریت کی تعلیق کے لئے وہ "ایجیپشن اسکرایب" کے نام سے ایک رسالہ بھی شائع کرنے لگے جس کو حکومت نے کچھ ہی مدت بعد بند کر دیا۔

آخر کار سنہ ۱۹۵۰ء میں مصر میں ایک آزاد حکومت اقتدار میں آئی اور ڈاکٹر تعلیم کی حیثیت سے ڈاکٹر حسین کا انتخاب عمل میں آیا۔ وزیر ہونے کے بعد انھیں اپنی دیرینہ اسکیم کو روبہ عمل لانے کا بہترین موقعہ ملا۔ چنانچہ انھوں نے بہت جلد ثانوی تعلیم بھی مفت کر دی۔ اور آج ایک مصری لڑکا ۱۲ سال تک کی تعلیم مفت حاصل کر سکتا ہے۔ مصری اس موقعہ سے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ چنانچہ سنہ ۱۹۵۰ء اور سنہ ۱۹۵۱ء میں صرف بنیادی تعلیم کے مدارس میں ۷۷۹۰ اور ۲۰۳۰۳ بچے علی الترتیب داخل کئے گئے۔ سنہ ۱۹۲۰ء میں جہاں سارے مصر کے طلباء کی تعداد ۲۹۸۰۲۷ تھی وہاں اب سنہ ۱۹۵۱ء میں ۱۴۳۱۷۵۴ سے زاید ہو گئی۔

دوسری عرب ثقافتی کانفرنس میں ڈاکٹر حسین نے تمام عرب ممالک کے نمائندوں کو مفت تعلیم کے رواج کو ایک عالمی حق کی حیثیت سے تسلیم کرنے کے لئے ہموار کیا۔ اور اب وہ اس بات کی کوشش کر رہے ہیں کہ مغرب و مشرق میں ثقافتی اعتبار سے جو فصیل ہے وہ کسی طرح ختم ہو جائے۔ چنانچہ اس ممن میں وزارت تعلیم کی جانب سے ان کے تحت ترجمے کا ایک محکمہ قائم کیا گیا ہے جہاں انگریزی، فرانسیسی اور دیگر مغربی ممالک کی ثقافتوں کو عربی زبان میں منتقل کیا جا رہا ہے اور حکومت سیکڑوں طلباء کو اعلیٰ تعلیم کے لئے بیرونِ ملک بھیج رہی ہے۔

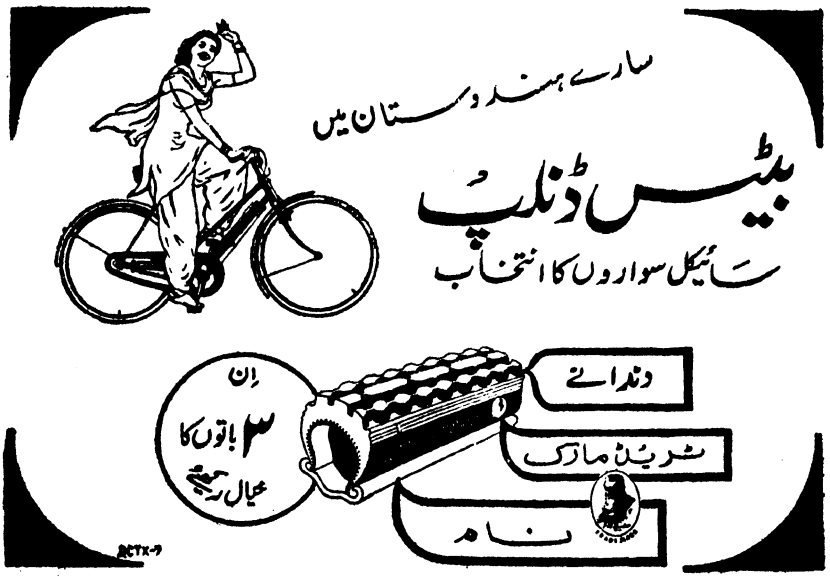
ڈاکٹر حسین نے ۴۰ بہترین کتابیں لکھی ہیں جن میں زیادہ تر قدیم و جدید عربی ادب سے متعلق ہیں اور کچھ کتابیں دیگر ممالک کے ادب کے بارے میں ہیں۔ اپنی کتاب "مصری ثقافت کا مستقبل" میں ثقافتی اور تعلیمی اصلاحات کے پروگرام کی

وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ مصری باشندے منطقہ بحیرہ روم کی ایک قوم ہیں اور وہ اس منطقے کے حال و مستقبل کی حد تک مغربی ممالک کے ساتھ ہیں۔ انھوں نے کئی ناول بھی لکھے ہیں۔ "دنیا کی جہنم" (جو سنہ ۱۹۴۹ء میں لکھی گئی) میں انھوں نے سماج پر کڑی تنقید کی ہے جس کی وجہ سے یہ ناول کچھ مدت تک ممنوع قرار دیا گیا تھا۔ ان کی آپ بیتی کا دوسرا حصہ عربی ادب میں ایک شاہکار تسلیم کی جاتی ہے) ۱۵۔ یورپی اور مشرقی زبانوں میں ترجمہ کیا گیا ہے۔

ڈاکٹر طٰہٰ حسین کو عام طور پر رعب دار چہرے والے مضبوط انسان کے نام سے موسوم کئے جاتے ہیں۔ اپنی بیوی اور بچوں کے ساتھ قاہرہ کے ایک محفوظ سے مکان میں رہتے ہیں۔ وہ دولت کی پروا نہیں کرتے۔ ان کے ہاں عربی، فرانسیسی اور یونانی کتابوں کے علاوہ گراموفون ریکارڈ بھی کثرت سے ہیں۔ وہ علی الصبح بیدار ہوتے ہیں اور خود ہی داڑھی بناتے ہیں۔ اس دوران میں اُن کا سکریٹری صبح کی خبریں پڑھ کر سناتا ہے۔ انھوں نے کبھی ویسی اُبھری ہوئی تحریر سے پڑھنے کا انداز جس پر ہاتھ رکھ کر انڈے پڑھ سکتے ہیں۔ نہیں سیکھا۔ جب وہ گھر پر ہوتے ہیں تو شیکسپیئر کی کتابوں کو پڑھوا کر سنتے ہیں یا کبھی اپنے شاگردوں کے ساتھ وقت گذارتے ہیں۔

دوسرے اکثر نابیناؤں کی طرح اُن کے چہرے سے مایوسی اور رنج کا اظہار نہیں ہوتا۔ اس کے برخلاف ان کا نورانی چہرہ ان کی خود اعتمادی اور سکونِ قلب کو ظاہر کرتا ہے۔

(مترجمہ۔ حبیب غازی الدین)



چترنجن

ایشیا میں ریلوے انجن طیار کرنے کا سب سے بڑا کارخانہ

شاید عام لوگوں کو اس امر کا علم نہیں کہ بھارت میں ریلوں کے ورکشاپوں میں ۱۸۵۴ء میں ہی ریلوے انجنوں کی تیاری کا کام شروع کر دیا گیا تھا۔ ۱۹۴۷ء تک جمال پور اور اجمیر کے ورکشاپوں میں وقتاً فوقتاً ۹۷ ریلوے انجن تیار کئے گئے۔ ان انجنوں کے بہت سے پرزے غیر ملکوں سے درآمد کئے گئے تھے۔

پہلی عالم گیر جنگ کے بعد سنٹرل لوکو موٹو کمپنی کا قیام ہوا۔ اس کمپنی نے جمشید پور میں ریلوے انجن تیار کرنے کا کارخانہ قائم کیا۔ لیکن ٹیرف بورڈ کی طرف سے کوئی تحفظ نہ ملنے کے باعث یہ کارخانہ چل نہ سکا۔ ۱۹۳۶-۳۷ء کے بعد حکومت کی طرف سے مقرر کردہ ایک کمیٹی نے یہ رپورٹ پیش کی کہ غیر ممالک سے ریلوے انجنوں کی درآمد کے مقابلے میں خود بھارت میں انجن تیار کرنا زیادہ فائدہ مند ثابت ہوگا۔ لیکن دوسری عالم گیر جنگ کا آغاز ان سفارشات کو عملی جامہ پہنانے میں مانع ثابت ہوا۔ اختتام جنگ پر ان سفارشات پر از سر نو غور کیا گیا۔ لیکن اس دفعہ ملک کی تقسیم سے پیدا شدہ مشکلات ان کی تکمیل کے راستے میں حائل ہوئیں۔

بالآخر اس مقصد کے لئے چترنجن کے مقام کا انتخاب کیا گیا اور اس اسکیم پر اتنی تیز رفتاری سے عمل کیا گیا کہ اپریل ۱۹۴۸ء میں کارخانے کی تعمیر کا باقاعدہ کام شروع ہو گیا۔

یہ مقام اس قسم کی صنعت کے لئے نہایت ہی موزوں ہے۔ مغربی بنگال کے کوئلے کے میدانوں سے دس میل اور دامودر ویلی کارپوریشن کے مانسون ڈیم سے صرف چھ میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ چنانچہ یہاں سارا سال بجلی اور پانی کی کمی واقع نہیں ہوتی۔ علاوہ یہاں کی معتدل آب و ہوا محنت کشوں کی صحت کی معاون ہے۔ کارخانے میں کام کرنے والوں کے لئے تقریباً ۵ ہزار رہائشی کوارٹر تعمیر کئے گئے ہیں۔ ہر کوارٹر میں بجلی اور صاف پانی مہیا کرنے کے انتظامات کئے گئے ہیں۔ مختصر یہ کہ چترنجن ایک ایسا مثالی شہر آباد کیا گیا ہے جہاں تمام جدید سہولتیں مہیا کی گئی ہیں۔ دامودر ویلی کارپوریشن سے کسی وقت کسی وجہ سے بجلی کی سپلائی منقطع ہو جانے کے امکانات کے پیش نظر چترنجن میں بھی بجلی تیار کرنے کا ایک کارخانہ قائم کیا گیا ہے۔

ریلوے انجن تیار کرنے کا یہ کارخانہ آٹھ لاکھ ۸۰ ہزار مربع فٹ رقبہ پر قائم کیا گیا ہے۔ اس میں جدید ترین مشینیں استعمال کی جا رہی ہیں جن کا ۹۵ فی صدی سے زائد حصہ برطانیہ سے منگوایا گیا ہے۔ باقی ماندہ مشینری امریکہ اور کینیڈا سے درآمد کی گئی ہے۔ ایشیا میں ریلوے انجن تیار کرنے کا یہ سب سے بڑا کارخانہ ہے۔

اس کارخانے میں ریلوے انجن تیار کرنے کے کام کو بڑے منظم طریقے سے انجام دیا جاتا ہے۔ جونہی کسی انجن کی تیاری کا آرڈر موصول ہوتا ہے انجن کے مختلف پرزوں کی تیاری اور اُن کو جوڑنے کی تاریخیں تعین کر دی جاتی ہیں۔ کارخانے میں تیار کئے جا سکنے والے اور باہر سے منگوائے جانے والے پرزوں کی الگ الگ فہرست تیار کی جاتی ہے۔ ہر پرزے کی تیاری کے دوران میں اُس کے معیار کی نگرانی کے موزوں انتظامات کئے گئے ہیں۔ آخر میں ریلوے بورڈ کا ایک افسر جوڑے گئے پرزوں کا معائنہ کرتا ہے۔ یہ اس قدر احتیاط اور دیکھ بھال کا ہی نتیجہ ہے کہ چترنجن میں تیار شدہ ریلوے انجن غیر ممالک سے درآمد شدہ بہترین انجنوں کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔

اس کارخانے کی عمارت اب بالکل مکمل ہو چکی ہے۔ اس میں تیار شدہ ۵۰ سے زائد ریلوے انجن بھارت کی مختلف ریلوے لائنوں پر چل رہے ہیں۔ اس میں ریلوے انجن کے تمام پرزے تیار کرنے کے انتظامات پایۂ تکمیل کو پہنچ چکے ہیں۔ ہر سال ۱۲۰ ریلوے انجن اور ۵۰ بائلر تیار کرنا بھارت کا مطمح نظر ہے۔ اس مقصد کے لئے ریلوے انجن کے مختلف پرزے زیادہ سے زیادہ تعداد میں تیار کرنے کی ضرورت ہے۔

چترنجن کی تعمیر میں حصہ لینے والوں کے قابل فخر کارنامہ نے قوم کی ایک دیرینہ خواہش کو عملی جامہ پہنایا ہے۔

تاج محل

روضۂ تاج محل آگرہ جو ایک شہنشاہ کے ابدی عشق کی مرمریں تعبیر ہے، اپنے حسنِ تعمیر و رعنائیِ تخیل کے لئے دنیا بھر سے خراجِ تحسین حاصل کر چکا ہے۔ اب بھی یہ سنگِ مرمر میں تخیل کی کبھی تصویر بگڑی ہوئی مسرتوں اور تمناؤں کا پیغام دے رہی ہے۔ روضے سے جس صناعی اور ذہنکا راند تعمیر و ترتیب کا ثبوت ملتا ہے۔ اس کی دنیا بھر کے ماہرینِ تعمیر نے تعریف کی ہے۔ فرگوسن نے مشرقی ممالک کے فنِ تعمیر کے بارے میں اپنی تحریروں میں تاج محل کو بے نظیر قرار دیا ہے۔ اس کی نفاست، اس کی تعمیر پر استعمال شدہ سامان کی خوبصورتی، اور اس کے طرزِ ساخت کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے لکھا ہے کہ

"تاج محل متعدد خوبصورتیوں کا مرقع ہے اور اس کی ترتیب کی موزونیت اور خوبصورت امتزاج نے اسے کل عالم کے لئے مثلِ نظر تھنے کا درجہ دے دیا ہے۔ اس کی کشش کا یہ عالم ہے کہ دنیا کے گوشے گوشے سے سیاح اسے دیکھنے کے لئے بھارت آتے ہیں۔

یہ مقبرہ سفید سنگِ مرمر سے تعمیر کیا گیا ہے۔ اس کے پیچھے کی طرف مسجد اور دکن کی طرف اندر داخل ہونے کا بڑا دروازہ ہے۔ عمارت کا یہ حصہ چودہ سال میں مکمل ہو گیا تھا لیکن باقی حصّے کی تکمیل پر مزید آٹھ سال صرف ہوئے۔ اس لاثانی عمارت کی تعمیر پر پچاس لاکھ سے لے کر چھ کروڑ روپے تک کے مصارف کے متعلق تخمینے پیش کئے گئے ہیں۔ بادشاہ نامہ میں درج اخراجات میں سنگِ مرمر، ریتلے پتھر اور جواہرات کی لاگت شمار نہیں کی گئی۔ اس کی وجہ شاید یہ ہو کہ یہ چیزیں سرکاری گودام سے حاصل کی گئی تھیں۔

کسی چیز کی خوبصورتی خواہ کتنی ہی بے عیب ہو وہ زمانے کی رفتار سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی۔ چنانچہ وقت کی رفتار بھارتی فنِ عمارت سازی کے اس نادر نمونے پر بھی اثر انداز ہوئی ہے اور مرکزی وزارتِ تعلیم کا شعبۂ آثارِ قدیمہ گزشتہ دس سال سے زائد مدت سے اس کے تحفظ کے اقدامات کی طرف توجہ دے رہا ہے۔ ۱۹۳۶ء میں بڑے گنبد میں پہلی بار پانی ٹپکنا شروع ہوا اور اس کی فوری مرمت کی تجویز پیش کی گئی لیکن اس کی تاریخی اہمیت کے پیشِ نظر بھارت سرکار نے ماہرانہ مشورہ حاصل کرنے کے لئے ایک مشاورتی کمیٹی قائم کی۔ ۱۹۴۴-۴۱ء کی درمیانی مدت میں اس کمیٹی کی سفارشات کو عملی جامہ پہنانے پر ۹۲ ہزار روپے صرف ہوئے۔ ۱۹۴۴ء میں تاج محل کے تحفظ سے متعلق مسائل پر غور کرنے کے لئے ایک اور مشاورتی کمیٹی کا قیام عمل میں لایا گیا۔ اس کمیٹی نے اس سال اپنی سفارشات پیش کر دیں اور انھیں بتدریج عملی جامہ پہنایا جا رہا ہے۔ بھارت سرکار نے ۱۹۴۷-۴۸ء سے لے کر پانچ سال کے دوران میں تاج محل کی مرمت کے لئے ساڑھے تین لاکھ روپے کے مصارف کی منظوری دی۔ مرمت کا کام ابھی جاری ہے اور اس کی تکمیل پر مزید دو سال لگیں گے۔ توقع کی جاتی ہے کہ مرمت کے بعد مستقبل میں بڑے گنبد میں پانی ٹپکنے کا اندیشہ قطعاً باقی نہیں رہے گا۔ سب سے بڑا مسئلہ عمارت کے اصل نمونے کو قائم رکھنے کا ہے۔ اس لئے محض ستونوں کی تبدیلی ہی کافی سمجھی گئی۔ اس طرح ۱۲ ستونوں میں سے ۹ ستون تبدیل کر دئے گئے ہیں اور چھتریوں کو تبدیل کرنے کے عوض اصل نمونے کو قائم رکھا گیا ہے۔ اس طریقے سے ابتدائی تخمینے کے مقابلے میں خرچ بھی بہت کم ہوا ہے۔ چھتریوں کی مرمت کے سلسلے میں مکرانا (جودھپور) سے خاص قسم کا سنگِ سرمر منگوایا گیا، کیونکہ ابتدا میں اُن کی تعمیر اس رنگ کے سنگِ مرمر سے کی گئی تھی۔ چبوترے کے سامنے کی طرف پرانی سلوں کی جگہ نئی سلیں لگوانے کے لئے اور سے سیاہ سنگِ مرمر منگوایا گیا۔ مقبرے پر پرمرمت کاری کے لئے قیمتی پتھر بڑی کوششوں کے بعد حاصل کئے گئے ہیں۔ اس کام کے لئے انہی کاریگروں کی خدمات حاصل کی گئی ہیں جن کے آباؤ اجداد نے شاہجہان کے زمانے میں تاج محل میں پرمرمت کاری کی تھی۔

۱۹۴۰-۴۱ء سے لے کر اب تک تاج محل کی مرمت کے لئے چار لاکھ روپے صرف کئے جا چکے ہیں لیکن مقبرے پر صرف شدہ ابتدائی رقم کے مقابلے میں مرمت کے ان مصارف کی کوئی خاص وقعت نہیں۔

پنج سالہ پلان

(آخری قسط)

مکانات کی تعمیر اور فراہمی

کمیشن نے مکانات کے مسئلہ پر بعض خصوصی سفارشات پیش کی ہیں۔ اس مسئلہ کے تحت یہ امور آتے ہیں ـــــ مکانات کی تعمیر و فراہمی مکانات کے معیار۔ لاگت کے تخمینے۔ غیر صحت مند مکانوں اور جھونپڑیوں کی صفائی۔ قصبوں اور دیہات کی منصوبہ بندی۔ دیہی مکانات اور مکانات سے متعلق تحقیقات اور ایسے قوانین کا وضع کرنا جن کے ذریعے کمیشن کی سفارشات پر عمل درآمد ہو سکے۔

کمیشن نے پنج سالہ پلان میں مکانات کی تعمیر کے لئے اڑتالیس کروڑ انہتر لاکھ روپے مخصوص کئے ہیں۔ اس رقم میں سے مرکزی حکومت کے ذمے اڑتیس کروڑ پچاس لاکھ روپے کا صرفہ رہے گا اور ریاستی حکومتیں دس کروڑ انیس لاکھ روپے خرچ کریں گی۔

پلان کے تحت صنعتی مرکزوں میں سب سے پہلے مکانات تعمیر کئے جائیں گے کیونکہ ایسے مراکز میں آبادی بہت گنجان اور قلت مکانات بہت زیادہ ہے۔ مرکزی حکومت اس میں امداد دے گی مرکزی اور ریاستی حکومتیں اپنی توجہ دیہاتی علاقوں پر مرکوز کر دیں گی۔

ریاستی حکومتوں کو مالی امداد اور قرض کے علاوہ مرکزی حکومت کو مزدوروں کے آجرین اور صنعتی مزدوروں کو مکانات کی کوآپریٹو سوسائٹی کے لئے بھی جگہ کا انتظام کرنا پڑے گا۔ ان معاملات میں مالی امداد کی مقدار تعمیری لاگت اور زمین کی قیمت کا ۲۵ فی صدی حصہ ہوگی۔ قرض کی مقدار تعمیر کی اصل لاگت کا ساڑھے سینتیس فی صدی حصہ ہوگی اور اس پر مناسب شرح سے سود بھی لیا جا سکے گا۔ ان قرضوں کے ادا کرنے کی مدت پندرہ سال ہوگی تمام صورتوں میں قرضے اور مالی امدادیں یک مشت اور کئی منزلہ سرکاری عمارتوں کی تعمیری لاگت کے تخمینہ کے مطابق دیئے جائیں گے اور ان کی لاگت علی الترتیب دو ہزار سات سو روپے اور ساڑھے چار ہزار روپے بیٹھتی ہے۔

کمیشن نے تجویز کیا ہے کہ ایک نیشنل بلڈنگ آرگنائزیشن قائم کی جائے تاکہ فن تعمیرات کی تحقیقات کے نتائج کو عمارتیں تعمیر کرنے والے اداروں کے ذریعے عمل میں لایا جا سکے۔ مکانات کی تعمیر کے پروگرام پر عمل درآمد ہونے کی غرض سے کمیشن نے یہ بھی تجویز کیا ہے کہ ایک سنٹرل ہاؤسنگ بورڈ اور اس کے ساتھ ہی علاقائی بورڈ قائم کئے جائیں۔ یہ بورڈ قانونی اور خود مختار ادارے ہونے چاہئیں اور اس مالی امداد کے علاوہ جو وہ مرکزی اور ریاستی حکومتوں سے وقتاً فوقتاً حاصل کریں گے اُن کے اپنے ذرائع آمدنی بھی ہونے چاہئیں۔

قانون بنانے کے سلسلے میں کمیشن نے تجویز کیا ہے کہ قانون سازی شہری اور دیہاتی قومی منصوبہ بندی کے لئے ہونی چاہئے۔ یہ بھی تجویز کیا گیا ہے کہ نئے مکانات کی تعمیر کی ضرورت کو پورا کرنے کے پیش نظر غیر صحت مند علاقوں اور خالی زمینوں کے حصول کی اجازت کے سلسلے میں لینڈ ایکویزیشن ایکٹ ۱۸۹۴ء میں مناسب ترمیم بھی کرنی چاہئے۔

معدنی وسائل

پنج سالہ پلان میں تجویز کیا گیا ہے کہ ملک کے اہم معدنی ذخیروں کی مقداروں اور اقسام کا تعین کرنے کے لئے جیولاجیکل سروے آف انڈیا۔ بیورو آف مائینز اور نیشنل لابوریٹریز کے ذریعے باقاعدہ تحقیقات کی جائے معدنیات نکالنے کا جو کام بھارت میں کچھ عرصہ پہلے تک انجام

پایا ہے وہ محض برآمد کے اغراض و مقاصد کے پیش نظر کیا گیا ہے اور ان معدنی اشیا کو قومی دولت نہیں سمجھا گیا۔ لیکن اب معدنیات نکالنے اور اُن کو استعمال میں لانے کا کام ایسے ٹھوس اقتصادی اصولوں پر انجام دیا جانا چاہیے جو ملک کے لئے زیادہ مفید ثابت ہوں۔ زمانہ جنگ ہو یا امن معدنیات جدید صنعتوں کے لئے ایک بنیاد قرار پا چکے ہیں اس لئے یہ بھی ضروری ہے کہ معدنیات کے نکالنے اور ان کے استعمال کے لئے ایک ایسی قومی پالیسی وضع ہونی چاہیئے جس کی بنیاد معدنیات کا تحفظ اور کفایت شعاری ہو ایسی پالیسی کے ایسے لوازم کے لئے کمیشن نے حسب ذیل سفارشیں کی ہیں

(۱) وسائل کا تعین مختلف قسم کے معدنی ذخیروں کی مقدار اور قدر قیمت پر کھانے کے لئے باقاعدہ تلاش و تحقیق۔

(۲) کانوں کی کھدائی میں درست طریقہ ——— اس کے تحت یہ امور آتے ہیں۔ کانوں کی کھدائی کی نگرانی کے لئے مستند ٹیکنیکل عملے سے کام لیا جائے۔ صرف اعلےٰ قسم کے معدنیات کی منتخب کانوں کی کھدائی تک ہی کام کو محدود نہ رکھا جائے۔ ناکارہ ڈھیروں میں سے قیمتی معدنیات کو نکالا جائے۔ معدنیات کی مختلف اقسام کے لئے اقتصادی یونٹوں کو وضع کیا جائے اور مرکزی حکومت کے اتفاق رائے سے خام لوہے، خام مینگنیز، کرومائٹ اور بکسائٹ جیسے اہم معدنیات کو ٹھیکے پر اٹھایا جائے۔

(۳) جنگ میں کام آنے والی کند ھک میگنسٹن۔ خام رانگ وغیرہ دھاتوں کے ذخیروں کے متعلق تحقیقات کا کام تاکہ ان کو ہنگامی صورت حال پیدا ہونے کے وقت ترقی دی جاسکے۔

(۴) کم درجے کی خام دھاتوں کے محفوظ ذخیروں کی مقدار کا تعین اور معدنیات کی تیاری وغیرہ کے مسائل کے بارے میں تحقیقات۔

(۵) برآمد کے مقصد کے لئے معدنیات کو تیار اور نیم تیار مصنوعات میں تبدیل کرنا ——— اور

(۶) انڈین بیورو آف مائینز کو ایسے اعداد و شمار جمع کرنے کے اختیارات دے دینا جو معدنیاتی صنعت کی اقتصادیات سے متعلق ہیں۔

مذکورہ اصول کے مطابق کمیشن نے ایک پروگرام وضع کر کے اسے تقدیم کے اعتبار سے مرتب کیا ہے۔ کمیشن نے بعض اہم دھاتوں جن میں پیتل کا کوئلہ، خام لوہا۔ خام مینگنیز، ابرق، کھریا مٹی، گندھک۔ غیر آہن آمیز دھاتیں کرومائیٹ اور بکسائیٹ وغیرہ کی ترقی کے لئے خاص طور پر سفارشات پیش کی ہیں۔

ٹیکنیکل ارتباط کی کمیٹی

کمیشن کے خیال میں محفوظ ذخیروں کا تخمینہ لگانے اور اقسام معلوم کرنے، معدنیات کو استعمال میں لانے اور فائدہ اٹھانے کے لئے تحقیقات کا کام اور کانوں کی کھدائی میں اصلاح کا کام سرانجام دینے کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ ایسے سرکاری اداروں میں ارتباط قائم ہونا چاہیئے جو خاص طور پر اس پروگرام پر عمل درآمد کرنے کے کام سے متعلق ہیں۔ ان اداروں میں جیولاجیکل سروے آف انڈیا انڈین بیورو آف مائینز اور نیشنل لیبوریٹریز (بشمول فیوئل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ دھاتوں کے متعلق فوجی تجربہ گاہ اور سنٹر گلاس اینڈ سیرامک انسٹی ٹیوٹ) شامل ہیں۔ اس ضرورت کے پیش نظر کمیشن نے ایک ٹیکنیکل کو آرڈینیشن کمیٹی کے قیام کی تجویز پیش کی ہے۔

سرکاری نظم و نسق میں اصلاحات

سرکاری نظم و نسق میں دیانتداری، بہتر کارکردگی، اہلیت بحث اور لوگوں کے تعاون کا خیال رکھنے پر کمیشن نے خاص زور دیا ہے سرکاری نظم و نسق اور پبلک زندگی میں ہر قسم کی بددیانتی کے خلاف نگاہ رکھنے کی ضرورت ہے۔ ان اشخاص کے خلاف بددیانتی کے الزامات کی تحقیقات کے لئے کسی ادارے کا قیام ضروری ہے جو کسی عہدے پر فائز ہوں۔ بلان میں اس مقصد کے لئے پیش کردہ تجاویز میں درج ہے کہ رشوت ستانی کے خلاف قانون کا اطلاق ان کمیشنوں پر بھی ہونا چاہیئے جن میں کسی سرکاری ملازم کے نزدیکی رشتہ دار اچانک دولتمند بن گئے ہوں۔ اس تجویز پر بھی غور کیا جائے کہ سرکاری ملازم ہر سال اس غیر منقولہ و منقولہ دونوں قسم کی جائدادوں کی فہرست پیش کریں جو انہوں نے یا ان کے نزدیکی رشتہ داروں نے حاصل کی ہو۔ اس لحاظ سے بدنام افسروں کو ذمہ دار عہدوں پر فائز کیا جائے مرکزی حکومت کی اسپیشل پولیس اسٹیبلشمنٹ کو نہ صرف مرکزی ملازموں کے خلاف بلکہ ان اہم ریاستی مقدموں کی تحقیقات

کا اختیار بھی حاصل ہونا چاہیئے جہاں قومی و ریاستی ادارہ کو اس کی مدد کی ضرورت پیش آئے۔ سیاسی یا انتظامیہ نوعیت کے اہم عہدوں پر فائز اشخاص کو ہمیشہ لوگوں کا اعتماد حاصل کرنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ نظم و نسق میں بہتر کارکردگی پیدا کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ درخواستوں وغیرہ پر غور کرنے میں دیر کی وجوہ کی چھان بین کی جائے اور ان کا حل تلاش کیا جائے جن عہدوں پر رشوت ستانی کا زیادہ امکان ہو وہاں افسروں کے انتخاب میں خاص احتیاط سے کام لیا جائے۔ بد دیانتی کی سزا کے ساتھ ساتھ دیانت دار اور اچھا کام کرنے والے ملازموں کو موزوں صلہ دینے کے اقدامات بھی کئے جائیں۔ اس مقصد کے لئے رائے عامہ کو بیدار کرنا اور اس کا تعاون حاصل کرنا بھی ضروری ہے۔

نظم و نسق کی کارکردگی کو بہتر بنانے کے لئے منظم و طریقہ کار میں متعدد تبدیلیاں پیدا کرنا ضروری ہوگا۔ سرکاری سرگرمیوں کے دائرے میں توسیع کے پیش نظر یہ ضروری ہے کہ جہاں تک معاشی پالیسی و نظم و نسق سے متعلقہ امور کا تعلق ہے خاص طور پر تربیت یافتہ و تجربہ کار افراد کو ہی یہ ذمے داری سونپی جائے انتظامیہ سروسز کے لئے منتخب جونیئر افسروں کو جامع تربیت دی جائے علاوہ ازیں پلان میں سرکاری اخراجات پر کنٹرول و بچت کی اہمیت پر بھی زور دیا گیا ہے۔

ریاستوں میں ترقی کے پروگرام کے لئے عملہ

پلان کی تکمیل کے لئے ریاستوں میں ترقی کی بہترین منظم سروسز کی موجودگی ضروری ہے۔ مرکزی حکومت کو ریاستی حکومتوں کے مشورہ سے زراعت، انجینئرنگ، جنگلات اور صحت عامہ سے متعلقہ امور کے بارے میں ترقی کے مرکزی ادارے قائم کرنے کے سوال پر غور کرنا چاہیئے ان مشترکہ انتظامات سے ریاستوں میں ترقی کی اسکیموں کے لئے تربیت یافتہ عملہ حاصل کرنے میں مدد ملے گی۔

پنج سالہ پلان کے مطابق سرکاری سرمایہ کے میدان میں بھی توسیع ہوگی اس قسم کے سرکاری اداروں کو کامیابی و خوش اسلوبی سے چلانا ضروری ہے۔ ایسے ہر سرکاری صنعتی ادارے کے لئے ڈائرکٹروں کے علیحدہ بورڈ کی تقرری کے علاوہ ایک مرکزی بورڈ کا قیام بھی ضروری ہے جو انتظامات، قیمتوں و سرمایہ کاری سے متعلقہ اہم معاملات پر حکومت کو مشورہ دے سکے لہٰذا اس سے متعلقہ پالیسی و انتظامات کے مشترکہ امور پر غور کرنے کے لئے جلد ہی ایک مرکزی بورڈ قائم کیا جانا چاہیئے۔

اضلاع کی ترقی کا پروگرام

مختلف اضلاع کی ترقی کے پروگراموں کے بارے میں بھی کمیشن نے چند اہم سفارشات پیش کی ہیں جن میں گاؤں کی پنچایتوں، لوکل باڈیوں اور سماجی خدمت کی تنظیموں کا ذکر بھی کیا گیا ہے۔ ایک اہم تجویز یہ ہے کہ دیہات میں ایسے نمائندہ ادارے قائم کئے جائیں جو گاؤں کی ترقی کے پروگرام کے لئے رہنما ہیا کر سکیں۔ لوکل باڈیوں کو ریاستی سرکار کے اداروں سے مل کر کام کرنا چاہیئے۔

قومی ترقی کے لئے عوام کا تعاون

منصوبہ بندی کی کامیابی کے لئے عوام کا تعاون حاصل کرنا سب سے زیادہ ضروری ہے۔ جمہوری منصوبہ بندی میں عوام کو اس امر کا یقین دلانا ضروری ہے کہ قومی پلان کا مدعا ایک ایسے سماجی نظام کا قیام ہے جس میں تمام لوگوں کو ترقی کے مساوی مواقع میسر ہونگے اور سماج کے مختلف طبقوں کی آمدنیوں میں موجودہ فرق بڑی حد تک کم ہو جائے گا۔ اس مقصد کے لئے اخبارات اور ریڈیو۔ فلم۔ گیتوں اور ڈرامے کے ذریعے اہل قلم و فنکاروں کا تعاون اور پلان کے بارے میں فروغ واقفیت لوگوں تک بالکل سادہ زبان میں پہنچانا ضروری ہے مقامی پروگراموں کی تکمیل کے لئے مقامی لوگوں کے جوش عمل اور مقامی رہنماؤں کے کردار کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ اس طریقے سے یہ پلان ملک کے ہر حصے میں تعمیری سرگرمیوں کا مرکز بن سکتا ہے اور عوامی کوششوں سے اسے مزید تقویت پہنچ سکتی ہے۔ سماجی کام کی رضاکارانہ تنظیمیں اس سلسلے میں بڑی مدد دے سکتی ہیں۔ عورتوں نوجوانوں اور اسکولوں کے استادوں کے لئے تعمیری کاموں کا میدان تیار کیا جا سکتا ہے۔ پلان میں مرکزی حکومت کی طرف سے ان رضاکارانہ تنظیموں کی مدد سے چار کروڑ روپے کی رقم اور نوجوانوں کے کیمپوں کے سلسلے میں ایک کروڑ روپے کی رقم مخصوص کی گئی ہے۔

عوامی تعاون کے لئے قومی کمیٹی

حال ہی میں عوامی تعاون کے حصول کے لئے دو اہم ادارے قومی مشاورتی کمیٹی اور بھارت سیوک سماج کا قیام عمل میں لایا گیا ہے۔

قومی مشاورتی کمیٹی قومی ترقی کے سلسلے میں عوامی تعاون حاصل کرنے کے پروگرام کا جائزہ لے گی اور وقتاً فوقتاً پلاننگ کمیشن کو اس بارے میں مشورہ دینے کے فرائض بھی انجام دے گی۔ علاوہ ازیں مذکورہ کمیٹی بھارت سیوک سماج کے مرکزی بورڈ کی رپورٹوں پر غور کرنے کے بعد مطلوبہ مشورہ دے گی اور عوامی تعاون کے موضوع پر بھارت سیوک سماج نے مرکزی بورڈ کے سامنے اپنی سفارشات پیش کرے گی۔

بھارت سیوک سماج

بھارت سیوک سماج تعمیری کاموں کے لئے غیر سرکاری و غیر سیاسی تنظیم ہے۔ کی سماجی فلاح و سماج کے پسماندہ طبقوں کے مصائب کم کرنے کی کوششیں ملک کی معاشی مضبوطی کے لئے کام کرنا اور بھارت کے شہریوں کے لئے رضاکارانہ خدمت کے مواقع تلاش کرنا اس کے بنیادی مقاصد میں شامل ہیں۔ بھارت سیوک سماج ان تمام افراد کو ایک مشترکہ پلیٹ فارم مہیا کرتا ہے جو قومی پلان کے سلسلے میں عوامی کوششوں کو تقویت پہنچانے کے لئے اپنا کچھ وقت صرف کرنے کی خواہش رکھتے ہوں۔

معلومات و اعداد

۱۔ ۱۹۵۳-۵۴ء کے مرکزی بجٹ میں "زیادہ اناج اگاؤ" اسکیموں پر صرف کرنے کے لئے ۳۶ کروڑ ۶۶ لاکھ روپے مخصوص کئے گئے تھے جن میں سے اب تک ۶ کروڑ ۹۸ لاکھ روپے کے مصارف کی منظوری دی جا چکی ہے۔

۲۔ ۱۹۵۲ء میں بھارت میں پہلی دفعہ ۴۱۳ سفری ایرکنڈیشنر طیارے کئے گئے۔

۳۔ ۱۹۵۲-۵۳ء کے دوران دہلی اور نئی دہلی میں تمام سرکاری عمارتوں سے تقریباً ۸۵ لاکھ روپے کی رقم بطور کرایہ وصول ہوئی۔

۴۔ گزشتہ سال بھارت میں تار گھروں کی تعداد ۳۷۱۳ تھی۔

۵۔ زہریلے اور دوا سازی میں کام آنے والے پودوں اور بوٹیوں کی دو ہزار سے کچھ زیادہ اقسام بھارت میں پیدا ہوتی ہیں۔

۶۔ ۱۹۵۲-۵۳ء کی آخری ششماہی میں ممنوعہ اشیاء کی تجارت کرنے والے تاجروں پر ضبط شدہ مال کو چھڑانے کی فیس اور سزاؤں کی صورت میں کل ۸ لاکھ ۴۱ ہزار روپے کے جرمانے کئے گئے۔

۷۔ بھارت میں تاروں کی آمدورفت کے لئے جو کیبل اور تار لگائے گئے ہیں ان کی مجموعی لمبائی ۳۱۹۴۲ میل ہے جو دنیا میں تیسرے درجے پر ہے۔ اندرون ملک کے تاروں کی آمدورفت کی سالانہ اوسط ۲ کروڑ ۴۵ لاکھ ہے اور یہ تعداد دنیا میں چھٹے درجے پر ہے۔

۸۔ بھارت میں ۱۹۵۲-۵۳ء میں ۲ کروڑ ۴۳ لاکھ ٹن چاول پیدا ہوا۔ اس سے پہلے کسی ایک سال میں اتنا چاول پیدا نہیں ہوا

۹۔ بھارت میں ۱۹۵۲ء میں گراموفون کی ۲۳ کروڑ ۹۵ لاکھ سوئیاں طیار کی گئیں۔ جبکہ پچھلے سال یہ صرف ۶ کروڑ ۷۳ لاکھ ۵۰ ہزار طیار ہوئی تھیں۔

۱۰۔ ۱۹۵۲-۵۳ء کی دوسری ششماہی میں متعلقہ حکام نے ۴۱ لاکھ ۹۰ ہزار روپے کی مالیت کا ناجائز تجارت کا سامان پکڑا۔

۱۱۔ ۱۹۵۱-۵۲ء میں غیر ملکوں سے بھارت میں کل ۳ کروڑ ۶۰ لاکھ گیمین پڑول منگوایا گیا۔

۱۲۔ بھارت میں ہر سال مختلف تیلوں کے ۴۸ لاکھ ٹن بیج پیدا کئے جاتے ہیں جن کی مجموعی مالیت ۱۶ ارب روپے تک پہنچتی ہے۔

رفتارِ زمانہ

بھارت کی خارجہ پالیسی

امین الدولہ پارک لکھنؤ میں ایک بھاری جلسے کو خطاب کرتے ہوئے پردھان منتری شری جواہر لال نہرو نے کہا کہ اس امر میں اب کوئی شک وشبہ کی گنجائش نہیں رہی کہ بھارت کی غیر جانبدار رہنے کی خارجہ پالیسی کامیاب رہی ہے اور بھارت نے جو درمیانی راستہ اختیار کر رکھا ہے اُس کی دوست دشمن سب نے تعریف کی ہے۔ دُنیا کے بڑے بڑے ملکوں نے ہم پر جو اعتماد کا اظہار کیا ہے وُہ کوئی معمولی بات نہیں ہے اور اگر ہم اس پر فخر کریں تو یہ کوئی ناجائز بات نہیں ہوگی۔ نہرو جی نے کہا کہ بھارت شروع ہی سے قیامِ امن کے لئے کوشش کرتا رہا ہے۔ اگر کسی وقت دُنیا میں جنگ کی صورت پیدا ہوئی تو ہم اُس میں کسی حالت میں شریک نہیں ہوں گے۔

ایک پریس کانفرنس میں شری نہرو جی نے اُردو کے متعلق ایک سوال کے جواب میں کہا کہ نہ صرف اُردو کا دروازہ کھلا رکھنا چاہیئے بلکہ اس کی ترقی میں ہمیں ہر طرح کی مدد دینا چاہیئے۔ پنج سالہ پلان کا ذکر کرتے ہوئے پردھان منتری نے کہا کہ یہ پروگرام ہمارے دیش کی آئندہ ترقی کی بنیاد ہے۔ اس کی تفصیلات سے اختلاف کیا جا سکتا ہے اور اُن میں ترمیمیں بھی ہو سکتی ہیں۔ لیکن تمام پارٹیوں کا فرض ہے کہ اپنا نظریہ مخلقہ نظر رکھتے ہوئے ملکی ترقی کی اس سکیم میں معاون ثابت ہوں۔ طالب علموں سے اپیل کرتے ہوئے نہرو جی نے کہا کہ طلبا اپنے دل اور دماغ کو اس طرح تربیت دیں کہ وہ اپنے ملک کے موجودہ مسائل کو بہادری اور جرأت کے ساتھ حل کر سکیں۔ تاکہ ہمارا ملک جو اس وقت تک معاشی طور پر ایک پسماندہ ملک ہے مادّی طور پر ترقی کی راہ پر گامزن ہو سکے۔

زیادہ اناج اُگاؤ مہم

زیادہ اناج پیدا کرنے کی مہم کے باب میں بھارت سرکار نے جو تحقیقاتی کمیٹی ۱۹۵۲ء میں مقرر کی تھی اُس کی پیش کردہ سفارشات کی بنا پر ماہرین کی ایک اسٹینڈنگ کمیٹی مقرر کرنے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ یہ کمیٹی ہر سال اس امر کا جائزہ لیگی۔ کہ مختلف ریاستوں میں بڑی بڑی فصلوں کے بہتر قسم کے بیج پیدا کرنے اور انھیں تقسیم کرنے کے کیا اقدام کئے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ ملک میں اناج کی پیداوار بڑھانے کے لئے کھاد کے استعمال کو زیادہ سے زیادہ فروغ دینے کی کوششیں ہو رہی ہیں۔

کشمیر میں عام رائے طلبی

وزیرِ اعظم پنڈت جواہر لال نہرو اور وزیرِ اعظم پاکستان مسٹر محمد علی کی جانب سے گفتگو کے بعد ۳۰۔ اگست ۱۹۵۳ء کو جو مشترکہ اعلانیہ شائع کیا گیا ہے، اُس میں کہا گیا ہے کہ دونوں وزرائے اعظم کشمیر میں رائے طلبی کے سلسلہ میں ایک عارضی پروگرام پر متفق ہو گئے اور اُنھوں نے اپریل ۱۹۵۴ء تک رائے طلبی کا منتظم مقرر کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔

اعلانیہ میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ مجوزہ رائے طلبی کے سلسلے میں ابتدائی معاملات براہِ راست دونوں وزرائے اعظم طے کریں گے، اور ان پر عمل درآمد کے لئے اقدام رائے طلبی کے منتظم کے تقرر سے پہلے کیا جائے گا اس سلسلے میں فوجی اور دوسرے ماہرین کی کمیٹیاں بھی مقرر کی جائیں گی۔ تاکہ وہ دونوں وزرائے اعظم کو فوری مشورہ دے سکیں۔

وزیرِ زراعت کی اپیل

بھارت سرکار کے وزیرِ زراعت ڈاکٹر پنجاب راؤ دیشمکھ نے سٹیٹ گورنروں راج پرمکھوں، وزیروں، یونیورسٹیوں کے وائس چانسلروں اور مختلف مشنوں کے افسران اعلیٰ سے اپیل کی ہے کہ وہ بن ہوتسو کو جوش وخروش سے منائیں اور زیادہ سے زیادہ درخت اُگائیں۔

پنڈت نہرو پر اعتماد

پاکستان کے وزیر اعظم مسٹر محمد علی نے لکھنؤ میں ایک پریس انٹرویو کے دوران میں اس یقین کا اظہار کیا کہ کشمیر کے مسئلے پر بھارت اور پاکستان میں سمجھوتہ طے پا جائے گا۔ آپ نے کہا کہ انھیں سنڑی نہرو کے خلوص پر پورا اعتماد ہے۔ آپ نے بھارت پاکستان اسٹینڈنگ کمیٹی کی کامیابی کو بہت ہی ہمت افزا اور صحت مند شگون قرار دیا۔ ایک سوال کے جواب میں پاکستان کے وزیر اعظم نے کہا کہ وہ کراچی پہنچ کر پاکستان کی کیبنٹ میں اقلیتوں کے ایک وزیر کے تقرر کے معاملے پر غور کریں گے۔

پٹڑے اور سوت کی تقسیم پر کنٹرول ختم

بھارت سرکار نے پٹڑے اور سوت کی تقسیم کے سلسلے میں تمام کنٹرول اٹھا لئے ہیں۔ یہ فیصلہ اس وجہ سے کیا گیا ہے کہ کچھ مدت سے پٹڑے کی پیداوار میں نمایاں اضافہ ہو گیا ہے اور ہر ماہ چالیس کروڑ گز پٹڑا تیار ہو رہا ہے۔ یہ مقدار اس مقدار سے بھی زیادہ ہے جو پلاننگ کمیشن نے ۵۶-۱۹۵۵ء کے لئے معین کی تھی۔ سوت کی پیداوار میں بھی کافی اضافہ ہوا ہے۔ ان حالات میں کنٹرول غیر ضروری سمجھا گیا ہے۔

ڈاکٹر شیاما پرشاد مکرجی کی وفات پر اظہار افسوس

ڈاکٹر شیاما پرشاد کی موت پر ملک کے طول و عرض میں گہرے رنج کا اظہار کیا گیا۔ ڈاکٹر صاحب ملک کی ایک بڑی شخصیت اور پارلیمنٹ میں نیشنل ڈیموکریٹک پارٹی کے لیڈر تھے۔ ان کا پارلیمنٹری تجربہ بہت وسیع تھا۔ وہ ایک بلند پایہ مقرر تھے۔ اور حکومت بنگال و مرکزی گورنمنٹ کے وزیر بھی رہ چکے تھے۔ ان کی موت سے بھارت ایک بڑے پارلیمنٹرین اور مدبر سے محروم ہو گیا ہے۔

موسیو پیریا کی برطرفی

روسی خبر رساں ایجنسی ٹاس کی اطلاع کے مطابق روس کے وزیر داخلہ موسیو پیریا کو ان کے عہدے سے برطرف کر کے ان کی جگہ موسیو کرگلوف کو وزیر داخلہ مقرر کیا گیا ہے۔ موسیو پیریا پر کمیونسٹ پارٹی اور عوام کا دشمن ہونے اور غیر ملکی طاقتوں کے آلۂ کار ہونے کا الزام عاید کیا گیا ہے۔ اب ان پر غداری کے الزام میں مقدمہ چلایا جائے گا۔ واضح رہے کہ موسیو پیریا اسٹالن کے عہد حکومت میں خفیہ پولیس کے حاکم اعلیٰ تھے۔ اب ان کی برطرفی کے بعد روس میں پکڑ دھکڑ کا سلسلہ تیزی سے شروع ہو گیا ہے اور روس کی کئی ریاستوں میں وزیروں کو برطرف کیا گیا ہے۔



جن بچوں کو
بڑا ہو کر دنیا میں اپنی آواز بلند کرنی ہے
اُن کی پرورش نونہال پر ہونی چاہیئے

نونہال

ننھے بچوں کو مضبوط بنانے والا
ان کا دل پسند ٹانک
ہمدرد دواخانہ وقف دہلی



زندگی بھر کے لئے

پنشن

کیا آپ ایسی ملازمت، تجارت یا کاروبار میں ہیں جہاں پنشن کا انتظام نہیں ہے؟ آپ بھی اِس آسان اور اپنی مدد آپ کرنے کی روپیہ لگانے والی اسکیم کے ذریعے زندگی بھر کے لئے پنشن حاصل کر سکتے ہیں

ابھی شروع کر دیجئے، آپ اگلے بارہ سال کے لئے ہر ماہ اگر ۱۵ روپے کے بارہ سالہ نیشنل سیونگز سرٹیفکیٹ خریدتے رہیں تو ۱۹۶۵ء کے بعد ہر ماہ ایک سرٹیفکیٹ کی میعاد پوری ہوتی رہے گی۔ اس کے بعد ہر ماہ ایک سرٹیفکیٹ کو بھناتے رہئے اور ۷۵ روپے کا بیاج بطور پنشن حاصل کرتے رہئے اور ۱۵ روپے کے زرِ اصل سے پھر سرٹیفکیٹ خریدیئے۔ اِس طرح ۱۹۶۵ء کے بعد آپ کو ۷۵ روپے ماہوار کی متواتر آمدنی ہوتی رہے گی اور اس کے علاوہ آپ کے قبیلے کے لئے آپ کے پاس ۲۱۶۰۰ روپے کی رقم جمع ہو جائے گی۔ آج ہی شروع کر دیجئے اور بارہ سال تک ہر ماہ ایک سرٹیفکیٹ خریدتے رہیئے۔

نیشنل سیونگز سرٹیفکیٹس

دُور اندیش لوگوں کا مستقبل محفوظ ہے

یہ سرٹیفکیٹس بموجب نیشنل سیونگز سرٹیفکیٹ قواعد ۱۹۶۱ء (بعد اصلاحات) جاری ہیں
مزید تفصیلات کے لئے نیشنل سیونگز کمشنر، شملہ - ۳ - کو لکھیں



بچوں کا آج کل



اطہر پرویز

کیا خوب آدمی تھے شیخ چلی بھی

ایک بار شیخ چلی نے ایک درزی کی دکان میں نوکری کر لی۔ درزی بڑا چالاک تھا۔ خود دوسروں کے کپڑے چراتا تھا اس لئے دوسروں پر بھی شک کرتا تھا اور ہر ایک کو چور سمجھتا تھا ایک دن وہ بوتل میں شہد لے کر آیا اور شیخ چلی سے بولا۔ شیخ جی! اس بوتل کو ہاتھ مت لگانا۔ اس میں زہر بھرا ہوا ہے۔ کبھی تم اسے شہد کے دھوکے میں پی لو۔ یہ خالص زہر کی بوتل ہے"۔

شیخ جی بے وقوف تو تھے ہی فوراً تاڑ گئے کہ اس میں کیا ہے۔ مگر اس وقت وہ چپ ہو رہے۔ جب درزی کسی کام سے باہر گیا تو شیخ چلی نے دکان سے ایک کپڑا اٹھایا اور لے جا کر ایک نانبائی کو دے دیا اور اس کے بدلے میں اس سے روٹی لے لی۔ اب انہوں نے یہ روٹی خوب مزے سے شہد میں لگا لگا کر کھائی۔

تھوڑی دیر کے بعد درزی آیا تو اس نے دیکھا کہ بوتل خالی ہے۔ اب تو وہ بہت ناراض ہوا اور بولا۔ کم بخت یہ بوتل کس نے خالی کی۔

شیخ چلی نے بڑی مسکین صورت بنا کر کہا "حضور! میں ذرا سی دیر کے لئے سو گیا تھا۔ آنکھ کھلی تو دیکھا کہ کوئی آدمی کپڑا لے کر چلا گیا۔ میں بہت پریشان ہوا۔ کیونکہ جانتا تھا کہ آپ ناراض ہوں گے۔ اس لئے میں نے بوتل کا سارا زہر پی لیا اور اب بیٹھا ہوا انتظار کر رہا تھا کہ کب مرتا ہوں۔

بے چارہ درزی چپ ہو گیا۔ مگر شیخ جی دل ہی دل میں مسکرائے۔

شیخ چلی کی بیوی بیمار ہوئی تو انہیں روپیہ کی سخت

ضرورت ہوئی۔ ادھر وہ کئی دن سے بیکار بیٹھے کہیں کوئی کام نہیں مل رہا تھا۔ چنانچہ شیخ جی دوڑے دوڑے بنیئے کے پاس گئے اور ایک مہینے کے وعدے پر اس سے روپیہ لے آئے۔ مگر کچھ دنوں کے بعد یہ حال ہوا کہ بنیا ان کے گھر کے چکر لگاتا ہے اور شیخ جی ہیں کہ ملتے نہیں۔ آخر ایک دن بنیئے نے دیکھا کہ شیخ چلّی ایک سڑک کے کنارے آٹھ دس آدمیوں کے گھیرے میں کھڑے ہیں اور ڈینگیں مار رہے ہیں۔



بنیئے کو غصّہ تو آ ہی رہا تھا اس نے شیخ جی کو دیکھتے ہی سخت سست کہنا شروع کر دیا۔ شیخ چلّی کو اتنے آدمیوں کے سامنے اپنی بے عزّتی بُری لگی۔ فوراً بگڑ کر بولے "لالہ جی! کتنے روپے ہیں"۔

بنیئے نے کہا "سود ملا کر ایک سو پانچ"

شیخ چلّی نے فوراً جواب دیا۔ اچھا تو پچاس کل لے لینا اور پچاس پرسوں دے دوں گا۔ اب بتاؤ کتنے بچے؟

بنیئے نے کہا "صرف پانچ روپے"۔

شیخ جی فوراً تیور بدل کر بولے "واہ لالہ جی ـــ صرف پانچ روپے کے لئے میری عزّت لینا چاہتے ہو۔ تم کو شرم نہیں آتی ـــ"

ایک دن شیخ چلّی کو بیٹھے بیٹھے نہ جانے کیا سوجھی کہ فوراً بولے "تم لوگ میری بات مانو، مجھے اللہ میاں نے ولی بنا کر بھیجا ہے"۔

لوگ ہنسنے لگے کہ شیخ چلّی ابھی تو اچھے خاصے تھے اب یہ کیا ہو گیا ہے جو ولی اللہ بن گئے۔ مگر لوگوں نے کہا۔ اگر تم سچ مچ کے ولی ہو تو پھر کوئی کرامات دکھاؤ۔

شیخ جی فوراً تیار ہو گئے اور بولے کیا مشکل ہے میں حکم دوں تو میرے کہنے سے وہ پیڑ ابھی میرے پاس آ جائے۔

یہ سُن کر سب لوگ حیرت میں پڑ گئے۔ انہوں نے کہا شیخ جی! تو ضرور بلاؤ۔ دیکھیں تمہارے کہنے سے پیڑ کس طرح آ جاتا ہے"۔

شیخ جی نے چھ سات بار آواز دی۔ مگر شیخ جی کے کہنے سے کیا ہوتا۔ درخت تو درخت پتہ بھی نہ ہلا۔ اب تو شیخ جی نہایت اطمینان سے پیڑ کے پاس پہنچ گئے۔ تو لوگوں نے کہا واہ شیخ جی! تم تو کہتے تھے کہ پیڑ تمہارے پاس آئے گا اور تم خود وہاں پہنچ گئے۔

شیخ چلّی نے بڑے مزے میں جواب دیا۔ ارے بھائی میں ولی ہوں اور تم جانتے ہو کہ ولیوں میں غرور نہیں ہوتا۔ میں نے پیڑ سے کئی بار کہا۔ مگر جب وہ نہ آیا تو میں خود اس کے پاس چلا گیا۔ اب تم ہی بتاؤ اس میں ہرج ہی کیا ہے۔

حامد اللہ افسر

اچھی امّی ذرا مُسکرا دیجئے

شاہزادہ مجھے پھر بنا دیجئے
پھر پرستان مجھ کو دکھا دیجئے
پھر پری کی کہانی سُنا دیجئے
اچھی امّی ذرا مُسکرا دیجئے

دیر تک میں جو مٹی سے کھیلا کیا
ہو گئیں آپ پھر آج مجھ سے خفا
آپ جو چاہے مجھ کو سزا دیجئے
اچھی امّی ذرا مُسکرا دیجئے

اب کتابیں نہ بھائی کی پھاڑوں گا میں
اب سیاہی نہ ان پر بکھیروں گا میں
آپ چپ کیوں ہیں یہ تو بتا دیجئے
اچھی امّی ذرا مُسکرا دیجئے

پھر خفا ہو جئے گھُرکیاں دیجئے
گود میں ہنس کے پھر مجھ کو لے لیجئے
پھر رُلا دیجئے، پھر ہنسا دیجئے
اچھی امّی ذرا مُسکرا دیجئے

مجھ سے بدتر کوئی بھی نہ ہوگا کہیں
مجھ سے اچھا بھی دنیا میں کوئی نہیں
پھر دعا دیجئے، بد دُعا دیجئے
اچھی امّی ذرا مُسکرا دیجئے

پھر جھگڑتی ہیں باجی انہیں روکئے
مجھ سے لڑتی ہیں باجی انہیں روکئے
ان سے میرا کھلونا دلا دیجئے
اچھی امّی ذرا مُسکرا دیجئے

کہئے پھر اپنی آنکھوں کا تارا مجھے
کہئے پھر اپنا ننھا سا راجا مجھے
میرا منّا سا دل پھر بڑھا دیجئے
اچھی امّی ذرا مُسکرا دیجئے

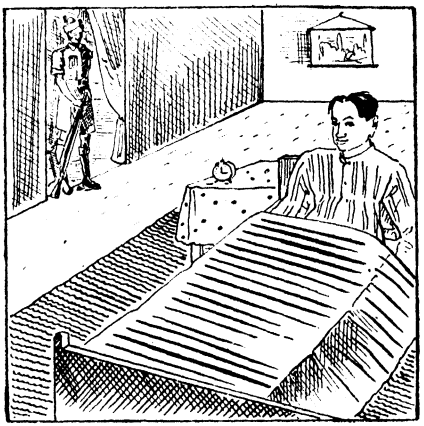
امن و راحت کا دُنیا میں چرچا کرے
دیش کی دیش والوں کی سیوا کرے
اپنے ننھے کو پھر یہ دُعا دیجئے
اچھی امّی ذرا مُسکرا دیجئے

ذکیہ نکہت

فرض

بچو! آؤ آج تمہیں ایک میٹھی اور سچی کہانی سناؤں - اور نزدیک آجاؤ - ہاں! شاہدہ تم ادھر بیٹھو - نسیم میرے قریب آ جاؤ اور تم زاہد ادھر شاہدہ کے بغل میں بیٹھ جاؤ لیکن دیکھو کوئی شور نہ مچائے ورنہ کہانی بند ہو جائے گی -

یہ اس زمانے کی بات ہے جب لڑائی زور و شور سے ہو رہی تھی - رنگون پر جاپانیوں کا قبضہ ہو گیا تھا اور کلکتے پر بم گرنے ہی والا تھا - غریب جمن روز روز کی بھوک اور نئی نئی مصیبتوں سے گھبرا کر فوج میں ملازم ہو گیا تھا - اپنی سچائی اور وفاداری کے لئے جمن اپنے ساتھیوں اور فوج کے اعلیٰ افسروں میں کافی ہر دلعزیز تھا -



کیپٹن ابراہم نے بھی اس کی خوبیاں سنی تھیں - اور اس کی سچائی اور بہادری سے مرعوب ہو کر اس کو رنگون کے محاذ سے واپس بلا لیا تھا -

فوجی قانون کے مطابق فوجی کیمپ کے چاروں طرف فوج کے سپاہی باری باری سے دن رات پہرا دیا کرتے تھے تاکہ ان کی بے خبری میں دشمن کا کوئی آدمی ان کے کیمپ میں گھسنے نہ پائے -

ایک رات جبکہ جمن کیمپ کی رکھوالی کر رہا تھا کیپٹن ابراہم نے اسے بلا کر پوچھا -

کیپٹن ابراہم "رات کی ڈیوٹی پر کون ہے؟"

جمن "میں ہی ہوں حضور!"

کیپٹن ابراہم "صبح کی ٹرین سے مجھے دلی جانا ہے - ۳ بجے مجھے جگا دینا -"

جمن "بہت اچھا" کہہ کر چلا گیا -

ٹھیک ۳ بجے جمن کیپٹن ابراہم کے کیمپ پر حاضر تھا لیکن اس کے قدموں کی چاپ زمین پر رُک رُک کر پڑ رہی تھی - ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ کسی گہرے فکر میں ڈوبا ہوا کچھ سوچ رہا ہے -

جمن کے بھاری بوٹ کی آواز سے کیپٹن ابراہم کی آنکھ کھل گئی اور وہ اٹھ بیٹھا - گھڑی دیکھی تو ٹھیک تین بجے تھے -

جمن "میں اٹھ گیا ہوں اب تم جا سکتے ہو"

جمن "لیکن .... مجھے آپ سے کچھ کہنا ہے"

کیپٹن "۔ کہو کیا کہنا چاہتے ہو۔ میں سُن رہا ہوں"

جمن "۔ آپ اس ٹرین سے سفر نہ کریں"۔

کیپٹن "۔ کیوں ؟"

جمن "۔ میں نے رات ایک خواب دیکھا ہے۔ ایک نہایت ہی بھیانک خواب"۔

کیپٹن "۔ خواب دیکھا ہے ؟ ـــــ خوب"

جمن "۔ کہ صبح کی جس ٹرین سے آپ سفر کر رہے ہیں وہ مخالف سمت سے آنے والی ٹرین سے ٹکرا گئی ہے اور بہت آدمی ہلاک ہو گئے ہیں۔ آپ اس گاڑی سے ہرگز سفر نہ کریں"۔

کیپٹن "۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ اور پھر خواب کا اعتبار ہی کیا۔ جمن ! مجھے دلی پہنچنا ضروری ہے"۔

جمن "لیکن میرے خواب کبھی غلط نہیں ہوئے۔ حضور!"

کیپٹن ابراہم سوچ میں پڑ گیا۔ اور اگر جمن کا خواب صحیح ہوا تو ؟ ـــــ اور اس نے اپنا سفر ملتوی کر دیا۔

دوسرے دن کے اخبار میں یہ خبر بہت افسوس کے ساتھ پڑھی گئی۔ گاڑیوں کا زبردست تصادم۔ بہت سے آدمی ہلاک و زخمی"۔

"پچاس آدمی ابھی تک لاپتہ ہیں"۔

جمن کا خواب صحیح ہو گیا تھا۔

اور کیپٹن ابراہم سے کہہ رہا تھا "جمن ! میں تمہارا بہت احسان مند ہوں۔ تم نے میری جان بچا کر مجھے نئی زندگی دی ہے۔ میں اسے کبھی نہیں بھول سکتا۔ لیکن میں مجبور ہوں میرا فرض مجھے مجبور کر رہا ہے کہ تمہیں ملازمت سے الگ کر دوں تم ملازمت کے قابل نہیں رہے"۔

کیپٹن ابراہم نے جمن کو بہت سا روپیہ انعام دے کر ملازمت سے نکال دیا۔

بچو ! کیا تم بتا سکتے ہو کہ جمن کا جرم کیا تھا اور اسے ملازمت سے کیوں نکال دیا گیا ؟ ـــــ"

تین سنگھ

بچو ! یہ تو تم جانتے ہو کہ دنیا میں سب سے اونچا پہاڑ ہمالیہ ہے۔ اس پہاڑ کی سب سے اونچی چوٹی کا نام ماؤنٹ ایورسٹ ہے۔ یہ سطح سمندر سے ۲۹۰۰۲ فٹ اونچی ہے۔ اس چوٹی پر چڑھنے کی کوشش دنیا کے مختلف ملکوں نے کی لیکن کامیابی حاصل نہ ہوئی۔ اس سال ایک برطانوی مہم کامیاب ہو گئی ان دو آدمیوں میں سے جو چوٹی پر چڑھنے میں کامیاب ہوئے ایک کا نام تین سنگھ ہے۔ یہ نیپال کے ایک چھوٹے سے گاؤں میں پیدا ہوا۔ لگ بھگ بیس سال سے دارجیلنگ میں رہتا ہے۔ بچپن ہی سے اسے پہاڑوں پر چڑھنے کا شوق ہے۔ اس سے پہلے بہت سی مہموں میں اس نے حصہ لیا تھا۔ پچھلے سال قریب قریب چوٹی تک پہنچ جانے کے بعد موسم کی خرابی کی وجہ سے اسے واپس آنا پڑا۔ اس نے اس سال چوٹی پر چڑھ کر بھارت کا ترنگا لہرایا۔ ہندوستان اور برطانیہ میں اس کی بہت عزت ہوئی ہے۔ اور بہت کچھ انعام و اکرام کی صورت میں ملا ہے۔ آج کل یہ اپنی بیوی اور دو لڑکیوں کے ساتھ یورپ کے مختلف ملکوں کی سیر کر رہا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ دارجیلنگ میں پہاڑ پر چڑھنے کی تعلیم دینے کے لئے ایک اسکول کھولا جائے گا اور تین سنگھ نوجوانوں کو اس فن کی تعلیم دے گا۔

جگت سنگھ

جیمز گارفیلڈ

آج سے قریباً سو برس پہلے کا ذکر ہے کہ امریکہ کے ایک چھوٹے سے گاؤں اریج نامی میں ایک غریب مزدور کے ہاں لڑکا پیدا ہوا۔ جسے بچپن میں محبت سے جیمی جیمی کہہ کر پکارا کرتے تھے۔ اس کا باپ کھیتوں میں محنت مزدوری کرکے تھوڑا بہت کما لاتا تھا۔ جس سے بمشکل گھر کا گزارہ چلتا تھا۔

متواتر سخت محنت کے باعث اس کا باپ بیمار پڑ گیا صحت بگڑ گئی۔ اور ابھی جیمی چھوٹا سا بچہ ہی تھا کہ اس کے باپ کا سایہ اُس کے سر سے اُٹھ گیا۔ جیمی کے تین بھائی اور بھی تھے۔ مگر وہ سب کے سب اس سے چھوٹے تھے باپ کے فوت ہو جانے کے بعد ان کی بوڑھی والدہ تھوڑا بہت کما لاتی اور بچوں کی پرورش کرتی۔

جب جیمی سات برس کا ہو گیا۔ تو اُسے بھی کھیتوں میں محنت مزدوری کرنے کے لئے جانا پڑا۔

ایک روز وہ تھکا ماندہ کھیت سے واپس گھر کو آ رہا تھا کہ اس نے ایک جگہ چند آدمیوں کو کھڑے دیکھا۔ جو امریکہ کے پردھان کے بارے میں باتیں کر رہے تھے۔ جیمی نے اُن کی باتیں سُن کر پاس کھڑے ایک آدمی سے دریافت کیا کہ پردھان کسے کہتے ہیں؟ یہ سُن کر اس آدمی نے ہنستے ہوئے کہا کہ تو کھیتوں کا مزدور ہے۔ تجھے بڑے آدمیوں کی نسبت کیا علم ہو سکتا ہے سارے ملک امریکہ کے اندر جو شخص سب سے اچھا، دانا، مدبر اور قابل آدمی ہوتا ہے۔ اُسے امریکہ کا پردھان بنایا جاتا ہے۔ اور وہ پانچ سال تک امریکہ پر حکومت کرتا رہتا ہے



جیمی جب گھر پہنچا تو اس نے اپنی ماں سے کہا اماں! میں امریکہ کا پردھان بننا چاہتا ہوں اُس کی ماں بچے کی اس بات کو سُن کر ہنس دی مگر معاً بچے کی حوصلہ افزائی کے لئے کہہ دیا کہ محنت کرو۔ پریذیڈنٹ بننا کون سا مشکل کام ہے۔ ابھی تیرے پڑھنے اور تعلیم حاصل کرنے کے دن ہیں۔

مگر ماں کے پاس جیمی کی تعلیم کے لئے پیسے ہی کہاں تھے لہٰذا کئی دن اس سوچ بچار میں گزر گئے اور ماں نے کئی بار اُسے سکول میں داخل کرا دینے کا ارادہ بھی کیا۔ آخر ایک

روز جیمی خود بخود سکول میں چلا گیا۔ اور اپنا نام پہلی جماعت کے لڑکوں میں لکھوا دیا۔

اب جیمی صبح و شام دو وقت تو کھیتوں میں جاتا۔ اور اپنے گزارے کے لئے محنت مزدوری کر کے کچھ کما لاتا۔ اور دن کا باقی حصہ وہ سکول جا کر پڑھتا رہتا۔ اور رات کو بھی جبکہ باقی دُنیا کے بندے میٹھی نیند سویا کرتے یہ بیٹھا پڑھا کرتا۔

ایریزونا کے جنگل میں ان کی گھاس پھوس کی ایک چھوٹی سی جھونپڑی تھی۔ جس میں جیمی رہا کرتا تھا۔ نہ اُسے کوئی پڑھانے والا تھا نہ پروش کرنے والا۔ مگر اس نے ہمت نہ ہاری۔ گھر کا زیادہ کام کاج اسی کے سپرد تھا۔ اور بعض اوقات باقی بھائی اُسے جھڑک بھی دیتے تھے۔ لیکن اس نے پڑھائی کا کام برابر جاری رکھا۔

کئی برس کی لگاتار محنت کے بعد جیمی نے سکول کی آخری جماعت پاس کر لی۔ اب اسے کالج میں داخل ہونے کا شوق چرایا۔ مگر کالج کے اخراجات کا کفیل کون بنے ایک تو کالج اس کے گھر سے بہت دُور تھا۔ دوسرے خرچ کی تنگی اس کا حوصلہ پست کئے دیتی تھی۔ آخر کار اس جواں مرد اور ارادے کے پکے لڑکے نے والدہ سے اجازت حاصل کر لی اور کالج میں جا ہی پہنچا۔ جب داخلہ کے لئے کالج کے دفتر میں گیا تو پرنسپل نے پوچھا۔ تیرا خرچ کون دے گا ماں تو میری بہت ضعیف ہے۔ اس لئے میں اپنا خرچ خود ہی مزدوری کر کے پورا کروں گا۔ اگر آپ ہی اس بارے میں میری کوئی امداد کر سکیں۔ تو بڑی عنایت ہوگی۔

پرنسپل حیران تھا۔ کہ اسے کیا جواب دوں۔ آخر سوچ کر اُس نے کہا۔ کہ بچہ یہاں تو صرف پڑھایا جاتا ہے۔ نوکری اور ملازمت تو تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد ہی ملا کرتی ہے۔ اس پر جیمی نے آہستہ سے کہا۔ میں کالج کے احاطے میں جھاڑو دے دیا کروں گا۔ اور گھنٹی بجا دیا کروں گا۔ آپ مجھے اس کے صلے میں جو بھی تنخواہ دیں گے۔ میں اُسی سے اپنا گزارہ کر لیا کروں گا۔

پرنسپل صاحب کو جیمی کی یہ درخواست سن کر بڑا ترس آیا۔ اور کہا۔ کہ یہ کام تیرے بس کے نہیں۔ تو ابھی بہت چھوٹا ہے۔ مگر اس نے عرض کی۔ کہ آپ تجربہ کر کے دیکھ تو لیں۔ اس پر پرنسپل مان گیا۔ اور اُسے جھاڑو دینے اور گھنٹی بجانے کا کام دے دیا۔ ساتھ ہی اسے کالج میں داخل بھی کر لیا۔

جیمی نے کام تو شروع کر دیا۔ مگر ساتھی اس سے مخول کرتے۔ کوئی بھنگی کہتا۔ اور کوئی نوکر۔ جیمی ان کی ان باتوں سے گھبراتا تو



ضرور تھا۔ مگر اُس نے نہ کام چھوڑا اور نہ آس امید ٹوٹنے دی۔ کچھ دنوں کے بعد اپنی قابلیت کی وجہ سے وہ سب کو اچھا لگنے لگا۔ پرنسپل صاحب کی مہربانی سے کالج کے اندر ہی اسے دو لڑکوں کو پڑھانے کی ٹیوشن بھی مل گئی۔ اس نگاتار محنت اور اچھے طریق کار سے ۲۵ برس کی عمر میں اس نے بی۔ اے پاس کر لیا۔

انہیں ایام میں جب امریکہ کو ایک جنگ میں شریک ہونا پڑا

تو جیمی بھی فوج میں بھرتی ہو گیا۔ طبیعت محنت اور مشقت کی عادی تھی۔ اس نے تین برس کے اندر ہی اپنی بہادری کے وہ جوہر دکھائے کہ افسر خوش ہو گئے۔ اور اسے میجر جنرل بنا دیا گیا۔ لڑائی ختم ہو گئی۔ اور ساتھ ہی جیمی نے نوکری بھی چھوڑ دی۔ گو اس کے دوستوں نے اسے ملازمت چھوڑنے سے روکا۔ مگر اس نے یہ کہہ کر استعفےٰ دے دیا۔ کہ میں اب اپنے ملک کی خدمت کا کام کروں گا۔

اب جیمی امریکہ کی کانگرس میں شامل ہو گیا۔ اور بڑی محنت سے کام کرنے لگا۔ اس کی ایمانداری اور محنت کو دیکھ کر بڑے بڑے لوگ اس کا احترام کرنے لگے۔ اس وجہ سے جیمی ان لوگوں میں نہایت ہر دلعزیز بن گیا۔

کانگرس میں شامل ہوئے اور محنت اور ایمانداری کے ساتھ خدمت خلق کرتے کرتے پندرہ سال بیت گئے۔ ۱۸۸۰ء



میں جب امریکہ کے نئے پردھان کا انتخاب ہونے والا تھا۔ تب لوگوں نے جیمی کو انتخاب لڑنے کے لئے کھڑا کر دیا۔ اس کی ہر دلعزیزی اور ایمانداری کا سکہ تو عوام کے دلوں پر بیٹھ چکا تھا۔ لہٰذا مقابلہ میں سب امیدواروں سے بڑھ کر جیمی کو ووٹ حاصل ہوئے۔ اور اس طرح سے ایرنج کے جنگلوں کا مزدور لڑکا ملک امریکہ کا پریذیڈنٹ بن گیا۔

اب ہمارا جیمی جیمس گارفیلڈ کے نام سے مخاطب کیا جانے لگا۔ اپنی ایمانداری اور اوصاف حمیدہ کی وجہ سے اس کو ہر جگہ عزت سے دیکھا جاتا تھا۔ اس اتنے بڑے عہدے پر پہنچ کر بھی اس نے کسی قسم کا تکبر اور غرور نہیں کیا۔

دلچسپ

استاد۔ دیکھو تم بہت غیر حاضر رہتے ہو۔ تمہیں اس سال امتحان میں بیٹھنے نہیں دیا جائے گا۔

طالب علم۔ کوئی بات نہیں جناب میں کھڑا ہو کر ہی امتحان دے لوں گا۔

جج۔ تم پر یہ الزام ہے کہ تم نے تین بار جعلی ووٹ ڈالا۔

ملزم۔ تو صاحب مجھ سے بہت بڑا دھوکا ہوا۔

جج۔ وہ کیا؟

ملزم۔ امیدوار نے صرف ایک ہی بار جعلی ووٹ ڈالنے کا معاوضہ دیا ہے۔

ایک دوست۔ آج ڈنر کے بعد اسلم نے ایک تقریر کی۔ سب کی زبان پر کلمۂ تحسین تھا۔

دوسرا دوست۔ کیا کہا تھا اُس نے۔

پہلا۔ بس یہی کہ ڈنر کا بل میں ادا کر دوں گا۔

۹۵۔ ۱ ۱۱۲

اُردو کا مقبول عوام مصور ماہنامہ

آج کل

دہلی

ایڈیٹر:- جوش ملیح آبادی

اسسٹنٹ ایڈیٹر:- یال مکند عرش ملسیانی

جگن ناتھ آزاد

جلد ۱۲ ——— نمبر ۳

سالانہ چندہ:- ——— ہندوستان میں چھ روپے / پاکستان میں چھ روپے

غیر ممالک سے:- ——— نو شلنگ یا ایک ڈالر

فی پرچہ:- ——— ہندوستان میں آٹھ آنے / پاکستان میں آٹھ آنے

اکتوبر ۱۹۵۳ء

پبلیکیشنز ڈویژن پوسٹ بکس ۲۰۱۰ دہلی

ترتیب

اُردو کا ترقی پسند خمیر	ڈاکٹر اعجاز حسین	۴
ہم	سکندر علی وجد	۱۰
اقبال اور اسرارِ خودی	سعادت علی خاں	۱۱
فریادِ شکستہ	کرپال سنگھ بیدلؔ	۱۴
ہوا لشافی	بلونت سنگھ	۱۵
میراجی کی شاعری کے دو پہلو	شکیل الرحمٰن	۲۱
مرکزی ٹریکٹر آرگنائزیشن کا عظیم کارنامہ	———	۲۷
اے دوست!	فضا ابنِ فیضی	۳۳
احساسِ کمتری کا ایک رُخ ـــ جھینپ	مسیح الزماں	۳۴
گلے کا ہار	موپاساں (ترجمہ)	۳۸
شملہ میں تحفظِ صحتِ عامہ کا نظام	اسرار احمد آزاد	۴۱
بادِ صبا سے	وارث کرمانی	۴۵
ذکر و فکر	یحییٰ اعظمی، عشرت قادری، اشرف قادری، قمر اُدھیانوی، ہما ہزاروی	۴۶
اچاریہ ونوبا بھاوے	حسن چشتی	۴۷
یورسٹ کی فتح	اختر جمال	۵۱
پس ماندہ لوگوں کے مسائل	———	۵۴
مسئلۂ کشمیر	———	۵۷
فتارِ زمانہ	———	۵۹
ٹی کا کھلونا ترے کس کام کا بچے	اشک امرتسری	۶۱
بونا	حامد اللہ افسر	۶۲
ب بڑھیا اور نپولین	منیر احسن ہاشمی	۶۵
لومات	———	۶۶
جہ بیبل کا جواب	احمد محی الدین	۶۷
نہ اور مسور کی دال	محمد اسلم	۶۸
قدیمی بچہ انڈیا ہی بھلا		

سرورق۔ جونسار کی ایک دیہاتی لڑکی

ڈاکٹر اعجاز حسین

اُردو کا ترقی پسند خمیر

جس طرح انسان کے مزاج کی تعمیر میں ماحول اور تاریخی حالات اثر انداز ہوتے ہیں اسی طرح زبان کی ساخت میں بھی سماجی پس منظر اور واقعات کار فرما ہوتے ہیں۔ زبان ابتدائی مراحل طے کرتے کرتے ایک تیور، ایک زاویۂ نگاہ پیدا کر لیتی ہے جو ایک دن اس کی اقدار طبیعت سے تعبیر کئے جاتے ہیں۔ یہی خصوصیت اس کی نشو و نما سے آخر وقت تک تشکیل کا خاکہ مرتب کرتی رہتی ہے اور زبان خواہ کتنی پختگی حاصل کر لے۔ کتنا ہی تراش خراش سے کام لے مگر یہ ابتدائی اثرات ہمیشہ اپنا کام کرتے رہتے ہیں۔ الفاظ کی فراہمی، خیالات کی پیداوار، تخیل کا دھارا سب کچھ انہیں کا سہارا لے کر آگے بڑھتے ہیں گویا یہ خصوصیات زبان کا خمیر بن جاتی ہیں جو ہر شکل میں ہر عالم میں زبان کی فطرت اور طریق کار کا پتہ دیتی ہیں۔ ممکن ہے کسی دور میں یہ ابتدائی نقوش مدھم ہو جائیں اور غلط قسم کے معماروں کے ہاتھ میں زبان کا دھارا مخالف سمتوں کی طرف بہتا نظر آئے مگر نقوش اور ان کے اثرات ختم نہیں ہوتے۔ وقت پر پھر نمایاں ہوتے ہیں۔ اگر زبان کے ابتدائی ماحول اور حالات ایسے نہ ہوئے جو اسے فراخ دل اور ملنسار بنا سکیں یا اگر ابتدا کے معماروں نے بنیاد کو اس کے مزاج کے موافق تعمیر نہ کیا تو عروج کے زمانہ میں خواہ کتنا ہی فنکاری سے کام لیا جائے۔ ایسی زبان اس زبان کا مقابلہ نہیں کر سکتی جو ابتدا ہی سے وسیع النظر اور ہمہ گیر رہی ہو۔ اسی اصول کے تحت آیئے اردو زبان کے خمیر کا جائزہ لیا جائے اور واقعات و ارتقاء کی روشنی میں جانچا جائے کہ اس کا خمیر کن خصوصیات سے مرکب ہے اور کس تماش کا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ، بعد کی ابتدا کب اور کن حالات میں ہوئی اس پر بھی ایک نظر ڈال لینا ضروری ہے۔

مسلمانوں کی آمد سے پہلے ہی ہندوستان میں مذہبی کشمکش پورے شباب پر تھی۔ سارا ملک مذاہب کا اکھاڑہ بنا تھا بدھ مذہب اپنی حیات و ممات کے آخری مراحل طے کر رہا تھا ہندو مذہب اپنی تجدید و اشاعت کے لئے نئے راستے تلاش کر رہا تھا۔ کبیر، تلسی داس اور ان کے چیلے نئے زاویہ سے مختلف خفائد اور فرقوں کو ایک کرنے میں منہمک تھے۔ شیو مت، وشنو مت ہندوستان کے مختلف گوشوں میں کسی نہ کسی عنوان سے اپنا اپنا کام کر رہے تھے۔ اسی اثنار میں مسلمانوں کی فتوحات کا سلسلہ شروع ہوا۔ رفتہ رفتہ وہ سارے ملک پر چھا گئے حکومتیں قائم کر کے یہیں کے ہو رہے۔ مذہب کی ترویج کے بجائے مسلمان بادشاہوں نے حکومت و تسخیر پر زیادہ زور دیا۔ مذہب کی اشاعت کو بزرگان دین نے اپنی انفرادی کوششوں کا ماحصل بنا لیا۔ آنے والوں اور رہنے والوں میں آریائی ہونے کے لحاظ سے کچھ خصوصیات مشترک تھیں۔ طرز معاشرت اور عقائد میں اختلافات ضرور تھے مگر ان اختلافات کو کم کرنا بھی ضروری ہو گیا تھا۔ اس لئے کہ آنے والوں نے ذہنی طور سے یہ سمجھ لیا تھا کہ اب ہم کو واپس نہیں جانا ہے۔ یہیں رہنا، یہیں مرنا جینا ہے اور یہاں کے پرانے رہنے والوں نے غیر شعوری طور پر یہ محسوس کر لیا تھا کہ ؎

بن بلائے ہوئے آئے کہ بلائے آئے　　اب جگہ دیجئے محفل میں جو آئے آئے

باہمی اختلاط اکبر و جہانگیر کے دور حکومت میں شباب پر

تھا۔ فنون لطیفہ، مذاہب، زبان و ادب، انداز فکر کا ردّ و بدل دنیا کی دو بڑی تہذیبوں یعنی ہندو، مسلمان کے درمیان ہوتے ہوتے ایک خاص نقطۂ امتزاج تک پہنچ گیا، جنوبی ہند میں اتفاق سے اکبر کی طرح سلطان قلی قطب شاہ بھی نہایت قلیل قدر خصوصیات کا مالک تھا۔ وہ بھی ہر لحاظ سے ہندوؤں اور مسلمانوں کو قریب تر کر دینا چاہتا تھا۔ وہ اکبر سے بھی زیادہ ہندوستانی تھا۔ قلی قطب شاہ سے پہلے جو بادشاہ تھے وہ بھی کم و بیش ہندوستانی مزاج کے تھے یعنی جب اردو بن رہی تھی اسی وقت سے ہندوستانیت بھی اپنا کام کر رہی تھی۔ غرض کہ حسن اتفاق سے شمالی و جنوبی ہندوستان کے دونوں حصّوں میں ایسی فضا قائم ہو گئی تھی کہ ملّت کے تخلّقات کو ایک نئے انداز سے اُبھرنے کا موقع ملا اور یہی وہ زمانہ تھا جب اردو ایک نئی زبان کی صورت اختیار کر رہی تھی، کبھی ہندوی، کبھی ہندی، کبھی ریختہ کے نام سے اپنا وجود قائم کر رہی تھی۔ فنون لطیفہ اور دوسری تحریکات کے اختلاط کو متشکل کر کے ایک زبان کی بھی ضرورت تھی جو بغیر کسی منظم کوشش کے غیر شعوری طور پر ظہور میں آ رہی تھی۔ یہ زبان اپنے سانچوں وجود کی فراہمی کے لئے ہر قوم، ہر ملّت اور ہر مروجہ زبان سے اپنے طور پر کسب فیض کر رہی تھی، ہندو مسلمان ہر ایک کی زبان کو کھنگال کر مختلف الفاظ کو ایک لڑی میں پرونے لگی اور اس وسیع النظری کے ساتھ یہ کوشش جاری رہی کہ ہندو مسلمان کے امتیاز سے یہ نئی پود کبھی مرعوب نہ ہوئی۔ ہندوؤں سے بھی الفاظ و ضرب الامثال لینے لگی اور مسلمانوں سے بھی محاورات، اسماء، علامات وغیرہ بغیر کسی تکلف کے حاصل کرنے لگی۔ ابھی اوپر عرض کیا جا چکا ہے کہ مسلمانوں کی آمد سے پہلے ہی ہندوستان میں مذہبی لہریں طوفانی انداز سے اُٹھ رہی تھیں۔ ہر دبستان فکر کا آدمی اپنے فلسفے کی زیادہ سے زیادہ تبلیغ کر رہا تھا۔ اسی تصادم میں مسلمان فقراء نے بھی تبلیغ اسلام کے لئے قدم بڑھایا۔ ہوا کا رُخ دیکھ کر انہوں نے تبلیغ کے لئے تصوّف کو مشعل راہ بنایا۔ اس میں فلسفے کا نچوڑ بھی تھا اور شریعت کا رس بھی اور ساتھ ہی ساتھ وسیع الخیالی اور ہمہ گیری بھی۔ اسلام کے خالص عقائد اور شرع کی سخت گیری بھی نہ تھی کہ دوسرے فرقے والے سُن کر فوراً بھڑک جائیں۔

دکن کے ابتدائی کارناموں میں جتنی کتابیں ہیں وہ زیادہ تر تصوّف پر مبنی ہیں گویا زبان کی ابتدا خیال و بیان کے لحاظ سے تصوّف ہی کی سرپرستی میں ہوئی۔ تصوّف کئی لحاظ سے مذہبی جکڑ بند کے خلاف بغاوت کا علم بردار تھا۔ رسمی پابندیوں اور ظاہری قیود کو اچھی نظر سے نہ دیکھتا تھا۔ مذہب کی ان سختیوں سے بیزار تھا جو بزور شمشیر انسان کو راہ راست پر لانے کی کوشش میں صرف کی جاتی تھیں۔ برخلاف اس کے انسان کو صرف محبّت و اخلاق سے اپنانے کی فکر کرتا تھا۔ صوفیائے کرام، محتسب اور نمائشی زاہد، ریاکار شیخ کا برابر مذاق اڑاتے تھے وہ آدمیوں کی تقسیم ہندو، مسلم، عیسائی اور یہودی کے لحاظ سے نہیں کرتے تھے۔ ہر ایک کو انسان سمجھتے تھے اور چاہتے تھے ہر طبقہ انسان کو انسان سمجھے، ہر انسان ایک دوسرے کو ہم سفر سمجھ کر محبت و دل جوئی سے کام لے اور منزل مقصود کو پیش نظر رکھے یہی رجحان فارسی ادب سے بھی منتقل ہوتا ہوا اردو کی طرف آیا تھا۔ مسلمان شعراء یا اہل قلم زیادہ سے زیادہ فارسی ادب و اخلاق سے متاثر تھے۔ اس لئے خاص قوت کے ساتھ ان کے تصوّرات و خیالات میں تصوّف کار فرما ہوا۔ گویا شروع ہی سے اردو کے پیکر میں آزادئ خیال کی لہریں دوڑنے لگی تھیں۔ تصوّف نے جو انسان کی اہمیت بتائی تھی اس کا ایک پہلو یہ بھی تھا کہ انسان کا کیا ذکر ہے ہم خدا سے بھی کم نہیں ہیں۔ ہم بھی وہی ہیں جو وہ ہستی جس کو خدا کہا جاتا ہے۔ اس نظریہ پر یہاں بحث مقصود نہیں کہنا صرف یہ ہے کہ انسان کی عظمت کا خیال ہماری زبان کے شعور کا ایک خاص جزو ہو گیا تھا۔ انبیاء مثلاً خضر، موسیٰ یوسف علیہم السلام سے شعراء کلّہ بہ کلّہ باتیں کرتے ہیں غرض کہ ہر قسم کی روایات و مذہبی تقدس سے نڈر ہو کر چلنے کا جذبہ ابتدائی دور سے اردو میں آنے لگا۔ شاعر و ادیب کو بے باکی

کے علاوہ یہ صلاحیت بھی عطا ہوئی کہ وہ آزاد ہو کر اپنے خیالات کو پیش کر سکے۔

ہم اس سے بھی بے خبر نہیں کہ اس کے خلاف جذبات بھی اردو کے ابتدائی دور میں پائے جاتے ہیں۔ مذہب کا احترام بھی نظر آتا ہے۔ انسان کو مسلمان سمجھ کر دوسرے مذاہب کے لوگوں پر ترجیح بھی دی گئی ہے لیکن ہم یہ سمجھتے ہیں کہ روایات کے سیلاب میں بہہ جانا یا عقیدت مندی کے سامنے سر جھکا دینا ہمیشہ سے ہوتا آیا ہے۔ تقلید یا پابندئ رسم میں کوئی تازگی نہیں ہوتی۔ قدرت و عظمت کے جوہر نقل و کورانہ تقلید میں نہیں نمایاں ہوتے بلکہ جبر آمیز فرسودگی کی مخالفت بے کار رسوم سے بغاوت میں ظاہر ہوتے ہیں۔ اردو نے جو رسوم سے بغاوت اور ملائیت سے مخالفت کا رویہ اختیار کیا اس میں جاذبیت تھی۔ آزادئ خیال کا مظاہرہ تھا اور شاعر و شاعری کی عظمت کا اعلان بھی تھا۔ یہی آزاد روی تھی جو آگے چل کر میر و آتش کے یہاں انتہائی خود داری کی شکل میں نمایاں ہوئی۔ جس نے بادشاہوں سے ان شعرا کو مرعوب نہ ہونے دیا جس کا ثبوت ان شعرا کی سرگزشت حیات میں ہر ایک اردو جاننے والے کو ملا ہوگا مگر یہ کہا جائے کہ جن بادشاہوں سے میر و آتش کو سابقہ پڑا وہ اپنی کمزوریوں سے ان لوگوں کی سخت کلامی و آزاد روی کو برداشت کر گئے تو یہ بھی سوچنا پڑے گا کہ کیا کبھی فنون لطیفہ کے کسی اور فنکار نے یہ ہمت کی تھی اور ان بادشاہوں نے ایسی ہی شرافت کا مظاہرہ کیا تھا۔ غالباً کوئی مثال نہ ملے گی۔ صرف اردو کی انفرادیت تھی جس میں ابتدا ہی سے بغاوت اور اپنی عظمت کا احساس پیدا ہو گیا تھا۔ یہی خصوصیت تھی جو آگے چل کر اقبال ایسے خدا پرست سے 'شکوہ' کے لئے زبان کھلوا سکی۔ اقبال پر اس وقت شاعرانہ عظمت کا خیال غالب تھا۔ وہ شدت احساس میں اس وقت یہ بھول گئے کہ اسلامی شرع و سزا بھی کوئی چیز ہے۔ جو کچھ بہ حیثیت شاعر کے انہوں نے محسوس کیا۔ خدا سے کہہ گئے یہ گرمئ کلام و شوخئ گفتار

در حقیقت اردو زبان کے ابتدائی نقوش میں مضمر تھی۔ اس زبان کا خمیر ہی ایسا بن گیا تھا کہ خوف و ہراس سے بالاتر ہو کر شاعرانہ احساس کے ساتھ محسوسات کو پیش کیا جائے اس دلیل کے خلاف یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ وہی شاعر جو کبھی عرش سے بھی اوپر نظر آتا ہے بعض اوقات اس بلندی سے پستی کی طرف آ جاتا ہے تو اس کی انفرادیت اور اردو کی امتیازی خصوصیت کہاں رہ جاتی ہیں؟ اس کے جواب میں صرف یہ عرض کرنا ہے کہ صلاحیت یا قوت کا وجود ایک الگ بات ہے اور اس کا استعمال نہ کرنا دوسری بات ہے۔ اردو نے یہ خصوصیت مہیا کر دی تھی۔ اس سے فائدہ اٹھانا یا نہ اٹھانا ظرف استعداد یا رجحان پر منحصر تھا۔ جس نے جس وقت بے باکی و بے نیازی کے عنصر سے فائدہ اٹھانا چاہا اس کو زبان کی طرف سے مایوسی نہیں ہوئی۔ شدت احساس کے لمحات میں وہ عرش پر جا پہنچا اور جس درجے کی کمی اس احساس میں آئی وہ اتنی ہی پستی پر آ گیا۔ شاعر بہر حال انسان ہے وہ خوبی و خرابی کا مرقع ہے۔ اس میں ملکوتی صفات بھی ہیں مگر زیادہ نہیں زندگی میں کم لمحے آتے ہیں جب شاعر محض شاعر ہوتا ہے۔ زیادہ تر وہ اپنے سماج، حالات، رسوم وغیرہ سے متاثر ہوتا ہے۔ اس لئے وہ سب سے بلند ہستی کے مرتبہ پر کم ہی اپنے کو پاتا ہے۔ عموماً وہ اس مرتبہ سے پست ہو کر محسوسات پیش کرتا ہے۔ زبان صرف اس کو اپنی خصوصیات کا سہارا دے سکتی ہے اس کو سوچنے کا طریقہ بتا سکتی ہے مگر اس کی تخیل اور پرواز نہیں بن سکتی۔ وجدان و سرشاری کا انحصار احساس و ادراک پر ہے۔ خمار کے عالم میں والہانہ کیفیت مائل بہ انحطاط ہوتی ہے جب وہ سرشار ہوتا ہے تو کہتا ہے ؎

ہیں آج کیوں ذلیل کہ کل تک نہ تھی پسند
گستاخئ فرشتہ ہماری جناب میں

اور جب شاعرانہ وجدان کم یا ختم ہو جاتا ہے تو ایک معمولی بادشاہ کے لئے دست بدعا ہو کر کہتا ہے

تم سلامت رہو ہزار برس ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

یہی حال اقبال کا ہوا - جب غیر معمولی وجدان طاری ہوا تو اردو کے مزاج کا سہارا لے کر وہ خدا سے شکوہ کر گئے اور ایسے لب و لہجہ و تاثر کے ساتھ کہ جس کا جواب نہ تھا اور جب اس وجدان کی کمی ہوئی جملہ بندشوں پر نظر گئی تو احساس ندامت نے 'جواب شکوہ' کہنے پر مجبور کیا جس میں نہ وہ شاعرانہ عظمت ہے اور نہ وجدان کی وہ کیفیت جو شکوہ میں پائی جاتی ہے اور اسی تضاد پر کیا منحصر وہ اقبال جو فلسفہ خودی اور شاہین کا خالق ہے وہ مسولینی کی بھی تعریف کر جاتا ہے -

یہاں یہ بحث نہیں ہے کہ کب کس نے کیا کہا اور کیوں ترقی پسند عناصر سے فائدہ نہیں اٹھایا - کہنا تو یہ تھا کہ اردو ابتدائے آفرینش ہی میں وہ طرز' تخیل' تصوف اور تصور سے پیدا کر چکی تھی جو تقلید و رسمیات سے خدام ادب کو بالا تر ہونے کا رجحان عطا کرتی تھی - اس کے مزاج میں ایک ایسا صحت مند عنصر آ گیا تھا جو اہل مذہب و حکومت کی غلط کاریوں کے خلاف بغاوت کرنے کا مادہ اور سہارا بن سکتا تھا اور جب کسی نے حسب توفیق استفادہ کیا اس نے فیض سے محروم نہیں رکھا -

ابتدائی تشکیل میں خیال کی بنیاد و طرز تخیل کی بے باکی کا جائزہ لینے کے بعد اگر ہم دوسرے اجزائے ترکیبی پر نظر ڈالتے ہیں جن سے زبان کا مزاج تیار ہوتا ہے تو اور زیادہ ثبوت ملتے ہیں کہ اردو کا خمیر ترقی پسند تھا - جن زبانوں سے الفاظ اس نئی زبان نے لئے تصرف کا سلسلہ برابر جاری رکھا - جو الفاظ اس کے ڈھانچے میں یا اضداد طبیعت کے لحاظ سے کسی قدر نامناسب یا کھٹکتے تھے ان کو اس نے اپنے طرز پر تراش خراش کے بعد نئی صورت دے کر اپنانے کی کوشش کی - یہ عمل مزاجی الفاظ و تلفظ کے علاوہ معنی و بیان میں بھی تھا - چنانچہ فارسی و عربی کے الفاظ و محاورات کے ساتھ بھی اردو کا یہ رویہ برابر جاری رہا - بادی النظر میں ابتدائی نقوش فارسی و عربی سے کافی متاثر ہیں - اکثر دھوکا ہوتا ہے کہ ریختہ انھیں زبانوں کی نقالی بلکہ غلامی ہے لیکن باوجود ان باتوں کے ریختہ نے اپنی انفرادیت اور ایک خاموش بغاوت کو اس عالم میں بھی برقرار رکھا اپنے ماحول اور اپنے عوام کو اس نے کبھی کبھی فارسی و عربی لغات و زبان پر ترجیح دی جس لہجے اور جس معنی میں عوام الفاظ کو استعمال کرتے تھے اس کو بھی اس نے صحیح مانا حالانکہ قواعد کے لحاظ سے عوام غلطی پر تھے اور شعراء جانتے تھے کہ یہ لفظ جہاں سے آیا ہے وہاں اس مفہوم میں یا اس طرح بولا نہیں جاتا مثال کے لئے بہت عام فہم لفظ کا استعمال ملاحظہ ہو - مسجد کے تلفظ سے کون شاعر یا ادیب ناواقف ہوگا مگر اس پائے کے لوگ مثلاً بابا فرید شکر گنج اور میر تقی میر مسجد کو "مسیت" بھی نظم کر جاتے ہیں حضرت شکر گنج کا شعر ہے -

اسا کیری یہی سوریت جاؤں نائے کہ جاؤں مسیت

ریت اور جیت کا قافیہ مسیت (بہ معنی مسجد) میر کے یہاں ملاحظہ ہو

کہ اینٹ کی خاطر یہ ڈھاتے ہیں گے مسیت

ان کے علاوہ ہندی کے مشہور شاعر تلسی داس نے بھی مسجد کو 'مسیت' ہی نظم کیا ہے کہتے ہیں

مانگ کے کھیبو - مسیت کو سوئیبو

بیوے کو ایک نہ دیوے کو دو

اسی طرح اور الفاظ مثلاً تماشا' ماجرا وغیرہ مثال میں پیش کئے جا سکتے ہیں جو بالکل مختلف معنوں میں استعمال کئے گئے ہیں اور یہ استعمال بالقصد تھا بالجہل نہ تھا محض اس لئے کہ عوام اسی مفہوم میں استعمال کرتے تھے - اس رویے و نظریے کے ثبوت میں میر کا وہ مقولہ بھی پیش کیا جا سکتا ہے جو آب حیات میں ملتا ہے کہ لکھنؤ کے چند عمائد و اراکین شہر میر صاحب کے پاس شعر سننے گئے مزاج پرسی وغیرہ کے بعد انہوں نے فرمائش اشعار کی - میر صاحب نے پہلے ٹالا

جب اصرار زیادہ ہوا تو جواب دیا صاحب قبلہ میرے اشعار آپ کی سمجھ میں نہیں آنے کے لیکن لوگوں نے جواب دیا کہ حضرت ہم انوریؔ خاقانی کا کلام سمجھ لیتے ہیں آپ کا ارشاد کیوں نہ سمجھیں گے میرؔ صاحب نے کہا میرے کلام کے لئے فقط محاورہ اہل اردو ہے یا جامع مسجد کی سیڑھیاں - اس بات سے صاف واضح ہے کہ ریختہ عوامی دنیا کی طرف مائل تھی اس کا رجحان ترقی پسند تھا - اس کی ابتدا عوام کے مذاق کے لحاظ سے پروان چڑھ رہی تھی - سیکڑوں ایسے فقرے ملیں گے جو اپنے اصل مفہوم سے بالکل الگ ہو کر عوام کے جذبات کی ترجمانی ایک دوسرے انداز میں کرنے لگے مثلاً سبحان اللہ' بسم اللہ' لاحول ولا قوۃ' ماشا اللہ' سن تراوی وغیرہ - ابتدائی نشو و نما میں ادبی معماروں کی ترقی پسند ذہنیت کا ثبوت اور کئی باتوں سے ملتا ہے مثلاً قافیہ کی صوتی اہمیت اور الفاظ کے مروجہ تلفظ کو اسی لحاظ سے جگہ دینا جس طرح عام طور پر وہ بولے جاتے تھے مثلاً تسبیح کو تسبی بولتے سن کر ہی کا قافیہ کرنا اور اس سے بھی ایک قدم آگے بڑھا کر رکھنا - دھڑ اور سر کو ہم قافیہ سمجھنا' گھوڑا' موڑا کا قافیہ گورا وغیرہ[1] - ہندی الفاظ کے ساتھ فارسی اضافت کا جائز قرار دینا مثال کے لئے مرزا مظہر جانجاناں کا ایک شعر ملاحظہ ہو - ؎

کسی کے خون کا پیاسا کسی کے جان کا دشمن
نہایت منہ لگایا ہے سجن نیں بیڑہ پان کو

ہندی الفاظ کا زیادہ استعمال مثلاً نکے' موند' بچن' مکھ وغیرہ - یہ ضرور ہے کہ اس رجحان کو اتنا فروغ نہ حاصل ہو سکا جس کا وہ مستحق تھا مگر ترقی پسند عناصر جو اردو کی گھٹی میں پڑے تھے ہر لحاظ سے قابل قدر و تعریف ثابت ہوئے سچ پوچھئے تو اردو کی تعمیر ہی عوام کی ضرورتوں پر مبنی تھی کیونکہ خواص کے لئے تو فارسی زبان اور دوسری زبانیں موجود تھیں سرکاری یا نیم سرکاری حیثیت سے اپنا کام کر رہی تھیں مگر جب ملک میں ایک نئے عقیدے کے ماننے والے یعنی مسلمان کے آنے سے دنیا بدلی تو ایک نیا تمدن کروٹیں لینے لگا چھوٹے چھوٹے حلقے جو سلطنت اور زبان کے لحاظ سے الگ ہو گئے تھے مسلمان بادشاہوں کی وجہ سے ایک ہونے لگے حکومت پھیلتی گئی آمد و رفت کا سلسلہ بڑھنے لگا مختلف بولیاں یا زبانیں ایک دوسرے کے قریب تر ہونے لگیں اور ایک ایسی کڑی کی ضرورت محسوس ہوئی جو فارسی' برج بھاشا' اودھی پنجابی وغیرہ کو ایک امتزاجی صورت عطا کر دے جس سے عوام اپنے خیالات کو بہ آسانی ادا کر سکیں - اس ضرورت کا ایک غیر شعوری مطالبہ یہ بھی تھا کہ ایسی تشکیل کی بنیاد ہندوستان ہی کی ایسی زبان پر ہو جس سے زیادہ سے زیادہ رائج الوقت زبانیں فیض یاب ہو چکی ہوں یعنی گرامر ہندی ہو اور اسماء وغیرہ دوسری مروجہ زبانوں سے بھی حسب ضرورت لئے جائیں - اس فطری مطالبہ کو عوام اپنے طور پر دانستہ یا نادانستہ پورا کرتے رہے نتیجہ یہ ہوا کہ ایک دن یہ مانگ ریختہ کی صورت میں ظہور پذیر ہوئی اور آگے چل کر صدیوں کے بعد اردو کہلائی -

ترقی پسند عناصر ابتدائی عہد میں فروغ پاتے رہے - خیال الفاظ سب کا رخ عوام پسند تھا حتیٰ کہ مذہب بھی ہندو اور مسلمان کو تصوف کا سہارا لے کر متحد کرنے کی فکر میں نظر آتا ہے - شروع شروع میں جتنی کتابیں ملتی ہیں ان میں زیادہ تر مواد ایسے اخلاقی مضامین پر مشتمل ہیں جو عوام کے لئے پیام حیات سمجھ کر پیش کئے گئے تھے - بزرگان دین کا مخاطب بھی عوام ہی سے تھا - زبان ایسی بھی ملتی ہے جو عوام کے لئے قابل پذیر تھی - مضامین عام فہم اور بیان اس وقت کے لئے کارآمد تھا مگر یہ رویہ اور طرز فکر آگے چل کر قائم نہ رہ سکے جیسے جیسے دربار سے زبان کا تعلق بڑھتا گیا خیال میں رنگینی آتی گئی' زبان کا دھارا عوام کی طرف سے ہٹ کر خواص کے قریب آ گیا - اختراع و اجتہاد کا مادہ کم ہوتا گیا - تخیل اور الفاظ فارسی کے بوجھ سے دبا گئے وہ فن کار جن کو ادبی

---

[1] آب حیات صفحہ ۹

معمار سمجھا جا سکتا تھا تقلید کے بار گراں سے ہانپتے نظر آتے ہیں اردو زبان کی کسوٹی فارسی سمجھی جانے لگی۔ جزئیات کے لئے بھی فارسی سے سند تلاش کی جانے لگی۔ سودا اور میر کے بعد سے داغ تک ادب کا کارواں تقلید کے گرد و غبار میں چلتا رہا البتہ دور جدید نے اردو کی ماہیت کو سمجھنے کی کوشش اور اس کے معماروں نے تعمیر کا خیال کرکے زبان حال سے کہنا شروع کیا کہ ؎

عمریست کہ افسانۂ منصور کہن شد من از سر نو جلوہ دہم دار و رسن را

معلومات و اعداد

۱ - بھارتی ریلیں پر ہر ۵ سیکنڈ کے بعد ایک ویگن مال و اسباب سے لادا جاتا ہے۔ اس ماہ جون میں مال لادنے کی یومیہ اوسط ۱۷۳۵۵ ویگن تھی اس تعداد میں سے ۶۴ فی صدی ویگن چوڑی پٹڑی کے تھے۔ ویگنوں کی مذکورہ تعداد تین سال پہلے کی تعداد سے ۹۳۶ ویگن یومیہ زیادہ ہے۔

۲ - پہلی چھ ماہی میں اجتماعی ترقی کے پروگرام کی سرگرمیوں کے تحت بھارت میں ترقی کے ۸۱ بلاکوں کی ساڑھے گیارہ ہزار ایکڑ افتادہ زمین کو کاشت کے قابل بنایا گیا اور ۵۷۰۰ ایکڑ کے ایک دوسرے رقبے پر کام ہو رہا ہے۔

۳ - ۱۹۵۲-۵۳ء میں بھارت سے ۱۳ لاکھ ساٹھ ہزار ٹن خام میگنیز غیر ملکوں کو بھیجا گیا جبکہ ۱۹۵۱-۵۲ء میں ۱۱ لاکھ ۲۰ ہزار ٹن بھیجا گیا تھا۔

۴ - ۱۹۵۱-۵۲ء میں بھارت میں کل ۳ ارب ۱۶ کروڑ ۹۰ لاکھ نارئل پیدا ہوئے اس تعداد میں سے ۲ ارب ۸۰ کروڑ ۲۰ لاکھ نارئل مدراس اور ٹراونکور۔ کوچین کی ریاستوں میں پیدا ہوئے تھے۔

۵ - بھارت میں ۱۹۵۱ء کے درمیان ۵۲۷۰۵ ٹن اور ۱۹۵۲ء میں ۲۲۰۰۰۰ ٹن ایلومینیم سلفیٹ تیار کیا گیا تھا۔

۶ - جنوری سے اپریل ۱۹۵۳ء تک اندرون ملک میں ہوائی جہاز چلانے والی کمپنیوں کے ذریعے سے ۱۵۷۲۵۰ مسافروں نے سفر کیا اور ۲۸۰۷۱۹۰۸ پونڈ مال و اسباب اور ۲۹۳۸۵۸۷ پونڈ ڈاک کی باربرداری عمل میں آئی۔

سکندر علی وجد

ہم

زنداں میں بھی بجھے رہے دار و رسن سے ہم
رہتے ہیں سرکشوں میں بہت بانکپن سے ہم

یہ پوچھتے ہیں راہبر راہزن سے ہم
شانِ وطن ہے ہم سے کہ شانِ وطن سے ہم؟

بُت کو خدا کہیں کہ تجھی کو خدا کہیں
کرتے ہیں یہ سوال ہر اِک برہمن سے ہم

ہم راہِ مہر و ماہ سے آگے نکل گئے
اُلجھے ہُوئے ہیں صبح کی پہلی کرن سے ہم

حُسنِ عمل کا چشمۂ شیریں تھا خندہ زن
پلٹے جو تشنہ کام سرابِ سخن سے ہم

پست و بلندِ دہر سے آساں گذر گئے
چھُوٹے نہ قیدِ زلفِ شکن در شکن سے ہم

ہے تن بدن میں بُوئے گُلِ تر بسی ہوئی
اتنے رہے قریب کسی گلبدن سے ہم

نکلے جب اپنے گھر سے تو صورت خزاں کی تھی
آئے بہار بن کے تری انجمن سے ہم

گُل دوستی نے خار کا خُوگر بنا دیا
مثلِ نسیم شاد ہیں سارے چمن سے ہم

خاموش لالہ زارِ تحیّر بنے ہوئے
لیتے ہیں داد نرگسِ نادک فگن سے ہم

خاطر پسند یُوں تو گُل و یاسمن بھی ہیں
رکھتے ہیں اُنس لالۂ خونیں کفن سے ہم

گلشن نیا ہو، پھُول نئے، زندگی نئی
خوش ہیں تو صرف عشق کی رسمِ کہن سے ہم

دو سو برس ہیں وجدؔ، سراج و ولی کے بعد
اُٹھے ہیں جھُومتے ہوئے خاکِ دکن سے ہم

بلونت سنگھ

ہوّا الشافی

Hey, Ho! Listen to the Wisdom of Woman; Woman older and wiser than Wisdom itself.

Hey, Ho! . . . They are a thousand years old when they are born and ten times than that when we begin only to see them.

Hey, Ho! . . . She is as strong as wind, as untouchable as wind, as beautiful as wind.——KONRAD BERCOVIVI

اُجالے کی جگمگاہٹ دروازے کے شیشوں میں سے مہاشے جی اور اُن کی دھرم پتنی کی صورتیں دکھائی دیں۔ کوشل اپنے دھاری دار پاجامے کو پھڑپھڑاتا دروازہ کھولنے کے لئے اُٹھا۔

دروازہ کھولتے کھولتے اس نے ایک نظر گھوم کر دیکھا کہ اس کی بیوی ابھی محوِ خوابِ ناز تھی۔

"اے ہے ہے! اے ہے ہے! اے ہے ہے!!"

یہ مہاشے جی کے ہنسنے کی آواز تھی۔ اُن کے منہ کا دہانہ بہت کُشادہ، دانت بڑے اور آگے کو بڑھے ہوئے تھے۔ جس طرح عام لوگوں کو دانتوں کی نمائش کرنے لئے منہ کھولنا پڑتا ہے۔ اس کے برعکس مہاشے جی کو بمشکل تمام مُنہ بند کرنا پڑتا تھا۔ رہی ہنسی، ہر دم عریاں دانتوں کو دیکھئے تو گویا چوبیسیوں گھنٹے ہنستے رہتے تھے لیکن جب وہ فی الحقیقت ہنستے تھے تو دانتوں کے ساتھ مسوڑھوں کی نمائش کے علاوہ پیٹ سے بھی کہیں نیچے سے ہوا کھینچ کر بلخ کی طرح تیں تے کی آوازیں نکالتے چناں چہ

"اے ہے ہے! اے ہے ہے!! ہم نے سوچا آج تو کوشل جی کے وہاں چلئے پشیں گے۔ اے ہے ہے"۔

ان چھپر پھاڑ قہقہوں کے شور سے مسز کوشل جاگ پڑیں اور وہ اپنی ناخوشی چھپانے میں زیادہ کامیاب بھی نہیں ہوئیں۔

کوشل پھر اپنے بستر میں گھس کر بیٹھ گیا۔

مہاشے جی اپنی استری کے ساتھ ہوٹل میں انہیں کے ساتھ والے کمرے میں قیام فرما تھے۔ شملہ آتے وقت کالکا سے انہیں کے ساتھ گاڑی پر سوار ہوئے تھے۔ اسے اُن کا نام یاد نہیں رہا تھا۔ اس لئے وہ انہیں مہاشے جی کے نام سے ہی پکارتا تھا۔ مہاشے جی کی سب سے بڑی خوبی یا عیب تھا، ان کی بے تکلفی۔ یُوں دل کے بُرے نہ تھے۔ البتہ چائے کے بعد یعنی دوسرے نمبر پر صنف نازک

کی اُن کے نزدیک بڑی اہمیت تھی - بلکہ بعض اوقات تو عورت کا پیار چائے کے پیالے کے برابر اونچا کر دیتے تھے - چناں چہ اب کے آتے ہی مسز کوشل کی جانب یُوں جھکے جیسے وہ گرم گرم چائے کا پیالہ ہو - کوشل جانتا تھا کہ اب وہ اس کی بیوی سے قدرے دم بازی (Flirt) کریں گے لیکن وہ یہ بھی جانتا تھا کہ اس کی بیوی کی نگاہ میں غالب کی آبرو کیا ہے -

یہ خیال اس کے ذہن کے اُفق میں پھیلتا چلا گیا - اب تو گویا اپنے گریبان میں منہ ڈالنے والی بات تھی - دلی اضطراب پر قابو پانے کے لیئے اس نے سیگرٹ جلا لیا -

بھلا اس کی معصوم بیوی کیا جانے !

ہاں وہ معصوم کیا جانے کہ اس کا شوہر گوگ جہانمیڈ تھا وہ تو پران پیارے کے ساتھ پہاڑ پر ہوا خوری کے لئے آئی تھی - لیکن

"کُسم ! کُسم !! تم نے مجھے کہیں کا نہیں رہنے دیا"

دل ہی دل میں یہ الفاظ کہہ کر اس نے ہملیٹ Hamlet کی طرح بازو اٹھا کر ہاتھ کھڑکی کے چوکھٹے پر رکھ دیا -

اسٹوو کا شور پس منظر موسیقی کا کام دے رہا تھا -

کوشل نے سوچا کہ اچھا ہی ہوا جو مہاشے جی آ گئے کیوں کہ کل شام کُسم نے ہاتھ جوڑ کر بینتی کی تھی - کہ سال بھر تمہاری راہ دیکھی اب صورت دکھائی ہے تو مہینہ بھر کے بعد بھاگ جانے کی ٹھان لی - کم از کم ایک ہفتہ بھر تو اور رُک جاؤ"

اس کی بیوی تین ہفتے سے زیادہ رُکنے کے حق میں نہیں تھی - اسے اخراجات کی فکر تھی ' ایک مہینہ تو کھینچ تان کر گزر گیا تھا - لیکن اور زیادہ طول دینا اس کے بس کی بات نہیں تھی البتہ یہ ممکن تھا کہ مہاشہ جی اور اُن کی بیوی کی تائید سے یہ کام بن جائے ؟

مسز کوشل خوش مزاج خاتون تھیں - میٹھی نیند سے جگائے جانے پر پہلے تو وہ کچھ برہم ضرور ہوئی لیکن مہاشے جی کی "ہے اے اے" کے باعث جلد ہی اُن کی سستی رفع ہو گئی -

مسز کوشل مہاشے جی کی بیوی مخاطب ہو کر بولیں -

"کہیے بچے تو ابھی سوئے پڑے ہوں گے" -

" اور نہیں تو کیا اُن کے جاگنے ہماری اتنی مجال ہو سکتی تھی کہ آپ کے پاس بیٹھ کر اطمینان سے چائے پی سکیں"-

اس پر دونوں ہنسنے لگیں - ہنس لیجیئے ! ابھی تو آپ کی شادی کو ایک ہی برس ہوا ہے - لیکن وہ دن دُور نہیں جب آپ بھی ہماری طرح مجبور ہو جائیں گی"

"اے ہے ہے" مہاشے جی نے چہک کر ہنستے ہوئے اظہار خوشنودی فرمایا -

بعض اوقات مسز کوشل کو حیرت ہونے لگتی کہ اس قدر سُگھڑ اور سنبھلی ہوئی عورت کو مہاشے جی سا پتی کہاں سے مل گیا - عجب بے جوڑ جوڑا تھا -

ان سب قہقہوں سے دُور کوشل سگرٹ کے دھوئیں میں کھو سا گیا تھا - وہ کش پر کش لئے جا رہا تھا - کھڑکی سے باہر سامنے پہاڑ کی ڈھلان پر ایستادہ درختوں پر بندروں کے جھنڈ ہلڑ بازی کر رہے تھے - اور آگے ڈھلانیں تہ در تہ دُور تک چلی گئی تھیں -

کُسم کنواری ہی تھی جب کوشل کی اس کی محبت کا آغاز ہوا - شادی بھی ہو سکتی تھی لیکن کوشل نے اس محبت کو دل بہلاوے کی حد سے آگے نہیں بڑھنے دیا - لیکن جب کُسم کی شادی ہو گئی تو نہ جانے کُسم کی شخصیت میں اُسے نئی نئی خوبیاں کیوں دکھائی دینے لگیں - اور جب اس کی اپنی شادی بھی ہو چکی تو کُسم سے عشق کی شدت اور بڑھی - حالاں کہ اپنی بیوی کُسم سے بہتر تھی پھر بھی وہ اپنے خاص دوستوں سے یہ کہے بغیر نہیں رہتا تھا کہ یار ! کُسم میں عجیب Wildness

ہے - بس میں تو اس کی اسی ادا پر مرتا ہوں۔ کسم ! کسم !!

ان دونوں کی ملاقات تقریباً ہر روز ہوتی تھی - جلوت میں بھی اور خلوت میں بھی - وہ نہیں جانتا تھا کہ ان دونوں کا پیار کیا رنگ لائے گا - اب تو کسم کا ایک پانچ برس کا لڑکا بھی تھا - لیکن اس کے باوجود بقول کسم اس کی محبت میں کوئی فرق نہیں آیا تھا کبھی کبھی کوشل کو یوں محسوس ہوتا جیسے وہ کسی خطرناک مرض میں مبتلا ہو - آخر اس مرض کی دوا کیا تھی ؟

چائے طیار ہو گئی -

اب مہاشے جی کوشل کی جانب متوجہ ہوئے "اجی کوشل صاحب ! اے ہے ہے چائے نہیں پیجئے گا"

"پلا ئیے گا تو ضرور پئیں گے"

"اجی پلانے والے تو آپ ہیں - اے ہے ہے"

کوشل نے زندگی بھر مہاشے جی کی بے تکی باتوں اور ان کی اے ہے ہے سے زیادہ واہیات چیز نہیں سنی تھی - اس مہاشے سے تو کسم کا شوہر ہی بہتر تھا - حالاں کہ اس کا حریف تھا لیکن بچارا ! معصوم !!

پہلا گھونٹ حلق سے اتارتے ہوئے مہاشے جی بولے "آج کی چائے یاد رہے گی ہمیشہ"۔

"وہ کیوں ؟"

"اے ہے ہے"

ہنس کر مہاشے جی نے دوسرے گھونٹ کے لئے ہونٹ بڑھائے اور دانتوں کے ساتھ اُن کے دیدے بھی چمک اٹھے - بولے "ارے بھائی آج آپ جا رہے ہیں نا !"

کوشل نے قدرے توقف کیا - پھر پانسہ پھینک ہی دیا - "ہو سکتا ہے ہو سکتا ہے ...."

اس پر اس کی بیوی کا گورا ہاتھ پیالہ اٹھاتے اٹھاتے رک گیا - ہموار جبیں پر ایک بل خنجر کی طرح نمودار ہوا پوچھا "کیوں؟"

کوشل بیوی سے آنکھ نہ ملا سکا - اس نے منہ پھیر لیا اور دل کڑا کر کے بولا "آج موڈ نہیں بن رہا ہے"۔

"واہ ! کیا بات ہے کیا بات کہی ہے" مہاشہ جی نے کوشل کی جانب ہاتھ پھینک کر یوں داد دی جیسے اس نے بہت بلند پایہ شعر کہہ سنایا ہو -

اس پر خوب لے دے ہوئی - کوشل کی شہ پا کر مہاشے جی نے میدانوں کی گرمی کے نقصانات اور پہاڑ کی خنک ہوا کے فوائد کا چارٹ Chart بنا کر پیش کیا - اور اس قدر زیادہ کائیں کائیں کہ مسز کوشل کو چپ ہونا پڑا -

چائے پی لینے کے بعد مہاشہ جوڑی اٹھی اور دروازے سے نکلتے نکلتے مہاشے جی نے کوشل کی بیوی پر بڑی لذیذ نگاہ ڈالی' ایک بار پھر فضا ان کی غیر موسیقانہ مے اے ائے سے تلملا اٹھی اور جاتے جاتے وہ یوں بولے جیسے انہیں آکاش بانی ہوئی ہو - "کل صبح آپ کو ہمارے کمرے میں چائے پینی ہوگی"۔

تنہا رہ جانے پر کوشل نے دل ہی دل میں ایک معذرت نامہ طیار کیا - اور اس کی ابتدا یوں کی "سنو ڈارلنگ"

"سنائیے" مسز نے خشک لہجے میں کہا -

کوشل کھسیانا سا ہو گیا "دیکھو ڈارلنگ"!

"دکھائیے" مسز خشک تر لہجے میں بولیں -

"بھئی معلوم ہوتا ہے کہ آپ خفا ہو گئی ہیں حالاں کہ بات معمولی ہے لیکن اگر آپ ...."

"جی میں خفا نہیں ہوں" مسز نے خشک ترین لہجے میں جواب دیا "لائیے تھیلا ! جب رکنا ہی ہے تو بازار سے سبزی لے آؤں"۔

کوشل جی ہی جی میں بہت خوش ہوا۔ بڑی فرماں برداری دکھاتے ہوئے وہ ایک کونے سے پھول دار کپڑے کا بنا ہوا تھیلا اُٹھا لایا، اور بولا "ذرا پہاڑی (نوکر) کو جگا دوں۔۔۔۔ آپ کے ساتھ۔۔۔۔"

لیکن نوکر کے جاگنے سے پہلے ہی بیوی زلفیں لہراتی بازار کی جانب روانہ ہوگئی۔

کوشل نے پھر سوچنا شروع کیا۔ اس بچاری کو کیا معلوم کہ کسم نے کیسی پیاری پیاری چٹھیاں اسے لکھی ہیں۔ وہ کیا جانے کہ وہ سب خطوط اُس کے اٹیچی کیس میں فائلوں کے نیچے محفوظ پڑے ہیں، اور اس کی چابی اس کے پائجامے کے ازاربند کے ساتھ بندھی ہوئی ہے۔

ہوٹل سے بازار تک خاصی چڑھائی تھی، چنانچہ لوئر بازار تک پہنچتے پہنچتے شریمتی جی کا دم پھول گیا، اور ابھی تک وہ اچھی طرح سنبھل بھی نہیں پائی تھی کہ دُور سے کسم کے پتی شرماجی آتے دکھائی دیئے۔ شریمتی جی نے فوراً نظر چُراکر رُخ پھیر لیا اور جلدی سے کھسک جانے کے لئے رفتار تیز کردی۔ لیکن شرماجی نے کرکٹ کے ماہر کھلاڑی کی طرح لپک کر آپ کو "نوچ" لیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ شریمتی جی کو شرمانا پڑا، مسکرانا پڑا، اور پتلی کمر کو قدرے ہلاکر حیرت سے دریافت کرنا پڑا "ارے آپ؟"

شرماجی اپنے زور میں ایک بار تو ریل کے چھک چھک کرتے ہوئے انجن کی طرح اُن کے اوپر ہی چڑھ دوڑے پھر بمشکل سنبھل کر لمحہ بھر کو یوں دم بخود رہ گئے جیسے جلوۂ حُسنِ یار کی تاب لانے سے قاصر ہیں۔ لیکن بالآخر ۔۔۔۔۔ لے آئے اور بصد شدومد فرمایا

"بیوٹی فل!"

یہ کہہ کر انھوں نے اپنے چہار آتشہ پیندے کو حرکت دی ـــــ کیونکہ بدن کا درمیانی حصّہ چربی اور بادی کی وجہ سے پھول کر سپیرے کی بین کے مانند دکھائی دے رہا تھا، پھر تھیلے کی طرف اشارہ کرکے پوچھا۔

"سبزی لے جانے کے بہانے سے آئی ہیں؟"

"بہانہ؟" شریمتی جی نے قدرے تامّل کیا۔ پھر کچھ سمجھ کر ہنس دیں۔ "جی ہاں بہانہ ـــــ بہانہ کرکے آئی ہوں۔"

اس پر شرماجی نے اظہارِ مسرّت کرتے ہوئے پھر آنے جانے والوں کی نظر بچاکر اپنے سینے پر دل والے مقام پر ہاتھ رکھا۔

"کسی نے سچ کہا ہے کہ بھگوان جب دیتا ہے تو چھپّر پھاڑ کر دیتا ہے۔" پھر ایک سبک سا بوسہ ہوا میں اُڑاکر فرمایا، "چلا جا لفافہ کبوتر کی چال، جو ہوگی محبت تو دیں گے جواب۔ لیکن مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ لفافے کے جواب میں آپ خود ہی تشریف لے آئیں گی۔"

"کیسا لفافہ؟" شریمتی جی دل ہی دل میں سوچنے لگیں۔

اسی اثنار میں شرماجی کا پانچ سالہ لڑکا دوڑتا ہوا آیا اور گھبرائی ہوئی آواز میں بولا "آپ مجھے چھوڑکر ایک دم کیوں بھاگ آئے ڈیڈی!"

"ارے بیٹا! سوری، ویری ویری سوری۔ دیکھو موسی جی کو جے ہند کہو ـــــ دونوں ہاتھ جوڑکر ہاں۔ جے ہند!!"

اس کے بعد شرماجی نے ایک آنکھ بند کرکے شریمتی جی کی جانب دیکھا، مراد یہ کہ ابھی سب انتظام کئے دیتا ہوں۔

پھر وہ بچے کو قریب حلوائی کی دُکان پر لے گئے۔

"لو بیٹا! پستے کی برفی کھاؤ۔ کرسی پر بیٹھ جاؤ۔ یہ بات۔ بس یہیں بیٹھے رہنا۔ لو یہ پیکٹ بھی تمہارے پاس دھرا ہے۔ اس کا خیال رکھنا۔"

بچے کو بٹھاکر شرماجی نے شریمتی جی کی کمر کو چھوا ـــــ

"آیئے اب چلیں۔"

قدرے ایک جانب ہٹ کر وہ اس جھنگلے کی طرف بڑھے۔ جہاں موچی پرانے فل بوٹوں کی مرمّت کرکے انھیں پہاڑیوں کے ہاتھ فروخت کیا کرتے ہیں وہ بلغم کے تودوں

سے بچتے ہوئے جھٹکے سے ٹیک لگا کر کھڑے ہو گئے۔

"یاد ہے آپ کو، پرسوں آپ نے مجھ سے کیا کہا تھا؟"

"کیا کہا تھا؟" اُس نے بن کر پوچھا۔

"یہی، آپ کیا جانیں کسی کے دل کا حال ـــ یاد آیا؟"

"ہاں جی ـــــ" وہ بن کر لجائی۔

"سچ مانئے چار دن سے ـــــ یعنی جب سے آپ کی آنکھوں نے اپنے پیار کا پیام دیا ہے کھانا، پینا، سونا، کام کرنا غرض سب کچھ حرام ہو گیا ہے، آپ سب کچھ جانتی تھیں، پھر بھی آپ نے کل ریزرویشن نہیں دیئے۔ کارن؟"

"آپ کو تو معلوم ہی ہے، ہمیں واپس جانے کی طیاری کرنی تھی، آج ہی تو جانے کا پروگرام ....."

"ایسا مت کہیئے، مت کہیئے ایسا" شرما جی نے اِن کی بات کاٹ کر زمین پر بچھتے ہوئے اصرار کیا۔

"لیکن اب تو پروگرام ملتوی ہو گیا ہے"

"سچ؟"

"ہاں ہاں!"

"ارے میں بڑا خوش نصیب انسان ہوں۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ میری چٹھی کا آپ کے دل پر اتنا گہرا اثر ہو گا"

"چٹھی کون سی؟"

"وہی جو ابھی ابھی آپ کو ملی ہے"

"مجھے تو کوئی چٹھی نہیں ملی"

"نہیں ملی؟" شرما جی چلا کر بولے

"نہیں"

"میں نے اپنے نوکر کے ہاتھ بھیجی تھی آپ کو"

"مجھے نہیں ملی"

"ارے واہ! معلوم ہوتا ہے کہ نوکر کے پہنچنے سے پہلے ہی چل دیں آپ"

"ہاں ایسا ہی ہوا ہو گا"

"تو یہ کہیئے کہ چٹھی پڑھ کر نہیں میرے دل کی پکار سن کر چلی آئیں آپ۔ کاش آپ نے میری چٹھی پڑھی ہوتی۔ میں نے اُس میں اپنا دل کھول کر رکھ دیا تھا ....."

شریمتی جی نے ناز سے پلکیں جھپکائیں اور دُور ہی سے بائیں شانے کو دھکا دینے کے انداز سے حرکت دے کر بولیں "ہائے کیا لکھا تھا آپ نے؟"

اس پر شرما جی نے آنکھیں موند لیں "ہائے مت پوچھئے ..... میں نے لکھا تھا، میری اور صرف میری" یعنی اس طرح خط شروع کیا تھا۔ پھر اس نوخیز محبت نے چار دن میں جو حال میرا بنا دیا تھا وہ لکھا تھا، اور اسی محبت کا واسطہ دے کر آپ سے درخواست کی تھی، کہ آپ کسی حیلے سے کم از کم ایک ہفتہ تو اور رُک جائیں۔ لیکن عجیب بات ہے آپ نے میری چٹھی پڑھی بھی نہیں، اور دل کی سب مرادیں بھی پوری ہو رہی ہیں"

اتنے میں شرما جی کو اپنا نوکر آتا دکھائی دیا۔ ڈپٹ کر بولے۔

"ابے کہاں مر گیا تھا، معلوم ہوتا ہے کہ کہیں راستے میں ہی سُلفہ پینے لگا ہو گا، چٹھی بھی وقت پر نہیں پہنچائی"

"پہنچا دی حجور ـــ"

"پہنچا دی؟ ابے کس کو دے آیا؟"

"بابو جی کو ـــــ بی بی جی ـــــ ارہاں بی بی جی ـــ تو یہاں کھڑی ہیں؟"

"ابے بی بی جی کے ... بَ ... بَ .... میرا مطلب ہے تو نے ..... ارے غضب کر دیا تُو نے"

شرما جی نے پلٹ کر دیکھا تو معشوقہ کو واپس جاتے ہوئے پایا ـــــ ان کا دماغ چکرا رہا تھا۔ نوکر الگ پریشان تھا ہکا بکا کہہ رہا تھا۔

"پر بابو جی نے مجھے گردن سے پکڑ لیا، بولے، سالے!

کیا کام ہے بی بی جی سے سویرے سویرے ....."

لیکن شرماجی نے کچھ نہیں سُنا، کیوں کہ مسز کوشل جنگلے کی بغل سے ہوکر نیچے ہوٹل کی جانب جانے والی سڑک پر پہنچ چکی تھیں۔

شرماجی نے گھبراکر پوچھا۔ "اب کیا ہوگا؟"

مسز کوشل نے چلتے چلتے بے اعتنائی سے جواب دیا "اب ہم واپس چلے جائیں گے فوراً"

شرماجی نے جنگلے ہی سے ہاتھ بڑھاکر منت کہا۔ "ایسا مت کہیے۔ آپ جانتی ہی ہیں کہ م.... م.... میں آپ کو...."

"یعنی؟"

لفظ 'یعنی' کے جواب میں مسز کوشل دلی اطمینان کے ساتھ چُپ چاپ خالی تھیلا گھماتی ہوئی ہوٹل کی جانب چلی گئیں۔

جب وہ اپنے کمرے کے دروازے پر پہنچیں تو دیکھا کہ سارا سامان باندھا جارہا ہے۔

کمرے میں داخل ہوتے ہی اُنھوں نے اس قدر جلد طیاری پر اظہارِ حیرت کیا تو کوشل کرخت لہجے میں بولا، "ہم واپس جارہے ہیں۔ ابھی اسی وقت"

اس کا خیال تھا کہ بیوی رُکنے پر اصرار کریں گی لیکن وہ بلا حیل و حجت طیار ہوگئیں۔

وہ اسٹیشن پر گاڑی چھُوٹنے سے بہت پہلے پہنچ گئے۔ مسز کوشل آرام سے ایک فلمی رسالہ پڑھنے لگیں اور کوشل نے بے چینی سے پلیٹ فارم پر اِدھر اُدھر ٹہلنا شروع کردیا۔ اس کے دماغ میں جیسے کوہ آتش فشاں پھُوٹ پڑا ہو، وہ اپنے آپ کو خوبصورت سمجھتا تھا، وہ نہیں جانتا تھا کہ اُس کی بیوی کا ذوق اِس قدر پست بھی ہوسکتا ہے اور وہ اسے چھوڑکر شرماجی ایسے بھونڈے انسان سے رومانس لڑانے لگے گی ـــــ اس نے سوچا کہ گاڑی میں بیٹھکر وہ اطمینان سے بیوی کی خبر لے گا۔

جس ڈبے میں وہ بیٹھے تھے وہاں ایک خوبصورت جوڑا پہلے سے ہی بیٹھا تھا، اگرچہ وہ دونوں ایک دوسرے میں مگن تھے۔ لیکن پھر بھی ان کی موجودگی میں وہ بیوی سے جھگڑا تو نہیں کرسکتا تھا۔

اسٹیشن سے گاڑی روانہ ہوئی تو وہ بیوی سے الگ تھلگ سیٹ پر منھ پھیرکر بیٹھ گیا۔ چند منٹ خاموشی میں گزر گئے۔ پھر یہ دیکھ کر کہ نیا جوڑا بڑی محبت اور اخلاص سے آپس میں کانا پھُوسی کررہا ہے۔ اسے اور بھی کوفت ہوئی، چنانچہ منھ پھیرا تو دیکھا کہ اس کی بیوی کھڑکی کے قریب بیٹھی کچھ کاغذات جلا رہی ہے۔

سخت اُس نے دھیمی لیکن مستحکم آواز میں جواب طلب کیا "یہ کیا جلا رہی ہو؟"

"چند پریم پتر" اسی لہجے میں جواب ملا

"کیسے پریم پتر؟"

"آپ دیکھ سکتے ہیں" یہ کہہ کر بیوی نے جلتا ہوا ایک کاغذ آگے بڑھا دیا ـــــ کسُم کے خطوط اُس کے نام۔

اس کے ہاتھ پاؤں شل ہوگئے .....

اور وہ سب کچھ سمجھ گیا تھا۔

بیوی چُپ چاپ کھڑکی کے باہر دیکھ رہی تھی۔ جلے ہوئے کاغذوں کا ایک آدھ ٹکڑا ہوا میں ناچ رہا تھا۔

بالآخر کوشل نے سچے دل سے جھینپ کر کہا۔

"تم بہت شریر ہو"

بیوی کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔ بھرّائی ہوئی آواز میں بولی۔

"اور آپ؟"

اِس پر کوشل نے فوراً آگے بڑھکر قریب قریب دوزانو ہوتے ہوئے جواب دیا۔

"میں؟ ـــــ میں آپ کا غلام"

شکیل الرحمٰن

میراجی کی شاعری کے دو پہلو

میراجی اُردو ادب کے بہت ہی بدنام شاعر ہیں۔ ان کی شاعری میں خود پرستی، جنس پرستی، ابہام اور گریز و فرار کے عناصر اتنے ہیں کہ ان میں صحتمند چیزوں کا ملنا نہایت مشکل ہے۔ ان کی علاماتی شاعری بھی ابہام کے بے پناہ سمندر میں چھلانگ لگاکر خودکشی کرلیتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی وہ علاماتی نظمیں بھی علاماتی نہیں بن سکی ہیں جو بڑی خوبصورت علاماتی نظمیں بن سکتی تھیں۔ ان نظموں کو بھی علاماتی کہتے ہوئے جھجک محسوس ہوتی ہے۔

میراجی اپنی بعض نظموں میں اپنی شخصیت ڈھونڈتے نظر آتے ہیں، وہ خود کو تلاش کرتے ہیں اور اس تلاش میں وہ بہت پریشان نظر آتے ہیں۔ ان کی ایسی نظموں میں ان کی وہ حیرت قائم رہتی ہے، جسے وہ اس وقت تک قائم رکھنا چاہتے ہیں جب تک کہ وہ خود کو پا نہ لیں، وہ خود کو پاکر حیرت میں پڑجانا چاہتے ہیں۔ اُن کی وہ نظمیں اس لئے تشنہ رہیں کہ کبھی بھی وہ خود کو نہیں پاسکے، اور اس طرح ان کی وہ حیرت بھی بے جان بن گئی جو شروع سے قائم تھی وہ اپنی بعض نظموں میں بڑی حسرت سے ان مردوں کو دیکھتے ہیں جن کے پہلو میں جوان عورتیں مسکراتی ہیں۔ ان عورتوں کو دیکھ کر اُن کے منہ میں پانی بھرآتا ہے ان کی بعض نظمیں ایسی ہیں جن میں وہ جنس کے دلدل کو دیکھتے دیکھتے اوندھے منہ اس میں گرجاتے ہیں۔ گرنے کے بعد نکلنے کی کوشش نہیں کرتے بلکہ وہیں رہ کر کیچڑ کو اپنے جسم میں لگاتے ہیں اور ذہنی سکون حاصل کرتے ہیں، وہ کبھی جنس کی دنیا سے الگ پرواز کرنا نہیں چاہتے اور کبھی حیات کی تلخیوں سے گھبراکر گریز کرنے لگتے ہیں، زندگی کی تاریکیوں سے گھبراکر کبھی وہ ایسی باتیں کرنے لگتے ہیں جنھیں دوسرے لوگ سمجھ نہ پائیں وہ اپنے آپ سے باتیں کرتے ہیں، اسی سے وہ دنیا کی ساری چیزوں سے منہ پھیرکر خود کو دیکھنے لگتے ہیں۔ بودلیر بھی اپنی شاعری میں خود کو دیکھتا ہے۔ تلاش کرتا ہے خود کو پانے کے لئے بڑی محنتیں کرتا ہے۔ وہ اپنا تماشائی آپ بننا چاہتا ہے۔ لیکن میراجی کی تلاش اور بودلیر کی تلاش میں بہت فرق ہے۔ میراجی کبھی کسی لمحہ اپنا تماشائی خود نہیں بننا چاہتے وہ اپنی کمزوریوں اور اپنی فطرت کی حماقتوں سے اچھی طرح واقف ہیں، وہ اپنی تصویر ہر وقت دیکھتے ہیں، اُن کی اپنی تلاش اسی حد تک ہے کہ وہ اپنی کمزوریوں کو نمایاں ہونے سے بچالیں۔ اور اپنی شخصیت کی کلائیوں کو بڑی سختی سے پکڑے رہیں۔ انہیں سماج سے ڈر بھی لگتا ہے یہی وجہ ہے کہ وہ ابہام کے بے پناہ سمندر میں چھلانگ لگاتے ہیں، اور علاماتی شاعری جب ایسی حرکت برداشت کرنہیں پاتی ہے، اور اتنے بوجھ سے دب جاتی ہے تو اپنی صورت بدل دیتی ہے، میراجی مبہم باتیں کرتے ہیں اس لئے کہ وہ خود سے اچھی باتیں کرسکیں، ایسا نہ ہو کہ یہ ساری کائنات ان کمزوریوں کا مذاق اڑانے لگے۔ میراجی اپنی شخصیت کی کلائیوں کے پکڑنے میں بھی ایک حیرت قائم رکھنا چاہتے ہیں، یہ بڑی بات ہے، ان کے یہاں تضاد بھی اس وقت رونما ہوتا ہے جب وہ خوف اور گھبراہٹ میں اپنی فطرت کو بار بار بدلنے کی کوشش کرتے ہیں وہ اپنی اس کوشش میں کامیاب نہیں ہوتے۔ لیکن بعض وقت انھیں جو اس کا اطمینان

ہوجاتا ہے کہ وہ کچھ کامیاب ہوگئے ہیں۔ یعنی جب وہ اس غلط فہمی میں مبتلا ہوجاتے کہ ان کی فطرت بار بار ان کی کوششوں سے بدل ہی ہے تو وہ تضاد پیدا کرلیتے ہیں اُن کا یہ اطمینان ان کے فن میں تضاد کا باعث بنتا ہے، اسی اطمینان کی وجہ سے وہ خود کو تنہا محسوس کرتے ہیں وہ سب کچھ کرجاتے ہیں جنھیں وہ گردوپیش کے ہنگاموں کو محسوس کرکے کبھی نہیں کرتے۔

میراجی کی اُن بہت ساری نظموں کو جن میں جنس پرستی ہے جنسی سکون حاصل کرنے کے نرالے ڈھنگ ہیں، اور مزے لینے کی باتیں کی گئی ہیں۔ دیکھا جائے تو محسوس ہوگا جیسے میراجی جنسی دنیا میں بھی ایک قیدی تھے اور جنھیں اس خاص دنیا کی بھی سیر کی اجازت نہیں تھی۔ ان کی ایسی نظموں کو پڑھتے ہوئے محسوس ہوتا ہے جیسے شاعر کے لئے جب مادّی زندگی وبالِ جان ہوگئی تو وہ جنس کی دنیا میں چلا گیا، لیکن وہاں بھی وہ قیدی ہوگیا، اسے کڑی سزائیں دی گئیں اور سب سے بڑی سزا یہ ملی کہ وہ جنس کی دنیا کو دیکھتا رہے اور ترستا رہے، لذّت حاصل نہ کرسکے اس کا ردِعمل بھی خطرناک ہوتا ہے، یعنی شاعر ذہنی عیاشی شروع کردیتا ہے، اور اپنی بھوک مٹانے کے لئے ہر تاریک گوشے میں جھانکتا ہے۔ کانا بھینگا سنتا ہے۔ انتہا ہوجاتی ہے کہ تصوّر میں کسی کو دروازہ بند کرتے ہوئے دیکھتا ہے تو اس سے بھی لذّت حاصل کرتا ہے۔ میراجی کی نظم "انتظار" کے چند مصرعے دیکھئے۔

گرم بستر پہ تڑپتا ہوا دل بول اٹھا
بند ہوتے ہوئے دروازے کے جاوے نے مجھے
پھیلتی وسعتِ نمناک میں الجھایا ہے

اس نظم میں میراجی نے بہت سے بند ہوتے ہوئے اور کھلتے ہوئے دروازوں کی باتیں کی ہیں، بعض باتیں تو اخلاق سے کوئی تعلق نہیں رکھتی ہیں۔ مگر بعض باتوں میں زندگی ہے جن کا ذکر میں آگے کروں گا۔ میراجی ایسی گندی باتیں بڑی آزادی سے کرتے ہیں۔ انھیں اپنے پکڑے جانے کا خوف ہے۔ اس لئے وہ ہر ممکن یہ کوشش کرتے ہیں کہ ایسی باتیں وہ لاشعور کی دنیا میں رہ کر کیا کریں، یہی وجہ ہے کہ وہ آزادی کے دلدادہ ہونے کے باوجود شعوری دنیا میں آنا پسند نہیں کرتے، لاشعور کی اُلجھنوں میں گرفتار رہنا چاہتے ہیں اور ان اُلجھنوں سے جو آزادی کا نظریہ پیدا ہوسکتا ہے وہ نظریہ میراجی کے پاس فطری طور پر پیدا ہوگیا ہے۔

میراجی اپنے ایک دیباچے میں لکھتے ہیں "جنسی فعل اور اس کے تعلقات کو میں قدرت کی بڑی نعمت اور زندگی کی سب سے بڑی راحت اور برکت سمجھتا ہوں۔ اور جنس کے گرد جو آلودگی تہذیب و تمدّن نے جمع کردی ہیں مجھے ناگوار گزرتی ہے۔ اس لئے ردِعمل کے طور پر میں دنیا کی ہر بات کو جنس کے اس تصوّر کے آئینے میں دیکھتا ہوں جو فطرت کے عین مطابق ہے اور جو میرا آدرش ہے" پھر بھی میراجی کے اس ماحول پر نظر جب پڑتی ہے جہاں انقلابات ہیں، جہاں غلامی کی زنجیروں کو توڑنے کے ارادے ہیں اور جہاں جنس کی دنیا میں بھی صحت مند خیالات اور افکار ہیں تو یہ سوچنے پر ہم مجبور ہوجاتے ہیں کہ میراجی کا دامن ان سے بچ نہ سکا ہوگا۔ وہ لاکھ ایسی دنیا میں اپنی کائنات بنائے رکھیں یا ایک انوکھا آدرش رکھیں، شعوری یا غیرشعوری طور پر ان سے متاثر ہونا ضروری ہے۔

میراجی کی شاعری میں تین باتیں بالکل صاف طور پر نظر آتی ہیں۔ پہلی بات یہ کہ وہ جنس کے دلدل میں گرکر لت پت ہوگئے ہیں۔ دوسری بات یہ کہ وہ مبہم بات کہنے کے عادی ہیں اور تیسری بات یہ کہ کسی بھی طاقت سے خوف کھاکر لاشعور ہی کی دنیا میں بیٹھ کر ایسی علامتیں Symbols تراشتے ہیں جنھیں وہ خود زیادہ سمجھ سکتے ہیں، کم سے کم ان کی یہ کوشش اس سلسلے میں ضرور ہوتی ہے کہ ان کے اشاروں اور علامتوں کے اندر ان کے علاوہ دوسرا کوئی بھی جھانک نہ سکے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ زندگی کو

ایک دھندلکا سمجھتے ہیں، ایک بھول بھلیاں اور ایک پہیلی سمجھتے ہیں، میراجی کی حد سے بڑھی ہوئی انفرادیت نے اُن کی شاعری کو ڈس لیا ہے۔ اپنی شاعری کے متعلق وہ خود کہتے ہیں "میری نظر میں یہ نظمیں اپنی ہستی کا عریاں انداز ہیں۔ یعنی اپنی شخصیت اور انفرادی ذہانت کا اُجالا ہی اُجالا ہیں، جن کے لئے کسی خالق اُجالے کی ضرورت نہیں۔" اپنی حد سے زیادہ بڑھی ہوئی انفرادیت کی دھندلی روشنی ہی کو وہ اُجالا سمجھتے ہیں، وہ سمجھتے ہیں یہ دھندلی روشنی ہی زندہ رہنے کے لئے بہت ہے، زندگی کی دوسری روشنیوں اور اُجالوں کی کوئی ضرورت نہیں ہے، یہی عنصر اُن کے آرٹ کو بڑی پستیوں میں لے جاتا ہے۔ جہاں شاعر کو خود اس کی اپنی خبر نہیں رہتی ہے اور اپنی شخصیت کی تلاش میں پریشان رہتا ہے، اسے اجتماعیت، سماج اور مادی دنیا سے خوف، گھبراہٹ اور نفرت رہتی ہے۔

"لب جوئبارے"۔ "سنگِ آستاں"۔ "سرسراہٹ"۔ "دھوکا" "دکھ دل کا دارو" اور "افتاد" اُن کی وہ نظمیں ہیں جن میں جنسی بھوک تیز ہے۔ لذت لے کر بہت ساری باتوں کا تفصیلی بیان ہے اور جن میں دنیا کی ہر بات کو جنس کے آئینے میں دیکھنے کی کوشش ہے۔ "سنگِ آستاں" میں دیکھئے۔

پکڑ کر ہاتھ میں پنچھی کو اس دھرتی کے جنگل میں
اسی خلوت کے محمل میں
ترے دل میں
جگا دوں گا میں اپنی گرم آہوں سے
اُسی نغمے کو جو سویا ہے تیرے جسم کے محبوب تاروں میں

"سنگِ آستاں"، "پنچھی" اور "دھرتی کے جنگل" کی علامتیں جن چیزوں کے لئے آئی ہیں وہ میراجی جانیں اس سے اندازہ ہو جائے گا کہ میراجی اس کوشش میں کتنی محنت کرتے تھے کہ سماجی جدوجہد میں رہنے والوں کو ان کی علامتوں کے سمجھنے میں دشواری ہو، وہ نہیں سمجھ سکیں کہ میراجی خود اپنی شخصیت سے کیا گفتگو کر رہے ہیں۔

"دھوکا" میں کہتے ہیں ؎

بڑھے قدم مگر یہ کیا انتہاہ کائنات اک کنواں
نہیں، یہ بھر ہے
انتہاہ کائنات کے خیال کو غلط سمجھ رہے تھے
ہم ستاروں کی مثال سے
مگر جو سلوٹیں کھلیں تو کھلتی ہی چلی گئیں
سہیلیوں کا ذکر کیا، سہیلیوں سے پہلے تھیں
ہر ایک بھید کی خبر ہوئی

"دکھ دل کا دارو" کے چند اشعار دیکھئے ؎

کہ ایک خنجر
اُتار دوں میں چبھا چبھا کر
سفید مرمر سے صلیبیں جسم کی رگوں میں
اور ایک بے بس حسین پیکر
مچل مچل کر تڑپ رہا ہو
مری نگاہوں کے دائرے میں
رگوں سے خوں کی اُبلتی دھاریں
نکل نکل کر پھسل رہی ہوں پھسلتی جائیں
سفید مرمر سے جسم کی چاند رنگ
ڈھلوان سے ہر ایک
بوند گرتی جائے
پھٹی جائے ادھورے بکھرے ہوئے
پریشان لباس کی خشک و تر
تہوں میں!

ان کے مبہم لفظوں کی اچھی مثالیں ان کے علاوہ اور بھی ملتی ہیں۔ "تفاوتِ راہ"۔ "بُعد کی اُڑان"۔ "محبت"۔ "ترقی پسند ادب" اور "برقع" مگر ان نظموں میں وہ گمراہی اور بے مقصد عریانی نہیں ہے جو "لب جوئبارے"، "سنگِ آستاں"، "سرسراہٹ"، "دھوکا" اور "دکھ دل کا دارو" میں ہے۔ یہ ضرور ہے کہ ان میں بعض

نظمیں اتنی مبہم ہیں جنھیں صرف میراجی سمجھتے ہوں گے۔ دوسروں کی سمجھ میں ان لفظوں کی کوئی بات نہیں آسکتی ہے۔ انتہا ہوجاتی ہے جب وہ "پنچمی" اور "سنگِ آستاں" سے مبہم چیزوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ "کالے بھنورے" سے ترقی پسند ادیب بتاتے ہیں۔ "سکھیاں" کی علامت ماضی کے قدیم ادب کے لئے لاتے ہیں اور کاجل کو کوّا کہتے ہیں۔

اِن ساری باتوں کے ہونے کے باوجود میراجی کی شاعری میں کچھ قابلِ قدر عناصر موجود ہیں، یہ کہنا باطل صحیح نہ ہوگا کہ جو قابلِ قدر عناصر ان کی شاعری میں ہیں وہ غیرشعوری طور پر آگئے ہیں۔ یہ ممکن ہے کہ غیرشعور کا ہاتھ اس سلسلے میں زیادہ ہو، لیکن شعور کا بھی ہاتھ ان میں نظر آتا ہے۔ "چل چلاؤ"، "ابوالہول"، "میں ڈوبتا ہوں مسرّت سے"، "بلندیاں"، "اغوا"، "بُعد کی اُڑان"، "کلرک کا نغمۂ محبّت"، "ریل میں" اور "افتاد" ایسی نظمیں ہیں جن میں میراجی کے سماجی ماحول کی دھڑکنیں محسوس ہوتی ہیں۔ اسی طرح اُن کے گیتوں میں "مرے گیت ہردم مرے ساتھ ہوں گے"، "دوگانا"، "لوگ"، "آئی اوشا" اور "جگ میں وقت کی ریت نرالی" ایسے گیت ہیں جن میں زندگی کا نکھار اور زندگی کی کمزوریاں دونوں نظر آتی ہیں۔ ان کی بعض رومانی نظمیں بھی بڑی ستھری اور پاک ہیں۔

اپنی نظم "کلرک کا نغمۂ محبّت" انھوں نے ۱۹۴۱ء میں لکھی تھی۔ اس نظم میں ایک کلرک کی زندگی کی تصویر سامنے آجاتی ہے جو سوچتے سوچتے ساری راتیں کاٹ دیتا ہے۔ صبح منہ دھوکر وہ باسی ڈبل روٹی کا آدھا ٹکڑا کھاتا ہے جو رات کھانے میں بچ گیا تھا۔ اس کا ناشتہ ختم ہوجاتا ہے اور وہ دفتر جاتا ہے۔ پیسوں کی کمی اسے ہر قدم پر محسوس ہوتی ہے۔ سڑکوں پر لوگوں کو موٹروں اور تانگوں میں جاتے ہوئے دیکھ کر وہ بہت کچھ سوچتا ہے۔ اس کا دل رو دیتا ہے، لیکن آنکھوں میں آنسو نہیں آتے ہیں۔ دفتر میں افسر کی حرکتوں سے پریشان رہتا ہے، وہ بار بار سوچتا ہے کاش وہ بھی ایک افسر ہوتا۔ لیکن فوراً ہی وہ ہوش میں آجاتا ہے اور اپنے غنی ہونے کا احساس اسے کہیں دور بھٹکنے سے روکتا ہے۔ میراجی نے یہ بڑی سچّی تصویر پیش کی تھی، ایک کلرک کے ذہن میں جو کشمکش ہوتی رہتی ہے اُس کا بڑا ہی اچھا نقشہ اُتارا ہے۔ یہ نظم اُس زمانے کی بالکل سچّی تصویر ہے، جبکہ ہندوستان اس موڑ پر نہیں پہونچا تھا جہاں وہ آج ہے۔ یعنی عوام میں اتنی بیداری نہیں آئی تھی جو عوام کو آج جو اپنی بیکاری اور فاقے کا شدید احساس ہے اور انھیں دُور کرنے کے لئے جس طرح وہ جدوجہد کررہے ہیں اس وقت ایسی بات نہیں تھی، کلرکوں کا طبقہ خصوصاً بڑا معصوم طبقہ تھا، وہ کلرک اندر سے کھوکھلے تھے۔ لیکن ظاہری طور پر ایسا بنے رہتے تھے جیسے ان کی بنیاد بالکل اُسی طرح مضبوط ہے جس طرح ان کے آفیسروں کی۔ انھیں اپنی کھوکھلی بنیاد کا احساس شدید نہ تھا، لیکن کچھ احساس ضرور تھا، وہ جب کام کرتے کرتے تھک جاتے تھے تو طبیعت بہلانے کے لئے کوٹ کے کالر میں اُسی طرح ایک پھول لگا لیتے تھے جس طرح اُن کے آفیسر لگایا کرتے تھے۔ سگرٹ کو مُنہ میں اسی انداز سے رکھتے تھے جس انداز سے اُن کے آفیسر سگرٹ پیتے تھے، یہ کلرک اُداسی کے لمحوں میں اپنی طبیعت کو سکون دینے کے لئے اداکاری کرنے لگتے تھے، لیکن یہ اداکاری تھوڑے لمحے کی ہوتی تھی اس لئے کہ وہ شدید احساس جو اُن کے منشی ہونے پر ہوا تھا اپنی شدّت بڑھا لیتا تھا اور اپنی کشش سے منشی جی کے اُڑتے ہوئے خیالات کو ذہن پر بُلا لیتا تھا، یہ لمحہ بڑا دل ہلا دینے والا لمحہ تھا، اس تصویر کو دیکھ کر ہنسی تو آجائے گی لیکن دل روئے گا۔ یہ سماج کا بہت بڑا المیہ تھا، میراجی اس المیہ سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکے اور ایک نظم کہہ دی اور اس نظم میں جو تصویر آئی وہ بڑی صاف اور حقیقی تصویر ہے، اس کی صداقت پر شبہہ کوئی نہیں کرسکتا ہے۔

"چل چلاؤ" میں وہ کائنات کی ہر چیز کو انسان کی محنت کا نتیجہ سمجھتے ہیں اور ساری دنیا کا جی بھر کے تماشہ دیکھنا چاہتے ہیں۔ "ابوالہول" میں ماضی کی عظمت کا احترام کرتے ہیں۔ "میں ڈرتا ہوں مسرت سے" ان کی ایک ایسی نظم ہے جس میں وہ مسرت کے ساتھ تلخیاں بھی لذت لینے کو چاہتے ہیں۔ اپنے سماج نے انسان کو تلخیوں کے ساتھ ہمیشہ سے ملا کر رکھا ہے۔ دونوں کو کبھی الگ نہیں کیا ہے۔ اگر دنیا میں صرف مسرت رہے گی تو جینے میں مزا نہیں آئے گا۔ پھر دیوتاؤں اور انسانوں میں فرق کیا رہے گا؟ یہ خواب کی سی زندگی دنیا کے لئے ٹھیک نہیں۔ زندگی کو مسرت بھی ملے۔ لیکن ساتھ ساتھ تلخیاں بھی کچھ ہوں، تاکہ جینے کا مزا ملتا رہے۔ میراجی کو انسانی زندگی سے محبت ہے وہ دیوتاؤں جیسی زندگی کسی لمحہ بسر کرنا نہیں چاہتے۔ "بلندیاں" بھی ایک اچھی نظم ہے۔ جہاں میراجی کو انسانوں کی قوتوں پر بھروسہ ہے، شاید یہاں انسانوں کی طاقت کا ظہور دیکھتا ہے اور انسان کے بڑھتے ہوئے کارواں سے یہی امید رکھتا ہے کہ وہ جذبۂ تعمیر کے ساتھ رات کی تاریکیوں کو پگھلا دے گا۔ "اغوا" اور "بُعد کی اُڑان" اچھی اور ستھری رومانی نظمیں ہیں۔ "افتاد" میں میراجی جہاں اور بہت سے بند ہوتے اور کھلتے ہوئے دروازے دیکھتے ہیں وہاں ہواؤں کے اُن دروازوں پر بھی اُن کی نگاہیں جاتی ہیں جو برابر بند ہوتے رہے ہیں، اور کھلتے رہے ہیں۔ حیات کے ایک تاریک گوشے کی طرف بڑے لطیف انداز میں اشارہ کرتے ہوئے بڑھ گئے ہیں، اس اشارے میں طنز ہے، اور تلخیوں کا بھرپور احساس ہے۔ اُن کے گیتوں میں "جگ میں وقت کی ریت نرالی" کا ایک بند دیکھئے۔

جگ میں وقت کی ریت نرالی — جیسے چلے پون متوالی
جیسے جھونکے ڈالی ڈالی — جیسے ساگر کی لہروں پر تانڈو
چکھ کے کھائے — دل کو نئی بات بھر مائے

"آئی اوشا" میں کہتے ہیں ؎

گیا اندھیرا
نیا سویرا
جگ پر چھائے، نیا روپ بھر مائے
ڈال ڈال پر پنچھی بولے
سب نے گھر کے دوارے کھولے
روپ کے رس کو پی کر ڈولے
چھوڑ آرام کو
چلے کام کو
نگر کام کو
پل میں جگاتی آئی ہے
آئی اوشا
لائی اوشا
نُور کے موتی، جیون جیوتی لائی ہے!

میراجی کے یہاں انسان دوستی اور انسانی حفاظت کا مکمل اعتراف نہیں ملے گا، اُن کے یہاں زندگی کی بھرپور طاقت سے محبت کی تصویر نہیں ملے گی، اُن کے یہاں آزادی کا جو تصور ملے گا۔ وہ سماجی یا اجتماعی آزادی کا جذبہ نہیں ہوگا، بلکہ ایک خطرناک قسم کی آزادی ملے گی، یہ انفرادی آزادی Self-destruction کے لبادے میں نہیں ہوگی، غیر شعوری طور پر اس کا لباس Self-destruction کے علاوہ دوسرا نہیں ہوگا۔ میراجی کا شعور دھندلکوں میں لپٹا ہوا تھا، جہاں سورج کی کرنیں نہیں پہنچ سکی تھیں، البتہ کچھ کرنوں کی چھائیاں پڑگئی تھیں وہ اس سماج کے خلاف بغاوت نہیں کرسکتے تھے۔ جس میں ان کی انفرادی آزادی کچلی جارہی تھی اس لئے کہ انھیں اپنی فطرت کی حماقتوں کا احساس تھا۔ وہ جو کچھ کہنا چاہتے تھے انھیں دبی دبی زبان میں کہنا چاہتے تھے۔ انھیں سماجی قوانین سے ڈر تھا۔ یہ کہنا غلط ہوگا کہ میراجی عوام کو اپنی گندی

نظروں سے جنسی طور پر اس لئے اُبھارنا چاہتے تھے کہ وہ برسرِاقتدار طبقوں کو خوش رکھ سکیں، یہ بڑی تنگ نظری بھی ہوگی اور انتہا پسندی بھی ہوگی۔ میراجی کبھی حرکت وعمل کو رد نہیں کرتے۔ اس کی موافقت نہیں کرتے تو مخالفت بھی نہیں کرتے، وہ بدلتی ہوئی قدروں اور مادی دنیا کی حقیقت سے انکار نہیں کرتے، وہ کبھی زندگی کو ٹوٹا ہوا درخت نہیں بتاتے، وہ کبھی عوام کو جاہل اور ڈرپوک نہیں کہتے اور وہ کبھی موت کی آرزو نہیں کرتے۔ انھیں "ڈیوگاگ" بھی نہیں کہا جاسکتا ہے۔ وہ ایک Cynic ضرور ہیں، لیکن ان کی کلبیت Cynicism کا مظاہرہ کھُل کر نہیں ہوتا ہے۔ وہ اپنی کلبیت کو چھپانا چاہتے ہیں بالکل اسی طرح جس طرح تپ دق کا وہ مریض جو تنہائی میں خون اُگلتا ہے۔ لیکن لوگوں کے سامنے اس کی کوشش کرتا ہے کہ لوگ اس کے مرض کو نہ جان سکیں۔ میراجی ایک غیر ذمہ دار شاعر ہیں جن کے پہلو خوبصورت ہیئت بھی ہے۔ لیکن وہ اپنی ذمہ داری سے گھبراتے نہیں، اور اپنے ماحول میں اپنی گہری دلچسپی کا بہانہ بنانے لگتے ہیں۔ ان کی آرزوؤں کا پھیلاؤ اپنی وسعت کے لحاظ سے بیکراں ہے۔ لیکن سماجی قوانین سے ڈر کر لاشعوری کے اندھیرے کمرے میں وہ آرزوئیں پھیل کر رہ جاتی ہیں۔ میراجی کو اس اندھیرے کمرے میں سکون ملتا ہے وہ لذت حاصل کرتے ہیں، وہ اس Defence Mechanism دفاعی مکانیت سے مطمئن ہوتے ہیں اسی مقام پر وہ اپنے آپ کو تلاش کرنے کے بدلے خود کو زبردست دھوکا اور فریب دینے لگتے ہیں۔ ان کے آرٹ میں یہ خود فریبی بہت نمایاں ہے جو ان کے فن کو پستیوں میں بے اختیار لے جاتی ہے۔ میراجی کو اپنے سماجی ماحول کے حالات کا شدید احساس نہ تھا، یہی شدت شاعر کو شاعر بناتی ہے اور اسی شدت سے فنکار حیات کو سنوارنے کا عزم کرتا ہے۔ میراجی کے پاس نہ تو یہ شدت ہے اور نہ ان کے پاس کوئی رچا اور نکھرا ہوا شعور ہے، ان کا شعور اس دھوئیں سے لپٹا ہوا ہے جو ان کے غیر شعور میں دبی ہوئی اُمنگوں سے بُری طرح اُٹھ رہا ہے۔

میراجی کے پاس اگر یہ دھندلکے نہ ہوتے تو اردو کو ایک بڑا ہی اہم شاعر مل جاتا۔ ان کا فن نکھر نہیں سکا، اس میں اُن کے انفرادی ماحول کا قصور زیادہ ہے اور اُن کا قصور کم ہے۔ انھوں نے جو کچھ کیا وہ بہت کم سہی، لیکن وہ اپنے انفرادی ماحول کے ہاتھوں چونکہ بُری طرح برباد ہو چکے تھے، اس لئے یہی بہت ہے۔

آم کی گٹھلی سے نشاستہ

بھارت میں آم کی گٹھلیوں کو عام طور پر بے فائدہ سمجھ کر پھینک دیا جاتا ہے۔ دیہات میں یہ گٹھلیاں بڑی تعداد میں اکٹھی کی جا سکتی ہیں۔ تجربوں سے ثابت ہوا ہے کہ آم کی گٹھلی کے اجزاء میں نشاستہ کی مقدار ۶۵ سے ۷۰ فیصدی تک ہوتی ہے۔ آم کی گٹھلی سے نشاستہ کی اس مقدار کو الگ کر کے نہ صرف بطور خوراک بلکہ مختلف صنعتی مقاصد کے لئے بھی استعمال کیا جا سکتا ہے۔ اس کا عمل یہ ہے کہ آم کی گٹھلیوں کو پیس کر پانی میں بھگو دیا جاتا ہے پھر اس پانی کو کسی باریک کپڑے میں سے چھان لیا جاتا ہے۔ دودھیا پانی میں کچھ کیمیائی اشیا ملا کر اسے آبخ دی جاتی ہے پھر اسی پانی کو نتھار کر تلچھٹ میں پڑا شیم پریسپیٹیٹ ملایا جاتا ہے اور بعد ازاں کیمیائی مدد سے اس کے رنگ کو کاٹ دیا جاتا ہے۔ پھر اسے کثافتوں سے پاک کر کے خشک کر لیا جاتا ہے۔

مرکزی ٹریکٹر آرگنائزیشن

کا عظیم کارنامہ

گزشتہ پانچ سال میں بھارت کی مزید دس لاکھ ایکڑ زمین کو کانس سے صاف کرکے قابل کاشت بنایا جا چکا ہے اور اس میں سے بہت سی زمین اس وقت مختلف فصلوں کے زیر کاشت ہے۔ اس مہم کی کامیابی کا سہرا مرکزی ٹریکٹر آرگنائزیشن پر ہے۔ بیلوں یا پرانے زرعی اوزاروں کی مدد سے اس کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچانا ناممکن تھا۔

مرکزی ٹریکٹر آرگنائزیشن نے ۱۹۴۷-۴۸ء میں فوجی اسٹاک سے خرید کردہ ایک سو پرانے ٹریکٹروں کی مدد سے اس کارِ عظیم کا آغاز کیا۔ شروع شروع میں انہیں ٹریکٹروں کی مدد سے کام جاری رکھا گیا لیکن ۱۹۵۰-۵۱ء میں ان میں سے کچھ ٹریکٹر بالکل ناکارہ ہو گئے اور انہیں بدلنا پڑا۔ ۱۹۴۹-۵۰ء اور ۱۹۵۰-۵۱ء میں بھاری قسم کے ۲۴۰ نئے ٹریکٹر اس کام پر لگائے گئے۔ ان میں سے ۳۰ ٹریکٹر اس وقت جنگل صاف کرنے کے لئے استعمال کئے جا رہے ہیں۔ یہ ٹریکٹر جب حرکت میں آتے ہیں تو ان کے بازو درختوں کو کاٹتے چلے جاتے ہیں۔ اس قسم کے پندرہ ٹریکٹر ایک دن میں ۴۰ ایکڑ رقبہ زمین کو جنگلوں سے صاف کر سکتے ہیں۔ اب تک کل ۳۷ ہزار ایکڑ رقبہ زمین کو جنگلوں سے صاف کیا جا چکا ہے مرکزی ٹریکٹر آرگنائزیشن نے اس سلسلے میں ضروری سامان خریدنے پر ۷½ کروڑ روپے صرف کئے ہیں اور اب دوسرے مصارف کی صورت میں ۲½ کروڑ روپے سالانہ خرچ کئے جا رہے ہیں۔

بھوپال میں ٹریکٹر چلانے کے ایک سال بعد ہی متعلقہ رقبے میں گندم کی فی ایکڑ پیداوار میں تین چار گنا اضافہ ہو گیا۔ مرکزی ٹریکٹر آرگنائزیشن کے بڑے ٹریکٹروں کی مدد سے ۲۸ انچ کی گہرائی تک زمین میں ہل چلانا ممکن ہے جبکہ ایک عام ٹریکٹر زمین میں ۱۴ انچ سے زیادہ کی گہرائی تک نہیں پہنچ سکتا۔ مرکزی آرگنائزیشن ان ٹریکٹروں کا کرایہ نفع نہ نقصان کی بنا پر وصول کرتی ہے۔ اور یہ کرایہ تقریباً ۶۰ روپے فی ایکڑ بیٹھتا ہے۔ متعلقہ ریاستی سرکار یہ رقم پانچ قسطوں میں مرکزی سرکار کو ادا کرتی ہے۔ اس طرح جن کاشتکاروں کی زمینوں کو قابل کاشت بنایا جاتا ہے وہ انفرادی طور پر یہ رقم ریاستی حکومت کو ادا کرتے ہیں۔

اس امر کا دعوےٰ کیا گیا ہے کہ مرکزی ٹریکٹر آرگنائزیشن کی سرگرمیوں کے نتیجے کے طور پر جن وسیع رقبوں کو زیر کاشت لایا گیا ہے ان سے اناج کی پیداوار میں پانچ لاکھ ٹن کا اضافہ ہوا ہے۔ اس رقبے کو کانس سے صاف کرنے کے نتیجے کے طور پر نہ صرف یہ زمین قابل کاشت بن گئی ہے بلکہ آس پاس کی زمینیں بھی کانس کے پھیلنے کے خطرے سے محفوظ ہو گئی ہیں۔

مرکزی ٹریکٹر آرگنائزیشن عام طور پر چند شرطوں کی تکمیل کی صورت میں ہی کسی زمین کو قابل کاشت بنانے کی ذمہ داری قبول کرتی ہے۔ یہ شرائط ان امور سے متعلق ہیں کہ جن بنجر زمینوں کو قابل کاشت بنایا جائے گا کیا ان کے

لئے آبپاشی کی سہولتیں بہتر ہیں اور ان میں فصلوں کی کاشت کے لئے دیہاتی حکومت نے کیا انتظامات کئے ہیں۔ کسی زمین پر ٹریکٹر چلانے کا فیصلہ کرنے میں اس زمین کے رقبے کا بھی خیال رکھا جاتا ہے۔ ٹریکٹر آٹھ آٹھ گھنٹے کی شفٹوں میں چلائے جاتے اور بعض اوقات یہ عمل دس سے لے کر بیس گھنٹے تک جاری رہتا ہے۔ رات کے وقت بھی ٹریکٹروں کے ذریعے سے ہل چلایا جاتا ہے۔

اتر پردیش میں علاقہ ترائی کا حلیہ ہی بدل گیا ہے۔ ۳۷ ہزار ایکڑ رقبہ زمین کو جنگلوں سے صاف کیا جا چکا ہے اور اس میں سے ۳۱ ہزار ایکڑ رقبہ زمین میں فصلیں بوئی جا چکی ہیں۔ ٹریکٹروں کے ذریعے سے زمین کو صاف کرنے کا کام عام طور پر یکم اکتوبر سے یکم جون تک کیا جاتا ہے۔ سال کے باقی مہینوں میں عملے کے ارکان مشینوں کی مرمت وغیرہ کرنے میں مصروف رہتے ہیں۔ بعض اوقات مرمت کے سلسلے میں کئی پرزے فوری طور پر بذریعہ ہوائی جہاز غیر ملکوں سے منگوائے جاتے ہیں تاکہ نئے سال کے کام کے آغاز میں تاخیر واقع نہ ہو۔

مرکزی ٹریکٹر آرگنائزیشن کے دو ورکشاپ ہیں۔ ایک دہلی میں اور دوسرا ہیرا گڑھ بھوپال میں۔ آرگنائزیشن نے ٹریکٹروں کے کچھ پرزے بھارت میں تیار کرنے کے انتظامات بھی کئے ہیں ایک ٹریکٹر کے مختلف پرزوں کی تعداد ۲½ ہزار سے تین ہزار تک ہوتی ہے۔ ایک خاص قسم کا مشینی ہل بھی استعمال کیا جاتا ہے جس کے مختلف پرزوں کی تعداد ۲۵۰ ہوتی ہے۔ ان میں سے بہت سے پرزے دہلی میں تیار کئے جا رہے ہیں۔

مرکزی ٹریکٹر آرگنائزیشن کی سرگرمیاں بنجر زمینوں کو قابل کاشت بنانے اور جنگلوں کی کٹائی تک ہی محدود نہیں بلکہ یہ متعلقہ علاقے کے دیہاتی لوگوں کے لئے اور بھی کئی طریقوں سے مفید ثابت ہو رہی ہیں۔ مختلف علاقوں تک پہنچنے کے لئے جو چھوٹی چھوٹی سڑکیں تعمیر کی گئی ہیں ان کی مجموعی لمبائی پچاس ہزار میل تک پہنچتی ہے۔ علاوہ ازیں کئی مقامات پر آبپاشی کی سہولتیں مہیا کرنے کے لئے تالاب کھودے گئے ہیں اور بند تعمیر کئے گئے ہیں۔ ان تالابوں میں جمع شدہ پانی نہ صرف آبپاشی بلکہ مویشیوں کو نہلانے اور ان کے پینے کے کام بھی آتا ہے۔

مرکزی ٹریکٹر آرگنائزیشن کے تمام ٹریکٹروں کو پندرہ یونٹوں میں تقسیم کیا گیا ہے اور ہر یونٹ ایک دن میں دس ہزار گیلن ڈیزل آئل استعمال کرتا ہے۔ دو یونٹوں کا انچارج ایک اسسٹنٹ انجینیر کو مقرر کیا جاتا ہے۔ عملے کے ارکان زیادہ تر سابق فوجیوں اور خانماں برباد لوگوں میں سے بھرتی کئے گئے ہیں۔ یہ بڑا مشکل کام ہے اور خاص کر گرمیوں میں جبکہ ٹریکٹروں میں درجہ حرارت ۱۲۰ ڈگری سے بھی زیادہ ہوتا ہے لیکن ان پر کام کرنے والے اشخاص نے بڑی اہلیت کا ثبوت دیا ہے۔

اگرچہ اب تک دس لاکھ ایکڑ رقبہ زمین کو قابل کاشت بنایا جا چکا ہے لیکن مرکزی ٹریکٹر آرگنائزیشن کا مطمح نظر بھوپال مدھیہ پردیش، مدھیہ بھارت اور اتر پردیش کے علاقوں میں سات سال کے عرصے میں ۳۰ لاکھ ایکڑ رقبے کی بنجر زمینوں کو قابل کاشت بنانا ہے۔ مرکزی ٹریکٹر آرگنائزیشن کی یہ قابل قدر سرگرمیاں اس امر کا واضح ثبوت ہیں کہ ملک غذائی طور پر خود کفیل ہونے کی منزل کی طرف گامزن ہے۔

"آج کل" کا خطوط نمبر

مفصل اعلان اگلے شمارے میں ملاحظہ فرمائیے

(اداره)

فضا ابن فیضی

اے دوست

یہی لے دے کے ہے بس عمر کا حاصل اے دوست!
کون رہتا ہے تری یاد سے غافل اے دوست

تپشِ سوزِ دروں مجھ سے ہے یوں گرمِ سلوک
جیسے بجلی ہو کوئی متصلِ دل اے دوست

وقت کے جبر پہ دل خون ہوا جاتا ہے
مسکرانا بھی ہے فریاد میں داخل اے دوست

کب گوارا مجھے ہوتا غمِ دنیا، لیکن
کچھ تو امرت بھی ہے اس زہر میں شامل اے دوست

آج تک کھائی نہ پندارِ تجلّی نے شکست
کتنی راتیں ہوئیں سورج کے مقابل اے دوست

وہم کے پاس کہاں علم و بصیرت کی کرن
روشنی بن نہ سکی سائے کی منزل اے دوست

رات کرتی رہی سورج کی صداقت سے گریز
صبح بنتی رہی آئینۂ محفل اے دوست

بحرِ ہستی کا نہیں کوئی کنارا محفوظ
آتشیں موج سے لَو دیتے ہیں ساحل اے دوست

کتنی تاریک ہے یہ آج کی "روشن دنیا"
کوئی دل بھی نہیں آئینہ شمائل اے دوست

ایک اِک پھول ہے انگارے کا نکھرا ہوا روپ
ایک اِک شاخ ہے تصویرِ سلاسل اے دوست

آہ جنّت کے نکالے ہوئے جائیں گے کہاں
اب تو دنیا بھی نہیں رہنے کے قابل اے دوست

غم کو سینے سے لگائے ہوئے ہنستے رہے پھول
کر سکے ضبطِ فغاں بھی نہ عنادل اے دوست

تجھ سے چھٹتے ہی فنا ہو گئے آثارِ حیات
اب تو سینے میں دھڑکتا بھی نہیں دل اے دوست

پڑھ کے اشکوں کے اُتر بھی گئے دریا کتنے
وہی طوفاں ہیں مگر راہ میں حائل اے دوست

دل کے ہمراہ گئی تیرے فضا کی راحت
اب کوئی بات نہیں کر کے قابل اے دوست

احساسِ کمتری کا ایک رُخ — جھینپ

ہم ایسے کتنے ہی آدمیوں کو جانتے ہیں جن کا مجمعوں میں بھی لگتا ہے۔ جو دو چار آدمیوں کی موجودگی ہی میں اپنے کو زندہ اور جاندار محسوس کرتے ہیں۔ گاڑی پر، پارک میں، جلسوں میں، کارخانوں کے اندر۔ یہ اپنے قریب والوں سے باتیں کرنے لگتے ہیں، اور دعوتوں، جلسوں میں یا اور اسی طرح کی دوسری جگہوں پر بڑے شوق سے جاتے ہیں اور اجنبیوں سے جان پہچان پیدا کرکے بے تکلف ہوجانے کا ملکہ رکھتے ہیں، اس مزاج کے لوگوں کو ہم آسانی کے لئے خارجی کہے لیتے ہیں۔ ان میں جھینپ نہیں ہوتی۔

دوسری طرح کے وہ لوگ ہیں جو طبعاً خاموش اور سنجیدہ ہوتے ہیں۔ تنہائی انھیں ناگوار نہیں ہوتی اور اپنے دوستوں اور جاننے والوں کے مخصوص حلقے کے باہر وہ بے تکلف نہیں ہوتے۔ انھیں کسی ایک یا متعدد چیزوں سے گہرا شغف ضرور ہوتا ہے اور اگرچہ زیادہ تر ایسے ہی لوگ انسانیت کی ترقی اور خدمت میں حصہ لیتے ہیں لیکن سماج کی گہما گہمی سے یہ لوگ الگ رہتے ہیں۔ یہ لوگ ہم سفر اجنبیوں پر سوالات کی بھرمار نہیں کرتے۔ سارے جہان کا درد اپنے جگر میں نہیں رکھتے، اور دنیا کے ہر معاملے میں دخیل نہیں ہوتے، مضراب کی گنگناہٹ میں کھوئے ہوئے لمحے، کتب خانوں میں گزارے ہوئے گھنٹے، برش اور رنگوں کی تنہائی کے مشغلے، انھیں پارٹیوں کے چبھتے ہوئے نشتروں، سوسائٹی کی عورتوں کے چرچوں اور افسروں کے تذکروں یا معاصروں سے کہیں زیادہ مزہ دیتے ہیں۔ اس قسم کے آدمیوں کو ہم داخلی کہے لیتے ہیں اور اسی طرح کا مزاج رکھنے والوں میں جھینپنے والے زیادہ ہوتے ہیں۔

داخلی مزاج والے اگر اپنی جھینپ کا علاج یہ سمجھتے ہیں کہ وہ ایسے مشاغل اختیار کرلیں جن کے لئے وہ طبعاً ناموزوں ہیں۔ مثلاً کوئی صاحب جنھیں گھر کی چار دیواری یا دریا کے سنسان کنارے شام گزارنا زیادہ پسند ہے کسی کلب میں نام لکھالیں کہ وہاں لوگوں سے ملنے جلنے پر مجبور ہوکر وہ اپنی جھینپ مٹا سکیں گے۔ ایسے لوگ بڑی غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔ فرائض کے ادا کرنے کے علاوہ کسی ناپسندیدہ کام پر اپنی طبیعت کو مجبور کرنا بڑی بھاری نفسیاتی غلطی ہے، اور جب تفریح کے لمحوں کا سوال ہو، زندگی کے اُن پُرسکون لمحوں کا جب آدمی دفتر کی گھس گھس یا تجارت کی زحمتوں سے آزاد ہوکر لطف اُٹھانا چاہتا ہے اور اس لطف میں دن بھر کی تھکن اور ناخوشگواریاں غرق کردینے کا آرزومند ہوتا ہے تو اسے اپنی طبیعت کو مجبور ہرگز نہیں کرنا چاہیئے۔ ہر انسان کا ایک معیار ہوتا ہے، ایک مزاج ہوتا ہے، اور اس کی تفریح ایسے ہی ماحول میں ہوسکتی ہے، جس میں اس کے مزاج کی تسکین ہو، اس کی روح کو دلچسپی اور اس کے ذوق کو آسودگی ملے۔ جھینپ مٹنے کے یہ معنی کسی طرح نہیں سمجھنا چاہئیں کہ آدمی ہر محفل کی روحِ رواں بن جائے اور ہر مجمع میں اس کی کمی محسوس کی جانے لگے۔

ہر داخلی آدمی جھینپو نہیں ہوتا، پھولوں کی کیاریوں

کو گوارتے ہوئے یا کسی کتاب کے ساتھ ایک داخلی مزاج کا آدمی ویسا ہی خوش اور مسرور رہ سکتا ہے، جیسے چائے کی بھری میز پر بیٹھا ہوا کوئی خارجی طرز طبیعت کا آدمی، اور ضروری نہیں کہ اوّل الذکر کی یہ تنہائی پسندی جھینپ کہلائے۔ مطالعے میں اپنے اوقات گزارنے والا پروفیسر اگر کسی مجمع میں تقریر کرنے سے نہیں ہچکچاتا، کسی اجنبی سے ملنے کی ضرورت سمجھنے کے بعد اس سے مخاطب ہونے میں پس و پیش نہیں کرتا۔ لوگوں کی نگاہیں اپنی طرف مرکوز دیکھ کر نہیں جھجکتا۔ بلکہ اپنی عادت کے مطابق روانی سے باتیں کرتا رہتا ہے تو اسے جھینپو نہیں کہا جا سکتا۔

آدمی کی جھینپ کا پتہ دوسروں سے اس کے برتاؤ اور ملنے جلنے کے انداز سے لگایا جا سکتا ہے۔ لوگوں کے درمیان اگر وہ اطمینان سے بیٹھتا ہے، رسمی میل جول آسانی سے بڑھا لیتا ہے اور لوگوں کی صحبت سے وحشت نہیں کھاتا تو اُسے اپنے کو مجبور کر کے کلبوں اور پارٹیوں میں لازمی طور پر شرکت نہیں کرنا چاہیئے، اسے اپنے مخصوص مزاج کے اعتبار سے اسی طرح رہنا چاہیئے جس میں اس کا دل لگے، اس کی دلچسپی ہو اور اس کا ذوق تسکین پائے۔ وہ جھینپو نہیں ہے۔ داخلی مزاج والے کی عادتیں اور خواہشیں جب تک اعتدال پر رہیں اس کے لئے اپنے کو اپنی طبیعت کے خلاف خارجی قسم کا بنانے کی کوشش نامناسب بھی ہوگی اور احمقانہ بھی۔

لوگوں کی صحبت سے وحشت کھانے، ان سے گریز کرنے کی خواہش ایک طرح کے ڈر کی پیداوار ہے۔ اس لئے اگر ہمارا مزاج داخلی ہے تو ہمیں اپنے کو اچھی طرح جانچ لینا چاہیئے کہ یہ گریز، یہ لوگوں سے الگ رہنے کی خواہش صرف افتاد طبیعت ہی کے لحاظ سے ہے کہیں ایسا تو نہیں کہ ہم اپنے کو دھوکا دیتے ہوں اور ابتدائی زندگی میں ہم لوگوں سے میل جول میں ایسے تلخ تجربے اُٹھا چکے ہوں جنھوں نے ہم کو ذہنی طور پر اُن سے پرہیز کرنا سکھا دیا ہو یا کسی ناخوشگوار واقعے سے اثر لے کر ہم نے یہ رائے قائم کر لی ہو کہ دنیا ہم کو پسند نہیں کرتی اور ہم بھی دنیا سے نفرت کرتے ہیں۔

حقیقت ہمیشہ تلخ ہوتی ہے۔ جو لوگ جھینپو اور شرمیلے ہوتے ہیں وہ یہ تسلیم کرتے ہوئے ہمیشہ گھبراتے ہیں کہ گوشہ نشینی سے وہ غیر مطمئن اور اندوہگیں ہیں۔ ان کی زندگی میں اس تنہائی کی وجہ سے بےکیفی، یاس اور بےرنگی آگئی ہے، وہ اپنے کو یہ فریب دینے کی کوشش کرتے ہیں کہ وہ

ہیچ آفت نہ رسد گوشۂ تنہائی را

کے زریں اصول پر بڑی خوشی سے کاربند ہیں اور یہ عزلت گزینی اُن کے لئے مفید، دلکش اور باعث مسرت ہے۔

ایسا نہیں ہے کہ جھینپے والے دنیا میں کسی سے ملنا ہی نہیں چاہتے۔ دو چار اُن کے بھی عزیز اور دوست ایسے ہوتے ہیں جن کے ساتھ وہ بڑی اچھی طرح وقت گزارتے ہیں اور ایسے لوگوں کے حلقے میں بیٹھا دیکھ کر کوئی اُن کے متعلق یہ سوچ بھی نہیں سکتا کہ یہ کسی دوسری جگہ جھینپتے ہوں گے۔ وہ گانے گاتے ہیں، قہقہے لگاتے ہیں۔ چٹکلے کہتے ہیں۔ نقلیں اُتارتے ہیں لیکن اُن کی جھینپ کا اندازہ کرنا ہو تو کسی اجنبی کو اُن کے درمیان بٹھا دیجئے۔ ان کے مذاق رُک جائیں گے۔ چٹکلے سرگوشیوں سے اور قہقہے خاموشیوں سے بدل جائیں گے، اور وہ کوئی نہ کوئی بہانہ تراش کر وہاں سے ٹل جانے کی کوشش کریں گے، اور اگر یہ ممکن نہ ہو سکا تو گھبرائیں گے۔ کسمسائیں گے۔ دہان کھولتے ہوئے جھجکیں گے اور کم سے کم الفاظ میں اپنا مطلب ادا کر کے خاموش ہو جائیں گے۔

لوگوں سے گریز، ملنے والوں کی کمی آدمی میں احساس کمتری بڑھا دیتے ہیں۔ وہ اپنے کو زیادہ اہمیت دینے لگتا ہے۔ ہر وقت ہر جگہ وہ یہ سوچتا ہے کہ لوگ اسی کو دیکھ

رہے ہیں۔ اس کی ٹائی کی گرہ کہیں ڈھیلی تو نہیں ؟ اس کی آنکھوں کا سُرمہ کہیں پھیلا تو نہیں ؟ اس کی فراک کہیں سمٹی تو نہیں ؟ باتیں کرنے میں اُس کا منھ کہیں زیادہ تو نہیں کُھلتا ؟ چپل سے نکلے ہوئے اس کے پیر بھدے تو نہیں لگتے ؟ لوگوں کے درمیان بیٹھ کر وہ اُن کی گفتگو سے پوری طرح لطفاندوز ہونے کے بجائے اپنے متعلق سوچتا رہتا ہے۔ ملنے جُلنے کی اسی کمی سے اس کے خیالات میں توازن نہیں رہتا۔ وہ چھوٹی چھوٹی باتوں کو بڑی اہمیت دینے لگتا ہے، اور ذرا ذرا سی بات میں اپنی توہین اور ذلّت کے ایسے پہلو سوچ لیتا ہے جن کا کہنے والے کو گمان بھی نہیں ہوتا۔

ان کی شخصیت پر سماجی میل جول سے اپنے کو الگ رکھنے کا اثر ضرور پڑتا ہے اور جب یہ علیحدگی اپنے فطری رجحان کے بجائے لوگوں سے گھبرانے کی وجہ سے ہو تو اور بھی نقصان دہ ہوتی ہے۔ ایسی صورت میں انسان کے اندر ہمیشہ لوگوں سے میل جول بڑھانے کی فطری طلب اور ان کی صحبت سے پرہیز کرنے کی متضاد خواہشوں میں برابر کشمکش جاری رہتی ہے، جس سے وقتی سکون پانے کے لئے آدمی یہ سوچ لیتا ہے کہ شاید ہم بنے ہی دوسری طرح سے ہیں۔ ہم عام لوگوں سے مختلف ہیں اور یہ سوچ کر وہ اپنے کو تسکین دے لیتا ہے۔

ایک لڑکی کو میں جانتا ہوں جو بہت اچھا گاتی ہے۔ ایسی تین لڑکیوں کے مجمعے میں جن کے متعلق وہ یہ عرصے سے جانتی تھی کہ ان کے گلوں میں نام کو بھی سُر نہیں ہے، جب اُس سے گانے کو کہا گیا تو اُس کے ہاتھ پیر سرد ہونے لگے۔ اور کافی دیر بعد جب اُس نے گانا سنانے کی ہمت کی تو اس کی آواز تھرتھرا رہی تھی، یہ لڑکیاں اس کے لئے اجنبی نہیں تھیں، بلکہ گھنٹوں ساتھ بیٹھ کر سب باتیں اور ہنسی مذاق کیا کرتی تھیں۔ میرے پوچھنے پر اُس نے کہا "میں جانتی ہوں کہ یہ لڑکیاں مجھ سے بہت خراب گاتی ہیں، یہ بھی جانتی ہوں کہ میرا گانا اچھا خاصا ہوتا ہے۔ لیکن پھر بھی معلوم نہیں کیوں میری ایسی حالت ہوگئی"

اسی طرح ایک اور صاحبہ نے یہ بیان کیا "میں ٹھنڈے دل سے سوچتی ہوں اور اپنے کو قائل کرنے کی کوشش کرتی ہوں کہ جن لوگوں سے میں ملتی ہوں اُن میں کوئی ایسی بات نہیں ہوتی کہ میں گھبرا جاؤں۔ جانتی ہوں کہ میں بھدّے یا کُند ذہن بھی نہیں اور عقل یہی کہتی ہے کہ مجھے لوگوں کے درمیان گھبرانے کی کوئی وجہ نہیں ہونا چاہیئے۔ لیکن پھر بھی مجھے لوگوں سے ملنا جلنا سخت ناپسند ہے اور بات چیت میں حصّہ لینا ناگوار گزرتا ہے۔ میرا جی چاہتا ہے کہ دس پانچ آدمی جہاں بیٹھے ہوئے دلچسپ باتیں کرتے ہوں وہاں میں بھی انھیں میں شامل بیٹھی رہوں۔ اسی طرح کہ کوئی مجھ پر غور نہ کرے ورنہ پھر وہاں سے بھاگ آنے کو جی چاہتا ہے۔ اگر لوگ باتیں کرتے کرتے رُک جاتے ہیں تو میرا حلق خشک ہونے لگتا ہے اور الفاظ بمشکل نکل پاتے ہیں۔ حالانکہ اس کی کوئی وجہ نہیں۔ سوچتی ہوں کہ میں اور لوگوں سے مختلف ہوں ہی۔

دنیا میں ہر بات، ہر برتاؤ، ہر حرکت کی، خواہ وہ کتنی ہی بے تُکی کیوں نہ ہو، کوئی نہ کوئی وجہ ضرور ہوتی ہے اور آدمی اگر اپنے اِس تک، اِس برتاؤ کی وجہ سمجھنا سیکھ جائے تو آدھے سے زیادہ مرحلہ سر سمجھنا چاہیئے۔ اپنی جھینپ کی اصل وجہ سمجھ میں آجانے کے بعد اُسے مٹانے کی طرف قدم بڑھانا بہت آسان ہوجاتا ہے، اور خودشناسی کی اس پہلی ہی منزل پر پہنچنے کے بعد کامیابی کے شادیانوں کی ہلکی ہلکی دھمک سنائی دینے لگتی ہے۔

اگر آپ جھینپتے ہیں، نئی جگہوں اور نئے آدمیوں سے غیر معمولی جھجک رکھتے ہیں تو آپ کو حقیقت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر واقعات کا سامنا کرنا چاہیئے۔ آپ کو تسلیم کرلینا چاہیئے کہ آپ اس طرح دنیا سے الگ الگ رہ کر

رنجیدہ ہیں ۔ تنہائی آپ کے لئے ناخوشگوار ہے ۔ آپ دوست چاہتے ہیں ، ملنے والے چاہتے ہیں ، ہنسی مذاق کرنے والوں کے خواہشمند ہیں ، اور لوگوں سے ملنا جلنا پسند کرتے ہیں ، اپنے کو یہ نہ سوچنے دیجئے کہ آپ کی یہ تنہائی ، یہ بےکیفی ۔ آپ کی زندگی کے ساتھ ہمیشہ کے لئے چپٹ گئی ہے ، زندگی میں اس بے آب و رنگ کیفیت کا رکھنا نہ رکھنا صرف آپ پر منحصر ہے ۔

جھینپ مٹانے کے لئے دو چیزیں لازمی ہیں ۔

(۱) آپ لوگوں کے ساتھ رہنے ، اُن سے ملنے جلنے کی فطری خواہش نہ دبائیں ۔

(۲) بے مروّتی کی حد تک سخت ذہنی ایمان داری ، تاکہ آپ ان قوتوں کو سمجھ سکیں جنھوں نے غیر محسوس طور پر آپ کو جھینپو بنا دیا ہے ۔

بچّوں کے فالج کا علاج

نئی دہلی کے اروِن ہسپتال میں کولمبو پلان کے تحت برطانیہ کی امداد سے جو آرتھو پیڈک یونٹ بچّوں کے جسمانی نقائص کے علاج کا یونٹ) قائم ہے اس کے بہت سے علاج معالجوں میں سے ایک علاج بارہ سال کی عمر کے ایک لڑکے سوہن سنگھ کا ہو رہا ہے ۔ یہ لڑکا دو سال کی عمر میں فالج بچگان کا شکار ہو گیا تھا تاہم اس یونٹ کے علاج کی بدولت اب سوہن سنگھ بیساکھیوں کی مدد سے چل پھر سکتا ہے ۔

سوہن سنگھ دو سال کی عمر ہی سے نہ تو چل پھر سکتا تھا اور نہ کھڑا ہو سکتا تھا ۔ تقریباً ڈیڑھ ماہ گزرا اس لڑکے کو ہسپتال میں داخل کیا گیا ۔ چار ہفتے کے علاج سے اب وہ اس قابل ہو گیا ہے کہ بیساکھیوں کے ذریعے سے چل پھر سکے ۔ لیکن توقع ہے کہ کچھ عرصے کے بعد اسے بیساکھیوں کی ضرورت بھی نہ رہے گی ۔ اب وہ اپنے خاندان کے لئے بھی بار نہیں ہے کیونکہ اخبارات اور کنگھے بیچ کر روزانہ کچھ پیسے کما لیتا ہے ۔ علاوہ ازیں اس نے سلائی کا کام بھی سیکھنا شروع کر دیا ہے اور تھوڑی ہی مدت میں درزی کا کام کرنے لگے گا ۔

مذکورہ یونٹ نے یکم ۱۹۵۲ء میں کام شروع کیا تھا اور ۲۰ جولائی ۱۹۵۳ء تک اسی قسم کے چھ ہزار مریضوں کا علاج معالجہ کر چکا ہے ۔ اس یونٹ میں آرتھو پیڈک سرجن ڈاکٹر روآف کے علاوہ دو قدرتی علاج کے ماہرین بھی شامل ہیں ۔ اس یونٹ میں جو مریض آتے ہیں ان کے اعضاء بیکار کے بہت سے اسباب ہوتے ہیں ۔ ہڈیوں اور جوڑوں کی دق کے مریضوں کی تعداد سب سے زیادہ ہوتی ہے اس کے علاوہ فالج بچگان' حادثوں کے باعث اعضا کی خرابی یا اعضا میں پیدائشی خرابی کے مریض بھی کثیر تعداد میں آتے ہیں ۔

چونکہ بھارت میں لنگڑے لُولے اشخاص کا مسئلہ بہت اہم ہے اس لئے یہ یونٹ بھارت کے طبّی اشخاص کی اس خصوصی سائنس میں تربیت کے لئے بھی قائم کیا گیا ہے ۔ لہٰذا یہ یونٹ قدرتی علاج کی تربیت کے علاوہ دشکاروں کو شکستہ اعضاء پر باندھنے سے کام آنے والی تختیاں' پٹیاں اور دیگر اشیاء تیار کرنے کی بھی تربیت دے رہا ہے ۔

اعضاء کی خرابی والے اشخاص کے علاج معالجہ کے علاوہ ان کی سماجی بحالی کا مسئلہ بھی درپیش ہے اور یہ مسئلہ بھارت جیسے بڑے ملک میں بہت وسعت اختیار کر سکتا ہے چنانچہ معذور اشخاص کو دستکاریاں سکھانے کے لئے اداروں کی ضرورت ہے تاکہ وہ اپنی روزی خود کما سکیں اور قوم کے خود کفیل افراد بن جائیں لیکن ایسے اقدامات کے لئے جن وسائل کی ضرورت ہے ان کی فراہمی کے لئے سماجی غور و فکر کو حرکت میں لانا پڑے گا ۔

گلے کا ہار

(ایک نک لیس جو واقعی گلے کا ہار بن گیا۔ مترجم)

وہ ان حسین لڑکیوں میں تھی جو بد قسمتی سے غریب خاندان میں پیدا ہوتی ہیں۔ یہ ناممکن تھا کہ کوئی شخص اس سے محبت کرکے اپنے عقد میں لے لے۔ لہٰذا وہ وزارتِ تعلیم کے ایک معمولی کلرک سے شادی کرنے کے لئے رضامند ہوگئی۔

وہ سادہ لباس پہنتی تھی کیونکہ زیادہ قیمتی لباس اُس کی بساط سے باہر تھا۔ لیکن وہ ہر وقت غمگین رہتی تھی کہ "اس قدر حسین ہوکر میں ایسی غریبی میں بسر کر رہی ہوں"۔ بات یہ ہے عورتیں سمجھتی ہیں کہ اُن کا حُسن دُنیا کی ہر چیز کو خرید سکتا ہے۔ مال و دولت وغیرہ اس کے سامنے ہیچ ہیں اُس کے خواب تو بہت اُونچے تھے۔ مشرقی طرز کی تصاویر سے آراستہ آدام کرنے کے کمرے جن میں شمعیں روشن ہوں اور جن کی دہلیز پر دو قد آور ملازم اونگھ رہے ہوں۔ بڑے بڑے وسیع ڈرائنگ روم جن میں ریشمی پردے پڑے ہوں اور چیزیں بیش بہا ہیرے جواہرات سے آراستہ ہوں، چھوٹے چھوٹے جیم جن میں شام کے وقت بے تکلف دوستوں سے بات چیت ہو۔ یہ چیزیں ہر وقت اُس کے دماغ میں بسی رہتی تھیں۔

جب وہ دونوں کھانے کی میز پر بیٹھتے تھے تو اُس کا شوہر شوربا کھاتا جاتا تھا اور تعریف کرتا جاتا تھا۔ لیکن اُس کے خیالات چاندی کی طشتریوں، لذیذ کھانوں اور خوبصورت کھانے کے کمروں کے چکر لگایا کرتے تھے۔

کاش اُس کے پاس بھی اچھے اچھے لباس اور زیورات ہوتے۔ وہ اِن چیزوں کو اپنا پیدائشی حق سمجھتی تھی۔ عورتیں اُس پر رشک کرتیں اور مرد اُس کے پیچھے دیوانہ رہتے۔ یہ تھا اُس کا آئیڈیل۔ اُس کی ایک امیر سہیلی تھی لیکن وہ اس کے یہاں ملنے نہیں جاتی تھی۔ اس لئے کہ اس امیرانہ ماحول کو دیکھ کر غریبی کا احساس شدّت پکڑ جاتا تھا۔ اکثر تو دن دن بھر اُس کی آنکھیں نم رہتی تھیں۔

ایک شام اُس کا شوہر نہایت خوش ہاتھ میں ایک لفافہ لئے گھر لوٹا۔ "دیکھو تمہارے لئے کیا لایا ہوں" وہ داخل ہوتے ہوئے بولا۔

اُس نے جلدی سے لفافہ کھولا تو ایک کارڈ نکلا۔ "وزیرِ تعلیم اور میڈم رمپانو مستدعی ہیں کہ موسیو اور میڈم لائزل ۱۸ جنوری بروز دوشنبہ وزارت کے دفتر میں ایک ایٹ ہوم میں شرکت فرما کر شکریہ کا موقع دیں۔"

خوش ہونے کے عوض اُس نے لفافے کو میز پر پٹخ دیا "میں اسے لے کر کیا کروں؟"

"کیوں، جانِ من، میں سمجھا تھا کہ تم خوش ہوگی۔ تم کہیں آتی جاتی نہیں ہو۔ یہ موقعہ بہت اچھا ہے۔ بڑی مشکل سے یہ دعوت نامہ ہاتھ آیا ہے۔ ہر شخص اپنی تاک میں تھا۔ دعوت میں بڑے بڑے لوگ آرہے ہیں اور چند مخصوص کلرک بھی ہوں گے۔"

"یہ بتاؤ کہ اس تقریب میں میں پہنوں گی کیا؟"

"وہی لباس جسے پہن کے تم کئی بار تھیٹر جا چکی ہو۔"

"وہ تو ....." ایک دم وہ رک گئی۔ اُس کی بیوی کے آنسو گر رہے تھے۔ "ارے یہ کیا۔"

"کچھ نہیں" وہ سنبھل کر بولی۔ "میرے پاس فراک نہیں ہے تم یہ دعوت نامہ اپنے کسی دوست کو دے دو جس کی بیوی کے پاس مجھ سے اچھے کپڑے ہوں۔"

"نہیں میٹلڈا نہیں" شوہر بولا۔ "بتاؤ تو ایک اچھے فراک میں کتنا لگے گا۔"

وہ تھوڑی دیر حساب لگانے کے بعد بولی۔ "شاید چار سو فرینک میں ہو جائے۔"

شوہر کا چہرہ زرد پڑ گیا، اس لئے کہ ٹھیک اتنی رقم اُس نے بندوق کی خریداری اور شکار پر جانے کے لئے بچائی تھی۔ اچھی بات ہے میں تمہیں چار سو فرینک دئے دیتا ہوں مگر دیکھو لباس خوبصورت خریدنا۔"

پارٹی کا دن قریب آتا جا رہا تھا لیکن میٹلڈ لائزل لباس پائے کے باوجود رنجیدہ تھی۔

"کیا بات ہے تم آج کل رنجیدہ ہو"۔ شوہر نے ایک دن پوچھا۔

"میں سوچتی ہوں کہ وہاں نہ جاؤں، اس لئے کہ میرے پاس کوئی زیور نہیں ہے۔" وہ بولی

"تو تم کچھ تازہ پھول لگا لینا۔ آج کل اس کا فیشن ہے۔"

"نہیں، تمام امیر عورتوں کے بیچ میں میں ہی غریب دکھائی دوں گی۔" اس نے احتجاج کیا۔

"کیسی نادان ہو۔ اپنی سہیلی میٹلڈ فورسٹیر سے زیور مانگ لو۔" شوہر کی اس بات پر وہ خوش ہو گئی۔ "ٹھیک، ہے مجھے اس کا خیال نہیں آیا تھا۔"

اور دوسرے دن وہ اپنی سہیلی کے یہاں سے ہیرے کا ایک ہار لے آئی۔

تقریب کی رات کو ہر طرف میٹلڈ لائزل کا سکہ چل رہا تھا۔ تمام مردوں کی نظریں اس کے حسن و جمال کی طرف تھیں ہر شخص اس سے گفتگو کا خواہش مند تھا۔ حتیٰ کہ آنریبل منسٹر بھی بار بار بھٹک رہے تھے۔ پھر ڈانس ہوا اور ڈانس میں میں وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر ایسی مست ہوئی گویا خوابوں کے دائرے میں گھوم رہی ہے۔

چار بجے صبح فرصت ملی۔ اُس نے اپنی دوزمرہ کی چادر اوڑھی۔ چادر معمولی تھی اور لباس قیمتی تھا۔ لہٰذا شوہر کے اصرار کے باوجود اس نے بگھی کا انتظار نہیں کیا اور دونوں وہاں سے غائب ہو گئے تاکہ کوئی یہ چادر نہ دیکھ لے۔

گھر پہنچتے ہی وہ چادر اُتار کر آئینے کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ شاید آخری بار اپنے جمال کا نظارہ کرنا چاہتی تھی لیکن آئینے کے سامنے جاتے ہی اُس کی چیخ نکل گئی۔

"کیا ہے، کیا ہے؟" شوہر گھبرا کے دوڑا۔

"میں..... میں..... میں نے..... میٹلڈ فورسٹیر کا ہار....."

کھو دیا۔" اُس کی زبان لڑکھڑا رہی تھی۔

"کھو دیا؟ ہار کھو دیا؟ ناممکن۔" شوہر کے حواس باختہ ہو گئے۔ دونوں نے لباس اچھی طرح جھاڑا۔ آس پاس دیکھا۔ پھر وہ جس راستے پر آئے تھے۔ اس پر ڈھونڈتا ہوا گیا ہار نہیں ملا۔ پولیس کو رپورٹ کی، اخبار میں اشتہار دئے۔ بگھی کی کمپنیوں میں تحقیق کی، ہار نہ ملنا تھا نہ ملا۔ میٹلڈ لائزل سارا دن رنج و غم میں پڑی رہی۔ شام کو لائزل واپس آیا پژمردہ اور ناکام۔

"تم اپنی سہیلی کو ایک خط لکھ دو" وہ بولا۔ "کہ ہار کا کانٹا ٹوٹ گیا ہے اور اس کی مرمت ہو رہی ہے۔ اس بیچ میں کچھ سوچنے کا موقع مل جائے گا۔" بیوی نے فوراً خط لکھ دیا۔

ایک ہفتہ گزر گیا۔ ہر طرف سے ناامیدی ہو چکی تھی لائزل اپنی عمر سے پانچ برس زائد لگتا تھا۔ اس نے کہا کہ اب ایسا ہی ہار خریدنا چاہیئے۔ دوسرے دن دونوں ہار

کے کیس کو لے کر اسی جوہری کے یہاں پہنچے جس کا نام انہوں نے لکھا تھا۔ جوہری نے اپنا بہی کھاتہ دیکھنے کے بعد کہا کہ ہار اس کے یہاں کا نہیں ہے۔ صرف کیس اُس کے یہاں کا رہا ہوگا۔

بہت تلاش کے بعد ایک دوکان پر ویسا ہی ہیرے کا ہار ملا۔ جس کی قیمت چالیس ہزار فرینک تھی لیکن چھتیس پر معاملہ طے ہوگیا اور دونوں دو تین دن کے بعد خرید کر لینے کا وعدہ کر کے چلے گئے۔

لائزل کے پاس اٹھارہ ہزار فرینک باپ کے چھوڑے ہوئے تھے۔ بقیہ رقم اُس نے تھوڑی تھوڑی اکٹھا کی۔ ایک ہزار اس سے مانگے، پانسو اُس سے، دو سو دوسرے سے۔ پرامیسری نوٹ دیئے، ذلیل سے ذلیل شرائط پر ماضی ہوگیا، سود خور مہاجنوں سے قرض مانگا، عجیب عجیب عہدناموں پر آنکھ بند کر کے دستخط کئے۔ قرض کسی طرح بقیہ اٹھارہ ہزار جمع کیا، اور پورا چھتیس ہزار روپیہ جا کر جوہری کے حوالے کر دیا۔

ہار لے کر میڈم لائزل میڈم فورسٹیر کے یہاں پہنچی۔

"بہت دیر لگائی تم نے"۔ وہ ناگواری سے بولی۔ غنیمت یہ ہوئی کہ اس نے کیس کھولا نہیں ورنہ وہ سمجھ جاتی کہ ہار دوسرا ہے۔ اور پھر وہ اپنے دل میں کیا سوچتی؟ یہی نا کہ میڈم لائزل چور ہے؟

میڈم لائزل اب بہت غریبی میں بسر کر رہی تھی اور نہایت بہادری سے مصائب جھیل رہی تھی۔ اتنا لمبا قرض کسی صورت سے ادا کرنا تھا۔ ملازمہ ہٹا دی گئی، فلیٹ چھوڑ کر ایک معمولی سی کوٹھری لے لی گئی۔ وہ خود گھر کا سارا کام کرتی، کھانا پکانا، برتن مانجنا، جھاڑو دینا، پانی بھرنا، سودا لانا۔ اور دوکانداروں سے لڑ بھڑ کر کوڑی کوڑی بچانے کی کوشش کرتی شوہر بھی دن بھر دفتر میں کام کرنے کے بعد شام کو کسی تاجر کے یہاں حساب دیکھتا، رات کو بھی اُجرت پر کوئی نہ کوئی کام کرتا۔

اس طرح دس سال بیت گئے اور آخر کار قرض کی ایک ایک پائی ادا ہوگئی۔

میڈم لائزل اب بالکل بڑھیا لگتی تھی۔ نہ بالوں کی فکر تھی نہ لباس کی۔ رنگ مرگیا تھا۔ آواز بھدی ہوگئی تھی۔ پھیپھڑے زمانے کی ہر بات ختم ہوگئی۔ اکثر تنہائی میں وہ سوچتی کہ غلط سی بات کس طرح آدمی کی زندگی کو بدل دیتی ہے اگر ہار نہ کھویا ہوتا تو اس کی کیا حالت ہوتی؟ یہ سب خیال آتے ہی اُس کی آنکھیں نم ہوجاتی تھیں۔

ایک بار اتوار کو وہ دل بہلانے کے لئے ایک تفریح گاہ میں گئی۔ وہاں ایک عورت نظر پڑی جو بچے کو لئے ہوئے تھی یہ میڈم فورسٹیر تھی، ویسی ہی جوان، ویسی ہی خوبصورت، میڈم لائزل بے تاب ہوگئی لیکن جھجک رہی تھی۔ آخر اس سے رہا نہ گیا۔ "گڈ مارننگ شان" اس کی سہیلی نے اسے سر سے پیر تک دیکھا اور اس بے تکلفی پر حیران رہ گئی۔

"غالباً آپ کو غلطی ہوئی۔ میں آپ سے واقف نہیں۔"

"میں ہوں میٹلڈا لائزل"۔ یہ سنتے ہی اُس کی سہیلی اُس سے لپٹ گئی۔

"پیاری میٹلڈا۔ تم کیسی بدل گئیں؟"

"بڑی مصیبتیں جھیلیں میں نے اس درمیان اور صرف تمہارے لئے۔"

"میرے لئے، کیا مطلب؟"

"وہ ہار جو میں نے تم سے مانگا تھا، وہ میں نے کھو دیا تھا۔"

"میں نہیں سمجھی، وہ تو تم واپس لے آئی تھیں۔"

"وہ دوسرا ہار تھا جو میں نے قرض لے کر خریدا تھا۔ دس سال سے اسی قرض کو بھگت رہی ہوں بہرحال وہ قصہ اب ختم ہوگیا اور مجھے کچھ سکون ہو رہا ہے۔"

میڈم فارسٹیر کو جیسے سکتہ ہوگیا۔ "تمہارا مطلب کہ تم نے اس ہار کی جگہ دوسرا ہیرے کا ہار خریدا؟"

"ہاں، کیا تم نے غور نہیں کیا، دونوں یکساں تھے۔"

میڈم فورسٹیر نے پریشانی کے عالم میں اس کے دونوں ہاتھ پکڑ لئے "مگر پیاری میٹلڈا۔ میرا ہار تو نقلی تھا۔ زیادہ سے زیادہ اُس کی قیمت پانسو فرینک رہی ہوگی۔"

(مترجمہ:۔ نجم الحسن صدیقی)

اسرار احمد آزاد

شام میں تحفظِ صحتِ عامہ کا نظام

شام یا سیریا بحیرۂ روم کے مشرق میں ایک چھوٹی سی عرب جمہوریہ ہے۔ اس کا رقبہ کم و بیش پچاس ہزار مربع میل ہے اور آبادی تقریباً چونتیس لاکھ افراد پر مشتمل۔ یہاں شام کے سیاسی حالات اور تغیرات بیان کرنا مقصود نہیں، لیکن اس قدر ضرور سمجھ لینا چاہیئے کہ ماضی قریب میں یہ ملک فرانس کا محکوم تھا، اور اگرچہ دوسری عالم گیر جنگ کے زمانے میں ۱۹۴۱ء میں جنرل ڈیگالے کی حکومت نے شام کی آزادی کو تسلیم کرلیا تھا، لیکن اس ملک سے غیر ملکی افواج کا انخلا ۱۹۴۶ء سے قبل عمل میں نہیں آسکا، اور اس طرح شام کی کامل آزادی کی عمر بھی سات آٹھ سال سے زیادہ نہیں۔ لیکن اس چھوٹے سے ملک کے باشندے اپنی آزادی کے زمانے کو اپنے لئے زیادہ سے زیادہ کارآمد بنانے کے خواہشمند ہیں اور اپنی جدوجہد سے ایسے تمام عوامل اور اسباب کو نابود کردینا چاہتے ہیں جو صدیوں سے اُن کی ترقی کو مسدود کئے ہوئے ہیں، مثلاً صحت اور تندرستی کے شعبے ہی پر ایک نظر ڈالئے تو اس بات کا اندازہ کرلینا کچھ مشکل نہ ہوگا کہ اس ملک کی حکومت اور عوام اس سلسلے میں جو کچھ کررہے ہیں اس کی بدولت شام بہت جلد ایک صحت مند ملک بن جائے گا۔

شام کے باشندے اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھ گئے ہیں کہ اگر ان کی صحت اچھی نہ ہوگی تو امراض پھیلتے رہیں گے۔ اموات کی تعداد میں اضافہ ہوتا رہے گا اور اس طرح ملک کی "جن شکتی" کم ہوتی چلی جائے گی۔ جس کا نتیجہ زرعی اور صنعتی پیداوار کی قلت کی صورت میں رونما ہوگا اور ملک کی ترقی پر اُس کا معکوس اثر پڑے گا، پھر شام کے باشندے اور حکومت اس حقیقت سے بھی بے خبر نہیں کہ عوام کی صحت کے معیار کو بلند کرنے کے لئے امراض کو پھیلنے سے روکنے، امراض میں مبتلا لوگوں کے معالجہ اور عوام کی صحت کو بہتر بنانے کے سلسلے میں مضبوط ارادہ اور عزم و استقلال درکار ہے اور اس میں شک نہیں مشرقِ وسطیٰ کے اس چھوٹے سے ملک کے باشندے قومی صحت کو ترقی دینے کے لئے ہر قسم کی مشکلات پر قابو پانے کی کوشش کررہے ہیں۔

امراض کا سدِّباب

شام کے محکمۂ صحت و تندرستی نے امراض کا سدِّباب کرنے کے سلسلے میں دو باتوں کو اپنا نصب العین بنایا ہے یعنی وہ امراض جنھیں غیر ملکی کہنا چاہیئے اور دوسری وہ بیماریاں جو مقامی حیثیت رکھتی ہیں اور جہاں غیر ملکی امراض کا تعلق ہے اُنھیں مسدود کرنے کے لئے قرنطینہ اور اسی قسم کی دوسری تدابیر اختیار کرنے پر بہت زیادہ زور دیا جاتا ہے۔

یہ امر محتاجِ بیان نہیں کہ بیشتر امراض غیر صاف شدہ گندے اور گدلے پانی کی بدولت پھیلتے ہیں۔ اس لئے شام کی حکومت ایسی ہر تجویز اور منصوبہ کی ہمت افزائی کرتی ہے جس کا مقصد صاف پانی بہم پہنچانا ہوتا ہے اور حکومت کی پالیسی عملی شہروں ہی تک محدود نہیں بلکہ دیہات نیز ریگستانی اضلاع میں بھی صاف پانی بہم پہنچانے کی ہر ممکن سعی کی جاتی ہے۔ مثلاً شام اور خصوصاً اس کے شمالی علاقے میں ایک بیماری بلہارزیا

پھیلاتی ہے اور گندے پانی کی بدولت بڑھتی اور پھیلتی ہے، اور اس بیماری میں مبتلا شخص محنت اور مشقت کے قابل نہیں رہتا۔ اس بیماری کو مسدود ہی نہیں بلکہ نابود کردینے کو حکومت نے اپنا نصب العین قرار دیا ہے، اور اس فیصلے کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ شمالی شام میں عنقریب آب پاشی کے لئے نہروں کا ایک وسیع سلسلہ قائم کیا جائے گا۔ چنانچہ گذشتہ سال حکومت نے ایک خصوصی حکم جاری کیا تھا، جس کا مفہوم یہ ہے کہ دو سال کی مدت میں مرض ہلہارزیا کو نیست و نابود کردیا جائے گا۔

شام میں امراض کے خلاف جو مہم جاری ہے اس میں امراض بردار حشرات الارض مثلاً مچھروں اور مکھیوں کی ہلاکت بھی شامل ہے اور اس سلسلے میں وزارتِ صحت کے زیرِ انتظام جو تجربات کئے جاتے رہے ہیں اُن کے خوشگوار اور ہمت افزا نتائج کے پیشِ نظر اس مہم کا دائرہ پورے ملک پر حاوی کردیا گیا ہے، اور وزارتِ صحت نے اس سلسلے میں جو طریقے طے کئے ہیں چھوٹے بڑے شہروں کی میونسپل کمیٹیاں اس عمل کرتی ہیں۔ تربیت یافتہ افراد پر مشتمل جماعتیں گھروں، دوکانوں، کارخانوں اور دوسرے مقامات پر ایسی ادویہ چھڑکتی ہیں جو امراض بردار حشرات الارض کی ہلاکت کا باعث ثابت ہوتی ہیں اور بعض مقامات میں راستوں پر ایسی ادویہ کا چھڑکاؤ بھی کیا جاتا ہے۔

ملیریا

چند سال قبل شام پر ملیریا کی گرفت بہت زیادہ سخت تھی اور چونکہ اسے مسدود کرنے پر مطلق توجہ مبذول نہیں کی جاتی تھی، اس لئے اس کی زیاں کاریاں روزافزوں ثابت ہوتی رہتی تھیں۔ لیکن اب ملیریا کے مریضوں کی تعداد روز بروز کم ہوتی جارہی ہے۔ لیکن ابھی حسن کے ایک ضلع غاب میں اس مرض پر قابو حاصل نہیں کیا جاسکا۔ مگر حکومت ضروری تیاریوں میں مصروف ہے اور توقع ہے کہ بہت جلد غاب اور اس کے نواحی علاقوں میں ملیریا کے خلاف زبردست مہم شروع کی جاسکے گی۔

بہرحال ملیریا کے سلسلے میں وزارتِ صحت نے جو منصوبہ تیار کیا ہے اس کی بناء پر اُسے کامل یقین ہے وہ آئندہ پانچ سال میں ملیریا ایسے موذی مرض سے پوری طرح نجات دلا سکے گی۔

ٹیکے کے ذریعے سے امراض کا سدِباب

چیچک ایک عالمگیر مرض ہے اور شام بھی اس مرض سے ناآشنا نہیں۔ لیکن اس مرض کو روکنے کے لئے شام کی وزارتِ صحت نے ایک خصوصی قانون نافذ کیا ہے۔ جس کے ماتحت بچوں کے لئے چیچک کے ٹیکے کو ضروری قرار دیا ہے، اور بعض حالات میں کسی جگہ کی پوری آبادی یا اس کے کسی جزو کے لئے بھی ٹیکے کو لازم بنادیا گیا ہے اور خلاف ورزی کو قابلِ سزا جرم قرار دیا ہے اور حکومت کی طرف سے یہ ٹیکے مفت لگائے جاتے ہیں۔

مرضِ دق کو روکنے کے لئے بی، سی، جی کے ٹیکے لگائے جاتے ہیں اور اگرچہ حکومت لوگوں کو یہ ٹیکے لگوانے پر مجبور نہیں کرتی، مگر اعداد و شمار سے اندازہ ہوتا ہے کہ شام کے باشندے بی، سی، جی کے ٹیکے برضا و رغبت لگواتے ہیں اور یہ امر اُن کے صحت پسند ذہن کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

وزارتِ صحت کے زیرِ اہتمام قائم شدہ معمّوں (لیبارٹریز) میں چیچک، ہذیانی بخار اور ہیضے کے خونناب تیار کئے جاتے ہیں اور حکومت ضرورت پیش آنے پر ہذیانی بخار، خناق، کزاز اور کالی کھانسی ایسے امراض میں ٹیکہ لگوانے کو لازم قرار دینے کے مسئلے پر غور کررہی ہے۔

حکومت نے متعدی اور متفامی امراض کے انسداد کے متعلق جو قواعد و ضوابط مرتب اور نافذ کئے ہیں اُن میں عوام اور عمّال کے فرائض اور ذمہ داریوں کو وضاحت کے ساتھ بیان کردیا گیا ہے۔ شام کی حکومت عوامی صحت کو برقرار رکھنے اور ترقی دینے کے لئے جو کچھ کررہی ہے اس کا

اندازہ "عوامی صحت کے تحفظ کے قانون" سے بخوبی کیا جاسکتا ہے۔ اس قانون کی ایک دفعہ میں ان ضوابط کو بیان کیا گیا جن کے ماتحت ان لوگوں کا طبی معائنہ کیا جاتا ہے جو عوام کے لئے کھانے کی چیزیں تیار کرتے ہیں۔ دوسری دفعہ ایسے اداروں اور کاروباری مقامات پر کنٹرول اور ان کی نوعیت کے تعین سے متعلق قوانین کی تشریح پر مشتمل ہے جو عوامی صحت کے لئے مستقل خطرے کی حیثیت رکھتے (مثلاً قحبہ خانے اور شراب خانے وغیرہ) ایک دفعہ میں ہوٹل، سنیما، ریستوران وغیرہ کھولنے کے قاعدوں کی تفصیل بیان کی گئی ہے۔ ایک اور دفعہ میں پرانے قبرستانوں کو بند کرنے، نئے قبرستان کھولنے، نیز نعشوں کو ملک سے باہر لے جانے یا کسی دوسرے ملک سے شام لانے کے ضوابط مدون کئے گئے ہیں اور ایک دفعہ میں مَردوں کے طبی معائنہ کے قواعد و ضوابط کی تصریح کی گئی ہے۔

شام میں متعدی امراض اور خصوصاً سَجال کے (جو آتشک ہی کی ایک قسم ہے اور شمالی علاقوں میں عمومیت کے ساتھ پایا جاتا ہے) انسداد پر خصوصی توجہ منعطف کی جارہی اور اس ہم میں حکومتِ شام کو "عالمی ادارہ صحت" کی عملی مدد حاصل ہے۔

تپ دق کے معالجہ اور انسداد کے لئے دمشق میں ایک خصوصی مرکز قائم کیا گیا ہے۔ یہ مرکز آئندہ ماہ اکتوبر میں اپنا کام شروع کرے گا اور اس میں مناسب مُدّت تک ڈاکٹروں، نرسوں اور صحت و تندرستی کے معاملے میں مفید مشورہ دینے والوں کی تربیت کرنے کے بعد انھیں عوام کو صحت و تندرستی کے اصول سمجھانے نیز تپ دق اور دوسرے امراض کے انسداد کی سعی کرنے کے لئے ملک کے گوشے گوشے میں بھیجا جائے گا، اور ان کی جگہ دوسرے لوگوں کی تربیت شروع کردی جائے گی۔ یہ مرکز پورے مشرقِ وسطیٰ میں اپنی نوعیت کا واحد مرکز ہوگا، اور یقین کیا جاتا ہے کہ اس کی بدولت چند ہی سال میں شام کے باشندے نہایت آسانی اور کامیابی کے ساتھ خوفناک ترین امراض کا مقابلہ کرنے کے قابل ہوجائیں گے۔

معالجات کا نظم

شام کی وزارتِ صحت نے ایک ایسا نظم قائم کیا ہے جس کے ماتحت سرکاری اور غیر سرکاری علاج گاہوں میں مریضوں کا نہ صرف علاج ہی کیا جاتا ہے بلکہ ان کی صحت کو بہتر بنانے کی تدابیر بھی اختیار کی جاتی ہیں۔ اس کے علاوہ شام کی وزارتِ صحت طبی پیشہ اور اطبا کی خدمات کو قومی بنا دینے سے متعلق دورِ حاضرہ کے قوانین کے مطالعے میں بھی مصروف ہے اور وہ ہیلتھ انشورنس کی ترویج کے مسئلہ پر بھی غور کررہی ہے، اور اس سلسلے میں جو منصوبہ تیار کیا جارہا ہے اُس کا نفاذ سب سے پہلے سرکاری ملازمین اور ان کے بعد تدریجاً مزدوروں، کسانوں اور دست کاروں پر کیا جائے گا۔ شامی عوام کو بروقت اور مناسب طبی امداد دینے کے لئے حکومت ملک کے طول و عرض میں زیادہ سے زیادہ شفاخانے اور چھوٹی چھوٹی علاج گاہیں قائم کرنے کی شدید جدوجہد کررہی ہے۔

فی الحال شام میں سولہ بڑے بڑے شفاخانے موجود ہیں — ان میں چار دمشق میں ہیں۔ دمشق کے ایک شفاخانے میں شام کی سرکاری یونیورسٹی کے شعبۂ طب میں تعلیم پانے والے طلباء کو طلب اور ادویہ کی تمام شاخوں کے تجربات کرائے جاتے ہیں اور تین شفاخانے علی الترتیب تپ دق، ذہنی امراض اور برص کے مریضوں کے معالجے کے لئے مخصوص ہیں۔ اسی طرح حلب کے تین شفاخانوں میں سے ایک تپ دق کے معالجے، دوسرا سرجری کے لئے اور تیسرا عام بیماریوں کے علاج کے لئے مخصوص ہے، ان کے علاوہ شام کے ہر محافظہ یعنی ضلع کے صدر مقام میں سرجری اور عام معالجات کے لئے ایک ایک شفاخانہ موجود ہے۔ بحیثیت مجموعی فی الحال شام کے تمام سرکاری شفاخانوں میں بیک وقت ۲۷۰۰ مریض داخل کئے جاسکتے ہیں، لیکن حکومت ایک بڑا شفاخانہ دمشق میں اور چار شفاخانے چار مختلف اضلاع میں قائم کرنے کا ارادہ کررہی ہے۔ جن کے قیام کے بعد تمام شفاخانوں میں بیک وقت ۵۰۰ مریضوں کے داخلے کی گنجائش پیدا ہوجائے گی۔

ان بڑے شفاخانوں کے علاوہ شام کے مختلف شہروں میں اس وقت ۱۳۰ چھوٹی چھوٹی علاج گاہیں بھی قائم ہیں جن میں سے ہر ایک میں بعد زائد کم و بیش ۱۶۰ مریضوں کا علاج کیا جاتا ہے۔ اس وقت شام میں مستند ڈاکٹروں کی تعداد ۷۴۰ ہے۔ جن میں ۵۵۰

ڈاکٹر وزارتِ صحت کے دفاتر اور سرکاری شفاخانوں اور علاج گاہوں میں کام کرتے ہیں۔ لیکن حکومت مستند ڈاکٹروں کی تعداد بڑھانے کی سرتوڑ کوشش کر رہی ہے اور قوم کی صحت کو بہتر بنانے کے لئے ضوابط مرتب اور منظور کرنے کا مسئلہ بھی زیرِ غور ہے۔

کچھ مدّت پہلے تک ہر کاٹے کتّے کے کاٹے ہوئے لوگوں کو شام سے معالجے کے لئے بیروت بھیجا جایا کرتا تھا اور سفر معالجہ کے مصارف حکومت برداشت کرتی تھی۔ لیکن ایسے سفر کی دشواریاں ظاہر ہیں اور ایسی حالت میں کہ مریض کم عمر ہوتے تھے یہ مشکلات اور بھی بڑھ جاتی تھیں۔ ان مشکلات پر قابو حاصل کرنے کے لئے حکومت نے متعدد ڈاکٹروں کو مصر اور یورپ بھیج کر انھیں تعلیم اور تربیت دلانے کے بعد اب دمشق میں ایک خصوصی مرکز قائم کیا ہے جس کے ساتھ ایک معقل بھی وابستہ ہے۔ اس معقل میں ہڑک کے علاج کے لئے خونناب (سیرم) تیار کیا جاتا ہے۔ ہڑک زدہ مریضوں کے علاج کے لئے ایک متحرک شفاخانہ بھی قائم کر دیا گیا ہے اور آوارہ کتّوں کو ہلاک کرنے پر خاص توجہ مبذول کی جاتی ہے۔ اس طرح کتّوں کے کاٹے ہوئے مریضوں کی تعداد ۱/۸ سے بھی کم ہو گئی ہے اور گزشتہ دو سال کی مدّت میں ایسے ایک مریض کی موت بھی واقع نہیں ہوئی۔

صحتِ عامّہ اور معالجہ کے معیار کو بلند کرنے کی تدابیر

شام کی وزارتِ صحتِ عامّہ نے عوام کی صحت اور معالجہ کے معیار کو بلند کرنے کی غرض سے ایک ایسا قانون نافذ کرنے کا فیصلہ کیا ہے جس کے ماتحت نابینا افراد کے علاج کے لئے مُردہ افراد کے قرنیے (ڈھیلوں کی بیرونی جھلّی) نابینا افراد کی آنکھوں میں منتقل کئے جا سکیں گے۔ اور ایسے لوگوں کی نعشوں کا طبّی معائنہ کیا جا سکے گا جن کی موت کو کسی متعدی مرض کا نتیجہ سمجھا جائے گا۔ اور اس میں شک نہیں کہ بنی نوعِ انسان کی خدمت اور عوام کی صحت کو بہتر بنانے اور برقرار رکھنے کے نقطۂ نظر سے یہ قانون، قانون سازی، اور سائنس کی ترقی کی راہ میں شامی حکومت کے ایک اہم ترین اقدام کی حیثیت رکھتا ہے۔

وزارتِ صحت عامّہ نے ایک خاص محکمہ قائم کیا ہے جو عوام کو صحت و تندرستی، امراض اور معالجات سے متعلق زیادہ سے زیادہ معلومات بہم پہونچاتا ہے، پھر حکومت نے ایک ایسا نظام بھی قائم کیا ہے جس کے ماتحت خواتین گھر گھر جا کر امراض میں مبتلا اور تندرست کی بیماری اور تندرستی کے اسباب و علل کا مطالعہ کرتی ہیں اور اس سلسلے میں گھر والوں کو ضروری اور مناسب ہدایات اور مشورے دیتی ہیں۔ اور یہی خواتین تپ دق کے معالجے میں زچہ اور بچّہ کی فلاح و بہبود کے لئے قائم شدہ مراکز میں بھی کام کرتی ہیں۔

ماؤں اور بچّوں کا تحفّظ

ماؤں اور بچّوں کے حالات کا مطالعہ کرنے کے بعد حکومت جس نتیجے پر پہونچی اُس کا خلاصہ یہ ہے کہ ——— ماضی میں ان کی حالت قطعاً ناقابلِ اطمینان رہی ہے۔ بیشتر بچّوں کی موت کی وجہ افلاس نہیں بلکہ اصولِ صحت و تندرستی سے ناواقفیت تھی اور بیشتر خواتین کو یہ معلوم ہی نہیں کہ زمانۂ حمل میں انھیں کیا احتیاطی تدابیر اختیار کرنا چاہئیں۔ اس نتیجے پر پہونچنے کے بعد شام کی وزارتِ صحت نے حال ہی میں ایک ایسا مرکز قائم کیا ہے جہاں خواتین کو ایک سال تک ماؤں اور بچّوں کی صحت کو بہتر بنانے کے موضوع پر تعلیم اور تربیت دی جائے گی، اور تربیت کا یہ سلسلہ اس وقت تک قائم رہے گا جب تک ملک کے گوشے گوشے میں ماؤں اور بچّوں کی فلاح و بہبود کے ادارے قائم نہیں ہو جائیں گے۔

شام کی وزارتِ صحت نے "ڈائرکٹریٹ جنرل آف سوشل سروس" کے نام سے جو محکمہ قائم کیا ہے اُس کے اراکین مدرسوں، محنت کشوں اور پیشہ وروں کے حلقوں، قید خانوں اور دیہات میں صحتِ عامّہ کو ترقی دینے کی جدوجہد کے علاوہ صحت سے

متعلق اعداد و شمار بھی جمع کریں گے اور تعمیرات میں صحت و تندرستی کے نقطۂ نظر سے صفائی قائم رکھانے کے ذمہ دار بھی ہوں گے۔

شام میں نرسوں کی بے حد قلت تھی۔ چنانچہ اس قلت کو مدنظر رکھتے ہوئے حکومت نے پرائیویٹ علاج گاہوں میں تربیت یافتہ نرسوں کو بھی لائسنس دے دیئے ہیں، اور اب حکومتِ مشق کے موجودہ تربیتی مرکز کے علاوہ حلب (الپو) میں نرسوں کی تربیت کے لئے ایک نیا مرکز قائم کرنے کی تجویز پر غور کر رہی ہے۔

ادویہ اور صحتِ عامّہ کے معیار کو بلند تر بنانے کے لئے ایک ایسے قانون کی ترتیب کی جارہی ہے، جس کے ذریعہ سے علم طب اور اس کے تمام شعبوں کا تحفظ کیا جاسکے گا۔ خاص ادویہ تیار اور فراہم کی جاسکیں گی، اور اس سلسلے میں کسی قسم کی دھوکہ بازی اور فریب دہی کی گنجائش باقی نہ رہے گی۔

صحتِ عامّہ کو بہتر بنانے کے لئے تمام شہروں اور فی الحال بعض دیہات میں برقی روشنی پہونچانے کی طرف بھی خصوصی توجہ مبذول کی جارہی ہے اور اگرچہ بظاہر "برقی روشنی اور صحتِ عامّہ" کا تعلق ایک مضحکہ خیز بات معلوم ہوتی ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ابتک شام کے بیشتر شہروں میں مٹی کا تیل جلایا جاتا رہا ہے، اور ظاہر ہے کہ اس کا دھواں صحت پر بُرا اثر ڈالتا ہے، اور اسی لئے شام کی حکومت بجلی کی روشنی کو صحتِ عامّہ کے لئے ایک ضروری چیز تصوّر کرتی ہے۔

مختصر یہ کہ جمہوریۂ شام میں امراض کے انسداد اور صحتِ عامّہ کی ترقی کے لئے جو کچھ کیا جارہا ہے اس سے مشرق کے بیشتر ممالک سبق حاصل کرسکتے ہیں، اور اگر شام صحتِ عامّہ کے سلسلے میں اپنے تمام منصوبوں کی تکمیل میں کامیاب ہوسکا تو مشرقِ وسطیٰ کا یہ چھوٹا سا ملک بیشتر مشرقی ممالک کے لئے شمعِ راہ ثابت ہوگا۔

وارث کرمانی

بادِ صبا سے!

اے صبا نکہتِ گیسوئے معنبر لانا — کوئی تحفہ گلِ نسریں سے بھی خوشتر لانا

جاں بلب ہیں ترے مشتاق سرِ راہِ حیات — دمِ عیسیٰ و مئے لعلِ و گلِ تر لانا

شبستانِ محبت کی حسیں رات ہوں میں — خنکیِ شبنم و نورِ مہ و اختر لانا

عشق ہو مست و غزلخواں و صراحی بر دوش — زندگی تازہ و سرشار و معطّر لانا

درِ خورشید و شایانِ خراباتِ مغاں — آتشیں مطرب و بیباک نوا گر لانا

کشتگانِ ستمِ دورِ خزاں ہیں ہم لوگ — اپنے ہمراہ بہاروں کے پیمبر لانا

حُسن ہی حُسن کا سامان تری آہ میں ہے — حُسن ہی حُسن کے انوار پہ سر لانا

تجھ کو اندوہِ اسیرانِ قفس کی سوگند — آرزوؤں کے حسیں پھول کھلا کر لانا

اِس نئے دَور کے شعروں میں تغزّل کم ہے

میری اُفتادِ طبیعت کا سخنور لانا

ذکر و فکر

غزل

یحییٰ عظیمی

شرابِ بے خودیِ شوق سے مخمور ہو جاؤں
اُنھیں دیکھوں تو با ایں ربط و ضبط مسرور ہو جاؤں

مری بزمِ تصوّر سے وہ سرگرداں نہیں سکتے
یہ ممکن ہے کہ اُن کی بزم سے میں دور ہو جاؤں

تصوّر بھی جو آجائے نگاہِ مستِ ساقی کا
ہجومِ درد و غم میں بے خود و مسرور ہو جاؤں

محبت کی یہ محرومی بھی یارب کیا قیامت ہے
نہ دیکھوں ہیں اُنھیں جی بھر کے اور مجبور ہو جاؤں

کسی کی دید ہی پر منحصر کیا سرخوشی میری
کسی کی لذّتِ تقریر سے مسحور ہو جاؤں

مری آنکھوں کو ذوقِ گریۂ خونیں نہیں بے ہم
مگر ہاں اضطرابِ دل سے جب مجبور ہو جاؤں

ہے جانِ اختصاص اُن کا یہ اندازِ تغافل بھی
نہ کیوں اِس التفاتِ خاص پر مغرور ہو جاؤں

قوس و قزح

عشرت قادری

دہکتے غنچے، سلگتی کلیاں، جو تم نہیں ہو تو کچھ نہیں ہے
جبینِ شب پر مہِ خراماں، جو تم نہیں ہو تو کچھ نہیں ہے

ہوا میں اُڑتا ہوا یہ آنچل، چھلکتے گیسو، لچکتی باہیں
یہ رنگ و نکہت کا سیلِ عریاں، جو تم نہیں ہو تو کچھ نہیں ہے

روش، روش بے قرار سی ہے، کلی کلی سوگوار سی ہے
دھڑک رہا ہے دلِ بہاراں، جو تم نہیں ہو تو کچھ نہیں ہے

فسردہ چہرے، اُداس نظریں، صدائے بربط، کھنکتے ساغر
یہ شورِ محفل، سکوتِ زنداں، جو تم نہیں ہو تو کچھ نہیں ہے

میں کیا کروں ذکرِ رنج عشرت ہر ایک منظر گراں ہے دل پر
یہ شامِ دل کش، یہ صبحِ خنداں، جو تم نہیں ہو تو کچھ نہیں ہے

غزل

اشرف قادری

غیر و پسپا ہ ماحول ہے ویرانوں کا
دل بہلتا نہیں صحرا میں بھی دیوانوں کا

آپ رکھیں گے نہ ترتیب سے سننے کا لحاظ
خون ہو جائے گا ناحق مرے افسانوں کا

راہ و شوار سہی دشتِ جنوں کی لیکن
دل ٹھکانے پہ تو آجائے گا دیوانوں کا

خونِ حیواں کے پسینے پہ بہانے والو
قدر داں کون ہے اِس دہر میں انسانوں کا

غزل

قمر لدھیانوی

نیرنگیِ بہار کا شکوہ نہ کیجیے
دامانِ تار تار کا شکوہ نہ کیجیے

اپنا ہی دل نہیں ہے اگر اختیار میں
تو پھر نگاہِ یار کا شکوہ نہ کیجیے

جب علم ہے کہ ذوقِ طلب بے کراں نہیں
پھر طولِ انتظار کا شکوہ نہ کیجیے

ہر پھول ہر کلی کو چٹکنا سکھائیے
بربادیِ بہار کا شکوہ نہ کیجیے

یا تو ذرا نکھلے عناصر کی قید کو
یا جبر و اختیار کا شکوہ نہ کیجیے

رکھیے نگاہ زُلف و رُخِ یار پر قمر
غم ہائے روزگار کا شکوہ نہ کیجیے

غزل

ہمّا ہر نالوی

اُن کا نشاں بھی لوحِ جہاں سے مٹا کے دیکھ
اہلِ وفا کو اور ابھی آزما کے دیکھ

عیش و طرب میں تو متبسّم ہوا تو کیا
اے دل ہجومِ غم میں کبھی مسکرا کے دیکھ

کتنی کڑی یہ شرط ہے اُن کے ظہور کی
کہتے ہیں "مجھکو پردہ ہستی اُٹھا کے دیکھ"

دستِ دعا کو دستِ کرم بڑھ کے تھام لے
یوں بھی کبھی دعا کے لئے ہاتھ اُٹھا کے دیکھ

تو اپنے دوستوں پہ فدا ہو چکا بہت
اب دشمنوں سے ربطِ محبت بڑھا کے دیکھ

بن جائے جو چراغِ شبِ تارِ زندگی
ایسا بھی کوئی اشکِ محبت بہا کے دیکھ

سرمایہ دار پر نہ حسد کی نگاہ ڈال
اُس کی مسرّتوں کو ذرا پاس جا کے دیکھ

منظور ہے وصال اگر ذاتِ ذات کا
پروانہ وار خرمنِ ہستی جلا کے دیکھ

تو عرضِ حال کر کے پشیماں تو ہو چکا
اب مُہرِ خامشی بھی لبوں پر لگا کے دیکھ

راہِ وفا میں سُود و زیاں کی نہ فکر کر
بے خوف، مال اپنی گرہ کا لُٹا کے دیکھ

دل ہی میں ہو نہ گو سرِ مقصود اے ہمّا!
اِس بھرے کہاں میں بھی غوطہ لگا کے دیکھ

ضروری تصحیح

آج کل کے ماہ ستمبر کے شمارے میں صفحہ ۴۹ پر بصری فاضل طٰہٰ حسین کی زندگی کے حالات درج ہیں۔ اس میں طٰہٰ کے بچے غلط لکھے گئے ہیں۔ ناظرین تصحیح فرما لیں۔ (ادارہ)

حسن چشتی

اچاریہ ونوبا بھاوے

گاندھی جی کی وفات کے بعد جس شخص میں ان کی تعلیمات کا سچا عکس ملتا ہے وہ اچاریہ ونوبا بھاوے ہے۔ ونوبا سے ہندوستان کے باشندے اتنے واقف نہیں جتنے جواہر لال نہرو یا راجندر پرشاد سے واقف ہیں، لیکن گاندھی جی کے بعد ونوبا نے بڑی شہرت اور ہر دل عزیزی حاصل کی۔ ونوبا گاندھی جی کی تعلیمات کے زبردست حامی رہے ہیں۔ گاندھی جی نے ۱۹۴۰ء کی سول نافرمانی کا پہلا ستیاگرہی ونوبا کو قرار دیا تھا۔

۱۹۲۳ء سے ۱۹۲۵ء تک ونوبا نے ایک ہفتہ وار "مہاراشٹر دھرم" نکالا تھا۔ اس کا مقصد گاندھی جی کی تعلیمات کی اشاعت تھا۔ ونوبا کی ادبی شخصیت مسلم رہی ہے، اور مہاراشٹر کے علاقے کے باشندے عام طور پر ونوبا کو اسی اعتبار سے جانتے ہیں۔ مہاراشٹر دھرم میں شائع شدہ ونوبا کے مضامین کا ایک انتخاب "مدھوکر" شائع ہو چکا ہے۔ انھوں نے سروودیہ پر بھی کتابیں لکھی ہیں، لیکن ان کتابوں کو اور ونوبا کے جاری کئے ہوئے ہفتہ وار کو وہ مقبولیت حاصل نہ ہو سکی جو "گیتائے" کو حاصل ہے۔ "گیتائے" دراصل گیتا کا مرہٹی زبان میں ترجمہ ہے، جس میں انھوں نے ترجمہ کرتے ہوئے اسی بحر کو پیش نظر رکھا ہے جو گیتا کے سنسکرت نسخے میں استعمال کی گئی ہے۔ یہ ترجمہ آزاد نظم میں ہے اور اس قدر مقبول ہوا کہ اس کے ۲۵۰۰۰ نسخے فروخت ہو چکے ہیں۔ کئی سال پہلے جب "گیتائے" کا پہلا ایڈیشن شائع ہوا تھا تو اس کی قیمت ونوبا نے بیڑیوں کے ایک بنڈل کے مساوی رکھی تھی۔ اُن دنوں ایک بنڈل کی قیمت ایک آنہ تھی، اور گیتائے ایک آنہ میں فروخت ہوتی رہی۔ بعد میں جیسے جیسے بیڑیوں کی قیمت میں اضافہ ہوتا گیا۔ گیتائے کی قیمت بھی بڑھتی گئی، اور آج اس کی قیمت تین آنے ہے۔ گیتائے ونوبا کی مقبول عام اور مشہور معروف تصنیف اور مرہٹی ادب میں ایک دیرپا اضافہ ہے۔ ونوبا کی ادبی شخصیت کو مہاراشٹر میں جو شہرت حاصل رہی وہ آج اُن کو سارے ہندوستان میں حاصل ہے، اس دور میں وہ اس مشعل کے علمبردار ہیں جو گاندھی جی نے جلائی تھی۔ گاندھی جی کی وفات کے بعد وہ ماج گھاٹ پر ہر ہفتہ لوگوں کو مخاطب کرتے جو پوجا کی غرض سے جمع ہوا کرتے تھے۔ انھوں نے پناہ گزینوں کے مسائل میں دلچسپی کا اظہار کیا اور تلنگانہ کا پیدل دورہ کیا۔

ونوبا آج سے کوئی ۵۷ سال پہلے ۱۸۹۶ء میں کوکن کے ایک برہمن خاندان میں پیدا ہوئے۔ بڑودہ کی ریاست میں ونوبا کے والد ہیڈ کلرک تھے۔ لیکن اُن کو اس پیشے سے کوئی لگاؤ نہ تھا۔ ان کی دلچسپی تمام تر رنگوائی اور چھپوائی میں تھی۔ اُن کا یہ ذوق برائے نام یا اضافی قسم کا نہ تھا۔ بلکہ اپنے اس محبوب مشغلے کے متعلق ان کے پاس زبردست کتب خانہ تھا۔ جس میں سینکڑوں کتابیں تھیں۔ انھوں نے اپنے مکان میں چھوٹا سا ایک تجربہ خانہ بنا رکھا تھا، اور وہ اپنے فرصت کے اوقات اسی تجربہ خانہ میں گزارا کرتے تھے۔ اُن کے تین لڑکے تھے، اور سب سے بڑے ونوبا ہیں۔ اُن کی تمنا تھی کہ ونوبا اسی پیشے کو اختیار کریں اور رنگوں کے تاجر بنیں۔ لیکن ونوبا کے پیش نظر دوسرے ہی منصوبے تھے۔ ان کی ماں نے انھیں عقلمندی کا شیدا بنا دیا تھا، اور ان دنوں جب کہ وہ کالج میں تعلیم پا رہے تھے اُن کے خیالات

دنیا سے کنارہ کشی پر جمے ہوئے تھے اُن کی تمنّا تھی کہ دنیاوی چیزوں کو خیرباد کہیں اور ساری عمر برہمچاری کی حیثیت سے گزار دیں۔ بے غرضی اور بے لوث خدمت کا جذبہ اس وقت ان میں موجود تھا۔ انھوں نے شیواجی کے گرو رام داس سوامی کی زندگی کا کافی مطالعہ کیا تھا۔ آر۔ بند۔ دلگوش کی تحریروں نے بھی ونوبا کو بے حد متاثر کیا اس کے علاوہ گوکھلے کی ہند۔وستانی سماج کے خادموں کی تحریک نے اُن کی زندگی پر اثر ڈالا۔ وہ سادگی پسند بنتے گئے اور سیاسی سادھو زندگی بسر کرنے لگے۔ شنکراچاریہ کی فلسفیانہ تحریروں نے ان کی زندگی پر ان تمام خارجی اثرات کی تکمیل کردی اور وہ ساری دنیا سے، اپنے گھر سے، کالج سے، دنیا کی ہر شے سے، اپنے مستقبل کی اُمیدوں سے کنارہ کشی کے منصوبے بنانے لگے۔ ان دِنوں وہ انٹرمیڈیٹ میں تعلیم پا رہے تھے۔ لیکن اُن کو کالج اور کالج کی تعلیم سے کوئی دلچسپی نہ رہی تھی۔ انھوں نے امتحان دینے کے بہانے گھر چھوڑ دیا۔ بہانہ کافی جاندار تھا کہ اُنھیں انٹرنس کا امتحان دینے سورت جانا ہے، گھر والوں نے انتظام کردیا اور وہ سورت جانے کے بجائے اپنے ایک دوست کے ساتھ بنارس جا پہنچے۔ دنیا کے بندھنوں کے خلاف ان کی یہ پہلی بغاوت تھی۔ بنارس پہنچنے کے بعد اُن کے ساتھی کا ہیضے سے انتقال ہوگیا اور ونوبا اکیلے رہ گئے۔ ایک دن انھوں نے وہاں کے ایک جلسے میں گاندھی جی کی تقریر سنی اور بے حد متاثر ہوئے۔ لیکن اُن کے کچھ شکوک باقی رہے۔ سچائی اور نیکی کی بنا پر وہ گاندھی جی سے نہ مل سکے۔ اور اُنھوں نے اُن کو ایک خط لکھا، جس میں اُنھوں نے مختلف سوالات کئے اور اُن کی تعلیمات کے متعلق اپنے شکوک کا اظہار کیا، جواباً گاندھی جی نے اُن کو سابرمتی آشرم میں شرکت کی دعوت دی جہاں وہ اُن سے قریب تر رہ کر اپنے شکوک کو دُور کرسکتے تھے۔ ونوبا کو اس سے بہتر موقع کہاں مل سکتا تھا۔ اور اُن کی تمنّا بھی یہی تھی، چنانچہ وہ فوراً سابرمتی آشرم جا پہنچے۔ وہاں وہ اپنے شکوک دُور کرنے اور اپنے سوالات کے جوابات حاصل کرنے لگے، اور گاندھی جی کے اس قدر عقیدت مند اور پیرو بنے کہ آج اُن کو گاندھی جی کا جانشین سمجھا جانے لگا۔

ونوبا کے اہلِ خاندان عرصہ تک پریشان رہے اور ان لوگوں کو ونوبا کا اُس وقت پتہ چلا جب وہ سابرمتی آشرم میں شریک ہوچکے تھے۔ اہلِ خاندان کا اصرار تھا کہ وہ گھر لوٹ آئیں۔ لیکن ونوبا کے لئے گھر یا دنیا میں اب کوئی دلچسپی باقی نہ رہی تھی۔ وہ اپنے گھر اُس وقت لوٹے جب اُن کی ماں مرض الموت میں مبتلا تھیں۔ اُن کو اندیشے ضرور تھے کہ شاید وہ اب وہاں سے نہ جاسکیں یا اُن کو روک لیا جائے گا۔ سب سے زیادہ خوف اُن کو اپنی ماں سے تھا کہ اگر وہ اُن سے التجائیں کرتیں کہ وہ نہ جائیں تو ونوبا کے لئے بڑی مشکل آپڑتی۔ لیکن ونوبا کی ماں نے اپنے نورِنظر کو اِس زندگی سے واپس بُلا لینا گوارا نہ کیا۔ وہ ونوبا کی اِس زندگی سے خوش تھیں۔

ماں کی موت پر ونوبا کے دل کو زبردست ٹھیس پہنچی۔ وہ چاہتے تھے کہ آخری رسوم اپنے ہاتھوں سے ادا کریں اور پجاریوں وغیرہ کو نہ بُلایا جائے، لیکن اُن کی یہ شرط ناقابلِ قبول تھی۔ ان کے والد نے کہا رسوم کی پابندی بہرحال ضروری ہے اور خاندان اور سماج کی رائے کو پیشِ نظر رکھنا ضروری ہے۔ سماج اور خاندان اس کی اجازت قطعاً نہیں دیتا کہ روایاتی رسوم ادا نہ کی جائیں۔ اُن کا خیال تھا کہ اُن کی ماں نے یہی بہتر سمجھا ہوگا کہ ان کی آخری رسوم ان کا نورِنظر ادا کرے خواہ اس میں رسوم و رواج سے بغاوت ہی کیوں نہ ہو۔ والد راضی نہ ہوئے اور ونوبا نے ماں کی آخری رسوم میں شرکت نہ کی۔

گھر سے رہے سہے بندھن بھی ٹوٹ گئے اور ونوبا آشرم کو لوٹ آئے۔ ۱۹۱۸ء تک وہ اس آشرم ہی میں رہے اور اس سال اُنھوں نے آشرم سے کوچ کیا، اور مہاراشٹر کے علاقوں میں گھومتے نکل کھڑے ہوئے۔ ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں کا دورہ کرتے اور اپنی لکھی ہوئی کتابوں کو تقسیم کیا کرتے۔ ایک سال تک وہ اسی طرح مہاراشٹر کے دیہی علاقوں

کا دورہ کرتے رہے۔ انھوں نے نہ صرف حالات کا جائزہ لیا بلکہ دیہاتیوں میں اپنی کتابیں تقسیم کیں اور اُن کے جلسوں کو مخاطب بھی کیا۔ مہاراشٹر کے پہاڑی علاقوں کی سیر کی، تاریخی مقامات کی سیاحت کی، قدیم قلعوں اور عمارتوں کو دیکھا اور اس سرزمین کی تاریخی یادگاروں سے روشناس ہوئے انھوں نے نوجوانوں اور نوعمروں سے تعلق پیدا کرنے کے مختلف ذرائع پیدا کئے ایک یہ بھی تھا کہ جب کبھی وہ کسی قلعے یا تاریخی مقام کو جاتے تو اعلان کرتے کہ جو بھی چلنا چاہیں وہ اُن کے ہمراہ آئیں۔ اِس طویل دوران میں انھوں نے گاندھی جی کو ایک طویل خط لکھا جس میں اپنی بے چینی کا تذکرہ کیا اور لکھا کہ وہ اُن سے قریب تر ہونے کے متمنی ہیں۔ گاندھی جی نے بڑا ہی اثر آمیز خط لکھا اور اُن کو دعوت دی۔ آشرم کو چھوڑے انھیں ایک سال گزر چکا تھا۔ اگرچہ وہ آشرم کو نہ لوٹنے کے ارادے سے نکل پڑے تھے لیکن ایک سال بعد لَوٹ گئے اور آئندہ چار سال وہیں گزارے۔

۱۹۲۲ء میں وردھا میں کھادی کی مہم اور دوسری سرگرمیوں کے لئے سیٹھ جمنالال بجاج کو ایسے کارکن کی ضرورت محسوس ہوئی جو گاندھی جی کا قابلِ اعتماد ہو۔ اُن کی نظریں ونوبا پر پڑیں اور اُنھوں نے گاندھی جی سے تذکرہ کیا۔ چنانچہ گاندھی جی کی مرضی پر چند ساتھیوں کے ساتھ ونوبا وردھا آئے، جہاں اُنھوں نے اپنا ایک علیحدہ آشرم تعمیر کیا۔ یہاں روزانہ کوئی آٹھ گھنٹے تک چرخہ کاتا جاتا اور کپڑا بھی بُنا جاتا۔ یہ آشرم ۱۹۳۳ء تک قائم رہا۔

۱۹۳۰ء میں ونوبا نے پانچ پانچ چھ چھ کے گروہ بنائے اور ان گروہوں کو دیہاتوں میں روانہ کیا، تاکہ گاندھی جی کے نظریات اور اُن کی تعلیمات کی اشاعت کریں۔ ان گروہوں کے اراکین کی تربیت اعلیٰ پیمانے پر ہوئی تھی۔ گاندھی جی کی تعلیمات کی اشاعت میں ان گروہوں کی کاوشوں کا بڑا حصّہ رہا۔ ۱۹۳۲ء میں سول نافرمانی کی تحریک اُٹھی اور ونوبا کو گرفتار کرکے چھ مہینے کے لئے قید کر دیا گیا۔ ان کو دھولیا جیل میں رکھا گیا۔ جہاں سیٹھ جمنالال بجاج بھی قید تھے انھوں نے اور دوسرے ساتھیوں نے ونوبا سے خواہش کی کہ وہ ان سب کو گیتا کے درس دیں چنانچہ اس خواہش کی تکمیل کے طور پر ہر اتوار کو وہ درس دیتے اس طرح جیل میں انھوں نے ۱۸ درس دئے جو بعد میں شائع ہو گئے۔

۱۹۳۵ء سے ۱۹۳۸ء تک ونوبا وردھا سے دو میل کے فاصلے پر ایک گاؤں نلواڑی میں قیام پذیر رہے۔ یہاں گرام سیوا سنگھ کی زیرِ سرپرستی انھوں نے کپڑا بُننے، چرخہ کاتنے، چرخے بناکر اُن کی نکاسی کرنے اور اسی قسم کے کاموں کے لئے وسیع تنظیم قائم کی۔ تین سال بعد ۱۹۳۸ء میں وہ وردھا سے کوئی ایک میل دُور ایک اور مقام پونا کو منتقل ہو گئے۔ یہاں اُن کا آشرم ہے۔ ان دنوں ونوبا کی صحت ٹوٹنے لگی تھی اور گاندھی جی نے اُن کو مشورہ دیا کہ وہ کسی پہاڑی علاقے پر چند دن گزاریں۔ عام انسانوں کی بے لوث خدمت اور ان سے بے لوث خلوص سے معمور دل رکھنے والے ونوبا کو خیال آیا کہ عام لوگ اپنی صحت کی بحالی کے لئے پہاڑی علاقوں کو نہیں جا سکتے تب وہ کیوں جائیں اس لئے اُنھوں نے پورنا کا انتخاب کیا جو وردھا سے آٹھ میل کے فاصلے پر تھا۔ یہاں دریائے دہم کے کنارے ان کا آشرم ہے۔ یہاں ونوبا کی صحت بہت جلد سنبھل گئی۔ ان کا وزن ۹۰ پونڈ سے بھی گر چکا تھا لیکن پورنا آنے کے بعد بہت جلد ۱۳۵ پونڈ تک چلا گیا۔

انفرادی ستیہ گرہ کی بنا پر ۱۹۴۰ء میں ونوبا کو دوبارہ گرفتار کر لیا گیا تھا، اور اس کے بعد اُن کو تین مرتبہ جیل جانا پڑا۔ پہلی بار وہ صرف تین مہینے کے لئے قید رہے، دوسری بار اُن کو چھ مہینوں تک قید رکھا گیا اور تیسری بار انھوں نے جیل میں نو مہینے گزارے۔ ۱۹۴۲ء میں اُن کو ایک بار پھر گرفتار کیا گیا تھا۔

گاندھی جی کی وفات کے بعد جو خلا محسوس کیا جانے لگا اس کو پُر کرنے کے لئے اچاریہ ونوبا بھاوے پر ہی ہر کسی کی نگاہیں پڑیں۔ ونوبا نے گزشتہ سال حیدرآباد کی ریاست کا پیدل دورہ کرکے

یہاں کے مسائل کو حل کرنے کی کوشش کی۔ انھوں نے کاشتکاروں کی فلاح و بہبود کے راستے نکالے، زمین تقسیم کرائی، دیہاتیوں کو قیمتی مشورے دیئے۔ منشیات کا استعمال ریاست کے دیہاتیوں میں بہت عام ہے۔ دنوبا نے اپنی اکثر تقریروں میں اُن کے استعمال کی مخالفت کی اور دیہاتیوں سے اس عادت کو ترک کرنے کی اپیلیں کیں۔ ان دنوں کا حال پڑھتے ہوئے گاندھی جی کی یاد تازہ ہوجاتی ہے۔ جن دنوں دنوبا بھاوے یہاں تھے، زبان کا مسئلہ بڑی سنجیدگی سے زیرِبحث تھا۔ ایک موقع پر اُنھوں نے زبان کے مسئلے پر جن خیالات کا اظہار کیا ہے ان سے ایک سچا ہندوستانی انکار نہیں کرسکتا۔ انھوں نے کہا تھا کہ "حیدرآباد کے مسائل ہندوستان سے مختلف نہیں۔ اِس لئے حیدرآباد کے مسائل حل کرنا ہندوستان کے مسائل کو حل کرنا ہے، حیدرآباد کی سرکاری زبان اردو تھی اور اُردو زبان کی وجہ سے حیدرآباد میں ایسی ہندی فروغ پاسکتی ہے جس کو عوام آسانی سے سمجھ سکتے ہوں۔ آسان اردو بامحاورہ ہندی بن سکتی ہے۔ مگر سب مل کر ہندوستانی کو ترقی دیں تو یہ ہندوستان کی سب سے بہتر زبان بن سکتی ہے، اور اس میں ہندوستان کی ترقی مضمر ہے۔"

اچاریہ جی کا یہ خیال گاندھی جی کے خیال کا سچا عکس ہے۔ اُنھوں نے ہربار اور ہر مقام پر گاندھی جی کی زندگی کو اُن کے نظریات اور اُن کی تعلیمات کو پیشِ نظر رکھا، اسی لئے تو اُن کو گاندھی جی کا سب سے بڑا پیرو مانا جاتا ہے۔

زرعی پیداوار میں اضافہ

اقوام متحدہ کے ادارۂ خوراک و زراعت کی علاقائی کانفرنس میں بھارتی وفد کے لیڈر پروفیسر رنگا نے بیان کیا کہ حکومت کی جدوجہد کی بدولت گزشتہ پانچ سال میں زرعی پیداوار میں قابلِ قدر اضافہ ہُوا ہے اور پنج سالہ پلان کے پایۂ تکمیل تک پہنچنے پر اجناسِ خوراک کی پیداوار میں بہت نمایاں اضافہ ہو جائے گا۔ بھارت چاول کی ضروریات کے لئے خود کفیل ہو جائے گا۔ پٹ سن اور خام روئی کی فراہمی کے لئے غیر ملکوں کا دست نگر نہ رہے گا، چینی بھی کافی مقدار میں دستیاب ہونے لگے گی بلکہ اس امر کی بھی توقع ہے کہ تلہن کی پیداوار بھی موجودہ فی کس شرح پر قائم و برقرار رہے۔

بھارتی نمائندے نے بتایا کہ اناج کی پیداوار ۵۳-۱۹۵۲ء میں گزشتہ سال کے مقابلے میں چالیس لاکھ ٹن زیادہ رہی۔ پلان کے پہلے سال خام روئی کی پیداوار ۲۰ لاکھ ۳۰ ہزار گانٹھ زیادہ رہی اور ۴۹-۱۹۴۸ء کے مقابلے میں پٹ سن کی پیداوار میں بھی ۲۰ لاکھ ۶۰ ہزار گانٹھوں کا اضافہ ہُوا۔ ۵۲-۱۹۵۱ء میں چینی کی پیداوار چالیس لاکھ ٹن زیادہ رہی۔ لیکن تلہن کی پیداوار میں کمی ہوئی ہے یعنی ۵۲-۱۹۵۱ء کی پیداوار پچاس لاکھ دس ہزار ٹن تھی جبکہ ۵۳-۱۹۵۲ء میں یہ پیداوار ۴۰ لاکھ ۸۰ ہزار ٹن رہ گئی۔

پروفیسر رنگا نے حکومت کے ان اقدامات کی وضاحت کی جو زرعی پیداوار کے اضافے کی غرض سے عمل میں لائے گئے ہیں۔ مثلاً کاشتکاروں کو بیج، کھاد، آبپاشی، زرعی ادنار قرضہ جات کی فراہمی۔ علاوہ ازیں حکومت نے سندری فیکٹری میں تین لاکھ ٹن ایمونیم سلفیٹ کی پیداوار کے باوجود غیر ملکوں سے مصنوعی کھاد کی درآمد کے انتظامات بھی کئے۔

ایورسٹ کی فتح

۲۹ مئی ۱۹۵۳ء ایک تاریخی دن ہے۔ اس دن انسان نے ایورسٹ فتح کر کے وہ عظیم الشان کامیابی حاصل کی ہے جس کی یاد رہتی دُنیا تک رہے گی۔ اس فتح نے انسان کا قدم دنیا کی سب سے اُونچی چوٹی تک پہنچا دیا ہے۔ اس سے انسان کی خوش اعتمادی میں اضافہ ہُوا ہے اور اب وہ یہ کہہ سکتا ہے کہ اس سرزمین میں کوئی جگہ ایسی نہیں ہے جہاں میں نہیں جا سکتا ورنہ ابھی کل ہی کی بات ہے کہ یہ بلندی بہت دُور تھی۔

اس مہم کی کامیابی کا سہرا نیوزی لینڈ کے کوہ پیما اے۔ پی ہلاری اور ڈارجلنگ کے باشندے شرپا تین سنگھ کے سر ہے۔ شرپا تین سنگھ کی پیدائش نیپال کی ہے لیکن وہ ایک مدت قبل ہندوستان کا شہری بن چکا ہے۔ گذشتہ بتیس برسوں میں یہ ایورسٹ پر گیارھواں حملہ تھا جن میں سے نو حملوں میں آزمودہ کار، اُنتالیس سالہ کوہ پیما تین سنگھ شریک ہُوا۔ ایورسٹ پر اتنی چڑھائیاں کسی دوسرے شخص نے نہیں کیں۔ تین سنگھ کے معنی ہیں شیر، اور یہ لقب اس کو حکومت نیپال نے اس کی کوہ پیمائی کی کامیابیوں کے صلے میں دیا تھا۔ ماؤنٹ ایورسٹ پر سوئٹزرلینڈ اور برطانیہ کے باشندوں نے جتنی بھی چڑھائیاں کی ہیں ان سب میں شرپا تین سنگھ شریک رہا۔ یہ شرپا تین سنگھ ہی تھا جو سوئٹزرلینڈ کے کوہ پیما ریمنڈ لیمبرٹ کے ساتھ پچھلے سال ۲۸ مئی کو اٹھائیس ہزار دو سو پندرہ فٹ کی بلندی پر پہونچ گیا تھا۔ اس سے پہلے کوئی انسان اتنی بلندی تک نہیں پہونچ سکا تھا۔ ٹھیک ایک سال ایک دن بعد ۲۹ مئی ۱۹۵۳ء کو اس نے ایورسٹ کی سربلند چوٹی کو سر کر لیا۔

تین سنگھ نے بچپن میں اپنے والدین اور دادا دادی سے پہاڑوں پر چڑھنے کی شوق ملانے والی کہانیاں سُنی تھیں اسی شوق میں وہ ایک بار اپنے گھر والوں سے روٹھ کر بھوٹان سے جو مشرقی نیپال میں ایک چھوٹا سا گاؤں ہے، بھاگا اور ایک سٹیشن کی ۱۹۳۵ء والی مہم میں مزدور کی حیثیت سے بھرتی ہو گیا۔ اس کے بعد سے آج تک تین سنگھ ہر سال اور کبھی تو سال میں دو دو تین تین بار ہمالیہ کی چوٹیوں پر چھبیس ہزار سے لے کر چھبیس ہزار فٹ کی بلندی پر چڑھتا رہا۔ سب سے زیادہ حیرت کی بات یہ ہے کہ وہ گذشتہ سال اٹھائیس ہزار دو سو پندرہ فٹ کی بلندی تک بغیر آکسیجن کے تھیلوں کے پہنچ گیا تھا۔

لیمبرٹ کے ساتھ اس نے دُنیا کا ایک ریکارڈ یہ بھی قائم کیا ہے کہ ستائیس ہزار پانچ سو فٹ کی بلندی پر ایک رات بسر کی۔ یہ ریکارڈ ان دونوں نے ۱۹۵۲ء کے موسم بہار کی مہم میں قائم کیا تھا۔ انھوں نے اس بلندی پر ایک خیمے میں رات اس طرح بسر کی کہ سونے کے لئے نہ تو بستر تھا نہ بچھانے کے لئے توشہ۔ کھانے کا سامان بھی نہ تھا۔ موم بتی سے برف پگھلا کر وہ صرف کچھ پانی حاصل کر سکتے تھے۔ یہ لوگ سوئے نہیں بلکہ ایک دوسرے کو تھپکیاں دے دے کر کسی طرح دورانِ خون برقرار رکھنے کی کوشش کرتے رہے۔ موسم کی خرابی کی وجہ سے دوسرے دن انھوں نے آگے بڑھنے کا

ارادہ ترک کر دیا۔

ایورسٹ سر کرنے کے لئے ۱۹۲۱ء میں سب سے پہلے برٹینیہ کی ایک ٹولی نے کوشش کی۔ اس ٹولی کی قیادت کرنل سی کے ہاورڈ بیوری کر رہے تھے۔

اس کے بعد کے تیس سال کی مدت میں جو مہمیں آتی رہیں وہ سب ناکام رہیں اور بعض میں تو لوگوں کی جانیں بھی گئیں۔ پہلی سات کوششیں پہاڑ کے شمالی رُخ کی طرف سے ہوئیں لیکن تبت پر چین کا قبضہ ہو جانے کے بعد کی کوششیں نیپال کی طرف سے ہوئیں۔ جنگ ختم ہو جانے کے بعد سے جاپانی، برطانیہ، سوئٹزرلینڈ اور جرمنی کی ٹولیاں ایورسٹ سر کرنے کی کوششیں کر چکی ہیں۔ تین سنگھ اور ہلیری دونوں ایک سٹیشن کی ۱۹۵۱ء والی اس مہم میں شامل تھے جس نے چوٹی پر چڑھنے کا جنوبی راستہ دریافت کیا۔

اس سلسلے میں ہم کو مشہور سیّاح اور مصنف پنگ ہس بنیڈ کو نہ بھولنا چاہیئے کیونکہ اس تحریک میں اصل جان اسی کی ڈالی ہوئی ہے۔ جب وہ نیشنل جاگرے فیلی سوسائٹی کا صدر ہُوا تو اُس نے یہ فیصلہ کیا کہ سوسائٹی کی طرف سے ایسی تحریک چلائی جا سکتی ہے اور یہ چیز علمی اور انسانی ترقی میں مدد گار ہوگی۔ پہلی انگریزی مہم نے راستوں کا پتہ لگایا اور حالات کا جائزہ لیا۔ اس مہم کی رہنمائی مودی نام کے ایک انگریز کے ہاتھ میں تھی۔

تیسری ٹولی ۱۹۲۲ء میں گئی۔ اس ٹولی نے اٹھائیس ہزار ایک سو فٹ کی بلندی پر رات بسر کی اور پھر دوسری صبح ایورسٹ کو سر کرنے کے لئے روانہ ہو گئے۔ ساتویں کیمپ کے ایک آدمی نے جو آٹھویں کیمپ کی طرف آ رہا تھا۔ ہم کے دو افراد کو سرنیفک چوٹی کے پاس ایک جھلک دیکھی اور پھر بس آگیا لیکن یہ دونوں پھر بھی واپس نہ آئے۔ ان کے بارے میں یہ خیال کیا جاتا ہے کہ وہ چوٹی تک تو پہنچ گئے لیکن واپسی میں شاید پیر پھسل جانے سے ہلاک ہو گئے۔

اس کے بعد جو ٹولیاں گئیں انھیں کوئی خاص کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔ ۱۹۵۱ء میں نیپال کی طرف سے ہم سر کرنے کا خیال پیدا ہُوا اور اس راستے کی جانچ کی گئی۔ اسی طرف سے سوئٹزرلینڈ کے کوہ پیماؤں کی ایک ٹولی پہلی بار ۲۸۲۱۵ فٹ کی بلندی تک پہنچنے میں کامیاب ہوئی اور اس بار یہ بلندی سر کر لی گئی۔

شرپا تین سنگھ اور ہلاری کو آخری بلندیاں طے کرنے میں بے حساب دشواریاں پیش آئیں۔ یورپ کا کوئی پہاڑ سولہ ہزار فٹ سے اُونچا نہیں ہے اور ہمالیہ کے کوہ پیماؤں کا دعویٰ ہے کہ اصل دشواریاں تو اس بلندی کے بعد پیدا ہوتی ہیں۔ آکسیجن کے ڈبے پوری طرح ضرورت کو پورا نہیں کرتے اور اس بلندی پر معمولی سی حرکت بھی کوہ پیما کے لئے سخت اذیت اور کرب کا باعث ہوتی ہے۔ موسم ایک دوسری دشواری ہے اور سال بھر میں مئی اور ستمبر میں دو ہی تین ہفتے ایسے ملتے ہیں جن میں چڑھائی کا کوئی خیال بھی ذہن میں لایا جا سکتا ہے۔ موجودہ مہم اور پچھلی مہموں میں جو تجربات حاصل ہوئے ہیں وہ ہمالیہ کی دوسری چوٹیوں کی چڑھائی کے لئے نہایت بیش قیمت ثابت ہوئے ہیں۔

تین سنگھ نے بالائی بلندیوں کا حال اس طرح بیان کیا ہے۔ "ان بلندیوں پر جب آپ تھوکتے ہیں تو تھوک برف بن کر پتھر کی طرح گرتا ہے۔ آپ جو سانس باہر نکالتے ہیں اُس کی بھاپ برف بن کر مُونچھ پر چپک جاتی ہے۔ آپ صرف ایک منٹ چل سکتے ہیں اور اس کے بعد پانچ منٹ آرام کرنا پڑتا ہے۔"

تین سنگھ کے ایک جگری دوست ڈی بی رائے نے ایک مضمون میں اس کا حال ان الفاظ میں بیان کیا ہے "سولہ ہزار فٹ کی بلندی پر وہ بھوک پیاس سب کچھ بھول جاتا ہے۔ اس کو ذرا بھی ڈر نہیں معلوم ہوتا۔ بچے بھی یاد نہیں آتے جیسے وہ خواب میں ہو۔ صرف ایک مقصد اس کے سامنے ہو جاتا ہے، یہ کہ کسی طرح چوٹی پر پہنچ جائے۔"

اس میں بغیر آکسیجن کے بالائی بلندیوں پر چڑھنے کی عجیب و غریب قوت ہے - جس کی وجہ سے اس کے دوست اُس کو یہ کہہ کر چڑاتے ہیں کہ تیرے پاس کوئی تیسرا چھپا ہوا پھیپھڑا ہے - کرنل ہنٹ کے گروہ میں شامل ہونے کے لئے جب وہ دارجلنگ سے روانہ ہوا تو اُس کے دوستوں نے اُس کو سفید رومال تحفے میں دئے جن کو کامیابی کا شگون سمجھا جاتا ہے - اس کی سلامتی اور کامیابی کے لئے خاص طور سے دعائیں بھی مانگی گئیں - کرنل ہنٹ کی ٹیم میں اُس کو دوسرے باقاعدہ نمبروں کا درجہ دیا گیا اور وعدہ کیا گیا کہ اگر دوسرے کوہ پیما اُس کا ساتھ نہ دے سکے تو بھی اُسے آگے بڑھنے دیا جائے گا - اپریل میں نچلی بازاروں میں اپنے دوستوں سے رخصت ہوتے وقت اُس نے کہا تھا کہ "اگر موسم ٹھیک رہا تو کوئی طاقت مجھے چوٹی پر پہنچنے سے نہیں روک سکتی"

اُتر پردیش میں کھیتی اور سنچائی

کھیتی کو ترقی دینے کے سلسلے میں اُتر پردیش کی حکومت نے ۱۹۴۶ء سے ۱۹۵۲ء تک جو اقدامات کئے اُن کی بنا پر پیداوار میں تخمیناً ۷ لاکھ ٹن کا اضافہ ہوا - اس مدت میں سیکڑوں نئے ٹیوب ویلس (نل کوپ) لگائے گئے - نئی نالیاں اور کئی ہزار میل لمبی نئی نہریں بنائی گئیں اور تقریباً ۲۲۹۹۰۰۰ ایکڑ پرتی اراضی پر کھیتی کی گئی - ۱۶ لاکھ ایکڑ سے زیادہ اراضی کو آبپاشی کی سہولتیں فراہم کی گئیں

زیرِ نظر سال میں جو کام کئے گئے اُن میں سیکڑوں نل کنوؤں کی تعمیر نئی نہروں کی کھدائی اور باندھوں کی تعمیر شامل ہے - چندر پربھا باندھ، ارجن باندھ، ماتا ٹیلہ باندھ اور بیلن نہر کی تعمیر کے سلسلے میں کام کی رفتار تیز رہی - ۱۲۵۰۰۰۰ ایکڑ بنجر زمین کو توڑ کر قابل کاشت بنانے کا کام جاری ہے -

سنچائی سے متعلق پروگرام پر تیزی سے عمل کیا جا رہا ہے - ۴۰ ٹیوب ویلس تقریب تعمیر کئے جا چکے ہیں - لکھنؤ میں ہائیڈل بجلی کا ایک حرمنی اسٹیشن قائم کیا گیا ہے جو ان ٹیوب ویلس میں سے ۲۵۰ کو بجلی سپلائی کریگا

جنوبی کھنڈ کے علاقے میں ۱۹۵۱ء کے آخر تک لات پور، سہراد اور کھرئی باندھ تعمیر سے سنچائی کے تین بڑے منصوبوں کی تکمیل کی گئی - اب ۱۰۵۰۰۰ ایکڑ مزید اراضی کی آبپاشی کی جا سکے گی - امراوہ، غیتی تال، گڑھوال اور ٹہری گڑھوال کے پہاڑی اضلاع میں ۲۵۰ میل لمبی نہروں کی کھدائی میں خاص ترقی ہوئی - مرکزی علاقہ ہزار میل لمبی نہروں کی تعمیر کے منصوبے کو بروئے کار لانے میں کافی کامیابی ہوئی - اس سال سارداہ نہر کی توسیع کر کے اس کے پانی میں ۲۰ فیصدی اضافہ کرنے کا کام بھی کیا گیا - اس طرح پردیش کے مغربی حصے میں اپر گنگا کینال میں بھی پانی کی مقدار میں اضافہ کیا جا رہا ہے -

حصولِ آزادی سے قبل پردیش کے مشرقی اضلاع میں نہ تو کافی مقدار میں پکے کنوئیں تھے اور نہ رہٹ - پچھلے کچھ برسوں میں ان اضلاع میں سنچائی کی سہولتیں کافی حد تک فراہم کی گئی ہیں - سنچائی سے متعلق جو کام اب تک ہوئے ہیں ان میں بڑی تعداد میں پکے کنوؤں کی تعمیر، پرانے کنوؤں کی مرمت اور پینچٹ لگانا اور ٹیوب ویلس لگانے کے کام شامل ہیں - ان کے علاوہ ۲۴ لاکھ روپیوں کی لاگت سے بان گنگا نہر کی اسکیم کو بروئے کار لایا جا رہا ہے - اور سرکاری امداد سے کئی ہزار پکے کنوئیں تعمیر کئے جا رہے ہیں -

پسماندہ لوگوں کے مسائل

پسماندہ طبقوں اور پسماندہ نسلوں کے مسائل کا موازنہ کرنا مفید ثابت ہو سکتا ہے۔ یہ تمام مسائل انسانی سماج کی تنظیم کے ادھورے پن سے پیدا ہوئے ہیں۔ نسل انسانی کی قدیم تاریخ کے بارے میں جو حالات معلوم ہوتے ہیں وہ کسی حد تک مبنی بر قیاس ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نسل انسانی کے ابتدائی دور میں لوگ چھوٹے چھوٹے گروہوں کی صورت میں بہتر ذرائع روزگار کی تلاش میں سرگرداں رہتے تھے اور جس جگہ انہیں زیادہ آرام میسر آنے کا امکان نظر آتا وہیں ڈیرا ڈال لیتے تھے۔ اس طرز زندگی سے قدرتی طور پر ان میں قبیلہ بندی کا احساس پیدا ہوا۔ اس زمانے میں ہر قبیلہ امداد باہمی اور مشترکہ سماجی زندگی کے کڑے قواعد کا پابند ہوتا تھا۔ ان خانہ بدوش قبیلوں کی کئی دفعہ باہم ٹکر ہو جاتی تھی اور انہیں باہمی تعلقات طے کرنے کے لئے کوئی نہ کوئی طریقہ اختیار کرنا پڑتا تھا۔ یہ امر قرین قیاس ہے کہ کچھ قبیلوں نے مل جل کر پُر امن زندگی بسر کرنے پر اظہار اتفاق کیا ہو اور بعض قبیلے باہمی کشمکش میں اُلجھ کر ایک دوسرے کو ختم کرنے کی کوششوں میں مصروف ہو گئے ہوں۔ لیکن کسی کی یہ کبھی فطرت انسانی کے مطابق نہیں۔ اس لئے وہ کوئی نہ کوئی درمیانی راہِ عمل تلاش کر لیتا ہے۔ غلامی کا رواج شاید اسی جذبے کا نتیجہ تھا اور مختلف قبیلوں نے شکست خوردہ قبیلے کا وجود ختم کرنے کی بجائے اس کے افراد کو غلام بنانا بہتر خیال کیا۔ کمزور قبیلوں نے طاقتور قبیلوں کی شرائط پر غلامی کی ذلت قبول کر لی اور دشمن کی جان لینے کی بجائے اس کی روح کو کچلنے میں زیادہ خوشی محسوس کی جانے لگی۔

نسلی کشمکش کے مسئلے کو حل کرنے میں محبت یا شادی کرنے کے جذبے کو بھی دخل حاصل ہے۔ کئی دفعہ ان مردوں اور عورتوں میں محبت ہو جاتی ہے جن میں مدتوں سے خاندانی رقابت چلی آ رہی ہو۔ اس لئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ محبت کا جذبہ شروع سے ہی نسلی منافقت کو دور کرنے میں معاون ثابت ہوتا رہا ہے۔

مہابھارت کا آغاز آریہ اور ناگ جاتیوں کی کشمکش سے ہوتا ہے۔ آریوں نے ایک دفعہ جذبۂ انتقام سے کام لیتے ہوئے ناگ لوگوں کا نام و نشان مٹانے کا فیصلہ کیا لیکن آستک رشی نے یہ جنگ نہ ہونے دی اور انہوں نے فریقین کو ایک دوسرے سے رواداری برتنے کی تلقین کی۔ اس کے بعد آریہ اور ناگ لوگوں میں باہمی شادیوں کا رواج چل پڑا اور وہ ایک نسل کی شکل اختیار کر گئے۔ اس طرح جو مقصد جنگ سے حاصل نہیں ہو سکتا تھا وہ باہمی محبت سے پورا ہو گیا۔

دو قبیلوں یا نسلوں کی ٹکر کا نتیجہ کسی ایک فریق کی غلامی کی صورت میں رونما ہو سکتا ہے لیکن پُر امن حالات میں یہ صورت زیادہ مدت تک قائم نہیں رہ سکتی اور غلامی کی شرائط کا نرم ہونا اور متعلقہ قبیلوں یا نسلوں کے درمیان کسی قسم کا تصفیہ ہو جانا قدرتی ہے۔ بعض دفعہ فاتحین مغلوب کو اپنے طرز زندگی کے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کرتے ہیں وہ اپنا مذہب سماجی نظام اور لباس وغیرہ مفتوح

لوگوں پر ٹھونسنا چاہتے ہیں۔ لیکن اس کے عین برعکس بعض دفعہ فاتحین میں یہ جذبہ کارفرما ہوتا ہے کہ وہ مغلوب قبیلے و نسل کے افراد کو اپنی زبان سیکھنے یا اپنے طرز زندگی کی نقل کرنے کی اجازت نہیں دیتے۔ کہا جاتا ہے کہ رومن بادشاہ اپنے غلاموں کی موجودگی میں لاطینی میں گفتگو کرنے سے پرہیز کیا کرتے تھے تاکہ غلام ان کی بات چیت سن کر حکمرانوں کی زبان نہ سیکھ جائیں۔ اسی طرح بھارت میں بھی داسوں اور شودروں کو سنسکرت زبان اور آریوں کے رسم و رواج سے دور رکھنے کی کوشش کی گئی۔ پیشواؤں کے زمانے میں برہمن حکمران اپنے کالسٹھ ساتھیوں کو بیوگان کی دوسری شادی کے رواج کے خلاف تحریک چلانے کی اجازت نہیں دیتے تھے انہیں اندیشہ تھا کہ کالسٹھوں میں بیوگان کی شادی کرنے کا رواج ختم ہو گیا تو وہ براہمنوں کے مساوی درجہ حاصل کر لیں گے۔

ایک دوسرے کے رسم و رواج اختیار کرنے کا نتیجہ یہ بھی ہوتا ہے کہ ایک قبیلہ یا نسل دوسرے قبیلہ یا نسل میں جذب ہو جاتی ہے۔ اسی لئے اعلےٰ نسل ایک ادنےٰ نسل کے افراد کو حکمرانوں کے طور طریقوں کی نقل کرنے کی اجازت نہیں دیتی۔ مجھے یاد ہے کہ ایک دفعہ معمولی تنخواہ پانے والے ایک انگریز ریلوے ملازم اس بنا پر ایک ہندوستانی کے انگریزی میں بات چیت کرنے پر معترض ہوا تھا کہ کالے آدمی کو انگریزی میں بات چیت کرنے کا حق حاصل نہیں۔

افریقہ کی کالی نسلیں اب آہستہ آہستہ باہمی ہمدردی کے جذبے سے متاثر ہو کر متحد ہو رہی ہیں۔ ایشیا کے لوگوں میں بھی اتحاد پیدا ہو رہا ہے اور وہ ایک دوسرے سے اظہار ہمدردی کرنے لگے ہیں۔ اسی طرح فاتح نسلیں بھی باہمی تفرقات کو زیر کر کے مشترکہ مقاصد کے حصول کے لئے ایک دوسرے کے نزدیک آ گئی ہیں۔ ایشیا اور افریقہ کے باشندوں کے مقابلے میں یورپی طاقتوں کے اتحاد میں یہی جذبہ کارفرما ہے۔ اپنی ہستی کو قائم رکھنے کا یہ جذبہ خواہ کتنا ہی قدرتی ہو اس کا نتیجہ عالمگیر پیمانے پر نسلی کشمکش کی صورت میں رونما ہوتا ہے۔ سوشلزم اور کمیونزم کا فلسفہ بھی اس نسلی کشمکش پر قابو پانے میں کامیاب ثابت نہیں ہوا۔ کمیونزم اور سرمایہ دارانہ نظام کی ٹکر۔ اس نسلی کشمکش کے نتائج کے سامنے زیادہ حقیقت نہیں رکھتی۔

ہمیں اپنے ملک میں بھی نسل اور ذات پات کی صورت میں باہمی کشمکش کا سامنا ہے۔ ہم یہ نہیں جانتے کہ نسل اور ذات پات کی کشمکش کے درمیان حدِ فاصل کون سی ہے ہم یہ بھی نہیں جانتے کہ مختلف مذاہب کی باہمی کشمکش جزوی طور پر نظریاتی ہے یا نہیں۔ ہمیں اس سلسلے میں زیادہ باریک بینی کی ضرورت بھی نہیں۔ اصلی مقصد تو کوئی ایسا راہِ عمل تلاش کرنا ہے جس پر چلنے سے مختلف نسلوں اور قبیلوں میں اشتراک پیدا ہو۔ بھارت کے تہذیب و تمدن کا ایک خصوصی پہلو فلسفہ عدم تشدد ہے۔ اس کے مطابق نسل، مذہب اور یہاں تک کہ مالی مفاد کا اختلاف بھی پُر امن زندگی کے راستے میں حائل نہیں ہو سکتا اور مختلف مذاہب و نسلوں کے لوگ ایک رہ کر بھی با امن زندگی بسر کر سکتے ہیں۔ جب بھی کسی نسل، قبیلے یا طبقے کے افراد جنگ سے اکتا جاتے ہیں تو وہ دوسرے فریق کی خوشنودی حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ طریقہ ہمیشہ ہی خطرناک ثابت ہوا ہے۔ اس سے مخالف فریق کی حرص اور بھی بڑھتی ہے اس مسئلے کا صحیح حل کسی ایک فریق کو ناجائز طور پر خوش کرنے کے ذریعے سے نہیں بلکہ ایک دوسرے کے طرز زندگی اور اصولوں اور ایک دوسرے کے بارے میں پائی جانے والی غلط فہمیوں کا ہمدردانہ مطالعہ کرنے کے ذریعے سے تلاش کیا جا سکتا ہے محبت اور باہمی خدمت کے جذبے سے ایک دوسرے کے نقطۂ نگاہ کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔ باہمی محبت اور

عزت کے جذبات سے متحرک ہو کر دوسرے فریق کو جو امداد بہم پہنچائی جائے اس کا نتیجہ آہستہ آہستہ دونوں فریقوں میں میل ملاپ کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ کسی فریق کو ناجائز طور پر خوش کرنے کے عوض اس سے طاقت آزمائی کر لینا بہتر ہے۔

باہمی محبت اور خدمت کے طریقے پر عمل کرنے کے لئے تبدیلیٔ دل کی ضرورت ہے۔ اس کے لئے یہ ضروری ہے کہ دلوں میں بنی نوع انسان کے لئے برادری پن کا احساس بیدار کیا جائے۔ تہذیب و تمدن کے میدان میں زیادہ ترقی یافتہ اور پسماندہ طبقوں کے افراد ایک دوسرے کو سگے بھائی سمجھنا شروع کریں۔ صرف اسی طریقے سے مختلف نسلوں کی پسماندگی کا مسئلہ حل کیا جا سکتا ہے۔ کسی ایک فرقہ، نسل یا قوم کے مختلف گروہوں کی پسماندگی کو دور کرنے کا بھی یہی ایک طریقہ ہے۔ اس کے لئے آغاز میں یک طرفہ کارروائی کی ضرورت ہوگی۔ اور یہ اسی صورت میں ممکن ہے جبکہ کسی انسان کا فطرت انسانی میں اعتماد نہایت ہی پختہ شکل اختیار کر چکا ہو۔ پرانے خیال کے لوگ یہ کہتے ہیں کہ انہیں اچھوتوں کو اپنی برادری کا حصہ خیال کرنے پر کوئی اعتراض نہیں لیکن چونکہ بزرگوں نے انہیں اچھوتوں سے دور رہنے کی ہدایت کی تھی اس لئے وہ ان ہدایات کے خلاف عمل نہیں کر سکتے۔

اچھوتوں اور قدیم نسلوں سے تعلق رکھنے والے اصل باشندوں کو امداد بہم پہنچانا وقت کا فوری تقاضا ہے۔ دوسرے پسماندہ طبقوں کو بھی فی الفور امداد بہم پہنچائی جانی چاہیئے۔ حکومت کو ان لوگوں کی مدد کے لئے ہر ممکن کوشش کرنی چاہیئے۔ شیڈولڈ کاسٹس، شیڈولڈ قبائل اور دوسرے پسماندہ طبقوں کی حالات کے مطابق ہر ممکن مدد کی جائے۔ اس میں کسی قسم کی تاخیر کی گنجائش نہیں۔ تاہم اس مسئلے کے صحیح حل کا انحصار پرانے خیال کے لوگوں کے رویّے پر ہے۔ ان لوگوں کو یہ سمجھانے کی ضرورت ہے کہ باہمی محبت اور انسانی برادری کے جذبات ذات، نسل اور مذہب کی تفریق سے افضل ہیں۔ اگر ہم اپنے ملک میں اس مسئلے کو حل کرنے میں کامیاب ہو جائیں تو ہم غیر ملکوں میں بھی نسلی کشمکش کے مختلف مسائل کو حل کرنے، بنی نوع انسان کے ایک برادری سے تعلق رکھنے کے نظریہ کو عملی شکل دینے اور دنیا کی ترقی کے لئے دائمی امن کے قیام میں معاون ثابت ہو سکیں گے۔

ملکی معلومات

(۱) بھارتی ریلوں کے محاصل مرکزی اور صوبائی سرکاروں کی مجموعی آمدنی کا ۳۴ فیصدی حصہ ہیں۔

(۲) ۱۹۵۱ء کے اختتام پر بھارت میں بیمہ زندگی کے کاروبار میں ۷ ارب ۹۲ کروڑ ۹۴ لاکھ روپیہ لگا ہوا تھا۔ پالیسیوں کی تعداد ۳۴ لاکھ ۱۴ ہزار تھی جن کے پریمیم سے ۳۹ کروڑ ۷۴ لاکھ روپے کی آمدنی تھی۔

(۳) ۱۹۴۶-۴۷ء میں بھارت میں ۵۳ لاکھ ۲۰ ہزار ایکڑ زمین میں ترقی یافتہ اقسام کی روئی کاشت کی گئی جبکہ ۱۹۵۱-۵۲ء میں ۸۷ لاکھ ۷۰ ہزار ایکڑ رقبہ زمین میں مندرجہ بالا اقسام کی روئی کاشت کی گئی۔

(۴) ۱۹۵۱ء میں بھارت میں ۸۵۹ ٹن سیسہ حاصل ہوتا تھا جو کہ ۱۹۵۲ء میں بڑھ کر ۱۱۳۲ ٹن ہو گیا۔

(۵) ۱۹۵۱-۵۲ء میں مرکزی اکسائز ڈیوٹی سے ۸۴ کروڑ روپیہ وصول ہوا۔

مسئلۂ کشمیر

پاکستان اور بھارت کے وزرائے اعظم نے نئی دہلی میں ۲۰۔ اگست ۱۹۵۳ء کو اپنی بات چیت کے خاتمے پر مندرجہ ذیل مشترکہ اعلان نامہ جاری کیا ہے۔

(۱) پاکستان اور بھارت کے وزرائے اعظم نے نئی دہلی میں ۱۷، ۱۸، ۱۹ اور ۲۰۔ اگست کو آپس میں بات چیت کی۔ تین ہفتے پیشتر کراچی میں دونوں وزرائے اعظم کی جو کانفرنس ہوئی تھی، یہ کانفرنس بھی اُسی سلسلے میں تھی۔ دونوں ملکوں کے مابین کشمیر اور دوسرے متنازعہ اُمور پر کھلے طور پر اور پوری طرح تبادلۂ خیال کیا گیا۔ ہر دو وزرائے اعظم اپنے دلوں میں اس امر کا تہیہ کئے ہوئے تھے کہ جتنا جلدی ہو سکے امن اور باہمی تعاون اور دونوں ملکوں کے مفاد کو مدِنظر رکھتے ہوئے اِن مسائل کا حل نکالا جائے۔

(۲) کشمیر کے مسئلے پر خاص طور پر تفصیل سے بات چیت ہوئی۔ دونوں کی ہی یہ واضح رائے ہے کہ اس مسئلے کا حل اُس ریاست کے عوام کی رائے کے مطابق اُن کے مفاد کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اور ریاست کے عوام کے مال و جان کو معمولی سا بھی نقصان پہنچائے بغیر نکالا جائے۔ عوام کی رائے دریافت کرنے کا سب سے مناسب طریقہ جانبدارانہ اور انصاف پسندانہ استصواب رائے ہے۔ استصواب رائے کی تجویز بہت مُدت پیشتر کی جا چکی ہے۔ لیکن کچھ ابتدائی معاملات پر سمجھوتہ نہ ہو سکنے کی وجہ سے اس میں ترقی نہ کی جا سکی۔ دونوں وزراء اعظم تسلیم کرتے ہیں کہ وہ ان ابتدائی مسائل پر براہِ راست غور کریں تاکہ اُن کے متعلق کسی سمجھوتے پر پہنچا جا سکے۔ پہلے اس سمجھوتے پر عمل درآمد کرنا ہوگا اور اس کے بعد دوسرا قدم استصواب لئے کے لئے ایڈمنسٹریٹر مقرر کرنا ہوگا۔

(۳) عارضی پروگرام طے کرنے کے لئے یہ فیصلہ کیا گیا کہ استصواب رائے کے لئے ایڈمنسٹریٹر کا تقرر اپریل ۱۹۵۴ء کے اختتام تک کر دیا جائے۔ اس تاریخ سے پیشتر مندرجہ بالا ابتدائی مسائل کا فیصلہ ہو جانا چاہیئے اور انہیں عمل میں لانے کے لئے کارروائی بھی مکمل ہو جانی چاہیئے۔ اس مقصد کے لئے وزراء اعظم کو مشورہ دینے کے لئے فوجی اور دوسرے ماہرین کی کمیٹیاں مقرر کی جانی چاہئیں۔ ریاست جموں اور کشمیر کی حکومت استصواب رائے کے لئے ایڈمنسٹریٹر مقرر کرے گی۔ اپنا عہدہ سنبھال لینے کے بعد ایڈمنسٹریٹر حالات کی چھان بین کرے گا اور اس کے متعلق اپنی رپورٹ دے گا۔ اس کے بعد وہ ساری ریاست میں ٹھیک اور غیر جانبدار استصواب رائے کے لئے تجاویز رکھے گا اور اس کام کو پورا کرنے کے لئے جو کارروائی مناسب سمجھے گا انجام دے گا۔

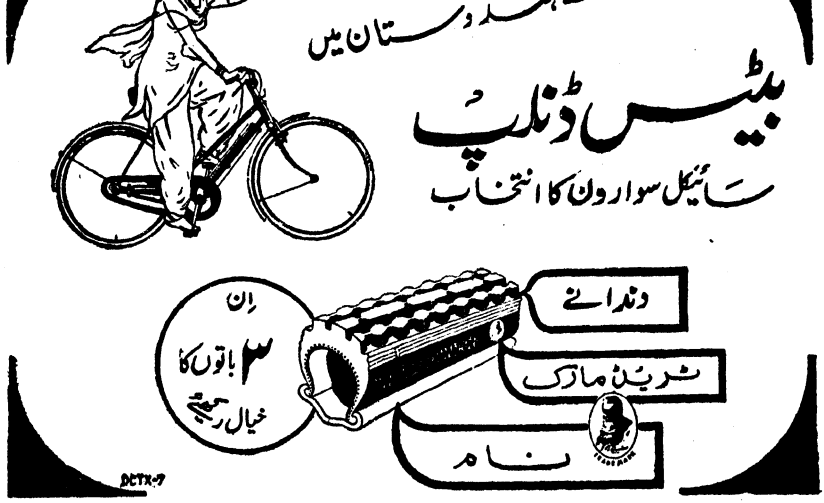
(۴) وزراء اعظم نے نکاسی جائیدادوں کے مسئلے پر بھی سوچ بچار کیا اور اس امر پر اطمینان کا اظہار کیا کہ دونوں حکومتوں کے نمائندوں کے مابین کراچی میں جو گفت و شنید ہوئی اس میں کافی ترقی ہوئی ہے۔ اب آخری فیصلے کے لئے کچھ بنیادی امور طے کئے جا رہے ہیں امید کی جاتی ہے کہ ان مسائل پر غور کرنے کے لئے ایک مہینے کے اندر دونوں حکومتوں کے نمائندوں کی ایک مزید میٹنگ منعقد ہوگی۔

(۵) کراچی میں ہر دو وزراء اعظم کی میٹنگ میں وہ اس پر رضامند ہو گئے تھے کہ مشرقی بنگال میں کوچ بہار کے

اور کوچ بہار میں مشرقی بنگال کے پاکٹوں کا باہمی تبادلہ کیا جائے گا - اس سلسلے میں یہ بھی فیصلہ ہوا تھا کہ اس سلسلے میں ضروری تفاصیل طے کرنے کے لئے جلد از جلد کلکتے میں ایک کانفرنس منعقد کی جائے - کانفرنس میں تجارت اور آمد و رفت کے متعلقہ مسائل خصوصاً مشرقی بنگال، مغربی بنگال اور آسام کے مسائل پر بھی غور و خوض ہوگا - اس کانفرنس میں مشرقی بنگال، مغربی بنگال، آسام اور دونوں مرکزی حکومتوں کے نمائندے شامل ہوں گے -

(۹) ہر دو وزراء اعظم کو دونوں ممالک سے متعلقہ اہم مسائل پر اتنے زیادہ اتفاق رائے پر نہایت خوشی ہے - انہیں یقین ہے کہ ان کی کوششیں مزید کامیابی حاصل کریں گی تاکہ وہ سارے مسائل جو ابھی تک دونوں ممالک کے مابین خیر سگالی کے تعلقات میں رکاوٹ ہیں، تسلی بخش طور پر حل کئے جا سکیں لیکن اس باب میں ترقی تبھی ممکن ہے جب کہ دونوں ممالک کے مابین امن اور تعاون کی فضا ہو - اس لئے ایسی فضا قائم کرنے کی حوصلہ افزائی کی جانی چاہیئے - دونوں ملکوں کے اخباروں، ریڈیو اور ذمے دار مردوں اور عورتوں کو ایک دوسرے کے خلاف پراپیگنڈے کی دونوں وزراء اعظم مذمت کرتے ہیں - اس لئے انہیں یقین ہے کہ سب اخبار اور عوام کے ذمے دار لیڈر دونوں ممالک کے مابین خیر سگالی کی فضا پیدا کرنے کے بڑے کام کی طرف متوجہ ہو کر دونوں ملکوں کے مسائل اور جھگڑوں کو ختم کرنے میں امداد کریں گے - اس دوستانہ طریق کار اور دونوں ملکوں میں نفرت بڑھانے والے الفاظ اور اعمال سے بے تعلقی کو دونوں وزراء اعظم سب سے زیادہ اہم سمجھتے ہیں -

مندرجہ بالا سمتوں میں ترقی کی رفتار کو تیز کرنے کے لئے دونوں وزراء اعظم قریبی ربط قائم رکھنے کا ارادہ رکھتے ہیں -



رفتارِ زمانہ

راشٹرپتی کا نشری پیغام

آزادی کی چھٹی سال گرہ پر ایک پیغام نشر کرتے ہوئے راشٹرپتی ڈاکٹر راجندر پرشاد نے بھارتی جنتا کو تلقین کی کہ وہ ملک سے افلاس اور جہالت کو ختم کرنے میں اپنی پوری طاقت صرف کریں آزادی کے بعد ہماری یہ ذمہ داری ہونی چاہیئے کہ ہم دیش کو خوشحالی کی طرف لے جانے میں مُدّ و معاون ہوں اور اس کے علاوہ نہ صرف اپنے دیش بلکہ دُنیا بھر میں امن کی طرف قدم اُٹھانے میں اپنے فرض کو پورا کریں۔ اس سلسلے میں یہ امر موجبِ تسلّی ہے کہ دنیا کو امن کی طرف لے جانے کے لئے ہماری کوششیں کامیاب ثابت ہو رہی ہیں۔ کوریا میں صُلح اس کامیابی کا واضح ثبوت ہے۔ راشٹرپتی نے اپنے پیغام میں اس امر پر بھی زور دیا کہ ہمسایہ ممالک سے ہمارے تعلقات دوستانہ ہونے چاہئیں۔ چنانچہ یہ خوشی کی بات ہے کہ اپنے پڑوسی ملک پاکستان سے ہمارے تعلقات بہتر صورت اختیار کر رہے ہیں اور نہ صرف بھارت اور پاکستان میں کھچاؤ کم ہو گیا ہے بلکہ فضا میں ایک خوشگوار تبدیلی بھی واقع ہو گئی ہے۔ راشٹرپتی نے اس صورت حال کو دُنیا میں امن کے لئے ایک نیک فال قرار دیا ہے۔

مالنکوف کا اعلان

روس کے وزیرِ اعظم مسیو مالنکوف نے اعلان کیا ہے کہ رُوس کے پاس ہائیڈروجن بم موجود ہے۔ آپ نے سپریم سوویٹ کے دونوں ہاؤسوں کے مشترکہ اجلاس میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ اب ہائیڈروجن بم پر امریکہ کی اجارہ داری باقی نہیں رہ گئی ہے

بھارت میں خوراک کی بہتر پوزیشن

۱۹۵۲-۵۳ء کے دوران میں بھارت میں جتنا اناج پیدا ہُوا ہے وہ جنگ کے بعد کے تمام سالوں سے زیادہ ہے۔ صرف چاول کی پیداوار ہی دو لاکھ چونتیس ہزار ٹن ہے۔ بھارت کے وزیرِ خوراک شری رفیع احمد قدوائی نے یہ بتایا کہ ۱۹۴۵-۴۶ء کے بعد کے سالوں میں کبھی اتنا چاول ملک میں پیدا نہیں ہُوا اور اس کا ہی یہ نتیجہ ہے کہ اس سال اپنے ہی ملک کا چاول بھارت بھر میں استعمال ہو رہا ہے اور غیر ملکی چاول ریزرو میں ہی پڑا ہے۔ آپ نے یہ بھی کہا کہ چاول کے سوا تمام اناجوں سے کنٹرول ہٹایا جا رہا ہے۔ اس بات سے ظاہر ہے کہ خوراک کے محاذ پر بھارت سرکار فتح یاب ہوئی ہے اور پنج سالہ پلان کے آخری ایام میں تو خوراک کے مسئلے پر بھارت پوری طرح خود کفیل ہو جائیگا اور اُسے باہر سے اناج منگوانے کی ضرورت نہیں رہے گی۔

چار بڑوں کی کانفرنس

امریکہ، برطانیہ اور فرانس کی جانب سے چار بڑے وزرائے خارجہ کی کانفرنس کی تجویز کو رُوس نے منظور کر لیا ہے اور کانفرنس کے لئے ایجنڈا بھی پیش کر دیا ہے۔ اس کے مطابق کانفرنس میں ایک تو اس مسئلے پر غور ہونا چاہیئے کہ بین الاقوامی کشیدگی کو کم کرنے کے لئے کون سی تدابیر اختیار کی جائیں اور دوسرا مسئلہ جرمنی کو پھر سے متحد کرنے اور صلح نامے کی تکمیل کا ہے۔

کشمیر کی صورتِ حال

کشمیر کی وزارت کے باہمی اختلافات اور شیخ عبداللہ کی طرف سے ریاست کشمیر کو آزاد رکھنے کی پالیسی کا نتیجہ یہ برآمد ہوا ہے کہ صدرِ ریاست نے شیخ عبداللہ اور مرزا افضل بیگ کو وزارت سے برطرف کر دیا ہے۔ اُن کو اُدھم پور کے ایک محل میں نظر بند کر دیا گیا ہے واضح رہے کہ پچھلے چند دنوں سے شیخ عبداللہ کی پالیسی میں ایک اہم تبدیلی واقع ہوئی تھی اور وہ کشمیر کو بھارت اور پاکستان دونوں سے آزاد کرنے کا پراپیگنڈا کر رہے تھے۔ چونکہ نیشنل کانفرنس کے کارکنوں کی ایک غالب اکثریت اُن کی اس پالیسی کے حق میں نہ تھی اس لئے اختلافات پیدا ہونے شروع ہو گئے اور نوبت یہاں تک پہونچی کہ شیخ صاحب اور نیشنل کانفرنس کے دیگر لیڈروں میں مل کر کام کرنا مشکل ہو گیا اور کیبنٹ کی اکثریت بھی اُن کے ساتھ نہ رہی۔ مجبور ہو کر صدرِ ریاست کو اس معاملے میں دخل دینا پڑا۔

شیخ صاحب کے برطرف ہونے کے بعد ایک دو دن تک شرانگیز عنصر نے کچھ گڑبڑ کرنے کی کوشش کی لیکن ریاست کے امن پسند عوام نے گڑبڑ پیدا کرنے کی تمام کوششوں کو ناکام بنا دیا۔ صدرِ ریاست نے شیخ عبداللہ کو معزول کرنے کے بعد بخشی غلام محمد کو نئی وزارت بنانے کی دعوت دی جو انھوں نے منظور کر لی۔ اس وقت تک شری گوھادی محل ڈوگرہ، شری میر قاسم اور شری شام لال صراف اُن کی کیبنٹ میں شامل ہو چکے ہیں۔ بخشی صاحب کو ریاست کے عوام کا پورا اعتماد حاصل ہے چنانچہ سری نگر کے مختلف حصوں میں اُن کی حمایت میں جلوس نکالے جا رہے ہیں۔ مدہربار اشخاص پر مشتمل ایک جلوس اپنے ہاتھوں میں ہندوستانی جھنڈے اُٹھائے بخشی صاحب کی کوٹھی پر پہنچا۔ اہلِ جلوس نے ہندوستان اور نیشنل کانفرنس کی حمایت میں نعرے لگائے۔ اس وقت ریاست کشمیر کے طول و عرض میں پورا امن ہے اور فضا بخشی صاحب کے حق میں ہے۔

کوریا میں عارضی صلح

کوریا میں صلح ہو جانے پر دُنیا بھر کے ممالک نے اطمینان کا سانس لیا ہے۔ بھارت سرکار نے اس باب میں جو کوششیں کی ہیں اس کے لئے دُنیا بھر کے ممالک نے اُسے خراجِ تحسین ادا کیا ہے۔ یہ فخر بھارت سرکار کو ہی تھا کہ اُس نے متحدہ اقوام کی فوج کو مدد دینے لائق پار نہ کرنے کی سب سے پہلے تلقین کی۔ بھارت کے اس بروقت انتباہ کا اثر خاطر خواہ ہوا اور اس کے ساتھ ہی صلح کی کوششوں کا آغاز ہو گیا۔ اس کے بعد متحدہ اقوام کی کونسل نے یہ ذمہ داری بھارت سرکار کو سونپی کہ وہ قیدیوں کے تبادلے کے لئے اپنی افواج کوریا بھجوائے۔ بھارت سرکار نے یہ پیش کش بخوشی قبول کی اور اس سلسلے میں بھارتی فوجوں کے دو بڑے جہاز مدراس سے روانہ ہو گئے ہیں۔ بندرگاہ پر مدراس کے گورنر شری سری پرکاش اور دیگر بڑے رسول اور فوجی افسروں نے اُن کو الوداع کہا۔

ایران میں سیاست کا نیا رُخ

ایران کی صورت حال نے ایک نئی کروٹ لی ہے۔ کہاں تو سارے ملک میں ڈاکٹر مصدق کا طوطی بول رہا تھا اور نوبت یہاں تک پہنچ گئی تھی کہ شاہِ ایران کو اپنا ملک چھوڑ کر بھاگنا پڑا اور کہاں یہ حالت کہ شاہ کی حامی افواج نے ڈاکٹر مصدق کی حکومت کو چند گھنٹوں کے اندر ختم کر دیا اور ڈاکٹر مصدق کو اُن کے اپنے گھر سے گرفتار کر کے کسی نامعلوم مقام کو بھیجا دیا۔ اب شاہ کی طرف سے جنرل فیض اللہ زاہدی کو وزیرِ اعظم مقرر کر دیا گیا ہے اور انھوں نے اپنی کیبنٹ مکمل کر لی ہے۔ شاہِ ایران تہران میں واپس آ گئے ہیں۔ اُنھوں نے رعایا کی بہبود سے متعلق اصلاحات نافذ کرنے کا اعلان کیا ہے۔



مٹی کا کھلونا ترے کس کام کا بچے!

اشک امرتسری

کس واسطے بیٹھا ہے سرِ راہ مچل کر — ہموار نہیں راہ تو رکھ پاؤں سنبھل کر
مشکل جو پڑی ہے اسے محنت ہی سے حل کر — اس راہ سے آخر ہے گزرنا تجھے چل کر
کاغذ کا یہ گھوڑا ترے کس کام کا بچے
مٹی کا کھلونا ترے کس کام کا بچے

تو کب سے پڑا خاک پہ سوتا ہے مرے لال — یہ ڈھول یہ طوفان یہ آندھی تو ہے جنجال
دامن میں پڑی خاک ہے مٹی میں اٹے بال — لے خاک نشیں تو نے بنایا ہے یہ کیا حال
یہ گھر یہ گھروندا ترے کس کام کا بچے
مٹی کا کھلونا ترے کس کام کا بچے

پڑھ لکھ کے ذرا سیکھ لے اب علم و ہنر تو — ہر سمت اندھیرا ہے اندھیرے سے نہ ڈر تو
دنیا ترے قدموں پہ ہے کہہ اپنی خبر تو — اماں کا تو ہے لعل تو ابا کا گہر تو
پتھر کا یہ ٹکڑا ترے کس کام کا بچے
مٹی کا کھلونا ترے کس کام کا بچے

کہتے ہیں کہ دنیا میں بڑی چیز ہے محنت — محنت سے بنا کرتی ہے انسان کی قسمت
قسمت ہے ترے ساتھ اگر دل میں ہے ہمت — ہمت ہے ترے دل میں تو ہے علم کی دولت
تابنے کا یہ پیسہ ترے کس کام کا بچے
مٹی کا کھلونا ترے کس کام کا بچے

کچھ سوچ تو یہ خواب ہے یا موت ہے طاری — کچھ لوگ ہیں زردار بہت لوگ بھکاری
خنجر ہے ترا بھالا ہے نہ برچھی نہ کٹاری — اور دیکھ کہ انسان ہے انسان کا شکاری
طوطے کا یہ پنجرا ترے کس کام کا بچے
مٹی کا کھلونا ترے کس کام کا بچے

اٹھ جاگ کہ دن آ گیا اور بھاگ گئی رات — معصوم اجالوں سے اندھیروں کو ہوئی مات
سورج سے لڑائے ہیں نظر خاک کے ذرات — سن اشک کی باتیں کہ ہے باتوں میں کرامات
پریوں کا یہ قصہ ترے کس کام کا بچے
مٹی کا کھلونا ترے کس کام کا بچے

حامد اللہ افسر

تربوزا

بہت دنوں کی بات ہے - جاپان میں ایک بڑے میاں اور ان کی بیوی رہتے تھے' دونوں کی عمر کافی ہو گئی تھی - بے چارے غریب تھے اور کوئی اولاد ان کے نہ تھی - پیٹ پالنے کے بھی لالے پڑ رہے تھے - بڈھاپے کے ہاتھ پاؤں روزی پیدا کرنے کے قابل نہ تھے -

ایک دن بڈھیا گھر سے تھوڑی دور ایک چشمے پر بیٹھی کپڑے دھو رہی تھی' دیکھتی کیا ہے کہ ایک بڑا سا تربوز بہا چلا آ رہا ہے بڑھیا نے وہ تربوز چشمے سے نکال لیا اور یہ سوچتی ہوئی اُسے اپنے گھر لے چلی کہ ایک وقت کے کھانے کا کام چل ہی جائے گا -



راستے میں وہ تربوز بڑھیا سے سنبھل نہ سکا اور اس کے ہاتھوں سے چھوٹ کر زمین پر گرا اور ٹوٹ گیا بڑھیا یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ تربوز کے ٹوٹتے ہی اس کے اندر سے ایک منّا سا لڑکا نکلا - بڑھیا بہت خوش ہوئی - خدا نے اس کے حال پر رحم کیا اور دونوں میاں بیوی کا دل بہلانے اور ان کو سہارا دینے کے لئے ایک بچہ بھیج دیا -

جب وہ اس بچے کو لے کر گھر پہنچی تو بڑے میاں بہت خوش ہوئے اور اس بچے کا نام انہوں نے تربوزا رکھ دیا -

ہوتے ہوتے تربوزا جوان ہو گیا - وہ بہت خوب صورت اور بڑا بہادر نکلا' بڑا ملنسار اور ہنس مکھ تھا اور ہر ایک کی مدد کرنا اور سب کو خوش رکھنا اپنا فرض سمجھتا تھا پاس پڑوس کے لوگ اس سے بڑی محبت کرنے لگے -

ایک دن اس نے اپنے منہ بولے باپ سے کہا - میں نے سُنا ہے پاس ہی کے ایک جزیرے میں چار دیو رہتے ہیں وہ ہمارے دیس کے لوگوں پر

حملے کرتے رہتے ہیں اور ان کے بچّوں کو اُٹھا کر لے جاتے ہیں اور انہیں مار ڈالتے ہیں۔ میں نے ارادہ کر لیا ہے کہ اس جزیرے میں جا کر ان چاروں دیووں کو مار ڈالوں گا"۔

غریب بُوڑھے کو بڑا رنج ہوا مگر اُس نے تربوزا کو دیوؤں کے جزیرے میں جانے کی اجازت دے دی۔

تربوزا دیوؤں کے جزیرے کو چلا تو راستے میں ایک جنگل پڑا۔ اس نے سوچا کہ لاؤ کسی درخت کے نیچے بیٹھ کر کھانا کھا لیں، جیسے ہی وہ کھانا کھانے بیٹھا ایک کتّا جھاڑیوں سے نکل کر اس کی طرف جھپٹا



اور بولا "تیرے پاس کیا ہے لا اِدھر، اگر تو نے مجھے کچھ کھانے کے لئے نہ دیا تو میں تیرے ٹکڑے کر ڈالوں گا

تربوزا اُسے دیکھ کر مسکرایا اور کہنے لگا دیکھو اس طرح ڈرا دھمکا کر تم مجھ سے کچھ نہیں پا سکتے، ہاں اگر طریقے سے مانگو تو میں اپنی خوراک میں سے آدھی تمہیں دے دوں گا۔

کُتّے نے نہایت نرمی اور خوشامد سے کہا "جناب سچ بات یہ ہے کہ میں نے جو کچھ کہا وہ بھوک سے پریشان ہو کر کہا، اگر آپ مہربانی کر کے مجھے کچھ کھانے کے لئے دے دیں تو آپ کا بڑا احسان ہوگا"۔

تربوزا نے اُسے پیٹ بھر کر کھانے کے لئے دیا کُتّے نے بہت شکریہ ادا کیا اور اس سے پوچھا آپ کہاں جا رہے ہیں؟

تربوزا نے کتّے کو سارا حال سُنایا تو کُتّے نے کہا مجھے بھی ساتھ لے لیجئے میں بھی اس کام میں آپ کی مدد کروں گا۔

دونوں آگے چلے، چلتے چلتے ایک درخت کے نیچے آرام کرنے بیٹھے تو اوپر سے ایک بندر کُودا۔ کُتّا اس پر جھپٹ پڑا، مگر تربوزا نے کتّے کو روک لیا۔ بندر بولا میں نے تم دونوں کی باتیں سُنی ہیں۔ میں تمہارے ساتھ دیووں کے جزیرے میں چلنا چاہتا ہوں، ممکن ہے میں بھی تھوڑا بہت سہارا دے سکوں۔ کتّے کو اس کا ساتھ پسند نہ تھا۔ وہ غُرّاتا رہا۔ لیکن تربوزا نے بندر کو بھی ساتھ لے ہی لیا۔

ایک تیتر بھی دانہ دُنکا چُگتا ہوا ادھر آ نکلا کُتّا اس پر بھی جھپٹا اور اس کے دو چار پر نوچ بھی لئے لیکن تربوزا نے کتّے کو پکڑ کر پیچھے ہٹا لیا۔ تیتر تربوزا کے کندھے پر آ بیٹھا اور کہنے لگا مجھے بھی ساتھ لے چلئے میں دیووں کے جزیرے تک پہنچنے کا ایک بہت آسان راستہ آپ کو بتاؤں گا۔ میرے کھانے پینے کے لئے فکر کرنے کی بھی آپ کو ضرورت نہیں۔ آپ کے بچے کھچے دو چار ٹکڑوں ہی میں میرا پیٹ بھر جائیگا

غرض تربوزا اور اس کے تینوں ساتھی دیووں کے

جزیرے میں پہنچ گئے - جب وہ جھاڑیوں میں اور درختوں کے پیچھے چھپتے چھپاتے آگے بڑھے تو انہیں کسی کے رونے کی آواز آئی' جھاڑیوں میں سے جھانک کر دیکھا تو چشمے پر دو عورتیں بیٹھی کپڑے دھو رہی تھیں' یہ رونے کی آواز انہیں دونوں کی تھی - تربوزا ان کے پاس خود نہیں گیا اس لئے کہ وہ اسے دیکھ کر ڈر نہ جائیں اور غل نہ مچا دیں - اس نے تیتر کو بھیجا - تیتر آہستہ آہستہ ٹہلتا ہوا ان عورتوں کے پاس پہنچا اور کہنے لگا - تم دونوں رو کیوں رہی ہو - کیا بات ہے ؟ ان میں سے ایک عورت بولی بھیّا! ہماری مصیبت کی داستان سُن کے کیا کروگے - ہم کبھی محلوں میں رہتے تھے - سینکڑوں کنیزیں ہماری خدمت کرتی تھیں - اب ہم خود ان ظالم دیووں کے غلام ہیں - یہ کسی نہ کسی دن ہمیں مار ڈالیں گے"۔

تیتر بولا" تم کچھ فکر نہ کرو - میں اور میرے تین ساتھی اسی لئے اس جزیرے پر آئے ہیں کہ تمہیں دیووں کی قید سے چھڑائیں - ہاں تم یہ تو بتاؤ کہ ان پر حملے کا سب سے اچھا طریقہ کیا ہوگا ؟

عورت بولی" قلعے پر دن چھپنے کے فوراً بعد پہنچ جاؤ - اس وقت چاروں دیو نشے میں دُھت ہوں گے" ہم محل کا چور دروازہ کھول دیں گے - تم لوگ اندر آجانا - خدا کرے تم ان کمبخت دیوؤں کو مار ڈالنے میں کامیاب ہو جاؤ"۔

تیتر یہ کہتا ہوا کہ تم بے فکر رہو - ہم ضرور چاروں دیووں کا کام تمام کر دیں گے اپنے دوستوں کی طرف روانہ ہوا -

چاروں دوست شام تک جھاڑیوں میں چھپے پڑے رہے - آخر قلعے کی روشنیاں جھلملانے لگیں اور گانے بجانے کی آوازیں آنے لگیں - قلعے کا دروازہ کھُلا ہوا تھا - چاروں دوست بے دھڑک اندر گھس گئے - کتّے نے ایک دیو کا ٹیٹوا دبایا - بندر نے دوسرے کو جھنجھوڑا - تربوزا نے تیسرے کا سر کاٹ



کر پھینکا - تیتر نے چوتھے کی آنکھیں پھوڑ ڈالیں - قلعے سے جو جواہرات ہاتھ لگے وہ تربوزا نے اپنے ماں باپ کے حوالے کئے - دونوں عورتوں کو ان کے دیس میں پہنچایا اور پھر ساری عمر جاپان میں جہاں جہاں دیو ملے ان کو مارنے اور کمزوروں اور دکھیاروں کی مدد کرنے میں بِتا دی -

---

لطیفہ

کانا سنیما کے ٹکٹ بابو سے :- مجھے آدھا ٹکٹ دے دیجئے

ٹکٹ بابو کانے سے :- آدھا ٹکٹ کیسا ؟

کانا ٹکٹ بابو سے :- کیوں کہ میری ایک آنکھ ہے

منیر الحسن ہاشمی

ایک بڑھیا اور نپولین

کہتے ہیں کہ ایک فوجی مدرسے کے سامنے ایک بوڑھی عورت اپنے چھوٹے سے جھونپڑے میں رہا کرتی تھی۔ وہیں پر اس کی ایک چھوٹی سی دُکان بھی تھی۔ چنانچہ وہ اپنی اس چھوٹی سی دُکان میں پھل بیچا کرتی تھی۔ شام کو چھٹی کے بعد اسکول کے لڑکے اس سے پھل خریدا کرتے تھے۔ انہیں میں ایک لڑکا نپولین بھی تھا۔ یہ بھی اس بڑھیا سے روزانہ پھل خریدا کرتا تھا۔



ایک دن کیا ہوا کہ وہ روز کی طرح بڑھیا کی دُکان پر پھل خریدنے کے لئے آیا اور کہنے لگا ۔ بڑی بی اس وقت میرے پاس پیسے نہیں ہیں اس لئے جو پھل میں نے آج خریدے ہیں ان کے پیسے پھر لے لینا"۔

بُڑھیا بولی ۔" ہاں ! ہاں ! بیٹا، جب جی چاہے دے دینا، مجھے تم پر بھروسہ ہے"۔

بہت دن گزر گئے، مگر بُڑھیا کا قرض ادا نہیں ہوا، آخر ایک دن ایسا آیا کہ نپولین اپنی تعلیم ختم کرکے فوج میں جانے لگا۔ اس وقت وہ بُڑھیا سے ملنے آیا تو اچانک اسے پیسوں کا خیال آیا اتفاق دیکھئے کہ جیب خالی تھی اور اس میں پھوٹی کوڑی بھی نہ تھی۔ نپولین نے بڑھیا سے بڑی شرمندگی ظاہر کی اور کہا۔

"بڑی بی اتنے دن ہو گئے تمہارے پیسے ادا نہیں ہونے پائے۔ جب ہوں گے فوراً ادا کر دوں گا"۔

بڑھیا نے کہا۔" نہیں بیٹا کوئی بات نہیں جب تمہارے پاس ہوں دے دینا"۔

بُڑھیا کا یہ جواب سُن کر نپولین کو اطمینان ہوا، اور وہاں سے رخصت ہو کر نپولین فوج میں داخل ہو گیا اور تھوڑی مدت میں ہی اپنی قابلیت اور سوجھ بوجھ کی بدولت ترقی کرتے کرتے فرانس کا بادشاہ بن گیا۔ چند سال بعد اُسے پھل بیچنے والی

بڑھیا کا خیال آیا۔

اس خیال کے آتے ہی وہ اپنی فوج کے ساتھ بڑھیا کے شہر کی طرف روانہ ہو گیا۔ شہر کے قریب جو پہنچا تو فوج کو باہر ٹھہرنے کا حکم دیا اور خود بھیس بدل کر بڑھیا کی دکان پر آیا اور آ کر جو دیکھا تو بے چاری بہت بوڑھی ہو گئی تھی۔

نپولین اس کی دکان پر بیٹھ گیا۔ کچھ پھل خرید کر کھائے اور بولا "بڑی بی! کل ہمارا بادشاہ آ رہا ہے۔ تم اُسے دیکھنے جاؤ گی؟"

بڑھیا نے جواب دیا "بیٹا اب میں بہت بوڑھی ہو گئی ہوں"۔

نپولین نے کہا "وہ بہت شاندار آدمی ہے"

بڑھیا نے جواب دیا "ہاں میں اُسے جانتی ہوں۔ بچپنے میں جب وہ سامنے کے اسکول میں پڑھتا تھا تو میری دکان سے پھل خریدا کرتا تھا۔"

نپولین نے پوچھا "بڑی بی وہ کیسا لڑکا تھا؟"

بڑھیا نے کہا "وہ بہت ایماندار لڑکا تھا اُس نے ایک دفعہ مجھ سے سودا خرید لیا تھا۔ مگر مجھے اُن پیسوں کا کچھ خیال نہیں"

نپولین یہ سُن کر تعظیماً کھڑا ہو گیا اور بڑھیا سے بولا "بادشاہ نپولین بونا پارٹ آج وہ پیسے ادا کرنے آیا ہے۔ یہ کہہ کر بڑھیا کے ہاتھ پر پیسے رکھ دئے۔ بڑھیا کو بڑی حیرت ہوئی، وہ نپولین کا منہ تکنے لگی۔

اس کے بعد نپولین نے بڑھیا کے رہنے کے لئے ایک عالی شان مکان بنوا دیا۔ بڑھیا ٹھاٹ باٹ سے اس میں رہنے لگی۔

معلومات

✓ انسان کے اندر ۲۰۶ ہڈیاں اور ۵۲۷ پٹھے ہوتے ہیں۔ ان میں سے ۸۳ پٹھے صرف سر میں ہی ہوتے ہیں۔

✓ ہمارے جسم کے اندر اتنی بجلی ہوتی ہے جس سے تین منٹ کے لئے ایک ۲۵ والٹ کا بلب جلایا جا سکتا ہے

✓ ہمارے جسم سے ہر گھنٹہ اتنی گرمی خارج ہوتی ہے کہ اس سے چار بڑی چائے دانی جتنا پانی گرم کیا جا سکتا ہے۔ یا نمونے کا ایک اسٹیم انجن تین گھنٹے تک چلایا جا سکتا ہے۔

کئی ایک چیزیں غلطی سے کھو دی جاتی ہیں لیکن اتنی کثرت سے نہیں جتنا کہ سُنا۔

جب انسان بنایا گیا تو اس کے جوڑ اس خوبی سے نہیں لگائے گئے تھے کہ وہ آسانی سے اپنی پیٹھ کو سہلا سکے۔

جس انسان میں غصہ ہونے کا جذبہ نہیں، وہ بے وقوف ہے۔ لیکن جو انسان اس جذبے کے ہوتے ہوئے بھی غصے نہیں ہوتا، وہ عقل مند ہے۔

خوش قسمتی کا موقع ایک بار ہی آتا ہے۔ لیکن خواہشات ہمیشہ ہی دروازہ کھٹکھٹاتی رہتی ہیں۔

احمد محی الدین

راجہ بیربل کا جواب

راجہ بیربل کی عقلمندی اور ہنسی مذاق کی باتیں تو بہت ہی مشہور ہیں - وہ اکبر بادشاہ کے نو وزیروں میں سے ایک تھے جن کو اکبر نورتن کہتا تھا - رتن ہیرے کو کہتے ہیں - ہیرا ایک بڑا قیمتی پتھر ہوتا ہے -



کہتے ہیں کہ ایک بار اکبر نے ان سب سے پوچھا بتاؤ ہماری بڑائی کو کس چیز سے تشبیہہ دی جا سکتی ہے کسی نے کہا چودھویں رات کے پورے چاند جیسی - کسی نے سورج جیسی تو کسی نے کچھ - جب بیربل کی باری آئی تو انہوں نے کہا "پہلی رات کے چاند جیسی - ان کا یہ انوکھا جواب سن کر سب دنگ رہ گئے کسی کی سمجھ میں نہ آ سکا کہ اتنے بڑے بادشاہ کی بڑائی کو کس طرح پہلی رات کے باریک ناخن جیسے چاند کی طرح کہا جا سکتا ہے - پھر اکبر نے انہیں سے اس کا مطلب پوچھا تو وہ کہنے لگے -

"جہاں پناہ ! چودھویں رات کا چاند تو گھٹنے والا چاند ہے اور پہلی رات کا چاند بڑھنے والا"۔ دیکھا تم نے کتنی ہوشیاری کی بات کہی ہے انہوں نے یعنی کسی بڑی چیز کو دیکھ کر یہ نہیں مان لینا چاہئے کہ کہ چھوٹی چیز حقیر ہے - چونکہ بڑی چیز ہر وقت بڑی نہیں رہتی لیکن چھوٹی چیز تو بڑی بن جاتی ہے -

---

راجدھانی

لڑکا :- بھگوان کرے کہ بمبئی ہندوستان کی راجدھانی بن جائے

بہن :- وہ کیوں ؟

لڑکا :- اس لئے کہ میں آج غلطی سے جغرافیے کے پرچے میں بمبئی کو ہندوستان کی راجدھانی لکھ آیا ہوں -

محمد اسلم

یہ مُنہ اور مسور کی دال

لکھنؤ کے آخری بادشاہ واجد علی شاہ کا ایک باورچی تھا۔ جو مسور کی دال بہت اچھی پکاتا تھا زمانہ ایک سا نہیں رہتا ان کی سلطنت انگریزوں نے چھین لی۔ اور اُن کو کلکتہ بھیج دیا گیا۔ یہ باورچی بھی بے کار ہو گیا۔ آخر وہ روزگار کی تلاش میں نکلا اور چلتے چلتے ایک شہر میں پہنچا وہاں ایک نواب کی حکومت تھی۔ اس نے خبر کرائی کہ واجد علی شاہ کا باورچی آیا ہے۔ نواب صاحب نے بلایا اور پوچھا کہ "میاں کیا پکانا جانتے ہو"۔ کہا "حضور! مسور کی دال جانتا ہوں"۔ فرمایا "اچھا آج اپنا کمال دکھلاؤ اور جس چیز کی ضرورت ہو ہمارے ہاں سے لے لو"۔

رات کو خاصہ میں مسور کی دال آئی اور نواب صاحب نے سب سے پہلے وہی چکھی۔ وہ ایسی پسند آئی کہ اور کسی چیز میں ہاتھ نہ ڈالا۔

باورچی کو بلایا اور کہا "واہ میاں خوب پکائی ہے کمال کر دیا تم نے تو"۔

"حضور کا اقبال ہے"۔

"اور بھئی خرچ کیا آیا"؟

"حضور ڈیڑھ ہزار روپے گیارہ آنے نو پائی"۔

"افوہ! ایک پیسہ کی دال پر ڈیڑھ ہزار روپے گیارہ آنے نو پائی"۔ باورچی بڑا نازک مزاج تھا۔ واجد علی شاہ کی آنکھیں دیکھے ہوئے تھا اتنی بات بھی برداشت نہ کر سکا۔ اور بڑبڑاتا ہوا چلا گیا —

"یہ مُنہ اور مسور کی دال"۔

بخشو بی بلّی چوہا لنڈورا ہی بھلا

ایک بلّی نہایت غریب اور مسکین صورت بنائے ایک جگہ کھڑی تھی۔ اتفاقاً ایک چوہا ادھر آ نکلا۔ بلّی نے نہایت پھرتی کے ساتھ اس پر حملہ کیا مگر چوہا بِل میں گھس گیا۔

اس چھینا جھپٹی میں اس کی دُم بلّی کے مُنہ میں رہ گئی۔ بلّی کو شکار کے نکل جانے کا بڑا افسوس ہوا۔ اس لئے نہایت متانت سے کہنے لگی "واہ میاں چوہے ڈر گئے۔ میں تو تمہارے ساتھ دوستی قائم کرنا چاہتی ہوں اور تم سے محض مذاق کرتی تھی۔ تم نے شاید کچھ اور سمجھ لیا۔ آؤ باہر آؤ میں تمہاری دُم کو جوڑ دوں۔ لنڈورے بہت بُرے معلوم ہوگے"۔

چوہا سمجھ دار تھا سمجھ گیا کہ بلّی مکاری کی باتیں کر رہی ہے۔ میں باہر نکلا اور مارا گیا۔ اس لئے اس نے وہیں سے بیٹھے بیٹھے کہا۔

"بخشو بی بلّی چوہا لنڈورا ہی بھلا"۔

آج کل



Osmania University Library,
HYDERABAD (DECCAN).

Osmania University Library,
HYDERABAD (DECCAN).

۸

نومبر ۱۹۵۳ء

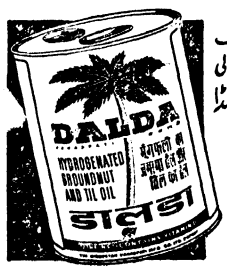
ڈالڈا

سے بنی مزیدار مٹھائیوں سے دیوالی منائیے



ڈالڈا کم۔ خرچ بھی بہت ہے!

اس برس ڈالڈا سے مٹھائیاں بنائیے اور دیوالی کا ایک نیا ہی مزہ اُٹھائیے۔ ڈالڈا وناسپتی ایک نہایت ہی اچھی کھانا پکانے کی چکنائی ہے اور یہ تندرستی کیلئے بھی اتنا ہی مفید ہے۔ اس سے دیوالی کیلئے ہر قسم کی مزیدار مٹھائیاں بنائیے۔ یہ کم۔ خرچ بھی بہت ہے! اس متبرک تیوہار کو ڈالڈا سے بنے پکوانوں سے جشن کا جامہ پہنا دیجئے۔ دیوالی مبارک!



ڈالڈا وناسپتی

دیوالی کیلئے خاص مٹھائیاں کیسے بنائی جائیں؟
مفت صلاح کیلئے آج ہی اس پتہ پر لکھئے۔
دی ڈالڈا ایڈوائزری سروس
پوسٹ بکس نمبر ۳۵۳، بمبئی ۱

MVM. 194-X52 UD

"مَیں جانتی ہوں
لکس ٹائلیٹ صابن آپ کی جِلد
زیادہ دِلکش بنائے گا"

— ثریّا



ثریّا کہتی ہیں "اس
خالص و سفید صابن کی دلفریب
خوشبو میری جلد میں بس جاتی ہے۔
آپ بھی اپنی جلد نہایت ملایم اور
خوبصورت بنانے کیلئے لکس
ٹائلیٹ صابن استعمال کیجئے۔"

لکس
ٹائلیٹ صابن
فلمی ستاروں کا
حسن بخش صابن

کتنا صفید، کتنا خالص، کتنا خوشبودار

LTS. 296-X30 UD

دن بہ دن
ایک نئی شگفتگی
ایک نیا حسن



رکھونا کیمیڈل آپ کے لئے بھی
یہ کمال کرے گا
کیمیڈل آمیز رکھونا صابن ہر روز استعمال کیجئے۔ اس
سے آپ کی جلد دن بہ دن زیادہ خوبصورت
اور نازک بنتی جائے گی۔



رکھونا
کیمیڈل آمیز واحد صابن

* جلد کو طاقت کر نکھارنے اور مقوی جیلہ
تیلوں کے ایک خاص مرکب کا تخلیقی نام

رکھونا بردریا طبقی لمیٹڈ کی تیار کردہ ہندوستان میں بنا ہوا

RP. 1040 UB

اُردو کا مقبول عوام مصوّر ماہنامہ

آج کل

دہلی

ایڈیٹر:- جوش ملیح آبادی

اسسٹنٹ ایڈیٹر:- بال مکند عرش ملسیانی
جگن ناتھ آزاد

جلد ۱۲ ——— نمبر ۴

سالانہ چندہ:- ——— ہندوستان میں:- چھ روپے
پاکستان میں:- چھ روپے

غیر ممالک سے:- ——— نو شلنگ یا ایک ڈالر

فی پرچہ:- ——— ہندوستان میں:- آٹھ آنے
پاکستان میں:- آٹھ آنے

نومبر ۱۹۵۳ء

ترتیب

قومی ترانے	محمد اجمل خاں	۴
ہندی شاعری میں تحریکِ اتحاد	رام سہاری سنگھ دِنکر	۸
مختصر مفید	علی منظور	۱۲
رام سہاری سنگھ دِنکر	بال مکند مشر	۱۳
غزل	قاسم شبیر نقوی نصیر آبادی	۱۵
جدید اُردو ناول	رفیعہ سلطانہ	۱۶
ڈگر پردیش کے عوامی گیت	گھنشام سیٹھی	۲۲
بے ہوش منش چھاپوش چھادماں	ہجور کاشیری	۳۳
لاطینی امریکہ	شفیق الحسن ہاشمی	۳۴
بسترِ مرگ کا اُردو ان	کمال احمد صدیقی	۳۹
نمک حرام	چندر آلکھ	۴۰
شعر و شاعری نمبر	———	۴۷
قافلۂ نو بہار	نواب علی خاں گوہر	۵۰
یہ سب سمجھنے کی باتیں ہیں	راگھویندر راؤ جذب	۵۰
صحت کے لئے وٹامن	———	۵۱
دامودر ویلی اسکیم	———	۵۳
نئی کتابیں اور رسالے	ع-م	۵۵
رفتارِ زمانہ	———	۵۹

بچّوں کا آج کل

طالب علم کی دُعا	فیض لودھیانوی	۶۱
خود غرض دیو	سیدہ نکہت	۶۲
چور	حلیم کوثر	۶۶
سزائے	نذیر حسانی	۶۸

سرورق:- سیکورٹی کونسل کی نئی صدر:- شریمتی وجے لکشمی پنڈت

پبلیکیشنز ڈویژن پوسٹ بکس ۲۰۱۱ - دہلی

محمد اجمل خاں

قومی ترانے

۴ - کنگ اڈورڈ روڈ - نئی دہلی
۸ ستمبر ۱۹۵۳ء (یوم شنبہ)

جناب مدیر آج کل - تسلیم

حسب الحکم "قومی ترانوں" کے سلسلے کی پہلی قسط ارسال خدمت ہے - میں کوشش کروں گا کہ آپ کی اطلاع کے مطابق مقررہ تاریخ پر ہر ماہ اس سلسلے یا زنجیر کی ایک کڑی آپ کی خدمت میں پیش کر دیا کروں -

ایشیا اور یورپ کے ترانے الگ الگ ہوں گے - میں اگرچہ شاعر نہیں لیکن کوشش کر کے بعض ترانوں کو نظم کر چکا ہوں - بہرحال اس طرح کی نظموں میں مفہوم کا ادا ہو جانا ہی غنیمت ہے نظم کے ترنم سے (خواہ وہ نظم عاری ہی کیوں نہ ہو) کلام میں ایک زور و اثر پیدا ہو جاتا ہے، اس لئے یہ کوشش کی گئی -

محمد اجمل خاں

شیر یا بھیڑیئے ایک دوسرے کو نہیں کھاتے مگر عادت سے مجبور ہیں - دوسروں کو کھانے کی عادت! وہ ایک دوسرے سے بھڑ جاتے ہیں، اور اس طرح ایک دوسرے کے ٹکڑے اُڑاتے ہیں کہ جیسے کھا ہی ڈالیں گے -

بھیڑ اور بکریاں بہت ہی غریب جانور سمجھے جاتے ہیں، وہ گوشت خود نہیں نوچ گوشت خوروں کی طرح اُن کے پنجے اور دانت ہیں - ہاں بھیڑیوں سے بچنے کے لئے قدرت نے انھیں تیز سینگ اور پتلے پیر ضرور عطا کئے ہیں - وہ بھی ان اس کے ہتیاروں سے کبھی بھی نہیں، بلکہ اکثر ایک دوسرے کو بھونکنے پر تیار رہتے ہیں -

قدرت نے جان رکھنے والی چیزوں کو تو ایک دوسرے کے خون کا پیاسا بنایا ہی تھا، لیکن بظاہر بے جان چیزوں یعنی سبزی اور ہریالی کی دُنیا میں بھی ایک دوسرے کو کھا جانے کا قانون جاری ہے - یہاں تک کہ بے جان چیزیں بھی اسی کشمکش سے زندہ معلوم ہوتی ہیں - کہیں پانی سے ہوا بن جاتی ہے اور کہیں ہوا سے برف، کہیں ریت کے ذرّے ایک دوسرے کو کھا کر پتھر بن جاتے ہیں کہیں سورج کی گرمی چٹانوں کو توڑ پھوڑ کے ریگستان بنا دیتی ہے - ہر طرف خونخواری، ہر سمت مار پیٹ اور ہر سُو تباہی و بربادی کا سماں کیوں ہے؟ کیا اسی کا نام ترقی ہے؟ کیا زندہ رہنے کی کوشش میں ایک دوسرے کو کھا جانے، مٹا دینے ہی کا نام زندگی ہے؟ اگر ہے تو غالب سچ کہتا ہے کہ ؎

رہا آباد عالم اہلِ ہمّت کے نہ ہونے سے
بھرے ہیں جس قدر جام و سبو میخانہ خالی ہے

انسان نے جب سے اس دُنیا کی ذمّہ داریاں قبول کیں اُس نے یہی دیکھا کہ ہر طرف خانہ جنگی کا بازار گرم ہے۔ کہیں پتھر کے ہتھیاروں سے شیروں اور اژدہوں کا شکار ہو رہا ہے کہیں وحشی کے ہتھیاروں سے ایک دوسرے کی چمڑا گاہیں چھینی جا رہی ہیں۔ کہیں رتھ اور ہاتھی میدان میں بھاگے جا رہے ہیں تو کسی جگہ گھوڑوں کی تیز رفتاری سے میدان جیتا جا رہا ہے۔ ہر طرف ترقّی ہی ترقّی ہے۔ گویا ترقی نام ہے آلاتِ جنگ کی ترقّی کا۔

اس کروڑوں سال کی دُنیا میں دس بیس ہزار سال کس گنتی شمار میں ہیں! یوں سمجھئے کہ پلک جھپکاتے نہ رتھ رہے نہ ہاتھی، نہ گھوڑے رہے نہ نیزے لیکن آگ اور لوہا باقی رہ گیا اور اُن کی شکلیں ذرا بدل گئیں۔ تیروں کی جگہ گولیاں اور بم لے گئے، گھوڑوں کی جگہ اُڑتی گھوڑوں اور موٹر گاڑیوں نے لے لی۔ اور جان لینے اور دینے کا جو کام سُستی سے ہوتا تھا وہ کسی قدر تیز ہو گیا۔ اب لڑنے والوں کے ساتھ "نہ لڑنے والی عورتیں" اور دودھ پیتے بچے بھی بن مارے مرنے لگے۔ پُرانے سورماؤں اور بانکوں **Knights** کے قوانینِ جنگ یا مروّت و مردی **Chivalry** کے اصول بھی بدل گئے، اب ہارے ہُوئے یا کمزور دشمن کے ساتھ اُس کے ساتھیوں اور پڑوسیوں ہی کو نہیں، بلکہ ہر اُس ملک کو جو جیتنے والوں کے ساتھ نہ ہو ہارا ہُوا سمجھتے ہیں اور اُن سب کو مٹا دینا، موت کے گھاٹ اُتار دینا، پیسے پیسے کو محتاج کر کے کوڑی یا غلام بنا لینا، مردی اور بانکپن سمجھا جاتا ہے۔ انسان مشینیں بنتا جاتا ہے اور مشینیں میں عواطف و احساسات کہاں!

دُشمن کے دل میں رعب پیدا کرنے کے لئے لوگ چلاتے تھے، نعرے لگاتے تھے۔ اُس ہنگامے کو زیادہ ہولناک بنانے کے لئے ڈھول اور نقارے بجاتے تھے۔ ہتھیاروں کو کھڑکھڑاتے تھے۔ فوجوں نے مہذّب بن کر موسیقی کا جامہ پہنا اور قومی ترانے بن گئے۔ باجوں نے باقاعدہ تال اور سُر کی پابندی شروع کی اور جنگی بینڈ تیار ہو گئے۔ اب جس ملک میں جائیے خُدا انسانیت اور محبّت کے نام پر خون بہانے کے قومی گانے ملیں گے۔ انسان ان پر فخر کرتا ہے۔ ایسی ایسی گانے کی طرزیں ایجاد ہوئی ہیں کہ انسان کا دل حُبِّ وطن کے احساسات سے بھر جاتا ہے اور وہ موسیقی کے سُروں میں مست ہو کر جان دینے اور لینے سے ذرا بھی نہیں ہچکچاتا۔ خونخواری ایک فنِ لطیف بن گئی ہے۔ خونریزی میں انسانوں کو مزہ آنے لگا ہے۔ اب بہترین باجا جنگی باجا سمجھا جاتا ہے، یہ دونوں کو گرما دیتا ہے۔ بہترین شاعری رزمیہ شاعری **Epic Poetry** مانی جاتی ہے، یہ قوموں میں لڑائی اور انتقام کی رُوح کو زندہ رکھتی ہے۔

ہما بھارت کیوں دونوں کو مرغوب ہے؟ یہ انسانوں کے جنگی کارناموں کی کہانی ہے۔ جو محض جنگی کارناموں کی وجہ سے دیوتا بن گئے اور عین میدانِ جنگ میں جنگی جوش پیدا کرنے کے لئے جو آتشیں تقریر کی گئی، وہ اب تک "فرمودۂ خداوندی" یا "بھگوت گیتا" کے نام سے کروڑوں انسانوں کے دلوں میں جوش پیدا کرتی رہتی ہے۔

شاہنامہ فردوسی کیوں ایرانی ادبیات میں سب سے بلند درجہ رکھتا ہے۔ کیا اس لئے کہ اُس میں خالص فارسی زبان ہے؟ یا اندازِ بیان زور دار ہے، یا لفظ پُر لطف ہیں اور رزم و بزم بے مثل ہے۔ ممکن ہے یہ سب چیزیں مجموعی طور پر ایک خاص اثر پیدا کر دیتی ہوں لیکن شاہنامے کی جان اُس کی جنگ ہے اور جنگ کے ساتھ قومی کامرانی اور سربلندی کا مست بنا دینے والا احساس۔

الیڈ اور اوڈیسی رزمیہ شاعری ہی کی کتابیں نہیں سمجھی جاتی تھیں بلکہ ہومر کی سحر بیانی نے انھیں مقدس کتابوں کا درجہ دلوا دیا تھا - یونان والے بھی آریہ نسل کے تھے اور وہ قوم جس نے ایران میں زرتشی اور ہندوستان میں ویاس کو پیدا کیا تھا اُسی نے یونان میں ہومر بھی تیار کیا تھا - ایرانی جنگوں نے یونان والوں میں جان ڈالی پھر اُنھوں نے ایسی دماغی ترقی کی جس کی مثال دُنیا میں کم ملتی ہے - ہومر کی تصنیف آرٹ بھی ہے، فلسفہ بھی! تاریخ بھی ہے مذہب بھی! اور سب سے بڑھ کر وہ ایسی جنگی شاعری ہے جس نے ایرانیوں کو بارہا یونان سے شکست دلوائی -

عربوں میں شاعر بننے سے نہیں بنتا تھا - دُنیا کے بہترین شاعروں کی طرح وہاں بھی قدرت ہی اس کام کو انجام دیتی تھی لہٰذا جس قوم یا قبیلے میں شاعر پیدا ہو جاتا تھا وہاں خوشی کے شادیانے بجنے لگتے تھے - عربی شاعر اپنی قوم کو زندہ کر دیتا تھا - وہ قبیلوں میں اپنی آتش بیانی سے آگ بھی لگا سکتا تھا اور زبان کے جادو سے اس پر پانی بھی ڈال سکتا تھا - وہ اپنی زبان سے وہ ہی کام لیتا تھا - یا تو کسی کی توصیف کر کے اُسے آسمان پر پہنچا دیتا تھا یا بُرائی کر کے ہمیشہ کے لئے اُس کی عزت کو خاک میں ملا دیتا تھا - وہ صرف وہ ہی خوبیوں کو سراہتا تھا شجاعت اور سخاوت - وہ وہ ہی بُرائیوں کو ذلیل سمجھتا تھا یعنی بُزدلی اور کنجوسی - اسی لئے اُس کی شاعری میں سب سے اُونچا درجہ جنگی شاعری کا تھا اور قتل و انتقام ہر قبیلے کا سرمایۂ ناز تھا - اس شاعری سے اُن کے دفتر کے دفتر بھرے پڑے ہیں اور اب تک دلوں کو گرماتے ہیں اور دُنیا کو مردت و حماست، شجاعت و سخاوت کے گر سکھاتے ہیں

غرضکہ جب دُنیا میں سائنس کی ترقیوں نے انقلاب برپا کر دیا اور گھوڑوں کی جگہ موٹر نے اور چپنے کی جگہ مشین نے لے لی تو جو قومیں گھوڑے اور چپنے کی دُنیا میں تھیں وہ مستی انقلاب کے ہجوم میں پھنس گئیں - یورپ نے مشرق و مغرب پر اپنا قبضہ جمانا شروع کیا اور دونوں تہذیبیں ٹکرا کر ایک نئی تہذیب اور ایک نئی دنیا بنانے لگیں - اب فلسفہ بھی سائنس کی بنیادوں پر کھڑا ہونے لگا - آرٹ اور موسیقی بھی مشین میں ڈھل کر کارخانوں اور سینماؤں کے ذریعے سے سستے داموں بکنے لگی یعنی انسان کی تخلیقی فن کاری نقلی مصنوعات کی طرح بازار میں آکر دلالوں کا ذریعۂ معاش بن گئی

اس زمانے میں قومیت اُبھری، سرمایہ دارانہ قومیت! پھر کہیں سرمایہ داری اور جمہوریت نے ساز باز کیا اور کہیں ڈکٹیٹروں نے دولت کو صرف اپنی قوم میں تقسیم کرنے کا راگ الاپا - کچھ دبی دبی آوازیں لوٹ کھسوٹ کے خلاف بھی اُٹھیں اور عالمگیر برادری کے گیت فضا میں لرزنے لگے - لیکن قوموں کی جنگی پیاس نہ بجھنا تھی نہ بجھی - انھوں نے اپنے دلوں کو گرمانے کے لئے اپنے اپنے قومی ترانے بنائے - اور جہاں پُرانے قسم کے گانے رائج تھے وہاں نئے قسم کے جوشیلے ترانے فضا میں گونجنے لگے -

بہر حال ہر قوم اپنے عروج و زوال کی مختلف حالتوں میں کوئی نہ کوئی فلسفہ بنا لیتی ہے، اور اُس کے مطابق اُس کی زندگی ڈھلتی رہتی ہے - قومی ترانوں سے پوری قوم کا اگر نہیں تو کم از کم اُس قوم کے کرتا دھرتاؤں یعنی لیڈروں یا مفکروں کی ذہنیت کا پُورا پُورا اندازہ ہو جاتا ہے اور یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ اُن کی وطن پرستی کی بنیاد خود پرستی ہے یا جمہور پرستی - وہ صرف اپنا یا اپنی جماعت کا بھلا اور تفوق و اقتدار چاہتے ہیں یا کل ملت کا، اور اگر اس تصور سے بھی آگے ہیں تو کل انسانیت کا! ہم دیکھیں گے کہ ان ترانوں میں کہیں حبِّ وطن

کا جوش ہوگا کہیں دشمنانِ وطن سے انتقام کا ولولہ، کہیں مایوسی کی تاریکی ہوگی کہیں اُمید کی روشنی۔ کہیں قیام سربلندیوں کا مرثیہ ہوگا اور کہیں موجودہ پست حالی کا رونا۔ غرضکہ کوئی غالب کا ہمنوا بن کر کہتا ہوگا کہ ؎

گھر میں کیا تھا جو ترا غم اُسے ویراں کرتا
وُہ جو ہم رکھتے تھے اک حسرتِ تعمیر سو ہے

اور کوئی صنفی نکہتوی کی زبان میں اس طرح دعوتِ انقلاب دے رہا ہوگا کہ ؎

ہم سینۂ ہستی میں، انگارہ ہیں انگارہ
شعلے بھڑک اُٹھیں گے جھونکے جو ہوا دیں گے

غرضکہ یہ نظموں کا ایسا دل چسپ سلسلہ ہوگا جس میں دنیا کی ہر قسم کی قوموں اور ملتوں کی نفسیاتی زندگی اور اُن کی آرزوؤں کی تصویریں کا نکھرا ہُوا رُخ صاف صاف نظر آئے گا۔

معلومات واعداد

۱۔ ۱۹۵۳-۵۴ء میں بھارت نے غیر ملکوں سے کل ۶ ارب ۵۸ کروڑ ۱۱ لاکھ روپے کا مال منگایا۔ جس کا ۲۷ فی صدی حصّہ امریکہ سے درآمد کیا گیا۔

۲۔ اس سال ماہ ستمبر سے نومبر تک ۵ لاکھ ۴۰ ہزار ٹن کھانڈ کی درآمد اور اسی دوران تقریباً ۴ لاکھ ۳۰ ہزار ٹن کھانڈ کی مانگ متوقع ہے۔

۳۔ ۳۱ جولائی ۱۹۵۳ء کو ختم ہونے والے ۴۰ مہینوں میں بھارتی ریلوں نے ہر مہینے اوسطاً سوا نئے ریلوے انجن حاصل کئے اور ان میں سے تین انجن بھارتی ساخت کے خریدے جاتے ہیں۔

۴۔ بھارت کی قومی شاہراہوں کا مجموعی طول ۵۵۱۲ میل ہے۔ اس میں سے ۴۸۵۰ میل کی شاہراہوں پر اسفلٹ (تارکول ڈامر اور ریت کا مرکب) بچھایا گیا ہے اور باقی ماندہ کنکٹ سے تیار کی گئی ہیں۔

۵۔ بھارت میں پٹرولیم سے تیارشدہ اہم اشیاء کی سالانہ کھپت تقریباً ۵ لاکھ ٹن ہے۔

۶۔ انکم ٹیکس تحقیقاتی کمیشن نے جنوری ۱۹۵۲ء سے اب تک پوشیدہ آمدنی کے جتنے معاملات کا پتہ لگایا ہے، اُن میں سے کسی فردِ واحد کی طرف سے چھپاکر رکھی ہوئی زیادہ سے زیادہ رقم ۱۶ لاکھ ۵ ہزار روپے ہے۔

۷۔ سندری کی کھاد کی فیکٹری سے اس وقت تک کل ۲ لاکھ ۹۹ ہزار ۹ سو ۵۰ ٹن امونیم سلفیٹ کی نکاسی ہوئی ہے۔ اس کی قیمت ۹ کروڑ ۷۰ لاکھ روپے سے زائد ہے۔

رام دھاری سنگھ دِنکر

ہندی شاعری میں تحریکِ اتّحاد

پروفیسر دنکر ہماری پارلیمنٹ کے ممبر ہیں۔ آپ ہندی کے مشہور شاعر اور معلم ہیں۔ آپ کا ایک ہندی مضمون آج کل ہندی میں شائع ہوا ہے۔ موصوف کی اجازت سے اس کا اُردو ترجمہ شائع کیا جاتا ہے۔ کوشش کی گئی ہے کہ اصل مضمون کے لب و لہجہ کو قائم رکھا جائے۔

اکثر دیکھا گیا ہے کہ کسی ملک کے لوگوں میں حبّ الوطنی کا جذبہ اُس وقت پیدا ہوتا ہے جب وہ ملک کسی اور ملک کا غلام ہوجاتا ہے۔ جب مسلمان ہندوستان کے حاکم ہوئے تب اس ملک میں حُبّ الوطنی کو جنم دینے والی حالت پیدا ہوگئی تھی۔ لیکن حُبّ الوطنی اُس وقت پیدا نہ ہوسکی۔ ہمیر اور کمھان جیسے ہندو بہادروں کے سوانح حیات پر جو نظمیں لکھی گئیں اُن میں ایک طرح کی حُبّ الوطنی کی جھلک ضرور تھی۔ مگر وہ حبّ الوطنی بالکل محدود تھی۔ اصل میں ان نظموں میں "ہندو حبّ الوطنی" نہیں بلکہ بہادروں کی انفرادی تعریف ہے۔ ہاں اورنگزیب کے زمانے میں "ہندو حبّ الوطنی" بڑے زور سے اُبھری۔ بھوشن اس تحریک کے شاعر تھے۔ مگر ہندی کے نقاد بھوشن کو بھی راشٹریہ کوی نہیں مانتے کیونکہ پچھم سے آنے والی حبّ الوطنی کی سبھی شرطیں وہ بھی پورا نہیں کرپاتے۔

ہمارے ملک میں حبّ الوطنی کا اصلی جنم انیسویں صدی میں ہوا۔ انگریزی سلطنت یہاں اپنا پاؤں جماکر بیٹھ گئی۔ اور اس کے زہر کا احساس ہندو اور مسلمان دونوں ہی کو ہونے لگا۔ انگریزی راج کے ساتھ یورپ کے جو گیان و گیان۔ دھرم اور اخلاق کے نئے خیالات اس ملک میں آئے۔ ان کے سامنے ہندو اور مسلمان دونوں توہمیں کانپنے لگیں۔ ہندو دھرم اور اسلام دونوں میں سے کسی کے بھی پاس کوئی ایسی چیز نہیں تھی جسے لے کر یورپ سے آئی ہوئی سائنس اور ریشنلزم کا مقابلہ کیا جاتا۔ بالآخر جن ہندوستانیوں کو انگریزوں کی تعلیم ملی ان میں سے اکثریت اپنے دھرم اپنے کلچر اور اپنی تہذیب کی بُرائی کرنے لگے۔ ہندوستانیوں نے ہندوستان کے مذاہب اور تہذیب کی ایسی تنقید شروع کی کہ ایک گھمسان سا مچ گیا اور ایسا دکھائی دینے لگا کہ یہ دیش اب پوشاک، دین لین و کھان پان اور خیالات کے لحاظ سے یورپ بن جائے گا۔ بھارت کا پُرانا اور جکڑا ہوا تمدّن یورپ کے جوان اور پُرجوش تمدّن سے ٹکرا گیا تھا اور اس دھکّے سے اُس کا انگ انگ کانپ رہا تھا۔ مگر اس بوڑھے تمدّن نے فوراً خود کو سنبھالا اور اس چیلنج کا جواب دینے کے لئے وہ اپنے اندر نئی سُپھرتی اور نئی طاقت اور نئی تازگی لانے کی کوشش کرنے لگا۔ ہندوؤں میں سے راجہ رام موہن رائے کیشوچندر سین۔ بنکم چندر، سوامی دیانند، پرامہنس رام کرشن اور سوامی وویکانند پیدا ہوئے۔ جنھوں نے ہندو دھرم کی قدامت کو صاف و پاکیزہ کرکے اُس کا ایک ایسا روپ کھڑا کردیا جس سے انگریزی پڑھے لکھے ہندو بھی عقیدت کا اظہار کرسکتے تھے۔ اسی طرح اسلام نے سرسیّد احمد خاں

مولانا حالی اور ذہنی انقلاب کے کئی رہنما پیدا کئے جنھوں نے بُری رسموں کو مٹاکر اسلام کا ایک صاف اور شفاف رُوپ دنیا کے سامنے رکھا۔ اسلام کو برائیوں سے پاک کرنے والے اس انقلاب کے پہلے شاعر حالی اور دوسرے سرمحمد اقبال ہوئے۔

یہاں یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ یورپی تہذیب کی ٹکر سے ہندو دھرم اور اسلام دونوں کی آنکھ کھلی اور دونوں ہی اپنے اندر اس طاقت کی کھوج کرنے لگے جسے بڑھاکر وہ سائنس۔ عیسائیت اور رشنیلزم کے حملوں کا جواب دے سکتے تھے اور دونوں کو یہ دکھائی دیا کہ اس چیلنج کا جواب دینے کا راستہ صرف ایک ہے۔ اور وہ یہ کہ ہم اپنے دھرم اور کلچر کی ان پرانی سچائیوں کو زور سے پکڑیں جو امر ہیں اور ان کا ان نئی قدروں سے میل پیدا کریں جو پچھم سے آرہی ہیں۔ راجہ رام موہن رائے انگریزی کے ساتھ سنسکرت عربی اور فارسی کے بھی عالم تھے اور رام کرشن پرمہنس کچھ دنوں تک اسلام کا بھی مطالعہ کرچکے تھے۔ اس لئے ان کے اس فیضان سے ہندو دھرم کا جو روپ نکھرا وہ بھارت میں پھیلے ہوئے سب ہی دھرموں کے لئے اتحاد اور محبت کا نشان بن گیا۔

اس انقلاب کو ہم رینا سانس یا بھارت کی نشاۃ ثانیہ کہتے ہیں اور اس بیداری نے ہمارے ملک میں حب الوطنی کو ترقی دی۔ جب رینا سانس یا نشاۃ الثانیہ کا وقت آتا ہے تو قوموں کی کچھ پرانی صداقتیں دوبارہ جنم لیتی ہیں اور قومیں اپنے اتھاس کے اس حصّے سے جا چپکتی ہیں جو گزر چکا ہو۔ مگر جس کی یاد سے لوگوں کے دلوں میں خودداری کی روشنی پیدا ہوئی ہو ہندوستان میں بھی یہی ہوا اور بدقسمتی کی بات یہ ہوئی کہ اپنے پچھلے اتھاس کو دیکھتے ہوئے مسلمان عرب اور قرآن کی طرف بڑھتے گئے اور ہندو وید اور اپنشد کی جانب۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں قوموں نے اپنی ان خصوصیتوں پر زیادہ زور دینا شروع کیا جو انھیں الگ کرنے والی تھیں، ان پر نہیں جو انھیں ملانے والی تھیں اور جنھیں ہندوؤں اور مسلمانوں نے مل کر پیدا کیا تھا۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے ملے جلے کلچر کے نیتا شہنشاہ اکبر ہوئے تھے۔ مگر بیداری کی اس نئی تحریک کے بعد اکبر مرجع عقیدت نہیں رہے۔ کچھ لوگوں نے آہستہ آہستہ یہ مرتبہ اورنگ زیب کو دے دیا۔ بھارت میں جو بیداری آئی اس کی سب سے بڑی ٹریجیڈی یہ رہی کہ اس نے ہندوؤں اور مسلمانوں کی آنکھوں کو گھماکر ان کے سر کے پیچھے کر دیا۔ آنکھیں سامنے رہیں تو ہم مستقبل کو دیکھ سکتے ہیں۔ وہ اگر پیٹھ پر چلی جائیں تو ہمیں صرف ماضی ہی دکھائی دے گا۔

اس تحریک بیداری سے جنمی ہوئی یہ حب الوطنی جب ادب میں آئی تو یہ بات صاف ہوگئی کہ نئے ہندو اور نئے مسلمان کس طرف جارہے ہیں۔ اس وقت مسلم حب الوطنی کے شاعر مولانا الطاف حسین حالی ہوئے۔ جن کی مسدس نے مسلمانوں کو خاص طور سے جگانے کا بڑا کام کیا۔ لیکن یہ بھی ٹھیک ہے کہ مسدس لکھنے کا جذبہ شاعر کو مسلم سماج کی بدحالی سے ملا تھا۔ بلکہ حالی مسدس میں اس بات کا بھی رونا روتے ہیں کہ بھارت میں آکر اسلام کا رُوپ بگڑ گیا ہے۔ اور ہندو یت سے میل جول بڑھاکر اُس نے اپنا کافی نقصان کر لیا ہے۔

وہ دینِ حجازی کا بے باک بیڑا — نشاں جس کا اقصائے عالم میں پہنچا
کئے پے سپر جس نے ساتوں سمندر — وہ ڈوبا دہانے میں گنگا کے آکر

اسی طرح ہندوؤں کے سب سے بڑے کوی شری میتھلی شرن گپت کی "بھارت بھارتی" بھی خصوصاً ہندو حب الوطنی کو بیدار کرنے کے لئے لکھی گئی اور اُس نے

ہندوؤں کا دھیان اس غلامی کی طرف کھینچا جو ختم ہوچکی تھی اور جس کی جگہ اب نئی غلامی آگئی تھی جس کے نیچے ہندو اور مسلمان دونوں ہی تڑپ رہے تھے۔ انگریزوں کے آنے سے جو حالت پیدا ہوگئی تھی اُس کا صحیح نقشہ آگے چل کر اقبال نے کھینچا۔

بُت خانے کے دروازے پہ سوتا ہے برہمن
تقدیر کو روتا ہے مسلماں تہ محراب

لیکن "بھارت بھارتی" کے زمانے تک ہندی میں بھی یہ خیال صاف طور سے ظاہر نہیں ہوا تھا۔

مگر ہندوؤں اور مسلمانوں میں بڑھتی ہوئی دراڑ کو پاٹنے کی کوشش میں کانگریس جنم لیتے ہی ہمہ تن مشغول ہوگئی اور جس حبّ الوطنی کی نمائندگی کانگریس کرتی تھی اُس کے نعرے ہندی بھاشا کے دل پر نقش ہوگئے۔ ہندی کے دل کے یہ نقش اتنے مضبوط ہیں کہ اس پر فرقہ واریت کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ اور نہ نواکھالی۔ بہار اور پنجاب کی خوں ریزیاں ہی اس پر کوئی دھبّہ چھوڑ سکیں

سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ جس شاعر نے "بھارت بھارتی" لکھ کر ایک طرح سے مولانا حالی کے مسدّس کا جواب دیا تھا، اُس نے بھی ایک بار قومی اتحاد کو اپنا لینے کے بعد پھر کبھی اپنی راہ نہیں بدلی اور اس کی شاعری نے کانگریس، گاندھی، آزاد اور جواہر لال کے آدرش کو برابر اونچا رکھا ہے۔ انیسویں صدی میں "ہندی ہندو، ہندوستان" کی آواز پنڈت پرتاپ نرائن مصر نے لگائی تھی۔ مگر یہ آواز انھیں کے ساتھ ختم بھی ہوگئی۔ ان کے بعد کے شاعروں نے بھارت کی سبھی قوموں میں اتحاد کو مضبوط کرنے کے آدرش کو برابر سامنے رکھا ہے۔

پنڈت شری دھر پاٹھک نے اپنے بھارت گیت میں۔

جے ہندو جن جے مسلم گن جین پارسی بودھ کرسچین

سبھی کی جے کامنا ایک ہی بھاؤ سے کی اور پنڈت گردھر شرما نے بھارت کی جو تصویر کھینچی اس میں سبھی پرانت بھارت کے اُن رنگ مانے گئے ہیں۔

پنجابی گجرات نواسی بنگالی ہو یا برج باسی
راجستھانی یا مدراسی رہتے سب ہیں بھارت باسی

سینہی جی نے بھارت کے تیس کروڑ لوگوں کا مقابلہ ۳۰ کروڑ دیوتاؤں سے کیا اور ہر ہر مہادیو اور اللہ اکبر کے درمیان انھوں نے کوئی فرق نہیں مانا۔

کرتے ہو کس اشٹ دیو کا آنکھ موند کر دھیان
تیس کوٹ لوگوں میں دیکھو تیس کوٹ بھگوان
کہہ دو ہر ہر یا اللہ اللہ بول دو

مندر مسجد اور گائے کو لے کر ہندوستان میں جو (فرقہ وارانہ) دنگے چلاتے رہے اُن کی چوٹ ہندی شاعری نے برابر محسوس کی اور برابر وہ بھارت باسیوں کو سچے مذہب کی یاد دلاتی رہی۔

خوں بہایا جا رہا انسان کا — سنگھ والے جانور کے پیار میں
قوم کی تقدیر پھوڑی جا رہی — مسجدوں کی اینٹ کی دیوار میں
(دینکر) ۱۹۳۸ء

اور

ذرا ایک وہ رتبے طور پر یا کاش کے دواروں میں
جوت ایک وہ کھلے چتا میں یا جن پرہے مزاروں میں
کنارے[1] بہتی نہیں امڑ کو لوٹ سے ندیوں کو کر دو کہو
ایسے ہم دل بھی قیدی ہے اینٹوں کی دیواروں میں
(دینکر) ۱۹۳۶ء

اور جب ۱۹۴۶ء میں نواکھالی اور بہار میں دنگے شروع ہوئے تب بھی ہندی شاعری خاموش نہیں تھی۔ وہ بربادی کے نظاروں کو دیکھ کر چیخ ہی تھی۔ دھاڑ مار کر رو رہی تھی۔ درد آمیز لے میں پکار رہی تھی

[1] کنارے

گہ دیش کی بدقسمتی نے لوگوں کے کان بہرے کردئے۔

اہ بدنصیب، اس جوالہ میں، آدیش تمہارا جلتا ہے
سچھائیت کیسے تھمیں کہ بھارت دیش تمہارا جلتا ہے
جلتے ہیں ہندو مسلمان بھارت کی آنکھیں جلتی ہیں
آنے والی آزادی کی لو دونوں پانکھیں جلتی ہیں

(دینکر) ۱۹۴۶ء

ہندی میں ایکتا کے آدرش کے لئے کام کرنے والے شاعروں میں مادھو پرشاد شکل، ماکھن لال تروید ی، بال کرشن نوین اور سوبھدرا کماری چوہان کے نام بھی عزت سے لئے جاتے ہیں۔ لیکن ایسا نہیں ہے کہ حب الوطنی کی آواز صرف ہندی شاعری کے گلے سے ہی نکلی، اُردو کے شاعروں نے بھی اس نصب العین کو سامنے رکھا جس کے لئے کانگریس جنگ کررہی تھی ان اردو شاعروں میں سب سے ممتاز الہ آباد کے مشہور شاعر اکبر تھے۔ جن کے اشعار کیا ہندو اور کیا مسلمان سب کی زبان پر آج تک چڑھے ہوئے ہیں۔ سرسید، مولانا حالی اور بعد میں اقبال حب الوطنی کی جس تحریک کے موید تھے اکبر اس تحریک کے بالکل خلاف تھے اور نیچے من سے ہندو مسلم ایکتا کے لئے کوشش کررہے تھے۔

ہندو و مسلم ایک ہیں دونوں — یعنی دونوں ہی ایشیائی ہیں
ہم وطن ہم جواں و ہم قسمت — کیوں نہ کہہ دوں کہ بھائی بھائی ہیں

انھوں نے ایک سپنا دیکھا تھا۔

محرم اور دسہرہ ساتھ ہوگا — نباہ اس کا ہمارے ہاتھ ہوگا
خدا کی اور سے ہی ہے یہ سنجوگ — رہیں تب کیوں نہیں مل کر کے ہم لوگ

جس آدرش کو اکبر نے سادگی سے دیش کے سامنے رکھا اُس آدرش کو بہادری اور نڈرتا سے قلم بند کرانے کا سہرا چکبست اور جوش کے سر ہے بلکہ جوش کے بارے میں اتنا ہی کہنا کافی نہیں ہے۔ اصل میں ہندی ادب کے باہر ایکتا اور کرانتی کی جو دو سب سے بلند آوازیں اُٹھ رہی تھیں اُن میں ایک تو بنگلا کے پُر جلال شاعر قاضی نذرالاسلام کی تھی۔ اور دوسری اردو کے فرش نصیب شاعر جوش کی۔ ہندوستانی نوجوانوں کے دل کو جوش نے کچھ ایسے ڈھب سے پکڑا کہ وہ آسانی سے ہندو اور مسلمان دونوں کے پیارے ہوگئے۔

مگر اکبر، چکبست اور جوش اور مردھر پانڈیہ شرن اور ماکھن لال ہار گئے۔ جیت اُن کی ہوگئی جو اقبال کے ساتھ تھے۔ لیکن ہمارا خیال ہے کہ یہ جیت چند روزہ ہے۔ ذہن کے کٹنے اور بٹنے سے آدمی کے دل کو نہیں بٹنا چاہئے۔ ہم جس کے لئے لڑ رہے ہیں وہ آنے والی انسانیت کا اصول ہے۔ ہم جس دنیا کو وجود میں لانے کی کوشش کررہے ہیں وہ ایک ایسی دنیا ہے جہاں مذہب نسلِ آدم کو متحد کرتا ہے۔ جہاں سیاست جتنا میں بدگمانی نہیں پھیلاتی ہے۔ اور جہاں انسان یہ محسوس کرکے ایک دوسرے سے گھل مل جاتا ہے کہ ہم سب کے سب ایک ہی مرکز سے آئے ہوئے ہیں۔

آج کی حالت ناکامی اور تاریکی ضرور پیدا کرتی ہے۔ ایک ہی ذہن کے دو ٹکڑوں کے درمیان ایک نقلی لکیر ہے جو پیڑوں پہاڑوں اور ندیوں کو ہی نہیں آدمیوں کو بھی بانٹے ہوئے ہے۔ مگر آدمی پیڑ پہاڑ اور ندی نہیں۔ بھلے بُرے کو پہچاننے والا انسان ہے یہ لکیر بنے رہنا چاہتی ہے تو اپنی جگہ پر بنی رہے۔ اگر آدمی آدمی سے الگ نہیں رہے گا۔ ہماری راہ پریم اور محبت کی راہ ہے۔ نفرت جھگڑے اور بدگمانی سے ہم جو بازی ہار بیٹھے ہیں اُسے ہم پریم اور محبت سے جیت لیں گے۔ ہندی کویتا آج بھی مایوس نہیں ہے۔ وہ زنجیروں اور دیواروں کو للکار کر کہہ رہی ہے۔

وشواش بندھے، زنجیروں میں یہ زور کہاں — روک سکے پریم، یہ تاؤ کہاں دیواروں میں
اس پار پریم کی ندی لہر کر جائے گی — ہوتیں اگر سچی اس پار پکاروں میں

علی منظور

مختصر مفید

بادل گرج گرج کے بدلتے چلے ہیں رنگ
آیا سکندر اور بجا رُن میں طبلِ جنگ
گھوڑے بھی تیز و تند سپاہی بھی شوخ و شنگ
دیوانہ وار دوڑتی ہے جنگ کی اُمنگ

سمجھو تو صورتاً نہیں دارا ہی خستہ حال
دیکھو تو آئینہ ہے سکندر کا بھی مآل
ہیں دونوں "یکہ تازِ فنا" مائلِ زوال
یوں جاں بلب "مسابقتِ زندہ" کی ترنگ

"سرلشکروں" نے پاس جو کی جنگ ہی کی رائے
دارا کی فوج نے بھی جواباً دہل بجائے
کیا جانے کون مدِ مقابل پہ غالب آئے
نقارہ زن ہے دونوں طرف جوشِ نام و ننگ

انساں کا جا نشیں میں ہے نرخ بَین بَین
خوں میں نہا چکے ہیں جوانانِ جا نشین
نعم البدل ہے "نغمۂ ہستی" کا شور و شین
بادِ ہوس اُڑا کے رہی حسرتوں کا رنگ

کرنے لگے سکندر و دارا مقابلہ
عنوانِ قتلِ عام ہے ان کا مقاتلہ
سُرخی ہے "لالہ زار" کی "خونیں معاملہ"
ہے عرصۂ حیات سرِ رزمگاہ تنگ

ایسے ہی کیا مقابلے ہوتے ہیں آج کل؟
نوکِ قلم نے توڑ دیئے ہیں سناں کے پھل
شہ زور کو گرائے وُہ کم زور سر کے بل
دے صُلح کا پیام جو لے کر پیامِ جنگ

رام دھاری سنگھ دِنکر

شری مکھن لال چترویدی (ایک بھارتیہ آتما) جگن ناتھ پرساد ملند ، بال کرشن شرما نوین کی طرح دنکر جی بھی قومیت کی راہ پر گام زن ہوئے ۔ انھوں نے ملک کی صورتِ حال سے متعارف کرانے کے خیال سے نوجوانوں کے سامنے اُن کی زندگی کی اصل تصویر پیش کی ۔ سماج کو ذہنی اور دوسری غلامی سے نجات دلانے کے جذبے کو اُبھار کر اُجاگر ۔ " چھایا وادی " موضوعِ خیال میں قومی بیداری کا نغمہ جاگا ۔ ایسے نغمہ فنکاروں میں شری دِنکر بھی ایک تھے جن کی شاعری سے ہندوستانی سماج کی قومی تحریک کو تقویت ملی اور آگے بڑھنے کا پیغام ملا ۔

چھایا واد کی تحریک تیزی سے بہ کر سُست ہو گئی تھی محض خیالی یا جذباتی شاعری کی طرف سے نوجوانوں کا رُجحان کچھ کم ہونے لگا تھا ۔ اُس میں کشش نہیں رہ گئی تھی ۔ ایسے زمانے میں دِنکر میدانِ سخن میں اُترا ۔ اس کے دل پر چھایا واد کے بندھنوں کا سایہ نہیں تھا ۔ اُس کا رُخ فلسفۂ زندگی کی طرف سیدھا تھا اس لئے کوی نے اپنے پاؤں تلے کی زمین پر پڑے ذرّاتی جواہرات کو پہچانا ۔ اُس نے اپنا معبود چُنا وقت کو اور آفاق کو ۔

کوی دِنکر کی آنکھیں مٹّی زمین اور اسی لوک کی طرف لگی ہیں ۔ اُن کی شاعری میں جوالا طوفان للکار اور آندھی ہے ۔ آندھی طوفان میں کوی ڈگمگایا نہیں بلکہ اُس نے ہر قدم پر ہر مصیبت کو للکار دیا ہے کہ وہ آئے ، وہ اپنی ہمّت سے اُن سب اڑچنوں کو پیس کے رکھ دیگا ۔ اُس کے کلام میں ایک آگ ہے جس کی گرمی منجمد خون کو بھی کھولا دیتی ہے ، حرارت پیدا کرتی ہے ۔ کوی نے جہاں دھرتی کو انسانی زندگی کا سرچشمہ مانا ہے وہاں اُس نے چھایا وادی کویوں کے آرٹ اور حُسنِ بیان کو اپنا کر اپنے کلام میں ایک خاص قسم کی روحانی پیدا کی ہے ۔ اُس نے نئے سُروں میں اپنے دل کی بات کہی ہے یہی اُس کا فن ہے ۔

نظم کے علاوہ دِنکر نے نثر بھی لکھی ہے ۔ چھایا دیوی کی طرح دِنکر کی نظم اور نثر میں یکسانیت نہیں ۔ جہاں مہا دیوی کی شاعری مشکل ہے وہاں اُن کی نثر نہایت عام فہم ہے ۔ اس کے برخلاف دِنکر کی نظم زود فہم اور نثر پیچیدہ ہے ۔

' رے نُکا ' ' رس ونتی ' ' ہنکار ' ' دُند گیت ' ' بابو ' ' سام دھینی ' ' دُھوپ چھانہہ ' ' کوروکشیتر ' اور ' رشمی رتھی ' اُن کی ۔ نظموں اور گیتوں کے مجموعے ہیں ۔

' رے نُکا ' کی ریچنا میں آرٹ کے لحاظ سے کوئی بہت خوبصورت یا منجھی ہوئی نہیں ہیں پھر بھی ہمیں اس سے کوی کے آغازِ شاعری کے زمانے کی ذہنی کیفیت سمجھنے میں کافی مدد ملتی ہے ۔ اس مجموعے کی نظمیں ۱۹۳۵ء میں لکھی گئی تھیں جب کہ قومی تحریک زوروں پر چل رہی تھی ۔

' رس ونتی ' میں رنگین تخیل اور پریم کے گیت ہیں ۔ ایک نمونہ ملاحظہ فرمائیے :

دو پریمی ہیں یہاں ایک جب
بڑے سانجھ آہا گاتا ہے
پہلا سُور اُس کی راد ھا کو

گھر سے یہاں کھینچ لاتا ہے
چوری چوری کھڑی نیم کی
چھایا میں چھپ کر سلگتی ہے

ایک اور گیت میں کوی گنگناتا ہے ۔
سنگنی ! جی بھر گا نہ سکا میں

. . . . . .

رنگتا رہا گلاب پٹی پر
اپنا چترؔ اٹھا نہ سکا میں

. . . . . .

جس دن وہ سورؔ میں آئے گا
شیش نہ پھر کچھ رہ پائے گا
کہہ کر اُسے کہوں گا وہ جو
اب تک کبھی سُنا نہ سکا میں
سنگنی ! جی بھر گا نہ سکا میں

"ہنکار" میں قومی گیت اور نظمیں ہیں - یہ قومی تحریک کے دنوں کی یادگار ہے

جنہیں دیکھ کر ڈول گئی
ہمت دیر مردانوں کی
اُن موجوں پر چلی جا رہی
کشتی کچھ دیوانوں کی

اُبھے بیڈھ جوالا مکھیوں پر
اپنا منتر جگاتے ہیں
یہ ہیں دے جن کے جادو
پانی میں آگ لگاتے ہیں

ایک اور تصویر

قبر قبر میں اُبھر ہاتھوں
کی بھوکی ہڈی دستک ہے
دُودھ دُودھ
دُنیا سوتی ہے ۔ لاؤں دُودھ کہاں کس گھر سے ؟
دُودھ ۔ دُودھ
ہے دیو ۔ دُودھ کی کچھ بوندیں ٹپکا امبر سے !
دُودھ ۔ دُودھ
گنگا ! تو ہی اپنے پانی کو دودھ بنا دے
دُودھ ۔ دُودھ
اُف ! ہے کوئی بھوکے مُردوں کو دلاسا دے
دُودھ ۔ دُودھ

ہٹو دیوم کے یگھ پنتھ سے
سورگ لوٹنے ہم جاتے ہیں
دُودھ ، دُودھ اور دُودھ
تمہارا دُودھ کھویے ہم جلتے ہیں
ہنکار جوالا مکھی جذبات سے بھرپور رچنا ہے

"دُھند گیت" میں کوی ایک فلسفی کے رُوپ میں ظاہر ہوا ہے "باپو" میں مہاتما گاندھی کی فلاسفو کو سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے ۔ اس میں باپو کا صاف اور خوبصورت چترؔ ہے "سام دھینی" سام دھینی میں کوی کی شخصیت نہایت اچھی طرح اُجاگر ہوئی ہے ۔ اُس میں ناٹکی بھی ہے اور کھٹور پن بھی ۔ اس میں روانی بھی ہے اور خوبصورتی بھی سادگی بھی اور بانکپن بھی ۔

پیارے سودیش کے ہت انگار مانگتا ہوں
چڑھتی جوانیوں کا شرنگار مانگتا ہوں

ہو میں تیز تیز کر بہا رہی جوانیاں

دیگر نظمیں نہایت کامیاب نظموں میں سے ہیں ۔
"دُھوپ چھانہہ" میں بچوں کے لئے نظمیں لکھی ہیں

ان میں دھوپ کم اور چھایا زیادہ ہے - کچھ نظمیں دِنکر کی ادیچسل ہیں اور کچھ بنگلہ نظموں کے چھایا انواد یعنی ترجمے

کورکشیتر دِنکر کی مشہور طویل رزمیہ نظم ہے - ہندی کے سناتنیہ کاروں (ادیبوں) نے اس کتاب کو شاعری کی ایک نمائندہ کتاب مانا ہے - جنگ کرنا مناسب ہے یا نا مناسب - اس پر کوی نے اپنے مخصوص انداز میں اظہارِ خیال فرمایا ہے - مہابھارت کے کیریکٹروں کے مکالموں میں جنگ کے تفکراتی پہلو پر نہایت وضاحت سے روشنی ڈالی ہے -

کورکشیتر کا پیغام ہے — ہٹو مت ، لڑو ! جب تک کہ مساوات کے ڈانڈے تک نہ پہونچ جاؤ - ایک تو کمی ہے نئے سماج کی تشکیل کی اور تنظیم کی - بے انصافی جبر اور ظلم کا جنگ سے خاتمہ کرو -

'رشمی رتھی' دِنکر جی کی تازہ ترین تصنیف ہے - یہ کتاب بھی اُن کے 'کورکشیتر' کی طرح اپنا مقام بنا رہی ہے - اس کا ہیرو بھی مہابھارت سے ہی لیا گیا ہے اس کا نام کرن ہے - اس کے دیباچے میں کوی نے لکھا ہے

"یہ یُگ دیوتوں ، پانڈوں اور مہتوروں کا یُگ ہے - اس لئے یہ مین قدرتی ہے کہ شاعر اُن کرداروں کو روشنی میں لائے جو ہزاروں برس ہمارے سامنے نفرت اور قہر کا ایک بے زبان مجسمہ بن کر کھڑے ہیں -"

دِنکر جی اس نظم میں بھی بہت حد تک کامیاب ہُوئے ہیں -

قاسم شبیر نقوی نصیرآبادی

غزل

حُسن کی ہر نگاہ کو "درد" بنا کے رہ گئیں
آج مری اُداسیاں اُن کو رُلا کے رہ گئیں

"حاصلِ دید" پا گئیں عشق کی خوش نگاہیاں
اُن کو بھی جیسے سربسر شوق بنا کے رہ گئیں

تیری نظر کی نرمیاں تیرے سخن کی گرمیاں
مجھ کو حیات و موت کے راز بتا کے رہ گئیں

اِتنی گھٹی گھٹی سی تھیں حُسن کی مُسکراہٹیں
جیسے سکوتِ عشق کا سوگ منا کے رہ گئیں

ہائے یہ جبرِ دل دہی "فطرتِ ناز" کے خلاف
اُن کے کرم کی کوششیں دِل کو دُکھا کے رہ گئیں

تجھ کو نہ فکر ہو تو خیر، قاسمِ سخت جاں، مگر!
کتنے دلوں کی بستیاں عشق میں ڈھا کے رہ گئیں

رفیعہ سلطانہ

جدید اُردو ناول

ناول کی بنیاد یُوں تو اٹھارھویں صدی میں اس وقت پڑی جب اُردو ادب کا جدید دَور شروع ہو چکا تھا - ناول کے معنی خود نئے اور جدید کے ہیں - اس لئے اس کے ساتھ 'جدید' کا اضافہ غیر ضروری معلوم ہوتا ہے لیکن سچ پوچھئے تو اُردو ناول کے ماضی اور حال میں اتنا ہی تفاوت ہے جتنا خود مرزا العبدوس کی 'اصغری' اور ٹیڑھی لکیر کی 'شمن' میں - جس طرح شمن کی دُنیا اصغری کی دُنیا سے مختلف ہے اس طرح جدید ناول بھی اپنے پیشروؤں کے اسلوب ٹیکنیک اور مواد کے لحاظ سے بہت مختلف ہے -

بہ نظرِ غائر دیکھا جائے تو ادب میں 'ناول' کی روایت ہی ایک صالح اور ترقی پسند رجحان کا نتیجہ ہے - آرنلڈ کیٹل نے انگریزی ناول کے متعلق جو لکھا یعنی

" انگریزی ناول کی ابتدا اور ترقی تاریخ کا ایک جُز ہے" اُردو ناول پر یہ کہاوت صادق آتی ہے، کیونکہ تاریخ صرف کتاب میں بند نہیں کی جا سکتی - تاریخ انسان کے محسوسات، کیفیات، رہن سہن کے طریقے سوچنے سمجھنے کے ڈھنگوں میں تبدیلی کو دیکھتی ہے - وہ یہ دیکھتی ہے کہ انسان نے نیچر کو کس طرح متاثر کیا - زندگی نے کون کون سے نئے مسائل پیش اور حل کئے - ناول ان ہی چیزوں کو ریکارڈ کرتی ہے اور حقیقت نگاری کی سب سے مقبول صنف ہے -

جس طرح تاریخ میں دَورِ جمہوریت نے جاگیرداری تمدن کی مطلق العنانی اور استبداد سے عوام کو رہائی دلائی اسی طرح ناول نے بھی ادب میں جمہوریت پیدا کی اور ادب کو رومانس یعنی تخیل کی مطلق العنانی سے نجات دلائی جس نے شاعری اور لمبی لمبی داستانوں میں اپنے کو محصور کر لیا تھا - جو صرف اُمراء کی دل بہلائی کے لئے اور اُن کی سرپرستی پر قائم تھا - جمہوریت جس طرح "لوگوں کی حکومت" لوگوں کے لئے اور لوگوں کے اپنے ہاتھ میں کا دوسرا نام ہے اسی طرح ناول بھی عام کثیر انسانوں کے رہنے سہنے کے ڈھنگ ان کے دُکھ سکھ تمناؤں ناکامیوں حسرتوں اور آرزوؤں کا مرقع بن گیا - اور ادب صرف اُمراء کی میراث نہیں، متوسط اور نچلے طبقے کا عکاس بن گیا تب ہی یہ زندگی کے بھی قریب آیا -

اٹھارھویں صدی میں ہندوستان کی زندگی میں جو انقلاب آیا اُس کی سب سے بہتر تصویر اُردو ناول ہے - نذیر احمد اور سرشار دو نام ایسے ہیں جنہوں نے اُردو ادب کو ناول کے نام سے روشناس کرایا - سرشار نے لکھنؤ اور دِلّی کی مرتی ہوئی تہذیب کو محفوظ کیا تو نذیر احمد نے اُجڑتی ہوئی زندگی کے نقوش بنائے - معاشرے کے بدلتے ہوئے رجحانات، عورتوں کی جہالت اکثریت کی مذہب سے بیگانگی، امیرزادوں کی عیاشی، بیواؤں کی کس مپرسی کو ناولوں کا موضوع بنایا تو سرشار نے اعلیٰ طبقے کی معاشرتی زندگی رسم و رواج، طور طریقے زبان کو حسن و عشق کی چاشنی

کے ساتھ بیان کیا۔

اُردو ناول کا دوسرا دَور تاریخی ناولوں اور ترجموں کا دَور تھا شرر اور محمد علی نے اسلاف کے کارنامے اس لئے پیش کئے کہ 'عروقِ مردہ' میں خونِ زندگی دوڑے ۔ اس دَور میں مرزا ہادی رُسوا کا ایک نام ایسا ہے جس کے ناول "امراؤ جان ادا" نے کم و بیش کلاسکس (ادبیاتِ عالیہ) کا مرتبہ حاصل کر لیا ۔

اس کے بعد طبقۂ نسواں نے ناول کو اصلاحِ معاشرت کا ذریعہ بنا لیا ۔ اس میں بعض بڑے اچھے ناول لکھے گئے ۔ کردار نگاری جذبات نگاری اور منظر کشی کے اعتبار سے یہ بالکل بھی بھلا دینے کے قابل نہیں۔ لیکن یہ ابتدائی کوششیں تھیں جس نے اُردو ناول کو کمال پر پہنچایا وہ ہیں پریم چند ۔

یہ کہا جائے کہ پریم چند جدید ناول کے بانی ہیں تو غلط نہیں اُردو ناول میں جو کچھ بھی فکری انقلاب ہوئے اُن کی بنیاد پریم چند نے رکھی ۔ انھوں نے مذہب کو نئی سماجی حقیقت نگاری سے آشنا کیا ۔ نئے شعور کو سمجھ کر نئے اخلاقی قدروں پر اپنے افسانوں اور ناول کی عمارت کھڑی کی ۔ ان کے ناولوں کا مرکزی نقطہ انسان اور انسان دوستی ہے ۔

۱۹۳۶ء میں انسان دوستی کے جذبے میں اور شدت پیدا ہو گئی ۔ ترقی پسند ادیبوں نے ادب کو 'برجِ عاج' سے نکال کر عام شاہراہوں پر لا کھڑا کیا ۔ ادبی تیکنیک اور فارم میں انقلاب آیا اور اس انقلاب کی زد سے شاعری، افسانہ، ناول، تنقید کچھ بھی نہ بچ سکے ۔ شاعری میں تو یہ انقلاب دوگونہ تھا اس میں نہ صرف معاملہ ہی میں تغیر ہُوا بلکہ ہیئت بھی منقلب ہوئے بغیر نہ رہ سکی ۔

ناول کی تیکنیک میں بھی ترقی ہوئی ۔ اُردو میں ناول انگریزی اثر کے توسط سے آیا تھا ۔ اُردو ناول پر انگریزی ناول کا گہرا اثر بھی ہے ۔ بیسویں صدی انگریزی ناول میں بھی جدت اور تجربے کا دَور سمجھی جاتی ہے ۔ جس میں ڈکوریائی عہد کی روایتیں پیس ۔ مذہب کے عوض سائنس اور مادیت کا غلبہ ہُوا ۔ اب جارج ایلیٹ، میریڈیتھ، ڈکنس کے اخلاقی بندھے ٹکے اقدار کے عوض نوجوان لکھنے والوں کا ایک گروہ اُٹھا جس نے پرانی ادبی قدریں بدل دیں ۔ ڈکنس کے بعد بنیٹ گالزوردی نے پھر بھی پرانی اقدار کو سینوں سے لگائے رکھا لیکن بیسویں صدی کے پہلے ان سے دو قدم آگے بڑھ گئے ۔

کاپٹن میکاولی نے ۱۹۱۵ء میں "داہماسہ فرار" لکھ کر جذبات اور نفسیات نگاری کی نئی جاذبیت شامل کی ۔ اس میں نوجوانوں کے کردار کی نفسیات کا اچھا تجزیہ کیا گیا تھا ۔ اس کے بعد اس نے کامیابی کی "یگنڈی گی" اور "اولی شارٹ کیٹ" ۔ یہ ناول کرداروں کے بچپن، بلوغ اور طالب علمانہ زندگی کے نفسیاتی مطالعے تھے، اس لئے یہ ناول نوجوانوں میں بہت مقبول ہُوئے ۔ کیونکہ اس میں قصہ پر کہ جدت کا کمال یہ تھا کہ جو سُننا تھا اُسی کی داستان معلوم ہوتی تھی ۔

ان ناولوں کی مقبولیت دیکھ کر فرینک سوئنرٹن نے رات اور نوجوانوں کا اجتماع لکھے ۔ اس طرح ان "ہکسفورڈ ناولوں" نے نوجوانوں کے جذبات و احساسات سمجھنے میں بڑی مدد دی ۔ ساتھ ہی ایک نئی اور بہتر دُنیا اُن کے سامنے پیش کی جو صرف من کی نہیں تن کی دُنیا بھی تھی ۔

اُردو ناول کا اس سے متاثر ہونا ناگزیر تھا ۔ چنانچہ سجاد ظہیر کی 'لندن کی رات' کرشن چندر کی 'شکست' عزیز احمد کی 'گریز' اسی طرح کی کوششیں ہیں اور یہ بلاشبہ اُردو کے جدید ناول ہیں۔

سجاد ظہیر نے صرف ایک مختصر ناول لکھ کر اردو ناول نگاری میں اپنا خاص مقام حاصل کر لیا ۔ ان کا ناول 'لندن کی ایک رات' اِن آکسفورڈ ناولوں ہی کا سا تھتی ناول سمجھا جا سکتا ہے جس طرح فرینک سوئنرٹن نے "رات" میں لندن میں رہنے والے ایک گروپ کی چند گھنٹوں کی زندگی پیش کی ۔ سجاد ظہیر نے لندن کی ایک رات میں بھی اسی طرح ایک طالب علم کی زندگی کے چند گھنٹے بتائے ہیں۔ نام سے تو خیال ہوتا ہے کہ اس میں بجز کسی نائٹ کلب کے رقص و سرود کے اور کیا ہو سکتا ہے ! کیونکہ ابھی تک ہمارے ناول نگاروں نے اہلِ فرنگ کی زندگی کے ایک ہی رُخ کو دیکھا

تھا۔ لیکن سجاد ظہیر کے ان چند لمحوں میں بڑا حسن اور خلوص ہے۔ یہ مجبوری محمد کے ایک نوجوان کے دل و دماغ کی کشمکش کی تصویر ہے۔ منشی پریم چند کے نوجوان ہیرو گاندھی وادی تھے۔ ان کے سامنے ہندوستان کی غلامی ہی سب سے بڑا مسئلہ تھی۔ سجاد ظہیر کے ہیرو کا دل مجموعی طور پر تمام انسانیت کے دکھوں دردوں اور ناکامیوں پر کڑھتا ہے۔ پریم چند نے صرف مشرقی عورت میں وفا اور ایثار دیکھا تھا۔ سجاد ظہیر نے بتایا کہ جنسیاتی حدیں انسانیت کو تقسیم نہیں کر سکتیں۔ وفا ایثار، ہمدردی جس طرح مشرقی عورتوں کا خاصہ ہے ویسے ہی مغربی عورتوں کا بھی وطیرہ ہے۔ آفاقیت اور انسان دوستی کے جذبے سے تمام ناول کی فضا معمور نظر آتی ہے۔ اس کی ٹیکنیک بھی غیر معمولی ہے۔ ابھی تک ہم اُردو ناولوں میں پلاٹ اور واقعات نگاری کو اہمیت دیتے آئے تھے۔ یہاں نہ کردار ہے نہ پلاٹ ایک نقطے کے گرد ناول گھومتا ہے۔ اس کے افعال سے زیادہ اس کے شعور کی رَو کا پتہ چلتا ہے۔ یہ ایک علامت ہے جو نئی نسل کے تذبذب، تشکک اور بے چینی کا آئینہ دار ہے جو ایک سماج کو ڈھا کر جس میں ظلم، استحصال، غلامی اور مجبوری ہے، نیا سماج تشکیل دینا چاہتا ہے جس کی تعمیر وہ اور اُس کے مغربی ساتھی کریں گے ان کا یہ ناول ذات پات مذہب و ملت ملک و قوم کے جھگڑوں سے بے نیاز ہے۔ وہ اپنی انسان دوستی کے وسیع مسلک کے سامنے ان سب کو پسِ پشت ڈال دیتا ہے۔

کرشن چندر

کچھ ہی دن بعد کرشن چندر نے 'شکست' لکھا۔ شکست بھی آکسفورڈ ناولوں کی طرح ایک نوجوان کے داخلی جذبے کے گرد گھومتا ہے۔ لیکن اس میں بلا کی جاذبیت ہے۔ اس کی رومانیت انقلابی ہے۔ جیسا کہ نام سے ظاہر ہے، اس کا ہیرو ان اُن گنت نوجوانوں میں سے ایک ہے جو سماج سے شکست کھا جاتے ہیں جن میں اتنی سکت نہیں ہوتی کہ ذات پات سوسائٹی کے بندھنوں کے خلاف آواز اُٹھا سکیں۔

اس میں سماجی اجارہ یعنی ہندوستان کے سامراجی نظام کی فتح اور طبقاتی کشمکش کی شکست کو پیش کیا ہے۔ ہیرو کی خارجی اور باطنی کشمکش کو کرشن چندر کے جادو نگار قلم نے جس طرح بیان کیا وہ صرف ایک فن کار ہی کا کمال ہے۔ ورنہ اس بظاہر معمولی داستانِ عشق میں اتنی دلچسپی باقی نہیں رہ سکتی تھی۔ اس میں جذبے کی دھیمی دھیمی آنچ ہے۔ کہانی صرف اتنی ہے کہ شیام ایک تحصیلدار کے لڑکے کو ایک برادری سے خارج شدہ عورت چھایا دیوی کی لڑکی دنتی سے محبت ہو جاتی ہے۔ اس کے اپنے خاندان کی عظمت کی پرانی قدریں ہیں جن کی وجہ سے دنتی سے اُس کی شادی نہیں ہونے پاتی۔ دنتی کسی اور کے گلے منڈھ دی جاتی ہے۔ ادھر شیام کی شادی کہیں اور ٹھہر جاتی ہے اور دنتی غم کی تاب نہ لاکر ختم ہو جاتی ہے اس طرح ایک عورت کی مدرہ اور جسم کی بربادی اور ویرانی کی داستان ہے۔ درد اصل اس میں دو حقیقی سلسلے ہیں۔ دوسرا سلسلہ ایک نیم برہمن نیم چمار لڑکی چندرا اور ایک چھتری نوجوان موہن سنگھ کی باہمی کشمکش کا ہے۔ جس میں موہن سنگھ کا کردار شیام سے زیادہ جیالا ہے۔ فرق اتنا ہے کہ موہن سنگھ نچلے طبقے کا ہوتے ہوئے اپنی مجبوبہ کو دوسرے کے ہاتھ میں نہیں سونپ سکتا۔

اس کہانی کو کشمیر کی وادی میں پیش کیا گیا ہے جس سے شاید ایک طرف فطرت کا حسن اور دوسری طرف انسان کی تباہ کاری بتانا مقصود ہے۔ منظر کشی اس میں انتہا کو پہونچی ہوئی ہے ہندوستانی عورت کی ذہنی حالی پر بھی کرشن چندر نے خون کے آنسو روئے ہیں۔ عزیز احمد نے ان کے اس ناول کے متعلق اعلان کیا کہ "وہ اُردو کا بہترین ناول ہے"۔ اس کے بعد انھوں نے دو اور ناول لکھ ہوتی ہے "اَدھ جلی کھیت جاگے" لکھے۔ اول الذکر کو میں ناول کی صف میں شمار نہیں کروں گی۔ "جب کھیت جاگے" ناول کی صف میں آ سکتا ہے۔ یہ شکست کے برعکس افادی

ناول ہے۔ اس کی کہانی بہت معمولی ہے، یعنی ایک کسان کی جد و جہد لیکن کرشن چندر کے جادو نگار قلم نے اس میں رنگینی بھر دی۔ ان کی ٹیکنیک کا کمال ہے کہ ایک غریب کسان کی زندگی میں کوئی دلچسپی نہیں ہوتی بہت دلچسپ بنا دیا گیا۔

کرشن چندر کا یہ ناول مقصد کے اعتبار سے فلیم ہی لیکن فن اور ٹیکنیک کے اعتبار سے بہت زیادہ اہم نہیں۔ ایسے محسوس ہوتا ہے پروپیگنڈے کی خاطر انھوں نے اپنے فن کی بھینٹ دی ہے۔ اُن کے ہیرو سے تو پریم چند کے غریب کسان 'ہوری' میں زیادہ سکت اور جان معلوم ہوتی ہے۔

عصمت چغتائی

کا ناول ٹیڑھی لکیر جدید ناولوں میں ایک اہم حیثیت کا حامل ہے۔ عصمت نے ایک ہی ناول رکھ کر اردو ناول میں اپنی جگہ بنا دی۔ ٹیڑھی لکیر' عبوری دور کی ایک لڑکی کی داستان ہے۔ جب پرانی قدروں کی جگہ نئی قدریں لے رہی تھیں۔ پردہ اور مردوں سے چھپنے کے تصور کے حوض مخلوط ماحول جنم لے رہا تھا۔ شادی بیاہ کے طریقے اور نظریے بدل رہے تھے اور عورت معاشی مسابقت میں مرد کی حریف بن رہی تھی۔ عصمت نے "ٹیڑھی لکیر" کا نام دے کر شخی کے روپ میں بڑا جیالا کردار پیش کیا جو 'شکست' کے بزدل 'شیام' 'لندن کی ایک رات' کے آورش 'اعظم' سے مختلف ہے۔ کسی قدر 'گریز' کا ہیرو 'نیم' اس کے مماثل ہے۔ پھر بھی بے باکی بے خوفی اور اُپج میں وہ نیم سے آگے ہے۔ وہ سوسائٹی سے شکست نہیں کھاتی۔ جو چیز اُس کو شکست دینے والی ہے وہ خود اُس کی ذات ہے وہ سماج کی باغی ہے لیکن انسانی فطرت سے بغاوت نہیں کرتی اس میں عصمت نے بدلتے ہوئے معاشرتی نظام کے ہر ایک پہلو پر نظر ڈالی ہے۔ آزاد محبت' مخلوط معاشرہ، پردہ نشین گھرانوں کی نفسیات، نوجوانوں کے جذبات و احساسات، عورت اور اُس کے مسائل۔ اس لئے اُن کے اس ناول کو اُردو ادب میں خاص مقام حاصل ہے۔

عزیز احمد

عصمت چغتائی کے ساتھ ہی ذہن میں عزیز احمد کا نام اُبھرنے لگتا ہے۔ عزیز احمد یوں تو شاعر بھی ہیں مترجم بھی نقاد بھی ہیں اور افسانہ نگار بھی۔ لیکن ان کی شہرت کا خاص میدان ناول ہے۔ بلاشبہ عزیز احمد اس زمانے کے سب سے بڑے ناول نگار ہیں۔ انھوں نے ابھی تک (۱) مرمر اور خون (۲) ہوس (۳) گریز (۴) آگ (۵) ایسی بلندی ایسی پستی (۶) شبنم کل چھ ناول لکھے۔ گو اُن کے ناول 'ہوس' اور 'مرمر اور خون' 'شکست' اور 'ٹیڑھی لکیر' سے پہلے چھپ چکے تھے۔ لیکن ان کی شہرت ان کے تیسرے ناول 'گریز' سے ہوئی۔ 'گریز' کے بعد ہی کنہیا لال کپور اور کرشن چندر کو اعتراف کرنا پڑا کہ "عزیز احمد کو ناول کی ٹیکنیک پر قابلِ رشک عبور حاصل ہے۔" کرشن چندر نے لکھا:۔

"عزیز احمد کے ناول ٹیکنیک میں پریم چند سے بھی بڑھے ہوئے ہوتے ہیں لیکن ان کی ساری مشاقی ایک لاش کو سنوارنے اور سجانے میں صرف ہو رہی ہے۔" لیکن یہ ٹھیک نہیں اسلوب ٹیکنیک زبان اور مواد کے لحاظ سے ان میں جدت اور انفرادیت ہے۔ ان کے تمام ناولوں کا مقصد انسان کو آزاد کرنا اور جگانا ہے۔ وہ یہ چاہتے ہیں کہ اپنے ناظر اور تماشائی کو اس بلندی تک لے جائیں جہاں سے واقعات زیادہ واضح اور زیادہ عمیق نظر آئیں۔ وہ ان سوالوں کو پیش کرنا چاہتے ہیں جن کے تشفی بخش جواب نہیں دئے جا سکتے۔ مثلاً اپنے حالیہ ناول شبنم میں انھوں نے یہ سوال اُٹھایا ہے! کیا محبت بار بار ممکن ہے؟

اس کو وہ اس طریقے سے پیش کرتے ہیں کہ معمولی سوجھ بوجھ کا آدمی ان مسائل کی تہہ تک نہیں پہنچ سکتا۔ چنانچہ اس ناول کی اشاعت کے بعد ایک نقاد نے اعتراض کیا کہ

"یہ پانچویں درجے کی داستان معلوم ہوتی ہے، ناول میں کچھ تو ہو۔ جینے کا سلیقہ نہ سکھائے تو کم از کم مرنے کا

ڈھنگ تو بتائیے 'شبنم' میں کیا ہے! ایک نیم مشرقی نیم مغربی اقتصار کا مارا نوجوان ہے جسے ایک خاص لڑکی کو پانے کی ہوس ہے یہ 'طلبِ عشق' ہے۔ ملنے کے بعد پسندیدگی یہ 'عشق' ہے، اس کی حدت آبی پر مسلسل شک اور اس سے پیدا ہونے والا اضطراب یہ 'دردِ عشق' ہے۔ تنہائی میں موقع ملنے پر لکھنؤ کی شاعری یہ 'وصل' ہے، قیدِ شریعت کے نیتوں سے گھبرا کر اسے 'جیمی مونڈین' بنانے کی خواہش یہ 'عشق کی گھات' ہے تعلقات بنا لینے سے گریز اور چھپکا ہٹ یہ ترکِ عشق' کا فلسفیانہ جواز ہے۔ اسی کے گرد پورا ناول گھومتا ہے۔"

حالانکہ ایسا نہیں اس میں انھوں نے "بیاہ" ایک حسیاتی اور نفسیاتی مسئلے کو اٹھایا ہے۔ جو تمام انسانیت کے لئے قابلِ غور بنا ہوا ہے۔ اسی کو انھوں نے اپنے طور پر حل کرنے کی کوشش کی ہے۔ ایک طرف تو وہ ذاتی جائیداد کے نظریے کو بُرا بتاتے ہیں، دوسری طرف اس کو چھوڑ دینے کی صورت میں اس سے پیدا ہونے والی نفسیاتی اُلجھنوں اور خرابیوں کو بھی بتایا ہے۔ اس موضوع پر دُنیا کے سب ہی ادیبوں برٹرانڈ رسل، اندرے ژید، ایس پال وغیرہ نے لکھ کر انسان کی حیثیت سے اس کا مطالعہ کیا اور روس نے جہاں یہ بندشیں ڈھیلی کرنے کی کوششیں کیں وہیں اُس کی خرابیاں دیکھ کر اُس کے تحفظ کی بھی کوشش کی۔ لیکن انسان ان دو لاعلاج مرضوں یعنی موت اور محبت پر قابو نہ پا سکا۔

عزیز احمد بھی اس ناول میں اس مسئلے کو ادھورا چھوڑتے ہیں، یعنی شادی کو وہ مستقل غلامی سمجھ کر اس سے پیچھا بھی چھڑانا چاہتے ہیں۔ دوسری طرف وہ جانوروں کا سماج بھی نہیں دیکھنا چاہتے جس میں عقل کے عوض جبلت کی کارفرمائی ہو۔ اسی لئے وہ اس لڑکی کو بُرا بتاتے ہیں جو (ان کے خیال میں) روحانی طور پر ہی سہی اورلف کے ساتھ وابستہ رہ چکی ہے۔ ساتھ ہی جیسا کہ پیشتر لکھا جا چکا ہے وہ انسانی فطرت کی ایک اور لاینحل گتھی 'محبت' کا بھی تجزیہ کرتے ہیں۔ کیا محبت بار بار ممکن ہے؟ یہ ایک ایسا سوال ہے جس کا جواب قطعی طور پر نہیں دیا جا سکتا۔ یہ بہت کچھ طبائع پر منحصر ہے۔ بعض کے لئے ممکن ہے بعض کے لئے ناممکن۔ چنانچہ عزیز احمد نے یہی چیز پیش کی اور بڑی دیانت داری سے عورت و مرد نے فطری تضاد کو بھی واضح کر دیا وہ اس طرح کہ ارشد جو اس ناول کے ہیرو ہیں ابتدا میں لیزل سے وابستہ ہیں پھر پروین، امیر، زیبا، رعنا ان کی توجہ کھینچتی ہے۔ شبنم پر نظرِ التفات کے بعد وہ آسکر وائلڈ کے ہم خیال بن کر مرگِ آرزو کا ذکر کرتے ہیں۔ یعنی کسی چھٹی منزل کی تلاش، اس کے برخلاف اس کے نسوانی کرداروں میں زیادہ عزم اور استقلال ہے۔ شبنم کو وہ ارشد کی طرح بار بار محبت کرتے دکھانا چاہتے ہیں۔ لیکن صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ خود تصفیہ نہیں کر پائے۔

عزیز احمد کے طرزِ خیال میں یاس، طنز اور درد ہے۔ لیکن ان کی قنوطیت کا مفہوم عام مفہوم سے بالکل مختلف ہے۔ معمولی خوشیوں یا راحتوں کے زوال جیسے بھوک بیروزگاری فاقہ کشی سے ان کے ناولوں میں یاس و الم کی کیفیتیں نہیں پیدا ہوتیں، بجائے معمولی حادثات کے، وہ حادثات جو ذہنی بے چینی اور تڑپ کی وجہ سے ظہور میں آتے ہیں ان کے ناولوں میں یاس و الم کی فضا پیدا کرتے ہیں۔ چونکہ یہ جذبات ذہنی تخیلات کی شکست سے پیدا ہوتے ہیں اس لئے ان میں شوکت و حسن ہوتا ہے۔

کردار نگاری میں بھی ان کو خاص ملکہ حاصل ہے۔ ان کی کردار نگاری البتہ سے ملتی جلتی ہے۔ وہ بھی اس طرح جہاں کرداروں کا باطنی رجحان کو دکھانا چاہتا ہے خود بین سے اُن کو دیکھ کر ناظرین کی طرف بڑھا دیتا ہے اس کی پروا نہیں کرتا کہ اس طرح پردہ دیئے سے اس کے ڈرامے کے افراد مر جائیں گے۔ اس کی مثالیں نعیم، شبنم، ارشد، سلطان حسین اور

سکندر ہیں جو کہ کردار ہیں - بہ حیثیتِ مجموعی عزیز احمد نے اُردو ناول کو بہت کچھ دیا - جان دار اسلوب، بےمثال ٹیکنیک، جذبات نگاری مختصراً ان کے ناول جدید اُردو ناول کے شاہکار سمجھے جاتے ہیں - جدید ناول کو عزیز احمد کے بعد جس نے مالا مال کیا وہ ہیں قرۃ العین حیدر

قرۃ العین حیدر

قرۃ العین حیدر دبے پاؤں آئیں اور دیکھتے ہی دیکھتے ادب کی دُنیا پر چھا گئیں - ان کا ناول 'میرے بھی صنم خانے' بیسویں صدی کی زندگی کا بڑا اچھا عکاس - اس میں داخلیت اور خارجیت کا بڑا خوش نما امتزاج ہے - یہ صرف ایک فرد کے محرب و اندوہ کی داستان نہیں 'جماعت' کے حسرت و غم کا مرقع ہے - ساتھ ہی ایک مخصوص معاشرے کا جو بہت تیزی سے مٹتا جا رہا ہے، ماتم بھی ہے - قرۃ العین صرف بورژوا طبقے کو لعنت ملامت کرنے پر اکتفا نہیں کرتیں جو ترقی پسند ادب کی ممتاز خصوصیت سمجھی جاتی ہے - یہ ترقی پسند سے زیادہ 'انسان' ہیں 'صحیح معنوں میں انسان جو ذات پات جماعت اور فرقے کے امتیاز سے ماورا ہے - اس کے کردار بڑے وسیع مشرب ہیں جو مشرقی مغرب کالے گورے ہندو مسلمان کا فرق نہیں کرتے اور زماں و مکاں کی پابندیوں سے آزاد ہیں - رخشندہ کے کردار میں نسوانی حسن بھی ہے اور عظمت بھی - ساتھ ہی ساتھ روح کی لطافت جو اُسے اُردو ادب کی تمام ہیروئنوں میں ممتاز کرتی ہے - ابھی تک اُردو ناول کی ہیروئن تو شہزادیاں قسم ناداں ہوا کرتیں یا بیسوائیں جو یا تو 'لطف محض' ہوتیں یا 'قہرِ مسلسل' - عصمت چغتائی نے سب سے پہلے اپنے ناول ٹیڑھی لکیر میں ایک ایسے کردار کو روشناس کیا جو قدیم و جدید کے دوراہے پر کھڑا ہے - لیکن یہ لڑکی متوسط طبقے کی ہے - قرۃ العین حیدر نے پورژوا طبقے کی لڑکی پیش کی ہے - قرۃ العین کے ناول میں محض حقیقت نگاری ہی نہیں حقیقت نگاری سے بڑھ کر آئیڈیلزم تصوریت ہے، اسی لئے ان کا یہ ناول ہنگامی نہیں دوامی ہے - ابھی حال ہی میں انھوں نے اپنا دوسرا ناول 'شعلۂ غمِ دل' پیش کیا - امید تو تھی کہ نقشِ ثانی نقشِ اوّل سے بڑھ جائے گا - لیکن ایسا نہیں - اس میں انھوں نے (مابعد واقعاتی) تجربے کو اُردو ادب میں منتقل کرنے کی کوشش کی ہے - یعنی واقعات سے آگے بڑھ کر (مابعد واقعات پیش کئے جائیں جس میں افراد کے احوال سے بڑھ کر (جو محض واقعات ہیں) ان کے خیالات و احساسات پیش کئے جائیں - لیکن اردو ادب میں یہ چیز ابھی نئی ہے - ان کا یہ ناول بڑی حد تک خیال میں کر غیر دل چسپ ہو گیا -

اُردو کے جدید ناولوں میں ابراہیم جلیس کے 'چور بازار' کا بھی نام لیا جا سکتا ہے - احسن فاروقی نے بھی اس زمانے میں ناول لکھنا شروع کئے لیکن ان کے ناولوں میں کوئی خاص بات نہیں بعض اوقات زبان و بیان کی غلطیاں مضحکہ خیز نظر آتی ہیں -

مجموعی طور پر اُردو کا جدید ناول تیزی سے ترقی کی طرف جا رہا ہے اور ممکن ہے یہ اُردو افسانے کی طرح دوسری زبانوں کے ادب میں اپنی جگہ پیدا کرے -

گھنیشام سیٹھی

ڈگر پردیش کے عوامی گیت

عوامی ادب ایک قوم کا وہ سرمایہ ہے جسے وہ قوم ہمیشہ سینے سے لگائے رہتی ہے۔ لوک گیت بھی لوک کہانیوں لوک ناچوں اور لوک کہاوتوں کی طرح اسی ادب کا نہایت اہم جزو ہیں۔ انھیں گیتوں میں اس قوم کے ملکی تمدن و روزمرہ زندگی کی جیتی جاگتی تصویریں اُبھرتی ہیں، انہیں تصویروں میں سادگی، دل نشینی، حُسن تراشی و فن کے نادر نمونے ملتے ہیں صحیح معنوں میں یہ گیت عوام کی زندگی کے قدیم ترین و جدید ترین نباض ہیں۔ عوامی شاعری میں آنکھیں دیکھتی ہیں اور دل گاتے ہیں۔ لوک گیت انسان کے اساسی جذبات کا اظہار کرتے ہیں، جو آج سے ایک ہزار برس پہلے بھی ایسے ہی تھے جیسے کہ آج ہیں۔ یہ جذبات ایک دائمی کیفیت رکھتے ہیں۔

دوسری زبانوں کی طرح ڈوگری کے لوک گیتوں کا بھی کوئی مصنف نہیں۔ لوک گیت صدیوں کا سینہ روندتے ہوئے ایک نا معلوم زمانے سے سینہ بہ سینہ اور گوش بگوش قوموں اور نسلوں میں منتقل ہوتے چلے آ رہے ہیں اور یہ گاؤں کے دہقانوں، گڈریوں اور میراثیوں کے دماغ کی اُپج ہیں۔ گو ان میں زبان کی چاشنی، محاوروں کا ہیر پھیر، مصنوعی جذبات کا تار پڑھاؤ، الفاظ کا طمطراق اور فلک پیما خیالات مفقود ہیں۔ تاہم فطرت کی سادگی، جذبات کی بے نقاب گہرائی، واقعات میں صداقت اور اندازِ بیان کی دل نشینی بدرجۂ اتم موجود ہے یہ گیت سب سے پہلے کب رائج ہوئے؟ کہاں رائج ہوئے اور کہاں سے کہاں پہنچے؟ اس بارے میں یقینی طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ لوک گیتوں میں بہت سے ایسے ہیں جو اسی شکل میں یا تھوڑی سی تبدیلی کے ساتھ وادیٔ کشمیر میں رائج ہیں۔ گیت ڈگر سماج کا ایک جُز ہیں اور سچ تو یہ ہے کہ موسیقی ان لوگوں کی گھٹی میں ہے اور وہ اس کو اپنے ادبی فن پاروں میں بڑی کاوشوں کے ساتھ سموتے ہیں۔ کیونکہ گیت یا کہانی سے کہیں زیادہ موسیقی انسان کی نبض پر ہاتھ رکھتی ہے اور انسان کی آتما کے تار ہلاتی ہے۔

جو سادگی، مٹھاس، دلکشی اور جذبات کی گہرائی ڈوگری لوک گیتوں میں ہے۔ وہ تمام ہندوستان میں ترنگو کے علاوہ سنگیت کی دیوی نے اور کسی کو نہیں دی۔

جنسی محبت، ماں باپ کی شفقت، بہن بھائی کا پیار ساس بہو کا جھگڑا اور گاؤں کی معصوم زندگی کے مختلف پہلو ہی ان گیتوں کا موضوع ہوتے ہیں۔ اس پس منظر میں انسان کے جذبات، چرند اور پرند، چاند اور سورج، کھیت اور کھلیان، بادل اور بجلی اس طرح سموئے ہوئے ہوتے ہیں کہ انسان ان میں کھو جاتا ہے۔ گاؤں کی کھلی فضا میں جب رات کے وقت نیلگوں آسمان کی پیشانی پر چاند اور تارے چمکتے ہیں تو دہقانی گیت کی نغمہ آرائی سے خود فراموشی کا عالم پیدا ہو جاتا ہے۔ اس وقت ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ساری کائنات گیت میں پیوست ہو گئی ہے اور گانے والا دن بھر کا تھکا ماندہ اپنے دُکھ درد کو

بھول کر تھوڑی دیر کے لئے گیت کی پُر کیف دُنیا میں پناہ لے رہا ہے — اور اپنی تیرتی ہوئی آواز کے علاوہ سب کچھ بھول چکا ہے۔ گیت کی سُریلی تانیں اور گانے والی یا والے کی آواز ہر سُننے والے کے کانوں کے پردوں سے ٹکرا کر جھنجھنا اُٹھتی ہے اور جوں کی چاول کی اعلےٰ قسم باسمتی کی خوشبو کی طرح پھیلتی جاتی ہے — پھیلتی جاتی ہے ——

نر پلد ہر پور ٹھنڈیاں نے چھاواں
بیٹھ بلوچیں دا ٹھانا
ہائے بلوچیں دا ٹھانا
پل پل بیٹ جانا، چندا رتی جانا
رتی جانا لدد
اج رانی رتی جانا
چٹے چول تے دودھ مانجھا
اے بلوچیں دا کھانا
پل پل بیٹ جانا .....
اُنگلاں گوری دیاں
دونگے دیاں چلیاں
وچ چمکے دانی تھیوا
پل پل بیٹ جانا .....
اکھیاں گوری دیاں
بلن شالاں
وچ کجلے دا ڈورا
پل پل بیٹ جانا .....
چٹی چادر روح بچھانیاں،
اے بلوچیں دا سونا
پل پل بیٹ جانا ....."

[نر پلد اور ہر پور (دو گاؤں) میں ٹھنڈی چھاؤں ہے۔ نیچے تلہٹی میں بلوچوں کا ٹھکانہ ہے۔ اے محبوب تم لمحہ بھر کے لئے رُک جاؤ۔ اے چاند تم بھی میرے محبوب کے ساتھ رُک جاؤ .....

سفید چاول اور بھینس کا دودھ — یہی بلوچوں کا کھانا ہے۔ اے محبوب لمحہ بھر کے لئے رُک جاؤ ....

گوری کی انگلیاں دونگی کی چلیوں کی طرح خوبصورت ہیں۔ ان میں انگوٹھی کا نگینہ چمک رہا ہے۔ اے محبوب پل بھر کے لئے رُک جاؤ۔

گوری کی آنکھیں اس طرح چمک رہی ہیں۔ جیسے ان میں مشعلیں روشن ہوں۔ ان آنکھوں میں کاجل کی لکیریں بھی ہیں۔ اے محبوب لمحہ بھر کے لئے رُک جاؤ]

چاندنی راتوں میں اس گیت کی مُدھر آواز سامعین پر ایک وجد کی کیفیت طاری کر دیتی ہے۔ اور ڈوگر کی دھرتی پر سے گزرنے والے ہر جانے انجانے راہی کو پل بھر کے لئے روک دیتی ہے —— وہ اپنی راہ بھول جاتا ہے۔

اور پھر روکنے پر بھی محبوب چلا جاتا ہے تو ہجر میں جلتی ہوئی بھولی بھالی معصوم گوری کے نالہ و فریاد سے پہاڑوں کی چوٹیاں تک پگھل اُٹھتی ہیں —

لگدا تیرا مندا او گدیا لگدا تیرا مندا
ٹکا نیا چھلڑو پچھے چھوڑی گیاں تو
گھا پتہ نہیں کھندا گدیا
خط پٹواری کی لکھی نیوں ونڈا
کرنی آں سو سو چھندا او گدیا
کوڑے ہتھ بھیجاں میں اج سُکھ ساندھڑا
کوئی پکھدد بھی نیوں جندا او گدیا
تیرے بنا چھلڑو گھا نہیں کھندے
مری کی حد لے ڈھٹی ڈھٹی پوندے
مکدا نہیں ٹبرے دا دھندا او گدیا
لگدا تیرا مندا ....."

[تمہارے ہجر میں میں تڑپ رہی ہوں، میں بے چین ہوں گدیا[1] - تو معصوم بکری کا بچہ پیچھے چھوڑ گیا ہے وہ بھی گھاس اور پتے نہیں کھاتا ہے -

پٹواری مجھ کو خط نہیں لکھ کر دیتا - میں اس کی بہت منت سماجت کرتی ہوں گدیا -

آج میں اپنا احوال کس سے کہوں ؟ اپنا پیغام کس کے ہاتھ بھیجوں ؟ کوئی پرندہ بھی تو تمہاری طرف نہیں جاتا۔

تمہاری جدائی کو بھیڑ بکریوں نے بھی بُری طرح محسوس کیا ہے اتنی کمزور ہو گئی ہیں کہ چل تک نہیں سکتیں - گھر گرہستی کا جھمیلا ختم ہی نہیں ہوتا - تمہارا ہجر میرے لئے بہت تکلیف دہ ثابت ہو رہا ہے -

اِدھر اس پردیش میں جس میں سلسلۂ کوہ پیر پانچال سے لے کر شوالک کے فلک بوس پہاڑوں تک کا علاقہ ہے - بھوک، افلاس اور بیکاری کی ایک باڑھ آ گئی ہے اسی لئے سردیوں کے موسم میں ہزاروں ڈوگرے چمبہ، ہماچل پردیش، کانگڑہ اور جموں کے علاقہ جات سے نیچے پنجاب کے میدانوں میں نوکری کی تلاش میں نکل جاتے ہیں - مندرجہ ذیل لوک گیت کانگڑہ کے ایک گاؤں میں میرے سُننے میں آیا - اس میں ماں اور بیوی کے کردار اُبھرتے ہیں - پردیش میں نوکری کرنے کے لئے گئے ہوئے کسی نوجوان کی واپسی کے انتظار میں اس کی ماں اور بیوی بیٹھی ہیں - ماں سوچتی ہے بیٹا پردیس سے واپس آتے وقت بہت سا زر و زیور لائے گا - بیوی سوچتی ہے اس کا خاوند بخیریت گھر پہنچ جائے یہی اس کے لئے بہت ہے -

سیلیاں دھاراں، یوں پھوہاراں
میرا ریشمی پچیرا سجایا او

پچیرے کی دھوتی آں، چھم چھم رونی آں
سجن پردیسگی ٹورا یو"۔

[بھینی بھینی پھواروں سے میرا ریشمی دوپٹہ بھیگ گیا ہے - دوپٹے کو دھو رہی ہوں اور چھوٹ چھوٹ کر رو رہی ہوں - محبوب کو پردیش جو بھیج چکی ہوں]

تب بہو ساس سے کہتی ہے —

سسسو جی دھن تُن دا چگرا
دھن تن کا لجا
پردیسینگی ٹورا یو

[آفریں ہے آپ پر اے ساس جی - آپ نے اپنے لختِ جگر کو پردیس بھیج دیا]

ساس —

نُیں او جی جاندا کالجا
او بھی جندا چگرا
دمں دے لاچے ٹوری آئے"

[اری بہو، میرا کلیجہ تو جل رہا ہے - دل میں آگ لگی ہوئی ہے - دولت کے لالچ میں بیٹے کو پردیس بھیج بیٹھی ہوں]

بہو —

چڑھ کے چبارے دکھن لگی آں
مت کوئی کتے دا آئے
چٹی پوشاکڑی ہتھے دچ چھتری
بابان الواداں دا کوئی آئے"۔

[بہو کہتی ہے مکان کے بالا خانے پر چڑھ کر دیکھ رہی ہوں - شاید کوئی کہیں سے آ رہا ہو - سفید پوشاک میں ملبوس، ہاتھوں میں چھتری تھامے، بازو ہلاتا ہوا کوئی آ رہا ہے]

ساس —

نویں کھولو پٹاریاں

---

[1] گدڑیا - جو پر اس پردیش کی ساٹھ فیصدی آبادی مشتمل ہے -

گنے والیاں' دماں دیاں بوریاں آیاں"

[اے بہو جلدی سے اپنے گھنے والی پٹاریاں کھولو۔ دھن کی بوریاں آ رہی ہیں]

بہو ——

"دماں دیاں بوریاں

مٹی دیاں ڈھیریاں حسداں خردیاں آیاں"

[یہ دھن کی بوریاں میری نظروں میں مٹی کے ڈھیر ہیں شکر ہے' یہ بخیریت گھر پہنچے ہیں]

ایک دوسرے جذبات سے بھیگے ہوئے لوک گیت میں بھی بہو کے کردار کا ایسا ہی بیان ہے ——

"بار بوکن کھڑا سجنا

بوبکھلیا مانو بو"

اندھیری رات میں جب کوئی پردیسی ایک برہن کا دروازہ کھٹکھٹاتا ہے تو وہ اندر سے ہی کہتی ہے۔

[باہر یہ کون پردیسی کھڑا ہے]

"بار بو میں کھڑا بو رانئے

بو میں بکھلا مانو'

آنگنے تیرے چمپہ پھول کھڑیا

لائی جو لینا کالے کیسیں"

پردیسی جواب دیتا ہے۔[باہر میں کھڑا ہوں' او بہو رانی! میں ہوں ایک مسافر! تمہارے آنگن میں چمپا کے پھول کھلے ہوئے ہیں۔انہیں اپنی زلفوں میں لگا لو] اندر سے درد اور شکایت سے بریز آواز سنائی دیتی ہے

جلی بو جاں چمبے پھل پردیسیا

جلی بو جاں کالے کیس

جنہیں کارن اساں چمبا لایا

او سجن پردیسی

[او پردیسی یہ کالی زلفیں جل جائیں اور چمبا کے ان پھولوں میں آگ لگ جائے۔ جس ساجن کو رجھانے کے لئے یہ پودا لگایا تھا۔ وہ تو پردیس چلا گیا]

کے بو جلن چمبے پھل نی گوریئے

کے بو جلن کالے کیس

جنہیں کارن تسیں چمبا لایا

او سجن ات دیسیں"

[کیوں جلیں چمبا کے یہ پھول اور یہ کالی زلفیں۔ جس ساجن کے لئے تو نے چمبا کا پودا لگایا تھا۔ وہ ساجن تو یہاں کھڑا ہے]

زندگی کے ہر ایک پہلو کو ان لوک گیتوں نے چھوا ہے۔ زندگی کی گھما گھمی کے ساتھ ساتھ ان میں تہذیب و تمدن کی جھلکیاں بھی ملتی ہیں۔ اندازِ بیان کی سادگی اور زبان کی روانی ہی ان گیتوں کی خصوصیت ہے۔ ان گیتوں میں کوئی خاص فن نہیں ہے' کوئی معجزہ نہیں ہے۔ لیکن ایک بہت اہم بات یہ ہے کہ نہایت سادہ' اشعوری اور قدرتی موضوع کو لے کر ہی ان گیتوں کی تخلیق کی گئی ہے۔ نیچے دو لوک گیت دئے جا رہے ہیں ان میں محنت کرنے والے عوام کی کٹھن زندگی کی ایک جھلک دیکھنے کو ملتی ہے۔

باجرے دی راکھی کری' ڈنگر ڈرائی کری

چڑیاں ڈوائی کری' کیاں کیاں کٹنا ؟

کرد حالی پانی بھرد' ہتھیں دچ سر ھسو

ڈھکئے دا دکھ ھسس کسی جائی دسنا ؟

بچھوین بچھڑینگی پانی پلیانا روج

ادھی راتی اٹھی کے چکی گی گھسنا

اکے گل سچ تھی سو لاد سے گلائی لڑی

سب نے توں کچاں لوکو' کنڈیاں دا بسنا"

[باجرے کے کھیت کی رکھوالی کرنا' جانوروں کو وہاں سے بھگانا اور پرندوں کو اڑانا —— پھر گھر سے دور جا کر پانی بھرنا رکیونکہ برساتی ندیاں سال بھر نہیں

بہتیں) اور پتھروں میں پیر تڑوانا' پھر آدھی رات کو اُٹھ چکی پیسنا اور روز گائے بھینسوں کو پانی پلانا — کون کون سے دُکھ گنائے جائیں؟ ایک ہی بات سچی ہے بہن وہ ہیں نے کہہ دی ہے — برساتی نالوں کے کناروں پر رہنا ان سب تکلیفوں کی وجہ ہے —

دناں بھر رُکیگی
مندیاں نی بولنا
چندے دی چاندنی چندے کنے
ہتھے دیاں دنتیاں کھٹھ ہوئی جندیاں
کھولنی پوندیاں دندے کنیں
ساڑھا تے کم تھا
لاڑیئے کُتا پنجنا
کنے تھا تیبے' تیبے دا
گھا بھار چکی اے
اُدوں ٹُرٹی گیاں
دسو جے راہ ان مُکنے دا

[کسی کی بُرائی مت کرو — چاند کی چاندنی ہمیشہ چاند کے ساتھ رہتی ہے — (بہنا سوچے سمجھے) ہاتھ سے دی ہوئی گانٹھیں بڑی سخت ہو جاتی ہیں' تب دانتوں سے کھولنی پڑتی ہیں — بہن ہمارا کام تو کاتنا' بونا اور دھنکنا تھا — لیکن اب گھاس اور بوجھ اُٹھا اُٹھا کر میرا جسم ٹوٹ گیا ہے' کوئی تھامنے کا راستہ بتایئے]

اوپر لکھے دونوں گیت جموں کے پتھریلے اور بنجر علاقوں میں ہی میرے سُننے میں آئے — یہ علاقے برساتی دریاؤں (بسنتر اور آج) کے کناروں پر بسے ہوئے ہیں —

مندرجہ ذیل گیت بہو کے بارے میں ساس کی شکایتیں پیش کرتا ہے —

دکھی نے جاگنا آپوں توں
لاڑیئے گی گلاں' گلاندیئے گی
ہور اک جاگنا بیاہ رچانیاں
چھوکی دے ایدیا پراندیاگی
گھرے دے کے گی ہتھ نہیں لاندی —
لائی بوندی ہتھ چاندیاگی
بھجیاں جساں گلاں' بُرا ہوئی گیا سناندیاگی"

[اے میرے لختِ جگر تم اپنی بیوی کو باتیں بناتے ہوئے خود دیکھ لو — اس کی چوٹیاں پھونک دو — میرے لاڈلے' میں تمہارا نیا بیاہ کر دوں گی — یہ تو گھر کے کام کاج کو ہاتھ تک نہیں لگاتی — صرف کنگھی چوٹی کرنے میں ہی مصروف رہتی ہے — اس کی جلی بھنی باتیں سنتے سنتے آج ایک برس ہو گیا ہے]

دیر بھابھی دا چلیا چاکری
کوئی بھابھیاگی سدیو رسوئی اندرا
مندا نہیں بھجیاں' بھابھی موپی
نتھ بو کڈھائی دیاں کوئی جندرا
سرنے کھڑوکی بھابھی دکھن لگی اے
اکھیں دا چلی جندا کوئی نیر چندرا

[بھابھی کا دیور نوکری کے لئے جا رہا ہے کوئی بھابھی کو باورچی خانہ سے بلائے — میری بھابھی دکھی مت ہونا — تمہارے لئے پیچوں والی ناک کی نتھ بنوا دوں گا — بھابھی اُداس ہو کر باہر دیکھنے لگی اور آنکھوں سے کئی آنسو بہہ چلے]

بیاہ شادی کے موقعوں پر گایا جانے والا یہ گیت دیکھئے جس میں دوسرے لوک گیتوں کی طرح سچا مشاہدہ اور شفاف احساس رچا ہوا ہے — عموماً ان گیتوں کو لڑکی کی سہیلیاں گاتی ہیں —

گوری دا چت لگا
چھبے دیاں دھاراں
چھبے دیاں دھاراں' ڈھولک بجدا

جموں دا بجدا نگارا
چھبے دیاں دھاراں
پون پھوہاراں' اوڑھنو سجی جندا سارا
جموں دا راجہ حاصل منگدا
چھبے دا منگدا نگارا

یہ گیت حُسن و عشق اور رنگ و بُو کی سرزمین پر ڈھولک کی تال میں مل کر ایک عجیب سی فضا طاری کر دیتا ہے۔

[گوری کا دل چھبے کی پھوہاروں پر عاشق ہو گیا ہے۔ چھبے کی پھوہاروں میں ڈھولک بج رہا ہے اور جموں کی پھوہاروں میں نقارہ۔ چھبے کی پھوہاروں سے اوڑھنی بھیگ گئی ہے۔ جموں کا راجہ راہگزاری مانگتا ہے اور چھبے کا راجہ جموں کا نگارا لینے کا خواہش مند ہے]

یہ گیت عموماً اس وقت گایا جاتا ہے۔ جبکہ بارات چمبہ یا ہماچل پردیش کے کسی علاقے سے جموں میں آئی ہو۔

ڈوگری میں بہن بھائی کے گیت بھی بہت مشہور ہیں۔ یہ گیت صرف بہنوں کے لئے مخصوص ہیں اور جب اُداس بہنیں اپنے پردیسی بھائیوں کی یاد میں یہ گیت گاتی ہیں تو (احمد ندیم قاسمی کے لفظوں میں) بہن بھائی کا پاکیزہ اور غیر فانی رشتہ کائنات کی سب سے بڑی نعمت معلوم ہونے لگتا ہے۔

چھبے دیئے دھارے بن نیٹھڑی ہویاں
چھبے دیئے دھارے بن نیندڑی ہویاں
گھا بڈی بڈی کری' پولڑے بنا ندیگی
ہتھویں دے چھالڑیں گی' دکھی دکھی گاندیگی
دکھی لے بھرا' میرا حال' دکھی لے بھرا
چھبے دیئے دھارے بن پھڑی ہویاں
لوئی ہی تھاں ڈولیچ دچ پائی پائی دوا کیتی
دودھے ناہیں' پتر پھلیاں' بھابھئی نے سیس دتی
مادمی کی دتے مڑھی اتھرو"

[اے چھبے کی دھارا ذرا نیچی ہو کر بہ۔ گھاس کاٹ کاٹ کر پُولے بنا رہی ہوں اور ہاتھوں کے چھالوں کو دیکھ کر کہہ رہی ہوں — دیکھ لے بھیا' میرا حال دیکھ لے۔

اے چھبے کی دھارا ذرا نیچی ہو کر بہ۔ جس وقت میری شادی ہوئی تھی' تو بھیا ڈولی میں ڈال کر تم نے مجھے روانہ کیا تھا۔ بھابھی نے مجھے "دودھوں نہاتے اور پُوتوں پھلے" کی دُعا دی تھی۔ اور ماں نے' اے سکھی' مجھے آنسو دیئے تھے]

جُوں جُوں اس علاقے کے تعلقات پڑوسی پنجاب سے بڑھتے جا رہے ہیں' پنجابی کی چھاپ ان گیتوں پر بھی لگتی جا رہی ہے۔ مندرجہ ذیل گیتوں کو دیکھئے پنجابی کے اثر نے ان گیتوں کی حُسن کاری کو کئی گنا بڑھا دیا ہے۔

نگلے گوٹے لائی چلیے
دُھوویں بھانیں روتی یاں
پچھے نئی نناں کُتے
کس دا اے دُکھ بنگی ؟
کودے پچھے روتی روتی رہلا!
گے سکھ تگی
دھواں دھار پائی
چُولہے منڈھ بیٹھی دی میں
اپنی اتھرویں دے موتیں دا
ہار پئی پرونیاں
دھرم آکھیں اودھی ایں تو
ماں پیو جدھے کھنے لایا
سن آکھ ملیں

جدھے کہنے تھا تو پیار پایا
کدھا لے شریر ؟
کدھی آتا اپنے پیار میرا
کِتا کِتا رچیر بیٹھی
سوچدی گی رہتی آں"

[چُولہے میں گیلے اُپلے جلا کر دُھواں کر لیا ہے۔ اور اب اسی بہانے سے رو رہی ہوں۔ کیونکہ اگر دُھواں نہ کروں تو نند پُوچھے کہ تجھے کس کا دُکھ ستا رہا ہے کس کے لئے رو رو کر تجھے سُکھ ملتا ہے ؟ دُھواں کر کے چُولہے کے نزدیک بیٹھی آنسوؤں کے ہار پروتی رہتی ہوں — یہ آنسو جو موتیوں جیسے ہیں۔ مذہب کہتا ہے کہ میں اسی کی ہوں جس کے ساتھ میرے ماں باپ نے مجھے باندھ دیا ہے۔ لیکن دل کہتا ہے نہیں، تم اُسی کی ہو جس کے ساتھ تم نے پیار کیا تھا"۔ یہ جسم کس کا ہے ؟ اور کس کی روح کے ساتھ میرا پیار ہے ؟ گھنٹوں بیٹھی یہی سوچتی رہی ہوں]

ایک اور دل کو چھو جانے والا گیت دیکھئے۔ ایک بہن ساس کے ظلم و ستم سے ستائی ہوئی چکّی کو اپنا رفیق بنا کر دل کا بوجھ ہلکا کرتی ہے۔

تیرے دویں پُڑ کھیاں کھنے کنے ریلے دے
سارھے دوے دل مولسی بکھو بکھ جلے دے
پُڑیں دا ملاپ، تدے سر مینھے لانی ایں
منیس دا ویلوگ موسی حسا گی کرانی ایں
انہیں جدوں آنا، می کی چیتے تیرے بُھلی جانے
تانے، پینے بھلی جانے حالو کھال بھلی جاتے
میرے کہے اس گھر پھلاں آلی بہار آئی
کنڈے آنگو بساں والے، دن اسیں بھلی جانے

[تیرے دونوں پاٹ کس طرح ایک دوسرے کے ساتھ ملے ہوئے ہیں اور ہمارے دونوں دل کس طرح ایک دوسرے سے دُور ہیں۔ تیرے دونوں پاٹ ملے ہوئے ہیں، اسی لئے تیرے دل کی گہرائی سے خوشی کا نغمہ پھوٹ رہا ہے۔ لیکن اس نغمے سے میری گزدری پر کیوں چھینٹا مار رہی ہو۔ جس دن میرا محبوب آئے گا اُس دن میں تمہیں بھول جاؤں گی۔ یہ نالے اور ان کے (ساس اور نند کے) طعنے اس دن ختم ہو جائیں گے۔ تب میرے لئے اس گھر میں نو بہار آئے گی]

سُکھ، دُکھ، شادمانی، غمی اور میلوں ٹھیلوں کے موقعوں پر ہی گیت عوام کا ساتھ دیتے ہیں۔ کھیتوں اور چراگاہوں میں یہ گیت ہی ڈوگروں کے بہترین رفیق اور ہمنوا ہیں۔ فصل کاٹتے اور بوتے وقت اور اپنے کھیتوں میں ہل چلاتے ہوئے ڈوگرے یہی گیت گاتے ہیں۔ اپریل کا جُھلستا ہوا سُورج انھیں کمزور و ناتواں نہیں کر سکتا، برف کے تودے اور طوفان کے تھپیڑے ان کے نغموں کو نہیں روک سکتے۔ یہ رنگیلے اور جادو کار گیت ڈوگروں کو ہر چیز سے بے نیاز کر دیتے ہیں۔ ان کا دیش خوب صُورت اور رنگین ہے۔ ان کی شاعری سے کہیں زیادہ رنگین اور خوب صُورت یہ دیس شاعری اور موسیقی کا دیس ہے۔ کتنا حسین اور کتنا دلکش۔

اصل

بے ہوش منش چھا پوش چھاواں

آیتن چھو خرمون زُدتے جان
سوکھ موکھ وأنچ چھم را وان
تھوَرس تھرِ پیٹھ اوس میون اول
دُچھ با خوانن زُولا جان
کالک نارتے صبوک سُور
دُچھ ، دُچھ دپوشِ ٹُور دگیے پریشان
لولہ نار پانس گوندُم میر بون
دلیہ کیا زِ آسم دلیہ راوان
یس نہ آسِ پَنہ نوی من بیدار
بے ہوش منش چھا پوش چھاداں
بلبلیں روپ گلس حسن چھوی پُور
بے زبانِ چھنہ یت زِندہ روزان
مہجورہ حیہ تِ بَن سونتک واد
حیہ تِ گچھ نیندبہ ہتِ وزناداں

مارہ متِ وارہ وتِ لاگ میون پان
مارہ متِ وارہ وتِ لاگ میون پان
اتھ کیت اَن گٹ نبہ ترٹِ زول
مارہ متِ وارہ وتِ لاگ میون پان
شاپچ گٹہ نبہ دراوُک نُور
مارہ متِ وارہ وتِ لاگ میون پان
ام نار، منزلِ سپنم سون
مارہ متِ وارہ وتِ لاگ میون پان
تس کیت چھ چھوی پوہ تے ہار
مارہ متِ وارہ وتِ لاگ میون پان
کیا ہ رَنے زیو چھے نہ سوی چھو وتھور
بے زبان تو یہاں جی سکتے نہیں!
روشِ روشِ باغس کُن قدم تراو
مارہ متِ وارہ لاگ میون پان!

بے ہوش آدمی پھولوں سے لطف اُٹھا سکتا ہے کیا؟

میرا جی جان تیرے بس میں ہے
جانے کیوں (بیٹھے بیٹھے) میرا کلیجہ چل اُٹھتا ہے
اُونچی ٹہنی پر تھا آشیانہ میرا
باغباں نے کیا خوب چراغاں دیکھا
رات کا شفق زار اور صبح کا پالا
دیکھ دیکھ کر تو کلیاں پریشاں ہوگئیں
پریم کی آگ نے مجھے گھیر لیا سر تا پا
جانے کیوں سکھیاں مجھے ڈرا رہی تھیں
جس کا اپنا ہی من بیدار نہ ہو
بے ہوش آدمی پھولوں سے لطف اُٹھا سکتا ہے کیا
بلبل نے گُل سے کہا تیرا حُسن تو ہے بھروسہ
یہ زبان تو یہاں جی سکتے نہیں!
مہجور! تو بھی بادِ بہاری بن جا
خزاں خزاں باغ میں چل

پریتم! میرے جیون کو ٹھکانے لگا
پریتم! میرے جیون کو ٹھکانے لگا
رات کے گھپ اندھیرے میں بجلی نے اسے راکھ کر دیا
پریتم! میرے جیون کو ٹھکانے لگا
شام کا اندھیرا اور پو پھٹ کا نور
پریتم! میرے جیون کو ٹھکانے لگا
میرا پیتل اس آگ سے سونا بن گیا
پریتم! میرے جیون کو ٹھکانے لگا
اُس کے لئے ہار اور پوہ (کے ہیولے) ایک ہیں
پریتم! میرے جیون کو ٹھکانے لگا
کیسے کہوں کہ تجھے زبان نہیں، یہی تیرا تقدیر ہے!
پریتم! میرے جیون کو ٹھکانے لگا
خزاں کے ماتوں کو جگائے جا!
پریتم! میرے جیون کو ٹھکانے لگا

شفیق الحسن ہاشمی

لاطینی امریکہ

آج کل ہم لوگ ممالک متحدہ امریکہ کا نام روزانہ اخباروں میں پڑھتے اور ریڈیو پر سنتے ہیں لیکن بہت کم لوگ اس بات پر دھیان دیتے ہیں کہ شمالی اور جنوبی امریکہ کے براعظموں میں اس کے علاوہ بھی اور دوسرے بڑے بڑے ممالک ہیں جو اگرچہ اتنے طاقتور اور ترقی یافتہ نہیں ہیں لیکن ان کا رقبہ اور ان کے وسائل ممالک متحدہ سے کچھ کم نہیں ہیں - ان تمام ملکوں کے جو ممالک متحدہ کے جنوب میں ہیں لاطینی امریکہ کہا جاتا ہے - اس طرح وسطی امریکہ کی چھ چھوٹی جنوبی امریکہ کی دس خود مختار مملکتیں میکسکو، کیوبا، ہیٹی اور ڈومینگن ریپبلک اس زمرے میں آتی ہیں - ان تمام ملکوں میں اسپینی یا پرتگالی یا فرانسیسی زبان بولی جاتی ہے -

لاطینی امریکہ کی اصطلاح زیادہ پرانی نہیں ہے - اس سے پہلے ہسپانوی امریکہ کا لفظ استعمال کیا جاتا تھا لیکن یہ لفظ صحیح نہیں تھا کیونکہ جنوبی امریکہ کے تقریباً نصف حصہ (برازیل) کی زبان اور تہذیب پرتگالی ہے - اس کے علاوہ ہیٹی کے رہنے والے فرانسیسی زبان بولتے ہیں اور ان کی تہذیب بھی فرانسیسی ہے - موجودہ اصطلاح پر بھی بعض اعتراض کئے جاتے ہیں مثلاً ایک اعتراض تو یہ ہے کہ اس خطۂ ارضی پر ایک بہت بڑی تعداد (بلکہ بعض ملکوں میں تو اکثریت) ہندوستانیوں کی ہے جن کا خون اور زبان بالکل علیحدہ ہے لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ لاطینی امریکہ کی اصطلاح چل نکلی ہے -

لاطینی امریکہ میں نئی دنیا کا وہ تمام علاقہ شامل ہے جو ریو گرینڈی کے جنوب میں واقع ہے - اس کا جملہ رقبہ ممالک متحدہ امریکہ کے رقبے کا تین گنا ہے اور اس کے اندر نئی دنیا کا نصف سے زیادہ علاقہ واقع ہے - اسی حصے میں نئی دنیا کے سب سے اونچے پہاڑ، سب سے بڑا دریا اور سب سے وسیع میدان ہیں - اس لاطینی امریکہ کا سب سے بڑا ملک برازیل ہے - جس کا رقبہ ۳۲۰۰۰۰۰ مربع میل ہے اور یہیں دنیا کا سب سے بڑا دریا امیزان بہتا ہے - سوائے برازیل اور ہیٹی کے ہر جگہ ہسپانوی زبان بولی جاتی ہے -

یورپینوں کے آنے سے پہلے اس ساری سرزمین پر ایشیائی نسل کے لوگ رہتے تھے - اگرچہ یہ تعداد میں بہت زیادہ تھے لیکن ہر جگہ انہیں ہسپانوی اور پرتگالی فاتحوں کے مقابلے میں زک اٹھانی پڑی - جہاں ان کی تعداد کم تھی جیسے ارجنٹائن اور یوراگوے میں وہاں ان کو باہر نکال دیا گیا - ہیٹی کیوبا اور ڈومینگن ریپبلک میں ان کی گنتی زیادہ تھی یہاں ان کو جنگ کے ذریعے سے اور وبائی امراض پھیلا کر باہر نکالا گیا - باقی علاقوں میں ہندوستانیوں کی کافی تعداد اب بھی موجود ہے ان تمام علاقوں میں ہسپانوی، پرتگالی اور فرانسیسی قومیں فاتح کی حیثیت سے داخل ہوئیں - انہوں نے ہر جگہ اپنے مذہب زبان اور تہذیب کو پھیلایا اور سیاسی اور مذہبی ادارے جو وہ اپنے ساتھ یورپ سے لائے تھے یہاں جڑ پکڑنے لگے -

اسپین اور پرتگال سے آنے والوں نے شروع شروع میں یہاں پر بڑی بڑی زمینیں حاصل کر لیں اور ان کے مالک بن

بیٹھے - اب بھی یہاں بڑے بڑے زمیندار موجود ہیں جو اپنی زمینوں سے بہت دُور یا تو جنوبی امریکہ کے بڑے بڑے شہروں میں یا پیرس میں اپنی زندگی عیش و عشرت سے گزارتے ہیں اور دوسری طرف بیچارے کاشت کار نہایت مفلسی اور غربت کی زندگی گزارتے ہیں - وہ قول پر زمینیں لیتے ہیں' کاشت کرتے ہیں اور پیداوار کا ایک بڑا حصّہ زمیندار اور حکومت کو دے دیتے ہیں چنانچہ ارجنٹائن جیسے ترقی یافتہ ملک میں بھی ۸۵ فیصد کسانوں کے پاس اپنی زمینیں نہیں ہیں اور یہاں کے زمیندار پیداوار کے ایک تہائی سے لے کر نصف حصّے تک ان کاشتکاروں سے ہتھیا لیتے ہیں -

لاطینی امریکہ میں غریبی اور افلاس بہت زیادہ ہے - خاص طور پر ان ملکوں میں جہاں اکثریت ہندوستانیوں اور نیگروؤں کی ہے معاشی صورت حال بہت گھناؤنی ہے - مشہور لاطینی امریکی مصنف لوئی کوین ٹینیلا کے خیال کے مطابق لاطینی امریکہ میں ابھی تک جاگیرداری نظام کا دَور دَورہ ہے - یہاں جہالت' افلاس اور تشدّد کا راج ہے اور چند بڑے بڑے جاگیرداروں اور لاکھوں غریب اور مفلس انسانوں میں جو زمین اور آسمان کا فرق ہے وہ بڑا تکلیف دہ ہے - کوین ٹیلا کے بیان کے آخری الفاظ چونکا دینے والے ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ کہیں اور کا نہیں بلکہ ایشیا کا نقشہ کھینچ رہا ہے - وہ لکھتا ہے کہ ۱۲۶۰۰۰۰۰ کی آبادی میں سے ۸۵۰۰۰۰۰۰ سے زیادہ تو ایسے ہیں جو بالکل بھوکے مرتے ہیں اور ان کے پاس نہ کوئی مکان ہے' نہ بستر ہیں اور نہ جوتے - میکسیکو میں جو مردم شماری ہوئی ہے اس میں بستر بھی گنے جاتے ہیں چنانچہ ہاں کی دو کروڑ کی آبادی میں پچاس لاکھ سے زیادہ بستر نہیں ہیں - میکسیکو کے ۳۸۸۴۶۰۰ مکانوں میں سے صرف ۲۶۵۰ گھروں میں پانی کا انتظام ہے -

جہالت بھی افسوس ناک حد تک بڑھی ہوئی ہے - ہونڈ راس' بولیویا' پیراگوے' گوئٹے مالا' ہیٹی اور ایکویڈور میں جاہل لوگوں کا اوسط ۷۳ سے لے کر ۸۳ فی صد تک ہے پیرو' نکارا گوا' برازیل اور وینزویلا میں ۷۰ فی صد ڈومینیکن ریپبلک' پناما اور کیوبا میں ۶۰ فی صد' ایل سالویڈور میں ۵۵ فی صد' کولمبیا میں ۵۰ فی صد' میکسیکو میں ۴۵ فی صد کوسٹاریکا میں ۳۲ فی صد' چلی میں ۲۴ فی صد' یوراگوے میں ۲۰ فی صد اور ارجنٹائن میں ۱۲ فی صد - (اس کے برخلاف ممالک متحدہ امریکہ اور کینیڈا میں ان پڑھ لوگ صرف ۴٫۳ فی صد ہیں)

ان باتوں سے پتہ چلتا ہے کہ لاطینی امریکہ ہر لحاظ سے بہت پست حالت میں ہے - خود بہت سے لاطینی امریکی یہ تسلیم کرتے ہیں کہ یورپینوں کے قبضے سے پہلے وہاں کے دیسی باشندے اتنے مفلس نہیں تھے جتنے کہ اب ہیں -

اگر لاطینی امریکہ کی موجودہ زمانے کی سیاسی تاریخ کو ہم پڑھنا چاہیں تو ہمیں اُنیسویں صدی سے شروع کرنا ہوگا اس صدی کے ابتدائی زمانے میں ہسپانوی بولنے والے امریکیوں نے اسپین سے لڑ کر آزادی حاصل کی - اس بغاوت کے بہت سے اسباب تھے - سب سے بڑی وجہ تو یہ خواہش تھی کہ بیرونی دُنیا سے آزادانہ طور پر تجارت کی جائے - اس کے علاوہ یہ جذبہ بھی تھا کہ اگر وہ آزاد ہو جائیں گے تو ان کی معاشی حالت بہتر ہو جائے گی - ان کے ذہنوں پر امریکہ اور فرانس کے انقلابوں کا اثر بہت زیادہ تھا - خاص طور پر فرانس کے انقلاب کا ان پر بہت اثر تھا کیونکہ وہ امریکی انقلاب کے مقابلے میں تازہ تھا - اس کے علاوہ فرانسیسی خیالات ہمیشہ لاطینی امریکہ میں غالب رہے -

اسپین سے آزادی حاصل کرنے کے بعد یہاں ایک زمانے تک مزاج اور بدنظمی کا دور دورہ رہا - عہدوں کو حاصل کرنے کے لئے لوگوں میں مستقل کشمکش رہتی تھی

سرحدوں کا کوئی تعین نہیں تھا اور بڑی مملکتیں چھوٹی چھوٹی مملکتوں میں تقسیم ہوتی جا رہی تھیں۔ صوبجات متحدہ جنوبی امریکہ بارہ سال کے بعد پانچ علیحدہ مملکتوں میں تقسیم ہو گیا۔ گرینٹ کولمبیا تقریباً چار سال کے بعد کولمبیا، وینی زولا اور ایکویڈور میں بٹ گیا۔ پوراگوے جو برازیل کا ایک حصہ تھا اس سے الگ ہو گیا۔

اس زمانے میں بہت سے دستور بنے اور ٹوٹے۔ آج کل جو دستور رائج ہیں ان میں سب سے پرانا ارجنٹائن کا ہے جو ۱۸۵۳ء میں بنا تھا لیکن اس میں بہت سی ترمیمیں ہو چکی ہیں ۱۹۲۵ء سے لے کر اب تک لاطینی امریکہ میں جتنے دستور بنے غالباً دنیا کے کسی اور حصے میں نہیں بنے ہوں گے۔ ان دستوروں میں جمہوریت، انصاف، انسانی حقوق اور باقاعدہ انتخابات کا جتنا زیادہ ذکر ہوتا ہے اتنا ہی ان پر عمل کم ہوتا ہے۔

لاطینی امریکہ کے تقریباً ہر ملک کی یہ خصوصیت ہے کہ وہاں شخصی حکومت رائج ہے۔ بعض وقت تو یہ دستوری حکومت کی آڑ میں کام کرتی ہے اور اکثر تو کھلی ہوئی ڈکٹیٹر شپ ہوتی ہے۔ یہاں کے تمام ملکوں میں ممالک متحدہ امریکہ کے دستور کی نقل اڑانے کی کوشش کی گئی ہے چنانچہ ہر جگہ لیجسلیچر ایگزیکٹو اور جوڈیشری کو ایک دوسرے سے بالکل الگ رکھا گیا ہے۔ ان کا آپس میں کوئی تعلق نہیں ہے۔ صدر کا انتخاب یا تو براہِ راست عوام کرتے ہیں یا ممالک متحدہ امریکہ کی طرح عوام کی ایک منتخب جماعت کرتی ہے لیکن ممالک متحدہ کی یہ نقل یہاں کسی جگہ بھی کامیاب نہیں رہی ہے اور صدر بالکل آزاد اور نحو مختار ہو جاتا ہے اور آخر میں چل کر ڈکٹیٹر بن جاتا ہے جسے کوئی انقلاب ہی اپنی جگہ سے ہٹا سکتا ہے۔ چند مستثنیات کو چھوڑ کر لاطینی امریکہ کے ہر ملک میں ڈکٹیٹر شپ قائم ہے اور اس کی کوئی توقع نہیں ہے کہ مستقبل قریب میں اس کا خاتمہ ہو جائے گا۔

چونکہ یہاں ہر جگہ شخصی حکومت ہے اس لئے ایک صحت مند اور آزاد رائے عامہ کا فقدان ہے۔ صدر بہت زیادہ اختیارات حاصل کر لیتا ہے اور مخالفت کرنے والوں کا ہرگز روادار نہیں ہوتا۔ برازیل اور ارجنٹائن میں پریس پر کڑی پابندی ہے اس لئے باہر والوں کے لئے تو وہاں کے لوگوں کے خیالات کا صحیح اندازہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ چونکہ جہالت بہت زیادہ ہے اس لئے عام لوگوں میں سیاسی شعور کا کال ہے البتہ شہر کے رہنے والے تعلیم یافتہ لوگ ریڈیو اور سنیما کے ذریعے مختلف قسم کے حالات اور واقعات سے واقف ہوتے رہتے ہیں لیکن ریڈیو اور سنیما بھی سخت سنسر سے آزاد نہیں ہیں۔

یونیورسٹیوں کے طالب علم زیادہ تر انتہا پسند اور نیشلسٹ ہیں اور ساتھ ہی ساتھ بہت جذباتی بھی۔ سیاست میں ان کو جتنی دلچسپی رہتی ہے اتنی دنیا کے شاید کسی اور ملک کے طالب علموں کو نہیں ہوتی۔ یہ زیادہ تر حکومتِ وقت کے مخالف رہتے ہیں اور تقریباً ہر انقلاب میں یونیورسٹی کے طالب علم بڑا اہم حصہ لیتے ہیں اسی لئے جب کسی انقلاب کا اندیشہ ہوتا ہے تو شراب خانے اور یونیورسٹیاں بند کر دی جاتی ہیں۔

لاطینی امریکہ میں کمیونزم سب سے پہلے پہلی سنسناری جنگ کے بعد داخل ہوا لیکن یہاں کے کمیونزم اور دوسری انتہا پسند تحریکوں کو ایک دوسرے سے الگ کرنا بہت مشکل ہے کیونکہ کمیونزم کے علاوہ بھی ایسی تحریکیں یہاں موجود ہیں جو جاگیرداری، غربت اور بیرونی قوموں کی لوٹ کھسوٹ کی مخالفت کرتی رہتی ہیں۔ جون ۱۹۳۲ء میں چلی میں کرنل مارما ڈیوک گرو کے تحت ایک سوشلسٹ حکومت بنی جو چند روز میں ختم ہو گئی۔ میکسیکو کی بعض ریاستوں میں مختلف وقتوں میں کمیونسٹوں نے اپنی حکومتیں قائم کیں۔ ارجنٹائن میں بھی ۱۹۲۰ء میں جب کمیونسٹ طاقتور ہو گئے تھے تو وہاں انہوں نے اس قسم کے کچھ تجربے کئے۔ کیوبا میں ۳۳-۱۹۳۲ء میں جب گراؤسان

مارٹن صدر تھا تو وہاں کمیونسٹوں کا کافی اثر ہو گیا تھا۔ میکسیکو کیوبا، چلی، پورا گوے، ارجنٹائن، پیرو، ایکویڈور اور کوسٹاریکا میں کمیونسٹ پارٹیاں چناؤ میں حصہ لیتی ہیں۔ کومنٹرن نے یہاں بھی کافی کوششیں کی ہیں چنانچہ ۱۹۲۳ء کے بعد تیسرے انٹرنیشنل کی شاخیں یہاں کے مختلف شہروں میں قائم کی گئیں اور صدر مقام مانٹی وڈیو (پورا گوے) کو بنایا گیا لیکن پہلے تو یہ کہ یہاں کے ڈکٹیٹر کمیونزم کے راستے میں بڑی رکاوٹ ہیں اور دوسرے یہ کہ یہاں کے تباہ حال عوام میں چونکہ کوئی اتحاد نہیں ہے اس لئے بھی کمیونزم کا پھیلنا یہاں بڑا دشوار ہے

لاطینی امریکہ کی مملکتوں میں آپس میں سخت جھگڑے رہے ہیں اور ہیں۔ غریب مملکتیں امیر مملکتوں سے اور چھوٹی مملکتیں بڑی مملکتوں سے جلتی اور خوف کھاتی ہیں اور ان میں اتحاد کا مادّہ بھی نہیں ہے۔ چھوٹی سے چھوٹی مملکت بھی بالکل آزاد اور خود مختار رہنا چاہتی ہے مثلاً ہیٹی کا چھوٹا سا جزیرہ دو حصّوں میں بٹا ہوا ہے اور یہ دو حصّے ایک ملک بننے کے لئے بالکل راضی نہیں ہیں۔ اسی طرح وسطی امریکہ کی چھ مملکتیں اکثر ایک دوسرے سے لڑتی جھگڑتی رہتی ہیں۔

برازیل کے سوائے باقی تمام لاطینی امریکی ممالک شروع ہی سے ممالک متحدہ امریکہ سے جلتے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ اس سے ڈرتے بھی ہیں۔ ان کا ڈرنا غلط نہیں ہے اس لئے کہ ممالک متحدہ نے تین مرتبہ میکسیکو پر حملہ کیا۔ کئی دفعہ نکارا گوا، ہیٹی اور ڈومینیکن ریپبلک پر قبضہ کیا، پناما کو کولمبیا سے الگ کر دیا اور پورٹو ریکو کو اسپین سے چھین لیا ان واقعات کو سامنے رکھتے ہوئے اگر لاطینی امریکہ والے ممالک متحدہ سے خائف نہ ہوں تو پھر کیا کریں۔

پان امریکن تحریک جس کا مقصد شمالی اور جنوبی امریکہ کے تمام ملکوں میں اتحاد قائم کرنا ہے ظاہر ہے ان حالات میں بہت زیادہ کامیاب نہیں ہو سکتی۔ پھر بھی بہت زمانے سے اس کی کوشش جاری ہے کہ نئی دنیا کے تمام ملک ایک دوسرے سے بہت قریب ہو جائیں اور ان میں کسی نہ کسی قسم کا اتحاد قائم ہو جائے چنانچہ اس مقصد کے لئے سب سے پہلی کانفرنس ۱۸۳۶ء میں پناما میں ہوئی۔ یہ کانفرنس کولمبیا کے اس زمانے کے صدر سائمن بولیوار نے طلب کی تھی لیکن اس میں بہت کم ملک شریک ہوئے اور ممالک متحدہ کے نمائندے تو اس وقت آئے جبکہ کانفرنس ختم ہو چکی تھی۔ سب سے پہلی کانفرنس جس میں تمام امریکی ملکوں کے نمائندے شریک ہوئے ۱۸۹۰ء میں واشنگٹن میں ہوئی۔ اس کے بعد پان امریکن یونین قائم ہوئی جس کا سب سے پہلا اجلاس ۱۹۰۱ء میں ہوا۔ اس کے بعد سے اب تک اس کی بارہ کانفرنسیں مختلف مقامات پر ہو چکی ہیں۔

۱۸۲۳ء میں ممالک متحدہ کے اس وقت کے صدر منرو نے یورپی طاقتوں کو خبردار کیا تھا کہ وہ اب نئی دنیا کی طرف حریص آنکھوں سے دیکھنا چھوڑ دیں۔ لاطینی امریکہ والے اس "نظریۂ منرو" سے بڑے خوش ہوئے تھے لیکن ممالک متحدہ کی مختلف حرکتوں کی وجہ سے جن کا اس سے پہلے ذکر آ چکا ہے لاطینی امریکی یہ سمجھنے لگے کہ یورپ کے بجائے ممالک متحدہ ان کے اوپر قبضہ جمانا چاہتا ہے مگر روز ویلٹ کی "اچھے پڑوسی" والی پالیسی نے ان شبہوں کو غلط ثابت کر دیا۔

جب ممالک متحدہ دوسری سنسناری جنگ میں کود پڑا تو لاطینی امریکی ملکوں نے محوریوں سے تعلقات توڑنے شروع کر دئے لیکن ارجنٹائن ایسا کرنے میں بہت پس و پیش کر رہا تھا جب اس نے دیکھا کہ جرمنی کی شکست یقینی ہے تو اس نے محوریوں سے اپنے ناتے توڑنے اور ۱۹۴۵ء کی سان فرانسسکو کی اقوام متحدہ کی کانفرنس کے بعد تمام لاطینی امریکی ملکوں نے محوریوں کے خلاف جنگ کا اعلان کر دیا لیکن ان میں برازیل

ہی وہ اکیلا ملک تھا جس نے ۱۹۴۳ء میں اپنی کچھ فوجیں لڑنے کے لئے یورپ بھیجیں۔

جنگ کے بعد امریکی اتحاد میں رخنے پڑنے کا اندیشہ بڑھ گیا۔ کچھ لاطینی امریکی ملک ممالک متحدہ کے خلاف تھے اور چاہتے تھے کہ لاطینی امریکہ کا ایک اتحاد قائم کیا جائے جس میں ممالک متحدہ کو کوئی دخل نہ ہو۔ اس کے لئے دو تجویزیں پیش ہوئیں ایک ارجنٹائن کی طرف سے اور دوسری پیرو کی جانب سے لیکن یہ دونوں تجویزیں ناکام ہو گئیں۔

۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو برازیل کے پایۂ تخت ریو ڈی جنیرو سے قریب ایک مقام پر تمام امریکی ملکوں کی ایک کانفرنس ہوئی اور ایک معاہدہ کیا گیا جس پر تمام نمائندوں نے دستخط کئے۔ دستخط کرنے والوں نے اعلان کیا ہے کہ وہ اپنے جھگڑوں کو ہرگز جنگ کے ذریعے سے طے نہیں کریں گے اور کسی جھگڑے والے مسئلے کو ادارہ اقوام متحدہ میں پیش کرنے سے پہلے اسے خود ہی طے کرنے کی کوشش کریں گے اس کے علاوہ یہ بھی طے کیا گیا کہ اگر معاہدہ کرنے والوں میں سے کسی ایک پر کسی بیرونی طاقت نے حملہ کیا تو یہ حملہ سب کے اوپر سمجھا جائے گا اور جس ملک پر حملہ ہوگا اس کی مدد اس معاہدے میں شریک ہر ملک کرے گا۔ اگر آپس میں ہی کسی ملک نے دوسرے پر حملہ کیا تب بھی یہی طریقہ اختیار کیا جائے گا۔

پان امریکن یونین اپنے مقصد میں اس حد تک تو ضرور کامیاب ہو گئی ہے کہ تمام امریکی قوموں میں اتحاد کا رشتہ مضبوط ہوتا جا رہا ہے اور پہلی مرتبہ اس کا ڈائرکٹر جنرل ایک لاطینی امریکی ڈاکٹر البرٹو لیراس ہوا ہے یہ کولمبیا کا باشندہ ہے۔ یہ ۱۲ مارچ ۱۹۴۷ء کو منتخب ہوا اور ۳۱ دسمبر ۱۹۵۴ء تک اپنے عہدے پر رہے گا۔

آج کل کا خطوط نمبر

خطوط نمبر کا ایک مختصر سا اعلان آج کل کے گزشتہ شمارے میں شائع ہو چکا ہے اب یہ فیصلہ کیا گیا ہے کہ مارچ ۱۹۵۴ء کے شمارے کو خطوط نمبر کے طور پر پیش کیا جائے۔ اس شمارے میں پرانے مخطوطات کے نمونے اور ان میں سے بعض کے عکس شائع کئے جائیں گے۔ اکثر نادر خطوط پر اردو کے مشہور نقادوں اور ادیبوں سے مضامین لکھوائے جا رہے ہیں اور یہ کوشش کی جا رہی ہے کہ خطوط نویسی کے اکثر ایسے پہلو آج کل کے ناظرین کے سامنے رکھے جائیں گے۔ جن سے اردو دنیا ابھی تک ناآشنا رہی ہے۔

اس شمارے کی قیمت عام شماروں کی طرح آٹھ آنے ہی مقرر کی گئی ہے۔ ایجنٹ حضرات حسب دستور مندرجہ ذیل پتے پر آرڈر بھیجیں۔

بزنس منیجر پبلیکیشنز ڈویژن اولڈ سیکرٹریٹ دہلی

کمال احمد صدیقی

بسترِ مرگ کا رومان

سوچتا ہوں یہ بہاروں کی حسیں قوسِ قزح
کیا خبر ہے ترے جذبات کا آئینہ ہو

جب بھی پڑتی ہیں کبھی تیری نگاہیں مجھ پہ
تیرے ہونٹوں پہ تبسم کی جھلک ہوتی ہے

سوچتا ہوں یہ ترا تختۂ رنگیں نہ کہیں
تیرے بہکے ہوئے لمحات کا آئینہ ہو

میں نے محسوس کیا ہے کہ تری باتوں میں
ایک نوخیز ترنّم کی جھلک ہوتی ہے

چشم و لب، عارض و رخسار کی شہ ملنے پر
اپنے ماحول پہ چھا جانے کی جرأت کی ہے

دستِ خود دار کو بننا پڑے جب دست طلب
کس اذیت میں پھر انساں کی بسر ہوتی ہے

کاکل و گیسو کا پہلے بھی رہا ہوں میں اسیر
میں نے پہلے بھی کئی بار محبت کی ہے

اجنبی شہر کی تنہائی میں تو کیا جانے
برق کے بیمار کی کس طرح سحر ہوتی ہے

شوخی و غمزہ و انداز و ادا، عشوہ و ناز
مدّتوں ان کا گرفتار رہا ہوں میں بھی

میرے بکھرے کی یہ شاداب دل آویز کشش
تو نے سوچا ہے کبھی یہ بھی سنبھالا ہی نہ ہو

حُسن جس رنگ میں جس روپ میں جس جال میں ہو
اس کا گرویدہ، پرستار رہا ہوں میں بھی

جس کو دیکھے بیٹھی ہے تو اپنا دھڑکتا ہوا دل
زندگی سے وہ کہیں روٹھنے والا ہی نہ ہو

بہ ایں قربت میں شاہد بھی نہیں کہہ سکتا
اور تو اور - تو نام نہیں لے سکتا

یہ مرے سوکھے ہوئے ہونٹ، یہ تیرے نزدیک
بادۂ کوثر و تسنیم کا سرچشمہ ہوں

مجھ پہ مازندہ مزاجی کے ہیں لاکھوں الزام
تیرے عنوان کا الزام نہیں لے سکتا

تو مجھے شاعر و فن کار سمجھتی ہے، مگر
آج میں دق کے جراثیم کا سرچشمہ ہوں

بے خیالی میں بظاہر جو تو کہہ دیتی ہے
سوچ بھی ہوئی اس بات سے جی ڈرتا ہے

صرف حسرت سے اسے دیکھ کے رہ جاتا ہوں
کس تمنّا سے بڑھا ہے مری جانب تریاک

لغزشِ لطف و کرم بھی میں رہا ہوں اکثر
تیری بے وجہ عنایات سے جی ڈرتا ہے

موت اور زیست کی اس کشمکشِ پیہم سے
دے نہیں سکتی تجھے تیری محبت بھی نجات

مجھ کو یہ رشک ہے کہ تو بھی طرح جانتی ہے
بسترِ مرگ بھی ہو سکتا ہے میرا بستر

یوں لگاتی ہے اسے ہونٹوں سے، یہ خالی ہے!

میرا ماضی بھی تہی ہے، مرا ساغر بھی تہی
اور اس پر بھی یہ بارانِ کرم ہے مجھ پر

ظرفِ ہستی ہوں، پھٹا پڑتا ہوا، اور کا ہوا ظرف!!

مجھ پہ مرکوز ہے کیوں تیری نگاہِ خود بیں
آئینہ تو نہیں میں تیری خود آرائی کا!

میں بھی تیزی سے اسی طرح گھلا جاتا ہوں

سوچتا ہوں کہ ترے سلسلۂ جنبانی بھی
مشغلہ ہی نہ ہو تیرے لئے تنہائی کا!

دیکھ وہ دور پہاڑوں پہ پگھلتی ہوئی برف!!

نمک حرام

اُس دن پاؤں پھسل جانے سے جو وحید گرا تو جمیلہ کا جانا رُک گیا۔ جمیلہ بھائی کے یہاں چھٹیاں منانے جا رہی تھی وحید ڈھلکے جانے کی سوچ رہا تھا اور اس وقت جانے کس بِنا پہ کہہ رہا تھا۔

"ہاں — اگر جُمّن نے پچ پچ ایسا ہی کیا تو تمہیں سوچنا ہوگا جمیلہ!"

"جمیلہ چونک کر بولی — جُمّن"

وحید گھبرا کر آگے بڑھا کہ دروازے پر دستک پڑنے کے ساتھ ہی ایک بلند آواز آئی "برخوردار!"

بدحواسی میں اُٹھایا ہُوا پاؤں جو سیمنٹ پر پھسلا تو ایک ہی جھٹکے میں چت وحید بالٹی پر لوٹتا پورے وزن سے فرش پر آ رہا۔

جمیلہ جھٹ ادھر بڑھی۔ سکتے کی سی حالت میں کھڑے کھڑے چیلائی

"زہرہ ..... عائشہ .... اس کے حواس باختہ ہوئے جا رہے تھے۔

زہرہ عرف عائشہ کا اشارہ کئے بنا وہ وحید پر جھکی۔ گہری آہ بھر کر دیکھا، بالٹی کی کھونٹی وحید کی بغل میں گھسا زخم کر چکی تھی اور تولیے میں لپٹا ہُوا وحید کا ٹھاٹھیں تڑپ تڑپ کر بل کھا رہا تھا۔ خون کا ایک قطرہ زخم سے ٹپک کر پانی میں جا گرا۔ جمیلہ نے دیکھا خون کا ہر قطرہ ایک نامعلوم آواز میں کہہ رہا تھا۔

"نمک حرام"

قطرہ بھر خون جسم کی مہر بن کر رہ گیا

"آہ" رگ رگ میں اس گھر کا خون پانی بن کر آج وحید کو اکیلا چھوڑ کر بھاگ جانا چاہتی تھی۔ لے اب بھگت

.....

ڈبڈبائی آنکھوں سے اُس نے وحید کو گھٹنوں پر ڈالا تب تک زہرہ یعنی عائشہ آ گئی تھی۔

ایک ایک کر کے گھر کے چھوٹے بڑے نوکروں پر فتح حاصل کر کے ان کو نکال کر عائشہ پُرانی نوکرانی بن بیٹھی تھی۔

وحید نشیئنج کو کہتی ہے "مسیلا"۔ "معصوم"!

پلپلے مُنہ سے کہتی ہے "باندی خدمت سے نہ ٹلے گی غریب پرور چاہے جھاڑو مار کر نکالئے۔ میں نے نمک کھایا ہے"

بڑھیا خوانٹ ہے بڑھاپے میں نوکری چھوڑنا چاہتی نہیں "نمک" کو آڑ بنا رکھا ہے۔ یہاں کون جھاڑو یا ڈنڈے سے پیٹے گا، کون بوٹی کاٹے گا۔ ہاں لاچار ہو کر چاہے بھاگ جائے۔

نام "عائشہ" کے بارے میں یہ ہے کہ حج پر جا کر وہ یہ نام پسند کر لائی ہے تب سے زہرہ کا نام پسند نہیں۔ جمیلہ عائشہ سے بڑی ہے چونکہ خود عائشہ نے وحید کا حامی تھام رکھا ہے۔ ساتھ جمیلہ کو بھی باندھ رکھا ہے اور گھڑی بھر چھٹی گھومنے گھمانے کی نہیں دیتی۔

جمیلہ ملیلیں دیتی ہے کہ اُس کی آنکھ اوجھل ہوتے ہی وحید سنبھل جائے گا۔ وہ آپ و ہوا بدلنے کے لئے

جائے گی وغیرہ۔

پر بڑھیا مانے والی نہیں منواکر چھوڑنے والی ہے۔ بکہ رہی ہے۔ "تقدیر پر بس نہیں بچی اور تقدیر کا پانسہ یکایک پلٹ سکتا ہے۔ ان دنوں کے پلٹتے ہی وحید کے دن پلٹ آئیں گے۔"

پر جمیلہ کیسے مانے "کیا وحید کے اطوار بھی بدل کر اور ہو جائیں گے۔"

بڑھیا سانس کھینچ کر کہتی۔ "اور نہیں تو کیا۔ سب ممکن ہے۔ تیرا بھولا دُلارا..... وہ کیا اس دن کو جانتا تھا۔ اور دیکھو نہ۔ نشہ پلا کے گرانا تو سب کو آتا ہے" پر بیٹی کہا ہے"۔ "مزا تو جب ہے کہ گرتوں کو تھام لے ساقی۔"

بڑے فخر سے یہ شعر پڑھ کر سُناتی ہے

وحید کے آنکھ لگتے ہی عائشہ نے کہا۔ "بسم اللہ، خدا نے ہاتھ دے کے بچا لیا"۔ پھر ٹھہر کر۔ "آنکھ لگی ہے، آرام کرنے دو۔"

جمیلہ کو بڑھیا کا سہارا قیمتی لگا۔ اپنا تھکا ماندہ سر عائشہ کی گود میں رکھ کر کہنے لگی

"اماں"

پہلی بار اماں سننے والی عائشہ بولی:۔

"یہ کیا بیگم؟"

جمیلہ بولی۔ "اور ایک اور شعر جو تو پڑھا کرتی ہے، خودی کو کر بلند اتنا....."

عائشہ ہنسی

پدیلے مُنہ کی ہنسی آج جمیلہ کے من بھا گئی۔ بولی۔ "اور اماں میرے اس فعل کا جسرم۔"

"فعل کیسا؟"

"میں ہی تو اندر اندر اندر جانے کی سازش کر رہی تھی کیا میری خودی بلند تھی اس فعل کا بدلا ہی ...."

"آہ۔ بیگم کو کون مجرم کہنے والا ہے۔ پتا پاؤں تو پوچھوں"۔

بس یہی ہے بڑھیا کی پیچیدہ چال، یکوں کو جمیلہ اُس کی گود میں اب سسکیاں بھر رہی تھی۔

ڈاکئے کے آنے پر عائشہ دوڑ کر ڈاک لے آئی۔ آج ڈاک جمیلہ نے دیکھی۔ بہت سے خطوط میں ایک خط تھا۔

"جناب وحید صاحب

کچھ کاغذوں کی فائل بیگ میں بند مجھے اپنے گھر کے صدر پھاٹک کے آگے ملی ہے۔ پڑھنے سے میں اس فیصلے پر پہنچا ہوں کہ وہ آپ کی ہے۔ اس کا ہرکارہ میرے پاس محفوظ رکھا ہے کسی دن صبح سات آٹھ بجے کے درمیان یا شام کو ۵ بجے کے بعد تشریف لے آئیے۔ شناخت وغیرہ ہو تو اور اچھا ہے

بیجو رفیق"

جمیلہ بڑبڑائی ــــ "کاغذات۔" ایک سانس اُوپر اور ایک نیچے آنے لگی۔ کان بجنے لگے "کاغذات"۔

کاغذ کے اس ٹکڑے کو اور جمیلہ کے چہرے کی گھبراہٹ کو عائشہ دیکھتی رہی اور پُوچھنے لگی "بیگم!"

"عائشہ"

"بیگم! ہے کیا؟"

"ذرا صبر کر عائشہ"

یہ دیکھ کر پریشان حال عائشہ اپنے "مسیحا" کے لئے دعائیں کرنے لگی "کیا اُس کے وحید سے کوئی گناہ سرزد ہو گیا ہے۔ اے خداوند کس آنچل میں چھپاؤں میں اسے۔ تو ہی بتا۔"

جمیلہ نے دیکھا تو بولی "کیا ہے اماں، ہمت باندھ"

عائشہ پھیکی ہنسی ہنستی ہوئی بولی "دھوکا ہُوا تھا مجھے"۔

ایک نامعلوم ساز دونوں کے دل میں بجتا رہا۔ آخر عائشہ نے کہا "یہ بیگم ہے کیا؟"

" میں سمجھتی ہوں وہی کاغذات نہ ہوں جو جمّن وکیل کے یہاں لے جا رہے تھے "۔

"کیا "۔

" ہاں اسی دن تو چلّا رہے تھے۔ کاغذات وکیل کو سونپ دوں گا۔" یہ سُن کر عائشہ ہٹ گئی۔"

چمڑے کا بیگ عائشہ کو سونپ جمیلہ بولی " تمہارے آقا اب تو اچھے ہو رہے ہیں، مجھے تو چھٹی دلا دو گی نا؟"

" حضور کو یہاں کیا تکلیف ہے، باندی خدمت کرے گی مل سے "

" نہیں عائشہ، مجھے اب آرام سے آب و ہوا تبدیل کرنے دو اور ہاں کاغذات جب چاہنا وحید کو دے دینا، دیکھنا وہ کہیں پھر نہ چرا لے جائے۔ "

دو تجربہ کار آنکھوں میں بجلی سی چمک اُٹھی۔ عائشہ نے کہا " وہ میں دیکھ لوں گی۔"

عائشہ اوٹی تو کانوں میں لفظ پڑے :" کہتا ہوں کراچی چلو میاں"

عائشہ رُکی۔ ان پُرانے وفادار جمّن کو عائشہ اس وقت سے جانتی ہے جب وہ ابھی زہرہ تھی۔ اسی کی طرح یہ جمّن بھی کبھی وحید کے پُرانے خدمت گار تھے۔ آج باپ دادا کے سونے پر جمّن وحید سے الگ اپنی ملکیت قائم کر کے بزاز کا حصّہ دار بن کر حقِ نمک ادا کر رہا ہے۔ اس کا بوجھ کبھی کڑواہٹ سے مٹھاس، کبھی مٹھاس سے کڑواہٹ کا رنگ اختیار کر لیتا ہے۔" کیا اسی کی وجہ سے بے بسی، نا امیدی ہے یا بے وفائی، اس کے آقا کیوں اسے اچھی طرح نہیں پہچانتے۔"

اس کو قدم بڑھا کر رُکنا پڑا۔ جمّن کی آواز تھی " ہاں میں کیا کر سکتا ہوں اور کوئی نہیں رہا تو عدالت کا دروازہ ہی تو ہے۔"

وہ بڑھی " آئے دن اسے عدالت کو یاد ہی کرتے دیکھ ہے جاتے نہیں دیکھا۔"

جمّن اپنی دُھن میں بول رہا تھا۔ جس سے عائشہ بھی بڑبڑاتی رہی۔

" بیوپار چلتا تھا ٹھیک تھا اب ان کا کام ٹھپ ہو گیا" ساتھ ہی وہ بھی بڑبڑائی :۔

" کاروبار ہے نہیں بھلا، اس میں آقا کیا کریں۔ انھوں نے چوری کی، جھوٹی کی۔"

جمّن نے آتا بھی نہیں سُنا تو بڑھیا نے وحید کو بلایا ذرا اشارہ کاغذات کے گم ہونے کا دیا کہ وحید بولا۔

" سالے گدھ رات کو بولتے ہیں دن کو آنکھیں دکھاتے ہیں۔"

عائشہ بولی :۔" مجھے تو یہی لگتا ہے کہ جھوٹی شیخی ہے کچھ بگاڑ سکتا تو رات دن خوشامد کرنے آتا؟"

" دیکھو نہ زہرہ " وحید سینہ تان کر بولا " زور دکھاتے ہیں تو دکھائیں۔ ڈراتے کس کو ہیں۔"

کچھ جلدی ہی ناشتہ تیار کر کے عائشہ وحید کی بیٹھک میں ہی آ گئی۔ خالی برتن لینے آئی تو جی کڑھن سے بھر گیا۔ وہی بھونڈی صورت، بے حیا، مسکاہٹ اور ننگ آلود نائلہ المیاد دھمکی، چھپی، چھپی، اس وقت اسے کام کی سُدھ نہ رہی۔ بے خبر کھڑی تھی کہ سُنا :۔

" برخوردار! چلو کراچی، تو بھائی کریم بھائی والے پھنسائے ہیں۔ ان سے اپنا لینا دینا دلاؤ۔ ہم سمجھیں گے تمہارا ہتھیں ملا۔ فیصلہ وہ کریں گے ضرور کچھ کم میں کچھ زیادہ میں۔ کچھ گھاٹا پڑنے کا نہیں۔"

وحید بولے :۔" مگر آپ کو بھروسہ ہے وہ دیں گے ضرور۔"

جمن نے کہا "ارے میاں کیوں نہ دیں گے وہ، انہیں خدا نے دیا ہے تو ماریں گے نہیں، ہمارا اتنا دینے سے انہیں کوئی فرق پڑنے کا نہیں مگر ہمارا اتنے میں نپٹ جائے گا وصولی کی ہمت چاہیئے۔ تم کر باندھو، چلو۔"

وحید بولا "وہ دیں تب نا"

"کیوں نہیں دیں گے۔ مجھے بوبی نے بتایا ہے کہ وہاں جا کر ہماری فتح ہے۔"

"فتح کوئی بُری بات نہیں مگر اب کیا ڈوبا تیرے گا" لیکن جمن اُمید افزا لہجے میں بولا۔" اس دن دل چھینکوایا تھا میں نے، دل بولا یقین دلاتا ہے۔"

وحید بولے "تو پھر دیر کیسی، نکالئے کاغذات، آج ہی کسی کے ہاتھ بھیج دیں۔ رقم کھری سمجھئے۔"

"ہاں بھائی وہ تو ہے مگر جب فیصلہ کراچی میں ہی ہو سکتا ہے تو عدالت کیوں نہ جائیں۔"

"میں کہتا ہوں عدالتی جھوت کے ہوتے ہوئے نورجہائی عاروں کے پیچھے کراچی چلو۔"

اور وحید کی نظر عائشہ سے جا ملی۔ عائشہ مسکرائی وحید بولے "عدالت موجود ہے تو کیا غم، دھولے دائر ہوتے ہی یہاں نپٹانے آئیں گے۔"

جمن سر ہلاتے ہوئے بولے "نہیں برخوردار۔ جب وہ فیصلہ ہی کریں گے تو عدالت میں کیوں جائیں۔ مجھے پوری اُمید ہے کہ وہ فیصلہ کر ہی لیں گے، کیوں کیا کہتے ہو۔" اور ساتھ ہی جمن پُرسے ارمان سے مسکرا دیئے۔

وحید بولے "میں نے بھی وکیل سے مشورہ کیا تھا ان کا کہنا ہے کاغذات کے حساب سے ہی چڑھائی کرنا ٹھیک ہے۔ ورنہ نور بھائی والے کیوں کچھ دینے لگے۔ مجھے کراچی چلنے میں یوں تو کوئی عذر نہیں۔"

یہ سب باتیں سن کر بے فکر عائشہ ہٹ گئی مگر گھنٹوں بعد کھانے کا وقت آنے پر بھی جمن کو موجود پایا وہ تیزی سے پیر ٹیکتے کہہ رہے تھے "میرا کیا بگڑے گا برخوردار چھپنا میں نہیں ہوں تم ہو۔ میرے لئے عدالت کا دروازہ کھلا ہے۔ خیال ہے تو چھوٹی بیگم کے کاغذات میں ان کی تحویل موجود ہے اُنھیں چھپانا میری فطرت ہی نہیں مانتی۔ اُسی کا ڈر ہے ورنہ تم ایک ایک کو گھسیٹ لے جاتا۔ جاتا تو میں تھا کر تم اور بیگم کچھ اس جھگڑے سے بری رہتے۔ کام باہر کا ہو جاتا۔"

عائشہ بڑبڑائی۔"ارے مردود دیکھ میں نے تیری بے ڈھائی فطرت کا بوجھ لاد رہا ہے بیگم کے سر، تو جاتا کیوں نہیں عدالت، نمک حلال بنا ہے۔"

جمن کے جانے کے بعد وحید اندر پہنچا "اماں" اماں بولی "ناس جائے بوڑھے کا۔ جس دن صورت دیکھ لو روٹی نصیب نہیں ہوتی بدبخت کو نہ گھر میں چین نہ باہر"

یہ سُن کر وحید نے بات بدلی "اماں! تجھی سے کیا برابر کام میں لگی ہو نپٹا نہیں"

پر اُسے حالات بگڑتے نظر آئے۔ کیونکہ جل بھن کر عائشہ بولی۔

"نہیں نپٹا، تو کیا نگوڑے کو پیالی بھر چائے، ناشتے کو کھوگے۔ یا آج اماں پر رحم آیا ہے۔"

"اچھا میاں چلتا ہوں"۔ یہ جمن کی آواز تھی۔

وحید دہلیز پر سے گھوما تو بولا "اماں جلدی کھانا لاؤ۔"

مگر آج اماں سے نہ رہا گیا۔ کھانا چُنا اور کھلانے بیٹھیں تو پوچھا "آخر جمن برابر کیوں آتے ہیں چھوٹے مالک!"

چھوٹے مالک ہنس کر بولے۔"اب انہیں اور کیا کام

رہ گیا ہے ؟

" مگر کہتے کیا ہیں وہ ہیں تو جانوں ۔"

مالک بے فکر ہو کر لنزاً بولے " کہیں گے وہی جو ہمیشہ کہتے ہیں مگر اپنے بن کر ۔ اب وہ خیر نہیں رہے اماں" کچھ سوچ کر عائشہ بولی " اور وہ جو بیگم کا نام لیتے تھے ۔"

مالک ہنسے " وہ تو ایک ایک کو اندر کرائیں گے ۔ چین کنڈو ر تک کی قرقی کرادیں، کہتے تھے "

" انھیں بھی ان کا دینا ہے کیا ؟"

" ہاں — کیونکہ وہ انھیں اپیورٹ کی اجازت نہ دے کر مجھے دیتے ہیں ۔"

" اس سے ان پر ان کا حق بنتا ہے ؟"

" اماں تم یہ کیا سمجھو گی ؟"

بڑھیا کا دل سچ مچ بھر آیا ۔ یہ دیکھ کر وحید بولا " میں نے سب سوچ رکھا ہے جلد ہی ٹھیک کر لوں گا"

" سچ تو یہ ہے ، کہ لوگے ، لیکن کب میرے لاڈلے" اور آنسو اُس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ بہنے لگے ۔

وحید ہنس کر لاپروائی سے بولا " عورتوں کا بس اتنا ہی حوصلہ ہوتا ہے اماں "

اماں بولی " لیکن کب، یہی سنتے سنتے تو بیگم ....."

وحید درمیان میں بول اُٹھا ۔ " چلی گئیں ۔ اچھا ہُوا " نمک حرام ۔"

عائشہ اُٹھ کر جو چڑے کا بیگ لائی تھی وہی وحید کے ہاتھ میں تھا اور اماں کو گھور رہا تھا عائشہ بولی " یہی ہیں نا کاغذات جن کا ذکر کیا تھا میں نے ۔"

" کاغذات "

" ارے ہاں کہاں گیا اُن کا شیر سا دُم ، کیا انھیں دستاویزوں نے نہیں چھوڑ لیا ۔ کیوں اب بنے پھرتے ہیں بیگمی بلّی ۔" بیگ کو کھول کر ایک ایک دستاویز دیکھ کر وحید بولے " کیا حاصل وہ دستاویز کھو بیٹھا ۔"

عائشہ سنجیدگی سے بولی " کچھ اصل اور کچھ جعلی ۔ کچھ اپنی اور کچھ چچی کی ۔ لیکن خدا دیکھ رہا تھا ۔ وکیل کے یہاں صلاح لینے جاتے راستے ہی میں گر گئیں ۔ انسان کے ذمے ہو تو وہ انسان کو پھنسا ڈالتے نہیں چوکتا ۔ لیکن خدا نے اس کو شکنجے میں پھنسایا ۔"

وحید بولا " افسوس "

عائشہ بولی " خدا کی قدرت ہے پروردگار تمہارا یہ احسان میں کبھی نہ بھولوں گی ۔"

وحید نے دُعا میں اُٹھے ہوئے ہاتھ تھامتے ہوئے کہا ۔" اماں تمہارا یہ احسان میں کبھی نہ بھولوں گا ۔"

" بیٹا احسان "

یہ کہہ کر عائشہ سامنے سے ہٹ گئی

وحید کی چوٹ ٹھیک ہو چکی ہے لیکن ابھی سفر کرنے کے قابل نہیں ۔ اس کے لئے جمن دوا کی پُڑیاں لئے اندر گھسے ۔

" برخوردار لیتا آیا ہوں دوا ۔ لیکن اب تو چل سکتے ہو ۔ اچھی طرح ٹھیک ہو ۔ یونہی چلو پھروگے تو دو دن میں بھلے چنگے ہو جاؤ گے ۔

" ہاں اب تندرست ہوں ۔"

تکیے کا سہارا لیتے ہوئے جمن بولے ۔" تب کراچی کا کیا سوچا ہے ؟"

" سوچا ہے چچا ۔ لیتا دعول کریں گے خواہ کچھ بھی ہو" جلد ہی تکیے سے سر اُٹھائے چچا بولے ۔" میری سمجھ میں وہی بات بنتی ہے یہاں وقت گنوانا بالکل بے فائدہ ہے ۔"

عائشہ اپنے آقا کا آج کا رقعہ دیکھنے کے لئے چھپ کر کھڑی ہوئی تھی کہ سُنا ۔

"میں نے انکار نہیں کیا چچا۔ مگر وہاں جاکر فائدہ نہیں"
جمن جھلا کر بولے۔ "سبحان اللہ میاں کہتے کیا ہو
بنا عدالت گئے روپے پا جائیں فائدہ نہیں کیا نقصان
ہے۔"

"پر روپے پا جائیں تب نا"۔

چچا بھڑک اٹھے۔ "انکار کیوں ہو ذرا بتاؤ تو
تم میرے ساجھی اور وہ تمہارا ساجھی۔ ہاں انکار کرتے
ہو تو صاف کہو میری راہ کھلی ہے۔"

وحید مسکرائے "چچا میں کہتا ہوں میرے نکلنے
کی تو راہ بند ہے لیکن آپ کی وصولی کیوں رُکے۔
میں چھنوں چاہے رہوں آپ مقدمہ دائر کر دیں۔"

چچا بولے "میری تو پائی پائی محفوظ ہے۔ مجھے
ڈر نہیں۔ ہاں ایک فکر ہے بیگم کی، ان کی دستاویز
میرے پاس ہے۔ ایک دو رقم ابھی دے ڈالو۔ تو میں
بھاری تہر سے بچ جاؤں۔"

"پر دے جو نہیں سکتا چچا چھوٹی کوڑی بھی تو
نہیں"۔

"تو کسی سے دلوا دو۔ رسید باقاعدہ دوں گا۔ پھر بیگم کی
فکر سے حاصلہ نہیں اور تمہاری فکر میں کروں گا نہیں، انہیں
تو پورا مزہ چکھانا ہے۔"

"تو یوں نہ کرو چچا۔ دستاویز کسی کے ہاتھ بیچ ڈالو۔
اپنی رقم وصول کر لو۔ دوسرا جو کچھ اُٹھاتا پھرے۔"

"پر بیچوں کیا بے دام۔"

"بے دام کیوں دام پورے وصول کریں۔ ہمارا وکیل
ایک بار کاغذات دیکھتے ہی آسامی کھری کر دے گا۔
"کاغذات دکھائے ہیں میں نے بھی۔ مگر وکیل کہتا ہے
کہ بیگم بیچ سے ہٹے تبھی کچھ ہوگا۔"

وحید بولے۔ "چچا چھوٹی رقم کی اتنی جلدی۔ پہلے
آپ کو بڑی رقم کی فکر کرنی چاہیئے"

چچا بولے۔ "آہا۔ دستاویز عدالت پڑھے تو بیگم پھر
کہاں چھوٹے گی۔ انھیں کیا کچہری چڑھاؤں گا اور میں جانتا
ہوں جھوٹ وہ بولیں گی نہیں۔"

بات چچا نے اونچے لہجے میں کہی تھی کہ جملہ سن کر
انصاف کرے۔ لیکن ادھر سے جواب نہ پانے پر وہ بے حوصلہ
ہو کر بولے "میری راہ کا کانٹا نکالو تم۔"

کچھ سوچ کر وحید بولے "کاغذ دیکھنے پر راہ نکل
سکتی ہے چچا۔"

لیکن چچا اتنے بے بس پر بھی اپنے بیان پر فخر کی
مہر ثبت کرتے ہوئے بولے:۔

"کاغذوں کی رٹ، لگائے ہوئے ہو۔ میں نے کہا تو
ہے کہ میری رقم محفوظ ہے، پر بیگم کی دھج سے میں
نپٹنا چاہتا ہوں۔"

وحید بولے "یوں تو ایک بار کاغذات میں اپنی آنکھوں
دیکھنا چاہتا ہوں، چچا کیا آپ کو میرا اعتبار نہیں۔"

"اعتبار۔ ایسا معلوم ہوتا ہے نہیں میرا نہیں۔ نہیں
تو بتا دیجیے بھی کیا جانتے نہیں ہو کہ دستاویزیں لکھی
ہوئی اور ..... وکیل کے طائر کرنے کی دیر ہے۔"

"لیکن میں بھی تو مفت میں دستاویزیں دینے کو نہیں
کہتا۔ آپ سوچیں تو سہی کوئی خریدے گا دستاویز تو
دیکھ دکھلا کر۔"

"یہ ضد ہے میاں ورنہ وصولی میری ہوئی رکھی ہے۔
مجھے وصولی سے کوئی روک نہیں سکتا۔"

"آپ رکاوٹ خود ہی ڈال رہے ہیں۔ میں نہیں چاہتا
کہ روپیہ آپ کا ڈوبے۔"

چچا بھڑک اٹھے۔ "روپوں کی فکر نہ کرو میاں" اور
جمن گواہوں کے نام گننے کے بعد بولے۔ "برخوردار! میاں
کریم اور جہانگیر جانتے ہیں، اس کے علاوہ کاغذات بیرسٹر
خلیق اللہ کو دکھا دیجیے ہیں۔ عبدالعزیز سے مشورہ لے چکا

ہوں ۔ اور وہ تناور سا جوان اور ہے نا ۔ اس سے بہت پرانے تعلقات ہیں ۔ صلاح دیتے ہیں پوری نیک نیتی سے ، اس کے علاوہ فیض اور میاں زیدی ساتھ ہیں ۔ کیس عاشق حسین کے پاس طیار پڑا ہے ۔ بنا کے کہنے کیا کاغذات کوٹا سکتا ہوں ۔"

" تو کہہ کر ہی لوٹا دیں نا ۔ بنا اُن کی صلاح کے کیوں بھیجیں گے آپ — کیا وہ نیک صلاح سے کام لیں گے ۔"

" لیکن وہ بھیجنے کی صلاح کیوں دیں ، میں کیا زور بھائی کو چھوڑ دوں یا طلعت کپنی کو ....."

" سید سے ہاتھ ملنے پر ایسا کیوں کریں گے چچا ۔ ابھی تو عدالت جانے سے غیریت کا تعلق بتا رہے تھے نا ۔"

اس پر جمیلہ ان سُنی کر کے چل دی ۔ عائشہ بے بس بوڑھے کو بے عزت جاتے دیکھ کر دل ہی دل میں کہنے لگی " نمک حرام "

لیکن رخ کی خوشی میں دونوں بانہیں اُونچی اُٹھا کر جوش و مسرت کی آواز میں اماں پکارنے والا وحید ذرا مضطرب سا نظر آنے لگا ۔ اِدھر اُدھر دیکھا تو حیرت سے کہہ اُٹھا " تم "

جمیلہ معصوم چہرے کو ویسے ہی دیکھتی رہی ۔

وحید نے پوچھا " یہاں کیسے ؟ "

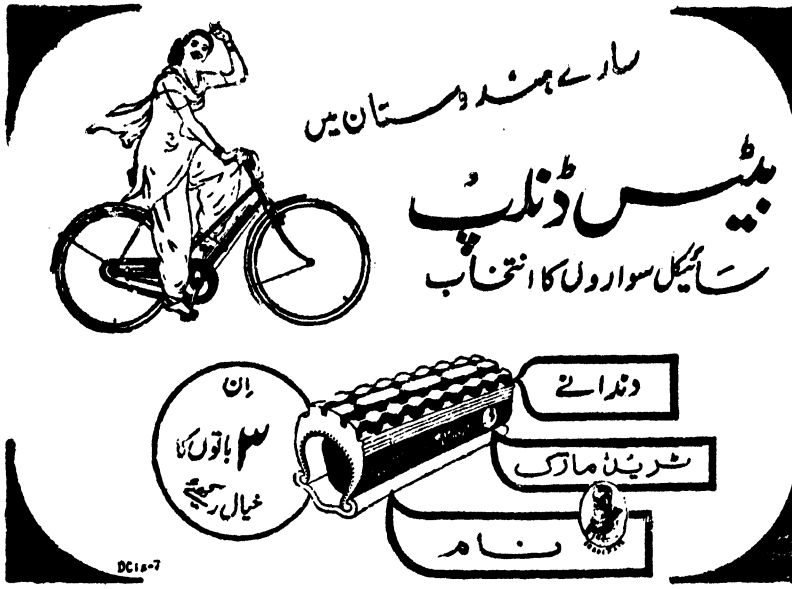
اور جمیلہ اس چہرے کے اُتار چڑھاؤ کو دیکھتی رہی ۔ جہاں حقیقی مسکراہٹ تھی ۔

وُہ عائشہ کو ڈھونڈھتی آگے بڑھی ۔

چمڑے کے بیگ کا ایک ایک کاغذ آتش دان کی آگ کے حوالے کرتی ہوئی عائشہ اُٹھتے ہوئے شعلوں کو دیکھ رہی تھی ۔

جمیلہ نے پکارا " اماں "

لیکن اماں مشغول تھی ایک ایک دستاویز کو آگ کے حوالے کرنے میں...



شعر و شاعری نمبر

چند آراء کے اقتباسات

میرے عنایت فرما! اگست ۱۹۵۳ء کا "آج کل" بہت خوب ہے۔ ہندوستان کی مختلف زبانوں کی شاعری کے نمونوں اور اُن کے شاعروں کی تصویروں کا یہ مجموعہ نادر اور دلچسپ بھی ہے، مفید بھی۔ تین سنگھ اور ہلیری کی فتح ہمالہ پر جو کئی نظمیں ہیں وقت کی چیز ہیں اور خاص طور پر لطف دیتی ہیں۔ نقاشی کے نمونے نہایت اچھے انتخاب کئے گئے ہیں اور مقالے اور نظمیں بھی اچھے معیار کی ہیں۔ رسالے کا یہ شمارہ ہر حیثیت سے کامیاب ہے۔

عبدالستار صدیقی

مہربان میرے! رسالہ آج کل کا سال نامہ میں نے دیکھا اور اس کے مطالعے سے بہت حظ اٹھایا۔ مختلف صوبوں اور علاقوں کی زبانوں کی شاعری کے نمونے دے کر آپ نے عام ادبی کلچر اور ایک طرح سے قوم کی بڑی خدمت انجام دی ہے۔ اس کے مطالعے سے لوگوں کو موقع ملے گا کہ وہ اندازہ کرسکیں کہ نئے رجحانات کی رَو کُل ملک میں ذوقِ سخن کو کہاں لے جا رہی ہے۔

برج موہن دتاتریہ کیفی

عنایت نامہ ملا، 'آج کل' اگست نمبر پڑھا۔ یہ شعر و شاعری نمبر اسم بامسمّٰی ہے۔ ہندی شاعری، پنجابی شاعری کشمیری شاعری وغیرہ پر خوب معلومات آپ نے جمع کرلئے ہیں اور اردو خوانوں کو ان سے استفادے کے پورے موقعے دے دیئے ہیں۔

عبدالماجد دریابادی

آپ کا پوسٹ کارڈ ملا۔ میں آج کل بہت بیمار ہوں۔ عجب نہیں کہ مشورے کے لئے بمبئی جانا ہو۔ اگست کے 'آج کل' پر ریویو لکھنا ممکن نہیں۔ مگر مجموعی حیثیت سے مجھے بہت پسند آیا۔ خصوصاً دوسری زبانوں کے ادب سے اُردو داں حضرات کو متعارف کرانا بہت اچھا اقدام ہے۔

اثر لکھنوی

'آج کل' شعر و شاعری نمبر بابت ماہ اگست ۱۹۵۳ء اپنے موضوع کے لحاظ سے قابلِ دید شمارہ ہے۔ اس میں ہندوستان کی مختلف زبانوں کی شاعری کے اچھے اچھے نمونے مع اردو ترجمہ پیش کئے گئے ہیں۔ اور ان پر برمحل تنقید بھی کی گئی ہے۔ بہت سے شعرائے ہند کی تصویروں نے اس نمبر کو دلکش مرقع بنادیا ہے۔ راجپوت نقاشی کے دو قیمتی نمونے بھی شاملِ اشاعت کرکے فنونِ لطیفہ کے دو بڑے شعبوں یعنی شاعری اور مصوری کو ہم آغوش بنادیا گیا ہے۔ پرانی

اور نئی شاعری پر جو تبصرے کئے گئے ہیں، بہت ہی منصفانہ ہیں۔ یہ تبصرے متعدد زبانوں کی شاعری پر حاوی ہیں۔ مختصر یہ کہ مذکورہ بالا نمبر شعر و شاعری پر جامع تنقید پیش کرتا ہے۔ مختلف زبانوں کے شاعر ان تنقیدوں سے رہنمائی حاصل کرسکتے ہیں۔

جوش ملسیانی

مکرمی، مجھے آپ کا شعر و شاعری نمبر بہت پسند آیا۔ آپ زبان و ادب کی تنویری قوت سے باخبر ہیں اور نئے ہندوستان میں اُن کا جو مقام ہے اُس کے صحیح شناسا ہیں۔ خدا کرے آپ اِس سلسلے کو جاری رکھ سکیں۔ آج جب سے اہم کام ہندوستان کی ہر رنگ تہذیب کو فروغ دینا ہے اور یہ کام مختلف ہندوستانی ادبیات کے مطالعے ہی سے ممکن ہے۔

خواجہ احمد فاروقی

میرے خیال میں آج تک کسی اُردو رسالے نے مختلف صوبوں کے شعر و ادب سے ہمیں واقف نہیں کیا تھا۔ آپ لوگوں نے اس کمی کو پورا کرکے اردو زبان و ادب پر احسان کیا ہے ادبی مضامین سب اپنی جگہ پر معقول اور پُراز معلومات ہیں۔

م، حفیظ سیّد

محترمی جوش صاحب! 'آج کل' کا شعر و شاعری نمبر ایک نثری اور شعری کارنامہ ہے۔ قریب قریب تمام مضامین محنت سے لکھے اور لکھوائے گئے ہیں۔ آپنے واقعی کوزے میں سمندر بند کرنے کی کوشش کی ہے۔ نئی ہندی شاعری، نئی پنجابی شاعری، جدید کشمیری شاعری اور نئے دَور میں جدید تلنگی شاعری بڑے دلچسپ اور کام کے مضامین ہیں اور بڑے صاف اور ستھرے انداز میں قاری کو اِن زبانوں کی شاعری سے روشناس کراتے ہیں، 'گل کدہ' میں اردو کی چند اچھوتی نظمیں شامل کی گئی ہیں۔ میری مراد تاج محل، ایورسٹ کی پریوں کا کورس، عظمتِ آدم اور باغ شالامار سے ہے۔ جوش صاحب کے 'آغاز انجام' اور فراق گورکھ پوری کی غزل کے چند اشعار حسبِ معمول نشتر کا درجہ رکھتے ہیں۔

اب وہ ارمان سرِ بزمِ لہو ہیں — کل جو تھے سربلند و سرافراز
کوئی ملا دھا ہے اپنا کوئی گرتا — کوئی محمود ہے نہ کوئی ایاز — جوش

اور

شیخ صاحب سب کی نظروں میں فرشتے ہی سہی
حق تو یہ ہے آدمی میں آدمیت چاہیئے — فراق

اس دفعہ آپ نے تصاویر میں بھی خاصی جدّت پیدا کی ہے۔ خدارا انھیں نظرِ بد سے بچایئے۔ یقیناً جناب جوش صاحب، آپ اور آزاد صاحب مبارکباد کے مستحق ہیں۔

کنہیا لال کپور

محترمی سلام و نیاز، 'آج کل' کا شعر و شاعری نمبر بابت اگست ۱۹۵۳ء موصول ہوا۔ یہ سالنامہ اس اعتبار سے پہلے سالناموں پر فائق ہے کہ اس کے ذریعے سے ہمیں ہندوستان کی مختلف زبانوں کے ادب سے واقف ہونے کا موقع مل سکا اور نہیں سے قسمتی سے ہم ایک ملک میں رہتے ہوئے ناواقف رہتے ہیں۔

اگر دوسری زبانوں کے رسالے بھی اِس قسم کی کوشش جاری رکھیں تو ہندوستان کے مختلف زبانوں کے ادب اور ادیب ایک دوسرے کے زیادہ قریب آسکیں گے۔ اور باہمی ارتباط سے ہرزبان اور اُس کے ادب کو فائدہ پہونچے گا۔ اور تنگ نظری اور علیحدگی پسندی دُور ہوکر ایک بین المللی ادب اور کلچر کی تعمیر میں سہولت

پیدا ہوسکے گی اور جب بھی ایسا ہوسکا تو "آج کل" اور اُس کے لائق مدیروں کو اس کام کے لئے تاریخ میں ہمیشہ نمایاں مقام حاصل ہوگا۔

میکش اکبر آبادی

جناب مکرم! تسلیم، کارڈ وصول ہوا۔ شکریہ
"آج کل" ماہ اگست کا دلچسپی سے مطالعہ کیا، علاقہ واری زبانوں اور اُن کی شاعری کے متعلق بڑا اچھا ذخیرہ پیش ہوا ہے۔ اردو میں اس کی کمی تھی، آپ نے بڑی اہم ضرورت کو پورا کیا ہے۔ ہمدرد والوں اردو کی جانب سے مبارک باد قبول کیجئے۔

نصیر الدین ہاشمی

اگست کا 'آج کل' میں نے دیکھا۔ جس کاوش اور اَن تھک محنت سے یہ نمبر مرتب کیا گیا ہے اس کی داد دینے کو بے ساختہ جی چاہتا ہے۔ اس کی خوبی یہی کیا کم ہے کہ ناظرین کو بیک وقت ملک کی مشہور زبانوں کی نہ صرف شاعری بلکہ نئی شاعری سے روشناس ہونے کا موقع ملا اور اُس کے ساتھ ہی نئے ادب کے غیر مشہور شعراء کے ناموں سے بھی تعارف ہوا۔

محمد علی خاں اثر

اگست ۱۹۵۳ء میں آج کل کا شعر و شاعری نمبر نکلا، یہ شعر و شاعری صرف اُردو تک ہی محدود نہیں بلکہ اپنے ملک کی متعدد زبانوں کی شاعری پر کافی بحث کی گئی ہے اور تقریباً ہر بحث، تذکرہ کامیاب ہے۔ اس میں ادارہ کی قابلیت اور سلیقہ انتخاب نیز جدت پسندی کو زیادہ دخل ہے۔ مختلف زبانوں کے شعراء کی تصاویر بھی بنایت اہتمام سے دی ہیں، اور نمبر کو ہر طرح کامیاب بنایا ہے۔

ابر احسنی گنوری

اگست نمبر کے تمام مضامین اور نظمیں وغیرہ ادب و زبان کے اعتبار سے بہت قیمتی ہیں۔ مختلف زبانوں کے ادب کو اُردو پڑھنے والوں کے سامنے جس محنت اور خوب صورتی سے پیش کیا گیا ہے، اُس کی داد کھلے لفظوں میں دینی چاہیئے۔

ملک کی دوسری زبانوں کے ادبا اور شعراء کی تصاویر ایک اندرونی ربط اور کشش کا ذریعہ ہیں۔ ان کی تحقیقات کو پڑھنے اور جانچنے کے لئے اگست نمبر بہت قیمتی سرمایہ ہے۔

ادیب مالیگانوی

اس نمبر میں نئی ہندی شاعری، نئی پنجابی شاعری، جدید کشمیری شاعری، نئے دور میں جدید تلنگی شاعری اچھے مضامین ہیں۔

ہماری زبان

نواب علی خاں گوہر

قافلۂ نوبہار

اُٹھا تھا صحنِ باغ سے رنگیں غبار ابھی
شاید گمیا ہے قافلۂ نوبہار ابھی

یکونکر جگائے پہلی کرن آفتاب کی
مرخوشش مئے شبانہ سے ہیں بادہ خوار ابھی

انوارِ صبح نو کے نظر آئیں کس طرح
چھایا ہُوا افق پہ ہے گرد و غبار ابھی

آسودگی ملے غمِ جاناں میں کس طرح
دل میں بسا ہُوا ہے غمِ روزگار ابھی

بدلا جہاں، ستاروں کی گردش بدل گئی
ہے عشق اور سلسلۂ انتظار ابھی

نزدیک ہے وہ وقت کہ آئے پیامِ دوست
کچھ دیر اور صبر کر اے جانِ زار ابھی

سو آفتیں ہیں آج بھی حق گو کے واسطے
جو تھا وہی ہے شیوۂ منصور و دار ابھی

پیدا ہُوا خلوص، نہ ایماں، نہ آشتی
دُنیا ہے دوزخ اے مرے پروردگار ابھی

سرسبز ہوگا مزرعِ مشرق بھی جلد ہی
اُٹھا ہے بحرِ ہند سے ابرِ بہار ابھی

منزل ہے ماورائے ثریا و کہکشاں
اے رہروانِ شوق نہ لینا قرار ابھی

گو تر ہے خارِ خارِ جنوں کو ہے یہ گلہ
آیا بروئے کار نہ وہ مردِ کار ابھی

راگھویندر راؤ جذب

یہ سب کہنے کی باتیں ہیں

وہ ہے دوست اور وہ پیارا یہ سب کہنے کی باتیں ہیں
یہاں کوئی نہیں اپنا، یہ سب کہنے کی باتیں ہیں

ملے انساں کو نفس و دل تو اُن سے کام لینا تھا
ہوس کیسی، محبت کیسا یہ سب کہنے کی باتیں ہیں

یہ کہتے ہو کل آئیں گے، پھر اس پر مسکراتے ہو
چلو بس جاؤ، ہیں سمجھا یہ سب کہنے کی باتیں ہیں

تمہارا عشق، اپنا غم کروں دُنیا پہ کیوں ظاہر
تمہیں انصاف سے کہنا یہ سب کہنے کی باتیں ہیں

یہ غمخوار و عزادار آج کچھ ہیں اور کل کچھ ہیں
یہاں کس کو ہے غم کس کا یہ سب کہنے کی باتیں ہیں

مرے قاصد یہ خط ہے اور یہ پیغامِ زبانی ہے
یہ باتیں یاد سب رکھنا یہ سب کہنے کی باتیں ہیں

جو کچھ ہوتا تو اب تک کھل ہی جاتا عقلِ انساں پر
نہ کچھ دُنیا، نہ کچھ عقبیٰ یہ سب کہنے کی باتیں ہیں

تجھے اے شیخ! جنت سے نہیں مطلب خُدا سے ہے
مجھے معلوم ہے بابا یہ سب کہنے کی باتیں ہیں

محبت ہو تو فکرِ ماسوا ہو ہی نہیں سکتی
وفائیں کیسا، جفائیں کیسا یہ سب کہنے کی باتیں ہیں

نہ وہ وعدے کے پکّے ہیں، نہ ہم ہیں عشق میں کامل
نتیجہ اِس کا یہ نکلا یہ سب کہنے کی باتیں ہیں

حرم اور بتکدے میں کچھ نہیں جو کچھ ہے دل میں ہے
ہیں سب کچھ جذب کہہ دوں گا، یہ سب کہنے کی باتیں ہیں

صحت کے لئے وٹامن

تندرست رہنے کے لئے انسان کو کس قسم کی خوراک استعمال کرنی چاہیئے ؟ اس موضوع پر بڑی تحقیق کی گئی ہے ۔ مختلف وٹامن کی اہمیت سے متعلق جدید علم کی روشنی میں ہمارے لئے یہ جاننا ضروری ہوگا کہ مختلف بیماریوں کی مدافعت میں وٹامن کیا پارٹ ادا کرتے ہیں اور خوراک میں مختلف وٹامن کی مناسب مقدار کی کمی کے باعث ہمیں کون کون سے امراض لاحق ہونے کا اندیشہ رہتا ہے ۔ اس علم کی مدد سے ہم روزمرہ کی خوراک میں صحت کے نقطہ نگاہ سے موزوں اشیائے خوردنی شامل کرکے کئی بیماریوں سے محفوظ رہ سکتے ہیں ۔

انیسویں صدی کے وسط تک غذائی تحقیق اس امر تک ہی محدود رہی کہ جسم انسانی کی نشو و نما میں خوراک کے تین اجزا پروٹین، چکنائی اور کاربو ہائیڈریٹ کو کیا اہمیت حاصل ہے ۔ لیکن اس تحقیق میں کوئی ایسا خلا محسوس کیا جاتا رہا جسے مزید کئی سال کے تجربوں کے بعد پورا کیا گیا ۔ ۱۸۴۷ء میں جیمز لنڈ نامی ایک ڈاکٹر نے تجربوں سے یہ ثابت کیا کہ سکروی (فساد خون سے پیدا ہونے والا ایک مرض جس سے جسم پر سیاہ داغ پڑ جاتے ہیں مسوڑے سوج جاتے ہیں اور ہاتھ پاؤں میں درد ہونے لگتا ہے) کا علاج لیموں یا دوسرے ترش پھلوں کے رس سے کیا جا سکتا ہے ۔ ۱۸۸۰ء سے تھوڑی مدت بعد جاپانی بحریہ کے ایک ڈاکٹر ایڈمرل ٹکاکی نے یہ ثابت کیا کہ مختلف پھلیوں کے ثابت دانوں کا استعمال بیری بیری نام (استسقا کی قسم کی ایک بیماری) کے مرض کی روک تھام میں مفید ثابت ہوتا ہے ۔ ۱۸۹۵ء میں میں جاوا میں جیلخانے کے ایک ڈاکٹر ایجکمن نے یہ دریافت کیا کہ پسے ہوئے چاول کھانے والے پرندوں میں بھی بیری بیری کے مرض کی علامتیں نمودار ہو جاتی ہیں جہاں تک وٹامن سے متعلق ایک علیحدہ علم کے قیام کا تعلق ہے، اس کا سہرا سر فریڈرک گولینڈ ہاپکنز کے سر ہے ۔ اب تک دریافت شدہ وٹامنوں کی تعداد اتنی زیادہ ہے کہ صرف ڈاکٹر ہی ان کے نام یاد رکھ سکتے ہیں ۔ ان میں وٹامن اے، سی، ڈی اور بی گروپ کے وٹامن زیادہ اہمیت رکھتے ہیں ۔

خوراک میں وٹامن کی کمی کئی بیماریاں پیدا کرنے کا موجب بنتی ہے ۔ یہ وٹامن ہمیں مکھن، گھی، دودھ دہی انڈے کی زردی اور مچھلی وغیرہ کے استعمال سے میسر آ سکتا ہے ۔ گھی کو کھلے برتن میں زیادہ دیر آنچ دینے سے وٹامن اے ضائع ہو جاتا ہے ۔ بناسپتی اور نباتاتی تیلوں میں وٹامن اے موجود نہیں ہوتا ۔ کاڈ، شارک اور بھارت میں پائی جانے والی بعض دیگر اقسام کی مچھلیوں کا تیل وٹامن اے کی مناسب مقدار حاصل کرنے کے لئے سستا اور آسان ترین طریقہ یہ ہے کہ ایک بالغ کی روزمرہ کی خوراک میں تین اونس پتوں والی سبزیاں شامل کی جائیں آم ۔ ٹماٹر ۔ گاجر، پپیتا اور سبز اور زرد رنگ کے دوسرے

پھلوں میں کیروٹین خاصی مقدار میں موجود ہوتی ہے جو کھانے کے بعد وٹامن اے میں تبدیل ہو جاتی ہے۔

بی گروپ میں کئی وٹامن شامل ہیں ان میں سے تھائمن نامی ایک وٹامن کی کمی سے بیری بیری کا مرض پیدا ہو جاتا ہے اس مرض سے مختلف اعضائے جسمانی کام کاج سے عاری ہو جاتے ہیں اور اس کا نتیجہ اکثر حرکتِ قلب بند ہو جانے کی صورت میں رونما ہوتا ہے۔ یہ وٹامن حاصل کرنے کے لئے دالیں، ثابت اناج، مونگ پھلی اور دوسرے گری دالے میوے استعمال کرنے چاہئیں۔ پسا ہوا چاول کھانے والے اشخاص بھی روزمرہ کی خوراک میں دو اونس دالیں شامل کرکے اس مرض کے خطرے سے محفوظ رہ سکتے ہیں۔ بی گروپ کے دوسرے وٹامنوں کی کمی سے زبان پر چھالے پڑنے اور آنکھ کی بیماریاں پیدا ہو جاتی ہیں دالوں اور گری دالے میووں میں اس گروپ کے بہت سے وٹامن موجود ہوتے ہیں۔ خمیرہ دودھ سے تیار شدہ اشیاء کلیجی اور انڈوں کے استعمال سے کافی مقدار میں وٹامن بی حاصل کیا جا سکتا ہے۔

دانتوں کی مضبوطی کے لئے وٹامن سی کو خاص اہمیت حاصل ہے اس کی کمی کے باعث مسوڑوں سے خون آنے لگتا ہے اور جسم میں زیادہ مدت تک اس وٹامن کی کمی کا نتیجہ مرض سکروی کی صورت میں نمودار ہوتا ہے۔ مسوڑھوں کی سوزش، جریان، خون اور مختلف اعضائے جسمانی کا درد اس مرض کی اہم علامتیں ہیں۔ یہ وٹامن عام طور پر تازہ پھلوں سبزیوں اور خاص کر سبز پتوں والی سبزیوں میں وافر مقدار میں پایا جاتا ہے۔ باسی سبزیوں میں وٹامن سی ضائع ہو جاتا ہے۔

آملہ ایک سستا پھل ہے جس میں وٹامن سی بہت زیادہ مقدار میں موجود ہوتا ہے ایک آملہ میں وٹامن سی کی مقدار ایک یا دو سنگتروں کے برابر ہوتی ہے۔ اس کے تازہ رس میں سنگترے کے رس کے مقابلہ میں وٹامن سی کی مقدار بیس گنا زیادہ ہوتی ہے۔ عام طور پر تازہ پھلوں اور سبزیوں کو خشک کرنے یا آنچ دینے سے ان میں وٹامن سی ضائع ہو جاتا ہے۔ لیکن آملہ کی یہ امتیازی خصوصیت ہے کہ اسے آنچ دینے سے بھی وٹامن سی ضائع نہیں ہوتا۔ اس لئے مُربّہ اور آچار وغیرہ ڈال کر بھی آملے میں موجود وٹامن سی کی مقدار سے پورا فائدہ اُٹھایا جا سکتا ہے۔ امرود اور آم میں بھی یہ وٹامن کثیر مقدار میں موجود ہوتا ہے۔

ہڈیوں کی مضبوطی کے لئے وٹامن ڈی کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ جسم میں اس وٹامن کی کمی سے ہڈیاں کمزور ہو جاتی ہیں۔ ان کی قدرتی ساخت میں فرق آ جاتا ہے اور سوکھے کی بیماری ہو جاتی ہے۔ یہ وٹامن زیادہ تر جانوروں کے جگر، جگر کے تیلوں، انڈے کی زردی، دودھ اور ان مویشیوں کے دودھ سے تیار شدہ گھی میں موجود ہوتا ہے جنہیں سبز چارہ کھلایا جائے اور دھوپ میں رہنے کا موقعہ دیا جائے۔ تنگ و تاریک گھروں میں رہنے والے بچوں اور پردہ کرنے والی عورتوں کو سوکھے کی بیماری لاحق ہونے کا زیادہ اندیشہ رہتا ہے۔ وٹامن ڈی حاصل کرنے کا سب سے ارزاں طریقہ دھوپ کھانا ہے۔ اس وٹامن کی کمی کو پورا کرنے کے لئے جو دوائیاں تیار کی گئی ہیں وہ بڑی مہنگی ہیں لیکن دھوپ کھانے سے یہ بلا قیمت حاصل کیا جا سکتا ہے۔ حاملہ عورتوں کو ایسی خوراک دی جانی چاہئے جس میں وٹامن ڈی وافر مقدار میں موجود ہو۔ اس وٹامن سے جہاں ماں کی صحت اچھی رہے گی وہاں یہ ہونے والے بچے کی تسلی بخش نشو و نما کا بھی ضامن ہوگا۔

دامودر ویلی اسکیم

دریائے دامودر جو پچھمی بنگال اور بہار کے علاقوں میں بہتا ہے اپنی تباہ کاریوں کے باعث "دریائے الم" کا لقب پا چکا ہے۔ اس کے زبردست سیلاب ہمیشہ اپنے ساتھ مصائب و الم کا پیغام لاتے رہتے ہیں لیکن انسانی دماغ نے اس سرکش دریا کو قابو میں لانے کے لئے جو جد و جہد شروع کر رکھی ہے اس کے پیشِ نظر یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ مستقبل قریب میں یہی دریا متعلقہ علاقے کے لوگوں کی اُمیدوں اور مسرتوں کا مرکز بن جائے گا۔ انسانی ترقی کی خاطر اس دریا سے پورا پورا فائدہ اُٹھانے کے لئے دامودر ویلی کارپوریشن اسکیم کے تحت کئی کثیر المقاصد منصوبوں پر عمل جاری ہے۔ وادیٔ دامودر میں زمین بڑی زرخیز ہے اور اس علاقے میں کوئلہ اور مختلف دھاتیں بکثرت پائی جاتی ہیں۔

دریائے دامودر میں پہلی زبردست طغیانی ۱۷۱۰ء میں آئی تھی اس سے قبل یہ دریا اتنا خطرناک نہیں تھا کیونکہ ہزاری باغ کے پہاڑی علاقے میں اس کا پانی کئی چھوٹی چھوٹی معاون ندیوں میں تقسیم ہو جاتا تھا۔ آہستہ آہستہ یہ معاون ندیاں پانی کے ساتھ بہہ کر آنے والی مٹی و ریت وغیرہ سے اَٹ گئیں اور برسات کے موسم میں اس میں پانی کا زور ہونے کی وجہ سے طغیانی کا خطرہ پیدا ہو گیا۔ ۱۹۱۳ء ۱۹۳۵ء ۱۹۴۱ء اور ۱۹۴۳ء میں اس دریا میں زبردست سیلاب آئے اور ان سے شدید جانی و مالی نقصان ہوا۔

دامودر اور اس کے دو معاون دریا کونار اور باراکار ضلع ہزاری باغ سے نکل کر دریائے گنگا کے ڈیلٹے سے گزرتے ہوئے جنوب میں خلیج بنگال کی طرف بہتے ہیں۔ یہ دونوں معاون دریائے آسنسول سے چند میل کے فاصلے پر دریائے دامودر میں مل جاتے ہیں۔

وادیٔ دامودر میں دھاتوں کی کثرت کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ بھارت میں کوئلہ، خام لوہا ابرق، تانبا، میگنیز، کسائٹ، کرومائٹ، چینی مٹی، ایسٹوس اور چونے کے پتھر کی پیداوار کے جو ذرائع ابھی تک معلوم ہوئے ہیں ان کا قطع الترتیب ۸۰، ۹۴، ۴۰، ۱۰۰، ۱۰، ۱۰۰، ۷۰، ۴۵، ۴۵ اور ۲۰ فی صدی حصہ اس وادی میں پایا جاتا ہے۔ لیکن بجلی کے میسّر نہ آنے اور اس دریا کے تند خُو ہونے کی وجہ سے ابھی تک اس سے صنعتی و زرعی ترقی کے لئے فائدہ نہیں اُٹھایا جا سکا۔

۱۹۴۳ء میں پہلی بار دریائے دامودر سے بجلی پیدا کرنے، آبپاشی کی سہولتیں حاصل کرنے اور تجارتی مقاصد کے لئے اس میں کشتی رانی کے انتظامات بہتر بنانے کی اسکیم پیش کی گئی۔ ماہرین نے اس مقصد کے لئے آٹھ کثیر المقاصد منصوبوں پر عمل کرنے کی سفارش کی اور بھارت سرکار نے ۱۹۴۶ء میں اس اسکیم کو منظور کر لیا۔ حصولِ آزادی کے بعد ۱۹۴۸ء میں دامودر ویلی کارپوریشن کا قیام عمل میں لایا گیا۔ اس کارپوریشن کے اخراجات مرکزی سرکار اور بہار اور پچھمی بنگال کی ریاستی

سرکاروں پر ہیں - کارپوریشن کو دامودر کے معدنی خزائن سے فائدہ اُٹھانے اور زرعی و صنعتی ترقی کی اسکیموں کو عملی جامہ پہنانے سے متعلق وسیع اختیارات دئے گئے ہیں - دریا میں چھوٹے جہازوں کی آمد و رفت کے لئے بہتر سہولتیں مہیا کرنے اور صحت عامہ سے متعلقہ اسکیمیں بھی کارپوریشن کے دائرہ اختیار میں شامل ہیں صرف پالیسی سے متعلقہ اُمور کا فیصلہ بھارت سرکار کرتی ہے - دامودر وادی اسکیم کے لئے اب تک عالمی بنک سے ۳ کروڑ ۸۰ لاکھ ڈالر کا قرضہ حاصل کیا جا چکا ہے -

اسکیم کے پہلے حصے میں پانچ منصوبے شامل کئے گئے ہیں - درگا پور کا بند ان منصوبوں کی آخری کڑی ہے دوسرے منصوبے مائتھون، پنچیت، کونار اور تلایا کے مقامات پر بند باندھنے سے متعلق ہیں - علاوہ ازیں بوکارو میں تھرمل بجلی پیدا کرنے کا اسٹیشن بھی اسکیم کے پہلے حصے میں شامل ہے - درگا پور کے کوئلے کے میدانوں سے ہگلی تک جہازرانی کے مقاصد کے لئے ۸۵ میل لمبی رودبار تیار کی جائے گی - آئر، برمو، بال پہاڑی اور بوکارو کے مقامات پر بند باندھنے کے منصوبوں کو اسکیم کے دوسرے حصے میں عملی جامہ پہنایا جائے گا -

درگا پور کے بند سے جو نہریں نکالی جائیں گی وہ دس لاکھ سے زیادہ ایکڑ رقبہ کو سیراب کر سکیں گی - توقع ہے کہ ان کی امداد سے اناج کی سالانہ پیداوار میں ۳۶۹۲۷۶ ٹن کا اضافہ ہوگا اور اس میں سے چاول کی پیداوار ۳۱۶۰۷۶ ٹن ہوگی - جہاز رانی کی سہولتیں میسر آنے سے ریل گاڑیوں پر بوجھ کم ہو جائے گا - اس بند کی تعمیر کا کام ۱۹۵۲ء میں شروع کیا گیا تھا اور توقع ہے کہ ۱۹۵۵ء میں پایۂ تکمیل کو پہنچ جائے گا - بڑی نہر میں سے ۱۹۵۵ء میں یا اس سے پہلے ہی آبپاشی کے مقاصد کے لئے پانی میسّر آنا شروع ہو جائے گا -

گزشتہ سال اتر پردیش، بہار اور آندھرا کے محنت کشوں کی خاصی تعداد اس بند کو پایۂ تکمیل کو پہنچانے کے لئے مصروفِ عمل رہی - یہ جد و جہد ملک میں غذائی قلت کا خاتمہ کرنے کی جد و جہد کا حصّہ ہے اس منصوبے پر عمل کی رفتار توقعات سے زیادہ تیز رہی ہے اور یہ اس امر میں حصہ لینے والے تمام انجینیروں، ٹیکنیکل ماہرین اور دوسرے کارکنوں کے لئے باعث فخر ہے - اس بند سے نہروں کی کھدائی کے لئے ٹریکٹروں، ڈوزروں اور دوسرے مشینی اوزاروں سے کام لیا گیا ہے - دامودر وادی اسکیم کا یہ پہلا منصوبہ ہے جس کا سارا نقشہ بھارتی ماہرین نے تیار کیا اور اسے عملی جامہ پہنانے کے لئے صرف بھارتی کارکن اور محنت کش مامور کئے گئے ہیں - وہ دن دُور نہیں جب اس منصوبے کی تکمیل کے نتیجے کے طور پر متعلقہ علاقے کے لوگوں کے لئے ضروریات زندگی کی قلت کے مسائل عنقا ہو جائیں گے -

ع.م

نئی کتابیں اور رسالے

احوالِ غالب علی گڑھ کالج میگزین کا غالب نمبر ۱۹۶۹ء میں شائع ہوا تھا۔ مختار الدین آرزو (جو اب ڈاکٹر ہیں) اُس زمانے میں اس میگزین کے ایڈیٹر تھے۔ تجسس و تفحص کے میدان میں آپ کی جانفشانیاں اور سخت کوشیاں اہلِ ادب سے بہت داد لے چکی ہیں۔ غالب کے عقیدت مندوں میں آپ نے اپنی خاص جگہ بنالی ہے۔ اُسی غالب نمبر کو آپ نے دوبارہ مُرتّب کیا ہے اور انجمن ترقی اردو نے حال ہی میں اُسے احوالِ غالب کے نام سے شائع کیا ہے۔

چار مضامین اس کتاب میں بالکل نئے ہیں اور خاص طور پر اسی کتاب کے لئے لکھے گئے ہیں یا لکھوائے گئے ہیں۔ یہ علی الترتیب پروفیسر مسعود حسن رضوی اور اظہار الحق ملک کے مضامین، غالب کے حالات میں پہلا مضمون اور غالب کے خودنوشت حالات ہیں۔ اس کے علاوہ دو مضامین مرتّب کے لکھے ہوئے ہیں۔ "سرِّ غالب در حدیثِ دیگراں" اور "غالب کی تصویریں"۔

دو پُرانے مضامین بھی ایک مولوی عبدالحق کا اور دوسرا خواجہ قمرالدین راقم کا اس کتاب میں شامل ہیں۔ مرتّب کا مضمون غالب کی تصویروں سے متعلق "آج کل" کے غالب نمبر میں شائع ہوچکا ہے۔ لیکن اب اس میں مرتّب نے نہایت ضروری اور دلچسپ اضافہ فرمادیا ہے۔

مضمون نگاروں میں رشید احمد صدیقی۔ مالک رام۔ غلام ربانی تاباں قاضی عبدالودود، پروفیسر حبیب احمد خاں، ڈاکٹر عبدالستار صدیقی کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ غالب کی ایک رنگین تصویر کے علاوہ متعدد تصاویر کتاب میں شامل ہیں۔ کتابت، طباعت اور کاغذ نہایت عمدہ، کتابت مجلّد ہے اور $\frac{۳۲}{۱۶} \times \frac{۲۲}{۱۶}$ کے ۲۹۶ صفحوں پر مشتمل ہے۔ قیمت فی جلد ۹ روپے۔

ملنے کا پتہ۔ انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ

آفتابِ تازہ سکندر علی وجد کا مجموعۂ کلام چتینا پرکاشن لمیٹڈ بیگم بازار حیدرآباد دکن نے شائع کیا ہے، قیمت چار روپے فی جلد۔ کتابت، طباعت، کاغذ عمدہ، کتاب مجلّد ہے۔ اور جلد پوش سے مزیّن۔ $\frac{۳۲}{۱۶} \times \frac{۲۲}{۱۶}$ کے ۱۴۸ صفحوں پر مشتمل ہے۔ سکندر علی وجد خاکِ دکن کے ایک مقبول و محبوب شاعر ہیں۔ اجنتا اور ایلورا پر آپ کی معرکۃ الآرا نظمیں اہلِ سخن سے داد لے چکی ہیں۔ آپ کے کلام میں جذب و اثر ہے۔ شدّتِ جذبات ہے۔ اس کے باوجود روانی و تسلسل میں فرق نہیں آتا۔ نظمیں بالعموم دلپسند و دلفریب ہیں۔ غزلوں میں البتّہ وہ کمالِ سخن وری نہیں جو نظموں کا حصّہ ہے۔ ہمارے خیال میں وجد کی اُفتادِ طبیعت اُسے غزل پر مجبور تو کرتی ہے لیکن وہ خود نظم کے لئے زیادہ موزوں ہیں — ہندوستانی مزاج کے مطابق تشبیہوں اور استعاروں کا استعمال وجد کے کلام میں کافی ملتا ہے۔ رقاصہ کی تعریف میں لکھتے ہیں

جمالِ اجنتا، جلالِ ہمالہ

ایک شعر اسی نظم میں اور ہے۔

چھڑا راگ دھارے نے حُسن و فن کے چلی ناؤ سنگم پہ گنگ و جمن کے

نظم 'ایلورا' میں ایک شعر ہے ؎

یہاں جو سیر کو فکر رسا نکلتی ہے　　وفورِ شوق میں پربت کی سانس چلتی ہے

محسنینِ ناشناس، نظیر اکبرآبادی۔ آفتابِ تازہ، ایلورا، تاج محل اس مجموعے کی بہت اچھی نظمیں ہیں۔ تحسینِ ناشناس کے چند شعر سنیئے۔

ناداں مجھے در کار نہیں داد کا مدّعی　　کیا شعر مرا کاسۂ دریوزہ گری ہے

کیا تجھ کو دکھاؤں دُرِ شہوارِ معانی　　نایاب جہاں میں ہُنرِ دیدہ وری ہے

بے سُود ہے تیرا گلۂ تلخ کلامی　　خنظل سے سوا تلخ ہے جو بات کھری ہے

یہ نکتہ حقیقت ہے کہ ہر شعر و لآویز　　معراجِ کمالاتِ خیالِ بشری ہے

میرے لئے طاعت ہے مری شعلہ نوائی　　تیرے لئے اک مشغلۂ خوش بسری ہے

میں گرمیِ محفل کے لئے دے نہیں سکتا　　اشعار میں جو سوزِ دعائے سحری ہے

یہ نظم واقعی قابلِ داد ہے۔ آخری شعر میں تو شاعر کی خودی یا خودداری اپنے معراج پر ہے۔ غزلوں کے چند شعر بھی ملاحظہ فرمایئے۔

ہمعنیرو کہاں کی آزادی　　دام سے تا قفس رہائی ہے

نکھر جائے گا کل تک حُسنِ گیتی　　ذرا چہرے پہ گردِ غم جمی ہے

شوق کی نکتہ دانیاں نہ گئیں　　رات بیتی کہانیاں نہ گئیں

انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ نے وجد کے نام سے **وجد** سکندر علی وجد کے کلام کا ایک انتخاب شائع کیا ہے۔ ٹائپ میں چھپا ہے۔ کاغذ نہایت اچھا ہے۔ قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے

کیفِ الم بسمل سعیدی ڈونگی کا دوسرا مجموعۂ کلام۔ ضخامت ۲۵۶ صفحے۔ کتابت و طباعت اچھی۔ قیمت چار روپے آٹھ آنے۔ کتاب مجلّد بھی ہے اور جلد پوش کی حامل بھی۔ اس سے قبل ہم 'آج کل' کی ایک اشاعت میں بسمل صاحب کی کتاب "نشاطِ غم" پر مختصر تبصرہ کر چکے ہیں۔ یہ کتاب اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے بسمل کی غزل گوئی واردات کی مرہونِ منّت ہے۔ آپ دل کی دھڑکن کو الفاظ کے سپرد کرتے ہیں، اور آپ بیتی کے سوا کچھ نہیں کہتے۔ غزلوں کے چند منتخب اشعار ذیل میں پیش کئے جاتے ہیں۔

مشکل تو عشق میری وفا سے بھی تھا مگر　　تیری وفا نے اور بھی مشکل بنا دیا

عشق میں عالمِ وصال تو کیا　　ہجر بھی بیشتر نہیں ہوتا

جو ہوئی تھیں وجہِ ترکِ رسم و راہ　　اُن جفاؤں کو بھی اب روتے ہیں ہم

تمہاری بزم کی یہ دو ستاریاں ہے　　کسی سے جیسے کسی کو کچھ احتراز نہیں

کم از کم اس قدر تو آدمی ہشیار ہو جائے　　کہ جب نیا نہ آئے راس تو دیدار ہو جائے

اپنے لئے رہا نہ مجھے کوئی اعتبار　　اتنا یقین اپنا دلائے ہوئے ہو تم

اس مجموعے میں نظمیں بھی ہیں اور رباعیاں بھی، لیکن اصل رنگ بسمل کا غزل ہی میں نظر آتا ہے۔ کتاب منشی گلاب سنگھ اینڈ سنز دریا گنج دہلی سے مل سکتی ہے۔

شکستِ زنداں ایشیائی ممالک کی آزادی کی جدوجہد سے متعلق مختلف شعراء کی نظموں کا یہ مجموعہ انڈین لٹریچر سوسائٹی جامعہ نگر دہلی نے شائع کیا ہے۔ قیمت فی جلد تین روپے۔ مرتب، غلام ربّانی تاباں۔ کاغذ، کتابت اور طباعت نہایت عمدہ۔ جلد اور جلد پوش خوب و خوب تر۔ ہندوستان و پاکستان کے بیس مشہور شعراء کی نظمیں اس مجموعے میں شامل ہیں۔ جوش، فیض، فراق، سردار جعفری، وجد، ساحر لدھیانوی کے نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ اپنی قسم کا یہ پہلا مجموعہ اپنی نوعیت کے لحاظ سے اُردو ادب میں ایک خاص اہمیت رکھتا ہے۔

آہٹیں نریش کمار شاد جواں عمری میں ہی شعر کہنے اور انہیں شائع کرنے کے سلسلے میں اپنے پیش رؤں سے بھی بہت آگے نکل رہا ہے۔ یہ کتاب اُس کا پانچواں مجموعۂ کلام ہے۔ قیمت سوا دو روپے۔ ناشر، رسالہ بیسویں صدی دہلی۔ ابتدائیہ جوش ملیح آبادی نے لکھا ہے، اور تعارف فکر تونسوی نے۔ نظمیں اور غزلیں دونوں اس مجموعے میں شامل ہیں۔ نمونۂ کلام ملاحظہ ہو۔

یوں آئے وہ رات ڈھلے　　جیسے جل میں جوت جلے

من میں نہیں یہ آس تری چنگاری ہے راکھ تلے

خود شاد نے اپنی شاعری پر اپنے ایک شعر میں تبصرہ کیا ہے۔

شاد ہمارے شعروں کے ان رنگا رنگ اشاروں میں
اپنے گھر کی، دنیا بھر کی، قلب و نظر کی باتیں ہیں

اُمید ہے یہ مجموعہ بھی سابق مجموعوں کی طرح مقبول ہوگا۔

بادۂ مخمور مخمور دہلوی کے کلام کا مجموعہ۔ ناشر، کتب خانہ رحیمیہ اُردو بازار دہلی۔ ضخامت ۲۲۴ صفحے $\frac{۳۰×۲۰}{۱۶}$ کاغذ، کتابت، طباعت، عمدہ۔ کتاب جلد اور جلد پوش کی حامل ہے۔ قیمت تین روپے فی جلد۔ مخمور دہلوی دہلی کے ممتاز شاعر اور بیخود دہلوی کے ارشد تلامذہ میں سے ہیں۔ ان کی طبیعت غزل اور وہ بھی حزنیہ غزل کے لئے خاص طور پر موزوں ہے۔ چند شعر ملاحظہ فرمائیے۔

پھول بن کر جب گلستاں میں کلی مرجھائی — بات جو میں نے بھلا دی تھی مجھے یاد آگئی
اب ہمارے بعد اک دنیا اُسے دہرائیگی — کہتے کہتے اپنا افسانہ ہمیں نیند آگئی
کم نگاہی کا گلہ رہ جائے گا — زخم دل تو مندمل ہو جائیں گے
مرے ٹوٹے ہوئے پائے طلب کا مجھ پہ احساں ہے — تمہارے در سے اُٹھ کر اب کہیں جایا نہیں جاتا

یہ شعر اپنے رنگ کا لاجواب شعر ہے۔

طواف کعبۂ دل اس قدر آساں نہیں ہرگز — ذرا ثابت قدم رہنا صنم خانے بھی آئیں گے

کتاب کے آخر میں چند قطعات اور سلام بھی ہیں۔

مرقع افکار طالب کاشمیری کشمیر جنت نظیر کے پرانے اور مشاق شاعر ہیں۔ آپ کی نظموں کا یہ مجموعہ نظامی بک ایجنسی بدایوں نے شائع کیا ہے۔ قیمت دو روپے۔ نظموں کے موضوعات سے مصنف کی تنوع پسندی ظاہر ہے۔ نور جہاں، مرزا غالب، ظہور کرشن اور کشمیر سے متعلق متعدد نظمیں دلپسند و دلپذیر ہیں۔

رقص بسمل ۲/۱۲
دودھ اور خون ۳/-

یہ دونوں کتابیں صدیقہ بیگم سیوہاروی کی افسانوی تخلیقات کے مجموعے ہیں۔ جنھیں آزاد کتاب گھر دہلی نے شائع کیا ہے۔ صدیقہ بیگم ملک کی مشہور افسانہ نگار ہیں۔ انداز بیان اور انسانی نفسیات کی ترجمانی کے لحاظ سے آپ کے افسانے اچھی خاصی شہرت پا چکے ہیں۔ موضوع کے لحاظ سے صدیقہ کے افسانوں میں تنوع موجود ہے۔ جذباتیت میں گو توازن نہیں، پھر بھی جہاں وہ مظلوم و محکوم کی وکالت کرتی ہے، قاری کی ہمدردی اس کے ساتھ ہوتی ہے۔ کتابیں حسن ظاہر کی دولت سے بھی مالا مال ہیں۔

فطری علاج مصنف حسن الدین احمد۔ کتاب مصنف سے عزیز باغ سلطان پورہ حیدرآباد دکن کے پتے سے مل سکتی ہے۔ قیمت دو روپے آٹھ آنے۔ ضخامت ۱۲۲ صفحے۔ کتاب فطری علاج کے فلسفے کی علمی انداز میں وضاحت۔ اس علم کے ابتدائی اور بنیادی اصول پر بحث اور علاج کے فطری طریقوں کی صراحت پر مشتمل ہے۔ فطری علاج کے بڑے بڑے ماہروں کی دس تصاویر بھی کتاب میں شامل ہیں۔

افریقہ کا آدمی (ہندی) ست پرکاش سنگر۔ بڑے مقبول و معروف افسانہ نگار ہیں۔ ہندی افسانوں کا یہ مجموعہ ساتھی پریس لکھنؤ سے چھپا ہے۔ قیمت دو روپے آٹھ آنے۔ آپ کی تخلیقات کی جنیدر کمار، یش پال اپندر ناتھ اشک ایسے فن کاروں نے تعریف کی ہے۔ اُمید ہے کہ یہ مجموعہ بھی سابق مجموعوں کی طرح مقبول ہوگا۔ ملنے کا پتہ: پیکو کاریالہ لکھنؤ۔

تنقیدی آئینے پروفیسر مبشر علی صدیقی کے تحقیقی و تنقیدی مضامین کا یہ مجموعہ حال ہی میں چھپا ہے۔ پبلشر سلیم مبشر علی محلہ سوتھ بدایوں (یو۔پی) قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے۔ پروفیسر صدیقی بڑے مشاق مضمون نگاروں میں سے ہیں۔ زیر تبصرہ کتاب کے اکثر مضامین مختلف زبانوں اور جریدوں میں شائع ہو چکے ہیں۔ مقام مسرت ہے کہ وہ ایک جا اس صورت میں شائع ہو گئے ہیں۔

اسلام اور جنسیات ناشر، پاک لٹریچر کمپنی پوسٹ بکس نمبر ۱۶۲ کراچی ۱ مؤلف پدنکیب

ضخامت ۳۰۶۲۰ کے ۳۶۸ صفحات۔ کتابت طباعت عمدہ۔ کتاب مجلّد ہے اور جلد پوش کی حامل۔ موضوع کے پیشِ نظر کتاب نہایت سنجیدگی سے مرتّب کی گئی ہے۔ جنس اور زندگی، جنس اور مذہب۔ جنس اور تمدّن جنس اور اسلام، وحدتِ ازدواج، طلاق و خلع اور دیگر موضوعات پر دلچسپ اور مفید مواد جمع کیا گیا ہے۔ قیمت فی جلد پانچ روپے

رسالے

فن کار یہ دو ماہی رسالہ پرکاش پنڈت کی ادارت میں دہلی سے شائع ہونا شروع ہوا ہے۔ ملنے کا پتہ۔ حالی پبلشنگ ہاؤس اردو بازار دہلی۔ قیمت فی جلد دو روپے سالانہ دس روپے رجسٹری سے بارہ روپے

ہر صنفِ ادب کے اچھے لکھنے والوں کی تخلیقات اس رسالے میں شامل ہیں۔ افسانہ، خاکہ اور طنز کا حصّہ خاصہ دلچسپ۔ اس حصّے کے لکھنے والوں میں کرشن چندر، اے حمید، ابریم جلیس، مہندر ناتھ، فکر تونسوی، عزیز اثری، ہاجرہ مسرور، سبھی ہمارے جانے پہچانے ادیب اور افسانہ نگار ہیں۔ ڈرامہ فلم، تھیٹر، غزل، نظم، مقالہ، الگ الگ عنوانات کے تحت اچھا اور معیاری ادب پیش کیا گیا ہے۔ راجندر سنگھ بیدی جو کچھ مدّت سے خاموش تھے ایک تازہ افسانہ لئے پھر زینتِ محفل ہو رہے ہیں۔ ہندوستان میں اُردو کے اچھے رسالوں کی کمی ہے۔ یہ رسالہ اس کمی کو ایک حد تک پوری کرے گا۔ ہمیں اُمید ہے کہ فن کار اسی حُسنِ ظاہر و باطن کا حامل رہے گا، جو اس کے پہلے شمارے میں موجود ہے۔ ایسے رسالے کو زندہ رکھنا اہلِ ذوق کا فرض ہے۔

نوائے ادب انجمنِ اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ بمبئی۔۱ کا یہ سہ ماہی رسالہ اپنے مخصوص مقاصد کے تحت اردو ادب کی گراں قدر خدمات ادا کر رہا ہے۔ چندہ سالانہ تین روپے ہے، جو رسالے کی افادیت اور حُسنِ ظاہر کے لحاظ سے کم ہے۔ جولائی ۱۹۵۳ء کے شمارے میں پروفیسر سید نجیب اشرف ندوی کے شذرات ڈاکٹر عبدالعلیم نامی کا مضمون، آغا حشر اور اُن کے معاصرین اور چند دوسرے مضامین قابلِ مطالعہ ہیں۔ اس رسالے کا مخصوص مضمون "متفرقات" اس شمارے میں نہیں۔ ہم ادارے سے درخواست کریں گے کہ وہ اس اہم ادبی خدمت کو جاری رکھیں۔ افسوس کہ پروفیسر محمد ابراہیم ڈار۔ جو اس رسالے کی روحِ رواں تھے انتقال فرما گئے۔ عربی کے استاد اور اُردو کے محقّق و ادیب کی حیثیت سے موصوف کا رتبہ بہت بلند تھا۔ اِس نقصانِ عظیم پر ہمیں ادارۂ "نوائے ادب" سے بہت ہمدردی ہے۔

سب رس ادارۂ ادبیاتِ اُردو حیدرآباد دکن کا یہ رسالہ ایک مدّت سے اردو ادب کی خدمت کر رہا ہے۔ ڈاکٹر سیّد محی الدین قادری زور جو حیدرآباد میں اُردو کے ایک ستون ہیں، اس کے نگراں ہیں۔ "دکن میں اُردو" کے مصنّف نصیرالدین ہاشمی بھی ادارے میں شامل ہیں۔ سالانہ چندہ چھ روپے ہے۔

گورنمنٹ انٹرمیڈیٹ کالج میگزین جھانسی اس میگزین کا آزادی نمبر ۲۶۔ جنوری ۱۹۵۳ء کے موقعے پر شائع ہوا تھا۔ ہندی۔ انگریزی۔ اُردو تینوں زبانوں کے لئے صفحات وقف کئے گئے ہیں۔ میگزین مجموعی حیثیت سے کالج کے خوش مذاق پرنسپل کیلاش ناتھ کاٹجو کی مساعیٔ جمیلہ سے اچھا خاصہ ادبی اور تعلیمی مجلّہ بن گیا ہے۔ حصّۂ اُردو گو مختصر ہے۔ مگر پروفیسر مبشر علی صدیقی کے طفیل اس میں بھی ادبیت کے اچھے آثار ملتے ہیں۔

صبحِ نو - آزادی نمبر صوبہ بہار کے ایک گوشے سے "صبحِ نو" مستقل شائع ہو رہا ہے یہ اردو اور اس رسالے کی مقبولیت کا ثبوت ہے۔ دفاعِ ملک پر اس کی یہ کوشش لائقِ داد و تحسین ہے۔ ادارے میں کلام حیدری، قاسم شبّیر نقوی، وامق دیوروی بھی شامل ہیں۔ آپ سب جانے پہچانے ادیب اور شاعر ہیں۔ زیرِ تبصرہ نمبر بڑے سلیقے سے مرتّب کیا گیا ہے۔ سالانہ چندہ پانچ روپے ملنے کا پتہ۔ منیجر رسالہ "صبحِ نو" پورنیہ سٹی۔ بہار

رفتارِ زمانہ

پارلیمنٹ میں پردھان منتری کی تقریر

بھارت پارلیمنٹ میں خارجی معاملات پر بحث کا آغاز کرتے ہوئے پردھان منتری شری جواہر لال نہرو نے کہا کہ میں نے وزیراعظم پاکستان مسٹر محمد علی پر گفتگو کے دوران میں یہ بات صاف طور پر واضح کردی تھی کہ ہم کشمیر کے مسئلے کو حل کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں اسے بڑی طاقتوں کے پالیٹکس سے دور رکھنا چاہیئے۔ شری نہرو نے اس امر کا ایک بار پھر اعادہ کیا کہ اپنے مستقبل کا فیصلہ کشمیر کے لوگ خود کریں گے۔ لیکن یہ فیصلہ مناسب فضا اور اچھے ڈھنگ سے ہونا چاہیئے۔

شیخ عبداللہ کا ذکر کرتے ہوئے پردھان منتری نے کہا کہ اصلیت تو یہ ہے کہ شیخ عبداللہ کو اپنی حکومت میں اکثریت کی تائید حاصل نہ تھی اور اس طرح وہ خود اپنی پارٹی میں اقلیت میں تھے۔ جس کی بنا پر ایک عجیب پیچیدگی پیدا ہوگئی تھی، اور ان پیچیدگیوں کے نتیجے کے طور پر ریاست کے نظم و نسق میں موجودہ تبدیلیاں آئیں۔ چین کے مسئلے کا ذکر کرتے ہوئے آپ نے کہا کہ اقوام متحدہ کی اسمبلی میں چین کی نمائندگی بہت عجیب و غریب ہے۔ کیا فارموسا کی حکومت اس قسم کا کوئی دعوہ کرسکتی ہے کہ وہ جو فیصلہ کرے گی اس پر چین میں عمل درآمد کرائے گی۔ اگر ایسا نہیں ہے تو یہ کہنا فضول ہے کہ اقوام متحدہ میں حکومت فارموسا کی نمائندگی چین کی نمائندگی ہے۔ بیرونی مقبوضات کا ذکر کرتے ہوئے شری نہرو نے کہا کہ جنگ کی صورت میں اگر بھارت میں بیرونی مقبوضات کو فوجی اڈا بنانے کی کوشش کی گئی تو بھارت سرکار اس کو روکنے کے لئے اقدام کرے گی۔

کشمیر نیشنل کانفرنس کے فیصلے

ریاست جموں اور کشمیر کی سب سے بڑی سیاسی جماعت نیشنل کانفرنس نے ریاست کے نئے وزیراعظم بخشی غلام محمد پر پورے اعتماد کا ریزولیوشن پاس کردیا۔ تمام ممبروں نے متفقہ طور پر اس قرارداد کی تائید کرتے ہوئے بخشی غلام محمد زندہ باد کے نعرے لگائے۔ ایک دوسرے ریزولیوشن میں کہا گیا ہے کہ بھارت اور کشمیر کے موجودہ تعلقات برقرار رہیں گے۔ اور کشمیر کو کسی حالت میں بین الاقوامی سازشوں کا اڈا نہیں بننے دیا جائے گا۔ اس موقع پر ریاست جموں اور کشمیر کے تمام علاقوں کے چار ہزار ڈیلیگیٹ موجود تھے۔

وراثت بل کی منظوری کا مقصد

بھارت پارلیمنٹ نے اپنے تازہ اجلاس میں طویل بحث کے بعد وراثت بل منظور کرلیا ہے۔ وزیر مالیات شری دیش مکھ نے بل کا مقصد بیان کرتے ہوئے کہا کہ اس بل کی غرض و غایت دولت کی تقسیم میں غیر مساوات کو ایک حد تک کم کرنا اور ترقی کی اسکیموں کے لئے فنڈ فراہم کرنا ہے۔

جرمنی کی حیرت انگیز ایجاد

برلن کی ایک فرم نے ایک ایسا مصنوعی دل تیار کرلیا ہے جو انسانی دل کی طرح دھڑکتا ہے۔ اس دل کا حجم

عام انسانی دل سے پانچسو گنا ہے اور بجلی کے ذریعے سے اُس کے تمام خانے کھلتے اور بند ہوتے ہیں۔ اس مصنوعی دل کو جلد ہی دنیا کے بڑے بڑے مقامات پر نمائش کے لئے پیش کیا جائے گا۔ کہا جاتا ہے کہ قلبی امراض کا شکار ہونے والوں اور کمزور طبیعت والوں کے سینے میں فٹ کردئے جانے کے بعد یہ دل عام انسانی دلوں کی طرح کام کرے گا۔

بھارت کو بین الاقوامی اعزاز

بھارت کو آزاد ہوئے ابھی چھ سال ہی ہوئے ہیں لیکن اس قلیل مدت میں ہی اپنی صحت مند خارجی پالیسی کی بدولت اس کے وقار میں اس قدر اضافہ ہوا ہے کہ آج اس کا شمار دنیا کے چند بڑے ممالک میں ہوتا ہے۔ اور اپنی امن پسندانہ روش کے باعث اس کا نام بین الاقوامی طور پر نہایت عزت سے لیا جاتا ہے۔ اس امر کا تازہ ثبوت بھارت کی نمائندہ شریمتی وجے لکشمی پنڈت کا متحدہ اقوام کی اسمبلی کا پردھان منتخب ہونے سے ملا ہے۔ اور پھر لطف یہ کہ امریکہ روس برطانیہ۔ اسرائیل موافق اور مخالف طاقتوں نے بیک زبان ہندوستان کے حق میں آواز بلند کی ہے۔ شریمتی وجے لکشمی کی اس عزت افزائی سے بلاشبہ یہ بات ثابت ہوگئی ہے کہ دنیا کی تمام بڑی طاقتیں بھارت کی امن پسندانہ سرگرمیوں کے باعث اس کو قدر کی نگاہ سے دیکھتی ہیں اور وہ محسوس کرتی ہیں کہ کشمکش اور جدوجہد کے اس یُگ میں بھارت کی رہنمائی ہی اُن کے لئے مشعلِ راہ ثابت ہوگی۔

بھارت میں فولادسازی کا نیا کارخانہ

بھارت سرکار دیش میں فولاد کی پیداوار بڑھانے کے لئے پوری کوشش کررہی ہے۔ حال ہی میں اُس نے ایک جرمن کمپنی کرپس اینڈ ڈلماگ سے ہندوستان میں فولاد کا ایک نیا پلانٹ لگانے کا معاہدہ کیا ہے۔ اس پلانٹ کے مکمل ہوجانے پر ہندوستان میں فولاد کی پیداوار میں کئی لاکھ ٹن کا اضافہ ہوجائے گا۔

عراق کی وزارت

عراق کے نئے نوجوان وزیراعظم ڈاکٹر جمالی نے عراق میں نئی وزارت کی تشکیل مکمل کرلی ہے اور انھوں نے اپنی کیبنٹ کے ممبروں کے نام شاہ عراق کے سامنے پیش کردئے ہیں۔ ڈاکٹر جمالی کی وزارت گیارہ وزراء پر مشتمل ہے جو سب کے سب نوجوان ہیں۔ ان میں سات وزیر تو ایسے ہیں جنھیں قبل ازیں کسی وزارت میں شامل ہونے کا موقع نہیں ملا۔

مس فاطمہ جناح کے نام ایک لڑکی کا خط

کراچی کی ایک مہاجر لڑکی نے مس فاطمہ جناح کو ایک کھلی چٹھی میں درخواست کی ہے کہ وہ پاکستانی عوام کو اپنے پڑوسی ملک کے خلاف جہاد کی تلقین کرنے سے باز آجائیں۔ اس لڑکی نے اپنے مراسلے میں اس امر پر زور دیا ہے کسی شخص کو اس بات کی اجازت نہیں دی جاسکتی کہ وہ ہندوستان اور پاکستان جیسے ممالک میں جن کا ایک دوسرے سے گہرا تعلق ہے جنگ کرنے کا پرچار کرے۔

متحدہ اقوام کی اسمبلی میں روسی نمائندے کے مطالبات

متحدہ اقوام کی اسمبلی میں تقریر کرتے ہوئے روس کے نمائندے مسٹر وشنسکی نے مطالبہ کیا کہ سیکیورٹی کونسل پر ماسکو اور ہائیڈروجن بم پر پابندی لگانے کے لئے جلد ہی قدم اُٹھائے اور بڑے ملکوں کو دوسرے ممالک میں فوجی اڈے توڑ دینے کی ہدایت دے۔ آپ نے یہ بھی تجویز کی کہ پانچ بڑے دیش ایک سال کے اندر اپنی افواج کا ایک تہائی حصّہ کم کردیں اور نفرت کا پروپیگنڈا بند کیا جائے۔



بچوں کا آج کل



فیض لودھیانوی

طالب علم کی دُعا

میرے کریم! جُھک کے بڑی عاجزی کے ساتھ
تیرے کرم کے سامنے پھیلا رہا ہوں ہاتھ

ناکامیوں کا غم نہ سہے میری زندگی
ہر طرح کامیاب رہے میری زندگی

وہ شوق دے کہ قوم کے کچھ کام آسکوں
ہر دل عزیز بن کے بڑا نام پا سکوں

پڑھ لوں جو علم اس پہ عمل بھی ہو اے خُدا
ہر وقت تیری یاد رہے دل کی رہنما

آمادہ ہو کبھی نہ طبیعت گُناہ پر
سیدھا چلوں ہمیشہ ہدایت کی راہ پر

دُنیا میں بے کسوں کی محبّت کا دم بھروں
ہمدرد بن کے اُن کی مصیبت کو کم کروں

توفیق دے کہ خلق کی خدمت کروں سدا
مردانہ وار حق کی حمایت کروں سدا

پروردگار! جوش میں لا اپنی رحمتیں
کر دے جہاں سے دُور غریبی کی لعنتیں

دولت نصیب ہو مجھے عزّت نصیب ہو
با روزگار بن کے فراغت نصیب ہو

میرا وطن چمن کی طرح شادماں رہے
تا حشر اس میں عدل کا سکّہ رواں رہے

پہنچاؤں فیض اپنے پرائے کو عمر بھر
یارب یہ مختصر سی دُعا ہے قبول کر

سعیدہ نکہت

خود غرض دیو

بچو! کسی زمانے میں ایک دیو رہا کرتا تھا۔ اس کا مکان بڑا عالیشان اور باغ بے حد حسین تھا۔ یہاں طرح طرح کے خوبصورت پھول کھلتے تھے اور میٹھے رس بھرے پھلوں کے درخت تھے۔ جن پر چڑیاں گیت گایا کرتی تھیں۔ لڑکے اسکول سے لوٹتے ہوئے اس باغ میں کھیلنے کے لئے رُک جاتے۔ دیو بہت دنوں سے غائب تھا اور بچے آزادی کے ساتھ وہاں کھیل سکتے تھے۔ وہ کہتے۔ "ہم سب یہاں کتنے خوش ہیں"!



لیکن خوشی کا یہ زمانہ جلد ہی ختم ہو گیا۔ دیو جو اپنے کسی دوست کے یہاں گیا ہوا تھا۔ ایک روز اپنے گھر واپس آ گیا۔ بچے اس وقت پھول توڑ رہے تھے، چڑیوں کے میٹھے گیت سُن رہے تھے اور ہنس رہے تھے۔ دیو نے اُنہیں غصّے کی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "باہر نکل جاؤ۔ خبردار جو آئندہ کبھی یہاں قدم رکھا"۔ بچے ڈر سے سہم کر باہر نکل گئے۔

دیو نے باغ کے چاروں طرف اُونچی دیواریں کھڑی کر دیں تاکہ بچے اندر نہ آ سکیں۔ اُس نے دروازے پر ایک تختی لگا دی جس پر یہ الفاظ لکھے ہوئے تھے۔

"اندر آنے والوں کو سخت سزا دی جائے گی"

وہ بہت ہی خود غرض تھا۔

اب بچوں کے کھیلنے کی کوئی جگہ نہیں تھی۔ اُنہوں نے سڑک پر کھیلنے کی کوشش کی لیکن سڑک پر گرد اور بے شمار کنکر اور پتّھر تھے۔ اس لئے وہ یہاں کھیل نہیں سکتے تھے۔

اسکول سے لَوٹ کر وہ اونچی دیواروں کے گرد گھومتے رہتے اور ایک دوسرے سے کہتے

"باغ میں ہم لوگ کتنے مزے سے کھیلا کرتے تھے"!

جب بہار آئی تو ہر طرف رنگ برنگ کے پھول کھل اُٹھے اور پرندوں کے نغموں سے فضا گونجنے لگی۔ لیکن دیو کے باغ میں ابھی تک جاڑا تھا۔ یہاں نہ پھول کھلے تھے اور نہ چڑیاں اپنے دلکش گیت سُناتی تھیں کیونکہ یہاں بچے نہیں تھے۔

ایک بار ایک خوبصورت پھول نے گھاس کے درمیان سے اپنا سر اُٹھایا ہی تھا کہ اُس کی نظر اس تختی پر جا پڑی جس پر لکھا ہوا تھا۔

"اندر آنے والوں کو سخت سزا دی جائے گی"۔

اور اس کو بچوں پر اتنا رحم آیا کہ وہ پھر زمین کے اندر چلا گیا اور خاموشی کے ساتھ سو گیا۔ گھاس اور درختوں پر برف نے اپنی سفید چادر ڈال دی تھی۔

بہار کے آنے میں اتنی دیر کیوں ہو رہی ہے؟ خود غرض دیو دریچے کے پاس بیٹھا ہوا برف سے ڈھکے ہوئے سفید باغ کو دیکھ کر اپنے دل سے سوال کرتا۔ وہ پھر سوچتا۔ موسم جلد ہی بدلے گا اور بہار آئے گی۔

لیکن اُس کے باغ میں بہار کبھی نہیں آئی ہر جگہ بہار آتی تھی۔ پھول کھلتے تھے اور درختوں پر خوشنما چڑیاں گایا کرتی تھیں لیکن دیو کے باغ میں برف اور سرد ہوا کے علاوہ کچھ نہ تھا۔

ایک صبح جب دیو اپنے بستر پر لیٹا ہوا تھا۔ اس نے بے حد دلکش گیت کی آواز سُنی اس نے سوچا کہ یہ ضرور شاہی موسیقار ہوگا جو گاتا ہوا گزر رہا ہے لیکن حقیقت میں یہ ایک بلبل تھی جو دریچے کے باہر گا رہی تھی۔ دیو کو بلبل کا گیت سُنے اتنے دن ہو گئے تھے کہ اس وقت یہ گیت اس کو دُنیا کا سب سے میٹھا گیت معلوم ہو رہا تھا۔ سرد اور برفیلی ہوا کا زور یکایک ختم ہو گیا تھا پھولوں کی خوشبو سے لدی ہوئی ہوا کا ایک جھونکا آیا۔ اور اُس نے سوچا کہ اب بہار کا موسم آ گیا ہے۔ اس نے باہر جھانک کر دیکھا تو عجیب منظر تھا۔

دیوار کے ایک شگاف کے ذریعے بہت سے بچے اندر گھس آئے تھے اور درخت کی ٹہنیوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ ہر درخت پر ایک نہ ایک بچہ



موجود تھا۔ درخت بچوں کو پا کر نئے سرے سے جی اُٹھے تھے اور خوشی سے جھوم رہے تھے۔ چڑیاں اِدھر اُدھر اڑ رہی تھیں اور خوشی کے گیت گا رہی تھیں۔ رنگ برنگ کے پھول گھاس کے درمیان اپنا سر اُٹھائے ہنس رہے تھے۔ لیکن باغ کے ایک

کونے میں ابھی تک بہار نہیں آئی تھی - وہاں ایک چھوٹا بچہ کھڑا ہوا درخت پر چڑھنا چاہتا تھا - وہ اتنا چھوٹا تھا کہ درخت پر چڑھ نہ سکتا تھا - وہ اس کے گرد گھوم رہا تھا اور پھوٹ پھوٹ کر رو رہا تھا - بیچارہ درخت ابھی تک برف سے ڈھکا ہوا تھا اور سرد برفیلی ہوا اس کے اوپر سائیں سائیں کر رہی تھی - "چڑھ جاؤ میرے بچے!" درخت نے اپنی شاخوں کو جھکاتے ہوئے کہا - لیکن بچے کا قد بہت چھوٹا تھا - اور وہ اب بھی درخت پر نہیں چڑھ سکتا تھا -

دیو کا دل یہ دیکھ کر پگھل اٹھا - "اب میری سمجھ میں آیا کہ بہار میرے باغ میں کیوں نہیں آتی تھی" اس نے سوچا - "میں آج ہی دیواروں کو ڈھا دوں گا اور بچوں کو یہاں کھیلنے کی پوری آزادی ہوگی - میں کتنا خود غرض ہو گیا تھا" وہ جلدی جلدی دوڑتا ہوا باغ میں پہنچ گیا لیکن بچوں نے جیسے ہی اس کو دیکھا، وہ ڈر سے بھاگ گئے - ان کے جاتے ہی بہار بھی رخصت ہو گئی - سارا باغ پہلے کی طرح اجاڑ اجاڑ اور برف سے ڈھکا ہوا نظر آنے لگا - صرف چھوٹا بچہ وہاں سے نہیں بھاگ سکا تھا کیونکہ اس کی آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے اور اس نے دیو کو آتے ہوئے نہیں دیکھا تھا - دیو نے چپکے سے جا کر اس کو اپنے ہاتھوں میں اٹھا لیا اور درخت پر بٹھا دیا - درخت فوراً سرسبز ہو گیا اور چڑیاں اس پر بیٹھ کر گانے لگیں - بچے نے اپنی بانہیں دیو کی گردن میں ڈال دیں اور اس کے منہ کو چوم لیا - دوسرے بچوں نے جب دیکھا کہ دیو اب خود غرض نہیں رہا تو وہ باغ میں واپس چلے آئے اور ان کے ساتھ بہار بھی آ گئی -

"بچو! آج سے یہ باغ تمہارا ہے" - اس نے یہ کہتے ہوئے ایک بڑی سی کلہاڑی اٹھائی اور دیواروں کو توڑ ڈالا -

بچے سارا دن باغ میں کھیلتے رہے - شام کو جب وہ رخصت ہونے کے لئے دیو کے پاس آئے تو اس نے پوچھا -

"تمہارا ننھا ساتھی کہاں ہے جس کو میں نے درخت پر بٹھایا تھا"؟ "ہمیں نہیں معلوم" - بچوں



نے جواب دیا - وہ یہاں سے چلا گیا ہے"

"کل اپنے ساتھ اس کو ضرور لانا" - دیو نے بچوں سے کہا - لیکن بچوں کو نہیں معلوم تھا کہ وہ کہاں رہتا ہے - انہوں نے اس کو پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا - دیو بہت غمگین ہو گیا - اس کو اس بچے سے بہت محبت ہو گئی تھی -

ہر روز شام کو بچے کھیلنے کے لئے باغ میں جمع ہوتے لیکن وہ بچہ پھر کبھی نہیں آیا۔ دیو تمام بچوں سے بہت محبت اور مہربانی سے پیش آتا لیکن اپنے پیارے بچے کو اپنے پاس نہ پا کر وہ بے حد غمگین ہو جاتا۔

دن گزرتے گئے اور اب دیو بے حد ضعیف اور ناتواں ہو گیا تھا۔ اب وہ خود لڑکوں کے ساتھ کھیل نہیں سکتا تھا۔ اس لئے آرام کرسی پر بیٹھ کر وہ انہیں کھیلتے ہوئے دیکھتا اور دل میں کہتا "میرے باغ میں بہت سے خوبصورت پھول ہیں لیکن بچے ان میں سب سے زیادہ خوبصورت پھول ہیں"۔

جاڑے کی ایک صبح کو اس نے باہر جھانک کر دیکھا۔ اب سردی کے موسم سے اس کو خوف نہیں معلوم ہوتا تھا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ بہار جلد ہی آئے گی۔ یکایک اس کو دیکھ کر حیرت ہوئی کہ باغ کے آخری کونے پر ایک درخت بالکل ہرا بھرا تھا اور اس کی ڈالیوں میں سفید کلیاں مسکرا رہی تھیں۔ درخت کے نیچے وہی بچہ کھڑا ہوا تھا جس سے اس کو بے حد محبت تھی۔ وہ خوشی سے دوڑتا ہوا بچے کے پاس پہنچ گیا لیکن جب اس نے دیکھا کہ بچے کی ہتھیلیوں اور پیروں پر زخم کے نشانات تھے تو اس کا چہرہ غصے سے سرخ ہو اٹھا۔

"کس نے تجھ کو زخمی کیا ہے؟ اس کا نام بتاؤ۔ میں اس کا سر قلم کر دوں گا"۔ دیو نے کہا۔

"نہیں؟ بچے نے جواب دیا۔ "یہ محبت کے زخم کے نشانات ہیں"۔ "تو کون ہے"؟ دیو نے پوچھا اور اس پر ایک عجیب کیفیت طاری ہو گئی۔ وہ گھٹنوں کے بل بچے کے سامنے جھک گیا۔

بچے نے مسکرا کر دیو کی طرف دیکھا اور کہا۔ "تو نے مجھے ایک بار اپنے باغ میں کھیلنے کا موقع دیا تھا۔ آج میں تجھے اپنے باغ میں لے جاؤں گا جس کو جنت کہتے ہیں"

شام کو جب بچے باغ میں جمع ہوئے تو انہوں نے دیکھا کہ دیو مر چکا تھا اور اس کی لاش سفید کلیوں سے ڈھکی ہوئی تھی۔

معلومات

۱۔ بھارتی ریلوں میں ہر سال ۳۰ کروڑ روپے کا کوئلہ خرچ ہوتا ہے۔

۲۔ گزشتہ سال بھارت سرکار نے اپنی ضروریات کے لئے تقریباً ۵ کروڑ روپے کا کاغذ خریدا تھا۔

۳۔ بھارت میں کلکتہ اور ڈائمنڈ ہاربر کو ملانے والی پہلی تار کی لائن ماہ اکتوبر ۱۸۵۱ء میں مکمل کر لی گئی تھی اور اس کی لمبائی ۳۰ میل تھی۔

۴۔ برطانوی مخزن الادویہ اور دیگر مخازن الادویہ میں جو دوائیں درج ہیں ان میں سے ۷۵ فیصدی بھارت میں خود رَو ہوتی ہیں۔

حلیم کوثر

چور

کردار

خورشید —— ایک ماسٹر
رضیہ —— خورشید کی بیوی
اسلم —— خورشید کا لڑکا
انور —— خورشید کا دوست

منظر

خورشید صوفے پر بیٹھا ہوا اسلم سے باتیں کر رہا ہے وہ باتیں کرتے کرتے رُک گیا اور کسی سوچ میں پڑ گیا۔ اتنے میں سامنے کا پردہ اُٹھتا ہے اور انور کمرے میں داخل ہوتا ہے خورشید انور کو دیکھ کر مسکراتا ہوا کھڑا ہو جاتا ہے۔

(دونوں بیٹھ جاتے ہیں)

انور۔ "کہو کیسے ہو"؟
خورشید۔ "اچھا ہوں تمہاری دُعا سے"
خورشید۔ "اسلم "
اسلم۔ "جی ابا جان"
خورشید۔ "چائے بنواؤ"
انور۔ "نہیں نہیں ابھی پی کر آیا ہوں"۔
خورشید۔ "یہاں بھی پینا پڑے گی"
انور۔ "نہیں پیٹ بہت بھرا ہوا ہے"۔
اسلم۔ "ابا جان چائے بنواؤں"؟
خورشید۔ "ہاں"
اسلم۔ "بہت اچھا" (چلا جاتا ہے)
خورشید۔ "کہو انور وہ پاس کا کیا ہوا"؟
انور۔ "ہونا کیا بن گیا"۔
خورشید۔ "تو چلوگے نا"؟
انور۔ "کیوں نہیں"۔
خورشید۔ تم طیار ہو ؟
انور۔ ہاں بس تمہارے طیار ہونے کی دیر ہے۔

پردہ اٹھتا ہے اور اسلم چائے لے کر آتا ہے۔

خورشید۔ اسلم سے ٹرے لے کر میز پر رکھ لیتا ہے۔ (اسلم چلا جاتا ہے)

(دونوں چائے پیتے ہیں)

خورشید۔ اسلم
اسلم۔ جی ابا جان
خورشید۔ برتن لے جاؤ
اسلم۔ بہت اچھا۔

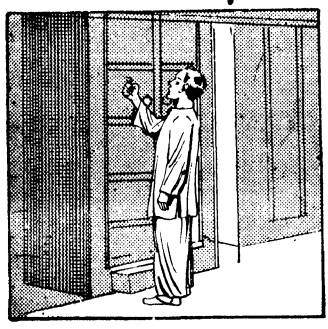
خورشید اندر جاتا ہے اور طیار ہو کر آ جاتا ہے۔

خورشید۔ ڈبیہ جھاتے ہوئے لو انور پان کھا لو پھر چلو سینما۔

انور - "اچھا"۔
خورشید - "اسلم ۔"!
اسلم - "جی"
خورشید - دروازہ بند کر لو - دونوں چلے جاتے ہیں اور اسلم دروازہ بند کر لیتا ہے - رات کے ساڑھے دس بجے خورشید دروازہ کھٹکھٹاتا ہے -

(رضیہ مصنوعی طور پر ڈر جاتی ہے)

رضیہ - "کون ہے"؟
خورشید - "میں ہوں خورشید"
رضیہ - "نہیں تم خورشید نہیں ہو چور ہو"۔
خورشید - (قہقہہ مار کر ہنستے ہوئے) نہیں جی میں چور نہیں ہوں - خورشید ہوں اسلم کا باپ اور تمہارا شوہر -



رضیہ - "اسلم کا باپ اور رضیہ کا شوہر بھی تو چور ہو سکتا ہے"۔
خورشید - "اچھا دروازہ تو کھولو" رضیہ دروازہ کھول دیتی ہے -
خورشید (اندر آتے ہوئے) کیا چرا لیا میں نے آپ کا"؟
(رضیہ ہنستے ہوئے) "آپ نے بندے چرائے ہیں میرے میں ابھی جامہ تلاشی لیتی ہوں"۔

رضیہ خورشید کی جیبیں ٹٹولتی ہے پھر اس کا بٹوا کھول کر بندے نکال لیتی ہے -
رضیہ - کہئے آپ چور ہیں یا نہیں ؟
خورشید - ہاں اب تو کہنا ہی پڑے گا کہ ہوں مگر یہ بندے میرے بٹوے میں آئے کیوں کر؟
(رضیہ قہقہہ لگاتے ہوئے)
رضیہ - پاندان میں رکھے ہوئے تھے - اسلم نے آپ کے بٹوے میں ڈال دئے جب میں سب جگہ ڈھونڈ چکی تو اس نے کہا کہ "ابا جان کے بٹوے میں چلے گئے ہیں"۔

دونوں ہنستے ہیں اور کھانے کی میز پر دیر تک مذاق ہوتا رہتا ہے -

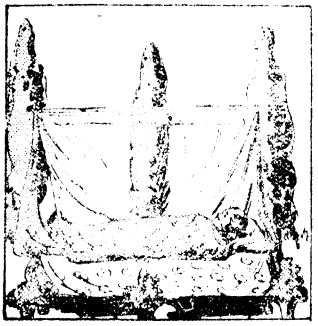
---

لطیفہ

درزی "جناب اب تو میرا بل دے دیں - میں نے سنا ہے کہ چچا صاحب کی دولت آپ کو بہت کچھ ملی ہے"۔
گاہک - اجی میں ایسی نمائش پسند نہیں کرتا۔ اگر میں اپنی سیدھی سادی عادتوں کو چھوڑ دوں گا تو لوگ کہیں گے دیکھو جی مفت کا روپیہ ملتے ہی پہلی عادتیں ساری اڑ گئیں -

نذیر رحمانی

سرائے



پُرانے زمانے کا ذکر ہے۔ ایک راجہ تھا۔ وہ بہت ہی شان و شوکت سے رہا کرتا تھا۔ اس کا ایک بہت بڑا محل تھا۔ محل کے دروازے کے سامنے ایک بہت بڑا باغ لگا ہوا تھا۔ اس باغ میں ایک مسہری بچھی ہوئی تھی۔ جس پر راجہ کبھی کبھی لیٹ جایا کرتا تھا۔ ایک روز راجہ شکار کو گیا تو راستے میں اس کو بہت دیر ہوگئی۔ ایک سادھو ادھر سے گزرا، باغ میں راجہ کی مسہری خالی پڑی تھی، سادھو بہت تھکا ہوا تھا وہ مسہری پر لیٹ گیا اور اس کو نیند آ گئی۔ تھوڑی دیر بعد راجہ آ گیا، اس نے اپنی مسہری پر سادھو کو سوتا دیکھ کر بہت تعجب اور اور غصّے کا اظہار کیا۔ سادھو جب سو کر اُٹھا تو راجہ اُس پر بہت خفا ہوا اور کہنے لگا کہ "تم یہاں کیسے آئے اور میری مسہری پر کیوں سوئے"؟ سادھو نے جواب دیا "بابا! اتنے گرم کس لئے ہوتے ہو۔ میں تو سرائے سمجھ کر سو گیا تھا" سادھو کے جواب پر راجے کو اور زیادہ غصّہ آیا اور اس نے کہا کہ "یہ تو میرا محل ہے، سرائے کیسے ہوگئی"۔ "ہاں بابا! تو جس کو اپنا محل کہتا ہے میں اس کو سرائے سمجھتا ہوں"۔ سادھو نے جواب دیا۔ "وہ کس طرح" راجہ نے دریافت کیا۔ سادھو کہنے لگا۔ بابا! تیرے اس محل میں پہلے کون رہتا تھا راجہ نے جواب دیا "میرا باپ" سادھو نے پوچھا۔ "تمہارے باپ سے پہلے کون رہتا تھا۔ راجہ نے کہا "میرا دادا" سادھو نے پھر دریافت کیا "اور اس سے پہلے"۔ "میرے دادا سے پہلے میرا پردادا یہاں رہتا تھا" راجہ نے جواب دیا۔ تب سادھو نے کہا، بابا! اب تو ہی انصاف کر اور بتا کہ جس جگہ اتنے آدمی بس کر چلے گئے ہوں وہ سرائے نہیں تو اور کیا ہے"؟

سادھو کے اس جواب پر راجہ چُپ ہو گیا اور اس کا غُصّہ ختم ہو گیا۔ اس نے سادھو کا قصور بھی معاف کر دیا اور محل کا ایک حصہ اس کے رہنے کے لئے دیا، لیکن سادھو نے اسے قبول نہیں کیا اور اپنی راہ چلا گیا"۔۔۔

آج کل



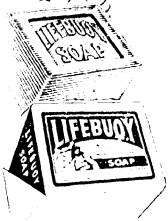
دسمبر ۱۹۵۳ء

آٹھ آنے

اِس روز روز کی گندگی
کے جراثیم سے اپنی صحت کی حفاظت کیجئے



لائف بُوائے کے
محافظ جھاگ
سے



یہ ہے آپ کتنی ہی احتیاط کیوں نہ برتیں اس روز روز کی گندگی کے جراثیم سے آپکو بیماری لگنے کا خطرہ رہتا ہی ہے۔ اپنی صحت کی حفاظت کرنے کیلئے لائف بُوائے سے نہانے کی عادت ڈالیے۔



سکے صحتی جھاگ سے گندگی کے جراثیم سے جسم صاف رہتا ہے اور دن بھر تروتازہ بھی رہتا ہے

لائف بُوائے صابن

روز روز کی گندگی کے جراثیم سے ہر روز آپکی حفاظت کرتا ہے

L 229-50 UD



ڈالڈا وناسپتی میں بنے کھانے ہر ضیافت کو کامیاب بنا دیتے ہیں۔ ڈبوں میں تازہ، خالص اور مفید صحت رہتا ہے۔ شادی کی تیاریوں
یہ ہر قسم کا کھانا پکانے کیلئے نہایت موزوں ہے۔ ہوا روک مہر بند ڈالڈا وناسپتی کا ہونا لازمی ہے۔ یہ کم خرچ بھی بہت ہے۔

شادی کی ضیافت کا انتظام کیسے کیا جائے؟
مفت صلاح کیلئے آج ہی اس پتہ پر لکھئے
دی ڈالڈا ایڈوائیزری سروس
بکس نمبر ۳۵۳ بمبئی ۱



ڈالڈا

وناسپتی



دِن بہ دِن
ایک نیا حُسن
ایک نیا نکھار

رکسونا کا کیڈل آپ کیلئے
بھی یہ کمال کرے گا

رکسونا صابن ہر روز استعمال
کیجئے۔ اس کا کیڈل آمیز
جھاگ آپ کی جِلد کو
دِن بہ دِن زیادہ صاف اور
ملایم بنائیگا۔



رکسونا
کیڈل آمیز واحد صابن

*جلد کو ملایم کرنے والے اور مقوی جلد
تیلوں کے ایک خاص مرکب کا ملکیتی دام

رکسونا پرو پرائٹری لمیٹیڈ کیلئے ہندوستان میں بنایا گیا

RP. 109-50 UD

اُردو کا مقبولِ عوام مُصوّر ماہنامہ

آج کل

دہلی

ترتیب

غزل	آلِ احمد سرور	۴
غزل	بسمل سعیدی	۴
ہندوستان کے قومی ترانے	محمد اجمل خاں	۵
صبحِ نو	روش صدیقی	۱۵
نشاطِ مطالعہ	شیر جنگ	۱۶
یگانہ آرٹ	یگانہ چنگیزی لکھنوی	۲۹
غزل	ابراہیمی گوّری	۲۹
کھنی لسی	کرتار سنگھ دُگل	۳۰
شاعر سے!	بشیشور پرشاد منوّر لکھنوی	۳۵
ترجمہ کیسے کرنا چاہیئے	رحم علی الہاشمی	۳۶
ترکی کے سیرت جات	شری رام شرما	۴۱
"عرض و نما" اور "دستورِ شہادت"	جوش ملیح آبادی	۴۶
عبارت میں تعلیم کا مستقبل	(ڈاکٹر) ذاکر حسین	۴۷
کشمیر کی سیر	ایچ، آر وہرہ	۴۹
رفتارِ زمانہ	ــــ	۵۱

بچوں کا آج کل

چنار	فی این رعنا	۵۳
ایک تھی چندا	لئہ۔ ان نجمی	۵۴
کالا جادو	زکی انور	۵۶
لطیفے	ــــ	۶۰

سرورق - دہلی میں فوٹوگرافی کی بین الاقوامی نمائش کی ایک تصویر "مطالعے کے کمرے میں" از فرانسس ڈد۔ ہُن ہانگ کانگ

ایڈیٹر:- ــــــ جوش ملیح آبادی

اسسٹنٹ ایڈیٹر ــــــ بال مکند عرش ملسیانی

جگن ناتھ آزاد

جلد ۱۲ ــــــ نمبر ۵

سالانہ چندہ:- ــــــ ہندوستان میں:- چھ روپے / پاکستان میں:- چھ روپے / نوشلنگ یا ایک ڈالر

غیر ممالک سے:- ــــــ

فی پرچہ:- ــــــ ہندوستان میں:- آٹھ آنے / پاکستان میں:- آٹھ آنے

دسمبر ۱۹۵۳ء

پبلیکیشنز ڈویژن پوسٹ بکس ۲۰۱۱ - دہلی

SARVODAYA SAHITYA MANDIR
HUSAINIALAM ROAD
Hyderabad-Du,

آلِ احمد سرور

غزل

کل جو میری خوبی قسمت بن گئی وہ خامی بھی
عقل کی پرستش بھی عشق کی غلامی بھی

حرف آئے گا ساقی تیری فیضِ بخشش پر
یوں مجھے گوارا ہے اپنی تشنہ کامی بھی

پیرہن میں بھی کیسا رنگ و بو کا چھلکا
جام میں اتر آئی مے کی لالہ فامی بھی

نغمۂ بہاراں میں تو کمی نہ کر بلبل
ہیں خزاں پرستوں میں فصلِ گل کے حامی بھی

آج کے جنوں سے ہیں کل کی حکمتیں روشن
اس لہو طرازی میں رنگ ہے دوامی بھی

انقلاب ٹھہرا ہے بے حجاب ہونے تک
تیری کم نگاہی سے ہے جنوں میں خامی بھی

نذرِ محبت کی سرخوشی میں حائل ہیں
میری سست گامی بھی تیری بے امامی بھی

تھی فضولی کاوشش دیکھئے نبھے کب تک
آپ کی پرستش بھی زیست کی غلامی بھی

یوں بہار آئی ہے اے سرور کیا کہیئے
دل گرفتہ عارف بھی دل شکستہ عامی بھی

غزل

بسمل سعیدی

ہیں کشتگانِ دل کے ٹھکانے کہاں کہاں
بکھرے پڑے ہیں غم کے فسانے کہاں کہاں

تیرِ نگاہِ ناز کی اللہ ری زدیں
تا کے ہیں ناوکوں نے نشانے کہاں کہاں

خوابیدہ دشت و در کی ہے بیدار خامشی
گونجے ہوئے ہیں تیرے ترانے کہاں کہاں

مل بھی گیا ہو اُن کو پتا تیرا، کیا خبر
پہونچے ہیں اپنی دُھن میں دیوانے کہاں کہاں

اس آسماں نے چھین کے ہم سے، زمین میں
جانے چھپا دئے ہیں خزانے کہاں کہاں

ہوں گے بھی ختم تیرے مقامات نامراد
ہم کو لئے پھرے گا زمانے! کہاں کہاں

دامِ آئیں یا نہ آئیں نظر تو یہ دیکھ لے
بکھرے پڑے ہیں باغ میں دانے کہاں کہاں

بسملؔ ہزار دل زندۂ جاوید جستجو
پہونچے ہیں اس اجل کے بہانے کہاں کہاں

محمد اجمل خاں

ہندستان کے قومی ترانے

ہندوستان کی صحیح قومیت کی جو بنیاد اکبر کے زمانے میں پڑی تھی، اگر اس پر عمارت تعمیر ہوتی رہتی تو آج ہندوستان کل دنیا کی قوموں میں بہت اونچی جگہ پر ہوتا۔ بہرحال فلسفۂ ہند کا بلند ترین تصور "ہم اوست" میں مضمر تھا، اور یہی تصور نہ صرف افلاطونس ملری کا سرمایۂ حیات تھا، بلکہ ابن عربی، رومی سے بہت پہلے گوتم بدھ، نرد اُشنہ اور لاؤتزے بھی وحدتِ وجود کو وحدتِ انسانیت کا سنگِ میل سمجھتے تھے:

تبدل کو ہی نظر، تبسلہ نما کہتے ہیں

اشوک اعظم نے ستیہ اور اہنسا کے تصور سے جو وحدتِ ہند پیدا کی تھی اور صدیوں مسلسل کے بگڑ میں جو لذت و مسرت پائی تھی وہی ہزار سال بعد ہند میں پھر پیدا ہوئی یعنی عالمگیر انسانیت و محبت کی صوفیانہ تعلیم نے ایسے بزرگ پیدا کر دئے جو کبیر نانک اور دادو کی طرح ترکِ رسوم اور محبتِ خلق سے توحیدِ انسانیت کی راہ دکھانے لگے ؎

ہم موساہیں ہمارا کھیش ہے ترکِ رسوم
ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہوگئیں

انسان دوستی کے ان عناصر اعلیٰ کو یونان نے حق، حسن اور خیر کا نام دیا تھا۔ آج کل حکمت و سائنس کو حق یا سچے علم کا ذریعہ مانا جاتا ہے، اسی کو مذہبی اصطلاح میں اساسِ ایماں کہتے ہیں۔ حسن و خوبی کی جستجو انسان کے لطیف احساسات کو شعور و فہم بنا دیتی ہے اور خیر و سعادت کی عملی تعبیر حسن و خوبی کے عملی جامے میں نمودار ہو جاتی ہے اُس وقت ایک عاشق یہ محسوس کرنے لگتا ہے کہ ؎

دل ہر قطرہ ہے سازِ انا البحر ہم اُس کے ہیں ہمارا پوچھنا کیا!

یا بقول جامیؒ

حق جانِ جہان ست، و جہاں جسد بدن
ارواح و ملائکہ، حواسِ ایں تن
افلاک و عناصر و موالید، اعضاء
توحید ہمیں است و دگر شیوہ و فن

غرضکہ ذکر و فکر یا محبت و عقل کی ہم آہنگی نے اکبر جیسا وحدت وجودی پیدا کیا، جس نے اشوک کے بعد ہند میں ایک ایسی دُنیوی حکومت Secular State قائم کی جس میں توحید انسانیت کی بنیادوں پر شرع و آئین کا کوئی تضاد باقی نہ رہا اور حکومت ایک صحیح فکر کے اساس پر چل پڑی۔ رسوم و قوانین کے لباس حالات کے اعتبار سے بدلنے لگے، لیکن حقیقتِ رسوم و قوانین یا "حکمت" اپنی ابدیت کی وجہ سے اٹل رہی۔

شیخ احمد سرہندیؒ نے جہانگیر کے زمانے میں وحدتِ شہود کو ابن عربیؒ کے تصور کے مقابلے میں پیش کیا۔ گو اسپار میں قید ہوئے اور دینِ الٰہی کی بعض بے اعتدالیوں کو راہ پر لگانے کے بعد اُمرا کی ایسی جماعت چھوڑ گئے جو مسلمانوں کے سیاسی تفوق میں اسلام کی ترقی دیکھتی تھی۔ خود راجپوتنی کا بیٹا تھا۔ اسی طرح دارا شکوہ بھی اُپنشد کے فلسفۂ ویدانت سے متاثر تھا۔ اگر ان میں سے کوئی قوت حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتا تو سامی و ایرینی تصورات کی ہموئی ہوئی انسانیت ابھری تخیلی وحدت انسانیت کو لے

کر آگے بڑھتی ۔ مگر حضرت شیخ سرہندیؒ کے فرزند کے مرید کی قسمت میں تھا کہ وہ عالمگیر بن کر تخت سلطنت پر براجے اور شیخ کی دعوت تجدید کو روبہ لائے اور اس طرح غزنی و بخارا و حجاز کی اسلامی سلطنتوں کو اپنا نمونہ بنائے۔

عالمگیر کے بعد ہند میں طوائف الملوکی رہی، اور اگرچہ صوفیوں اور بھگتی مارگ کے شاعروں نے عوام میں وحدت الوجود کے عالمی یا انسانی تصور کو زندہ رکھا، مگر دہلی کے مرکز کی کمزوری کی وجہ سے سیاسی خود غرضیوں نے عام ہندوستانی کو "قسمت" پر شاکر ہونے پر مائل کر دیا تھا۔ پھر بھی مرہٹوں، سکھوں، جاٹوں، روہیلوں اور ایرانی و تورانی گروہوں میں ایسے لیڈر پیدا ہو گئے تھے جو اپنی محدود جماعتوں کو سربلند کرنا چاہتے تھے۔ البتہ شاہ ولی اللہ دہلویؒ (المتوفی ۱۷۶۲ء) نے اُس عالمی تصور انسانیت کو دوبارہ زندہ کیا جو وحدت انسانیت کے رُوپ میں دُنیا میں پہلے سے موجود تھا۔ انھوں نے ایک طرف تو احمد شاہ ابدالی کی مدد کر کے مرہٹوں کی فرقہ پرستانہ تحریک کو کمزور کر دیا اور دوسری طرف علم و حکمت کو متوسط طبقے کی عام فارسی زبان میں رواج دیا۔ اسی طرح ان کے بیٹے شاہ عبدالعزیزؒ نے سکھوں کو عام انسانی تصور سے قریب لانے، اور فرقہ پرستی سے دُور رکھنے کے لئے جانبازوں کی ایسی جماعت تیار کی جو انسانیت کو اپنے مجاہدانہ عمل و ایثار سے دُنیا میں پھیلانا چاہتے تھے۔ اس کے قائد سید احمدؒ شہیدؒ رائے بریلوی اور شاہ عبدالعزیز کے داماد (مولانا عبدالحی) اور بھتیجے (شاہ اسماعیل شہید) تھے۔ سید احمد اور شاہ اسماعیل سرحد میں بالاکوٹ پر ۱۸۳۱ء میں شہید ہو گئے۔ رجعت پسندوں نے اُن کی جماعت کے خلاف پروپاگنڈا شروع کر دیا اور سکھوں کی گمراہ بندی بدستور قائم رہ گئی اور شکست خوردہ ذہنوں میں پھر "قسمت" نے بسیرا لے لیا

حتیٰ کہ ۱۸۵۷ء کی تحریک آزادی کے ختم ہونے کے بعد دہلی کا مرکز انقلاب بھی بے چراغ ہو گیا۔

مختصر یہ کہ ہند میں کیا، تمام دُنیا میں، دو تصورات موجود تھے، ایک تصور وحدت انسانیت و مساوات تھا، دوسرا ایک نسل یا گروہ کے تفوق و برتری کا تھا۔ مجبوروں کو سوائے اس کے چارہ نہ تھا کہ اپنے کرموں کو روئیں اور قسمت پر شاکر رہیں۔ لہٰذا جتنے فرقے یا ترانے تھے وہ اپنے اپنے گروہ کی مناسبت سے تھے۔ یہ قومی نہ تھے یہ مخصوص طبقوں سے متعلق تھے اور زبان زد خلائق ہو جاتے تھے۔ اُن کے نمونے صوفیوں اور بھگتی مارگیوں کے کلام سے بخوبی مل سکتے ہیں۔

سقوط دہلی کے بعد ہندوستان پر ایک مردنی چھا گئی تھی۔ طبقہ اُمرا اپنی بے راہ روی سے بے کار ہو چکا تھا۔ متوسط طبقہ صنعتی انقلاب اور تجارتی شہنشاہیت سے ناآشنا تھا اور طبقۂ عوام ہمیشہ سے علوم عقلی سے محروم تھا۔ لیکن یہاں وطن پرستی کی کمی نہ تھی۔ نادر و ابدالی کے قصے افسانہ بن کر رہ گئے تھے اور خانہ جنگیوں نے عوام کو خواہ وہ کسی مذہب و ملت کے ہوں ایک دوسرے سے نفرت کرنا نہیں سکھایا تھا۔ بلکہ وہ ان سب لڑائیوں کو راجاؤں اور اُمراء کی لڑائیاں سمجھتے تھے۔ اسی لئے اگرچہ دلی کا آخری تاجدار انگریز کا پنشن خوار تھا اور اُس کی حکومت قلعۂ معلیٰ تک محدود تھی، لیکن کل اقوام ہند اُسی کو اپنا "شہنشاہ" سمجھتی تھیں۔

یہاں زوال دہلی کا بیان مقصود نہیں نہ یہ بتانا ہے کہ ابو ظفر بہادر شاہ اور بے گناہ ہندوستانیوں پر انگریز کمپنی کے گرگوں نے کیسے کیسے بہیمانہ مظالم کئے۔ تاہم موجودہ دلّی جیل کے سامنے جو دروازہ جنوبی دروازے کے نام سے مشہور ہے اُسے دیکھئے اور وہ منظر اپنے تصور میں لائیے جبکہ جان نثاری کا وعدہ کر کے شہزادوں کو ہمایوں

کے منجرے سے لال قلعہ کی طرف لایا گیا اور خونی دروازے تک لاکر انھیں قتل کر دیا گیا - پھر کرنل ہڈسن نے اپنا دل ٹھنڈا کرنے کے لئے مرزا مغل کے سینے سے بہتا ہُوا گرم خون پیا - یہی نہیں بلکہ چاندوں شہزادوں کے سر کاٹ کر ایک خوان میں رکھ کر بادشاہ کے سامنے پیش کئے گئے اور کہا کہ یہ وہ نذر ہے جو گورنر جنرل نے بند کر دی تھی - خوان پوش ہٹائے جانے پر بوڑھے بادشاہ نے اس جاں فرسا منظر کو دیکھ کر فرمایا کہ تیمور کی اولاد اسی طرح اپنے بزرگوں کے سامنے سُرخ رُو ہو کر آیا کرتی ہے -

اس طرح کے ہتاسوں نہیں لاکھوں بے گناہوں کے خون نے ہند کو لالہ زار بنا دیا تھا - عام تباہی نے بادشاہ کے دل پر جو ضربِ شدید لگائی تھی اُسی کا یہ اثر تھا کہ ایک غزل اُن کے قلم سے نکل کر ہر ہندوستانی کے دل کو برمانے لگی اور ایسی مشہور ہوئی کہ کمپنی نے اُس کے پڑھنے کو بغاوت قرار دیا - ہم کہہ سکتے ہیں کہ ظفر کا یہ مرثیہ ہند کا پہلا قومی ترانہ تھا

گئی یک بیک جو ہوا پلٹ

گئی یک بیک جو ہوا پلٹ ، نہیں دل کو میرے قرار ہے
کروں غم ستم کا میں کیا بیاں ، مرا غم سے سینہ فگار ہے
یہ دعا یہ ہند نتیجہ ہوئی ، یہ بُوں کیسی اُن پہ جفا ہوئی
جسے دیکھا حاکمِ وقت نے ، کہا یہ تو قابلِ دار ہے
یہ ستم کسی نے بھی ہے سُنا ، ملی پھانسی لاکھوں کو بے گنہ
وہ کلمہ گوئیوں کی طرف سے ابھی اُن کے دل میں نہار ہے
نہ دبایا زیرِ جمیں اُنھیں ، نہ دیا کسی نے کفن اُنھیں
کیا یارو کس نے ہے دفن اُنھیں ، بے ٹھکانے جن کا مزار ہے
شب و روز پیڑوں میں جو تلیں ، بھلا خار غم سے نہ کیوں گھلیں
ملا طوق قید میں جب اُنھیں ، کہا بد سے گل کے یہ ہار ہے
پڑی آ کے جانوں پہ ایسی بن کہ لئے بھنوں کے ہوئے ہرن
جسے دیکھتا ہوں پڑا ہُوا مگلے اُس کے اشکوں کا ہار ہے

یہاں حال تنگ جو سب کا ہے ، یہ کرشمہ قدرتِ رب کا ہے
یاں بہار میں تو خزاں ہوئی ، واں خزاں بھی اُن کو بہار ہے
نہ تھا شہر دہلی یہ تھا چمن ، جہاں ہر طرف تھی اک انجمن
اسے جا کے دیکھو تو اب ذرا ، فقط ایک اُجڑا دیار ہے
نہ تھا شہر خلد سے یہ بھی کم ، سبھی جا خوشی تھی نہ تھا الم
چلی ایسی بادِ سمومِ غم ، نہ وہ رنگ ہے نہ بہار ہے
تجھے دے خطر بھلا کس کا ڈر ، تو خدا کے فضل پہ رکھ نظر
تجھے ہے وسیلہ رسول کا وہی تیسرا عاصی کار ہے

ظفر اُردو درجے کے شاعر تھے ، اُن کے سامنے اُردو ہندی کا جھگڑا نہ تھا - وہ فارسی کو چھوڑ کر ہند کی عوامی زبان اُردو کو اختیار کر چکے تھے - یہ سلسلہ شاہ حیدانقادر کے زمانے سے شروع کر دیا تھا اور خدائی کلام اردوئے ہندی یا ہندوی میں منتقل ہو چکا تھا - راج دھانی کی زبان اُردو ہو چکی تھی اور مخلوط السان فوجوں اور بیوپاریوں کے میل جول کا یہ ناگزیر نتیجہ تھا - اردو شہریوں کی زبان تھی - مخلوط بھاشائیں گاؤں والوں کی بولیاں تھیں اُردو میں وسعت تھی ، بھاکا میں گہرائی اور رس تھا - اُس میں علوم تھے ، سیاست تھی اور سوشل چمک دمک تھی - اِس میں مذہب تھا ، پُرانے اساطیر تھے اور فطری سادگی اس کا سنگار تھی - ظفر دونوں زبانوں کے بادشاہ تھے - اس لئے موقع کی مناسبت سے وہ دونوں زبانوں میں شعر کہا کرتے تھے - "انقلابِ دہلی" موسمِ بہار میں ہُوا تھا یعنی ہولی کا موسم تھا - مندرجہ بالا نظم کے سالویں شعر میں اسی "بہار" کی طرف اشارہ ہے - وہ "بغاوت" کے جُرم میں اپنے ہی گھر یعنی قلعۂ معلّٰی میں قید تھے - "سادن بھادوں" کا جزبی حصّہ قید خانے کا کام دیتا تھا دیوان خاص میں عدالت بنائی گئی تھی - سترے بہترے بہادر شاہ ، ہاتھ میں تسبیح ، لب پہ خدا کا نام ، اور دل میں ہند کی تباہی کا درد لئے "روزانہ عدالت" میں

آتے تھے اور باوقار خاموشی کے ساتھ مجبوراً اس تماشے کو دیکھا کرتے تھے۔ البتہ صرف ایک مرتبہ بولے تھے کہ "بادشاہ تو میں ہوں بھلا میں اس "عدالت" کو کیسے تسلیم کر سکتا ہوں" !!

ہند میں کیسو پھاگ مچوری !

بغاوت کے ملزم کو لکھنے پڑھنے کے سامان سے محروم کر دیا گیا تھا لیکن قلم کی جگہ کوئلہ اور کاغذ کی جگہ "سادن بھادوں" دیواریں موجود تھیں۔ ۱۸۵۷ء کی فصلِ گل میں جو خون کی ہولی کھیلی گئی تھی اُسے شعر کی زبان سے سنئے۔ ممکن ہے کہ اس کوئلے سے لکھی ہوئی ہولی میں الفاظ کا ہیر پھیر ہُوا ہو، بہر حال ۱۸۵۷ء میں بمشکل سرّ آصف علی مرحوم کی توجہ سے جو ہولی ملی ہے وہ غدر کے بعد بچے بچے کی زبان پر تھی۔ یہ ایک طرح سے ہند کا مرثیہ بھی ہے اور قومی ترانہ بھی۔

۱۔ ہند میں کیسو پھاگ مچوری جو راجوری ہند میں...
ہند کا تھا گلشن بنا تھا کیسر کی سی کیاری
کرم ہی نید نیکے جو نکسے ٹوٹ گئی باگ بہاری
کٹ گئی سب پھلواری
ہند میں کیسو پھاگ مچوری.....

۲۔ گورں کے کھکے بنایو توپ کی پچکاری
سینے کھائی دئی کھو ماری ایسی تک تک ماری
شور دنیا میں مچوری ہند میں کیسو پھاگ

۳۔ گنگا رام یہودی نے مل کے تخت کا تاس کیوری
پہلی کلی اور ہونی پاپ ریت کا یوری
ہند میں کیسو پھاگ مچوری.....

۴۔ بہادر شہ مُدّلا گاجی مرد نے دین کا ساتھ دیوری
مرتے دم تک اُس پر یی نے دین ہی دین کہوری
نام اُس رب کا لیوری
ہند میں کیسو پھاگ مچوری.....

انگریزی راج کی وطنی نظمیں

ہند کا دل، یعنی دِلّی سے راج دھانی کلکتہ منتقل ہونے کے بعد سب سے پہلے بنگال میں انگریزی راج اور خیالات نے اڈّہ جمایا۔ انگریزی تعلیم کے اثر سے وہاں نئے بنگلہ لٹریچر کی بنیاد پڑی اور موجودہ صدی کے شروع میں جب سامراجیوں نے بنگال کو تقسیم کرنا چاہا تو وطن پروری کے جذبات میں ایک ہیجان بپا ہو گیا۔ اس زمانے کی بہت سی نظمیں اتنی باغیانہ اور پُرجوش تھیں کہ اُن کا علانیہ پڑھنا بلکہ سننا بھی جُرم سمجھا جاتا تھا ویسے تو سیکڑوں نظمیں تھیں جن کے پڑھنے والے اب باقی نہیں رہے، لیکن مجھے ایک نظم کا پہلا مصرعہ اب تک یاد ہے، جو میری رائے میں "بندے ماترم" اور "جن من گن" دونوں سے خیال اور ترنّم کے اعتبار سے بہت شاندار ہے:

گر تو آمار، جاتنی آمار، دھاتری آمار، آمار دیشی
(ہماری قوم، ہمارا وطن ہماری زمیں، ہمارا دیش)

اُردو میں حالی مرحوم نے قومی نظموں کا سلسلہ شروع کر دیا تھا اور انھوں نے ۱۸۷۹ء میں ایک بے مثل نظم "وطن" کے عنوان سے لکھی تھی۔ چند اشعار یہ ہیں۔

اے وطن اے مرے بہشتِ بریں کیا ہوئے تیرے آسمان و زمیں
تیری اک مشتِ خاک کے بدلے لوں نہ ہرگز اگر بہشت ملے

جب بلا رام چندر کو بن باس اور نکلا وطن سے ہو کے اداس
پاؤں اُٹھتا تھا اُس کا بن کی طرف اور کھنچتا تھا دل وطن کی طرف
تیر اِک دل میں آ کے لگتا تھا آتی تھی جب اجودھیا کی ہوا

بیٹھے بے فکر کیا ہو ہم وطنو اُٹھو اہلِ وطن کے دوست بنو
تم اگر چاہتے ہو ملک کی خیر نہ کسی ہم وطن کو سمجھو غیر

ہو مسلماں اِس میں یا ہندو ۔ بودھ مذہب ہو یا کہ ہو برہمو
سب کو میٹھی نگاہ سے دیکھو ۔ سمجھو آنکھوں کی پتلیاں سب کو
ہند میں اتفاق ہوتا اگر ۔ کھاتے غیروں کی ٹھوکریں کیونکر

سر محمد اقبال نے انجمن حمایت اسلام لاہور کے ایک جلسے میں ایک بین اسلامک نظم پڑھی تھی جسے بعض مسلمان "اسلامی قوم" کی نظم سمجھتے تھے :

چین و عرب ہمارا ہندوستاں ہمارا ۔ مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا

بعد میں ہندوستان کے عام رجحان کی پیروی میں ایک نظم صرف ہندوستان کو اپنا وطن مان کر لکھی :

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا ۔ ہم بلبلیں ہیں اس کی وہ گلستاں ہمارا

پنڈت برج نرائن چکبست نے اس سے بہتر نظم لکھی جو نہ صرف زبان و طرزِ ادا کی خوبیوں سے مملو ہے بلکہ جو بحر اختیار کی ہے وہ قومی ترانوں کے لئے بہت ہی مناسب ہے ؎

یہ ہندوستاں ہے ہمارا وطن ۔ محبت کی آنکھوں کا تارا وطن
ہمارا وطن دل سے پیارا وطن

مولانا شبلی نے بھی قومی نظمیں لکھی ہیں مگر اُن میں حالی کے مدو جزر و اسلام اور اقبال کی شاعری کی طرح پرانے کارناموں کی یاد پر رونا ہی رونا ہے ۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے فنِ مرثیہ نگاری اتنا عام پسند ہو گیا تھا کہ قسمت پر شاکر رہنا اور رونا ہی مقصدِ شعر و ادب بن گیا تھا ۔ غالباً اسی فرسودہ و پامال راہ پر چل کر شبلی نے وہ نظم لکھی تھی جس کا ایک شعر مجھے یاد ہے کہ :

طرابلس جا چکا ، ایران گیا ، اب دیکھنا یہ ہے
کہ جیتا ہے یہ ٹرکی کا مریضِ سخت جاں کب تک

بہر حال اُمدہ شعراء میں بنگالی شعراء کی طرح ایسے شاعروں کی کمی نہیں رہی جو عملی طور پر برٹش امپیریلزم سے ٹکر لیتے تھے اور صرف مرثیہ گو نہیں تھے ، بلکہ شعرائے عرب جاہلیہ کی طرح اپنے قول و عمل سے انسانوں کو سرگرم عمل بنا دیتے تھے ۔ اگر ان شعراء کا شہنشاہ سید الاحرار مولانا حسرت موہانی کو مانا جائے تو ذرا مبالغہ نہ ہوگا ۔ فرماتے ہیں :

وطن ہے میرے لئے اور میں وطن کے لئے
چمن ہے گل کے لئے اور گل چمن کے لئے
وطن ہے میرے لئے اور میں وطن کے لئے
کہاں وہ عہد گزشتہ ! کہاں وہ لطفِ چمن !
تڑپ رہا ہوں اُسی لذتِ کہن کے لئے
ہم آہ رشتۂ اُلفت کو اُستوار کریں
یہ تفرقے ہیں فقط شیخ و برہمن کے لئے
یہی ہے ایک مرے دل کی آرزو حسرت
جیوں وطن کے لئے اور مروں وطن کے لئے

بات یہ ہے کہ اکثر شعراء شعر تصنیف کرتے ہیں اُن کے دل میں خود کوئی کیفیت نہیں ہوتی جس کے اظہار کرنے پر وہ مجبور ہوں ۔ حسرت شاعر پہلے تھے اور پالیٹیشن دوسرے نمبر پر تھے ۔ وہ عام شعراء کی طرح مرثیہ گو یا واعظ نہیں تھے ۔ اُن کی زندگی ایک متحرک جذبہ تھی اور اُن کا کلام اسی لئے سراپا تاثیر تھا ۔ اُن کا عمل اس شعر پر تھا کہ

این راز کہ در سینہ نہانست نہ وعظ است
بر دار تواں گفت بر منبر نتواں گفت

ورنہ جوشیلی نظمیں اوروں نے بھی خوب کہیں ، مثلاً صفی لکھنوی نے بھی غالباً تقلیداً اسلام کے ماننے والوں کو اقبال وغیرہ کی طرح ایک قوم سمجھ لیا تھا اور ایک نظم لکھی تھی جس کے بعض اشعار عام انسانیت کے لئے پیرو نشتر بن سکتے ہیں ، فرماتے ہیں :

زندہ ہیں اگر زندہ دنیا کو ہلا دیں گے
مشرق کا سرا اُٹھ کر مغرب سے ملا دیں گے
ہم سینۂ ہستی میں انگارہ ہیں انگارہ

شعلے بھڑک اُٹھیں گے جھونکے جو ہوا دیں گے
اسلام (انسان؟) کی فطرت میں قدرت نے پلک دی ہے
اُبھرے گا پھر اُتنا ہی جتنا کہ جُھکا دیں گے

(لیکن پھر مرثیہ کا رنگ غالب آگیا جبکہ فرمایا کہ)

ایران ہو یا ترکی دونوں کو مٹا دیکھیں
کیا صنعوہ ہستی سے اسلام مٹا دیں گے

بندے ماترم

بنگال کے مشہور انشا پرداز بنکم چندر چیٹرجی نے 'بندے ماترم' کا تراد ایک ناول کے سلسلے میں لکھا تھا۔ اس ناول میں بظاہر مسلمانانِ بنگال کے اقتدار کے خلاف ایک کہانی کے سلسلے میں جدوجہد کی تلقین کی گئی تھی۔ لیکن وہ اصل مُسلم حکومت بہت پہلے ختم ہو چکی تھی اور مقصد یہ تھا کہ بنگالی ہندوؤں کو ناول کے پیرائے میں برٹش اقتدار کے خلاف اُبھارا جائے۔ بنگال کے بعض انارکسٹوں نے اسے اپنا ترانہ بنا لیا تھا اس لئے انگریز حکومت نے اس کا پڑھنا جُرم قرار دے دیا تھا۔ لیکن جن کے دل کو لگی تھی وہ اسے علانیہ پڑھتے اور قید و بند اور مار درکن کو بیک کہتے۔

۱۹۲۱ء میں مسلمان پورے جوش و خروش سے کانگرس میں شریک ہو گئے۔ جس طرح ہر جگہ سامراجی حکومت نے نفاق و افتراق کے لئے مذہب کو آلہ کار بنا رکھا تھا اُسی طرح انگریز نے ہند کی مخلق فرقہ بندیوں کی آگ کو ہوا دی۔ پنجاب میں آریہ اور سناتنی، وہابی و حنفی، قادیانی پیدا کئے گئے۔ مدراس میں برہمن، غیر برہمن، بنگال میں برہمو، سناتنی اُبھارے گئے اور ہر جگہ وفاداران طبقہ جاگیردار پیدا کئے گئے جو انگریز کو خوش کرنے کے لئے بے گناہوں کو سازش کے مقدموں میں پھنسایا کرتے تھے۔ اس ترانے میں کوئی خاص شاعرانہ زور ہے نہ جوش دلانے والا جذبہ۔ لیکن تیس کروڑ شور مچانے والے گلوں اور ساٹھ کروڑ قدموں بردار ہاتھوں کا ذکر ہے۔ بس اتنی سی بات مذہبی تفریق پیدا کرنے کے لئے کافی تھی اور مسلمانوں سے کہا گیا کہ یہ نظم تو "کالی مائی" کی تعریف میں ہے اور قدموں بردار سب ہندو ہیں جو اُس ماں کے پجاری ہیں۔ حالانکہ ماں سے مراد صرف مادرِ ہند تھی۔ فرقہ پرست مسلمانوں کے لئے، جو انگریز کے لئے ایمان فروشی کرنا عین مذہب سمجھتے تھے، اتنا اشارہ کافی تھا۔ انھوں نے شور مچایا کہ کانگرس میں شریک ہونا کفر ہے۔ لیکن کانگرسی بھی بچی گولیاں کھیلے ہوئے نہ تھے انھوں نے قدموں والے بند کو اپنے جلسوں میں پڑھنا ممنوع قرار دے دیا لیکن جن کے دلوں پر انگریز کی مہر لگ چکی تھی وہ کب آزادی کے طلبگار بن سکتے تھے۔ وقار انبالوی نے اپنے ترجمے میں اصل نظم سے زیادہ شگفتگی پیدا کر دی ہے، وہ درج ذیل ہے:

بندۂ مادرم — بندۂ مادرم

میری نظر کا نور ہے صورتِ مادرِ وطن
دل کا مرے سرور ہے عظمتِ مادرِ وطن — بندۂ مادرم

اِس کی ہوا میں تازگی اس کے چمن بہشت ہیں
اِس کی فضا میں زندگی، دشت و دمن بہشت ہیں — بندۂ مادرم

دامنِ کوہسار کے، چشمے حیات بخش ہیں
نزہتِ لالہ زار کے جلوے حیات بخش ہیں — بندۂ مادرم

مادرِ ہند کا جمال، رشکِ حوریاں رہا
مادرِ ہند کا جلال، مرجعِ نوریاں رہا — بندۂ مادرم

قلب میں اس کے لاکلام شفقتِ مادری بھی ہے
چہرے پہ ہاں بپے سلام عظمتِ مادری بھی ہے — بندۂ مادرم

اس کی عزیز خاک سے پیکر باصفا اُٹھے
یعنی اِس ارضِ پاک سے خلق کے رہنما اُٹھے

اس کے جوانِ تند خو، ثابت و صف شکن رہے
اس کے یلانِ جنگ جو گرد فلک شکن رہے — بندۂ مادرم

آزاد ہند فوج (انڈین نیشنل آرمی) کا قومی ترانہ

آزادیٔ ہند کے بعد یہاں یہ بحث چھڑ گئی تھی کہ "جن من گن" بہتر ہے یا "بندے ماترم"۔ معترضین کا خیال تھا کہ سر رابندر ناتھ ٹیگور نے "جن گن من" شہنشاہِ ہند و برطانیہ کی تعریف میں لکھا تھا۔ اس سے انکار نہیں کہ ۲۷ دسمبر ۱۹۱۱ء کو جب یہ ترانہ کانگرس کے دوسرے اجلاس میں پڑھا گیا تھا تو اُس وقت کانگرس سورندر ناتھ بنرجی جیسے معتدل (ماڈریٹ) لیڈروں کے زیرِ اثر تھی۔ اور چونکہ ۱۲ دسمبر ۱۹۱۱ء کو جارج پنجم نے دہلی دربار میں یہ اعلان کیا تھا کہ بنگال کی تقسیم منسوخ کر دی گئی ہے۔ اس لئے لیڈر خوش تھے اور کانگرس میں شاہ جارج کی تعریف میں ایک ہندی نظم پڑھی گئی تھی۔ لیکن "جن گن من" کے اشعار خود شاہد ہیں کہ یہ نظم بادشاہ برطانیہ کی تعریف میں نہیں بلکہ اُس شہنشاہِ دو عالم کی تعریف میں ہے جو قوموں کا "ازلی رہنما" ہے۔

یہاں یہ نوٹ کر لینا چاہیئے کہ بعض ہندو یہ سمجھتے ہیں کہ "ازلی رہنما" سے ارجن کی رتھ کے رہنما سری کرشن جی مراد ہیں۔ یہ اُن کی غلط فہمی ہے۔ ٹیگور ہندو نہیں تھے، وہ برہمو سماج یا یزدان پرست جماعت سے متعلق تھے، اور وہ غیر مشخص خدا کے قائل تھے، حتیٰ کہ اُس کو کسی نام سے موسوم کرنا بھی اُس کی ذات کو صفات کے قیود میں پھنسانا سمجھتے تھے۔ وہ "اُس ذات" کی ضمیر سے اس کو پکارتے تھے۔ اس کے علاوہ یہ مناجات یا بھجن رابندر ناتھ کے مذہبی بھجنوں کے مجموعہ "دھرم سنگیت" میں شامل ہے۔ جس سے صاف ثابت ہے کہ یہ ایک روحانی و مذہبی تعلیم ہے نہ کہ ایک بادشاہ کی خوشامد کا قصیدہ۔

نیتا جی سبھاش چندر بوس نے جب انڈین نیشنل آرمی کو قائم کیا تو اُن کی کیبنٹ کے ایک وزیر آنریبل عابد حسین صاحب کے یہ کام سپرد ہوا کہ وہ ہندوستان کے شایانِ شان ایک قومی ترانہ تلاش کریں۔ نظرِ انتخاب بجا طور پر "شبھ سُکھ چین" پر پڑی۔ اس کا ہندوستانی ترجمہ "شبھ سُکھ چین" کے عنوان سے کیا گیا اور یہی مشرقی ایشیا میں گونجنے لگا۔ ظاہر ہے جرمن اور جاپانی اپنے ترانوں پر بے حد فخر کرتے تھے، لیکن جب انھوں نے آزاد ہند فوج کی لے سُنی تو وہ بھی قائل ہو گئے کہ ترانہ ہو تو ایسا ہو۔ اس میں شک نہیں کہ جن گن من کا یہ بہت ہی سادہ ہندوستانی ترجمہ ہے۔

شُبھ سُکھ چین کی بارش برسا

۱۔ شُبھ سُکھ چین کی بارش برسا۔ ہندوستان کے داتا
ہندُستان کی قسمت جاگا راجاؤں کے راجا
پنجاب سندھ گجرات مراٹھا دراوڑ اُتکل بنگا
چنچل ساگر، وِندھ ہمالا نیلا، جمنا، گنگا
سب تیرے گُن گاتے ہیں
تجھ سے رحمت پاتے ہیں
جے ہو جے ہو تیری فتح ہو ہندُستان کے داتا

۲۔ ہندو، بُدھ، سِکھ جین پارسی مسلم اور عیسائی
تیرے تخت کے آگے جھک کر ماں جائے ہیں بھائی
سب کے دل میں پریت بسا کر تیری میٹھی بانی
پریم کی لڑیاں گوندھ رہی ہے آزادی کی رانی
اندھیرا مٹانے والے
فریادیں سننے والے

جے ہو جے ہو تیری فتح ہو ہندوستان کے داتا

دیپ ہوئی اور پھکے پھیکڑ ترے گن گاتے ہیں
ہلکے جھونکے نئی زندگی کا من میں رس لاتے ہیں
سورج بن کر جگ پر چھکے ہندوستان ہمالا
سب مل کر جے ہند پکاریں ہند آزاد کا نعرہ
جے ہو جے ہو تیری فتح ہو کل دنیا کے آقا
قسمت کو جگانے والے
یہ بیڑا پار لگا دے
جے ہو جے ہو تیری فتح ہو ہندوستان کے داتا

ہندوستان آزاد ہوا اور بحث مباحثہ کے بعد آخرکار یہ طے ہو گیا کہ سر رابندر ناتھ ٹیگور کی وہ مناجات جس میں انسانیت کا ایک عالمگیر تصور ہے اور ذات پات، چھوت چھات مٹانے والا وحدت الوجودی خیال ہے، ہندوستان کا نیشنل ترانہ تسلیم کر لیا جائے ہم اس ترانے کے اصل الفاظ مع ترجمہ کے درج کرتے ہیں، اور امید کرتے ہیں کہ امن و سلامتی کے تصور کو کل دنیا اپنا لے گی۔

آزادیٔ ہند کے بعد دو تقریر جناب جواہر لال نہرو،

مسٹر وی، سی کیشو راؤ کے جواب میں ۲۵ اگست ۱۹۴۷ء کو عزت مآب وزیر اعظم ہندوستان نے پارلیمنٹ میں فرمایا کہ ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء ہی کے بعد ہمیں ایک ایسے قومی ترانے کی ضرورت محسوس ہوئی جو بینڈ اور آرکسٹرا پر بجایا جا سکے۔ اس کی ضرورت نہ صرف ہماری فوجوں کو تھی بلکہ بیرونِ ہند کے سفارت خانوں کو بھی تھی ..... ۱۹۴۷ء میں اقوامِ متحدہ کی جنرل اسمبلی نے ہمارے وفد سے قومی ترانہ طلب کیا اور اس نے "جن گن من" پیش کر دیا۔ یہی ہماری فوجوں میں رائج ہو گیا ..... اور ہر ملک میں نہ صرف اس کی لے پسند کی گئی، بلکہ مبارک بادیاں آنے لگیں۔ پھر گورنروں اور صوبائی بڑے وزیروں سے استصواب کیا گیا۔ سوائے سی پی کے ہر صوبے نے اسے پسند کیا اور عارضی طور پر کابینۂ ہند نے "جن گن من" کو ہند کا ترانہ تسلیم کر لیا۔ پھر بنگال کے بڑے وزیر نے لکھا کہ ان کی حکومت "بندے ماترم" کو پسند کرتی ہے .... افسوس ہے کہ یہ بحث چھڑ دی ہوئی ہے... ..... بہر حال قومی ترانے کے لئے ایسی لے کی ضرورت ہے جس سے ہندوستان کی موسیقی کا جوہر نمایاں ہو اور بیرونِ ہند میں بھی پسند کیا جائے۔ لہذا بعض ماہروں کی رائے ہے کہ بندے ماترم کی دھن ایسی ہے کہ باہر کے ملکوں کے آرکسٹرا میں اس کی نزاکتیں پورے طور پر ادا نہیں ہو سکتیں۔ بہر حال بندے ماترم، اگرچہ ہند کا قومی ترانہ رہے گا لیکن نیشنل ترانے کی لے وہی رہے گی جو "جن گن من" کی ہے اس معاملے کا آئین ساز اسمبلی جلد فیصلہ کرے گی۔

جَن گَن مَن اَدھینائک

(۱)

جَن گَن مَن اَدھی نائک جَے ہے بھارت بھاگ بِدھاتا
پنجاب سِندھ گجرات مراٹھا دراوِڑ اُتکل بنگا
وِندھ ہمالچل جمنا گنگا اُچھل جلدھی ترنگا

تب سُبھ نامے جاگے
تب سُبھ آشِس مانگے
گائے تب جَے گاتھا
جَن گَن منگل دائک، جَے ہے بھارت بھاگ بِدھاتا
جَے ہے، جَے ہے، جَے ہے، جَے جَے جَے ہے

(۲)

اَہَرَہ تب اَہوان پرچا رِت، سُنی تب اُدار وانی
ہندو، بودھ، سکھ، جَینی، پارسی، مسلمان کرسٹانی
پورب پچھم آسے
تب شنگھاسن پاسے
پریم ہار ہے گا نتھا
جَن گَن ایکیہ بِدھایک، جَے ہے بھارت بھاگ بِدھاتا
جَے ہے، جَے ہے، جَے ہے، جَے جَے جَے ہے

(۳)

پَتَن بھیو دئے بنُدھرا نِپتا اُگیَگ دھاوِت یا تری

ہے چر ساردتی، تب رتھ چکرے مُکھرت پتھ دن رتری
دارُن وِپلَو ماجھے
تب شنکھ دھونی باجے
سنکٹا دُکھو نواتا
جَن گَن پتھ پَریچایک، جَے ہے بھارت بھاگ بِدھاتا
جَے ہے، جَے ہے، جَے ہے، جَے جَے جَے ہے

آج کل دہلی

(سیگیوں)

اے سب کے دِلوں کے بادشاہ!

(۱)

اے 'وہ' جو سب کے دلوں پر حکمراں ہے تو ہی بھارت کی قسمت جگانے والا ہے
تیرا ہی نام پنجاب، سندھ، گجرات، مرہٹہ، دراوڑ، اُڑیسہ اور بنگال میں
اور وندھیاچل اور ہمالیہ میں گونج رہا ہے۔ گنگا جمنا اور ہند ساگر
کی لہروں میں تیری تانیں رچی ہوئی ہیں۔
وُہ تیرے مقدس نام سے زندہ ہیں
وُہ تیری رحمت کے طلبگار ہیں
وُہ تیرے ہی گُن گاتے ہیں
ہر ایک تیرے ہی بچانے سے بچ سکتا ہے، اے ہند کی قسمت اُجاگر کرنے والے
جے ہو، جے ہو تیری جے ہو، تیری فتح ہو، تیرا بول بالا ہو

(۲)

رات ہو یا دِن، مسلسل تیری آواز اَیک ملک سے دوسرے ملک کو جا رہی ہے
اور ہندو، بُدھ، سکھ، جین، پارسی، مسلمان اور عیسیٰ کو
اپنے تخت کی طرف بُلاتی ہے
پورب پچھم مِل جُل کر تیرے گُن گاتے ہیں
اور محبت کے پھُولوں کا ہار گوندھتے ہیں
تو سب کے دلوں کو زندگی کی ایک ڈوری میں پرو رہا ہے، اے ہند کی قسمت جگانے والے
جے ہو جے ہو، تیری فتح ہو، تیرا بول بالا ہو

(۳)

اے ازلی رہنما! تو انسانی تاریخ کو اُس رستے پر چلا رہا ہے، جو
قوموں کے اُبھرنے اور گرنے سے ناہموار ہو گیا ہے
اس پر جانوروں کے کارواں برابر چلے جا رہے ہیں
اور اس سڑک پر تیری رتھ کے پہیوں کی آواز دن رات گونج رہی ہے
تیرا بگل افلاق کے بھیانک دنوں میں بج رہا ہے
اور دُکھوں کو دُور کرنے کی صدا دے رہا ہے
اُس کی آواز مایوس جانوروں کے دلوں کو ڈھارس دے رہی ہے
اور تیری اُنگلی ہر ایک کو رستہ بتا رہی ہے۔ اے بھارت کی قسمت اُجاگر کرنے والے
جے ہو، جے ہو، تیری فتح ہو، تیرا بول بالا ہو

(۴)

گھور رتیر گھن جوڑ نشی تھے پڑیت مُور چھت دیشے

جاگرت چھل تب اَوچل منگل نت نیئے اَنی مے سے
دُھن پیئے آنکھے
رکشا کریلے اَنکے
سنیہ مَئی تمی ماتا

جن گن دُکھا ترایک جے ہے بھارت بھاگّ بدھاتا
جے ہے، جے ہے، جے ہے، جے جے جے جے ہے

(۵)

راتری پربھاتا، اُودیا راچھو پھٹی پُورب اُدیا گری بھالے
گاہے پنکھم پُنّ سمیرن نو جیون رس ڈھالے
تب کرو نارُن راگے
نندتا بھارت جاگے
تب چرنے نت ماتھا
جے، جے، جے ہے، جے راجیشور، بھارت بھاگّ بدھاتا
جے ہے، جے ہے، جے ہے، جے جے جے جے ہے

(۴)

جب اندھیاری گہری تھی، رات بھیانک اور ڈراؤنی تھی اور میرا
موت کی سی بے ہوشی میں پڑا ہُوا تھا

تب بھی تیری ماتا بھری بانہیں اُسے چپٹائے ہُوئے تھیں
اور تیری نہ سونے والی آنکھیں اُس کے دُکھیارے چہرے کو برابر تک رہی
تاآنکہ اُن ڈراؤنے خوابوں کی جھلک اُس کے چہرے سے جاتی رہی
جو اُس کی رُوح کا بوجھ بنے ہُوئے تھے

تو ہی دُکھیاروں کی پکار سننے والا ہے، بھارت کے بھاگوں کو پروان چڑھانے وا
جے ہو، جے ہو تیری فتح ہو، تیرا بول بالا ہو

(۵)

پو پھٹ رہی ہے، سورج کی کرنیں پوربی پہاڑیوں پر اپنی جھلک دکھانے لگ
چڑیوں کے چہچہے، صبح کی نرم ہواؤں سے مل کر نئے جیون کا رس ڈھالنے۔
تیری رحمت کی محبت بھری سنہری کرنوں نے
بھارت کی سرزمین کو نیند سے جگا دیا
اور اُس نے تیرے قدموں پر سر رکھ دیا
اے راجاؤں کے راجا! تیری فتح ہو، تو ہی ہند کی قسمت جگانے والا۔
جے ہو، جے ہو، تیری فتح ہو، تیرا بول بالا ہو۔

معلومات و اعداد

۱۔ اب تک داموددیلی پروجیکٹ کو عملی جامہ پہنانے کے سلسلے میں کل ۲۹ کروڑ ۸۰ لاکھ رُپے کا سامان خریدا گیا ہے۔ اِس میں سے ۸ کروڑ ۹۶ لاکھ روپے کا سامان بھارت میں خریدا گیا۔

۲۔ ۱۹۵۲-۵۳ء میں بھارتی ریلوں پر آمد و رفت کے ذریعے سے روزانہ محاصل کی اوسط ۴۷ لاکھ روپے سے زیادہ رہی۔ اسی دوران میں خرچ کی روزانہ اوسط ۶۱ لاکھ روپے رہی۔

۳۔ بھارت میں شیشی عمل کے ذریعے سے صابن طیار کرنے کی فیکٹریوں میں تقریباً ۱۲½ کروڑ کا سرمایہ لگا ہُوا ہے۔

۴۔ گذشتہ سال چھوٹی بچتوں کی اسکیم کے تحت کل ۴۰ کروڑ ایک لاکھ روپے کی رقم جمع ہوئی۔

۵۔ آندھرا کی نئی ریاست میں بقیہ ریاست مدراس کی بہ نسبت تین گنا سے بھی زیادہ تمباکو پیدا ہوتا ہے لیکن اس (آندھرا) میں تمباکو کی اوسط پیداوار تقابلاً قریباً ۳ پونڈ فی ایکڑ ہے۔

روش صدیقی

صبحِ نو

صُبحِ نو ، دُور نہیں ، دُور نہیں ، دُور نہیں

★

یہ اندھیرا ہی تو پیغامِ وداعِ شب ہے
اس اندھیرے کا بہت دیر ٹھہرنا دشوار
ساحلِ بحرِ تمنّا کہیں ہاتھ آتا ہے
ڈوب کر کشتیٔ انجم کا ابھرنا دشوار
اِس بدلتی ہوئی دُنیا کا یہ دستور نہیں
صُبحِ نو دُور نہیں

★

چشمِ غفلت کے لئے دعوتِ بیداری ہے
رُخِ مشرق سے سرکتی ہوئی یہ چادرِ خواب
رازِ تخلیق ہے یہ سلسلۂ ظلمت و نور
ورنہ خورشیدِ درخشاں کو کہاں تابِ نقاب
آتشِ سینۂ گیتی کبھی مستور نہیں
صُبحِ نو دور نہیں

★

یہ شبِ بارئ آلام سے سہمی ہوئی رات
گھٹتی پڑتی ہوئی منزل کے قریں آ پہونچی
خشک ہو جائیں گے شبنم کے لرزتے آنسو
نوبتِ جلوۂ خورشیدِ مبیں آ پہونچی
اب یہ ہنگامِ فغاں، اے دلِ رنجور نہیں
صُبحِ نو دُور نہیں

★

یہ سپیدی یہ سیاہی شفق سُرخ کے ساتھ
امتیازات کی دُنیا پہ ہے اک طنزِ عظیم
اسود و ابیض و احمر کی یہ تفریقِ غلط
دلِ انساں ہے جہاں میں، دلِ انساں کا ندیم
کسی سلطان سے کم، عظمتِ مزدور نہیں
صبحِ نو دُور نہیں

★

صبحِ نو، حسنِ تقاضائے فروغِ انساں
صبحِ نو، مدرسۂ فکر و نظر کی تجدید
صبحِ نو، امن و محبّت کا دل افروز پیام
صبحِ نو، عہدِ مساواتِ بشر کی تجدید
آدمی دہر میں آزاد ہے مجبور نہیں
صبحِ نو دُور نہیں دُور نہیں دُور نہیں
صبح نو دُور نہیں

★

شیر جنگ

نشاطِ مطالعہ

(۴)

جان ولف گانگ گوئٹے

آپ نے کبھی حسین تخیل کے وفورِ شدت کا احساس کیا ہے ، ایسا حسن جو ایک درد کی شکل اختیار کرکے آپ کے وجود کا جزو بن گیا ہو ؟ آپ بے چین ہوجاتے ہیں ۔ اور اس کی تلاش میں موسیقی کے دامن میں پناہ لیتے ہیں ۔ موسیقی بھی زیادہ دیر تک آپ کی توجہ نہیں کھینچ سکتی ۔ آپ دفعتاً غایب ہوجاتے ہیں ۔ خود میں ہی کہیں دُور ، بہت دور گم ہوجاتے ہیں ۔ وقت کا دھارا جیسے رُک گیا ہو ، اور تب آپ کی کائنات کا خلاء آن جانے میں ہی اس اَن سُنی موسیقی سے بھر جاتا ہے اور آپ کا تصوّر اُس دوشیزہ کی طرح مسکرانے لگتا ہے جو دن بھر ٹیگور کی نظموں کا مجموعہ پڑھتی رہی ہو ۔ جس کو شام کے دھندلے سایوں نے دھرتی کو اپنے گہوارے میں سمیٹ لیا ہو اور دُور پہاڑ کی چوٹیوں پر سے کھسک کر کتاب کے صفحوں پر آنکھ مچولی کھیلنے لگی ہو ۔ اب ادھ کھلی کتاب کو آغوش میں لئے ادھ پڑھی آخری نظم کے تاج محل کو اپنی نیم وا آنکھوں میں بند کرکے تاریک تصوّرات میں ڈوب جاتی ہے اور پھر اُسی حالت میں سوجاتی ہے ۔ اگلے دن کسی کام میں اُس کا جی نہیں لگتا ، وہ کھوئی کھوئی سی رہتی ہے ۔ جیسے کہیں کچھ رکھ کر بھول گئی ہو ۔ دل میں رہ رہ کر ایک کسک سی اُبھرنے لگتی ہے اور نامعلوم اجنبی سے درد کا بوجھ تکان بن کر تمام بدن میں سرایت کرجاتا ہے ۔ اکھڑی اکھڑی سی طبیعت میں "بی تھوون" کی "سمفنی" کے سے نغمے ناچنے لگتے ہیں ۔ اور وہ غیر ارادی طور پر چھلکی ہوئی آنکھوں کے سائے تلے مسکرانے لگتی ہے ۔

گوئٹے کی شاعری کا تخیل بھی کچھ ایسی ہی کیفیت ہمارے اندر پیدا کردیتا ہے ۔ ایک درد ، ایک سرور اور خود فراموشی کا ایک ایسا شدید انجذاب ہمارے اندر پیدا ہوجاتا ہے کہ ہم اَن جانے میں ہی زندگی کے ہم نوا ہوکر مسکرانے لگتے ہیں اور حُسن کی بلندیوں سے تخلیق کے کرشموں کا تماشہ کرنے لگتے ہیں ۔

گوئٹے جس کے متعلق علامہ اقبال نے فرمایا ہے ۔

شاعرے کو ہم چو آں عالی جناب　　نیست پیغمبر ولے دارد کتاب

یہی گوئٹے آسمانِ ادب کے ان چند درخشندہ ستاروں میں سے ایک ہے جن کی کرنوں کے لمس سے انسانی فکر کی کلیاں چٹکتی ہیں اور جن کی شبنم میں تخلیقِ حُسن کے پھول پلتے ہیں ۔ وہ اُس محفل کا صدر ہے جس میں ہومر ، ورجل ، دانتے شیکسپیر ، رومی ، فردوسی ، حافظ ، بھرتری اور کالی داس جیسی سحر آفریں ہستیاں دوش بدوش ہیں ، ایسی ہستیاں جو ہر قوم ، ہر ملک اور ہر نسل کی مشترکہ وراثت ہیں ، جنھوں نے انسانی شعور کے حاشیوں پر سے جہالت کی پرانی ، میلی اور بھاری بھرکم

سنگین دیواروں کے بوجھ ہٹائے۔ جنھوں نے انسانی تخیل کو پرپرواز دیئے اور انسانی اُمنگوں کو زبان دی۔

آرٹ کی دنیا میں جو درجہ مائیکیل انجیلو اور رافیل کا ہے، ادب کی دنیا میں وہی مقام گوئٹے کو حاصل ہے۔ یعنی سلطانِ مطلق، مقتدرِ اعلیٰ، جس کا ہر لفظ قانون اور ہر بول کُلیہ۔ اور جس طرح مائیکیل انجیلو کو اپنے آرٹ کی ہر شاخ یعنی مصوّری، مجسّمہ گری، استرکاری، نقاشی، تعمیرسازی وغیرہ میں تفوّق اعلیٰ حاصل تھا ٹھیک اُسی طرح گوئٹے کو ادب کی ہر صنف پر قدرتِ اولےٰ حاصل تھی۔ کتبوں سانیٹ، گیت، رزمیہ اور بزمیہ نظموں سے لے کر فاؤسٹ جیسا عظیم اور ابدی شاہکار اُس نے تخلیق کیا۔ ایسا شاہکار جس کا ہم پلّہ دانتے کی ڈیوائن کامیڈی اور والمیکی رامائن کے سوا دنیائے ادب میں نایاب ہے۔ فاؤسٹ نہ صرف دنیا کی ایسی اعلیٰ ترین غنائی نظم ہے جو حُسن کی انتہائی بلندیوں پر پہنچائی ہوئی ہے اور جس کی ڈرامائی ہیئت اپنے تعمیری اسلوب اور فنی تکمیل میں شیکسپیئر، بھاباؤبھوتی، تنجور اور مدورا کے اُن جنوبی مندروں کا تصوّر جگاتی ہے جو مفرد چٹانیں کاٹ کر بنائے گئے ہیں، بلکہ یہ شاہکار انسان اور انسانی فطرت کا نہایت وسیع اور عمیق مطالعہ بھی ہے۔ اس کے دیگر ڈرامے رزمیہ، بزمیہ، طنزیہ اور المیہ سبھی ادب کے تخلیقی معجزے ہیں۔ ایسے معجزے کہ اس کے علاوہ شاید شیکسپیئر ہی وہ دوسرا معجزہ گر ہے جس کے قلم کا جادو اس صنفِ ادب میں دنیا کے سامنے پیش کیا جاسکتا ہے۔ نثر میں بھی، چاہے وہ کہانی کی شکل میں ہو یا رومان کی، چاہے وہ ناول ہو اور چاہے سفرنامہ اس کو وہی عظمت، تفوق اور قدرت حاصل ہے جو کہ نظم اور ڈرامہ میں ہے۔

گوئٹے کو بلاشبہ رُوحِ تخلیق کہا جاسکتا ہے جس کی تخلیقی اور تعمیری قدرت محض ادب کی دنیا تک ہی محدود نہ تھی بلکہ ادراک اور فہم کے ہر شعبے کو احاطہ کئے ہوئے تھی۔ وہ صحیح معنوں میں عصر آفریں شخصیت اور ہمہ گیر فراست کا مالک تھا۔ دنیا کی اُن معدودے چند عصر آفریں ہستیوں میں سے شاید وہ آخری انسان تھا جس کے شعوری معراج نے بلندی کی انتہائی منزلوں میں عافیت اور شادمانی کے آشیانے تعمیر کئے ہیں۔ وہ شاعر تھا، ادیب تھا، مدبّر تھا، مفکّر تھا، سیاست داں تھا، حکیم تھا، مصوّر تھا، فنِ تعبیر کا ماہر تھا، اُس کا لکھا ہوا ضابطۂ قانون، رنگوں کے متعلق اُس کی حکیمانہ تشریحات اور علم نباتات پر اُس کے تحقیقی مقالے دنیائے علم کے بیش بہا گوہر ہیں۔ گوئٹے کا یہ ہمہ گیر علم اور تبحّر اُسے دانتے پر بھی فوقیت بخشتا ہے جس نے کہ لیوفارڈو داونچی اور مائیکیل انجیلو کی طرح علم، فن اور آرٹ کے بہت سے شعبوں پر قدرت حاصل کی تھی۔

جان وولف گانگ گوئٹے کا جنم جرمنی کے فرانکفرٹ شہر میں ۲۸۔ اگست ۱۷۴۹ء کو ایک متموّل، متمدّن اور پڑھے لکھے گھرانے میں ہوا تھا۔ اس کے والد شاہی کونسلر تھے اور والدہ چیف مجسٹریٹ کی بیٹی تھیں۔ ہونہار گوئٹے بلا کا ذہین بچہ تھا۔ آٹھ سال کی عمر میں ہی اُس نے جرمن، فرانسیسی، اطالوی، لاطینی اور یونانی زبانیں سیکھ لی تھیں اور بعد کو ان میں انگریزی اور عبرانی زبانوں کا اضافہ کرلیا تھا۔ اکتوبر ۱۷۶۵ء میں جب کہ اس کی عمر سولہ سال کی تھی یہ لائپ زیگ یونیورسٹی میں داخل ہوا۔ جہاں سے ۱۷۷۰ء میں قانون پڑھنے کے لئے یہ سٹراز برگ یونیورسٹی چلا گیا۔ یہاں اُس نے ڈاکٹر کی ڈگری حاصل کی، محبت کا داغ کھایا اور شیکسپیئر کا مطالعہ کیا۔ ۱۷۷۱ء میں اس کی تین کتابیں شائع ہوئیں۔ گوئٹز، آوارہ گرد اور آوارہ گرد

کے طوفانی گیت ۔ ۱۷۷۳ء میں اُس نے 'پرومی تھی یس' ایمیر اور چند طنزیہ نظمیں لکھیں۔ ۱۷۷۴ء میں اُس کا ایک ناول شائع ہوا 'نوجوان ورتھر کی آہ و زاری' جس کے متعلق ایک نقاد لکھتا ہے :۔

"یہ آہ و زاری، اُس گہرے اور اَن جانے درد کی گونج ہے جو فکر پرور دماغ اور زودحس دل کے انسانوں کو، ایک خاص عمر میں اندر ہی اندر گھُن کی طرح کھائے جارہا تھا۔ اُس کی درد بھری پُکار اور فریاد بھرت شکوے یورپ بھر کے دلوں میں گونج اُٹھے تھے، اور صدائے بازگشت بن کر ہر جوان مرد اور ہر جوان عورت کی زبان پر وِرد ہوگئے تھے"۔ نوجوان شاعر کی اس کتاب کا ہیرو گویا مرقع تھا، اس تمام بےچینی اور افراتفری کا جو کہ یورپ میں اُس وقت عام تھی۔ وہ تمام تمدنی اور سماجی بےزاری جس نے یورپ کے عوام کو گھیرا ہوا تھا، "ورتھر" کی آہ و زاری میں زبان اختیار کرکے ایک وسیلہ بنی جس کی مدد سے ہر شخص نے اپنے دل کی آواز سُنی اور اُس کو سمجھا۔ اس کتاب کو عظیم الشان کامیابی حاصل ہوئی۔ اگرچہ اس میں سماج کی اُس بیماری کا کوئی علاج نہیں بتایا گیا تھا جس کی وجہ سے ہر شخص پریشان اور ہراساں تھا۔ وہ تو انقلاب فرانس کا جراحی عمل ہی تھا جس نے اس دُکھ کی دوا پیش کی اور جس نے انسان کو ایک بار پھر اطمینان کا سانس لینے کے ذرائع بہم پہنچائے۔

اس کتاب کی اشاعت نے گوئٹے کی شہرت کو جرمنی کی حدود سے نکال کر یورپ بھر میں پھیلا دیا اور "ورتھر" کے تتبع میں مختلف زبانوں میں ادبی تخلیقیں ہونے لگیں۔ "ورتھر" اپنے زمانے کا نہ صرف ادبی جنون ہی تھا بلکہ اس کا اثر عوام کی گفتار و رفتار اور وضع قطع پر بھی خبط کے درجے تک پہنچ گیا تھا۔ حد یہ کہ اس کردار کی نقل میں لوگوں میں ویسی ہی پوشاک مروج ہوچلی تھی جیسی کہ گوئٹے نے اس ناول میں اُسے پہنائی تھی۔

اس کے علاوہ گوئٹے نے اور بھی بہت سی کتابیں نظم اور نثر میں لکھیں، جن میں سے مندرجہ ذیل بہت مشہور ہیں۔ ایفی جینیا، اِگمانٹ، تاسو، ولیم مائیسٹر، ہرمن اور ڈوروتھیا، رنگوں کا نظریہ، آپ بیتی اور دیوانِ شرق و غرب، مؤخرالذکر کتاب حافظ اور دیگر شعرائے فارس کے تتبع میں گوئٹے کی غزلوں کا مجموعہ ہے جو کہ یورپی ادب میں ایک انوکھی جدت ہے۔

گوئٹے کی شہرت سے متاثر ہوکر دائمر کے نوعمر سلطان چارلس آگسٹس نے اُسے ۱۷۷۵ء میں اپنے دربار میں مدعو کیا۔ سلطان کی عمر اُس وقت بیس برس کی تھی، اور گوئٹے کی پچیس برس کی۔ پہلی ہی ملاقات میں دونوں ایک دوسرے کے ہوگئے۔ اور ایک لمبے عرصے کے لئے دونوں کی دوستی استوار ہوگئی۔ گوئٹے کو علاقے کا گورنر مقرر کیا گیا، اور اس کے بعد سے گیارہ برس تک وہ اسی اونچے مقام سے اپنے آس پاس کی دنیا کو دیکھتا ہوا مختلف فرائض انجام دیتا رہا۔

دنیا کی تاریخ میں کتنے اہم تھے یہ سال! انسان کے شعور کا ارتقاء بلوغیت کے بال و پَر نکال کر آسمان کی بلندیوں میں پرواز کے خواب دیکھ رہا تھا۔

یہی وہ سال ہیں جن میں ٹامس پین، نے اپنی شہرۂ آفاق منشور "آزادی کا اعلان" مرتب کیا، جس کی بازگشت براعظم امریکہ کو ایک کونے سے دوسرے کونے تک ہلاتی ہوئی دنیا بھر کے صاحبِ فراست لوگوں کے سینوں میں گونج اُٹھی تھی اور جو آج بھی ہر ملک میں انسانی آزادی کی ایک مسلم الثبوت، لافانی اور ٹمکسالی دستاویز کی شکل میں لوگوں کے دلوں پر کندہ ہے۔

صنعتی انقلاب کا جادوگر بھاپ بن کر آہستہ آہستہ

اُبھر رہا تھا، اور تاریخ کو ایک نئی کروٹ دینے کے لئے خم ٹھونک رہا تھا۔

امریکہ میں جنگِ آزادی کا شعلہ بھڑک چکا تھا۔ اور آزادی کے پروانے دور دور سے اس کی طرف جوق در جوق کھنچے چلے آرہے تھے۔ یورپ کا خود دار طبقہ جگہ جگہ روپے اور رضاکار جمع کر رہے تھے کہ انہیں حصّہ لے سکیں۔

فرانس کا حکمراں طبقہ ملک کے بے روزگار لوگوں سے چھٹکارا پانے کے طریقے ایجاد کر رہا تھا۔ چنانچہ ۱۷۷۷ء میں بارہ لاکھ بھک منگے جیلوں اور جبریہ مشقّت کے مرکزوں میں کوڑوں سے ہانک ہانک کر بھیجے گئے تاکہ وہاں کے ایک لاکھ چھیالیس ہزار امراء اور ایک لاکھ تیس ہزار کاہن اور گرجا کے رکن اطمینان اور عیش کی زندگی گزار سکیں، اور اس طرح اُن جانے میں ہی آنے والے انقلاب کے لئے راستہ صاف کیا جا رہا تھا۔

اور یہی وہ سال ہیں جن میں دنیا کی لافانی نظم فاؤسٹ، گوئٹے کے ذہن میں بتدریج نشو و نما پا رہی تھی۔

گوئٹے کا یہ شاہکار اُس کی تمام زندگی کا حاصل ہے۔ جس کی تخلیق میں وہ عمر بھر لگا رہا۔ ۱۷۷۱-۷۰ء میں اُس نے یہ نظم شروع کی اور ۱۷۹۰ء میں پہلی مرتبہ ایک ادھورے ڈرامے کی شکل میں شائع کی۔ ۱۷۹۷ء میں اُس نے اس کو پھر سے ڈھالا اور بہت سی ترمیم و تنسیخ کے بعد شائع کیا۔ ۱۸۰۱ء میں اس میں مزید تبدیلیاں کی گئیں اور ۱۸۰۶ء میں مزید ترمیم و تنسیخ کے بعد کم و بیش اُس صورت میں شائع ہوئی جس میں کہ آج یہ ہمارے سامنے موجود ہے۔ اس کے بعد بھی ۱۸۳۲ء میں اپنی موت کے دن تک گوئٹے اس نظم کو سنوارنے میں مصروف رہا۔

ٹامس من نے، جس کو ۱۹۲۹ء میں دنیا کا بہترین ادیب ہونے کی حیثیت سے نوبل پرائز ملا تھا۔ مندرجہ ذیل الفاظ میں گوئٹے کی موت کا نقشہ کھینچا ہے۔

"۱۸۳۲ء کے مارچ کی بائیسویں تاریخ تھی۔ اپنی آرام کرسی میں گھٹنوں پر کمبل اوڑھے اور آنکھوں پر سبز سایہ باندھے گوئٹے دنیا سے رخصت ہوا..... مرنے سے کچھ عرصہ پہلے اُس نے دریافت کیا کہ آج کونسی تاریخ ہے۔ بتایا گیا کہ بائیسویں۔ یہ سُن کر اُس نے کہا کہ اب بہار کا موسم آپہنچا ہے۔ سختی کے دن ختم ہوگئے ہیں۔ اور پھر اپنا بازو اُٹھا کر انگلی سے ہوا میں کچھ لکھنے لگا۔ اُس کی انگلی لکھتی رہی۔ بائیں سے داہنی طرف کو۔ اور بازو نیچے ہوتا گیا۔ وہ سطر کے نیچے سطر لکھتا گیا، حتّٰی کہ اُس کا بازو تھک کر اُس کے پہلو میں ڈوب گیا۔ اُس کی انگلی پھر بھی بدستور کمبل پر لکھتی رہی۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ کوئی ایک ہی چیز بار بار لکھ رہا تھا، جس میں نہایت احتیاط سے اوقاف و اعراب لگاتا جاتا تھا۔ وہ لکھتا گیا، لکھتا گیا، سایوں کی تحریر میں لکھتا گیا۔ حتّٰی کہ اُس کی انگلیاں نیلی ہوگئیں، اور اُن کی حرکت بند ہوگئی، اور جب اُس کی آنکھوں پر سے سبز سایہ ہٹا کر دیکھا گیا تو اُن کی روشنی بجھ چکی تھی، اور وہ سایوں کی دُنیا میں پہنچ چکا تھا۔"

گوئٹے لکھتے لکھتے دنیا سے رخصت ہوا اور کون جانے اس وقت بھی وہ اپنی نظم فاؤسٹ پر ہی کام کر رہا ہو۔

حُسن اور حریّت کا اتحاد اُس کا مطمحِ نظر تھا، اُس کی انفرادیت جو کہ جمالیاتی آزادی کے مترادف تھی، اُس کے زورِ قلم سے ایک ایسے ناقابلِ شکن حصار کی شکل اختیار کر گئی تھی۔ جس کی سیسہ پلائی ہوئی دیواروں سے سیاسی سماجی اور فکری بندشیں، ہر زمانے کے بندھن، ٹکراتے

تھے اور چُور چُور ہوکر گرجاتے تھے ۔ اُس کی زندگی کا دھارا اپنے دَور کی ہر تحریک کو ، یورپ کی ہر علمی ، سماجی اور فکری تحریک کو اپنی لہروں میں سمیٹتا ، اُچھلتا کودتا اپنے ساحلوں کو سیراب کرتا ، سیپ ، موتی اور مونگے بکھیرتا ، قوس و قزح کے رنگوں سے تانے بانے بُنتا ، ایک لافانی ، ابدی نغمے کی طرف بڑھتا گیا ، حتیٰ کہ خود بھی اس لافانی اور ابدی نغمے میں مدغم ہوکر ایک لافانی اور ابدی نغمہ بن گیا ۔

اُس کی زندگی کا دامن کتنا وسیع اور بسیط تھا! کتنوں کی زندگی اور زندگی کا ماحصل اس میں جمع ہے ۔ 'وِنکل مین' اور 'لے سنگ' ، 'مینڈل شون' اور کانٹ ، شلر شیلے کیٹس اور شے لنگ ، فشتے ، ہیگل اور شوپن ہاور ، بیش و کم اس کے ہم عصر تھے ۔ جن کی فکر نے اُس کے تخیل کی آبیاری کی ۔ نپولین اور بیتھوون سے یہ ذاتی طور پر ملا ۔ اور دونوں پر اپنے گہرے اثرات چھوڑے ۔ برطانوی شاعر کیٹس اور کولرج نے اُس کے تخیل کی پھلواری سے کلیاں چُنیں ، اور شیلی کے نغموں کی رنگینی نے اُس کے گیتوں میں رنگ آمیزی کی ۔

گوئٹے نے اپنی کتاب فاؤسٹ کی تصنیف میں کم و بیش ساٹھ سال لگائے اور اُس دَور کی رُوح کو اس نظم میں چاند کی کرنوں اور ستاروں کے نغموں میں سمو کر بند کردیا ۔ یاد رہے کہ اس دَور میں تاریخ کا وہ ناقابلِ فراموش زمانہ بھی شامل ہے جس میں انسان کی انسانیت نے غلامی کی زنجیروں پر پہلی ضرب پہنچائی تھی ۔ یعنی ۲۷ ۔ اگست ۱۷۸۹ء سے لے کر جبکہ "انسانی حقوق کا اعلان" شائع ہوا تھا ، ۲۱ ۔ جنوری ۱۷۹۳ء تک جس دن کہ فرانس کا بادشاہ 'لوئی سولیوان' انقلابیوں کے ہاتھوں قتل ہوا ، یہ زمانہ بھی اِس دَور میں شامل ہے ۔

ایک فرانسیسی نقاد کے الفاظ ہیں ، اُس نظم میں انسانی روح کے ارتقاء کا پورا دَور لافانی طور پر محفوظ ہے ۔ اس درد سے جو نسلِ انسانی کے لئے سوہانِ روح ہے ، یہ نظم کراہتی ہوئی ملے گی ۔ وہ سب عناصر جن سے نسلِ انسانی بے تاب ہے ۔ جن سے نسلِ انسانی گریز کرتی ہے اور جن سے نسلِ انسانی متنفر ہے ، یہ نظم بھی اُن سے بے تاب ، بے زار ، گریزاں اور متنفر ملے گی ۔ اور تمام وہ عناصر جو نسلِ انسانی کے لئے راحت اور شادمانی کے باعث ہیں اس نظم میں بھی وہ محبوب اور مقبول ہیں ۔ اور شاید یہی وجہ ہے کہ اس کتاب کو اس قدر قبولِ عام اور شہرتِ دوام حاصل ہے ۔ اگرچہ دُنیا کے مسائل آج وہ نہیں ہیں جو کہ شاعر کے دَورِ حیات میں تھے اور ہماری جدوجہد بھی آج اُس دَور کی جدوجہد سے مختلف ہے ۔ لیکن نسلِ انسانی کی جذباتی کیفیت ، اُس کی شادی و غمی ، اس کے آنسو اور قہقہے بیش و کم آج بھی وہی ہیں جو کہ اُس وقت تھے ۔ چنانچہ آج اور کل کی نسلوں کے لئے یہ سودمند ہی ہے کہ وہ پچھلی نسلوں کے غم اور شادمانی کی داستان کا مطالعہ کریں تاکہ آنے والے کل کے استقبال کے لئے تیار ہوسکیں ۔

اور آنے والے کل کے دامن میں ہے کیا ؟

شاید فاؤسٹ کا یہ کورس اُس کی طرف اشارہ کرتا ہے ۔

جو فانی ہے وہ محض سایہ ہے ۔
نا مکمل یہاں تکمیل پاتا ہے ۔
جو کبھی الفاظ میں ادا نہ ہوسکا وہ یہاں شکل اختیار کرتا ہے ۔
مردِ ابدی حسینہ ، ابدی نسوانیت ، ہمیں بلندیوں کی طرف کھینچتی ہے ۔"

یہی بات ایک دوسرے پیرائے میں گوئٹے اس سے قبل بھی کہہ چکا ہے ۔ آزاد کے پہلے باب میں وہ یوں کہتا ہے ۔

" ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نیکی اور حُسن کے تمام

مظاہر۔ نیچر نے جنسی زندگی کی رنگینیوں میں یک جا کردئے ہیں۔"

گوئٹے نے ان الفاظ میں مافوق الفطری نظریوں کی دھند کو کاٹ چھانٹ کر کائنات کے اُس کھُلے راز کو بے نقاب کیا ہے جس کے جلوے خود ہی پردہ داری کے ضامن ہیں۔ ابدی نسوانیت یعنی حُسن اور ذوقِ حُسن کے اطوار ہی وہ ذرائع ہیں جن کی بدولت انسانی رُوح بالیدگی اور بلوغیت کے معراج حاصل کرتی ہے۔

اِس نظریئے میں فاؤسٹ کا مصنف ہیگل، شے لنگ اور شوپن ہاور کا ہم خیال ہے۔ اُن کے فلسفے کی "خودی اور عدمِ خودی" "دعویٰ اور جوابِ دعویٰ" اور "عزم اور تصوّر" کے مقابلے میں اُس نے فاؤسٹ اور میفسٹو کے کردار پیش کئے ہیں۔ جو ایک دوسرے کی ضد بھی ہیں اور ایک دوسرے کا تکملہ بھی۔ نیچر کی وحدت اُس کے نزدیک ان دونوں کے ادبی تضاد اور ازلی جدوجہد سے عبارت ہے۔ جس جدوجہد میں نہ کسی کو فتح حاصل ہوتی ہے اور نہ شکست۔ اگر فاؤسٹ خواہش ہے تو میفسٹو خواہش کی سیری، اگر فاوسٹ زندگی کی بےچینی کا نام ہے تو میفسٹو اس بےچینی کا سکون۔ اگر فاؤسٹ مردِ فاعل کا تخیّل ہے تو میفسٹو ابدی نسوانیت کا تصوّر۔ اُس طاقت کا تصوّر جو ہر جذبے ہر ذائقے اور ہر خواہش کی تسکین کے سامان بہم پہنچاتی ہے۔

یہ صحیح ہے کہ اکثر مقامات پر میفسٹو کا کردار اُس جانے پہچانے کردار سے مشابہ ہے جو کہ مسیحی مذہب نے شیطان کا پیش کیا ہے ایک گھناؤنا، بدکار۔ دھوکا باز اور فتنہ ساز کردار جس پر فتح حاصل کرنا انسانی مسرّت کا باعث ہوتا ہے۔ میفسٹو کا یہ کردار فاؤسٹ کے دوسرے حصّے کے دوسرے سین میں خاص طور پر اُبھر کر سامنے آتا ہے۔ لیکن مجموعی طور پر اس رزمیہ ڈرامے کی تشکیل میں میفسٹو کے کردار کی وہ تمثیلی اور تصوّری خصوصیت غالب ہے جو اُسے زندگی کا جزولاینفک قرار دیتی ہے۔ میفسٹو کے بغیر فاؤسٹ ایک بےسود خواہش اور لاحاصل تمنّا بن کر رہ جاتا ہے۔ میفسٹو کے نکال دینے سے فاؤسٹ کے لئے کوئی بھی چیز ایسی نہیں رہ جاتی جس کے لئے زندگی کی صعوبت اُٹھائی جاسکے۔ وہ ایک ایسی خواہش بن جاتا ہے جس کا کوئی مُدّعا نہ ہو۔ ایسی محنت جس کا کچھ حاصل نہ ہو اور ایسی مسافت جس کی کہیں منزل نہ ہو۔ میفسٹو کے رہنے سے فاؤسٹ کے پاس زندگی کا مُدّعا ہے اور اُس کے جذبات کے لئے ایک منزل۔ اِس کے وجود سے فاؤسٹ کی اُمنگیں اور ولولے قائم ہیں، اور قائم ہی نہیں بلکہ اُس کی مدد سے اُنھیں منزل کی نشان دہی ملتی ہے۔ منزل کی سمت اور منزل کا راستہ ملتا ہے۔ اس کا مقصد حاصل ہوتا ہے، چاہے وہ ادھورا ہی کیوں نہ ہو۔ اور ادھورا اُسے رہنا بھی چاہئے۔ کیونکہ تکمیل کے معنی ہیں خاتمہ۔ اُس تڑپ، جدوجہد اور جوش کا خاتمہ جو زندگی کی شرطِ اوّلین ہے اور اس فاصلے کا نفیِ مطلق میں تبدیل ہوجانا، جو خواہش اور تسکین، تخم اور ثمر اور زندگی اور موت کے درمیان حائل ہے۔ تکمیل کے معنی ہیں محبّت اور تصرّف کا فرق مٹ جانا۔ حُسن اور قبضہ تمنّا اور حصول، کاوش اور منزل کا دو نہ رہ کر ایک ہوجانا، زندگی کا موت میں کھوجانا یعنی فاؤسٹ کا میفسٹو میں مدغم ہوجانا اور گردشِ دوراں پر سکوت کا حکم نافذ کرکے مرزا غالب کے اس شعر کا مجسّمہ بن جانا۔

نومیدیٔ ماگردشِ ایّام نہ دارد دوزے کہ سیہ شد سحر و شام نہ دارد

گوئٹے نے اس اوغام اور کھوجانے کے اس عمل کو جنسی مباجعت کی مثال میں پیش کیا ہے۔ "محبّت" وہ کہتا ہے "موت کی طرح خودی کو فنا کردیتی ہے۔ جنسی مباجعت ایک ایسا متبرک پیمان ہے جو دو اشخاص کی انفرادی شخصیتوں کو اُن میں سے نوچ کر علیحدہ کرتا ہے۔

اور پھر تخلیقی خود فراموشی اور مکمل سپردگی کی آغوش میں جھٹک کر ایک کر ڈالتا ہے "یہ اتحاد اُس کے نزدیک اُس وسیع اور بے کراں اتحاد کی نشان دہی کرتا ہے جو موت کی عظیم قربانی کے علاوہ اور کہیں میسّر نہیں آسکتا۔

یہ موت ہی میفسٹو کی معنوی صورت ہے۔ وہ خود ہی اپنے آپ کو "نفی کی روح" بتاتا ہے یا ایسی استدلالی بصیرت کا حامل جو ہر جدوجہد کا مقصد جنتا کر کے خود جدوجہد کی شکست کا موجب ہوتا ہے اور مقصد کو ختم کر ڈالنے کا باعث۔ فاؤسٹ کے لئے زندگی کا یہ ایک ایسا ساتھی ہے جو اُس سے الگ نہیں کیا جاسکتا۔ یہ زندگی کے مرض کا خوفناک معالج ہے، زندگی کے زخم کا بے رحم جرّاح، اُس ابتدائی عالمگیر تاریکی کا ایک جُز جس سے روشنی ظہور پذیر ہوئی اور ہر موجود شے نے وجود پایا۔ یہ خدا کی لافانی یادداشت کو زندہ رکھکر زندگی کی بھاگ ڈور کو متانت کی طرف موڑتا رہتا ہے۔ یہ اُس قوّت کا ایک جُز ہے جو ادراک کی گرفت سے باہر رہتا ہے۔ جو شر سے شروع ہوتی ہے اور خیر پر ختم ہوتی ہے۔ اور جس کا ہر سالمہ نفی اور اثبات سے مرکّب ہے۔ نفی اور اثبات کی یہی دو طاقتیں جو ہر انفرادی زندگی اور ہر ملک کی ارتقائی تاریخ کی تہ میں کارفرما ہیں، جو نیچر اور انسان کے ارتقاء کی عظیم الشان عمارت کے بنیادی پتھر ہیں۔ گوئٹے کے اس ڈرامے میں دو کرداروں کی شکل میں پیش کی گئی ہیں۔ ان میں سے ایک کردار کا نام فاؤسٹ ہے اور دوسرے کا نام میفسٹو۔

گوئٹے نے اپنے اس ڈرامے کا پلاٹ ایک پرانی داستان سے لیا ہے اور کچھ اس طرح پیش کیا ہے۔

ایسٹر سے پہلی شام ہے، اور شام کا دامن دھاگ بوکر رات کے آنچل سے اُلجھ چکا ہے، ایک اونچے مکان کی کھڑکیوں کے گرداگرد شیشوں میں سے چاند کی دھیمی روشنی کتابوں کے انبار سائنس کے آلات، کانچ کی نالیوں اور صراحیوں پر سے پھسلتی ہوئی بہت سے ناپنے، تولنے والے اور مختلف قسم کے ریاضی آلات پر پڑ رہی ہے۔

سامنے لیمپ کی مدھم سی زرد روشنی میں گھرا ہوا ایک ادھیڑ عمر کا آدمی بیٹھا ہے۔ جس کی کمر مطالعے کے بوجھ سے جھکی ہوئی ہے اور جس کا لباس اور وضع قطع کمرے کی خشک بے رونق اور سن رسیدہ فضاء سے ہم آہنگ ہے... یہ جرمنی کا شہرہ آفاق عالم ہے۔ جس کے علم و فضل کے کمال کا شہرہ دُور و نزدیک پھیلا ہوا ہے اور جس کا نام ڈاکٹر فاؤسٹ ہے۔

آج یہ غیر معمولی طور پر اداس ہے۔ مایوسی کی کراہٹ سے اس کا سینہ لبریز ہے۔ تحصیلِ علم میں چوتھائی صدی کی شب و روز جانفشانی کے بعد آج اس پر یہ حقیقت واضح ہوئی ہے کہ علم کا غرور کتنا تھوتھا ہے۔ کیونکہ علم خود ایک بے حقیقت شے ہے۔ اس کی نظریں کتاب کے صفحے سے اُچٹ کر کمرے کا جائزہ لے رہی ہیں۔ جس کا ہر گوشہ انسانی دماغ کی صدیوں کی تحقیق و تدقیق کے حاصل کا ایک بوسیدہ گودام ہے۔ وہ سوچتا ہے۔

"میں نے فلسفہ، قانون اور طب کے ہر شعبے میں تحقیق و تدقیق کی ہے یہ

میں نے الٰہیاتی علوم کے مطالعے میں دن رات ایک کیا ہے۔

لیکن حیف! سمجھا یہ کہ کچھ بھی سمجھا نہیں جاسکتا۔

اور بعد میں وہی روزِ اوّل کا جاہل مطلق ہوں۔

حقیقت کا یہ انکشاف مجھے کھائے جارہا ہے"

فاؤسٹ کو یہ احساس ہورہا ہے کہ سالہا سال کی اُس کی محنتِ شاقہ مائیگاں گئی۔ مطالعے کے دبیز غلاف نے زندگی کو اس کی آنکھوں سے اوجھل رکھا۔ کتابوں کے

گنجان جنگل میں ہی وہ بھٹکتا رہا اور زندگی سے اُس کی آشنائی نہ ہوئی ۔ وہ زندگی کے لئے بےتاب ہوجاتا ہے ۔ زندگی کی لذّت چکھنا چاہتا ہے ۔ زندگی سے اس کی مراد لہو و لعب، عیش و عشرت اور رقص و سرود نہیں ہے ۔ اُن کے لئے اب اس کی عمر نہیں ہے ، وہ گزر چکی ۔ اور اب وہ پیچھے نہیں پلٹ سکتا اور نہ ہی عمرِ گذشتہ کو واپس بلا سکتا ہے ۔ پھر زندگی کہاں ہے ؟ زندگی کی لذّت کیسے حاصل کرے ؟ وہ اسی کشمکش میں مبتلا ہے کہ میفسٹو سے اس کی ملاقات ہوتی ہے اور وہ زندگی کے راستے پر ــــ عمل پیرائی ، ہمّت آزمائی ، جہم جوئی ، حوصلہ مندی ، حُسن بازی ، دل فروشی اور محبت کے راستے پر ــــ اس کی رہنمائی کرتا ہے ۔ وہ سب کچھ مہیّا کرنے کا وعدہ کرتا ہے ، جس کے لئے اُس کا دل تڑپ رہا ہے ۔ میفسٹو سب سے پہلے اُسے شراب خانے میں لے جاتا ہے ۔ لیکن شراب کا سرور فاوسٹ کو مسرور نہیں کرتا اور وہ وہاں سے باہر نکل آتے ہیں ۔ اس کے بعد وہ ایک جادوگرنی کی کٹیا میں جاتے ہیں ، جہاں اُس کے دماغ کو اُس زنگ سے پاک کرنا ضروری ہے ، جو علم نے اُس پر چڑھا دیا تھا ۔ فاوسٹ یہاں ایک آئینے میں ایک حسین عورت کا عکس دیکھتا ہے اور بس دیکھتا ہی رہ جاتا ہے ۔ اس اثنار میں جادوگرنی فاوسٹ کے لئے ایک دوا تیار کرکے لاتی ہے ، اور اُسے پلا دیتی ہے ۔ دوا پیتے ہی اُس کی جوانی واپس آجاتی ہے اور میفسٹو کے الفاظ میں "اب اُسے ہر عورت وہ ابدی حسینہ نظر آنے لگے گی جس کا نام ہیلن ہے اور جو حُسن و جمال کے اُس انتہائی نقطۂ کا مجسّمہ ہے جس تک پہنچنے کے لئے روزِ اوّل سے ، شعرا کا تخیّل صدیوں اور نسلوں کی منزلیں طے کرتا ہوا روزِ آخر کی طرف سرگرمِ سفر ہے ۔"

فاوسٹ نے آئینے میں ہیلن کا عکس دیکھا تھا اور اب ہیلن کو حاصل کرنا ہی اُس کی زندگی کا مقصد ہوجاتا ہے ۔ میفسٹو اُسے دھوکا دیتا ہے اور ہیلن کی جگہ ایک اور لڑکی کو پیش کرتا ہے ۔ فاوسٹ اور اُس لڑکی کے تعلقات ، حُسن پر عشق کا قبضہ لڑکی کے لئے تباہی کا باعث بن جاتے ہیں ۔ محبت میں گرفتار ہوکر یہ لڑکی اپنی ماں کو زہر دیتی ہے ۔ اپنے بھائی کو قتل کرتی ہے ، اپنے نوزائیدہ بچے کو گلا گھونٹ کر مار ڈالتی ہے اور پھر خود بھی پاگل ہوجاتی ہے اور پھانسی پر لٹکا دی جاتی ہے ۔ حُسن اپنی آزادی کھوکر عالمگیر تباہی کا حربہ بن جاتا ہے اور اور خود بھی اس تباہی کے ساتھ تباہ ہوجاتا ہے ۔

ڈرامے کا پہلا حصّہ یہاں ختم ہوجاتا ہے ۔ دوسرے حصّے میں گوئٹے اپنے ہیرو کے لئے ازسرِنو دنیا تخلیق کرتا ہے ۔ میفسٹو کی مدد سے فاوسٹ دوبارہ زندگی شروع کرتا ہے ۔ اُسے شہرت حاصل ہوتی ہے ۔ عیش و عشرت حاصل ہوتا ہے ۔ دولت حاصل ہوتی ہے ۔ سلطنت اور اقتدار حاصل ہوتا ہے ۔ لیکن دل کا سکون حاصل نہیں ہوتا ۔ "زندگی" حاصل نہیں ہوتی ۔ ہیلن کی تلاش ، حُسنِ مطلق کی تلاش ، اُسے بدستور بےتاب رکھتی ہے اور کشاں کشاں ایک منزل سے دوسری منزل کی طرف ، آگے ہی آگے کھینچتی چلی جاتی ہے ۔ آخر میں کچھ وقفہ کے لئے اُسے ہیلن مل جاتی ہے ۔ جو اُس کی روح کو بالیدگی اور اُس کی زندگی کو ارتعاش بخشتی ہے ۔ لیکن جوں ہی وہ اس پر قبضہ کرنا چاہتا ہے ، اپنے بازوؤں میں باندھنے کی کوشش کرتا ہے وہ دفعتاً بادلوں میں غائب ہوجاتی ہے ۔ محض اُس کا لبادہ اس کے ہاتھوں میں رہ جاتا ہے اور ازسرِنو جستجو و جہد و جہد کا میدان اس کی آنکھوں کے سامنے ــــ اب وہ سمجھتا ہے کہ پیہم جد و جہد اور مسلسل جستجو ہی زندگی کا راز ہے ۔ صرف وہی لوگ زندگی اور آزادی کے حقدار ہیں جو اپنے لئے زندگی اور آزادی اور جیت ازسرِنو حاصل کرتے ہیں ۔ نیز یہ کہ حُسن

اور آزادی کے اتحاد پر ہی زندگی قائم رہ سکتی ہے۔ اس اتحاد کی نفی پر نہیں۔

یہ نظم کیا ہے گویا انسانی زندگی کے دائرے کا نقشہ ہے۔ زندگی کی طرح یہ بھی عورت کی محبت سے شروع ہوتی ہے اور جادو فن، آرٹ، دولت، جاہ و حشم، جنگ و جدل اور شادی غمی میں سے گزرتی ہوئی عورت کی ہی محبت پر ختم ہوتی ہے۔ جب تک یہ رواں ہے ہر بلا اور ہر فتنے سے محفوظ ہے اور جہاں اور جب یہ روانی بند ہوئی کہ فتنوں اور بربادیوں نے اُسے آدبوچا۔

گوئٹے کے اپنے الفاظ میں "یہ نظم انسانی زندگی کی تمثیل ہے، جو شروع ہوتی ہے، ختم ہوتی ہے اور جس میں کوئی باہمی ربط نہیں ہے"۔ اور جو ربط یا اتحاد اس میں نظر آتا بھی ہے وہ محض اُن کی نفی کا ہی پیدا کردہ ہے۔ فقدانِ ربط کا ہی ظہور ہے۔ فقدانِ ربط گویا ایک دامن ہے جس کے زیرِ سایہ حرّیتِ عزم پرورش پاتی ہے۔ وہ حرّیت جو اپنے لئے مسلسل جد و جہد اور مستقل جستجو کے میدان تیار کیا کرتی ہے اور ازلی طور پر ابدی حسینہ کی جویا رہتی ہے۔

اس ابدی حسینہ کو کون پکڑ کر رکھ سکتا ہے؟ حصولِ حُسن کی یہ نفی حرّیتِ عزم کے اثبات کو پیدا کرتی ہے اور اس طرح حُسن اور حرّیت کا اتحاد وجود میں آتا ہے۔

غالب میموریل فنڈ

۱۸ ستمبر ۱۹۵۳ء کو مندرجہ ذیل اصحاب کی ایک میٹنگ ڈاکٹر شانتی سروپ بھٹناگر سکرٹری وزارتِ تعلیمات حکومتِ ہند کے کمرے میں ہوئی۔ (۱) ڈاکٹر شانتی سروپ بھٹناگر صدر (۲) ڈاکٹر ذاکر حسین وائس چانسلر علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی (۳) مسٹر شنکر پرشاد چیف کمشنر دہلی (۴) مسٹر شوراج بہادر۔ ۱۷ راج نارائن روڈ دہلی۔ (۵) مسٹر برج نارائن ۲ راج نارائن روڈ دہلی (۶) مسٹر وی شنکر جائنٹ سکرٹری منسٹری آف ڈیفنس حکومتِ ہند (۷) سیّد اشفاق حسین ڈپٹی سکرٹری مملکۃ تعلیمات حکومتِ ہند۔

بیگم صاحبہ پالودی، نواب زین یار جنگ بہادر اور جوش ملیح آبادی حاضر نہ ہوسکے۔ لیکن اُنھوں نے میٹنگ کے مقاصد اور سوسائٹی کے ممبر بننے کے باب میں اپنی قبولیت کی اطلاع دے دی تھی۔

میٹنگ میں مندرجہ ذیل ریزولیوشن پاس ہوا۔

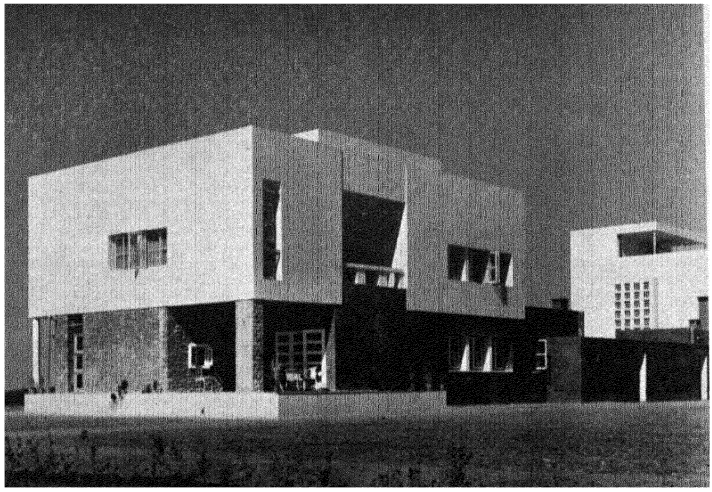
غالب سوسائٹی کے نام سے ایک ایسوسی ایشن مرزا اسداللہ خاں غالب کی مستقل یاد منانے کی غرض سے فوراً قائم کی جائے۔ مرزا کے مزار کی مرمّت، اس پر مناسب عمارت کی تعمیر اور مرزا کی یادگار کے طور پر ایک پبلک ہال تعمیر کرنے کے سلسلے میں فوری قدم اُٹھائے جائیں ــــ اس سلسلے میں سیّد اشفاق حسین نے کمیٹی کو مطلع کیا کہ نظام الدین تھانے کے پیچھے ایک قطعۂ زمین جو متھرا روڈ، لودھی روڈ، کھائی اور چوسٹھ کھمبے کے سامنے سے گزرنے والی سڑک سے محصور ہے لینڈ ڈیولپمنٹ آفیسر دہلی نے میموریل ہال کے لئے وقف کردیا ہے۔ یہ فیصلہ کیا گیا ہے کہ غالب سوسائٹی کے رجسٹرڈ ہوتے ہی یہ قطعۂ زمین حاصل کرنے کے لئے درخواست دے دی جائے۔ میٹنگ نے اس کے بعد مندرجہ ذیل اصحاب پر مشتمل سوسائٹی کی پہلی انتظامیہ کمیٹی کو منتخب کیا۔

ڈاکٹر ایس۔ ایس بھٹناگر صدر۔ مسٹر وی شنکر خازن۔ سیّد اشفاق حسین سکرٹری۔ اراکین۔ بیگم صاحبہ پالودی۔ جوش ملیح آبادی۔ مسٹر شنکر پرشاد۔ مسٹر برج نارائن۔ مسٹر شوراج بہادر۔ نواب زین یار جنگ بہادر۔ ڈاکٹر ذاکر حسین۔ فیصلہ کیا گیا کہ سوسائٹی کے قواعد و ضوابط وضع کئے جائیں۔ قواعد کے مسودے کی نقل جو کہ تیار ہوچکی تھی، ممبروں کو غور کرنے کے لئے دی گئی۔ سکرٹری کو ہدایت کی گئی کہ سوسائٹی کو جلد از جلد رجسٹرڈ کرائے۔

پنجاب کا نیا دارالسلطنت

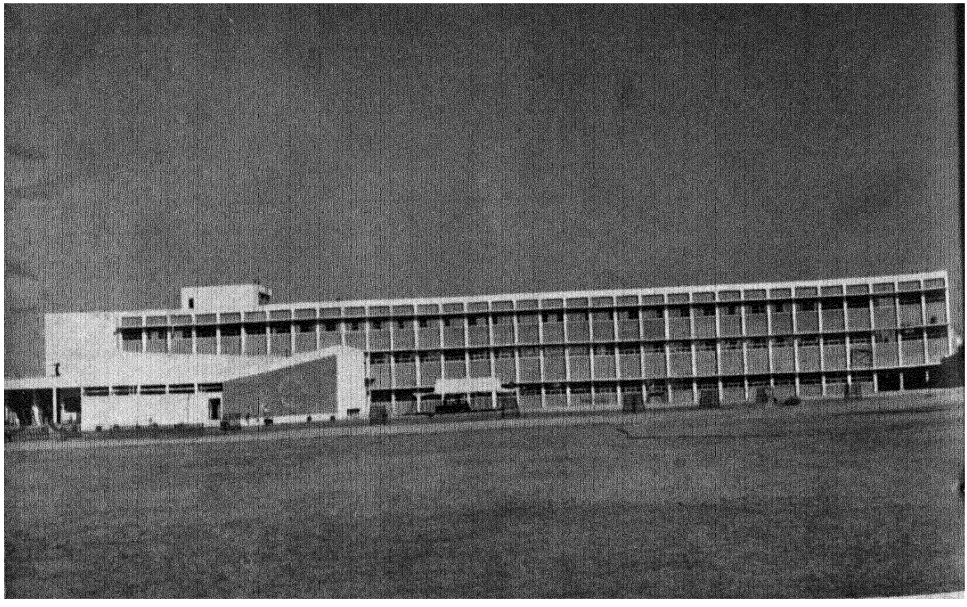
چنڈی گڑھ

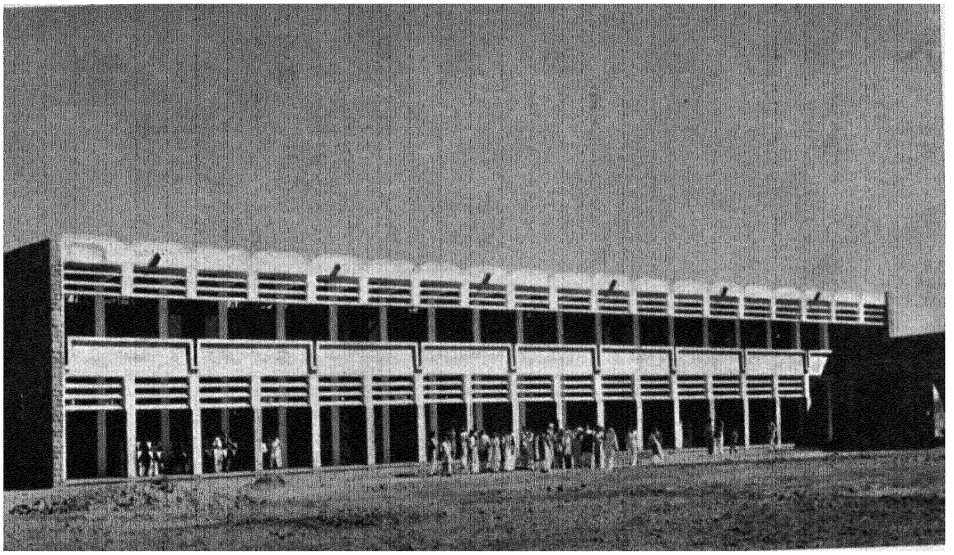
سوالک کی پہاڑیوں کے دامن میں
جدید طرز کا ایک خوبصورت شہر
یہ تعمیر ہے - ان صفحات کی
تصاویر اسی سے متعلق ہیں -



ججوں کے بنگلوں
میں سے ایک بنگلہ

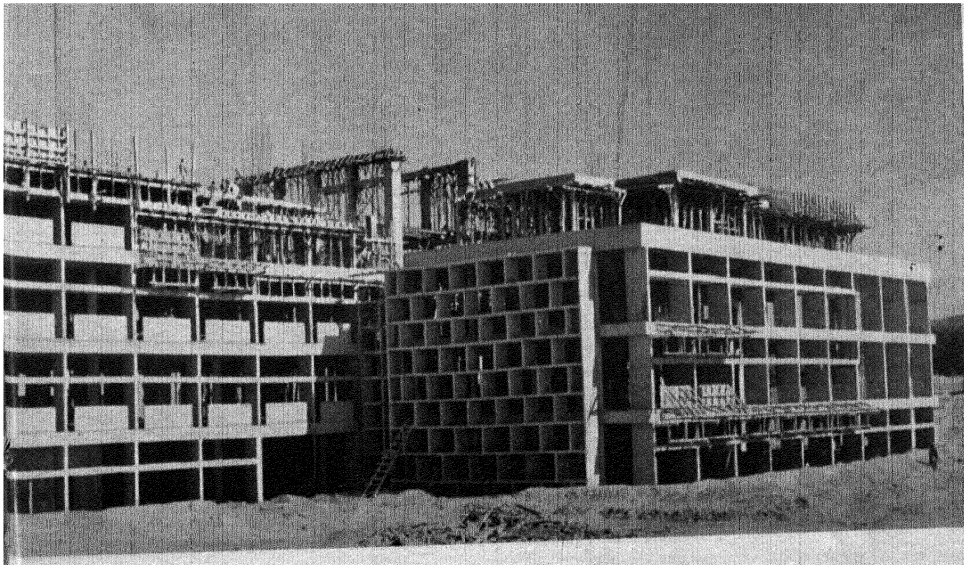
پنجاب انجنیرنگ کالج

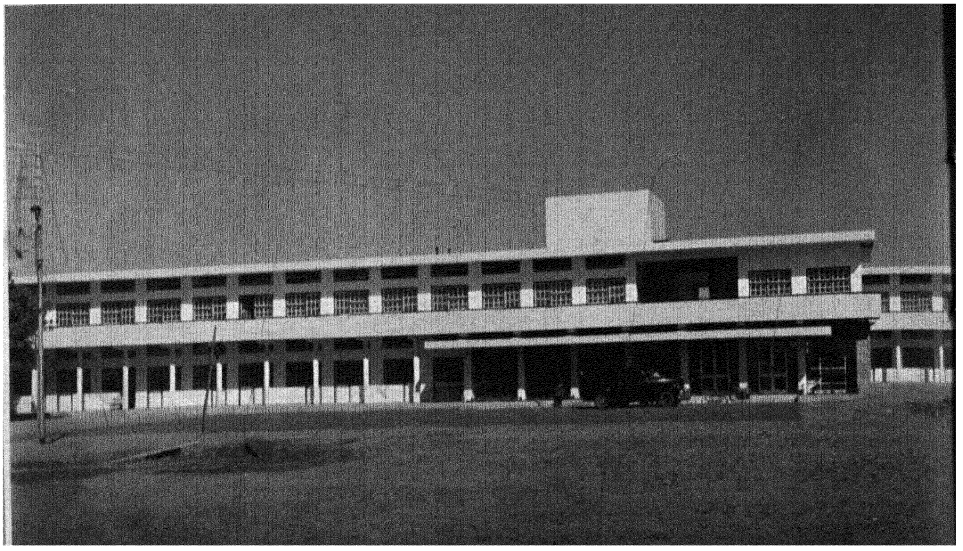




سیکٹر نمبر ۲۳ میں گرل ہائی اسکو

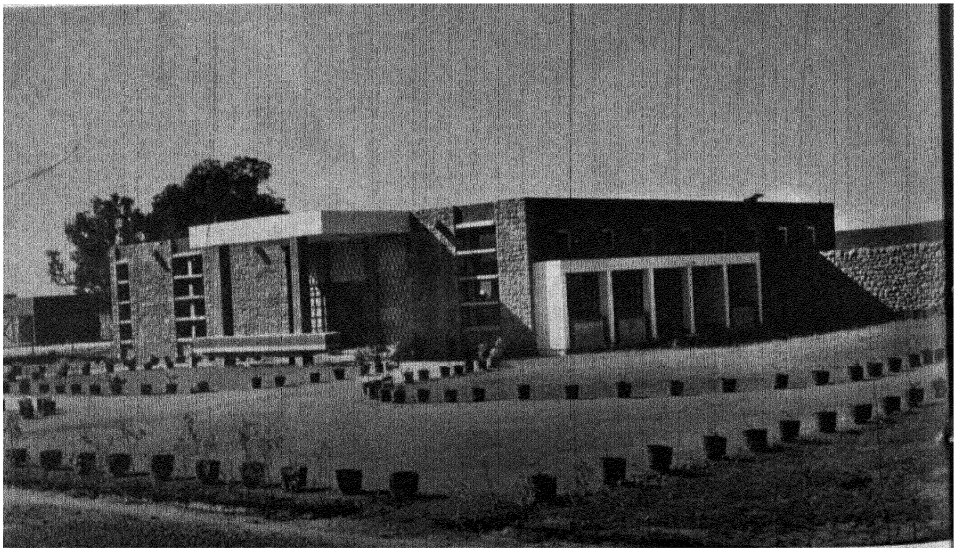
پنجاب ہائی کورٹ کی زیر تعمیر عمارت

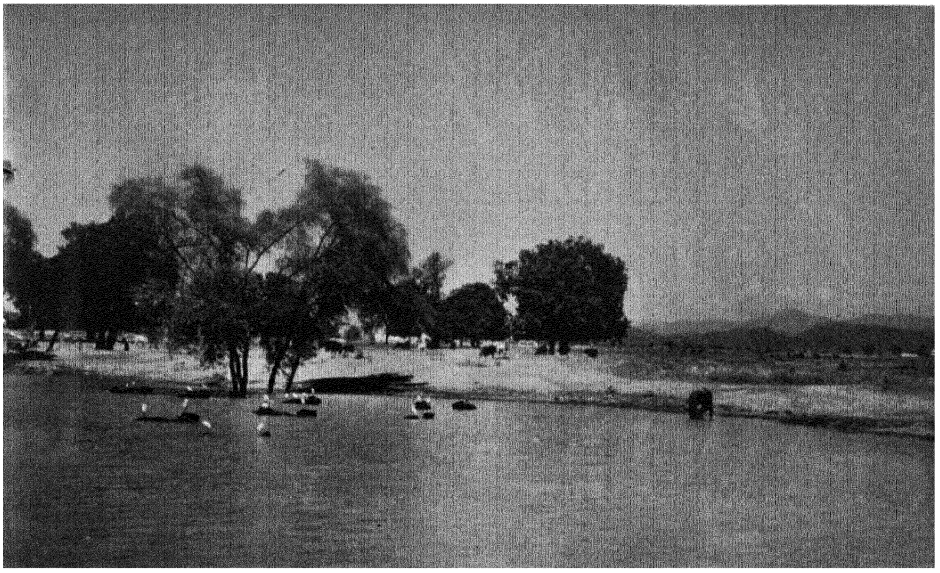




پنجاب انجینئرنگ کالج ہوسٹل کا ایک منظر

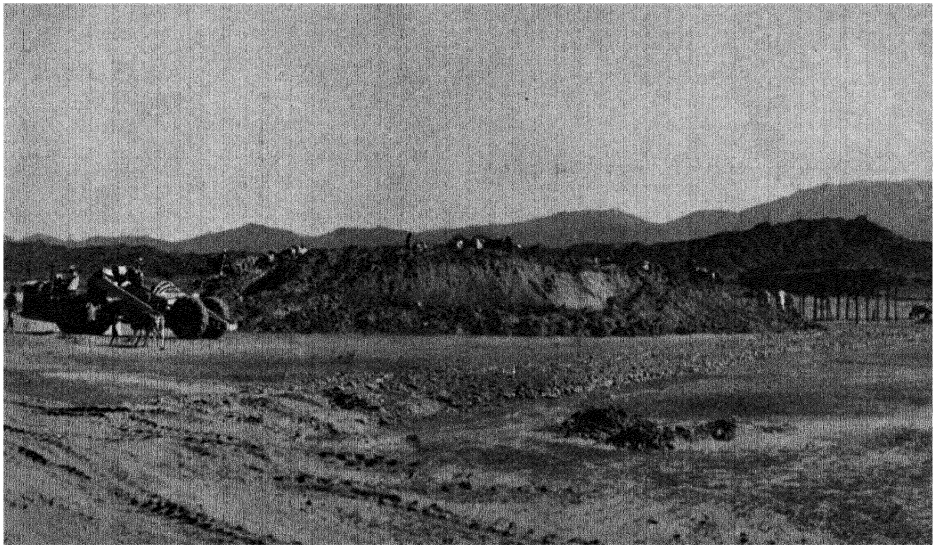
ک وزیر کے رہنے کا بنگلہ





دیہاتی فضا کا ایک منظر جہاں چنڈی گڑھ کا شہر جدید زیر تعمیر ہے

سوالک کی پہاڑیوں کے دامن میں پلنجاب سکریٹریٹ زیرتعمیر ہے



یگانہ آرٹ

بندھی ہے بکتی، آپس میں گفتگو نہ سہی — زبانِ حال سہی حسرتِ آرزو نہ سہی

بھرا ہے بادۂ بیرنگ سے یہ شیشۂ دل — داغ تازہ ہے اپنا شگفتہ رو نہ سہی

ٹٹول لینے سے بیچارہ کیوں رہے محروم؟ — ہوس نصیب کو احساسِ رنگ و بو نہ سہی

بھری بہار میں نیت نہ ہوگی دانوں ٹوٹ؟ — خیالِ خام سہی، تیری آرزو نہ سہی

مزاج کیونکر بہکتا زمانہ سازوں کا — زمانہ اُن کے موافق ہے ایک تُو نہ سہی

جو تیری یاد میں کھویا گیا تو کیا پروا؟ — جدھر بھی ہو دلِ گم گشتہ قبلہ رُو نہ سہی

پیامِ حق تو اُدھر ہی سے آئے گا اک دن — کھڑے ہیں منتظرِ وقت جستجو نہ سہی

خدا کے سامنے پاکیزگی جتانا کیا؟ — نگاہ پاک ہو، دل صاف ہو وضو نہ سہی

کہاں وہ جلوۂ عریاں، کہاں یہ حسنِ حجاب — یہی تو دید کے قابل ہے، روبرو نہ سہی

یگانہ آم وہی ہیں وہی ہیں خربوزے
یہ لکھنؤ ہے وہی گو وہ لکھنؤ نہ سہی

غزل

اگر مذاق دوئی دل میں دخل پا نہ سکے — بشر خود اپنے ہی جلووں کی تاب لا نہ سکے

پناہ، لمحۂ دل آشکوں کی رو سے پا نہ سکے — بہائے تیز تھا دریا کے پار جا نہ سکے

حجاب، حسن کی فطرت، حجاب، ظلمِ عظیم — مگر وہ آنکھ جو تابِ جمال لا نہ سکے

وہ مجھ پہ کرتے عنایت یہ دور کی تھی بات — تسلیوں کے سہارے بھی ہاتھ آ نہ سکے

کلیمِ خام نظر تھے، مجھے نہیں تسلیم — یہ اتفاق، کہ تابِ جمال لا نہ سکے

پھر اُس کو صورِ قیامت بھی کیا اُٹھائے گا — تری نگاہ گر اک بار جسے اُٹھا نہ سکے

چمن میں غنچۂ تصویر تو نہیں تھے ہم — کہ گدگدایا بہاروں نے مسکرا نہ سکے

اگل رہا ہے ہر اک پھول مستقل شعلے — غلط کہ دامنِ گلشن پہ آنچ آ نہ سکے

جگر کے زخم ہنسے، گل ہنسے، ہنسیں کلیاں
ہمیں اک ابر بہاروں میں مسکرا نہ سکے

کرتار سنگھ دُگل

کھٹّی لسّی

کھٹّی لسّی، اس کا نام سوبھاں اس کی بہن نے رکھا تھا۔ سردیوں کی ایک دوپہر دھوپ میں پڑا چٹّا گورا وہ اسے ایسے لگا جیسے کھٹّی لسّی ہو۔ اور کتنی دیر اس کے چھوٹے چھوٹے پیروں کو منہ میں لے کر چباتی، اس کے ہاتھوں کو چومتی چاٹتی۔ اس کے انگ انگ کو سہلاتی دباتی، بار بار اسے وہ کھٹّی لسّی، کھٹّی لسّی کہتی رہی اور وہ کھلکھلا کر ہنستا رہا۔ ہنس ہنس کر دوہرا ہوتا رہا۔

اور پھر جب کبھی اسے اپنے ننھے سے بھائی پر پیار آتا، اسے وہ کھٹّی لسّی کہہ کر بُلایا کرتی تھی۔

کھٹّی لسّی اُسے کہتی اور اس کا اپنے بھیّا کے لئے پیار جیسے اُس کی آنکھوں میں اُمڈ آتا۔ وہ اُسے کھٹّی لسّی کہہ کر بُلاتی۔ یہ سنتے ہی وہ مُسکراتا اور بہن کے ہاتھ ایک بے پایاں محبّت میں ڈوب کر بھائی کی طرف کھُل جاتے اور اپنی چھاتی سے لگا کر وہ اسے بھینچ بھینچ سی ڈالتی۔ وہ کھیل رہا ہوتا، دُور سے اُسے کھٹّی لسّی کہہ کر وہ پکارتی اس کا مُنہ جیسے شہد کے گھونٹ سے بھرا ہوتا میٹھی مصری کا مزا سا جیسے آس پاس میں بکھر جاتا۔

پھر وہ بڑا ہوا اور بہن بھائی جب کبھی اکیلے ہوئے تو وہ اُس سے پُوچھا کرتا، بہن تو نے میرا نام کھٹّی لسّی کیوں رکھا تھا؟

بہن کو کوئی وجہ نہ سُوجھتی۔ وہ بھائی کے گورے گورے مُکھڑے کی طرف بار بار دیکھتی۔ ایک الہڑ لڑکی کے مُنہ میں اپنی کا نام سُن کر جیسے پانی بھر جاتا ہے ویسے ہی اپنے بھائی کی طرف دیکھتے ہی اُس کے مُنہ میں پانی آ جاتا۔

اور وہ اُسے پھر کھٹّی لسّی کہتی۔ اُسے کھٹّی لسّی کہتی اور اس کی انگلیوں کو دھیرے سے مُنہ میں لے کر دانتوں کے نیچے چبا چبا لیتی۔

پھر وہ اور بڑا ہو گیا۔ اُس کی بہن اور بڑی ہو گئی۔ اُس کی بہن کا بیاہ ہو گیا۔ اور وہ اپنے سُسرال چلی گئی۔ سُسرال سے بہن کے خط آئے۔ چٹھی دیکھ کر وہ تڑپ اٹھتا تھا۔ کہاں سوبھاں نے لکھا ہے، کھٹّی لسّی کو پیار۔

اور "کھٹّی لسّی" اپنا نام چٹھی میں دیکھ کر اُسے ٹھنڈک سی پڑ جاتی۔

اُس کی بہن اُسے کھٹّی لسّی کہہ کر بُلاتی ہے یہ بات ایک دن ایک پڑوسی بچّے نے باتوں باتوں میں اپنے اسکول کے لڑکوں کو بتا دی۔

کھٹّی لسّی سُنتے ہی ایک بچّے نے ہنسنا شروع کر دیا۔ ایک کو ہنستا دیکھ کر باقی کے سب بھی ہنس پڑے۔ ہنستے جاتے، ہنستے جاتے جب ہنسی ذرا دھیمی پڑنے لگتی تو پھر کوئی کہہ دیتا۔ کھٹّی لسّی اور پھر سب کے سب بچّے کھکھلانے لگتے۔ وہ

اُن کے مُنہ کی طرف دیکھتا رہا اور چُپ چاپ کمرے میں جا کر اپنی کتاب کھول کر پڑھنے لگ گیا۔

وہ چلا گیا۔ بچے پھر بھی ہنستے رہے۔ پھر ایک لڑکے کو شرارت سُوجھی۔ اسکول کے سامنے والے گھر میں گائے تھی۔ وہاں سے ایک چھاچھ کا گلاس لے آیا اور اونٹے جماعت کے ایک لڑکے کے ہاتھ گلاس اندر بھجوا دیا۔

یہ کھٹی لسی کا گلاس تمہارے لئے مائی ہیرو نے بھیجا ہے جیسے چھوٹے لڑکے کو سکھایا گیا تھا ویسے ہی اس نے اندر جا کر اُسے کہہ دیا۔

اور سوبھاں کا بھائی تیج غضب آلود آنکھوں سے اس بچے کی طرف دیکھنے لگا۔

باہر کھڑکیوں کے پیچھے سے چھپے ہوئے لڑکوں نے پھر کہنا شروع کر دیا۔ کھٹی لسی، کھٹی لسی، کھٹی لسی کہتے اور ہنستے جاتے۔

اُسی دن جماعت میں پڑھتے ہوئے ایک لڑکے نے اپنے اُستاد سے پوچھا۔ جی کھٹی کو انگریزی میں کیا کہتے ہیں؟ اُستاد نے اسے بتایا۔ دوسرا لڑکا بولا اجی لسی کی انگریزی کیا ہوتی ہے۔ اور پھر سارے لڑکے ہنس پڑے اُستاد کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔

اگلی گھنٹی حفظان صحت کی تھی۔ اُستاد نے بتایا۔ اچھی صحت کے لئے ہمیں دودھ، دہی اور لسی کا زیادہ سے زیادہ استعمال کرنا چاہئے۔

ماسٹر جی کھٹی لسی بھی صحت کے لئے اچھی ہوتی ہے ایک لڑکے نے کھڑے ہو کر پوچھا اور باقی سب لڑکے ہنس پڑے۔

اس اُستاد کی سمجھ میں بھی کچھ نہ آیا اور وہ پڑھاتا رہا۔

اگلی گھنٹی کے شروع میں تیج ایک منٹ کے لئے باہر گیا۔ جب واپس آیا تو سامنے کالے تختے پر چاک سے لکھا ہوا تھا، کھٹی لسی! اس نے یہ دیکھا اور اس کا چہرہ ایک دم تمتما اُٹھا۔ لڑکوں نے ہنسنا شروع کر دیا۔ اتنے میں استاد آ گیا اور اس نے جغرافیہ پڑھانا شروع کر دیا۔ نہ اس استاد کو بلیک بورڈ کی ضرورت پڑی نہ اس نے بلیک بورڈ کی طرف دیکھا۔ اس گھنٹی کا سارا وقت سامنے بلیک بورڈ پر موٹے موٹے حروف میں لکھا ہوا تھا کھٹی لسی، اور تیج ایک پل کے لئے آنکھیں اُوپر نہ اُٹھا سکا۔

اسکول کے بعد اس نے آنکھ بچا کر بھاگنے کی کوشش کی، مگر لڑکوں نے کسی نہ کسی طرح اسے گھیر لیا۔ کھٹی لسی، کھٹی لسی کہتے گئے اور ہنستے گئے۔ تیج جو ابھی تک چُپ تھا، جھنجھلا کر ایک لڑکے کو ٹھوکر مار بیٹھا۔ پھر کیا تھا۔ باقی سبھی اس پر ٹوٹ پڑے اور اسے مار پیٹ کر کھٹی لسی، کھٹی لسی کہتے پھر اپنے اپنے گھر بھاگ گئے۔

اگلے دن جب وہ پڑھنے آیا۔ اسکول کی چار دیواری پر، حلوائی کی دکان پر، کمرے کے دروازے پر، بلیک بورڈ پر، ڈیسک پر، جہاں وہ بیٹھتا تھا ہر جگہ کھٹی لسی، کھٹی لسی لکھا ہوا تھا۔ ہری سفید لال کھڑیا رنگ سے۔ جدھر بھی اس کی آنکھ اُٹھتی۔ کھٹی لسی، کھٹی لسی کے علاوہ اُسے کچھ بھی دکھائی نہ دیتا۔

سہما سہما دبکا دبکا ایک فاختہ کی طرح اپنے پروں کو سنبھالے وہ کمرے کے اندر اپنی جگہ پر بیٹھ گیا۔ اسے ایسا لگا جیسے اس کے کندھوں پر منوں بوجھ ٹوٹ پڑا ہو جیسے لاکھوں آنکھیں گھور گھور کر اسے دیکھ رہی ہوں۔

تیج سارے اسکول میں سب سے سُندر۔ سب سے زیادہ ذہین لڑکا تھا۔ جو کام دوسرے لڑکے نہیں کر سکتے وہ کر لیتا۔ جو بات دوسروں کی سمجھ میں نہ

آتی وہ اسے جھٹ سمجھ لیتا۔ اس کا بستہ صاف اس کی کتابیں کاپیاں ہر چیز ہمیشہ ستھری ہوا کرتیں۔

یہی سبب تھا کہ لڑکے ہمیشہ اس سے حسد کرتے تھے۔ جب بھی اُستاد شاگردوں پر ناراض ہوتا ایک وہی اس کے غصّے سے بچا رہتا۔

کئی لڑکوں کو وہ اچھا لگتا تھا مگر تیج ان سے بھی ہنستا کھیلتا نہیں تھا۔ کئی ایک کو امتحان میں اس کی نقل کرتا ہوتی حالانکہ وہ اس کام میں اُن کی مدد نہیں کرتا تھا۔

اُسی دن پہلی گھنٹی میں ہی استاد نے کوئی سوال کیا۔ ساری کی ساری جماعت میں کوئی جواب نہ دے سکا۔ تیج کو اس سوال کا جواب معلوم تھا مگر لڑکوں کے ڈر کی وجہ سے چُپ رہا۔ پھر ٹپ ٹپ آنسو بہاتے ہوئے سب لڑکوں کے ساتھ اُس نے دو بید اپنی ہتھیلیوں پر کھا لیے۔

بید لگا کر اُستاد نے ساری جماعت کو جواب لکھوانا شروع کیا۔ تیج نے جب ڈیسک میں سے دوات نکالی تو سیاہی کی جگہ اس میں لسّی بھری ہوئی تھی۔ تیج کی دوات دیکھ کر سارے لڑکے ہنس پڑے۔ اُستاد کچھ نہ سمجھ سکا۔ اُس نے خفا ہو کر ایک دو لڑکوں کے ساتھ تیج کو بھی پیٹ ڈالا۔ اور اس کی لسّی سے بھری دوات کو اُٹھا کر باہر پھینک دیا۔

اسکول میں کمرے سے باہر جدھر بھی وہ جاتا اسکول کے چپڑاسی، خوانچے والے، مالی، مہتر، اُستاد ہیڈ ماسٹر سب اُسے کھٹّی لسّی کہہ کر چھیڑتے۔

اسکول کی دیواریں، بلیک بورڈ، دروازے، کھڑکیاں فرش "کھٹّی لسّی"۔ "کھٹّی لسّی" سے بھرے جا رہے تھے۔ اسکول کے لال لیٹر بکس پر بھی کسی نے "کھٹّی لسّی" لکھا ہوا تھا۔ شہتوت کے نیچے پڑے ہوئے پانی کے مٹکوں پر سفید کھڑیا مٹّی سے لکھنے والے بار بار "کھٹّی لسّی" کھٹّی لسّی" لکھ جاتے اور بار بار بہشتی اُنہیں مٹاتا رہتا۔

تیج کے من میں آتا کہ وہ کہیں بھاگ جائے چُھپ چُھپ کر وہ روتا رہتا۔ ہر وقت اُسے ڈر رہتا کہ ابھی کوئی اُسے "کھٹّی لسّی" کہہ کر چڑائے گا اور آس پاس کھڑے سبھی لوگ ہنس پڑیں گے۔ جب کبھی اس کی نظر اُوپر اٹھتی جہاں بھی اس کی آنکھ پڑتی وہاں "کھٹّی لسّی" لکھا ہوتا۔

جس دن سے وہ لڑکوں سے لڑا تھا اُس دن سے کوئی لڑکا اس سے بات نہیں کرتا تھا۔ تیج خود بھی کسی کے ساتھ نہیں بولتا تھا۔ ویسے بھی فطرتاً وہ خاموش طبع ہی تھا۔

جماعت کے باہر وہ ایک قدم چین سے نہیں اُٹھا سکتا تھا۔ اور جماعت میں حالت یہ تھی کہ لڑکوں کو ایک اُستاد کے جانے اور دوسرے کے آنے میں جو وقت ملتا اس میں تیج کی مٹّی پلید کر دیتے۔

اور پھر ایک دن اسکول کے کمرے میں وہ پھُوٹ پھُوٹ کر رونے لگا۔ اگلے دن اُسے بُخار ہو گیا اور وہ اسکول نہ آیا۔ پھر ہر روز اسکول کے نام ہی سے اُسے بخار ہو جاتا۔

دوپہر کے بعد جب اس کا بخار اُترتا تو اُس کا جی چاہتا کہ وہ باہر نکلے پر جس گلی میں وہ جاتا لڑکے کھٹّی لسّی" "کھٹّی لسّی" کہہ کر اُسے چڑاتے۔ بازار میں۔ کھیل کے میدان میں ہر جگہ جہاں بھی کوئی تیج کو دیکھ لیتا۔ آہستہ سے کھٹّی لسّی کہہ دیتا اور باقی ہنسنا شروع کر دیتے۔ اپنے بچّے کی حمایت میں اُس

کی ماں نے اڑوس پڑوس والوں سے لڑنا شروع کر دیا اس کے والد نے ایک دن بازار میں کھڑے ہو کر شرارتی لڑکوں کے ماں باپ کو گالیاں دیں۔

پھر کیا تھا جیسے ایک آگ سارے گاؤں کو لگ گئی ہر جگہ تیج کا چرچا ہونے لگا۔ ہر جگہ "کھٹی لسی" "کھٹی لسی" کی آواز سُنائی دینے لگی۔ پنچایت کے پنچ اس بات پر ہنستے رہتے چوپال میں بیٹھے نوجوان اس کا مذاق اُڑاتے رہتے۔ عورتیں پانی بھرتی ہوئی، سندر جاتی ہوئی، گلی کوچوں میں کھڑی "کھٹی لسی" "کھٹی لسی" کا ذکر کرتی رہتیں۔

تیج ڈرتا باہر نہ نکلتا گھر بیٹھتا تو والدین اس پر ناراض ہوتے اُدھر اسکول کی پڑھائی خراب ہو رہی تھی۔ اس بات کی فکر خود اُسے کھائے جا رہی تھی۔

گھر پر بھی وہ باہر آنگن میں نہ بیٹھتا۔ گلی میں سے گزرتے چھوٹے چھوٹے بچے اسے "کھٹی لسی" کہہ کر بھاگ جاتے اور وہ دانت پیستا رہ جاتا۔ اُس کی ماں گالیاں دیتی تھی۔ اور بچے اور زیادہ اونچی آواز میں مل کر کہتے۔ "کھٹی لسی" اور پھر چھپ جاتے۔

رات کو سوتے سوتے کئی بار گھبرایا سا وہ اُٹھ کھڑا ہوتا۔ گھبراہٹ سے اس کے پسینے چھوٹ جاتے اور کانپتا ہوا کچھ نہ کچھ بڑبڑاتا رہتا۔

ایک شام لیٹر بکس میں ایک چٹھی ڈالنی تھی۔ اس کا والد گھر پر نہیں تھا۔ اس کی ماں کھانے پکانے سے فارغ نہیں ہوئی تھی۔ کتنی دیر سے وہ تیج کو چٹھی ڈالنے کے لئے کہہ رہی تھی۔ تیج ٹالتا جا رہا تھا آخر اُس کی ماں نے ناراض ہونا شروع کر دیا۔ تیج ماں سے ڈرتا ہوا چٹھی لے کر گھر سے نکل پڑا۔ اُسے دو گلیوں میں سے ہو کر گزرنا تھا۔ پھر کھیل کا میدان اور پھر پکی سڑک پر لیٹر بکس۔

تیج ایک گلی میں سے تو ڈرتا سہمتا گزر گیا۔ دوسری گلی میں لڑکے گلی ڈنڈا کھیل رہے تھے۔ ایک لڑکے نے اُسے دیکھتے ہی کہا۔ "کھٹی لسی" اور باقی سب کھیل چھوڑ کر ہنسنے لگے۔ تیج کا دل دھڑکنے لگا۔ اس کے قدم تیزی سے بڑھنے لگے۔ لڑکوں نے مل کر پھر کہا۔ "کھٹی لسی"۔ اور اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگے۔ تیج ایک دم دوڑنے لگا۔ سب کے سب لڑکے "کھٹی لسی" "کھٹی لسی" کہتے اس کے پیچھے ہو لئے۔ سامنے بازار تھا۔ بازار میں لوگوں نے تالیاں بجائیں۔ آگے آگے تیج اور پیچھے پیچھے بچے، جوان، بوڑھے، مرد، عورتیں "کھٹی لسی" "کھٹی لسی" کہتے تیج کو ایسے لگا جیسے ایک طوفان اس کے پیچھے چلا آ رہا ہے۔

کھیل کے میدان میں اور لڑکوں نے "کھٹی لسی" "کھٹی لسی" کہنا شروع کر دیا۔ تیج دوڑتا دوڑتا راستے سے بھٹک گیا اور پتھر، کانٹے، جھاڑیاں، گڑھے پار کرتا گاؤں سے باہر نکل آیا اور دوڑتا گیا۔ اُسے ایسا محسوس ہوا جیسے سارے کا سارا گاؤں اُس کے پیچھے آ رہا ہے۔ آخر ایک جھاڑی کے پاس وہ بیہوش ہو کر گر پڑا۔

اندھیرا ہو چکا تھا جب اس کے والد نے اُسے گاؤں کے باہر جنگل میں پڑا پایا۔ وہ بخار سے پھنکا جا رہا تھا۔ گھر لا کر لاکھ دوائیاں کی گئیں ڈاکٹر آئے حکیم آئے۔ پھر تیج نے کہیں آنکھیں کھولیں۔ آنکھ تو اس نے کھول دی مگر تیج کسی کو پہچان نہیں سکتا تھا۔ اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرتے جاتے تھے۔ ڈاکٹر آئے اور علاج ہوا پھر پتہ چلا کہ تیج کے دماغ میں خلل آ گیا ہے۔ اب اس نے کپڑے پھاڑنے، بال نوچنے، دانتوں سے کاٹنا اور

گندی گالیاں دینا شروع کر دیا ۔ آ گئے، آ گئے کہتا اور پلنگ کو چھوڑ کر بھاگنے لگتا ۔ نہ کسی کے سمجھائے سمجھتا نہ کسی کے سنبھالے سنبھلتا ۔ باندھ کر اور جکڑ جکڑ کر اسے رکھتے ۔

ماں باپ کا اکلوتا بیٹا ۔ لاکھ علاج تیج کے ہوئے ۔ جھاڑ پھونک کرنے والے اور منتر پڑھنے والے آئے ۔ مالش کرنے والے سارا سارا دن مالش کرتے رہتے ۔ انگریزی دوائیاں، دیسی دوائیاں کسی چیز کی کمی نہ رہی ۔ گھر میں جب وہ اچھا نہ ہوا تو اسے ہسپتال میں داخل کروا دیا گیا ۔

جس دن وہ ہسپتال پہنچا اسی شام اس کی بہن سوبھاں آ گئی ۔ ہسپتال والوں نے اسے ایک ہوا دار کمرے میں تنہا رکھا ہوا تھا ۔ گھر والوں کو اس سے ملنے کی اجازت نہیں تھی ۔

کسی نہ کسی طرح سوبھاں چپکے سے تیج کے کمرے میں چلی گئی ۔

"کھٹی لسی"! سوبھاں نے ارمان بھری آواز میں کہا اور اُچھل کر جیسے اپنے بھیّا کے پلنگ پر جا گری ۔ "کھٹی لسی" کہتی اور اُسے چومتی ۔ "کھٹی لسی" کہتی اور اسے چھاتی سے لگاتی ۔ "کھٹی لسی" کہتی اور اس کی اُنگلیوں کو دانتوں کے نیچے دھیرے دھیرے چباتی ۔ جیسے گھور گھٹاٹوپ گھٹاؤں کے پیچھے سے کبھی سُورج زبردستی اُبھر آتا ہے ویسے ہی تیج کے دماغ پر چھائے ہوئے اندھیرے کے پردے ہٹنے شروع ہو گئے ۔ سوبھاں "کھٹی لسی" "کھٹی لسی" کہتی اور تیج کے ماتھے سے بیماری کے نشانات مٹتے جاتے ۔ اس کی آنکھوں میں چمک سی آنا شروع ہو گئی ۔ سوبھاں اس کے ہاتھوں کو دباتی ماتھے کو ملتی ۔ گالوں کو دُلارتی ۔ اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتی ۔ بار بار اُسے "کھٹی لسی ۔ کھٹی لسی" کہہ کر پکارتی جیسے اُسے گہری نیند سے جگا رہی ہو ۔ کوئی پندرہ منٹ اسی طرح کرنے کے بعد جب سوبھاں نے "کھٹی لسی" کہا تو تیج کا جکڑا ہوا سا جسم کھُل گیا ۔ اُس کے ہونٹوں پر مُسکراہٹ دوڑ گئی ۔ اُس نے اپنی بہن کو پہچان لیا ۔ پھر وہ دونوں کتنی ہی دیر بیٹھی بیٹھی باتیں کرتے رہے ۔ سوبھاں جب کھٹی لسی کہتی تو اس کے بھیّا کی جیسے میل کی تہیں اترتی جاتیں ۔ "کھٹی لسی" سوبھاں کہتی تو اس کے دل کو سکون سا مل جاتا ۔ بار بار وہ سسکیاں لیتا اور بار بار وہ اپنی بہن کی آنکھوں میں بے پایاں محبّت کا اُمڈتا ہوا ساگر دیکھتا ۔ اس کے انگ انگ میں طاقت بھرتی جاتی ۔

اس رات سوبھاں وہیں رہی ۔ اگلے دن وہ اپنے بھیّا کو ہنستا کھیلتا ٹانگے میں بٹھا کر گھر لے آئی ۔ "کھٹی لسی" وہ اپنی بہن کو پکارتے ہوئے سُنتا تو اس میں اتنی طاقت اتنی دلیری آ جاتی کہ تیج سوچتا کہ وہ تو دیواروں کو گرا سکتا ہے ۔ لاکھوں سے لڑ سکتا ہے ۔

بشیشور پرشاد منوّر لکھنوی

شاعر سے!

آئینہ تجھ پہ نہیں تیرے حقیقی جوہر
میں بتاتا ہوں تجھے تیرا وقار اے شاعر

اپنی عظمت کے لئے غیر کا محتاج نہیں
اپنی عظمت کا ہے تو آئنہ دار اے شاعر

جامِ جم سے بھی سوا کچھ ہے ترے جام کی قدر
مستقل ہے تری صہبا کا خمار اے شاعر

عنبر و عود جلاتی ہے تری بزم میں شام
ہے سخن تیرے لئے غالیہ بار اے شاعر

فرشِ پا تیرے لئے دیدۂ غلمانِ حسیں
تجھ پہ نا طورۂ جنّت بھی نثار اے شاعر

یہ تو خود تیری بڑائی سے شرف پاتے ہیں
کیا کروں تجھ کو فرشتوں میں شمار اے شاعر

ہیں ترے سامنے فردوس کے گلشن بھی حقیر
تری ہستی نہیں صحرا کا غبار اے شاعر

تو جو بہکے تو اُلٹ جائے نظامِ کونین
ترے شانوں پہ دو عالم کا ہے بار اے شاعر

ترے ہاتھوں میں ہے اسرار و معانی کی لگام
تو ہے شبدیز حقیقت کا سوار اے شاعر

نظر و فکر سے اندازہ ہے دشوار اسان کا
تری قدروں کو وہ حاصل ہے قرار اے شاعر

پائداری میں قیامت ہے تری آتشِ فکر
تو نہیں محض دلِ برق و شرار اے شاعر

لاابالی ہی کہیں تجھ کو زمانے والے
لاشعوری ہی رہے تیرا شعار اے شاعر

سرحدِ ہوش سے بھی ترے قدم آگے ہیں
عقل پر کیوں ہو ترا دار و مدار اے شاعر

فرق و تمییز کا ایواں میں ترے دخل نہ ہو
ترے پابوس ہیں ہر نوں گل و خار اے شاعر

کیوں ترے پاؤں میں ہو حرصِ ہوس کی زنجیر
تُو نہ ہو دامِ علائق کا شکار اے شاعر

فرض ہے تجھ پہ ہوس کار حریفوں سے گریز
تجھ کو لازم ہے کمینوں سے فرار اے شاعر

خندۂ جہل سے احساسِ حقارت کیوں ہو
اپنی ہستی سے کبھی تجھ کو ندامت کیوں ہو

حلقۂ تنگ میں شرمندۂ دولت ہو کر
تری مٹّی نہ خدارا ہو خراب اے شاعر

بیچ دے گا جو خودی کو کسی نا اہل کے ہاتھ
تجھ پہ ٹوٹے گا قیامت کا عذاب اے شاعر

تجھ سے بڑھ کر تری تشریح کا یارا ہے کسے
تو ہے خود اپنے سوالوں کا جواب اے شاعر

تری منزل تو ہے دنیا کی منازل سے جدا
ہے کہاں کے لئے تو پا بہ رکاب اے شاعر

نہ رہے دل میں ترے خوفِ عقوبت باقی
لے کے رہ کفرِ محبت کا عذاب اے شاعر

بے ثباتی کا ہے بے کار تجھے اندیشہ
نقش تیرا تو نہیں نقش بر آب اے شاعر

تری ہستی کا ہے خود بیتے ہی نغموں سے ظہور
تیری ہستی نہیں محتاجِ رباب اے شاعر

مل چکا ہے تجھے خلّاقِ معانی کا لقب
تجھ کو حاصل ہے پیمبر کا خطاب اے شاعر

ہے ترے ذکر سے شاہین بھی افسانہ طراز
ہے تری فکر میں پروازِ عقاب اے شاعر

ہے تری فکرِ جواں بختِ جواں کی حامل
ہے تری عمر کا ہر روز شباب اے شاعر

میکدے حافظ و خیّام کے شاہد ہیں مرے
نشہ رکھتی ہے عجب تری شراب اے شاعر

جس کے غمزوں سے ردائے رُخِ کونین اٹی
تو ہے اس چشمِ عروسی کا حجاب اے شاعر

دمِ شب محفلِ انجم پہ نظر ہے تیری
ہیں عبارت ترے دل سے ترے خواب اے شاعر

تری تحریر ہے عکاسِ جمالِ پروین
ترے مضمون کی سُرخی ہے شباب اے شاعر

اُس کو اپنی نگہِ مہر سے ٹھنڈا کر دے
تجھ پہ جس کی بھی اُٹھے چشمِ عتاب اے شاعر

اب ترا کام ہے کعبے کو نہ کھولے پردہ
لے یہ ہے شاہدِ فطرت کی نقاب اے شاعر

دیکھ اس نظم کے آئینے میں صورت اپنی
پست ہو کر نہ مِلا، خاک میں عظمت اپنی

رحیم علی الہاشمی

ترجمہ کیسے کرنا چاہیئے

اس مضمون کا عنوان دیکھ کر آپ کو تعجب ہوگا کہ ترجمہ کرنا کونسی بڑی بات ہے۔ جس کے لئے مضمون لکھنے اور پڑھنے کی ضرورت ہو۔ یہ فن تو اتنا پُرانا اور فرسودہ ہے کہ جب سے حضرت آدم کی اولاد نے دنیا کے مختلف گوشوں کو آباد کیا اور اپنی اپنی تہذیب اور زبان الگ الگ بنائی اسی وقت سے ایک ملک کی زبان کا ترجمہ دوسرے ملک کی زبان میں ہوتا چلا آیا ہے۔ اور آج کل تو یہ چیز اتنی عام ہے کہ اسٹیشن یا ڈاک خانے کا تار بابو انگریزی نہ جاننے والے کو اس کے عزیز کی بیماری کا تار ترجمہ کرکے سُنا دیتا ہے اور Babu's condition improving کی جگہ بابو جی کی حالت ترقی کر رہی ہے کہہ دیتا ہے کہ دہلی آگرہ کے گائیڈ انگریز اور امریکی سیاحوں کو اپنا مطلب یہ کہہ کر سمجھا دیتے ہیں کہ You stand here Jahangir Badshah stands here اور خود یہ انگریز اور امریکن سیاح چند ہی دن ہندوستان کی سیر کرکے "پانی مانگتا" کہنے لگتے ہیں I want water کا ترجمہ ہے۔ آپ نے شاید وہ قصہ بھی سُنا ہوگا کہ ہندوستان میں بجلی کا رواج ہونے سے پہلے ایک انگریز ڈپٹی کمشنر کے یہاں اُن کے کوئی دوست انگلستان سے آکر مقیم ہوئے اور پنکھا کھینچنے والے قلی کو حکم دیا کہ Shut the door وہ بیچارا نہ سمجھ سکا اور صاحب کے بار بار کہنے پر بھی جب اس نے تعمیل نہ کی تو اس کی مرمّت کر دی گئی۔ قلی نے میزبان سے شکایت کی اور میزبان صاحب کو جب واقعہ معلوم ہوا تو انہوں نے مہمان کو سمجھایا کہ قلی آپ کی زبان نہیں سمجھتا ہے دیکھئے میں سمجھائے دیتا ہوں۔ چنانچہ انہوں نے قلی سے کہا "دیروازہ بیند کر" قلی نے فوراً دروازہ بند کر دیا۔ پھر صاحب نے کہا "دیروازہ کول ڈے"۔ قلی نے فوراً دروازہ کھول دیا۔ بس مہمان صاحب نے فوراً اپنی نوٹ بک نکالی اور لکھ لیا کہ:۔

'In India there was a Banker means shut the door and there was a cold day means open the door.''

آپ شاید یہ بھی کہیں کہ میرے خانساماں لوگ بھی تو ترجمہ کر لیتے ہیں اور جب وہ کسی ہندوستانی کے یہاں ملازم ہوتے ہیں تو وہاں بھی یہی ترجمے والی زبان بولتے ہیں اس سلسلے میں مجھے بھی ایک تجربہ ہوا ہے جو ناظرین کی ضیافت کے لئے پیش کرتا ہوں۔ دہلی کے ایک مشہور کلب کے بٹلر صاحب پنشن لے کر گھر آئے اور قسمت کے مارے میرے یہاں ملازم ہو گئے تو جب میں ان سے نرم انڈا تلنے کو کہتا تو یہ چیں بہ جبیں ہوتے اور اصرار کرتے کہ میں ہاپھ رائی کہا کردں۔ ان کا سن شریف ساٹھ کے لگ بھگ تھا اس لئے اُن کی بزرگی کا خیال کرکے میں انہیں بڑے میاں کہہ کر پکارتا تھا لیکن اس سے یہ ناراض ہوتے تھے اور چھوکرا کہہ کر پکارنے پر خوش ہوتے تھے۔ سب ماتیں کہاں تک لکھوں مختصر یہ کہ اس ترجمے کے بارے میں میرا

ان کا اختلاف یہاں تک بڑھا کہ ایک دن وہ اپنا بستر سنبھال کر چپکے سے چلتے بنے اور پھر آج تک اس طرف کا رُخ نہ کیا۔

مگر جناب میں اس وقت اس قسم کے ترجمے کی ترکیب نہیں بتانا چاہتا اس لئے کہ یہ تو مجھ سے بہتر آپ خود کر لیں گے۔ میں جس قسم کے ترجمے کی ترکیب بتانا چاہتا ہوں اس کا ہماری آپ کی موجودہ نسل اور آئندہ نسلوں کی زندگی سے بہت گہرا تعلق ہے، اور ہماری تہذیب و تمدّن کی ترقی کا اس پر بہت کچھ انحصار ہے۔ آپ نے محسوس کیا ہوگا کہ مختلف قوموں میں تجارتی، سماجی اور سیاسی تعلقات جتنے بڑھتے ہیں اتنی ہی ترجمے کی ضرورت وسعت اور ہمہ گیری بڑھتی جاتی ہے۔ اور آج کل آمد و رفت کی سہولتوں نے تو ترجمے کا میدان اتنا وسیع کر دیا ہے کہ ہر قدم پر ہمیں اس فن کے جاننے کی ضرورت ہوتی ہے۔ سیاسی معاہدوں کی اس زمانے میں اتنی کثرت ہے کہ ایک کی روشنائی خشک نہیں ہونے پاتی اور دوسرا طیار ہو جاتا ہے۔ ان معاہدوں کے الفاظ اور فقروں پر آپ نے غور کیا ہوگا تو آپ کو یہ اندازہ ہو گیا ہوگا کہ ان کے ترجموں میں جن کے بغیر کوئی معاہدہ مکمل نہیں ہوتا کس قدر کاریگری اور اُستادی کی ضرورت ہوتی ہے اور ان کے ترجمے کا کام کتنا کٹھن ہے۔ تعلیم کے پھیلانے کے لئے تو ترجمے کی بے پناہ ضرورت ہے، بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ ترجمے کے بغیر اس منزل میں ایک قدم بھی آگے بڑھنا دشوار ہے۔ عربی، فارسی، انگریزی سنسکرت کے علاوہ یورپ اور ایشیا کی دوسری زبانوں کے علوم و فنون جب تک ترجمے کے ذریعے سے ہماری زبان میں نہیں آئے اُس وقت علم کے ہر شعبے میں ہماری معلومات تشنہ رہیں۔ اور آج ہندوستان کی پہلی دیسی زبان کی یونیورسٹی حیدر آباد میں اسی کے بل بوتے پر چل رہی ہے اور جس حد تک ہمارے ملک میں ذریعۂ تعلیم دیسی زبان ہوتا جائے گا اس حد تک ترجمے کی ضرورت زیادہ سے زیادہ بڑھتی جائے گی۔ اخبار آج کل ہماری زندگی کا اہم جزو ہے لیکن جب ہم دیسی زبان میں کوئی اخبار نکالتے ہیں تو اس میں بہت کم حصّہ ایسا ہوتا ہے جو دوسری زبان سے ترجمہ کیا ہوا نہ ہو۔ عدالتوں میں شروع سے آخر تک ترجمے کا جتنا کام ہوتا ہے وہ عدالت سے سابقہ پڑنے والے ہر شخص کو معلوم ہے۔ لیکن روزمرّہ کی زندگی میں اگر بیگم صاحبہ انگریزی خوان نہیں ہیں اور آپ کی زبان سے قصداً یا بھولے سے کوئی انگریزی لفظ نکل گیا تو جب تک آپ اس کا ترجمہ نہ کر دیں گے آپ کا پیچھا نہ چھوٹے گا۔ چاہے آپ سوچ بچار کر یہ ترجمہ ایسا ہی کیوں نہ کریں کہ ناراضی کی بات ہونے کے باوجود بیگم صاحبہ خوش ہو جائیں۔

پھر بھی ہماری زندگی کے ہر شعبے میں ترجمہ اتنا ضروری ہونے کے باوجود فن کی حیثیت سے ابھی ہمارے یہاں بالکل ابتدائی حالت میں ہے اور واقعی ترجمہ کرنے والوں کا شمار کیا جائے تو سارے ملک میں بس اتنے ہی آدمی نکلیں گے جو انگلیوں پر شمار کئے جا سکیں۔ لیکن اس کے باوجود ترجمہ کی ہوئی کتابیں سیکڑوں کی تعداد میں روزانہ چھپ کر شائع ہو رہی ہیں۔ ترجمہ کرنے والوں کی اتنی کمی اور ترجمہ کی ہوئی کتابوں کی اتنی زیادتی سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ اس کے متعلق کچھ لکھنے کی کس قدر شدید ضرورت ہے۔

آپ جانتے ہیں کہ لوہار، بڑھئی، راج، مستری اور دوسرے کاریگروں کو اپنے کام کے لئے اوزاروں کی ضرورت ہوتی ہے۔ اسی طرح ترجمہ کرنے والوں کے لئے بھی چند اوزاروں کی ضرورت ہے اور گو ان کی شکل کتنی، لسوڑی، کُرکھانی اور رندے سے مختلف ہوتی ہے مگر ان کا کام

تقریباً اسی طرح کا ہوتا ہے اور ان کے بغیر ترجمہ کا کام بالکل کندہ ناتراش کی شکل کا رہ جاتا ہے - یہ تو ظاہر بات ہے کہ جب آپ ایک زبان سے دوسری زبان میں ترجمہ کرنے بیٹھیں تو دونوں زبانوں کا جاننا ضروری ہے' لیکن جاننے کا مطلب اس موقع پر معمول سے زیادہ وسیع ہے کیونکہ جب تک آپ کا علم دونوں زبانوں میں کافی وسیع نہ ہو اُس وقت تک ہر ہر لفظ پر آپ کو مشکل پیش آئے گی - اس کے علاوہ سہولت سے ترجمہ کرنے کے لئے آپ کو ایک قدم اور آگے بڑھنا چاہئے اور وہ یہ کہ دونوں زبانوں کی مہارت کے ساتھ جس زبان میں آپ ترجمہ کر رہے ہیں اس میں اظہارِ خیال اور ادائے مطلب کی کافی مشق ہونا چاہئے اس لئے کہ محض علم سے خواہ وہ کتنا ہی گہرا اور وسیع کیوں نہ ہو آپ زبان کو بطور ذریعۂ اظہار خیال کے بآسانی استعمال نہ کر سکیں گے اور چونکہ الفاظ فقرات اور محاورات کی تلاش میں دشواری کا سامنا ہوگا اس لئے ترجمے میں سلاست اور روانی پیدا نہ ہوگی بلکہ آپ کی عبارت کنجلک اور کھانچے دار ہو جائے گی جس کا سمجھنا دوسروں کے لئے آسان نہ ہوگا اور دوسروں کا سمجھنا تو الگ رہا خود آپ کو اپنی عبارت اصل کو سامنے رکھے بغیر سمجھنے میں دشواری ہوگی -

اس طرح زبان کی واقفیت اور اظہارِ خیال پر قدرت یہ دو بہت ہی اہم اوزار ہیں جن کے بغیر آپ ترجمے کا کام کر ہی نہیں سکتے - لیکن ان کے علاوہ ایک اور اوزار بھی ہے جس کی اہمیت کچھ کم نہیں ہے - اور یہ کہ جس فن کی کتاب یا مضمون کا آپ کو ترجمہ کرنا ہے اس فن سے بھی آپ کو واقف ہونا چاہئے مثلاً اگر اخبار میں آپ خبروں کے ترجمے کا کام کرتے ہیں تو ایک اخبار نویس کو جن چیزوں سے واقف ہونا چاہئے اُن سے آپ کو بخوبی واقف ہونا چاہئے ورنہ Benghazi Recaptured کا ترجمہ آپ "بن غازی پھر پکڑا گیا" کر دیں گے اور چونکہ بن غازی کی اصلیت کا آپ کو علم نہیں ہے اس لئے آپ اسے کوئی نامی ڈاکو خیال کریں گے اور کہیں اگر Political Lever لفظ آپ کے سامنے آ جائے گا تو اس کا ترجمہ آپ سیاسی ڈھینکلی کر دیں گے اس لئے کہ لغت میں Lever کے معنے ڈھینکلی لکھے ہیں - یہی ترجمے چند سال ہوئے ایک مشہور اردو اخبار میں چھپے تھے -

اسی طرح جب آپ کسی ڈاکٹری کی کتاب کا ترجمہ کرنے بیٹھیں گے تو آپ کی عبارت کچھ اس قسم کی ہوگی اس کے وسط میں انٹریر ٹیوبرکل ہے تاکہ اس پر لانگس کولائی مسلز (Longus Golli Muscles) چسپاں ہو سکیں - یہ پیچھے سے مجوف ہوتی ہے اور اس پر ایک صاف چکنا بیضوی مدور فیسٹ (Facet) یعنی نشان نوویا ڈینٹس ہوتا ہے تاکہ ایکسس (Axis) یا ایپس ٹروفیس (Epistropheus) کے اوڈنٹائیڈ پروسس یا ڈنٹس کے سامنے کی سطح کے ساتھ ملحق ہو سکے - بالائی کنارہ انٹریر ایٹلانٹو آکسیپٹل میمبرین Anterior Atlanto Occipital Membrane اور زیریں کنارہ انٹریر ایٹلانٹو ایپسٹروفیکل لگمنٹ Anterior Atlanto Epistrophical سے ملحق ہوتا ہے - Ligament

یہ ایک مشہور ڈاکٹری کی کتاب کے ترجمے کی عبارت ہے جو شاید کوئی ڈاکٹر بھی نہ سمجھ سکے گا - آخری اوزار جو ترجمے کے وقت آپ کے پاس ہونا چاہئے وہ ایک معتبر اور مستند لغت ہے جس میں الفاظ کے مختلف معنی اور طریقِ استعمال کی مثالیں دی ہوئی ہوں اور آپ اس میں سے حسبِ مرضی اور با موقعہ لفظ ترجمے کے لئے انتخاب کر سکیں -

یہ چار نہایت ہی اہم اوزار ہیں جن کے بغیر آپ ترجمے

کا کام کر ہی نہیں سکتے - لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ جس وقت یہ اوزار آپ کے قبضے میں آ جائیں تو آپ سمجھیں کہ اب کوئی دشواری باقی نہیں رہی - ترجمے کی سنگلاخ اور کٹھن وادی سے گزرنا اتنا آسان نہیں ہے - اس سلسلے میں اپنے تجربے کی ایک مثال پیش کرنا چاہتا ہوں - جس وقت میں مولانا حسرت موہانی مرحوم کے دیوان کا انگریزی میں ترجمہ کر رہا تھا تو اس میں ایک مصرعے پر اٹک گیا اور کامل تین دن تک غور کرنے کے باوجود ترجمے کا حق ادا نہ کر سکا - وہ مصرعہ یہ تھا -

بندہ پرور جایئے اچھا خفا ہو جایئے

جس کا مطلب الفاظ سے نہیں بلکہ لہجے سے ادا ہوتا ہے اور لہجے کا ترجمہ کرنا بہت ہی دشوار ہے - قبل اس کے کہ میں ترجمہ کرنے کا طریقہ بتاؤں ایک ضروری بات اور کہہ دینا چاہتا ہوں اور وہ یہ کہ جس طرح ہر فن کے لئے مشق کی ضرورت ہوتی ہے اسی طرح ترجمے میں بھی بغیر مشق کے کام نہیں چلتا اور جس قدر آپ کی مشق زیادہ ہوگی اتنا ہی آپ ترجمے کا کام تیزی اور صفائی سے کر سکیں گے - اس لئے اگر آپ اس فن میں مہارت پیدا کرنا چاہتے ہیں تو برابر اس کی مشق کرتے رہنا چاہیئے - اس کی ضرورت نہیں کہ آپ کسی سے اصلاح بھی لیں - اس لئے کہ جتنی جتنی آپ کی مشق بڑھے گی اتنی ہی خامیوں کی خود بخود اصلاح ہوتی جائے گی، اور آپ کی اہلیت اور شوق اصلاح کی کمی کی تلافی کریں گے -

اب مختصر الفاظ میں ملاحظہ فرمایئے کہ ترجمہ کرنے کا طریقہ کیا ہے اور اس کے مختلف مدارج کیا ہیں -

(۱) سب سے پہلے آپ جس مضمون یا کتاب کا ترجمہ کرنا چاہیں اُسے اول سے آخر تک بغور پڑھ لیں اور حسب ذیل امور کو اچھی طرح ذہن نشین کر لیں -

(الف) مضمون نگار یا مصنف کا اصل منشا یا مدعا کیا ہے ؟

(ب) اس منشا یا مدعا کا اظہار اُس نے کس انداز سے کیا ہے ؟ یعنی اندازِ بیان عالمانہ ہے یا عامیانہ، جذباتی یا فلسفیانہ ؟

(ج) طرزِ استدلال کیسا ہے ؟ معقول یا منقول، لفظی یا معنوی ؟

(د) الفاظ اور فقرے سلیس ہیں یا پیچیدہ ؟ صاف یا مبہم، واضح یا ذو معنین ؟

(ہ) ترتیب کا نہج کیا ہے اور پیراگراف یا ابواب کی تقسیم کس اصول پر ہے ؟ واقعات کی رفتار کے لحاظ سے یا منطقی استدلال کی ترتیب سے ؟

ان باتوں کو اس طرح ذہن نشین کر لیجئے کہ جب تک اُس مضمون یا کتاب کا ترجمہ آپ کرتے رہیں کسی وقت بھی آپ کا ذہن ان سے خالی نہ ہونے پائے، ورنہ ترجمے میں آپ ایسے الفاظ یا فقرے استعمال کر جائیں گے جو مضمون نگار یا مصنف کے منشاء کے خلاف ہوں گے اور اس طرح ترجمہ اصل سے بہت دُور ہٹ جائے گا -

(۲) ترجمہ کرتے وقت آپ کی نظر الفاظ کے بجائے مفہوم پر ہونا چاہیئے، اس لئے کہ جس قدر آپ کا ترجمہ اصل کے مفہوم سے قریب تر ہوگا اسی قدر اچھا سمجھا جائے گا، خواہ الفاظ کے استعمال میں آپ کتنی ہی آزادی سے کام لیں - یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اصل کے ایک جملے کا ترجمہ چار جملوں میں ختم ہوگا یا اصل کے چار جملے ترجمے کے ایک ہی جملے میں سما جائیں - دونوں صورتوں میں دیکھا یہی جائے گا کہ اصل کے مفہوم کو آپ نے کس حد تک صحیح ادا کیا ہے -

(۳) جو لفظ یا فقرہ آپ ترجمے میں لکھیں اُسے ہماری پہلی ہدایت کی روشنی میں خوب ٹھونک بجا کر دیکھ لیں کہ نفسِ مضمون کے منافی تو نہیں ہے - مثلاً کسی کی موت کا ذکر ہو تو آپ کوئی ایسا لفظ نہ لکھ دیں جو ترجمے

کی زبان میں خوشی یا شوخی کے موقعے پر استعمال ہوتا ہو۔

(۴) مضمون کے ہر پیراگراف اور کتاب کے ہر باب کا ترجمہ ختم کرنے کے بعد اس پر نظر ثانی کریں اور دیکھیں کہ آپ کا ترجمہ تمام شرائط و قواعد کے اندر ہے یا نہیں۔ نظر ثانی کا کام سارا مضمون یا ساری کتاب ختم کرنے پر اُٹھا رکھنے میں یہ اندیشہ ہے کہ بہت سی باتیں آپ کے ذہن سے اُتر جائیں گی اور پھر جو خامی رہ جائے گی وہ رفع نہ ہو سکے گی۔

(۵) ہر زبان کا اندازِ بیان لب و لہجہ اور طرزِ ادا دوسری زبان سے مختلف ہوتا ہے اور اس میں آپ کو اصل کی تقلید کرنے کے بجائے اس زبان کے محاورے پر نظر رکھنا چاہیئے جس میں آپ ترجمہ کر رہے ہیں۔ مثلاً "آپ تشریف لا سکتے ہیں" محمود نے کہا" یہ انگریزی میں بہت ہی پسندیدہ اندازِ بیان ہے لیکن اردو میں ایسے موقعے پر ہم کہتے ہیں "محمود نے کہا "بسم اللہ تشریف لائیے"۔ اسی طرح انگریزی میں "میں آپ کا شکر گزار ہوں" چھوٹے بڑے سب کے لئے کہیں گے، مگر ہمارے یہاں ایسے موقعے پر بڑوں سے "تسلیم" آداب عرض" وغیرہ اور چھوٹوں سے "جیتے رہو، خوش رہو شاباش" وغیرہ کہا جاتا ہے۔ آپ ترجمے میں اپنی زبان کی لطافت کو ضائع نہ ہونے دیں۔

(۶) علمی اور فنی کتابوں کے ترجمے میں اصطلاحات کا صحیح استعمال بہت ضروری ہے اور جہاں آپ کو صحیح اصطلاح نہ مل سکے وہاں آپ اصل کا لفظ بھی لکھ سکتے ہیں۔ مگر قوسین میں اس کا مطلب واضح کر دینا چاہیئے۔ تاہم قوسین کا اندھا دھند استعمال ترجمے کو بالکل خشک اور بے مزہ کر دیتا ہے۔

یہ چند موٹی موٹی باتیں ہیں جو ترجمے کے کام میں آپ کی مشعلِ راہ بن سکتی ہیں اور اگر آپ نے انھیں ملحوظ رکھ کر مشق جاری رکھی تو بہت جلد آپ کو اس فن میں مہارت حاصل ہو جائے گی۔



جن بچوں کو
بڑا ہو کر دُنیا میں اپنی آواز بلند کرنی ہے
اُن کی پرورش نونہال پر ہونی چاہیئے

نونہال

ننھے بچوں کو مضبوط بنانے والا
ان کا دل پسند ٹانک
ہمدرد دواخانہ وقف دہلی



Hamdard

شری رام سرنا

ترکی کے میوہ جات

دنیا کا نقشہ دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ ترکی کا محلِ وقوع یورپ اور ایشیا کی حدِ اتصال پر ہے۔ اس جغرافیائی پوزیشن کے باعث ترکی کی سیاسی اور سماجی زندگی دوگونہ تاثرات کی حامل رہی ہے۔ ابتدائی دور میں ترکوں کی یلغار یورپ اور ایشیا دونوں میں وسعت پذیر تھی۔ بعد میں جب عالم اسلام کی خلافت سلطانِ ترکی کی تحویل میں آگئی تو ترکی کا رجحان یورپ سے ہٹ کر ایشیا کی طرف مایل ہوگیا اور پھر جب کمال اتاترک کی قیادت میں ترکی نے مذہب کو سیاست سے جدا کردیا اور دلبستانِ جمہوریت میں ایک نئے باب کی بنیاد رکھی تو ترکی کی سیاسی اور سماجی زندگی کا رجحان ایشیا سے ہٹ کر یورپ کی طرف راغب ہوگیا۔

سماجی اور سیاسی زندگی کے علاوہ ترکی کی آب و ہوا پر بھی دوگونہ تاثرات حاوی دکھائی دیتے ہیں۔ یورپ اور ایشیا کے درمیان واقع ہونے کے باعث ترکی کو یہ فائدہ پہنچا ہے کہ آب و ہوا انتہائی مدارج سے بچی ہوئی ہے۔ خیال رہے کہ وسط مشرق کی قربت کے باعث ترکی میں بھی ریگستان ہونا چاہیئے تھا، لیکن یورپ کی نزدیکی نے ترکی کو ریگستان کے عذاب سے بچا رکھا ہے۔ دوسری طرف یورپ کے قریب واقع ہونے سے ترکی میں سردی تو ضرور ہوتی ہے۔ لیکن وسط مشرق کی نزدیکی نے آب و ہوا کو معتدل بنا رکھا ہے۔ کسی حد تک قدرت بھی ترکی کے لئے نہایت فراخ دل ثابت ہوئی ہے۔ اس ملک کو پہاڑوں جنگلوں اور وادیوں سے اور دریاؤں جھیلوں اور سمندروں سے گھرا ہوا ایک گلزار اور سبزہ زار بنانے میں معمارِ ازل نے کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔ اس سرسبز اور دلفریب دھرتی میں پھولوں اور پھلوں کی اس قدر بہتات ہے کہ ترکی کو رشکِ فردوس کہنا مبالغہ نہ ہوگا۔ اس بیان میں ترکی کے میوہ جات کا ایک اقتصادی جائزہ پیش کیا جارہا ہے۔

اس موضوع کے آغاز میں ترکی کے جغرافیائی محلِ وقوع پر بالتفصیل روشنی ڈالنا ازبس ضروری ہے۔ خیال رہے کہ ترکی کے مشرق میں اور کسی حد تک شمال میں سمندر موجزن ہے اور باقی اطراف میں خشکی ہے۔ خشکی پر ترکی کی سرحدوں کے ڈانڈے یورپ میں روس۔ یونان اور بلغاریہ کے ساتھ، اور ایشیا میں ایران عراق اور سیریا (شام) کے ساتھ ملے ہوئے ہیں۔ بلغاریہ کے ساتھ ملتی ہوئی سرحد ۳۰۰ کلومیٹر لمبی ہے۔ یونان کے ساتھ ۲۰۴ کلومیٹر اور روس کے ساتھ ۵۹۰ کلومیٹر۔ ادھر ایران کے ساتھ ملتی ہوئی سرحد ۴۷۰ کلومیٹر لمبی ہے۔ عراق کے ساتھ ۳۷۸ کلومیٹر اور سیریا (شام) کے ساتھ ۸۸۹ کلومیٹر۔ ان سرحدی علاقوں میں پہاڑی سلسلے متواتر پھیلتے چلے گئے ہیں۔ ایک اندازے کے مطابق ملک میں چھوٹے بڑے ۶۸ کوہستان پائے جاتے ہیں۔ ان پہاڑوں کی وجہ سے بارش بھی کافی ہوتی ہے، اس لئے یہ کوہستان جنگلوں

سے گھرے ہوئے ہیں اور ان کی وادیاں لالہ زار بنی ہوئی ہیں۔ مزید براں ان پہاڑوں میں سے ۴۸ دریا نکلتے ہیں اور ملک کے مختلف حصّوں کو سیراب کرتے ہیں۔ آشامی ہیں۔ ان پہاڑوں اور جنگلوں میں ۴۸ جھیلیں بھی پائی جاتی ہیں۔ اس طرح ترکی کا بہت بڑا حصّہ پہاڑوں جنگلوں وادیوں دریاؤں اور جھیلوں کے باعث سبزہ زار بنا ہوا ہے۔ ریگستانِ عرب کے عین پڑوس میں یہ لہلہاتا ہوا نخلستان قدرت کا ایک کرشمہ ہے۔

ترکی کا ایک سرا اگر پہاڑوں اور جنگلوں سے گھرا ہوا ہے تو دوسرا سرا سمندروں سے گھرا ہوا ہے، اندازہ لگایا گیا ہے کہ ترکی میں بحیرۂ اسود کے کنارے کا ساحل ۱۵۴۶ کلومیٹر تک پھیلا ہوا ہے۔ خلیج باسفورس کا ساحل ۸۰ کلومیٹر تک۔ خلیج مارمارہ کا ساحل ۹۴۷ کلومیٹر تک۔ علاقائی لحاظ سے تھریس یا یورپ کی جانب کا ساحل ۷۳۴ کلومیٹر تک پھیلا ہوا ہے۔ اور ایشیا کی جانب کا ساحل ۵۸۷۲ کلومیٹر تک پھیلا ہوا ہے اس کے علاوہ خلیج مارمارہ میں ترکی کے دیرصحت جزیروں کا ساحل ۲۰۴ کلومیٹر تک اور بحیرۂ ایجین میں جزیروں کا ساحل ۳۱۶ کلومیٹر تک پھیلا ہوا ہے۔ ان ساحلی علاقوں کی آب و ہوا خوشگوار ہے۔ زمین زرخیز ہے اور میوہ جات کی پیداوار کے لئے نہایت موزوں ہے۔ بالخصوص بحیرۂ ایجین کے نزدیک ازمیر کا علاقہ میوہ جات کا گہوارہ ہے۔

میوہ جات کے بیان میں یہ بتانا بھی موجبِ دلچسپی ہوگا کہ ترکی کا کل رقبہ کتنا ہے اور اس کی مختلف انواع میں کس طرح تقسیم کی گئی ہے۔ ترکی کے محکمۂ زراعت کے سرکاری شماروں سے واضح ہوتا ہے کہ ترکی کا کل رقبہ ۷۷٬۶۹۸٬۰۰۰ ہیکٹر ہے۔ ایک ہیکٹر اڑھائی ایکڑ کے مساوی ہوتا ہے۔ اس رقبہ کی تفاصیل یوں ہیں۔

زیرِ کاشت رقبہ	۱۵٬۴۹۶٬۰۰۰	ہیکٹر
چراگاہیں	۳۶٬۸۰۶٬۰۰۰	〃
پھلوں کے باغات	۱٬۵۱۳٬۰۰۰	〃
جنگلات	۱۰٬۴۱۸٬۰۰۰	〃
بنجر زمین	۱۳٬۴۶۵٬۰۰۰	〃
میزان	۷۷٬۶۹۸٬۰۰۰	〃

میوہ جات کے زیرِکاشت رقبے میں پھلوں کے تجارتی باغیچے اور فارم۔ انگوروں اور زیتون کے بھی شامل ہیں۔ ترکی میں پیدا ہونے والے میوہ جات کی فہرست یوں ہے۔ (۱) انگور (۲) سٹرس (۳) لیموں (۴) نارنگیاں (۵) سیب (۶) انجیر (۷) خوبانی (۸) شہتوت (۹) انار (۱۰) ناشپاتی (۱۱) اڑو (۱۲) چیری (۱۳) سیاہ چیری (۱۴) آلوبخارہ (۱۵) جوجوب (۱۶) کیرب (۱۷) کارنل (۱۸) زیتون۔ اس کے علاوہ خشک میوہ جات کی فہرست بھی قابلِ قدر ہے۔ بادام۔ کشمش۔ اخروٹ، چلغوزے، پستہ، فندق اور چیسٹ نٹ۔ ان میوہ جات کی پیداوار کے سلسلے میں یہ بتانا بھی لازم ہوجاتا ہے کہ میوہ جات کی کتنے رقبے میں کاشت ہورہی ہے۔ سرکاری اعداد کے مطابق تفصیل ذیل میں دی جارہی ہے۔

میوہ	درختوں کی تعداد	پیداوار (ٹن)
انگور	۵۹۶ (ہیکٹروں میں)	۱۳۵۸۶٬۲۰۶
سیب	۶٬۸۹۳	۸۸٬۸۶۳
انار	۲٬۱۴۳	۱۹٬۶۵۶
ناشپاتی	۶٬۳۲۸	۸۰٬۵۵۶
خوبانی	۱٬۹۱۳	۱۹٬۱۱۵
اڑو	۱٬۳۰۲	۱۰٬۲۶۶

انجیر	۴۵۷۵	۱۱۴ر۱۰۷
شہتوت	۳۶۵۶	۹۰۹ر۵۴
آلوبخارہ	۵۸۲۹	۶۲۱ر۵۵
چیری	۱۹۵۰	۲۴۳ر۲۴
سیاہ چیری	۱۷۷۰	۳۹۲ر۱۳
سنگترے	۳۶۰	۰۶۵ر۴۰۱
نارنگیاں	۵۶۶	۱۱۶ر۱۰۹
لیموں	۴۵۶	۶۶۸ر۱۵۱
جوجوب	۷۲۰	۱۱۱ر۴
کیرب	۱۷۰	۳ر۵۴۷
کارنل	۱ر۳۱۲	۷ر۸۷۲
بادام	۲ر۲۵۳	۱۰ر۸۵۱
اخروٹ	۲ر۴۴۷	۵۶ر۱۱۰
چیسٹ نٹ	۱ر۹۶۵	۱۵ر۰۲۴
فندق	۱۳۱ر۷۳۲	۹۳ر۲۲۱

اگر بغور دیکھا جائے تو میوہ جات کی اس فہرست میں بھی آپ کو ترکی کی جغرافیائی پوزیشن کا عکس ملے گا۔ انگور سیب اور انار بحیرۂ روم کی مخصوص آب وہوا کی پیداوار ہیں۔ سنگتروں اور نارنگیوں کے متعلق ماہرین کا بیان ہے کہ وسط مشرق کی زمین ان کے لئے نہایت موزوں ہے۔ انجیر ایک ایشیائی میوہ ہے، اور شہتوت بھی۔ چیری اور آلوبخارہ یورپ کی بخشش ہیں۔ خشک میوہ جات ایشیا کے اس خطہ کے لئے مخصوص ہیں، جو کوہ ہندوکش سے لے کر بحیرۂ اسود تک پھیلا ہوا ہے۔ خیال رہے کہ ژیگستان کی عدم موجودگی کے باعث ترکی میں کھجوروں کی پیداوار نہ ہونے کے برابر ہے۔ حالانکہ پڑوس کے عرب ممالک میں بالخصوص عراق، سیریا اور سعودی عرب میں کھجوروں کی بھرمار ہورہی ہے۔

ان میوہ جات کی علیحدہ علیحدہ روداد بھی قابلِ بیان ہے۔ سرکاری اعداد کے مطابق دوسری عالمگیر جنگ سے پہلے ترکی میں انگوروں کی کاشت ۳۵۹,۰۰۰ ہیکٹروں میں ہوتی تھی۔ ۱۹۵۱ء میں انگوروں کے زیرِکاشت رقبہ ۵۹۶,۰۰۰ ہیکٹروں تک جا پہنچا تھا۔ جنگ سے پہلے انگوروں کی پیداوار صرف ۹ لاکھ ٹن ہوتی تھی، لیکن ۱۹۵۰ء میں ۱۴ لاکھ ٹن تک جاپہنچی تھی۔ انگوروں کو کھانے کے علاوہ انگوری شراب تیار کرنے اور کشمش بنانے کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ ۳۹-۱۹۳۸ء سے پہلے ۸ ہزار ٹن انگوروں سے شراب طیار کی جاتی تھی۔ لیکن ۱۹۵۰ء میں ۲۰ ہزار ٹن انگور شراب تیار کرلے کے لئے استعمال کئے گئے تھے۔ ترکی میں انگوروں سے کشمش تیار کرنے کا کام بہت مقبول عام ہے۔ ۳۹-۱۹۳۸ء سے پہلے ترکی میں کشمش کی کل پیداوار ۸۳ ہزار ٹن ہوتی تھی۔ لیکن بڑھتے بڑھتے ۱۹۵۰ء میں کشمش کی کل پیداوار ۱۰۵ ہزار ٹن ہوگئی تھی۔ اس کشمش کا بیشتر حصہ غیر ممالک کو بھی جاتا ہے۔ جنگ سے پہلے ۶۲ ہزار ٹن کشمش باہر بھیجی گئی تھی۔ اور ۱۹۵۰ء میں ۸۰ ہزار ٹن۔

انگوروں کے بعد سنگتروں اور نارنگیوں کا نمبر آتا ہے۔ وسط مشرق میں ان کی پیداوار سب سے زیادہ اسرائیل اور ترکی میں پھیل سکی ہے۔ ترکی میں دوسری عالمگیر جنگ سے پہلے سنگتروں کی سالانہ پیداوار ۳۵ ہزار ٹن ہوتی تھی۔ ۱۹۴۹ء میں بڑھکر ۵۰ ہزار ٹن ہوگئی تھی۔ لیکن بعد میں کئی وجوہ کے باعث ان کی کاشت پر ناموافق اثر پڑا، اور پیداوار کم ہوکر ۳۹ ہزار ٹن رہ گئی۔ خیال رہے کہ ایک ٹن میں کم از کم ۶ ہزار سنگترے ہوتے ہیں۔ لیموں اور نارنگیوں کی کاشت پر شروع میں مقابلتاً کم توجہ دی جاتی تھی۔ اس لئے پیداوار صرف ایک ہزار ٹن ہوتی تھی۔ بعد

میں اُن کی کاشت کا رواج بڑھتا گیا اور پیداوار کو بھی فراوانی حاصل ہوتی گئی۔ ۱۹۵۰ء میں اُن کی پیداوار سات ہزار ٹن ہوئی تھی۔ سنگتروں اور نارنگیوں کو باہر نہیں بھیجا جاتا کیونکہ ان کی اندرونی مانگ ہی بہت زیادہ ہے۔ صرف ۱۹۴۹ء میں ایک سو ٹن باہر بھیجے گئے تھے۔

انجیر۔ ترکی میں انجیروں کی پیداوار بھی بہت زیادہ ہوتی ہے۔ ۳۹-۱۹۳۸ء سے پہلے انجیروں کی سالانہ پیداوار ۳۷ ہزار ٹن تک ہوتی تھی۔ ۱۹۴۵ء میں بڑھ کر ۶۰ ہزار ٹن ہوگئی تھی۔ لیکن ۱۹۵۰ء میں گھٹ کر ۲۹ ہزار ٹن رہ گئی تھی۔ تازہ انجیروں کو کھانے کے علاوہ خشک کرکے باہر بھیجا جاتا ہے۔ مزید براں انجیروں کو ادویہ تیار کرنے اور صنعتی ضروریات کے لئے بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ ترکی کے انجیروں کی یورپ کے ممالک بالخصوص سویڈن اور ناروے میں بہت مانگ رہتی ہے۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ ہر سال قریباً دس بارہ ہزار ٹن انجیر دساور کو بھیجے جاتے ہیں۔ جس سے ملک کو کافی مالی فائدہ ہوتا ہے۔

زیتون۔ ترکی میں انگوروں کے بعد سب سے زیادہ زیتون کی کاشت ہوتی ہے۔ دوسری عالمگیر جنگ سے پہلے زیتون کی سالانہ پیداوار تقریباً ۲۲۹ ہزار ٹن ہوتی تھی۔ ۱۹۵۰ء میں بڑھتے بڑھتے یہ پیداوار ۲۶۵ ہزار ٹن تک جا پہنچی تھی۔ زیتون کھانے کے علاوہ تیل نکالنے کے کام میں آتا ہے۔ زیتون کا تیل کئی کاموں میں استعمال کیا جاتا ہے۔ اس لئے ترکی میں زیتون کا تیل نکالنے کی صنعت کو بہت فروغ حاصل ہوا ہے۔ ۱۹۴۸ء میں ۱۸۰ ہزار ٹن زیتون تیل نکالنے کے مصرف میں آئے تھے۔ اور ان سے ۳۷ ہزار ٹن تیل نکلا تھا۔ ۱۹۴۹ء میں ۲۱۰ ہزار ٹن زیتون سے ۴۳ ہزار ٹن تیل نکالا گیا تھا۔ ۱۹۵۰ء میں اس صنعت کو اور بھی ترقی حاصل ہوئی اندازہ لگایا گیا ہے کہ ۲۴۴ ہزار ٹن زیتون تیل نکالنے کے کام میں آئے تھے۔ اور ان سے ۵۲ ہزار ٹن تیل نکلا تھا۔ یہ تیل دنیا بھر میں بھیجا جاتا ہے۔ اور ترکی کی پیشی تجارت میں خاص اہمیت رکھتا ہے۔

خشک میوہ جات کے سلسلے میں ترکی کو یہ طرۂ امتیاز حاصل ہے کہ وہاں فندق کی پیداوار دنیا بھر میں سب سے زیادہ ہوتی ہے۔ بادام پستہ اور اخروٹ بھی کافی تعداد میں پیدا ہوتے ہیں۔ ان میں سے فندق اور پستہ بھاری تعداد میں غیر ممالک کو بھیجے جاتے ہیں۔

سوال اُٹھتا ہے کہ ترکی کے اقتصادی نظام میں میوہ جات کی پوزیشن کیا ہے؟ اسی سوال پر غور کرنے کے لئے یہ بتانا لازم ہوگا کہ میوہ جات کی وسیع کاشتکاری اور پیداوار کے باعث ترکی میں خوردنی اناج پر مقابلتاً کم دباؤ پڑتا ہے، اس لئے ایشیا کے دیگر ممالک کی طرح خوردنی اناج کی شدید قلت لاحق نہیں ہوتی۔ مزید براں میوہ جات خوراک کا ایک توانا حصہ ہیں۔ اس لئے اُن کے استعمال کی بدولت عوام کی صحت پر بھی موافق اثر پڑتا ہے، اور اس حقیقت کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کہ ترکی کی زراعت پیشہ آبادی کو میوہ جات کی کاشتکاری سے معقول آمدنی وصول ہوتی ہے جو ان کی زراعتی آمدنی پر اضافہ ہوتی ہے۔ میوہ جات کا بیوپار اندرونی تجارت کا قابل قدر حصہ تسلیم کیا جاتا ہے۔ اور اس بیوپار سے آبادی کے ایک بہت بڑے حصے کو روزگار ملا ہوا ہے، ان سب سے بڑھ کر ان میوہ جات کی پیشی تجارت ملک کے لئے ازحد فائدہ بخش ثابت ہو رہی ہے۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ ملک کی کل تجارت برآمد کا قریباً پانچواں حصہ میوہ جات کی برآمد پر مشتمل ہے۔

(ہزار پونڈوں میں)

	۱۹۴۸ء	۱۹۴۹ء	۱۹۵۰ء	۱۹۵۱ء
کل تجارت برآمد	۵۵۱،۰۳۸	۶۹۳،۹۱۰	۵۸۷،۷۳۷	۸۷۹،۲۲۹
میوہ جات کی تجارت برآمد	۸۵،۳۹۶	۱۱۴،۴۷۲	۸۷۲،۱۲۱	۱۱۱،۰۳۲

میوہ جات کی تجارت برآمد کی تفصیل یوں ہے۔

میوہ	۱۹۴۸ء	۱۹۴۹ء	۱۹۵۰ء	۱۹۵۱ء
	(ترکی کے سکہ لیرا میں)			
سلطانہ	۱۳۵ لاکھ	۶۳ لاکھ	۵۸۲ لاکھ	۳۰۲ لاکھ
خشک انجیر	۵۶	۶۱	۶۸	۶۵
پستہ	۳	۲۱	۸۸	۵۳
فندق	۱۲۲	۳۹۹	۵۱۲	۴۸۸

میوہ جات کی کاشت اور تجارت کے بیان میں یہ بتانا بھی ضروری ہوگا کہ حکومۂ امداد باہمی بھی اس شعبے میں سرگرم کار ہے۔ لگاتار سعی کے بعد اب یونین یہاں تک پہنچ چکی ہے کہ ترکی میں انجیروں کی کل پیداوار کا چوتھائی حصہ یعنی ۲۵ فی صدی امداد باہمی کی انجمنوں کی معرفت فروخت ہو رہا ہے۔ علاقہ ازمیر میں انجیر اور کشمش پیدا کرنے والے کاشتکاروں نے ایک انجمن قائم کر لی ہے جس کے ۱۹۴۱ء میں ۲۰ ہزار ممبر تھے۔ اس کے علاوہ فندق اور پستہ پیدا کرنے والے کاشتکاروں نے ان میوہ جات کو بھیجنے کے لئے کئی علاقائی انجمنیں قائم کر رکھی ہیں۔

ترکی کی حکومت بھی میوہ جات کی پیداوار میں پوری پوری دلچسپی لے رہی ہے۔ محکمۂ زراعت کی طرف سے مختلف میوہ جات کی کاشت کو بہتر بنانے کے لئے زراعتی تحقیقات کی جاتی ہے۔ بہتر قسم کے نئے پودے کاشتکاروں کو مہیا کئے جاتے ہیں۔ اُن کی کاشتکاری کے لئے دیگر سہولیات بہم پہنچائی جاتی ہیں۔ اُن کی تجارت کو باقاعدہ منظم کرنے کے لئے سعی کی جاتی ہے۔ ان پھلوں کو ڈبوں میں بند کرکے بھیجنے کے لئے دو کارخانے بھی قائم کئے گئے ہیں۔

گنّے سے تیار شدہ موم کے صنعتی ادارے

مویشیوں کی چربی اور نباتات سے تیار شدہ موم مختلف صنعتوں میں کام آتا ہے۔ پالش کرلے اور رنگ وغیرہ کی تہ جمانے کے علاوہ کاربن پیپر، سٹینسلوں، سیاہی، فوٹوگرافی کے سامان، مختلف ادویہ، مدھن (مشینوں کو چکنا کرنے والا تیل وغیرہ) آگ کے اثر سے محفوظ رکھنے والی اشیاء اور خوشبودار کریم وغیرہ کی تیاری میں بھی یہ موم استعمال کیا جاتا ہے۔ گزشتہ چند سالوں میں گنّے سے تیار شدہ موم کی مانگ بڑھ گئی ہے۔ بھارت میں کھانڈ کے کارخانوں میں ہر سال تقریباً ۱½ کروڑ ٹن گنّا پیلا جاتا ہے اور اس سے تقریباً ۴۵ ہزار ٹن موم تیار کیا جا سکتا ہے۔ بھارت میں پیدا شدہ گنّے میں موم کی مقدار ۰٫۳۴ فی صدی ہوتی ہے۔ طبعی حالت میں یہ موم صنعتی مقاصد کے لئے استعمال نہیں کیا جا سکتا۔ ضرورت کے مطابق اُسے مزید صاف کیا جا سکتا ہے۔

صنعتی و سائنسی تحقیق سے متعلق رسالہ کے ماہ اکتوبر کے شمارے میں شائع شدہ ایک مضمون میں گنّے سے موم تیار کرنے کے عمل کی تفاصیل بیان کی گئی ہیں۔

"عرضِ ثنا" اور "دستورِ شہادت"

یادش بخیر جب میں حیدرآباد میں تھا۔ "حیدرآباد" !! ع زباں پہ بارِ خدایا یہ کس کا نام آیا ؟ وہ حیدرآباد، جہاں میری مسیں بھیگیں اور میری شامیں مہکی تھیں۔

کیا کہوں، اور کون سمجھ سکتا ہے کہ اس معمورۂ رنگ و بُو اور اس محرابِ زمزمۂ و کیف حیدرآباد کی یاد نے اس وقت میرے دل میں سوئے ہوئے کتنے افسانوں کے شبستانوں کو جگا اور میری یادوں کے سمندر میں ڈوبے ہوئے کتنے افسوں کے جزیروں کو اُبھار کر میرے احساسات کے سینے میں چھری پیوست کر دی ہے۔ اک تیر میرے دل پہ وہ مارا کہ ہائے ہائے۔

خیر، تو جب میں بقیدِ حیات یعنی رہینِ زلفِ حیدرآباد تھا، اُس وقت پرنس مُعظّم جاہ کی خدمت میں اکثر و بیشتر بلکہ تقریباً ہر رات کو اُن کی نیازمندی کی مسرّت حاصل کیا کرتا تھا۔ وہ زمانہ میری جوانی اور شاہ زادے کی تقریباً نوجوانی کا عہد تھا۔

وہ دَور ـــــ برگِ یاسمن پہ دمکتی ہوئی شبنم کی سی وہ راتیں، وہ نیلم اور پکھراج سے جگمگاتی ہوئی سونے کی انگوٹھیاں آج بھی میرے دل میں نشیمن بنائے ہوئے ہیں، جن کی میٹھی اور ٹھنڈی چاندنی میں ہمارے دل اس طرح کھلا کرتے تھے، جس طرح باغوں کے اُن نرم پودوں کی کلیاں، صبا کی اٹھکھیلیوں اور فضا کی آب کاریوں سے چٹکتی ہیں۔ جن کی شاخوں کا سایہ دریا کی گنگناتی موجوں میں مچلتا رہتا ہے۔

اُن تمام شب نشینوں کے نام اب مجھے یاد نہیں رہے ہیں، لیکن اس قدر زمانہ دراز گزر جانے کے باوجود، اگر آج بھی میں اُنھیں دیکھ لوں تو پہچان لوں اور مجھے ایسا محسوس ہو کہ میری کوئی دولتِ گم شدہ مجھے دوبارہ مل گئی ہے۔

اللہ اللہ کیا دَور تھا، ہم لوگ شام کو بیٹھتے اور تاروں کی چھاؤں میں اُٹھتے تھے۔ اور کبھی کبھی تو اُفق کی گلابی روشنی ع جرس فریاد می دارد کہ ہر بندید محمل ہا" سناتی ہوئی ہمارے سروں پر سے گزرنے لگتی تھی۔

یہ پیشِ نظر دونوں مجموعے "عرضِ ثنا" اور "دستورِ شہادت" اُسی میرِ محفل کی ذہنی تخلیق ہیں جس کی محفلوں کی طرف ابھی اشارہ کر کے ذہنی ہو چکا ہوں۔

اِن دونوں مجموعوں کو پڑھ کر اس امر کا اندازہ ہوا کہ معظّم جاہ شیخ کو اہلِ بیت سے کس قدر بے پایاں عقیدت و محبّت ہے ـــ اور یہ محسوس کر کے بے حد خوشی ہوئی کہ اتنی قلیل مدّت میں حضرتِ شیخ نے اس قدر کثیر مشقِ سخن کی دولت حاصل کر لی ہے کہ اُن کے کلام میں اساتذہ کی سی ادائی و شیرینی اور پختگی پائی جاتی ہے ـــ اللہ کرے زورِ سخن اور زیادہ!

یہ اُن تمام عقیدت کا قرینہ ہے کہ اِن دونوں مجموعوں کو خود سے پڑھیں اور مصنّف کے اِس ادبی کارنامے کی داد دیں جنہیں خانوادۂ پیغمبرِ اسلام سے وابستگی و شیفتگی کا شرف و مجد حاصل ہے۔

نیز تا از درِ ے خانہ کشائے طلبیم ہر دمِ دوست نشینیم و مُرادے طلبیم

جوشؔ

بھارت میں تعلیم کا مستقبل

آل انڈیا ریڈیو سے ڈاکٹر ذاکر حسین کی نشری تقریر

بھارتی عوام کے مستقبل کا انحصار بھارت کے آئندہ تعلیمی ڈھانچے پر ہے۔ اپنے دیش کے طریق تعلیم کو بہتر بنائے بغیر لوگوں سے دیانتدارانہ، منصفانہ اور اشتراکِ عمل کی زندگی بسر کرنے کی توقع کیونکر کی جا سکتی ہے اور ان میں ووٹ کھسوٹ سے بڑا مشترکہ غیر طبقاتی سماج قائم کرنے کا جذبہ کیونکر پیدا کیا جا سکتا ہے؟ بھارت میں تعلیم کے مستقبل کا مسئلہ ہم سب کی گہری دلچسپی کا مرکز ہے کیوں کہ بھارتی تہذیب کی بنیادوں پر قائم شدہ سماجی ڈھانچے کو برقرار رکھنے اور دیگر لوگوں کو اس سے روشناس کرنے کے تاریخی فریضے کے ادا کرنے کا انحصار اس مسئلے کا کامیاب حل تلاش کرنے پر ہے۔

اس امر میں شک نہیں کہ اس وقت بھارت میں تعلیمی سہولتوں کی کمی تشویشناک ہے۔ ہمارے ملک کی آبادی کا صرف ۱۷ فی صدی حصہ خواندہ ہے اور تعلیمی سہولتوں میں وسیع پیمانے پر توسیع درکار ہے۔ مجھے اندیشہ ہے ہم آئین میں مندرج اس ہدایت کو عملی جامہ نہیں پہنا سکیں گے کہ آئین کے نفاذ کے بعد دس سال کی مدت کے اندر اندر تمام بچوں کے لئے چودہ سال کی عمر تک لازمی و مفت تعلیم حاصل کرنے کی سہولتیں مہیا کی جائیں۔ پانچ سالہ پلان کے تعلیمی پروگرام کو عملی جامہ پہنانے کی رفتار بھی سست ہے۔ تاہم مجھے یقین ہے کہ ہم پانچ سالہ پلان پر عمل کے دوران میں حاصل کردہ تجربے سے فائدہ اٹھائیں گے اور تعلیمی ترقی کی آئندہ اسکیموں کو زیادہ تر تیز رفتاری سے عملی جامہ پہنائیں گے۔

چھ سے چودہ سال تک کی عمر کے تمام لڑکے لڑکیوں کے لئے بنیادی تعلیم کی سہولتیں مہیا کرنا۔ پہلی اسٹیج کے کامیاب طلباء کی ۲۰ فی صدی تعداد کے لئے ثانوی تعلیم کی سہولتیں مہیا کرنا، ہائی سکولوں کا امتحان پاس کرنے والوں کی دس فیصدی تعداد کے لئے یونیورسٹی کی تعلیم کے انتظامات کرنا، ملک کے وسعت پذیر معاشی نظام کی ضروریات کے مطابق ٹیکنیکل تعلیم کی سہولتیں مہیا کرنا اور بنیادی و ثانوی تعلیم کے اسکولوں کے لئے تقریباً ۲½ لاکھ استادوں کو تربیت بہم پہنچانا ہمارے قومی تعلیمی پروگرام میں شامل ہے اور اس کے متعلق ضروری نظم و نسق قائم کرنے کے لئے ۲۵ سال کی مدت درکار ہے۔ اس کا شمار دنیا کی سب سے وسیع تعلیمی تنظیموں میں ہوگا لیکن اصل سوال تو یہ ہے کہ ہم اتنی زبردست تنظیم سے فائدہ کیوں کر اٹھائیں گے۔

طریق تعلیم میں اصلاح کے بارے میں کئی تجاویز

پیش کی جاتی ہیں لیکن ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم ہوائی قلعے بنانے کے بجائے اس مسئلے کو بخوبی سمجھ کر سائنسی نقطۂ نگاہ سے اس کا حل تلاش کرنے کی کوشش کریں۔ مہاتما گاندھی نے اس امر پر زور دیا تھا کہ چودہ سال کی عمر تک کے لڑکے اور لڑکیوں کو جسمانی محنت کے ذریعے سے تربیت دی جائے۔ انہوں نے تعلیم کے بارے میں ایک ایسا بیش بہا نظریہ پیش کیا ہے جو مستقبل میں تعلیمی منصوبہ بندی کی کسی بھی منزل پر ہمارے لئے کار آمد ثابت ہوگا۔ بچّوں میں عملی طور پر کچھ کرنے کا ایسا مادہ موجود ہوتا ہے جسے نشو و نما کا موقع نہ دے کر بچّوں کی سرگرمیوں کو محض کتابوں کی ورق گردانی تک ہی محدود رکھنا کوئی اچھے نتائج پیدا نہیں کر سکتا۔ بنیادی تعلیم کے زمانے میں طلباء کی ذہنی نشو و نما میں انفرادیت کا رنگ پیدا ہونا شروع ہو جاتا ہے اور مستقبل کے تعلیمی سسٹم میں ثانوی تعلیم کے ایسے اسکولوں اور کالجوں کے قیام کی گنجائش رکھنا لازمی ہے جہاں طلباء کو ان کی صلاحیتوں کے مطابق ادب، سائنس، فن اور زراعت وغیرہ کی تعلیم دی جا سکے۔ اس کے باوجود طلباء کے انفرادی رجحانات کے لئے تسلی بخش انتظامات کرنے میں خامیاں رہ جائیں گی۔ چنانچہ اس امر کا خیال رکھنا چاہئے کہ کسی طالب علم کا سارا وقت اسکول کے مقررہ کام میں ہی صرف نہ ہو جائے بلکہ طلباء کو ان تہذیبی پہلوؤں کی طرف متوجہ ہونے کے لئے بھی وقت دیا جائے جنہیں اسکول کے مقررہ پروگرام میں جگہ نہیں دی جا سکی۔

مستقبل میں ہمارے تعلیمی اداروں میں معلومات کو تعلیم سے خلط ملط نہیں کیا جائے گا اسکول میں محض اِدھر اُدھر کی معلومات ہی جمع نہیں کی جائیں گی بلکہ ذہنی تربیت کی طرف خصوصی توجہ دی جائے گی۔ ہمارے آئندہ تعلیمی سسٹم میں بنیادی اسکول سے لے کر یونیورسٹی تک تعلیمی نقطۂ نگاہ سے تخلیقی کام کی اہمیت پر زور دیا جائے گا۔ یہ کام ذہنی بھی ہو سکتا ہے اور جسمانی بھی شرط صرف یہ ہے کہ یہ سرگرمیاں ہمیں نئے خیالات سے روشناس کرائیں اور مختلف خیالات کو نئے ڈھنگ سے یکجا کرنے میں معاون ثابت ہوں۔ لیکن اس طرح ذہنی سرگرمیوں میں مصروف اشخاص میں سماج سے بے رخی کا جذبہ پیدا ہونے کا اندیشہ بھی ہے جس کے سدِّ باب کے لئے تعلیم کے سماجی پہلو کی طرف توجہ دینا ضروری ہے۔ ادب، فن اور سائنس کے ماہرین کی خدمات سے سماج کو فائدہ پہنچنا چاہئے۔ مستقبل میں ہمارے تعلیمی اداروں کو اجتماعی ترقی کے لئے صحت مندانہ اجتماعی مساعی کی تجربہ گاہوں کی حیثیت حاصل ہوگی جہاں طلباء کو عملی زندگی اور کام کے ذریعے اپنے حُسنِ کارکردگی اور حُسنِ اخلاق کو بہتر بنانے کا موقعہ ملے گا۔ علم کی اہمیت اس وقت ہے جب اس سے کوئی کام لیا جائے۔

بعض لوگ مذکورہ خیالات کو ایک خواب سے زیادہ اہمیت دینے کو تیار نہ ہوں گے لیکن میرے خیال میں ہمارے ملک میں اس قسم کے تعلیمی سسٹم کے وجود میں آنے میں زیادہ دیر نہیں لگے گی اور ہمارے تعلیمی ادارے محض یک طرفہ نظری تعلیم کے مراکز ہی نہیں رہیں گے بلکہ ان میں انسان کی نشو و نما کے لئے بسیار پہلو عملی تربیت کے انتظامات بھی کئے جائیں گے اور یہ طلباء میں خود غرضانہ مقاصد کی تکمیل کی بجائے سماجی فلاح اور بہبود کے لئے کام کرنے کا جذبہ پیدا کرنے کے مراکز ثابت ہوں گے۔

ایچ، آر دہرہ

کشمیر کی سیر

وادیٔ کشمیر اِس قدر خوبصورت و دلکش قدرتی مناظر کو اپنی گود میں لئے ہوئے ہے کہ اُنھیں بار بار دیکھنے پر بھی انسان کی طبیعت سیر نہیں ہوتی اس جنّت نظیر خطّے کی قدرتی رنگینیاں بار بار انسان کو دعوت دیتی ہیں اور ہر بار انسانی آنکھوں میں اس کی خوبصورتی پہلے سے بھی زیادہ اُجاگر ہوجاتی ہے۔ مجھے کئی بار کشمیر کی سیر کرنے کا موقع مِلا ہے اور اس بار موسم خزاں میں کچھ غیر ملکی سیّاحوں کے ساتھ میں پھر وہاں گیا۔ کشمیر کے لئے ہوائی سفر اختیار کرنا ان دنوں رواج بن چکا ہے چنانچہ ہم بھی ہوائی جہاز میں روانہ ہوئے۔ لیکن راستے میں ہم نے ایک انوکھی بات یہ کی کہ ہم جمّوں میں ہوائی جہاز سے اُتر کر ایک کار میں سوار ہوگئے۔ میرے ساتھیوں کو اس طویل سفر کے خیال سے کچھ گھبراہٹ ہوئی۔ البتہ میرے لئے پُرانی یادوں کو تازہ کرنے کا یہ ایک موقع تھا۔ چونکہ میں پہلے بھی ایک بار اپنی چھوٹی کار میں سری نگر جمّوں روڈ پر سفر کرچکا تھا۔ دوسرے مجھے ہوائی جہاز کے مقابلے میں سست رفتار سواری سے اس لئے بھی دلچسپی ہے کہ اس سے راستے کے قدرتی مناظر کو جی بھر کر دیکھنے کا موقع ملتا ہے۔ یہاں اس بات کا ذکر کرنا بے محل نہ ہوگا کہ مغل بادشاہ کشمیر کی سیر گھوڑوں پر کیا کرتے تھے اور کون یہ کہنے کی جسارت کرسکتا ہے کہ وہ اس طریقے سے ان مناظر سے کچھ کم لطف اندوز ہوا کرتے تھے؟ اب گھوڑوں کی جگہ موٹروں نے لے لی ہے۔ پختہ اور چوڑی سڑکیں بن گئی ہیں۔ گھوڑوں پر سفر کا زمانہ اب نہیں رہا۔ لیکن کم از کم اتنا تو ممکن ہے کہ کشمیر کے ذرّے ذرّے اور چپّے چپّے میں قدرت نے انتہائی فیاضی سے جو خوبصورتی سمودی ہے اس سے پوری طرح لطف اندوز ہونے کے لئے ہم موٹر کار یا بس کے ذریعے سفر کریں۔ یہ ٹھیک ہے کہ ہوائی سفر میں وقت کی بچت ہوتی ہے۔ لیکن اس قیمت پر ہم راستے کے مناظر سے لطف اُٹھانے سے محروم رہتے ہیں۔

ہم کافی رات گئے سری نگر پہنچے۔ یہ ایک دلچسپ سفر تھا اور اگر صرف میری مرضی پر ہوتا تو میں اُسے دو دن میں ختم کرتا۔ لیکن بدقسمتی سے مجھے کچھ جلدی تھی۔ ہم ابھی بانہال کی تمام چڑھائی چڑھنے نہیں پائے تھے کہ اندھیرا ہوگیا اور اس پر مصیبت یہ کہ دھند چھائی ہوئی تھی۔ دس فٹ سے زیادہ فاصلے پر کوئی چیز دکھائی نہیں دیتی تھی۔ میرے غیر ملکی ساتھیوں کو اس امر کا علم نہیں تھا کہ یہ راستہ کتنا پُرخطر ہے اور نہ ہی میں نے انھیں اس موقع پر اس بارے میں کچھ بتانے کی ضرورت محسوس کی۔ رات کے نو بجے ہم بانہال کی سُرنگ تک پہنچے اور ہمیں یہ معلوم ہوا کہ دوسری طرف بھی گہری دھند چھائی ہوئی ہے۔ یہ جگہ سطح سمندر سے تقریباً نو ہزار فٹ کی بلندی پر ہے اور ہمیں اس پہاڑی سلسلے کو عبور کرنے کے لئے کم از کم دو ہزار فٹ کی اور بلندی پر پہنچنا تھا۔ بہرحال یہ سفر ہنسی

مذاق میں کٹ گیا اور جب ہم قاضی گنڈ سے سیدھی سری نگر جانے والی سڑک پر پہنچے تو ہم نے اپنے آپ کو بڑا ہلکا محسوس کیا میں اس تجربہ کو غالباً دوہرانا نہیں چاہوں گا۔ لیکن میں یہ بھی نہیں کہہ سکتا کہ میں نے اس تجربے سے گزر کر غلطی کی۔

آدھی رات کے قریب جب ہم سری نگر پہنچے تو میں سفر کی مشکلات کو بڑی حد تک فراموش کر چکا تھا اور اس پریشانی کے کچھ آثار اگر باقی تھے تو وہ بھی صبح کے نمودار ہونے تک زائل ہو گئے۔

ایک مہینہ پیشتر جب میں سری نگر میں تھا تو زعفران کے پھول اپنے جوبن پر تھے ڈلیا کے پھول نہایت ہی خوبصورت دکھائی دیتے تھے اور اسی طرح سنبرو اور طرح طرح کے دیگر پھول من کو بہت بھاتے تھے موسم گرما ختم ہو چکا ہے اور اس میں شک نہیں کہ اب پھول مرجھا رہے ہیں۔ لیکن اس سے کشمیر کی سیر کرنے والوں کو مایوس ہونے کی ضرورت نہیں۔ میرے موسم خزاں میں دو دفعہ کشمیر کی سیاحت کی ہے۔ اس موسم میں بھی وادیٔ کشمیر کی اپنی ہی بہار ہوتی ہے — چنار کے درخت زرد اور اس کے بعد آہستہ آہستہ گلابی و سُرخ رنگ اختیار کر لیتے ہیں تمام وادی میں پودوں اور پھولوں پر ایک نئے رنگ سے بہار آجاتی ہے۔ موسم ٹھنڈا ہو جاتا ہے اور رات کو اوور کوٹ پہننے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ اس موسم میں ٹہلنا خوب لگتی ہے۔ آدمی خوب کھاتا ہے اور اپنے اندر ایک گھوڑے کی سی قوت محسوس کرنے لگتا ہے میں خزاں میں وادیٔ کشمیر کی سیاحت کو ترجیح دیتا ہوں۔ کیونکہ جون سے اگست تک موسم میں اتنی خنکی نہیں ہوتی اور بعض اوقات گرمی بھی ہو جاتی ہے۔ اکتوبر کے پہلے ہفتے میں میں نے وادیٔ کشمیر میں برف پڑنے کا نظارہ دیکھا ہے۔ موسم خواہ کیسا ہی ہو، سیر و سیاحت کے لئے کشمیر سے بڑھکر اور کوئی جگہ نہیں۔

جھیل ڈل کشمیر کی سب سے بڑی جھیل ہے۔ اس کی لمبائی چودہ میل ہے۔ کشمیری ماہی گیر اور اُن کے بچے چھوٹی چھوٹی کشتیوں میں اس جھیل میں مچھلیاں پکڑنے میں مصروف رہتے ہیں۔ جھیل کے کنارے پر کئی چھوٹے چھوٹے گاؤں آباد ہیں۔ ہاؤس بوٹ میں رہنے کے لئے جھیل ڈل کا کنارہ بہترین جگہ ہے۔ انسان اس جھیل کے وسیع رقبے میں پھیلے ہوئے پانی پر نظریں جمائے اس کے کنارے کئی گھنٹے عالم محویت میں گزار سکتا ہے۔ ایک پرانی روایت ہے کہ کسی زمانے میں تمام وادیٔ کشمیر ایک وسیع جھیل کی مانند تھی۔

کشمیر میں رہائش کا انتظام کرنے میں کوئی مشکل پیش نہیں آتی۔ وہاں تقریباً دو تین سو آراستہ ہاؤس بوٹ ہیں۔ پانی پر تیرتے ہوئے ان مکانوں میں رہائش کا بہت اچھا انتظام ہے۔ ایک عام ہاؤس بوٹ میں دو رہائشی کمرے، دو یا تین سونے کے کمرے اور ایک غسل خانہ ہوتا ہے۔ کچھ ہاؤس بوٹوں میں صفائی کی جدید سہولتوں کا اہتمام بھی کیا گیا ہے۔ پہلی بار کشمیر جانے والا کوئی بھی شخص قدرتی طور پر ہاؤس بوٹ میں رہائش اختیار کرنے کو ترجیح دے گا۔ کیونکہ اس طرح اُسے زندگی کا ایک نیا تجربہ حاصل ہوگا

بے سوزِ عشق گر بہ شکست آورد دل
سنگ است آب گردۂ آتش ندیدہ را

رفتارِ زمانہ

کمیونٹی پراجیکٹس کی سالگرہ

۲ر اکتوبر ۱۹۵۲ء یعنی مہاتما گاندھی کی سال گرہ پر بھارت کے طول و عرض میں دیہات کی حالت سُدھارنے اور دیہاتیوں کے معیارِ زندگی کو بلند کرنے کے لیئے بھارت سرکار کی طرف سے کمیونٹی پراجیکٹ ایڈمنسٹریشن کے نام سے ایک جماعت قائم کی گئی تھی۔ ۲ر اکتوبر ۱۹۵۳ء کو اس جماعت کو قائم ہوئے ایک سال پورا ہو چکا ہے۔ اس ایک سال کے اندر اس جماعت نے جو کارہائے نمایاں انجام دیئے وہ بھارت کی تاریخ میں سُنہرے حروف سے لکھے جائیں گے۔ سال بھر میں دیش کے کونے کونے کے اندر سینکڑوں ہسپتال اور اسکول قائم کیئے گئے، ہزاروں بیل لمبی سڑکیں طیار کی گئیں، کسانوں کو ہزاروں من بیج اور کھاد بانٹی گئی۔ کاشتکاری کے نئے نئے تجربات کیئے گئے۔ گھریلو صنعتوں کو فروغ دینے کے لیئے اقدام کیئے گئے غرضیکہ دیہاتی زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں رہ گیا جس میں نمایاں ترقی نہ کی گئی ہو اور پھر اس پر طرہ یہ کہ اس کام پر خرچ بہت کم ہوا اور اس خرچ کا بھی ایک بہت بڑا حصّہ خود دیہاتیوں نے برداشت کیا۔ دیہاتیوں نے ترقی کی ایک ایک اسکیم میں بھارت سرکار کے ساتھ پورا تعاون کیا۔ ان تمام باتوں کا نتیجہ یہ ہے کہ اس وقت سرکاری کارکنوں اور دیہاتیوں کے حوصلے بہت بلند ہیں اور امید کی جاتی ہے کہ کمیونٹی پراجیکٹ اسکیم دوسرے سال کے دوران میں پہلے سال سے بھی زیادہ ترقی کرے گی۔

اندھرا کی رسمِ افتتاح

یکم اکتوبر ۱۹۵۳ء کو بھارت کے ایک نئے صُوبے اندھرا کی رسمِ افتتاح پردھان منتری شری جواہر لال نہرو کے دست مبارک سے ادا کی گئی۔ کرنول میں ایک لاکھ کے مجمع کو مخاطب کرتے ہوئے پردھان منتری نے اندھرا کے لوگوں کو ان کی اُمید بر آنے پر مبارک باد دی اور کہا کہ "آپ! آج اس مبارک دن کے موقعے پر اس بڑے آسمان کے نیچے ہم سب اس امر کا حلف اٹھائیں کہ اندھرا کی تعمیر کے لیئے ہم بڑی سے بڑی قربانی کرنے سے بھی دریغ نہ کریں گے۔" شری نہرو نے دیش کی یکجہتی پر زور دیتے ہوئے اس امر کی تلقین کی کہ لسانی بنیاد پر بنائی گئی مختلف اکائیاں دیش کی یکجہتی کے کام کو دیگر سب باتوں پر مقدم رکھیں گی۔

اندھرا کی نئی وزارت

راشٹرپتی کے اعلان کے مطابق شری چندو لال ترویدی اندھرا کی نئی اسٹیٹ کے گورنر مقرر کیئے گئے ہیں۔ وزارت پانچ اشخاص پر مشتمل ہے۔ وزیر اعظم شری ٹی پرکاشم اور نائب وزیر اعظم شری سنجیو ریڈی بنائے گئے ہیں۔

بخشی غلام محمد کی تقریر

بارہ مولہ کے ایک عظیم جلسے میں تقریر کرتے ہوئے ریاست جموں اور کشمیر کے وزیر اعظم بخشی غلام محمد نے اعلان کیا کہ کشمیر پوری طرح بھارت کے ساتھ شامل ہو چکا ہے اور اس فیصلے کو بدلا نہیں جا سکتا۔ آپ نے کہا کہ استصواب رائے ہو یا نہ ہو کشمیر کے لوگوں کا یہ پختہ عزم ہے کہ ہمارا فائدہ بھارت کے ساتھ رہنے میں ہی ہے۔ اقتصادی، تمدنی اور سیاسی حالات نے ہمارا رشتہ بھارت کے ساتھ منسلک کر دیا ہے اور دُنیا کی کوئی طاقت ہمیں بھارت سے جُدا نہیں کر سکتی۔

کشمیر میں کنٹرول ختم

کشمیر کے وزیر خوراک و سپلائی کے ڈائریکٹر کرنل بلدیو سنگھ سانیال نے ایک غیر معمولی اعلان میں بارہ سال کے بعد ریاست بھر میں اناج سے کنٹرول ختم کر دیا ہے۔ اس کے ساتھ لازمی طور پر غلہ کی وصولی کا حکم بھی رد کر دیا گیا ہے۔ کنٹرول کی تمام دکانوں کو مناسب نرخ کی دکانوں میں تبدیل کر دیا گیا ہے۔ اب ریاست بھر میں چاول اور گندم کے اِدھر اُدھر لے جانے پر کوئی رکاوٹ نہ رہے گی۔

خوراک کی بہتر پیداوار

بھارت کے وزیر خوراک شری رفیع احمد قدوائی نے ایک انٹرویو میں بتایا کہ امسال دیپ میں چاول کی فصل بہت اچھی ہے اور آئندہ سال باہر سے چاول منگوانے کی ضرورت نہیں رہے گی۔ آپ نے یہ بھی کہا کہ اب ملک میں خوراک کی صورتِ حال بالکل نارمل ہے

انقلابِ روس کی ۳۶ ویں سالگرہ

انقلابِ روس کی ۳۶ ویں سالگرہ پر ماسکو ریڈیو نے رُوس کی خارجہ پالیسی اور بنیادی مقاصد کے سلسلے میں جن آدرشوں کا اعلان کیا اُن میں سب سے بڑی اہمیت بڑی عالمگیر جنگ چھڑنے کی کوششوں کے خلاف جدوجہد کرنا ہے۔ اس کے علاوہ دیگر ممالک کے ساتھ تجارتی اور تمدّنی تعلقات بڑھانا بھی حکومت رُوس کا نصب العین رہے گا

جنوبی افریقہ اور نسلی امتیاز

بھارت اور پاکستان نے مشترکہ طور پر اعلان کیا ہے کہ جنوبی افریقہ کے ہندوستانیوں کے سوال کو سُلجھانے کے لئے حکومت جنوبی افریقہ کے ساتھ گول میز کانفرنس شروع ہونے سے پہلے یہ ضروری ہے کہ حکومت جنوبی افریقہ اپنی نسلی امتیاز کی پالیسی میں ترمیم کرنے کے لئے واضح اعلان کرے۔

کشمیر

(باتصویر تمدّنی ماہانہ انگریزی رسالہ)

کشمیر ایک ماہانہ رسالہ ہے جس میں کشمیر کی زندگی اور اُس کے مسائل سے بحث کی جاتی ہے۔ اس رسالے میں جو کیمرے کی تصاویر، مصوّروں کی بنائی ہوئی تصاویر اور خاکوں سے مزیّن ہوتا ہے، دنیا کو کشمیر، اُس کے عوام، اُس کی خوبصورتی، لوگوں کے پیشے، رسم و رواج اور اُن کے رہنے سہنے کے طریقے سے واقفیت بہم پہنچائی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ اس میں کشمیر کی شہرہ آفاق صنعت و حرفت کے متعلق بھی مضامین شائع کئے جاتے ہیں۔

کشمیریوں کے لئے اس رسالے میں ملک اور دُنیا میں رونما ہونے والے ہر روز کے واقعات اور مسائل سے بحث موجود ہوتی ہے اور یہ رسالہ اس سرزمین کی دل کشی اور عظمت پر پوری طرح روشنی ڈالتا ہے۔

قیمت ایک کاپی -/۸/-

سالانہ قیمت ۵/-/-

ملک بھر کے تمام اچھے بک سٹالوں سے مل سکتا ہے

یا براہِ راست مندرجہ ذیل پتے سے طلب فرمائیں

پبلیکیشنز ڈویژن منسٹری آف انفارمیشن اینڈ براڈکاسٹنگ

اولڈ سیکرٹریٹ دہلی ۸



بچوں کا آج کل



ٹی۔ این رعنا

چنار

کشمیر ایک ریاست ہے جو کہ ہندستان کے شمال میں واقع ہے یہ ہندستان کی سب سے بڑی ریاستوں میں سے ایک ہے جس کا رقبہ ۸۷،۰۰۰ مربع میل ہے۔ خوبصورتی اور قدرتی نظاروں کے لئے یہ دُنیا بھر میں مشہور ہے۔ ہر سال تمام ملکوں سے ہزاروں کی تعداد میں یہاں سیاح لوگ آتے ہیں۔

کشمیر کے پھل، پھول، سبزی اور ترکاریاں اپنی مثال آپ ہیں۔ یہاں کے چند درخت ایسے ہیں جو کشمیر کے بغیر کسی اور جگہ نہیں اُگتے جس کی وجہ زمین اور آب و ہوا کی خصوصیت ہے۔ کشمیر میں ایک بہت بڑا درخت اُگتا ہے جو ایک بہت بڑے بڑ کے درخت سے مشابہ ہے۔ اس پیڑ کا نام چنار ہے۔ یہ بہت بڑا ہوتا ہے اور اس کی موٹائی دس فٹ سے لے کر پچاس فٹ تک ہوتی ہے۔ اس درخت کی عمر بہت لمبی ہوتی ہے چنانچہ وادیٔ کشمیر میں ایسے چنار کے درخت بھی موجود ہیں جن کی عمر پانچ سو سال سے زیادہ ہے۔ یہ پیڑ بہت بلندی تک بڑھتا ہے اور اُس کی ٹہنیاں اور شاخیں بڑے بڑ کے درخت کے مانند ہوتی ہیں اور یہ درخت چھاتے کی طرح پھیل جاتا ہے۔ اس کے پتے سبز رنگ کے ہوتے ہیں جو بڑے آدمی کے کھُلے پنجے کے برابر ہوتے ہیں۔ اس پیڑ کا سایہ بہت ٹھنڈا ہوتا ہے اور گرمیوں میں بہت سہانا لگ جاتا ہے۔

چنار کشمیر میں مغل بادشاہوں نے لاکر بویا تھا۔ یہ ایران کے ملک میں بھی ہوتا ہے اور دنیا میں صرف یہ انھیں دو ممالک میں اُگتا ہے۔ چنار کی خوبصورتی اور خوشنمائی موسم خزاں میں پُورے عروج پر ہوتی ہے جب کہ اس کے پتے پت جھڑ سے لال اور بھورے بن کر زمین پر گرتے ہیں تو صبح کے وقت اُفق پر اور شام کی شفق میں دھوپ کی کرنوں سے ایسا دکھائی دیتا ہے گویا کہیں آگ جل رہی ہے اور آگ کے شعلوں کے مانند یہ پیڑ دکھائی دیتے ہیں۔ اس کے سوکھے پتے کشمیر کے لوگ جمع کرتے ہیں اور سردیوں میں انیٹھن یا گوبر کے ساتھ ملا کر جلاتے ہیں۔

ایک تھی چندا



ننھی مُنّی سی ایک تھی چندا
کیسا سُرخ و سفید رنگ اُس کا
شوق تھا اُس کو علم و حکمت سے
پر بُرا ہو نصیب کا بچّو!
ننھّی چندا نصیب کی ہیٹی
اُس کی امّی بھی مر چکی تھیں قضا
کام کرنے کے بھی تھے ناقابل
پھر بھی چندا اسے اُن کو اُلفت تھی
صبح اُٹھتے ہی اپنے بستر سے
نذرِ احباب خاص جاتے تھے
پھر جگاتے تھے آ کے چندا کو
ننھّی مُنّی وہ خوش نمو چندا
کر کے جُزدان کو بغل میں نہاں
پڑھنے لکھنے میں تھی بڑی ہشیار
ماسٹر اُس سے پیار کرتے تھے
اور بچّے بھی تھے بہت ایسے
کچھ امیروں کے لاڈلے تھے وہاں
اس کو اکثر وہ جھاڑ دیتے تھے



دل سے کتنی ہی نیک تھی چندا
کتنا پیارا ہر ایک ڈھنگ اُس کا
ذوق تھا نکتہ ہائے فطرت سے
دل جو توڑے غریب کا بچّو!
ایک بوڑھے غریب کی بیٹی
گھر میں تھے اُس کے ایک ہی ابّا
توڑ ڈالا تھا عُسرتوں نے دل
اس کو اُن سے بڑی محبت تھی
دھو کے مُنہ ہاتھ وہ چلے گھر سے
کچھ نہ کچھ لُطف خاص لاتے تھے
کچھ کھلاتے تھے آ کے چندا کو
چھوڑ دیتی تھی پھر وہ سب دھندا
ہو ہی جاتی تھی مدرسے کو رواں
سب ہی کہتے تھے اس کو ہونہار[1]
اُس پہ سب کچھ نثار کرتے تھے
بات کرتے تھے اس سے چاہت سے
جن سے اکثر بچائی اُس نے جاں
اس کی دُنیا اُجاڑ دیتے تھے





---

[1] ہونہار۔



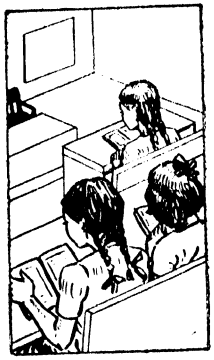
کہتے تھے ہے غریب کی بیٹی
لَوٹ آتی تھی گھر کو وہ اکثر
پھر وہ ابّا سے کہہ سُناتی تھی
لوگ کہتے ہیں اُن کی دنیا ہے
اچھّے ابّا! یہ لوگ کیسے ہیں؟
اس کے ابّا کا دل بھر آتا تھا
ضبط کر کے ہزار، گریہ کو
"اچھّی بچّی! یہی تو ہے دُنیا
جھوٹ میں لوگ مست رہتے ہیں
دُنیا اُس کی جو کام کر جائے
میں تو بُوڑھا ہوں جی نہیں سکتا
لیکن اک بات کر چلوں بیٹی!
جی چُرانا کبھی نہ محنت سے
دیکھنا پھر کدھر ہے یہ دُنیا؟
سر پہ آئی بلا نہیں ٹلتی
ابّا چندا کے مر گئے آخر
رہ گئی تھی اب ایک ہی چندا
اس پہ کیا کیا مُصیبتیں گزریں
یہ کسی نے خبر نہ لی آ کے
پر نہ ہمّت نے اس کا چھوڑا ساتھ
جیسی آئی گزار لی اُس نے
پڑھتے پڑھتے وہ پڑھ گئی اک دن
بن گئی تھی وہ ڈاکٹر اب تو
اب نہ دُنیا سے اُس نے مُنہ موڑا
اب نہ کہتے تھے کر کے مُنہ گندا!





دیکھو، چندا نصیب کی ہیٹی
رویا کرتی تھی پھر وُہ دِن دِن بھر
حال دِل کا وُہ یوں بتاتی تھی
میں یہ کہتی ہوں میری دُنیا ہے
میرے جیون کے سوگ کیسے ہیں؟
اشک آنکھوں میں پر نہ آتا تھا
چُوم لیتے تھے پھر وہ چندا کو
ہم غریبوں کا بھی جو ہے ماوا
سچ ہے بیٹی وہ جُھوٹ کہتے ہیں
اپنے ابّا کا نام کر جائے
زخم دُنیا کے سی نہیں سکتا
کچھ تسلّی سے مر چلوں بیٹی!
کام کرنا سب اپنی ہمّت سے
تم جدھر ہو اُدھر ہے یہ دُنیا!
سچ تو یہ ہے قضا نہیں ٹلتی
اس جہاں سے گزر گئے آخر
کتنی مجبور و بے کس و تنہا!
کیسی کیسی قیامتیں گزریں
کوئی تسکین بھی نہ دی آ کے
اور نہ محنت کا اس نے چھوڑا ہاتھ
اپنی دُنیا سنوار لی اُس نے
یوں ہی پروان چڑھ گئی اک دن
اس کی شہرت تھی خاص کر اب تو
اب کسی نے نہ اس کا دل توڑا
کس کی بیٹی ہے؟ ڈاکٹر چندا!







زکی انور

کالا جادو



ایک تھا راجہ۔ وہ بہت ہی رحم دل تھا، اُس کی رانی بھی نیک اور رحم دل تھی۔ وہ دونوں بھوکوں کو کھانا کھلاتے، ننگوں کو کپڑا پہناتے، اور بچّوں بچیوں کو مٹھائیاں کھلاتے اور کھلونے دیتے۔ سارا راج اپنے راجہ اور رانی سے بہت خوش تھا۔

راجہ رانی کا ایک بچّہ تھا جس کا نام پھُول تھا، اور ایک بچّی تھی جس کا نام کلی تھا۔ پھُول، پھُول کی طرح پیارا اور بھولا بھالا تھا، اور کلی، کلی کی طرح نرم و نازک اور چُپ چُپ سی تھی، راجہ رانی پھُول اور کلی کو دیکھ کر پھُولے نہیں سماتے تھے۔ کوئی بھی اُنھیں دیکھ کر پیار کرنے کو مچل جاتا تھا۔

دُور، کہیں سات سمندر پار ایک جادوگر راجہ تھا۔ وہ پھُول اور کلی سے اس بات پر بہت جلتا تھا کہ وہ اتنے خوبصورت اور پیارے کیوں تھے۔ جب کہ اُس کے بچّے موٹے، بھدّے، کالے اور بدشکل تھے۔ کوئی بھی اُنھیں دیکھ کر خوش نہیں ہوتا تھا۔ اُن کے دانت ڈراؤنے تھے، اور باہر کو نکلے ہوئے تھے۔ جادوگر راجہ کو پھُول اور کلی کو دیکھ کر اتنی جلن ہوتی کہ اُس کے بس کی بات ہوتی تو وہ اُن کی شکلیں بگاڑ دیتا۔

اور جلن میں جادوگر راجہ نے ایک رات پھول اور کلی کو اُن کے ننھے مُنّے پلنگوں پر سے اُٹھایا اور جنگل میں چھوڑ دیا۔ صبح اُن کی آنکھیں کھُلیں تو وہ بہت گھبرائے کہ وہ جنگل میں کیسے آگئے۔ وہ دیر تک گھبراہٹ میں ایک دوسرے کو تکتے رہے۔ پھر رونے لگے۔ اور جب کافی دیر تک رو چکے تو پھُول نے کہا:

"اب ہمیں گھر واپس جانے کے لئے راہ تلاش کرنی چاہیئے۔"

"ہاں۔" گھبرائی ہوئی کلی نے مُرجھائی ہوئی آواز میں کہا، اور دونوں گھر کی راہ کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے۔ سُورج اوپر اُٹھتا گیا۔ اور پھر دوپہر بھی ہوگئی، مگر اُنھیں راہ نہیں ملی۔ اب بھوک اور پیاس سے اُن کا بُرا حال تھا۔ سامنے ایک صاف شفّاف جھرنا تھا۔ وہ دونوں پانی پینے کے لئے جھرنے کی طرف بڑھنے لگے، تو کلی کو ایسا لگا جیسے اُس کے کان میں کوئی کہہ رہا تھا۔

یہ جادو کا جھرنا ہے مُنّی جادو کا سنسار
بنے بھیانک شیر پیئے جو یہ پانی اک بار

کلی نے جلدی سے پھُول کا ہاتھ تھام لیا۔ پھر بہت خوف زدہ ہو کر بولی۔

"کیا تم نے کچھ سُنا؟"

"نہیں تو، کیا بات ہے؟" پھُول اُس کی طرف حیرت سے

دیکھنے لگا۔

"یہ پانی مت پیو!" کلی کہنے لگی "یہ پانی پی کر تم بھیانک شیر بن جاؤ گے، اور مجھے چیر ڈالو گے۔ مت پیو بھیّا!"

پھول مان گیا اور وہ دونوں دوسرے جھرنے کی تلاش میں چلے۔ اب پیاس سے دونوں کے حلق میں جیسے کانٹے چبھ رہے تھے۔ میرے کچھ دور جانے پر انھیں ایک دوسرا جھرنا مل گیا، اور وہ اُدھر بڑھے ہی تھے کہ کلی کے کان میں جیسے پھر کسی نے کہا:-

یہ جادو کا جھرنا ہے سُنی جادو کا سنسار
بن جائے وہ بھیڑیا جو چھوئے پانی اک بار

کلی نے پھر پھول کا ہاتھ تھام لیا اور اور بھی خوف زدہ ہو کر بولی۔

"کیا تم نے پھر بھی کچھ نہیں سُنا؟"

"نہیں تو، اب کیا ہوا؟" پھول اُس کی طرف دیکھ کر مسکرانے لگا۔

"پیارے بھیّا۔" کلی التجا بھری آواز میں کہنے لگی "یہ پانی مت پیو میرے راجہ بھیّا۔ یہ پانی پی کر تم بھیڑیا بن جاؤ گے اور مجھے کھا جاؤ گے۔ مت پیو بھیّا، اِسے ہاتھ تک نہ لگاؤ۔۔۔"

"میں سمجھتا ہوں کہ تم بہت گھبرا گئی ہو کلی!" پھول نے اُس کی بات کاٹ کر کہا "اور گھبراہٹ میں تمھارے کانوں میں ایسی ایسی آوازیں آ رہی ہیں کہ اُس جھرنے کا پانی پی کر آدمی شیر بن جائے گا۔ اور اِس جھرنے کا پانی پی کر بھیڑیا۔"

"نہیں بھیّا سچ کہتی ہوں" کلی کہنے لگی "تم پہلے جھرنے کی طرف بڑھ رہے تھے تو میرے کان میں کسی نے کہا تھا۔

یہ جادو کا جھرنا ہے سُنی جادو کا سنسار
بنے بھیانک شیر پیئے جو یہ پانی اک بار

اور ابھی جو تم اِس جھرنے کی طرف بڑھے تو میرے کان میں پھر کسی نے کہا۔

یہ جادو کا جھرنا ہے سُنی جادو کا سنسار
بن جائے وہ بھیڑیا جو چھوئے پانی اک بار

"پگلی۔" پھول نے کلی کے گال پر ہلکے سے ایک چپت لگائی "اگر ایسی بات ہوتی تو آواز میرے کان میں بھی آتی۔ تم ضرور بہت زیادہ گھبرا گئی ہو۔ گھبراؤ نہیں ہم جلد ہی گھر کی راہ تلاش کر لیں گے۔"



پھول جب پھر جھرنے کی طرف بڑھنے لگا تو کلی نے بڑی التجا سے اُسے روک لیا۔ تب پھول نے بتایا کہ پیاس سے اُس کا بُرا حال ہے۔ اب کے جو جھرنا ملے گا اُس سے وہ پانی پیئے بغیر نہیں رہے گا۔

وہ دونوں آگے چلے۔ اب دھوپ بہت تیز ہو گئی تھی۔ سورج آگ برسا رہا تھا۔ وہ پیاس سے تڑپ اُٹھے تھے۔ کافی دور چلنے پر پھر انھیں ایک جھرنا ملا، اور پھول بے تحاشا اُدھر بھاگنے لگا۔ ٹھیک اُسی وقت کلی کے کان میں کسی نے کہا۔

یہ جادو کا جھرنا ہے سُنی جادو کا سنسار
بنے وہ جنگلی مور پیئے جو یہ پانی اک بار

کلی نے پھر اُس کا ہاتھ تھام لیا۔ مگر پھول اُس کا ہاتھ جھٹک کر بھاگ گیا۔ لیکن جھرنے کے پاس پہنچ کر جیسے ہی اُس نے ایک گھونٹ



پانی پیا، وہ یک لخت ایک خوبصورت جنگلی مور بن گیا، اور کلی کی آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑے۔ ٹھیک اُسی وقت کلی کے کان میں پھر کسی نے کہا۔

یہ جادو کا جھرنا ہے مُنّی جادو کا سنسار
سات برس میں بھاگ پھریں جو پی لو اب پانی اک بار

"تو کیا ہمارے بھاگ سات برس سے پہلے نہیں پھر سکتے؟" کلی نے اپنے دل میں کہا، مگر کسی نے جیسے اُس کے دل کی آواز سُن لی، اور پھر کسی نے اُس کے کان میں کہا۔

"میری مُنّی کلی! تم دونوں کالے جادوگر کے چکّر میں پڑ گئے ہو۔ اگر تم اب اِس جھرنے کا پانی نہیں پیوگی تو تمہاری مصیبت ہزاروں سال تک ختم نہیں ہوگی۔ ہاں اگر اپنے بھائی کے مور بن جانے کے بعد اِس جھرنے کا پانی پی لو تو سات برس کے بعد تمہارے دن پھر جائیں گے۔"

"آپ کون ہیں؟" کلی نے روتے ہوئے پوچھا۔

"میں نیکی ہوں۔" کلی کے کان میں آواز آئی۔ "تم لوگ نیک بچے ہو۔ اِس لئے میں تمہاری مدد کرنے اس جنگل پہاڑ میں بھی آگئی ہوں۔ مگر قسمت بدلنے کے لئے اکیلی میں کچھ نہیں کر سکتی۔ تمھیں تدبیر تو کرنی ہی پڑے گی۔"

کلی نے سوچا کہ اگر یہ آوازیں بھی محض دھوکہ ہیں تو کیا ہوا؟ یہی ہوگا کہ وہ بھی مور بن جائے گی، اور اب جب اُس کا بھائی مور بن چکا ہے تو وہ اکیلی رہ کر کیا کرے گی؟ اور یہ سوچ کر وہ جھرنے کی طرف بڑھی۔ پھر اُس نے بھی جھرنے سے پانی پی لیا۔ مگر وہ مور نہیں بنی۔ پھر اُس نے اپنے مور بھائی کو گود میں اُٹھا لیا، اور بالکل بے سہارے ایک طرف چل پڑی۔ جب بہت بھوک لگی تو اُس نے جنگل سے پھل توڑ کر کھائے۔ اور مور کو بھی کھلائے۔ اور اب بالکل بے ڈر ہو کر جھرنوں سے پانی پیتی رہی۔ اس طرح بھٹکتے بھٹکتے شام ہوگئی، اور جب رات آگئی تو وہ پہاڑ کی گپھا میں گھس گئی اور وہیں پڑ کر سو گئی۔

کلی اپنے مور بھائی کے ساتھ اُسی گپھا میں رہنے لگی، اُس نے اپنا سونے کا ہار مور کی گردن کے گرد لپیٹ دیا تھا، اور دن رات اُسے اپنے ساتھ رکھتی تھی، تاکہ کہیں ایسا نہ ہو کہ کوئی شکاری اُسے شکار کرلے۔ یا پکڑ کر لے جائے۔ کچھ دنوں کے بعد کلی نے کچھ جنگلی لکڑیوں کو باندھ کر ایک دروازہ سا بنا لیا، اور اب وہ پھل کی تلاش میں گپھا سے باہر جاتی تو مور کو ساتھ لے کر نہ جاتی بلکہ اُسے گپھا کے اندر چھوڑ کر باہر سے دروازہ بند کر کے چلی جاتی۔ اسی طرح دن گزرتے گئے۔ کلی بڑی ہوتی گئی اور سات برس کے بعد وہ ایک بہت زیادہ حسین راج کماری بن گئی۔ اور اپنے بدن پر درخت کے پتّے اور چھال لپیٹے رہنے لگی۔ اب کلی اپنے اچھے دن لوٹنے کا بُری طرح انتظار کر رہی تھی۔



ایک دن کوئی راجہ جنگل میں شکار کھیلنے آیا۔ جنگل میں چہل پہل پھیل گئی۔ ہر طرف سے ہانکے والے ڈھول باجوں کے ساتھ جانوروں کا ہانکا کرنے لگے۔ بندوقیں چھوٹنے لگیں اور جنگل میں ہنگامہ برپا ہوگیا۔ اُس دن ڈر کے مارے کلی اپنی گپھا سے باہر نہیں نکلی لیکن دوسرے دن بھی وہی ہنگامہ شروع ہوا۔ اب کلی اور اُس کا موربھائی دونوں بھوک سے بے تاب ہوگئے تھے۔ مگر وہ اس ہنگامے میں باہر کسی طرح بھی نہیں جاسکتی تھی۔ وہ اُداس اور خاموش بیٹھی سوچ رہی تھی کہ اب کیا کیا جائے، اتنے میں کسی نے اُس سے پوچھا۔ "کلی میں باہر جنگل میں جاؤں؟"

کلی نے مڑکر دیکھا تو گپھا میں اُس کے موربھائی کے علاوہ اور تھا ہی کون؟ لیکن اُس نے دیکھا کہ مور کی چونچیں ہلیں، اور اُس سے آواز نکلی۔

"میں باہر جاتا ہوں۔ اور تمہارے لئے جنگل سے میٹھے پھل لے آتا ہوں۔" کلی دوڑ کر مور سے لپٹ گئی۔ اب اُس کا موربھائی آدمیوں کی طرح بول سکتا تھا۔ اُس نے سوچا اب اُس کے اچھے دن ضرور لوٹیں گے، اور وہ مور کو سینے سے لگائے، آنکھوں میں آنسو بھر کر کہنے لگی۔

"نہیں بھیّا! تم باہر مت جاؤ۔ باہر شکار کا ہنگامہ برپا ہے۔ کوئی تمھیں مار ڈالے گا یا پکڑلے گا۔ باہر نہ جاؤ میرے بھیّا!"

لیکن مور نے ہٹ کی، اور آخر وہ اپنی ہٹ منوا کر ہی رہا۔ اور کلی نے اُسے جانے کی اجازت دے کر کہا کہ جب تک وہ دروازے پر آکر تین بار چنگھاڑے گا نہیں وہ دروازہ نہیں کھولے گی، کون جانے کوئی اور گھس آئے۔ مور نے وعدہ کرلیا، اور اُڑ گیا۔

جیسے ہی مور جنگل میں پہنچا، راجہ اور اُس کے آدمیوں نے گردن میں سونے کا ہار پہنے، تعجب خیز مور کو دیکھ کر اُس کا پیچھا شروع کیا اور مور بڑی مشکلوں سے چھپتے چھپتے گپھا کے پاس پہنچا، اور تین بار چنگھاڑ کر بولا۔ "بہن جلدی سے دروازہ کھولو۔" اور جیسے ہی کلی نے دروازہ کھولا وہ بے تحاشا دوڑ کر اندر گھس گیا۔ لیکن راجہ کے کسی آدمی نے اُسے آدمیوں کی طرح بولتے سن لیا۔ اور پھر کلی کو دروازہ کھولتے دیکھ لیا۔ اُس نے جلدی سے جاکر سارا قصہ راجہ کو سُنا دیا۔ راجہ کو یہ سب کچھ سن کر بڑی حیرت ہوئی، اور وہ اُسی وقت اُس آدمی کے ساتھ گپھا کی طرف بھاگا۔ گپھا کا دروازہ توڑ دیا گیا۔ اور جیسے ہی راجہ اندر داخل ہوا اُسے ایسا لگا جیسے بجلی کوند گئی ہو۔ کلی کھڑی کانپ رہی تھی۔ راجہ عش عش کر رہا تھا، کہ اُس نے اتنی پیاری خوبصورت اور بھولی بھالی لڑکی آج تک نہیں دیکھی تھی۔ لیکن کچھ دیر تک کلی کو غور سے دیکھتے رہنے کے بعد وہ اُداس سا ہوگیا، اور اُس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

"ڈرو مت۔" راجہ نے کلی سے کہا۔ "ہم تمھیں کوئی تکلیف نہیں

پہنچا ئیں گے۔ لیکن کیا تم میری بیٹی بننا پسند کرو گی؟ میں راجہ ہوں، تم راج کماری ہو گی، اور راج محل میں رہو گی۔" کلی نے اس شرط پر راجہ کی بیٹی بننا منظور کر لیا، کہ وہ اس مور کو بھی ہمیشہ اپنے ساتھ رکھے گی، اور اُس مور کو بھی کسی قسم کی تکلیف نہیں پہنچے گی۔ اس پر راجہ نے کلی سے اُس عجیب و غریب مور کا راز پوچھا جس کے گلے میں سونے کا ہار تھا۔ جو آدمیوں کی طرح بول سکتا تھا۔ اِس پر کلی نے اپنی ساری کہانی شروع سے آخر تک سُنا ڈالی، اور ساری کہانی سُن کر راجہ پاگلوں کی طرح کلی سے لپٹ گیا اور اُس کی پیشانی چُوم کر بولا۔

"بیٹی میں ہی ہوں تم دونوں کا وہ بدنصیب باپ جو سات برس تک اپنے جگر کے ٹکڑوں سے دُور رہا۔" پھر اُس نے مور کو گود میں اُٹھا لیا، اور اُسی وقت راجہ کلی اور مور کو لے کر اپنے سارے آدمیوں کے ساتھ محل کو لوٹ گیا۔ محل میں کلی کے پہنچتے ہی شادیانے بجنے لگے۔ چہل پہل پھیل گئی ـــ گویا بہار آگئی۔ مگر راجہ اب بھی اُداس تھا کہ اُس کے تخت کا وارث تو ابھی مور کی شکل میں تھا۔

دوسرے ہی دن اُس نے اپنے وزیروں سے مشورہ کیا کہ سات سمندر پار کے کالے جادوگر راجہ کے ملک پر حملہ کیا جائے۔ اور طلسم توڑ دیا جائے۔ تاکہ پھول اپنی اصلی شکل میں آجائے۔ پہلے تو اُس کے سپہ سالار کسی جادوگر سے لڑتے ہوئے ذرا ہچکچائے۔ مگر جب راج گرو نے بتایا کہ سچائی بڑے سے بڑا جادو بھی توڑ کر رکھ دیتی ہے تو فوجیں آراستہ ہونے لگیں اور محض دو دنوں میں راجہ ایک بھاری فوج لے کر کالے جادوگر راجہ کے ملک کی طرف روانہ ہو گیا۔

خوب گھمسان کی لڑائی ہوئی اور راج گرو کی بات سچ ثابت ہوئی۔ راجہ کی فوج نے کالے جادوگر راجہ کی سلطنت کو تباہ کر ڈالا۔ اور اُس کا سارا طلسم ٹوٹ کر دھواں بن گیا، اور دھواں بن کر اُڑ گیا۔

فوج فتح کے جھنڈے لہراتے واپس لوٹ رہی تھی تو راجہ کا بیٹا، راج کُمار پھول، ملک کی سرحد پر بھاری فوج لئے اُس کے سواگت کے لئے موجود تھا۔

کالے جادوگر راجہ کا جادو ٹوٹتے ہی وہ اپنی اصلی شکل میں آگیا تھا۔

لطیفے

وکیل نے اپنے مؤکل سے پوچھا، کیا تم نے اپنا بیان مجسٹریٹ کو دے دیا۔

"ہاں جناب۔"

"تو اُس نے کیا کہا؟"

"اُس نے مجھے شیطان کے پاس جانے کو کہا۔"

"اور پھر تم نے کیا کہا؟"

"چنانچہ میں آپ کے پاس آگیا۔"

جج۔ تم پر یہ الزام ہے کہ تم نے تین بار جعلی ووٹ ڈالا۔

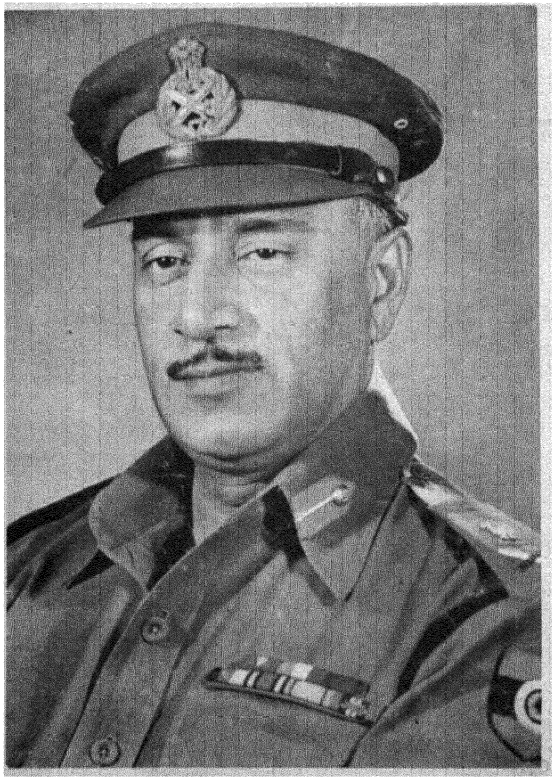
ملزم۔ تو صاحب مجھ سے بہت بڑا دھوکا ہوا۔

جج۔ وہ کیا؟

ملزم۔ اُمیدوار نے صرف ایک ہی بار جعلی ووٹ ڈالنے کا معاوضہ دیا ہے۔

آج کل

Vol. 1



آٹھ آنے

جنوری ۱۹۵۴ء

شادی کی
شادمانیوں میں
سب شادر ہے



ڈالڈا وناسپتی میں بنے کھانے ہر ضیافت کو کامیاب بنا دیتے ہیں۔ ڈبوں میں تازہ، خالص اور مفید صحت رہتا ہے۔ شادی کی تیاریوں
یہ قسم کا کھانا پکانے کیلئے نہایت موزوں ہے۔ ہوا روک مہر بند ڈالڈا وناسپتی کا ہونا لازمی ہے۔ یہ کم خرچ بھی بہت ہے۔

شادی کی ضیافت کا انتظام کیسے کیا جائے؟
مفت صلاح کیلئے آج ہی اس پتہ پر لکھئے
دی ڈالڈا ایڈوائزری سروس
پوسٹ بکس نمبر ۳۵۳، بمبئی ۱



ڈالڈا
وناسپتی

HVM. 193-X52 UD


ہر روز آپ کو
گندگی کے
جراثیم سے
بیماری کا خطرہ
رہتا ہے۔
اس خطرہ
سے آپ کو
اپنی حفاظت
ضرور کرنی
چاہیئے۔
لائف بُوائے
صابن سے
گندگی کے ساتھ
جراثیم بھی
دھو ڈالئے۔
اس کا
"محافظ جھاگ"
آپ کی صحت
کی حفاظت
کرتا ہے
LIFEBUOY
لائف بُوائے
صابن
روز روز کی گندگی کے جراثیم
سے آپکی حفاظت کرتا ہے

L. 231-40 UD





دِن بہ دِن
ایک نیا حُسن
ایک نیا نِکھار

رکسونا کا کیڈل آپ کیلئے
بھی یہ کمال کرے گا

رکسونا صابن ہر روز استعمال
کیجئے۔ اس کا کیڈل آمیز
جھاگ آپ کی جِلد کو
دِن بہ دِن زیادہ صاف اور
ملایم بنائیگا۔





رکسونا
کیڈل آمیز واحد صابن

* جلد کو ملایم کرنے والے اور مقوی جلد
تیلوں کے ایک خاص مرکب کا ملکیتی نام

رکسونا پروپرائٹری لمیٹیڈ کیلئے ہندوستان میں بنایا گیا

B.P. 109-50 UD

ترتیب

یادِ کارواں	سلیم کہانی	۴
چین کے ترانے	محمد اجمل خاں	۷
بے گھر لوگوں کو معاوضے کی عبوری سکیم	——	۱۱
نشانِ مطالعہ	فقیر جنگ	۱۲
راجہ	راجندر راجن	۲۱
غزل	بسمل سعیدی	۲۹
حشرِ جذبات	ثاقب کان پوری	۲۹
اقبال — سچدانند سہنا کی نظر میں	اختر علی تلہری	۳۰
غزل	شفا گوالیاری	۳۶
غزل	طرفہ قریشی	۳۶
ذکر و فکر	یعقوب عثمانی، ارشد کاکوی، احسن طباطبائی، حسن نعیم، برج لال جگی رعنا	۳۷
امریکہ کا موجودہ دستور	عالیہ ناہید	۳۸
کولمبو پلان کے تحت امداد	——	۴۶
نئے مطبوعات	ع۔م	۴۷
رفتارِ زمانہ		۵۱

بچوں کا آج کل

احمد اور جگنو	یحییٰ اعظمی	۵۳
پری سے پھول	شہلا جمال	۵۴
سوچنے کی عادت	مظفر زیدی	۵۶
پہیلیاں	——	۵۸
اندھیر نگری چوپٹ راجہ	سلیم مبشر علی	۵۹

سرورق :- کوریا میں نیوٹرل نیشنز ری پیٹری ایشن کمیشن کے صدر ہندوستان کے مشہور فوجی جرنیل لفٹننٹ جنرل تھمایا

اُردو کا مقبولِ عوام مصوّر ماہنامہ

آج کل

دہلی

ایڈیٹر :- جوش ملیح آبادی

اسسٹنٹ ایڈیٹر :- بال مکند عرش ملیسانی

جلد ۱۲ —— نمبر ۶

سالانہ چندہ :- —— ہندوستان میں ۸ چھ روپے، پاکستان میں :- چھ روپے (پاک)

غیر ممالک سے :- —— نو شلنگ یا ایک ڈالر

فی پرچہ :- —— ہندوستان میں :- آٹھ آنے، پاکستان میں :- آٹھ آنے (پاک)

جنوری ۱۹۵۴ء

پبلیکیشنز ڈویژن پوسٹ بکس ۲۰۱۱ دہلی

सर्वोदय साहित्य मन्दिर.
मैनी अलम रोड, हैदराबाद (द.) नं. २

شمیم کرہانی

یادِ کارواں

بتا اے ہمنشیں! کیا شاد ہیں اہلِ دیار اب بھی
وطن کی خاک ہے آئینۂ باغ و بہار اب بھی
ہیں کتے ہیں دلوں میں زندگی کے سبزہ زار اب بھی
ہیں دامن و عیش ہیں سیمیں تنانِ جو بہار اب بھی
بخیر و عافیت ہیں آہوان کوہسار اب بھی

چٹانیں، پھول، کانٹے، کھیت، پھلیاں خیریت سے ہیں
کنویں، تالاب، پنگھٹ، باغ، کلیاں خیریت سے ہیں
مرے ساتھی اور اُن کی رنگ رلیاں خیریت سے ہیں
وہ لڑکپن جن میں کھیلا تھا وہ گلیاں خیریت سے ہیں
جنوں جس بن میں جاگا تھا وہ بن ہے سایہ دار اب بھی

ہوا کے دوش پر گیسو گھٹاؤں کا مچلتا ہے
فضا میں زندگی کا لالہ گوں چشمہ اُبلتا ہے
زمیں کے دل میں خونِ رنگ و بو کروٹ بدلتا ہے
برس کر جب گھٹا کھلتی ہے اور سورج نکلتا ہے
تو ٹیلوں سے گرا کرتے ہیں سیمیں آبشار اب بھی

چھلکتی ہے شرابِ زندگی دل کے ایاغوں میں
جنوں کی لَو دلوں سے دوڑ جاتی ہے دماغوں میں
ستارے آ کے بس جاتے ہیں بستی کے چراغوں میں
گھٹا گھنگھور اُٹھتی ہے تو کیا آموں کے باغوں میں
پڑا کرتے ہیں جھولے گائے جاتے ہیں ملہار اب بھی

بجوُرت بادل کی آتی ہے تو کیا میری طرح ساتھی
ہوا جنگل کی گاتی ہے تو کیا میری طرح ساتھی
ندی چھاگل بجاتی ہے تو کیا میری طرح ساتھی
گھٹا پاگل بناتی ہے تو کیا میری طرح ساتھی
پھرا کرتا ہے جنگل میں کوئی دیوانہ وار اب بھی

نیا دیوانہ بن ہوتا ہے ساون کی ہواؤں میں
جنوں کا شور اُٹھتا ہے پپیہوں کی صداؤں میں
دیا ساحل کے بجھتا، بجھ کے جلتا ہے گھٹاؤں میں
اندھیری رات آتی ہے تو کیا بھیگی فضاؤں میں
اچانک جگمگا اُٹھتے ہیں جگنو بے شمار اب بھی

بوقتِ شام رنگ آتا ہے جب تاروں کے درپن میں
شفق سونا بچھا دیتی ہے میدانوں کے دامن میں
لگائے انتظارِ شوق کی اک آگ تن من میں
گلی کے موڑ پر چھوٹی سی پھلواری کے آنگن میں
کھڑی رہتی ہے اک مالن لئے بیلے کا ہار اب بھی

ڈھلک جاتا ہے زرّیں رنگ جب سُورج کے مینا کا
جب آنچل سُرخ ہو جاتا ہے رنگ و بُو کی بیلا کا
لئے ہمراہ رنگیں کارواں شوق و تمنّا کا
سُہانی شام آتی ہے تو کیا حورانِ صحرا کا
رہا کرتا ہے اک جُھرمٹ کنارِ جو بُبار اب بھی

اندھیرا پر کو پھیلاتا ہے جب ویران راتوں میں
ٹھہر جاتا ہے شورِ راہ کا طوفان راتوں میں
جگا کر روح کا سویا ہوا ارمان راتوں میں
سکوں جب دن سے ملتا ہے تو کیا سنسان راتوں میں
کنارے جھیل کے جھینگر بجاتے ہیں ستار اب بھی

جو خیمہ نصب کر دیتا ہے کہرا صحنِ عالم میں
فضائیں ڈوب جاتی ہیں یخ و برفاب شبنم میں
شکاری ٹولیاں اُٹھتی ہیں جوشِ خیر مقدم میں
پہاڑوں سے اُتر کر ہمنشیں جاڑے کے موسم میں
بطیں آتی ہیں جھیلوں میں قطار اندر قطار اب بھی

جب آنچل ڈال دیتے ہیں فضا پر شام کے سایے
ہوا میں تیرنے لگتی ہیں چیلیں پر کو پھیلائے
گھروں کی سمت بجتی گھنٹیاں گردن میں لٹکائے
چراگاہوں سے شاموں کو پلٹتے ہیں جو چوپائے
تو اُٹھتا ہے فضا میں سرمہ آلودہ غبار اب بھی

فضائے شام جب تبدیل ہوتی ہے فسانوں میں
دئے مٹی کے جل جاتے ہیں بوسیدہ مکانوں میں
صدائیں ڈھولکوں کی دُور سے آتی ہیں کانوں میں
پلٹتے ہیں پرندے اپنے اپنے آشیانوں میں
تو مل کر غل مچاتے ہیں میانِ برگ و بار اب بھی

گھروں میں چکّیوں پر گیت گاتی ہیں تو اے ساتھی
اُٹھائے لکڑیاں جنگل سے آتی ہیں تو اے ساتھی
سنبھالے بوجھ کھلیانوں کو جاتی ہیں تو اے ساتھی
جو مائیں کھیت میں ہنسیا چلاتی ہیں تو اے ساتھی
لگے رہتے ہیں اُن کی چھاتیوں سے شیر خوار اب بھی

زمینِ رشکِ مہر و غیرتِ مہتاب کے آگے
خرامِ آبجو و موجۂ خوش آب کے آگے
فضائے رنگ و بو کے دیدۂ پُر خواب کے آگے
کھجوروں کی گھنیری چھاؤں میں تالاب کے آگے
ڈھکے رہتے ہیں پھولوں سے بزرگوں کے مزار اب بھی

ہوائے تند کا محرم، بلائے چرخ کا عادی
جلیسِ وحشتِ صحرا، رفیقِ غربتِ وادی
بہار و باغ سے نا آشنا، محرومِ آبادی
رہا کرتا ہے کیا دن رات، تنہائی کا فریادی
درخت اک ٹاڑ کا میدان میں بے برگ و بار اب بھی

فراقِ آفتاب و دشت کے مغموم سائے ہیں
گریزِ دقت کے گمنام و نامعلوم سائے ہیں
ستاروں کے طلسماتی مگر معصوم سائے ہیں
فضا سنسان ہوتی ہے تو کیا موہوم سائے ہیں
کسی سے گفتگو کرتی ہے شامِ راہگزار اب بھی

فضا بنتی ہے بُت خانہ شبابِ کفر آگیں سے — چمن بنتا ہے رعنائی جمالِ روئے رنگیں سے
ہوائے شام خوشبو مانگتی ہے زلفِ مشکیں سے — کرن پاتی ہے تابانی لبوں کی موجِ سیمیں سے
گریباں سے چمک لیتی ہے صبحِ آبشار اب بھی

ہوائے صبح جب صحرا کی حوروں کو جگاتی ہے — کرن کا تاج بن کی اپسراؤں کو پہناتی ہے
کشش وادی کی وادی میں کسی کو کھینچ لاتی ہے — تو وقتِ سیر جو چُبھ کر اچانک ٹوٹ جاتی ہے
جھلکتی ہے گلابی پاؤں میں وہ نوکِ خار اب بھی

جو کشتی چاند کی اک نیل گوں ساگر میں بہتی ہے — فضائے رنگ و بُو میں چاندنی سرشار رہتی ہے
بیاں کیا کیجئے روحِ محبت دُکھ جو سہتی ہے — کوئی مہوش دلِ عاشق پہ سر کو رکھ کے کہتی ہے
کہ اے بیتاب کیا آیا نہیں تجھ کو قرار اب بھی

بیاباں کی حسینہ جب کسی سے چھوٹ جاتی ہے — کھڑی چوکھٹ پہ گھر کی رات دن آنسو بہاتی ہے
اسی دُھن میں ہوا جب دوپہر کی خاک اُڑاتی ہے — گلی میں ڈاکئے کے پاؤں کی آہٹ جو پاتی ہے
تو پہلو میں دھڑکتا ہے دلِ امیدوار اب بھی

ہوائے خواہش و طوفانِ احساسات ہیں تنہا — غمِ عاشق ہیں کم، ڈوبی ہوئی جذبات ہیں تنہا
کسی محبوب سے ملنے کو، آدھی رات ہیں تنہا — کوئی مہوش جوانی کی بھری برسات میں تنہا
کبھی آ کر جلاتی ہے دیا، ندی کے پار اب بھی

جو ہم آغوش ہو جاتی ہیں روز و شب کی بیلائیں — شفق میں ڈوب جاتی ہیں بیابانوں کی سلمائیں
اُٹھاتی ہیں سنہری ڈور کو پنگھٹ کی مہلائیں — نہاتی ہیں ندی میں آ کے صحرا کی حسینائیں
تو چہروں پر چمکتی ہے کرن کی سُرخ دھار اب بھی

لئے گردِ شکستہ خاطری، دل کے نگینے پر — سنبھالے ایک نازک ٹھیس دل کے آبگینے پر
بہائے آنسوؤں کی دھار، ارمانوں کے سینے پر — اندھیرے منہ شکستہ گھاٹ کے بوسیدہ زینے پر
کیا کرتی ہیں دو آنکھیں کسی کا انتظار اب بھی

جو کلیاں دو دلوں کی بن میں کھلانے کو مچلتی ہیں — دواعی صبح کی کرنوں سے چوٹیں دل کی چھلتی ہیں
ستارے کانپتے ہیں، پتیاں جنگل کی ہلتی ہیں — نگاہیں چھوٹ جانے کے لئے اُٹھ اُٹھ کے ملتی ہیں
تو شبنم اُن کو تکتی ہے بچشمِ اشکبار اب بھی

چمن سے چاندنی سے چاند سے باغوں سے لالوں سے — گھٹا سے دشت سے کہسار سے چشموں سے نالوں سے
بتانِ وادیٔ صحرا سے بستی کے غزالوں سے — کوئی اے کاش کہہ دیتا وطن کے رہنے والوں سے
کہ تم کو یاد کرتا ہے شمیمِ بے دیار اب بھی

محمد اجمل خاں

چین کے ترانے

چینیوں کا دعوا ہے کہ اُن کی تہذیب مصر اور بابل کی تہذیبوں سے بھی زیادہ پُرانی ہے اور اس میں تو شبہ نہیں کہ دنیا کی بہت سی تہذیبیں مٹ چکی ہیں، لیکن چینی تہذیب نہ صرف باقی ہے بلکہ ترقی کر رہی ہے۔

چین کا پُرانا قومی ترانہ بادشاہ تانگ یاؤ (قبل مسیح ۲۲۰۰) کے زمانہ کے قریب کا ہے جسے یوشن شاعر نے کہا تھا۔ یہی ترانہ قدیم چین کا قومی ترانہ تھا۔

اس کے بعد ڈاکٹر سن یت سن نے ۱۹۲۳ء میں چینی نیشنلسٹ پارٹی بنائی اور اس پارٹی نے جس کا نام "کومن تانگ پارٹی" ہے پُورے چین کے لئے ایک دوسرا ترانہ منظور کر لیا۔ اس ترانے کو "سان منگ چو آئی" کہتے ہیں۔ یعنی چینی قوم کے تین اصول یا دمنگ، ہیں۔ یہ اصول ڈاکٹر سن نے یورپ کی حالت کا ذاتی تجربہ کرکے بنائے تھے۔

۱۔ پہلا منگ تسو ہے، یعنی چینی قوم کی آزادی یا نیشنلزم کا اصول۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ اندرونی طور پر چین میں ہر چینی کو شہری مساوات حاصل ہو، اور خارجی طور پر مختلف قومیں کُلی طور پر انٹرنیشنل برابری حاصل کریں۔

۲ دوسرا "منگ چوان" ہے یعنی چینی قوم کی حکومت کا طریقہ ڈماکریٹک یعنی جمہوری ہو۔ اس کے بھی دو معنی ہیں (۱) ہر ایک کے سیاسی حقوق ہوں، مثلاً ووٹ کا حق۔ رفرنڈم کا حق وغیرہ اور (۲) حکومت کے اختیارات کو پانچ حصّوں میں تقسیم کر دیا جائے جو قانون سازی عدالت، انتظام، احتساب یا امتحانات اور کنٹرول پر مشتمل ہوں۔

۳۔ تیسرا منگ "شین" ہے یعنی چینی قوم (یا عوام) کی معیشت (روزی) کا اصول ہے جسے چینی سوشلزم کہا جا سکتا ہے جو کارل مارکس کے سوشل فلسفے، یا روس کے کمیونسٹ تجربے سے بالکل مختلف چیز ہے۔ اگرچہ یہ بھی سرمایہ داری اور زمینداری کو ختم کرنا چاہتا ہے۔

جب ۱۹۰۵ء میں چینی انقلابی تنظیم "جس کا ذکر اُوپر ہو چکا ہے قایم ہُوا تو یہ تینوں اصول "سان منگ چو آئی" یعنی نیشنلزم، ڈماکریسی اور سوشلزم، اس انقلابی پارٹی کے اصول قرار پائے۔ اور نیشنلسٹ پارٹی کے ترانے میں انھیں کو چینی قومیت کی بنیاد اور ان کی آرزوؤں کا مرکز مانا گیا ہے۔ چینی نیشنلسٹ پارٹی کا مختصر حال نیچے لکھا جاتا ہے۔

چینی نیشنلسٹ پارٹی

یہ نام سرکاری طور پر ۱۹۱۲ء میں استعمال ہُوا۔ اور اس پارٹی پر پانچ دَور گذرے۔ یعنی پہلے

۱۔ "منگ چینگ ہوئی" قایم ہوئی۔ یہ "انجمن ترقی چین" ۱۸۹۴ء میں جنگ چین و جاپان کے زمانے میں پیدا ہوئی۔ اس کا بانی ڈاکٹر سن یٹ سن تھا۔ یہ جزائر ہوائی میں بنی تھی۔ اس کے صرف بیس ممبر تھے۔ اس کے بعد دوسری انجمن

۲۔ "چینی انقلابی تنظیم" قایم ہوئی۔

یورپین تعلیم یافتہ نوجوانوں نے ۱۹۰۵ء میں یہ انقلابی جماعت بنائی اس میں تیس سے زیادہ نوجوانوں نے انقلاب کا بیڑا اُٹھایا۔ پھر برلن اور پیرس کے نئے ممبر شریک ہوئے اور ٹوکیو میں یہ خفیہ سوسائٹی زیادہ مضبوط بنیادوں پر کھڑی ہو گئی اور ڈاکٹر سن لیڈر بنے اس کے بعد

۳۔ "سیاسی پارٹی کومن تانگ" بنائی گئی۔

جب یہ پارٹی بنی تو مانچو خاندان ختم ہو چکا تھا۔ اور ایک قسم کی

جمہوری حکومت بن چکی تھی۔ "ملاپ پارٹی" نے طے کیا کہ اب پنچایتی یا نمایندہ اسمبلی سے قومی معاملات طے ہوں اور "ملاپ" جو ایک انقلابی سیاسی پارٹی تھی، بنادی گئی۔ اس کا نام "کومن ٹانگ" ہوگیا۔ اس کے بعد

۴۔ چینی انقلابی سوسائٹی بنائی گئی۔

جب (یو آن شہ کائی) نے غیر آئینی طور پر پارلیمنٹ کو ختم کر کے اپنی بادشاہی کی فکر شروع کی تو ڈاکٹر سن نے چینی انقلابی سوسائٹی بنائی۔ اس لئے کہ کومن ٹانگ صرف سیاسی پارٹی تھی اور اس پر انقلاب کا بوجھ نہیں ڈالا جا سکتا تھا۔ ٹوکیو میں بچے کھچے انقلابی کومن ٹانگ پارٹی کے تھے، سب اُس میں شریک ہو گئے۔ شہ کائی کا دَور جلد ختم ہوگیا اور پھر جمہوریہ قایم ہوگئی۔

اِس کے بعد اس پارٹی کا نام ۱۹۱۲ء میں

۵۔ چینی نیشنلسٹ پارٹی یا کومن ٹانگ ہوگیا۔

۱۹۲۳ء میں اس پارٹی کی عام کانفرنس شنگھائی میں بلائی گئی ایک کمیٹی نے پارٹی کا آئین بنایا اور پھر ایک مکمل مینی فسٹو (اعلان) نکالا۔ جنوری ۱۹۲۴ء میں پہلی کانگریس کینٹن میں بیٹھی۔ آئین پاس کیا گیا اور پہلی نیشنل کانگریس کا اعلان بھی جاری کیا گیا۔ اس میں پُرانے بکھیڑوں کو مٹا کر نئی اور جواں ہمّت سوسائٹی بنانے کا عہد تھا اور اسی میں عوام کے تین اصول "سان مِنگ چوآئی" کو قومی آزادی کا نشانہ مان لیا گیا۔ اب مسٹر طے چت آد پریزیڈنٹ استمانات یو آن کی تجویز پر کومن ٹانگ پارٹی کا ترانہ بطور قومی ترانے کے استعمال کیا جانے لگا۔ ۸ اکتوبر ۱۹۲۵ء کو یہ تجویز سنٹرل الگزکٹو کمیٹی، کی مجلسِ عاملہ نے منظور کی۔ اس ترانے کے الفاظ وہی ہیں جو ڈاکٹر سن یاٹ سن نے ۱۹۲۳ء میں "وھم پوآ" فوجی مدرسے کے سامنے کہے تھے۔

ایک سو تیس آدمیوں نے اسے الگ الگ نظم کیا۔ ان میں سے مسٹر چنگ موچن کی نظم جنوری ۱۹۲۹ء میں پسند کی گئی۔

نیا چینی آئین

چینی آئینی مجلس نے ۲۵ دسمبر ۱۹۴۶ء کو اپنا ایک جمہوری (ریپبلکن) آئین بنا لیا۔ اور جنرل چیانگ کائی شیک نے ڈاکٹر سن یٹ سن کی تصویر کو مخاطب کر کے ۱۵ دسمبر ۱۹۴۶ء کو اس پر ہاتھی دانت کے برش سے دستخط کر دئے۔ جنرل چیانگ نے کہا کہ "آج چینی جمہوریت کو چھتیس سال ہو گئے۔ یہ ہماری باون سالہ کوششوں کا نتیجہ ہے، اور اُمید ہے کہ ہم اپنے تین اصول (سان من چوآئی) کے مطابق اپنی جمہوری سلطنت کو چلا سکیں گے۔ اس آئین کا مسودہ ۱۹۳۵ء میں تیار ہو چکا تھا۔ لیکن جنگ چین و جاپان کی وجہ سے اس پر دستخط نہ ہو سکے۔ چینی کمیونسٹ اس سے اتفاق رکھتے تھے۔ لیکن جب ۱۷ نومبر کو نیشنل اسمبلی بیٹھی تو وہ شریک نہیں ہوئے اور دو ہزار چھپن نمایندوں میں سے صرف ایک ہزار چار سو شریک ہوئے۔ وہ کہتے تھے کہ اس کی بنیاد غیر قانونی ہے اور چاہتے تھے کہ مرکزی حکومت دوبارہ بات چیت شروع کرے۔

یہ آئین ۲۵ دسمبر ۱۹۴۶ء کو جاری ہُوا اور اس عرصے کے لئے ایک درمیانی حکومت بن گئی۔

"چھن یُن لیَن سشی"

(چین کا پُرانا ترانہ)

چھین یِن لیَن سشی چُنگ مَین مَین سشی
زے یوئی کوانگ وا تن فو تن سشی

(نوٹ) یہ چین کا نہایت پُرانا گانا ہے جسے موجودہ ریپبلک نے اپنا قومی ترانہ بنا لیا ہے۔

ترجمہ

اے خوش نصیب بادلو اے دل فریب بادلو
دکھلاؤ اپنی شان کو پھیلاؤ آن بان کو
اے سورج آسمان کے اور چاند آن بان کے
بناؤ تم سدا یہیں دِنوں کو روشن اور حسیں

"سان منگ چوآئی"

(کومن ٹانگ پارٹی یا جمہوریہ چین کا ترانہ)

پہلا بند

"سان منگ چوآئی" مقصد پارٹی کا اپنی ہے
یعنی پھر تعمیرِ جمہوری کریں ہم چین میں
اور انٹرنیشنل بن جائے یہ برادری

دُوسرا بند

یارو بڑھو یارو بڑھو
تم ہو ہراول قوم کے
پہرہ نہ چھوڑو تم کبھی
پابند اصولوں کے رہو

تیسرا بند

محنت کرو ہمت کرو
سچے بنو پکے رہو
مل کر چلو یک دل بنو
مقصد تلک بڑھتے رہو

نیا چین

۱۹۴۹ء میں چنگ کائی شیک کی حکومت کو شکست اور عوامی انقلابی پارٹی کی فتح ہوئی۔ اور نئے چین کی بنیاد پڑی۔ یہ انقلاب لیکن دیا جدیدی چین کی شکستہ اور پامال اقتصادیات کو نئے ڈھنگ سے بہتر اور مضبوط بنا رہے ہیں۔ ان کے مفکرین نے مالی عدم مساوات کو دُور کرنے کا وہی طریقہ اختیار کیا ہے جو گوتم بدھ، کنفوشس اور لاؤ تزے کی تعلیمات کے عین مطابق ہے اب صرف فکری اخوت و محبت کی تبلیغ نہیں کی جاتی بلکہ عملی طور پر لوگوں کو بھائی بھائی بن جانے پر "مجبور" کیا جا رہا ہے۔ سب برائیوں کی جڑ جاگیرداری تھی۔ ظاہر ہے کہ جس قوم کی ستر فیصدی آبادی کی معاش کا مدار زراعت ہو وہ چند جاگیرداروں کے قبضے سے نہ نکلے تو کسی طرح معاشی مساوات و ترقی نہیں پیدا ہو سکتی۔ لہٰذا جاگیرداری ختم کر کے چین کے رہنماؤں نے بنیادی بُرائی کو ختم کر دیا اور قوم کا ہر فرد مساوی طور پر ملک کے لئے مفید بننے کی کوشش کرنے لگا۔

جاگیرداری نظام میں انفرادی دولت کی بہتات کا ناگزیر نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ عورتوں کا درجہ محض ایک غلام کا سا ہو جاتا ہے۔ گویا قوم کی نصف آبادی اپنے سے قوی تر صنف کے رحم و کرم پر زندگی بسر کرنے لگتی ہے۔ عورتوں کے لئے قانون بھی مرد ہی بناتا ہے اور اُس میں اُس کے نہیں بلکہ اپنے بھلے اور تن آسانی کو پیشِ نظر رکھتا ہے۔ کہیں راجہ کے مونے پر اُس کی رانیاں زندہ دفن کر دی جاتی ہیں کہیں جل کر مر جانے پر مجبور کیا جاتا ہے اور کہیں کمسن بیواؤں تک کو عمر بھر بیوہ رہنے پر مجبور کیا جاتا ہے۔ چین میں ایسی بیواؤں کو بہت ہی نفرت کی نظر سے دیکھا جاتا تھا جو عمر بھر دوسرا بیاہ نہ کرتی تھیں۔ لیکن اب اس نئے دَور میں عورتوں کو مردوں کے برابر تعلیم، وراثت اور خدمت کا راستہ صاف کر دیا گیا ہے۔ اس اقتصادی و تعلیمی مساوات نے عورتوں کو مردوں کا دست نگر نہیں رکھا۔ اب نہ تو کوئی عورت فاقہ کشی کی وجہ سے بدکاری کی زندگی پر مجبور ہے، نہ مردوں کی ہوس کا شکار ہو کر سوکنوں کی آماجگاہ بن سکتی ہے۔ ایک شوہر کے لئے ایک بیوی اور ہر عورت کے لئے معیشت کی سرکاری ذمہ داری نے صنفی کشمکش اور عدم مساوات کو ہمیشہ کے لئے دفن کر دیا ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ خاندان کی مردم شماری بڑھانے کا خیال بھی ختم ہو گیا ہے۔ خاندان کی جگہ فرد نے لینا شروع کی ہے۔ اور زراعتی یا جاگیرداری دَور کا سوشل نظام، جس میں بچوں کی کثرت پر بہت کچھ خاندانی ترقی کا انحصار تھا، اب ختم ہو رہا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ جس چینی قوم کی آبادی کی کثرت نے ذرائع خوراک کو ناکافی بنا دیا تھا اب اُسی قوم میں ضرورت سے زیادہ خوراک پیدا ہو رہی ہے۔ کسی جگہ کمزور بچے اور فاقہ زدہ انسان نظر نہیں آتے اس لئے کہ حکومت ہر شخص کی ضروریاتِ زندگی کی ذمہ دار ہے اور حکومت کل قوم کی ہے۔ یعنی اب پوری قوم ہر فرد کی ترقی اور معاش کی کفیل ہے۔ اسی کو عوامی جمہوریت کہا جا سکتا ہے۔

جہاں تک تعلیم کا تعلق ہے۔ نئے چین کے قائم ہونے سے پہلے ہی اس مسئلے کو حل کرنے کی طرف توجہ ہو گئی تھی۔ نئے چین نے اُن کو زیادہ عوامی بنا کر دسعت دے دی ہے۔ دُنیا جانتی ہے کہ کاغذ بنانے کا فن سب سے پہلے چین میں جاری ہُوا تھا۔ اتفاق سے پہلی صدی ہجری میں کچھ چینی کاغذ ساز مسلمانوں کے ہاتھ لگ گئے تھے، جن سے یہ فن حاصل کر کے مسلمانوں نے نہ صرف دنیا میں عام کر دیا، بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ پُرانی دنیا کے لئے علم و فن کا دروازہ کھول دیا۔ اسی کے ساتھ ساتھ فن کاغذ سازی کو اتنی ترقی کی کہ خرطیطُ دمشقی Charita Damaskena کے مقابلہ میں ریشم کی قدر نہ رہی

بہرحال اگرچہ چین میں ہزارہا سال سے کتابت کا فن جاری تھا۔ ان کا رسم الخط الف بائی نہ تھا بلکہ ہر لفظ کی ایک الگ الگ تصویر ہوتی تھی۔ نتیجہ یہ ہُوا۔ کہ تحریری و تقریری زبان میں دُوری ہوتی گئی اور سیکڑوں بولیاں لاپتہ ہو گئیں جو کہ سکل زبان کے مقابلے میں زیادہ ترقی یافتہ اور تعلیم یافتہ ہیں۔ تحریری زبان کلاسکل تھی۔ یعنی اُس پر قدامت پرستی چھائی ہوئی تھی اور حرف اپنے اشکال کی وجہ سے صرف چند لوگوں تک محدود تھی۔ یورپ اور امریکہ نے جو چینی خطرہ پیدا کیا۔ انھوں نے دیکھا لاتینی زبان نے جو ظلم عام یورپین زبانوں کے ساتھ کیا تھا اور انھیں قدرتی طور پر پنپنے سے روکا تھا، وہی رجعت چین کے رسم الخط اور قدیم زبان کی پیروی سے ہو رہی ہے۔ انھوں نے لاکھوں میں سے صرف چھ سو بنیادی اصواتی رسوم خط کو چن لیا۔ اور ہر ابتدائی مدرسے میں اسے جاری کر دیا۔ عوامی زبان Pai Hua میں نیا ادب ڈھلنے لگا۔ اور قدیم کلاسکل اور مُردہ زبان خود بخود سکّہ خارج الوقت قرار پائی۔ تعلیم مفت کر دی گئی۔ طلبہ کے لئے حکومت نے یہ انتظام کر دیا کہ تعلیم حاصل کرتے ہی جو جس لائق ہو فوراً لگا دیا جائے۔ اس طرح نہ صرف عوامی زبان و ادب کل ملک میں رائج ہو رہا ہے بلکہ تحریر کی آسانی کی وجہ سے کثرت سے اہلِ قلم پیدا ہو رہے ہیں جو ملک کو ایک بلند جمہوری نصب العین کے لئے متحد کر رہے ہیں۔

لیکن باوجود اتنی ہمہ گیر ترقی اور انقلاب کے یہ سمجھنا غلط ہوگا کہ چین کا عوامی انقلاب کسی دوسرے ملک کی نقل کر رہا ہے، یا کارل مارکس کے فلسفہ کی لفظ بلفظ پیروی کرنا چاہتا ہے۔ ظاہر ہے کہ چینی مذہب کی بنیاد اجداد پرستی اور جہالت کی وجہ سے چند توہمات اور جوتشی وغیرہ پر قائم تھی۔ تعلیم کے عام ہونے اور سائنٹیفک جنتری کی سرکاری اشاعت کی وجہ سے پرانے کاہن اور جوتشی بے کار ہو گئے۔ بلکہ وہ خود معاشی آزادی حاصل ہونے کی وجہ سے اپنی جہل فروشی پر نادم ہو گئے۔ رجعت پسندی کی جڑ کٹ گئی۔ لیکن قدیم فنونِ لطیفہ نے جو جمالیاتی احساس بیدار کیا تھا وہ جُوں کا توں قائم رہا۔ بدھسٹ فنِ تعمیر و بُت تراشی کے تناسب، نزاکت اور سنجیدگی و شکوہ کو کون چینیوں کے تصورات سے محو کر سکتا ہے۔ ان کی موسیقی کی لطافت اور جاں نوازی کو کون فردوسِ گوش بننے سے روک سکتا ہے اور ان کی معمّاری کے اچھوتے رنگوں کو جنّت نگاہ بننے کا کون اہلِ نظر منکر ہو سکتا ہے! اسی کے ساتھ ساتھ اس لاانتہا قوتِ عمل کی مالک قوم کو کون مجبور کر سکتا ہے کہ سیلابوں کے رُخ کو نہ پھیرے۔ جس نے مسیح سے دو سو دس سال پہلے چودہ سو میل لمبی دیوارِ چین بنا ڈالی تھی جس نے شمالی جنگلی اقوام کے سیلاب کو چین میں داخل ہونے سے روک دیا تھا۔ اب استعمار پسندوں کی افیون خورانی چین کی آنکھوں کو بند نہیں کر سکتیں۔ وہ آگے بڑھ رہا ہے۔ لیکن اُس نے اپنے قدیم اصولوں کی خوبیوں کو ترک نہیں کیا۔ اُس نے انعقادِ سرمایہ داری اور مذہب کی برکتوں کو یک لخت خیرباد نہیں کہا اُس نے انسانی اشتراکی قوتِ عمل کو بیدار کر دیا ہے لیکن مختصر سرمایہ داری کی افادیت کو جاری رہنے دیا ہے۔ اس کا انقلاب مزدوروں کا نہیں بلکہ کسانوں کا انقلاب ہے۔ مذہب سے نہیں توہمات سے انقطاع ہے۔ لہٰذا ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ نہایت مفید اور نیا تجربہ ہے۔ ان کا ادب و شعر انسانی زندگی کو پوری آب و تاب کے ساتھ نمایاں کر رہا ہے۔ اور اُن کا آرٹ، ڈرامہ اور معاشرہ ہندوستان کی طرح امن و جمہوریت کا علمبردار ہے۔

چین کا ابھی کوئی قومی ترانہ نہیں بنا۔ نیچے دیا ہُوا ترانہ اُن کی ترقی پسندی، ہمّت و اتحاد کی پکار ہے۔ اسی کو انھوں نے قومی ترانہ مان لیا ہے:-

نئے چین کا قومی ترانہ

اُٹھو! اُٹھو!
وہ سب اُٹھو
جنہیں نہیں قبول ہے
غلامی دین واستا۔
کھڑی کھڑی!
ہاں، ہو کھڑی
ہمارے ہاڑمانس کی
دیوار اک بہت بڑی۔

کہ اِس گھڑی
آ پڑی
ہماری جینی قوم پر
بلا بہت بڑی کڑی
ہر ایک دل سے
زور سے
اُٹھے آواز ایک ساتھ
اُٹھو! اُٹھو! اُٹھو اُٹھو!

دسیوں لاکھوں پر ہوں ایک
ایک دل ہوں ایک جان
کھول چھاتیاں جوان
چلے چلو چلے چلو
دشمنوں کی گولیاں
ہاں چھاتیوں پہ جھیلنے
بڑھے چلو، بڑھے چلو!
بڑھے چلو، بڑھے چلو!

بے گھر لوگوں کو معاوضے کی عبوری اسکیم

بھارت سرکار نے ان بے گھر لوگوں کو جن کے نام پانچ ترجیحی زمروں میں شامل کئے گئے ہیں، عبوری معاوضہ دینے کی جو اسکیم منظور کی ہے اس کی شرح کا نقشہ درج ذیل ہے۔

شہری جائداد کے کلیم کی تشخیص شدہ رقم روپے	عبوری تادیہ: معاوضہ روپے	عبوری تادیہ: بحالیاتی امداد روپے	میزان روپے			
۱۰۰۰	۲۰۰	۴۰۰	۶۰۰	۲۴۰۰۰	۴۸۰۰	۱۸۳۲	۶۶۳۲
۲۰۰۰	۴۰۰	۸۰۰	۱۲۰۰	۲۶۰۰۰	۵۲۰۰	۱۵۷۶	۶۷۷۶
۳۰۰۰	۶۰۰	۱۰۰۹	۱۶۰۹	۲۸۰۰۰	۵۶۰۰	۱۳۰۱	۶۹۰۱
۴۰۰۰	۸۰۰	۱۱۸۰	۱۹۸۰	۳۰۰۰۰	۶۰۰۰	۱۰۲۴	۷۰۲۴
۵۰۰۰	۱۰۰۰	۱۳۲۷	۲۳۲۷	۳۵۰۰۰	۷۰۰۰	۳۰۴	۷۳۰۴
۶۰۰۰	۱۲۰۰	۱۴۵۴	۲۶۵۴	۴۰۰۰۰	۷۵۵۸	-	۷۵۵۸
۷۰۰۰	۱۴۰۰	۱۵۶۷	۲۹۶۷	۴۵۰۰۰	۷۷۸۷	-	۷۷۸۷
۸۰۰۰	۱۶۰۰	۱۶۶۶	۳۲۶۶	۵۰۰۰۰ اور زیادہ	۸۰۰۰	-	۸۰۰۰
۹۰۰۰	۱۸۰۰	۱۷۵۸	۳۵۵۸				
۱۰۰۰۰	۲۰۰۰	۱۸۴۰	۳۸۴۰				
۱۲۰۰۰	۲۴۰۰	۱۹۸۰	۴۳۸۰				
۱۴۰۰۰	۲۸۰۰	۲۰۹۷	۴۸۹۷				
۱۶۰۰۰	۳۲۰۰	۲۱۹۳	۵۳۹۳				
۱۸۰۰۰	۳۶۰۰	۲۲۰۰	۵۸۰۰				
۲۰۰۰۰	۴۰۰۰	۲۱۴۴	۶۱۴۴				
۲۲۰۰۰	۴۴۰۰	۲۰۲۴	۶۴۲۴				

آشرموں اور محتاج گھروں میں رہنے والے اُن لوگوں کو جن کے کلیم تصدیق ہو چکے ہیں، دیگر قسم کے ترجیحی دعویداروں کے مقابلے میں زیادہ بحالیاتی امداد ملے گی۔

تقدیم کے پانچ زمرے

موجودہ اسکیم کے تحت وہی بے گھر لوگ آتے ہیں جو تقدیم کے حسب ذیل پانچ زمروں سے متعلق رکھتے ہیں۔

(۱) ایسی بیواؤں، بوڑھے یا بیمار اشخاص جو گذارہ الاؤنس حاصل کر رہے ہیں۔
(۲) عورتوں کے آشرم یا محتاج گھروں میں رہنے والے اشخاص۔
(۳) دیگر بیواؤں جنہوں نے کلیموں کی تصدیق اپنے ناموں سے کرائی ہے۔
(۴) حکومت کی تعمیر کردہ بعض نئی بستیوں میں رہنے والے اشخاص
(۵) پنجاب میں کچے جھونپڑیوں والی بستیوں میں رہنے والے اشخاص

نشاطِ مطالعہ

(۵)

فریدرش ولہلم نتشے

نشاطِ مطالعہ اگر آپ کی جذباتی دُنیا پر ایک معراجی کیفیت طاری نہیں کر دیتا تو یہ ضروری نہیں ہے کہ آپ احساسِ کمتری کے شکار ہو جائیں اور یہ سمجھنے لگیں کہ آپ کا جمالیاتی ذوق کور ہے اور آپ تلمیذِ حُسن کے شناور نہیں بن سکتے۔ علامہ اقبال خُدا انہیں مغفرت نصیب کرے۔ آپ کی تسلّی کے لئے اور شاید آپ کی تسلّی سے زیادہ خود اپنی تسلّی کے لئے فرماتے ہیں۔

گمان مبر کہ نصیبِ تو نیست جلوۂ دوست
دروں سینہ ہنوز آرزوئے تو خام است

یہ آرزوئے خام تو پختہ کی جا سکتی ہے اور پھر یہ بھی کیا ضروری ہے کہ اسے پختہ کیا ہی جائے۔ قوالی سنتے ہوئے آخر سب کو تو وجد نہیں آ جاتا اور جن کو وجد آتا بھی ہے اور جن کو اس حالت میں بعض اوقات درخت سے اُلٹا لٹکا کر "اوند ھم معراج" پر پہنچا دیا جاتا ہے۔ ان میں سے کیا ہر ایک قوالی کے نشاط سے آشنا ہے؟ مختصر یہ کہ نشاط کے لئے وجد کا آنا یا نہ آنا ضروری نہیں ہے اور نہ ہی یہ ضروری ہے کہ یہ نشاط آپ پر معراجی کیفیت طاری کر ہی دے۔ اور حضرت غالب تو اس نشاط کو بھی 'روسیاہ' حضرات کی مطلوب اور مقبول شے قرار دیتے ہیں۔ البتہ "اک گونہ بے خودی" انہیں ضرور مرغوب ہے۔ اور یہی بے خودی ہمارے لئے بھی آج کے مطالعے کا وسیلہ بن سکتی ہے۔ آیئے اس 'بے خودی' کو وسیلہ بنا کر "خودی" کے سب سے بڑے پیغمبر کے حضور میں چلیں جو اس وقت عالم ارواح میں ہے اور جس کا نام نتشے ہے۔

باغِ رضواں کا ایک تنہا گوشہ ہے۔ برگد کی سی شکل کا ایک درخت، اپنے چکنے چکنے پتّوں پر سے پھسلی ہوئی دھوپ چھاؤں سے زمین کے سبزے پر قالین سا بچھائے ہوئے ہے۔ اس درخت کی ایک جھکی ہوئی شاخ کو پکڑے مہاتما بدھ کھڑے ہیں، نحیف، کمزور بے حد غمگین، اداس اور خاموش، آنکھوں میں کچھ سوئے ہوئے خواب اور چہرے پر ایک جاگا ہوا درد گویا جھیل کی ساکن سطح پر کسی منڈلاتے ہوئے زخمی سارس کے بازوؤں کا سایہ صبح کی پہلی کرنوں میں سے چھن کر بیداری کی کروٹیں لے رہا ہے۔

کنفیوشس اپنے چینی طرز کے لبادے میں ملبوس قریب آتے ہیں اور مہاتما بُدھ سے اُن کی اُداسی کی وجہ پوچھتے ہیں۔ مہاتما بدھ نہایت گلوگیر آواز میں جواب دیتے ہیں۔

دنیا کی حالت دیکھ کر کیا تمہارا دل اُداسی سے نہیں بھر جاتا؟ دنیا ماتم کدہ بنی ہوئی ہے۔

انسان اپنی ایک نسل میں دو دو جنگ لڑ چکا ہے اور جنگ بھی وہ جس کی بہیمیت پر جنگلی درندے بھی شرمندہ ہیں - مادرِ گیتی کے دودھ بھرے سینے سے ابھی ان زخموں کا بہتا ہوا لہو تھما نہیں تھا - کہ یہ انسانی درندے تیسری جنگ کی طیاری میں مشغول ہیں - آہ! ان کا علم کیا ہوا - وہ علم جس کے پیچھے خلیفوں' شاعروں' آرٹسٹوں اور مفکروں کی پشت ہا پشت کا وجدان اور صدہا سال کی کاوشِ طبع کا نچوڑ موجود ہے - ان کا گیان کس اندھیرے میں چھپ گیا - ان کی انسانیت کو کس نے ڈس لیا -

کنفیوشس - میں تو کبھی اس "علم" اور "گیان" کا قائل نہیں تھا - امام رازی اس کی شہادت دیں گے جنھوں نے تمام عمر کی کاوش سے انسانی علم کی غیر اعتمادی کے ثبوت میں بذاتِ خود ایک مستقل علم قائم کر دیا ہے - میرے نزدیک تو انسانی علم کی نسبت انسانی اطوار اور چلن کہیں زیادہ قابل وثوق اور قابل توجہ ہیں - کم و بیش اسی زمانے میں جب آپ ہندوستان کے میدانوں میں گیان اور علم کی باتیں کر رہے تھے میں نے چین کی پہاڑیوں میں لوگوں سے کہا تھا -

نکو کاری' صدق گوئی' بڑوں اور محترم لوگوں کو پہچاننا اور ان جیسا بننے کی کوشش کرنا اور ان صفات پر ان تھک مسرت کرنا یہ آسمانی شرافت ہے - اس کے بعد بھی لوگوں کے پاس اگر کچھ وقت بچ جاتا ہے اور ان میں سکت باقی رہتی ہے تو پھر وہ کتابوں کی طرف رجوع کر سکتے ہیں - تحصیلِ علم کی کوشش کر سکتے ہیں -

مہاتما بدھ - میں اس بحث میں نہیں پڑوں گا کہ انسانی علم قابل وثوق و اعتماد ہے کہ نہیں - آپ نے امام رازی کا ذکر کیا ہے - ابھی پرسوں ہی اُن سے ملاقات ہوئی تھی - وہاں شپینگلر بھی تھے' نٹشے بھی تھے اور چند ایک اور احباب بھی - کتنا مذاق اڑایا اُنھوں نے میرے منطقی اصولوں کا - لیکن لطف یہ کہ منطق اور علم کو بے بنیاد ثابت کرنے کے لئے سہارا اُنھوں نے بھی منطق اور علم کا ہی لیا - اور اس طرح قدم قدم پر خود ہی اپنے دعوے کی تردید کرتے رہے - خیر جو بھی ہو مجھے اس وقت ان مسائل سے بحث نہیں ہے - میرے سامنے تو اس وقت دُکھی انسانیت ہے اور اس کی کراہتی ہوئی لاچاری - کیا ہم ایک لمحے کے لئے بھی دُنیا کے اپاہجوں' لنگڑیں' لُولوں' کوڑھی اور بھوک' امراض اور افلاس سے بلبلاتے لوگوں کی حالت زار سے بے پروا رہ سکتے ہیں! وہ یتیم بچے اور بیوہ عورتیں جو ظالم اور سفاک سرپرستوں کے رحم و کرم پر آنسو پی پی کر زندہ ہیں! وہ افلاس زدہ مزدور جو دن بھر کی پشت شکن مشقت کے بعد ہڈیوں میں تکان کا درد لئے خالی پیٹ خون کے گھونٹ پی کر سو جاتے ہیں' میدانِ جنگ کے وہ زخمی سپاہی جو درد اور تکلیف کی آگ میں جلتے ہوئے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر بے کسی کی ایک لمبی اور بھیانک موت مرتے ہیں آنے والے کل کے تغیرات سے ہراساں اور موت کے خوف سے سہما ہوا وہ انسان جو بظاہر کامیاب زندگی گزارتا ہے لیکن جس کے دل میں مستقبل کے اندھیرے کا گھُن لگا ہوا ہے اس کی بے بسی اور لاچاری کیا ان کے خیال سے کوئی بھی ذہین غافل رہ سکتا ہے - اس دکھوں کے سمندر میں ڈوبتی ہوئی انسانیت کے لئے عاقبت کا کوئی ساحل تلاش کرنا ہوگا - اس کی نجات کا راستہ ڈھونڈنا ہوگا - اور میرے نزدیک یہ راستہ محبت کا راستہ

ہے' عدم تشدّد کا راستہ ہے - اس راستے پر چل کر ہی وہ عاقبت کے ساحل پر پہنچ سکتا ہے - اُسے نجات حاصل ہو سکتی ہے" -

مہاتما بُدھ کی پیشانی پر شدّتِ غم سے سایے کا ایک جال سا لرزنے لگا تھا اور آنسو آنکھوں میں چھل آئے تھے - گویا چراگاہ کی پُر امن فضا میں سردیوں کی سنسان شام کا ہلکا کہرا پھیلنے لگا ہو جس کے نیچے مکڑی کے جالوں پر شبنم کے جھلملاتے قطروں میں رات کے اولین ستاروں کا عکس جاگ اُٹھا ہو وہ اسی حالت میں کھڑے تھے کہ حکیم نتشے کہیں سے ٹہلتے ہوئے وہاں آ پہنچے اور مہاتما بدھ کو اس طرح غمگین اور اُداس دیکھ کر کہنے لگے -

"یہ آپ نے کیا مُحزنی صورت بنا رکھی ہے ؟ آدمی کو اتنا بھی نرم دل نہ ہونا چاہیئے - یہ تو کمزوری کی نشانی ہے - یہ چھوٹے موٹے بے مصرف اور کمزور انسانوں کی قسمت پر آنسو بہانا کس کام کا ! لوگ اذیّت اُٹھا رہے ہیں تو کیا ہوا - آخر اذیّت اٹھانا بھی تو ایک قربانی ہے - ادنےٰ آدمیوں کی اذیت بھی ادنےٰ اور قربانی بھی ادنےٰ اور اعلےٰ آدمیوں کی اذیّت بھی اعلےٰ اور قربانی بھی اعلےٰ - آپ نے کبھی اس بات پر بھی غور کیا کہ آپ کی تعلیمات ایک کورا منفی نظریہ پیش کرتی ہیں - زندگی کے سلبی پہلو کے علاوہ اس میں اور دھرا ہی کیا ہے ! آپ فقدانِ اذیت پر زور دیتے ہیں - یہ حالت تو فقدانِ وجود کے ذریعے ہستی کو مٹا دینے سے کہیں زیادہ اچھی طرح اور آسانی سے حاصل ہو سکتی ہے - بخلاف اس کے میرا نظریہ اثباتی نظریہ ہے - میرے نزدیک شہنشاہ فریڈرش دوم' چنگیز خان' سکندر اعظم اور نپولین جیسی شخصیتیں قابل احترام اور قابل تقلید ہیں - ایسی ہستیوں کے لئے ہر ظلم' ہر تعدّی' ہر اذیّت اور ہر قربانی جائز ہے - میں اس تخلیقی قوّت سے اپیل کروں گا جس کے ذوقِ سلیم نے نپولین اور سکندر جیسے فنی معجزے آشکار کئے کہ وہ آپ جیسے نفسیاتی مریض اور کج ذوق انسان کے بسورنے اور ٹسوے بہانے کو نظر انداز کرکے اپنے فنّی کمالات کی شانِ رعنائی کو بروئے کار لائے" -

مہاتما بدھ - "یہ صحیح نہیں ہے" - پروفیسر نتشے کہ میرے نظریے میں منفی اور سلبی پہلو کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے - اس میں شک نہیں کہ فقدانِ اذیّت کا منفی پہلو اس میں ہے' لیکن اس منفی پہلو میں اثباتی جُز بھی اتنا ہی اہم اور ہمہ گیر ہے جتنا کہ شاید دُنیا کے کسی بھی نظام فلسفہ میں ہو سکتا ہے - آپ کی طرح میں بھی بہت سی ہستیوں کا گرویدہ ہوں اگرچہ چنگیز خاں اور نپولین جیسے شخصیوں کے لئے میرے دل میں کوئی جگہ نہیں - میرے نزدیک یسوع مسیح قابلِ احترام بزرگ ہیں جنہوں نے محبت' درگزر اور رواداری کی تعلیم دی جنہوں نے دشمن کو بھی پیار کرنا سکھایا - میرے نزدیک وہ لوگ قابلِ احترام ہیں جنہوں نے نئی ادویہ دریافت کیں اور امراض کی صعوبت کو کم کیا یا جن کے ذوقِ تخلیق نے اشعار' تصاویر اور راگوں میں ابدی حُسن کے لافانی لمحے جمع کئے اور انسانی مسرّت کے لئے پرِ پرواز اور فضائے بسیط مہیّا کئے - کیا محبّت' علم اور نشاطِ حُسن کا نظریہ منفی نظریہ قرار دیا جا سکتا ہے - پروفیسر نتشے! یہ چیزیں تو وہ ہیں جن میں ہر ایک دنیا کے بڑے بڑے انسان کی زندگی کو اثباتی جوہر سے بھر دینے کے لئے کافی ہے -

حکیم نتشے - "ہوں گی" ! مجھے اس سے بحث

نہیں اور نہ دلچسپی ہی ہے - لیکن جب مجموعی طور پر میں آپ کی دنیا کا تصور کرتا ہوں تو مجھے گھن آنے لگتی ہے - اخ! کیا بے کیف ہوگی وہ دنیا جو آپ کے تخیل کی بنا پر قائم کی جائے گی - وہ تو مردوں کے رہنے کی جگہ ہے زندہ انسانوں کی نہیں - تمہاری محبت تو خوف اور ریا کا دوسرا نام ہے جو دکھ اور درد کے پروردہ ہیں - جس چیز کو آپ صداقت کہتے ہیں وہ نفی کا دوسرا نام ہے کیونکہ وہ قربانی اور تیاگ کے ذریعے سے حاصل ہوتی ہے - ہاں حسن ضرور ایک اثباتی تخیل ہے لیکن جنگلی شیر سے بڑھ کر دنیا میں اور کونسی چیز زیادہ حسین ہے؟ اور وہ حسین ہے چونکہ وہ ہیبت ناک ہے، چونکہ وہ شہ زور ہے - اگر آپ کے تخیل کی دنیا بن جائے تو یقین مانیئے کہ ہم سب زندگی سے اکتا جائیں گے اور خود کشی کر کے مر جائیں گے"۔

مہاتما بدھ - "ہو سکتا ہے! کیونکہ تم ایسے اذیت پسندوں کا وہی راستہ ہے - تمہیں زندگی سے محبت نہیں ہے اور نہ ہی انسانیت سے سروکار ہے - دہشت، خوف اور تشدد تمہارے فکر کا سرمایہ ہے دوسرے کی شکست تمہاری فتح کا پرچم ہے - دوسرے کی غلامی تمہاری آزادی کا حاصل ہے - ہزیمت کی بنیادوں پر تم اپنی حکومت کے قلعے تعمیر کرتے ہو اور خود بینی اور زعم باطل کے دامن میں فرائض اور منصب کے پیوند لگاتے ہو -

مہاتما بدھ ابھی بول ہی رہے تھے کہ نتشے کے صبر کا پیمانہ چھلک اٹھا اور وہ بیچ میں ہی ٹوک کر بول اٹھے -

حکیم نتشے "یہ سب بے ربط تلقین ہے، ٹھیک ویسی ہی جیسی کہ آپ کے بعد یسوع مسیح نے کی تھی - جو نظام تمدن و اخلاقیات آپ کے تتبع میں مذہب عیسوی نے صدہا سال سے دنیا میں قائم کر رکھا ہے وہ انسان کو بلندی کی طرف نہیں لے جاتا اور غلامانہ ذہنیت پیدا کرتا ہے - لہذا ان قدروں کو جو اخلاقیات کی جدول پر مرقوم ہیں حرف غلط کی طرح مٹا دینے کی ضرورت ہے - اُن کے بعد نئی قدروں کی روشنی میں جس منزل پر انسان پہنچے گا وہی فوق البشر ہوگا اور زندگی کا حق دار ہوگا -

مہاتما بدھ - یہ فوق البشر کیا بلا ہے؟

حکیم نتشے - "مجھے معلوم نہیں تھا کہ آپ اس قدر ناواقف ہیں - آپ نے ڈارون کا نام سنا ہے؟ اس نے سائنس کی تحقیقات کے ذریعے سے یہ ثابت کیا ہے کہ ہر حیوان نے اپنے سے بڑھ کر ایک جنس پیدا کی ہے - اس کو وہ نظریۂ ارتقا کہتا ہے وہ اپنی ارتقائی تحقیقات درجۂ اسفل کے حیوانات سے شروع کرتا ہے اور انسان تک پہنچ کر ختم کر دیتا ہے میں نے اس کے نظریے میں اضافہ کیا ہے اور اس کی یوں تکمیل کی ہے کہ انسان کو بھی اپنے سے بڑھ کر ایک جنس پیدا کرنی چاہیئے جس کا نام میں نے فوق البشر رکھا ہے - یہ فوق البشر ہی میرا مطمح نظر ہے - یہ ایسے لوگوں کا طبقہ ہے جو عوام کے اوپر ہوگا - جن کی دماغی اور روحانی قوت اس درجہ عروج یافتہ ہوگی کہ محض اُن کا وجود ہی دنیا کی مایوسانہ اور عامیانہ ذہنیت کو معدوم کر دے گا - وہ ایسا رہبر اور رہنما ہوگا جس کا مقصدِ حیات تکمیلِ عیش و آرام نہ ہوگا اور جس کا مطمح نظر پڑھا لکھا آدمی نہ ہو کر ایک ٹھوس صاحبِ عزم و عمل انسان ہوگا -

یہ جمہور اور جمہوریت کی باتیں انسانیت کے

لئے تضحیک کی باتیں ہیں۔ اب ان کا اخلاق خواہ معاشرتی زندگی پر ہو خواہ ادبیات و فنیات پر۔ جمہوریت میں قوم کے تنزل کی نشانیاں آشکار ہیں بالخصوص اعلےٰ خیالات اور راہبر لوگوں کے مفقود ہونے کی نشانیاں ۔ ادنےٰ طبقے کی مدد سے قوم کو اونچا کرنا یا آزادئ نسواں کے ذریعے سے مردوں کو ترقی یافتہ بنانے کی کوشش خبط الحواسی بھی ہے اور نقصان دہ بھی۔ طبقۂ اسفل کی خاطر طبقۂ اعلےٰ کی بے حرمتی کرنے سے طبقۂ اسفل کو کوئی عروج حاصل نہیں ہوتا بلکہ وہ اُن کے لئے اور زیادہ انحطاط کا باعث ہوتا ہے۔ یہ انسانِ اعلےٰ کا کام ہے کہ وہ اپنے زمانے کے لئے روحانی اور دماغی مواد بہم پہنچائے ۔ اگر ایسے لوگ موجود نہیں ہیں تو پوری قوم بے مقصد ہو کر تباہ ہو جاتی ہے عوام کے لئے یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ از خود اعلےٰ قوانین ایجاد کریں۔ دس بے وقوف مل کر ایک عقلمند نہیں بن سکتے۔ ان کا دائرۂ خیال محض اس حد تک محدود رہتا ہے کہ وہ زندگی کے لئے سامان عیش و آرام مہیا کریں۔ اس کے آگے دماغی اور روحانی ارتقا کے اسباب پیدا کرنے سے وہ قاصر ہے۔

مہاتما بُدھ ۔ میں نے مانا کہ آپ کا فوق البشر ایک جری اور جارحانہ عزم کا انسان ہے ۔ لیکن ابھی تک میں یہ نہیں سمجھ سکا ہوں کہ آخر آپ کے نزدیک بنی نوع انسان کی منزل مقصود کیا ہے؟

حکیم نتشے ۔ اگر منزلِ مقصود سے آپ کی مراد "نروان" یا نجاتِ آخر ہے تو میں اس کا سب سے بڑا مخالف ہوں ۔ بنی نوع انسان کی منزل مقصود میرے نزدیک، ان کا منقطع ہونا نہیں بلکہ ان کے اندر بہترین نمونے پیدا کرنا ہے، تاکہ مردِ کامل بار بار پیدا ہوتا رہے اور ان کے درمیان زندگی بسر کرتا رہے ۔ انسانی زندگی کی دنیاوی جد و جہد کا بس یہی ایک مفہوم ہونا چاہئے تاکہ ہمیشہ ایسے انسان پیدا ہوتے رہیں جو انھیں ایک زینہ بنا کر بلندی کی طرف چڑھتے رہیں اور ان کے یتیم ہونے کے خیال کو ان کے دل سے نکالتے رہیں۔ ایسے لوگوں کا وقتاً فوقتاً پیدا ہوتے رہنا ہی عوام کے لئے استحقاقِ حیات کا ثبوت ہے۔ اس کے بغیر ان کی زندگی ہیچ اور بے معنی ہے ۔

مہاتما بُدھ ۔ "تو اس کے یہ معنی ہوئے کہ دنیا کے تمام آلام و تکالیف، تمام اذیتیں اور مصیبتیں بار بار آتی رہیں گی اور زینہ بنا ہوا چھوٹا انسان اعلےٰ انسانوں کے بوجھ کے نیچے دبا ہوا ہمیشہ پستا چلا جائے گا۔ کیوں یہی مطلب ہے نہ آپ کا"؟

نتشے ۔ "آپ نے پھر یہ چھوٹے انسان، اور آلام اور تکالیف کی رام کہانی شروع کی ۔ آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ غلام سیرت اور کمزور لوگوں کا مخالف ہوں ۔ وہ نظریہ جس میں چھوٹے اور تکلیف زدہ لوگوں میں خود کو محو کر دینا ایک نیکی تصوّر کی جاتی ہے انسان کو پستی کی طرف لے جاتا ہے۔ اگر اس قسم کی انسانیت کو کامیابی ہو جائے تو بقول گوئٹے ساری دنیا شفا خانہ ہو جائے گی اور ہر شخص دوسرے کا تیماردار قوتِ حیات کی جڑ اس سے زیادہ اور کوئی چیز نہیں کاٹ سکتی جتنی کہ دوسرے کے ساتھ خود بھی تکلیف زدہ بن جانے کی تعلیم ۔ میں انسان کی بشریت کو ترتیب دے کر ابھارنا چاہتا ہوں ۔ میں دنیاوی وسائل قوی انسانوں کو قوی تر بنانے میں صرف کرنا چاہتا ہوں ۔ بیماروں، لولوں اپاہجوں، کمزوروں اور طفیلیوں کو زندہ رکھ کر ان کو بے کار زائل کرنے میں نہیں ۔ بڑے انسانوں کے لئے ہمدردی کرنا اور

خود کو چھوڑ کر دوسروں میں محو ہو جانا اتنا ہی جرم ہے جتنا کہ چھوٹے انسانوں کے لئے وہ کارِ نیک ہے۔ بنی نوع انسان کے لئے بڑے انسان کا وجود چھوٹے انسان کے وجود سے زیادہ ضروری ہے کیوں کہ اس سے دماغی اور روحانی زندگی کے ہزارہا چشمے پھوٹتے ہیں۔

جمہور اور جمہوریت کا تخیّل کمزوروں کا تخیّل ہے۔ بڑے لوگوں کے مخالف وہی ہوتے ہیں جو خود چھوٹے ہوں اور جن کی ذات میں کافی مادہ اور قوت نہ ہو۔ جب ہندو سماج کے قواء ڈھیلے پڑنے شروع ہوئے تھے تو آپ کی نامردانہ تعلیم، بدھ مت نے اپنا سر اٹھایا تھا۔ جب رومتہ الکبریٰ میں اعصاب کی کمزوری اور جسموں کی سستی نے زور پکڑا تھا تو وہاں عیسویت پھیلنی شروع ہوئی تھی۔ جس وقت سے علماء کے وجود نے قوتِ قومی کو زائل کرنا شروع کیا۔ اس وقت سے جمہوریت کی ابتداء پڑی۔ بدھ مت، عیسویت جمہوریت یہ سب ایک تھیلے کے چٹے بٹے ہیں۔ ان کے زیرِ اثر کمزور کو قوی سے عداوت ہوتی ہے اور کُولا، اپاہج، طاقت ور اور تنومند کو دیکھ کر روحانی تکلیف محسوس کرتا ہے۔ صحیح و سالم شخص کے مقابلے میں اپنے آپ کو ناکارہ اور بے دست و پا دیکھ کر یہ سب بدھ، عیسائی، جمہوری دل ہی دل میں کُڑھتے ہیں اور خیالی دنیا میں اس سے انتقام لیتے ہیں۔ صحیح سالم کے لئے دوزخ بناتے ہیں اور نا اہلوں، ناکاروں اور اپاہجوں کو جنت کی خوش خبری سُناتے ہیں۔

مہاتما بدھ "کتنا قابلِ رحم ہے تمہارا فوق البشر مجھے یقین ہے کہ اس غریب کی روح ایک کھوکھلے ڈھول سے زیادہ اور کچھ نہیں ہے جو اپنی گونج اور دہلا دینے والے کرخت شور کے پیچھے اپنا تھوتھا پن چھپائے ہوئے ہے۔

نتشے۔ یہ روح کی بھی آپ نے ایک ہی کہی کیا کبھی اس بات پر بھی آپ نے غور کیا کہ جنسِ انسانیت کی یہ صورت کیوں مسخ ہوتی چلی جا رہی ہے؟ کیوں انسان کی شرافت اس کا ساتھ چھوڑنے پر مجبور ہوئی ہے؟ وجہ یہ ہے کہ آپ ایسے حضرات کی کوششوں سے انسان کے وجود کو دو ٹکڑوں میں بانٹ دیا گیا ہے۔ ایک کا نام جسم رکھا گیا ہے اور دوسرے کا روح۔ حالانکہ یہ دونوں چیزیں ایک دوسرے کی لازم و ملزوم ہیں اور ایک دوسرے سے علیٰحدہ نہیں کی جا سکتیں۔ روح در اصل جسم کے ایک فعل کا نام ہے۔ جسم بمنزلۂ سبب ہے اور روح نتیجہ اور اثر۔ روح کا عروج اور انحطاط جسم کے ساتھ ساتھ ہے اور جسم کے تغیّر سے روح بھی متغیّر ہو جاتی ہے۔ انسان کے اندر جسم اور روح کی یگانگی اب مسلمہ سمجھی جانے لگی ہے لیکن مذہبی دیوانے اب بھی اپنی ہٹ پر اڑے ہوئے ہیں۔ وہ اب بھی یہی سکھاتے ہیں کہ یہ دونوں مختلف اور آزاد چیزیں ہیں۔ روح کا دار و مدار جسم پر نہیں ہے اور نہ جسم کا روح پر۔ جسم ایک فانی اور برائے نام چیز ہے اس لئے قابلِ توجہ نہیں۔ روح کا قیام جسم میں عارضی ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ اس قسم کے اور بھی بہت سے توہمات ہیں جو غلط ثابت ہو چکے ہیں لیکن جن کو لے کر اب بھی لکیر پیٹی جا رہی ہے ان جملہ اوہام کے موجد بانیانِ مذہب ہیں جو انسان جیسے مظہرِ قدرت کو سمجھنے کے لئے نہ بحیثیتِ فن قابلیت رکھتے ہیں اور نہ بحیثیت علم بہرے تخیّل کا فوق البشر اس

قسم کے توہمات سے بڑا ہے اور اسی لئے نہ ٹھوٹتا ہے اور نہ وہ گرج گرج کا شیدائی - وہ تو ایک مرد عامل ہے جس کے لئے دنیا اور اہلِ دنیا کا وہی مصرف ہے جو شیر کے لئے جنگل اور جنگل کے جانوروں کا - یہی اس کا اخلاق ہے اور یہی اس کی شرافت - آپ المیسے حضرات نے "اخلاق" اور "نیک دلی" کو ہم معنی الفاظ بنا دیا ہے - لیکن کیا اس نیک دلی کی وجہ سے بشریت زیادہ خوبصورت، قابلِ احترام ارفع اور اعلےٰ ہو گئی ہے؟ ہرگز نہیں! اس نے تو ہمیں چھوئی موئی قسم کا ایسا انسان بنا دیا ہے جو دوسروں میں محو رہتا ہے، خود سے پیچھا چھڑا کر بھاگتا ہے، اور ہمدردی کی ڈھال اوڑھے رہتا ہے - ہر انسان دوسرے سے قریب تر ہوتا جاتا ہے - اور نتیجہ یہ ہے کہ آج بڑے آدمی کو اپنی بڑائی سے شرم آنے لگی ہے - آپ جیسوں کا سکھایا ہوا غلامانہ اخلاق ہمارے رگ و پے میں سرایت کر گیا ہے اور ہم اچھے انسان کی جگہ نرم دل، رحم دل، یہ الفاظِ دیگر بزدل بن کر رہ گئے ہیں - نہ ہم دوسروں کے ساتھ سختی کر سکتے ہیں اور نہ اپنے ساتھ ہر تفاوت اور مراتب کو مٹا کر ہم بھیڑوں کے گلے کی طرح ایک برابر اور مساوی مخلوق کے خفدار بن گئے ہیں - اب اگر انسان کو انسان بن کر رہنا ہے تو اُسے اِن عہدِ متوسط کی بوسیدہ اخلاقی قدروں کو مٹانا ہوگا اور ان نئی قدروں کو اپنانا ہوگا جو میں نے دنیا کے سامنے پیش کی ہیں اور جن کے مطابق شیر اور بکری آقا اور غلام، قوی اور ضعیف، قابل اور جاہل، صحت مند اور مریض، بڑا اور چھوٹا، افضل اور اسفل دو مختلف اور متضاد مظاہر کے نام ہیں جو کبھی برابر نہیں ہو سکتے اور نہ کبھی ایک دوسرے میں تبدیل ہو سکتے ہیں"۔

مہاتما بدھ - "بڑی بھیانک ہے آپ کی دنیا، پروفیسر نتشے! یہ تو اندھیری رات کا کابوس ہے - جس کی کوئی سحر نہیں، جس کی کوئی بیداری نہیں - اور چونکہ اس میں کوئی تبدیلی نہیں، تغیّر و تبدّل نہیں اس لئے یہ بے جان بھی ہے، چٹان کی طرح بے لوچ، سرد، سخت، منجمد، بے جس اور بے حرکت - لیکن میں اس سے ہراساں نہیں ہوں کیونکہ مجھے یقین ہے کہ زمانے کا حرکیاتی قانون اور تاریخ کا منطقی شعور آپ کی تعلیمات کو قبول نہیں کر سکتا - آپ کے پیش رو اور آپ کے پس رو سبھی اس حقیقت کا دعویٰ ہیں چکے ہیں، ہلاکو، چنگیز، سکندر، ایوان نپولین اور ان کے بعد ہٹلر، مسولینی اور اسی جنس کے ہزاروں چھوٹے بڑے فوق البشر انسان کی بشریت سے ٹکرا چکے ہیں اور تاریخ کے منطقی شعور کے مقابلے میں ہزیمت اُٹھا کر دنیا سے بے نیل و مرام رخصت ہو چکے ہیں"۔

حکیم نتشے - "تم ایسے غلامانہ ذہنیت والے نفیاتی مریض میرے نظریے کو نہیں سمجھ سکتے - شاہین بچّہ کی پرواز کو کنجشک بے مایہ کی اڑان نہیں پہنچ سکتی - تم سے بات کرکے میں نے خواہ مخواہ اپنا وقت ضائع کیا تمھیں یہ رونا دھونا مبارک - میں جاتا ہوں!

حکیم فریدرش ولہلم نتشے، جن سے ابھی آپ کی ملاقات ہوئی جرمنی کے روئے بن نامی قصبے میں ۱۵ اکتوبر ۱۸۴۴ء کو ایک پادری کے گھر پیدا ہوا - ابھی یہ پورے پانچ سال کا بھی نہ ہو پایا تھا کہ باپ کا سایہ سر سے اُٹھ گیا - دس سال کی عمر میں وہ شول پفورتا مقام کے گمنازیم (سکول) میں داخل ہوا اور ۱۸۶۴ء تک وہیں تعلیم پاتا رہا - بچپن ہی سے نتشے بہت خاموش طبع واقع ہوا تھا اور قواعد و احکام کی پوری طرح پابندی کیا کرتا تھا - اپنی خاموشی طبع کی وجہ سے

وہ اپنے ساتھیوں میں چھوٹے پادری کے نام سے مشہور تھا۔ ایک بار اس کی ماں نے جو اس کی غیر معمولی سنجیدگی اور متانت سے فکر مند رہتی تھی۔ اُسے ہنسنے کھیلنے کے لئے کہا تو اس نے جواب دیا کہ اسکول کے قواعد میں یہ لکھا ہے کہ اسکول چھوڑتے وقت لڑکوں کو اُچھلنا کُودنا نہ چاہیئے بلکہ سکون اور آہستگی کے ساتھ گھر جانا چاہیئے اور کھیل کود میں وقت ضائع نہ کرکے مطالعے میں مشغول رہنا چاہیئے۔

مذہبی ماحول کا اس پر اتنا گہرا اثر تھا کہ بچپن میں ہی وہ مذہبی راگ اور انجیل کی آیتیں اس دردناک آواز سے گایا کرتا تھا کہ سننے والے آب دیدہ ہو جاتے تھے۔ سچ بولنے کی عادت اس کی رگ و پے میں سرایت کر گئی تھی اور اس کی وجہ ایک یہ بھی تھی کہ وہ اپنے آبا و اجداد کی خاندانی شرافت پر بہت نازاں تھا۔ جو ایک زمانے میں پولینڈ کے نوابوں میں شمار ہوتے تھے اور اٹھارھویں صدی کے اواخر میں پروٹسٹنٹ ہونے کی وجہ سے پولینڈ سے بھاگ کر جرمنی میں پناہ گزین ہوئے تھے۔ اس کی بہن الزبتھ ہمیشہ کہا کرتی تھی کہ جھوٹ بولنا ہم نوآب زادگان کے شایانِ شان نہیں ہے۔

اس کی قوت تخیلہ اس قدر تیز تھی کہ وہ بچپن میں ہی طرح طرح کے کھلونے ایجاد کیا کرتا تھا۔ چھوٹی عمر میں ہی وہ شعر کہنے لگا تھا اور پیانو بجانے میں مہارت حاصل کر لی تھی۔ اسکول کے زمانے میں ہی اُسے یونانی اور لاطینی پڑھنے کا بے حد شوق ہو گیا تھا۔ یہ شوق اُسے ۱۸۶۴ء میں باں یونیورسٹی لے گیا اور پھر لائپ تسیگ یونیورسٹی جہاں اس نے سائنیات کی تعلیم حاصل کی۔ ان علوم میں اس کی ذہانت اور قابلیت کی ایسی دھاک بندھی کہ یونیورسٹی کی ڈگری حاصل کرنے سے پہلے ہی ۱۸۶۹ء میں جبکہ اس کی عمر ابھی چوبیس برس کی ہی تھی، بازل یونیورسٹی نے اُسے لسانیات کا پروفیسر مقرر کر لیا۔ جہاں وہ دس سال تک کام کرتا رہا۔ اپنی صحت کی طرف سے اسے کبھی اطمینان نصیب نہ ہوا۔ وہ اکثر بیمار رہتا تھا۔ چنانچہ بیماری کی ایک لمبی چھٹی کے بعد ۱۸۷۹ء میں اُسے ملازمت ترک کرنا پڑی۔ اس کے بعد وہ تقریباً سوئیٹزرلینڈ کے مختلف صحت افزا مقامات میں گھومتا رہا اور تصنیف و تالیف کے کام میں مشغول رہا۔ اس نے بہت سی کتابیں لکھیں جن میں سے خاص خاص کے نام یہ ہیں:-

"غمناک ناٹک کی ابتدا" ۱۸۷۲ء "بے وقت کی راگنی" ۱۸۷۳-۷۶ء "آدمیت بے حد آدمیت" ۱۸۷۸ء "دانشمندانہ مقولے" ۱۸۷۹ء "آوارہ گرد اور اس کا سایہ" ۱۸۸۰ء "شفقِ صبح" ۱۸۸۱ء "دل خوش کن علوم" ۱۸۸۲ء "بقول زردشت" ۱۸۸۳ء "مادرائے خیر و شر" ۱۸۸۶ء "اخلاق کا شجرہ نسب" ۱۸۸۷ء "دیوتاؤں کی آخری گھڑیاں" ۱۸۸۹ء "دجّال" ۱۹۰۲ء "دیکھ ایک آدمی" ۱۹۰۸ء "عزمِ تحصیل اقتدار" ۱۹۱۰ء

آخر کی تین کتابیں اس کی وفات کے بعد شائع ہوئیں۔ ان سب کتابوں میں اس کا شاہکار "بقولِ زردشت" ہی سمجھا جاتا ہے۔ اس سے پہلے کی تمام کتابیں گویا اس شاہکار کا دیباچہ ہیں اور بعد کی کتابیں اس کی تفسیریں اور تشریحیں۔

۱۸۸۸ء میں ایک روز نٹشے اپنے گھر سے کہیں جا رہا تھا کہ راستے میں بے ہوش ہو کر گر پڑا۔ لوگ اسی حالت میں اُٹھا کر اُسے گھر لائے اور وہ دو روز تک بے حس و حرکت بچھونے پر پڑا رہا۔ جب اُسے ذرا افاقہ ہوا تو اس میں جنوں کے آثار پائے گئے۔ اس وقت وہ اٹلی میں تھا۔ یہاں سے اُسے جرمنی لے جایا گیا اور اس کی ماں نے اُسے پہلے تا نظام کے دماغی ہسپتال میں داخل کرا دیا۔ یہاں وہ آٹھ مہینے

تک زیر علاج رہا - کچھ افاقہ ضرور ہوا اور طبیعت ذرا سنبھلی بھی لیکن آرام نہ ہوا - اس کے بعد وہ اپنی ماں کے ساتھ ناؤمبرگ میں رہا اور جب ۱۸۹۷ء میں اس کی ماں کا انتقال ہوا تو اس کی بہن اسے اپنے ساتھ وائی مار لے آئی ۲۵ر اگست ۱۹۰۰ء کو اسی مقام پر نتشے کا انتقال ہوا اور روئے کن میں جہاں وہ پیدا ہوا تھا دفن کیا گیا -

عیسویت اور قدامت دو ایسی قوتیں تھیں جنہوں نے نتشے کے دل اور دماغ پر بچپن ہی سے بہت گہرا اثر ڈال رکھا تھا - عیسویت سے اس نے بغاوت کی اور سقراط سے پہلے کے قدیم یونانی فلسفے کو اس نے اپنایا سقراط اور افلاطون سے وہ سخت کبیدہ خاطر تھا کیونکہ اس کی نظروں میں یہ دونوں ایتھنز کے نوجوان شرفاء کو جمہوریت کی تعلیم دے کر ان کے اخلاق بگاڑنے کے مجرم ہیں - کانٹ اس کا معتوب ترین فلسفی تھا جس کو وہ روسو جیسا اخلاقی کٹھ ملا کہا کرتا تھا -

سیاسی مسلک میں وہ بہت کچھ اطالوی مدبر اور مصنف ماکی آولی کا ہم خیال ہے - اگرچہ انسان کی حیثیت سے ان دونوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے - ماکی آولی ایک دنیا دار آدمی تھا جس کا اپنے زمانے کی سیاست سے نہایت قریبی اور عملی تعلق تھا اور جس کے خیالات اپنے زمانے کے عین مطابق تھے - اس کے سیاسی فلسفے میں نہ کوئی تسلسل اور نظام ہے اور نہ فکر میں عالمانہ گہرائی اور رفعت - بخلاف اس کے نتشے ایک عالم ہے' یونیورسٹی کا پروفیسر' کتابوں کا کیڑا' دنیا سے بے خبر' اور ایک ایسا فلسفی جو دیدہ دانستہ اپنے زمانے کی مروجہ سیاسی اور اخلاقی قدروں کے خلاف برسرِ پیکار ہے - جس کے فکر میں تنوع ہے اور جس کے بیان میں جادو - جہاں تک سیاسی نظریے کا تعلق ہے نتشے' ماکی آولی کی مشہور کتاب "سلطان" کے نفسِ مضمون سے بہت قریب ہے - یہ دونوں ایک ایسے اخلاقی نظام کی تعلیم دیتے ہیں جس کا مقصد شرفاء کے اقتدار کو برقرار رکھنا اور حق بجانب قرار دینا ہے - نیز دونوں ہی عیسویت کے سخت ترین دشمن ہیں -

نتشے مذہب اور مذہبی فلسفوں کی اخلاقی نقطۂ نظر سے مخالفت کرتا ہے کیونکہ اس کے نزدیک یہ انسانی اخلاق اور اخلاقی قدروں کو بگاڑنے اور مسخ کرنے کے ذمہ دار ہیں - چند مخصوص صفات کا وہ مداح ہے جو اس کے نزدیک طبقۂ اشرافیہ کے چند گنے چنے افراد کے اندر ہی پائی جا سکتی ہیں' عوام میں نہیں " عوام کی زندگی کا جواز تو صرف یہی ہے کہ وہ بڑے لوگوں کی ترقی کے لئے زینے کا کام دے سکیں' جس پر پاؤں رکھتے ہوئے وہ آگے بڑھ جائیں' آزادانہ طور پر ان کی بربادی اور آبادی دونوں بے معنی باتیں ہیں اور یہی حیثیت ان کے رنج و راحت کی ہے" - اس کا مقصد اس بے کراں عظمت کی بے پناہ قوت کو دعوتِ عمل دینا ہے جو مستقبل کے انسان کو بیدار کرے گی - اس انسان کو جس کی بشریت کی عالی شان عمارت لاکھوں اور کروڑوں ادنیٰ انسانوں کی لاشوں پر تعمیر ہوگی - اس بربادی و تباہی سے اس کی شخصیت مضمحل اور پژمردہ ہونے کی جگہ شگفتہ اور بار آور ہوگی اور تاریخ کی تنومند امیدیں اس کے وسیلے سے پھلیں اور پھولیں گی -

قوم پرستی اس کے نزدیک ایک دھوکا ہے - محض انفرادیت ہی ایک حقیقت ہے " ایک مرد کامل کی مصیبت کے مقابلے میں تمام قوم کی تباہی ہیچ اور بے حقیقت ہے - یہ چھوٹے انسان اگر تمام کے تمام برباد بھی ہو جائیں تو مردِ کامل کے ایک لمحے کی ذہنی کوفت کے مقابلے میں پاسنگ کے برابر بھی نہیں ہو سکتے" - (باقی)

راجہ

دیوالی کا دن تھا۔

وِنود، پریم ہشی سب اپنے نئے کھلونوں سے کھیل رہے تھے۔

منو دُکان کی تنگ و تاریک کوٹھری میں قید اپنے کام میں مشغول تھا۔ پُرانی بوتلیں صاف کرتے کرتے جب اُس کے ننھے ننھے ہاتھ تھک جاتے تو اُس کا دماغ ماضی کی کسی بھولی بِسری یاد میں کھو جاتا۔ اس کا دماغ ایک عجیب سی مانوس مگر بعید از ادراک بھینی بھینی خوشبو سے مہک اُٹھتا۔ اُس کے چھوٹے چھوٹے ہونٹ جیسے کسی گداز شے میں کھُب جاتے اور اُس پر ایک اَن جانا نشہ طاری ہوجاتا۔ مگر جُوں ہی اُس کا ننھا سا دماغ اِس عجیب احساس کو سمجھنے کی کوشش کرتا سحر ٹُوٹ جاتا اور پھر وہی تاریکی اور ایک دُھندلی سی یاد ـــــ گداز پیار بھری باہیں۔ متبسّم آنکھیں شفیق مسکراہٹیں ـــــ اور اُس کی نگاہیں اپنی داہنی کلائی پر تیزاب سے کھُدی ہوئی سبز کلی پر جا رُکتیں۔ وہ سوچتا تھا یہ کلی ہی اُس کی زندگی ہے۔ اِس کلی کی طرح اُس کی زندگی کبھی پھُول نہ بن سکے گی۔ شبنم کے موتی پھولوں کی نرم و نازک پنکھڑیوں سے کھیلیں گے۔ مگر اُس کا مُنہ کبھی نہیں کھُلے گا۔ وہ ہمیشہ موتیوں سے محروم رہے گی۔ کاش سورج کی کوئی شوخ کِرن اُسے بیدار کرسکتی۔ کاش دوسرے بچّوں کی طرح اُسے بھی آزادانہ کھیلنے کُودنے کی اجازت ہوتی۔

اُس کے بوڑھے مالک رام چرن نے اپنی عینک کے موٹے موٹے شیشوں میں سے اُس کی طرف گھُورتے ہوئے پُرانی بوتلوں کی ایک اور ٹوکری اُس کے سامنے رکھ دی۔ مُنّو نے ایک سرد آہ بھری اور کام میں لگ گیا۔ خواستہ یا ناخواستہ اُسے یہ کام کرنا ہی پڑتا تھا۔ کیونکہ اگر وہ کام نہ کرے تو اُسے سارا دن بھوکا رہنا پڑے، اور اُس کے ننھے سے جسم میں اِس سزا کو برداشت کرنے کی طاقت نہ تھی۔ اُس کی للچائی ہوئی نظریں بار بار اُس لاپروائی سے کھیلنے والے گروہ کی طرف اُٹھتی تھیں۔ اور نراش پلٹ آتی تھیں۔

رام چرن کسی ضروری کام سے باہر گیا۔ مُنّو کے دل میں اُمنگ اُٹھی۔ وہ جانتا تھا کہ یہ آزادی محض عارضی ہے۔ وہ جانتا تھا کہ یہ چند لمحوں کی آزادی اُسے بہت مہنگی پڑے گی۔ مگر چند لمحوں کی آزادی فی الحال اُس کے دل و دماغ کو تازگی بخشنے کے لئے کافی تھی۔ چنانچہ اُس نے بُرش اُٹھاکر ایک طرف رکھ دیا اور کھڑکی سے چھلانگ کر دبے پاؤں اُس خوش و خرّم گروہ میں جا ملا۔

مُنّو ڈرتا تھا مہیش کہے گا "جاؤ مُنّو تمہارے پاس کھلونے نہیں ہم تمہیں نہیں کھلاتے۔ مگر جُوں ہی مُنّو گروہ میں داخل ہوا، مہیش آنکھ بچاکر بھاگ گیا۔

ششی نے اُسے اپنے کھلونوں سے کھیلنے کی اجازت بھی دے دی۔ مُنّو نے پہلے اپنے کُرتے سے تمام کھلونوں کی گرد جھاڑی۔ پھر تھوڑی دیر سوچنے کے بعد اُنھیں ایک قطار میں مُرتب کردیا۔ سب سے آگے اونٹ۔ پھر گائے پھر بکری۔ پھر بلّی۔ اِس کے بعد اُس نے اونٹ کے پاس مُنہ لے جاکر یوں سیٹی بجائی جیسے ریل کا انجن وِسل دیتا ہے۔ پھر چھک چھک چھک چھک۔ اور گاڑی روانہ ہوپڑی۔ ششی کو یہ کھیل بہت پسند آیا۔ چنانچہ یہ کھیل بار بار دوہرایا گیا۔ کھیل کے دوران میں ایک بار گائے کے سینگ اونٹ کی ٹانگوں سے ٹکرا گئے۔ اور نتیجے کے طور پر گائے کا ایک سینگ ٹُوٹ گیا۔ مُنّو ڈر کے مارے سہم گیا۔ مگر ششی خلاف اُمید مُسکرادی۔ وہ کہنے لگی مُنّو بھیّا کوئی بات نہیں، میں ماں سے کہہ کر نئی گائے لے لوں گی۔ مُنّو کے آنسو خوشی سے چھلک پڑے، اور اُسے ششی کی آنکھوں میں وہی تبسم دکھائی دیا جو اُس کے انوکھے سُپنوں کو مُنّو دکھایا کرتا تھا۔

تھوڑی دیر بعد دنو نے شور مچانا شروع کردیا۔ میرا سفید ہاتھی کہاں ہے؟ میرا سفید ہاتھی کس نے چُرایا؟" سب ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے۔ کھیل بند ہوگیا۔ پریم بولا "ضرور مُنّو نے چرایا ہوگا۔ کیونکہ اُس کے پاس اپنے کھلونے تو ہیں نہیں پس جب موقع پاتا ہے چوڑوں کی طرح ہمارے کھیل میں گھس آتا ہے اور ایک آدھ کھلونا اُٹھاکر غائب ہوجاتا ہے"۔

مُنّو نے ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے سب کی طرف دیکھا۔ وہ بہت کچھ کہنا چاہتا تھا مگر بڑی مشکل سے صرف یہی کہہ پایا کہ اُس نے دنو کا سفید ہاتھی دیکھا بھی نہیں۔

"یہ جُھوٹا ہے" کیلاش نے مُنّو کو دھکا دیتے ہوئے کہا۔ مُنّو بے چارہ گھبرایا ہوا تو تھا ہی، بس گرتے کو ٹھیلے کا سہارا ہوگیا۔ ذرا سے دھکے سے لڑھک گیا۔ جوں ہی وہ گرا سب اُس پر پل پڑے۔ وہ چلّاتا رہا "میں نے ہاتھی نہیں چُرایا۔ میں نے ہاتھی نہیں چُرایا" ششی نے کہا "میں جانتی ہوں اصل چور کون ہے۔ مُنّو چور نہیں۔ اِسے چھوڑ دو" مگر اِس بے چاری کی آواز اُس شور و غل میں نقارخانے میں طوطی کی آواز سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی تھی۔

گھر جاکر ششی نے سارا واقعہ ماں کو کہہ سنایا۔ اُس نے خود مہیش کو ہاتھی اُٹھاکر بھاگتے دیکھا ہے۔ ماں نے مہیش سے پوچھا وہ صاف مُکرگیا۔ اور اپنی صفائی میں یہ دلیل پیش کی کہ وہ تو چوری سے پہلے ہی گھر چلا آیا تھا۔ اِس دلیل سے ماں کا شک یقین کی صورت اختیار کرگیا۔ اُس نے بڑھ کر مہیش کی الماری کھولی۔ دنو کا سفید ہاتھی کتابوں سے ڈھکا پڑا تھا۔ ماں نے مہیش کو اِس حرکت پر بہت لعنت ملامت کی اور ہاتھی دنو کے حوالے کردیا۔ وہ کہنے لگا "میں رام چرن کی دوکان پر جاکر ہاتھی مُنّو کو دے دوں گا۔ وہ بے چارہ بے قصور پٹ گیا۔

"کیا تم نے اُسے بہت پیٹا تھا؟ ماں نے پوچھا۔

"ہاں ماں" دنو نے ڈرتے ہوئے جواب دیا۔

"بہت بُری بات کی تم نے دنو۔ اچھے لڑکے کسی کو ستایا نہیں کرتے۔ اچھا اب جاؤ رام چرن کی دُکان سے مُنّو کو بُلا لاؤ۔ آج وہ غریب بھی تمہارے ساتھ ہی دیوالی منالے"

ششی نے اپنے چھوٹے چھوٹے ہاتھوں سے تالی بجائی اور خوشی سے اُچھلتی کودتی رام چرن کی دُکان کی طرف چل کھڑی ہوئی۔

مُنّو اُن کے گھر آیا۔ ماں نے اُسے مہیش کی سب سے بڑھیا پوشاک پہنائی۔ سب نے اُس سے معافی مانگی۔

اور اُس نے مُسکراتے ہوئے سب کو معاف کر دیا۔ پریم ہمیش۔ دھرو۔ کیلاش سب اُس کے دوست بن گئے۔ اور سب نے مل کر فیصلہ کیا کہ رات والے ناٹک میں کیلاش کی جگہ اب مُنّو راجہ بنے گا۔ کیونکہ وہ سب میں بڑا ہے۔ ماں نے بچوں کی پُرامن گفتگو سُنی۔ اور زیرِلب مُسکراتی ہوئی پُوجا کی تھالی اُٹھاکر مندر چلی گئی۔

مندر میں خوب رونق تھی۔ مگر ماں اپنے معمول کے مطابق گرد و نواح سے بے نیاز دیوی کی مُورتی کی طرف کھچی جا رہی تھی۔ اُس نے پُوجا کے پھول دیوی کے چرنوں میں ڈال دیئے۔ اور دیوی کے چرنوں کی دُھول اپنے سوہاگ کے سیندور میں رچائی۔ ایک لمحے کے لئے ماں کو ایسا معلوم ہوا گویا دیوی مسکرا رہی ہے۔ ماں نے فرطِ مسرت سے آنکھیں بند کرلیں اور عقیدت سے اپنا سر دیوی کے چرنوں پر رکھ دیا۔ کچھ ثانیئے وہ یوں ہی بے حس و حرکت پڑی رہی جیسے کسی روحانی لذت سے بہرہ یاب ہو رہی ہو۔ پھر ایک ہلکی سی شیتل آواز اُس کے کانوں میں پڑی "بیٹی تیری پُوجا سپھل ہو"۔ ماں نے سر اُٹھایا۔ مندر کا بوڑھا پُجاری اُس کے پاس کھڑا تھا اور دیوی کے ہونٹوں پر شفیق مسکراہٹ تھی۔

آج سے کئی برس پہلے لکشمی دیوی نے اُس کا لاڈلا بچہ اُس سے چھین لیا تھا۔ تب اُس کا راجہ تین برس کا تھا۔ جب کہ وہ خود اِسی طرح پُوجا میں گم تھی۔ راجہ مندر کے برآمدوں میں کھیل رہا تھا۔ ماں نے پُوجا ختم کی اور پھول دیوی کے چرنوں پر چڑھا دیئے۔ مگر وہ نہیں جانتی تھی کہ دیوی پھولوں سے کہیں زیادہ قیمتی چڑھاوا قبول کر چکی ہے۔ اُس کا بیٹا اُس کا لاڈلا راجہ گم تھا۔ وہ دیوانی ماں کو عمر بھر نہ بھول سکے گی۔ تمام گھر ماتم کدہ بن گیا تھا۔ اُس کے پتی نے دیوانوں کی طرح شہر کا کونہ کونہ چھان مارا۔ ڈھنڈورے پٹے۔ منادیاں ہوئیں۔ اخباروں میں تصویریں شائع ہوئیں۔ انعام مقرر کئے گئے۔ مگر غریب ماں کی آس بر نہ آئی۔ اُس کے بیٹے کا سُراغ نہ مل سکا ——— اور آج دیوی مُسکرا رہی تھی۔ چاندنی کی طرح شفاف اور شفیق مسکراہٹ۔ ماں کی سوئی ہوئی اُمید پھر جاگ اُٹھی۔ اُس نے برآمدے میں کھیلتے ہوئے بچوں کو بغور دیکھا۔ پریم دیوانی سمجھتی تھی کہ سات برس کے بعد بھی اُس کا بیٹا ویسا ہی ہوگا۔ ننھا مُنّا سُندر پیتامبر کپڑے پہنے ہوئے۔ اور وہ اُسے اُٹھالے گی۔ آغوش میں لے لے گی۔ چھاتی سے چمٹالے گی۔ اور دیوی کا لاکھ لاکھ شکر مناتی ہوئی گھر لے جائے گی۔ پھر دعوتیں ہوں گی۔ دان دئے جائیں گے۔ لوگ اُسے مُبارکباد دینے آئیں گے۔ اُس کے گھر میں گہما گہمی ہوجائے گی۔ اور اس تمام بھیڑ میں ایک چاند سا مُکھڑا چمک رہا ہوگا۔

سارا گھر جگمگا رہا تھا۔ سب ناٹک کی تیاریوں میں مشغول تھے۔ ماں پُوجا سے واپس لوٹی۔ ناٹک شروع ہوا۔

سب سے پہلے کیلاش زرق برق لباس پہنے لکڑی کی ننگی تلوار ہوا میں لہراتا ہوا اسٹیج پر آیا۔ اس کے بعد پریم ایک لمبی ڈاڑھی لگائے لاٹھی ٹیکتا ہوا داخل ہوا۔ سب اُسے دیکھ کر کھلکھلاکر ہنس پڑے۔ منتری جی پرنام۔ منتری جی پرنام۔

اور پھر مُنّو اور ششی راجہ اور رانی کے روپ میں داخل ہوئے۔ سب درباریوں نے جھک کر اُنھیں پرنام کیا۔ راجہ اور رانی راج گدی پر براجمان ہوئے۔

"مہاراج آپ اُداس کیوں ہیں؟" رانی نے ملتجی نگاہوں سے راجہ کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ راجہ نے اپنا سر دونوں ہاتھوں میں تھامتے ہوئے جواب دیا "رانی دشمن ہر طرف سے ہمارے نگر کو گھیرے ہوئے

ہیں۔ دیش کا اس خطرے میں ہے۔ بس یہی چنتا ہے یہی فکر ہے جو مجھے گھن کی طرح کھائے جاتا ہے۔"

"لیکن مہاراج اس کی چنتا آپ کو کیوں۔ آپ کا سینا پتی کس مرض کی دوا ہے۔ آپ کی ٹڈی دل فوج کس دن کے لئے ہے۔"

"رانی سینا پتی باغی ہوچکا ہے۔" مہاراج نے اور بھی غمگین ہوتے ہوئے کہا۔

"یہ میں کیا سن رہی ہوں مہا منتری؟"

"ہاں مہارانی۔ یہ سچ ہے۔" پریم کا سر جھک گیا۔ اس کی لمبی ڈاڑھی گھٹنوں سے جا ملی۔

"کاش آج میرا بیٹا، میرا راج کمار میرے پاس ہوتا وہ میری سینا کا سالار بنتا۔ دشمن کے چھکے چھڑا دیتا۔ باغیوں کے دانت کھٹے کر دیتا۔ مگر افسوس۔" منو نے ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔

"مہاراج آپ بیتی ہوئی باتوں کو یاد کرکے دکھ میں اضافہ کر رہے ہیں۔" پریم نے لقمہ دیا۔

"میں نراش ہوچکا ہوں مہا منتری۔" منو چلایا۔

عین اسی وقت کہیں باہر ایک کرخت اور بھاری سی آواز سنائی دی۔ بوڑھا رام چرن داخل ہوا۔ منو کو تاج پہنے ہوئے سامنے کھڑا دیکھ کر وہ غصے سے لال پیلا ہوگیا۔ راجہ گھبرا کر گدی سے نیچے اتر آیا۔ اس نے تاج اتار کر ایک طرف رکھ دیا۔ رانی بھی گدی سے اتر آئی۔ اس کی معصوم آنکھیں غصے سے چمک رہی تھیں۔ اس نے بآواز بلند کہا۔ "رام چرن منو اب تمہاری دوکان پر نہیں آئے گا۔ وہ اب راجہ ہے۔"

بچوں نے تالیاں پیٹیں، سیٹیاں بجائیں۔ اور راجہ کی جے کے نعرے بلند کئے۔ مگر رام چرن جوں کا توں کھڑا تھا۔ پھر ماں نے اسے سمجھایا کہ منو بھی آخر بچہ ہے۔ تمہاری دوکان پر نوکر ہے تو کیا ہوا۔ اس کا بھی تو کبھی کبھار کھیلنے کو جی چاہتا ہے۔ رام چرن نے اپنی عینک کے موٹے موٹے شیشوں سے ایک بار اپنی مخاطب کو گھورا اور پھر تحکمانہ سر ہلاتے ہوئے جواب دیا "کھیل کود آپ کے بچوں کے لئے ہوتے ہیں ماں جی۔ نوکروں کے لئے نہیں۔"

منو نے اپنے بوڑھے مالک کی آگ برساتی ہوئی آنکھوں کی طرف دیکھا اور ڈر کے مارے فوراً شاہی چغہ اتار کر پھینکا۔ اور اپنے کپڑوں کی تلاش میں دائیں ونگ کی طرف بڑھا۔ سب بچوں کے کپڑے ماں کی کرسی کے پاس بیچ پر خلط ملط پڑے تھے۔ منو کو ان میں اپنے پھٹے پرانے چیتھڑے ڈھونڈنے میں کچھ دقت نہ ہوئی۔ مگر جوں ہی اس نے اپنا کرتا اٹھایا، ماں نے فوراً بڑھ کر اس کا بازو تھام لیا۔ اور وہ حیرانی سے کلائی پر کھدی ہوئی سبز کلی کو دیکھنے لگی۔ یہی کلی گم ہونے سے کچھ دن پہلے ماں نے اپنے لاڈلے کی کلائی پر کھدوائی تھی۔ آج سے سات برس پہلے ـــــ ماں کی پیاسی نظریں منو کے چہرے۔ نقش ہرگئیں۔ ہاں ہاں وہی آنکھیں۔ وہی لب۔ وہی بال، اور منو کی عمر بھی اس وقت دس برس سے زیادہ نہ ہوگی۔ یہ بدمعاش رام چرن۔ ماں کا شک یقین کی صورت اختیار کرچکا تھا۔ مگر ابھی تک اس کے منہ سے ایک لفظ بھی نہ نکلا تھا۔ سب بچے بالک کو بھول کر اس نئے کھیل کو دیکھ رہے تھے۔ بالآخر ماں کی باہیں کھلیں اور انھوں نے منو کو اپنی گرفت میں لے لیا۔

"میرا بیٹا میرا راجہ" ماں اس سے زیادہ اور کچھ نہ کہہ سکی۔ باقی داستان اس کی آنکھوں کا طوفان بتا رہا تھا۔

ماں کے سینے سے لپٹے ہوئے منو نے محسوس کیا کہ اس کے پیارے بچھڑے زندہ ہوگئے ہیں۔ یا وہ خود بچپن میں جا بسا ہے۔ وہی بھینی بھینی خوشبو۔ وہی گداز باہیں، وہی نشہ۔ آج اس کا دماغ اس عجیب کیفیت کو کسی حد تک سمجھ رہا تھا۔ آج یہ معمہ خود بخود حل ہوچلا تھا ـــــ

"ماں:ـــ" یہ لفظ بیساختہ اس کے منہ سے نکلا اور اس کی ننھی ننھی باہیں محبت کے اس مجسمے سے لپٹ گئیں ـــ اس کے چھوٹے چھوٹے ہونٹ کسی گداز شے میں کھب گئے۔

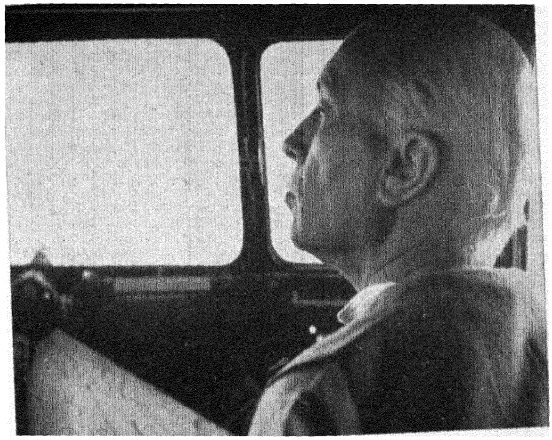
جنوری ۱۹۵۴ء



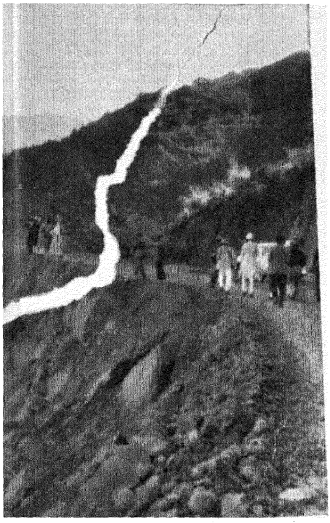
باپو کا جنم دن برازیل میں

ریوڈی جنیرو (برازیل) میں ۲ اکتوبر ۱۹۵۳ء کو برازیل یونی ورسٹی کے ریکٹر کے زیر صدارت مہاتما گاندھی کی یاد میں ایک جلسہ منعقد ہوا۔ بائیں طرف کی تصویر میں مشہور برازیلی شاعرہ ڈونا سسلیا میریلس اس جلسے میں تقریر فرما رہی ہیں اور نیچے کی تصویر میں حاضرین جلسہ کا ایک منظر دکھایا گیا ہے۔





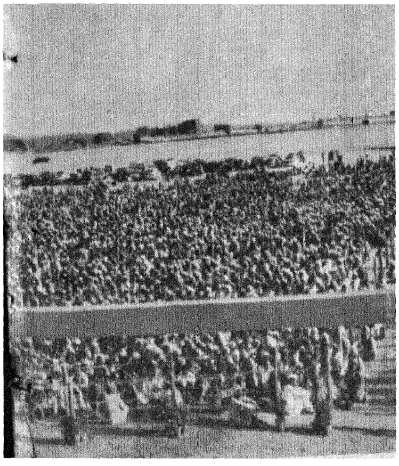
وزیراعظم شری جواہر لال نہرو ہوائی جہاز سے بہار کے سیلاب زدہ علاقوں کا جائزہ لے رہے ہیں

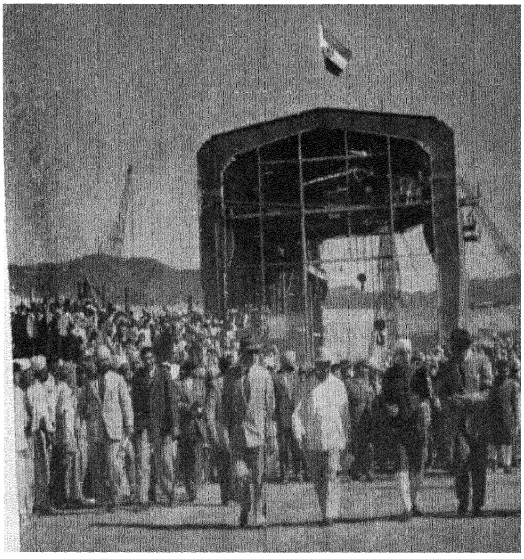


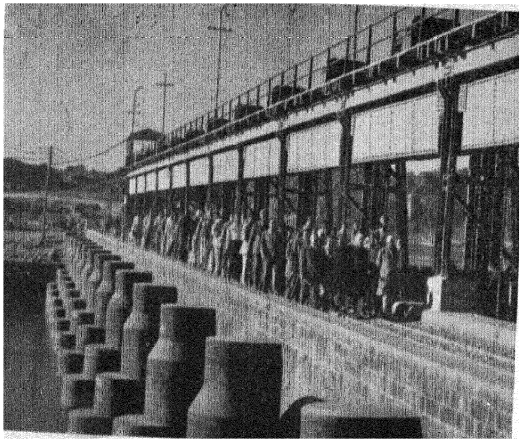
وزیراعظم بھاکڑہ پراجیکٹ کے اہم م

شری جواہر لال نہرو گنگروالی پاورہاؤس کا معائنہ کر رہے ہیں۔
یہ پاورہاؤس پنجاب میں ننگل برقابی نہر پر تعمیر ہوا ہے

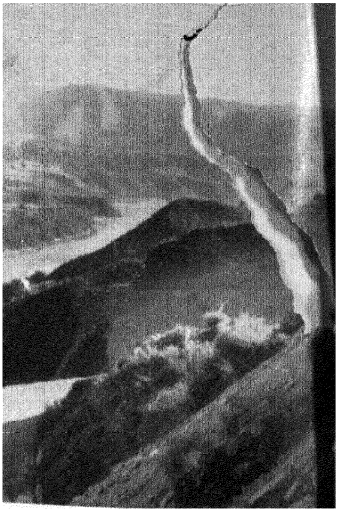
وزیراعظم چنڈی گڑھ میں تقریر فرما رہے ہیں۔ اس تقا





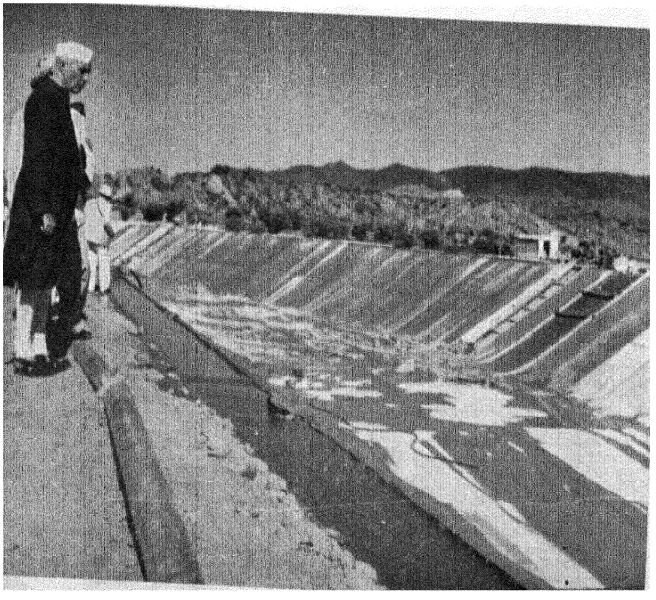


وزیراعظم روہڑ (ارماڑہ) ھیڈ ورکس پر

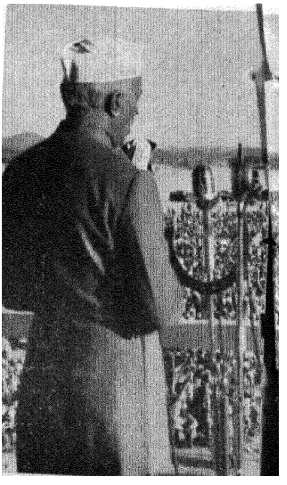


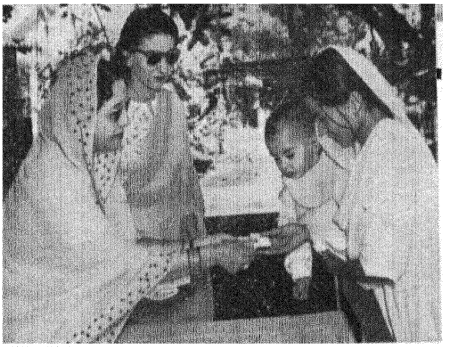
،، چھیل ،، کے رقبے کو دیکھ رھے ھیں

وزیراعظم نئگل برقابی نہر کو دیکھ رھے ھیں



تقریباً کو ھزاروں مرد اور عورتوں نے سلا

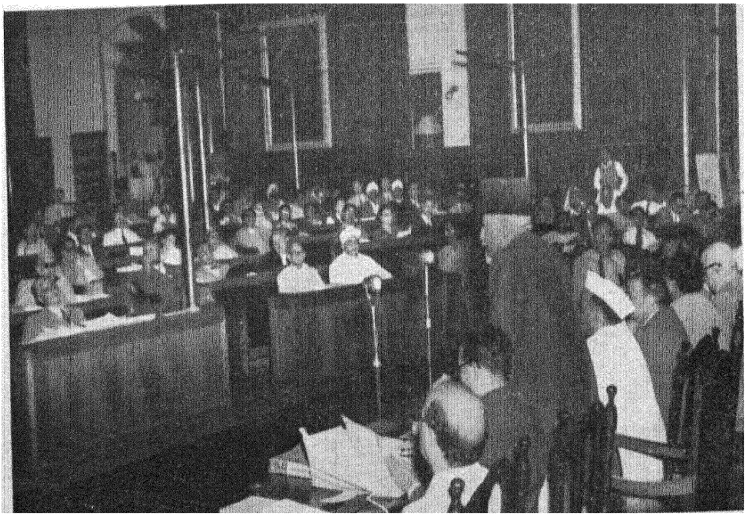




بنگال انجینئرز کی صد سالہ جوبلی کے موقعے پر کمانڈر انچیف کی دھرم پتنی رانی راجندر سنگھ جی حوالدار منگت سنگھ مرحوم کی بیوہ کو ایک تمغہ عنایت کر رہی ہیں -



ریذکراس ڈے کے موقعے پر راشٹرپتنی کو ایک ریذکراس جھنڈا پیش کیا جا رہا ہے -



مولانا ابوالکلام آزاد وزیر تعلیمات حکومت ہند تعلیمات کے مرکزی مشاورتی بورڈ کے بیسویں سالانہ جلسے میں جو 9 نومبر ۱۹۵۳ء کو ہؤا ، افتتاحی تقریر فرما رہے ہیں -

غزل

جب اہلِ عشق کا ہر حال عاشقانہ تھا
حدودِ عشق سے باہر غمِ زمانہ تھا

بھلا دیا ترے کانٹوں نے بھی چمن ہم کو
ہمارا تیری بہاروں میں آشیانہ تھا

ترے غرور نے ٹھکرا کے جس کو پھینک دیا
مری جبیں وہ نہ تھی تیرا آستانہ تھا

اب آنسوؤں نے حقیقت بیان کی اس کی
جو قہقہوں کی زبان پر کبھی فسانہ تھا

قبولِ سجدہ پہ بھی وہ تو ہو سکا نہ ادا
جو ذوقِ سجدہ پر اک فرضِ آستانہ تھا

وہی ہے فطرتِ عشق اور وہی سرشتِ حسن
وہی ہے آج زمانہ جو کل زمانہ تھا

پہونچ کے گنبدِ خضرا پہ بسمل اب سمجھا
مری جبیں کے تو لائق یہ آستانہ نہ تھا

حشرِ جذبات

یہ کاوشِ غمِ ہستی کہاں پہ ٹھہری ہے
اُمیدِ زیست مری اب فغاں پہ ٹھہری ہے

نظر کہ جس پہ کبھی قافلے کی نظریں تھیں
وہی غبارِ رہِ کارواں پہ ٹھہری ہے

ملا قرار نہ اِس کو کہیں زمانے میں
جبینِ شوق ترے آستاں پہ ٹھہری ہے

اب اور ہوگا صلہ کیا مری محبّت کا
نظر کسی کی مری داستاں پہ ٹھہری ہے

میں سوچتا ہوں ہوا کیا ہے میری ہمت کو
کہ دل فریبیٔ حُسنِ بُتاں پہ ٹھہری ہے

اگر میں خاک بسر آج ہوں تو غم کیسا
کبھی تو آہ مری آسماں پہ ٹھہری ہے

سمجھ کے فیصلہ کر تو مری محبّت کا
مری حیات ترے اک بیاں پہ ٹھہری ہے

نکل نہ جائے کہیں مُنہ سے حرفِ غم ثاقب
ابھی تو شرحِ محبّت زباں پہ ٹھہری ہے

سید اختر علی تلہری

اقبال

سچدانند سنہا کی نظر میں

علامۂ اقبال کی شاعری اور اُن کے فلسفۂ و پیام کی تشریح کے سلسلے میں اب تک ہزاروں صفحے لکھے جا چکے ہیں۔ لیکن جو کچھ لکھا گیا ہے وہ بیشتر خاص طرح کے جذبۂ عقیدت مندی کے تحت۔ اس لئے اس کی حیثیت تقریظی حدوں سے آگے نہ بڑھ سکی ہے۔ ایسا ہونا کچھ زیادہ تعجب کے قابل بھی نہیں ہے، کیونکہ اقبال کی شاعری کے دباب سے جو زمزمے نکلے تھے اُن کے لہجے میں فلسفہ و مذہب کی مخصوص نوعیت کی آمیزش نے سامعین پر اچھا خاصا سحر کر دیا تھا، اور اس سحر زدگی نے اُن سے انتقادی تحلیل اور تجزیہ کی صلاحیت بالکل سلب کر لی تھی۔ ایسی فضا میں آفرین و مرحبا و احسنت کے سوا کوئی اور آواز سنائی ہی کیا دے سکتی ہے۔

ڈاکٹر سچدانند سنہا جو دوسرے اہم مختلف سیاسی منصبوں پر فائز ہونے کے علاوہ ۱۹۴۶ء میں ہندوستان کی کانسٹی ٹیوشنٹ اسمبلی کے عارضی صدر بھی رہے ہیں۔ بیسویں صدی کی اُن نابغہ ہستیوں میں سے تھے جنھیں بیک وقت سیاست و ادب پر اتقدار حاصل تھا۔ انھیں انگریزی زبان و ادب پر عبور کے ساتھ فارسی اور اُردو کا بھی غیر معمولی ذوق تھا، اُنھوں نے علامہ اقبال کو قریب سے دیکھا تھا، اُن کی شاعری کو اُنھوں نے اچھے طریقے سے سنا تھا، پرکھا تھا اور اس شاعرِ اعظم کو اُس کے مداحوں کی طرف سے تحسین و تمجید کا جو خراج پیش کیا گیا تھا اُس کا ایک انصاف پسند نقاد کی حیثیت سے جائزہ بھی لیا تھا۔ ایسے شخص کو اقبال کے بارے میں تفصیل سے گفتگو کرنا ہی چاہئے تھی۔ ڈاکٹر سنہا کے ادبی مزاج کی تشکیل میں منطقیت بڑی حد تک شریک تھی۔ اس لئے اُن کی نگاہ میں تقریظی نگارشوں کی کوئی وقعت نہ تھی۔ وہ ہر ادبی شاہکار کو اپنے تنقیدی تجزیہ تحلیل کی محک پر کستے تھے۔ لیکن اُن کی اس تنقید میں مذہبی و قومی تعصب یا فرقہ واریت کے رجحان کو دخل نہ ہوتا تھا۔ اُن کی تنقیدیں اس قسم کی آمیزشوں سے پاک و صاف ہوتی تھیں۔ "اقبال دی پوئٹ اینڈ ہز میسج" پان سو بارہ صفحوں پر پھیلی ہوئی ضخیم کتاب ڈاکٹر صاحب کی اس غیر معمولی وسعتِ نظر اور اُن کی اس ادبی و تنقیدی صلاحیت کا نتیجہ ہے۔

"اقبال دی پوئٹ اینڈ ہز میسج" میں شاعر پر تقریظی زر و جواہر نثار نہیں کئے گئے ہیں۔ یہ تو بہت کچھ ہو چکا ہے البتہ اس کتاب میں کوشش کی گئی ہے کہ اُن کی شاعری پر مختلف گوشوں سے صحیح معنوں میں ایک سچے نقاد کی طرح نظر ڈالی جائے، اُن کی شاعری کا اُن کے فلسفے کا اُن کے پیام کا بے لوث طریقے سے تحلیل و تجزیہ کیا جائے۔ وہ خوش عقیدہ لوگ جو اقبال کے بارے میں تنقید کا ایک لفظ سننا پسند نہیں کرتے انھیں تو اس کتاب میں شاید خوش کن چیزیں نہ مل سکیں، کیونکہ اس میں تحسینِ ناشناس کی بے معنی نمائش سے احتیاط برتتے ہوئے ایک بار ایک نظر "سخن شناس" کی حیثیت سے تنقید کا راستہ طے کرنے کی کوشش کی گئی ہے ہاں جو لوگ تنقیدی نگارشوں

پر انصاف کی نظر ڈال سکتے ہیں۔ انھیں اِس کتاب میں اقبال کے متعلق غور و فکر کرنے کے لئے بہت کچھ سامان ملے گا۔ زیرِ نظر کتاب کے مختلف قسم کے تعصّبات کی آلائشوں سے پاک وصاف ہونے کا سب سے بڑا ثبوت خود کتاب کے ابتدائی ابواب ہیں، جن میں ڈاکٹر سنہا نے مرتّبِ بہادر سپرو، سرہندی ایسے معتبر ادیبوں کی وقیع رائیں تفصیل کے ساتھ اقبال کی عظمت کے اعتراف کے سلسلے میں پیش کردی ہیں اور اُن کے بیشتر حصّے سے اپنے اتفاق کا اظہار بھی کردیا ہے۔ ڈاکٹر راجنی جی سہانی انگریزی اور فرانسیسی زبانوں کے بلند پایہ عالم ہیں اور جہاں تک معلوم کیا جاسکا ہے فارسی اور اردو ادب میں بھی انھیں ناقدانہ درک حاصل ہے۔ نومبر ۱۹۴۳ء کو انھوں نے ایسٹ انڈیا ایسوسی ایشن لندن کے ایک جلسہ میں جو مسٹر ای۔ ایل۔ مری، دی ٹائمس لٹریری سپلیمنٹ کے مشہور اڈیٹر کی صدارت میں منعقد ہوا تھا۔ ایک خطبہ "ہندوستان کے ادبی رجحان" کے عنوان سے پڑھا تھا۔ اس خطبے میں ڈاکٹر سہانی نے ابتداءً ٹیگور کے بارے میں اظہارِ خیال کرتے ہوئے اُن کی بلند صوفیانہ اور فلسفیانہ حیثیت سے انکار کیا ہے، اور انھیں صرف ایک بڑا شاعر مانا ہے۔ ٹیگور کے متعلق سب کچھ کہنے کے بعد انھوں نے اقبال کا تذکرہ کیا ہے اور بڑے ہی پُرتہذیب لہجے میں کیا ہے۔

ڈاکٹر سہانی کے خیال میں اقبال کے "سخنہائے جانفزا" ٹیگور کی "متصوفانہ قیل و قال" کے مقابلے میں زیادہ اطمینان بخش، زیادہ تسلّی بخش ہیں۔ انھیں تو ہندو ہونے کے باوجود اقبال کی اسلامیت میں بھی کوئی قابلِ اعتراض چیز نظر نہیں آتی۔ اُن کی نگاہ میں اقبال کا فلسفۂ قسمت کے خلاف جنگ آرا ہونا اُن کی شاعری کا بڑا ہی محبوب رُخ ہے۔ وہ ہم میں شجاعت و حماست کے جذبات پیدا کرتے ہیں۔ عمل اور جدوجہد اُن کی شاعری کا نصب العین ہے۔ یقیناً ڈاکٹر سہانی کے خیالات میں جہاں تک ٹیگور کا تعلق ہے "تفریط" کا پہلو نمایاں ہے اور اقبال کے بارے میں اُن کی رائیں "افراط" کی نمائندگی کررہی ہیں۔ لیکن ڈاکٹر سنہا نے بعینہٖ یہ تمام حصّہ نقل کردیا ہے اور زیادہ تر اپنی تائید کے ساتھ نقل کردیا ہے۔ یہ سب ڈاکٹر صاحب کی کشادہ دلی کا ثبوت ہے اور اس سے اندازہ ہوجاتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب ملّا اقبال کے بارے میں کوئی تعصّب نہیں رکھتے۔ اقبال کے مخصوص خیالات سے اُن کے مخصوص رجحانات سے ڈاکٹر صاحب کو خواہ مخواہ کی پرخاش نہیں ہے۔ وہ جو کچھ کہتے ہیں غیر جنبہ دار ہوکر انصاف پسند نقّاد کی حیثیت سے۔ یہ ضروری نہیں کہ ہے کہ اُن کی تمام رایوں سے اتفاق کیا جائے۔ اس کتاب میں بہت سے ایسے مقامات ملیں گے جن سے ہم آہنگ ہونا مشکل ہے۔ لیکن اس سے کتاب کی بلند ناقدانہ حیثیت میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ڈاکٹر سنہا نے اس کتاب کو ۲۸ ابواب پر تقسیم کیا ہے، اور ہر باب میں اقبال کی شاعری اُن کے فلسفہ اور پیام کے کسی نہ کسی پہلو سے سیر حاصل بحث کی ہے۔ اُن سب کے بارے میں تو اجمالاً بھی ایک صحبت میں اظہارِ خیال نہیں کیا جاسکتا۔ یہاں صرف ڈاکٹر سنہا کے اُن خیالات کا مختصر طور سے ذکر مقصود ہے جن کا تعلق اقبال کی اُردو شاعری سے ہے۔ ڈاکٹر سنہا نے کتاب کے گیارھویں باب میں اقبال کی اردو شاعری کی قدر و قیمت معیّن کرنے کی کوشش کی ہے۔ ڈاکٹر سنہا کے خیالات کا تذکرہ کرنے سے پہلے اسے ابتدا ہی میں عرض کردوں۔ کہ میرا یہ ہمیشہ سے عقیدہ ہے کہ اقبال کی شخصی عظمت ہمیشہ اُن کی شاعرانہ حیثیت ہی کی رہینِ منّت رہے گی۔ اسی چشمے سے اُن کی بزرگی کی جڑیں بقائے دوام کا پانی حاصل کرتی رہیں گی۔ اب یہ دوسری بات ہے کہ اُن کے غالی مدّاح اُنھیں مختلف راستوں سے فلسفیِ اعظم بنادیں اور وہ خود بھی اِن تفریطوں سے اثر لے کر اپنے کو صرف ایک فلسفی ایک پیامبر قرار دے لیں۔ لیکن شاعر اقبال بہرحال

شاعر ہی رہے گا فلسفی نہیں بن جائے گا۔ اس لئے اقبال پر تنقیدی نظر ڈالنے والوں کا یہ فرض ہے کہ وہ سب سے پہلے اس کی شاعرانہ قدر و قیمت معین کریں اور اُس کی دوسری حیثیتوں کی آڑ لے کر اُس کی شاعرانہ حیثیت سے نظر بچا کر نہ گزریں۔

اس سلسلے میں سب سے پہلی بات تو میں یہ کہوں گا کہ اقبال کی فارسی شاعری کا جہاں تک تعلق ہے وہ غالباً اُن کی اُردو شاعری سے زیادہ لطیف اور زیادہ شیریں ہے۔ اُن کے فارسی لہجے میں ترنم کہیں زیادہ خوش گوار اور دل پذیر ہے۔ اُن کی شکست اور فارسی ترکیبیں خاصی ملاحت کی کیفیت رکھتی ہیں۔ اُن کا امتیازی وصف اُن کی جاں نواز روانی اور اُن کا خوب صورت ڈھلاؤ ہے۔ ان سب باتوں نے مل کر اُن کے فارسی اشعار میں جو ملاحت جو ملاحت پیدا کردی ہے وہ اُن کی اردو شاعری میں بہت کم نظر آتی ہے۔ شکوہ اور جوابِ شکوہ کے مصنف اقبال میں پہلے کا شاعر شکوہ شاعرانہ جلال بہت زیادہ نمایاں تھا اور توقع تھی کہ شاعر اقبال شاعری کے اس نئے رنگ کو فروغ دے کر اُردو شاعری کا قیمتی سرمایہ دُگنا چوگنا کردے گا۔ لیکن حالات نے ایسا نہ ہونے دیا۔ علامہ اقبال کی بعد کی شاعری میں مستعار فلسفیانہ افکار کی کثرت اور اصلاحِ ملت کے خیالات کی افراط نے اُن کے منظومات سے حقیقی شعریت کا رنگ روغن بڑی حد تک اُڑا دیا۔ لہجے میں وہ شکوہ نہ رہا۔ وہ بانکپن نہ رہا، وہ لطافت نہ رہی، وہ ملاحت نہ رہی۔ تشبیہوں اور استعاروں سے وہ اب بھی کام لیتے تھے۔ مگر نرعومہ فلسفیت کا رکھ رکھاؤ اور مصلحانہ پیامبری کا جوش اُن میں جھجکتی اور چلبلاپن نہ پیدا ہونے دیتا تھا۔ اب اُن کی شاعری کی صباحت پھیکی پھیکی ہوتی تھی۔ اُن کی شاعری کی ملاحت بے نمک معلوم ہوتی تھی۔ قندِ پارسی کے جا بجا اضافوں سے اب بھی کہیں کہیں اُن کے اشعار میں حلاوت پیدا ہوجاتی مگر بعض اوقات تو ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے اس میں گڑ گھول دیا گیا ہو۔ اُن کے بعد کی اُردو شاعری میں جو یہ سپاٹ پن پیدا ہوگیا تھا وہ تمام تر نتیجہ تھی اُن کے اس خیال کا کہ وہ اب شاعر نہیں ہیں بلکہ حکیم ہیں فلسفی ہیں، مصلح ہیں، مجدّد ہیں، صاحبِ پیام ہیں۔ ایسی صورت میں اگر ترکیبیں اردو کے مذاق کے لحاظ سے سست ہیں تشبیہیں میں شعریت کی رُوح نہیں ہے۔ بیان میں عجز کے پہلو نظر آتے ہیں۔ اُن کے استعمال کردہ عربی اور فارسی کے جہیم و ضخیم الفاظ اُردو کے لطیف ڈھلاؤ کے سانچے میں ٹھیک نہیں اُترتے تو کوئی محلِ حیرت نہیں ہے۔ اقبال نے اُن چیزوں کی طرف التفات یک لخت ترک کردیا تھا، وہ شعری فن کاری میں آب و رنگ پیدا کرنے کے لئے اپنا خونِ جگر صرف کرنا بے دانشی کا عمل سمجھنے لگے تھے۔ اسی قسم کی کم و بیش بہت سی باتیں ہیں جن کی وجہ سے ڈاکٹر سنہا اقبال سے اُن کے اُردو شاعر ہونے کی حیثیت سے زیادہ متاثر تو نہیں ہوسکے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کی نگاہ میں مولانا حالی اردو شاعر کی حیثیت سے جہاں تک اُن کی مثنوی "مدوجزر اسلام" کا تعلق ہے زیادہ پسندیدہ ہیں۔ ڈاکٹر سنہا نے اس باب کے آغاز میں داغ دہلوی کے یہ دو شعر درج کئے ہیں ؎

اُردو ہے جس کا نام ہمیں جانتے ہیں داغ
ہندوستاں میں دھوم ہماری زباں کی ہے

ہنس مکھ ہے اے داغ یاروں سے کہدو کہ آتی ہے اردو زباں آتے آتے

ان اشعار کے بعد سرتیج بہادر سپرو وغیرہ کے وہ چند اقوال درج کئے ہیں جن میں سادہ اُردو لکھنے پر زور دیا گیا ہے۔ ان بداعت استہلال پر مشتمل سطور سے معلوم ہوجاتا ہے کہ ڈاکٹر سنہا ایک اچھے اردو شاعر سے کس قسم کی زبان کی توقع رکھتے ہیں۔

ڈاکٹر سنہا نے اس تمہید کے بعد ہی اُن لوگوں کے

خیالات کا جائزہ لیا ہے جنھوں نے اقبال کے مخصوص "طرزِ انشا" (اسٹائل) کی تائید کی ہے۔ ان موٴیدین میں مشہور کیمونسٹ انشار پرداز ڈاکٹر ملک راج آنند بھی ہیں۔ جن کا خیال ہے "اقبال کی ابتدائی کامیابی اُردو کے محدود ذخیرۂ الفاظ کو فارسی و پنجابی کے اثر انگیز استعاروں اور دوسری تخیلی باتوں کے اضافے کے ذریعے سے وسیع بنانے کی کوششوں کی منّت کش ہے"۔ اس طرح ڈاکٹر آنند کی رائے میں اقبال نے اُردو کو ایک شکل دی ہے اور اُسے موجودہ زمانے کی ضرورتوں کے مطابق بنایا ہے۔ ڈاکٹر سنہا کو اس خیال سے اتفاق نہیں ہے۔ وہ ڈاکٹر آنند کی رائے سے بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں "اقبال نے سوچ سمجھ کر کوئی ایسی کوشش کی ہے یا اگر کوئی ایسی کوشش کی ہے تو اس میں وہ اُس مرعوب حد تک کامیاب بھی ہوئے ہیں جس کا ڈاکٹر آنند نے ذکر کیا ہے مجھے اس کا کوئی علم نہیں ہے۔ اس لئے کہ میری نظر سے اس بارے میں کسی صاحبِ زبان، مستند اور غیر جانب دار نقاد کا بیان نہیں گزرا ہے بلکہ اس کے خلاف اس امر کے یقین کرنے کی وجوہ موجود ہیں کہ بہت سے اہمیت رکھنے والے نقادوں کی نگاہ میں اقبال نے اچھی اردو لکھنے والے کی حیثیت سے کوئی امتیاز پیدا نہیں کیا تھا۔ پروفیسر بخاری نے تو صاف صاف لکھا ہے "اقبال پنجابی تھے۔ اُن کے نقاد بالخصوص یو۔پی کے نقاد ہمیشہ اُن کے طرزِ انشا کے نقائص یاد دلاتے رہتے تھے اُن کے ان اعتراضوں میں کچھ نہ کچھ جان ہوتی تھی۔ لیکن بے رحمانہ نکتہ چینی اُن میں سب سے زیادہ نمایاں رہتی تھی"۔

اس سلسلے میں اکبر علی اور ڈاکٹر نظیر احمد وغیرہ کی طرف سے اقبال کی جو تائید کی گئی ہے اُس پر نظر کرنے کے بعد ڈاکٹر سنہا نے اُردو اور ہندی انشا پردازوں کے اس رجحان کا ذکر کیا ہے کہ وہ اردو اور ہندی کو گراں بار کرنے کے لئے فارسی، عربی اور سنسکرت سے علی الترتیب غیر مستعمل اجنبی الفاظ اور ترکیبیں مستعار لیتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے اس سلسلے میں اُس حائل ادبی رجحان کا بھی ذکر کیا ہے جو سولھویں صدی میں انگلستان میں ظہور پذیر ہوا تھا۔ اُس وقت کے انگریزی ادب میں بڑے بڑے غریب و نامانوس لفظوں کا استعمال ہوتا تھا۔ بدمزہ صفتیں استعمال کی جاتی تھیں۔ غیر ضروری صنعتوں سے کام لیا جاتا تھا۔ جغرافیائی تلمیحات اور بڑے بڑے بھاری بھرکم مرکبات اشعار و عبارات میں نظر آتے تھے۔ دوسرے لفظوں میں اُس وقت کا ادب سراپا تصنّع ہوتا تھا۔ یہ تصنّع کا رنگ بہت دنوں تک ہاتھ پیر مارنے کے بعد انگریزی ادب سے غائب ہوگیا۔ اس کا اثر ڈاکٹر جانسن اور دوسرے اٹھارھویں صدی کے مصنفین میں دیکھا جاسکتا ہے، اُن کی تحریروں کی خصوصیت ہی یہ تھی کہ بہت زیادہ لاطینی کی آمیزش اُن میں ہوتی تھی، سر والٹر اسکاٹ نے اپنے مشہور ناول دی مونسٹری کے ایک مشہور کردار سر پرسی شینٹلس کی شکل میں اس پر تصنّع رنگ انشا کا بُری طرح خاکہ اُڑایا ہے۔ سر والٹر اسکاٹ کے بعد جو مصنفین پیدا ہوئے اُن کی خوش ذوقی کی وجہ سے انگریزی ادب انیسویں صدی میں اس بدمزہ تصنّع سے پاک ہوا۔ ہندوستان میں البتہ یہ تصنّع ادب کے مختلف روپوں میں موجود ہے، اور یہاں تو اردو میں اور نہ ہندی میں کوئی ایسا مصنف پیدا ہوا جو ہمّت و جرأت سے کام لے کر اس پرانے رواج کو توڑ دیتا۔ اقبال اعلیٰ ادبی صلاحیتوں کے مالک تھے، اُن سے یہ توقع قائم کی جاسکتی تھی کہ وہ اس رواج کے بندھن توڑ دیں گے، لیکن اُنھوں نے بھی ایسا نہیں کیا بلکہ اُن کے اندازِ انشا نے تو اس رسم کو اور مضبوطی سے قائم کر دیا۔ زبان کی سادگی پر زور دینے کے بعد ڈاکٹر سنہا نے علامۂ اقبال کی اُس اُردو کا جو فارسی اور عربی الفاظ سے بھری ہوئی ہے اور جس میں موٹے موٹے لفظ اور ترکیبیں استعمال کی گئی ہیں جائزہ لیا ہے اور اپنے اس خیال کی تائید میں کہ ان الفاظ کے استعمال سے اردو

کی روانی اور فصاحت کو شدید صدمہ پہنچتا ہے اقبال کے اردو کلام سے کچھ مثالیں پیش کی ہیں۔

مثلاً حور و فرشتہ ہیں اسیر میری تخلیقات میں[1]
میری نگاہ سے خلل میری تخلیقات میں

یا جب تک نہ زندگی کے حقائق پہ ہو نظر
تیرا زجاج ہو نہ سکے گا حریفِ سنگ

ڈاکٹر صاحب نے اس سلسلے میں حضرتِ آرزو مرحوم کی سُریلی بانسری کے اندازِ نگارش کا ستائشی لہجے میں ذکر کیا ہے اور اُسے بطور نصب العین کے پیش کیا ہے۔

جہاں تک سُریلی بانسری کا تعلق ہے اُس میں حضرت آرزو نے لزوم مالایلزم کی حیثیت سے ایک خاص صنعت کا التزام کیا ہے۔ سُریلی بانسری میں جتنے منظومات درج کئے گئے ہیں وہ فارسی اور عربی کے لفظوں سے یکسر پاک ہیں۔ لیکن ہمیں اسے بھی صاف صاف کہوں نہ کہوں کہ اس طرزِ تحریر کی اہمیت بھی ایک صنعت سے زیادہ نہیں ہے۔ اگر اس پر عمل کیا جائے تو زبان جن فطری وسعتوں کی طرف پھیلنا چاہتی ہے اُس میں رُکاوٹ پیدا ہو جائے گی۔ کوئی زبان ہو مختلف انقلابات کا سینہ چیرتے ہوئے مختلف حالات کا مقابلہ کرتے ہوئے اپنا ایک مخصوص مزاج پیدا کر لیتی ہے۔ اُس کے مخصوص سانچے بن جاتے ہیں، اردو بھی اس خصوص میں کوئی استثنائی حیثیت نہیں رکھتی۔ مختلف حالات و انقلابات کے راستوں سے گزرتے ہوئے اُس کا بھی ایک مخصوص مزاج بن گیا ہے۔ اُسے بھی لفظوں اور ترکیبوں کے ڈھلاؤ کے لئے مخصوص سانچے مل گئے ہیں۔ اُردو کے اس مزاج کو فارسی، عربی، سنسکرت وغیرہ کسی زبان کے لفظوں سے کوئی عناد نہیں ہے۔ بشرطیکہ وہ اُس کے مخصوص سانچوں میں ڈھل سکیں۔ اُردو کا مزاج دیکھتے ہوئے حضرتِ آرزو کی سُریلی بانسری کا طرزِ انشا بڑی حد تک غیر فطری ہے اور اس لئے ڈاکٹر سنہا کی اس رائے سے مکمل طور پر اتفاق نہیں کیا جا سکتا۔ البتہ یہ بات ضرور ہے کہ فارسی اور عربی فقرے کے جو الفاظ استعمال کئے جائیں وہ اُردو کی فصیح زبان کو صدمہ پہنچانے والے نہ ہوں۔ تخلیقات[2] خلعت کے معنی میں اور زجاج شیشے کے معنی میں اقبال نے جس مقام پر استعمال کئے ہیں وہ یقیناً اردو کے مزاج کے خلاف ہیں اور اس لئے غیر فصیح ہیں۔ اقبال کی اردو شاعری میں اس قسم کے غیر فصیح الفاظ کے استعمال کی کثرت ہے۔ اس سے یہی نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ وہ اپنی اُردو شاعری میں فصیح و مترنم الفاظ کے استعمال کی قطعاً پروا نہیں کرتے تھے۔ آپ اقبال کی کوئی بڑی نظم بعد والے دَور کی اُٹھا لیجئے اور اُن کی شخصیت کی بلندی اور اُن کے لہجے کے فلسفیانہ طمطراق اور مذہبی شان و شکوہ سے قطع نظر کرتے ہوئے اُس پر نظر کیجئے تو آپ کو جگہ جگہ اس قسم کے غیر فصیح لفظ ملیں گے۔ اقبال کی یہ لغزشیں شاعری کے نقطۂ نظر سے یقیناً قابلِ اعتراض ہیں اور یہ کہہ کر کہ اقبال کا اصل مقصد فلسفہ طرازی یا پیغامبری ہے۔ اقبال، شاعر اقبال کو کوئی فائدہ نہیں پہنچایا جا سکتا۔

اقبال کی ایک مشہور نظم ہے "ابلیس کی مجلسِ شوریٰ" اس میں شک نہیں کہ یہ نظم اپنے خیالات کے لحاظ سے خاص معرکہ آرا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ یہ کہنا بھی ناگزیر ہے کہ اس نظم میں نہ صرف بعض الفاظ کا استعمال قابلِ نظر ہے بلکہ بعض مقامات پر بیان کا نقص بھی نمایاں ہے۔

اس نظم میں ایک شعر ہے ؎

کارِ دنیا بر شہریاری کی حقیقت اوست[3] یہ وجودِ میر و سلطان پر نہیں ہے منحصر

خود نگر، خطر، نظر وغیرہ کے قافیہ میں منحصر بفتح الصاد کا استعمال صحیح نہیں ہے۔ لغت و استعمال دونوں کے لحاظ سے صحیح لفظ منحصِر بکسر الصاد ہے۔ اس نظم میں

---

[1] شعر اپنی صحیح صورت میں یوں ہے ؎ حور و فرشتہ ہیں اسیر میرے تخلیقات میں + میری نگاہ سے خلل تیری تجلیات میں

[2] فاضل مضمون نگار نے صحیح لفظ نقل نہیں کیا (ادارہ)

دوسرا شعر ہے ؎

تو نے کیا دیکھا نہیں مغرب کا جمہوری نظام چہرہ روشن اندروں چنگیز سے تاریک تر

چنگیز غالباً سیاہ فام تو نہ تھا۔ اس لئے اقبال کا مدّعا چنگیز کے دل سے تشبیہ دینا ہے مگر وہ اسے صاف صاف ادا نہ کر سکے۔

اس عجزِ بیان کا بہت ہی واضح نمونہ اُن کی ایک مشہور نظم کے مندرجۂ ذیل شعر میں ملتا ہے۔

حق را بسجودے صنم را بطوافے اچھا ہے چراغِ حرم و دیر بجھا دو

مطلب تو سمجھ میں آ ہی جاتا ہے لیکن اس کا انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ان دونوں مصرعوں میں کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو اُنھیں ربط دے سکے۔ شاعری کی اصطلاح میں اس شعر کے دونوں مصرعے "لخت" ہیں۔ اقبال کے پیشِ نظر کسی استاد شاعر کا یہ شعر ؎

زہار ازاں قوم نباشی کہ فریبند حق را بسجودے و نبی را بدرودے

اپنا مندرجۂ بالا شعر "حق را بسجودے و نبی را بدرودے" نظم کرتے وقت رہا ہے اور جس طرح اُس شعر کا مطلب مکمّل طور سے ادا ہو گیا ہے، اُنھوں نے یہ سمجھ لیا کہ اُن کے مندرجۂ بالا شعر کا مطلب بھی ادا ہو گیا ہے حالانکہ صورتِ حال یہ نہ تھی۔

جس نظم کا ابتدا میں ذکر کیا گیا ہے "ابلیس کی مجلسِ شوریٰ" اُسی میں پانچواں مشیر ابلیس کو مخاطب کرتے ہوئے کہتا ہے ؎

اے ترے سوزِ نفس سے کارِ عالم استوار تو نے جب چاہا کیا ہر پردگی کو آشکار

اِس مقام پر لفظ "پردگی" پردہ کرنے والے کے معنی میں اُردو کے لئے بالکل ہی غیر مانوس اور اجنبی ہے اور اس لئے غیر فصیح۔ ضربِ کلیم اور بالِ جبریل میں تو اِس قسم کی مثالیں کثیر تعداد میں مل سکتی ہیں۔

ایک نظم کا عنوان ہے "جہاد" اُس میں یہ شعر ملتا ہے ؎

باطل کے فال و فر کی حفاظت کے واسطے یورپ زرہ میں ڈوب گیا دوش تا کمر

"فال و فر" صاف طور پر اُردو کے ٹکسال سے باہر کا سکّہ معلوم ہوتا ہے۔ ایک دوسری نظم ہے "امامت" اُس میں یہ شعر موجود ہے۔

دے کے احساسِ زیاں تیرا لہو گرما دے فقر کی سان چڑھا کر تجھے تلوار کرے

استعمال میں "سان پر چڑھانا" ہے "سان چڑھانا" نہیں ہے، ایک اور جگہ اقبال نے نظم کیا ہے ؎

اگر ہو جنگ تو شیرانِ غاب سے بڑھ کر اگر ہو صلح تو رعنا غزالِ تاتاری

"شیرانِ غاب" اُردو کے لئے قطعاً غیر فصیح ہے۔ اگر اقبال نے "غاب" کی جگہ "بیشہ" فرما دیا ہوتا تو یہ ترکیب اُردو زبان کے مزاج کے موافق رہتی۔ اقبال کو لفظ "غیں" سے بھی بہت زیادہ محبت ہے۔ اکثر جگہ اُنھوں نے اسے استعمال کیا ہے۔ غیں فارسی میں فصیح سہی، لیکن اردو کے لئے قطعاً غیر مانوس ہے۔ اس لئے اُن کی اُردو نظموں میں "ولیکن" لیکن کی جگہ اور "تا" "تاکہ" کی جگہ خاصی تعداد میں ملتا ہے۔ اتباں کتنے ہی بلند مقام فلسفی سہی، کتنے ہی حقیقت شناس پیامبر سہی، تاہم جب وہ شاعری کے میدان میں آئیں گے تو اُنھیں ایک شاعر کی حیثیت سے جانچا بھی جائے گا۔ پرکھا بھی جائے گا۔ اور ظاہر ہے کہ شاعر کے لئے زبان و بیان پوری اہمیت رکھتے ہیں۔ اسے اس کی اجازت نہیں دی جا سکتی کہ وہ جوہی، چمیلی اور گلاب کے پھولوں کے ساتھ گیندے کے پھول ایک ہی حیثیت سے پیش کرے۔ یہ امر حیرت خیز ہے کہ مجنوں گورکھپوری نے اپنے رسالے "اقبال" میں اقبال کی شاعری کا ایک غالب عنصر اُن کی انفرادی موسیقیت کو بھی قرار دیا ہے جس کی سب سے نمایاں خصوصیت ہمواری اور بلاغت ہے اور اس خصوص میں اقبال کو اُنھوں نے اُردو کے جملہ شعرا پر فوقیت دی ہے۔ اس سلسلے میں جناب مجنوں نے کئی صفحے لکھ دئے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس ضمن میں اُنھوں نے جو کچھ فرمایا ہے وہ ایک صاحبِ جد کے کلماتِ عالیہ ہی کی حیثیت رکھتا ہے۔ جب کلام کا خاصا حصّہ فصاحت سے عاری ہے تو پھر اُس میں کیسی موسیقیت۔ کیسا ترنم، کیسی بلاغت، کاش کہ جناب مجنوں نے اس جگہ جو کچھ لکھا ہے وہ اُن کے فارسی کلام سے مخصوص کر دیتے۔

؎ صحیح شعر یوں ہے ؎ حق را بسجودے صنماں را بطوافے + بہتر ہے چراغِ حرم و دیر بجھا دو (ادارہ)

شفا گوالیاری

غزل

شعورِ غم کی آشفتہ سری تک بات کیوں پہنچے
خرد کی راہ سے دیوانگی تک بات کیوں پہنچے

وفاداریِ عشق کی غم یا خوشی تک بات کیوں پہنچے
ہزاروں اور بھی دل ہیں اسی تک بات کیوں پہنچے

اگر دامن بچے رہبر کی اُلجھن سے تو اچھا ہے
خرابِ جستجو کی گمرہی تک بات کیوں پہنچے

نگاہ و دل کے پرتو سے کریں شام و سحر روشن
مہ و خورشید کی تابندگی تک بات کیوں پہنچے

محبت کی کہانی ہو کہ نفرت کی حکایت ہو
کسی کی بھی سہی لیکن کسی تک بات کیوں پہنچے

نکھرنا ہے تو نکھرے اپنے ہی آئینے میں فطرت
کسی رُخ سے نگاہِ آدمی تک بات کیوں پہنچے

محبت خود ہی حل کرلے محبت کے معموں کو
اُلجھنے کو خودی و بیخودی تک بات کیوں پہنچے

سمو دیں حال کے دل میں جو مستقبل کی دھڑکن کو
تو بڑھ کر اس صدی سے اس صدی تک بات کیوں پہنچے

سکوتِ گل ہی آئینہ بنا دے رازِ گلشن کو
شفاؔ اپنے مذاقِ شاعری تک بات کیوں پہنچے

طرفہ قریشی

غزل

وفا کی بُنیاد تیشۂ غم سے تم نے ڈھا دی بُرا کیا یہ
مرے محبت پناہ دل کی ہنسی اُڑا دی بُرا کیا یہ

ذرا سے اک لفظِ بے وفا پر بدل لی اپنی نگاہ تم نے
ذرا سے سہو و خطا پہ اتنی کڑی سزا دی بُرا کیا یہ

بجھی بجھی سی تھی آتشِ غم دبا دبا سا تھا سوزِ اُلفت
پھر آج تم نے جھلک دکھا کر اُسے ہوا دی بُرا کیا یہ

تمہارے دامن میں آنے والے تھے بن کے پروانہ گل چمن کے
بہار آتے ہی تم نے شمعِ وفا بجھا دی بُرا کیا یہ

تبسم اور اس طرح تبسم، بہار کا ظرف بھی نہ دیکھا
چمن میں ہر سمت تم نے اک آگ سی لگا دی بُرا کیا یہ

گلاب سرشار، لالہ بدمست، چشمِ نرگس سرور بستہ
شرابِ حُسن و جمال ہر اک طرف لنڈھا دی بُرا کیا یہ

شکستہ دل ہو گئی محبت نہیں رہا اب وہ جوشِ وحشت
خرد وروں نے مرے جنوں کی ہنسی اُڑا دی بُرا کیا یہ

بتا رہے ہیں اُچھل اُچھل کر ہر ایک کو میکدے کی باتیں
جنابِ طرفہ کو ہم نے تھوڑی سی جو پلا دی بُرا کیا یہ

ذکر و فکر

غزل ——— یعقوب عثمانی

نا رساں ہیں کہ آہا ہے، زحسرت بن کے آتا ہے
خیالِ آدمیت آج عبرت بن کے آتا ہے

کہ ہر ہیں مست نخوت آئیں آئیں سامنے آئیں
زوالِ خود سری آئینِ قدرت بن کے آتا ہے

فغانِ دل ٹھہر، وہ دیکھ اُفق پر ڈوبتی کھیتی
اثر آتا ہے اور بیباکِ فطرت بن کے آتا ہے

گزرنا مشکل ہے مایوسی کا اُن ذہنی فضاؤں میں
تخیل تک جہاں جوشِ طبیعت بن کے آتا ہے

ستمگر دیکھ ہی لیں گے کبھی شکلِ ہزیمت بھی
ابھی تو وقت آثارِ ہزیمت بن کے آتا ہے

اُسی سے پوچھتا رہتا ہوں اہیں کامرانی کی
وہی جذبہ جو پیغامِ صداقت بن کے آتا ہے

یہی تو پیشِ خیمہ انقلاب نو کا ہے ہمدم
ہر احساس ان دنوں تازہ مصیبت بن کے آتا ہے

کہاں تک ضبط کو یعقوب پابندِ ادب رکھیں
جو غم آتا ہے ایمائے مشیت بن کے آتا ہے

اے دوست ——— ارشد کاکوی

چمن میں آج کھلی پھر نئی کلی اے دوست
پھر آج روحِ گلستاں لرز گئی اے دوست

کہاں گئی تری پہلی سی بے رخی اے دوست
تجھے وہ پہلی سی الفت نہیں رہی اے دوست

بلا رہے ہیں مجھے میکدے میں دیوانے
کہاں سے لاؤں وہ پہلی سی تشنگی اے دوست

جو تیرے دل سے بھلا دے گی تیرگی کیا ہے
وہ روشنی ہے حقیقت میں روشنی اے دوست

نہیں یہ بات کہ احسانِ میکدہ ہے گراں
خراب بادۂ الفت ہے زندگی اے دوست

مجھے تم اچھے لگے میں نے کہہ دیا تم سے
عجیب ہے مری فطرت کی سادگی اے دوست

بہت بڑی ہی سہی پھر بھی بخش دے مجھ کو
یہ پہلی پہلی خطا ہے نگاہ کی اے دوست

یادِ وطن ——— احسن طیا طبائی

میں کیا بتاؤں کیوں گلستاں سے دور ہوں
دیوانہ وار محفلِ رنداں سے دور ہوں

غربت میں عکسِ جلوۂ جاناں سے دور ہوں
ظلمانِ غم میں شمعِ شبستاں سے دور ہوں

میکش ہوں اور سرور دل و جاں سے دور ہوں
کیوں ساقیا میں محفلِ رنداں سے دور ہوں

یہ دوپہر ہے لئے تاریک رات ہے
گویا شعاعِ مہرِ درخشاں سے دور ہوں

غربت میں بھی نصیب ہے گوشاخِ گل مجھے
پھر بھی وطن کے سنبل و ریحاں سے دور ہوں

فرزانگی کا شور ہے دیوانگی کا قحط
دل چاک ہوں کہ چاک گریباں سے دور ہوں

ہیں لوحِ دل پہ اُن کے خطِ خال مرتسم
کافر بتوں سے عارضِ تاباں سے دور ہوں

گلشن میں بھی شگفتہ گلوں کی تلاش ہے
صحرا میں بھی خرام غزالخواں سے دور ہوں

باتیں جہاں کی شعر میں اشعار سحر ہیں
احسن میں اس فضائے غزالخواں سے دور ہوں

غزل ——— حسن نعیم

حُسن کی سحر و کرامات سے جی ڈرتا ہے
عشق کی زندہ روایات سے جی ڈرتا ہے

ہم نشیں ترکِ محبت کو زمانہ گذرا
جانے کیوں پھر بھی ملاقات سے جی ڈرتا ہے

اتنا رویا ہوں غمِ دوست ذرا سا نہ کر
مسکراتے ہوئے لمحات سے جی ڈرتا ہے

سچ تو یہ ہے کہ ابھی دل کو سکوں ہے لیکن
اپنے آوارہ خیالات سے جی ڈرتا ہے

جو بھی کہنا ہے کہو صاف شکایت ہی سہی
ان اشارات و کنایات سے جی ڈرتا ہے

کس گھڑی کون سی وحشت میں کر گے تو ترک
عشق کی ایک اسی بات سے جی ڈرتا ہے

ہجر کا درد نئی بات نہیں ہے لیکن
دن وہ گزرا ہے کہ اب رات سے جی ڈرتا ہے

قطعات ——— برج لال بگی رعنا

جب کوئی تازہ چوٹ کھاتا ہوں
ایک عادت ہے مسکراتا ہوں

چل رہی ہوں جہاں ہوائیں تیز
شمع اپنی وہیں جلاتا ہوں

شادمانی جسے سمجھتے ہیں
ایک رنگِ ملال ہی تو ہے

زندگانی جسے سمجھتے ہیں
موت کی ایک چال ہی تو ہے

رنج و راحت کا امتزاج حسیں
پُرسکوں اضطراب ہے گویا

ہمہ تلخی ہمہ سرور و نشاط
زندگی بھی شراب ہے گویا

دل میں اُٹھتی ہے موج رنگ و بو
بھول جیسے نظر میں کھلتے ہیں

جب بھی ملتے ہیں وہ مجھے رعنا
مثلِ فصلِ بہار ملتے ہیں

عالیہ ناہید

امریکہ کا موجودہ دستور

امریکہ اڑتالیس ریاستوں پر مشتمل ایک وفاقی حکومت ہے۔ اُس کے دستور کی اساس نظریۂ تفریقِ اختیارات ہے۔ ابتداء میں ان ریاستوں نے انگریزوں کے اقتدار سے نجات حاصل کرنے کے لئے ایک اتحاد بنایا تھا۔ جنگِ آزادی کے زمانے میں اس اتحاد کو قائم رکھنے کے لئے اس کا ایک مرکز بھی بنایا گیا تھا۔ ۱۷۸۳ء میں جنگِ آزادی جیتی گئی اور ۱۷۸۷ء میں فلاڈلفیا میں ایک اجلاس ہوا، جس نے موجودہ دستور کا مسودہ مُرتب کیا۔ اُس کو ایک سال بعد تمام ریاستوں نے تسلیم کرلیا، اور جارج واشنگٹن امریکہ کے اس اتحاد کے صدر منتخب ہوگئے۔ یہ انتخاب تقرّر کی نوعیت رکھتا تھا۔ اِس طرح ایک وفاق کی بناء پڑی۔ لیکن اِس وفاق کی ریاستوں کو دو گروہوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ ایک ایسا گروہ ہے جو وفاقی مرکز کو طاقتور بنانا چاہتا تھا، اور دوسرا گروہ انتہائی جمہوریت کا قائل اور ریاستوں کی آزادی کا حامی تھا۔ دونوں میں کشمکش ہوتی رہی۔ لیکن امریکہ کی تاریخ میں سب سے بڑی کشمکش اُس وقت شروع ہوئی جب کہ ابراہام لنکن کی صدارت کے زمانے میں جنوبی ریاستوں نے شمالی ریاستوں سے اپنا رشتہ توڑنا چاہا۔ جس مسئلے پر یہ اختلاف رونما ہوا تھا وہ امریکہ میں حبشی باشندوں کی غلامی کا مسئلہ تھا۔ جنوبی ریاستوں میں حبشی غلاموں کی تعداد زیادہ تھی۔ اگرچہ یہ ایک عارضی مسئلہ تھا۔ لیکن جنوبی ریاستوں نے اِس کو بہانہ بناکر وفاقی مرکز سے آزادی حاصل کرنے کی ناکام کوشش کی۔ ان کو شکست دے کر ۱۸۶۸ء میں لنکن نے امریکہ میں وفاق کی بنیادوں کو مستحکم کردیا۔ امریکہ کی حکومت آج دنیا میں وفاقیت کی کامل ترین مثال تسلیم کی جاتی ہے۔ ابتدائی دَور میں یہاں انگریزوں کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ لیکن اب تو سوئٹزرلینڈ کی طرح یہاں کی آبادی مخلوط ہے۔ یہاں جاپانی، چینی اور افریقی باشندے قابلِ لحاظ حد تک آباد ہیں۔

یہاں کا دستور برطانوی دستور کو پیشِ نظر رکھ کر بنایا گیا تھا۔ لیکن انگلستان کا دستور غیر تحریری اور لچکدار ہے اور امریکہ کا دستور استوار اور تحریری ہے۔ سربنری مین نے تو یہاں تک کہا ہے کہ امریکہ کا دستور انگریزی دستور کی کاربن کاپی ہے۔ اس دستور کی اہم ترین خصوصیت یہ ہے کہ اس کی اساس نظریۂ تفریقِ اختیارات پر ہے۔ مُقننہ عاملہ اور عدلیہ کو اِس بناء پر ایک دوسرے سے آزاد رکھا گیا ہے، اور یہ ایک دوسرے کو "چیک اور بیلنس" کرتے رہتے ہیں۔ اگرچہ مانٹسکو کا نظریۂ تفریقِ اختیارات بنیادی اعتبار سے بے بنیاد ہے، اور مانٹسکو نے برطانیہ کے دستوری ارتقاء کو غلط سمجھتے ہوئے اس نظریئے کو پیش کیا ہے۔ لیکن امریکہ کا دستور بنانے والوں نے اس کو سند مان لیا، اور اسی پر اپنے دستور کی اساس رکھی، وہاں

پارلیمانی طرز کی بجائے صدارتی طرز کی حکومت ہے

اس کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ یہ ایک وفاقی دستور ہے۔ وفاقی مملکت میں دو قسم کی حکومتیں پائی جاتی ہیں۔ ایک تو مرکزی حکومت ہوتی ہے اور دوسری اجزا کی حکومت۔ ایسا ہی ہمارے ملک بھارت میں ہوا ہے مرکز اور اجزا یا ریاستوں کے اختیارات علیحدہ علیحدہ ہیں۔ مرکز کو خارجی معاملات کرنسی انکم ٹیکس اور دفاع وغیرہ کے اختیارات حاصل ہیں۔ امریکہ کے مرکز کو کنیڈا کی مرکزی حکومت سے کم اختیارات حاصل ہیں۔ ہندوستان کی مرکزی حکومت کے اختیارات بھی امریکی مرکزی حکومت کے اختیارات سے زیادہ ہیں۔

امریکہ کا فیڈریشن یا وفاق موجودہ تاریخ میں پہلا فیڈریشن ہے۔ لارڈ میکالے کا خیال تھا کہ یہ وفاق ناکام رہے گا لیکن یہ تو اب تک باقی ہے۔

اس دستور کی تیسری اہم خصوصیت یہ ہے کہ یہ دستور تحریری ہے۔ اس کا اثر دنیا کی اُن مملکتوں پر پڑا جو امریکہ کے قیام کے بعد معرضِ وجود میں آئیں۔ امریکہ کے دستور کی ترتیب کے بعد جس قدر دستور تشکیل پائے سارے ہی تحریری ہیں۔ امریکہ کا دستور استوار ہے۔ اور اس میں تبدیلی کرنا محال ہوتا ہے۔ اب تک اس میں صرف ۲۱ ترمیمیں ہوسکی ہیں۔ اگر کانگریس کی دو تہائی اکثریت ترمیم کا مطالبہ کرے تو تمام ریاستوں کے سامنے یہ مطالبہ پیش کیا جاتا ہے اور اگر تین چوتھائی ریاستیں اس کو تسلیم کرلیں تو ترمیم ہوجاتی ہے۔

مرکزی مقننہ یا لیجسلیچر

امریکی مرکزی مقننہ یا لیجسلیچر کو کانگریس کا نام دیا گیا ہے اس کے دو ایوان یا ہاؤس ہوتے ہیں۔ ایوانِ اعلیٰ سنات کہلاتا ہے اور ایوانِ زیریں کو "ہاوز آف ریپ رے زن ٹے ٹیوز" یا دارالنائبین کہتے ہیں۔ سنات ریاستوں کا نمائندہ ایوان ہے، اور دارالنائبین عوام کا۔

امریکہ کا دارالنائبین انگلستان کے دارالعوام فرانس کی نیشنل اسمبلی یا ہندوستان کی ہاوز آف دی پیپل کی طرح ذیلی ایوان ہے۔ یہ دو ایوانی لیجسلیچر دراصل امریکہ کی نقل ہے۔ اس ایوان میں آبادی کی اساس پر نمائندگی دی جاتی ہے۔ ابتداءً اس کے نمائندوں کی تعداد ۶۵ تھی اور اب ۴۳۵ ہے۔ ۱۷۸۹ء میں اس ایوان کا نمائندہ صرف ساٹھ ہزار، اب تین لاکھ باشندوں کی نمائندگی کرتا ہے۔ کیونکہ آبادی کے ساتھ ساتھ نمائندوں کی تعداد بڑھ جانے کا اندیشہ تھا۔ وہی شخص اس کا ممبر بن سکتا ہے جو سات سال کا شہری ہو جس ریاست سے بطور اُمیدوار انتخابات میں کھڑا ہو اسی ریاست کا باشندہ ہو۔ اور کم سے کم ۲۵ سال کی عمر ہو۔ اس حد تک انگلستان کے دستور کی عمدگی سے امریکہ کا یہ دستور محروم ہے۔ اس ایوان میں عام طور پر پچاس ساٹھ سال کی عمر والے بوڑھے ہی آتے ہیں اور سات سال کی بجائے پندرہ بیس سال کے شہری ہی منتخب کئے جاتے ہیں۔ یہ روایت بن چکی ہے۔ اُمیدوار کا پیشہ بھی انتخاب کو متاثر کرتا ہے۔ ۱۹۲۵ء میں انگلستان کے دارالعوام میں وکیلوں کی تعداد ۶۱۵ اراکین میں صرف ۹۰ تھی اور دارالنائبین امریکہ کے ۴۳۵ اراکین میں ۲۶۲ وکیل تھے، وکیلوں کو اپنے عوامی نمائندوں کے انتخاب کے لئے انتخابی حلقے بنانے کا اختیار دیا گیا ہے جو سراسر غیر جمہوری طریقہ ہے۔ یہ اراکین دو سال کے لئے منتخب ہوتے ہیں اور اس انتخاب میں ہر نمائندے کو ایک مقررہ رقم سے زیادہ خرچ کرنے کی اجازت نہیں ورنہ اس

کو نمائندہ نہیں بنایا جاتا۔ ایوان کی میعاد دو سال ہے۔ اور یہ عرصہ نمائندوں کے کام کرنے کے لئے قطعاً کافی نہیں، ایک تحریک ہے کہ اس کو چار سال کردیا جائے۔

۱۹۱۶ء تک اس ایوان کے اراکین کو تنخواہیں نہیں دی جاتی تھیں۔ لیکن بعد میں دی جانے لگیں۔ ہر ممبر کی سالانہ تنخواہ تیرہ ہزار ڈالر سالانہ تک پہنچ گئی۔ اس کے علاوہ کئی الاؤنس بھی ملتے ہیں۔ آج کل ہر ممبر کی تنخواہ پندرہ ہزار ڈالر سالانہ ہے، طرح طرح کی اور بھی سہولتیں اُن کو دی جاتی ہیں۔ مثلاً مفت ٹیلی فون اور ٹیلی گراف کی اُن کو اجازت ہوتی ہے۔ ڈاک کا خرچ اُن کو ادا نہیں کرنا پڑتا۔ اُن کے مددگار کو بھاری تنخواہ دی جاتی ہے۔ اُن کے مددگار کو سالانہ دس ہزار اور سکرٹری کو بھی اسی قدر تنخواہ دی جاتی ہے۔ امریکہ کی کانگریس پر اس قدر رقم صرف ہوتی ہے کہ دنیا کی کسی مقننہ پر نہیں ہوتی۔ ان اراکین کو غداری یا بغاوت ہی کے جرم پر گرفتار کیا جاسکتا ہے۔ دونوں سال اس کے اجلاس مساوی مدّت کے لئے ہوتے ہیں ورنہ اس ترمیم سے پہلے پہلا اجلاس مختصر اور دوسرا اجلاس طویل ہوا کرتا تھا۔



اسپیکر دارالنائبین کی صدارت کرتا ہے۔ انگلستان کے دارالعوام کا اسپیکر پارٹی کا طرفدار ہوتا ہے۔ اور کوشش کرتا ہے کہ اپنے اختیارات سے اپنی پارٹی کو زیادہ سے زیادہ فائدہ پہونچا سکے۔ اس کو ابتداءً تو زبردست اختیارات حاصل تھے۔ لیکن ۱۹۱۱ء کے بعد ان اختیارات میں کمی کردی گئی۔ اس کا انتخاب تجربے، مقبولیت اور قابلیت کی اساس پر ہوتا ہے۔ ہاؤس کی تمام کارروائیوں کو آگے بڑھاتا ہے، وہ ہاؤس کا ناظم اعلیٰ ہوتا ہے اور نظم و ضبط کا نگراں کہا جاسکتا ہے۔

دارالنائبین کی معاون کمیٹیاں ہوتی ہیں "کمیٹی آف دی ہول ہاؤز"، "اسٹانڈنگ کمیٹی"، "کانفرنس کمیٹی"، "اسپیشل کمیٹی" اور "جائیٹ کمیٹی" قابلِ ذکر ہیں۔ پہلی کمیٹی ایوان کے اہم کام انجام دیتی ہے۔ اس میں پورے ایوان کے اراکین ہوتے ہیں صرف نام بدل جاتا ہے۔ دارالنائبین کا کورم ۲۱۸ اور کمیٹی کا ۱۰۰ ہے۔ اسپیکر اس کی صدارت نہیں کرتا بلکہ علیحدہ صدر منتخب کیا جاتا ہے۔

دونوں ایوانوں میں کسی مسئلے پر اختلاف ہو تو کانفرنس کمیٹی بلائی جاتی ہے۔ جو دونوں ایوانوں کے اراکین کی مقررہ تعداد پر مشتمل ہوتی ہے۔ اسپیشل کمیٹی غیر معمولی حالات میں طلب کی جاتی ہے۔ ان کے علاوہ اور بھی ۱۹ کمیٹیاں ہوتی ہیں — جو مختلف کام انجام دیتی ہیں۔

لیجسلیچر کا بالائی ایوان سناٹ کہلاتا ہے۔ جو دنیا کا طاقتور ترین ایوان ہے، دنیا میں ایوان بالائی کی ضرورت کو محسوس نہیں کیا جارہا ہے اور اس کی اہمیت کم ہوتی جارہی ہے۔ لیکن امریکہ میں اس ایوان کو ذیلی ایوان سے زیادہ اختیارات حاصل ہیں۔ اس میں ہر ریاست سے دو نمائندے منتخب ہوکر آتے ہیں۔ اس طرح کل تعداد ۹۶ ہے۔ ہر رکن چھ سال کے لئے منتخب ہوتا ہے، لیکن تمام اراکین کا انتخاب ایک ساتھ نہیں ہوجاتا بلکہ ہر دو سال بعد اس ایوان کے ایک تہائی اراکین کا انتخاب ہوتا ہے۔ وہی شخص رکن بن سکتا ہے جس کی عمر ۳۰ سال ہو۔ نو سال تک شہری رہ چکا ہو، عام طور پر انتہائی مالدار اشخاص منتخب ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ وہ ذمہ دار عہدے سنبھال چکے ہوتے ہیں۔ عام طور پر پچاس ساٹھ سال کی عمر والے رکن بنتے ہیں۔ ریاست خواہ چھوٹی ہو یا بڑی، دو نمائندے اس ایوان

کو بھیج سکتی ہے۔ بیئرڈ نے تنقید کرتے ہوئے لکھا تھا کہ اس طرح اکثریت کی حکومت کو ضرب لگتی ہے۔ اس کا جواب یہ دیا جاتا ہے کہ اس طرح ریاستوں میں توازن پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

اگر کوئی شخص چھ سال سے پہلے مرجائے یا استعفیٰ دے دے تو خصوصی انتخاب کے ذریعے اُس کی نشست پُر کی جاتی ہے۔ بعض وقت متعلقہ ریاست کا گورنر بھی نامزد کرسکتا ہے۔ جو لوگ ناجائز طریقے اختیار کرکے رکن بنتے ہیں اُن کو نکال دیا جاتا ہے۔ مثلاً زیادہ خرچ کرکے انتخاب جیتنا، نسلی تعصب کا سہارا لینا، رشوت سے کام نکالنا۔ سنات کا صدر ہوتا ہے وہ امریکہ کا نائب صدر ہوتا ہے۔ ایک اور صدر بھی منتخب کیا جاتا ہے، جو صدر کی غیر موجودگی میں سنات کی صدارت کرتا ہے۔ سنات میں تقریر کی کافی آزادی رہتی ہے، اس آزادی سے غلط فائدہ بھی اُٹھایا جاتا ہے۔ سنات میں کارروائیوں کا وہی طریقہ ہے جو دارالنائبین میں ہے۔ سنات معاہدوں پر غور کرنے کے لئے کمیٹی کی شکل اختیار کرلیتی ہے۔ دونوں ایوانوں کے اختیارات مساوی ہوتے ہیں۔ لیکن ریونیو بل سنات میں پیش نہیں کئے جاسکتے مالیاتی معاملات میں دونوں ایوان مساوی اختیارات رکھتے ہیں۔ کوئی قانون اُس وقت منظور نہیں ہوتا جب تک دونوں ایوان منظوری نہ دیں۔ سنات میں کمیٹیوں کو زیادہ اہمیت حاصل نہیں۔ مختلف کمیٹیاں مختلف فرائض انجام دیتی ہیں۔ امورخارجہ اور سفراء کے تقرر میں سنات کی آواز خاصی مؤثر رہتی ہے۔ جب تک دوتہائی اکثریت حمایت نہ کرے نہ معاہدہ ہوسکتا ہے اور نہ کوئی سفیر مقرر ہوسکتا ہے۔ سنات اپنی کارروائی کے قواعد خود وضع کرتی ہے۔ جو کبھی بدل بھی سکتے ہیں۔

مرکزی عاملہ

۱۷۸۷ء میں اس دستور کی تشکیل و تدوین کے وقت بعض لوگوں کا یہ خیال تھا کہ بادشاہت قائم کی جائے جو موروثی ہو اور دوسرا خیال یہ تھا کہ ایک کابینہ ہو جو صدر کے سامنے جوابدہ ہو۔ اکثریت کی رائے نے ایک طاقتور عاملہ کی حمایت کی۔ چونکہ منٹسکو کا نظریہ کارفرما تھا، اس لئے یہ خیال رکھا گیا کہ صدر نہ کانگریس پر اپنا اقتدار جماسکے اور نہ کانگریس صدر کو کٹھ پتلی بناسکے۔ جب عاملہ کا ہونا طے پایا تو اس کی نوعیت زیربحث آئی کہ انفرادی عاملہ ہو یا اجتماعی۔ ان تمام مراحل سے گزرنے کے بعد یہاں ایک صدارتی حکومت قائم ہوئی۔ ملک کی ایک عاملہ ہوتی ہے اور اُس کا ایک صدر ہوتا ہے جو عاملہ کا ناظم اعلیٰ ہوتا ہے۔ کابینہ کی موجودہ شکل ایک ارتقائی شکل ہے۔ ابتداءً دستور بنانے والے افراد کے پاس کابینہ کا کوئی تصور نہ تھا بلکہ صدر محکمہ جات کے صدور سے صلاح و مشورہ کیا کرتا۔ لیکن رفتہ رفتہ ان صدور کی جماعت کابینہ بن گئی۔ یہ صدور وزیر کہلاتے ہیں اور صدر کے مشیر کار ہوتے ہیں۔ ہر وزیر اپنے فرائض کی تکمیل میں صدر کی مرضی کا کامل طور پر پابند ہوا کرتا ہے۔ اگر کابینہ کے تمام ارکان متحدہ طور پر صدر کی مرضی کی مخالفت کریں تو بھی یہ مخالفت بارآور نہیں ہوتی۔ کابینہ کا رکن نہ مقننہ کا رکن بن سکتا ہے نہ مقننہ کے سامنے ذمہ دار ہے۔ وہ صرف اپنے صدر کے سامنے ذمہ دار ہے جس کی مرضی کا وہ پابند ہوتا ہے۔ صدر منتخب ہوتا ہے۔ عوام اپنے نمائندوں کو منتخب کرتے اور وہ نمائندے صدر کو منتخب کرتے ہیں۔ لیکن رفتہ رفتہ بالواسطہ انتخاب کا یہ طریقہ ختم ہوگیا۔ تمام ریاستوں میں انتخابات ہوتے اور صدر و نائب صدر

سے کو عام رائے دیتے ہیں۔ انتخاب کے بعد تمام صندوقوں کو واشنگٹن پہونچایا جاتا ہے، جہاں وہ کھولے جاتے ہیں۔ امریکہ کا صدر پانچ سال کے لئے منتخب ہوتا ہے اور یہ انتخاب روایات کی روشنی میں زبردست ہنگاموں کے ساتھ ہوتا ہے۔ امریکہ کی سیاست میں اس قدر ہلچل شاید ہی کسی اور موقعے پر ہوتی ہو جس قدر صدر کے انتخاب پر ہوتی ہے۔ اور یہی انتخاب ساری دنیا کی نگاہوں کو امریکہ کی طرف مرکوز کردیتا ہے۔ امریکہ سے دنیا بھر کے باشندوں کی دلچسپی بڑھ جاتی ہے۔ ہر پارٹی اپنا اُمیدوار منتخب کرتی ہے اور یہ اُمیدوار انتخابات میں حصہ لیتے ہیں۔ دستوری اعتبار سے امیدوارِ صدارت ہونے کے لئے تین شرائط ضروری ہیں۔ وہ پیدائشی شہری ہو۔ کم سے کم چودہ سال امریکہ میں رہا ہو، اور کم سے کم اُس کی عمر ۳۵ سال ہو۔ ان شرائط کے علاوہ روایات اور رواج بھی اس انتخاب پر گہرا اثر ڈالتے ہیں۔ پچاس سال سے کم عمر صدر بہت کم ہوئے ہیں۔ کوئی خاتون منتخب نہیں ہوئی۔ عام طور پر پروٹسٹنٹ ہوتے ہیں۔ حالانکہ یہ وہاں کا اقلیتی فرقہ ہے۔ ۱۹۴۷ء کی ترمیم کے بعد کوئی شخص دو سے زائد مرتبہ امریکہ کا صدر نہیں بن سکتا۔ کیونکہ وہ اپنے غیر معمولی اختیارات کے سہارے کہیں آمر نہ بن جائے۔ اُس کے اختیارات اس قدر وسیع ہیں کہ شاید ہی کسی اور صدر کے ہوں۔ وہ واشنگٹن میں رہتا ہے، اُس کے رہنے کی جگہ وہائٹ ہاؤس ہے۔ وہاں اُس کا اور اُس کی عاملہ کا دفتر ہوتا ہے۔ ۲۰ جنوری سے وہ اپنی کارروائیوں کا آغاز کرتا ہے۔ اور کارروائیوں کے آغاز اور عہدے کا جائزہ لینے پر چیف جسٹس کے سامنے وہ وفاداری کا حلف اُٹھاتا ہے۔

امریکہ کے صدر کے اختیارات انتہائی وسیع ہوتے ہیں۔ اس کو کافی عدالتی اختیارات حاصل ہوتے ہیں۔ وہ ہر عدالت کی سخت سے سخت سزا کو معاف کرسکتا ہے۔ اس کو اختیار حاصل ہے کہ سزا میں کمی کردے یا منسوخ کردے۔ بغاوت یا ایسے سنگین جرائم کے سوا وہ ہر عدالت کی سزا کو معاف کرنے کا اختیار رکھتا ہے۔ اگرچہ وہاں نظریۂ تفریقِ اختیارات کو پیشِ نظر رکھا گیا ہے لیکن صدر کو عدالتی اختیارات بھی کافی حاصل ہیں۔ قانون سازی سے بھی صدر کا تعلق رکھا گیا ہے۔ صدر ہر نئے سال کے آغاز پر لیجسلیچر کو "دی اسٹیٹ آف دی یونین" کے عنوان کے تحت بڑا اہم پیغام بھیجتا ہے۔ اس میں وہ امریکہ کی تمام ریاستوں کے حالات قلمبند کرتا ہے۔ ایسے موقعے پر وہ پیام کی بجائے خود جاکر بھی تقریر کرسکتا ہے۔ وہ عام حالات میں بھی جاکر تقریر کرسکتا ہے۔ وہ خود کوئی بل پیش کرنے کا مجاز نہیں۔ لیکن اپنے کسی دوست کے ذریعے وہ مقننہ میں کسی بل کو پیش کراسکتا ہے۔ اُس کو ویٹو کا اختیار حاصل ہے۔ جب تک وہ دستخط نہ کرے کانگریس کا کوئی بل قانون نہیں بن سکتا۔ صدر کو اختیار ہے کہ وہ کانگریس کے کسی قانون کو نامنظور کردے۔ اگر دوبارہ دونوں ایوان اس بل کو دوتہائی اکثریت سے منظور کردیں تو قانون منظور شدہ متصور ہوگا۔ غور کرنے کے بعد منظور یا نامنظور کرکے صدر کو ہر بل دس دن کے اندر واپس کرنا پڑتا ہے۔ صدر کے ویٹو کے اختیار کی حمایت بھی کی جاتی ہے، اور مخالفت بھی اور ایک خیال ان دونوں کے بین بین ہے۔ وہ اس اختیار میں تبدیلی کا خواہاں ہے۔

کابینہ صدر کو مشورہ دیتی ہے۔ اُس کے اختیارات محدود ہوتے ہیں۔ دس اراکین پر مشتمل ہوتی ہے، جو وزیر یا سکرٹری کہلاتے ہیں۔ صدر جس کو چاہے کابینہ کا رکن مقرر کرسکتا ہے۔ اس تقرر کے لئے صدر پر کسی قسم کی

پابندی ہے اور نہ کوئی شرط ہے۔ انگلستان کے برخلاف امریکی صدر اپنی کابینہ کے مقابلے میں وسیع اختیارات کا حامل ہوتا ہے اور اس کے مقابلے میں کابینہ کے اراکین کی کوئی اہمیت نہیں۔ یہاں کابینہ کی حیثیت ایک ایڈوائزری کونسل کی ہے، جو صدر کو مشورہ دے۔ صدر چاہے قبول کرے، چاہے قبول نہ کرے۔ لیکن انگلستان میں ایسا نہیں ہوتا۔ دستوری اعتبار سے تمام معاملات کا ذمہ دار صدر ہے، اور اس کی کابینہ پر کسی قسم کی ذمہ داری عاید نہیں ہوتی۔

صدر دستور کی بقا، حفاظت اور اس پر عمل درآمد کی نگرانی کرنے کا حلف اُٹھاتا ہے۔ اُس کا فرض ہے کہ وہ دیکھے کہ دستور پر عمل ہو رہا ہے یا نہیں۔ امورِ خارجہ میں اس کو بہت بڑا دخل حاصل ہوتا ہے اس کو اختیار ہے کہ وہ بیرونی ریاستوں کو تسلیم کرے یا نہ کرے، وہ سفارت کو منسوخ اور سفارت خانے کو بند کرسکتا ہے۔ امورِ خارجہ کا محکمہ اس کی نگرانی میں اپنے فرائض انجام دیتا ہے۔ سنات جب جنگ کا اعلان کرتی ہے تو صدر کی مرضی کو اس میں کافی دخل ہوتا ہے۔ بیرونی ممالک سے معاہدے وہی طے کرتا ہے، وہ سفیروں کا انتخاب کرتا ہے اُس کو ان چیزوں کے لئے سنات سے منظوری لینا پڑتی ہے اور سفارت اکثر اُس کی رائے سے اتفاق کرتی ہے۔ وہ بری اور بحری فوج کا سپہ سالار ہوتا ہے۔ ہوائیہ کا صدر ہوتا ہے، وہ افواج کو احکام بھیجتا ہے۔ بجٹ اُس کے حکم سے بنتا ہے۔

امریکہ کا صدر دوسری مملکتوں کے صدر کے مقابلے میں کہیں زیادہ با اختیار اور طاقتور ہوتا ہے۔ وہ فرانس کے صدر کی طرح نمائشی نہیں اور نہ انگلستان کے وزیراعظم کی طرح کابینہ کا پابند، وہ اندرونی اور بیرونی انتظامات کا ناظم اعلیٰ اور مرکزِ کُل تسلیم کیا جاتا ہے۔ اس کا مرتبہ سوسائٹی سے بلند تر ہوتا ہے۔ اس لئے وہ عام سماجی تقاریب میں حصّہ نہیں لیتا۔ غداری رشوت یا اس قسم کے سنگین جرائم کی صورت میں اس کا مواخذہ ممکن ہے۔ اگر صدر یا نائب صدر استعفےٰ دے دے یا مرجائے تو صدارت یا نائب صدارت کا فیصلہ کانگریس کو تفویض ہوجاتا ہے۔

عدلیہ

امریکہ کا عدالتی نظام ذرا عجیب ہے۔ وہاں وفاقی عدالتیں اور ریاستی عدالتیں علیحدہ ہیں۔ ان دونوں کا تعلق نہیں ہوتا۔ وفاق کی سب سے بڑی عدالت ہندستان کی طرح سپریم کورٹ ہے۔ اس عدالت العالیہ کو کانگریس اور عاملہ کے اثرات سے پاک رکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ سپریم کورٹ کے ججوں کا تقرر صدر کرتا ہے لیکن سنات کا مشورہ بھی شریک رہتا ہے۔ یہ عدالت العالیہ نو ججوں پر مشتمل ہوتی ہے۔ ان میں ایک چیف جسٹس ہوتا ہے۔ ججوں کے تقرر میں جماعتی جذبات کارفرما نہیں ہوتے۔ صدر انھیں لوگوں کو مقرر نہیں کرسکتا جو اُس کی پارٹی کے ہوں، بلکہ قابلیت اور تجربہ اصل چیز ہوتی ہے اور اُن کے طرزِ کار پر اُن کے عہدے کی مُدّت منحصر ہوتی ہے۔ چیف جسٹس کو سالانہ چودہ ہزار پانچ سو ڈالر اور ہر جج کو چودہ ہزار ڈالر بطور تنخواہ ملتے ہیں۔ عام طور پر سپریم کورٹ کے جج غیر معیّنہ مدّت کے لئے مقرر ہوتے ہیں۔ یوں تو وہ ستر سال کی عمر میں ذمہ داریوں سے سبکدوش ہوسکتے ہیں، لیکن اُن کو برطرف نہیں کیا جاتا۔ یہ اس صورت میں ممکن ہوتا ہے جب کہ غداری یا ایسے ہی سنگین جرائم ان کے خلاف ثابت نہ ہوجائیں۔ سپریم کورٹ بنیادی عدالت کی حیثیت سے کارگزار ہے۔ اس کو دستور کی تعبیر کا اختیار حاصل ہے۔ وفاقی نوعیت کے مواخذات کا تصفیہ کرتا ہے۔ صدر جمہوریہ کا مواخذہ چیف جسٹس سپریم کورٹ کی صدارت میں ہوتا ہے۔ ایسے

ایسے مقدمات کا فیصلہ جن کا تعلق مرکز اور کسی ریاست سے ہو، یا وہ ریاستوں سے ہو یا مرکز اور تمام ریاستوں سے ہو یا کسی ریاست کے ایک فرد کا دوسری ریاست کے کسی فرد سے ہو، سپریم کورٹ کرتا ہے۔ وہ خارجہ امور سے متعلق مقدمات کا فیصلہ بھی کرتا ہے۔ اور دستور کی حفاظت بھی۔ وہ حکومت کے مختلف اعضاء میں توازن کی برقراری کا ذمہ دار ہے۔ وہ مرافعے کے مقدمات کی سماعت کا اختیار رکھتا ہے۔ اس کے علاوہ وہ ذیلی وفاقی عدالتوں اور ریاستوں کی اعلیٰ عدالتوں کے مرافعے کی سماعت کرسکتا ہے۔ ذیلی وفاقی عدالتیں دس ہوتی ہیں، جو کانگریس کی جانب سے قائم کی جاتی ہیں۔ ہر ایسی عدالت میں دو جج ہوتے ہیں اور اُن کے تحت سارے ملک کی ۸۹ عدالتیں ہیں جو ضلع واری عدالتیں کہلاتی ہیں۔ یہ ریاستی عدالتوں کے متوازن قائم ہیں۔

امریکہ کا نظام عدلیہ صحت مند ہے۔ اور اختیارات کا اعتبار کرنے میں لیجسلیچر کے دونوں ایوانوں سے اس کو زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ لاسکی کا خیال ہے کہ سپریم کورٹ لیجسلیچر کا تیسرا ایوان بن گیا ہے۔ کیونکہ اکثر عدالت نے مقننہ کے قوانین کو دستور کے خلاف قرار دے کر منسوخ کردیا۔

اجزأ یا ریاستیں

مرکز سے ہٹ کر جب ہم امریکہ کی ریاستوں کے اندرونی نظام کا جائزہ لیتے تو اکثر ریاستوں میں قانون سازی کا دو ایوانی طریقہ نظر آتا ہے۔ ان ایوانوں کے ارکان کا انتخاب شہری ہی کیا کرتے ہیں۔ کونٹی کے نمائندے سنات کے ارکان کو منتخب کرتے ہیں۔ مرکزی لیجسلیچر کے بل پر صدر جمہوریہ دستخط کرتا ہے۔ اور ریاستی لیجسلیچر کے بل پر گورنر کے دستخط ضروری قرار دیئے گئے ہیں۔ گورنر ریاستی عاملہ کا صدر ہوتا ہے ریاست کے باشندے اس کا انتخاب کرتے ہیں۔ وہ مقننہ کے سامنے ذمہ دار نہیں ہوتا، وہ ریاست کی کسی پارٹی کا قائد اور ریاست کا پبلسٹی شہری ہوتا ہے۔ دستوری اعتبار سے پانچ سال کا شہری ہونا کافی ہے اور تیس سال کی عمر ضروری ہے۔ صدر کی طرح ایک ہی شخص وہ بار منتخب ہوسکتا ہے۔ وہ حکام کے تقرر کا حق رکھتا ہے، اور اُن کو برطرف کرسکتا ہے۔ لیجسلیچر کا اجلاس طلب کرسکتا ہے۔ بعض ریاستوں میں تقرر اور برطرفی کا حق گورنر کی بجائے عوام کو دیا گیا ہے۔ اس کو صدر جمہوریہ کی طرح سزا معاف کردینے کا اختیار دیا گیا ہے۔ وہ ریاست کی تمام افواج کا سپہ سالار ہوتا ہے۔ ان ریاستوں کا عدالتی نظام ایک دوسرے سے علیحدہ ہے۔ عدالتوں کے صدر کا انتخاب عوام کیا کرتے ہیں۔ ریاستی عدالتیں چار قسم کی ہوتی ہیں: امن کی محافظ، "کونٹی کورٹ" "سوپیریر کورٹ" اور "سپریم کورٹ"۔ چونکہ ہر ریاست اپنا علیحدہ دستور رکھتی ہے۔ اس لئے اُن کے عدالتی عاملانہ اور مقننائی نظام ایک دوسرے سے کچھ نہ کچھ اختلاف رکھتے ہیں۔ لیکن ہر دستور کی بنا نظریۂ تفریق اختیارات ہی پر رکھی گئی ہے۔ یہی نظریہ مرکزی دستور کی اساس ہے۔ ناقدین کا کہنا ہے کہ اس بنا پر ریاستی حکومتوں میں ذمہ داری کا احساس کم ہوچلا ہے اور ریاستی حکومتیں کمزور پڑرہی ہیں۔

دستور مرکز اور ریاستوں کے اختیارات کی تخصیص کرتا ہے۔ مرکز کو محصول عائد کرنے یا جمع کرنے، دفاع جنگ اور علیح، داخلی اور خارجی تجارت، آبکاری، شہریت، سکہ سازی اور ڈاک کے کُل اختیارات حاصل

ہیں۔ لیکن محصولِ برآمد، مذہبی آزادی اور تقریر کی آزادی میں مداخلت کا حق نہیں ہے۔ اسی طرح ریاستوں کو بیرونی ممالک سے معاہدہ کرنے، دفاعی امور اور سکّہ سازی کا اختیار حاصل نہیں ہے۔ اختیارات کی یہ تقسیم توازن و تصادم کے اصول کو پیشِ نظر رکھکر کی گئی ہے۔

امریکہ کا یہ دستور ۱۷۸۸ء میں مکمل ہوا اور اب تک اس میں صرف ۲۱ ترمیمات ہوسکی ہیں۔ ناقدین اس دستور پر اختلاف رائے رکھتے ہیں۔ سر ہنری مین کا کہنا ہے کہ یہ انگلستان کے دستور کی کاربن کاپی ہے۔ اور لارڈ میکالے نے اس وفاق کے جلد ٹوٹ جانے کی پیشن گوئی کی تھی۔ ایک صاحب قلم کا کہنا ہے کہ "امریکہ کا دستور دُنیا کا سب سے بڑا وفاقی دستور ہے۔ یہ وفاقی جمہوریت کے لئے مثالی حیثیت رکھتا ہے"۔

وڈرو ولسن کا کہنا ہے کہ "یہ دستور ایک مکمل نظام نہیں رکھتا۔ بلکہ تنظیم کی بنیاد قائم کرتا ہے۔ یہ اصولوں کی بنا رکھتا ہے۔ وہ سنگِ بُنیاد ہے، مکمل عمارت نہیں۔ جڑ ہے پُورا درخت نہیں"۔

ایک اور خیال یہ ہے کہ "امریکہ کا دستور "چیکس اور بیلینس" کا دستور ہے۔ قومی حکومت کے بمقابلہ ریاستوں کا، سنات کے بمقابلہ دارالنائبین کا، دارالنائبین کا سنات کے مقابلے، صدر کا کانگریس کے بمقابلہ اور کانگریس کا صدر کے بمقابلہ اور عدلیہ کا ان تمام کے بمقابلہ توازن برقرار رکھتا ہے"۔

ایک ماہر سیاسیات نے کہا تھا کہ "امریکہ کا دستور محض قانونی دستاویز نہیں بلکہ زندگی کا پروانہ ہے"۔ اور ایک ماہر سیاسیات نے بڑی حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا تھا کہ "بڑے تعجب کی بات ہے کہ عملاً یہ دستور کیوں کر کامیابی حاصل کرسکتا ہے"۔

امریکی باشندوں کے الفاظ میں اس دستور کی غرض و غایت یوں بیان کی گئی ہے کہ "ہم امریکہ کے رہنے بسنے والے ایک مکمل اتحاد کی تعمیر کے لئے، انصاف کے لئے، اندرونی امن و امان کے تیقن کے لئے، عام دفاع کی تشکیل کے لئے۔ عام فلاح و بہبود کا سامان کرنے کے لئے، اور آزادی کی نعمتوں سے استفادے کے لئے، اس دستور کی تشکیل و تدوین کرتے ہیں"۔ اس طرح اس کو ایک عوامی دستور بھی قرار دیا جاسکتا ہے۔

یہ تسلیم کیا گیا کہ امریکہ کا دستور دنیا کا مختصر ترین اور انتہائی ٹھوس دستور ہے۔ یہ دستور جمہوری آئین کا دستاویز خیال کیا جاتا ہے۔ اس کے متعلق جس قدر پیش قیاس آرائیاں کی گئی تھیں کہ یہ دستور عملی اعتبار سے ناکام رہیگا۔ سچ ثابت نہ ہوسکیں، اور آج بھی یہ دستور موجود ہے، اور اس دستور کی پابند مملکت امریکہ کا شمار دنیا کی زبردست ترقی یافتہ اور انتہائی طاقتور مملکتوں میں ہوتا ہے۔

یادگارِ غالب

مرزا غالب کی تعمیر و توسیع اور غالب کی یادگار کے طور پر ایک وسیع ہال کی تعمیر کے سلسلے میں عطیات مندرجہ ذیل پتے پر ارسال کئے جاسکتے ہیں۔ سیّد اشفاق حسین ڈپٹی سکرٹری منسٹری آف ایجوکیشن گورنمنٹ آف انڈیا نیو دہلی

خطوط نمبر

ماہ مارچ ۱۹۵۵ء کا شمارہ خطوط نمبر ہوگا۔ اس میں اکابر اور مشہور ادیبوں کے خطوں کے عکس اور ان پر دلچسپ مضامین شائع ہوں گے۔ قیمت فی شمارہ آٹھ آنے ——— بزنس منیجر پبلی کیشنز ڈویژن اولڈ سکریٹریٹ دہلی

کولمبو پلان کے تحت امداد

رائٹ آنریبل آر۔جی۔کیسی (وزیر امور خارجہ آسٹریلیا)

یہ ایک حقیقت ہے کہ بھارت خوراک کی قلت کا سدِباب کرنے کے لئے مسلسل جد و جہد میں مصروف ہے۔ اور قحط کے متعلق مبالغہ آمیز اطلاعات بھی موصول ہوتی رہتی ہیں مگر کوئی شخص بھوک سے مرتا نہیں ہے۔ بھارت سرکار کی مسلسل جد و جہد کا یہ نتیجہ برآمد ہوا ہے کہ ۱۹۵۴ء کے لئے گزشتہ سالوں کے مقابلے میں سب سے کم مقدار میں غلّہ درآمد ہوگا۔

مذکورہ امور سے قطعِ نظر دولتِ مشترکہ کے ممالک پر بھی اس سلسلے میں امداد دینے کا فرض عائد ہوتا ہے یہ امر باعثِ مسرّت ہے کہ کولمبو پلان کے تحت اس ضمن میں قابل قدر امداد دی گئی ہے۔

آسٹریلیا نے مذکورہ پلان کے تحت ۱۹۵۱-۵۲ء میں ۴۰ کروڑ روپے کا گندم اور آٹا بھارت کو بطور امداد دیا اور اسی پلان کی ٹیکنیکل کوآپریشن اسکیم کے تحت جو امداد دی گئی ہے اس سے خوراک کے مسئلے کے حل میں بڑی مدد لی ہے۔

اس سال آخر جولائی تک ایشیائی ملکوں سے ۳۹۶ امیدوار تربیت حاصل کرنے کی غرض سے آسٹریلیا آئے ان میں سے ۱۰۸ امیدوار بھارت سے آئے ہیں۔ بھارت کے امیدواروں میں سے ۳۰ نے خوراک سے متعلق نصابات کا انتخاب کیا ہے اور یہ امیدوار ملک میں اجناس خوراک کی پیداوار کے بڑھانے کے لئے بہت کارآمد ثابت ہوں گے۔

یہ امر بھی باعث مسرت ہے کہ اس سال سڈنی کی یونیورسٹی آف ٹیکنالوجی میں ایشیائی امیدواروں کے لئے خوراک کی ٹیکنالوجی کا ایک خصوصی نصاب بھی داخل کر دیا گیا ہے۔ چنانچہ اس نصاب کی تعلیم کے لئے جو ۲۹ امیدوار آسٹریلیا آئے ان میں سے ۵ ہندوستانی ہیں اور یہ نصاب دو سال کا ہے۔ خوراک سے متعلقہ مضامین کی تعلیم کے علاوہ اس نصاب میں عملی طور پر تجربہ حاصل کرنے کے لئے بھی کچھ مدّت مقرر کر دی گئی ہے۔ اس مدّت میں طالب علم کو خوراک کی اس خصوصی صنعت کو تربیت دی جاتی ہے جس میں وہ خاص طور پر دلچسپی لیتا ہو۔ بہرکیف کولمبو پلان کے تحت یہ نصاب سب سے زیادہ قابلِ قدر امداد ہے۔

اشیائے خوراک کو ذخیرہ کرنے اور محفوظ کرنے کے سلسلے میں بھارت میں جن موسمی حالات سے دوچار ہونا پڑتا ہے آسٹریلیا کی لیبارٹری میں حتی الامکان ایسا ہی ماحول پیدا کر دیا جاتا ہے۔ علاوہ ازیں سڈنی یونیورسٹی کے شعبۂ خوراک کے افسر اعلیٰ بھی بھارت کا دورہ کرنے آ رہے ہیں تاکہ بھارتی مسائل کا جائزہ لیں اور ہندوستانی طلبا کی ان ضروریات کو پورا کرنے کی کوشش کریں جو ان کو واپسی پر درپیش آئیں گی۔

نئے مطبوعات

کلاسکی ادب ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی کے تنقیدی مضامین کا یہ مجموعہ آزاد کتاب گھر کلاں محل دہلی نے شائع کیا ہے۔ تقطیع $30 \times 20 \frac{1}{2}$ ضخامت ۲۵۶ صفحات۔ کتابت طباعت عمدہ۔ کتاب جلد اور رنگین جلد پوش کی حامل ہے۔ قیمت فی جلد تین روپے آٹھ آنے۔

خواجہ احمد فاروقی دہلی کالج میں شعبۂ اُردو کے صدر تھے۔ حال ہی میں ڈاکٹر بھی ہوگئے ہیں۔ اور دہلی یونیورسٹی میں شعبۂ اُردو کے ریڈر بھی۔ آپ اُردو زبان کے ایک سنجیدہ ادیب کی حیثیت سے بہت اچھی شہرت کے مالک ہیں۔ آپ کے تنقیدی مضامین، ادبی تجسس، پختہ شعور اور شگفتہ بیانی کے آئینہ دار ہیں۔ ہمارے نقادوں میں جہاں فکر کی گیرائی اور مطالعے کی گہرائی ملتی ہے وہاں بیان میں وہ برنائی اور توانائی نہیں ملتی جو اُن کا حصّہ ہونا چاہیئے۔ خشک عبادت آرائی تنقید کے لوازم میں سے ہے۔ پھر بھی جو اس سے بچ سکتے ہیں وہ مغتنم ہیں۔ فاروقی صاحب نثر میں نظم کا لطف پیدا کرتے ہیں۔ ذرا ملاحظہ فرمائیے۔

"جس طرح اُن کی غزل حدیثِ دلبراں سے گزر کر حدیثِ زندگی بن گئی ہے ایسے ہی اُن کے خطوں میں زندگی کا سونا پگھلتا نظر آتا ہے۔" (غالب کی عظمت)

"خودنوشت میں سب سے اہم چیز توازن ہے۔ وہ نہ تو اپنے پندار ہی کا صنم کدہ ہو اور نہ اپنے مخصوص فلسفے ہی کا تذکرہ۔" (ذکرِ میر خودنوشت کی حیثیت سے)

"فسادات شروع ہوگئے اور یہ مجموعہ تلف ہوگیا۔ میرے لئے اس جگرِ لخت لخت کو پھر جمع کرنا بہت مشکل تھا۔ اگر ڈاکٹر ذاکر حسین کا تصرّف شاملِ حال نہ ہوتا، انھوں نے میرے اندر وہ حوصلہ اور عزم پیدا کیا جو پیروں کے تھک جانے کے بعد سینے کے بَل راستہ طے کرنے میں مدد دیتا ہے۔" (مقدمہ)

"لیکن وہ معمولی عورت نہیں ہے۔ اس کا خمیرِ حیات محبت و جرأت سے گوندھا گیا ہے۔ وہ سراسر تہمتِ عشق ہے، جس نے جسم اختیار کرلیا ہے۔" (مرزا شوق کی مثنویاں)

اس مجموعے میں میر کے کلام اور سیرت سے متعلق دو مضمون اور ہیں۔ مومن، ریاض، فانی، اصغر، غالب اور آزردہ۔ واجد علی شاہ اور اُن کی بیگمات کے خطوط ایسے دلچسپ موضوعات پر سلجھے ہوئے تنقیدی مضامین بھی ہیں۔

مختصر تاریخ ادبِ اُردو مصنف، ڈاکٹر اعجاز حسین، الہ آباد یونیورسٹی۔ ضخامت ۵۱۸ صفحات، تقطیع $20 \times 30 \frac{1}{16}$ قیمت مجلد پانچ روپے بارہ آنے۔

ناشر: آزاد کتاب گھر، کلاں محل دہلی

اس کتاب کا پانچواں ایڈیشن ترمیم و اضافے کے بعد شائع ہوا ہے۔ طالب علموں کے لئے یہ کتاب اچھی معلومات پر مشتمل ہے۔ جیسا کہ کتاب کے نام سے ظاہر ہے، یہ ادبِ اُردو کی مختصر تاریخ ہے۔ افراط و تفریط کا عیب کہیں کہیں پایا جاتا ہے۔ اِس کتاب میں اقبال کے لئے

چار اور ناصری کے لئے چھ صفحے وقف کئے گئے ہیں۔ غالباً مؤلف کو مؤخرالذکر سے تعلقِ خاطر ہے۔ اثر لکھنوی ایسے معروف شاعر و نقاد کے لئے صرف دو صفحے اور ایک پروفیسر صاحب کے لئے چار صفحے وقف کئے گئے ہیں۔ بہرحال کتاب طلبا کے لئے معلوماتی حیثیت سے مفید ہے۔ جدید تنقید کے طلبا اس سے مستفید نہیں ہوسکتے۔

گلگونہ ناشر مکتبہ جامعہ دہلی۔ محمد یٰسین تسکین قریشی کے کلام کا مجموعہ نامی پریس لکھنؤ سے چھپا ہے قیمت دو روپے آٹھ آنے۔ جگر مرادآبادی۔ اثر لکھنوی اور آل احمد سرور نے پیش لفظ، جدید تعارف اور سخنہائے گفتنی کے عنوانات سے دیباچے تحریر فرمائے ہیں۔ تسکین زیادہ تر گوشہ نشین شاعر ہیں۔ سرور صاحب لکھتے ہیں: "اُردو کے کس شاعر کو قیدِ حیات و بندِ غم نے اتنی آزادی دی ہے کہ وہ اپنے سوزِ نفس سے ہی اپنی زندگی کو روشن کرسکے۔ تسکین صاحب صرف شاعری کے ہوکر رہ سکتے تو کیا کیا نہ کرتے۔ مگر زندگی کی کشمکش میں بھی اُنھوں نے آدابِ سخن کو جس طرح ملحوظ رکھا اور تغزل کو جس طرح نبھایا وہ بہت کم آدمیوں کے بس کی بات ہے۔ اُن کے لئے یہی تسکین کیا کم ہے؟

انتخابِ کلام ملاحظہ ہو۔

دل اور وہ بھی ٹوٹا ہوا دل — اب زندگی ہے جینے کے قابل
جوشِ جنوں میں کیا کیا ہیں دونوں — کیا گردِ صحرا کیا خاکِ منزل

زندگی تیرے تصور سے الگ رہ نہ سکی — نغمہ کوئی ہو مگر ساز یہی کام آیا

عشق سے پہلے نہ سمجھے تھے خوشی ہوتی ہے کیا
کیوں چمکتے ہیں ستارے چاندنی ہوتی ہے کیا

فطرتِ دل ہی بدل دی تو نے اے تاثیرِ غم
آج یہ محسوس ہوتا ہے خوشی ہوتی ہے کیا

تھی ہمارے اسیر ہونے تک — اب چمن میں وہ بات کیا ہوگی
قیدِ قفس سے رہا کہیں چھٹ سکے گی کیا؟ — ہم ہوں نہ ہوں چمن میں ہماری بہار ہے

ایسے نشتر تسکین کے کلام میں بہت ملتے ہیں۔ تسکین کی شاعری میں ٹھہراؤ ہے لیکن ایسا کہ روانی اور بھی تیز ہوجاتی ہے۔ سنبھلے ہوئے مزاج کی طوفان آفرینیوں کی فراوانی ہے۔ شعر اور وہ بھی شعرتر۔ ریاضت تام یا خونِ جگر صرف کئے بغیر تخلیق نہیں پاسکتا۔ تسکین نے سینکڑوں شعر تر کہے ہیں۔ کتنا خونِ جگر صرف ہوا ہوگا۔ کتنی ریاضت تسکین نے کی ہوگی۔ اس کا اندازہ خود لگائیے۔ گلگونہ اُن سخن سراؤں کے لئے مشعلِ راہ کا کام دے سکتا ہے، جو "کاتا اور لے دوڑی" کی ڈگر پر چل رہے ہیں۔ اُن کے اس قول کے لئے کہ غزل میں کیا رکھا ہے، کلامِ تسکین پیش کرکے یہ کہہ دینا ہی کافی ہے ؎

گر نہ بیند بروز شپرہ چشم — چشمۂ آفتاب را چہ گناہ

نمک پارے سیّد سبطِ حسن نقوی کے چودہ مضامین کا یہ مجموعہ سنگم کتاب گھر، اردو بازار دہلی نے شائع کیا ہے۔ قیمت دو روپے آٹھ آنے فی جلد۔ نقوی صاحب "لائٹ لٹریچر" لکھنے والوں میں اچھی شہرت کے مالک ہیں۔ ان مضامین میں سے بیشتر "آج کل"، "نئی روشنی" اور "بیسویں صدی" میں شائع ہوچکے ہیں۔ نقوی صاحب کے شگفتہ مزاج کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ مجموعے کی ابتدا "الائچی کی پُڑیا" اور انتہا غزارے سے ہوئی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ بیچ میں ابّا جان کی کھیتی، ہمارے میر صاحب اور نہ جانے کیا کیا کچھ موجود ہے۔ ہمیں اُمید ہے کہ یہ مجموعہ مقبول ہوگا۔ سیّد عابد حسین نے دُعا کی ہے کہ خدا اُنھیں زود نویسی اور پُر نویسی سے محفوظ رکھے، ہم اس میں زود طبعی کا اضافہ کردیں تو بے جا نہیں ہوگا۔

پنجاہ سالہ تاریخ انجمن ترقی اُردو مُرتّبہ سیّد ہاشمی فرید آبادی۔ قیمت تین روپے آٹھ آنے۔ کتاب ٹائپ میں چھپی ہے۔ حسین و جمیل جلد سے

مُزیّن ہے۔ کاغذ عمدہ۔ تصاویر کی حامل بھی ہے ۳۶×۲۲/۱۶ کے ۳۱۲ صفحوں پر مشتمل ہے۔ ۱۹۴۷ء کے بعد انجمن سے متعلق بہت سی باتیں ایسی بیان کی گئی ہیں جو غلط فہمی پھیلانے کا موجب ہیں۔ پہلے حصّے میں انجمن کی تاریخ وضاحت سے درج ہے۔ لیکن اس میں بھی جہاں اُردو کی حمایت مقصود ہے وہاں دوسری زبانوں سے متعلق خواہ مخواہ معاندانہ لہجہ اختیار کیا گیا ہے۔ ملنے کا پتہ۔ انجمن ترقیِ اردو پاکستان

تاریخ مسلمانانِ پاکستان و بھارت مؤلف سیّد ہاشمی فرید آبادی
جلد دوم قیمت آٹھ روپے آٹھ آنے۔ کتابت۔ طباعت کاغذ۔ جلد عمدہ۔ ضخامت ۳۶×۲۲/۱۶ کے ۶۵۶ صفحے۔ تاریخی حیثیت سے اِس کتاب کی افادیت میں کوئی شبہ نہیں۔ لیکن ہندی اردو کا مسئلہ چھڑا ہے تو لہجہ تلخ ہوگیا ہے۔ اور تقسیم ملک کے بعد فسادات وغیرہ کا ذکر آیا ہے تو ایک طرفہ الزام تراشی نے کتاب کی سنجیدگی کو زائل کردیا ہے۔

تلخیص الاردو انجمن ترقیِ اُردو کے سہ ماہی رسالے 'اردو' کے دس سالہ پرچوں سے بہترین مضامین کا انتخاب ۴۱۶ صفحوں پر مشتمل کتاب میں شائع ہوا ہے۔ مرتّب سیّد ہاشمی فرید آبادی۔ ملنے کا پتہ۔ انجمن ترقیِ اردو پاکستان اردو روڈ۔ کراچی۔ قیمت پانچ روپے آٹھ آنے۔ یہ انتخابِ مضامین ہر لائبریری کی زینت ہونا چاہیئے۔ مولوی وحیدالدین سلیم۔ علاّمہ محمود شیرانی۔ ڈاکٹر مولوی عبدالحق، اور اُردو کے بڑے بڑے ادیبوں کے مضامین اس مجموعے میں شامل ہیں۔

موصولات

سچ کا پجاری۔ مصنّف پرکاش پنڈت۔ چاند پبلی کیشنز محمد علی روڈ ناگ پور۔ قیمت بارہ آنے۔ ضخامت ۶۴ صفحے۔ بچّوں کے لئے گاندھی جی کے حالات پر مشتمل ایک کتابچہ۔

مسدّسِ رنگین مُرتّبہ تحسین سروری۔ شائع کردہ، ادارۂ ترقیِ ادب لارنس روڈ کراچی۔ مرزا سعادت یار خاں رنگین کی مثنوی۔ قیمت ۸ر ضخامت ۴۸ صفحات۔

نوائے نیم شب حضرت نواب غازی آف گورداسپور کی دُعائیہ نظموں کا مجموعہ۔ باہتمام منیجر الفاروق پریس۔ کامٹی۔ مدھیہ پردیش شائع ہوا ہے۔ قیمت آٹھ آنے۔

خروشِ عشق مصنّف خان غازی کابلی۔ ناشر۔ عوامی کتاب گھر کٹرہ بابر بیگ لال کنواں دہلی مجموعۂ نظم متعلقہ پختونستان۔ ضخامت ۳۲ صفحات۔ قیمت کتاب پر درج نہیں۔

رسالے

علی گڑھ میگزین طنز و ظرافت نمبر۔ مُرتّب، ظہیر احمد صدیقی قیمت تین روپے۔ بڑی تقطیع کے ۲۷۶ صفحوں پر مشتمل یہ رسالہ حال ہی میں شائع ہوا ہے۔ رشید احمد صدیقی، شوکت سبزواری، قاضی عبدالودود۔ کشن پرشاد کول، سلطان حیدر جوش۔ علی عباس حسینی۔ غلام احمد فرقت اور بہت سے اچھے مضمون نگاروں اور ادیبوں کے مضامین اس شمارے میں شامل ہیں۔ یہ شمارہ بھی جامعیت کے لحاظ سے علی گڑھ میگزین کے سابق شماروں کی روایات کو پورا کرتا ہے۔

شاعر خاص نمبر سنہ ۱۹۵۳۔ ملنے کا پتہ۔ مکتبۂ قصرالادب پوسٹ بکس ۵۲۶ بمبئی ۸۔ قیمت ایک روپیہ زرِ سالانہ چھ روپے۔

اعجاز صدیقی علاّمہ سیماب اکبرآبادی مرحوم کے صاحب زادے اور جواں ہمت ادیب و شاعر ہیں۔

مشکلاتِ زمانہ سے دو چار ہوتے ہوئے بھی خدمتِ ادب سے نہیں گھبرائے ۔ یہ خاص نمبر بھی آپ کی سخت کوشی اور سخت جانی کا ثبوت ہے ۔ نظمیں ، مقالات ، غزلیں اور افسانے ، ہندوستان بھر کے شاعروں ، ادیبوں اور افسانہ نگاروں سے حاصل کرکے اس شمارے میں شامل کی گئی ہیں ۔ جوش ، فراق ، وجد ، جاں نثار اختر ، کرشن چندر ، خواجہ احمد عبّاس ، جمیل مہدی ، شکیل الرحمٰن ، مسیح الزماں ، کوثر چاندپوری اور کتنے ہی ادیب اس شمارے میں نظر آئیں گے ۔ اعجاز صاحب نے اپنے ادبی سفر کے حالات نہایت ہی دلکش پیرائے میں درج کئے ہیں ۔ بھوپال کے ادب دوست اور ادیب حضرات کا ذکر نہایت دلچسپ ہے ۔ ان میں جانے پہچانے چہرے ہمیں ہوبہو نظر آئے ۔ کوثر ، شفا ، محبوب ، ممنون ، سنگر ، عشرت قادری ، شعری اور ممنون کے ساتھ ہی نگم ۔ ہمیں اُمّید ہے یہ شمارہ ہاتھوں ہاتھ بکے گا ، اور یوں بھی شاعر کی سرپرستی سے اہلِ ادب مدیر رسالہ کی ہمّت افزائی فرمائیں گے ۔

تعلیم و ترقی نمبر ۔ تعلیم و ترقی جامعہ ملیّہ کا ماہانہ رسالہ ہے ۔ شفیق الرحمٰن قدوائی مرحوم دہلی اسٹیٹ کے ہردل عزیز وزیر تعلیم تھے ۔ جامعہ ملیہ سے اُن کا بہت پُرانا اور گہرا تعلق تھا ۔ جامعہ کی خدمت میں اُنھوں نے اپنی زندگی گزار دی ۔ ملک کی خدمت میں وہ پیش پیش رہے ۔ قید و بند کی مصیبتیں سہیں ۔ ریشم اور کمخواب کو چھوڑکر کھدر زیبِ تن کیا ۔ ہمیشہ خنداں جبیں رہے ۔ مصیبتیں زیادہ برداشت کیں ۔ اور فراغت کے دن کم دیکھے ۔ یہ نمبر مرحوم کی شخصیت کے باب میں بہت اچھی معلومات کا حامل ہے ۔ مرحوم اس ماہ نامے کے بانی تھے اور اور پروفیسر محمد مجیب نگراں ہیں ۔ اس نمبر کی قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے ہے ۔ ماہ نامے کا سالانہ چندہ چار روپے ہے ۔ منیجر ادارۂ تعلیم و ترقی مٹیا محل دہلی کے پتے سے مل سکتا ہے ۔

سرفراز محرّم نمبر ۔ قیمت ایک روپیہ چار آنے ۔ سرفراز ملنے کا پتہ ۔ منیجر اخبار سرفراز لکھنؤ

سیّد الشہداء حضرت امام حسینؑ کی شہادت انسانی سیرت کی وہ معراج ہے جسے تصوّر میں لانا بھی مشکل ہے ۔ ہر سال محرّم آتا ہے اور ہر سال اس یاد کو تازہ کرنے کے لئے سرفراز کا محرّم نمبر ماتمی لباس میں یہ اہتمام تام شائع ہوتا ہے ۔ یہ نمبر بھی سابق روایات کا حامل ہے ۔

انیس محرّم نمبر ۔ حیدرآباد دکن ۔ اس خصوصی نمبر کی قیمت ایک روپیہ ہے ۔ شہادتِ حسینؑ سے متعلق معیاری مضامین اور نظمیں اس شمارے کی زینت ہیں ۔

اسرار احمد آزاد دہلی کے مشہور صحافی **چہار و جہد** ہیں ۔ آپ نے جد و جہد کے نام سے ایک سنجیدہ ہفتہ وار اخبار جاری کیا ہے ۔ جس کے متعدد شمارے اہلِ نظر سے داد و تحسین حاصل کرچکے ہیں ۔ صحافت میں ایک قسم کی عام بد مذاقی کے اِس دَور میں ایک سنجیدہ ہفت روزہ کا قائم رہنا ذرا مشکل نظر آتا ہے ۔ لیکن آزاد صاحب جس تن دہی اور جانفشانی سے یہ اخبار نکال رہے ہیں اُس سے ظاہر ہے کہ یہ اخبار سخت جانی کا پورا ثبوت دے گا ۔ اخبار میں سیاسی اور ادبی موضوعات پر اچھے مضامین شائع ہوتے ہیں ۔ عالمی سیاست کے باب میں اچھی معلومات ملتی ہیں ۔ ہمیں اُمّید ہے کہ سنجیدہ مزاج اہلِ ذوق اس اخبار اور مُدیر اخبار کی ہمّت افزائی فرمائیں گے ۔ سالانہ چندہ دس روپے ۔ ملنے کا پتہ ۔ منیجر جد و جہد ہفتہ وار احاطہ کالے صاحب گلی قاسم جان دہلی

رفتارِ زمانہ

بھارت اور کشمیر کا اٹوٹ رشتہ

سری نگر سے ۳۴ میل دُور ایک قصبے میں نیشنل کانفرنس کے کارکنوں کو خطاب کرتے ہوئے ریاست جمّوں وکشمیر کے وزیراعظم بخشی غلام محمد نے کہا کہ کشمیر بھارت کے ساتھ شامل ہو چکا ہے اور یہ فیصلہ کافی غور و خوض کے بعد کیا گیا ہے اس لئے اب اس فیصلے کو بدلنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا بخشی صاحب نے بتایا کہ ہمیں اس امر کا خیال رکھنا چاہیئے کہ کشمیر کا ترقی پسند سیاسی نصب العین بھارت کے ساتھ رہنے سے پورا ہو سکتا ہے۔ اور بھارت کے ساتھ شامل ہونے کے بعد سے ہمیں سیاسی اور اقتصادی طور پر بہت فائدہ حاصل ہُوا ہے۔ پاکستان کا ذکر کرتے ہوئے بخشی صاحب نے کہا کہ پاکستان کے لیڈر کشمیر کو اس لئے پاکستان کے ساتھ شامل کرنا چاہتے ہیں کہ کشمیر میں اکثریت مسلمانوں کی ہے۔ لیکن اس قسم کا مذہبی پراپیگنڈا کشمیریوں پر اثر پذیر نہیں ہو سکتا۔ مغربی پاکستان میں مسلمانوں کی آبادی صرف اڑھائی کروڑ ہے۔ جب کہ بھارت میں چار کروڑ سے زیادہ مسلمان بستے ہیں۔ جنہیں اکثریت کے افراد کی طرح ہی ترقی کے تمام مواقع حاصل ہیں۔ باقی رہا مشرقی پاکستان، تو اُس کا کشمیر سے کوئی تعلق نہیں کیونکہ وہ صوبہ کشمیر سے دو ہزار میل کے فاصلے پر ہے۔

کوریا میں بھارتی افواج کی سراہنا

امریکہ کے مشہور اخبار نیویارک ٹائمز نے کوریا میں مقیم بھارتی محافظ افواج کی تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے کہ وہ اپنے کام کو نہایت خوش اسلوبی سے انجام دے رہی ہیں۔ آغاز میں کچھ لوگوں کے دل میں بھارت کی محافظ افواج کے بارے میں جو شکوک تھے وہ اب ختم ہو گئے ہیں۔ اور اُس کا سارا سہرا بھارتی فوج اور اُس کے افسروں پر ہے۔ جنھوں نے اپنے حسنِ سلوک سے سب کو مداح بنا لیا ہے۔

پاکستانی دستور پر انڈونیشیا کے اخبار کا تبصرہ

انڈونیشیا کے مشہور انگریزی روزنامے ٹائمز آف انڈونیشیا نے اپنے ایک مضمون میں پاکستان آئین ساز اسمبلی کے اس فیصلے پر زوردار اور سخت لہجے میں نکتہ چینی کی ہے جس میں پاکستان کو ایک اسلامی حکومت قائم کرنے کا اعلان کیا گیا ہے۔ پاکستان کی اقلیتوں کے متعلق تشویش کا اظہار کرتے ہوئے اخبار مذکور نے لکھا ہے کہ اس فیصلے سے پاکستان کی اقلیتوں کی حیثیت دوسرے درجے کے شہریوں کی سی ہو گئی ہے۔ اقلیتوں کے تئیں یہ ایک سیاسی ظلم ہے جس کا موازنہ جنوبی افریقہ میں ملان کی نسلی امتیاز کی پالیسی سے کیا جا سکتا ہے۔ ترکی کی متعدد سیاسی پارٹیوں نے بھی اسی انداز میں حکومت پاکستان کے اس فیصلے پر نکتہ چینی کی ہے جن میں موجودہ حکمران ڈیموکریٹک پارٹی اور پیپلز ریپبلکن پارٹی کا نام قابلِ ذکر ہے۔ ریپبلکن پارٹی کے سیکرٹری جنرل نے ایک بیان میں کہا ہے کہ مذہبی حکومت کے طور پر پاکستان کی موجودہ دنیا میں کوئی جگہ نہیں۔ پاکستان وہی حیثیت حاصل کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ جس سے ہم نے پانچ سو سال کی کوشش کے بعد چھٹکارا حاصل کیا ہے۔

مسئلۂ خوراک

کھیتی باڑی اور خوراک کے ماہرین نے یہ رائے ظاہر کی ہے کہ ملک میں آبپاشی کے ذرائع میں بہت زیادہ ترقی ہونے والی ہے۔ ملک کی اسّی کروڑ ایکڑ زمین میں سے ابھی تک ۳۲ کروڑ ایکڑ زمین ہی میں کاشت ہوتی ہے، جب کہ آب رسانی کا فایدہ صرف پانچ کروڑ ایکڑ زمین کو پہنچتا ہے۔ قیاس ہے کہ باقی ماندہ ۴۸ کروڑ ایکڑ زمین میں سے کم از کم ۲۴ کروڑ ایکڑ زمین کو قابلِ کاشت بنایا جا سکتا ہے۔ یہ بھی اندازہ لگایا گیا ہے کہ آئندہ بیس سال میں مزید دس کروڑ ایکڑ زمین کو آبپاشی کے قابل بنا دیا جائے گا۔

ڈاکٹر جگن چھیدی کی اپیل

برٹش گائنا کے معزول شدہ وزیراعظم ڈاکٹر جگن چھیدی نے نئی دہلی میں بھارت پارلیمنٹ کے ممبروں کے سامنے تقریر کرتے ہوئے کہا کہ "برٹش گائنا میں کمیونزم یا نیشنلزم کا کوئی مسئلہ نہیں، وہاں کا مسئلہ تو یہ ہے کہ عوام کو اپنی مرضی اور خواہش کے مطابق ووٹ دینے کا حق حاصل ہونا چاہیئے۔"

ڈاکٹر صاحب نے بتایا۔ کہ ہم برٹش گائنا میں بھارت کا یوم آزادی مناتے ہیں، کیونکہ یہ ہمارے لئے مشعلِ راہ بن گیا ہے۔ اور وہ ہم کو یہ سبق دیتا ہے۔ کہ ایک نہ ایک دن ہر نوآبادیاتی نظام والا دلیشس آزاد ہوگا۔ آخر میں آپ نے پارلیمنٹ کے ممبروں سے جمہوریت اور تہذیب کے نام پر اپیل کی۔ کہ وہ اُن کے اس مقصد کی حمایت کریں۔

انصاف مفت ملنا چاہیئے

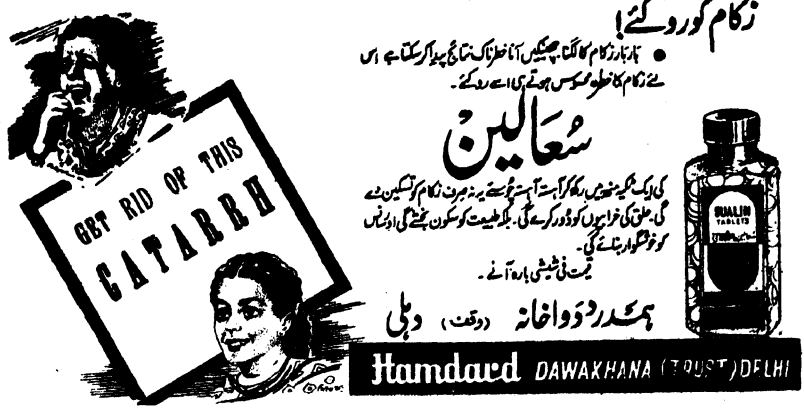
بھارت کے ہوم منسٹر ڈاکٹر کیلاش ناتھ کاٹجو نے ایک یادداشت صوبائی حکومتوں اور ہائی کورٹوں کو روانہ کی ہے جس میں انھوں نے اس سلسلے میں ٹھوس تجاویز پیش کی ہیں کہ بھارت کی عدالتوں میں فیس میں کافی کمی کی جائے۔ آپ نے یادداشت میں لکھا ہے کہ انصاف ہر شخص کو مفت ملنا چاہیئے۔ اور اگر صوبائی حکومتیں کچھ فیس بھی لینا چاہیں تو وہ بہت ہی معمولی ہونی چاہیئے۔

گوپی ناتھ امن وزارت میں

اُردو کے مشہور صحافی اور شاعر اور دہلی اسمبلی کے ڈپٹی سپیکر شری گوپی ناتھ امن دہلی اسٹیٹ میں وزیر مقرر ہو گئے ہیں۔ آپ نے ۲۶ نومبر ۱۹۵۳ء کو حلف وفاداری لیا۔ آپ کے مضامین آج کل میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ آپ کا مجموعۂ نظم "کاروان و منزل" حال ہی میں منظرِ عام پر آیا تھا۔

بھودان تحریک کی مقبولیت

آچاریہ ونوبا بھاوے کی بھودان کی تحریک تبدیریج ہر دل عزیز ہوتی جا رہی ہے اور یہی ایک ایسی تحریک ہے جس کی تمام سیاسی پارٹیوں نے ایک آواز سے حمایت کی ہے۔ مشہور سوشلسٹ لیڈر شری جے پرکاش نارائن نے بریلی میں کسانوں کے ایک جلسے میں تقریر کرتے ہوئے عوام کو بھودان تحریک کی حمایت کرنے کے لئے ذور دیا۔ اس موقعہ پر چوباری گھاٹ کے لوگوں نے ۱۲۵ بیگھے زمین اور ایک جوڑی بیل شری جے پرکاش نارائن کو بھودان بگیہ کے لئے دیئے





یحییٰ اعظمی

احمد اور جگنو

کل رات فضا میں ایک جگنو
احمد کے قریب آ کے چمکا

روشن کیڑا نظر جو آیا
بچّے نے اُسے لپک کے پکڑا

دامن میں اُسے چھپا لیا جب
حیرت سے اس سے یُوں وہ بولا

ننھّے کیڑے یہ راز کیا ہے؟
تیرے اندر یہ نُور کیسا

روشن ہے اندھیری رات تجھ سے
کیڑا ہے اگرچہ تو ذرا سا

روشن کیڑے بتا مجھے بھی
کس نے تجھے یہ فروغ بخشا

کس نے تجھے یہ چمک دمک دی
روشن تجھے اِس قدر بنایا

ننھّا کیڑا اور ایسا روشن
قدرت کا ہے یہ عجب تماشا

بولا کیڑا کہ پیارے بچّے!
فطرت کا ہے فیض میرا جلوا

قدرت نے مجھے یہ روشنی دی
چمکا کے مجھے دیا بنایا

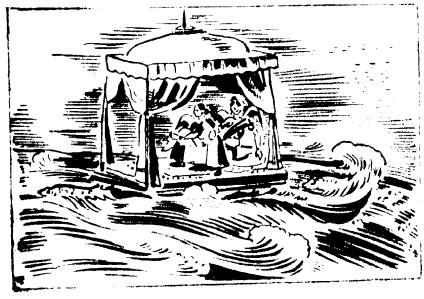
یُوں ہی فطرت ہے جن کی روشن
دُنیا میں اُنھیں سے ہے اُجالا

شہلا جمال

پری سے پھول

بہت پرانے زمانے کی بات ہے کہ کسی ملک میں ایک بہت بڑا سمندر تھا۔ اُس سمندر کے بادشاہ کی بہت سی بیٹیاں تھیں۔ وہ سب سمندر کے نیچے غاروں میں رہا کرتی تھیں۔ اُن کا سر اور سینہ پری کا تھا اور باقی دھڑ مچھلی کا تھا۔ اور اُن کی دُموں میں ہیرے اور موتی جڑے ہُوئے تھے۔ وہ سب کی سب پریاں بے حد حسین تھیں۔ اُن کے بال لمبے اور سنہری تھے۔ اور اُن کا لباس سمندری گھاس اور بیلوں کا بنا ہُوا تھا۔ جن غاروں میں وہ رہا کرتی تھیں اُن کی دیواروں میں سیپ اور موتی جڑے ہُوئے تھے۔ اور فرش پر سفید اور چمکدار ریت بچھی ہوئی تھی۔

ہر ایک پری کے پاس سیپ کی بنی ہوئی نہایت ہی خوبصورت گاڑی تھی۔ جس میں گھوڑوں کی جگہ سنہری مچھلیاں جُتی ہوئی تھیں پریاں جب کہیں جانا چاہتیں تو اُن گاڑیوں میں سوار ہو جاتیں۔ اور یہ مچھلیاں انھیں اُسی جگہ پہنچا دیتی تھیں۔ یہ سب پریاں خوش خوش



رہا کرتی تھیں۔ بھلا انھیں غم کس بات کا۔ دن بھر تو سمندر کی تہ میں کبھی سمندری ناچ ناچتیں، کبھی آنکھ مچولی کھیلتیں اور کبھی سیپ کی گاڑیوں میں بیٹھ کر ننھے مُنّے سمندری جانوروں کا شکار کھیلتی رہتیں۔ رات کو سمندر کے سبز پانی سے باہر نکل آتیں۔ سمندر کے کنارے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر سمندری ناچ ناچتیں۔ پَو پھٹتے ہی وہ اپنی گاڑیوں میں سوار ہو جاتیں اور سنہری مچھلیاں اُنھیں اُن کے غاروں میں واپس لے آتیں۔ اُن پریوں نے سورج کو کبھی نہیں دیکھا تھا۔

ایک دفعہ چاندنی رات میں یہ سب پریاں سمندر کے کنارے ناچتی رہیں۔ جب صبح ہونے کو آئی تو سب پریاں اپنی اپنی گاڑیوں میں سوار ہو کر سمندر میں لوٹ آئیں۔ مگر ایک پری جو سب سے چھوٹی تھی وہیں سمندر کے کنارے ایک چٹان کے پاس کھڑی رہی۔ اُن کی بہنوں نے اُسے چلنے کو کہا لیکن اُس نے ایک بھی نہ سُنی اور بولی

"میں یہ دیکھنا چاہتی ہوں کہ جب چاند اور ستارے غائب ہو جاتے ہیں، رات کا اندھیرا دُور ہو جاتا ہے تو اُس کے بعد کیا ہوتا ہے۔"

تھوڑی دیر بعد اُس پری کو مشرق کی طرف سے بڑی



سُہانی روشنی نظر آئی۔ اُس نے اس قسم کی روشنی پہلے کبھی نہ دیکھی تھی۔ وہ بہت حیران ہوئی اُس کے بعد کیا دیکھتی ہے کہ آسمان پر مشرق کی طرف سے ایک سنہری رتھ چلی آ رہی ہے۔ جس کے آگے دو سفید چمکدار گھوڑے جُتے ہوئے ہیں اور اُس رتھ میں ایک نہایت حسین شخص بادشاہوں کا سا لباس پہنے بیٹھا ہے۔



یہ نظارہ دیکھ کر پری کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا اور وہ کہنے لگی۔

"اے کاش! یہ بادشاہ مجھے بھی اپنی رتھ میں بٹھالے تاکہ میں بھی آسمان کی سیر کروں"۔

لیکن سورج بادشاہ نے اُس کی طرف دیکھا تک نہیں۔ اُس کی رتھ آگے گذر گئی اور پری بے حد غمگین ہوگئی اور اُس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

پوری دن بھر اُس بادشاہ کی رتھ کو دیکھتی رہی اور رتھ آہستہ آہستہ سارے آسمان کو طے کرکے مغرب میں پہنچ گئی اور وہاں غائب ہوگئی۔ اس کے غائب ہوتے ہی اندھیرا ہونا شروع ہوگیا۔ تھوڑی دیر میں جب ہر طرف اندھیرا چھا گیا۔ چاند ستارے نکل آئے تو اس کی بہنیں سمندر سے باہر نکلیں اور سمندر کے کنارے ناچنے لگیں۔ مگر وہ اپنی جگہ سے نہ ہلی۔ جب رات جا چکی۔ آسمان پر ستارے غائب ہونے شروع ہوئے تو سب جل پریاں سمندر میں لوٹنے لگیں لیکن وہ اب بھی اُن کے ساتھ نہ گئی۔ اُس نے انھیں سنہری رتھ والے بادشاہ کا سب حال سنایا اور کہا "جب تک وہ بادشاہ مجھے اپنی رتھ پر سیر نہ کرائے گا۔ تب تک میں اپنی جگہ سے نہ ہلوں گی۔

ہر روز صبح کو سورج بادشاہ کی رتھ مشرق سے نکلتی اور شام کو مغرب میں جا کر غائب ہو جاتی۔ مگر بادشاہ اُس کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہ دیکھتا تھا۔ دن یونہیں گزرتے جاتے تھے۔ جل پری غم سے سوکھ کر کانٹا ہوئی جاتی تھی۔ مگر اس اُمید میں کہ کبھی نہ کبھی تو بادشاہ میری طرف دیکھے گا ہی، وہ اپنی جگہ سے ایک قدم بھی نہ ہٹتی تھی۔

ایک دن اُسے خیال آیا کہ شاید میں ایسی جگہ کھڑی ہوں۔ جہاں سے بادشاہ کو نظر نہیں آسکتی۔ اس لئے یہاں سے چل کر کسی اونچی جگہ جا کر کھڑی ہو جاؤں تو کیا عجب وہ مجھے دیکھ لے۔ یہ سوچ کر جل پری نے وہاں سے چلنا چاہا مگر کافی مدت تک ایک ہی جگہ کھڑے رہنے سے اُس کے پاؤں زمین میں گڑ گئے تھے اور وہ ایک قدم بھی نہ چل سکتی تھی۔ دیکھتے اُس کا جسم ایک ٹہنی کی شکل میں تبدیل ہوگیا تھا اور چہرہ ایک خوبصورت پھول بن گیا تھا۔ اُس پھول کی پنکھڑیاں ایسی ہی سنہری تھیں جیسے اُس جل پری کے بال۔

جب سورج بادشاہ اپنی رتھ میں سوار ہو کر آسمان کا سفر طے کرتا تو یہ سنہری پھول اُس کی طرف منہ پھیر لیتا اور بڑی حسرت سے اُسے تکتا رہتا۔

اُس شہر کے لوگوں نے جب اُس نئے اور عجیب و غریب پھول کو دیکھا تو بہت حیران ہوئے اور اُسے "سورج مکھی" کا پھول کہنے لگے۔

مظفر زیدی

سوچنے کی عادت



پیارے بچّو! تمہاری کیا عمر ہے مجھے نہیں معلوم تم پانچ برس کے ہو شاید سات برس تمہاری عمر ہو یا شاید تم نے کل ہی اپنی دسویں سالگرہ منائی ہو بہر حال مجھے نہیں معلوم تم اپنی عمر کے کتنے ننھّے مُنّے سال گزار چکے ہو مَیں تم میں سے ہر ایک کو اپنے چاروں طرف دیکھ رہا ہوں - پانچ سے لے کر بارہ سال تک کے بچّے میرے ارد گرد جمع ہیں اور انھیں سے میں آج کچھ ان کے دل کی باتیں کہنا چاہتا ہوں -

جیسے ہم سب تمہارے گھر کے آنگن میں جمع ہیں وہاں چند سایہ دار پھولوں سے لدے ہوئے درخت ہیں ان درختوں کی مہک تمہارے دماغ کو معطّر کر رہی ہے اور ان کے سایے کے ہلکوروں میں تمھیں جیسے نیند آنے لگتی ہے ان کی لچکتی ہوئی شاخیں بڑھ بڑھ کر تمہارے ننھّے مُنّے گالوں کو پیار کرتی ہیں - صحن کے بیچ میں پتّھروں کا ایک ڈھیر ہے تم میں سے کوئی بڑھ کر چند پتّھر اُٹھاتا ہے ان کو الٹ پلٹ کر دیکھتا ہے - دو چار چکنے خُوب صُورت پتّھر اپنی جیب میں رکھ لیتا ہے - یہ سب تمہارے لئے کام کی چیزیں ہیں جیسے رہنے کے لئے گھر پھل پھول اور سایے کے لئے درخت - اسی طرح کھیلنے کے لئے پتّھر غرض ان تمام چیزوں سے تمہاری دُنیا بنتی ہے - یہ کوئی تعجّب کی بات نہیں - ایسا سوچنا تمہارے لئے قدرتی چیز ہے - سوچو - کیا تمھیں بھی ایسا محسوس نہیں ہوتا - کہ یہ ساری دنیا تمہارے دل بہلاوے کی چیز ہے - اور صرف تمھیں اس دنیا کے مرکز ہو - تمہارے ہی لئے گویا یہ ساری چیزیں پیدا ہوئی ہیں - یہ سن کر تمہیں حیرت نہ ہونی چاہئے کہ جو کچھ تمہارے ننھّے سے دل میں ہے وہ سچ ہے اور سَو فیصدی سچ ہے -

رات آتی ہے تم سوچتے ہو سو رہنے کا وقت آ گیا - چاند ستارے تمہارے خیال میں تم سے نظر لڑاتے ہیں - تمھیں گھورتے ہیں اور تم انھیں خیالات میں کھوئے رہتے ہو - تم سوچتے

ہو یہ سورج چاند آسمان میں جڑے ہوئے ہیں اور جب یہ روشن ہوتے ہیں - تو ساری دنیا روشن ہو جاتی ہے یہ ستارے موسم کا حال بتلاتے ہیں - پتھر - مٹی سوکھی پتیاں اور سیپیاں سب ہی کھیل کی چیزیں ہیں -

تمھارا خیال ہوگا کہ ان تمام چیزوں میں اس طرح زندگی ہے جس طرح تم میں - تم میں سے کوئی سوچتا ہے پتھر تو آدمیوں کی طرح جوان ہو کر بوڑھے ہوتے ہیں اور پھر مر جاتے ہیں - یا کوئی پتھر کو اپنا سا سمجھ کر ایک اونچی جگہ پر رکھتا ہے تاکہ وہ وہاں سے اپنے چاروں طرف کی سیر کر سکے - تم میں سے کوئی بچّہ پھول کے پودوں کو اس لئے پاس پاس لگاتا ہے تاکہ وہ اکیلے نہ رہیں اور ان کا جی نہ گھبرائے کس بچّے کا خیال ہوگا کہ دریا جو اتنی تیزی سے بہتا ہے تو یقیناً اس میں جان ہوگی - تم درختوں کے نام رکھتے ہوئے اُن کے بارے میں اسی ڈھنگ سے بات چیت کرتے ہو جیسے یہ انسان ہیں - پانی ہوا اور آگ تمھارے لئے بُرے یا بھلے اس وقت بن جاتے ہیں جب یہ تمھارے راستے میں رکاوٹ پیدا کرتے ہیں یا جب تمھیں ان سے آرام ملتا ہے مثلاً تم کھیلنے کے لئے باہر جاتے ہو اور بارش شروع ہو جاتے اس وقت تم پانی کو بہت بُری چیز سمجھوگے - اسی طرح سردی کے دنوں میں دادی اماں رات کو تم سے کہانی کہتے جا رہی ہوں اور اس وقت ایک آگ سے بھری انگیٹھی تمھارے پاس رکھ دی جائے تو اس وقت آگ تمھارے لئے ایک بہت اچھی چیز ہوگی - اس طرح قدم قدم پر اپنی سہولت کے لحاظ سے تم چیزوں کو اچھا بُرا خیال کرتے ہو -

بہت سی ایسی چیزیں بھی تمھارے سامنے آتی ہیں جن سے تمھارے ننھے مُنّے دماغوں میں سوالات پیدا ہوتے ہیں - مثلاً بارش کیسے ہوتی ہے ؟ سُورج کو کون چلاتا ہے ؟ سورج چاند اور تارے یہ سب آسمان



پر کس چیز کے سہارے رکھے ہوئے ہیں ؟ پینے کا پانی زمین سے کس طرح پیدا ہوتا ہے ؟ بیج پھول اور پھل کس طرح بن جاتے ہیں ؟ بہت سے بچّوں کی عادت ہے کہ جس چیز کو وہ سمجھ نہیں سکتے اسے وہ جادو سمجھنے لگتے ہیں - بعض بچّوں کے ماں باپ صرف یہ کہہ کر اُنھیں سمجھا دیتے ہیں کہ سب چیزیں بھگوان یا خدا کی بنائی ہوئی ہیں - اور وہ ہی ان کا انتظام کرتا ہے لیکن ان سب سے الگ کچھ بچّے ایسے بھی ہیں جو ان سب باتوں کا جواب عقل کے سہارے جاننے کے لئے

بے تاب رہتے ہیں۔ اور اگر کوئی شخص انہیں ایسا نہیں ملتا جو ان کے سوالوں کا جواب عقل کے مطابق دے سکے تو وہ خیالی پلاؤ پکاتے رہتے ہیں کہ شاید میرے اس سوال کا جواب یہ ہو۔ غرض ان میں سوچنے کی عادت پیدا ہو جاتی ہے۔ اسی طرح ایک لڑکی جو سوچنے کی عادی تھی یہ کہتی سُنی گئی کہ "میں تو بادلوں کو روئی کے گالے سمجھتی تھی لیکن اب مجھے معلوم ہوا کہ پانی سے جو بھاپ اٹھتی ہے اسی سے بادل بنتے ہیں"۔ اسی طرح ایک چھوٹے بچے کو یہ کہتے سُنا گیا کہ یہ بادل تو وہ دُھواں ہے جو بجلی کے چمکنے کے بعد اس سے پیدا ہوتا ہے۔ اور آسمان کے اندر بہت سے سوراخ ہیں جن سے پانی چھنتا ہے اور یہی بارش ہے۔ یا آسمان پر بہت سے جھونپڑے ہیں رات کے وقت جب وہاں چراغ جلتے ہیں تو وہ زمین پر ستارے دکھائی دیتے ہیں۔

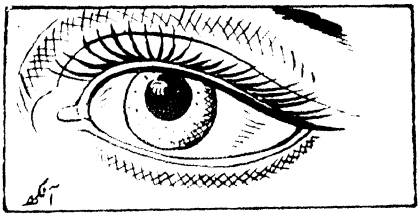
غرض اس قسم کی بہت سی باتیں تم لوگ سوچتے اور کہتے رہتے ہو یہ سب سوچ بچار کیوں اور کیسے پیدا ہوتے ہیں۔ یاد رکھو اس سوچ بچار کی عادت سے ایک روز تمہارے دماغ بہت ترقی کر جائیں گے۔ اور تم میں سے بہت سے لوگ سائنس دان، سیاست دان، بڑے شاعر اور بڑے ادیب اور قوم کے خدمت گزار بن جائیں گے۔

اُستاد۔ "جانتے ہو برف کیا چیز ہے"؟

شاگرد۔ "جی ہاں سوئے ہوئے پانی کو برف کہتے ہیں"۔

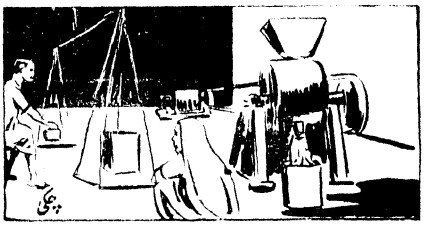
پہیلیاں

آوے تو اندھیری لاوے — جاوے تو سب کچھ لے جاوے
کیا جانوں وہ کیسی ہے — جیسی دیکھو ویسی ہے



آنکھ

اِک ناری کے ہیں دو بالک — دونوں ایک ہی رنگ
اِک پھرے اِک ٹھارا رہے — پھر بھی دونوں سنگ



چکی

جا گھر لال بلیسا جائے — تا گھر ہیں دند چبائے
لاکھن من پانی پی جائے — دھر ڈھکا سب گھر کا کھائے



آگ

سلیم مُبشّر علی

اندھیر نگری چوپٹ راجہ

پُرانے زمانے کا ذکر ہے کہ دو دوست سفر کو نکلے۔ ایک کا نام منیر تھا اور دوسرے کا رحیم چلتے چلتے ایک شہر میں پہنچے۔ دیکھا کہ چیزوں کا نرخ بہت سستا ہے۔ روٹی۔ دال۔ گھی سب ایک ہی بھاؤ۔ منیر تو خوش ہوئے کہ خوب کھا پی کر موٹے ہوں گے۔ لیکن رحیم نے کہا کہ بھائی یہاں ٹھہرنا ٹھیک نہیں۔ کیوں کہ یہاں ناانصافی بہت ہوتی ہے۔ مگر منیر نہ مانا۔ آخرکار ایک سرائے میں کمرہ کرایہ پر لے کر رہنے لگے۔

ایک دن منیر اور رحیم دونوں شہر کو دیکھنے نکلے یکایک شاہی دربار کے پاس آپہنچے۔ دیکھتے کیا ہیں کہ ایک مقدمہ عدالت میں پیش ہے۔ مقدمہ یہ ہے کہ ایک سوداگر کے مکان میں ایک چور نے نقب لگایا۔ دیوار چونکہ نئی بنی ہوئی تھی اس لئے فوراً گر پڑی اور چور کا کام تمام ہوگیا۔ صبح کو اُس کے بھائی نے دیکھا فوراً عدالت میں مقدمہ دائر کردیا۔ اس وقت یہ مقدمہ فیصل ہورہا تھا۔ بادشاہ سلامت نے سوداگر کو بُلایا اور کہا "چونکہ تمہارے مکان کی دیوار کے گرنے سے اِس شخص کے بھائی کی موت ہوئی اِس لئے تم کو پھانسی دی جائے گی۔ سوداگر نے جواب دیا "حضور! یہ میری خطا نہیں بلکہ مزدوروں کی ہے۔ جنھوں نے یہ دیوار بنائی تھی۔ مزدوروں کو طلب کیا گیا اور حکم ہوا کہ تم نے دیوار بنائی ہے اور اُس کے گرنے سے ایک شخص کی موت واقع ہوئی ہے۔ لہٰذا تم سزائے موت قبول کرو۔ مزدوروں نے جواب دیا کہ نہیں صاحب! ہمارا کچھ قصور نہیں ہے۔ مستقے نے پانی زیادہ ڈال دیا تھا اِس وجہ سے گارا پتلا ہوگیا۔



جس کی کمزوری سے دیوار گر پڑی۔ بادشاہ کا نادرشاہی حکم ہوا کہ سقّے کو بُلاؤ۔ سقّہ حاضر کیا گیا۔ اِس بیچارے کو کچھ جواب نہ بَن پڑا۔ اِس لئے حکم ہوا کہ اِس کو پھانسی دے دی جائے۔ لیکن بد قسمتی سے پھانسی کا پھندا بہت بڑا تھا۔ اور سقّے

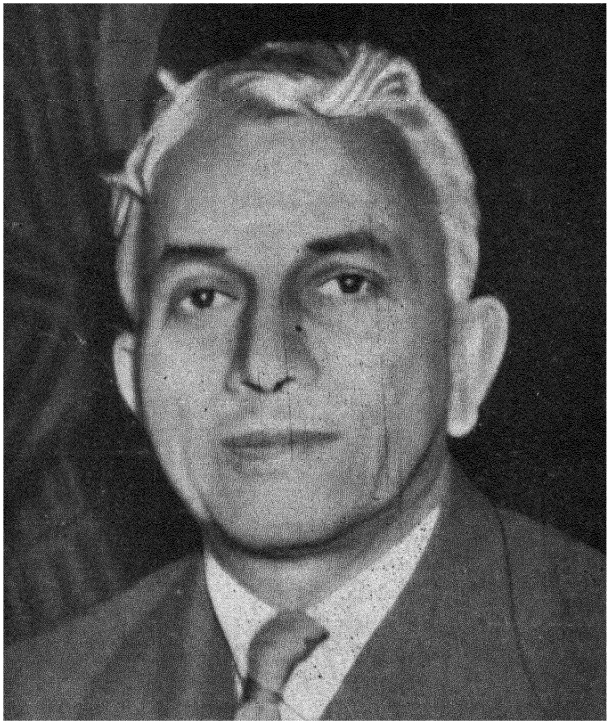
ترکیب سوچی۔ اُس نے بادشاہ سے کہا " مجھے ابھی بشارت ہوئی ہے کہ جو شخص اِس وقت سُولی پر چڑھایا جائے گا سیدھا جنّت میں جائے گا۔ اِس لئے بہتر ہے مجھ کو چڑھادیا جائے " بادشاہ نے ٹھنڈی سانس لی اور



کی گردن چھوٹی تھی۔ بادشاہ نے چاروں طرف نگاہ دوڑائی کہ کوئی موٹی گردن کا آدمی تو نہیں کھڑا ہے۔ اتفاق سے مُنیر پاس ہی کھڑا تھا اور اُس کی گردن بھی موٹی تھی۔ فوراً اُس کو سُولی چڑھانے کا حُکم دیا۔ اب رحیم نے ایک

کہا " نہیں میں سُولی پر چڑھوں گا۔ اور سیدھا جنّت میں جاؤں گا۔ میرے لئے اس سے بہتر موقعہ کوئی اور نہیں ہوسکتا " یہ کہتے ہی بادشاہ سُولی پر چڑھ گیا اور اس طرح منیر کی جان بچی۔

آج کل



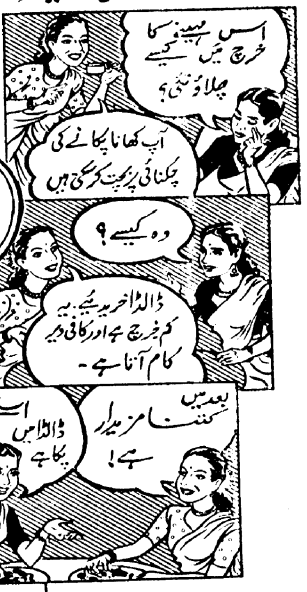
آٹھ آنے

فروری ۱۹۵۴ء

ڈالڈا وناسپتی
آپ کی قیمت خرید کا بہترین معاوضہ کیوں ہے؟

ہر ایک عورت یہی کہتی ہے:
"ڈالڈا خریدیئے اور پیسے بچائیے،
کھانے بھی زیادہ مزیدار پکائیے"





ہر ایک سمجھ دار عورت ہمیشہ ڈالڈا ہی خریدتی ہے۔ ہماری روزانہ غذا میں ڈاکٹر جس کھانا پکانے کی چکنائی پر زور دیتے ہیں، ڈالڈا اسی قسم کی ہے اور کم خرچ بھی ہے۔ آج ہی ڈالڈا کا ایک مہر بند ڈبہ خریدیئے اور دیکھئے کہ یہ کتنی دیر کام آتا ہے اور اس سے کھانے بھی کتنے مزیدار بنتے ہیں!

کھانا پکانے پر بچت کیسے کی جائے؟
مفت مصلاح کیلئے آج ہی یا کبھی بھی اس پتہ پر لکھئے:-
دی ڈالڈا ایڈوائزری سروس
پوسٹ بکس نمبر ۳۵۳، بمبئی ۱

ڈالڈا



۱۰ اپاؤنڈ، ۵ پاؤنڈ، ۲ پاؤنڈ اور ایک پاؤنڈ کے ڈبوں میں دستیاب ہے

HVM. 192-X52 UD

اُردُو کا مقبولِ عوام مصوّر ماہنامہ

آج کل

دہلی

ایڈیٹر:- جوش ملیح آبادی

اسسٹنٹ ایڈیٹر:- بال مکند عرش ملسیانی

جلد ۱۲ ——— نمبر ۷

سالانہ چندہ:- ہندوستان میں:- چھ روپے
پاکستان میں:- چھ روپے ۱۰ پاک

غیر ممالک سے ——— نو شلنگ یا ایک ڈالر

فی پرچہ:- ہندوستان میں:- آٹھ آنے
پاکستان میں:- آٹھ آنے ۱۰ پاک

فروری ۱۹۵۴ء

ترتیب

غزل	ہری چند اختر	۲
رُوس کے قومی ترانے	محمد اجمل خاں	۳
انتقالِ پُرملال	——	۸
نشاطِ مطالعہ	شیر جنگ	۹
مولانا آزاد کو خراجِ تحسین	——	۱۲
ماتھ	رضیہ سجاد ظہیر	۱۳
کشمکش	یاقر مہدی	۱۷
کشمکش	سکندر علی وجد	۱۷
سرہتھیل نرسنگ راؤ آنجہانی	محمد مسلم الدین احمد	۱۸
تاج محل	وارث کرمانی	۲۲
وہ کہاں ہے؟	عبدالعزیز حنفی عمیق	۲۲
امجد کے ساتھ چند لمحے	عرش ملسیانی	۲۳
رُباعی۔ غزل	امجد حیدر آبادی	۲۵
مولوی ریاض الدین امجد ریاض	نفیس سندیلوی	۲۹
جنگِ آزادی اور اکبر الہ آبادی	ڈی اے ہیریسن	۳۲
بنیادی تعلیم	ڈی این ملک	۳۷
رُوپ چند رانی	انور علی فاروقی	۴۱
یومِ حقوقِ انسانی کی سالگرہ	——	۴۵
تعلیم کا حقیقی نصب العین	——	۴۶
رفتارِ زمانہ	——	۴۸
بچوں کا آج کل		
کلنڈر برائے ۱۹۵۴ء	ظہیر الحسن محبی سلانی	۵۳
پہیلیاں	تاظم میواتی	۵۴
اچھا خواب	جمیس احمد نظامی	۵۵
حلوہ سوہن	سراج انور	۵۷
زرافہ اور گینڈا	عبید اللہ صدیقی	۵۹

سرورق:- سرپی، این راؤ آنجہانی

پبلیکیشنز ڈویژن پوسٹ بکس ۲۰۱۱ دہلی

DAYA SAHITYA MANDIR.
SAINIALAM ROAD

غزل

عزمِ ضبط سے آہ و فغاں تک بات آ پہنچی
ہوس نے کیا کیا۔ دل سے زباں تک بات آ پہنچی

سکونِ دل سے ناقوسِ اذاں تک بات آ پہنچی
خداوالوں کی ہمّت سے کہاں تک بات آ پہنچی

خلافت سے جبین و آستاں تک بات آ پہنچی
خُدا اور ابنِ آدم میں یہاں تک بات آ پہنچی

ملی تھی آنکھ اور آہ و فغاں تک بات آ پہنچی
ذرا سی بات تھی۔ لیکن یہاں تک بات آ پہنچی

ہماری داستاں میں ذکرِ قیس و کوہکن آیا
وہاں سے پھر ہماری داستاں تک بات آ پہنچی

جہانِ دوستی اِک جنّتِ ایثار ہوتا تھا
وہاں بھی کاہشِ سُود و زیاں تک بات آ پہنچی

محمد اجمل خاں

رُوس کے قومی ترانے

رُوس کی سوویٹ سوشلسٹ جمہوریہ تقریباً ڈیڑھ کروڑ مربع میل کی اقوام کی یونین ہے۔ اس ملک پر دو سو سال تک تاتاریوں کا قبضہ رہا لیکن آخر کار چودھویں صدی میں بہادر روسیوں نے متحد ہو کر انھیں شکست فاش دے دی اور یورپ کے تمدن کو تباہ ہونے سے بچا لیا۔ جس کا یہ نتیجہ ہُوا کہ سولھویں صدی تک روس کی خانہ جنگی ختم ہو گئی اور وہ ایک متحد قوم بن گئی۔

نصرانیت گیارھویں صدی میں روس پہنچ چکی تھی۔ یہ یونانی یا مشرقی نصرانیت تھی۔ اور چونکہ کلیسا کا یونانی زبان سے تعلق تھا اس لئے رُوسیوں کی زبان، ادب اور اخلاق پر یونانی زبان و تصوّرات کا کافی اثر پڑا تھا۔ لیکن ملک کے رقبے کے لحاظ سے آبادی بہت کم تھی۔ سخت برفانی علاقوں کی وجہ سے بہت سے خطّے غیر آباد تھے، یا ایسی آبادیاں تھیں جو موسمی ضرورتوں کے اعتبار سے خانہ بدوش زندگی پر مجبور تھیں۔ اس لئے چین و ہند کے مقابلے میں یہاں کے باشندے مستقل وطن بنا کر مدنی زندگی یعنی ذرا محنتی کچھ کر جلد بروئے کار نہ لا سکے۔ چنانچہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ روسی تمدن کی بنیادیں خانہ بدوش اور ذرا محنتی کچھ کی خوبیوں اور برائیوں دونوں پر کیساں طور پر قائم تھیں۔ اور دُنیا میں اپنی نوعیت کے اعتبار سے یہ برفانی تمدن نے انداز سے ترقی کر رہا تھا۔

یہاں کے باشندے فطری طور پر افغانستان کے باشندوں کی طرح جنگ جوؤں کے دلدادہ تھے۔ سفر کی دشواریوں نے بہت سے ابنِ بطوط پیدا کر دئے تھے، جو نہ صرف افسانے سُناتے تھے، بلکہ ان افسانوں میں خوف و حزن، محبت و جرأت، محبت و نفرت کے عواطف کو بھی بھر دیتے تھے۔ تعلیم یعنی نوشت و خواند کی کمی اور نیم غلام کسانوں کی زندگی نے زبانی داستان سرائی کا اچھا خاصہ لٹریچر تیار کر دیا تھا۔ اور اسی کے ساتھ ساتھ مذہب نے تصوف کے اُس خاص رنگ کو غالب کر دیا تھا جسے موضیانہ زبان میں رضاء توکل کہتے ہیں۔ قدرت کی ناہمواریوں اور اُمراء کی خونخواریوں نے عوام کو مجبور و بے عمل بنا کر اُنھیں غالب کا ہم زبان بنا دیا تھا کہ ؎

رات دن گردش میں ہیں سات آسماں
ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا!

لیکن نفسیات و تاریخ کے تقاضے کسی طرح دبائے نہ جا سکے۔ محبت و امن کے بہت سے پیام پر خود طبقۂ اُمراء میں پیدا ہونے لگے۔ پشکن اور کاؤنٹ ٹالسٹائے نے انیسویں صدی میں محبت کے حائل احساس کو پھر زندہ کرنا شروع کیا، اور مجبور و مقہور انسان کے ولی جذبات کو شعر و افسانے کے ذریعے سے عوام تک بالکل اُسی طرح پہنچایا جس طرح ہندی شاعرہ عورت کی زبان سے حقیقت انس و محبت کو بیان کرتا ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ عورت فطری طور پر شرم و حیا کا پتلا ہوتی ہے۔ دُنیا کی کسی زبان میں آپ کو ہندی شاعری کی یہ خصوصیت نہ ملے گی۔ کہ وہ محبوب فراق، محبت و وصال کے جذبات کو عورت کی زبان سے اس طرح ادا کرے کہ ؎

"پیا سے سندیسہ مورا کہیو جائے" یا "سگری رین موری تڑپت بیتی" یا "پنگھٹوا پہ موسے نجر لاگی"۔ اسی طرح مغربی ہندی یعنی پنجابی میں فریدصاحب فرماتے ہیں:

ترس نہ آوے پک تل تینوں سخت خماں وچ گلیاں
ویڑا کھاوے آنگن نہ بھاوے۔ آگ فراق دی جلیاں

(میں سخت غمِ فراق میں جل رہی ہوں لیکن تجھے تل بھر رحم نہیں آتا۔ میدان مجھے کھاتا ہے، گھر کا آنگن بھاتا نہیں۔ فراق کی آگ میں جلی جاتی ہوں)

بالکل اسی طرح خود روس کے اُونچے طبقے میں "انسان" سے محبت کرنے والے اور اُن کو سماج میں مساوی درجہ دلوانے والے ادیب و شاعر پیدا ہونے لگے۔ اور رفتہ رفتہ خود عوامی ادیب و شاعر چیخوف اور گورکی کی شکل میں انسانیت کے

دا فنار جسم سے پردہ اُٹھانے لگے۔ ظاہر ہے کہ اس نئے منشور کا نتیجہ سوائے "سرّیت" و حیرت کے کیا ہو سکتا تھا۔ اُسے خواہ اشتراکیت کہئے، جمہوریت بتایئے یا آمریت قرار دیجئے، مگر واقعہ یہی ہے کہ "ذہنِ ہندی" کے محسوسات کی ترجمانی جن مردوں نے عورتوں کی زبان سے کی اُن کا مقصود سوائے اس کے کچھ نہ تھا کہ دُنیا سے سرمایہ داری اور غلام سازی ختم ہو اور مساوات و محبت جوامیشار کا جذبہ پیدا کرتی ہے اُس سے سب سرشار ہو جائیں۔

البتہ ذرائع مقصود پر نکتہ چینی ہو سکتی ہے، یعنی اپنے اپنے نقطۂ نظر سے ہر جماعت اپنے طریقِ کار کو اچھا کہہ سکتی ہے۔ وہ عورتیں جو اپنی ساسوں کے ظلم کو ہمدردی نہیں سمجھتیں وہ اپنا راستہ زہر خورانی کے ذریعے سے صاف کرنے کو بہتر سمجھ سکتی ہیں یا ساسوں کے نقطۂ نظر سے پُر امن طریقے پر خود زہر کھا کر مر سکتی ہیں۔

بہر حال ۱۹۱۷ء کی جنگ کے دوران میں زار کی مستبدانہ حکومت انقلاب سے دوچار ہوئی۔ اور اُس وقت سے اشتراکی قہر برابر جاری ہے جس نے روس کو دُنیا کی بڑی قوموں کے دوش بدوش بلکہ مضبوط مقابل کی طرح کھڑا کر دیا ہے۔ وہاں نہ صرف سیاسی انقلاب پیدا ہوا ہے بلکہ زندگی کے ہر شعبے میں انقلاب ہی انقلاب ہے زراعتی تمدن سے صنعتی تمدن تک ایک قدم میں پہنچ جانا بظاہر ناممکن معلوم ہوتا تھا لیکن یہ ہوا اور روس کسی بھی صنعتی ملک سے مقابلہ کرنے پر قلیل عرصہ میں آ گیا ہے۔ ان اقتصادی زندگی میں پانچ سالہ پلانوں نے جان ڈال دی ہے۔ اور سفر و خبر کے ذریعوں کی ترقی نے مشترک زراعت و تجارت کے دروازے سب کے لئے یکساں طور پر کھول دئے ہیں۔ اگر انقلابِ فرانس کی اخوت، مساوات و عدالت کا منشا یہی تھا کہ ایک ایسی حکومت قائم ہو جس میں انسان اپنا صحیح مقام پائے، تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ روس کے اقتصادی پلانوں نے اس دَور کا آغاز کر دیا ہے۔

ذہنی و روحانی ترقی کے لئے روس نے کیا، دُنیا کے بیشتر ملکوں نے دین کو سلطنت سے الگ کر دیا ہے۔ یعنی کلیسا اور پروہتوں کو دنیوی قوانین بنانے میں مداخلت کا حق باقی نہیں۔ عقلِ انسانی کے لئے اس سے زیادہ تنزّل کا باعث کوئی چیز نہیں ہو سکتی کہ وہ خود محروم ہو جائے اور دوسروں کی سوچی ہوئی باتوں کو ہر زمانے اور ہر ماحول کے لئے اپنا پیشہ تسلیم کر لے۔ اسی لئے روس کی حکومت کو "لادینی" کہنا درست نہ ہوگا۔ اُس کا "دین" یعنی زندگی بسر کرنے کا قانون خود اُس کے اہل الرائے بناتے ہیں۔ گویا وہ ایک "انسانی" حکومت ہے۔ اس نکتے کو سمجھنے کے لئے ہمیں یورپ میں کلیسا کی تاریخ اور حکومت و کلیسا کی کشمکش کی تاریخ پر نظر ڈالنا ہوگی۔ یورپ میں کلیسا کے اشاروں پر "مذہب" کی روشن جاری تھی۔ عوام کو انجیل کے ترجموں کی اجازت نہ تھی۔ وہ علم سے دُور رہ کر کلیسا کے غلام بن گئے تھے۔ دوسرے جاہل ملکوں کے باشندوں کی طرح سحر و کہانت، جوتش و نجوم، تعویذ، گنڈے سے بیماریوں کو صحت سمجھ کر دُور کرنا اور سنتوں اور پیروں کی جیبیں گرم کرنا اُن کے لئے قانونِ زندگی تھا۔ اگر کوئی شخص کسی سائنس کے نظریہ کو بیان کرتا، یا سوائے بتیسم کے پانی کے کوئی اور علاج کرتا تو وہ قابلِ دار سمجھا جاتا تھا۔ یہ مذہب نہ تھا، توہم پرستی تھی۔ روس نے تعلیم کے ذریعے سے اس کا استیصال کرنا چاہا ہے۔ اور اسی لئے سلطنت کو کسی مذہب کی تبلیغ کا اختیار نہیں دیا۔ نہ کسی مذہب کی بنیاد پر دینوی قوانین کو بنانے کا حق دیا۔

نتیجہ یہ ہوا ہے کہ نہ صرف بے عملی کے تصوّف و توہمات سے روسی باشندے نکل رہے ہیں، بلکہ جوانوں میں حیوانیات، طبعیات (نیوکلیر فزکس)، نباتیات اور علم طبقات الارض کے ایسے ایسے ماہر پیدا ہو گئے ہیں جن کی شہرت کا ڈنکا دُنیا میں بج رہا ہے۔ جبری تعلیم ۱۹۳۰ء سے جاری کی گئی ہے۔ اس کا مقصد محض مذہب و تصوف سے نکال کر انسان کو انسان کی عملی خدمت پر مائل کرنا ہے تاکہ عقلی و سائنسی ترقی کے ذریعے سے ملک خوش حال و فارغ البال بن جائے اور "چہ خورد با مداد فردم" کے خوف سے نجات ملے۔ اسی لئے وہاں اب علمی غلط روؤں کی گرفتاری اور جلاوطنی ضروری نہیں رہی۔ غلہ، مویشی اور صنعتی پیداوار کی فراوانی نے عام انسان کو اتنی فرصت پیدا کر دی ہے۔ کہ وہ سٹرو ادب، تھیٹر اور ڈرامہ، موسیقی و مصوّری میں سادگی و افادیت پیدا کرنے کے لئے خود سوچے اور قدیم طبقاتی تصوّرات پر ناقدانہ نظر ڈال سکے۔

اگر یونانیوں کے قدیم تصوّر کے مطابق انسان کا مذہب "حق، حسن اور خیر" Beauty, Truth & Goodness. میں مضمر ہے تو ہر روسی نوجوان ان تینوں کو عملی طور پر بروئے کار لانے میں سرگرم ہے۔ پھر بھی وہاں روحانی کیتھولک مذہب اور گرجے باقی ہیں بلکہ ان کی مرمّت سلطنت کی طرف سے ہوتی ہے۔ اسی طرح مسلمانوں کی مسجدیں نہ صرف باقی ہیں بلکہ نئی بنی بن رہی ہیں۔ لیکن اب گرجے اور مسجدیں صرف نمازوں کے لئے نہیں بلکہ کتب خانوں اور علمی مذاکروں کے لئے کھول دئے گئے ہیں۔ اور ہر مذہب والے کو اختیار ہے کہ وہ اپنی دینی تعلیم اپنے بچّوں کو دے سکے اور اس کے لئے مُدّت

کھول سکے۔

دنیا میں عدم مساوات اور توہمات کو پھیلانے کے لئے جاہل اور مجبور عورتوں کا وجود باقی ہے۔ روس نے جو سماجی انقلاب پیدا کیا ہے اس میں اس نظریے کو ختم کر دیا ہے کہ عورت شیطان مجسم ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ عیسائیوں نے نکاح کو مقدس مان کر یہ قانون بنا دیا تھا کہ یہ رشتہ کسی نوعیت سے نہیں ٹوٹ سکتا۔ روس نے اس قانون کو توڑ کر عورت اور مرد کو مساوی حقوق دے دئے ہیں۔ اب نکاح ناقابل تنسیخ نہیں۔ عورت ہو یا مرد وہ ایک دوسرے کو خبر دے کر نکاح کو ختم کر سکتے ہیں۔ طلاق کے قانون نے عائلی زندگی کی ناخوشگواریوں کو ختم کر دیا ہے اور اساسی کے ساتھ ساتھ مرد کو سابق بیویوں کے بچوں کی پرورش کا ذمہ دار قرار دیا ہے۔

روس کے قومی ترانوں سے آپ کو اندازہ ہوگا کہ مزدوروں یا محنت کشوں، اور مجبوروں یعنی عورتوں اور بچوں کے متعلق ان کے کیا خیالات ہیں۔ اور ان خیالات کو کتنے پر اثر طریقے پر وہ بیان کرتے ہیں! اور کس طرح ترقی کے لئے خود اعتمادی اور ہمت پیدا کرتے ہیں!

دی انٹرنیشنال

روس

جو مزدوروں کا سب قومی ترانہ بھی ہے

(نوٹ) جنگ سے پہلے یہ ترانہ روس کا قومی گانا تھا۔ حقیقت میں یہ انٹرنیشنال یا سب قومی مزدوروں کی کمیونسٹ پارٹی کا گیت ہے جسے بعد میں روسی قوم نے اپنا سرکاری ترانہ تسلیم کر لیا تھا۔ لیکن دوران جنگ میں یہ ترانہ ترک کر دیا گیا۔ اور نیا ترانہ تصنیف کر کے روس کی یکجہتی اور اسٹالن کی سرپرستی پر زور دیا گیا۔ مزدوروں کے ترانے میں ترقی کرنے، مذہب اور سرمایہ داری کو ختم کرنے پر زیادہ زور ہے اور اب تک دنیا کے مزدوروں کا یہی ترانہ ہے۔

زمانے بھر میں تم ذلیل ہو چکے، اُٹھو اُٹھو
دراز شب میں فاقہ کر کے سو چکے، اُٹھو اُٹھو

مزدوروں کی جماعتوں میں حشر آ رہی ہے اب
وہی انھیں مراد کی طرف بڑھا رہی ہے اب

گذشتہ قوم کی کٹائنوں کو دور پھینک دو
پکارتی ہے حریت، غلامو غور سے سنو

اُلٹ دو دہر کی بنا۔ امیر سب غریب ہوں
جو سب سے نیچے تھے، انھیں بلندیاں نصیب ہوں

سنبھالو اپنے اسلحہ اُٹھو اُٹھو بڑھو بڑھو
کھڑے ہو جنگ کے لئے اُٹھو اُٹھو بڑھو بڑھو

وہ اور ہیں جو دیوتاؤں کی خوشامدیں کریں
جو شاہ اور قیصروں کی آڑ ڈھونڈتے پھریں

کریں گے اپنی آپ ہم مدد یہی خیال ہے
ہم اس کو کاٹ دیں گے جو غلامیوں کا جال ہے

جو ڈاکوؤں نے لیا ہے اس کو پھیر لیں گے ہم
اب ان کا اس طرح کا ظلم کرنے ہی نہ دیں گے ہم

یہ سلطنت کا قاعدہ بھی ہے عجیب قسم کا،
ہزاروں ٹیکس چوستے ہیں خوں ہمارے جسم کا

ہے جملہ ہی دقفول "فرض مال دار کا"
"حقوق مفلساں" بھی ایک قول ہے گنوار کا

بہت سہیں مصیبتیں اب عیش کے دن آ گئے
مساویانہ زندگی کی روشنی کو پا گئے

ملے گی سردی اگر تو فرض آ ہی جائے گا،
صلہ ہر ایک مفلسی کا اپنی پا ہی جائے گا،

جو ریل اور کانوں کے ہیں مایہ دار مزے
یہ اُن کی شان و شوکتیں گھٹا دُنی ہیں کس قدر

بلا سے مفلسوں کا قافلہ اگر لُٹا کرے!
ہماری محنتوں کا فائدہ اُنھیں ہُوا کرے!

ہمیں کو چاہیئے ملے ہماری محنتوں کا پھل
اگر ہم اس کو مانگیں تو مطالبہ ہے برمحل

بڑھو بڑھو بہادرو جفاکشو بڑھو بڑھو
کمانے والو روٹیاں ہر ایک روز کے بڑھو

نہ دیں گے مہلت اب ذرا ٹیرے ڈاکوؤں کو ہم
اب آؤ اُن کی زندگی کو خاک میں ملائیں ہم

یہ ہو رہے ہیں موٹے تازے خون چُوس چُوس کر
بسر شکاری کر رہے ہیں بس ہمارے گوشت پر

یہ مٹ گئے تو آفتاب اسی طرح سے چمکے گا
اثر نہ ہوگا اُس پہ کچھ اسی طرح سے دمکے گا

روس کا نیا قومی ترانہ

نوٹ:- لندن سے ۳۱ دسمبر ۱۹۴۳ء کو خبر آئی کہ ۳۰ دسمبر کی رات کو ماسکو سے یہ اعلان ہُوا ہے کہ قومی گیت "انٹرنیشنل" کی جگہ سوویٹ روس میں اب نیا گانا جاری ہوگا۔

چند سال ہوئے ہندستان میں برٹش امریکن اور روسی لیڈروں نے جنگی پالیسی کے متعلق نئی نئی باتیں سوچی ہیں۔ اسی کا نتیجہ معلوم ہوتا ہے کہ روس نے انقلابی جماعت "کامن ٹرن" سے اپنا رشتہ توڑ لیا ہے اور پرانے عیسائی مذہب (آرتھوڈکس چرچ) کی قدامت پرست (رسناتنی) شاخ کو پھر زندہ کر دیا گیا ہے۔

اس کے بعد ایک خاص بات یہ کی گئی ہے کہ مزدوروں اور غریبوں کے ترانے کو چھوڑ دیا گیا ہے۔ یہ "انٹرنیشنل" (سب قومی گیت) سب قوموں کے مزدوروں کا ترانہ ہے۔ دُنیا کے مزدور ہر جگہ اسے گاتے ہیں۔ اس میں مارکس کے فلسفے (درشن) کی پوری جھلک موجود ہے۔ اوّل تو مارکس ایسی سوسائٹی بنانا چاہتا تھا جس میں مالدار اور مزدوروں کا جھگڑا باقی نہ رہے۔ اور سب اپنے ملک کی دولت سے برابر فائدہ حاصل کر سکیں، دوسرے یہ کہ وہ مزدوروں میں ایسا جوش پیدا کرنا چاہتا تھا کہ وہ خود اپنا راستہ بنائیں، ترقی کریں، اور نہ قیصروں (بادشاہوں اور رئیسوں) کی مدد ڈھونڈیں نہ پیغمبروں (عیسیٰ مسیح اور اُن کے دیبوں) کے مذہب کے نشے میں رہیں۔ عقل اور سائنس جو کچھ بتائے اُس پر عمل کریں۔ مرنے کے بعد کی زندگی، نجات اور نجات دہندہ کا خیال چھوڑ دیں کل دُنیا کے مزدور ایک ہو جائیں تاکہ سرمایہ داری (پُونجی واد) کا خاتمہ ہو سکے۔ اور قیصروں کا بیڑا غرق ہو جائے۔

لیکن نئے ترانے میں قیصروں اور دیوی دیوتاؤں کے خلاف ایک لفظ بھی نہیں ہے۔ اس میں عام لوگوں کا تو ذکر ہے لیکن مزدوروں کا نام نہیں ہے۔ دیوتاؤں کی جگہ لینن اور اسٹالن کا ذکر ہے۔ لینن کو راستہ روشن کرنے والا بتایا گیا ہے۔ اس ترانے میں ایک روحانی شان پائی جاتی ہے۔ "اسٹالن کو پروردگار" (پرورش کرنے والا) کہا گیا ہے۔ گویا اس کو قیصروں کی طرح "ان داتا" مان لیا ہے۔

"ڈیلی ہیرلڈ" لندن کے کمیونسٹ اخبار کا خیال ہے کہ پرانا گانا "انٹرنیشنل" ہی برٹش کمیونسٹوں کا ترانہ بنا رہے گا اور یہی دنیا کے غریب اور پامال (ذلت) مزدوروں میں زندگی پیدا کرتا رہے گا۔ "امرت بازار پتر کا" کو خاص طور پر لندن سے یہ خبر ملی تھی کہ جارج برنارڈ شا نے کہا کہ "میں نہایت بھاری دل سے چاہتا ہوں کہ ہم بھی سوویٹ روس کی مثال پر چلیں اور اپنے قومی ترانے کے دوسرے بند کو بدل دیں۔ اس لئے کہ موجودہ بولوں پر بہت سے آدمیوں کو اعتراض ہے۔ بہت دن ہوئے میں نے نئے بول لکھے تھے۔ مگر وہ نہ چلے۔ چونکہ اب نئے سرے سے یہ بات سامنے آ گئی ہے۔ اس لئے ممکن ہے کہ اب کوئی بہتر طریقہ اختیار کیا جا سکے۔ مجھے "انٹرنیشنل" کے گانے کی طرز پسند نہ تھی، اور نہ کبھی مجھے یہ گمان ہُوا تھا کہ یہ گانا اتنا پاک ہے کہ کوئی اسے چھو تک نہیں سکتا۔ بہرحال اس کی طرز کمیونسٹ پارٹی کی شان کے مطابق نہیں تھی۔"

اس تبدیلی کی وجہ سے یہ بحث دوسرے ملکوں میں چھیڑ دی گئی ہے کہ انھیں اپنے قومی ترانے کو بدلنا چاہیئے یا نہیں۔ بہرحال "ڈیلی ورکر" کا خیال صحیح نکلا اور بدیشی کمیونسٹوں نے روسی گیت کو اختیار نہیں کیا۔ وہ ہر موقع پر اپنا انٹرنیشنل ہی گاتے ہیں۔

روس میں نت نئی تبدیلیاں ہو رہی ہیں چنانچہ ۱۹۴۳ء سے مارشل اسٹالن نے روس کے مختلف صوبوں کو اندرونی طور پر بالکل آزاد کر دیا ہے۔ یہ سب سوویٹ اب انھیں اختیار ہے کہ جس ملک سے چاہیں اپنا رشتہ جوڑ لیں، اور سیاسی تعلق قائم کر لیں۔ انھیں یہ بھی حق مل گیا ہے کہ وہ اپنی اپنی فوج بھی بنا لیں لیکن قومی ترانہ سب کا ایک ہی ہوگا۔

اُمید ہے کہ روس کی پیروی میں دوسرے سامراج بھی اپنے مقبوضات کو جلد آزادی دے دیں گے اور خود اپنے ملکوں میں زبان اور کلچر کی بنا پر ریاستیں بنائیں گے، تاکہ جماعتی اور شخصی آزادی حاصل ہونے کے بعد انسانیت کا اصلی جوہر اُبھر سکے، اُبھر کر پھیلے، پھلے پھولے۔ اور اس مقصد کو پا لینے کی کوشش کرے جو روحانیت اور مادیت کی کشمکش میں نظروں سے اوجھل ہو رہا ہے اور سوچنے والوں کو اپنی تیز رفتاری کی وجہ سے کسی ایک نکتے پر جمنے نہیں دیتا۔ جس کا نتیجہ یہ ہو رہا ہے کہ انسان بیکار بیکار کے اپنی بے بسی کا اظہار خیام کے ان لفظوں میں کرنے لگتا ہے۔

دریاب کہ از روح جدا خواہی رفت — در پردۂ اسرار خدا خواہی رفت
مے خور کہ ندانی ز کجا آمدۂ — خوش باش ندانی کہ کجا خواہی رفت

رُوس کا نیا قومی ترانہ

(۱) سب صوبوں کو آزاد کیا۔ پیمانے ہیں سب ہاں ایک ہیں سب
اب روس بڑا ہے۔ طاقت ور ہے۔ سب کو اس نے ایک کیا
ہاں زندہ ہو! ہاں زندہ ہو! سوویت یونین زندہ باد!!

اپنی خوشی اور مرضی سے
جنتا نے روس بنایا ہے
یہ روس وطن ہے رُوسی کا
کس شان سے اب یہ بڑھتا ہے
جنتا کی خوشیوں کا سہارا
روس ہمارا، روس ہمارا

(۲) سورج آزادی کا نکلا
لینن نے رستہ چمکایا
اسٹالن نے پار لگایا
جنتا کا ہے وہ رکھوالا
ہم میں پریم اور ہمت ڈالی
جنگ ہماری فوج کی ماں ہے
جنگ نے اس کو پیدا کیا ہے
چالاک لڑاکا دشمن کو
ہم مار بھگاتے ہیں دم میں
اور جنگ کے ذریعہ آنے والی
نسلوں کی قسمت ہیں بناتے
لے جائیں اپنے ملک کو ہم
عزت کی طرف، شوکت کی طرف

سُرخ فوج کا مارچنگ ترانہ

روس

(از لارنس بن یون)

ورغنزل برائے ستمبر ۱۹۴۲ء

دوڑو یارو — دوڑو یارو
جنگی باجا — بجتا ہے
ہتھیار سجا کر جسموں پہ — آزادی کی ہم جنگ کریں
ہم کاٹ نکالیں گے رستہ — مزدور ہیں ہم مزدور رہیں ہم
اک تھوڑی سی مزدوری ہی — کافی ہے ہمارے کھانے کو
اس کا جھنڈا گڑ جاتا ہے
دل جنتا کا، دل جنتا کا
اس کے نیچے کام بنیں گے
جیتیں گے ہم جیتیں گے

یکجہتی ، اخوت ، آزادی - ہیں اپنی جنگی ترکیبیں
تھے اب تک قافلے قسمت میں - زنجیرِ غلامی پہنے تھے
اور بھوکے فقیروں کی صورت - ہوتی تھی گذر کچھ ٹکڑوں پر
اب چمکا نور اندھیرے سے - آزادی کا تڑکا آیا
ہم جنگ کی جانب بڑھتے ہیں - گاتے ہیں گیت آزادی کا

میدان کی جانب جلد چلو
میدان کی جانب جلد چلو

اے آزادی کے متوالو - ہم کب شاہوں سے ڈرتے ہیں
کیا خوف ہو ان کی طاقت کا - جب ہم ہی ان کے بازو ہیں
یہ توپ خمارے ، بندوقیں - ہم نے ہی بنائی ہیں یارو
ہم اپنی دُھن کے پکے ہیں - اب فتح و ظفر ہم پائیں گے
ہم موت کو دعوت دیتے ہیں - ہم طوقِ غلامی توڑیں گے

لو جنگ کرو آزادی کی
لو جنگ کرو آزادی کی

ہیں جب تک آنکھوں میں آنسو - اور کھا لیں نوچی جانے کو
مُنہ میں ہے زباں جب تک اپنے - ہم بولیں گے چلّائیں گے
ہم سخت مصیبت جھیلیں گے - پر کوشش جاری رکھیں گے
ارمانِ دلی ہے یہ اپنا - جن کا ہے لقب انسان یہاں
وہ دنیا میں آزاد رہیں - نکلیں وہ ننگِ غلامی سے
جینا ہے اگر آزاد جیو - یہ زندگی موت سے بدتر ہے
کاٹیں گے مصیبت کی گھڑیاں - اور خون بہائیں گے اپنا
ان لمبی راتوں کے پیچھے - چمکے گی سحر آزادی کی

ہاں جنگ کرو آزادی کی
بس جنگ کرو آزادی کی

انتقالِ پُر ملال

مولانا سید سلیمان ندوی چند ماہ علیل رہنے کے بعد نومبر ۱۹۵۳ء کے مہینے میں انتقال فرما گئے۔ اپنے علم و فضل کے اعتبار سے سید صاحب کی ذات ستودہ صفات بہت ممتاز تھی۔ حال ہی میں آپ کے نام مولانا ابوالکلام آزاد کے خطوط معارف میں شائع ہوئے ہیں۔ ان سے پتہ چلتا ہے کہ دونوں اکابر میں کس قدر باہمی اخلاص و موانست تھی۔ تاریخ اسلام، اُردو زبان اور اُردو ادب کی تاریخ سے متعلق آپ کی خدمات آنے والی نسلوں سے خراجِ تحسین حاصل کرتی رہیں گی۔ دارالمصنفین اعظم گڑھ نے جو ادبی خدمات انجام دی ہیں اُن کا سہرا بیشتر سید مرحوم کے سر ہے۔ ادارہ "آج کل" کو اُن کے پسماندگان سے پوری ہمدردی ہے۔

ذیل میں "قومی زبان" کراچی" سے مولانا کی تاریخ وفات نقل کی جاتی ہے۔

"فاضل گرامی سلیمان"

۱۳۷۳ ہجری

آں را کہ جاہ و مسندِ شاہی نہ داشتہ
ایں فضل بس کہ "نقشِ سلیماں" گذاشتہ"

۱۳۷۳ھ

نشاطِ مطالعہ

فریدش وہلم نتشے

گزشتہ سے پیوستہ

یہ ایک عجیب لطیفہ ہے کہ روح کے مقابلے میں جسم کا، مادرائے حیات کے مقابلے میں حیات کا اور اگلی دنیا کے مقابلے میں اس دنیا کا یہ فلسفی اپنی ذاتی زندگی میں دنیا کے تمام صاحبِ عظمت مصنفوں اور فنی تخلیق کاروں میں سب سے زیادہ روحانی اور پاکیزہ ہے۔ کردار کی یہ پاکیزگی اور روحانی لطافت اس کے علاوہ انگلستانی شاعر شیلی میں ضرور ملتی ہے۔ لیکن نتشے کے تخیل کی کڑک اور بجلی کے کوندے کی سی خیرہ کن پاکیزگی کے مقابلے میں شیلی کی دنیا ایک ایسے دھندلے تصوّر کی ماحصل معلوم ہوتی ہے جس میں زندگی کی جگہ تھوتھے، ڈھیلے اور بے جان الفاظ کی حکمرانی ہو اور جسم کی بھوک دبی ہوئی آواز میں زیرِ لب کراہ رہی ہو۔ نتشے کی شہرہ آفاق کتاب "بھلوں زردشت" لیجئے۔ یہ شاہکار نہ صرف بلحاظ ایک فلسفی کتاب کے ہی اعلےٰ رتبہ رکھتی ہے بلکہ اگر آفاقی ادب کی معدودے چند ایسی منتخب کتابیں یکجا کی جائیں جو آسمانِ رفعت پر نورانی ستارے بن کر لوگوں کی آنکھوں میں چکاچوند پیدا کر دیں تو ان میں یہ کتاب پیش پیش ہوگی۔ دنیا کے ادب میں مشکل سے ہی کوئی ایسی کتاب ملے گی جس میں شروع سے لے کر آخر تک وہ زورِ بیان اور قدرت کلام پایا جائے جو اس کتاب میں ہے"۔

اگر دنیا کے ادب کا اس نکتۂ خیال سے جائزہ لیا جائے کہ لکھنے والوں کے جسمانی حواس اور جسمانی مطالبوں کا ان کے تخیل پر کتنا اثر ہے تو معلوم ہوگا کہ نتشے کی تصانیف اس سے یکسر مبرّا ہیں عقلِ محض، شعورِ مطلق، ذہن اور روح ہی وہ اجزا ہیں جن سے اس کا تخیل پرورش پاتا ہے اور ادب کی شکل میں ڈھل جاتا ہے۔ وہ ایک ایسے لاگ، بے لوث اور پاکباز شمشیر زن ہے کہ جب وہ اپنی تلوار اٹھاتا ہے تو دیکھنے والے یہ محسوس کرنے لگتے ہیں کہ وہ خود اس کی تلوار کی دھار بن گئے ہیں اور اس کے وار کی کاٹ کا ایک جُز بن کر دشمن کی ہڈیاں ریت رہے ہیں۔

اس کی زندگی ایک نہایت سادہ اور راہبوں کی سی پاکباز اور تارکانہ تھی۔ شراب اور لہو و لعب سے اسے سخت نفرت تھی لیکن اس کا کلام شراب کہنہ سے زیادہ تند اور نشہ آور ہے۔ اس کے اسلوبِ بیان میں ہر وہ چیز مفقود ہے جس میں جسم کے مطالبے کا پہلو ہو۔ اس میں اعضاء کا تناؤ ہے، دل کی رگوں کے کھچے ہوئے تار ہیں اور شاید یہی وجہ ہے کہ اس میں سے اس قسم کی شعلہ نفس تانیں نکلتی ہیں جن سے مہمیز ہو کر فوجیں میدانِ جنگ میں اپنی جانیں نچھاور کر دیا کرتی ہیں۔ شہر تہ تیغ اور ملک نذرِ آتش ہو جاتے ہیں۔

یہ ضروری نہیں ہے کہ ہم اس کے نظریۂ تناسخ یا بار بار پیدا ہونے کے ہولناک نظریے کو قبول کریں۔ یہ بھی ضروری نہیں ہے کہ ہم اپنے دل کے دروازے بے کسوں کے رحم پر بند کر لیں یا خود کو فوق البشر کا زینہ بنتے ہوئے دیکھ کر اپنی لاچاری پر رحم کھانا چھوڑ دیں۔

یہ بھی ضروری نہیں ہے کہ ہم "حسرتِ بعد" رقت انگیز نظریے کی جھوٹی لطف آفرینی میں اُلجھ کر آدمی پر آدمی کی خود غرضی تسلیم کر لیں اور ان ابدی مسرّت کے سنہری تاروں سے اپنے کام و دہن کی دعوت کریں جو کہ ازلی وائرے کے پکے ہوئے اور رس بھرے گول پھل نچوڑ کر حاصل کئے جاتے ہیں"۔

مختصر یہ کہ اس کے فلسفے کا کوئی بھی جُز و منظور کرنا ضروری نہیں

ہے - ضروری ہے تو صرف یہ کہ ہم بدظنی اور تعصب کا شکار ہو کر اس کی صدائے مستانہ سے اپنے کانوں کو محروم نہ رکھیں جس کی الہامی شوکت کی مثال ولیم بلیک کی نظموں کے علاوہ دنیا کے ادب میں شاید اور کسی جگہ نہیں ہے -

ہمیں چاہیے کہ نفسیاتی تحقیق و تجسس کی وہ بے رحم شعاعیں جن کی مدد سے نتشے نے اپنی منزلیں طے کی ہیں ہم بھی اپنے باطن کی طرف لے جائیں اور دیکھیں کہ وہاں اس تاریکی میں کیا کیا کچھ پوشیدہ ہے -

اس کے الفاظ میں کوہستانی ہواؤں کی سی تیزی، تندی اور تازگی ہے جو ہمارے شعور کی دھند کو چھانٹتی ہوئی ہمارے تخیل کے مطلع کو صاف اور شفاف بنا ڈالتی ہے

قدیم یونانی فلسفیوں کی طرح نتشے کے اسلوب بیان میں وہ جادو ہے جو ہماری آنکھوں کے سامنے ہماری بھی زندگی کے باطنی ڈرامے کو آشکار کر ڈالتا ہے اور اس کے چھپے ہوئے کردار وں کو اس خوبی سے برسرمنبر پچھاڑ ڈالتا ہے کہ جدید ادب کے بڑے سے بڑے شاہکار میں بھی اس کی مثال نہیں ملتی - اس کے زور بیان کی بے خطا تیر اندازی سے ہمارا دل بیّوں اچھلنے لگتا ہے اور جب اس کے بے پناہ ناوک ہمارے سینے میں پیوست ہو کر خون کے چھینٹے اچھالنے لگتے ہیں اور جب ان پر روشنی تھرکنے لگتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ قوس قزح کا پل ہمارے سامنے پھیلا ہوا ہے اور عبور کرنے کی دعوت دے رہا ہے - اب دوسرے کنارے پر خواہ جہنم کی آگ ہو اور خواہ جہالت اور درندگی کی بے کراں تاریکی - وہ ایک ایسا آہنیں بریدہ بازو ہے جس کی مٹھی میں برہنہ خنجر ہے اور خنجر کی نوک پر قوس قزح کے رنگ جھلملا رہے ہیں - اس کے الفاظ میں خودکشی کے قریبی لمحوں کی تاریکی ہے اور نوزائیدہ کی اولین چیخ کے کے اسرار اور اسرار کی ہیبت -

نتشے ہمارے سامنے ایک ایسا اسلوب پیش کرتا ہے جس کی مدد سے ہم انسان کی نفسیاتی گہرائیوں کا تجزیہ اور مطالعہ کر سکتے ہیں اور زندگی کی ان ڈرامائی حقیقتوں سے روشناس ہو سکتے ہیں جن کی موجودگی میں ہر وہ چیز جو بے کیف ہے، جو سطحی اور عامیانہ ہے - اور ہر وہ امر جو مسلمہ اور مفروضہ ہے خزاں زدہ پتّوں کی طرح ناپید کے دامن میں جھڑ جاتے ہیں - ہماری زندگی میں ایک حجّت پیدا ہو جاتی ہے اور ہر نیکی و بدی کے تخیّل کو ہم نئی قدروں کے ترازو میں تولنے لگتے ہیں - ہماری شخصیت کا مبارزانہ پہلو ابھر آتا ہے اور ہم ایک زندہ احتجاج کی صورت اختیار کر جاتے ہیں - ہم پکار اٹھتے ہیں کہ سعدی کا صبر اور انسان دوستی دانیکی کی فرض شناسی، کبیر اور نانک کی رواداری اور مروّت، تلسی داس کی خدا ترسی اور بھگتی، شکسپیر کی دلجوئی اور شفقت، سقراط کی ستم ظریفی رابعے کی روحانیت اور دوستایفسکی کا تسلیم و رضا ان سب کو پرکھنے کے لیے آگ میں تپانا چاہئے - کسوٹیوں اور تلواروں کی پچھاڑ میں سے گزارنا چاہیئے - اور تب اگر مسیح یہ محسوس کرے وہ معاف نہیں کر سکتا - سعدی انسان دوستی اور صبر بھول جاتا ہے، دانیکی اپنی فرض شناسی، کبیر اور نانک اپنی رواداری، تلسی داس اپنی خدا ترسی، شکسپیر اپنی دلجوئی، سقراط اپنی ستم ظریفی اور رابعے اپنی روحانیت سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے تو ان کی قدریں ایک فریب اور ان کی تعلیم ایک مکر اور ریاکاری - اور اگر اپنے عندیوں پر وہ قائم رہتے ہیں اور اپنی "دنیا تسخیر کر لیتے ہیں" تو پھر نتشے کی بغاوت کا پرچم نگوں اور انسان کی بہترین ظفریاب اور سربلند -

نتشے ہمارے ذوقِ جمد کو دعوتِ عمل دیتا ہے اور تقاضا کرتا ہے کہ ہم اس محبت، ہمدردی، رحم دلی، صبر، شفقت اور مروت سے درگزر کریں جو امن اور تحفظ کے نرم بچھونوں پر پلتی ہیں اور جو خطرے سے دور اور امتحان کی سختیوں سے ناآشنا ہیں - ہر وہ نیکی جو مند آرا ہے اور مسلم الثبوت سمجھی جاتی ہے نتشے کی نظروں میں ایک ایسی لاش بن جاتی ہے جس سے برائیوں کا تعفّن پھیلنے لگتا ہو اور جس میں خود غرضی اور مطلب پرستی کے کیڑے رینگنے لگتے ہوں -

زندگی میں پہلی مرتبہ جب نتشے کی کوئی کتاب ہاتھ آتی ہے تو وہ واقعہ جوانی کے اولین حاشقے کی طرح زندگی کے ان ناقابل فراموش لمحوں کی ابدیت اور دائم الحجّت حاصل کر جاتی ہے جس میں نہ صرف محبوب کی ادا، شرمایا ہوا کوئی ادھورا تبسّم - چرائی ہوئی کوئی نیم نگاہی، اور زیر لب کہے ہوئے کوئی ادھورے بول ہی لوح دل پر کندہ ہو جاتے ہیں بلکہ وقت اور مقام اور مقام کی بکھری ہوئی رنگینی اور نغمے بھی دامانِ حیات پر منقش ہو کر سامانِ نشاط اور سرمایۂ حیات بن جاتے

ہیں اور لطف یہ کہ اس کے بعد جب کبھی آپ نشتے کی کوئی کتاب اٹھائیں گے آپ کے دل پر اور آپ کے جذبات پر وہی کیفیت طاری ہو جائے گی جو روزِ اول آپ نے محسوس کی تھی -

اگرچہ وہ دن اور وہ حالات میں آج بھی یاد کر سکتا ہوں جب کانٹ اور ہیگل کی کتابیں میں نے پہلی مرتبہ ہاتھ میں لی تھیں - ایک بار پڑھ چکنے کے بعد میں نے پھر کبھی ان کتابوں کو ہاتھ نہیں لگایا اور شاید کبھی لگاؤں گا بھی نہیں - لیکن میرے لئے یہ ناممکن ہے کہ نشتے کی کوئی کتاب نظر پڑے اور میں اسے کھولے بغیر دو چار صفحے پڑھے بغیر وہاں سے ٹل سکوں - حالانکہ اس کے نظریے سے مجھے شدید ترین اختلاف ہے اور اس کی تصانیف ایک مرتبہ نہیں بارہا شروع سے آخر تک پڑھ چکا ہوں -

نشتے کے کلام میں ایک جادو ہے' ایسا جادو جس کا اثر زندگی بھر زائل نہیں ہوتا اور سر پر چڑھ کر بولتا ہے' اور یہ ہونا چاہیے اس کی مخالفت میں ہی کیوں نہ ہو' اس کی تردید اور تنسیخ میں ہی کیوں نہ ہو - اس کے مطالعے کے بعد آپ سب کچھ کر سکتے ہیں لیکن اس کی طرف سے اغماز نہیں برت سکتے - بے اعتنا اور غیر جانبدار نہیں رہ سکتے - آپ مجبور ہوتے ہیں کہ اپنے رویے کا تعین کریں' اپنے متعلق فیصلہ کریں کہ آپ کی جگہ کونسی صف میں ہے' اس کے مخالفوں کی یا اس کے موافقوں کی - آپ کے لئے بین بین کوئی جگہ نہیں رہتی آپ کو ایک طرف ہونا ہی پڑتا ہے - مجھے اس کے مطالعے نے ہی اس کی صفِ مخالف میں بھیجا ہے اور میرے لئے میرا راستہ صاف کر دیا ہے

اس کا کلام ایک نشہ ہے' تند' تیز' بے پناہ اور نکھرا ہوا' جو آپ کے دماغ کو جھنجھنا دیتا ہے اور آپ کے خون کی گردش میں برق کی جلن بگولوں کی بے تابی اور برفانی ہواؤں کی تندی شامل کر دیتا ہے - اور وہ سکون جو طوفانوں کے دامن میں بے قرار رہا کرتا ہے آپ کی کائنات کو ماں کے آغوش کی طرح گھیر لیتا ہے - اسی کے لفظوں میں آپ محسوس کرنے لگتے ہیں -

خاموش! خاموش! کیا یہ دنیا اس گھڑی مکمل نہیں ہو چکی ہے آخر یہ مجھے کیا ہو رہا ہے؟

جس طرح کہ لطیف ہوا کا نازک جھونکا' نظر سے پوشیدہ' مسطح صفحۂ آب پر رقص کرتا ہے اسی طرح ہلکی' پر کی طرح ہلکی غنودگی مجھ پر رقص کر رہی ہے -

یہ مکمل میری آنکھیں بند نہیں کرتی - یہ میری روح کو بیدار رکھتی ہے ہلکی' یہ پر کی طرح ہلکی غنودگی -

وہ مجھے پھسلاتی ہے' نہ معلوم کس طرح؟ وہ مجھے اندر ہی اندر اپنے محبت آمیز ہاتھوں سے چھوتی ہے - وہ مجھے مجبور کرتی ہے - ہاں وہ مجھے اس بات پر مجبور کرتی ہے کہ میری روح ہاتھ پاؤں پھیلائے -

وہ کس طرح ہاتھ پاؤں پھیلائے سست پڑی ہے' میری عجیب و غریب روح! کیا اس کے پاس ساتویں دن کی اونینڈی رات ٹھیک دوپہر کے وقت آئی ہے کیا وہ بہت دنوں تک اکسٹ گھومتی رہتی ہے - بادلِ خواستہ' خوش و خرم' اور شگفتہ اور رس بھری چیزوں کے درمیان؟

وہ ہاتھ پاؤں پھیلائے لمبی پڑی ہے' لمبی بہت لمبی - وہ چپ چاپ پڑی ہے' میری عجیب روح! وہ اب تک بے حد اچھی نعمتیں چکھ چکی ہے یہ سنہری اداسی اسے کچلے جا رہی ہے - اور وہ منہ بنائے پڑی ہے -

مثل اس جہاز کے جو اپنی پر اسن خاموش کھاڑی میں داخل ہوتا ہے لمبے لمبے سفروں اور دغا باز و ناقابلِ اعتبار سمندروں سے تنگ آ کر - اور اب زمین پر لنگر لگائے بیٹھا ہو - کیا زمین زیادہ قابلِ اعتماد اور وفادار نہیں ہے؟

جس طرح ایک تھکا ماندہ جہاز خاموش ترین پر اسن کھاڑی میں آرام کرتا ہے' میں بھی زمین سے لگ کر آرام کرتا ہوں' وفاداری کے ساتھ بھروسے کے ساتھ' منتظر' اور نازک ترین ڈور سے سے بندھا ہوا -

اے مسرت! اے میری مسرت! کیا تو گائے گی؟ اے میری روح تو تو گھاس پر پڑی ہے - دیکھ! یہ کتنی خاموش خفیہ اور سنجیدہ گھڑی ہے - ایسی کہ چرواہا بھی اپنی بانسری نہیں بجاتا -

تو بھی چین کر! دیکھ گرم دوپہر کھیتوں کے اوپر سو رہی ہے - گامت خاموش! دنیا اپنی تکمیل کو پہنچ چکی ہے -

گامت! اے مرغِ چراگاہ کی سی سبک پرواز میری روح! گامت! دھیمی سے دھیمی آہٹ بھی مت کر! وہ دیکھ' پرانی دوپہر سو رہی ہے - اس کے ہونٹ ہل رہے ہیں - کیا وہ مسرت کی بوند کا مزا نہیں لے رہی ہے - ایک پکی ہوئی سنہری مائل بادامی مسرت کی بوند کا مزا - بادۂ

زرتاب کا مزا۔ کسی چیز کا سایہ اسے چھو رہا ہے۔ یہ اُس کی مسرت ہے جو ہنس رہی ہے۔ گویا خدا ہنس رہا ہے۔ خاموش! زیرِ لب بھی مت بول!

مسرت کے لئے، ہاں مسرت کے لئے کتنی ادنےٰ اور کتنی معمولی سی چیز کافی ہوتی ہے۔ لطیف ترین اور سبک ترین چیزیں — گرگٹ کی سرسراہٹ، ایک سانس، ایک نگاہ، ایک لمحہ — بہترین سے بہترین اور بڑی سے بڑی مسرت کا سرمایۂ حیات ہو سکتے ہیں۔

خاموش! .....

.... کیا؟ کیا دنیا ابھی مکمل نہ تھی؟ گول اور پختہ؟ ...

خاموش!

زردشت نے یہ کہا — خود سے۔

مولانا آزاد کو خراجِ تحسین

ایران کے سرکردہ روزنامہ "اطلاعات" کے ایڈیٹر مسٹر مسعودی نے بھارت کے وزیرِ تعلیم مولانا ابوالکلام آزاد کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے لکھا ہے کہ بھارت میں پنڈت نہرو کے بعد مولانا آزاد سب سے زیادہ ممتاز اور فاضل شخصیت ہیں۔

یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ کچھ مدت پیشتر ایرانی صحافیوں کا جو وفد بھارت کا دورہ کرنے کے لئے آیا تھا مسٹر مسعودی اس کے قائد تھے

مسٹر مسعودی نے مزید لکھا ہے کہ مولانا آزاد اور پنڈت نہرو کا نظریہ ایک ہے بھارت کی اندرونی سیاسیات میں اور فرقہ وارانہ اختلافات و انتشار پسندانہ رجحانات کو ختم کرنے میں وہ نمایاں پارٹ ادا کرتے ہیں۔ بھارت کا دورہ کرتے ہوئے ایرانی صحافیوں کو ان سے دل کھول کر اور آزادانہ بات چیت کرنے کا موقعہ ملا تھا۔ مولانا آزاد اس خیال کے حامی ہیں کہ مذہب کو سیاسیات سے کوئی واسطہ نہیں اور کسی ملک کے نظم و نسق کی بنیاد مذہب پر نہیں رکھی جا سکتی۔ انہوں نے بات چیت کے دوران میں ایرانی صحافیوں کے وفد کو بتایا کہ بھارت کی موجودہ سرکار گاندھی جی کی تعلیمات کے مطابق ہندو، مسلم، سکھ اور عیسائی وغیرہ تمام فرقوں کے افراد سے مساوی سلوک کرنے کی پالیسی پر عمل پیرا ہے۔ بھارت کے سرکاری دفتروں اور قومی و نجی اداروں میں تمام فرقوں کے افراد مل جل کر کام کر رہے ہیں مولانا آزاد نے بتایا کہ بھارت میں مسجدوں اور مندروں میں دوسرے فرقوں کے افراد کو داخل ہونے کی بھی اجازت ہے اور مختلف فرقوں کے افراد ایک دوسرے کے تہواروں میں شریک ہوتے ہیں انھوں نے ڈاکٹر راجندر پرشاد اور پنڈت نہرو کی خاص طور پر تعریف کی کہ وہ عید کی تقاریب میں شامل ہوتے ہیں اور مسلمانوں میں مٹھائیاں تقسیم کرتے ہیں۔

مولانا آزاد کے ساتھ اپنی بات چیت کا ذکر کرتے ہوئے مسٹر مسعودی نے مزید لکھا ہے کہ وہ (مولانا آزاد) بھی ہندوؤں کے تہواروں میں شریک ہوتے ہیں انہیں توقع ہے کہ بھارت سرکار کی موجودہ جمہوری پالیسی بالآخر ملک کے مختلف فرقوں میں مکمل امن اور دوستی کی فضا پیدا کرنے میں کامیاب ثابت ہوگی۔

فارسی زبان سے مولانا آزاد کی دلچسپی کا ذکر کرتے ہوئے مسٹر مسعودی لکھتے ہیں کہ مولانا آزاد بھارت میں فارسی زبان کی تعلیم کو ایرانی معیار پر لائے جانے کے حق میں ہیں۔

آخر میں مسٹر مسعودی نے ایران کی وزارت تعلیم سے اپیل کی کہ وہ بھارت میں فارسی کی تعلیم کا معیار بلند کرنے کے لئے وزارت تعلیم سے تعاون کریں۔

رضیہ سجاد ظہیر

ہاتھ

جب اُس نے ایک دم پھاٹک کی آڑ سے نکل کے کہا "نمستے" تو میں ذرا سا تو ضرور گھبرا گئی تھی - بات یہ ہے کہ میٹنگ سے نکلتے وقت تو کئی لوگ ساتھ تھے لیکن نہ جانے کیسے پھاٹک تک پہنچتے پہنچتے میں اکیلی رہ گئی تھی - ایک دفعہ میں نے پیچھے مُڑ کر دیکھا بھی تھا کہ کوئی اور آ رہا ہے کہ نہیں لیکن وہ دو تین ساتھی جو میرے ساتھ چل رہے تھے انھیں راستے میں کچھ اور لوگ مل گئے تھے اور شاید کوئی بحث چل پڑی ہوگی - لہٰذا میں اکیلی ہی روانہ ہوگئی تھی - جاڑوں کا زمانہ تھا جب چھ بجے ہی اچھی خاصی رات آجاتی ہے، سڑک پر سناٹا تھا اور مجھے جس بات سے اور بھی گھبراہٹ ہوئی وہ یہ تھی کہ وہ ہانپ رہا تھا -

اندھیرے میں اس کے تین نقش تو میں اچھی طرح نہیں دیکھ پائی لیکن اتنا اندازہ ضرور ہوا کہ اس کا قد درمیانہ ہے، جسم تندرست اور رنگ صاف - عمر بیس اکیس سال سے زیادہ نہیں لگتی تھی - کالے رنگ کی گرم پتلون پہنے تھا - بھورے رنگ کا پورے آستینوں کا سویٹر — جُوتے اندھیرے میں دکھائی نہیں دیئے -

"بھئی معاف کرنا میں نے تمہیں پہچانا نہیں — میں نے اس کی نمستے کے جواب میں کہا - یہاں اندھیرا بہت ہے" — وہ ہنسنے لگا، اس کی ہنسی بڑی پُرخلوص اور معصوم تھی - اندھیرے کا کیا سوال ہے اگر اُجالا ہوتا تب بھی آپ مجھے نہیں پہچانتیں اس لئے کہ آپ نے مجھے کبھی دیکھا ہی نہیں ہے - میں نے بھی آپ کو آج اس میٹنگ میں پہلی بار دیکھا — کچھ دیر خاموشی رہی - ہم لوگ چلتے رہے - اور یونین کی بلڈنگ کے قریب پہنچ گئے - "اچھا تو تم بھی اسی میٹنگ سے آ رہے ہو" - میں نے بات کرنی شروع کی - ویسے دراصل اس سوال سے میرا یہ مطلب تھا کہ اگر اسی میٹنگ سے آ رہے ہو تو میری کہانی کے بارے میں کچھ کیوں نہیں کہتے

وہ ذہین نکلا اسمجھ گیا - آہستے سے بولا "مجھے آپ کی کہانی بہت اچھی لگی اور میں یہی پوچھنا چاہتا تھا کہ آپ جو یہ .... پھر ذرا رُک کے بولا دیکھئے میرا نام سوشیل مسرا ہے - مَیں ہندی میں ایم اے کر رہا ہوں اور کہانیاں لکھنے کا مجھے بھی شوق ہے — میں نے آپ کی دو تین کہانیاں ہندی کے میگزینوں میں دیکھی تھیں، دو تین ریڈیو پر سُنیں اور میرے دو ایک دوستوں نے جو اردو جانتے اور آپ سے بھی ملتے رہتے ہیں مجھے یہ بتایا ہے کہ ... دیکھئے میں چاہتا ہوں اگر آپ کے پاس تھوڑا ٹائم ہو تو آپ کبھی کبھار میری کوئی کہانی سُن لیا کریں" -

"ضرور — شوق سے! میں نے جواب دیا" میں شام کو چھ بجے تک کالج سے گھر آجاتی ہوں — اتوار اور سوموار کی شام چھوڑ کر جبکہ مجھے میٹنگوں میں جانا ہوتا ہے، جس دن تمہارا سبیتا ہو - ضرور آجاؤ" -

"بہت اچھا — اُس نے کہا پھر ذرا رُک کے بولا" یہ اپنی ایک کہانی میں لیتا آیا تھا اور اس نے جیب سے چند صفحے نکالے — اب مجھے معلوم ہوا کہ جب اس نے مجھے نمستے کی تھی تو وہ ہانپ کیوں رہا تھا میٹنگ ختم ہونے کے بعد وہ دوڑ دوڑا ہوسٹل گیا ہوگا اور اپنے کاغذوں میں سے کہانی نکال کر دوڑا دوڑا ہی واپس آیا ہوگا — تب تک میں پھاٹک پر پہنچ چکی تھی -

اب ہم لوگ پُل کے بالکل نزدیک سڑک پر لگی ہوئی ایک لالٹین کے نیچے آگئے تھے - وہیں بس اسٹینڈ بھی تھا - اس نے کہانی کے صفحے میری طرف بڑھائے اور بتی کی روشنی میں میں نے دیکھا، اُس کے ہاتھ بہت ہی خوبصورت تھے - لمبی لمبی پتلی پتلی انگلیاں، ناخن بہت ہی صاف، ہاتھ کی پشت پر دو تین نیلی نیلی رگیں اُبھری ہوئی جو گوری جلد میں سے جھلکتی

ہوئی بہت اچھی لگ رہی تھیں' تیسری انگلی میں ایک پتلی سی سونے کی انگوٹھی تھی جس میں کوئی عُنابی رنگ کا نگ جڑا ہوا تھا - میں نے دل میں سوچا کہ منگنی کی انگوٹھی ہوگی' پھر جلدی سے ان کاغذوں کو دیکھ کر بولی" بھئی میں چھپی ہوئی ہندی تو پڑھ لیتی ہوں مگر لکھی ہوئی ابھی نہیں پڑھ پاتی - تم ایسا کرو کل اس کہانی کو لے کر میرے یہاں آجاؤ - کوئی چھ بجے - مجھے خود ہی پڑھ کر سناؤ - اس کے چہرے پر پہلے ایک خوشی کی لہر آئی - پھر اُداسی کی ایک جھلک "چھ بجے تو میں نہیں آسکوں گا - مجھے کام رہتا ہے"۔

"اچھا تو چار بجے آؤ"۔

"جی ہاں - چار بجے آسکتا ہوں — آپ کیسے جائیں گی' بس سے؟ اس نے دُور سے آتی ہوئی بس کو دیکھ کر پوچھا - "میں عام طور پر بس میں نہیں بیٹھتی ہوں لیکن فوراً ہی بس مل جانے کے خیال سے اسٹینڈ پر کھڑی ہوگئی' وہ بھی میرے پاس ہی کھڑا ہوگیا اور بس کے اسٹینڈ والے کھمبے پر رکھے ہوئے اس کے داہنے ہاتھ پر میری نظر پھر پڑی — سچ مچ اس کا ہاتھ بہت ہی خوبصورت تھا - اور میں نے سوچا کہ اس ہاتھ سے لکھی ہوئی کہانی بھی خوبصورت ہونی چاہیئے - دیکھیں کیسی ہوتی ہے -

دوسرے دن شام کو چار بجے وہ میرے گھر آیا - میں چند ہی منٹ پہلے کالج سے آئی تھی لہٰذا جہاں بیٹھی چائے پی رہی تھی وہیں اس کو بھی بُلوالیا - وہ اندر آیا تو اس کے ہاتھ میں ایک معمولی کپڑے کا سِلا ہوا تھیلا تھا' اس نے تھیلا میرے لکھنے کی میز کے پائے سے ٹکا کر رکھ دیا اور ہنستے کر کے کُرسی پر بیٹھ گیا - میں نے یوں ہی کہا" کیوں بھئی کیا تھیلا بھر کے کہانیاں لائے ہو؟ وہ ہنسا پھر بولا "جی نہیں - اس میں تو میرے کپڑے ہیں - پھر اُس نے کہانی نکالی اور سُنانی شروع ہی کی تھی کہ میں نے" بھئی ذرا ٹھہرو - میں پنسل کاغذ لے لُوں ویسے مجھے یاد نہیں رہے گا کیا کیا کہنا ہے کہانی سُنتے سُنتے میں کبھی کبھی بحث طلب بات بھول جاتی ہوں — وہ رُک گیا - میں اپنی کُرسی سے اُٹھ کر میز پر پنسل تلاش کرنے لگی - یکایک میری نظر اس کے تھیلے پر گئی جو میز کے پائے سے لگا رکھا تھا - اس میں ایک خاکی پتلون اور ایک میلی سی دھاری دار قمیص لپٹی رکھی تھی' ایک کالا گرم سویٹر اور اخبار کے کاغذ میں لپٹے ذرا پھٹے سے کینوس کے جُوتے تھے' ایک اور چھوٹا سا بنڈل تھا اس میں نہ جانے کیا تھا -

تھوڑی سی تلاش کے بعد مجھے پنسل مل گئی - میں پنسل کاغذ لے کر تخت پر بیٹھی اور وہ اپنی کُرسی ذرا اور قریب کھینچ کر کہانی سُنانے لگا کہانی چھوٹی سی تھی مگر گھٹی ہوئی' چھوٹے چھوٹے پتے تلے جُملے - سادی سی زبان واقعہ معمولی تھا لیکن لکھنے والے نے وہ تمام پہلو اُبھار دیئے تھے جو ایک معمولی واقعہ کو ایک موثر کہانی بناتے ہیں! پوری کہانی کو سُن کر میں اس نتیجے پر پہنچی کہ لکھنے والا ہونہار ہے! میں نے کچھ باتیں نوٹ کی تھیں ان پر اس سے بحث کی - اور اس سے بحث کر کے بھی مجھے بہت خوشی ہوئی کیونکہ اسے بحث کرنے کا بڑا سلیقہ تھا - پہلے میری بات بہت خاموشی اور دھیان سے سُنتا تھا پھر آہستہ آہستہ اپنی بات اس طرح کہتا تھا جیسے اسے اپنی بات کے صحیح ہونے کا پورا یقین ہو اتنی کم عمری میں اس کی یہ خود اعتمادی مجھے اچھی لگی - کہانی میں دو تین جگہ جذبات بڑی شدت سے اُبھر آئے تھے لیکن خود وہ بہت ہی ٹھہراؤ سے بات کرتا تھا اور میں نے سوچا کہ جو شخص خود جذباتی ہوتے بغیر فن میں جذبات سے کام لینا جانتا ہو اُسے تو آگے چل کر کامیاب فنکار بننا چاہیئے -

آخر میں میں نے اس سے کہا" سوشیل تم ہندی میں لکھتے ہو اور میں تو بہت ہی کم ہندی جانتی ہوں لیکن مجھے تمہاری کہانی کو سمجھنے میں ذرا سی بھی دقت نہیں ہوئی - وہ خوش ہوا پھر ذرا سنجیدہ ہو کر بولا" میں پریم چند سے بہت متاثر ہوں - کوشش بھی یہی کرتا ہوں کہ بول چال کی زبان لکھوں — جیسے میرے گھر میں بزرگوں نے اردو ہی پڑھی تھی اور میں تو بس اپنے گھر کی زبان لکھتا ہوں" - جب وہ کہانی کے ورق سمیٹنے لگا تو میری نظر پھر اس کے ہاتھ اور تیسری اُنگلی میں پہنی ہوئی انگوٹھی پر گئی - میری نظریں انگوٹھی پر پڑتے دیکھ کر وہ ذرا سا مُسکرایا پھر دھیمے سے بولا" یہ میری منگنی کی انگوٹھی ہے - جب میری منگنی ہوئی تھی تو میں صرف ۱۴ برس کا تھا - اس وقت یہ انگوٹھی میری بیچ کی اُنگلی میں ڈھیلی آتی تھی اب تو تیسری انگلی میں بھی پھنس کر آتی ہے — میرا دل چاہا اُس کی منگیتر کے بارے میں پوچھوں لیکن وہ یکایک بولا" کیا بجا ہے"

"چھ بجنے میں دس منٹ ہیں" میں نے گھڑی کو دیکھ کے جواب دیا۔
"ارے! تب تو مجھے جانا چاہئے"۔ اس کی یہ جلدی مجھے کسی قدر عجیب تو ضرور لگی لیکن میں نے اس سے کچھ پوچھا نہیں۔

اس کے بعد وہ کبھی کبھی میرے یہاں آتا تھا اور ہر مرتبہ کے بعد میرے دل میں اس کی عزت اور محبت بڑھتی جاتی تھی لیکن وہ ہمیشہ چھ بجے سے پہلے چلا جاتا تھا اور اس سلسلے میں وقت کا اتنا پابند تھا کہ مجھے ذرا کرید ہونے لگی کہ آخر یہ چھ بجے جاتا کہاں ہے۔ اس نے مجھے اپنے بارے میں بہت سی باتیں بتائی تھیں کہ وہ ایک معمولی پوسٹ ماسٹر کا لڑکا تھا کئی بھائی بہن تھے اور سب پڑھ رہے تھے۔ ایک دن اس نے ہنس ہنس کر مجھے اپنی ایک ٹیوشن کا قصہ بھی سنایا کہ کس طرح ایک میر گھرانے کے کوڑھ مغز صاحبزادے اسے اپنا ٹیوٹر رکھ کر یہ سمجھ بیٹھے تھے کہ وہ اُن کا ذہنی غلام بھی ہے۔ اور کس طرح آخر میں اپنی خودداری کو قائم رکھنے کے لئے اسے چالیس روپے ماہوار کا ٹیوشن چھوڑ دینا پڑا تھا ــــ یہ سب کچھ بتانے کے بعد بھی چھ بجے والا معاملہ راز ہی رہا اور میں نے اپنی جگہ یہ سمجھ لیا کہ ضرور اس بات میں صنفِ نازک کا کچھ تعلق ہے سمجھی تو مجھے نہیں بتاتا۔ آخر ہر بات بزرگوں کو بتائی بھی کیوں جائے یہ اس کا جمہوری حق ہے کہ وہ اپنا کوئی محبوب راز اپنے ہی تک رکھے۔ یہاں تک کہ وہ شام آگئی جس کے بارے میں آپ کو بتانے کے لئے میں نے یہ لمبی چوڑی تمہید باندھ کر آپ کا اتنا وقت ضائع کیا۔

اس شام کو وہ میرے یہاں ذرا جلدی آگیا تھا۔ یعنی کوئی تین بجے کے قریب۔ کیونکہ اُسے معلوم تھا کہ اس دن میرا کالج آدھے دن کا ہوتا ہے۔ وہ ایک نئی کہانی بھی اپنے ساتھ لایا تھا جو بہت ہی پیاری تھی۔ میں نے اس سے بڑے اصرار سے کہا کہ اپنے کسی دوست سے اس کو اردو میں لکھوا دو تاکہ کسی اردو کے رسالے میں چھپوائی جاسکے۔ کہانی ختم ہونے کے بعد میں نے اس کے لئے چائے بنائی۔ جب وہ پیالی لینے کے لئے ہاتھ بڑھا رہا تھا تو میری نظریں پھر اس کے ہاتھ پر گئیں اور اچانک مجھے ایک دھکا سا لگا۔ تیسری انگلی میں انگوٹھی نہیں تھی۔

اس کی نظریں میری نظروں کا پیچھا کر رہی تھیں۔ جب میں نے نگاہیں اٹھا کر اس کو دیکھا تو وہ ایک جاننے بوجھنے انداز سے مسکرایا "انگوٹھی تو چلی گئی رضیہ آپا ــــ صرف نشان چھوڑ گئی" ــــ اس نے ہاتھ کو ذرا سا اوپر اُٹھایا ــــ لمبی لمبی پتلی پتلی انگلیاں، ناخن بہت صحیح۔ ہاتھ کی پشت پر دو تین نیلی نیلی رگیں اُبھری ہوئی جو گوری جلد میں سے جھلکتی ہوئی بہت اچھی لگ رہی تھیں اور تیسری انگلی پر ایک مدت تک پہنی ہوئی انگوٹھی کا صرف نشان۔ ہاتھ نیچے کرتے وقت وہ پھر مسکرایا اور اس مسکراہٹ میں جو بات مجھے بھا گئی وہ یہ تھی کہ دُکھ تو اس میں بہت تھا لیکن تلخی ذرا سی بھی نہیں تھی۔ میں نے اس کی بات کا جواب نہیں دیا سمجھ ہی میں نہیں آرہا تھا کیا کہوں۔ خاموشی سے چائے میں چمچہ ہلاتی رہی۔ اس نے چائے کا ایک گھونٹ پیا اور آہستہ سے بولا "میری منگیتر پڑھی لکھی لڑکی تھی اور مجھے معلوم ہے کہ جو کچھ ہوا اس کی مرضی کے بغیر نہیں ہوا اس لئے مجھے یہ اطمینان ہے کہ اس پر کوئی زبردستی نہیں کی گئی۔ پھر ذرا رُک کے بولا "آخر آرام کی زندگی تو ہر شخص ہی بسر کرنا چاہتا ہے۔ ہے نا؟ ــــ میں نے آہستہ سے کہا "ہوں"۔ اس نے میری طرف غور سے دیکھا۔ میری آنکھوں نے اُسے یقین دلایا کہ "ہاں ہاں کہتے چلو ــ خوشی کی بات کہو چاہے غم کی ــــ گہرے پانی میں چاہے پھول ڈال دو چاہے کوڑا۔ دونوں ہی تہہ میں چلے جائیں گے"۔

اسے ضرور کچھ اطمینان ہوگیا ہوگا کیونکہ اس کے بعد وہ بڑی دیر تک بیٹھا اپنی منگیتر کے بارے میں باتیں کرتا رہا۔ اس کے بات کرنے کا انداز کچھ ایسا تھا جیسے کسی سے مخاطب نہ ہو جیسے اپنے آپ ہی سے بات کر رہا ہو، جیسے کوئی خواب بیان کر رہا ہو ــ ایک ایسا خواب جو اگرچہ ٹوٹ چکا تھا مگر تھا بہت شیریں جس کی مٹھاس کا احساس اس کے ٹوٹ جانے کی تکلیف سے بھی زیادہ پیارا تھا۔ ایک مرتبہ بھی اس نے اپنی منگیتر کی نہ کوئی شکایت کی نہ اس پر کوئی الزام لگایا۔ نہ ہی اپنی کسی کمزوری یا کسی غلطی کا ذکر کیا۔ میں چُپ چاپ سُنتی رہی۔ یکایک اس نے پوچھا "چھ بج گئے"

میں نے گھڑی دیکھی "نہیں تو ــــ ابھی تو تیرہ، چودہ، تقریباً پندرہ منٹ باقی ہیں"۔

"اچھا تو میں چلوں" ــــ وہ کھڑا ہوگیا اور اپنا تھیلا اُٹھایا کیونکہ تھیلا وہ ہمیشہ اپنے ساتھ لاتا تھا۔ بے اختیار میرا دل چاہا کہ آج

اس سے پوچھ ہی لوں کہ یہ کیا قصّہ ہے کیونکہ اب مجھے یقین سا ہو چلا تھا کہ اس کی منگنی کے ٹوٹنے میں بھی ضرور اس چھ بجے کا کچھ ہاتھ ہے لیکن پوچھتے نہیں بنی - بات کو گھما کر بولی "سوشیل! آج تو ہم بھی سات بجے کے بعد یونیورسٹی جائیں گے! وہاں ایک موسیقی کی تقریب ہے نہ - تم ذرا دیر رُکو تو ساتھ چلے چلیں"۔ اس نے حسرت سے میری طرف دیکھا اور آہستہ سے بولا "مجھے تو سنگیت سے بہت ہی پیار ہے لیکن میں چھ بجے اور دس بجے کے بیچ کہیں جا نہیں سکتا۔ مجھے ایک جگہ جانا ہوتا ہے اگر وہاں نہ جا سکا تو گڑبڑ ہوگی"۔ اور یہ سوچ کر مجھے آج تک دُکھ ہوتا ہے کہ اگرچہ میں نے اس پر ظاہر تو نہیں کیا تھا لیکن ایمان کی بات یہ ہے کہ اس وقت مجھے اس پر غصّہ آگیا تھا۔ اُونہہ! ایسا بھی کیا عشق کہ روزانہ کی حاضری میں گھنٹے آدھ گھنٹے کا فرق نہ پڑے جبھی تو اپنی منگیتر کو کچھ کہنے کا منہ نہیں ہے۔ ظاہر ہے کھسے کہے گا جبکہ خود ہی .....

جب میرا رکشا حضرت گنج پہنچا تو بس چار بلاک سے آتی دکھائی دی میں نے اس خیال سے فوراً رکشا چھوڑ دیا کہ بس میں چلی جاؤں گی تو آٹھ آنے بچ جائیں گے۔ لیکن جب رکشا والے کو پیسے دوں اور سڑک پار کر کے بس کے اڈّے تک پہنچوں بس نو دو گیارہ ہو گئی۔ کھسیاہٹ اس لئے اور بھی زیادہ ہوئی کہ اڈّے پر میرے واقف کاروں میں سے ایک صاحب کھڑے تھے۔ وہ بھی اسی تقریب میں یونیورسٹی ہی جا رہے تھے۔ مجھے آتا دیکھ کر رُک گئے۔ لہٰذا بس ان کے ہاتھ سے بھی گئی۔ یوں بھی دیر ہو گئی تھی اس لئے اب دوسری بس کا انتظار کرنا فضول تھا چنانچہ انہوں نے ایک مڑتے ہوئے رکشا کو آواز دی اور ہم دونوں جلدی جلدی قدم اُٹھاتے اس میں جا کر بیٹھے اور یونیورسٹی کی طرف روانہ ہو گئے۔ راستے میں کسی بات پر بحث ہونے لگی اور بحث کے دوران میں انہوں نے ایک ایسی مثال دی کہ میں زور سے کھلکھلا کے ہنس پڑی۔ پل پر میرے ساتھی نے رکشا والے سے کہا "بھئی رکشا والے دوسرے پھاٹک سے چلن اچھا۔ رکشے والے نے گردن ہلا دی۔ انہوں نے پھر کہا "پھاٹک سے سیدھے اندر چل کے جولال بلڈنگ ہے نہ۔ اس کے سامنے روک لینا۔ سمجھے۔ رکشے والے نے پھر گردن ہلا دی۔ یہ رکشے والا کیا گونگا ہے۔ جواب نہیں دیتا" میں نے دھیمے سے کہا۔ جو صاحب میرے ساتھ تھے وہ ازحد پریکٹیکل واقع ہوئے ہیں۔ بولے گونگے ہونے سے کیا فرق پڑتا ہے۔ رکشا تو تیز چلا لیتا ہے۔ ہمیں اس سے کوئی تبادلۂ خیالات کرنا ہے؟

ہم دونوں منزلِ مقصود پر پہنچے تو میں نے رکشے سے اُتر کر اپنی بیگ سے ایک روپے کا نوٹ نکالا اور رکشا والے کی طرف بڑھایا۔ اس نے جلدی سے نوٹ لے لیا اور سوئیٹر کے اندر قمیص کی جیب میں ہاتھ ڈال کر کچھ ریزگاری نکالی۔ جہاں رکشا کھڑا تھا وہاں اندھیرا بہت تھا۔ لہٰذا میں ایک قدم آگے بڑھی اور سائیکل میں لگے ہوئے لیمپ کی روشنی میں وہ اپنے ایک ہاتھ کی ہتھیلی پر پیسے رکھ کے دوسرے ہاتھ کی انگلیوں سے گننے لگا۔ میں نے اپنی آنکھیں ملیں۔ یہ کیا دکھائی دے رہا ہے۔ پھر ایک ہاتھ اپنی انگلیوں میں آٹھ آنے کی ریزگاری دبائے میری طرف بڑھا ـــ لمبی لمبی پتلی پتلی انگلیاں، ناخن بہت ہی سجل، ہاتھ کی پشت پر دو تین نیلی نیلی رگیں اُبھری ہوئی جو گوری جلد میں سے جھلکتی ہوئی بہت اچھی لگ رہی تھیں اور تیسری انگلی پر ایک مدّتوں تک پہنی ہوئی انگوٹھی کا صرف نشان۔

ضروری اطلاع

بعض وجوہ سے "خطوط نمبر" مارچ ۱۹۵۴ء کے عوض
ماہ اپریل ۱۹۵۴ء میں شائع ہوگا۔
ناظرین نوٹ فرمالیں۔ قیمت فی پرچہ آٹھ آنے (ادارہ)

باقر مہدی

کشمکش

ہے میری رسم وفا پاسِ محبّت کے لئے
بیقراری کا میں اظہار کروں یا نہ کروں

عقل کی شمع نئے عشق کی مشعل ہے مگر
وحشتِ دل سے میں انکار کروں یا نہ کروں

حُسنِ معصوم بھی بیگانۂ آلام نہیں
عشقِ شوریدہ کو بیدار کروں یا نہ کروں

جانے نغموں میں محبت کا اثر ہو کہ نہ ہو
تیز تر گرمیٔ گفتار کروں یا نہ کروں

بیخودی وجہِ سکونِ دلِ ناداں نہ ہوئی
خود کو رسوا سرِ بازار کروں یا نہ کروں

اپنے اشکوں کی زباں کون سمجھ سکتا ہے
دلِ ناشاد کو خونبار کروں یا نہ کروں

خونِ دل اپنا ابھی نذرِ بُتاں ہوتا ہے
سوچتا ہوں تجھے غمخوار کروں یا نہ کروں

زندگانی کا سفر سخت بھی دشوار بھی ہے
ہمسفر! تجھ سے میں اصرار کروں یا نہ کروں

سکندر علی وجد

کشمکش

فکرِ گلریز کو خونبار کروں یا نہ کروں
شرحِ رسم رسن و دار کروں یا نہ کروں

ایک مدّت سے ہے دل شانہ کشِ زلفِ جمال
اس کو آمادۂ پیکار کروں یا نہ کروں

جوہرِ سوزِ تمنّا ہے میرا خونِ جگر
صرفِ رنگینیٔ اشعار کروں یا نہ کروں

بجلیاں جن سے برستی ہیں ستم زاروں پر
اُن خیالات کا اظہار کروں یا نہ کروں

مُشتعل اور بھی ہو جائے نہ صیّاد کہیں
یادِ یاران گرفتار کروں یا نہ کروں

ہو رہا ہے ابھی اپنوں کی جفاؤں کا بیان
ذکرِ بے مہریٔ اغیار کروں یا نہ کروں

باغ میں خونِ شہیداں سے بہار آئی ہے
زیبِ تن جامۂ گلنار کروں یا نہ کروں

آج کیوں پُوچھ رہی ہے گلِ خنداں سے نسیم
خدمتِ نرگسِ بیمار کروں یا نہ کروں

قتلِ معصوم ستاروں کا ہوا ہے لیکن
چاک دامانِ شبِ تار کروں یا نہ کروں

مُلکِ زرمست سے اُٹھی ہے غضب کی آندھی
اہلِ عالم کو خبردار کروں یا نہ کروں

محمد مصلح الدین احمد

سر بنیگل نرسنگ راؤ آنجہانی

آزادی کے حصول کے بعد ہندوستان نے اقوام متحدہ میں بھی شاندار حصہ ادا کیا جس کے باعث ہندوستان کا وقار آزاد اقوام کی نظر میں کافی بلند ہو چکا ہے۔ اس ضمن میں سر بنیگل نرسنگ راؤ آنجہانی کی کوششوں کو خاص دخل حاصل ہے۔ جن کی انتھک مساعی کے باعث ہندوستان نے آج عظیم مرتبہ حاصل کیا ہے۔ آپ نے دو سال کی مختصر سی مدت میں کئی ممالک کو ہندوستان کا دوست بنا لیا اور اقوام متحدہ کے کئی مسائل میں ایسی موزوں و حق بجانب پالیسی اختیار کی جس کی وجہ سے ساری دنیا کی نظریں ہندوستان کی پالیسی پر مرکوز ہو گئیں۔ مسٹر راؤ کے تقرر سے قبل ہندوستان کا اقوام متحدہ میں اتنا بلند مقام نہ تھا لیکن سر بی، این راؤ نے اپنی غیر معمولی قابلیت، سادگی، ملنساری اور حقیقت افروز تقاریر کے ذریعے صورت حال بدل دی۔ آج مسٹر راؤ کی کوششوں کے باعث اقوام متحدہ میں ہندوستان نے وہ خاص مقام حاصل کر لیا ہے جو آج تک کسی ایشیائی ملک کو حاصل نہ ہو سکا اور کوئی ایشیائی مسئلہ بغیر ہندوستان کی مرضی معلوم کئے حل نہیں کیا جاتا اور تمام بین الاقوامی مسائل میں ہندوستان کی رائے کا احترام کیا جاتا ہے۔ مسٹر راؤ نے ہندوستان کا اقوام عالم کی نظر میں وقار بلند کر کے اپنا مقام بلند کر لیا تھا۔ یہ ایسا مشکل کام تھا جس کی تکمیل دوسروں سے مشکل تھی۔ مسٹر راؤ کی کوششوں کے باعث اقوام متحدہ کی مختلف مجالس میں ہند کو کافی نمائندگی دی گئی۔ آزاد ہندوستان کو آزاد اقوام سے روشناس کرانے میں سر بنیگل نرسنگ راؤ نے وہ عظیم خدمت انجام دی ہے جسے بھارت ہرگز فراموش نہیں کر سکتا۔ ہندوستان کو آزاد ممالک کی صف میں اور اقوام متحدہ کے رکن ممالک میں نمایاں مقام دلانے میں مسٹر راؤ کا خاص حصہ رہا ہے۔ آپ جدید ہندوستان کے معماروں میں سے تھے۔ جنھوں نے ملک سے باہر رہ کر ملک کی ٹھوس خدمت انجام دی۔ آزادی کے حصول سے قبل آپ نے سول سرونٹ کی حیثیت سے ہندوستان کی اور ۱۵۔ اگست کے بعد انٹرنیشنل سول سرونٹ کی حیثیت سے اقوام عالم کی خدمت کی۔ سر بنیگل نرسنگ راؤ نے ہندوستانی مستقل مندوب برائے اقوام متحدہ صدر صیانتی مجلس و جوہری توانائی کمیشن و نائب صدر بین الاقوامی قانونی کمیشن اور بین الاقوامی عدالت انصاف کے جج کی حیثیت سے قیام امن کے لئے مقدور بھر کوشش کی۔ آپ اقوام متحدہ کے صف اول کے سیاست دانوں میں سے تھے۔ آپ کچھ عرصے سے زیر علاج ہسپتال میں سخت علیل اور آنتوں کے خطرناک مرض میں مبتلا تھے۔ آپ کا انتقال ۳۰۔ نومبر ۱۹۵۳ء کو صبح کے سات بجے ہوا۔ بستر مرگ پر آپ کے دونوں بھائی مسٹر بی راما راؤ گورنر ریزرو بنک آف انڈیا اور مسٹر بی شیوا راؤ رکن پارلیمان موجود تھے۔ آپ کی بے وقت موت سے ہندوستان کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا ہے۔

حالات

مسٹر نرسنگ راؤ ۲۶ جنوری ۱۸۸۸ء کو جنوبی کرناٹک کے ایک گاؤں بنگل میں پیدا ہوئے۔ آپ نے مدراس پریسیڈنسی کالج سے بی اے پاس کیا۔ بعد ازاں ٹرینٹی کالج کیمبرج میں شریک ہوئے۔ آپ کے مضامین طبیعیات و ریاضی تھے۔ خصوصاً آپ کو ریاضی سے دلچسپی تھی۔ یہ چیز بہت کم ماہرین دستور اور سیاست دانوں میں دیکھی گئی ہے۔ اس وقت آپ کو فیلوشپ کی پیشکش کی گئی جس کو آپ نے مسترد کرنے کے بعد ای سی ایس کا امتحان ۱۹۱۰ء میں پاس کیا۔ مسٹر راؤ کا پہلا تقرر اسسٹنٹ کلکٹر کی حیثیت سے عمل میں آیا۔ اس حیثیت سے ترقی کر کے عالی عدالت کا جج بننا یقیناً حیرت انگیز ہے۔ آپ نے ۱۹۱۹ء سے ۱۹۳۶ء تک مجسٹریٹ اور پھر چار سال تک شریک جسٹریٹ کی حیثیت سے کام کیا جہاں سے آپ کا محکمۂ عدالت آسام کو تبادلہ کیا گیا۔ بنگال میں آپ نے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ اور ملیریائی بورڈ کے صدر کی حیثیت سے کام کیا اور دیہاتی عوام کے علاج کے لئے ایک اسکیم بنائی۔ سلہٹ کے

ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کی حیثیت سے اس طبقہ کے علاج کی حوصلہ افزائی کی اور آپ کی پرخلوص کوششوں کے باعث جذام کا دواخانہ قائم کیا گیا۔ ۱۹۲۶ء سے ۱۹۳۳ء تک مسٹر راؤ معتمد محکمۂ قانون رہے۔ پھر انھیں معتمد لیجسلیٹو کونسل اور پھر ایڈیشنل سیکرٹری جنرل مقرر کیا گیا۔ صوبائی صلیب احمر کی معتمدی کے عہدہ کے حصول کے بعد آپ نے بچوں اور خواتین کی بہبود کے لئے ایک اسکیم بنائی۔ لیجسلیٹو کونسل کے معتمد کی حیثیت سے "مانٹیگو فورڈ اصلاحات" کے وقت کافی کام کیا۔ ۱۹۲۳ء سے آپ میدانِ قانون میں داخل ہوئے۔ جب کہ آپ کو لیجسلیٹو کونسل کا شریک معتمد بنایا گیا تھا۔

کلکتہ ہائیکورٹ کے جج کی حیثیت سے

حکومتِ ہند نے مسٹر راؤ کی اعلیٰ قانونی صلاحیتوں سے کامل واقفیت کے بعد انھیں ۱۹۳۹ء میں کلکتہ ہائی کورٹ کا جج مقرر کیا۔ آپ اس عہدہ پر ۱۹۴۴ء تک فائز رہے۔ آپ نے جج کی حیثیت سے اپنے فرائض بخوبی انجام دیے۔ ۱۹۳۵ء میں رفارمس ایکٹ کے نافذ ہونے کے باعث آپ کو کمشنر اصلاحات بنایا گیا۔ بعد میں حکومت نے جی۔ آئی۔ پی ریلوے کے مزدوروں کی شکایات کی سماعت کے لئے ایک کمیٹی مقرر کی۔ جس کے صدر کی حیثیت سے آپ کا انتخاب کیا گیا۔ کئی اہم مسائل میں گورنر جنرل ہند کو بیش بہا مشورے دیتے رہے۔

وزیر اعظم جموں و کشمیر

حکومتِ کشمیر نے اس اعلیٰ دستوری ماہر کی خدمات کے حصول کی پوری کوشش کی۔ چنانچہ ۱۹۴۴ء میں آپ کا تقرر جموں و کشمیر کے وزیر اعظم کی حیثیت سے کیا گیا۔ آپ ۱۹۴۵ء تک اس خدمت پر متمکن رہے۔

مشیر دستوری حکومت ہند۔

۱۹۴۶ء میں حکومت ہند نے آپ کو مشیر دستوری مقرر کیا۔ آپ مختلف کانفرنسوں وغیرہ میں لارڈ ویول سابق وائسرائے ہند اور لارڈ مونٹ بیٹن کو اہم دستوری مشورے دیتے رہے۔ آپ نے اس وقت بڑے ایثار سے کام کیا اور تنخواہ لینے سے انکار کر دیا۔ اس زمانے میں آپ نے امریکہ و آئرلینڈ کا چھ ماہ تک دورہ کیا تاکہ ان ممالک کے دساتیر کا ذاتی طور پر مطالعہ کر سکیں۔ برطانوی حکومت ہند تمام اہم قانونی امور میں آپ سے مشورہ لیتی تھی۔ جب ہندوستان نے ۱۵۔ اگست کو غیر ملکی اقتدار سے نجات پائی تو سب سے اہم مسئلہ دستور کی تدوین کا تھا۔ حکومت ہند نے اس کام کے لئے ایک دستوری کمیٹی تشکیل دی جس میں سر بنیگل نرسنگ راؤ۔ سر سعد اللہ خاں (آسام) ڈاکٹر بی۔ آر۔ امبیدکر تھے۔ اس کمیٹی کے صدر ڈاکٹر راجندر پرشاد صدر مجلس دستور ساز تھے۔ اس وقت ڈاکٹر راجندر پرشاد نے آپ سے خواہش کی کہ مختلف ممالک کے دساتیر کے متعلق ایک کتابچہ لکھیں۔ اس مشکل کام کو اس ماہر دستور نے چار دن میں مکمل کر لیا۔ اس کتابچے میں امریکہ۔ کنیڈا۔ برطانیہ۔ آسٹریلیا۔ سوئیزرلینڈ۔ سوئیڈن اور روس کے دساتیر پر بحث کی گئی تھی۔ مسٹر بی۔ این راؤ نے دستورِ ہند کی تدوین میں بہت زیادہ کام کیا۔ علاوہ ازیں ۱۹۴۷ء میں اس مایہ ناز ہندوستانی دستوری ماہر کو حکومت برما نے دعوت دی کہ وہ برمی دستور کی تدوین میں مدد دے سکیں۔

بین الاقوامی قانونی کمیشن میں

نومبر ۱۹۵۲ء میں جب اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کا اجلاس ہوا تو اس میں آپ کو ہندوستانی وفد برائے اقوام متحدہ کے رکن کی حیثیت سے بھیجا گیا۔ آپ نے ہندوستانی وفد کو کئی اہم دستوری مشورے دیے، اور مختلف مسائل میں مدد دی۔ مسٹر راؤ کو اس اجلاس میں بین الاقوامی قانونی کمیشن کا رکن منتخب کیا گیا۔ اس کمیشن کا رکن صرف انھیں لوگوں کو بنایا جاتا ہے جن کا قانونی ریکارڈ بہت ہی شاندار ہو۔ آپ پہلے ہندوستانی ہیں جو کمیشن کے رکن اور اپریل ۱۹۵۰ء میں اس کے نائب صدر رہے جبکہ امریکہ کے مسٹر مینلی اوڈیسن صدر رہے اور برادیل کے نمائندے ارکان تھے۔ آپ نے اگست ۱۹۴۸ء میں انٹرنیشنل بار ایسوسی ایشن کے اجلاس منعقدہ پیرس میں شرکت فرمائی۔

۱۹۴۸ء میں جامعہ دہلی نے آپ کو ڈاکٹر آف سیول لا کی اعزازی ڈگری عطا کی۔ آپ ایک اچھے مصنف بھی ہیں۔ آپ کی تصانیف میں زیادہ مشہور Constitutional Precedents ہے۔ آپ نے انسانی حقوق سے متعلق اقوام متحدہ کی "ایر بک" لکھی۔ اور ہندوستان میں انسانی حقوق کے عنوان سے کئی مضامین لکھے۔

ہندوستانی مستقل مندوب برائے اقوام متحدہ

مسٹر بی۔ این راؤ کی غیر معمولی قابلیت کی دنیا اس وقت معترف ہوئی جبکہ وزیر اعظم ہند پنڈت جواہر لال نہرو نے انھیں جون ۱۹۴۹ء میں ہندوستانی مستقل

مندوب برائے اقوام متحدہ کی حیثیت سے ایک سکس بھیجا۔ انھیں سفیر کا درجہ دیا گیا تھا۔ مسٹر راؤ پہلے ہندوستانی مندوب تھے جنھوں نے اقوام متحدہ کے سیاستدانوں کو سب سے زیادہ متاثر کیا۔ آپ نے اقوام متحدہ میں پیش کردہ مختلف امور میں بیباک رائے کا اظہار کیا اور ہندوستان کی پالیسی کو واضح اور جامع طور پر پیش کیا جس کے باعث ہر ملک کو ہندوستانی رائے سے خاص دلچسپی پیدا ہوئی

جنرل اسمبلی میں نمائندگی

مسٹر بی این راؤ نے کئی دفعہ جنرل اسمبلی کے اجلاسوں میں نمایاں حصہ لیا۔ آپ نے ۱۹۴۸ء سے ۱۹۵۰ء تک اسمبلی کے اجلاسوں میں ہندوستانی مندوب کی حیثیت سے شرکت کی۔ جب انڈونیشیا کا مسئلہ نازک صورت اختیار کر گیا تو ہندوستان نے اس مقدمہ کو مسٹر بی این راؤ کے ذریعے اقوام متحدہ میں پیش کیا اور جب انڈونیشیا آزاد اقوام کی صف میں شامل ہوا تو اقوام متحدہ میں اس کی شرکت کی درخواست آپ ہی نے پیش کی تھی۔ اور انڈونیشیائی مندوب ڈاکٹر رین پا لار کا اقوام متحدہ میں پرجوش خیر مقدم کیا۔ آپ نے ہمیشہ ایشیائی مسائل میں بے باک رائے کا اظہار کیا۔

جنرل اسمبلی کے پانچویں اجلاس میں جو نیویارک میں ۱۷ ستمبر ۱۹۵۰ء کو منعقد ہوا۔ آپ نے ہندوستانی وفد برائے اقوام متحدہ کے قائد کی حیثیت سے شرکت کی۔ جام صاحب آف نوانگر، نواب علی یاور جنگ بہادر، ڈاکٹر کیسکر ارکان کی حیثیت سے شامل تھے۔ اس اجلاس پر ساری دنیا کی نظریں لگی ہوئی تھیں۔ اس لئے کہ سر بی این راؤ "چینی عوامی جمہوریہ کی صیانتی مجلس میں شرکت" کے متعلق درخواست پیش کر رہے تھے اس قرارداد کی ۱۶ ممالک میں جن میں ہندوستان، پاکستان، برما، روس، یوگوسلاویہ، افغانستان، بلوروشیا شامل ہیں تائید کی، اور ۳۳ ممالک نے مخالفت میں رائے دی اور آپ کو ووٹ دینے سے، فرانس، گوئی مالد، لبنان، سعودی عرب، شام، یمن، ارجنٹائن اور کینیڈا غیر جانبدار رہے۔ اس طرح ہندوستان کی قرارداد مسترد کر دی گئی۔ مسٹر بی این راؤ نے بتایا کہ "چینی عوامی جمہوریہ کو صیانتی مجلس کا رکن بنا لینا چاہیئے اگرچہ ۱۶ ممالک نے ہندوستانی قرارداد کی تائید میں رائے دی ہے جن کی آبادی ۸۰۹ ملین ہے جس میں ۵۲۷ ملین غیر کمیونسٹ اور ۲۸۲ ملین کمیونسٹ ہیں۔ وہ ۳۲ ممالک سوائے چین کے جنھوں نے مخالفت میں رائے دی ہے۔ ان کی کل آبادی ۱۲ ملین ہے۔ یہ آبادی بلاکسی شبہ کے غیر کمیونسٹ ہے۔ اس لئے کہا جا سکتا ہے کہ آبادی کے لحاظ سے قرارداد منظور ہو گئی ہے"۔ اسمبلی نے چین کو کوریائی جنگ میں شرکت کے باعث مجرم آور قرار دیا۔ اسمبلی کی اس قرارداد کی ہندوستانی مندوب کی حیثیت سے مسٹر راؤ نے سخت مخالفت کی۔ قائد ہندوستانی وفد نے فرمایا کہ "چین کو حملہ آور قرار دے کر ہرگز امن قائم نہیں کیا جا سکتا اور نہ ہی پیچیدہ صورت حال کو بہتر بنانے کا یہ کوئی موزوں طریقہ ہے۔ بلکہ اس سے صورت حال اور ابتر ہو جائے گی"۔

سابق اطالوی نوآبادیات میں لیبیا اور آرٹریا وغیرہ کی آزادی کی آپ نے پرزور حمایت کی۔ لیبیا کی آزادی کا مسئلہ جب اسمبلی میں پیش ہوا تو آپ نے اس تجویز کا خیر مقدم کیا۔ اور وزیر خارجہ پاکستان سر محمد ظفر اللہ خاں کی قرارداد کی کامل تائید کی۔ جب لیبیا کے کمشنر کے تقرر کی ضرورت پیش آئی تو اقوام متحدہ کے کئی ارکان اور لیبیائی مندوبین اقوام متحدہ نے سر بی این راؤ سے درخواست کی کہ وہ اس عہدے کو قبول کریں۔ لیکن آپ نے خرابی صحت اور دیگر ذمہ داریوں کے باعث معذرت چاہی۔

اقوام متحدہ کی رکنیت کے مسئلے میں مسٹر راؤ کے خیالات جمہوری و منصفانہ تھے۔ آپ چاہتے تھے کہ اقوام متحدہ کے دروازے کسی ملک کے لئے بند نہ کئے جائیں اور زیادہ سے زیادہ ممالک کو رکنیت دے کر اقوام متحدہ کو بہتر نمائندہ جماعت بنایا جائے۔ کئی دفعہ آپ نے اس نقطۂ نظر کا اعادہ کیا۔ آپ نے ۱۴ ارکان کی غیر مشروط و فوری شرکت کی تائید کی تھی۔ جب ۶ نومبر ۱۹۵۱ء کو پیرس میں جنرل اسمبلی کے چھٹے کا آغاز ہوا تو آپ نے ہندوستانی وفد کی قیادت کی، اور آپ نے ہندوستانی مندوب کی حیثیت سے طویل جامع تقریر کی جس میں خصوصاً تخفیف اسلحہ پر زیادہ زور دیا گیا تھا۔ اس مسئلہ پر اکابرین اختلاف کی خلیج کو پاٹنے کے لئے آپ نے بھی پوری کوشش کی۔

صدر صیانتی مجلس

سر بینگل نرسنگ راؤ پہلے خوش قسمت ہندوستانی تھے جنھوں نے صیانتی مجلس کی صدارت کی۔ ہندوستان کو ۱۹۴۹ء سے ۱۹۵۱ء تک دو سال کے لئے صیانتی مجلس کا عارضی رکن منتخب کیا گیا۔ جنوری ۱۹۵۰ء میں مسٹر راؤ کو صیانتی مجلس میں ہندوستانی مندوب مقرر کیا گیا۔ آپ نے جون ۱۹۵۰ء میں صیانتی مجلس کی صدارت کی (صیانتی مجلس کی صدارت ہر ماہ رکن ممالک کو حروف تہجی کے اعتبار سے دی جاتی ہے) مسٹر راؤ نے صیانتی مجلس کے صدر کے فرائض بڑی کامیابی سے انجام دئے۔ بدقسمتی سے کوریائی جنگ کا آغاز ہوا۔ اس لئے آپ کو صیانتی مجلس کا ہنگامی اجلاس طلب کرنا پڑا، تاکہ حملہ

کو روکا جاسکے۔ اس وقت آپ کی ذمہ داریاں کافی بڑھ گئیں۔ انھیں پہلے صد صیانتی مجلس اور پھر ہندوستانی مندوب کے فرائض انجام دینے پڑے۔ آپ نے بڑی دانشمندی سے اس نازک مسئلے میں ہندوستانی پالیسی کی وضاحت کی۔ اور شمالی کوریا کو حملہ آور تسلیم کرلیا۔ اور یہ بھی بتلایا کہ ہندوستان اپنے مخصوص حالات کے باعث کوریا کو افواج بھیجنے سے قاصر ہے۔ آپ جون ۱۹۵۱ء میں دوبارہ منتخب

عرب ایشیائی بلاک کا قیام

سر بی این راؤ کا صیانتی مجلس میں ہندوستانی مندوب کی حیثیت سے سب سے بڑا کارنامہ "عرب ایشیائی بلاک" کا قیام ہے۔ جس میں اس وقت ۱۶ ارکان ہیں۔ اس کے قیام کی شدید ضرورت تھی۔ اس لئے کہ باوجود ۱۶ عرب ایشیائی ممالک کے ہونے کے اقوام متحدہ کے مسائل میں اُن کی آواز مؤثر نہ تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اُن میں اتحاد نہ تھا اور نہ اُنھوں نے کبھی مشترکہ پالیسی اختیار کی اس لئے اُن کے مطالبات پر کوئی توجہ نہیں کی گئی اور کئی ایشیائی و عرب امور میں سراسر ناانصافی برتی گئی۔ مسٹر راؤ نے عرب ایشیائی بلاک قائم کرکے بہت بڑا احسان کیا ہے۔ لاطینی امریکی ممالک کی طرح عرب ایشیائی بلاک کو اقوام متحدہ میں خاص سیاسی اہمیت حاصل ہوگئی ہے۔ اور اہم مسائل میں اس بلاک کی رائے کی اہمیت کی رائے کو دونوں بلاکوں نے تسلیم کرلیا ہے۔ آپ نے عرب ایشیائی بلاک کے کئی اجلاس کی صدارت کی اور مختلف مسائل میں رہنمائی کی۔

صدر جوہری توانائی کمیشن

مسٹر بی۔ این راؤ نے اقوام متحدہ کی کئی اہم کمیٹیوں، کمیشنز اور مجالس کے رکن و صدر رہے۔ جن میں قابل ذکر جوہری توانائی کمیشن کی صدارت پر آپ کا انتخاب ہے۔ ہندوستانی مندوب کی حیثیت سے آپ نے اس مدت کو بخوبی سنبھالا اور جوہری توانائی پر نگرانی کے لئے معقول تجاویز پیش کیں۔ جن میں ایک اہم تجویز یہ تھی کہ یہ کام "بین الاقوامی قانونی کمیشن" کے سپرد کیا جائے۔ یہ سب سے موزوں طریق کار تھا۔ اور نہ بحث کے باعث فریقین سمجھوتے سے دُور ہوتے جا رہے تھے اور یہ مسئلہ کئی سال سے حل طلب رہ گیا ہے۔ مسٹر راؤ کی ان تجاویز کا ساری دنیا پر اچھا اثر پڑا۔ اقوام متحدہ کے حلقوں میں اس کا خیر مقدم کیا گیا۔ ۱۹۵۱ء میں مسٹر راؤ کا نام نوبل انعام امن کے امیدواروں میں شریک کیا گیا تھا۔ اگر انھیں انعام دیا جاتا تو غالباً مذکورہ بالا تجویز ہی پر دیا جاسکتا تھا۔

بین الاقوامی عدالت انصاف کے جج کی حیثیت سے

۱۹۵۱ء میں ہندوستان کی صیانتی مجلس میں میعاد رکنیت ختم ہوئی۔ اس لئے حکومت ہند نے دانشمندانہ اقدام کرتے ہوئے مسٹر بی این راؤ کو عالمی عدالت کے جج کے عہدے کے لئے انتخاب لڑنے کی ہدایت کی۔ اُس سال چھ عہدے خالی تھے۔ سر بی این راؤ کی اقوام متحدہ میں اوسط مقبولیت کا اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ۱۱ ممالک نے آپ کا نام اس عہدے کے لئے تجویز کیا تھا۔ جن میں ۶ صیانتی مجلس کے ارکان شامل تھے۔ مصر نے برازیل کے جج کے انتقال سے خالی شدہ نشست پر مسٹر راؤ کے لئے سفارش کی تھی۔ اقوام متحدہ کے دستور کی رو سے جنرل اسمبلی کو یہ حق حاصل ہے کہ عام رائے شماری سے عالمی عدالت کے ۱۵ ججوں کا انتخاب کرے۔ جب اسمبلی میں رائے شماری ہوئی تو آپ نے ۳۰ آراء حاصل کیں، اور اس طرح انھیں بین الاقوامی عدالت انصاف کا جج منتخب کیا گیا۔ آپ کا انتخاب ۱۹۵۱ء سے ۱۹۶۰ء تک دس سال کے لئے کیا گیا تھا۔ اس نئی خدمت کا چارج لینے کے لئے آپ نے ہندوستانی مستقل مندوب برائے اقوام متحدہ کے عہدے سے استعفیٰ دے دیا۔

وفات

سر بی۔ این راؤ آنتوں کے خطرناک مرض کے علاج کے لئے زیورخ کے ہسپتال میں داخل ہوئے۔ آپ کئی دنوں تک سخت تکلیف میں مبتلا رہے اس لئے ڈاکٹر نے انھیں خواب آور دوا دی۔ لیکن ۳۰۔ نومبر ۱۹۵۳ء کو صبح کے سات بجے یہ عظیم ہندوستانی اس موذی مرض کے باعث عالم خواب میں اس جہان فانی سے کوچ کرگیا۔ بستر مرگ پر آپ کے دونوں بھائی مسٹر بی راما راؤ گورنر ریزرو بنک آف انڈیا اور مسٹر بی شیوا راؤ رکن پارلیمان موجود تھے۔ مسٹر راؤ کی موت سے ہم کو ایک ایسے ہندوستانی سے محروم کردیا ہے جس کا بدل ناممکن ہے۔ شاید آپ جیسا بے باک و سنجیدہ ہندوستانی ترجمان بھارت میں مشکل سے پیدا ہو۔ مسٹر بی این راؤ کے انتقال سے نہ صرف ہندوستان ایک قابل مندوب و اعلیٰ ماہر دستور سے محروم ہوگیا ہے بلکہ اقوام متحدہ ایک قابل ترین فرد کی اعلیٰ رہنمائی سے محروم ہوگئی ہے۔ جس نے ہر مسئلے میں اور ہر مرحلے پر اقوام متحدہ کے مقاصد کے حصول کے لئے پوری کوشش کی۔

وارث کرمانی

تاج محل

ایک خوابیدہ و مخمور و پُراسرار محل

سنگ مرمر میں محبّت کا تخیل جیسے

میٹھے میٹھے غمِ ہجراں کا تخیل جیسے

چاندنی رات میں بہکا ہوا رنگین خیال

جیسے ٹھہرے ہوئے نغمات کا سیمیں آنچل

جیسے شیراز کی پیمانہ در آغوش غزل

گورگانی خلش غم کی جنوں خیز تراش

جیسے چنگیز کے بھٹکے ہوئے رومان کا خواب

جیسے مریخ کی آغوش میں زہرا کا رباب

شہسوارانِ سمرقند کا خونریز جلال

ڈھل گیا اُلفت و اخلاص کے پیمانوں میں

سو گیا وادیٔ جمنا کے خیابانوں میں

ایک نقّاش نے مرمر کا سفینہ لے کر

جانے کس تازگیٔ فکر کا اظہار کیا

وقت کے حُسن گریزاں کو گرفتار کیا

عبدالعزیز حنفی عمیق

وہ کہاں ہے

(ٹیگور کی گیتانجلی سے ایک آزاد ترجمہ)

منتشر کر دے یہ دانے اپنی مالا توڑ دے
اے پجاری چھوڑ دے بے کیف نغمے اور بھجن
اپنے مندر کے کواڑے بھیڑ کر تنہا یہاں
گوشۂ تاریک میں ہے کس کی پوجا میں مگن
اپنی آنکھیں کھول کر تو دیکھ تو سے غور سے
وہ کہاں ہے سامنے جس سے لگائے ہے لگن

وہ ہے ان میں جن کے ہل کی گدگدی سے ایک دم
کھا کھلا پڑتی ہے ہو کر نرم پتھر دل زمین
ٹھنڈ میں برسات میں اور چل چلاتی دھوپ میں
تو اسے پائے گا ان محنت کشوں میں ہے مکیں
چھوڑ دے اپنے تقدّس کا یہ جھوٹا آسماں
جلوۂ حق منتشر ہے آ — بُلاتی ہے زمیں
ڈھونڈھتا پھرتا ہے تنگی میں کہاں راہِ نجات
خالق و مخلوق کے ناتے سے کیا واقف نہیں
مالکِ کون و مکاں نے رشتۂ تخلیق میں
کر لیا ہے منسلک خود کو ہمیں سے یا نہیں

چھوڑ دے لوبان و چندن توڑ دے پھولوں کے ہار
اپنے ماتھے سے مٹا دے فکر کی گہری شکن
تیرے کپڑوں پر اگر لگ جائیں گے مٹی کے داغ
روح تیری جھوم اُٹھے گی صاف ہو جائے گا من

عرشؔ ملسیانی

امجد کے ساتھ چند لمحے

جنوری ۱۹۵۳ء کے شروع میں مجھے آج کل کی توسیعِ اشاعت کے سلسلے میں حیدرآباد جانے کا اتفاق ہوا۔ دو تین دن بڑی مصروفیت میں گزرے۔ ڈاکٹر محی الدین قادری زور، پروفیسر عبدالقادر سروری، خواجہ حمیدالدین شاہد، نصیرالدین ہاشمی، تمکین کاظمی اور بہت سے اصحاب کے دیدار کا موقع ملا۔ خواجہ حمیدالدین شاہد بڑے علم دوست اور دوست نواز نوجوان ہیں۔ میں تو انھیں عزیز خاطر "شفقت عالاں" ہی لکھوں گا۔

غالباً ۲۰ جنوری کی شام تھی۔ شاہد مجھے ہوٹل تک پہنچانے آئے۔ رخصت کے وقت میں نے بلقیس خانموں سے انھیں ملایا تو فرمانے لگے کہ کہیے کیا ارشاد ہے"۔ میں نے کہا، شاہد بھائی ایک کام کرو تو احسان مند رہوں گا۔ کل صبح عثمان ساگر لے چلو۔ لیکن اس شرط پر کہ امجد صاحب بھی ساتھ ہوں۔ شاہد نے بہ کمالِ مروت اس تجویز پر صاد کیا اور صبح سات اور آٹھ بجے کے درمیان آنے کا وعدہ کیا۔

ابوالاعظم سید احمد حسین امجد مرحوم اپنی شاعری میں اپنے قطعات و رباعیات کے لئے خاص طور پر مشہور ہیں۔ آپ کا ایک شعر مدت سے سن رکھا تھا ؎

کس شان سے میں کہتا ہوں اللہ رے میں

سمجھ نہیں میں کو آج تک واہ رے میں

اس شعر کو سن کر امجد کی ایک تصویر میری آنکھوں کے سامنے خود بخود پھرنے لگی۔ صوفی منش، سادہ مزاج، پیرانہ سال، بزرگ صورت، پاکیزہ سیرت، متین، خاموش، یہ تمام صفات جمع کرتا اور کوئی مشکل سا تصور دماغ میں پھرنے لگتا۔ حیدرآباد میں ادھر سے کوئی ادیب یا شاعر جائے تو حیدرآباد کے ادب نواز حلقوں کی مہمان نوازی سے متاثر ہوتا ہے یہی حال میرا بھی تھا۔ تین چار گھنٹے منقضی ہوئیں اُن میں مجھے امجد نظر نہ آئے۔ دوسرے دن صبح شاہد آئے اور اپنی سبارو فقارہ گاڑی میں مجھے بٹھا کے امجد صاحب کے دولت کدے کی طرف روانہ ہو گئے۔

میں نے امجد صاحب کو توقع کے مطابق پایا۔ وہ بڑے متین اور خاموش قسم کے انسان ہیں۔ نہ جانے جوانی میں بھی شوخ و شنگ ہوں گے یا نہیں۔ عثمان ساگر چلنے سے پہلے ہماری تواضع چائے سے کی۔ راستے میں سلاطین دکن کے گنبد دیکھے دکن کا نہیں بلکہ ہندوستان کا پہلا عوامی شاعر، قطب شاہی سلسلے کا مشہور تاجدار قلی قطب شاہ یہیں مدفون ہے۔ اس کا گنبد فنِ تعمیر کا اعلیٰ نمونہ ہے لیکن ع بوم نوبت می زند بر گنبدِ افراسیاب والی مثل صادق آتی ہے ؎

فلک سے کم نہیں فتنہ اُٹھائے اے زمیں تو نے

دبے ہیں خاک کر ڈالے ہیں کتنے مہ جبیں تو نے

شاہد اور امجد صاحب کچھ تفصیلات یہاں کی مجھ سے بیان کر رہے تھے اور میں ماضی کے تصور میں اپنا تعلق حال سے توڑے ہوئے ان کی باتیں سُنی اَن سُنی کر رہا تھا۔ ذرا چونکا تو شاہد نے قلی قطب شاہ کے چند اشعار سُنائے

مئے لعلیں سے لکھ زردی ہماری دُور کر ساقی

مجالس نہرہ رقاصی سوں توں پُر نور کر ساقی

لطافت بیش ہے دن دن سوا اس سرو سہی قد سوں

پیالہ اس کا میرا سو عجب معمور کر ساقی

جگوئی ہے عشق میں ثابت سدا ہے جیو نا اس کا

سو اس کے ناؤں سوں میخانہ سب معمور کر ساقی

نظر کی مرحمت سوں دیکھ منہ مسکین کوں یک پل

پیالی کیمیائی دشٹ سوں نفور کر ساقی

کتنا لوچ اس زبان میں ہے۔ یہ میٹھی میٹھی پیاری پیاری بولی اب کہاں گئی۔ نہ جانے بعد میں ہندوستانی زبان کا تصور کیا ہوگا اور سیاست ہمیں کہاں سے کہاں لے گئی۔ کچھ اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے اور ماضی و حال کا موازنہ کرتے ہم عثمان ساگر کی طرف روانہ ہوئے۔ گولکنڈے کے کھنڈروں کے قریب ہی کانگریس

کے سالانہ اجلاس کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ پنڈال بن رہا تھا۔ ایک نیا شہر آباد ہو رہا تھا۔ عثمان ساگر کے قریب پہنچے تو جوش کی نظم یاد آئی

دوستو عثمان ساگر کا سماں

عثمان ساگر سچ مچ ایک ساگر ہے۔ انسانی صنعت کی یہ ایک حیران کن مثال ہے۔ اتنا بڑا پانی کا ذخیرہ جو بظاہر ایک سمندر سے کم نظر نہیں آتا بہت کم دیکھنے میں آیا ہے۔ شفاف اور نیلگوں پانی کی سطح پر حدِ نگاہ تک لہریں اس طرح چھپتی ہوئی نظر آرہی تھیں جس طرح زندگی کے بحرِ ناپیدا کنار میں اضطراب کی لہریں۔ شاہد نے اشارہ کیا۔ ہم پانی کے کنارے پتھروں پر بیٹھ گئے۔ کچھ ناشتہ ساتھ لائے تھے اُسے ختم کیا۔ دو چار شعر میں نے اس منظر سے متاثر ہو کر امجد و شاہد کی خدمت میں پیش کیے۔ رسمی داد و صول کی اور پھر اپنے اصل مقصد کی طرف آیا۔ میری درخواست کہ شرف پذیرائی ملا، امجد صاحب نے ایک رباعی سنائی۔ شاعر کی سادہ مزاجی اور پیرانہ سالی، اور عثمان ساگر کا کنارہ، شعر خوانی کے لئے کسی ترنم ریز لہجے یا بقول احسن مارہروی مرحوم "ساز نغموں کے انداز"، اور "بجتی ہوئی آواز" کی ضرورت نہ تھی۔ نہایت متانت سے اُنھوں نے ارشاد فرمایا

تو کان کا کچا ہے تو بہرا ہو جا
بد بیں ہے اگر آنکھ تو اندھا ہو جا
گالی غیبت دروغ گوئی کب تک
امجد، کیوں بولتا ہے، گونگا ہو جا

اس کے ساتھ ہی انھوں نے ایک کہانی بھی سُنائی۔ کہ خواب میں ایک بزرگ نظر آئے اور انھوں نے مجھ سے کہا، بہرا ہو جا، اندھا ہو جا، گونگا ہو جا۔ ان الفاظ سے نا آشنا قبول کیا اور یہ رباعی ہو گئی۔ لیکن دوسرے دن وہ بزرگ پھر خواب میں نظر آئے اور کہا کہ اُن کا مفہوم ابھی ادا نہیں ہوا۔ چنانچہ اسی موضوع پر دوسری رباعی ہو گئی۔

مت سن پردے کی بات بہرا ہو جا
مت کہہ اسرارِ غیب، گونگا ہو جا
وہ دوئے لطیف اور یہ ناپاک نظر
امجد کیا دیکھتا ہے اندھا ہو جا

پاکیزہ نفس اور شرافت کی زندگی بسر کرنے والا شاعر ہی یہ رُباعی کہہ سکتا ہے۔

ایک اور رباعی امجد صاحب نے سُنائی

دُنیا کے ہر اک ذرّے سے گھبراتا ہوں
غم سامنے آتا ہے جدھر جاتا ہوں
رہتے ہوئے اس جہاں میں مدّت گزری
پھر بھی اپنے کو اجنبی پاتا ہوں

عثمان ساگر کی خاموش فضا میں کلامِ امجد کا لطف اُٹھاتے ہوئے، لبِ ساحل پھولوں کی کیاریوں کو دیکھتے ہوئے ہم واپس آنے کے لئے موٹر میں سوار ہوئے۔ فردوسِ چشم اور فردوسِ گوش دونوں کا لطف رہا۔ راستے میں امجد صاحب نے مجھ سے والدِ محترم کا کلام فرمائش سُنا اور بہت بہت دادِ سخن دی۔

اُسی دن شام کو نصیر الدین ہاشمی صاحب کے دولت کدے پر کچھ خواتین، ڈاکٹر زور، پروفیسر سروری اور کچھ اور احباب موجود تھے۔ میں نے ایک شعر پڑھا جو یا دِ محبوب سے متعلق تھا۔ متفرد یاد نہیں رہا۔ میں اس وقت سکندرآباد کے اسٹیشن سے ریل پر سوار ہونے کی فکر میں تھا۔ اس لئے امجد صاحب کی یہ رباعی دوگونہ لطف دے گئی

دل شاد اگر نہیں تو ناشاد سہی
لب پر نغمہ نہیں تو فریاد سہی
ہم سے دامن چھڑا کے جانے والے
جا، جا کر تو نہیں تری یاد سہی

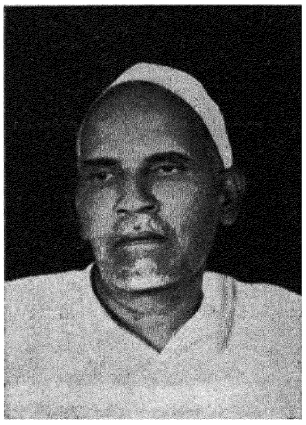
جا، جا، میں جو محبت اور خلوص پنہاں ہے اس سے لطف اندوز ہوتا ہوا میں حیدرآباد کی ادب پرور فضا سے رُخصت ہوا۔ بوقتِ رخصت ملک الشعراء وجہی کے یہ شعر میرے کانوں میں گونج رہے تھے۔

دکھن سا نہیں ٹھار سنسار میں — بچ فاضلوں کا ہے اس ٹھار میں
دکھن ہے نگینہ، انگوٹھی ہے جگ — انگوٹھی کو حرمت نگینہ ہی لگ
دکھن ملک کھن دھن عجب ساج ہے — کہ سب ملک سر ہور دکھن تاج ہے
دکھن ملک پھوتنج خاصہ رہے — تلنگانہ اس کا خلاصہ رہے

رُباعی

گلزار بھی صحرا نظر آتا ہے مجھے
اپنا بھی پرایا نظر آتا ہے مجھے
دریائے وجود میں ہے طوفانِ عدم
ہر قطرے میں خطرہ نظر آتا ہے مجھے

امجد حیدرآبادی



حضرت امجد حیدرآبادی

غزل

برباد نہ کر بیکس کا چمن، بے دردِ خزاں سے کون کہے
تاراج نہ کر میرا خرمن، اس برقِ تپاں سے کون کہے

مجھ خستہ جگر کی جان نہ لے یہ کون اجل کو سمجھائے
کچھ دیر ٹھہر جا اے دریا، دریائے رواں سے کون کہے

سینے میں بہت غم ہیں نہاں، اور دل میں ہزاروں ہیں ارماں
اس قہرِ مجسّم کے آگے حالِ اپنا زباں سے کون کہے

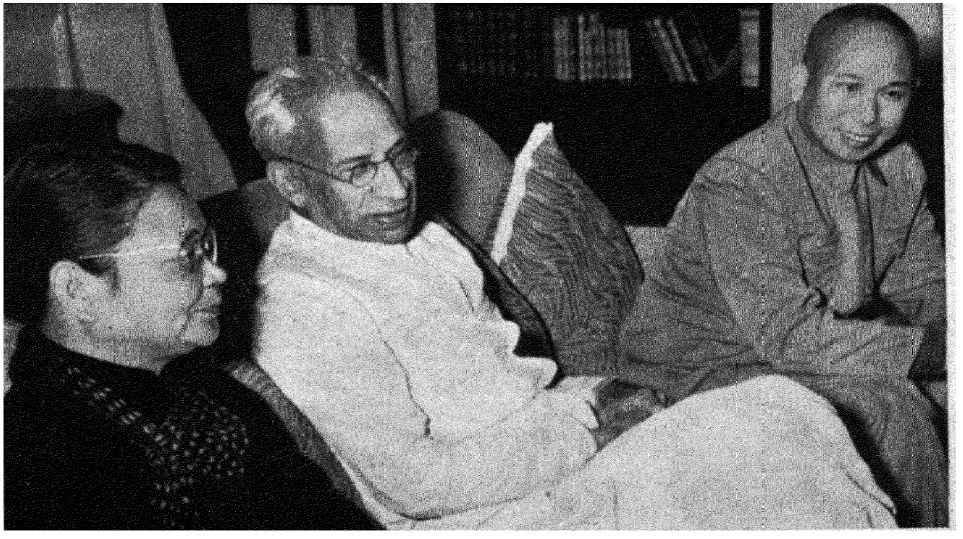
ہر چند ہماری حالت پر رحم آتا ہے ہر اک کو لیکن
کون آپ کو آفت میں ڈالے اس آفتِ جاں سے کون کہے

قاصد کے بیاں کا اے امجد کیونکر ہو اثر اُن کے دل پر
جس درد سے تم خود کہتے ہو اس طرزِ بیاں سے کون کہے

امجد حیدرآبادی



چین کي وزير صحت هرايڪسهلنسي مادام لي ته چوان پنڈت جواهر لال نهرو کے ساتھ



مادام لي ته چوان ڈاکٹر رادھا کرشنن نائب صدر جمہوریہ ھند کے ساتھ -
دائیں طرف بھارت میں چین کے سفیر بیٹھے ھیں



مادام لي تہ چوان مہاتما گاندھي کی سمادھي پر پھول چڑھا رھي ھيں



چين کي وزير صحت ھندوستان کي وزير صحت راج کماري امرت کور کے ساتھ

اگلے صفحے کي تصوير – کھڑے کا آرٹ - بلھدان



مولوی ریاض الدین امجد ریاض

ماہ فروری ۱۹۵۳ء کے "آج کل" میں مختار الدین صاحب آرزو کا ایک مقالہ "غالب سے ایک ملاقات" میری نظر سے گذرا۔ جس میں انھوں نے مولوی ریاض الدین امجد ریاض کی کتاب سیرِ دہلی (سرودِ ریاض ۱۸۶۱ء) کے حوالے سے اُن کی اس ملاقات کا ذکر کیا ہے جو انھوں نے ۱۸۶۰ء میں مرزا غالب سے کی ہے۔ مقالہ نگار نے سیرِ دہلی کے مصنّف کے حالات سے اپنی لاعلمی ظاہر کرتے ہوئے صرف اِتنا لکھا ہے کہ اُن کا اصلی وطن سندیلہ تھا اور قیام متھرا میں تھا۔ میں چاہتا ہوں کہ آج اُن کے مختصر حالات اور شاعری پر روشنی ڈالوں۔

ریاض اپنے زمانے کے بڑے زود گو، مشّاق اور قادر الکلام شاعر اور مشہورِ زمانہ عالم جمعۃ المحققین حضرت مولانا حمد اللہ شارحِ سلم سندیلوی المخاطب بہ ملک العلماء فضل اللہ خاں کے پوتے، شیوخ سندیلہ سے تھے۔ ان کا تذکرہ "خم خانۂ جاوید" مؤلفہ لالہ سری رام دہلوی میں جلد نمبر سوم ص ۵۹۳ پر موجود ہے۔

ان کا پورا نام ریاض الدین امجد اور ریاض تخلص تھا۔ ان کے والد مولوی غیاث الدّین اشرف مولانا حمد اللہ کے پوتے اور عالم فاضل تھے۔ ۳۲ واسطوں سے ان کا سلسلۂ نسب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے ملتا ہے۔ ریاض ۱۸۱۵ء میں بمقام اکبرآباد پیدا ہوئے اور وہیں مختلف اساتذہ سے علوم متداولہ کی تعلیم حاصل کی اور مولانا کاظم علی مرحوم سے جو اسی خاندان میں ایک بڑے زبردست مناظر اور عالم متجر گذرے ہیں ان سے بھی چند عربی کتب پڑھیں۔ جب دہلی تشریف لے گئے اور مرزا غالب سے ملاقات کی اس وقت ان کی عمر ۴۵ سال کی اور مرزا کی عمر ۶۴ سال کی تھی۔ دوسرا سبب اس سیاحت کا یہ بھی تھا کہ ان کے حقیقی چچیرے زاد بھائی مولوی نیاز علی پریشاں خم اکبرآبادی وہاں ڈپٹی انسپکٹر مدارس تھے۔ پریشاں بھی اپنے وقت کے مشہور شاعر اور مرزا حاتم علی بیگ قہر اکبرآبادی کے شاگردِ رشید تھے۔ ان کا تذکرہ بھی خم خانۂ جاوید جلد نمبر دوم ص ۱۰ پر موجود ہے۔

حضرتِ ریاض بڑے خوش رو، خوب صورت، خوش خلق، دیدہ زیب اور وجیہہ شخص تھے۔ شعر و سخن سے طبعی مناسبت رکھتے تھے اور فی البدیہہ شعر کہنے پر کمال حاصل تھا اور لکھنؤ کے مشہور شاعر خواجہ وزیر کے ارشدِ تلامذہ میں سے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ کتاب "سیرِ دہلی" میں خواجہ وزیر کے اشعار کثرت سے ملتے ہیں اور اس سے ان کی عقیدت و محبّت کا پتا چلتا ہے۔ حضرتِ پریشاں نے اپنے واسوخت "افسانۂ عشق" مطبوعہ ۱۲۸۳ھ مطابق ۱۸۶۷ء کے اختتام پر چند مشاہیر اکبرآباد و دہلی کا ذکر کیا ہے جس میں ریاض کا حال بھی ہے۔

"اخیِ معظم مولوی ریاض الدین امجد، سلّمہٗ اللہ تعالیٰ میں اپنا جواب نہیں رکھتے ہیں اور نثاری میں ممتنع المثال ہیں، غزل، رباعی، مثنوی، فرد، بیت، قصیدہ، مرثیہ، سلام سب کچھ کہا ہے اور تمام کلام دیکھنے سننے کے لائق ہے۔ حق تو یہ ہے کہ صوتِ سرّیں میں خالقِ دو جہاں نے ان کو کیسا پیدا کیا ہے۔"

ریاض نے ابتدا میں وکالت کا امتحان پاس کرکے متھرا میں وکالت شروع کی پھر وکالت پر ملازمت کو ترجیح دی

اور مفرا میں صدرِ امین کے سررشتہ دار ہوگئے بعد میں مرادآباد کلکٹری کے محافظِ دفتر ہو گئے آخر میں پھر ملازمت ترک کر دی اور مستقل مفرا میں وکالت کرنے لگے - عمر کا بیشتر حصّہ بڑے عیش و عشرت سے بسر ہوا مگر آخرِ عمر ثقلِ سماعت اور بڑے صاحبزادے کے گوشہ نشیں اور تارکِ دنیا ہو جانے سے فکر و آلام میں گھندی - ۱۸۹۵ء میں بمقام مفرا رحلت فرمائی - ریاض نے جملہ اصنافِ سخن پر طبع آزمائی فرمائی ہے مناجات ، سلام ، رباعی ، مراثی اور غزلیات کا ایک بڑا ذخیرہ چھوڑا جو اُن کے انتقال کے بعد کچھ چوری چلا گیا اور کچھ ضائع ہو گیا - ایک میلاد اور چند کتابیں بھی لکھی تھیں وہ بھی تلف ہو گئیں -

ان کے کلام میں ندرتِ مضامین جدّتِ ادا اور نزاکت بدرجۂ اتم پائی جاتی ہے لیکن تشبیہات و استعارات اور رعایت لفظی کی بڑی بھرمار ہے جس نے تمام کلام بے مزہ کر دیا ہے یہ ہی وہ لکھنوی آرٹ ہے جس سے اس زمانے کا کوئی لکھنوی شاعر اپنا دامن نہ بچا سکا - اور بہتوں کو یہ مذاقِ سخن لے ڈوبا - خواجہ آتش (متوفی ۱۸۴۷ء) کم اور ان کے تلامذہ محمّد خاں رند (۱۷۹۷ء - ۱۸۵۷ء) میر وزیر علی صبا (متوفی ۱۸۵۵ء) مرزا عنایت علی بیگ ماہ اکبر آبادی ، پنڈت دیا شنکر نسیم (۱۲۷۷ھ - ۱۲۶۰ھ) میر دوست علی خلیل اور ناسخ (متوفی ۱۸۳۸ء) اور اُن کے تلامذہ خواجہ وزیر (متوفی ۱۸۵۵ء) مرزا محمّد رضا برق (متوفی ۱۸۶۰ء) مرزا حاتم علی بیگ مہر (۱۲۳۰ھ - ۱۸۷۹ء) مرزا مہدی علی آباد (متوفی ۱۲۷۳ھ) علی اوسط رشک (متوفی ۱۲۸۴ھ) شیخ امداد علی بحر (متوفی ۱۸۸۲ء) وغیرہ سب اسی گورکھ دھندے میں اُلجھے نظر آتے ہیں - مولوی ریاض الدین امجد ریاض اس مذاقِ سخن سے کیوں کر بچ سکتے تھے - انھوں نے ناسخ و آتش - میر انیس (۱۸۰۲ء - ۱۸۷۲ء) مرزا دبیر (۱۸۰۳ء - ۱۸۷۵ء) کو دیکھا تھا بڑے بڑے مشاعرے سر کئے تھے - ایک مرتبہ آگرے کے ایک بہت بڑے مشاعرے میں جس میں مہر و ماہ اور مرزا اعظم بیگ صاحب فنی اور مشتاق شاعر موجود تھے ان کے اس شعر نے بڑی داد و تحسین حاصل کی ؎

فاختۂ چمن چُپ ہیں مری شیوہ بیانی پر
مرے ناموں نے گویا داب لی منقار چٹکی میں

زمین ٹیڑھی ہونے کے ساتھ ساتھ شعر کے تیور بتا رہے ہیں کہ کس انداز کا ہے مگر وہی رعایت لفظی - یہ حضرات ان تشبیہات و استعارات اور رعایت لفظی کے کچھ ایسے خوگر ہو گئے تھے کہ بغیر اُس کے آگے چل ہی نہیں سکتے تھے ہر ہر قدم پر اس کا سہارا تلاش کرتے تھے - مرزا غالب نے مولوی صاحب کو جو داد دی وہ بہت مناسب دی کہ " رعینی زبان میں اچھے معنی نکالتے ہو خاصے شعر ڈھالتے ہو - "

مولوی صاحب کی قادر الکلامی کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ عاشقانہ کلام پر عزائیہ مصرع لگا کر تضمین کرتے اور واقعی کمال حاصل تھا اس کے وہ خود ہی موجد اور خود ہی خاتم تھے - اپنے اُستاد خواجہ وزیر ، شیخ ناسخ اور خواجہ آتش کی بعض مشہور غزلوں پر مصرع پہنچائے ہیں - اس کے علاوہ میر انیس اور مرزا دبیر کے بعض سلاموں کو بھی تضمین کیا ہے - بعض تضمینوں کے چند بند ملاحظہ ہوں ؎

تضمین بر غزل ناسخ

عروسِ فتح تیغِ جوہرِ غازی سجتی وہ جوبن پر — عجب ڈھب کا خرامِ ناز تھا لشکر کشی کی گردن پر
نئی تشبیہہ سجتی جوہرِ شمشیرِ آہن پر — نہیں ہے سبزۂ خط عارضِ محبوبِ پُرفن پر
ہُوئے ہیں جمع پروانے یہ آکر شمعِ روشن پر
عجب احوال تھا صغرا کی بیماری کی حالت میں — کبھی دل ڈوب جاتا جوششِ گریہ سے وقت میں
کبھی کہتی تھی بابا تو نے چھوڑا کس مصیبت میں — تپِ غم سے ہُوا یہ حال میرا تیری فرقت میں
کہ گنڈا ضعف سے بارِ گراں ہے میری گردن پر

تضمین بر غزل آتش

چمکتا تھا رخِ سرور سے جب ہر ذرہ میدان کا — زبانِ حال سے یہ قول تھا جنّت میں رضواں کا
کرے اے ابنِ علی الاریب تو ہے فوجِ یزداں کا — خدا شرمائے تو سولہ ہے تری زلفِ پریشاں کا
جو آنکھیں ہوں تو نظارہ ہوا یہ سنبلستاں کا

زندانِ شہ مظلوم کہتے تھے یہی دل سے — ملے جلدی اگر خدمت ہمیں سلطانِ عادل سے
یہی بانگِ جرس آئے گی خلقِ تیم لیسل سے — کہاں جائے گی یہ ہر چند بھاگے شوقِ منزل سے
ہمیں آگے ہیں جب پیچھے کیا عمرِ گریزاں کا

تضمین بر غزل خواجہ وزیر

مدینہ میں پہنچ جلدی حرم کے درمیاں ہو کر — نہ کھو دینِ گرامی صفت شیدائے بتاں ہو کر
قیامت میں خدا جانے کہاں جائے کہاں ہو کر — چلا ہے او دلِ راحت طلب کیا شاداں ہو کر
زمینِ کوئے جاناں رنج دے گی آسماں ہو کر

وہ ہیں ایسے نبی جن کے نواسے سے قضا بولی — کرائے ابنِ علی کیوں فدیۂ قاتل سے کیا گذری
پسِ حمدِ ثنائے پاک یہ لب سے صدا نکلی — وہ پیاسا ہوں دکھا کر تیغ پر آب اس نے جب کھینچی
نکل آئی دہانِ زخم سے سوکھی زباں ہو کر

دیگر

عاشور کو شب بھر رہی مصحف پہ دھری آنکھ — غربت میں بھی شہ کی رہی ایک نہ ٹری آنکھ
فرماتے تھے اور آتی تھی حسرت سے بھری آنکھ — ہر عضو مسافر ہے نہیں کچھ سفری آنکھ
ہے آخری شب، عمر کا چراغ سحری آنکھ

ہو چھوڑ کے آیا تھا جو گم راہوں کا لشکر — عباس نے فرمایا کہ شاباش برادر
سچ ہے کہ ہوا دیدۂ حق بیں ترا رہبر — صحبت کا اثر صاحبِ نسبتیں کو ہو کیوں کر
بینک ہوا گر سبز نہ ہو جائے ہری آنکھ

جب لشکرِ سلطانِ ہما کٹ گیا سارا — اس دم تھا زمیں کا سوئے افلاک اشارا
کیوں دیدۂ گردوں تجھے اللہ رے پیارا — دیکھا جسے بسمل کیا، تاکا جسے مارا
اس آنکھ سے ڈریئے جو خدا سے نہ ڈری آنکھ

جب تک پوری غزل کی تضمین سامنے نہ ہو صحیح اندازہ نہیں ہو سکتا ہے۔ میں نے محض طوالت کے خیال سے چند بند بطور نمونہ پیش کئے ہیں۔ ریاض نے ریاضیاں بھی کثرت سے کہی ہیں۔

کہیں پہ نغمہ گئی کلیسا دیکھا — کیا کیا نہ دو عالم کا تماشا دیکھا
کس جا پہ نہ تھا ظہورِ قدرت کا ریاض — اک نور کا سو طرح سے جلوا دیکھا

دیگر

غفلت جو جہاں میں باعثی ہوگی — مرنے پہ کساں جاں خراشی ہوگی
دنیا سے تو چل دیں گے سبھی مرنے ہیں حباب — اس شہر کے ناکے پہ تلاشی ہوگی

مندرجہ بالا رباعی کے پہلے مصرعے کا قافیہ صاف پڑھے میں نہیں آیا۔ غور و فکر سے یہ ہی سمجھ میں آتا ہے۔ غزلیات کے بھی چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

سوزِ شبِ فراق نہ مجھ سے بیاں ہوا — مانندِ شمع گو میں سراپا زباں ہوا

ذیل کی غزل سے جو سنگ لاخ زمیں میں ہے اُن کی قادر الکلامی کا اندازہ ہوتا ہے۔

دے فریب نے دھوکے چھینے سراب میں پاؤں — نہ پائی خاک، چلے جب تلاشِ آب میں پاؤں
ہوئے خراب بہت، وادیٔ خراب میں پاؤں — جو بس چلے نہ جہیں سوئے دشت خواب میں پاؤں
سنِ عمر نے لئے منزلِ عدم کر دی — جمانے پائے نہ تھے ہم ابھی رکاب میں پاؤں
نہ دسترس ہے اجل پر نہ طاقتِ رفتار — میسر ہیں پھنسے ہاتھ، عذاب میں پاؤں
تمام عمر بسر کی ہے میں نے کوشش میں — پڑے ہیں ہاتھ سے گردوں کی انقلاب میں پاؤں

نہ پہنچے گا سرِ شوریدہ تیرے قدموں تک
رہیں گے طالعِ خفتہ کے ساتھ خواب میں پاؤں

وہم کیا، کیوں نہ تقسیم ہو ہمیں دنیا میں — آئینہ خانے میں جو آئے وہ چیز بھی نہ ہو
ہیں محبوں شہنواز اس کو جو — رد کے — عثماں اس نوسیِ عمرِ رواں کی
دیر و حرم میں ایک سا جلوہ ہے زاہد — حق ہیں اگر ہو آنکھ تو پہچان جائیے
ذوقِ مژگاں نے بنایا ہدف تیز مجھے — خمِ ابرو نے کیا ہے نہ شمشیر مجھے
صبر کب تک کیا کرے کوئی — دل نہ مانے تو کیا کرے کوئی
تم کسی سے وفا نہیں کرتے — تم سے کیوں کر وفا کرے کوئی

مولوی صاحب کی اولاد میں اُن کے ایک پوتے مولوی نذیر الحسن صاحب مراد آباد میں اور ایک مولوی ڈاکٹر مبین الدین احمد صاحب پرنسپل میونسپل ہائی کالج ہردوئی موجود ہیں اور پڑپوتے ڈاکٹر شاہ حسین الدین احمد مشہور ڈاکٹر نظامی بریلی میں ایک خاص شہرت کے مالک ہیں۔

ڈی۔ اے ہیرسن

جنگِ آزادی اور اکبر الہ آبادی

قومی تذلیل اور تنزل کا درد جس قدر اکبر کے دل میں اُٹھا شاید ہی کسی دوسرے شاعر کو اتنا ہوا ہو یہ اکبر کا جذبۂ حبّ الوطنی ہی تھا جس کے تحت انہوں نے ہندوستان کو مغرب پرستی سے بچانے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا۔ وہ فرنگی دبدبہ اور فرنگی شاطرانہ چالوں میں ہندوستان کو جکڑا ہوا دیکھ کر درد سے چیخ اٹھتے تھے۔ وہ پکار پکار کر کہتے تھے کہ آپس کا نفاق بند کرو ہندو مسلم اتحاد قائم کرو ورنہ ہندوستان نہ معلوم غلامی کے کتنے گہرے غار میں جا گرے گا۔ اکبر کا جذبہ آزادی اتنا بڑھا ہوا تھا کہ انگریزی سرکار کی ملازمت میں رہ کر ان کی مخالفت کرتے تھے ان کی چالوں کے خلاف آواز بلند کرتے تھے ان کی پول کھولتے تھے اور اپنے برادران وطن کو مستقبل کے خطروں سے آگاہ کرتے تھے اور لطف یہ کہ کھڑے ہو کر ہر کہنے والی بات بے دھڑک مُنہ پر کہتے تھے اور اس پیرایہ میں کہ دشمن اسے چٹکلہ سمجھ کر ہنستے تھے گویا شکر میں لپیٹ کر تلخ دوا پلاتے تھے۔ چونکہ سرکاری ملازمت میں تھے اس لئے انگریزی چالوں کو دوسرے لوگوں سے کچھ زیادہ سمجھتے تھے لیکن واہ رے ہمّت کبھی ہاں میں ہاں نہ ملاتے تھے بلکہ جہاں کوئی خطرناک بات دیکھی بغیر کہے رک نہ سکے خود کہتے ہیں ؎

شاگرد ڈارون تو خدا ہی نے کر دیا اکبر مگر نہیں ہے مداری کے ہاتھ میں

وہ چاہتے تھے کہ کسی نہ کسی طرح ملک آزاد ہو جائے۔ لوگوں میں حب الوطنی پیدا ہو جائے اور انگریزوں کے پنجے سے ہندوستان آزاد ہو جائے۔ اس لئے جب ملک میں سیاسی تحریک نے زور پکڑا گاندھی جی اور ان کے رفقاء نے پیش قدمی کی تو اکبر کو بڑی مسرّت ہوئی اس کا اظہار یوں کیا ہے ؎

ایشیا نے کر تو باندھی ہے کوئی شوکت ہے کوئی گاندھی ہے
ہر چند بگولہ مضطر ہے اک جوش تو ہے اس کے اندر
اِک رقص تو ہے اِک وجد تو ہے بے چین سہی برباد سہی
داخل میری دانست میں یہ کام ہے پُن میں
پہنچائے گا تو تخت شجر ملک کے بُن میں
تحریک سودیشی پہ مجھے وجد ہے اکبر
کیا خوب یہ نغمہ ہے چھڑا دیس کی دُھن میں

ساتھ ہی وہ انگریزی کو چیلنج بھی کرتے ہیں ؎

آپ نے طاقت کی تو جولانیاں دیکھیں بہت
ضعف کے ہیجان کا بھی اب تماشا دیکھئے

یہاں تک کہ وہ اپنے دلی جذبات کا اظہار کر کے گاندھی جی اور دوسرے لوگوں کی ہمّت افزائی کرتے ہیں اور خواہش کرتے ہیں کہ کاش وہ بذاتِ خود اس جنگ آزادی میں شرکت کر سکتے ؎

مدخولۂ گورنمنٹ ہوتا اگر نہ اکبر
اس کو بھی آپ پاتے گاندھی کی گوپیوں میں

نہ صرف یہ بلکہ ان کو اپنی ضعیفی اور کمزوری کا خیال

ہے ورنہ وہ آگے بڑھنا چاہتے ہیں ؎

مل نہ سکتی ہمیں تو جیل ہی کو جھیلتے
ناقداں ہیں ورنہ کوئی کھیل ہم بھی کھیلتے

اب ان کی نظر ہموطنوں کی پست ہمتی، آپس کی نا چاقی اور خود غرضی پر بھی پڑتی ہے اور وہ کس قدر صحیح تصویر کھینچتے ہیں ؎

کر باندھی بھی یاروں نے چوراہِ حبِّ قومی میں
وہ بولے تو نہیں چلتا وہ بولے تو نہیں چلتا

ہمارے ملک میں یہ زورِ اقبال فرنگی ہے
کہ فن کو آپریشن میں بھی باہم خانہ جنگی ہے

یہی نہیں ملکی لیڈروں کی خود غرضیاں اور بدنیتی بھی ان کی نظروں سے مخفی نہیں ۔ فرمایا ہے

"ہمارے لیڈر حکومت سے بیزاری اور قوم سے ہمدردی کا اعلان کرتے ہیں لیکن ان کے دل کو ٹٹولتا ہوں تو وہی یورپ زدہ پاتا ہوں کام میں خلوصِ نیت اور پاسِ مذہب بہت کم ہے ان لوگوں کو نہ خدا یاد ہے نہ اپنی خبر" ؎

خدا کی راہ میں پہلے بسر کرتے تھے سختی سے
محل میں لیٹ کر اب عشقِ قومی میں تڑپتے ہیں

اکبر نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ یہ تقریریں ۔ سمجھوتے کانفرنسیں سب بے کار ہیں ۔ مردانگی دکھاؤ اور آزادی حاصل کرو ؎

ہیں وفد اور اپیلیں فریاد اور دلیلیں
اور کبر مغربی کے ارماں نکل رہے ہیں

زورِ بازو نہیں تو کیا اسپیچ
ہاتھ بھی دے خدا زبان کے ساتھ

یا فلسفہ ہے تیغ کا یا ہے سکوت کا
باقی جو ہے وہ تار ہے سب عنکبوت کا

اس سے زیادہ تعلیم عمل اور آتش بیانی کیا ہو سکتی ہے اور یہ باتیں اس شخص کی ہیں جو سرکاری عہدے سے ممتاز ہے ۔

جب اس سے بھی لوگوں کی سرد بازاری دور ہوتے نہیں دیکھتے تو مختلف طریقے سے قومی اور ملکی مصیبتوں، پریشانیوں، محتاجی اور غیروں کے صبر کا ذکر کر کرکے دلوں میں گرمی پیدا کرنا چاہتے ہیں ؎

سوچو تو آگے چل کر قسمت میں کیا لکھا ہے
دیکھو گھروں میں کیا تھا اور آج کیا رہا ہے
آگے دیکھئے ؎

مل کا آٹا ہے نل کا پانی ہے اب دوآبے پہ حکمرانی ہے

اس محتاجی کی بھی کوئی حد ہے ؎

پائپ کوئی کھلا نہیں گھر میں لگی ہے آگ
اب بھاگنا ضرور ہوا غور کیا کریں

کچھ صنعت و حرفت پہ بھی لازم ہے توجہ
آخر یہ گورنمنٹ سے تنخواہ کہاں تک

موقع بحث نہیں صاحب اقبال ہیں آپ
میری ہر بات بُری آپ کی ہر بات اچھی

اور دیکھئے اس سے آگے کسی قوم کی کیا پستی اور گراوٹ ہو سکتی ہے ؎

معاذ اللہ کیا مجبوریٔ تقدیرِ مسلم ہے
تڑپنا سامنے قاتل کے گستاخی میں داخل ہے

وہ توڑتے ہیں تو کلیاں شگفتہ ہوتی ہیں
وہ روندتے ہیں تو سبزہ نہال ہوتا ہے

سانس لیتے ہوئے بھی ڈرتا ہوں
یہ نہ سمجھیں کہ آہ کرتا ہوں

دشنام و پیرہن گم اور جیب و کیسہ خالی
تہذیبِ مغربی نے ہم کو چھٹکارا ڈالا

چمن کی یہ کیسی ہوا ہو گئی کہ صرصر سے بدتر صبا ہو گئی
علم یورپ کا ہوا میدان وسیع رزق میں ہندی کے تنگی ہو گئی

قوم کی بد حالی کا ذکر کر کے اب انگریزوں کی جابرانہ پالیسی اور ان کی سیاسی چالوں کا ذکر کرتے ہیں اور کس دیدہ دلیری کے ساتھ ؎

اغیار تو رگ رگ سے ہماری ہوئے واقف
ہم وہ ہیں کہ پاتے نہیں اس بُت کی کمر بھی

یورپ والے جو چاہیں دل میں بھر دیں
جس کے سر پر جو چاہیں تہمت دھر دیں

بچتے رہو ان کی تیزیوں سے اکبرؔ
تم تو کیا ہو خدا کے بھی تین ٹکڑے کر دیں

وضع مغرب سے مجھے کچھ بھی تسلّی نہ ہوئی
ناز تو بڑھ گئے دولت کی ترقّی نہ ہوئی

درد کسی کا نہ رہا دل میں اب
خُوب دیا تم نے بھلا را ہمیں

ہمیں تو چاہتے ہیں کھینچنا خود ہم سے کھنچتے ہیں
یہ ان کی پالیسی کے باغ کس پانی سے سنچتے ہیں

وقعت تمہاری شاہ کی منزل میں کچھ نہیں
کاغذ پہ اعتراف مگر دل میں کچھ نہیں

ہر بگولہ تھینکس میں مصروف صبح و شام ہے
اس طرح برباد کرنا آپ ہی کا کام ہے

بچ بنا کر اچھے اچھوں کے وہ لے لیتے ہیں دل
ہیں نہایت خوشنما دو جیم ان کے ہاتھ میں

آپ اکبر لاکھ مشق خوش کلامی کیجئے
کتنا ہی اظہار اعزاز دوامی کیجئے

دوستی کی آپ سے فرصت نہیں اس شوخ کو
یا کھسکیئے سامنے سے یا غلامی کیجئے

روزنہ کو رقص پر کس بات کی میں داد دوں
ہاں یہ جائز ہے مداری کو مبارکباد دوں

کمیٹی کل ہوئی برگیڈ میں میں خاموش بیٹھا تھا
طلب میں اپنے حصّے کی ہر ایک نمبر نے منہ کھولا

کمیٹی جب ہوئی برخاست اور حصّہ ملا سب کو
چھ ماشہ سونا پر ایک کو ملا اور مجھ کو ایک تولا

کہا صاحب نے یہ انعام دہرا تم کو ملتا ہے
سبب یہ ہے کہ تم چپکا رہا اور کچھ نہیں بولا

دیکھا آپ نے اور اُنھوں نے اسی پر اکتفا نہیں
کی بلکہ یہاں تک کہہ دیا ؎

ہمیں بھگوان کی کرپا نے تو بابو بنایا ہے
مگر یورپ کے شالا لوگ نے اُلّو بنایا ہے

انگریزی پالیسی اور چالوں کا ذکر کر چکنے کے بعد اب وہ اپنے بھائیوں کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور افسوس کرتے ہیں کہ ہندوستان بے سوچے سمجھے کس طرح ضمیر فروشی قوم فروشی اور ملک فروشی کر رہے ہیں ؎

طلبِ جاہ پہ کرتے ہیں وہ کس کو مجبور
سچ تو یہ ہے کہ ہمیں لوگ غضب کرتے ہیں

عزیزان وطن سوچیں سول سروس سے کیا حاصل
بگاڑوں میں رہو بیگانہ ہو کر اس سے کیا حاصل

اب اور چاہیئے نیٹو کے واسطے کیا بات
یہی بہت ہے مشرّف ہوئے سلام سے ہم

شیخ صاحب خدا سے ڈرتے ہوں
ہیں تو انگریز ہی سے ڈرتا ہوں

یہ طنز ملاحظہ ہو ؎

چار دن کی زندگی ہے کوفت سے کیا فائدہ
کھا ڈبل روٹی کلرکی کر خوشی سے پھول جا

ملک پر تاثیر چشم دوٹ طاری ہو گئی
مفت شیخ و برہمن میں فوجداری ہو گئی

کیا شرف بخشیں گی تم کو عرش پر یہ کاوشیں
جب زمیں پر تم کو غیروں کی غلامی ہو گئی

اپنی منقاروں سے حلقہ کس رہے ہیں جال کا
طائروں پر سحر ہے صیاد کے اقبال کا

وہ کہتے ہیں یہ ٹھیک ہے ہم کہتے ہیں جی ہاں
بالفعل تو ہم اس کے سوا کچھ نہیں کرتے
ہم ہوں جو کلکٹر تو وہ ہو جائیں کمشنر
ہم ان سے کبھی عہدہ برا ہو نہیں سکتے
ہوشیار ہو کے پڑھنا اس جال میں نہ پڑنا
یورپ نے یہ کہا ہے یورپ نے وہ کہا ہے

اب ان کی نظر ایک نہایت اہم پہلو پر پڑتی ہے یعنی طریقۂ تعلیم۔ کسی ملک و قوم کی ترقی کا انحصار وہاں کے طریقۂ تعلیم پر مبنی ہے۔ اس لئے انگریزوں نے ہندوستان کی تعلیمی پالیسی پر خاص توجہ رکھی۔ اکبر نے اس تعلیم کے تمام مضر اثرات اپنی دُور بین نگاہوں سے پہلے ہی دیکھ لئے تھے اور اس کے خلاف آوازِ بغاوت بلند کر دی تھی بالفاظِ دیگر جن اثرات کے ماتحت اس وقت ملک کے طریقۂ تعلیم سے کسی طرف اطمینان نہیں اور گورنمنٹ اس کے بدلنے کی کوشش کر رہی ہے اس کی داغ بیل اکبر نے ہی ڈال دی تھی اور اس وقت یہ بڑا بہادرانہ اور جرأت آمیز قدم تھا۔ فرماتے تھے ؎

"میکالے نے موجودہ تعلیم کی داغ بیل اس خیال سے ڈالی تھی کہ کمپنی کو سستے کلرک اور ملازم حاصل ہو سکیں اور اسی تعلیم کا نتیجہ ہے کہ ہم ناکارہ خود پسند
بے ادب، لا مذہب، بد اخلاق اور کاہل ہو گئے ؎
تعلیم جو دی جاتی ہے ہمیں وہ کیا ہے نری بازاری ہے
جو عقل سکھائی جاتی ہے وہ کیا ہے فقط سرکاری ہے
مغربی رنگ و روش پر کیوں نہ آئیں اب قلوب
قوم ان کے ہاتھ میں تعلیم ان کے ہاتھ میں

پھر فرماتے ہیں "موجودہ طریقۂ تعلیم میں ترمیم کی ضرورت ہے اس نے ہم کو نکما، بزدل اور پست ذہنیت بنا دیا اس تعلیم کو حاصل کرتے ہم کو ایک صدی ہو گئی اور اب تک اپنے ہاتھوں سے ایک سوئی بنانا نہیں آئی، آئی تو خوشامد اور ضمیر فروشی ؎
خدا پسند بنائے گا کیا وہ لٹریچر کرے جو طبع کو بے قید اور گناہ پسند
نئی تعلیم کو کیا واسطہ ہے آدمیت سے
جناب ڈارون کو حضرت آدم سے کیا مطلب
ہم ایسی سب کتابیں قابلِ ضبطی سمجھتے ہیں
جنہیں پڑھ پڑھ کے بیٹے باپ کو خبطی سمجھتے ہیں
کالج میں دھوم مچ رہی ہے پاس پاس کی
عہدوں سے آرہی ہے صدا دُور دُور کی
طفل دل محو طلسم رنگ کالج ہو گیا
ذہن کو ٹیپ آ گئی مذہب کو خانج ہو گیا
مذہب چھوڑ دو ملت چھوڑ دو صورت بدلو عمر گنواؤ
صرف کلرکی کی امید اور اتنی مصیبت توبہ توبہ
نوکر کو سکھاتے ہیں یہاں اپنی زبان
مطلب یہ ہے کہ سمجھے ان کی زبان
مقصد نہیں یہاں کی سی عقل و تمیز
اس نقطہ کو کیا سمجھیں وہ جو ہیں ناداں

اب اس تعلیم کا اثر لڑکیوں پر دیکھئے ؎
اعزاز بڑھ گیا ہے آرام گھٹ گیا ہے
خدمت میں وہ ہیں میری اور ناچنے کو ریڈن
تعلیم کی خرابی سے ہو گئی بالآخر
شوہر پرست بیوی پبلک پسند لیڈی
جاتی ہے اسکول میں لڑکی کہ کچھ حاصل کرے
کیا ہوا حاصل جو بنی بے بال ہو کر رہ گئی
تعلیم لڑکیوں کی ضرور دی تو ہے مگر
خاتونِ خانہ ہوں وہ سبھا کی پری نہ ہوں
نغمہ سبھی سے بھی آتی تھی خوانیں کو شرم ساز مغرب سے گر اب ہو گئی ناچ کی دھن

اور وہ یہ تعلیمی حالت دیکھ کر کہہ اٹھتے ہیں ؎
پراگندہ بہت ہے دل میرا دنیا کے دھندوں سے
چمٹ آؤ کہ یارب نوکری کے سخت پھندوں سے

غلامانہ طریقوں پر مجھے مجبور کرتے ہیں
خدایا بے نیازی دے مجھے ان خود پسندوں سے

نغمۂ یورپ سے ہیں واقف نہیں
دلیں ہی کی یاد ہے بس گت مجھے

تجھ کو کیا کسی کی ہوا نے فدائے گل
مجھ کو کیا کسی کی ادا نے فدائے قوم

آ عندلیب مل کے کریں آہ و زاریاں
تو ہائے گل پکار میں چلاؤں ہائے قوم

خوشامدی کو مبارک ہو رات دن چکر
یہاں تو رکھتے ہیں بس کام اپنے کام سے ہم

تب وہ آزادی حاصل کرنے کے لئے سب سے بڑی شرط
یعنی ہندو مسلم اتحاد کا سبق دیتے ہیں ؎

بھائی کی ٹانگ توڑتے ہیں غیروں کے ہاتھ جوڑتے ہیں

رعایا کو مناسب ہے کہ باہم دوستی رکھیں
حماقت حاکموں سے ہے توقع گر مجوشی کی

کہتا ہوں میں ہندو مسلمان سے بھی
اپنی اپنی روش پہ تم نیک رہو

لاٹھی ہے ہوائے دہر پانی بن جاؤ
موجوں کی طرح لڑو مگر ایک رہو

خواہش ہے تجھے اگر غنی بننے کی
دولت کی ہوس ہے اور دھنی بننے کی

شخصی حالت کو چھوڑ کر بندے
کوشش لازم ہے کمپنی بننے کی

ہندو و مسلم ایک ہیں دونوں
یعنی یہ دونوں ایشیائی ہیں

ہم وطنؑ ہم زبان و ہم قسمت
کیوں نہ کہہ دوں کہ بھائی بھائی ہیں

غرض کہ اکبر الہ آبادی کا نام بلا پس و پیش آزادی کے علمبرداروں میں آ جاتا ہے۔ خود فرمایا ہے "میں اس وقت اگر عملی طور پر شریک نہیں ہوں تو دعا سے ہوں ؎

انجن ہے دل اور آہ ہوائی جہاز ہے
ہم نے سمجھ لیا ہے خدا کارساز ہے



ڈی، این ملک

بنیادی تعلیم

بنیادی تعلیم جس کا ابتدائی تصوّر ۱۹۳۷ء کے بردھمن کے کانوں میں ظہور پذیر ہُوا۔ آج ایک عالمگیر حقیقت ہے اور ملک کے مرکزی اور صُوبائی حکومتوں کی سرپرستی میں روبہ ترقی ہے۔ مہاتما گاندھی نے جہاں ملک میں سیاسی بیداری پیدا کرکے جمہوریت کی بنیاد رکھی وہاں امیر و غریب کی تمیز سے برّ صاحب کا تصوّف قوم کے سامنے پیش کرتے ہوئے عدم تشدّد اور امداد باہمی کے سنہرے اصول پر مبنی اس نئی طرزِ تعلیم کا بے بہا تحفہ ملک کے وارثوں کو عطا کیا۔ جہاتما جی کے خواب کی رنگین تعبیر ہماری آنکھوں کے سامنے ہے۔ بنیادی تعلیم پرائمری بیسک اور پوسٹ بیسک کے مدارج طے کرکے یونیورسٹی حدود میں داخل ہو چکی ہے اور سیواگرام اور کمار باغ (بہار) کے قومی اداروں کے تجربات اس امر کے شاہد ہیں کہ زندگی کی عمارت کو پختہ بنیادوں پر تعمیر کرنے اور ملک کو خودداری اور خود اعتمادی کی دولت سے مالا مال کرنے کے لئے یہ نیا طریقِ تعلیم نہ صرف ضروری بلکہ لازمی ہے۔

تعلیم کا مقصد بچّے کو دماغی، جسمانی اور روحانی تربیت دے کر سوسائٹی کا بہترین رکن بنانا ہے۔ تاکہ ہر تعلیم یافتہ انسان خودداری اور خود اعتمادی کے زیور سے مزیّن ہو کر زندگی کی جدوجہد میں مشکلات پر حاوی ہو اور ملک کی مجلسی، اقتصادی اور سیاسی گتھیوں کو سلجھا کر ایک ایسے سماج کی بنیاد رکھے جس پر زمانہ فخر کر سکے نہ کہ خود زندگی کا شکار ہو کر ذلّت اور رسوائی کے عالم میں خود فراموشی اور خودکشی پر آمادہ ہو۔ یہ ایک مسلّمہ امر ہے کہ ملک کا موجودہ بنیاد اور ناکارہ تعلیمی ڈھانچہ جس کی تاریخ ملک میں غیر ملکی حکومت کی تاریخ سے وابستہ ہے۔ ملک میں مجلسی اور اقتصادی انقلاب پیدا کرنے میں ناکام رہا ہے۔ اور ملک کے باشندوں کو کسی حد تک خود غرض اور خود فروش بنانے کا موجب ہُوا ہے۔ باہمی نفرت اور فرقہ وارانہ ذہنیت اس انتہا کو پہنچی اور قوم کی مجلسی اور اقتصادی زندگی اس قدر زوال پذیر ہوئی کہ اس کا تصوّر بھی باعثِ شرم و ذلّت ہے۔ ہمارے ملک کا تعلیم یافتہ نوجوان معاشی اغراض کے پیشِ نظر دفتر کی گھڑکی اور افسر کی خوشامد کا محتاج ہو گیا۔ جس ملک کو اپنی دستکاری پر ناز تھا اور جس کی کاریگری کے نمونے آج بھی غیر ممالک کے عجائب گھروں کی زینت ہیں، اپنی روزانہ ضروریات کے لئے یورپ کے کارخانوں کا محتاج بن گیا۔ اور دستکار کو جو ملک کا بہترین سرمایہ ہے، نفرت اور حقارت کی نگاہ سے دیکھا جانے لگا۔ یہ سب کچھ غیر ملکی حکومت اور غیر ملکی طرزِ تعلیم اور تسلّط کا لازمی نتیجہ تھا اور صدیوں کی غلامی نے ہمارے نفع اور نقصان پر کھنے والے شعور کو نائل کر دیا تھا۔ اور اگر کبھی اس زندگی کو انقلاب پیدا کرنے کا خیال بھی آتا تو وہ ذرائع اپنی قدرت سے باہر تھے۔

۱۹۳۷ء میں جب ہندوستان کے سات صوبوں میں ملک کی ہر دلعزیز جماعت کانگریس برسرِ اقتدار آئی اور ملک کے سیاسی نظام میں ردّوبدل کرنے کا اختیار حاصل ہُوا تو رہبرِ ملّت مہاتما گاندھی نے زندگی کے دھارے کو بدلنے کے لئے بنیادی تعلیم کا تصوّر قوم کے سامنے رکھا۔ مہاتما جیسا عالم، باعمل، مدبر اور سیاست دان جس نے زندگی کو ایک ٹھوس حقیقت اور جدوجہد کو کامیابی کا ذریعہ مانا ہو، وہ اس حقیقت کو ہرگز نظر انداز نہیں کر سکتا تھا جو یورپ اور دیگر ممالک میں جنگ و جدل اور بے چینی کا ذریعہ بن رہی تھی۔ مزدور اور سرمایہ دار کی باہمی کشمکش اور ملکوں کی تجارتی دوڑ جو زندگی کے شیرازے کو بکھیر رہی تھی اور انسانیت کے لئے زہرِ قاتل کا اثر رکھتی تھی۔ بلائے ناگہانی کی طرح دنیا کو اپنے تسلّط میں کرتی چلی جا رہی تھی۔ انہتا کا پجاری اور امن کا دیوتا قوم کی زندگی میں ایک ایسا انقلاب لانا چاہتا تھا جہاں انسانیت کو ایک ممتاز فضیلت حاصل ہو اور وہ ہمیشہ کے لئے مذہب اور سرمایہ پرستی کی قربان گاہ پر خودکشی کرنے سے بچ جائے۔ ہندوستان کے لاکھوں گاؤں اقتصادی خودمختاری حاصل کرکے ملک کی خوشحالی کا باعث ہوں۔ محنت کا وقار قائم ہو اور ملک کے باشندے خودداری اور خود اعتمادی کا جوہر پا کر ایسے سماج کی بنیاد رکھیں جو تہذیب و تمدّن، سیاست اور فراست میں دُنیا کے ممالک کے لئے باعثِ تقلید و فخر ہو۔ ان جذبات سے بے قرار ہو کر

اُنھوں نے اپنے خیالات کی اشاعت ہری جن کے کاموں میں کی۔ اور ان کو عملی جامہ پہنانے کے لئے بنیادی تعلیم و بیسک ایجوکیشن، کے نام سے نئی طرزِ تعلیم کا اعلان کیا۔

بنیادی تعلیم کی تاریخ

بنیادی تعلیم کے مسئلے پر غور کرنے کے لئے ماہرینِ تعلیم کی پہلی کانفرنس اکتوبر ۱۹۳۷ء میں وارد ھا میں گاندھی جی کی صدارت میں ہوئی۔ تین روز کے بحث مباحثہ کے بعد نئی تعلیم کو اصولاً تسلیم کر لیا گیا اور ڈاکٹر ذاکر حسین کی صدارت میں بنیادی تعلیم کا نصاب تیار کرنے کے لئے سات ماہرینِ تعلیم کی ایک کمیٹی مقرر کی گئی۔ جس میں ان تین نکات پر زور دیا گیا۔

۱۔ ملک کا ہر بچہ سات سال تک مفت اور لازمی طور پر تعلیم حاصل کرے۔

۲۔ تعلیم کا بنیادی ذریعہ ایک دستکاری ہو۔

۳۔ اس دستکاری کی آمدنی سے تعلیم کے اخراجات پورے کئے جائیں۔

۱۸ فروری ۱۹۳۸ء کے دوران میں ڈاکٹر ذاکر حسین کمیٹی کی رپورٹ جو بنیادی تعلیم پر ایک جامع اور مستند کتاب ہے شائع ہو گئی۔ اس میں تعلیم کے ہفت سالہ نصاب اور اس کے اقتصادی اور سماجی تعلیمی پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ مارچ ۱۹۳۸ء میں انڈین نیشنل کانگریس کے سالانہ اجلاس میں اس نئی طرزِ تعلیم پر عوام کی قبولیت کی مہر ثبت ہوئی اور بنیادی تعلیم ملک کی فوجی تعلیم قرار پائی۔ اپریل ۱۹۳۸ء میں سیواگرام (وارد ھا) میں ہندوستانی تعلیمی سنگھ کی بنیاد پڑی جس کے اثر و رسوخ سے اس طرزِ تعلیم کو اور تقویت حاصل ہوئی۔ اور اکتوبر ۱۹۳۹ء تک ملک میں ۴۰۷ بیسک اسکول اور ۴۱ ٹریننگ اسکول قائم ہو چکے تھے۔ اکتوبر ۱۹۳۹ء میں مسٹر کھیر وزیرِ تعلیم بمبئی کی صدارت میں ایک کمیٹی مقرر ہوئی۔ کھیر کمیٹی نے سفارش کی کہ:-

۱۔ بنیادی تعلیم دیہات میں جاری کی جائے۔

۲۔ بنیادی تعلیم ۶ سال سے ۱۴ سال کے بچوں کو دی جائے۔

۳۔ آٹھ سال کی مدت دو حصوں میں تقسیم کی جائے۔ ۶ سال سے ۱۱ سال تک جونیر بیسک اور ۱۱ سے ۱۴ سال تک سینیر بیسک اسکول ہوں

جنگِ عظیم نے تمام دنیا کی توجہ اپنی طرف مبذول کرا دی اور بنیادی تعلیم کے تجربات کی رفتار مدھم پڑ گئی۔ ۱۹۳۹ء سے ۱۹۴۵ء تک اس میدان میں کوئی نمایاں کام نہیں ہوا۔ پوسٹ وار ایجوکیشن اور ڈیولپمنٹ بورڈ نے کھیر کمیٹی کی سفارش کو اپنی رپورٹ میں درج کر دیا اور ۶ سال کا عرصہ تعلیم کو مفت اور لازمی طور پر جاری کرنے کا اظہار کیا۔ بورڈ نے تعلیم کے نصاب میں بھی کچھ تبدیلی کی۔ ملک میں جمہوریت کے قیام کے بعد بنیادی تعلیم کا ترقی کرنا لازمی امر تھا۔ ہندوستانی تعلیمی سنگھ کے سالانہ اجلاس میں صوبائی اور مرکزی حکومت کے تعلیمی نمائندے شرکت فرماتے ہیں اور مختلف تعلیمی مسائل پر بحث کرتے ہیں۔ ان اجلاس کی رپورٹ ملک میں تعلیمی وسعت کا صحیح خاکہ ناظرین کے سامنے پیش کرتی ہے۔ آج بنیادی تعلیم صرف دیہات کی پرائمری جماعتوں تک ہی محدود نہیں بلکہ زندگی کی مکمل تربیت کا نصاب ہے۔ جس کو ہم مندرجہ ذیل پانچ حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔

۱۔ پری بیسک ایجوکیشن سات سال سے کم عمر کے بچوں کے لئے

۲۔ بیسک ایجوکیشن سات سال سے چودہ سال کے بچوں کے لئے

۳۔ پوسٹ بیسک ایجوکیشن چودہ سال سے اٹھارہ سال کی عمر کے طلبا کے لئے

۴۔ یونیورسٹی ایجوکیشن اٹھارہ سال سے پچیس سال کے طلباء کے لئے

۵۔ سماجی تعلیم یا تعلیم بالغاں

بنیادی تعلیم کے مقاصد

نئی تعلیم کے مقاصد ہماری موجودہ تعلیم کے مقاصد سے جداگانہ ہیں۔ اب ہمیں ملک میں صرف کلرکوں کی تعداد کو بڑھانا اور تعلیم یافتہ لوگوں کو ملک کی عملی زندگی سے الگ رکھ کر بیزاری کا نظام کو مضبوط کرنا نہیں بلکہ اس کے برعکس ایک ایسے سماج کی بنیاد رکھنا مقصود ہے جس کا ہر رکن اپنے حقوق اور ذمہ داریوں سے آگاہ ہو کر ملک اور قوم کے لئے باعثِ فخر ہو۔ دماغی، جسمانی اور روحانی طور پر تربیت یافتہ ہو کر زندگی کے مدارج کو طے کرنے کی صلاحیت خود میں پیدا کرے اور سماج کی بہتری میں اپنی بہتری سمجھے۔ ہم پورے وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ بنیادی تعلیم کا نصاب ہمارے ان مقاصد کو عملی جامہ پہنانے کے لئے لاجواب ہے۔

بنیادی تعلیم کا نصاب

۱۔ دستکاری

۲۔ مادری زبان

۳۔ ریاضی

۴۔ سماجی تعلیم

۵۔ جنرل سائنس (فطرت۔ حیوانات وغیرہ)

۶۔ آرٹ (مصوری، موسیقی وغیرہ)
۷۔ جسمانی تعلیم
۸۔ ہندوستانی (اُردو اور ہندی رسم الخط میں)

اسکول میں روزآدھا وقت دستکاری پر صرف ہوتا ہے اور آدھا وقت دوسرے مضامین پر۔ لیکن اس سے بچے کو صرف دستکار بنانا ہی مقصود نہیں بلکہ دستکاری کو تربیت کا ذریعہ مان کر تعلیم کے ساتھ دل چسپی سے وابستہ کرنا ہے اس لئے ایسی دستکاری سکھانا چاہیے جو تعلیمی مواد سے معمور ہو اور انسان کی بنیادی ضروریات سے متعلق ہو۔ چند ایسی دستکاریاں مندرجہ ذیل ہیں۔

۱۔ کاتنا بُننا
۲۔ کاشتکاری باغبانی
۳۔ ترکھان کا کام
۴۔ مٹی کے برتن اور کھلونے بنانا۔
۵۔ دھات کا کام
۶۔ جلد سازی
۷۔ چمڑے کا کام
۸۔ گھریلو کام، خاص کر لڑکیوں کے لئے۔

بنیادی تعلیم کے انصاب کے اہتمام پر ہر بچے میں صاف اور صحت مند زندگی بسر کرنے، خوراک اور پوشاک میں آزادی حاصل کرنے کی صلاحیت پیدا ہو جانی چاہیئے اور کسی ایک دستکاری میں بھی مہارت ہو جانی چاہیئے تاکہ اپنی ضروریاتِ زندگی مہیا کرنے میں انھیں آسانی ہو۔ اصول سنہرے اور ملک کے علمی اور اقتصادی مسائل کو حل کرنے اور اپنے حقوق اور ذمہ داریوں کو سمجھنے کی اہلیت پیدا ہو جانی چاہیئے۔ ہر فارغ التحصیل بچہ ہر بات کو تحقیق کی نگاہ سے دیکھنا اور زندگی کی روزمرہ گتھیوں کو سلجھانا جانتا ہو۔ اپنے قدرتی اور علمی ماحول سے اقتصادی ماحول کو اس طرح وابستہ کرنا جانتا ہو کہ زندگی پُر لطف سفر معلوم ہو۔ موسیقی اور مصوری سے باخبر ہو کر حسنِ فطرت کا نظارہ کر سکے اور اپنے اور سماج کے فرصت کے لمحوں کو رنگین بنانے کی صلاحیت رکھتا ہو۔

بنیادی تعلیم کا مجلسی پہلو

جس ملک کی مجلسی زندگی ذات پات اور چھوت چھات کی نذر ہو چکی ہو، اور اونچ نیچ کے تعصبات نے سماج کا شیرازہ بکھیر کر رکھ دیا ہو وہاں ہر شخص کو بلا لحاظ مذہب اور ملت برابر کی زندگی کا حق دلانا اور اُس کو اپنے وجود پر فخر کرنا سکھلانا بنیادی تعلیم ہی کا حصّہ ہے۔ دستکاری کے ذریعے سے محنت کا وقار دل میں قائم ہوتا ہے اور دستکار، جو قوم کی دولت ہے، سماج میں عزت کا درجہ حاصل کرتا ہے۔ تعلیم یافتہ گروہ سماج سے الگ نہیں ہوتا بلکہ اپنے حقوق اور ذمہ داریوں سے آگاہی حاصل کر کے سماج کا کارآمد جزو بن جاتا ہے۔ اپنے آپ میں مزدریاتِ زندگی کے مہیا کرنے کی صلاحیت دیکھ کر اپنے آپ پر فخر کرتا ہے۔ اور سوائی اور ذلت کے عالم میں خودکشی سے بچ جاتا ہے۔ خود ہی سرمایہ دار اور خود ہی مزدور ہوتے ہوئے ملک میں مزدور اور سرمایہ دار کی باہمی کشمکش کو پیدا نہیں ہونے دیتا اور عدم تشدد کی بنیادوں پر سماج کے شاندار ایوان کو تعمیر کرتا ہے۔ جہاں نفرت کے عوض محبت اور خودسپنی کے عوض خودداری ملک کی مجلسی زندگی کی بنیاد ہوتے ہیں۔ ہر گاؤں بذاتِ خود ایک تفریح گاہ اور ہر شہر ایک جنت معلوم ہوتا ہے۔

بنیادی تعلیم کا اقتصادی پہلو

بنیادی تعلیم کی سب سے بڑی خوبی اقتصادی خودمختاری ہے۔ اسکول کے اندر دستکاری طلبا کے اخراجات پورے کرتی ہے اور اسکول کے باہر طلبا کی زندگی کا سہارا بن جاتی ہے۔ نہ تو تعلیم حکومت کی محتاج رہتی ہے اور نہ تعلیم یافتہ لوگ ملازمت پر تکیہ کرتے ہیں۔ اگرچہ ابتدا میں مرکزی اور صوبائی حکومتیں اس تعلیم کو عام کرنے کے لئے روپے کی تلاش میں ہیں۔ لیکن وہ وقت دُور نہیں جب تعلیم اور طلباء دونوں اقتصادی طور پر خود کفیل ہو جائیں گے۔ ملک کے باشندوں میں ملک کے قدرتی وسائل کو استعمال کرنے کی اہلیت پیدا ہوگی اور ہندوستان کے کارخانوں کی صحت ور آبادی روزگار کی تلاش میں شہروں کی خاک چھاننے سے بچ جائے گی۔ ہر شخص اپنے خوراک، پوشاک اور رہن سہن کے مسئلے کا حل خود کر سکے گا۔ اور حکومت بے روزگاری کے مسئلے کا حل ڈھونڈنے سے نجات پائے گی۔ ملک غیر ملکی پیداوار کی منڈی نہیں رہے گا بلکہ اپنی کاریگری کے نمونے ایک بار پھر ممالک غیر کے عجائب گھروں کی زینت بنیں گے باعزت وسیلۂ معاش بن کر زندگی کے معاشی نظریے کو بدل دے گی۔ ہر گھر ایک کارخانہ اور ہر مکان ایک عجائب خانہ ہوگا۔ جہاں فطرت کی فیاضیاں آزادی کے لمحوں کو رنگین اور پُرسکون بنا دیں گی۔

بنیادی تعلیم کا تہذیبی پہلو

دستکاری کو تعلیم کا مرکز بنانے سے صرف ملک کی مجلسی اور اقتصادی حالت

کو بدلنا ہی مقصود نہیں بلکہ Learning By Doing. کے فلسفے کے تحت تعلیم کو ایک ایسی دل چسپی سے وابستہ کرنا ہے جو بچے کی وجدانی، جسمانی اور روحانی قوتوں کی تربیت کے لئے جادو کا اثر رکھتی ہو۔ دستکاری میں بچے کا دل۔ دماغ نگاہ اور ہاتھ ایک مرکز پر ہو کر تربیت پاتے ہیں اور اس کی مکمل شخصیت تعلیم حاصل کرتی ہے۔ بچہ صرف کتابوں کا کیڑا ہی نہیں بنتا بلکہ اپنے تجربات اور مشاہدات سے حاصل کردہ علم کی بدولت ہر مسئلے کو تحقیق کی نگاہ سے دیکھنے کا اہل بنتا ہے۔ زندگی کے مختلف مرحلوں کو اسکول کی چار دیواری میں طے کرنے کے بجائے تعلیم براہ راست آپ کو زندگی کے قریب تر پاتا ہے۔ زندگی کی مشکلات کا سامنا کرنے سے نہیں گھبراتا بلکہ خودداری اور خود اعتمادی کے زیور سے مزین ہو کر ہر مصیبت کا ہنسی خوشی مقابلہ کرتا ہے

بنیادی تعلیم کا مستقبل

آج سے سولہ سال پہلے مہاتما گاندھی نے ۳۱ جولائی کے ہریجن کے کالموں میں اس نئی تعلیم کا ذکر کیا۔ آج سولہ سال کے بعد ہم دیکھتے ہیں کہ ملک کے ہر صوبے میں ابتدائی تعلیم بنیادی تعلیم کے طرز پر جاری ہے۔ کہیں کہیں سینئر بیسک اور پوسٹ بیسک ادارے بھی کھولے گئے ہیں۔ دہلی کے چھوٹے سے صوبے میں اس وقت تو بہائر بیسک اسکول اور ساڑھے گیارہ بیسک اسکول اور بارہ سینئر بیسک سکول قائم ہو چکے ہیں۔ ہندوستانی تعلیمی سنگھ کی سالانہ رپورٹیں اس امر کی شاہد ہیں کہ آج بنیادی تعلیم صرف ابتدائی درجوں تک ہی محدود نہیں بلکہ پوسٹ بیسک سے نکل کر یونیورسٹی ایجوکیشن میں داخل ہو چکی ہے۔ اور زندگی کی تربیت کا مکمل نصاب طیار ہو چکا ہے سیکنڈری ایجوکیشن کمیشن کی رپورٹ میں تعلیم کے مستقبل کا جو خاکہ ماہرین تعلیم نے پیش کیا ہے۔ اس میں نئی تعلیم کے نظریے کو خاص اہمیت حاصل ہے اور جان پڑتا ہے کہ باپو کے خوابوں کی تعبیر رنگین اور پر بہار ہے۔

معلومات اور اعداد

۱۔ اس سال مارچ میں ختم ہونے والے دو سال کی مدت کے دوران میں بھارتی ریلوں پر جو مسافر اور مال گاڑیوں کے نئے ڈبے استعمال کے لئے لائے گئے۔ ان میں سے علی الترتیب تقریباً ۸۸ فیصدی اور ۵۸ فیصدی بھارت ہی میں طیار کئے گئے تھے۔

۲۔ گذشتہ فصل میں کل بھارت میں ۷ لاکھ ایکڑ سے زیادہ رقبے پر جاپانی طریقے کے مطابق کاشت کی گئی اور اس رقبے میں سے ۶۱ ہزار آٹھ سو ایکڑ اراضی پر اسی طریقے کے تحت مزدور بنگال میں کاشت کی گئی ہے۔

۳۔ پانچ سالہ منصوبے کے تحت زرعی توسیع کی قومی سروس پر ایک ارب ایک کروڑ ۶۰ لاکھ روپیہ صرف ہوگا اس کل رقم میں مرکزی حکومت کا حصہ ۶۸ کروڑ ۲۰ لاکھ روپیہ اور ریاستی حکومتوں کا حصہ ۳۳ کروڑ ۳۰ لاکھ روپیہ ہوگا

بھارت میں ربڑ کی صنعت پر اب تک تقریباً ۱۳ کروڑ روپیہ خرچ ہو چکا ہے۔

گذشتہ سال تاروں (ٹیلیگرام) کے محصول سے بھارت کے ڈاک اور تار کے محکمے کو ۵ کروڑ ۶۰ لاکھ روپے کی آمدنی ہوئی۔

کل بھارت میں ۳۰ ستمبر ۱۹۵۳ء کو انکم ٹیکس (بشمول زائد ٹیکس، زائد منافع ٹیکس اور کاروباری منافعوں پر ٹیکس) کی واجب الادا رقم ایک ارب ۴۷ کروڑ روپے سے زائد تھی۔

اظہر علی فاروقی

نُور چندرانی

ایک بنگلا رومانی منظوم

نور چندرانی بنگلا زبان کا ایک ایسا منظوم رومان ہے جس میں بیک وقت دو شاعروں کی تصویریں دکھائی دیتی ہیں - دولت قاضی اور الاول - نور چندرانی اپنے پس منظر میں ایک ایسا سیاسی، سماجی اور ثقافتی انقلاب رکھتی ہے جس نے بنگلا شعر و ادب کی کایا پلٹ دی اور شعر و شاعری کی راہوں میں 'نور چندرانی' کو نشانِ راہ کی حیثیت بخشی -

بنگلا ادب نہ جانے کتنے انقلابوں سے گزرا - مذہبی سیاسی اور سماجی- اس کی تشکیل اور تخریب میں سب کو کچھ نہ کچھ دخل رہا ہے - کانو بھٹ کی سہجیائی تحریک کی بدولت چنڈی داس کے رسیلے گیت گونجے - دھرم منگل کے ترانوں پر موریا بھٹ، کھیلا رام، مانک گنگولی، شیام پنڈت نے وہ راگ چھیڑے، جس سے سارا بنگال جھوم اُٹھا - سین اور پال راجاؤں کے درباروں سے مالا دھر بسو اور شری کرشن کے بھرے نغمے سنائی دئے - حسین شاہی دربار سے اتحاد اور یگا نگی کی آواز بلند ہوئی - ستیہ پیر تحریک نے نہ صرف ہندو اور مسلمان کو ایک کرنے کی کوشش کی، بلکہ مسلمان شاعروں نے سرسوتی، چنڈی دُرگا کے سامنے سر جھکا دیا - کرشن لیلاؤں کی رچنا کی چنڈی منگل نظم کئے - مسلمانوں سے ہندوؤں نے اثرات قبول کئے - ویشنوی شعر و ادب نے بنگلا زبان میں تہلکہ مچا دیا - یہ سب کچھ ہوتا رہا، مگر سچ پوچھئے تو شعر و ادب کے نقطۂ نظر سے گھوم پھر کر سب کے سب ایک ہی دائرے میں رہے - اپنی دنیا سے دور، دیوتاؤں اور اپسراؤں کی دنیا، دیویوں اور گندھرب کے چمتکاروں ہی میں پھنسے رہے -

نور چندرانی ایک ایسے انقلاب کی تصویر ہے - جس نے بنگلا شاعری میں ایک نئی راہ پیدا کی - اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ ۱۵۷۶ء میں افغان فرمانرواؤں میں سے آخری تاجدار سلطان داؤد شاہ کا انتقال ہوا اور بنگال مستقل طور پر مغلیہ مملکت محروسہ سے ملحق ہو گیا تو بنگلا ادب نے ایک ایسی انگڑائی لی، جو حسین شاہی دور میں نہ لے سکا تھا - حسین شاہی شاعروں نے محض مذہبی تصنیفات کو بنگلا قالب میں ڈھالا، فارسی اور عربی کے کچھ الفاظ شامل کر دینے کے سوا بنگلا ادب کو فارسی شعر و شاعری کے اثرات سے محفوظ ہی رکھا - دولت قاضی، پہلا شاعر ہے - جس نے بنگلا شاعری کو رومان کی راہیں دکھائیں اور دیوی دیوتاؤں کی دنیا سے پلٹ کر خود اپنی دنیا کو دیکھا اپنے آپ کو، اپنے جیسے انسانوں کو - اگرچہ وہ راجاؤں اور رانیوں کی پہنائی ہوئی سُنہری زنجیروں کو نہ توڑ سکا پھر بھی اس نے کالی ماتا کے چرنوں سے ہٹا کر انسان کو اپنی دنیا تو دکھائی اور یہی دھوکا سب سے بڑا کارنامہ ہے نور چندرانی یا ستی مینا وتی نہ صرف بنگلا

شاعری میں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے، بلکہ اس جدید دور کی علم برداری کرتی ہے جسے الاؤل اور بعد میں بھرت چندر نے اپنایا۔ بنگلا شاعری کی یہ نشاۃ ثانیہ اُن ذہنیتوں کی رہین منت ہے جنھوں نے یوسف زلیخا، لیلیٰ مجنوں، ہشت بہشت، ہفت پیکر وغیرہ جیسی مثنویاں نظم کیں۔ اور چندرانی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔

دولت قاضی سولھویں اور سترھویں صدی کے درمیانی دور کا شاعر ہے جو مشرقی بنگال کے ضلع چٹگاؤں میں کسی جگہ کا رہنے والا تھا۔ اس کے سوانح زندگی پورے طور پر اب تک نہ معلوم کئے جا سکے البتہ یہ بات طے ہے کہ وہ اپنے ابنائے وطن کی ایذا رسانی سے تنگ آکر اراکان چلا گیا اور وہاں کے راجہ شری شودھرما کے دربار سے وابستہ ہو گیا اور اس کا قیام ۱۶۲۰ء سے ۱۶۳۸ء تک وہاں رہا۔ وزیر جنگ اشرف خاں کی فرمائش پر اور چندرانی کو نظم کرنا شروع کیا، جسے وہ اپنی ناگہانی موت کے باعث پورا نہ کر سکا اور اٹھارہ سال بعد ۱۶۵۷ء میں الاؤل نے پورا کیا۔

اور چندرانی کی افسانوی اہمیت اس وقت اور بھی واضح ہو جاتی ہے جب ہم دیہے گیت کی داستان چند سوداگر میں لکشیندر، بیہولا اور منسا دیوی کے کردار اپنے سامنے رکھیں یا پھر چنڈی منگل کی کال کیتو شکاری، اور دھن پتی سوداگر کے کردار پھلا رانی، لہنا کھلنا وغیرہ کو اس کے سامنے لائیں۔

اور چندرانی کا افسانہ تاریخی ہے یا محض فرضی؟ یہ طے کرنا تو بہت دوبھر ہے مگر اتنی بات ضرور ہے کہ قاری پڑھتے پڑھتے ایک بار کہہ اٹھتا ہے کہ ہاں ایسا بھی ہوتا ہے۔ کلاسیکی طور پر حمد و ثنار حاکم وقت کی مدح اور اشرف خاں کی ستائش کے بعد کہانی کا آغاز اس طرح ہوتا ہے۔

ریاست[1] گئو پاری کا حکمران راجا ور شادی شدہ ہے اور اپنے دیش کے ریت رواج کے مطابق اس کی شادی راجکماری بینا دتی سے ہو چکتی ہے۔ اتفاق وقت راجہ سوار ہو کر سیر کو نکلتا ہے کہ ایک جوگی کے گرد بھیڑ بھاڑ دیکھ کر گھوڑا روک دیتا ہے۔ جوگی راجا کو ایک حور تمثال پری شمائل نازنین کی تصویر دکھاتا ہے اور راجا اس کے حسن کا شیدائی بن جاتا ہے۔ جوگی سے پتہ نشان دریافت کرکے وہ راج بھون لوٹتا ہے اور اپنی رانی بینا دتی کو اس کے حال پر چھوڑ کر رانی چندرا[2] دتی کی تلاش میں نکل کھڑا ہوتا ہے صدہا مصیبتیں جھیلتا وہ سوہارا کی سرحد میں داخل ہوتا ہے اور چندرادتی کے دیدار کی تدبیریں سوچتا ہے بڑی دشواری کے بعد اسے ایک کٹنی مالن ملتی ہے جو ور کو وہاں لے جاتی ہے جہاں چند رانی بیاہی گئی ہے اور دونوں کی ملاقات کرا دیتی ہے اور چندرادتی ور کے ساتھ فرار ہو جاتی ہے۔

جب چندرادتی کے شوہر بامن کو اس کی خبر ہوتی ہے تو وہ ور کا تعاقب کرتا ہے مگر چونکہ وہ ایک ناکارہ مرد ہے، شکست کھا جاتا ہے۔ چندرا دتی اپنے میکے سوہارا پہنچتی ہے۔ جب اس کے باپ کو یہ معلوم ہوتا ہے اور ور کی حقیقت سے واقف ہو جاتا ہے تو وہ چندرانی کا بیاہ بیاہ ور کے ساتھ کر دیتا ہے اور اپنا راج پاٹ ور کے حوالے کر کے خود سنیاس لے لیتا ہے۔

رانی بینا دتی سب کچھ جان لیتی ہے پھر بھی وہ اپنے پتی کی جدائی میں گھلتی رہتی ہے اور اس سے

---

[1] پراچین پوتھی دورن - عبد الکریم ڈگ ساہتیہ سوسائٹی کلکتہ
[2] چندرانی

ملنے اور اس کے پھلنے پھولنے کی آشا کرتی ہے اور یہی دعا کرتی رہتی ہے - اسی اثنا میں چھٹن نامی ساہوکار رانی مینا وتی کے عشق میں گرفتار ہو جاتا ہے اور اسے اپنے دام فریب میں لانا چاہتا ہے - وہ ایک کٹنی مقرر کرتا ہے جو مینا وتی کے وہاں جا کر داسی کا کام کرتی ہے اور مینا وتی کو بہکانا چاہتی ہے مگر مینا وتی اس کی حرکتوں سے اسے پہچان لیتی ہے اور نکال باہر کرتی ہے -

آخرکار اپنی ایک پرانی خادمہ کی صلاح سے رانی مینا وتی ایک برہمن اور توتا ریاست سوہارا بطور قاصد راجا لور کے پاس بھیجتی ہے - برہمن راجا کو اس کی پرانی محبت اور رانی مینا وتی کا خلوص اور سچا پریم یاد دلاتا ہے رانی چندرا وتی لور کے ساتھ گٹھ جوڑی چلنے پر راضی ہو جاتی ہے اور لور ریاست کا کار و بار اپنے بیٹے کے سپرد کر دیتا ہے اور مینا وتی کے پاس واپس آ جاتا ہے اس طرح مدت کے بعد دو بچھڑے مل جاتے ہیں -

افسانوی تکنیک کے لحاظ سے کہانی میں کوئی جان نہیں ہے بلکہ اردو اور فارسی مثنویوں سے بھی کمزور ہے - مگر اتنی بات ضرور ہے کہ دولت قاضی 'ادب برائے حیات' کا پہلا نمایندہ ہے اور اس نے دیوی دیوتاؤں اور مافوق فطری عناصر سے رہائی کرکے انسان کو انسان کی باتیں بتائیں - مینا وتی پر ایک خوبرو' نوجوان ساہوکار چھٹن فریفتہ ہوتا ہے - یہاں تک تو خود دولت قاضی کی تخلیق ہے - اس کے بعد والا ٹکڑا الاؤل کی تخئیل اور فکر کا نتیجہ ہے - الاؤل کو دولت قاضی سے احسان مندانہ عقیدت ہے اس لئے کہ جب الاؤل خانماں برباد ہو کر اراکان پہنچا تھا تو دولت قاضی نے نہ صرف اسے پناہ دی' بلکہ بہت کچھ سکھایا پڑھایا[1] بھی - دولت قاضی نے عورت کے کیریکٹر کا ایک تاریک پہلو پیش کیا - باس ایک ناکارہ[2] مرد ہے - چندرانی ہوس پرست ہے اور شہوانیت کی پرستار - الاؤل کے لئے عورت کے کیریکٹر کا ایک روشن پہلو ہی باقی رہ گیا تھا - اس لئے اس نے مینا وتی کے ساتھ تیاگ - شوہر پرستی اور پاک دامنی کے اوصاف وابستہ کئے - اور اس طرح مینا وتی کے کردار کی روشنی میں الاؤل نے اس وقت کی زندگی کی تلخیوں کو ہمارے سامنے رکھا کہ عورت صبر و تحمل کا ایک مجسمہ ہے -

دولت قاضی کا اسلوب نگارش سنسکرت کے اسالیب بیان سے مماثلت رکھتا ہے جہاں الفاظ کی مصوری، بندشوں کی دلآویزی، صنائع بدائع کی فراوانی ہی سب کچھ ہے - لطیف تشبیہوں اور نازک استعاروں اور تلمیحات کی دھوم دھام ہی سے بیان میں زور پیدا کیا جاتا تھا - قاضی دولت نے کہیں کہیں فارسی الفاظ بھی بر محل استعمال کئے ہیں - فارسی اسلوب کے تتبع کے باوجود اس میں نہ گل ہے اور نہ بلبل بلکہ دیسی بنگالی فضا ہے - رنگن ہے اور مالتی' پدم - کدم اور ملکا کے پھول - مور ہے اور کوئل - آموں کے خوشبو دار بور ہیں اور کیلوں کے جھرمٹ - اشوک ہے اور اشوتھ کے لمبے لمبے نازک پیڑ ہیں - بنگال کی عائلانہ زندگی کی تصویریں ہیں - یہ خصوصیت بنگال کے سبھی شاعروں میں پائی جاتی ہے کہ وہ موسمی کیفیات اور حزن و یاس کے مرقعے ایسے دردناک پیرائے میں پیش کرتے ہیں کہ قاری کا دل بے چین ہو جاتا ہے اور بیٹھی بیٹھی ٹیسیں گھیر لیتی ہیں - کندہ رام "دھن پتی" سوداگر کی داستان میں کھلنا کے فراق کا بیان بڑے دردناک

---

[1] ٹھاکر سو کمار سین

[2] پراچین پوتھی دبرن عبد الکریم

پیرایے میں کرتا ہے، بالکل اسی طرح ہمیں کُور چندرانی میں ستی مینا وتی کے جذبات اُبھرتے نظر آتے ہیں۔

"..... ندی کے کنارے کھڑی مینا وتی کا دماغ خوشبو سے بھر گیا۔ شاید بہار آ گئی اور کام دیو کی سواری نکل رہی ہے۔ وہ چونک پڑتی ہے اور اس کی نظریں اشوک، کیتکی، دھتکی، کن شکا کی لال لال کونپلوں پر پڑ جاتی ہیں۔ جہاں اُسے اپنے مانگھ سیندور کی لالی دکھائی دیتی ہے۔ وہ اشوک کی ایک ٹہنی اپنی چھاتی سے لگا لیتی ہے جس سے بیلیں لپٹی ہیں مینا وتی بیلوں سے کہتی ہے بہن! تم کتنی سوبھاگوتی ہو کہ اپنے پریتم کے گلے میں بانہیں ڈالے ہو ....

مور کا جوڑا ناچ رہا ہے، ساریں بہار کی ترنگ میں جھوم رہے ہیں۔ وہ مورنی بول پڑی اور مور سے لپٹ گئی۔ مینا وتی یہ منظر دیکھ کر تڑپ جاتی ہے اور اُسے اپنے پتی کی یاد آ جاتی ہے ... اس کی آنکھوں میں بنر ہے اور آنسو ...."

سچ بات تو یہ ہے کہ ایسی تصویروں کا لُطف کچھ بنگلا ساہتیوں میں ہی ہے۔ ترجمے سے اس کی بہت سی دلکشی کم ہو جاتی ہے۔

کور چندرانی ایک ایسی تصنیف ہے جس میں دو شاعروں کے تخیّل کار فرما ہیں ایک نے خود اپنی فکر اور اپنے رجحان سے اسے شروع کیا اور دوسرے نے محض اپنے ارادت مندانہ رجحان کی بنا پر اُسے پایۂ تکمیل کو پہنچایا۔ الاؤل علم و فضل میں دولت قاضی سے کہیں آگے ہے۔ دونوں حصّوں کو پڑھنے کے بعد ایسا حکم لگانا کہ شدّت تاثر، سلاست زبان اور زور بیان کے لحاظ سے الاؤل دولت قاضی سے پیچھے رہ گیا ہے ایک ذہنی فریب پر مبنی ہے۔ عبد الکریم اور ڈاکٹر دنیش چندر سین کے بیانات کو سامنے رکھتے ہوئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ الاؤل نے اپنے زورِ بیان اور زبان کی بدولت کور چندرانی میں جان ڈال دی ہے۔ اور وہ دولت قاضی سے نہ صرف علم و فضل بلکہ شاعرانہ فنِ کمال میں اُس سے بہت آگے[1] ہے

---

[1] بنگا بھاشا و ساہتیہ کتھا ص۸۱۰

روم میں انڈیا ڈے

۲۸ نومبر کو روم میں اطالوی ہندوستانی انجمن اور ادارہ برائے وسط و بعید مشرق نے مشترکہ طور پر "انڈیا ڈے" کا اہتمام کیا۔ اس تقریب پر ہندوستانی سفیر شری سین نے چار ہندوستانی فنکاروں کی جو آجکل یورپ میں مقیم ہیں مصوّری اور سنگتراشی کے نمونوں کی نمائش کا افتتاح کیا۔ اس نمائش کا انتظام مذکورہ ادارے کے ہال میں کیا گیا۔ اس موقع پر ہندوستانی دستکاری کی ایک نمائش بھی کی گئی۔

ہندوستانی سفیر نے اقوام میں دوستانہ تعلقات استوار کرنے کے لئے ایسی تقریبوں کی اہمیت پر زور دیا۔ بعد ازاں کلچرل اٹیچی شری مدن جیت سنگھ نے اجنٹا کے رنگدار خاکوں کے بارے میں اطالوی زبان میں لیکچر دیا۔

سامعین میں دوسرے ملکوں کے سفیر حکومت اٹلی کے افسر اٹلی کی معاشرتی انجمنوں کے نامور نمائندے اور کئی دیگر ممتاز ہستیاں شامل تھیں۔

یومِ حقوقِ انسانی کی سال گرہ

۱۰ دسمبر ۱۹۴۸ء کو اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے اس سال اپنے پیرس کے اجلاس میں حقوق انسانی کے عالمگیر اور یادگار صحفہ نامے کو قبول کرکے اس کا اعلان کیا تھا۔ یہ صحفہ تین سال میں تیار کیا گیا تھا۔ اس کا ایک ایک لفظ بہت سے ممالک کے نمایندوں نے مرتب کیا ہے۔ تاکہ معیار اور مقاصد کی یہ متفقہ دستاویز مختلف قوموں اور مختلف تہذیبوں کے افراد کے لئے قابلِ قبول ہو سکے۔ اس صحفہ کی باقاعدہ قبولیت آزادی اور تحفظ کے حصول میں انسان کی اجتماعی جدوجہد کے لئے ایک تاریخی واقعہ اور سنگِ میل ہے۔ اس واقعہ کی تقریب منانے کے لئے ۱۹۵۰ء میں اقوامِ متحدہ کی جنرل اسمبلی نے یہ تجویز کیا تھا کہ آئندہ ہر سال ۱۰ دسمبر کو دنیا کے تمام لوگ یومِ حقوقِ انسانی کی تقریب منائیں۔ درحقیقت تاریخ بہت سے حقوقِ انسانی کو تسلیم کرانے کے لئے انسانی جدوجہد کی دستاویزیں ہیں اور انھیں حقوق کے عالمگیر صحفہ میں متعین کیا گیا۔ اگرچہ تاریخ کے ہر دور میں لوگوں نے بعض حقوق کے منوانے یا ان کی حفاظت میں جدوجہد ضرور کی ہے مگر ان حقوق سے تمام افراد فیض یاب نہ ہوتے تھے اور نہ ہی حقوق یافتہ لوگوں کو اس امر کا احساس ہوتا تھا کہ وہ اپنے بدنصیب بھائیوں کے حقوق تسلیم کرانے کے سلسلے میں ان کی راہ نمائی کریں۔ پانچویں صدی قبل مسیح میں حقوق کی وسعت کے لحاظ سے ساری دنیا میں ایتھنز والوں کی جمہوریت بہت ہی مکمل تصور کی گئی ہے۔ مگر اس میں بھی عورتوں، ۱۸ سال سے کم عمر کے بچوں اور غیر ملکوں سے آئے ہوئے باشندے شہری حقوق سے محروم تھے۔ ۱۲۱۵ء کے برطانوی عظیم چارٹر (میگنا کارٹا) میں آزاد لوگوں کے حقوق اور ملکی قانون کے تحت عدل و انصاف کی ضمانت دی گئی تھی مگر آزاد لوگ صرف برطانوی نواب اور جاگیرداری ہی تصور کئے جاتے تھے اور ملکی قانون کا منشا محض جاگیرداری کا قانون ہوتا تھا۔ لیکن مذکورہ بالا عالمگیر صحفہ طبقے اور جماعت کی کل یا بندیوں سے بالاتر ہے۔

حقوقِ انسانی کا یہ عالمگیر صحفہ جب سے منظور ہوا ہے اس نے انسانی امور پر بڑا زبردست اثر ڈالا ہے۔ یہ صحفہ اقوام متحدہ کے امنِ عالم کے پروگرام کی قوتِ حیات ہے۔ اس کی بدولت اقوام متحدہ کی کونسلوں کو ایسے فیصلے کرنے میں بڑی مدد ملتی ہے جن سے دنیا کے تمام حصوں میں رہنے والے انسانوں کی زندگی اثر پذیر ہوتی ہے بلکہ دنیا میں تعلیم، سائنس اور تہذیب کے معیار بلند کرنے کے سلسلے میں یہ صحفہ یونسکو کا خاص موضوع رہا ہے۔ اکثر حکومتوں کی دستور سازی پر بھی اس صحفہ کے اثر کو تسلیم کرنے کے علاوہ دنیا کے اکثر معاہدے اسی کے نمونے پر مرتب کئے گئے ہیں۔ بلکہ ہائی کورٹوں اور ٹریبونلوں میں بھی انسانی حقوق سے متعلق اہم فیصلوں میں اس کے حوالے پیش کئے جاتے ہیں۔

اس صحفہ میں تعلیم پر خاص توجہ مرکوز کی گئی ہے۔ کیونکہ آزادی اور وقار کی ترقیوں کا دارومدار تعلیم پر ہی ہے۔ اس صحفہ کی نشر و اشاعت زیادہ تر اساتذہ کا ہی کام ہے بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ انسانی حقوق کا تعلق استادوں سے ہی ہے خواہ ان کے تعلیم دینے کا مضمون کوئی بھی ہو۔ تاریخ عالم کے ایسے ابواب جن میں حقوقِ انسانی کی وضاحت کی گئی ہو، تاریخ کی جماعت کے طلباء کو سنائے جائیں۔ نسلی امتیاز کی کمزور اور جعلی سائنسی بنیادوں کو سائنس کی کلاسوں میں بے نقاب کیا جا سکتا ہے۔ درحقیقت اظہارِ خیال کی آزادی کا مظاہرہ اسکول کلب اور سوسائٹی کی تنظیم کے موقع پر کیا جا سکتا ہے۔

بھارت سرکار کی وزارتِ تعلیم نے تمام یونیورسٹیوں کے وائس چانسلروں اور ریاستی حکومتوں کے محکمۂ تعلیم کے ڈائرکٹروں سے اس دن تقریب منانے کی درخواست کی ہے۔ اور ایسے طریقوں کی سفارش کی ہے جو اس عالمگیر صحفہ کو مقبول عام بنانے میں بہت کامیاب ثابت ہو چکے ہیں۔ ان طریقوں میں مضامین کا مقابلہ، حقوقِ انسانی کی دستاویزوں کو پڑھ کر سنانا، ڈرامے، موسیقی، مصوری اور شاعری کے مقابلوں کے علاوہ صحفہ کی نمائشیں اور اس کے ڈرامے تیار کرنا بھی شامل ہے۔

تعلیم کا حقیقی نصب العین

آل انڈیا ریڈیو سے ڈاکٹر سمپورنانند کی تقریر کا اقتباس

اُتر پردیش کے وزیر داخلہ ڈاکٹر سمپورنانند نے "بھارت میں تعلیم کا مستقبل" کے قومی پروگرام کے تحت آل انڈیا ریڈیو دہلی سے تقریر نشر کرتے ہوئے کہا کہ علم اور قوت کو سب کی بھلائی کے لئے استعمال کرنا چاہئے۔ ہمارا واحد حق لوگوں کی سیوا ہے اور یہی ہمارے فرض میں بھی داخل ہے۔ تعلیم کا مقصد ہی جسمانی و ذہنی نشو و نما، اخلاق اور جذبات کو اسی سانچے میں ڈھالنا ہے۔ تعلیم کے مقاصد پر خیالات کا اظہار کرتے ہوئے وزیر موصوف نے کہا کہ بھارت میں تعلیمی سسٹم کے آئندہ ڈھانچے کے بارے میں کسی نتیجے پر پہنچنے سے پیشتر تعلیم کے حقیقی مقصد کو سمجھنا لازمی ہے۔ یہ روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ مستقبل میں بھارت میں تعلیم عام ہوگی اور ثانوی تعلیم کے نقائص کو دور کرنے کے لئے اُس میں موزوں تبدیلیاں کی جائیں گی، تاکہ ثانوی تعلیم حاصل کرنے کے بعد طلبا کے لئے روزگار اور سماجی خدمت کے مواقع میسّر ہو سکیں۔ نہ صرف یہ بلکہ یونیورسٹی کی تعلیم کا معیار بھی بلند کیا جائے گا۔ بھارت میں تکنیکل تربیت حاصل کرنے کی سہولتوں میں اضافہ ہوگا اور بھارتی سائنسداں عالمگیر سائنسی ترقی میں اپنا پارٹ ادا کریں گے۔ اگر بھارت میں مذکورہ تمام باتیں عملی شکل اختیار کر جائیں تو یقیناً یہ امر ہمارے لئے باعثِ فخر ہوگا۔ لیکن بھارت کے آئندہ تعلیمی ڈھانچے پر اعتراض کرنے والے کسی فرد کے لئے محض مذکورہ امور کو پیشِ نظر رکھنا ہی کافی نہیں۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ تعلیم کا حقیقی مقصد کیا ہونا چاہئے۔

آج کل کی تعلیم کا اہم مقصد انسانوں کو زندگی کی جد و جہد کے لئے تیار کرنا اور اسے اپنے شعور و شخصیت کی نشو و نما کے لئے مواقع بہم پہنچانا ہیں۔ تاکہ وہ اچھے شہری ثابت ہو سکیں۔ اس میں شک نہیں کہ جو تعلیمی سسٹم انسان کو کسی روزگار کے قابل نہیں بناتا وہ اصلاح طلب ہے۔ لیکن اس بارے میں کوئی انتہائی نظریہ قائم کرنا ایک ایسی غلطی کے مترادف ہوگا جس سے ہمیں بچنا چاہئے۔ لوگوں میں یہ عام خیال پایا جاتا ہے کہ تعلیم بذاتِ خود روزگار مہیا کر سکتی ہے۔ تجارت و صنعت میں متوقع توسیع نہ ہونے کے باعث بیکاری کا مسئلہ ہر روز زیادہ خطرناک صورت اختیار کر رہا ہے۔ مگر بے کاری کے اس مرض کی تہ تک پہنچنے کے عوض اُس کی تمام تر ذمہ داری موجودہ تعلیمی سسٹم پر ڈال دینے کا آسان طریقہ دریافت کر لیا گیا ہے۔

محض تعلیمی ڈھانچے میں تبدیلیوں سے ہی بیکاری کا یہ مسئلہ حل نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے لئے ایک دلیرانہ و دور اندیشانہ اقتصادی پالیسی پر عمل کرنے کی ضرورت ہے۔ اس موقعے پر پھر یہ سوال سامنے آتا ہے کہ تعلیم کا مقصد کیا ہونا چاہئے؟ تعلیم اور زندگی کے حقیقی مقاصد میں چنداں تفاوت نہیں۔ بھارت کے مفکروں کی رائے کے مطابق اپنی ہستی کو قائم رکھنا ہی انسانی زندگی کا مقصد ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم دوسرے لوگوں کے اس قسم کے جذبات کو نظر انداز کر دیں۔ جب ذاتی مفاد کے احساس کے ساتھ ساتھ ہم علم و تہذیب کی روشنی سے بہرہ ور ہوتے ہیں تو ہمیں زندگی میں ایک دوسرے سے تعاون کرنے اور ایک دوسرے کی خدمت کرنے کی اہمیت کا احساس بھی ہو جاتا ہے۔ اس طرح

آہستہ آہستہ ہمارے اندر بے غرضانہ خدمت کرنے کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ بالآخر ہم "موکش" کی منزل پر پہنچ جاتے ہیں اور ہمارے تمام اعمال خود بخود دھرم کی شکل اختیار کر جاتے ہیں۔ زندگی کا یہی مقصد انسان کو اشرف المخلوقات ہونے کا درجہ عطا کرتا ہے۔ چنانچہ تعلیم کا مقصد بھی یہی ہونا چاہیئے لیکن اس سے یہ مراد نہیں کہ تعلیمی اداروں کو آشرموں میں تبدیل کر دیا جائے اور انھیں "موکش" کی منزل پر پہنچنے کے لئے یوگ وغیرہ کی تربیت گاہیں بنا دیا جائے۔ بہرحال اس بات کو شدت سے محسوس کیا جا رہا ہے کہ دھرم کے بغیر طلبا کو اخلاقی تربیت نہیں دی جا سکتی۔ یہاں مذہب سے مراد کوئی خصوصی اصول نہیں۔ بلکہ وہ اسپرٹ ہے جو تمام مذہبی عقیدوں کی تہ میں پائی جاتی ہے۔ اگر ہم سب فرائض کی انجام دہی کی طرف زیادہ توجہ کرنے لگ جائیں تو ہر شخص کے حقوق محفوظ ہو جائیں گے۔ تعلیمی مدت کے دوران میں طلبا کی محض ذہنی نشوونما یا جسمانی مشقت کی اہمیت پر ہی زور نہیں دیا جانا چاہیئے بلکہ ان کی روحانی ترقی کی طرف بھی توجہ کرنی چاہیئے۔

ہمارے موجودہ تعلیمی سسٹم میں "عقیدہ" کے اسی عنصر کی کمی ہے۔ ہماری زندگی کا کوئی ایسا نصب العین نہیں جو محض زندہ رہنے کی خواہش سے بلند تر ہو۔ مہاتما گاندھی نے ہمارے سامنے ایک فلسفہ پیش کیا تھا۔ لیکن اُسے بھی ہم نے مکمل طور پر نہیں اپنایا۔ اس طرح ہماری زندگی میں ایک خلا سا پایا جاتا ہے۔ انسان کا نظریہ ایسا ہونا چاہیئے جو محض مادی ترقی کے نظریئے سے بلند تر ہو۔ اس غرض کے لئے انسان کو پھر دھرم کی طرف واپس لانے کی ضرورت ہے۔

اگر سیکولرازم اور جھوٹی عقلیت کے نظریوں پر غلط انداز سے زور دیا جائے۔ اگر ہمارے ملک کی تعلیمی پالیسی مرتب کرنے والے افراد تعلیمی ڈھانچے میں ہمارے ملک کی عظیم روایات کو موزوں مقام دیں اور اگر ہماری یونیورسٹیاں وقت کے تقاضوں پر پوری اتر سکیں تو بھارت کا مستقبل یقینی طور پر شاندار ہوگا اور اس قسم کی تعلیم سے ایسے شہری تیار ہوں گے جن کی موجودگی سے بھارت میں پُرمسرت زندگی کے ایک نئے دور کا آغاز ہوگا۔ اس کے برعکس اگر ہمارے ماہرین تعلیم کے مسئلہ پر بھی مغربیت سے ہی بندھے رہے اور انھوں نے تعلیمی سسٹم میں دھارمک اسپرٹ کو داخل کرنے کے لئے کوئی قدم نہ اُٹھایا تو ہماری ترقی رُک جائے گی۔

انسان کو اس قسم کی تعلیم دی جانی چاہیئے جس سے انسانوں میں پھوٹ ڈالنے والی رکاوٹیں بالکل ہٹ جائیں، یا بہت حد تک اُن کا وجود باقی نہ رہے۔ اس راستے پر چلنے سے بھارت تمام دنیا کی طرف سے مبارک باد کا مستحق ہوگا۔ ورنہ وہ مغرب کے پیچھے ہی لڑھکتا رہے گا اور عقلیت کے بے روح نظریے کی پیروی کرنے سے کوئی شاندار کامیابی حاصل نہیں کر سکے گا۔

معلومات و اعداد

گزشتہ سال بھارت سے ملوں کا تیار کردہ ۵۶ کروڑ گز سے کچھ زیادہ کپڑا برآمد کیا گیا، اور کرگھوں سے بنا ہوا تقریباً ۵ کروڑ ۵۰ لاکھ گز کپڑا بیرونی ممالک کو بھیجا گیا۔

۱۹۵۲-۵۳ء میں بھارت میں چینی کے صرف کی مقدار ۱۶ لاکھ ۷۰ ہزار ٹن رہی۔

۱۹۵۲-۵۳ء میں پاکستان کی مشرقی اور مغربی سرحدوں پر بھارت کی طرف سے اسمگلنگ اور درآمد کے سلسلے میں جانچ کرنے والی چوکیوں نے ۴ لاکھ روپے سے کچھ زیادہ قیمت کا خلاف قانون درآمد کردہ مال پکڑا۔

انڈسٹریل ہاؤسنگ اسکیم (صنعتی کارخانوں کے ملازمین کے لئے مکانات کی تعمیر اور بہبود رسانی) کی امداد کے تحت مرکزی حکومت کی طرف سے ایک کروڑ ۳۳ لاکھ روپے کے قرضہ جات دیئے گئے ہیں۔

بھارت میں سونے کی کانوں میں ۲۴ ہزار اشخاص کام کرتے ہیں۔

رفتارِ زمانہ

پاکستان کے گورنر جنرل بھارت میں

پاکستان کے گورنر جنرل مسٹر غلام محمد لکھنؤ سے ۵۰ میل دور ضلع بارہ بنکی کے مقام دیوا شریف پر حاجی وارث شاہ کی درگاہ کی زیارت کرنے تشریف لائے۔ نمائندگان پریس سے ایک ملاقات میں انھوں نے سیاسی معاملات پر رائے زنی کرنے سے معذوری کا اظہار کیا۔ لیکن بھارت اور پاکستان کے عوام کو یہ مشورہ دیا کہ وہ پچھلے تلخ واقعات کو بھلا کر باہمی خیر سگالی، محبت اور اعتماد کے جذبات پیدا کریں۔ انھوں نے مزید کہا کہ بدگمانی، نفرت اور برداشت نہ کرنے کا جذبہ مختلف اقوام کی تباہی کا موجب ہے۔ اس لئے ہمیں مرتے دم تک یہ عقیدہ رہے گا کہ بھارت اور پاکستان ہر دو ممالک میں باہمی اعتماد اور محبت پیدا ہو۔ انسانیت کے جذبات قائم رہیں۔ اور دونوں میں خوفِ خدا ہو۔

چینی کلچرل مشن کے لیڈر کی تقریر

چینی کلچرل مشن کے لیڈر شری ننگ سی لنگ نے دہلی میں ایک تقریر کے دوران میں ہندوستانیوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ "ہم ہمایوں دوستی کا ہاتھ آپ کی طرف بڑھاتے ہیں اور ہماری خواہش ہے کہ آپ بھی اپنی دوستی کا ہاتھ ہماری طرف بڑھائیں۔ آپ نے کہا کہ چین اور بھارت دونوں پرانی تہذیب کے علمبردار ہیں اور دونوں ہمیشہ سے ہی پُرامن رہے ہیں۔ آپ نے امید ظاہر کی کہ دونوں دیش امن کی کوششوں میں ایک دوسرے سے تعاون کریں گے۔

وزیر اعظم کشمیر بخشی غلام محمد کا بیان

ریاست جموں و کشمیر کے وزیر اعظم بخشی غلام محمد نے ایک بیان میں کہا کہ کشمیر کے عوام کسی طاقت کو اُن کی سیاسی آزادی چھیننے کی اجازت نہیں دیں گے بھارت کے ساتھ کشمیر کے تعلقات کا ذکر کرتے ہوئے بخشی صاحب نے کہا کہ کشمیر بھارت کے ساتھ شامل ہو چکا ہے اور نیشنل کانفرنس کی رائے میں ریاست کے مسلمانوں اور غیر مسلمانوں کی بہتری بھارت کے ساتھ وابستہ رہنے میں ہی ہے۔ آپ نے ریاست کے لوگوں سے اپیل کی کہ وہ متحد رہیں اور اپنے باہمی تعلقات خوشگوار رکھیں۔

پیپسو اور ٹرا وانکور۔ کوچین میں انتخابات

بھارت پارلیمنٹ میں مدیرہ اعلیٰ ڈاکٹر کیلاش ناتھ کاٹجو نے اعلان کیا کہ الیکشن کمشنر کی طرف سے ایسے اقدام کئے جا رہے ہیں کہ پیپسو اور ٹرا وانکور کوچین کی سٹیٹ اسمبلیوں کا انتخاب موجودہ آئین کی بنا پر ۱۹۵۶ء کے پہلے ہفتے تک کرا دیا جائے۔

روس اور بھارت کے درمیان تجارتی معاہدہ

بھارت اور روس کے درمیان دوستی و مفاہمت کی فضا میں تجارتی معاہدے کی جو بات چیت جاری تھی اُس کے نتیجے کے طور پر ۱۰ دسمبر ۱۹۵۳ء کو نئی دہلی میں دونوں ملکوں کے درمیان ایک پنج سالہ تجارتی معاہدے پر دستخط کئے گئے۔ اس معاہدے کے تحت مساوی و باہمی مفاد کی بنیادوں پر دونوں ملکوں کے درمیان تجارتی تعلقات کو استوار کرنے اور انھیں ترقی دینے کی ہر ممکن کوشش کی جائے گی۔

بھارت اور روس کے درمیان یہ پہلا تجارتی معاہدہ ہے جس کی رو سے معاہدے کے پہلے سال میں بھارت سے پٹ سن کی مصنوعات، چائے، کافی، تمباکو، لاکھ، کالی مرچ و دیگر گرم مسالے۔ اون، کھالیں اور چمڑا، نباتی و خوشبو دار تیل اور چند دیگر اشیاء روس کو برآمد کی جائیں گی۔ اس کے عوض بھارت روس سے اناج (گندم، جو) پیٹرولیم (طبعی حالت میں) پیٹرولیم کے مصنوعات، عمارتی لکڑی، کاغذ، لوہے اور فولاد کی مصنوعات، کیمیائی اشیاء۔ رنگ تیار کرنے والی لکڑی، ادویہ، آنکھوں کے متعلق سامان، کیمسٹو گراف فلمیں چھاپنے کی چیزیں اور دیگر کئی قسم کی صنعتی اشیا جن میں سوراخ کرنے کی مشینیں۔ کانکنی اور سڑکوں کی تعمیر سے متعلق سامان۔ کھدائی کے اوزار۔ دباؤ ڈالنے کے اوزار۔ بجلی کا سامان۔ کپڑے، جوتے، خوراک اور دوا کے تیار کرنے کی صنعتوں سے متعلق سامان، ٹریکٹر و زرعی مشینیں اور دیگر مختلف اقسام کے مشینی اوزار و آلات شامل ہیں حاصل کرے گا۔

حکومت روس کی طرف سے بھارت میں روسی سفیر ہز ایکسیلنسی ایم۔ اے منشیکروف نے اور بھارت سرکار کی طرف سے وزارتِ تجارت و صنعت کے سکرٹری شری ایچ۔ وی۔ آر۔ آئینگر نے اس معاہدے پر دستخط کئے۔

بھارت میں خوراک کی تسلی بخش صورتِ حال

۸۔ دسمبر ۱۹۵۳ء کو ایوانِ عام میں ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے نائب

وزیر خوراک شری ایچ وی کرشنا پائے نے بتایا کہ مختلف ریاستوں میں خوراک کی کھڑی فصلوں کے متعلق عموماً تسلی بخش اطلاعات موصول ہوئی ہیں۔ موصوف نے ایوان کے سامنے حسب ذیل گوشوارہ پیش کیا جس میں ۱۹۵۳-۵۴ء میں فصل خریف کے اناجوں کے زیر کاشت رقبہ کے ابتدائی اندازے پیش کئے گئے ہیں۔

فصل	رقبہ (ہزار ایکڑوں میں)		کالم ۳ کے مقابلے میں کالم ۲ کا فی صدی اضافہ
	۱۹۵۳-۵۴ء کا پہلا اندازہ	۱۹۵۲-۵۳ء کا تصحیح کردہ پہلا اندازہ	
۱	۲	۳	۴
چاول	۶۷۴۵۲	۶۵۳۷۴	(+) ۳٫۲
جوار	۲۶۱۹۲	۲۴۶۰۶	(+) ۶٫۴
باجرہ	۲۶۵۱۴	۲۳۱۵۴	(+) ۱۴٫۵
مکئی	۸۴۷۴	۷۷۶۴	(+) ۹٫۰
راگی	۴۷۷۱	۴۵۹۸	(+) ۳٫۸
خریف کے اناجوں کی مجموعی	۱۳۳۳۹۳	۱۲۵۴۹۶	(+) ۶٫۳

خریف کے موسم میں جھونا باجرہ بھی بکثرت بویا گیا ہے۔ مگر اس کے متعلق اندازے آئندہ سال وسط مارچ میں موصول ہوں گے۔ نائب وزیر موصوف نے مزید بتایا کہ بحیثیت مجموعی خوراک کی صورت حال عموماً تسلی بخش ہے اور سیلابوں کے باوجود فصل کی حالت اچھی رہی ہے۔

ایسوشی ایٹڈ چیمبر آف کامرس کے اجلاس میں شری نہرو کی تقریر

کلکتہ میں ایسوشی ایٹڈ چیمبر آف کامرس کے سالانہ جلسے میں تقریر کرتے ہوئے بھارت کے پردھان منتری شری جواہر لال نہرو نے صنعت سازوں کو مشورہ دیا کہ انھیں مزدوروں کے ساتھ اپنے جھگڑوں کو انسانی اصولوں کی بنیاد پر سلجھانا چاہیئے اور اس بات کو بھی مدنظر رکھنا چاہیئے کہ صنعتوں کی ترقی میں مزدوروں کا بھی اہم ہاتھ ہوتا ہے۔ اس امر کو تسلیم کرتے ہوئے بھی کہ صنعتی مزدوروں کو ہڑتال کرنے کا حق حاصل ہے۔ شری نہرو نے اس امر پر زور دیا کہ مزدوروں اور صنعت سازوں کو اپنے جھگڑے باہمی بات چیت اور سمجھوتوں سے طے کرنے چاہئیں اور اگر اس طرح کوئی مسئلہ حل نہ ہو سکے تو معاملہ ایک تیسرے شخص کے سپرد کر دینا چاہیئے۔ ہڑتال کرنے سے صنعت سازوں اور مزدوروں کا نقصان تو ہوتا ہی ہے لیکن سب سے زیادہ نقصان ملک کا ہوا کرتا ہے۔ پردھان منتری نے پنج سالہ پلان کی اہمیت پر بھی زور دیا اور ملک کے ہر ایک شخص سے اپیل کی کہ وہ اس پلان کو کامیاب بنانے میں پوری کوشش کرے۔

بارا موڈہ کانفرنس

بارا موڈہ میں تین بڑوں کی کانفرنس (امریکہ، برطانیہ، فرانس) کے خاتمے پر ایک مشترکہ اعلان میں بتایا گیا ہے کہ تین بڑے ویٹو دنیا کے امن اور حفاظت کے لئے متحدہ کارروائی جاری رکھیں گے۔ اعلان میں یہ امید ظاہر کی گئی ہے کہ برلن میں منعقد ہونے والی چار بڑے وزرائے خارجہ کی میٹنگ میں جرمنی کو ملانے کے سوال پر فیصلہ ہو جائے گا۔ نیویارک سے آمدہ ایک اطلاع کے مطابق جنرل آئزن ہاور، مسٹر چرچل اور موسیو لینیل نے بارا موڈہ کانفرنس میں یہ بھی فیصلہ کیا ہے کہ ہند چینی کی پوری امداد کی جائے تاکہ وہاں کمیونسٹ کامیاب نہ ہو سکیں۔

ریاست جموں وکشمیر میں اجتماعی ترقی کے پراجیکٹ

ایک سوال کے تحریری جواب میں منصوبہ بندی، آبپاشی اور بجلی کے نائب وزیر شری جے سکھ لال ہتھی نے بتایا کہ اجتماعی ترقی کے پروجیکٹوں کی اسکیم کو ریاست جموں وکشمیر میں بھی جاری کر دیا گیا ہے اور اس پر عمل درآمد کرانے کی ذمہ داری ریاست کی حکومت پر رہے گی اور اس اسکیم کے تحت لداخ، مانسور اور باگدام کے اضلاع کے علاقوں میں کام کیا جائے گا۔

کشمیر جانے والے سیاحوں کی تعداد میں اضافہ

گزشتہ موسم گرما میں کشمیر جانے والے سیاحوں کی تعداد ۱۹۵۲ء کی نسبت ۵۰ فی صدی زیادہ رہی۔ ۱۹۵۳ء میں اپریل سے ستمبر تک ۱۷۷۵۰ سیاح کشمیر گئے۔ جبکہ گزشتہ سال اسی مدت کی تعداد ۱۱۸۱۳ تھی۔ مذکورہ مدت میں غیر ممالک سے آنے والے اشخاص کی تعداد ۱۰۶۷ سے ۱۶۸۸ ہو گئی لیکن ہندوستانی سیاحوں کی تعداد میں غیر معمولی اضافہ ہوا۔ ۱۹۵۳ء میں اپریل سے ستمبر تک کی مدت میں اُن کی تعداد ۴۶۰۰ تھی جبکہ اس سال اسی مدت میں یہ تعداد ۱۶۰۶۹ ہو گئی۔

دیہی معاشیات کے مثالی تجربات کا منصوبہ

دو سالہ اسکیم کی منظوری

نئی دہلی کے ٹاؤن ہال میں بھارت سرکار کی انڈین کونسل آف ایگریکلچرل ریسرچ کے مشاورتی بورڈ نے اپنے پہلے اجلاس میں دیہی معاشیات سے متعلق مثالی تجربات سرانجام دینے کے لئے ۴ لاکھ ۷۷ ہزار روپے کی ایک اسکیم منظور کی ہے۔ یہ اسکیم دو سال یعنی ۱۹۵۴-۵۵ء اور ۱۹۵۵-۵۶ء تک جاری رہے گی اور نئی تحقیقات اور زرعی توسیع سے متعلق تجاویز کے سلسلے میں یہ ایک بہت اہم اسکیم ہے

انڈین کونسل آف ایگریکلچرل ریسرچ کے وائس چیئرمین شری کے آر ڈملے نے اس اجلاس کی صدارت کی اور بورڈ کے ممبران کی شرکت کے علاوہ کونسل کے چیف مشیروں، مرکزی وزارت خوراک و زراعت کے کے تحت تحقیقات کے مرکزی اداروں کے ڈائرکٹروں، ریاستوں کے زراعت کے ڈائرکٹروں، مویشیوں کی نسل پروری اور علم الحیوانات کی سروسوں کے ڈائرکٹروں نے بھی شرکت کی۔ ان حضرات کے علاوہ اجناس کی مرکزی کمیٹیوں اور امداد باہمی کی تحریک کے نمائندوں، غیر سرکاری اشخاص اور سائنس دانوں نے بھی اس اجلاس میں شرکت کی۔

بھارت میں اہم فصلوں کے متعلق منصوبہ بندی کے تحت جو کام اب تک سرانجام پایا ہے وہ ناکافی ہوا۔ اس لئے ضروری ہے کہ جب دریائی وادیوں کے پروجیکٹ تکمیل کے قریب ہیں تو فصلوں کے واسطے مختلف قسموں کے کھادوں اور مختلف اقسام کی مٹی کے لئے آبپاشی کی ضروریات کا مطالعہ کیا جائے۔ لہٰذا بورڈ نے ۳۴ مرکزوں میں دیہی معاشیات کے تجربات سرانجام دینے کی غرض سے ایک ٹیکنیکل پروگرام مرتب کیا ہے۔ ان مرکزوں میں وہ ۱۸ مراکز بھی شامل ہوں گے جو اس وقت بھی کاشتکاروں کے تعاون سے ٹی۔ سی۔ اے (ٹیکنیکل کوآپریشن ایگریمنٹ) کا کام سرانجام دے رہے ہیں۔

کاشتکاری کے رائج طریقے

بورڈ نے تین سال کے لئے ۳ لاکھ ۲۸ ہزار روپے کی ایک دوسری اسکیم بھی منظور کی ہے جس کی رُو سے مختلف ریاستوں میں کاشت کاری کے مروّجہ طریقوں کے متعلق تحقیقات کی جائے گی اور اس اسکیم کو بروئے کار لانے کی غرض سے بھارت کے چھ زرعی حلقوں میں تقسیم کر دیا جائے گا۔ بورڈ نے ۹ ریاستوں میں چراگاہوں کی ترقی سے متعلقہ اسکیمیں بھی منظور کی ہیں جو عالمی ادارۂ خوراک و زراعت کے ماہر سبزہ زار ڈاکٹر آر۔ او۔ ونیٹ کے تیار کردہ منصوبہ کی تعمیل کا ایک جزو ہے۔ اس منصوبے پر ۲ لاکھ ۳۴ ہزار روپیہ صرف ہوگا اور مذکورہ کونسل کے لئے ہی تیار کیا گیا ہے۔ اس اسکیم کے تحت گھاس والی زمینوں کا جائزہ لیا جائے گا اور نقشے وغیرہ تیار کئے جائیں گے۔ چارہ کی پیداوار اور دیسی اور بدیسی اقسام کے گھاسوں اور خودرَو تر کاریوں کی پیداوار کے متعلق بھی تحقیقات وغیرہ کی جائے گی۔

دیگر اسکیموں کے علاوہ بورڈ نے خشک کاشت کاری، زمین کا تحفظ، تجارتی پیمانے پر کئی کی اقسام کی مخلوط پیداوار، زمین کو قابل کاشت بنانے، کاشتکاروں کے کھیتوں میں کھاد کے وسیع پیمانے پر تجربات وغیرہ کی اسکیمیں منظور کی ہیں۔

بورڈ نے کونسل کے تحت ایک علیحدہ سائنسی کمیٹی کے قیام کی بھی منظوری دی ہے۔ اس کمیٹی کا ایگریکلچرل انجینئرنگ اینڈ سائل کنزرویشن کمیٹی (زرعی انجینئرنگ اور تحفظ زمین کی کمیٹی) ہوگا جو انہیں دو متعلقہ امور کی اسکیموں کی جانچ پڑتال کرے گی۔

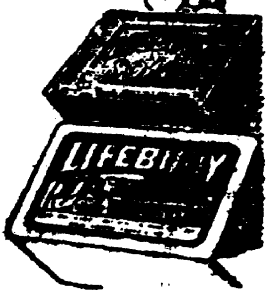
اس روز روز کی گندگی
کے جراثیم سے اپنی صحت کی حفاظت کیجئے



لائف بوائے کے
محافظ جھاگ
سے

چاہے آپ کتنی ہی احتیاط کیوں نہ برتیں اس روز روز کی گندگی کے جراثیم سے آپکو بیماری لگنے کا خطرہ رہتا ہی ہے۔ اپنی صحت کی حفاظت کرنے کیلئے لائف بوائے سے نہانے کی عادت ڈالئے۔ اسکے مصفی جھاگ سے گندگی کے جراثیم سے تم صاف رہتا ہے اور دن بھر تروتازہ بھی رہتا ہے۔





لائف بوائے صابن

روز روز کی گندگی سے جراثیم سے ہر روز آپکی حفاظت کرتا ہے

L 250-50 UD

"مَیں جانتی ہوں
لکس ٹائلیٹ صابن آپ کی جِلد
زیادہ دِلکش بنائے گا"

— ثریّا



ثریّا کہتی ہیں "اس
خالص و سفید صابن کی دلفریب
خوشبو میری جِلد میں بس جاتی ہے۔
آپ بھی اپنی جِلد نہایت ملایم اور
خوبصورت بنانے کیلئے لکس
ٹائلیٹ صابن استعمال کیجئے"

لکس
ٹائلیٹ صابن
فِلمی ستاروں کا
حُسن بخش صابن

کتنا سفید، کتنا خالص، کتنا خوشبودار

LTS. 286-X30 UD

جلیس احمد نظامی

اچھّا خواب



ایک مرتبہ چار دوست سفر میں گئے - ان میں ایک عیسائی تھا دوسرا یہودی، تیسرا نصرانی اور چوتھے ایک مولوی صاحب - سفر لمبا تھا - اور گھر سے جو کچھ کھانے پینے کا سامان لے کر چلے تھے وہ آدھے رستے میں ہی ختم ہو گیا - اس لئے اب چاروں دوست فاقے کرنے لگے - آخر جب بھوک کے مارے پاؤں لڑکھڑائے اور چلنا دوبھر ہو گیا تو چاروں ایک سرائے میں اتر گئے اور یہ سوچنے لگے کہ کسی تدبیر سے کھانا حاصل کیا جائے لیکن کوئی صورت ذہن میں نہیں آئی -

اتفاق کی بات کہ شام ڈھلنے کے بعد ہی ایک شخص کھانا لایا اور اُس نے اِن سے کہا کہ اگر آپ لوگوں کو بھوک لگی ہو تو بے تکلف کھائیے یہ کھانا موجود ہے اندھا کیا چاہے ؟ دو آنکھیں ! انہوں نے جھٹ اس سے کھانا لے کر رکھ لیا اور گھبراہٹ میں اُلٹا سیدھا شکریہ بھی ادا کر دیا -

بے چارہ کھانا دینے والا تو چلا گیا لیکن بدقسمتی سے وہ کھانا صرف ایک ہی آدمی کا پیٹ بھر سکتا تھا - اور ان چاروں میں سے ہر شخص یہ چاہتا تھا کہ میں ہی کھالوں باقی سب چاہے بھوکوں ہی کیوں نہ مر جائیں - آخر لڑ جھگڑ کر اس نتیجے پر پہنچے کہ اس وقت سب سو جائیں اور کھانا یونہیں رکھ دیں صبح اُٹھ کر کھائیں گے مگر شرط یہ ہے کہ ہم میں سے جو رات کو اچھّا خواب دیکھے گا سب کھانا وہی کھائے گا - اگر خواب کسی کا بھی اچھا نہ ہوا تو کھانا برابر حصّوں میں تقسیم کر لیں گے - اس بات پر سب رضامند ہو گئے - اور لمبی تان کر سو گئے -

جب رات آدھی ڈھل گئی ـــــ تو ان میں سے مولوی صاحب اٹھے اور سب کھانا کھا کر چین کی نیند سو گئے -

جب صبح کو چاروں ساتھی جاگے تو یہ صلاح ہوئی کہ اپنا اپنا خواب سُناؤ - چنانچہ عیسائی نے کہا کہ میں نے رات خواب میں یسوع مسیح کو دیکھا ہے کہ وہ مجھے اپنے ساتھ چوتھے آسمان پر لے گئے ہیں - وہاں تمام چیزوں کی مجھے سیر کرائی اور جنّت میں بھی گھمایا -

یہودی نے یوں بیان کیا کہ اس نے حضرت موسیٰؑ کو دیکھا کہ وہ اسے کوہِ طُور پر لے گئے ہیں اور حضرت موسیٰؑ کے ساتھ اللہ میاں سے بھی خوب بات چیت رہی -

نھرانی نے کہا کہ اس نے تو یہ خواب دیکھا کہ حضرت خضرؑ پکڑ کر اسے ایک سبزہ زار میں لے گئے ہیں اور وہاں کا منظر بڑا ہی خوش نما ہے ہر چیز ایسی رنگین ہے کہ آنکھوں کی روشنی بڑھ جائے۔ مگر وہاں حضرت خضر بکریاں چرا رہے ہیں اور میں بھی اُن کے ساتھ ہوں۔

اب ان سبھوں نے اپنا اپنا خواب بیان کر کے مسلمان ساتھی سے پوچھا کہ "مولانا تم نے کیا خواب دیکھا"؟ مولوی صاحب نے ایک ٹھنڈی آہ بھری اور فرمایا کہ کچھ نہ پوچھو۔ میں نے بڑا خطرناک خواب دیکھا ہے اب تک دل قابو میں نہیں ہے۔

ساتھیوں نے چونک کر پوچھا خیریت تو ہے کیا واقعہ گزرا کچھ ہمیں بھی تو بتائیے !!

مولوی صاحب نے اپنا سر پکڑ کر ایک جھرجھری لیتے ہوئے فرمایا کہ رات کو آسمان سے دو فرشتے اُترے اور اُن کے ہاتھوں میں دو ننگی تلواریں ایسی چمک دار تھیں کہ اُن کو دیکھ کر آنکھیں چُندھیا گئیں (یہ کہتے ہوئے پھر مولوی صاحب نے ایک جھرجھری لی —!)

اور وہ دونوں فرشتے میرے کاندھوں پر سوار ہو گئے مجھے تلواریں دکھا کر بہت زور سے ڈانٹا اور یہ حکم دیا کہ جتنا کھانا رکھا ہے سب ابھی کھا لے ورنہ جان سے مار ڈالا جائے گا"۔

یہ سُن کر ان کے ساتھی چونکے اور کنکھیوں سے اس طاق کی طرف دیکھا جہاں رات کھانا رکھ کر سوئے تھے۔ لیکن ان پر عجب کیفیت گزری جب طاق کو خالی پایا۔ اب تو سب نے سٹ پٹا کر اُس سے پوچھا

"تو کیا تم نے کھانا کھا لیا"؟

"اور — نہ کھاتا تو کیا اپنی جان سے ہاتھ دھوتا۔ وہ دونوں فرشتے تو سر پر سوار تھے!"

مولوی صاحب نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا —

اُن کے ساتھیوں نے چیخ کر کہا "تو تم نے ہمیں کیوں نہیں جگا لیا۔ ہم ان فرشتوں کو بھگا دیتے۔ یہ تو غضب ہو گیا۔

مولوی صاحب فرمانے لگے

"جگاتا کسے؟ یہاں تھا کون؟ کوئی چوتھے آسمان پر گیا تھا۔ کوئی کوہ طور پر اللہ میاں سے باتیں کر رہا تھا کوئی بکریاں چرانے گیا ہوا تھا۔ سرائے میں تو بس میں بدنصیب تھا اور وہ ظالم فرشتے — !!



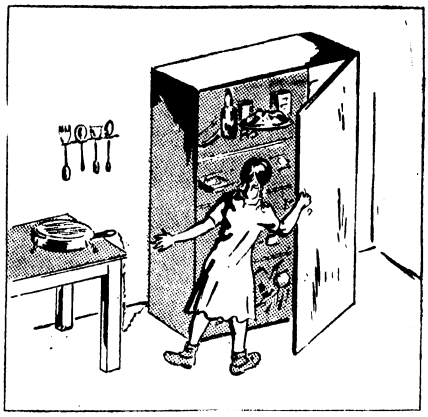
سراج انور

حلوہ سوہن

گرمیوں کے دن تھے اور انجم و ثروت کے ابّا نے ریفریجیریٹر نیا نیا لیا تھا۔ ثروت بچاری کے ذہن میں اس نام نے عجیب گڑبڑ مچا رکھی تھی یہ نام اُس کی زبان پر چڑھتا ہی نہ تھا۔ وہ یہ تو جانتی تھی کہ سفید رنگ کی اِس الماری کے نیچے ایک مشین سی لگی ہوئی ہے جو پُوری الماری کو ٹھنڈا رکھتی ہے۔ اِس الماری میں کئی خانے ہوتے ہیں اور اِس میں پھل، سبزیاں اور ایسی کھانے کی چیزیں جو گرمی میں گل سڑ جاتی ہیں رکھ دی جاتی ہیں۔ تاکہ چیزیں خراب نہ ہوں — انجم کو تو حیرت اس بات کی تھی کہ ایک خانے میں برف کی ننھی ننھی سی ڈلیاں بھی بن جاتی تھیں — جیسے چوکور ہیرے ہوں — چمکتے ہوئے ہیرے۔

ثروت کو یہ الماری بہت اچھی لگتی تھی۔ لیکن اس کا نام — بس نام یاد کرنے کے لیے وہ کافی دیر تک سر کھجاتی رہتی لیکن نام تھا کہ یاد آنے کا نام ہی نہ لیتا تھا۔ آخر اس نے ریفریجیریٹر کو سفید الماری کہنا شروع کر دیا۔ یہ نام انجم کو بھی پسند آیا۔ گو انجم کو بہت کم باتیں ثروت کی پسند آتی تھیں لیکن اس الماری سے چیزیں چُرا چُرا کر کھانے کا اِرادہ اُس نے ابھی سے کر لیا تھا اور بغیر ثروت کی مدد کے چیزیں چرانے کا یہ کام بہت مشکل بلکہ ناممکن تھا — ثروت یقیناً امّی سے شکایت کر دے گی اور امی کی جُوتی — توبہ ہے وہ کم بخت ٹوٹتی بھی تو نہیں —!

ایک دن انجم نے دیکھا کہ امّی چینی کے ایک پیالے میں



کتھئی رنگ کی کوئی چیز کتر کتر کر ڈال رہی ہیں — آخر وہ کیا ہو سکتی ہے — چاکلیٹ — ؟ اُدھر ہوں چاکلیٹ امّی اس قدر فراخ دلی سے پیالے میں نہیں جما سکتیں — مُربّہ — مگر یہ مُربّہ بھی نہیں ہو سکتا — پھر آخر یہ کیا ہے ؟ — انجم کی سمجھ میں جب کچھ نہیں آیا تو دوڑا دوڑا ثروت کے پاس گیا — ثروت بیٹھی ہوئی گڑیا کی چوٹی گوندھ رہی تھی — وہ جاتے ہی چیخا

ثرو — ثرو — ذرا یہاں تو آ — دیکھ امّی کیا بنا رہی ہیں

"— کیا بنا رہی ہیں — تم نے دیکھا جمّی بھیّا — ؟ ثروت نے گڑیا ایک طرف پٹخ دی۔

— مجھے تو معلوم ہو نہیں سکا — تو چل کر دیکھ —

اور ثروت لپک کر انجم کے ساتھ ہولی — دونوں آہستہ آہستہ امّی کے پاس پہنچے — امّی مسکرائیں۔

"امّی — امّی — انجم نے گُدّی کھجاتے ہوئے کہا — کیا ہے امّی یہ —"؟

"جاؤ کھیلو — تمہارے مطلب کی چیز نہیں ہے — امّی

نے جواب دیا ۔

"— امّی کوئی مہمان آ رہا ہے — ؟ ثروت نے پوچھا ۔

"— تمہیں کیسے معلوم — ؟

"آپ — آپ یہ کچھ بنا جو رہی ہیں — ثروت نے کہا — اچھی امّی ہمیں بتا دیجئے کیا ہے — ؟



"تمہارے ابّا کے دوست آ رہے ہیں — حلوہ سوہن ہے — خبردار تم مت کھانا ۔ ورنہ ماروں گی — ہاں

"ہم تو حلوہ سوہن کھاتے ہی نہیں امّی — ثرو کو بھی بُرا لگتا ہے کیوں ثرو — ؟

اور ثروت نے اپنی گردن ہلا کر ہاں کہی — اور پھر دونوں ایک کونے میں بیٹھ کر امّی کو کام کرتے دیکھتے رہے انہوں نے حلوہ سوہن چھوٹی سی پتیلی میں پکانا شروع کیا — اور انجم کی رال ٹپکنے لگی ۔

"ثرو — یہ تو ایک ہی مہمان کے لئے ہے ۔ ہمارے حصّے میں تو آئے گا نہیں ۔ تھوڑا سا ہے نا!" اور ثروت اداس نظروں سے انجم کو دیکھنے لگی ۔ اتنے میں امّی نے وہ حلوہ سوہن چینی کے ایک پیالے میں اُلٹ کر نوکرانی کو حکم دیا کہ وہ پیالہ سفید الماری میں رکھ آئے تاکہ حلوہ جلد ہی جم جائے —

یہ سنتے ہی انجم نے ثروت کو دیکھا — دونوں کی نگاہیں چمک اٹھیں ۔ چپکے چپکے کچھ اشارے ہوئے اور دونوں اُٹھ کر چل دئے — راستے میں انجم نے ثروت سے کہا ۔

"ثرو — زیادہ تو نہیں ہاں تھوڑا سا کھا لیں گے —"

"کیا بھیّا — ؟ ثروت نے سمجھتے ہوئے بھی انجان بن کر پوچھا

"ارے وہی حلوہ سوہن — اور ہاں انگلی سے نہیں نکالیں گے ورنہ امّی ہماری انگلیاں پہچان جاتی ہیں ۔ تجھے یاد ہے نا ایک مرتبہ کھیر کھانے پر انہوں نے ہمیں کتنا مارا تھا ۔ ہماری انگلیاں کھیر کے پیالے پر رکھ کر انہوں نے یہ ثابت کر دیا تھا ۔ کہ کھیر ہم ہی نے کھائی ہے —"

"بھیّا آخر امّی کو یہ معلوم کیسے ہو جاتا ہے — وہ ہماری ہر بات جان جاتی ہیں —" ثروت نے تعجّب سے کہا ۔

"ارے بھئی آخر وہ ہماری امّی ہیں ۔ دوسرے کم بخت طوطا بھی اُن سے سب کچھ کہہ دیتا ہے ۔ تمہیں تو معلوم ہی ہے ہمیں بُرا بھلا کہتے وقت وہ ہمیشہ یہی کہتی ہیں کہ طوطے نے مجھ سے کہا تھا ۔ طوطے نے شکایت کی تھی ۔ اس طوطے کی بھی خبر لوں گا — تم دیکھنا —"

میرے خیال میں حلوہ سوہن اب جم بھی گیا ہوگا ۔ دو چمچے لے لو بھیّا ۔ اس مرتبہ چمچوں سے کھائیں گے ۔ لیکن صرف ایک ہی چمچہ کھانا

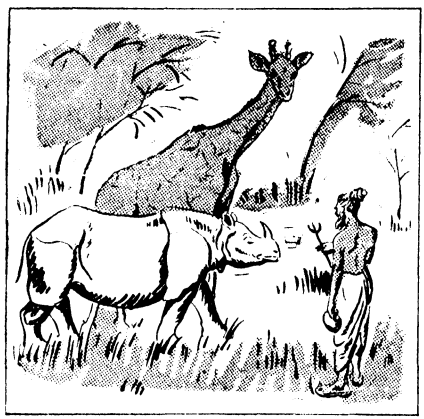
(باقی صفحہ ۶۰ پر)

عبید اللہ صدیقی

زرافہ اور گینڈا

آؤ بچو تمہیں ایک چھوٹی سی کہانی سُناؤں

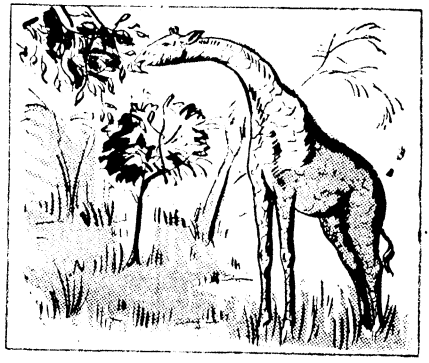
آج سے بہت سال پہلے زرافے اور گینڈے میں بڑی دوستی تھی - ایک دن دونوں میدان میں گھاس کھا رہے تھے تو گینڈے نے کہا "دوست ہم دونوں بہت ناٹے ہیں - اِس لئے ہم لوگوں کو سبھی جانوروں کے پیروں کی روندی ہوئی گھاس کھانا پڑتی ہے - اگر ہماری لمبی گردن ہوتی تو کتنے مزے سے پیڑوں کی ملائم پتیاں کھاتے پھرتے - لیکن خدا نے ہم لوگوں کو لمبی گردن دی ہی نہیں - اس لئے اب سوچنے سے کیا فائدہ - زرافے نے جواب دیا - یہ سُن کر گینڈا کچھ سوچنے لگا پھر بولا سُنو دوست دنیا میں عقلمندی سے بڑھ کر کوئی دوسری چیز ہی نہیں - تم انسان کو جانتے ہو نا ؟ وہ اپنی عقلمندی سے مشکل سے مشکل کام کو بھی آسانی سے انجام دے لیتا ہے - اِس لئے چلو اُسی کے پاس - وہ کوئی نہ کوئی تدبیر ضرور بتا دے گا" - یہ سوچ کر دونوں ایک سادھو کے پاس گئے جو جنگل کے قریب ہی اپنی



کٹیا میں رہتا تھا - اور انہوں نے اپنی خواہش ظاہر کی - سادھو نے ان کی باتوں کو سُن کر کہا "تم دونوں فلاں روز دوپہر کے وقت فلاں جگہ آؤ - میں تمہارے لئے ضرور کوشش کروں گا - لیکن سُنو تم دونوں کو وقت مقررہ پر پہنچ جانا پڑے گا - وقت گزر جانے کے بعد میں کچھ نہیں کر سکوں گا - اور تم دونوں سدا پچھتاتے رہو گے - یہ سُن کر دونوں دوست خوشی خوشی واپس آ گئے -

اس دن وقت مقررہ پر زرافہ اس جگہ پہنچا - سادھو وہیں بیٹھا کچھ پڑھ رہا تھا زرافے کو دیکھ کر اس نے پوچھا - تم دونوں آ گئے" - "نہیں ابھی گینڈا پیچھے آ رہا ہے" - زراف نے جواب دیا - کچھ دیر بعد جب گینڈا نہیں آیا - تو سادھو نے جھنجھلا کر کہا - وقت گزرتا جا رہا ہے - اب میں اس کا انتظار نہیں کر سکتا - تم اب اپنا مُنہ کھولو - یہ سُن کر زرافے نے اپنا مُنہ کھول دیا - سادھو نے ایک جڑی اُس کے مُنہ میں ڈال دی - بعد میں کچھ پانی پڑھ کے اس کے بدن پر چھڑک دیا

جسم پر پانی پڑتے ہی زرافے کی ٹانگ اور گردن بڑھنے لگی۔ یہ دیکھ کر زرافے نے سادھو کا شکریہ ادا کیا۔ پھر اس نے اپنے دوست کے بارے میں پوچھا۔ اب میرے دوست کا کیا ہوگا؟ تب سادھو نے جواب دیا جو وقت کی قدر نہیں کرتا۔ وہ سدا پچھتاتا ہے۔ گینڈے کے لئے جو جڑی تھی وہ بھی میں نے تمہیں ہی کھلا دی ہے۔ یہ کہہ کر سادھو اپنے



کام میں مشغول ہوگیا۔ اور زرافہ اب آرام سے گھوم گھوم کر روندی ہوئی گھاس کھانے کے بدلے درختوں کی تازہ اور ملائم پتیاں کھانے لگا۔ جب گینڈے نے زرافے کو درخت کی سبز سبز اور ملائم پتیاں کھاتے دیکھا تو وہ حسد سے جل ہی تو گیا۔ اور اسی دن سے گینڈا انسان کا جانی دشمن اور زرافہ دوست بنا۔" (ترجمہ)

لطیفہ

حمید۔ ابّا جان! باہر ایک آدمی چلّا رہا ہے اس لئے ایک آنہ دیجئے

باپ۔ (اکنّی دے کر) کون آدمی؟.... **حمید**۔ مٹھائی والا۔

حلوہ سوہن (صفحہ ۵۸ سے آگے)

ورنہ امّی جان جائیں گی — ثروت نے رائے دی

چھپے اپنی اپنی آستینوں میں چھپا کر یہ دونوں دبے دبے پاؤں بڑے کمرے کی طرف چلے۔ بڑے کمرے میں ان دونوں کو جانے کی اجازت نہیں تھی۔ کیونکہ دونوں وہاں پہنچ کر صوفے خراب کر دیتے تھے۔ اور پھر اب تو وہاں سفید الماری بھی آگئی تھی۔ جہاں یہ الماری کے نزدیک گئے اور امّی کی گرج دار آواز آئی —

"کمرے سے باہر نکلو —" لیکن آج انہوں نے آپس میں نہ لڑنے کی قسم کھالی تھی اس لئے بغیر کسی قسم کا شور کئے وہ کمرے میں پہنچ ہی گئے۔

"ثرو — تو کھول الماری — انجم نے پیچھے مڑ کر دیکھتے ہوئے کہا۔

"بھیّا تم بڑے ہو — تم کھولو —" ثروت نے جواب دیا۔

"اچھا۔ لیکن تم دیکھتی رہنا کوئی آنہ جائے —"

"ہاں ہاں —"

انجم نے الماری کھولی — حلوہ سوہن جما ہوا تیار رکھا تھا۔ دونوں نے اپنے اپنے چھپے نکالے، جہاں تک ممکن ہو سکا چمچہ لبالب بھرا اور پھر خراب سے وہ چمچے منہ میں چلے گئے — لیکن اچانک جیسے زلزلہ آگیا — دونوں نے چمچے پھینک دئے۔

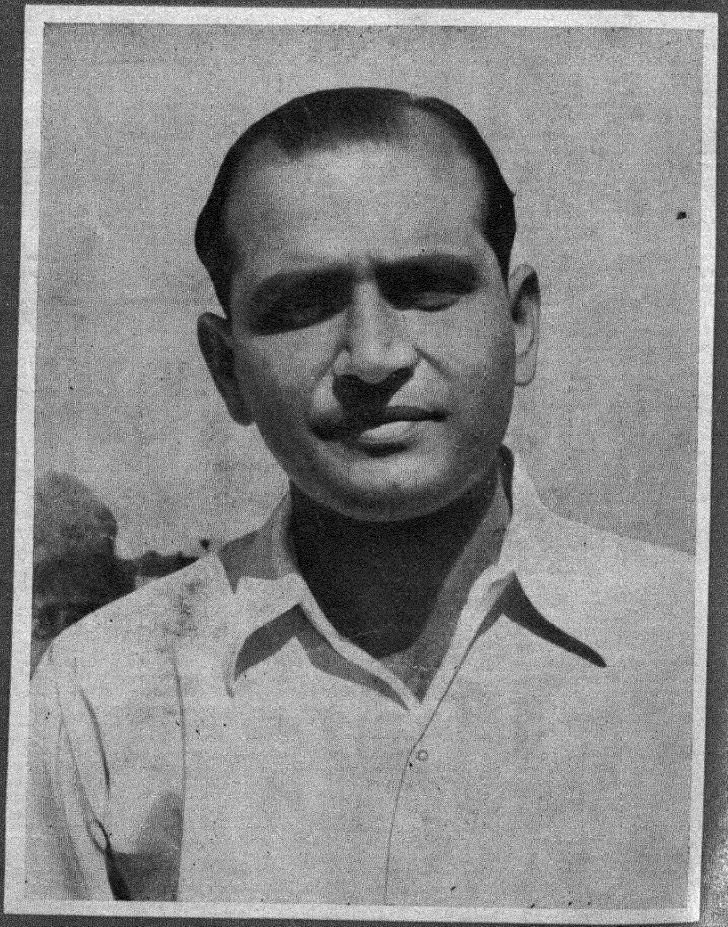
"اخ تھو — اخ تھو — اخ — ہائے امّی مر گیا — انجم چلّایا اور ثروت نے بھی آسمان سر پر اٹھا لیا — دونوں بار بار تھوک رہے تھے۔ چیخ پکار سُن کر امّی دوڑی دوڑی اندر آئیں۔ یہ منظر دیکھ کر وہ مسکرائے بغیر نہ رہ سکیں۔ دونوں کو تھوڑا بہت مارا اور بولیں۔

"دیکھی چوری کرنے کی سزا — اور کچھ نہیں تو کتھا ہی کھا گئے۔ چلو منہ دھوؤ چل کر —"

دونوں تھوکتے ہوئے امّی کے ساتھ باہر چلے گئے۔

آج کل

مارچ ۱۹۵۴ء



۸



دن بہ دن

زیادہ صاف و زیادہ دِلکش جِلد

رکسونا کا کیڈِل آپ کے لئے بھی یہ کمال کرے گا

اپنی جِلد پر رکسونا کا کیڈِل آمیز جھاگ ملئے، پھر دھو ڈالئے، آپ خود ہی محسوس کریں گی کہ آپ کی جِلد دن بہ دن زیادہ ملایم اور صاف ہوتی جا رہی ہے۔



رکسونا

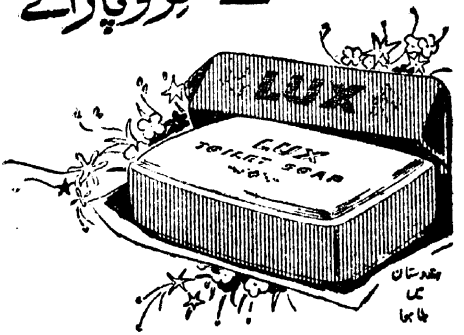
کیڈِل آمیز واحد صابن

* جِلد کو ملایم کرنے اور مقوی جِلد تیلوں سے ایک خاص مرکب کا ملکیتی نام

رکسونا پروپرائٹری لمیٹیڈ کیلئے ہندوستان میں بنایا گیا

RP 100-X30 UD

"کتنا خالص، کتنا سفید
لکس ٹائلیٹ صابن
کا جھاگ کتنا ملایم اور خوشبودار ہے!"
— ڈوپارائے





ڈوپارائے کہتی ہیں: "میری جلد صرف اسی خالص و سفید لکس ٹائلیٹ صابن سے ہی بالکل صاف ہو پاتی ہے۔ یہ اس لئے کہ اس کا ملایم بافراط جھاگ جلد کے مساموں میں جذب ہو کر میرے ذاتی حُسن کو دوبالا کرتا ہے اور جلد کو اتنا نکھارتا ہے کہ یہ چمک اُٹھتی ہے۔ اور اس خالص و سفید صابن کی خوشبو جو میرے جسم میں بس جاتی ہے اس پر تو مَیں فدا ہوں۔"

"یہی وجہ ہے کہ مَیں جلد کی خوبصورتی کے لئے لکس ٹائلیٹ صابن ہی پسند کرتی ہوں"

★ فلمی ستاروں کا حسن ۔۔۔ صابن

LTS. 416-X54UD



آج مجھے اُن کے چڑاسی سے اطلاع ملی کہ وہ رات کے کھانے پر اپنے بڑے افسر کو ساتھ لا رہے ہیں۔ میری پریشانی کی کوئی انتہا نہ رہی کیونکہ اُنکے آنے میں صرف تین گھنٹے ہی رہ گئے تھے! اسی سوچ میں تھی کہ ڈاکیہ نے دروازے پر دستک دی اور میری منگائی ہوئی ڈالڈا سے کھانا پکانے کی خوبصورت، باتصویر کتاب میرے سامنے پیش کی۔ ڈالڈا سے کھانا پکانے کی کتاب سے میری یہ مشکل بھی حل ہو گئی۔ تھوڑی ہی دیر میں میں ڈالڈا وناسپتی کا ڈبہ سامنے رکھ کر کام میں محو ہو گئی۔ جب وہ اور اُن کے افسر کھانے کی تعریف کے ساتھ ساتھ انگلیاں تک چاٹنے لگے تو میں نے ٹھنڈی سانس لی، آخر کار میری محنت سپھل ہوئی!

ڈالڈا وناسپتی سے کھانا پک کر اپنا اصلی مزا دیتا ہے، روزمرہ کا کھانا بھی لذیذ اور مزیدار بنتا ہے، یہ بھی نہ بھولئے کہ ڈالڈا وناسپتی کھانا پکانے، تلنے اور بھوننے کیلئے یکساں طور پر کارآمد ہے، اس سے آپ چھونک دے سکتے ہیں، اور عمدہ مٹھائیاں بنا سکتے ہیں۔ اور پھر اس میں اے اور ڈی بھی شامل ہیں۔

بازار سے کھلے ڈبے سے چکنائی خریدنا اپنی صحت کو خطرے میں ڈالنا ہے، اس پر گرد پڑتی ہے اور مکھیاں بھنبھناتی ہیں جس سے آپ سخت بیماری کے شکار ہو سکتے ہیں۔

ڈالڈا وناسپتی ایسی خالص چکنائی ہے جو تندرستی قائم رکھنے کیلئے ضروری ہے، ڈالڈا وناسپتی ہوا روک، مہر بند ڈبوں میں ملتا ہے، اسے اپنی ضرورت کے مطابق دس، پانچ، دو، اور ایک پونڈ کے ڈبوں میں خرید لیجئے، آج سے ہمیشہ ڈالڈا وناسپتی ہی استعمال کیجئے۔

ڈالڈا سے کھانا پکانے کی باتصویر کتاب ہندی، بنگالی، تامل اور انگریزی میں ملتی ہے، اسمیں تین سو قسم کے کھانے پکانے کی ترکیبیں ہیں، اسمیں باورچی خانے کی دیکھ بھال اور غذائیت وغیرہ پر بھی اشارے ہیں، قیمت فقط دو روپیہ ڈاک خرچ بارہ آنے، اپنی کاپی کے لئے آج ہی اس پتہ پر لکھئے۔۔

دی ڈالڈا ایڈوابزری سروس
پوسٹ بکس ۳۵۳، بمبئی ۱



دیکھ کر خریدیئے

ڈالڈا وناسپتی

کم خرچ — پکانے میں بہتر

HVM. 210-X52 UD

اردو کا مقبول عوام مصوّر ماہنامہ

آج کل

دہلی

ایڈیٹر:- جوش ملیح آبادی

اسسٹنٹ ایڈیٹر:- بال مکند عرش ملسیانی

جلد ۱۲ ——— نمبر ۸

سالانہ چندہ:- ہندوستان میں:- چھ روپے
پاکستان میں:- چھ روپے (پاک)
غیر ممالک سے:- نو شلنگ یا ایک ڈالر
فی پرچہ:- ہندوستان میں:- آٹھ آنے
پاکستان میں:- آٹھ آنے (پاک)

مارچ ۱۹۵۴ء

ترتیب

غزل	فراق گورکھپوری	۴
انڈونیشیا کا قومی ترانہ	محمد اجمل خاں	۵
غزل	آنند نرائن ملّا	۱۱
عقل اور عشق	باقر مہدی	۱۲
غلام احمد	توفیق احمد	۲۱
زنوکاے زما چشمے	جگن ناتھ آزاد	۲۹
ماتا رام	کوثر چاندپوری	۳۰
دیہات میں تعمیر مکانات کا مسئلہ	———	۳۵
انکشافات	کرپال سنگھ بیدار	۳۶
جے پور کا ایک گمنام شاعر	احترام الدین احمد شاغل	۳۷
رجھکاران	رام شرکے	۴۰
اندھرا ریاست کا افتتاح	حیدر حسین موسوی	۴۳
آفتابی قوت کا استعمال	بھگوت سرپ گوئل	۴۶
نئی کتابیں اور رسالے	ع-م	۴۸
رفتار زمانہ	———	۵۱

بچوں کا آج کل

ہمت	بلونت کمار ساگر	۵۳
حج کا فرض	راشد حسن قادری	۵۴
واسکوڈی گاما	اعجاز فاطمہ حیدر	۵۶
باپو نے کہا اور کیا	گھنشام سیٹھی	۵۹
لطیفے	———	۶۰

سرورق:- کرکٹ کے مشہور ہندوستانی کھلاڑی غلام احمد

پبلیکیشنز ڈویژن پوسٹ بکس ۱۰۱۱ دہلی

غزل

جان و دل سے عزیز چھوٹ گئے
عشق میں کتنے رشتے ٹوٹ گئے

عشق میں اب غم و نشاط کہاں
یہ مقامات کب کے چھوٹ گئے

اُن پر اب جور بھی نہیں ہوتا
اہلِ غم کے نصیب پھوٹ گئے

اِک اشارے میں کھو گئی محفل
بزم کو اک نظر میں لوٹ گئے

کیا کریں ہمنشیں کہاں جائیں
عشق میں ہاتھ پاؤں ٹوٹ گئے

دے رہی ہیں ہوائیں بوئے کفن
آج تیرے اسیر چھوٹ گئے

میکدہ زندہ باد، گو کتنے
ساغرِ آفتاب ٹوٹ گئے

اب وفا بھی گراں ہے اے تپِ عشق
اب کے ہم اس مرض میں ٹوٹ گئے

رہِ غم رہگذارِ عام نہیں
ساتھیوں کے بھی ساتھ چھوٹ گئے

میری جاں جمع و خرچ عشق میں بھی
جانے کتنے حساب چھوٹ گئے

جن سے روشن تھی بزمِ دیدہ و دل
اب وہ تارے فراق ٹوٹ گئے

محمد اجمل خاں

انڈونیشیا کا قومی ترانہ

آزادی سے پہلے بھی ہندوستان کی یہ خواہش تھی کہ نہ صرف ہندوستان بلکہ کُل دُنیا آزاد ہو جائے۔ ۱۹۲۰ء کی تحریکِ خلافت و سوراج کے زمانے میں خود مہاتما گاندھی نے تحریک خلافت کی پیشوائی کی تھی۔ اور ہند کے مسلمانوں نے دُنیا کو یہ بتایا تھا کہ غیر ملکی اقتدار سے ہندوستان کا آزاد ہونا یہ معنی رکھتا ہے کہ جبرالٹر سے لے کر جاوا تک جتنے اسلامی ممالک ہیں وہ استعمار کے پنجے سے نکل جائیں گے، اس لئے یہ سب ملک محض ہندوستان کو دائمی غلامی میں رکھنے کے لئے غلام بنائے گئے ہیں۔ یہ زمانہ سمندری لڑائی کا تھا۔ اس کے علاوہ خود محکوم ممالک میں پھوٹ اور جہالت پھیلا کر اُنھیں سے غلامی کی تعلیمیں کرائی جاتی تھیں۔ مجھے اپنے بچپن کا تصور یاد ہے کہ انگریزی حکومت کی طرف سے غالباً ۱۹۱۱ء میں اَوَر ڈے Our Day اسکولوں اور کالجوں میں منایا جاتا تھا، جس میں انگریزی راج کے قصیدے پڑھے جاتے تھے۔ ہندوستانی اُمرا اور مہاجن چندے دیتے تھے، اور پھلوں کو مٹھائیاں تقسیم ہوتی تھیں اور جھنڈے کے تمغے دئے جاتے تھے تاکہ بادشاہ انگلستان کی تصویر دیکھ کر سب اُس کی تعریفیں کریں اور انگریزی حکومت کی خوبیوں کو اس طرح سراہیں: ؎

ہندوستاں میں لائی یہی ریل اور تار
پہنچائے اس نے فائدے ہیں ہم کو بے شمار

اسکول کے مولوی صاحب اَوَر ڈے Our Day کو (اُوَر دے) کہا کرتے تھے

لیکن اسی زمانے میں انڈونیشیا کے ڈچ حکمرانوں کو یہ شکایت تھی کہ انگریز سیمت غلطی کر رہے ہیں کہ وہ ہندوستانیوں کو جدید تعلیم سے روشناس کر رہے ہیں۔ خود ڈچ حکومت کا یہ نظریہ تھا کہ اہلِ انڈونیشیا کو جاہل رکھا جائے اور ان کو جاہل اور غیر منظم رکھ کر بے رحمی طرح سے لوٹا جائے۔ پھر اس لوٹ کھسوٹ کو اس طرح سے دنیا کی نظروں سے اوجھل رکھا جائے کہ اہلِ جاوا جدید تعلیم سے نہ صرف اپنے وطن میں محروم رہیں بلکہ ملایا، برما اور ہند میں بھی جا کر تعلیم نہ پا سکیں۔

یہ زمانہ خشکی اور تری کی فوجوں کا زمانہ تھا۔ اس زمانے میں سمندروں کا قبضہ تجارتی لوٹ کھسوٹ کے لئے ضروری تھا۔ اور سمندروں کے ہر ناکے پر خواہ وہ جبرالٹر ہو یا عدن، سنگاپور ہو یا راس اُمید استعماری طاقتوں نے قبضہ جما رکھا تھا۔ اور تجارت کے فروغ کے لئے پورے ایشیا و افریقہ کو غلام بنا رکھا تھا۔ لیکن آخر کب تک! ملک گیری کی ہوس یعنی لالچ کے بھوت نے ان "تاجر بادشاہوں" کو پاگل بنا دیا۔ اور اُنھوں نے خود ایک دوسرے کا گلا کاٹنا شروع کر دیا۔ ایک جنگ ہوئی، تو زہریلی گیسوں اور بارود کے گولوں نے انسانیت کی لہلہاتی کھیتی کو پامال کیا اور یہ سبق پڑھایا کہ تاجرانہ شہنشاہی کی جگہ تاجرانہ جمہوریت میں انسان کی نجات ہے دوسری جنگ ہوئی تو ہوائی جہاز اور ایٹم بم نے انسانیت کی قدروں ہی کو مبہم بنا دیا۔ جبر و قدر، اُمید و بیم، جمہوریت و آمریت، مقصد و ذریعۂ مقصد کے جتنے نظریات تھے وہ نوجوانوں کے لئے بے معنی بن گئے۔ جن ملکوں کو جنگ نے تباہ کیا تھا وہ جنگ کے نام سے کانپنے لگے اور وہ فوجیں جو قتل و غارتگری کے ترانے گاتی ہوئی آگے بڑھتی تھیں جاگ اُٹھیں اور امن امن پکارنے لگیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دنیا میں کوئی ایسی قوم باقی نہ رہی جو محکوموں کے لئے ایک زبردست اور جرار فوج ہر وقت تیار رکھ سکے اور اس کا بار اُٹھا کر زندہ بھی رہ سکے۔ ہند آزاد ہوا اور اس کی آزادی اور مدد کا یہ نتیجہ تھا کہ نہ صرف سیلون اور برما آزاد ہو گئے۔ بلکہ ایک عظیم الشان ملک "انڈونیشیا" بھی آزاد ہو گیا۔ اور ڈچ حکمراں، اپنے محکوموں کو جاہل و پریشان رکھ کر بھی غلام نہ رکھ سکے۔

چلی شوخیِ نہ کچھ بادِ صبا کی
بگڑنے پر بھی زلف اس کی بنا کی

انڈونیشیا جزیروں کا ملک ہے۔ لسانی نقطۂ نظر سے ایک ہی زبان بولنے والے سیکڑوں چھوٹے بڑے جزیرے بحرِ ہند سے بحرالہادی Pacific تک پھیلے ہوئے ہیں۔ ان میں سے جزائر جاوا، مدورا اور بالی اور جزائر ماتورا

کو انڈونیشیا کا نام دیا جاتا ہے۔ ان کی آب و ہوا نہایت معتدل، زمین زرخیز، پھول اور جانور خوش نما اور کثرت سے ہیں۔ ان جزائر کا رقبہ ہندوستان سے آدھا ہے لیکن سوائے جاوا کے باقی جزائر میں آبادی کی کثرت نہیں ہے۔ کل آبادی سات آٹھ کروڑ انسانوں کی ہے۔ جن میں سے ننانوے فیصدی مسلمان ہیں۔ اس لئے کہا جا سکتا ہے کہ دُنیا میں ایک زبان بولنے والی سب سے بڑی مسلمانوں کی آبادی صرف انڈونیشیا میں ہے۔ اس آبادی میں سات لاکھ عرب اور ڈیڑھ لاکھ جاپانی جنگ سے پہلے موجود تھے۔ چینیوں کی بھی کافی آبادی ہے۔ ان سب غیر ملکیوں سے انڈونیشیا والے خوش نہیں ہیں۔ عرب سود خوری کی وجہ سے، اور چینی محنتی صنّاع ہونے کی وجہ سے مقامی باشندوں کے لئے پریشان کن ہیں۔

راس اُمید Cape of Good Hope کے راستے سے آنے والے یورپین ابھی ہندوستان نہیں پہنچے تھے کہ ہندوستان میں سیحی کے اواخر ۱۲ھ میں اسلام جاوا میں داخل ہو چکا تھا۔ اس سے بھی ڈیڑھ سو سال پہلے عرب تاجر بحر قلزم اور خلیج فارس کے راستے جزائر شرق الہند میں داخل ہو کر اسلام پھیلا چکے تھے۔ اور گرم مسالے وغیرہ کی تجارت یورپ تک پہنچا چکے تھے۔ قدرتاً ان مسلمانوں کا طریق زندگی عربی اسلام، یعنی شافعی مذہب کے سانچے میں ڈھلا تھا جس میں تمام کلچر کا گہرا رنگ غالب تھا، یہی حال جنوبی ہند کا بھی تھا۔ شمالی ہند میں عربی اسلام کی شکل وہ رائج ہوئی ہے جو ایرین تصوّرات سے اثر پذیر ہو کر حنفی مذہب میں نمایاں ہوئی۔ اس جزئی اختلاف کے علاوہ انڈونیشیا کے مسلمان کسی طرح دوسرے مسلمانوں سے مختلف نہیں ہیں۔ اُن میں بھی قدیم مذاہب کے تصوّرات و خیالات اُسی طرح موجود ہیں جیسے دوسری جگہ ہیں۔ اس کی دو وجہیں ہیں، ایک تو یہ کہ خود ہندو دھرم اور بودھ مت جو ان جزائر میں اسلام سے پہلے رائج تھے۔ اُن کے قدیم یا نیچرل مذہب میں رنگ گئے تھے، یعنی جو رسم و رواج اور مذہبی توہمات پہلے تھے وہی نئے مذہب کے نام پر جاری رہ گئے تھے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ اسلام تاجروں اور صوفیوں کے ذریعے سے پہنچا تھا۔ اور ان لوگوں نے اسلام کی خصوصیت یعنی توحید اور مساوات کو زیادہ نمایاں کیا تھا۔ ملکی رسم و رواج اور توہمات کو بجبر ختم نہیں کیا تھا۔ اس کے علاوہ اسلام کے مشہور شہزی خود ملکی باشندے تھے جو اسلامی رواداری کا نمونہ تھے۔

زبان و ادب

پولی نیشیا Polinesia یعنی اُن جزائر کی زبانوں میں جو مدغاسکر سے فلپین تک پھیلے ہوئے ہیں، بہت کچھ مماثلت پائی جاتی ہے۔ اگرچہ سیکڑوں بولیاں Dialects موجود ہیں لیکن صوتی اور نحوی مماثلت میں سب ایک دوسرے سے ملتی جلتی ہیں۔ گو سنسکرت سے اثر پذیر ہونے سے بہت پہلے سے یہ زبانیں موجود ہیں۔ لیکن جتنی ترقی یافتہ زبانیں ہیں سب میں سنسکرت کے لفظ کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ اور یہ لفظ جاوا کی زبان سے دوسری بولیوں میں پھیلے ہیں۔ جزائر انڈونیشیا میں بھی اگرچہ متعدد بولیاں موجود ہیں لیکن اب انھوں نے اپنی قومی زبان کا نام انڈونیشین رکھ لیا ہے۔ اسلام کے آنے کے بعد قدرتی طور پر عربی لفظوں نے ملکی زبان میں جگہ نکال لی۔ اور پرتگیز، ولندیز، ہسپانوی اور انگریزوں کی وجہ سے یورپین زبانوں کے الفاظ بھی بہت کچھ رائج ہو گئے ہیں۔ انڈونیشیا میں پہلے کئی قسم کے خط رائج تھے۔ اسلام کے بعد ملکی زبان عربی رسم الخط میں لکھی جانے لگی اور ۱۹۲۵ء سے لاطینی رسم خط عام ہو گیا ہے۔ اس کی وجہ سے سائنٹفک اور جدید علوم کے حاصل کرنے میں بہت آسانی ہو گئی ہے۔ آزادی کے بعد اب ان کی انڈونیشنل زبان ڈچ نہیں رہی بلکہ انگریزی اختیار کر لی گئی ہے۔ ملکی زبان بدستور انڈونیشین ہے جو لاطینی حروف میں لکھی جاتی ہے۔

اس زبان میں (ف) اور (شین) نہیں ہیں۔ اور بنگالی کی طرح الف کو واؤ کے طور پر بولتے ہیں۔ مثلاً کاما کو کومو اور درشنا کو درشنو بولیں گے یہاں کی جتنی بولیاں ہیں وہ نہایت سادہ ہیں اور مختلف قسم کی صنعتوں سے جو آرین یا سامی زبانوں میں پائی جاتی ہیں قطعاً بے گانہ ہیں۔ اسماء ہر حال میں اپنی اصلی حالت پر قائم رہتے ہیں، یعنی واحد ہوں یا جمع، مذکر ہوں یا مؤنث، فاعل ہوں یا مفعول، مبتدا ہوں یا خبر، اُن میں کوئی تبدیلی نہیں کی جاتی۔ یہی حال ضمائر کا ہے۔ افعال بھی گردانوں کی گردش سے بچے ہوئے ہیں۔ جاوی (کاوی) زبان خصوصیت سے نہایت وسیع ہے۔ اور ایک ایک چیز کے لئے بیسیوں الفاظ اُس کی مختلف کیفیتوں کو ظاہر کرنے کے لئے رائج ہیں۔

جاوی زبان میں ہندوستان کے دو مشہور رزم نامے مہابھارت (رزمایہ) اور رامائن موجود ہیں۔ ان میں مقامی کہانیاں بھی مل جل گئی ہیں۔ اُن کی نظمیں اور گیت نہایت سادگی سے انسانی جذبات کا اظہار کرتے ہیں۔ ہم ذیل میں ایک گیت کا نثری ترجمہ درج کرتے ہیں جس سے آپ اندازہ کر سکیں گے کہ ان کا شاعر کس طرح اظہار جذبات کرتا ہے:-

ہزاروں ملکوں کا سفر کر ڈالیں، لیکن
اے میری معشوقہ! تیرا کوئی ثانی نہ ملے گا۔
تمہارا چہرہ چاند سا ہے۔
تمہاری پیشانی مور میں ہے۔
تمہاری کنپٹیوں پر گھونگھر والے بال
سیکوں کی لڑی کی طرح معلوم ہوتے ہیں۔
تمہاری بھویں "لبا" (درخت) کے پتے ہیں۔
تمہاری نرم پلکیں اوپر کو اٹھی ہوئی ہیں۔
تمہارے لمبے اور کالے بال گھونگھر والے ہیں۔
تمہارے گال "دیان" کی طرح ہیں
تمہارے منہ کا "شگاف"
پکے ہوئے گلابی آم کے منہ کی مانند ہے۔
تمہاری تیلی ناک موزوں ہے۔
تمہارے گال پر جو زلف ہے
وہ "توری" (درخت) کی کلی ہے۔
تمہاری ٹھوڑی بڑھئی کے "رندہ" کی طرح جھکی ہوئی ہے
جس میں دستہ لگا ہوا ہے۔
تمہاری گردن اسی طرح خمیدہ ہے
جیسے کسی پودے کی کونپل۔
تمہارا چوڑا سینہ حسین ہے۔
تمہاری چھاتیاں ہاتھی دانت کے ناریل ہیں
جن کے بعد کسی چیز کی تمنا نہیں رہتی۔
میری رانی کی چھاتیاں ایسی ہیں کہ
گویا دو ننھے ناریل ہیں، اور
ایک لال کرتی میں بندھی ہوئی ہیں!
بھرتو اور چکنی ہیں، اور
ایسا متوالا بنا دیتی ہیں کہ انسان پاگل ہو جائے۔
اُس کے کندھے چمکدار اور نازک ہیں۔
اُس کے بازو ایسی کمانوں کی طرح ہیں
جو کھنچی ہوئی نہ ہوں۔
کمر اتنی نازک ہے کہ اشارے سے ٹوٹ جائے۔
اُنگلیوں کے سرے کانٹوں کی مانند ہیں۔
ناخن لمبے اور خوبصورت ہیں۔
اُس کی ٹانگیں پوڈک پھول کی طرح ہیں۔
تلوے محرابی ہیں۔
ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میری گوری
محبت کی سانس سے فنا ہو جائے گی۔
اگر اس کی جملہ خوبیاں بیان کی جائیں
تو جگہ کتنی کم اور کلھنا کتنا زیادہ ہے!
اگر ایک سال تک تلاش جاری رکھی جائے
تب بھی اُس کی مانند ملنا محال ہے۔

ہندوستان کے رزم ناموں کے مقابلے میں جاوی رامائن، اور برتنیدیو رہما جاتا، پھیکے معلوم ہوتے ہیں۔ دونوں کے نمونے درج ذیل ہیں۔

۱۔ "راجہ اونگا کا حملہ کیا تھا ایک طوفان تھا۔ پانڈوؤں کی تیز رفتار فوجیں کرن سے بھڑ گئیں۔ اُن کے سرداروں نے حملے کو روکنا چاہا۔ لیکن اُن کی صفیں بُری طرح پامال ہو گئیں اور روند ڈالی گئیں۔ گرڈ کی رفتار اور شور کے ساتھ راجہ کا رتھ بڑھ رہا تھا۔ ہر طرف اُس کے بان اور بجلی کے تیر چل رہے تھے۔ یہ تیر دسمبر کی بارش سے زیادہ تیز برس رہے تھے۔ پانڈو پسپا ہو گئے اور تھالے کی تاب نہ لا سکے۔ کرن کو بے انتہا غصہ آیا۔ سو پانڈوؤں نے دوبارہ حملہ کیا، لیکن شکست کھا کر بھاگے اور منتشر ہو کر اس طرح پامال ہوئے جیسے بپھری ندی کے طوفان سے خس و خاشاک بہ جاتے ہیں۔ کراوا (کوروو) کا طوفانی حملہ جاری رہا اور برابر بڑھتا رہا۔" (برات پیدھ)

۲۔ (لنکا کے راجا راون کی حالت اس کے لڑکوں کی موت کے بعد)

"راجہ کے غصے کی کوئی حد نہ رہی۔ وہ دانتوں سے اپنی مونچھیں کاٹنے لگا۔ اُس کا چہرہ آتشیں اور اُس کا دل و راوری پھول کی طرح سُرخ ہو گیا تھا۔ روئیں روئیں سے پسینہ جاری تھا۔ باچھیں لرز رہی تھیں، پلکیں ایک دوسرے سے چپٹ گئی تھیں۔ اُس کا غصہ اُس قاتل کی طرح تھا جو کسی بے گناہ کو قتل کر دیتا

ہے۔ وہ اُچھلا اور ہوا میں اڑنے لگا۔ اس کی رفتار ایسی تھی جیسے کوئی بہت بڑی کبوتر پر بھیٹ رہی ہو۔ اپنے بیٹوں کے انتقام کی خواہش سے وہ ایسا محسوس کرتا تھا کہ گویا دشمن سے بھڑ گیا ہے۔ وہ دل ہی دل میں خوش تھا، وہ فخریہ چلّا رہا تھا، وہ اپنے سب دشمنوں کو للکار رہا تھا کہ آؤ سب نکل آؤ۔" (رامائن)

مسلمان ہونے سے پہلے انڈونیشیا میں علم تاریخ کا رواج نہ تھا۔ البتہ مقامی افسانہ گو نصائح لقمان Aesop's Fables یا کلیلہ دمنہ کی مانند کہانیاں سُنایا کرتے تھے۔ ان کی "تنتی شاستر" سے دو حکایتیں یہاں درج کی جاتی ہیں:-

۱۔ "دوست بناؤ تو برابر کا بناؤ۔ شیر اور جنگل کی طرح کبھی عمل نہ کرو۔ ایک شیر تھا اور ایک جنگل تھا۔ دونوں میں گہری دوستی ہوگئی، اور وہ دونوں ایک دوسرے کی حفاظت کرنے لگے۔ لوگوں نے شیر کے ڈر سے جنگل سے لکڑیاں اُٹھانے لانا چھوڑ دیا۔ اور جنگل نے شیر کو اپنے اندر چھپا لیا کہ کوئی آدمی اُسے پکڑ نہ سکے۔ عرصۂ دراز کے بعد جنگل اور شیر میں لڑائی ہوگئی۔ شیر جنگل چھوڑ کر چلا گیا۔ جب لوگوں کو شیر کا خطرہ نہ رہا تو انھوں نے لکڑیاں کاٹ کاٹ کر جنگل کو ویران کر دیا۔ پھر شیر کی باری آئی۔ اُسے چھپنے کی جگہ نہ رہی اور وہ بھی مارا گیا۔ اس ناتفاقی کا نتیجہ یہ ہُوا کہ نہ جنگل رہا نہ شیر۔"

۲۔ "کھٹکھجورے کا زہر اُس کے سر میں ہوتا ہے، بچھو کا زہر اُس کی دُم میں ہوتا ہے، سانپ کا زہر اُس کے دانت میں ہوتا ہے۔ ہر شخص کو معلوم ہے کہ یہ زہر کہاں کہاں ہوتے ہیں۔ لیکن شریر آدمی کے زہر کی کوئی جگہ متعین نہیں، وہ اُس کے پورے جسم میں ہوتا ہے۔ لہٰذا اُس کا پانا صعب مشکل ہے۔"

قومی تحریکیں اور ترانہ

مغربی سامراج کی سخت گیریوں نے سترھویں صدی مسیحی ہی سے جزائر کے باشندوں میں آزادی کا جذبہ پیدا کر دیا تھا ؎

غم کے ٹھوکے کچھ بھی ہوں لیکن آ کے جگا تو جاتے ہیں (فانی)

ایشیا ہو یا افریقہ ہر ملک میں یورپین اقوام تاجروں کے بھیس میں آئیں، پھر مذہبی مشنری اپنا مہذب بنانے کا پروگرام پھیلانے لگے اور آخر کار وہی حکمران بن بیٹھے۔ انڈونیشیا کی بھی یہی تاریخ ہے۔ قبضے کے بعد ڈچ حکمرانوں نے اتنی سخت گیر پالیسی اختیار کی تھی کہ تمام باشندے ادنیٰ درجے کے مزدور بن کر رہ گئے تھے۔ تعلیم کا دروازہ ان پر بند تھا۔ ڈچ کالجوں میں اتنی بڑی فیس

دُصول کی جاتی تھی کہ متمدن اُمرا بھی اپنے بچّوں کو تعلیم نہیں دِلا سکتے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ خود باشندگانِ انڈونیشیا نے ایک تعلیمی سوسائٹی "تمان سسترا" کے نام سے بنائی اور ملک بھر میں پچاس ہزار اسکول کھول دئے۔ اس پر ڈچ حکومت نے یہ فیصلہ کیا کہ طلبہ کو تاریخ اور انشا پردازی یعنی مضمون نگاری نہ سکھائی جائے۔ انھیں خطرہ تھا کہ ان دونوں سے دماغ میں بغاوت کا پیدا ہونا یقینی ہے۔ پھر انھیں ذلیل رکھنے کے لئے یہ قانون جاری کیا کہ کوئی شخص کرسی نہ رکھے اور اگر رکھے تو دوڈالر فی کرسی ٹکس ادا کیا کرے۔ آخر حاکم و محکوم میں کچھ تو امتیاز ہو۔

بیسویں صدی کی ابتدا میں اخلاق و دین کے نام پر ایک رسالہ جاری ہُوا اور ایک تعلیمی سوسائٹی "بودی اوتومو" (بدھی آتما۔ مشرقی روح) کے نام سے بنی۔ پھر سوراج حاصل کرنے کے لئے ایک پارٹی شرکت اسلام (اسلامی شرکت) کے نام سے بنی اور ۱۹۱۲ء میں محمدیہ جماعت (بخلاف احمدیہ کے) قائم ہوئی جو اب تک باقی ہے۔

پہلی جنگ کے بعد گورنر جنرل نے جمہوری حکومت رائج کرنے کا وعدہ کیا روس کی نئی سوشلسٹ تحریک نے انڈونیشیا پر بھی اثر ڈالا اور وہاں ایک ڈچ سوشلسٹ سنیولیت نے انڈین سوشلسٹ ڈیماکریٹک دیسے فی کٹنگ I. S. D. V. قائم کی۔ جو بعد میں انڈونیشین کمیونسٹ پارٹی بن گئی۔ اور ۱۹۲۳ء میں یہ قانونی قسم ادا دی گئی۔ اسی کے ساتھ ساتھ حاجی سلیم اور عبدالمعز وغیرہ نے اسلامی پارٹی بنائی۔ آخر انڈونیشین کمیونسٹ پارٹی نے پہلے "شرکت اسلام" (سُرخ مسلم یونین) بنائی۔ پھر اس کا نام "شرکت رکجات" (عوامی پارٹی) رکھ دیا۔ نوجوانوں کی جماعتیں بھی بنیں اور عورتوں کی مجلسیں بھی قائم ہوئیں۔ ان کے علاوہ انڈونیشیا میں ایک مذہبی جماعت "نہضۃ العلماء" بھی قائم ہے۔ اس میں نہ صرف مسلم بلکہ نصرانی علماء بھی شامل ہیں۔ کاش اسی طرح کی مشترک خدا پرست جماعتیں ہر ملک میں قائم ہو کر ایک عالمی نظام میں وابستہ ہو سکیں:

قومی ترانے کے سلسلے میں نوجوانوں کی مختلف مجالس نے ۱۹۲۸ء میں متحد ہو کر ایک اہم قدم اُٹھایا۔ نوجوان کانگرس نے ۱۹۲۸ء میں یہ عہد نامہ تیار کیا کہ:

۱۔ ہم انڈونیشیا کے نوجوان مرد اور عورتیں ایک ہی متحدہ انڈونیشین قومیت رکھتے ہیں۔

۲۔ ہم سب نوجوان انڈونیشیا کے بچے ہیں۔ اور انڈونیشیا، ساٹھ پدرِ وطن ہے۔

۳۔ ہم سب کی ایک ہی زبان ہے، جس کا نام انڈونیشین ہے۔

واگے رودولف سُوپراتمان Wage Rudalf Supratman نے نوجوانوں کا قومی ترانہ "انڈونیشیا رایہ" تصنیف کیا تھا۔ اس کانگرس نے اسے نوجوانوں کا ترانہ تسلیم کرلیا۔

مسٹر سوکارنو نے ۱۹۳۵ء میں اس ترانے کے الفاظ میں بعض ترمیمیں پیش کی تھیں۔ ان ہی کی بنیاد پر ۱۹۴۴ء میں محمد یامین اور ہاجار دیوان تارا صاحبان کی کمیٹی نے اس ترانے کے الفاظ کو سدھارا۔ اور پھر یہی ترانہ قومی ترانہ تسلیم کیا گیا۔

اندونیشیا رایہ (بزبان انڈونیشی)

انڈونیشیا تانہ اے آر کو
تانہ توسپہ دورہ آکو
دِسنا لاہ کیتا بردیری
منجگا پنچی اسی بو کو
اندونیشیا کے نیگسا آن کو
مری لاکیتا برسیدو
اندونیشیا برسا تو
ہی دو پلہ تانہ کو، ہی
ہی دو پلہ نگری کو ..... (کورس)

جیوا کو، رایت کو، سے مو آن یا
بسنگون لہ رایہ اُیا
بسنگون لہ کا دون یا
اوں توک انڈونیشیا رایہ
اندونیشیا رایہ مردیکا مردیکا
تانہ کو، نگری کو، بنگ کو جنتا
اندونیشیا رایہ مردیکا مردیکا
ہی دو پلہ اندونیشیا رایہ

انڈونیشیا رایہ (ترجمہ)

(۱) پدرِ وطن ہمارا، ہے انڈونیشیا ہی
ماں بھی وہی ہے، اُس کو ہم دل سے چاہتے ہیں
ہم سب وہاں ہیں رہتے، اور پیار کی نگاہیں
ہر وقت ڈالتے ہیں، اُس سرزمیں کے اُوپر
یہی ہے وطن اور یہی روح اپنی
یہی اپنی عزت یہی جان اپنی
چلو گائیں اپنی فخر کا ترانا
جو ہے انڈونیشیا رایہ کا گانا

انڈونیشیا، انڈونیشیا، شاندار انڈونیشیا
تو ہی ہے وطن، قوم اور اپنا سب کچھ
ترے حسن اور شان میں ہی سب کچھ
تری عظمت و حرّیت میں ہے سب کچھ

کورس:۔ انڈونیشیا۔ انڈونیشیا
شریف ملک۔ شریف ملک
ہماری روح۔ ہمارا وطن
شاندار انڈونیشیا رایہ

---

(۲) موزوں ہے یہ ملک انڈونیشیا
یہ مشرق کا ہے باغ، ہم سب یہاں
رہا کرتے ہیں شاد و خوش بے گماں۔
وفادار تیرے ہیں ہم اے زمیں
کوئی ملک تجھ سا جہاں میں نہیں۔
چلو گائیں اپنا مقدس ترانا
سلام اے وطن! ہاں سلام اے وطن!!
ہے اپنا نشاں انڈونیشیا رایا
ہے عظمت کا اور حرّیت کا یہ گانا

---

(۳) تو ماں ہے ہماری، پیاری پیاری

ترے بچے ہم سب ہیں، ہوں تجھ پہ واری
اور آزاد و مضبوط اسے ہم بنائیں

دکھائیں ہم اپنی دکھائیں گے تجھ کو
شاندار انڈونیشیا، شاندار انڈونیشیا

گئی شان و شوکت دلائیں گے تجھ کو
ترے بحر و بر کے لئے گا رہے ہیں

یہ مشرق کی ملکہ ہے انڈونیشیا
ترے بچوں کے واسطے گا رہے ہیں

کرے پیار اس کو نہ کیوں دل سے دنیا
شرف حریت کے لئے گا رہے ہیں

چلو فاتحانہ حسیں گانا گائیں
. . . . . کورس

معلومات و اعداد

بھارت کی مختلف ریلوے لائنوں پر آج جتنے ریلوے انجن چل رہے ہیں، ان کی تعداد عرصہ تیس سال پیشتر متحدہ ہندوستان میں زیر استعمال ریلوے انجنوں کی تعداد سے ۱۳۰ کم ہے لیکن اس کے باوجود بھارتی ریلیں اُس زمانے کے مقابلے میں دو گنے مسافروں کا بوجھ اور سامان کی ۴۰ فیصدی زیادہ مقدار ڈھو رہی ہیں۔

اجتماعی ترقی کے پروگرام پر عمل کے پہلے سال ۴۴ ۱ ترقیاتی بلاکوں میں تقریباً ایک لاکھ تیس ہزار ایکڑ رقبہ زمین کے لئے آبپاشی کی سہولتیں مہیا کی گئیں اور ۵۵ ہزار ایکڑ بنجر رقبہ زمین کو قابل کاشت بنایا گیا۔

بھارت میں ۲۶۵۰ نل کنوئیں (ٹیوب ویل) تیار کرنے کا پروگرام مرتب کیا گیا ہے۔ اس پروگرام کی تکمیل پر تقریباً آٹھ لاکھ ایکڑ رقبۂ زمین کے لئے آبپاشی کی سہولتیں میسر آئیں گی۔ اور اناج کی پیداوار میں ایک لاکھ ۶۰ ہزار ٹن سالانہ اضافہ ہوگا۔

پرنٹنگ و سٹیشنری کے محکمہ کے کنٹرولر نے ۵۳-۱۹۵۲ء میں مرکزی اور ریاستی سرکاروں کے بعض دفاتر کو بھارت میں طیار شدہ تقریباً ۲۰ لاکھ پنسلیں مہیا کیں جن کی مجموعی قیمت ۲ لاکھ ۳۱ ہزار روپے ہے۔

۵۴-۱۹۵۳ء کے بجٹ میں زیادہ اناج اُگاؤ مہم کے لئے ۳۳ کروڑ ۶۶ لاکھ روپے کے مصارف کی گنجائش رکھی گئی ہے، جبکہ گذشتہ سال کے بجٹ میں اس مقصد کے لئے ۲۰ کروڑ ۶۰ لاکھ روپے کی رقم مخصوص کی گئی تھی

بھارت میں اندازاً ۱۲ لاکھ ۸۰ ہزار اشخاص ایسے ہیں جن کا واحد پیشہ سوتی کپڑا بُننا ہے۔

اجتماعی ترقی کے پروجیکٹوں کی کارکردگی کے پہلے سال کے دوران یعنی اکتوبر ۱۹۵۲ء سے ستمبر ۱۹۵۳ء کی مدت میں ان پروجیکٹوں کی تکمیل کے لئے عوام نے ایک کروڑ ۵۱ لاکھ روپے کے چندہ دیا۔ اور حکومت نے ایک کروڑ ۹۵ لاکھ روپے کی رقم صرف کی۔

محکمہ ڈاک و تار روزانہ ۷۰ لاکھ اشیائے ڈاک کی ترسیل کا کام سرانجام دیتا ہے۔ ان اشیائے ڈاک کے پتے تقریباً ۱۳ زبانوں میں ہوتے ہیں۔ اس تعداد میں سے تقریباً ۴۵ فیصد مراسلات غیر پتے کے ہوتے ہیں۔

اندازہ لگایا گیا ہے کہ سنٹرل ٹریکٹر آرگنائزیشن ۱۹۵۴ء کے وسط تک دس لاکھ ایکڑ اراضی کو کاشت کے قابل بنا دے گا۔

آنند نرائن ملّا

غزل

ہر لب پہ شعلہ نوائی ہے لیکن دلِ سوزاں کتنے ہیں
گفتار کا انساں کون نہیں، کردار کے انساں کتنے ہیں

یہ فصلِ گُل و جوشِ سبزہ اے گلشن تجھ کو مُبارک ہو
لیکن اِس فصل کے پھُولوں میں شایانِ بہاراں کتنے ہیں

ہر شعلۂ رقصاں کو سمجھا ناداں رہبر و نورِ منزل
اِس رہ میں نہ جانے دشت ابھی ہم رنگِ گلستاں کتنے ہیں

آباد دیارِ نعرہ زنی، میدانِ عمل میں سنّاٹا
ڈھونڈے نہیں ملتے آبلہ پا اور چاک گریباں کتنے ہیں

اسکندرِ صحرا اِس جانب دارائے گلستاں اُس جانب
لب پر تو جزر ہے دِل میں مگر دونوں ہی طوفاں کتنے ہیں

شرحِ سوزِ ہستی کیا ہو جتنے دِل ہیں اُتنے چھالے
افسانۂ غم ہے ایک مگر افسانے کے عنواں کتنے ہیں

آزادی کس کو حاصل ہے ہر نظمِ جہاں اک زنداں ہے
بس فرق ہے اتنا کس زنداں میں روزنِ زنداں کتنے ہیں

ایک ایک نظر ہے ساقی کی صدیوں کے تمدّن کا حاصل
مخمور تو صد شیرازہ چکاں برہم تو صفاہاں کتنے ہیں

اے غنچۂ خنداں باغ ہی پر یہ بارشِ رنگ و نکہت کیوں
محرومِ تبسّم سے تیرے صحرا و بیاباں کتنے ہیں

یہ رُت راس آئی ہے تجھ کو ہاں خوش ہو لے ہنس لے لیکن
آبادِ بہاراں بھُول نہ جا بربادِ بہاراں کتنے ہیں

ہر دیر و حرم کو ٹھکرا کر مُلّا آیا میخانے میں
مُلّا کے سے لیکن دُنیا میں سُلجھے ہُوئے انساں کتنے ہیں

باقر مہدی

عقل اور عشق

(اقبال کی نظر میں)

ابتدائے آفرینش سے جو مسائل زیرِ بحث ہیں اُن میں عقل و عشق کا مسئلہ بھی ہے۔ انسان کا ذہنی ارتقا ان تمام منازل سے گزر چکا ہے۔ یہاں وحشت اور سرآپگی عشق کو فزوں تر کرنے میں پیش پیش رہتی تھیں۔ کبھی "جنونی" کا روپ اہلِ دل کی رہنمائی میں عشق کی زندگی بنی ہوئی تھی کبھی عشق کو "خلل ہے دماغ کا" کا نام دیا جاتا تھا۔ اور اس طرح عقل و عشق کا مسئلہ قبائلی زندگی سے ذرا عہد دور اور پھر آہستہ آہستہ صنعتی نظام میں پہنچ کر نئی صورت اختیار کر لیتا ہے عقل دلیل محض کے عوض زندگی کے مسائل کو غیر جذباتی طریقۂ فکر سے وابستہ کر دیتی ہے۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ عقل نے گمراہی کا اس طرح کوئی سدِّ باب کر دیا تھا یا ہے۔ بلکہ انسانی ادراک کی مشعل کو تیز کرنے میں عقل نے اپنا "خونِ دل" صرف کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جذباتیت کی سیاہ آندھیاں بھی اس کو آج تک گل کرنے میں ناکام رہ چکی ہیں ـــــ یہ مسائل فلسفیانہ معمّا بن کر آج بھی گمبھیر ہو جاتے ہیں۔ یہ سمجھنا ضروری ہے کہ تمام زندگی کے مسائل کسی نہ کسی فلسفۂ حیات کی تشکیل اور عمل میں انسان کی بنیادی قدروں سے براہِ راست تعلق رکھتے ہیں، اور اس طرح سماجی قدریں اور معاشی قوتیں فلسفیانہ تصورات کو حقائق کی جامعیت بخش دیتی ہیں اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ فلسفیوں نے خیالِ محض کو اپنے تصورات کی تعمیر میں نمایاں جگہ نہیں دی ہے۔ بلکہ تمام عینیت پرست فلسفیوں نے اپنے خیالات کا ڈھانچہ خیالِ محض کی بنیاد پر استوار کیا تھا اور آج بھی کر رہے ہیں۔ عینیت پرستوں کی پہلی خصوصیت یہ ہے کہ وہ ذہن کی تخلیق کو حقیقت سے الگ کر کے اس پر غور و فکر کرتے ہیں۔ تاکہ مادّیت کی "پرچھائیاں" بھی اُس پر نہ پڑ سکیں۔ لیکن خود اُن کا طریقۂ فکر مادیت کے بغیر چند گام سے آگے نہیں جاتا۔ اس لئے وہ دنیا کو خیال کا "مادی عکس" کہتے ہیں۔ اس طرح خود اُن کے نظریے میں واضح تضاد پیدا ہو جاتا ہے ـــــ عینیت پرستوں کی اساس مادی حقائق سے زیادہ خیالِ محض پر ہوتی ہے۔ اور وہ خیال کو ایک وجدانی کیفیت سمجھتے ہیں جس کا تعلق براہِ راست مادی دنیا سے نہیں ہے۔ یہاں پہنچ کر بقولِ غالب ع

عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے

نظر آنے لگتا ہے۔ جو حقیقت میں محض خیال کی خوش فہمی سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا۔ عینیت پرستوں کی ایک اور پہچان ہے۔ وہ اُن کا فکری نظریہ ہے جو براہِ راست مذہبی عقائد کے خمیر سے بنتا ہے۔ کیونکہ اُنھیں اس طرح ایک بڑا پس منظر مل جاتا ہے۔ اور کسی نہ کسی صورت سے تمام عینیت پرست مذہبی عقائد کے مفروضوں پر اپنے خیالات کی اسکیم مرتب کرتے چلے گئے ہیں۔ اس طرح وہ بہت سے مسائل کو اتنا اُلجھا دیتے ہیں کہ اُن کے نظریے میں ایک قسم کا "تقدس" پیدا ہو جاتا ہے، اور ایک پُراسرار فضا کا علاقہ بنا دیتے ہیں۔ جو بظاہر بہت ہی "اعلیٰ و ارفع" معلوم ہوتا ہے۔ گو کہ انسانی ادراک نے آج اس کا سارا طلسم توڑ دیا ہے۔ یہ کام بہت سے سائنسدانوں اور دانشوروں نے کیا تھا، جو زندگی کے مسائل کو خیر، محض اور آسمانی مدد کے بغیر حل کرنا چاہتے تھے۔ کارل مارکس نے عینیت پرستی کی قبا کو چاک کرنے میں بہت زیادہ مدد دی تھی۔ اُس نے ہیگل کے 'انسان' کو پیروں پر کھڑا کر کے تمام مسائل کو مادی حقیقت سے منسلک کر دیا تھا۔ فلسفے نے آج تک خیال آرائی کی ہے۔ آج ضرورت اس بات کی ہے کہ اُسکی مدد سے حالات کو بدلا جائے نہ۔ اور اس طرح کارل مارکس نے فلسفیانہ موضوعات کو انسانی زندگی کے مسائل سے منسلک کر کے تصویر کے سارے رنگ ایک سرے سے بدل دئے اور منطقی استدلال کو حقائق کی صداقت سے

جوڑ دیا جس کی وجہ سے نظر خلا میں گم رہنے کے عوض انسانی افکار اور اُس کی بنیاد اور زندگی کی ضروریات پر مرکوز ہو گئی اور یہیں سے کارل مارکس نے عینیت پرستوں کے ہوائی قلعے کا خاتمہ کر دیا۔

اقبال ایک عینیت پرست شاعر تھے، اُنھوں نے بھی اپنے چراغ کو تمام عینیت پرستوں کی طرح مذہبی آگ سے روشن کیا تھا، وہ ایک فلسفی نہ تھے لیکن فلسفیانہ موضوعات پر غور و فکر ضرور کرتے تھے۔ اسی لئے اُن کی شاعری میں فلسفیانہ مسائل کی غیر واضح پرچھائیاں نظر آتی ہیں، کیونکہ اُنھوں نے اپنی فکر کی آماجگاہ کے لئے جو میدان چُنا تھا وہ مابعد الطبیعاتی مفکرین اور عینیت پرست فلسفیوں کی جولانگاہ رہ چکا تھا، اس لئے اُنھوں نے نئے خیالات تو نہیں پیش کئے۔ البتہ نئے انداز اور نئے اسلوب کو ضرور جنم دیا۔ اقبال اردو شاعری کے فلسفی شاعر ضرور کہے جا سکتے ہیں، اس سے یہ ہرگز مطلب نہیں ہے کہ اقبال سے پہلے اردو شاعری میں کسی قسم کا فلسفہ نہیں ملتا۔ بلکہ یہ کہنا مقصود ہے کہ اقبال نے فلسفیانہ موضوعات کو دوسرے شعراء کے مقابل زیادہ غور و فکر سے کام لے کر پیش کیا ہے۔ یوں تو اردو شاعری میں یہ رسم عام رہی ہے کہ تصوف اور حکیمانہ خیالات کو کسی نہ کسی پہلو سے شاعرانہ قالب میں ڈھالا جاتا ہے، اور میر و درد سے لے کر اصغر تک تصوف اور مذہبی عقائد کو مختلف نظریے سے "جانِ غزل" بنایا گیا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ کہیں کہیں اُس کا رنگ گہرا ہو گیا ہے اور کہیں کہیں صرف دھندلے دھندلے نقوش ملتے ہیں لیکن اقبال نے تصوف کو فلسفیانہ استدلال دے کر اسلامی پس منظر میں جدید دَور کا خیال رکھتے ہوئے پیش کیا ہے۔ اقبال کی شاعری میں سب سے اہم اُن کا تصورِ عقل و عشق ہے۔ اِس موضوع کو سمجھنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ اقبال کی نظر کو سمجھا جائے۔ اسی لئے میں نے اپنے مقالے کی ابتدا عینیت پرستوں کی خصوصیات سے کی ہے۔ تاکہ اقبال کی فکرِ آزاد کو پابندِ رسوم ثابت کیا جا سکے۔ یوں تو اقبال نے اردو شاعری میں فکر اور اسالیب کی نئی راہیں پیدا کی ہیں۔ لیکن یہ راہیں اتنی نئی نہیں ہیں جتنا کہ سمجھا جاتا رہا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اُردو شاعری اپنے تمام تنوّع کے باوجود اقبال سے پہلے اتنے رنگ نہیں رکھتی تھی کہ سنجیدہ اور فلسفیانہ موضوعات کو پوری شاعرانہ رنگا رنگی کے ساتھ آسکیں اور یہی اقبال کا کارنامہ ہے کہ اُنھوں نے شاعرانہ نزاکتوں اور شعری پابندیوں کو پوری طرح برتتے ہوئے فکری موضوعات کو پیش کیا ہے۔

اقبال کے تصورِ عقل و عشق پر بحث کرنے سے پہلے اس موضوع کے بارے میں چند ضروری باتیں کہنا چاہتا ہوں۔ عقل کوئی مجرّد خیال یا کلیہ کا نام نہیں ہے۔ بلکہ عقل کا تعلق انسانی ادراک اور حقائق کی منطق سے ہے۔ عقل پہلے مفروضوں کو آلۂ کار بنا کر انسانی ذہن کی رہنمائی نہیں کرتی بلکہ اس کی تعمیر میں خارجی حقائق کا شعور کارفرما رہتا ہے، اور یہ شعور ہی عقل کو دلیل فکر نظر عطا کرتا ہے جس کی مدد سے فلسفیانہ مسائل کی گرہیں کھلتی ہیں۔ اور اسی عقل کا تعلق مسائل سے براہِ راست ہو جاتا ہے، اور حقیقت کو سمجھنے میں جذبات سے گریز کرنا بھی بالغ نظری کا ثبوت بن جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عقل کی بصیرت کا امتحان ہر مرحلہ پر بڑا صبر آزما ہوتا ہے۔ ارسطو نے خیال کیا تھا کہ دلیل سے حقیقی صداقت کو پانے کا راستہ آسان ہو جاتا ہے۔ مگر وہ عقل کو کوئی مجرّد شے سمجھتا تھا۔ اسی لئے اُس نے Pure Reason "خالص دلیل" پر زور دیا ہے۔ اور خالص دلیل کا حقائق کی منطق سے کوئی رشتہ نہیں رہتا اور وہ خیالِ محض کا درجہ رکھتی ہے۔ اسی لئے تجربے کی ضرورت پیش آئی۔ تاکہ منطق کی ساخت میں ماحول کی طاقت اور اثر آسکے۔ بے معنی دلیل اور ناپختہ تجربے سے کوئی فلسفیانہ تصور حقائق کو سمجھنے میں مدد نہیں دے سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ دلیل اور تجربے میں جو تضاد بظاہر نظر آتا ہے وہ غلط منطق کا نتیجہ ہے۔ ورنہ دلیل کا خارجی حقائق سے رشتہ ضروری ہے۔ اور خارجی حقائق کا شعور دلیل اور تجربے کے آہنگ سے نکھرتا ہے۔ عقل جذبات کے لئے بند کا کام نہیں دیتی بلکہ اُن کو سمجھنے کا ایک آلہ ہے۔ بہرحال کہنے کا مقصد یہ ہے کہ عقل کا تصور بھی انسانی ادراک، تجربہ اور خارجی قوتوں سے بنتا ہے، اور یہ سمجھنا غلط ہوگا کہ عقل کا جذبات سے دُور کا بھی تعلق نہیں ہے۔ پروفیسر ویڈ گلٹن نے اپنی مشہور کتاب "سائنٹیفک نظریہ" The Scientific Attitude میں یہاں تک کہا ہے کہ "سائنٹیفک نظریے میں بھی انتہائی جذبہ ہوتا ہے جتنا کسی اور نظریے میں۔ البتہ یہاں جذبات مرکز نہیں ہوتے بلکہ رنگ آمیزی کا کام دیتے ہیں"——— اس طرح یہ بات سمجھ میں آجاتی ہے کہ عقل کی قوت بھی خارجی حالات اور انسانی ادراک سے بنتی ہے اور وہ کوئی غیر واضح

شئے نہیں ہے اور اقبال نے بھی اُسے آسمانی قوت نہیں سمجھا ہے۔ لیکن اُن کے پاس عقل کا جو تصور ہے وہ شک اور شبہ سے دیا وہ نزدیک ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ عقل سے معرفت کی منزل تک پہنچنا چاہتے تھے، اور جب اُنھیں اُس کی مدد سے یہ راہ ملے ہوتی ہوئی نظر نہیں آئی تو اُنھوں نے "جذبِ باطن" کا سہارا لیا۔ تاکہ ہر ف ایک جست سے وہاں پہنچ سکیں، جہاں غور و فکر کی راہ سے جانا سینکڑوں منزلوں سے گزرنا ہوتا اور اس طرح راہ کی دشواریوں سے ایک جست کی وجہ سے چھٹکارا مل جاتا ہے۔

اقبال نے عقل و عشق کے تصورات عینیت پرست فلسفیوں اور صوفی شاعروں سے لے کر اسلامی فلسفے کے پس منظر میں اُبھارے ہیں۔ برگساں کہتا ہے کہ "انسان کے ذہن کا کام یہ ہے کہ حیاتی وظائف کو حرکی میں منتقل کر دے"۔ اس سے برگساں نے جو نتیجہ نکالا ہے وہ قابلِ غور ہے۔ اُس کا خیال ہے کہ جو تصورِ کائنات ذہن و حواس سے حاصل ہوتا ہے وہ عملی زندگی کے لئے ناگزیر ہے۔ لیکن یہ حقیقت کا تصور نہیں ہے اور یہاں پہنچ کر برگساں انسانی ادراک کو لائقِ اعتنا نہیں سمجھتا اور خود بخود مابعد الطبیعاتی نظریئے کو اپنا لیتا ہے۔ برگساں ایک سخت قسم کا رومن کیتھولک تھا، اور وہ جدید فلسفۂ وجدانیت کا بانی بھی سمجھا جاتا ہے۔ اقبال کا فلسفۂ وجدانیت اسی سے ماخوذ ہے اور اسی لئے وہ عقل کو عشق کی رہنمائی کے بغیر قبول کرنے پر تیار نہیں ہیں۔

ڈاکٹر عابد حسین نے "اقبال اور عقل و عشق" کے عنوان سے ایک مختصر مضمون میں کچھ اشارے کئے ہیں۔ اس مضمون میں تنقید تو نہیں ملتی۔ اس لئے کہ اقبال پر تنقیدی نظر سے ابھی بہت ہی کم لکھا گیا ہے۔ اُنھوں نے تصورِ عقل و عشق کی وضاحت میں یہ اشعار پیش کئے ہیں ؎

عقل نے ایک دن یہ مجھ سے کہا — جذبے بے عقل کی رہنما ہوں میں
ہوں مفسّر کتابِ ہستی کی — مظہرِ شانِ کبریا ہوں میں
دل نے سُن کر کہا یہ سب سچ ہے — پر مجھے بھی تو دیکھ کیا ہوں میں
رازِ ہستی کو تو سمجھتی ہے — اور آنکھوں سے دیکھتا ہوں میں
ہے تجھے واسطہ مظاہر سے — اور باطن سے آشنا ہوں میں
علم تجھ سے تو معرفت مجھ سے — تو خدا جُو، خدا نما ہوں میں
تو زمان و مکاں سے رشتہ بہ پا — طائرِ سدرہ آشنا ہوں میں
کس بلندی پہ ہے مقام مرا — عشق بس رب جلیل کا ہوں میں

ڈاکٹر عابد حسین کا یہ خیال صحیح ہے کہ ان اشعار سے اقبال کے تصورِ عقل و عشق کا ایک پہلو واضح ہو جاتا ہے۔ لیکن اس کے آگے اُنھوں نے کچھ نہیں کہا، اب آئیے آپ کو ان اشعار کی مدد سے اقبال کے تصورِ علم کے باب میں ایک تصویر دکھاؤں۔ اقبال نے عقل و دل کی کشمکش کو بڑے شاعرانہ طریقے سے دکھلایا ہے۔ لیکن حقائق کو ایک سرے سے بدل دیا ہے، علم کا تصور یہ ہے کہ وہ خارجی حالات کی مدد سے پیدا ہوتا ہے، اور سماجی قوتوں کو سمجھنے میں مدد دیتا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ تاریخی شعور کی مدد سے اپنے میں وسعت پیدا کرتا ہے، اور اسرار نہاں کو فاش کرنے میں کوشاں رہتا ہے۔ لیکن اقبال علم کو سراسر حجاب سمجھتے ہیں کیوں کہ اُن کے خیال میں علم تو "محض منطا ہرے" تک پرواز کر سکتا ہے اور بس لیکن سوال یہ ہے کہ اُس کے آگے تخیل کے شہ پر بھی بغیر منطقِ استدلال کے راہ بھول جاتے ہیں، اور نظر آسمانوں میں گم ہو کر رہ جاتی ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ اس گمرہی کو حاصلِ منزل سمجھا جائے۔ جیسا کہ صوفی شعرا کا مسلک تھا۔

اقبال نے ضربِ کلیم کی ایک نظم میں جو "علم و عشق" کے عنوان سے ہے ایک دلچسپ نکتہ پیش کیا ہے۔ نظم کے چند بند یہ ہیں ؎

علم نے مجھ سے کہا عشق ہے دیوانہ پن
عشق نے مجھ سے کہا علم ہے تخمین و ظن
بندۂ تخمین و ظن! کرمِ کتابی نہ بن
عشق سراپا حضور، علم سراپا حجاب
عشق کی گرمی سے ہے معرکۂ کائنات
علم مقامِ صفات، عشق تماشائے ذات
عشق سکون و ثبات، عشق حیات و ممات
علم ہے پیدا سوال، عشق ہے پنہاں جواب
عشق کے ہیں معجزات سلطنت و فقر و دیں
عشق کے ادنیٰ غلام صاحب و تاج و نگیں
عشق مکاں و مکیں، عشق زمان و زمیں
عشق سراپا یقیں اور یقیں فتح یاب

ان اشعار سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اقبال نے عشق کے حلقے میں تمام زمان و مکان کو تو لے لیا لیکن زمان و مکان کے مسائل سمجھنے میں عشق نے کون سے کرشمے دکھائے۔ اُس کا ذکر نہیں ملتا۔ اس لئے کہ اقبال

تصورِ علم و عقل مابعد الطبیعاتی ہے اور مذہبی عقائد علم کو وقعت کی نظر سے نہیں دیکھتے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ انسانی ادراک اور تجسس پسند نظر کو شک و شبہ کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ اس لئے کہ یہ نظر عینیت پرستی کی قباتار تار کرنے میں دانشور سائنسدانوں کو مدد دیتی ہے اور اقبال پُراسرار طریقے سے عشق کو عقل پر فوقیت دے کر یہ سمجھ بیٹھے ہیں کہ منطقی استدلال سے چھٹکارا مل گیا۔ حقیقت اس کے برعکس ہے۔ اس نظم (علم و عشق) میں علم کو تجارتی نقطۂ نظر سے پیش کیا گیا ہے۔ جہاں پہنچ کر علم ایک تجارتی پیمانہ رہ جاتا ہے۔ علم بازار میں کیوں بکنے لگا اور کس نظام نے اُس کی خرید و فروخت کے لئے بازار سجایا، اُس پر اقبال کی نظر نہ جا سکی، اس لئے وہ خرد کو رازداں بنانے کے قائل نہیں۔ کیونکہ ع

"خرد کے پاس خبر کے سوا کچھ اور نہیں"

اور اس کا ادراک صورتِ زمانہ اور حواسِ ظاہری کا پابند ہے۔ اقبال نے تصورِ عقل کو سرے سے غلط سمجھا تھا، اس لئے غلط نتائج تک پہنچے۔ عقل کی تعمیر میں انسانی جبلت بھی حصہ لیتی ہے۔ عقل جہاں عمل کے لئے تحریک دیتی ہے وہاں عمل سے عقل میں پختگی اور تیزی بھی پیدا ہوتی ہے۔ عقل خود ذہنی عمل اور سائنٹیفک نظریے کے آئینے لئے رہتی ہے جس میں جذبات کا عکس بھی پڑتا ہے۔ یہ آگے بڑھ کر سماجی تعلیقات کو نئی صورت دیتا ہے جس میں ماضی کی جھلک، حال کی تصویر اور مستقبل کا خواب ایک ساتھ نظر آتے ہیں اور اس طرح تمام پوشیدہ گوشے کھل جاتے ہیں اور حالات کے مختلف پہلو سمجھ میں آنے لگتے ہیں۔

اقبال نے اپنے خیالات کی ترتیب میں مختلف (و متضاد) فلسفیوں کے تصورات سے مدد لی تھی اور خود انھیں اُلجھنوں میں کئی جگہ اُلجھ گئے ہیں۔ یورپی فلسفیوں نے ذہن کی آزادی اور روٹی کے اہم سوالات کو ایک دوسرے سے الگ کر کے انسانی افکار کو بڑی حد تک گمراہ کیا ہے اور یہ سوال بالکل اُسی رنگ میں اقبال کے یہاں بھی ملتا ہے۔ جیسا کہ میں نے شروع میں عرض کیا تھا کہ اقبال نے عقل و عشق کے تصورات کو الگ الگ قائم کر کے اُن میں جو نتیجہ پیدا کر دی ہے وہ اُن کو غلط نتائج پر پہنچاتی ہے۔ ورنہ "شکم یا دل" میں انتخاب کرنے کے لئے وہ "مردِ مسلمان" سے نہ کہتے۔ اُن کے خیال میں دل کی آزادی زندگی کی بنیادی ضروریات کے پورا ہوئے بغیر بھی حاصل ہو سکتی ہے۔

اور یہی وہ منزل ہے جہاں اقبال اُن لوگوں کے ہم نوا ہو جاتے ہیں جو سماج کی قوتوں اور سماجی قدروں کی اہمیت کے منکر ہیں اور معاشی جد و جہد کو تہذیبی زندگی کے لئے اتنا ضروری نہیں سمجھتے جتنا کہ وہ مستحق ہے اور ذہنی آزادی کے خیالی نعرے پر اپنی "زندگی" کو استوار کرنا چاہتے ہیں۔ اقبال کے یہ اشعار مندرجہ بالا وضاحت کی روشنی میں دیکھنے سے کئی پہلو سمجھ میں آجاتے ہیں ؎

عشق سے پیدا نوائے زندگی میں زیر و بم
عشق سے مٹی کی تصویروں میں سوزِ دمبدم

آدمی کے ریشے ریشے میں سما جاتا ہے عشق
شاخِ گُل میں جس طرح بادِ سحر گاہی کا نم

اپنے رازق کو نہ پہچانے تو محتاجِ ملوک
اور پہچانے تو تیرے گدا دارا و جم

دل کی آزادی شہنشاہی، شکم سامانِ موت
فیصلہ تیرا ترے ہاتھوں میں ہے دل یا شکم

اے مسلماں اپنے دل سے پوچھ مُلّا سے نہ پوچھ
ہو گیا اللہ کے بندوں سے کیوں خالی حرم

ان اشعار کے تجزیے کے بعد وہی نتیجہ نکلتا ہے جو میں نے وضاحت سے بیان کیا ہے۔ یہ انفرادی آزادی کی ایک شاخ ہے۔ یورپ میں آج بھی بڑے پیمانے پر اس "وہم" کے سہارے اجتماعی جد و جہد کو آگے بڑھنے سے روکا جا رہا ہے۔ میرے خیال میں خود کارل مارکس بھی زندگی کے تہذیبی اور انفرادی مسائل کا منکر نہیں تھا۔ جیسا کہ اُس نے اپنے ایک خط میں اینگلز کو لکھا بھی تھا۔ لیکن اقبال نے جس طرح شکم اور دل کا سوال اُٹھایا ہے وہ کسی طرح بھی صحیح نہیں مانا جا سکتا۔ انگریزی ادب کا مذہبی نقاد بھی زندگی کے ارتقاء کے راز سے منکر نہیں ہے اور آج کا مشہور مورخ ٹوائن بی تک اس کو تسلیم کرتا ہے۔

اقبال کا عشق کا تصور بھی مابعد الطبیعاتی ہے۔ وہ حرفِ کُن سے عشق کی ابتدا کرتے ہیں۔ کیونکہ انھوں نے عقل کا تصور صحیح طور سے نہیں سمجھا تھا۔ اس لئے وہ عشق کو عقل کا "مرشد" کہہ جاتے ہیں، اور کہیں حریف سمجھ بیٹھتے ہیں۔ اقبال کے تصورِ عقل و عشق میں خوبصورت تضاد ملتا ہے، اور اس کے وہ پہلو ہیں۔ ایک ہے عقل و عشق کے اتحاد کا اور دوسرا عقل و عشق کے اختلاف کا ـــــ اُن کا خیال ہے کہ "عقل کی بصارت" کے ساتھ اگر عشق کی بصیرت شامل ہو جائے تو رازِ حیات کے سمجھنے میں اتنی دشواری نہیں ہوگی ؎

یہ کائنات چھپاتی نہیں ضمیر اپنا
کہ ذرّے ذرّے میں ہے ذوقِ آشکارائی

کچھ اور ہی نظر آتا ہے کارِ بارِ جہاں
نگاہِ شوق اگر ہو شریکِ بینائی

انسان رازہائے سربستہ کو ظاہر کرنے کے لئے عقل ہی سے تحریک

حاصل کرتا ہے لیکن جذبۂ شوق اس عمل کی تکمیل میں معاون رہتا ہے، جبھی تو جستجو میں اتنی بیقراری ہوتی ہے کہ اُس کی لگن انسان کو "شعلۂ دانش" بنا دیتی ہے اور یہ کاوش ہی کا نتیجہ ہے کہ شوق اور فکر ایک دوسرے سے گھُل مل جاتے ہیں۔ لیکن اقبال اس کا تھوڑی دور کے بعد ساتھ چھوڑ دیتے ہیں۔ کیونکہ اُن کے خیال میں عقل کو مقصدِ حیات کا احساس نہیں رہتا، وہ کشمکشِ حیات کا تماشا دیکھتی رہ جاتی ہے، اور عشق کا ردِ عمل میں بے خطر کُود پڑتا ہے ؎

بے خطر کُود پڑا آتشِ نمرود میں عشق — عقل محوِ تماشائے لبِ بام ابھی
عشق فرمودۂ قاصد ہے سُبک گامِ عمل — عقل سمجھی ہی نہیں معنیِ پیغام ابھی

اقبال نے عشق اور عقل کے تصورات الگ الگ قائم کئے تھے، اس لئے جب کبھی وہ اُن کے اتحاد سے بھی عمل کی دُنیا میں اُترتے ہیں تو وہ دونوں ایک تصور نہیں بنتے اور فرق خاطر خواہ رہتا ہے، اس لئے وہ عقل کو جلد ہی ناکارہ سمجھ بیٹھتے ہیں، اُن کا خیال ہے کہ ؎

حیات ہست جہاں را اسیرِ جاں کردن — تو خود اسیرِ جہانی کجا توانی کرد
تو از شمارِ نفس زندۂ نمی دانی — کہ زندگی ز شکستِ طلسمِ ایام است

اور "شکستِ طلسمِ ایام" عقل کے دائرۂ فکر سے باہر کا مسئلہ ہے، جو شاید سائنٹیفک تجسس سے بے خبر تھے۔ پچھلے دو صدی سے سائنس نے مادی مکان پر قابو پانے میں کہاں تک کامیاب ہو گئی ہے اور اتنی وسیع دنیا ان فتوحات کی وجہ سے "ایک خاندان" کی صورت اختیار کرتی جا رہی ہے، رسل و رسائل کی نئی ایجادات، ذرائع پیداوار میں حیرت انگیز تبدیلی اس بات کا ثبوت ہیں کہ سماجی قدروں کی تخلیق میں ان سائنسی ایجادات کا کتنا بڑا حصّہ ہے۔ میں فلسفیانہ مسائل کو سماجی قدروں سے الگ کر کے خیالِ محض کے "شگوفے" نہیں سمجھتا، اس لئے فلسفہ اور سائنس کے باہمی اثر اندازی کے نکتے کو اتنی وضاحت سے بیان کر رہا ہوں۔

اقبال نے سائنس کے اتنے ہی اثرات قبول کئے ہیں جو اُن کے عقائد پر ضرب نہیں لگاتے اور جہاں بھی جدید فلسفہ اور سائنس نے مابعد الطبیعیاتی قباحتوں کو چاک کرنے کی کوشش کی ہے وہ سائنس کی دنیا سے الگ ہو کر عینیت پرستی کی فضاؤں میں پناہ لینے لگتے ہیں۔ اقبال مغربی افکار سے متاثر ہونے کے بعد بھی اُن "عقائد شکن" خیالات کے شدید مخالف تھے جن کا سائنس اور مادی فلسفے سے تعلق تھا، یہی وجہ ہے کہ وہ کائنات کے حصار کو توڑنے کے لئے عشق ہی سے کام لیتے ہیں ؎

عشق کی اک جست نے طے کر دیا قصہ تمام — اس زمین و آسماں کو بیکراں سمجھا تھا میں

اس شعر میں ایک بات قابلِ غور ہے کہ جو سفر ایک جست میں طے ہوتا ہے وہ راہ کی دشواریوں اور فکر کی منزلوں کا سفر نہیں ہے بلکہ وہی صوفی شعرا کا "ذہنی سفر" ہے جو ایک نعرے کے زور سے ایک دنیا سے دوسرے عالم میں پہنچا دیتا ہے اور پھر "قصہ تمام" ہو جاتا ہے۔ اقبال "ایمان بالغیب" کے عقیدے پر ایمان رکھتے تھے لیکن فکر کا دامن بھی ہاتھ سے نہیں جانے دیتے تھے۔ یہ ایک حد تک تو ممکن ہے لیکن اس کے آگے وہ تنہا رہ جاتے ہیں اور تمام عینیت پرست اور صوفی مزاج شعرا کی طرح اس میں اپنی خودی کی تکمیل دیکھتے ہیں۔ اس کے ثبوت میں جاوید نامے کی مثال سامنے آتی ہے، جہاں پہنچ کر عشق کا تصور اتنا وسیع ہو جاتا ہے کہ صرف "عشقِ الٰہی" تک محدود ہو جاتا ہے۔ کیونکہ اقبال "عشقِ الٰہی" کی توفیق سے زمانے کے حدود سے گزر کر ابدیت کی نامحدود دنیا میں کھو جانا چاہتے تھے۔

عشق کے بارے میں مولانا عبدالسلام ندوی اپنی کتاب "اقبالِ کامل" میں یوں رقم طراز ہیں ——— "ہمارا خیال ہے کہ سب سے پہلے عشق اور عشق کی تمام خصوصیات کو فلسفۂ اشراق نے نمایاں کیا اور اُن کو نہایت اہمیت دی ——— اشراقیوں کے نزدیک نظامِ عالم تہر و پہر کی بنیاد پر قائم ہے" ("اقبالِ کامل" صفحہ ۳۰۳) اسی کے بعد اُنھوں نے شیخ الاشراق کا ایک طویل اقتباس دیا ہے۔ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا اگر ہم یہ اقتباس یہاں نقل کر دیں۔

"بلند نور کو نیچے کے نور پر غلبہ و اقتدار حاصل ہے اور نیچے کا نور بلند سے محبت کرتا ہے اور ایضِ قہر و مہر سے نظامِ عالم کا وجود وابستہ ہے۔ اور جب بہت سے انوار جمع ہو جاتے ہیں تو بلند نور نیچے کے نور پر غلبہ حاصل کر لیتا ہے اور نیچے کے نور کو بلند نور سے عشق ہو جاتا ہے۔ اسی لئے نورالانوار (خدا) کو اپنے ماسوا تمام موجودات پر غلبہ حاصل ہو جاتا ہے، اور وہ اپنی ذات کے سوا کسی اور سے عشق نہیں کرتا، کیونکہ وہ ہر چیز سے زیادہ خوبصورت اور مکمل ہے اور اُس کو خود اپنا کمال نظر آتا ہے۔ اسی لئے وہ عاشق بھی ہے اور معشوق بھی، اور چونکہ خدا سے زیادہ کوئی چیز حسین اور مکمل نہیں، اس لئے کسی چیز کو بھی دوسری چیز کے عشق میں وہ لطف نہیں حاصل ہوتا جو عشقِ الٰہی میں ہوتا ہے۔ غرض نظامِ عالم کا وجود و عروج

سے قائم ہے۔" (صفحہ ۲۸۳)

اشراقی فلسفیوں کا یہی عشق ہے جس کو آگے چل کر تمام صوفیوں اور اُن کے شاعروں نے وحدت الوجود کی شکل میں اپنایا ہے اس تصورِ عشق سے بقول مولانا عبدالسلام ندوی تمام فارسی شعرا متاثر رہ چکے ہیں "مولانا روم فلسفہ اور تصوّف دونوں کے اسرار و رموز سے واقف تھے۔ اس لئے اُن کو معلوم ہو گیا کہ فلسفیانہ اور متکلمانہ عقل خدا تک نہیں پہنچ سکتی۔ اُس کا ذریعہ صرف عشق و محبت ہے جو تصوّف کا خمیر ہے۔" (اقبال کامل" صفحہ ۱۸۴) اس جملے کے بعد مولانا عبدالسلام ندوی نے مولانا روم اور امام رازی کے اس مسئلے پر بحث کا ذکر کیا ہے اور یہ جملہ لکھا کہ ــــ "اس دور میں صرف عقل زندہ ہے اور عشق مردہ ہو چکا ہے"۔ اس لئے اقبال نے عقل کو ٹھیک ہی معطون کیا ؎

بُرا نہ مان ذرا آزما کے دیکھ اِسے فرنگ دل کی خرابی نرد کی معموری

اس سے ایک بات اور واضح ہو جاتی ہے کہ اقبال نے دل کو عشق کی آماجگاہ بھی سمجھا ہے اور دل اور خرد کو الگ الگ خانوں میں تقسیم کر دیا ہے گو کہ اُن کے زمانے میں بھی اُردو شاعری میں "خرد اور دل" کے رشتے استوار ہونے لگے تھے۔ لیکن جیسا کہ کہا جا چکا ہے اقبال نے چند صفر و صنموں پر اپنے عقل و عشق کے تصوّر کی بنیاد رکھی تھی اور جب وہ بنیاد ہی غلط ہو تو ساری عمارت کج ہی اُٹھے گی۔

اقبال کے فلسفۂ حیات کو سمجھنے کے لئے عقل اور عشق کے تصوّر کو سمجھنا ضروری ہے۔ پیامِ مشرق میں ایک نظم "تسخیرِ فطرت" کا یہ بند ملاحظہ ہو جس میں حضرتِ آدمؑ کو ابلیس یہ کہہ کر اغوا کرتا ہے ؎

زندگی سوز و ساز بے سکون و دوام — فاختہ شاہیں شو از تہیشِ زیر دام
ہیچ نیایذ تو غیر سجدِ نیاز — خیز چو سرو بلند لے بسمل تیز گام
کوثر و تسنیم بر و از تو نشاطِ عمل — گیر زمینائے تاک بادۂ آئینہ فام
زشت و نکو زادۂ وہم خدا و ندیست — لذّت کردار گیر، کام بخواہ، جوئے کام
نیز کہ بنیادِ ملکتِ تا نہ نہ — چشمِ جہاں بیں گشا، بہر تماشا خرام
قطرۂ بے مایۂ گوہر تابندہ شو — از سرِ گردوں بغیت گیر بدر یا مقام
تخمِ دو شینہ ام، حاصلِ جہانِ گسل — جوہرِ خود را نمائے، آئے بروں از نیام
بازوئے شاہیں گشا، خونِ قدر اں بریز — مرگ بود باز زدستِ اندر کنام

لہ تا ثریا می رود دیوار کج (ادارہ)

قوتِ شناسی ہنوز شوقِ پیروزِ وصل — چیست حیاتِ دوام؟ سوختنِ ناتمام

ان اشعار میں ابلیس کے ذریعے اقبال کے فلسفے کے مختلف پہلو آجاتے ہیں، حیاتِ انسانی کی تخلیق، غایت اور نوعیت سے متعلق اقبال کے خیالات کی تصویریں اُبھر آتی ہیں۔

اقبال ولیم جیمس سے بھی بہت متاثر تھے۔ ولیم جیمس عبادت کو اصلی روح اور جوہر سمجھتا تھا۔ یہی نہیں عبادت خود مذہب ہے اور عبادت کو عبارت ہے، اس حیات بخش عمل سے جس کی بدولت کل نفس اسی جرثومہ سے پیوست ہو کر اُسی کو زندگی عطا کرتا ہے"ــــــ اقبال کا عمل کا تصوّر بھی اسی مابعد نفسیات سے متاثر معلوم ہوتا ہے۔ اس سے یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ اقبال عمل کے دلدادہ تو ہیں اور انسانی جد و جہد کو زندگی کو بہتر بنانے کے لئے ضروری بھی سمجھتے ہیں مگر ایک خاص قسم کی وجدانی کیفیت کو عمل سے وابستہ بھی رکھتے ہیں جیسا کہ ایک فلسفی کا قول ہے (Contemplation is itself an Action) یعنی غور و فکر بذاتِ خود ایک عمل ہے"۔ اور اقبال ایک جگہ خود لکھتے ہیں ــــــ "یہ تحقیق کا واحد عمل ہے جس کی بدولت جستجو کرنے والا انسانی ذات کے ساتھ ہی اپنی خودی کا اثبات کرتا ہے۔ اور اس کائنات کی زندگی میں ایک حرکی عمل کی حیثیت سے اپنے وجود کی قدر اور جواز کو جان لیتا ہے"۔ ان اقتباسات سے یہ بات تو واضح ہو جاتی ہے کہ اقبال خود بھی عقل کو قابلِ اعتماد نہ سمجھتے تھے البتہ وہ اس کے سرے سے مخالف بھی نہ تھے۔ پھر بھی اُنھوں نے عقل اور عشق کو خانوں میں تقسیم کر رکھا تھا ؎

عقل او را سوئے جلوت می کشد — عشق او را سوئے خلوت می کشد

اور یہاں پہنچ کر وہ ایک سجدہ شکرانہ ادا کرتے ہیں۔ لیکن وہ اس نکتے کو نظر انداز کر جاتے ہیں کہ زنجیر کی ایک کڑی کی طرح ایک سجدہ بھی تمام سجدوں کی ابتدا ہے اور یہ سلسلہ بھی دُور تک پھیلا ہوا ہے اُن کا خیال ہے کہ ؎

وہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے — ہزار سجدوں سے دیتا ہے آدمی کو نجات

اقبال خالص عینیت پرست شاعر تھے۔ اُن کے فلسفے میں منطقی استدلال کی شدید کمی کا احساس ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں اُن کی مشہور نظم "مسجدِ قرطبہ" قابلِ غور ہے جو اُردو کی بہترین نظموں میں شمار کی جا سکتی ہے۔ پہلے بند میں شاعر نے دُنیا کی بے ثباتی کا ذکر کیا ہے اور اوّل و آخر فنا ہی نہیں بلکہ نئی اور پرانی ہر شئے کی صرف ایک حقیقت ہے۔ یعنی فنا، اس خیال کے بعد عشق

کے متعلق دوسرا بند شروع ہوتا ہے ؎

ہے مگر اس نقش میں رنگِ ثباتِ دوام — جس کو کیا ہو کسی مردِ خدا نے تمام
مردِ خدا کا عمل عشق سے صاحب فروغ — عشق ہے اصلِ حیات، موت ہے اس پر حرام
تند و سبک سیر ہے گرچہ زمانے کی رَو — عشق خود اک سیل ہے، سیل کو لیتا ہے تھام
عشق کی تقویم میں عصرِ رواں کے سوا — اور زمانے بھی ہیں جن کا نہیں کوئی نام
عشق دمِ جبرئیل، عشق دلِ مصطفیٰؐ — عشق خدا کا رسول، عشق خدا کا کلام
عشق کی مستی سے ہے پیکرِ گِل تابناک — عشق ہے صہبائے خام، عشق ہے کاسُ الکرام
عشق فقیہِ حرم، عشق امیرِ جنود — عشق ہے ابنُ السبیل، اس کے ہزاروں مقام
عشق کے مضراب سے نغمۂ تارِ حیات — عشق سے نورِ حیات، عشق سے نارِ حیات

اور تمام دنیا کی ساری جد و جہد کو فنا کے سپرد کرنے کے باوجود عشق کو "آبِ حیات" پلا کر دوامِ بخشنا بھی اقبال کے مابعد الطبیعاتی شاعر ہونے پر دلالت کرتا ہے۔ وہ شاعرانہ بہاؤ اور مذہبی عقائد کی رَو میں آکر عشق کو تمام اشیاء پر فوقیت دیتے ہوئے "نورالانوار" سے وابستہ کر دیتے ہیں یعنی عشق کے سرچشمہ میں کھو جانا ہی "حیاتِ جاوید" کے مترادف بن جاتا ہے اور اس طرح اقبال انسانی زندگی کو جسے وہ "پیہم رواں و دواں اور جاوداں سمجھتے تھے" آسمانوں میں لے جا کر بھول جاتے ہیں، اور یہ ایک خاص ہیئت پرستوں کی صفت ہے، اس سے اقبال کیسے الگ ہو سکتے تھے: جو ہر زندگی عشق ہے اور عشق جوہر خودی ہے" اور اس طرح یہ سلسلہ دراز ہوتا چلا گیا ہے اور جس کی انتہا کی اقبال کو بھی خبر نہیں ہے۔ اقبال کا فلسفۂ خودی عقل اور علم کی بنیاد پر نہیں ہے بلکہ عشق اور "خالص عشق" کے خمیر سے ہی خودی کا وجود ہوتا ہے۔ اس لئے کہ ؎

دانش و دین و علم و فن بندگیِ ہوسِ تمام — عشق گرہ کشائے کا فیض نہیں ہے عام ابھی

اور عشق تمام مسائل کا حل بھی پیش کر سکتا ہے۔ اقبال عشق کو مختلف غور و فکر کی راہوں پر مختلف معنی دیتے ہیں، اور اس طرح عشق کے گرد ایک دھندسی چھا جاتی ہے۔ مگر نقاد کی تیز نظریں "عبارہ" کو چیر کر اصل تک پہنچ جاتی ہیں اور عشق کی حقیقت معلوم ہو جاتی ہے ——— وہ ایک زمانے میں مسولینی، نیٹشے، ہیوم، برگساں، ولیم جیمس، لینن، مولانا روم اور امام رازی سے بہت متاثر تھے اور اُن کے تمام تصورات پر اُن فلسفیوں اور دانشوروں کے اثرات کے واضح نقوش ملتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کا "مردِ مومن" کا تصور بھی اُن تمام فلسفیوں کے خیالات کے اجزا سے مل کر بنا ہے۔ اس لئے "مردِ مومن" "لباسِ دانش" پہننے کے باوجود "شعلۂ عشق" نظر آتا ہے اور اقبال کے "شاہین" میں بھی عشق کی خصوصیات پائی جاتی ہیں، وہی بیباکی، وہی منزلوں کو گرد سفر بنانے کا عزم اور وہی اونچی اُڑان اس کے علاوہ فوق البشر کا تصور بھی عشق کے خمیر سے اُٹھا ہے۔ اس طرح اقبال کے تمام فلسفۂ حیات میں عشق کی بڑی اہمیت ہے۔ اور اس کے سمجھے بغیر اقبال کی نظر، خیال اور عمل کے تصورات کو نہیں سمجھا جا سکتا۔

یہاں ڈاکٹر یوسف حسین کی مشہور کتاب "رُوحِ اقبال" کا ذکر ضروری معلوم ہوتا ہے "رُوحِ اقبال" میں عشق و عقل کے بارے میں اشعار کی تشریح تو ملتی ہے، لیکن تنقید کی جھلک نظر نہیں آتی، اُس کی وجہ یہ ہے کہ ——— "رُوحِ اقبال" "ایک مدلل تقاریظ" ہے۔ اور اس کتاب میں بھی تنقید کے فرائض پوری طرح ادا نہیں کئے گئے ہیں اور مصنف نے عقیدت مندی کی وجہ سے وہ "انتقادانہ نظر" نہیں ڈالی جو نقاد کے لئے ضروری تھا۔ ڈاکٹر یوسف حسین کا بھی یہی خیال ہے کہ عقل گلے میں غلامی کا طوق بن جاتی ہے (صفحہ ۵۲) لیکن برخلاف اس کے عشق، مجاز کی منزلوں سے گزرتا ہوا شاہدِ حقیقی سے ہمکنار ہو جاتا ہے۔ اور اس طرح عشق کی ساری جد و جہد اس دنیا سے الگ ہو کر نورانی فضا میں ختم ہو جاتی ہے۔ اقبال نے عشق کے ذریعے معرفت حاصل کرنے کی سعی کی ہے اور اُنھیں اس کے ہمراہ جن راہوں سے گزرنا پڑتا ہے وہاں عقل ہم سفر نہیں بن سکتی، اس لئے عقل غور و فکر کی منزلیں طے کرتی راہ کی دشواریوں کو سمجھتی ہوئی آگے بڑھتی ہے، لیکن اقبال جس سفر کو طے کرنا چاہتے ہیں وہ ایک حیثیت میں ختم ہونے والا سفر ہے اور وہ کسی بھی صورت سے غور و فکر اور علم و عقل کا سفر نہیں بن سکتا ——— یہی وجہ ہے کہ عقل کو ساتھ رکھنے میں اُن کا "مقصد" پورا نہیں ہو سکتا، جو اُنھیں تمام دشواریوں کو لئے ہوئے نظر آتی ہے، اور وہ تیز رفتار بھی نہیں ہوتی جو "عشق جنوں خیز" کی خصوصیت ہے۔ اقبال کے یہ اشعار ملاحظہ ہوں ؎

من بندۂ آزادم عشق است امامِ من — عشق است امام من عقل است غلامِ من
ہنگامۂ ایں محفل از گردشِ جامِ من — ایں کوکبِ شامِ من، ایں ماہ تمامِ من
جاوید و عدم آسودہ بے ذوقِ تپ و تابے — مستانہ تواپا زد و در حلقۂ دامِ من
اے عالمِ رنگ و بو ایں صحبتِ ساقی چند — مرگ است دوامِ تو عشق است دوامِ من

ان اشعار میں اقبال کے تصورِ عقل و عشق کے ایک اور پہلو کی طرف اشارہ ملتا ہے اور وہ پہلو یہ ہے کہ اقبال عقل کو عشق سے بالکل الگ کبھی نہیں رکھنا چاہتے اور اس کو "غلام" بنا کر یا بند عشق کرنا چاہتے ہیں لیکن اقبال نے عقل اور عشق کے تصورات الگ الگ قائم کئے تھے۔ اس لئے جب وہ اُن کے باہمی تعلق سے توازن پیدا کرنا چاہتے ہیں تو وہ آقا اور غلام کا تعلق بن جاتا ہے اور کبھی وہ عقل کو آستاں کے قریب بھی سمجھتے ہیں۔ لیکن اس کی اہلیت سے واقف ہونے کی وجہ سے قُرب کے لائق نہیں سمجھتے ؎

عقل گو آستاں سے دُور نہیں — اُس کی تقدیر میں حضور نہیں
علم میں بھی سرور ہے لیکن — یہ وہ جنت ہے جس میں حُور نہیں
دل بینا بھی کر خدا سے طلب — آنکھ کا نُور، دل کا نُور نہیں
کیا غضب ہے کہ اس زمانے میں — ایک بھی صاحبِ سُرور نہیں
اک جنوں ہے کہ باشعور بھی ہے — اک جنوں ہے کہ باشعور نہیں

اور اس منزل پر پہنچ کر عقل آستاں کے اتنے قریب آجاتی ہے کہ عشق اور عقل میں صرف چند مدارج کا فرق رہ جاتا ہے اور یہ اشعار اقبال کے عقل و عشق کے اتحاد کے پہلو کی بھی نمائندگی کرتے ہیں۔ ڈاکٹر یوسف حسین ایک جگہ لکھتے ہیں کہ "انسانی تاریخ گواہ ہے کہ قوموں کی زندگی کسی نہ کسی جذبے کی وجہ سے بدل گئی ہے (صفحہ ۵ رُوحِ اقبال) لیکن وہ اس نکتے کو نظر انداز کر گئے ہیں کہ جذبے کو عمل کی قوت اور تاثیر کی گرمی دینے میں دانشوروں کا کتنا اہم حصہ ہوتا ہے اور عقل و عشق کو کسی بھی طرح خانوں میں تقسیم کر کے حکم نہیں لگایا جا سکتا جیسا کہ اقبال اور اُن کے مدّاحین نے کیا ہے۔ ہر جذبے کو عملی صورت دینے میں علم و فراست کی قدم قدم پر ضرورت پڑتی ہے ورنہ وہ جذبہ "سراسر وحشت" میں تبدیل ہو سکتا ہے اور جس کی منزل بھی متعین نہیں کی جا سکتی۔ اس لئے کہ "صحرا نوردی" وحشت تک محدود نہیں ہے، اور وحشت کی منزل بھی "دشت" ہی ہو سکتی ہے۔ اقبال نے ایک بڑا شاعرانہ خیال یوں بیان کیا ہے ؎

زمانہ عقل کو سمجھا ہوا ہے مشعلِ راہ — کسے خبر کہ جنوں بھی ہے صاحبِ ادراک

اور اس شعر میں عشق کی دانش مندی کی طرف جو واضح اشارہ ہے وہ عقل اور عشق کے اتحاد کے عمل میں عشق کو زیادہ فہیم اور "عقیل" ثابت کرنے کی کوشش کی ہے، اور باشعور جنوں کی خیال آرائی بڑی لطیف اور خوبصورت ہے اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے کہ جرأت رندانہ زیادہ تر "قدح خوار" کے حصے میں آتی ہے۔ لیکن جب اس مسئلے پر فلسفیانہ طریقے سے بحث کی جائے تو شاعرانہ تخیل سے زیادہ جرأت آزما فکر خیز نظر معلوم ہوتی ہے۔ وہ عقل جو مہ پروین کا شکار کھیلنے کی جرأت رکھتی ہے وہ کتنی طوفان خیز ہے۔ اس کا اندازہ لگانا آسان نہیں۔ اس لئے اگر اقبال یہ کہتے ہیں کہ ؎

یہ عقل جو مہ و پروین کا کھیلتی ہے شکار — شریکِ شورشِ پنہاں نہیں تو کچھ بھی نہیں

تو یہ خیال قابلِ قبول نہیں ہے، کیونکہ "شورشِ پنہاں" کا سارا خیال دل سے ایک الگ راہ پر جانے کا خیال ہے اور "شورشِ پنہاں" تو ہر قدم پر خارجی اثرات سے بدلتا رہتا ہے۔

اقبال کے تصورِ عقل و عشق میں کئی مسائل اُلجھ جاتے ہیں اور یہ مسائل زیادہ تر مابعد الطبیعاتی ہیں اُنھوں نے عقل کو انسانی جذبات سے الگ کر کے سوچا ہے۔ یہ دو شعر ملاحظہ ہوں ؎

تازہ پھر دانشِ حاضر نے کیا سحر قدیم — گزر اس عہد میں ممکن نہیں بے چوب کلیم
عقل عیار ہے سو بھیس بنا لیتی ہے — عشق بیچارہ نہ ملّا ہے، نہ زاہد، نہ حکیم

ان اشعار سے ایک بات اور واضح ہو جاتی ہے کہ دانشِ حاضر نئے فلسفے سے متاثر تو ہے لیکن ماضی کی قدروں اور رجعتی روایت کا بہت زیادہ دلدادہ ہے، اس لئے نئے اور پرانے کے غلط امتزاج سے کوئی بھی خوبصورت اور حسین تصورِ حیات فلسفیانہ معیار پر نہیں آتا اور اقبال ذہانت پر شک کرنے لگتے ہیں اور عقل کو عیاری کے مترادف کہہ جاتے ہیں۔ اس کی وجہ ظاہر ہے کہ وہ عقل کو کہیں شک و شبہ کا نام دیتے ہیں اور کہیں چالاکی کا۔ عقل کو فکر اور شعور کے لئے ضروری نہیں سمجھتے۔ علم تک کو اقبال "سراسر حجاب" خیال کرتے ہیں۔

خواجہ غلام السیدین کا خیال ہے کہ اقبال منزلِ فرزانگی سے بڑی آسانی سے گذر گئے اور بقول اقبال مقامِ عشق میں کھوئے گئے ؎

مقامِ عشق سے آساں گزر گیا اقبال — مقامِ عشق میں کھویا گیا وہ فرزانہ

خواجہ صاحب نے اپنے مقالے کا آغاز اس شعر سے کیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اقبال نے جہاں بھی فلسفیانہ موضوعات کو اپنایا ہے وہاں پر وہ خوب خوب بہکے ہیں، یہ دوسری بات ہے کہ "لغزشِ پیہم" سے شاعرانہ حسن پیدا ہو جاتا ہے لیکن فکر کی عظمت میں کمی آجاتی ہے۔ خواجہ صاحب نے اقبال کو مغربی مفکرین کے مقابل میں فوقیت دی ہے کیونکہ بقول خواجہ

صاحبِ اقبال کا تصورِ خودی"، دولت، حکومت اور قوت سے آزاد ہے۔ لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو اقبال کے "فلسفے" کی فلک بوس عمارت زمین پر آجاتی ہے، اس لئے کہ وہ علم، عقل، عمل اور زندگی کے دوسرے فلسفیانہ مسائل کو عینیت پرست فلسفیوں کی مدد سے اسلامی رنگ میں پیش تو کر دیتے ہیں لیکن منطقی استدلال کا دامن چھوٹ جاتا ہے، جہاں وہ سائنس اور اس کی ایجادات کی ہجو کرنے لگتے ہیں وہاں وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ ذرائع پیداوار کے مالک اور آلات کے استعمال کرنے والے سائنس کی ایجادات سے اپنے طبقے کی حفاظت کرنے کے لئے غلط راہ پر گامزن ہیں، اس میں سائنس یا کسی علم کا قصور نہیں ہے بلکہ اُس طبقے کے افراد کو موردِ الزام ٹھہرانا چاہیئے جس نے سیکانکی ترقیات سے غلط فائدہ اُٹھایا ہے۔ لیکن اقبال کے ذہن میں طبقاتی کشمکش کا سوال نہ تھا۔ اقبال اُردو کے پہلے شاعر ہیں جن کا شعور اتنا بلند تھا لیکن وہ سماجی شعور رکھتے ہوئے بھی تاریخی شعور سے بے خبر تھے اور یہی وجہ ہے کہ اُن کو ماضی ہمیشہ شاندار اور عظیم نظر آتا ہے۔ حال سے وہ بیزار تھے اور مستقبل سے بڑی حد تک مایوس تھے۔

خواجہ صاحب کا یہ خیال ہے کہ "اقبال نے مغربی تہذیب کی جو بے پناہ تنقید کی ہے اُس کا اصل سبب یہی ہے کہ مغرب نے محض عقل بے دین کی پرستش اختیار کر لی ہے اور عشق و نظر کو جو انسانیت کے بہترین جذبات کا ماخذ اور مذہب و اخلاق کی بنیاد ہے مسترد کر دیا ہے"۔ درست نہیں معلوم ہوتا۔ خواجہ صاحب ایسا دانش ور بھی عقیدت مندی کا شکار نظر آتا ہے۔ اقبال عقل اور مغربی نظریۂ فکر کو اپنا لیتے اگر وہاں بے دینی نہ پھیل ہوتی، اس سے اقبال کی سائنس اور مغربی افکار کے بارے میں تنگ نظری کا پتہ چلتا ہے۔ اقبال مغربی فکر و نظر سے متاثر بھی تھے۔ اُن کا شاہین اور مردِ مومن کے تصورات عینیت پرست فلسفی نیٹشے سے ماخذ ہیں اور عمل اور وجدان کا تصور برگساں اور ولیم جیمس سے متاثر ہے وہ مغرب اور امریکہ کو مادیت کا شکار سمجھتے تھے گو امریکہ میں عینیت پرستی کا دور دورہ ہے۔ صرف صنعتی ترقی سے مادیت کے فلسفے کی فضائیں نہیں بنتیں، اس لئے کہ صنعتی انقلاب سے پہلے بھی مادیت کے بارے میں مباحث ہوتے تھے لیکن اقبال نے صنعتی ترقی، سائنسی ایجادات اور سماجی قدروں کو ایک سرے سے مادیت قرار دے دیا اور مادیت بقول اقبال "غیر انسانی" خیالات کو پروان چڑھاتی ہے۔ اقبال اٹھارھویں صدی کی مادیت اور جدلیاتی اور تاریخی مادیت میں بھی فرق نہیں کر پاتے، کیونکہ وہ مادیت کو ایک سرے سے قابلِ غور و فکر نہیں سمجھتے تھے۔

اقبال نے دورِ حاضر کے انسان کی جو تصویر مندرجہ ذیل اشعار میں پیش کی ہے وہ بھی قابلِ غور ہے ؎

عشق ناپید خرد می گزدش صورت مار — عقل کوتاہ فرامانِ نظر کر نہ سکا
ڈھونڈنے والا ستاروں کی گزرگاہوں کا — اپنے افکار کی دنیا میں سفر کر نہ سکا
اپنی حکمت کے خم و پیچ میں اُلجھا ایسا — آج تک فیصلۂ نفع و ضرر کر نہ سکا
جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا — زندگی کی شبِ تاریک سحر کر نہ سکا

ان اشعار میں اقبال نے جو جدید انسان کے نقوش اُبھارے ہیں وہ جدید انسان کی خصوصیات تو ٹھیک ہے کسی حد تک صحیح ہوں مگر وہ "دورِ حاضر کے انسان" کا میکانکی تصور رکھتے تھے، اس لئے جب انسان نے تسخیرِ فطرت کر لی ہے تو زندگی کی "شبِ تاریک" کی سحر کرنا کیا معنی رکھتا ہے۔ اقبال نے ذہن میں جس انسان کا قصر بنایا تھا وہ خوف و ہراس، نفع و ضرر میں گرفتار شخص کا تصور ہے اور نئے انسان کی عظمتوں کا حامل نہیں ہے، وہ یہ نہیں سوچ سکتے تھے کہ انسان آلات کا موجد ہے تو کسی نے اُس کو اُن کا غلام بنا دیا ہے اور یہ کیسا نظام ہے کہ "انسان" اپنی تباہی کی تیاری اتنی دھوم سے کر رہا ہے۔ بہرحال اقبال نے نئے انسان کو عیار کی صورت میں پیش کیا ہے اور اُن کا "مردِ مومن" عشق کا جوہر یعنی خودی کا مبلغ ہے اور عقل کو عیار سمجھتا ہے۔

اقبال کے تصورِ عقل و عشق پر بحث ختم کرتے ہوئے یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اُن کے خیالات سے اختلاف کے باوجود اُن کی شاعرانہ عظمت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ انگریزی نقاد رچرڈ نے ملٹن کے بارے میں لکھا ہے کہ ملٹن کے مذہبی تصورات سے اختلاف کے باوجود اس کی شاعری تمام خوبیوں کی حامل ہے۔ میں بھی اقبال کے بارے میں یہی کہنا چاہتا ہوں۔ اقبال ایک فلسفی نہ تھے وہ اوّل و آخر شاعر تھے۔ اقبال نے اُردو شاعری کو نئے خیالات اور نئے اسالیب سے متعارف کرایا اور سیاسی افکار اور فلسفیانہ مسائل کو اتنی خوبصورتی اور شاعرانہ نزاکتوں کے ساتھ پیش کیا ہے، کہ ترقی پسند شاعروں کے لئے یہ راہ بڑی حد تک آسان ہو جاتی ہے۔

توفیق احمد

غلام احمد

فاضل اوقات میں ایک دلچسپ مشغلہ یہ بھی ہے کہ مختلف بولروں اور بیٹسمین کی صلاحیتوں کا موازنہ کیا جائے۔ ماہرین کرکٹ کی متفقہ رائے ہے کہ ابھی تک دنیا کا سب سے اچھا بولر سڈنی بارنس ہوا ہے جس نے ۲۹ ٹیسٹ کرکٹ میں ۱۸۹ وکٹ لئے اور ابھی تک یہ دنیا کا ریکارڈ تھا لیکن ۱۳، ۱۴ جون کو انگلستان کے بولر بڈسر نے آسٹریلیا کے خلاف کھیلتے ہوئے اس ریکارڈ کو توڑ دیا لیکن انھوں نے ۴۳ ٹیسٹ اسکو انجام دینے کے لئے لئے۔

دنیا کے ریکارڈوں میں ہندوستان کو کوئی خاص جگہ حاصل نہیں تھی لیکن گزشتہ سال ونوومنکڈ نے ایک نیا عالمی ریکارڈ قائم کیا۔ فاسٹسٹ کرکٹر ڈبلیو ایچ ایچ منکڈ کے بعد اگر فی زمانہ کوئی بولر ہے جس کو ہم ممتاز بولروں کی صف میں جگہ دے سکتے ہیں تو یقیناً وہ غلام احمد ہیں ابھی چند سال پہلے غلام احمد کو شاذ و نادر ہی لوگ جانتے تھے لیکن ۱۹۵۲ء کے دورۂ انگلستان کے بعد تمام دنیا نے ان کی قابلیت (بحیثیت بولر) کا اعتراف کیا جیسا کہ ہم کو معلوم ہے غلام احمد دائیں ہاتھ سے گیند اندازی کرتے ہیں اور آپ دنیا کے چار ماہر آف بریک (Off Break) بولروں میں شمار کئے جاتے ہیں۔ گو کہ ابھی تک باتفاق رائے کوئی فیصلہ نہیں ہو سکا ہے کہ آف بریک زیادہ موثر ہوتا ہے یا لیگ بریک۔ مشہور محقق رابرٹسن گلاسگو اس خیال کی حمایت کرتے ہیں کہ آف بریک زیادہ خطرناک ہوتا ہے۔ بہرحال اس حقیقت سے کوئی منکر نہیں ہو سکتا ہے کہ آف بریک بولر کے بغیر کوئی ٹیم مکمل نہیں ہو سکتی ہے۔ انھیں تمام چیزوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے ۱۹۴۸ء میں غلام احمد کو پہلی بار ٹسٹ میں کھیلنے کے لئے جزائر غرب الہند ٹیم کے خلاف مدعو کیا گیا اور وہ بقیہ تین ٹیسٹ میں ہندوستان کی نمائندگی کرتے رہے اور کامیاب ترین بولر ثابت ہوئے۔ ان کی کامیابی کا اندازہ اس امر سے بخوبی کیا جا سکتا ہے کہ انھوں نے تین ٹیسٹ میں ۱۷ وکٹ لئے خصوصاً تیسرے ٹیسٹ میچ میں ایڈن گارڈنس گراؤنڈ کلکتہ پر انہوں نے چھ وکٹ لئے۔ اس کے بعد دو ٹیمیں دولت مشترکہ کی طرف سے ہندوستان آئیں لیکن افسوس ہے کہ جملہ دس ٹیسٹ میں انہیں ایک میں کھلایا گیا اس کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی گئی اور برصغیر کے ممتاز اخبارات نے ان کے کھلائے جانے کی پُرزور اپیل کی لیکن بورڈ کا یہ اقدام ایک غلط فہمی کا نتیجہ تھا کیونکہ عام خیال یہ تھا کہ وہ صرف ایک "سیٹنگ بولر" ہیں لیکن بعد میں آنے والے واقعات نے اس کو غلط فہمی سے تعبیر کیا اور اب وہ ہندوستانی ٹیم میں مستقل جگہ کے مالک ہیں۔

۱۹۵۱-۵۲ء کی سیاح ایم۔ سی۔ سی ٹیم کے خلاف ان کی دانشمندانہ شمولیت کو پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا گیا۔ کانپور ٹیسٹ میں ان کے جوہر بخوبی روشن کی طرح عیاں ہوئے بہت ہی نازک وقت میں انہوں نے ٹیم کو سہارا دیا اور ۷۰ رن دے کر پانچ وکٹ لئے جملہ ۳۷ اوور پھینکے جس میں ۱۷ میڈن تھے دوسری اننگس میں دس رن پر ایک وکٹ حاصل کیا اس میچ میں ان کی بولنگ ونوومنکڈ سے بھی زیادہ کامیاب رہی پانچویں اور آخری ٹیسٹ میں ہندوستان کو جو پہلی سرکاری فتح حاصل ہوئی اس میں بھی غلام احمد نے کارہائے نمایاں انجام دئے۔ دوسری اننگس میں جب ہر طرح کی امیدیں منقطع ہو چکی تھیں اور رابرٹسن وغیرہ آؤٹ ہوتے نظر نہیں آتے تھے غلام احمد نے کامیاب طریقہ سے بولنگ کی اور ۷۷ رن پر ۴ وکٹ لئے۔

۱۹۵۲ء کے دورۂ انگلستان میں غلام احمد پر منکڈ کی عدم موجودگی کی وجہ سے بھاری ذمہ داریاں عائد ہوئی تھیں جن کو بحسن و خوبی پورا کیا پہلے ہی میچ میں ورسسٹر شائر کے خلاف غلام احمد نے صرف ۱۳ اوور ۲۹ رن دے کر دو وکٹ لئے۔ بارش کی وجہ سے میچ پورا نہ ہو سکا لیکن اس کے اختتام پر رابرٹسن گلاسگو نے پھٹ کر اور غلام احمد کی بہت تعریف

کی اور لکھا کہ دونوں نے بہت شاندار بولنگ کا مظاہرہ کیا خصوصاً مؤخر الذکر نے بہت عمدہ بولنگ کی Length) بالکل صحیح اور Flight) بہت مناسب تھی۔ بولنگ کرنے کا طریقہ اتنا خوبصورت ہے کہ دیکھنے کو جی چاہتا ہے۔

پہلا ٹیسٹ کئی لحاظ سے بہت سنسنی خیز ثابت ہوا اور کھیل کی تقدیر تعجب خیز طریقے پر کروٹ بدلتی رہی پہلے دن جب ہندوستان کی قسمت اپنی رفعت پر تھی انگلستان کی (The Cream of the Batting غلام احمد کے سامنے مضحکہ خیز معلوم ہو رہی تھی۔ ہٹن، سمس اور کاٹن تینوں غلام احمد کے Leg Trap کا شکار ہوئے اور اس وقت تک صرف ۶۲ رُن ہوئے تھے لیکن گرینی اور واٹکنس کی آمد سے کھیل کا رُخ بدلتا نظر آیا لیکن ایک دفعہ پھر غلام احمد نے ان دونوں سے نجات دلائی جبکہ ۶۳ اُوور کئے جس میں ۲۴ میڈن تھے اور ننانوے دے کر پانچ وکٹ لئے ان اعداد و شمار سے اس کی عظمت نہیں ظاہر ہوتی جب تک کہ ہم یہ نہ جانیں کہ یہ لوگ کون تھے اس کی اہمیت اس وقت اور بڑھ جاتی ہے کہ ان کے "شکاروں" میں ہٹن اور کاٹن جیسے شہرۂ آفاق کھلاڑی تھے یہ ہر دو اصحاب کرکٹ کے ان چودہ چیدہ کھلاڑیوں میں سے ہیں جنہوں نے ننانوے سے زاید سنچریاں بنائی ہیں۔ آلف گوور نے لکھا "ہندوستانی بولروں میں غلام احمد ہی ایک ایسا بولر ہے جو انگریز کھلاڑیوں کے لئے ایک معمہ ثابت ہوگا درحقیقت پہلا ٹیسٹ غلام احمد کی شخصی جیت ہے" اس ٹیسٹ میں غلام احمد نے (Sustained Bowling) کا بہترین مظاہرہ کیا۔ پینتالیس منٹ کے علاوہ وہ لگاتار بولنگ کرتے رہے اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ان کی Length) کبھی نہ خراب ہوئی اور نہ ہی (Length) میں کوئی فرق آیا۔ ہم کو تفصیلات میں جانے کی ضرورت نہیں محض اتنا جان لینا کافی ہے کہ پورے ربر میں انھوں نے سب سے زیادہ وکٹ لئے اور پہلی جگہ پائی جملہ ۱۸۵ اوور پھینکے جس میں سے ۵۷ میڈن تھے اور ۳۷ رنز پر ۱۵ وکٹ حاصل کئے۔ دینو مانکڈ کو چوتھی جگہ ملی۔ پورے دورے میں غلام احمد نے ہی ٹاپ کیا جملہ ۸۰ وکٹ لئے ان کی بولنگ کا شاہکار اکسفورڈ یونیورسٹی میں رہا جہاں مجموعی طور پر ۱۳ وکٹ لئے۔ پہلی اننگس میں ۸ وکٹ لئے اور جملہ ۵۵ گیند پھینکے اور اس طرح سے ایک نیا (Endurance Bowling) ریکارڈ قائم کیا۔ برطانیہ کے مشہور اخبارات "ڈیلی ہیرالڈ" اور "مانچسٹر گارڈین" نے بھی سرخیوں میں Staminatip کے عنوان سے ایک مقالہ سپردِ قلم کیا "بے شک اس میچ کی کامیابی غلام احمد کی انتھک کوششوں کی مرہونِ منت ہے"۔ گرد ناٹن (جو ہندوستانی ٹیم کے ساتھ بحیثیت نامہ نگار سفر کر رہے تھے) دورے کے اختتام پر رقمطراز ہیں "اس دورے کی سب سے زیادہ تعجب انگیز چیز یہ ہے کہ بولنگ نسبتاً بہت اچھی ثابت ہوئی برخلاف اس کے بیٹنگ اس درجہ ناقابل اعتبار رہی کہ مانچسٹر ٹیسٹ میں نامور ہندی کھلاڑی ٹرومین کی بولنگ کے سامنے بہت بُری طرح اُڑ رہے تھے۔ چار کھلاڑی آوٹ ہو چکے تھے اور ایک بھی رن نہ ہوا تھا یہ بھی ایک عالمی ریکارڈ ہے۔ غلام احمد سب سے زیادہ کامیاب رہے یہ اعتراف ان کی قابلیت میں ایک اور اضافہ کرتا ہے کہ ان کو (Helping Wickets) نہیں ملیں مقابلتاً بہت کم میچوں میں کھیلے اور اگر ان کو فیلڈروں سے مدد ملی ہوتی تو اتنے ہی قلیل میچوں میں ننانوے سے زیادہ وکٹ لیتے۔ بہت زیادہ میچوں میں اسی وجہ سے بولنگ اوسط میں وہ دوسری جگہ پا سکے۔ پھر بھی یہ کارنامہ فراموش نہیں کیا جا سکتا اور ان کا نام اس کھیل کی تاریخ میں سنہرے حرفوں میں لکھے جانے کے قابل ہے۔

پاکستان کے خلاف دہلی ٹیسٹ میں ہندوستان کو جو کامیابی ہوئی اس میں بھی غلام احمد کا کافی ہاتھ تھا سب سے پہلے ہندوستان کے کھلاڑی جلدی جلدی اوٹ ہو رہے تھے۔ یہاں تک کہ ہزارے بھی ۷۶ رُن بنا کر اوٹ ہو گئے۔ اور ٹوٹل بہت کم تھا۔ جیسے جیسے سورج ڈوبتا جاتا تھا۔ ہندوستان کی قسمت پر بھی بدقسمتی کے بادل چھائے جا رہے تھے لیکن اس دفعہ غلام احمد نے ادھیکاری کے ساتھ ایک بیٹسمین کا رول ادا کیا اور ہمارے وقار کو تعرِ ذلت میں گرنے سے بچا لیا اس آخری پارٹنرشپ نے ۱۰۹ رن بنائے۔ جس میں غلام احمد کا ذاتی حصہ پچاس کا تھا۔ یہ ۱۰۹ کا سکور ایک بین الاقوامی ریکارڈ ہے۔ دوسری اننگس میں جب پاکستانی مایۂ ناز کھلاڑی امتیاز احمد نے کھیلنا شروع کیا تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بمبئی پھر اپنی تاریخ دہرائیگی اور امتیاز ۳۰۰ رن بنائے گا۔ ایسے پُرآشوب وقت میں غلام احمد نے

مانکڈ کی بہت مدد کی اور شاندار بولنگ کا مظاہرہ کرتے ہوئے امتیاز کو اول - بی - ڈبلیو لے لیا - جملہ ۲۳ اوور پھینکے - ۷ میڈن تھے جس میں ۳۵ رن پر ۴ وکٹ لئے یہ سچ ہے کہ چاند اپنی تمام دلفریبیوں کے باوجود سورج کی روشنی میں معدوم ہوجاتا ہے بعینہٖ یہی حال غلام احمد کا ہوا - وینو مانکڈ کی موجودگی نے ہمیشہ ان کو پس پشت ڈال دیا - مجموعی طور پر آپ نے ۱۴ ٹیسٹ میں ۴۴ وکٹ لئے - اس سے بڑھ کر آپ کے پایے کے بولر ہونے کا اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے کہ نواب پاٹودی جیسے قیافہ شناس نے یہ پیشین گوئی کی تھی کہ اگر ۱۹۴۶ کی ٹیم میں ان کو لیا گیا تو وہ ۱۵۰ وکٹ لیں گے - اعداد و شمار کا تجزیہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ غلام احمد اپنی طرز کے بہترین کھلاڑی ہیں - اب تک تمام بولروں میں محمد نثار کے بعد ٹیسٹ میچوں میں غلام احمد کا نمبر آتا ہے - محمد نثار نے ۲۹ وکٹ لئے اور غلام احمد نے ۴۴ وکٹ لئے - ان کے پورے اعداد و شمار یہ ہیں :- ۵۸۷ اوور ۱۶۲ میڈن ۱۲۷۸ رن ۴۴ وکٹ اوسط ۲۹ رن ہر ایک وکٹ - نمبروں کے لحاظ سے مانکڈ سب پر سبقت لے جاتے ہیں لیکن ہم کو یہ نہیں بھولنا چاہئے کہ غلام احمد صرف ۱۴ ٹیسٹ میں کھیلے ہیں ۱۳ سال سے رانجی ٹرافی میں جید آباد سے کھیل رہے ہیں اور ۴۰ وکٹ لے چکے ہیں ان کی بولنگ کا شاہکار مدراس کے خلاف ۱۹۴۵ء میں رہا جب انہوں نے ۹ وکٹ صرف ۵۳ رن پر حاصل کئے - جزائر غرب الہند کے خلاف ناگپور میں ۸ وکٹ لئے - ۴ دفعہ انھوں نے ایک سیزن میں سنچری سے زاید وکٹ لئے - بڑودہ کے خلاف ۱۹۴۸ء میں ان کی تاریخی بولنگ ۸ وکٹ میں ظاہر ہوئی -

غلام احمد کے اندر وہ تینوں چیزیں پائی جاتی ہیں جو ایک Spin Bowler) کے لئے اشد ضروری ہیں یعنی Spin & Accuracy Length زمانہ طالب علمی ہی سے غلام احمد ایک بیٹسمین کی حیثیت سے داخل ہوئے اور معین الدولہ کرکٹ ٹورنامنٹ میں عثمانیہ یونیورسٹی کو جو شکست فاش ہوئی اس میں ان کی بیٹنگ بھی ایک خاص وجہ تھی تکمیل تعلیم کے بعد راشٹرنگ ٹیم کی طرف سے حمید الدین احمد کی قیادت میں اگر ایک طرف آپ نے طفیل احمد کی خاص مدد کی تو دوسری طرف بیٹنگ میں حسام الدین دستگیر کے ہم پلہ رہے عثمانیہ کے خلاف ایک دفعہ انھوں نے ۱۶۱ رن بنائے جس میں چھ چھکے شامل تھے ان کی بیٹنگ دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے - بہت آرام سے بغیر کسی پریشانی کے ساتھ کھیلتے ہیں اور عموماً چھکے چوکے سے کم بات نہیں کرتے انگلستان اور سامرسٹ کے کھلاڑی ہرالڈ گیملٹ نے دنیا میں سب سے زیادہ چھکے مارے ہیں یعنی ۴۳۴ لیکن ایک میچ میں سب سے زیادہ چھکے مارنے کا سہرا غلام احمد کے سر ہے انھوں نے اس واقعے کو دلچسپ طریقے پر (Sports Pastime) میں خود لکھا ہے ایک مقامی میچ میں کھیلتے ہوئے انھوں نے ۱۲ چھکے مارے جس میں ۵ لگاتار تھے جب میچ ختم ہوگیا تو ایک لڑکے نے انھیں ایک کارڈ پیش کیا جس میں دکھایا تھا کہ دس کھلاڑی میدان کے باہر کھڑے ہیں (بشمولیت وکٹ کیپر) اور بولر بھی گیند پھینکنے کے بعد اپنے ساتھیوں کی طرف دوڑ رہا ہے اور وہ سب بہ یک آواز چلا رہے ہیں " خدا کے لئے آؤٹ ہو جاؤ " ان کا سب سے زیادہ اسکور غالباً ۲۲۰ کا ہے - انھوں نے بہت آڑے وقتوں میں اپنی ٹیم کی مدد کی ہے - اسٹیٹ ریلوے کے خلاف راشٹرنگ ٹیم کے ٹوٹل ۱۵۷ میں غلام احمد نے ۷۶ رن بنائے جو کلچرڈ اسٹروکس سے بھرپور تھے اس کو دیکھنے کے بعد معلوم ہوتا تھا کہ اگر وہ چاہیں تو کتنا عمدہ کھیل سکتے ہیں - دسمبر ۱۹۵۱ء میں رانجی ٹرافی میں میسور، حیدرآباد کے مابین جو میچ کھیلا گیا اس میں صرف غلام احمد ہی چل سکے اور ۵۶ رن بنائے جب کہ حیدرآباد کا ٹوٹل ۱۲۶ کا تھا - بڑے افسوس کی بات ہے کہ بیٹنگ کی طرف ان کی کوئی خاص توجہ مبذول نہیں ہے اور گذشتہ سالوں میں انھوں نے کوئی اچھا اسکور نہیں کیا لیکن اس کی ایک خاص وجہ غالباً یہی ہے کہ وہ صبر کا دامن بہت جلدی چھوڑ دیتے ہیں اور اننگس کے بالکل ابتدائی عرصے ہی میں چھکا و چوکا مارنا چاہتے ہیں لیکن جلد بازی کی قیمت بہت مہنگی ادا کرنی پڑتی ہے - دوسری خاص خبر یہ ہے کہ فضل محمود کی طرح غلام احمد نے اپنی بیٹنگ کی صلاحیت کو ہمیشہ نظر انداز کیا درحقیقت وہ ایک اچھے (Stroke Player) ہیں لیکن (Aggressive) قسم کے اور اس قسم کے لوگ چارلی میکارٹنی کے مطابق زیادہ خطرناک ہوتے ہیں - دولت مشترکہ کی ٹیم کے خلاف حیدرآباد میں انھوں نے ۴ وکٹ لینے کے بعد ۳۸ رن بنائے یہ میچ جارج

ڈکورتھ نے بڑی تعریف کی۔

یہ امر باعثِ خوشی ہے کہ اب وہ بیٹنگ میں بہت کافی ترقی کر چکے ہیں اور اس خیال کی حقیقت دہلی میں بخوبی ظاہر ہوئی جہاں انھوں نے ۵۰ رن بناتے ہوتے ایک نئے باب کا اضافہ کیا ان کی اس ترقی کے آثار انگلستان کے آخری میچوں میں ظاہر ہونا شروع ہو گئے تھے اور انھوں نے کافی اچھے اسکور کیے جیسے ۳۰ رن د ۲۷ رن، اسکاربارو میں پاکستان کے خلاف انھوں نے حیدرآباد میں ۲۷ رن بنائے اور آوٹ نہیں ہوتے ان کو یہ بھی فخر حاصل ہے کہ دو سیزن میں ایک ہزار رن بنائے۔ اتنا کچھ جان لینے کے بعد یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان کے متعلق کچھ اور جانا جائے۔

غلام احمد حیدرآباد میں ۱۵ جولائی ۱۹۲۲ء کو ایک معزز خاندان میں پیدا ہوئے۔ جاگیردار کالج نظام کالج میں تعلیم حاصل کی۔ حصولِ علم کے بعد راشٹرنگ میں اعلیٰ خدمات پر معمور رہے۔ سال گزشتہ ان کی خدمات کو ملحوظ رکھتے ہوئے ان کو نہ صرف حیدرآبادی ٹیم کا کپتان مقرر کیا گیا۔ بلکہ ساؤتھ زون کے کپتان بھی مقرر کیے گئے۔ آج کل آپ صدر المہام۔ تعمیراتِ عامہ۔ زین یار جنگ صاحب کے پی۔ اے ہیں اور دکن بلوز سے کھیلتے ہیں ابھی پارچ میں ان کی شادی وظیفہ یاب ممبر بورڈ آف مال غوث محی الدین کی دخترِ نیک اختر فاطمہ سے ہوئی ہے۔ جنوری ۱۹۵۳ء میں جزائر غرب الہند میں جو ٹیم گئی اس میں آپ کا بھی چناؤ عمل میں آیا لیکن اپنے چچا کی ناسازیٔ طبع کی وجہ سے نہ جا سکے۔

تتمہ۔ یہ مضمون موصول ہونے کے بعد غلام احمد نے مزید جوہر دکھائے ہیں دولتِ مشترکہ کی ٹیم کے خلاف مدراس میں ہونے والے چوتھے ٹیسٹ کے آپ کیپٹن بنائے گئے۔ یہ ٹیسٹ میچ ہندوستانی ٹیم نے جیت لیا۔ کرکٹ کے مبصروں کا یہ قول ہے کہ یہ میچ غلام احمد کی ذاتی فتح ہے۔ آپ نے دونوں اننگز میں ملا کر ۹۳ رنز کے خلاف ۱۲ وکٹ لئے (ادارہ)

مویشیوں سے متعلق معلومات

۱۔ ہندوستان کے مختلف حصوں میں اس وقت ۳۰ ہزار گئو شالائیں اور پنجرہ پول قائم ہیں۔ جن میں ۷ کروڑ روپیہ سالانہ کے خرچ سے ۶ لاکھ مویشیوں کی پرورش ہوتی ہے۔ مرکزی سرکار نے ان اداروں کی ازسرِ نو تنظیم اور ترقی کے لئے اسکیمیں مرتب کی ہیں۔

۲۔ پنج سالہ پلان کی "پنج سالہ اسکیم" کے تحت ۰۰ ۶ "کلیدی گاؤں" اور مویشیوں کی مصنوعی افزائشِ نسل کے ۱۵۰ مرکز قائم کئے جائیں گے۔ جن پر تین کروڑ روپیہ مرکزی حکومت اور تقریباً اتنی ہی رقم ریاستی حکومتیں خرچ کریں گی۔

۳۔ اس وقت تک ۴۳۰ "کلیدی گاؤں" اور ۱۰۹ مویشیوں کی مصنوعی افزائشِ نسل کے مراکز ملک میں قائم کئے جا چکے ہیں۔

۴۔ پنج سالہ پلان کی مدت میں ناکارہ مویشیوں کی پرورش کے لئے ۱۶۰ گوسدن قائم کرنے کی تجویز ہے۔ جن پر ۹۷ لاکھ ۱۵ ہزار روپیہ مرکزی حکومت اور تقریباً اتنی ہی رقم ریاستی حکومتیں خرچ کریں گی۔

۵۔ حکومتِ ہند نے کرنال، عزت نگر اور بنگلور میں تین مراکز کھولے ہوئے ہیں جن میں مویشیوں کی افزائشِ نسل کے لئے عمدہ قسم کے بیل رکھے گئے ہیں۔

۶۔ مرکزی حکومت عمدہ نسل کے ۷۵۰ بیل ہر سال ریاستوں میں تقسیم کرتی ہے۔ تاکہ ان سے دودھ نہ دینے والے اور دودھارو دونوں قسم کے مویشیوں کی حالت سدھاری جا سکے۔

۷۔ اس وقت ملک میں مویشیوں کے دو ہزار ہسپتال ہیں۔ جن میں بیمار مویشیوں کا علاج ہوتا ہے۔



ہز ایکسی لنسی جواہر لال نہرو اور مسز پنڈت ۱۱ جنوری ۱۹۵۴ء کو دہلی پالم ایئرپورٹ پر پردھان منتری اندرا گاندھی ان کا استقبال کر رہے ہیں

راشٹرپتی آچاریہ آدیناراین جیدرآباد میں گاندھی ہاسپٹل کے نرسنگ ہوم کا معائنہ فرما رہے ہیں



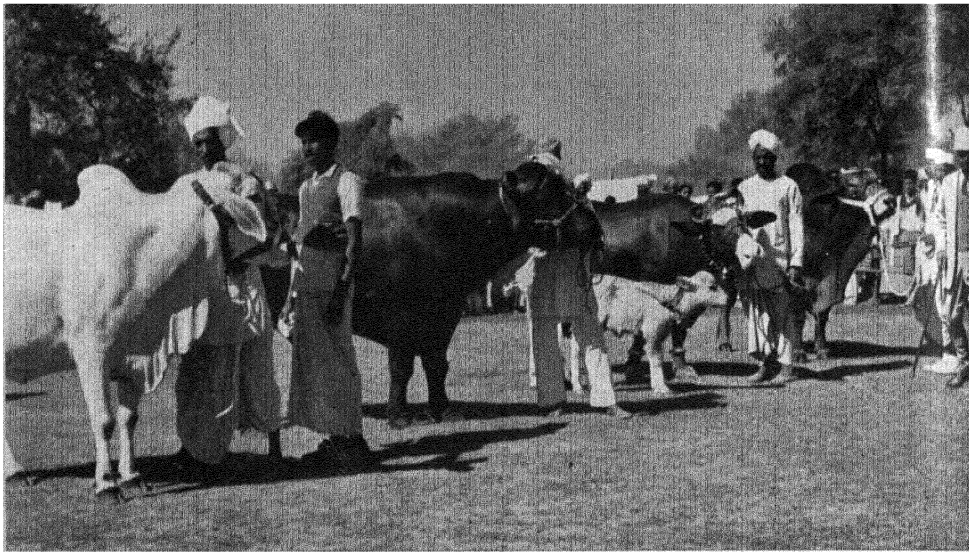
کاروا عم

دهلي اسٹ
مرکزي مد
تعليم کے
ديهاتيوں کو
معلوماتي تعلي
ديلے کے لئے مب
گاڑيوں کا ايک قا
ايک جگه
دوسري جگه جا
هے ديهاتي اس
قافلے سے
دلچسپي کا اظه
کرتے هيں - تصو
ميں ايک گا
والے مجھوروں
نمونے ديکھ رهے هي

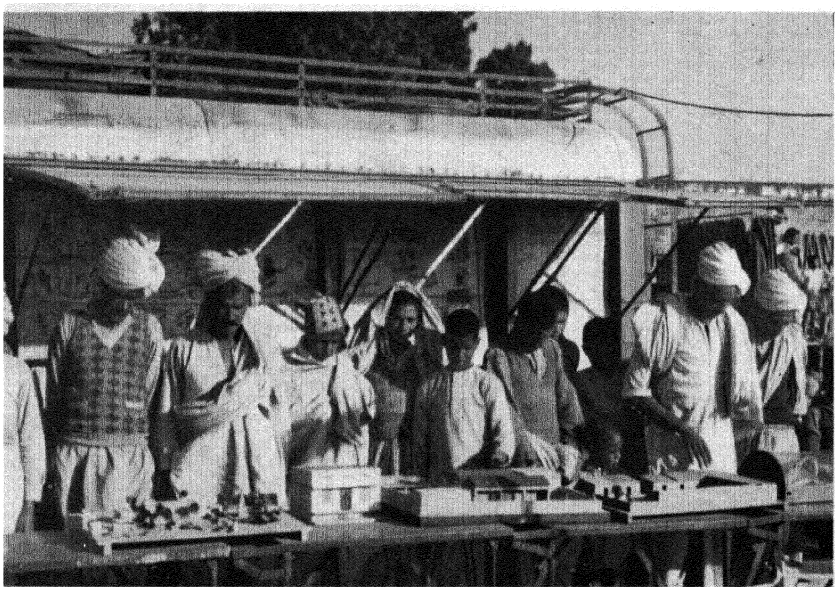


کرنال میں بچھڑوں کي نمائش



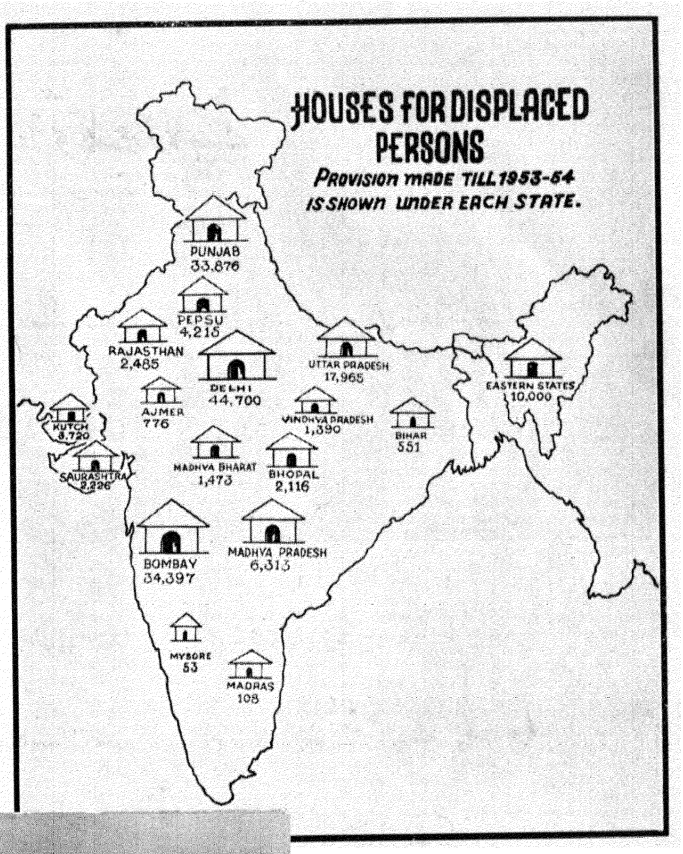


مویشیوں کي آل انڈیا نمائش میں انعام حاصل کرنے والے مویشیوں کے نمونے

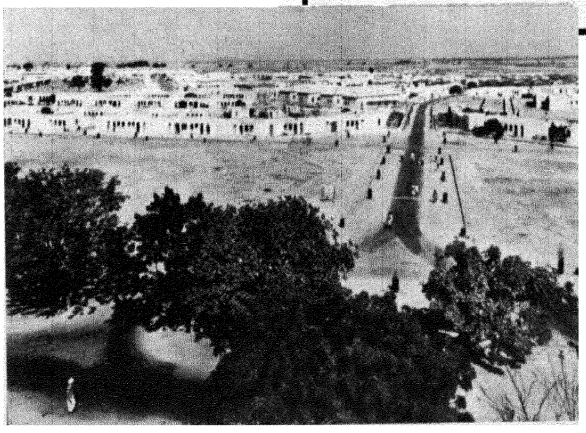


کاروان علم

ں والے دھلي کے
یب ایک گاؤں
یں منعقدہ
لیمي نمائش کے
ال دیکھ رہے
یں موٹر گاڑیوں
چلاي پھرتي
تماش ایک
ں دوسرے
ں م قافلے کي
ورت ں منتقل
کي ني ہے



مغربي پاکستان سے آئے ہوئے چوبیس لاکھ ستر ہزار بے گھر لوگوں کو نوتعمیر مکانوں یا پاکستان جانے والوں کے خالي گھروں میں بسایا جا چکا ہے - اِس نقشے میں ہر ریاست میں نوتعمیر مکانوں کے اعداد و شمار دیئے گئے ہیں



نجف گڑھ روڈ دہلي پر بےگھر لوگوں کے لئے نوتعمیر بستي "تلک نگر"

حکومت ہند نے بے گھر لوگوں کے لئے مکانات کي تعمیر پر ماہ مارچ ۱۹۵۳ء تک ۶۱ کروڑ باون ہزار روپیہ صرف کیا ہے - ۱۹۵۳-۵۴ء میں مزید دس کروڑ پچاس لاکھ روپیہ اِس مقصد کے لئے وقف کیا گیا ہے

جگن ناتھ آزاد

زتو گامے زما چشمے

دہلی کے انڈو پاکستان مشاعرے میں پاکستانی شعراء کے اعزاز میں پڑھی گئی

مری بزمِ طرب میں سوزِ پنہاں لے کے آئے ہو
چمن میں یادِ ایّامِ بہاراں لے کے آئے ہو

اُسی درماں کو میرا دردِ پنہانی ترستا ہے
تم اپنے دل کے پردوں میں جو درماں لے کے آئے ہو

خبر کردی ہے میں نے تشنہ کامانِ محبّت کو
مئے دردِ محبّت کے خُمستاں لے کے آئے ہو

دیارِ ہند میں نغموں کا اک طوفان برسا دو
کہ تُم سینوں میں ابرِ نوبہاراں لے کے آئے ہو

دیارِ میر میں اقبال و وارث شاہ کے گھر سے
نسیم و رنگ و کیف و شبنمستاں لے کے آئے ہو

جہاں غالب کے نغمے پرفشاں ہیں اُس گلستاں میں
بھٹائی اور خٹک کی فکرِ تاباں لے کے آئے ہو

سلامِ شاعرانِ کشورِ ہندوستاں تُم پر
کہ تم نغمات کی جنسِ فراواں لے کے آئے ہو

تمھارے ساتھ اِک گزرا زمانہ لوٹ آیا ہے
محبّت کا گراں مایہ خزانہ لوٹ آیا ہے

کوثر چاندپوری

ماتا رام

بھرا ہوا سُرخ و سفید چہرہ، اُبھرے ہوئے گال، اور اُن پر اَن گنت جُھریاں، بڑی بڑی نیلگوں آنکھیں اور پتلے ہونٹ، یہ تھی ماتا رام کی شکل و شباہت، میں نے انھیں اس زمانے میں دیکھا تھا جب میں سوہن کے ساتھ چھٹیوں میں اس کے گاؤں گیا تھا۔ انھیں دیکھتے ہی مجھے ملکہ وکٹوریہ کی وہ تصویر یاد آگئی جو بارہا اسکول کی کتابوں میں نظر پڑی تھی، وہی رعب دار چہرہ، ویسی ہی چمکتی ہوئی آنکھیں، فرق یہ تھا کہ ماتا رام کی آنکھوں میں جلال سے زیادہ محبت تھی، جب وہ غور سے کسی کو دیکھتیں ایسا معلوم ہوتا کہ پریم کا نور فوّارے کی مانند ان سے اُبل رہا ہے۔ جب میں نے انھیں پرنام کیا۔ ان آنکھوں کے نیلے پردوں میں ایک جنبش سی ہوئی اور گالوں کی جُھریاں سمندر کی لہروں کی طرح آگے پیچھے دوڑتی دکھائی دیں انھوں نے اپنا ٹھنڈا ہاتھ میرے سر پر رکھ دیا اس کی ٹھنڈک سے میرے شعور میں ٹھنڈک سی بھر گئی، جیسے اس ہاتھ کی کپکپاہٹ نے دماغ سے سارے تکلیف دہ خیالات اور افکار چوس لیے ہوں ——— ماں کی دائمی جدائی کا خیال، باپ کے مرنے کی اذیت اور پھر چچا کی سختیوں کا تصوّر، ایک دم ذہن سلگتے ہوئے سیکڑوں انگارے بجھ گئے، میں بھول گیا کہ اگلے مہینے کالج کی فیس کیونکر ادا ہوگی، ہوسٹل کا قرض کیسے دے سکوں گا، ماتا رام کے محبت بھرے اس ہاتھ نے مجھے کسی ایسی دنیا میں پہنچا دیا جہاں رنج و الم نہ ہوں معاشی اُلجھنیں نہ ہوں بس اطمینان اور سکون ہی کی ایک پھیلی ہوئی مسرت بخش فضا ہو۔

کیا نام ہے تمھارا؟

گیندا رام! ———

کس کے لڑکے ہو؟

پٹواری تھے گاؤں میں میرے باپ!

تھے، اب نہیں ہیں؟

کئی برس ہوئے ان کا دیہانت ہو گیا۔

اور ماتا کہاں ہیں تمھاری؟

میری چھاتی میں ایک ہوک سی اُٹھی جی چاہا زور سے چیخ مار کر رو پڑوں، سامنے سوہن کھڑا تھا وہ خاکی قمیص پر ویسا ہی نیکر پہنے تھا اور سر میں آڑی مانگ نکلی ہوئی تھی۔ مانگ میں بہت سی دھول بھر گئی تھی۔ مجھے ماتا رام کے سامنے اس انداز سے کھڑا وہ بہت ہی اچھا لگ رہا تھا۔ میں اس کی خوش قسمتی پر رشک کرنے لگا سوہن کو دیکھ کر میری کچھ ڈھارس بندھی، چھاتی میں کھولتی جوالا ٹھنڈی ہو گئی۔

ان کا بھی ..... میری زبان میں لکنت آگئی میں نے دیکھا ماتا رام کی نیلی آنکھوں میں آنسو لہرانے لگے ان کے گالوں کی جُھریوں میں موتی سے اٹک کر رہ گئے۔ انھوں نے مجھے گود میں بھینچ لیا تب میں چیخ مار کر رو پڑا، میں سمجھتا ہوں اس وقت وہ چیخ میرے سینے میں اُلجھ کر رہ جاتی تو میرا سارا بدن پھنک جاتا۔ سوہن مجھے روتے دیکھ کر بہت حیران ہوا، اسے پتہ نہیں تھا کہ ماتا رام کی سوکھی ہوئی چھاتیوں میں میرے لئے بھی ممتا کی لہریں اُٹھنے لگی تھیں میں نے ان میں دودھ کی دہی سنسناہٹ سُن لی تھی جسے میں اپنی سگی ماں کی چھاتی میں سننے کا عادی تھا۔ ماتا رام نے اب تک سوہن سے بات تک نہ کی تھی وہ مجھے ہی سوہن سمجھ بیٹھی تھیں شاید ذرا دیر بعد وہ سوہن کی طرف مخاطب ہوئیں۔

کس کی اجازت سے آئے ہوئے سوہن؟ ——— اب ان کے لہجے میں حاکمانہ وقار تھا ضابطے اور ڈسپلن کی دبی سختی تھی جو ایک سپاہی کی آواز میں ہوتی ہے۔ سوہن سٹ پٹا گیا، ماتا رام کے گالوں کی سفیدی میں سُرخی پھوٹ پڑی ایک دم ایسا معلوم ہوا جیسے وادی میں ڈھاک کے پھول کھل گئے ہوں۔

پرنسپل چھٹی پر گئے ہیں ماتا رام!

ان کی جگہ کون تھا؟

میں نے اپنے پروفیسر سے پوچھ لیا تھا! — سوہن نے فُل بُوٹ کی ایڑیاں زمین سے اُٹھا کر کہا' ماتا رام کو اس کی اس گھبراہٹ پر ترس آگیا اور اسی دم گاؤں کی سُرخی غائب ہوگئی' ڈھاک کے کھلے ہوئے پھول بھی پہاڑ کی اوٹ میں جا چھپے۔

اچھا تم لوگ مُنہ ہاتھ دھوڈالو میں تمھارے لئے کھانا لاتی ہوں۔

سوہن کا گھر گاؤں میں تھا مگر میں تعجب کر رہا تھا کہ شہر کا سارا تمدن اس میں بند تھا گھر کی ہر چیز کو دیکھ کر مجھے ماتا رام کے انتظام اور ان کی قابلیت کی داد دینی پڑ رہی تھی' ہاتھ روم بہت صاف ستھرا تھا' بالٹی میں نہایت شفاف پانی بھرا رکھا تھا کھونٹی پر نیلے حاشیے کی تولیا ٹنگی تھی میں ہاتھ مُنہ دھو کر نکلا تو سوہن مجھے کھانے کے کمرے میں لے گیا وہاں میز کے چاروں طرف کرسیاں پڑی تھیں' ایک الماری میں چینی کے برتن چُنے ہوئے تھے کواڑوں پر جالی لگی تھی' کھانا ہمارے پہنچنے سے پہلے ہی چُن دیا گیا تھا' سوہن نے کھانے پر مجھ سے ماتا رام کے متعلق بہت سی باتیں کیں اس نے کہا کہ وہ شہر کے ایک بہت بڑے خاندان کی بیٹی ہیں' انہوں نے اسکول میں پڑھا بھی ہے وہ وقت اور ڈسپلن کی بہت پابند ہیں۔ اپنے اصول کا بہت خیال رکھتی ہیں گاؤں والوں سے بالکل اپنا پن برتتی ہیں۔ ایک مرتبہ اس کے پتا جی بہت گھبرائے ہوئے باہر سے آئے وہ رسوئی گھر میں بیٹھی کھانا بنا رہی تھیں۔ زمیندار وہیں چلے گئے' اور جلدی سے کھانا طلب کیا۔

ابھی کھانے کا وقت نہیں ہوا —— بارہ نہیں بجے

میں شہر جا رہا ہوں ایک ضروری کام ہے!

کھانا کھا کر ہی جائیے گا۔ ذرا دیر اور ٹھہریئے۔

ٹھہرنے میں لاری نکل جائے گی۔

کیا وقت ہے لاری کا؟

سوا بارہ بجے روانہ ہو جاتی ہے

اور لاری چلی گئی تو کیا ہوگا؟

مقدمہ بگڑ جائے گا

اور بے وقت کھانے سے تندرستی خراب ہوگئی تو؟

پتا جی لاجواب ہوگئے۔ اور کھانے کے لئے انھیں بارہ بجے کا انتظار کرنا پڑا۔

گیندا۔ ماتا رام بہت عجیب عورت ہیں۔ ان کا کردار اُن بھلائیوں سے ملتا جُلتا ہے جن کا ذکر میں نے تاریخ کی کتابوں میں پڑھا ہے۔ سوہن نے گرم گرم پراٹھے کا نوالہ مُنہ میں رکھتے ہوئے کہا۔ میں تمھیں ایک حیرت انگیز واقعہ سُناتا ہوں۔

میرے ماما دلیپ سنگھ یعنی ماتا رام کے چھوٹے بھائی مانک پور میں اسٹیشن ماسٹر تھے۔ ماتا رام انھیں سب بہن بھائیوں سے زیادہ چاہتی تھیں' انہوں نے کچھ خراب آدمیوں کے کہنے سے مال گاڑی میں چوری کرادی ہزاروں روپے کا سامان نالا توڑ کر نکال لیا گیا' یہ واقعہ چھُپ نہ سکا۔ سازش کھل گئی اور ایک ساتھی نے دلیپ ماما کا نام بھی لے دیا وہ گرفتار ہونے سے پہلے ہی بھاگ کھڑے ہوئے۔ بڑی مشکل سے چھپتے چھپاتے رات کے بارہ بجے ہمارے گھر آئے۔ ماتا رام انھیں دیکھ کر گھبرا گئیں وہ کسی کا بھی اطلاع دئے بغیر اپنے یہاں آنا پسند نہ کرتی تھیں اور ان کی اس عادت سے سب ہی واقف تھے۔ رشتہ داروں اور جان پہچان والوں میں کوئی بھی ایسا نہ تھا جو اس بات کا لحاظ نہ رکھتا ہو۔

خیریت ہے' بغیر خبر دئے کیوں آگئے دلیپ؟

بہن کے مُنہ سے یہ بات سُنتے ہی بھائی کا حوصلہ ٹوٹ گیا وہ گاؤں کے آس پاس کے گھنے جنگل میں چھپنے کا جو تصور لے کر آئے تھے وہ دُھندلا ہوگیا۔ جیسے سفید کاغذ پر چمکتے ہوئے حروف پر کسی نے سیاہی ڈال دی ہو انھوں نے پورا قصہ سچ سچ بیان کر دیا۔ آخر میں وہ بولے۔

جی جی دن نکلنے سے پہلے مجھے کہیں چھپا دو مجھے ڈر ہے پولیس میرے پیچھے نہ آرہی ہو۔

ماتا رام کے گالوں کی جھُریاں گہری ہوگئیں ان کی نیلی آنکھوں میں نفرت جھلکنے لگی' وہ دلیپ کو نہایت حقارت سے دیکھ رہی تھیں جیسے ان کا دلیپ سے کوئی رشتہ ہی نہ ہو' وہ ان کا ماں جایا نہ ہو کوئی بہت

بڑا دشمن ہو ـــــ ان کے ذہن میں دلیپ کے چھپنے کی بہت سی جگہیں تھیں - مہاراج والی کھو ـــــ بہت سے گہرے غار ـــــ ایک پرانی سمادھی جس کے نیچے دُور تک ایک اندھیری سرنگ چلی گئی تھی اور ان کے پتی نے اسی اندھیری سُرنگ میں اپنے ایک دوست کو سال بھر تک چھپائے رکھا تھا - وہ قتل کا ملزم تھا - زمیندار روز ہی ماتا رام سے ان کے لئے کھانا پکوا کر لے جاتے تھے - لیکن وہ دلیپ کو ان میں سے کسی بھی جگہ چھپانے کو تیار نہ تھیں -

دلیپ - اُنھوں نے کچھ سوچ کر بڑی سنجیدگی سے کہا تھیں چھپا دینا بہت آسان ہے، پولیس سے بچا لینا بھی مشکل نہیں - مگر میں پرماتما سے نہیں بچا سکوں گی تھیں ! !

ایک بارگی دلیپ ماما کی آنکھیں ماتا رام کی طرف اُٹھ گئیں - ان کی گہری نیلی آنکھوں سے نفرت کا غبار چھٹ گیا تھا اس کی جگہ بہت سے سوالات ناچتے محسوس ہو رہے تھے -

بات یہ ہے دلیپ وہ یوں تم اپنے جُرم کا اقبال کر رہے ہو میرے نزدیک تمھیں اپنے آپ کو قانون کے حوالے کر دینا چاہیئے ـــــ دلیپ میں تمھیں پناہ نہیں دے سکتی - تم نے مال گاڑی کا ڈبہ نہیں کھولا میری اور اپنی ماتا کا پیٹ چاک کیا ہے - تم نے ان کی کوکھ میں چاقو مارا ہے اور اس کی تیز دھار سے وہ نائی کٹ گئی ہے جس نے میرے اور تمہارے پیٹ میں نو مہینے تک خون کی دھاریں ٹپکائی ہیں ـــــ دیش کو بھی تو ہم ماتا کہہ کر ہی پکارتے ہیں ـــــ بھارت ماتا، اور مال گاڑی کا ڈبہ اس دیش ہی کی ایک امانت تھی، آخر تو سمجھ لو اسے بھارت ماتا کی اسی سے وہ اپنے ہزاروں لاکھوں بچوں کے پیٹ میں لہو کے دھارے انڈیلتی ہے تم نے دیش کی امانت میں خیانت کی ہے - دلیپ تم میرے بھائی نہیں ہو، دشمن ہو تم نے میری ماں کا شریر گھائل کیا ہے ! دلیپ آہستہ آہستہ اندر سے بدلتے جا رہے تھے - ان کی آنکھوں کے آگے پھیلا ہوا چھٹتا جا رہا تھا، اور پھر دفعتہً جیسے اس کہرے کی چھاتی پھاڑ کر بجلی چمک اٹھی ہو - دلیپ کا ضمیر جاگ پڑا - اُن کے من کا سارا میل صاف ہو گیا اور آتما میں ستارے جھلملانے لگے وہ گہری نیند سے بیدار ہو گئے -

سچ کہتی ہو جی جی ـــــ بالکل سچ کہتی ہو میں پاپی ہوں، مجرم ہوں میں پولیس سے بھاگ سکتا ہوں، پرماتما سے نہیں بھاگ سکتا اب میں اپنے آپ کو پولیس کے حوالے کر دونگا -

یہ باتیں سُن کر میرا دل آپ ہی آپ ماتا رام کے چرنوں میں جُھک گیا، وہ دیوی کے روپ میں میرے آگے آ کھڑی ہوئیں ـــــ ان کا گداز اور بھاری بدن دودھ کی طرح سفید ساری میں لپٹا کتنا بھلا معلوم ہوتا تھا ـــــ بالکل اجنتا کا کوئی مقدس مجسمہ، اور جب بالوں کے لچھے اُن کے چہرے پر بکھر جاتے تو یوں لگتا جیسے سورج کو دھوئے بادلوں نے دو طرف سے گھیر لیا ہو - میرا دل برابر ان کے چرنوں میں جُھکتا گیا - سوہن کا باپ کبھی کا مر چکا تھا اور اب تو زمیندارہ بھی چھن گیا تھا مگر ماتا رام کا گاؤں بھر پر ویسا ہی اثر تھا، جوان، بوڑھے اور بچے سب ان کا ادب کرتے تھے - وہ اس گاؤں میں مندر کی دیوی معلوم ہوتی تھیں ماتا رام کو مجھ سے وہی پریم ہو گیا جو سوہن سے تھا - چلتے وقت انھوں نے ہم دونوں کو سو روپے کا ایک ایک نوٹ دیا - میں نے کئی بار سو روپے کا نوٹ دیکھا تھا اور اسے حاصل کرنے کی اُمنگ بھی میرے من میں پیدا ہوئی تھی مگر ہر مرتبہ وقت نے اس کا گلا گھونٹ دیا تھا اور اب چند دن سے وہ بالکل ہی مر چکی تھی، ماتا رام ہی نے اسے زندہ کیا، اسی روپے سے میں نے کالج کے سارے مطالبات ادا کر دئے -

سوہن کا اور میرا ساتھ زیادہ دنوں تک نہیں رہا کالج سے نکل کر ہم دونوں ایک دوسرے سے جدا ہو گئے - مگر ماتا رام کا ٹھنڈا ہاتھ ہر وقت میرے سر پر رکھا رہتا تھا میں سمجھتا تھا انھوں نے مجھے بہت بڑے چھتر میں چھپا رکھا ہے -

سوہن نوکری کی تلاش میں شہر آیا تو کلکٹری کے دفتر میں اچانک میری اور اس کی ملاقات ہو گئی - اس نے تحصیلداری کے لئے درخواست دے رکھی تھی اور میں وہیں آفس سپرنٹنڈنٹ تھا - میں نے سب سے پہلے ماتا رام کی خیریت پوچھی اس نے کہا وہ بیمار ہیں بہت کمزور ہو گئی ہیں - مجھے یہ سُن کر بہت دُکھ ہوا زندگی میں دوسری بار میرا جی چاہا کہ زور سے چیخ مار کر رو پڑوں - چھاتی میں آنسوؤں کا طوفان اُمنڈنے لگا - تھوڑے ہی دنوں میں سوہن کو تحصیلداری

کی جگہ مل گئی اور وہ پروہیشنر کی حیثیت سے آفس ہی میں کام کرنے لگا۔ تب میں اس کے ساتھ ایک مرتبہ اور ماتا رام کو دیکھنے گاؤں گیا۔ جب ہم پہاڑوں سے گھرے ہوئے ایک خوبصورت گاؤں کی وادی میں پہنچے تو پچھم میں پہاڑ کی چوٹی پر سفید بادل جمع کھڑے تھے اور اونچے درخت اپنی پھلنگوں سے بادلوں کی سفید پیشانی چومنے کی کوشش کر رہے تھے۔ روئی کی مانند پھولے ہوئے بادل میں مجھے ماتا رام مسکراتی دکھائی دیں۔ نیچے وادی میں جگہ جگہ ہری جھاڑیاں اس طرح بکھری ہوئی تھیں جیسے میز پر ہرے رنگ کا ٹیبل کلاتھ ڈال کر کسی نے بہت سے گل دستے جما دئے ہوں۔ میں بڑے دروازے سے گزر کر جلدی سے اندر پہنچ گیا۔ اور فوراً ماتا رام کے چرنوں میں جھک گیا۔ وہ بدستور سفید ساری میں لپٹی ہوئی تھیں، ان کا بدن سچ مچ سنگِ مرمر کا مجسمہ نظر آ رہا تھا۔ بال قطعی دودھیا ہو گئے تھے، گالوں کی جھریاں اور موٹی ہو گئی تھیں۔ مگر نیلگوں آنکھوں میں وہی چمک دمک تھی۔ ان کے سر کی کناروں پر روشنی کی کرنیں جگمگا رہی تھیں۔ انھوں نے اپنا وہی ٹھنڈا ہاتھ میرے سر پر رکھ دیا۔ میں سوچنے لگا کہ میں پہاڑ کے پیڑوں سے اونچا ہو گیا ہوں اور میرا سر آسمان پر جمے ہوئے سفید بادلوں کو چھونے لگا ہے، وہ فرشتوں کے پیروں سے لمس ہو رہا ہے۔ ستاروں کی پیشانی چوم رہا ہے۔ باہر گاؤں والوں کی بھیڑ لگی تھی۔ وہ سب ماتا رام کو پرنام کرنے آئے تھے۔

ذرا دیر مختلف باتیں کرنے کے بعد ماتا رام نے میری تنخواہ کی بابت سوال کیا۔ اور پھر ہم سب چائے کی میز پر چلے گئے۔ وہاں بھی ماتا رام برابر سوالات کرتی رہیں۔

گیندا شادی نہیں کی تو نے؟

کیا تنخواہ سب کی سب خرچ کر ڈالتا ہے؟

گھر کیسا ہے تیرے رہنے کا؟

رسوئی کون بناتا ہے تیرے لئے؟

باتیں کرتے کرتے ماتا رام دفعتہً کھڑی ہو گئیں۔ گیندا رام اب میں باہر جا کر گاؤں والوں سے باتیں کروں گی۔ وہ میری راہ دیکھ رہے ہوں گے۔

میں نے روکنا چاہا، سوہن بولا

اب نہیں ٹھہریں گی وہ ان کا وقت ہو گیا۔ گیندا وہ عمر بھر سے وقت کے اسی چکر میں الجھی ہوتی ہیں وہ ہر کام ایک مقررہ وقت پر کرتی ہیں۔ میں نے ہفتے بھر کے قیام میں نہایت گہری نظر سے ماتا رام کو اندر اور باہر سے دیکھنے کی کوشش کی مجھے ان میں بہت سی عجیب باتیں نظر آئیں وہ بہت زیادہ بُردبار تھیں انھیں غصہ بالکل نہ آتا تھا۔ اور ہر شخص سے وہ بحث سے بات کرنے کی عادی تھیں۔ انھیں اپنے گاؤں میں جو عزت حاصل تھی وہ اس سے زیادہ تھی جو ملکہ وکٹوریہ کو اپنی مملکت میں میسّر تھی۔ وہ ہر شخص کے دل میں گھر بنا چکی تھیں ——— میرے قیام کے زمانے میں ایک اور دلچسپ واقعہ پیش آیا۔ گاؤں کے ایک آدمی کو اچانک پانچ سو روپے کی ضرورت پیش آ گئی اس کی بیوی رات کو بارہ بجے ماتا رام کے پاس آئی۔ یہ وقت ان کے آرام کا تھا لیکن ایسی اہم ضروریات کے وقت وہ ہمیشہ جاگ اٹھتی تھیں عورت نے رو کر ان سے پانچ سو روپے کی درخواست کی۔ میں اپنے کمرے میں لیٹا سب باتیں سُن رہا تھا۔ ماتا رام نے اسے دلاسا دیا پھر کنجیاں بج اٹھیں میں سمجھ گیا وہ تجوری کھولنے جا رہی ہیں۔ وہ اُٹھ کر دوسرے کمرے میں گئی اور جلد ہی روپے لے آئیں۔ عورت روپے لے کر بہت خوش ہوئی اب وہ کچھ بول نہیں رہی تھی صرف رو رہی تھی میں اس کی سسکیاں سُن رہا تھا۔ ماتا رام بڑے پریم کے ساتھ اسے سمجھا رہی تھیں صبح کو چائے پر میں نے ماتا رام سے پوچھا۔

کیا بات تھی ماتا رام رات وہ عورت کیوں آئی تھی؟

بات وات کچھ نہیں تھی بیٹا اسے کچھ تکلیف تھی وہ مجھ سے دوا لینے آئی تھی۔

کیا تکلیف تھی؟

بہت سی تکلیفیں ہو جاتی ہیں بیٹا آدمی کو!

میں ان کے جواب پر حیران رہ گیا۔ مجھے ان کے دل میں سمندر کی گہرائی اور وسعت نظر آئی۔ میں نے سوچا ماتا رام واقعی بہت بڑے درجے کی عورت ہیں ——— بڑے آدمی کی یہی تو پہچان ہے۔ کہ وہ شیخی بگھارے بغیر اپنی دلیری کا اظہار کرتا ہے۔

A man who is truly great is valaint without Boasting

اگلے دن مَیں نے پوچھا۔

آپ کا کتنا روپیہ اُدھار میں پھیلا ہوا ہے ؟

اس کا میں نے کبھی حساب نہیں لگایا میں نے ہی کھانا نہیں کھول رکھا گیندا !

آپ کا اودھار وصول بھی ہو جاتا ہے ؟

ہاں ایک پائی بھی کسی پر باقی نہیں رہتی ! مَیں گاؤں میں کسی کو بے ایمان نہیں سمجھتی۔

اور مَیں آج کل کسی کو بھی ایماندار نہیں جانتا ماتا رام !

یہ تمھاری بھول ہے گیندا ! تمھارے اپنے من کا کھوٹ ہے۔ تم دل سے دوسروں پر بھروسہ کرنے کی عادت ڈالو تو وہ کبھی تمھیں دھوکہ نہیں دے سکتے۔

اور اس وقت مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے پہاڑ کی چوٹی پر چھائے ہوئے بادلوں کے اوپر سے پرماتما بول رہا ہو۔ ان کی یہ بات میرے دل میں اُتر گئی۔

سوہن کا بیاہ کب کر رہی ہیں آپ ؟

اِسی سال کر دوں گی !

اور سچ مچ اسی برس سوہن کی شادی ہو گئی انھوں نے ایک مہینہ پہلے تار بھیج کر مجھے بُلا لیا تھا اب مَیں دُور کے ضلع میں کام کر رہا تھا۔ سوہن مجھ سے بھی زیادہ فاصلے پر تھا۔ ماتا رام بہت خوش تھیں۔ شادی کے سب دھندوں سے نِمٹ کر انہوں نے مجھ سے کہا۔

گیندا ! اب میں زیادہ دن نہیں جی سکوں گی۔ تم مہینے بھر کی چھٹی اور منگا لو۔ سوہن کو بھی مَیں نے روک لیا ہے۔

کیوں ؟ مَیں نے ڈرتے ڈرتے سوال کیا۔ وہ اس وقت کچھ خفا نظر آ رہی تھیں۔

بات یہ ہے کہ بہُو رانی سُندر ہیں، پڑھی لکھی ہیں، پر مجھے پسند نہیں۔

کیوں ؟

وہ نک چڑھی بہت ہیں، بات بات پر بگڑتی ہیں، گالیاں دیتی ہیں۔ کل اُنھوں نے ایک بوڑھی عورت کو میرے سامنے ہی ایک بہت بڑی گالی دے ڈالی ـــــ وہ گالی اس عورت کو نہیں مجھے دی گئی تھی، اس گاؤں کی ہر ناری کی عزّت میری عزّت ہے۔

اسی سال ماتا رام پرلوک سدھار گئیں اور جب مَیں چوتھی مرتبہ سوہن کے بلانے پر گاؤں گیا تو وہاں کا نقشہ ہی بدلا ہوا تھا۔ جن پہاڑوں نے چاروں طرف سے گاؤں کو گھیر رکھا تھا، ان کی چوٹیاں بالکل گنجی نظر آ رہی تھیں اونچے پیڑ سب کاٹ ڈالے گئے تھے۔ دُور دُور تک سفید بادلوں کا کہیں نشان نہ تھا۔ وادی کے گلہ سنتے سوکھ چکے تھے۔ گاؤں کا ہر شخص سوہن اور اس کی بیوی کا دشمن تھا۔ صبح و شام اس کے دروازے پر آدمیوں کا جمگھٹا نہ ہوتا تھا۔ لیکن ماتا رام کی سمادھی پر اب بھی لوگ پھول چڑھاتے تھے۔ جب ان پر کوئی مصیبت آتی یا کال پڑتا وہ ماتا رام کی سمادھی پر جاتے وہاں گاتے ناچتے اور کھانے پکاتے۔ جب میں نے سوہن سے ان تغیرات کی وجہ پوچھی تو وہ بولا۔

گیندا ! بہو رانی اور ماتا رام میں صرف عمر ہی کا فرق نہیں ان میں عورت اور دیوی کا سا فرق ہے۔ ماتا رام دیوی تھیں اور بہو رانی صرف عورت ہیں اور وہ بھی بہت بُری عورت، وہ سب سے لڑتی ہیں۔ اور دس دس روپے کے پیچھے گاؤں والوں پر نالش کرا دیتی ہیں انہوں نے ایک منیب اور ایک وکیل نوکر رکھ لیا ہے۔ یہ دونوں گاؤں والوں کے خلاف مقدمے بازی کرتے رہتے ہیں۔ میں تو بہت دنوں سے سوچ رہا ہوں کہ گاؤں چھوڑ کر شہر چلا جاؤں۔ وہیں رہوں گا۔ نوکری چھوڑ کر یہاں اس لئے آیا تھا کہ آرام سے زندگی کے دن گزاروں گا۔ مگر ماتا رام کی آنکھ بند ہوتے ہی ایسا معلوم ہو رہا ہے کہ سکھ چین اس گاؤں سے بالکل اُٹھ گیا۔

سوہن ! کیا یہ ممکن نہیں کہ گاؤں چھوڑنے سے پہلے تم بہو رانی کو ماتا رام کے نقشِ قدم پر چلانے کی کوشش کرو۔ انھیں بتاؤ کہ لڑائی بُری چیز ہے۔ بہت بُری۔ گاؤں ہو یا شہر، حکومت ہو یا کوئی معمولی سی زمیداری، لڑائی ہر جگہ بے چینی اور ابتری پیدا کر دیتی ہے۔ وہ دلوں کا سُکھ چین ہی نہیں چھینتی، ہمدردی اور انسانیت بھی چھین لیتی ہے۔ وہ سہاگ لُوٹ لیتی ہے خوشیاں برباد کر دیتی ہے۔ بہو رانی

چاہیں تو خود بھی خوشی اور آرام کی زندگی بسر کر سکتی ہیں اور گاؤں والوں کو بھی امن اور دوستی کی راہ دکھا سکتی ہیں - تم اپنا گھر نہ چھوڑو اس گھر میں سب کچھ ہے سوہن - یہاں شہر کا سا باتھ روم ہے' کھانے کا کمرہ ہے' سونے کا کمرہ ہے - صفائی اور سلیقہ ہے بس کمی ہے تو ماتا رام کی - اور وہ کمی بھی پوری ہو سکتی ہے بہورانی اپنا دل بدل کر

گاؤں والوں کو رام کر سکتی ہیں - دیہاتی محبت کے بھوکے ہوتے ہیں - انہیں پریم کی ضرورت ہے - اور ماتا رام نے ان کو ان چیزوں کا عادی بنا دیا ہے ـــ سوہن میری باتوں پر دیر تک غور کرتا - وہ اسی طرح سوچتے سوچتے سو گیا' اور صبح تک اس کا ارادہ بدل چکا تھا وہ یقین کر چکا تھا کہ میرا مشورہ صحیح ہے !

دیہات میں تعمیر مکانات کا مسئلہ

(سی - بی مٹیل)

تعمیر مکانات کے شہری اور دیہاتی مسائل کے حل کا بنیادی اصول یہ ہے کہ مالک مکان کی آمدنی کے مطابق ہی مکان کی لاگت بھی ہو لیکن ہر لحاظ سے دیہاتی اور شہری حالات اور ضروریات میں بہت نمایاں فرق ہے - غیر ممالک میں مکان کی لاگت کا تخمینہ خاندان کی دو سال کی اوسط آمدنی کے مساوی لگایا جاتا ہے لیکن ہندوستان میں اس طریقے سے مکان کی لاگت مقرر کرنا بہت دشوار ہے - چنانچہ مذکورہ اصول کے مطابق فی کس ڈھائی سو روپیہ سالانہ کی آمدنی کے حساب سے دو سال میں پانچ افراد کے خاندان کی آمدنی ڈھائی ہزار روپیہ ہوتی ہے - مگر دیہات میں ایک متوسط خاندان کے لئے ڈھائی ہزار کی لاگت کا مکان تیار کرنا بعید از قیاس ہوگا - بہرکیف مکان کی لاگت کی اوسط پانچسو سے چھ سو روپیہ تک متعین کی گئی ہے جو متمول خاندانوں کے لئے ڈھائی ہزار تک بھی بڑھائی جا سکتی ہے لیکن عام حالات میں پانچسو یا چھ سو روپیہ میں مکان تعمیر کرنا بھی ناممکن ہوگا -

مکان کی لاگت کا تجزیہ کرنے سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس سلسلے میں زیادہ تر خرچ سامان اور مزدوروں پر ہوتا ہے اور اس میں کفایت شعاری اس طریقے سے ہو سکتی ہے کہ کسان خود بھی کام کرے اور اپنے خاندان اور دوستوں سے بھی مزدوروں کا کام کرے - لہٰذا اب یہ انجینئر کا کام ہے کہ وہ مکانات کی تعمیر کے لئے اپنی مدد آپ کرنے کے اصول پر ایسا پروگرام مرتب کرے جس کے تحت مقامی طور پر دستیاب ہونے والا مال مسالہ زیادہ سے زیادہ استعمال ہو - لیکن مکان کے ڈیزائن میں اس امر کا لحاظ بھی رکھا جائے کہ ضرورت پڑنے پر اس میں توسیع کی جا سکے -

بھارت کی آب و ہوا میں اختلاف اور مال مسالہ کی فراہمی میں فرق کے باعث یہ امر مناسب ہوگا کہ تعمیر مکانات کے لئے کم از کم تین ایسے نمونے مقرر کر دئے جائیں جو شمالی ہندوستان، ساحلی علاقوں اور پہاڑی خطوں کے لئے یکساں طور پر کارآمد ہو سکیں - شمالی ہندوستان کی آب و ہوا کے باعث مٹی کی پختہ اینٹیں بنانا اور دیواریں تعمیر کرنا بھی مفید ثابت ہوگا - مگر دیواروں وغیرہ کی چوڑائی اتنی ہونی چاہیئے کہ گرمی اور سردی کا بچاؤ ہو سکے -

دیہات میں مکان کا فرش مٹی میں گوبر ملا کر تیار کیا جا سکتا ہے - لیکن باورچی خانہ اور کپڑے وغیرہ دھونے کی جگہ کا فرش سمنٹ یا پتھر کے ٹکڑوں سے تیار کرنا چاہیئے - علاوہ ازیں مکان کے سامنے اور پشت کے صحن زیادہ کشادہ رکھیں تاکہ مویشیوں کے لئے جھونپڑے اور چارے اور اناج کی ذخیرہ گاہیں تعمیر ہو سکیں - دیہات میں کنبے بڑے ہوتے ہیں اور سماجی رسم و رواج کے مطابق عورتوں کے لئے تنہائی ضروری ہے - اس لئے مکان میں ایسی گنجائش بھی رکھی جائے جہاں وہ علیحدہ بیٹھ کر کام کاج کر سکیں -

گاؤں میں مکانات کی ترتیب ایک بہت اہم چیز ہے کیونکہ انفرادی طور پر تو مکانات صاف ستھرے ہوتے ہیں مگر ان کا ماحول بہت گندہ ہوتا ہے - بدبودار اور نالیوں کی عدم موجودگی کی وجہ سے گاؤں کا کنواں بھی گندہ ہوتا ہے - اس لئے ضروری ہے کہ نالیوں اور بدروؤں کا مناسب انتظام کیا جائے - مکانات کی تعمیر قطاروں کی صورت میں کی جائے -

کرپال سنگھ بیدار

اِنکشافات

اگر شباب میں عفّت نہیں تو کچھ بھی نہیں
شگفتہ پھول میں نکہت نہیں تو کچھ بھی نہیں

ہزار خوبیٔ صورت نصیب ہو، لیکن
بشر میں خوبیٔ سیرت نہیں تو کچھ بھی نہیں

عبث ہے وسعتِ املاک پر غرور اے دوست!
دِل و نگاہ میں وسعت نہیں تو کچھ بھی نہیں

یہ مانتا ہوں کہ اُونچا ہے مرتبہ تیرا
مگر خیال میں رفعت نہیں تو کچھ بھی نہیں

کوئی یہ حاکمِ عالی وقار سے کہہ دے
اگر دِلوں پہ حکومت نہیں تو کچھ بھی نہیں

صفات اور بھی لازم سہی بشر کے لئے
مگر حمیّت و غیرت نہیں تو کچھ بھی نہیں

تجھے خبر ہے کہ پروانہ مشربی کیا ہے
یہی کہ موت پہ قدرت نہیں تو کچھ بھی نہیں

درونِ سینہ تب و تابِ شوق پیدا کر
کہ زندگی میں حرارت نہیں تو کچھ بھی نہیں

خیال لاکھ دل آویز ہو مگر بیدار!
اگر بیان میں ندرت نہیں تو کچھ بھی نہیں

احترام الدین احمد شاغل

جے پور کا ایک گمنام شاعر

گُل تخلص، اور بعض غزلوں میں نگار بھی کیا ہے۔ مگر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ پہلے کونسا تخلص اختیار کیا۔ اس لئے کہ دونوں تخلص کی غزلوں میں حالتِ کلام یکساں ہے۔ چار سو چھپّر (۴۷۶) صفحے کا ضخیم کلیات ہے جس میں علاوہ غزلیات، رباعیات، قطعات، قصائد، مستزاد، بحر شراہ و شنویاں بھی ہیں۔ مجھے یہ کلیات قدیم قلمی کتب کے تحفظ اور شعرائے جے پور کا تذکرہ مرتب کرنے کے سلسلے میں منشی نعیم الدین صاحب پنشنر انسپکٹر پولس جے پور کے پاس دستیاب ہوا صاحب کلام کا نام یا کوئی حال کہیں کچھ درج نہیں ہے۔ البتہ پورا کلیات پڑھنے پر پتہ چلا کہ مرزا اکبر علی خاں نام ہے۔ نگار اُن کے اُستاد کا تجویز کردہ تخلص ہے۔ اور گُل بلبل کا مجوزہ۔ مگر بلبل سے کون مراد ہے یہ عقدہ پھر بھی نہ کھُل سکا۔

بہر حال ایک غزل کا مقطع ہے۔

گُل رکھا بلبل نے اور استاد نے رکھا نگار — کیا اکبر علی خاں نے قبول احکام دونوں کا

دوسری غزل کا مقطع ہے۔

گُل رکھا بُلبل نے اور استاد نے رکھا نگار — میرزا اکبر علی خاں کے ہوئے ہیں نام دو

باشندۂ جے پور ہونے کے ثبوت میں بھی ان کے کلیات کی شہادت کافی معتبر ہے۔ مثلاً ایک غزل میں کہتے ہیں۔

آہ اے دوستو تے ہجر میں یا رہے پور — مثلِ ویرانہ سمجھتے ہیں دیا رہے پور

بے شبہ خاک سمجھنا اُسے وقد کی مرے — پہنچے تم تک جو کبھی گرد و غبار جے پور

ایک قصیدہ جے پور کے مشہور رئیس منشی جے لال کی مدح میں لکھا ہے جس میں کہتے ہیں۔

ہے ایسا کون منشی جے لال کے سوا — جس کا ہو بحر وش بحیاں فیض بار دست

اسی زمین میں حضرت رحمت علی شاہؒ کی مدح میں بھی قصیدہ کہا ہے۔ جس کا ایک شعر ہے۔

جز ترے دنیا میں اے رحمت علی شاہِ جہاں — کون رکھتا ہے بسانِ ابر گوہر بار دست

شاہ صاحب مولانا ضیاء الدین فخری کے خلیفہ تھے جنھوں نے ۱۳۳۰ھ میں بعد وصال مولانا صاحب اُن کی مسند رشد و ہدایت سنبھالی تھی۔

۱۳۵۴ھ میں کسی سند رلال کے پسر کی شادی کا حسب ذیل قطعہ تاریخ کہا ہے۔

بعد شادی چوں برات آمد بہ جے پور با خوشی
موجزن شد بحرِ عشرت چار سو از ذوقی
دا دہاتف ایں ندا از بہرِ تاریخش۔ بہ گُل
با دو صد شادی فرزند سند رلال جی

۱۳۵۴ھ

ایک قصیدہ راس صاحب پولیٹیکل ایجنٹ جے پور کی مدح میں لکھا ہے جس کا مطلع ہے۔

نام تیرا ہے ضیا افزا مہ و خورشید دار — خلق میں اے راس صاحب صاحبِ عزّ و وقار

اس قصیدے میں جو کچھ اپنے متعلق کہا ہے وہ جستہ جستہ اشعار حسب ذیل ہیں۔ اسی میں یہ شعر بھی ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جے پور کا نظم و نسق راس صاحب کے ہاتھ میں تھا۔

حکم تیرا ہے مساوی کمپنی کے حکم سے — تجھ کو گر کہئے گورنر ہے بجا اے نامدار

ہے یقیں آفاق کے دل پر کہ تیرے حکم سے — بلدۂ جے پور کا جاری ہے سارا کاروبار

حلِ مشکل کے لئے آیا ہوں تیرے پاس میں — گردشِ ایام سے ناچار ہو کر بے شمار

میں بھی امرازادہ ہوں اور قوم کا خرانہ[1] ہے — ہے بزرگوں کا مرے آفاق میں نام آشکار

حاکم جے پور کو مت سونپ میرا کام تو — وہ رکھیں لیت و لعل میں مجھ کو تا روزِ شمار

خود تجھے معلوم ہے کرنا یہاں کی منصفی — سُن چکا ہوگا مقرر شہر جے پور کی اُبار[2]

[1] مقامی دبان کا لفظ ہے یعنی ابھی، اور اصطلاحاً ایسا اقرار جو وثوق کے ساتھ کیا جائے اور کبھی پورا نہ ہو۔

میں نے جے پور کے سن رسیدہ اور بالخصوص شعر و سخن سے دلچسپی رکھنے والے حضرات سے گل صاحب کی بابت معلومات کی، مگر کوئی حال معلوم نہ ہوا۔

حضرت گل اپنے کو میر کا شاگرد کہتے ہیں۔ اُن کا مقطع ہے۔

نہ کیوں گل ہر غزل اشعار میرے نکتہ داں ہو
مرا استاد ہے اے گل، میر سا کیتائے دوراں ہے

اسی اتباع میں قاضی فرزند علی صاحب فقیر جے پوری نے اپنا تخلص تبدیل کرتے وقت ۱۲۸۵ھ مطابق ۱۸۶۸ء کے منعقدہ مشاعرہ میں ایک قطعہ پڑھا ہے، اور منسارام باقی نے اس مشاعرے میں جو غزل پڑھی ہے اُس کے ایک ایک مصرع سے جملہ سنین مروجہ برآمد کیے ہیں۔ یہ تاریخی مشاعرہ فرحت الشعرا[1] میں میرے پاس محفوظ ہے۔

اس سے ثابت ہوا کہ گل صاحب ۱۲۸۵ھ کے بعد ۱۲۸۸ھ سے قبل رحلت کر چکے تھے۔ میر تقی میر کا سنہ وفات ۱۲۲۵ ہجری ہے۔ اس لئے گل صاحب کا حضرت میر سے شرف تلمذ حاصل کرنا بعید از قیاس نہیں۔ فقیر کا قطعہ یہ ہے۔

شاگرد ہوں میں حضرتِ شورش[2] شریف کا — اور شورِ باغ حضرتِ گل کے ہیں خوش صفیر
اور گل وہ تھے کہ اُن کی بہارِ کلام سے — آتی مشامِ عقل میں تھی بوئے باغِ میر
استاد کی عطا ہے تخلص مرا نشاط — کرتا رہا اطاعتِ حکم آج تک فقیر
ہے انقلابِ دورِ فلک سب پہ آشکار — پہلے تو میں جوان تھا اب ہو گیا ہوں پیر
دورِ نشاط ختم ہوا۔ اب کہاں نشاط — کیسی نشاط، عمر کی ہے نوبتِ اخیر
میں چاہتا ہی تھا کہ تخلص کروں کچھ اور — احباب بھی ہوئے مرے اس باب میں مشیر
ناچار رہین کے حضرتِ تسلیم[3] سے رضا — قطعِ نظرِ نشاط سے کی ہو گیا فقیر
یارو خدا کے واسطے اب میں فقیر ہوں — کوئی فقیر پر نہ کرے اس میں اور گیر
پیری میں فکرِ شعر جوانانہ کرنے سے — عاجز ہے بندہ، ہاں مگر اللہ رے قدیر

حضرت گل نے اپنے بعض معاصرین بھی بتائے ہیں۔ چنانچہ کہتے ہیں۔

نے فگار و بندہ و مہدی و اطہر سے یہ گل — اس غزل پر آفریں اے بندہ پرور تو سہی

گل صاحب کا کلام دیکھنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ علاوہ پُر گوئی، وہ تمام محاسن کلام نمایاں طور پر موجود ہیں کہ جو کسی بلند مرتبہ شاعر کے یہاں ہونے چاہئیں۔ کہیں کہیں وہ قدیم الفاظ بھی استعمال کئے ہیں جو اُن کے زمانے میں متروک ہو چکے تھے۔ بعض اشعار میں فارسی کا بیجد غلبہ ہے۔ سنگلاخ زمینوں کے دل دادہ ہیں۔ اکثر میں سہ غزلہ و چہار غزلہ تک لکھا ہے، اردو اور فارسی کے علاوہ ہندی اشعار بھی کہتے ہیں۔ جن میں بجائے گل، پھول تخلص کیا ہے۔ مختلف اصنافِ سخن میں اردو۔ فارسی اور ہندی کو مخلوط کر کے عجیب لطف پیدا کیا ہے۔ اساتذہ کی تجویز کردہ زمینوں میں بھی خوب خوب جوہر دکھائے ہیں، تاہم وہ جے پور کے ایک گم نام شاعر ہیں۔ نمونہ کلام حسب ذیل ہے۔

قیس کے پاس پس مرگ نہ نکلی کچھ شے — ہر تنِ مُو سے مگر خارِ مغیلاں نکلا
پونچھتا آنسوؤں کو چشم سے اپنی کیوں کر — جا نہ گل میں تو اتنا بھی نہ دامانی نکلا
ہے سلاسل میں مقید آج تک تصویرِ قیس — جرم کیا ثابت کیا اے عشق بے تقصیر کا
رشتہ کبھی ہم سے غمِ ہجراں کا نہ ٹوٹا — تار اس لئے اشکِ گہر افشاں کا نہ ٹوٹا
یہ کس عشوہ گر نے اشارا کیا — مرے دل نے مجھ سے کنارا کیا
نہ دی مجھ کو دشنام تک بھی کبھی — میں ہر چند دامن پسارا کیا
پس از تیرہ مرزا ابلکِ سخن — سُنا ہے کہ گل نے اجارا کیا

شعلہ اُٹھے تو دے مری چشمِ پُر آب آب — رکھتا ہوں آگ عشق کی سینے میں اے جناب
جھلک رہا ہے دلا آفتاب رتبہ آب — عرق سے اور ہوئی رُخ کی آب رتبہ آب
مجھ پہ تقصیر کرے دشت ہجراں ثابت — موسمِ گل میں رکھوں میں جو گریباں ثابت
اے ماہ کہاں اُس کے ہو تو پشت برابر — خورشید نہ ہو جس کے کھبو پشت برابر
نکلا ہے استخواں کو تیشہ سے توڑ کر — تھا طائرِ جنوں کو سرِ کوہ کن قفس
داغ رکھتے ہیں ترے حُسن سے اے مایۂ ناز — لالہ و ماہ و دلِ سوختگاں تینوں ایک
فصلِ گل، وصلِ صنم، بزمِ طرب اے ساقی — اِس کو تحقیق سمجھ پھر یہ کہاں تینوں ایک
اے اہلِ زباں کوئی تو انصاف سے بولو — محفل سے جدا ہو کے کدھر جائے گی بلبل
جب پیں دریا کنارے غیر نے مل کے تل — کیوں نہ بحرِ رشک میرا تو ڈبو دے پل کے پل
ایسے شیدا کو کریں کیا یا دزِ نجیر و چمن — ہو جسے صحرا و موج یا دزِ نجیر و چمن
شورِ بلبل باغ میں، زندانِ دیوانوں پہ گُل — عشق کے ہے فیض سے آباد زنجیر و چمن
مُرغِ عرق میں غرق ہے یا عکسِ گلشنِ آب میں — یا شفق کا ترکیا گردوں نے دامن آب میں

نہیں قرار ایک دم مری جاں ہمیشہ دن رات چرخ داں میں
سپہر ہفت اور بروج بارہ عقول دس یہ فلام تیسوں
اس اشک و نالہ کے ہیں اثر سے فلک پہ بجلی زمیں پہ باراں
اُدھر وہ چمکی، اِدھر یہ برسی، فلک پہ بجلی زمیں پہ باراں

تر نہیں اشک سے کچھ پیرہنِ ابر فقط — دامنِ برق بھی اس آہ سے جل جاتے ہیں
بھر مستی سے گزرتا ہوں ابھی شکلِ حباب — لطف لے گردشِ گرداب کہ پھر آ نہ سکوں
مجھ سے مت تنگ ہو اے چرخ چلے جاؤں گا — پروش یافتۂ دامنِ مژگاں ہوں میں

---

[1] مولوی شیخ عطا حسین شورش دہلوی متوطن جے پور۔ [2] مولانا محمد سلیم الدین تسلیم نارنولی۔

بوقت سرکشی مردمانِ خانۂ چشم — عصائے نازپئے اہتمام لیتے ہیں
ہنشیں ہم نے نہ پایا کبھی آرام کہیں — چین دیتی ہی نہیں گردشِ ایام کہیں

نہ چھوڑوں ناصح صنم کے در کو اِدھر کی دنیا اگر اُدھر ہو
نہ جاؤں اس جائے اُٹھ کے گھر کو اِدھر کی دنیا اگر اُدھر ہو

اس قدر فرطِ جنوں ہے تو سے دیوانے کو — تار چھوڑا نہ گریباں میں قسم کھانے کو
کس طور ہم مرگِ شفایاں نہ ہوں عاجز — جب یہ دلِ بیمار اِدھر ہو اُدھر ہو
پھرتی ہے طبابت تنِ دیوانہ کی خاطر — زنجیر لئے موجِ صبا دیکھئے کیا ہو
اُٹھتا نہیں غُل، چل نہ بسا ہو گلِ وحشی — زنداں میں کوئی خانۂ زنجیر تو دیکھو
کوہکن کو بھی ہو اور پرویز کو شیریں سے — جذبۂ اُلفت کی کیا ہے عشق میں تاثیر دیکھو

سوادِ توسن وہ ہے یا زمیں پہ صرصر ہوا پہ شعلہ
یہ دیکھو یارو نیا تماشا زمیں پہ صرصر ہوا پہ شعلہ

اے طبیب لطف فرما آپ کی تدبیر سے — دردِ عشق کا واللہ درماں دُور ہے
ضعفِ پیراہن دری کرنے نہیں دیتا ہمیں — ورنہ دستِ چاک دامن سے کیا گریباں دُور ہے

حالتِ دل کباب کی سی ہے — سانس بھی اضطراب کی سی ہے
عشق کے ہاتھ سے مجھے اے گل — زندگی اک عذاب کی سی ہے
میں نے پوچھا کہاں ہے میرا دل — ہنس کے بولے مری بلا جانے
ناتواں کو ترے پڑے نہ کہیں — خلق دیکھے تو نقشِ پا جانے

پڑے پھپھولے جو اے ستمگر جگر کے اوپر قدم کے نیچے
تو کیوں نہ دیکھیں مثالِ اخگر جگر کے اوپر قدم کے نیچے

آپ اک دل کے لئے گل سے خفا ہوتے ہو — جان حاضر ہے یہ کیا تم نے بڑی بات کہی

وہ بہن حرص کر دیا ہم نے — دوختہ رسوزنِ توکل سے
مجھ سے کہتا ہے یہی پنجۂ دشتِ اے گل — آپ یہ بارِ گریباں نہ اُٹھایا کیجے
آئے دو فصلِ بہاری کو ذرا پھر دیکھوں — آپ سیتے ہیں مرے چاک گریباں کتنے
حکم رونے کا جو دوں دیدۂ گریاں کو مرا — دیکھو پھر اُٹھتے ہیں آفاق میں طوفاں کتنے

کلام مخلوط

چاک سو جا سے ہوا سینۂ سوزاں میرا — کارگر ہجر کا اس دل پہ زلیں خار ہوا
کانشا سالتِ نیہہ کا، لیا پرہ کا جوگ — ہمرا مَرمْ نہ جانیا بات بناوت لوگ
چاک زد پر جگرم ہجر ستم اے ناصح — چہ رفو کنی اے وائے گریباں مرا
آتشِ ہجر سے کا شانۂ دل جلتا ہے — اک جھڑی اشک کی اے چشمِ گہربار لگا
آگ پرہ کی نا مجھے سگرا جلا ہریو — روت روت بیچ مری نین بہا کے نیر
رحم اے آتشِ فرقت کہ بہ اطفائے تو نیست — تاب و طاقت بسخد ادیدۂ گریانِ مرا
مرضِ ہجر سے اے خضر میں کب بچتا ہوں — سر بسر دیجئے گر چشمۂ حیواں مجھ کو
کالی ناگن نیہہ کی جا کا من ڈس جائے — امرت وا کے جیو کو بس کا گُن دکھلائے
چہ کنم سیر لبِ جوئے جہاں مثلِ حباب — کہ بقائے منِ جاں باختہ بے بنیاد است

کلام ہندی

برہ بیا میں ہول دے کیسے دیکھوں لال — بن پی دیکھوں پھول جدرنگے جیا میں ہوں سال
دیکھ لکھی کرتار کی میٹ سکیں کب لوگ — موبرہن کے بھاگ میں بدھنا لکھیا جوگ
پانی برسا سینہ کا اگ یا ئی سگ بس — بھیگت ہیں وہ میہہ میں جن کا جھگل باس
آہ کروں تو تن جلے چپ کے من جلائے — ایسی بھاری پیڑ میں کیسے کر کل آئے

دو لاکھ نئے مکانات تعمیر ہوئے

بھارت کے شہروں یا قصبوں میں یا اُن کے نواح میں مغربی پاکستان سے آئے ہوئے دس لاکھ بے گھر لوگوں کی آبادکاری کے لئے تقریباً دو لاکھ نئے مکانات تعمیر ہو چکے ہیں یا پھر تعمیر کے مختلف مدارج میں ہیں۔

نئے تعمیر شدہ مکانات اور نکاسی مکانات (جن میں ۱۴ لاکھ ۷۰ ہزار بے گھر لوگ آباد ہو چکے ہیں) میں مجموعی طور پر ۲۴ لاکھ ۷۰ ہزار بے گھر لوگ آباد کئے جا چکے ہیں اور یہ تعداد دہلی کی آبادی سے تقریباً ۹ گنا زیادہ ہے۔ چونکہ نکاسی مکانات میں بسنے والے گنجان آباد دیہات میں رہتے ہیں۔ اس لئے مسئلے کے اس پہلو سے عہدہ برآ ہونے کی غرض سے مزید مکانات کی تعمیر کے سلسلے کی تجاویز زیرِ غور ہیں۔ ان نئے تعمیر شدہ مکانات میں ۵ ہزار ایسے رہائشی یونٹ بھی شامل ہیں جو بے گھر لوگ حکومت کی امداد سے تعمیر کر چکے ہیں یا کر رہے ہیں۔

رام شرما کے

بھکارن

(مرہٹی سے ترجمہ)

وہ مصوّر تھا، اور سادہ رنگوں کی مدد سے کینوس پر انسانی جذبات کی ترجمانی اتنی خوبصورتی سے کرتا تھا کہ جذبات کے پابند خطوط ہونے کا گمان ہوتا تھا۔ نازک، شوخ اور لطیف سے لطیف احساسات کو برش اور رنگوں کی مدد سے پردے پر بھی وہی زندگی اور تابندگی بخشنا کوئی آسان کام نہیں ہے - یہ سعادت باکمال فن کار کو ہی حاصل ہو سکتی ہے کہ وہ پردے پر رنگوں کو پریوں کی طرح اُڑتے ہوئے نازل کرتا ہے اور اپنی نازک انگلیوں کے اشاروں پر نچاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انسانی جذبات کی تصویر کشی میں جان پڑ جاتی ہے۔ ناک مکھ وغیرہ کی تصویر تو ہر وہ آدمی کھینچ سکتا ہے جسے برش پکڑنے کی معمولی شُدبُد ہو۔ لیکن انسانی قلب کی گہرائیوں میں اُبھرتے ہوئے جذبات کی موجوں کو پابند حدود کرنا باکمال فن کار ہی کا کام ہے۔

وہ اسی طرح کا باکمال فن کار تھا۔

یہ تو اُس کی زندگی کی ریاضت اور عبادت تھی۔ شدید احساس اور فن سے شغف اُس کا لازوال سرمایہ تھے۔ عوام کے مذاق کی اُس نے کبھی پروا نہیں کی۔ وہ تو اپنے دل کی اُمنگ اور حوصلے ہی کی رَو میں تصویر بنایا کرتا تھا۔ نگار خانے میں پہنچ کر وہ خود کو بھول جایا کرتا تھا۔ ایسی محویت کے عالم میں بنائی ہوئی تصویریں اگر بولتی ہوئی سی دکھائی دیں تو اس میں حیرت کی بات ہی کیا ہے۔ اپنی تصویروں کے موضوع وہ روزمرّہ کی زندگی ہی سے منتخب کرتا تھا۔ اس کے گرد و پیش کی پھیلی ہوئی دنیا میں ایک کشمکش تھی، جب اُس کے حساس دل و دماغ پر اس کشمکش کا ارتعاش مرتسم ہوتا تو کوئی موضوع اُس کے ذہن میں اُبھر آتا تھا۔ موضوع کے انتخاب کے بعد اُس کا ذہن ماڈل کے لئے بے قرار ہو جاتا۔

جب تک اُسے حسبِ دلخواہ ماڈل نہ ملتا وہ برش نہیں اُٹھاتا تھا۔ تصویروں کے ذخیرے میں شفقت انگیز تصویر کی کمی اُسے بہت کھٹکتی تھی۔

اس لئے اُس نے ایک تصویر بنانے کا تہیّہ کیا جو شفقت اور محبت کا مرقع ہو۔

یوں تو اُس نے ماں اور مامتا کے موضوع پر نامور فن کاروں کی بنائی ہوئی تصویریں دیکھی تھیں، لیکن کسی ایک نے بھی اسے متاثر نہیں کیا تھا۔ تمام تصویروں میں اُسے کوئی نہ کوئی خامی نظر آ ہی جاتی تھی۔ اب اسے یہ محسوس ہوا کہ تصویروں سے شفقت اور محبت کا جو رس ٹپکنا چاہیئے اور جو اثر قائم رہنا چاہیئے وہ ان میں نہیں ہے۔

اُسے اپنے فن پر ناز تھا، جس کام کو اب تک کوئی نہ کر سکا اُسے میں کر دکھاؤں گا۔ اس بلند مقصد سے اُس نے اپنی تصویر کے لئے موزوں ماڈل تلاش کرنا شروع کر دیا۔

صبح کا وقت تھا، ایک بھکارن اُس کے مکان پر صدا لگا رہی تھی۔ اُسے ٹالنے کے ارادے سے وہ باہر آیا۔ لیکن بھکارن کو جو دیکھا تو اس کی ٹکٹکی لگ گئی۔

بچے کو سینے سے لگائے بھکارن نے بھیک کا پیالہ آگے بڑھایا اور کہا "مائی باپ! مجھے خیرات نہ دو مگر میرے اس مُنّے پر تو ترس کھاؤ!"

اپنی بھیگی ہوئی پلکوں سے وہ بچے کو دیکھتی جاتی تھی اور رقت بھری آواز میں کہہ رہی تھی "کچھ مل جائے مائی باپ!"

فن کار کی نگاہیں اس پر جمی ہوئی تھیں۔

بھکارن جوان تھی۔ پھٹے لباس میں اُس کے جسم کا کوئی حصّہ بھی پوری طرح ڈھک نہیں سکا تھا۔ اُس کے اعضاء سے شباب چھلک رہا تھا اور گندے بچے کے تن لاغر کو چھاتی سے چپکائے ہوئے تھی، اس لئے اس کے سینے کا حصّہ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اُس کی بڑی بڑی چمکدار آنکھوں نے فن کار کو یکایک متوجہ کر لیا۔ آنکھوں میں عاجزی اور رحم کا ایک حسین امتزاج تھا۔ فن کار کو یہ محسوس ہوا کہ وہ جن جذبات کی ترجمانی کرنا چاہتا ہے وہ

ان آنکھوں میں موجود ہے۔ اس لئے اُس نے سوچا کہ وہ اس بھکارن کو ہی اپنی تصویر کا ماڈل کیوں نہ بنالے۔

عاجزی اور رحم کے اِس پس منظر کے ساتھ اگر شفقت اور محبت کی تصویر بنانے میں اُسے کامیابی حاصل ہوگئی تو اس کی تخلیق لازوال ہوگی۔ ایک لمحے کے لئے وہ تصویر کی دنیا میں رنگ آمیزی کرتے کرتے کھو سا گیا۔

فن کار کے دل میں نہ سما سکنے والا انبساط اُس کی آنکھوں میں چھلک آیا جس چیز کی اُسے تلاش تھی وہ آج مل گئی۔ شاید اسلئے اُس کی آنکھوں میں چمک تھی۔ فن کار کی اس کیفیت کو بھکارن نہ جانے کیا سمجھی اور مایوس ہو کر آگے بڑھنے لگی۔ وہ محض بھکارن ہی نہیں تھی بلکہ جوان بھی تھی۔ جوانی کا نکھار جب بدصورتی تک کو پُرکشش بنا دیتا ہے تو وہ کوئی بدصورت بھی نہیں تھی۔ فرق صرف اتنا تھا کہ غریبی کی گرد اس کے حُسن کے آئینے پر جمی ہوئی تھی۔ در در بھیک مانگنے میں اُسے بڑے عجیب و غریب تجربے ہوتے رہتے تھے۔ کوئی طعنہ زنی کرتے ہوئے کہتا۔ "آج کل کے بھکاریوں کے پاس اتنا اندوختہ ہوتا ہے کہ ٹاٹا کو بھی خرید لیں" کوئی کہتا" نوبت یہ ہے کہ بھیک مانگی جاتی ہے۔ لیکن بچے پیدا کرنے سے یہ لوگ باز نہیں آتے، یہ شوق بھی خوب ہے؟" بھکارن جب اس قسم کے آوازے سنتی تو اُس کا دل اس طرح چھلنی ہو جاتا جس طرح غریبی نے اس کے لباس میں رخنے پیدا کر دیئے تھے۔ ایسے موقعے پر وہ اپنا زخمی دل لئے بے رُوح بوجھل مشین کی طرح آگے بڑھنے لگتی۔ وہ نڈھال کیوں نہ ہوتی۔ اس لئے کہ بے غیرتی اور بے باکی سے اس کا دل مضبوط نہیں ہوا تھا۔

صرف اتنا ہی نہیں کچھ نوجوان آوارہ لوگوں کی حریصانہ نگاہوں کو دیکھ کر کبھی تو اُسے خودکشی کا خیال آتا لیکن جب بھیک کے بدلے اسی سے اس کے جسم کی بھیک مانگی جاتی تو اُس کے دل میں ایک شعلہ بھڑک اٹھتا۔

ان اذیتوں کے باوجود اُس نے اپنا تک حسن کی تجارت نہیں کی تھی اور اگر ایسا ہوتا تو وہ اپنی دوسری بہنوں کی طرح کسی کوٹھے پر بیٹھ کر گاہکوں کو تاکتی رہتی۔

لیکن فن کار کی آنکھوں کی چمک کو وہ نہ سمجھ سکی۔

اے، اے، ذرا ٹھہر۔ کہہ کر جب فن کار نے اُسے پکارا تو وہ جھجھک میں پڑ گئی۔ اس کی یہ اندرونی کشمکش فن کار کی نگاہوں سے پوشیدہ نہ رہ سکی اس لئے کہ کئی بار ایسے مواقع آچکے تھے۔ ہر ممکن طریقے سے سمجھاتے ہوئے فن کار نے کہا

"بائی! میں اُن لوگوں میں سے نہیں ہوں جیسا تم سمجھ رہی ہو۔

پھر آپ کیا چاہتے ہیں؟" بھکارن نے پوچھا

فن کار نے جب اُسے تمام باتیں سمجھائیں تو بھکارن نے تجویز منظور کر لی۔

سٹوڈیو میں داخل ہونے پر جب اس نے دیکھا کہ کمرے میں سینکڑوں تصویریں مختلف قسم کے رنگ اور دوسرا سامان پڑا ہوا ہے اور ایک عجیب قسم کی بُو آ رہی ہے تو وہ کچھ سمجھ نہ سکی۔ اُس کے لئے یہ ماحول بالکل نیا تھا۔

کچھ دیر بعد خوف اور بدگمانی دور ہوگئی۔ اس روز کا کام پورا ہونے پر فن کار نے اُسے جو معاوضہ دیا وہ اتنا تھا کہ دن بھر شہر کی خاک چھاننے کے بعد بھی اسے کبھی نہیں ملا۔

"کیا میں کل بھی آؤں؟" بھکارن نے آس بھری آواز میں پوچھا۔

"ہاں ضرور، اور میں جب تک انکار نہ کروں ہر روز چلا نا فہ آتی رہو۔

یہ سن کر بھکارن کی خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی۔ کم سے کم کچھ دن کے لئے تو اُسے شہر میں بھٹکنے سے نجات مل جائے گی۔ پھر بھیک مانگنے سے اتنا مل بھی تو نہیں سکتا۔

وہ ہر روز آنے لگی۔ فن کار اس سے جس انداز اور جس پہلو سے بیٹھنے کو کہتا وہ بچے کو گود میں لے کر بیٹھتی۔ تصویر پوری ہو جائے گی تو پھر میری ضرورت نہیں رہے گی، اور مجھے پہلے کی طرح در در بھٹکنا پڑے گا۔ بس یہی فکر اُس کو دامن گیر ہوگئی۔

ادھر فن کار کی تصویر مکمل نہیں ہو رہی تھی۔ وہ تصویر بناتا اور بگاڑتا رہا۔ اتنی محنت اور کاوش سے بنائی ہوئی تصویروں کو وہ برباد کر دیا کرتا۔ اس کی اس حرکت کو دیکھ کر بھکارن کے دل میں شکوک پیدا ہوتے رہے۔

لیکن اسے اس کی کوئی پروا نہیں تھی۔ وہ تو چاہتی تھی کہ تصویر کبھی مکمل نہ ہو اور اسے شہر میں بھٹکنے سے نجات مل جائے۔

فن کار اگرچہ ذہنی کوفت سے آگہی اور مایوسی کا شکار تھا۔ لیکن بھکارن ہر روز اپنے بچے کو گود میں لئے بیٹھی رہتی۔

فن کار کی بے چینی کا سبب اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ وہ تو اس کی ہدایت کے مطابق بچے کو لے بیٹھتی اور اپنی اجرت لے کر خوش خوش چلی جایا کرتی۔

ایک روز بھکارن نے دیکھا کہ فن کار کے چہرے پر پہلی سی خوشی نما ہر ہو رہی تھی۔ وہ تصویر کو مسرت اور مو قلم سے بنا رہا تھا۔

اس دن گھر لوٹتے وقت وہ بڑی پریشان تھی۔ اس لئے کہ اسے ایسا محسوس ہوا کہ تصویر فن کار کی پسند کے مطابق تیار ہو چکی ہے۔ کل سے اس کی روزی کا سلسلہ ختم ہو جائے گا۔

اس دن فن کار کا ایک دوست ملاقات کے لئے آیا۔

"دوست! تمہاری یہ تخلیق بہت حسین ہو گئی ہے" تصویر کو دیکھتے ہی اس نے کہا۔ دوست کے یہ الفاظ سنتے ہی فن کار کی خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی۔

سچ! کیا یہ تصویر تمہیں پسند ہے؟ فن کار نے مجسم مسرت سے چلّا کر پوچھا یہ اس لئے کہ اس کا دوست بھی کوئی معمولی فن کار نہیں تھا۔

ہاں: ہاں! ضرور پسند ہے۔ بھکارن کی ایسی جیتی جاگتی اور دل گداز تصویر میں اپنی زندگی میں پہلی بار ہی دیکھ رہا ہوں۔

لیکن دوست کے جملے پورے بھی نہ ہونے پائے تھے کہ فن کار نے اُلٹے سیدھے برش مار کر تصویر خراب کر دی۔

"ہائیں: یہ کیا کر دیا پاگل" فن کار کی اس حرکت سے حیران ہو کر دوست چیخ اُٹھا۔

"یہ میری زندگی کی پہلی شکست ہے" فن کار نے کہا۔

کیا مطلب؟

میں بھکارن کی نہیں بلکہ مامتا اور شفقت کی تصویر بنانا چاہتا تھا۔

یہ حقیقت ہے کہ تصویر سے مامتا اور پیار کی کوئی جھلک نظر نہیں آتی۔ اس پر بھکارن ہی غالب نظر آتی ہے۔ دوست نے ہمدردی کے انداز میں کہا۔

دوسرے روز جب حسب معمول بھکارن آئی تو فن کار نے اجرت کی رقم دے کر کہا۔

"اب تم کل سے نہ آؤ گی"

"بھکارن نے آبدیدہ ہو کر پوچھا "کیوں کیا تصویر پوری ہو چکی"؟

اب تک جتنی تصویریں بنیں اور بگڑیں وہ سب قریب ہی بکھری پڑی تھیں۔ فن کار نے آبدیدہ ہو کر اُن کی طرف دیکھا اور جواب دیا "نہیں"

اور کل جو تصویر خراب کی گئی تھی وہ بھی اسی ڈھیر میں شامل ہو چکی تھی۔

اس تصویر پر بھی اُس نے نگاہ ڈالی۔۔۔۔۔۔۔

"جا: جا! چلی جا" وہ گھر کے اندر ہی سے چلّایا۔

"مجھ سے ایسی کیا بھول ہو گئی ہے بابو جی"؟ بھکارن نے سہمے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

"میں مامتا اور پیار کی تصویر بنانا چاہتا تھا، ماں کے پیار کی۔ یہ کام مجھ سے نہ بن آیا اور میں ناکام رہا" اُس نے افسردہ ہو کر کہا۔

"تو اس میں میرا کیا قصور ہے"؟ فن کار کی بیکار بھکارن کو اچھی نہیں لگی۔

ایک بھکارن اسے اس طرح چیخ دے، یہ بات فن کار کو ناگوار گزری۔ اُس نے کہا۔ "تو پھر کس کا قصور ہے؟ بابو

"بابو جی! حقیقت یہ ہے کہ ابھی میری شادی نہیں ہوئی ہے"

"تو کیا بغیر شادی کا بچہ لے کر یہاں آئی تھی؟ اُس نے جھلا کر کہا۔

"کیا کنواری کے بچے پر ماں کا پیار نہیں ہوتا، بابو جی آپ جانتے ہیں میں بھکارن ہوں"

"ہاں! ہاں! میں جانتا ہوں ـــــ اور یہ لڑکا"۔۔۔۔۔۔

"لیکن میں اس کی ماں نہیں ہوں"

فن کار اس انکشاف پر بھونچکا رہ گیا۔

بھکارن نے آنسو پونچھتے ہوئے گردن جھکا کر کہا۔

"بابو جی! بھیک کی قیمت جسم سے اوزار کرنی پڑے ـــ اسی خیال سے مجھے یہ بچہ ایک پڑوسن سے کرائے پر لانا پڑتا ہے۔ تاکہ بھیک آسانی سے مل سکے۔

(مترجمہ امیر محمد خاں)

دیہات میں ڈاکخانوں کی تعداد میں اضافہ

۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو بھارت میں دیہاتی ڈاکخانوں کی تعداد ۱۸۱۲۱ تھی۔ آزادی کے تقریباً ۵ سال بعد یہ تعداد دو چند سے زیادہ ہو گئی۔ اب دیہاتی ڈاکخانوں کی تعداد ۳۸۳۶۰ ہے۔ جن میں سے ۹۳۳۳ ۱۹۵۳ء کے دوران میں کھولے گئے۔

حیدر حسین موسوی

اندھرا ریاست کا افتتاح

یکم اکتوبر ۱۹۵۳ء کو اندھرا کی راجدھانی کرنول میں وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو نے اندھرا کی نئی ریاست کا افتتاح کیا۔ اس موقع پر مرکزی حکومت کے کئی وزراء کے علاوہ اندھرا کے بہت سے لیڈر بھی موجود تھے۔ افتتاحی جلسے میں عوام کی کثیر تعداد شریک تھی۔

پنڈت نہرو نے افتتاح کرتے ہوئے کہا کہ خوشی کی بات ہے کہ آج ایک نئی ریاست وجود میں آگئی اب اس ریاست کے عوام کا یہ فرض ہے کہ وہ اپنی اس نئی ریاست کی فلاح و بہبود کے لئے مل جل کر کام کریں جس سے ریاست ترقی کرے اور یہاں کے عوام خوش حال ہوں۔

مدراس کے چیف جسٹس نے مسٹر ترویدی گورنر سے حلف وفاداری لیا جس کے بعد مسٹر ترویدی نے مسٹر ٹی پرکاشم کو وزارت بنانے کی دعوت دی۔ موصوف نے اپنی کابینہ کی تشکیل کی۔ فی الحال ان کی کابینہ حسب ذیل وزراء پر مشتمل ہے۔ مسٹر این سنجیوا ریڈی۔ مسٹر ٹی وشوا ناتھم۔ مسٹر ڈی سنجیوا اور مسٹر کوٹی ریڈی۔

اندھرا ریاست بنانے کا فیصلہ

یاد ہوگا کہ اندھرا ریاست بنانے کے فیصلے کا اعلان پارلیمنٹ میں پنڈت جواہر لال نہرو نے دسمبر ۱۹۵۲ء میں کیا تھا جس میں بتایا گیا تھا کہ اندھرا ریاست موجودہ مدراس ریاست کے ان علاقوں پر مشتمل ہوگی۔ جن کی زبان تیلگو ہے۔ اس کے بعد راجستھان ہائی کورٹ کے چیف جسٹس شری واچو کو مقرر کیا گیا کہ وہ اندھرا ریاست کی تشکیل کے فیصلے سے وابستہ مالی اور دوسرے معاملات کی جانچ پڑتال کرنے کے بعد اپنی رپورٹ دیں۔ مسٹر واچو نے اپنی رپورٹ، فروری ۱۹۵۳ء کو پیش کی اور اس رپورٹ کی بات حکومت ہند کے فیصلے کا اعلان ۲۵ مارچ ۱۹۵۳ء کو کیا گیا۔

فیصلے کی اہم تجاویز

حکومت ہند کے فیصلے کی اہم تجاویز یہ تھیں۔ ۱۔ مجوزہ اندھرا ریاست کو موجودہ مدراس ریاست کے ان علاقوں پر مشتمل ہونا چاہیئے جن کی زبان متفقہ طور پر تیلگو ہے۔ ۲۔ اندھرا ریاست میں مدراس شہر شامل نہ ہوگا۔ ۳۔ ریاست کی تشکیل ہو جانے پر بعد میں حد بندی کے ایک یا ایک سے زائد کمیشن مقرر کئے جائیں گے جو نئی ریاست کے ٹھیک ٹھیک حدود کا تعین کریں گے اور وقتی طور پر نئی ریاست کے حدود متعلقہ ضلعوں کے حدود کے مطابق سمجھے جائیں گے۔

تیلگو زبان والے علاقے

اندھرا ریاست کے وہ گیارہ ضلعے حسب ذیل ہیں جن کی زبان بلا اختلاف رائے تیلگو مانی گئی ہے۔ ۱۔ سری کاکولم۔ ۲۔ وساکھاپٹم ۳۔ پوربی گوداوری۔ ۴۔ پچھمی گوداوری۔ ۵۔ کرشنا۔ ۶۔ گنٹور۔ ۷۔ نیلور ۸۔ کرنول۔ ۹۔ انتاپور۔ ۱۰۔ کداپہ۔ ۱۱۔ چتوڑ

ریاست کی تشکیل کے لئے مسودۂ قانون

ان مراحل کے طے ہو جانے کے بعد اندھرا کی نئی ریاست قائم کرنے کے اقدامات کے سلسلے میں مدراس اور میسور کی مجالس قانون ساز میں اندھرا ریاست بنانے۔ مدراس ریاست کا علاقہ گھٹانے اور میسور ریاست کا علاقہ بڑھانے اور دوسرے متعلقہ معاملات کی بابت مسودہ قانون پیش کیا گیا اور ان مجالس قانون ساز میں اس مسودۂ قانون کی منظوری کے بعد اگست ۱۹۵۳ء میں اسی مقصد کے لئے ایک مسودۂ قانون پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں میں پیش ہو کر منظور ہوا۔ اور ۱۴ ستمبر کو پریسیڈنٹ نے بھی اس کی منظوری دے دی۔

اندھرا کی نئی ریاست

اندھرا ریاست قائم کرنے کی تقریباً چالیس سالہ مہم آخر کامیاب ہوئی۔ اگرچہ اس نئی ریاست کو فی الحال مالی اور چند دوسری دشواریاں درپیش ہیں لیکن اس ریاست کے گوناگوں قدرتی وسائل اور ترقی کی مختلف صلاحیتوں کے پیش نظر کافی امید پائی جاتی ہے کہ اگر ریاست کے برسر اقتدار لوگوں اور عوام نے اپنے وزیر اعظم کے مشورے کے مطابق عمل کیا تو ان کی دشواریاں حل ہو کر ان کا مستقبل درخشاں ہو جائے گا۔

اندھرا ریاست کا رقبہ اور آبادی

رقبے اور آبادی کے لحاظ سے اندھرا ریاست کا پارٹ "اے" ریاستوں میں ساتواں نمبر ہوگا۔ اس ریاست کا رقبہ ۷۴۱۷۶۳ مربع میل ہے، اور اس کا ساحلی علاقہ چھ سو میل لمبا ہے۔ اس ریاست کی آبادی ۱۹۵۱ء کی مردم شماری کے مطابق (۱۸۰۸۲۰۵) ہے۔

پوری ریاست میں تقریباً دو ہزار گاؤں۔ دس ڈسٹرکٹ بورڈ۔ ۳۵ میونسپلٹیاں اور دو سو سے زاید پنچایتیں ہیں۔ یہاں کی تمام سڑکوں کی مجموعی لمبائی ۱۶۲۴۹ میل ہے۔

زراعت

اندھرا زیادہ تر ایک زراعتی سرزمین ہے۔ یہاں زیر کاشت زمین ۱۵٫۵ ملین ایکڑ ہے اور قابل کاشت زمین ۲۰ ملین ایکڑ ہے۔ اور ۸ ہزار مربع میل کے رقبے میں جنگلات ہیں۔ گوداوری اور کرشنا کے علاوہ جو ہندوستان کے پانچ بڑے دریاؤں میں شمار ہوتے ہیں اندھرا کی سرزمین کو اور کئی چھوٹے چھوٹے دریا بھی سیراب کرتے ہیں۔ یہاں زراعتی ترقی کے کافی امکانات پائے جاتے ہیں۔ اگر یہاں کے بڑے بڑے دریاؤں سے باقاعدہ طور پر آبپاشی کا کام لیا جائے تو تقریباً ایک لاکھ ایکڑ زمین کی آبپاشی ہو سکتی ہے اور اگر یہاں زراعت کے جدید اور ترقی یافتہ طریقوں کے مطابق کھیتی کی جائے تو اندھرا ریاست ہندوستان کے لئے "غلے کی ذخیرہ گاہ" بن سکتی ہے۔

اندھرا کی خاص پیداواریں تمباکو۔ دھان۔ گنا۔ کپاس اور مونگ پھلی وغیرہ ہیں۔ دھان کی سالانہ پیداوار یہاں تقریباً ۳ و ۳ ملین ٹن ہے اور ہندوستان کی تمباکو کی مجموعی پیداوار میں ۸۰ فی صدی حصہ اندھرا کی تمباکو کی پیداوار کا ہوتا ہے۔

صنعت و حرفت

اندھرا کے معدنی وسائل اس قدر کافی ہیں کہ ان سے کیمیاوی صنعت اور خام دھات کی صاف سازی کی صنعت میں یہاں کافی ترقی کی جا سکتی ہے۔ اندھرا میں ابرق۔ منگنیز۔ لوہا۔ چونے کا پتھر۔ کرومائٹ اور بارائیٹس وغیرہ وغیرہ پائے جاتے ہیں۔ اندھرا کی صنعت و حرفت کو پانی سے بجلی پیدا کرنے کے وسائل سے اس وقت بہت کافی مدد ملے گی اور فائدہ پہنچے گا۔ جب "مچکنڈ" اور "تنگ بھدرا" کے منصوبے جو اس وقت زیر تعمیر ہیں مکمل ہو جائیں گے۔ ان سے اسے ایک لاکھ کلو واٹس سے زاید بجلی کی طاقت مہیا ہو جائے گی۔ اندھرا میں دھان صاف کر کے چاول نکالنے اور تلہن سے تیل نکالنے کی صنعت وہاں کی خاص صنعتیں سمجھی جاتی ہیں۔ یہاں چاول اور نباتاتی تیل کے ایسے فالتو ذخیرے مہیا ہیں جو برآمد کئے جا سکتے ہیں۔ اندھرا میں ۱۹۵۰-۵۱ء میں ۸ء۶۱ کروڑ روپے کی قیمت کے چاول کی پیداوار ہوئی تھی اور ۸ء۴ کروڑ روپے کی قیمت کا نباتاتی تیل تیار کیا گیا تھا۔

شکر سازی

اندھرا کی دوسری خاص صنعت شکر سازی کا کاروبار ہے۔ یہاں شکر سازی کے نو (۹) کارخانے ہیں جن میں تقریباً سالانہ پچاس ہزار ٹن شکر بن سکتی ہے۔ یہاں گنے کی ایک ایکڑ کاشت سے شکر کی پیداوار تقریباً تین ٹن ہوتی ہے جبکہ ہندوستان کے دوسرے مقامات کی ایک ایکڑ کاشت سے شکر کی پیداوار کا اوسط تقریباً ۱ء۳ ٹن ہوتا ہے اس سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ یہاں کی موافق آب و ہوا۔ مناسب زمین اور آبپاشی کی سہولتوں کی بنا پر اندھرا میں شکر سازی کی صنعت کو زبردست ترقی دی جا سکتی ہے۔

نمک سازی

نمک سازی بھی یہاں کی ایک بہت پرانی صنعت ہے جو ضلع وزاگ میں سالہا سال سے کامیابی کے ساتھ جاری ہے۔ اس صنعت کو جدید طریقوں پر چلانے کی ضرورت ہے۔ نمک سازی کی صنعت کاسٹک سوڈا بنانے کی صنعت میں ایک بنیادی حیثیت رکھتی ہے اور کاسٹک سوڈا

دوسری مختلف صنعتوں کے لئے ـــ جیسے صابن سازی اور مصنوعی ریشم بنانے کی صنعت ـــ نہایت اہم چیز ہے۔

دوسری صنعتیں

اندھرا میں شکر وغیرہ کے کارخانوں کے علاوہ دو سیمنٹ کے کارخانے۔ ایک شیشے کا کارخانہ۔ ایک کاغذ کا کارخانہ۔ ایک دنا سپتی تیل کا کارخانہ۔ ایک سٹھائی کا کارخانہ۔ ایک بینا کاری کا کارخانہ اور تین کپڑے کے کارخانے بھی ہیں۔

تعلیم

ابتدائی اور ثانوی تعلیم کے اداروں کے علاوہ اندھرا میں ایک یونی ورسٹی۔ ۲۸ آرٹس کالج اور نو دوسرے ایسے کالج ہیں جن میں ان مضامین کی تعلیم دی جاتی ہے جو کسی خاص پیشے سے تعلق رکھتے ہیں مثلاً زراعت، طب، انجینری وغیرہ وغیرہ۔ اعلیٰ تعلیم کے نظام کی ترقی اور اصلاح کے ساتھ ساتھ ابتدائی اور ثانوی تعلیم کے نظاموں کی ترقی اور اصلاح کا کام بھی جاری ہے اور بنیادی تعلیم کے نئے طریقے رائج کرنے کے سلسلے میں اسکول کھولے جا رہے ہیں۔

ابتدائی اسکول

سابق مدراس ریاست کے مجموعی ۳۸۰۰۰ ابتدائی اسکولوں میں سے اندھرا کے ضلعوں میں ۱۷۴۰۲ اسکول تھے جن میں سے ۶۱۳ سرکاری اسکول تھے اور ۶۸۴۴ اسکول ڈسٹرکٹ بورڈوں کے تحت تھے جن میں پنچایتوں کے اسکول بھی شامل ہیں اور ۲۴۲ اسکول میونسپلٹیوں کے تھے اور بقیہ اسکول پرائیویٹ تھے۔

ثانوی اسکول

گزشتہ پانچ چھ سال کے دوران میں اندھرا ریاست میں ثانوی اسکولوں کی تعداد ۸۰۰ سے دوگنی ہو کر ۱۶۰۰ ہو گئی ہے۔

کلچر

اندھرا کا کلچر بہت پرانا ہے۔ اندھرا کے باشندے بھی تامل ناڈو باشندوں کی طرح پرانے زمانے میں دکن کے حکمراں رہ چکے ہیں۔ مسٹر ونسنٹ اسمتھ نے ان کے بارے میں لکھا ہے کہ چندر گپت موریہ کے زمانے میں اندھرا کے باشندے ہندوستان کے مشرق میں گوداوری اور کرشنا دریاؤں سے سیراب ہونے والی سرزمین پر قابض تھے اور اس وقت ان کی فوجی طاقت اتنی زبردست تھی کہ اسے چندر گپت موریہ کی فوجی طاقت کے بعد دوسرا درجہ دیا جاتا تھا۔

وجے نگر خاندان کے حکمران کرشنا دیوا رائے کے زمانہ حکومت میں اندھرا کا کلچر ترقی کی حد معراج کو پہنچ چکا تھا۔ اس خاندان کے بادشاہ فنون لطیفہ اور مذہبیت کے بے حد دلدادہ تھے۔ اٹھارھویں صدی کے وسط میں یہاں فن موسیقی میں کافی ترقی ہوئی۔ اور موسیقی کے آلات ایجاد ہوئے۔ یہ قدیمی روایات اب بھی چلی آ رہی ہیں چنانچہ اندھرا کو اب بھی موسیقی اور شاعری کے "جنم بھوم" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

دکن اور اتر کی موسیقی کی اکاڈیمیوں کی تحقیقات سے اب موسیقی سے دلچسپی رکھنے والے تقریباً سب لوگ جان گئے ہیں کہ موسیقی میں اندھرا کا کتنا حصہ ہے اور ہر شخص مانتا ہے کہ تھائی اگا راجا کو موسیقی اور شاعری میں کتنا بلند درجہ حاصل ہے۔ تیلگو زبان کی جیسی خدمت تھائی اگا راجا نے کی ہے کسی نے نہیں کی۔ یہ تھائی اگا راجا ہی کے گیت ہیں جنھیں آج بھی سارے دکنی ہندوستان میں بڑے بڑے کوی گاتے ہیں اور امید ہے کہ شمالی ہندوستان میں "کارناٹک موسیقی" کا عام رواج ہو جانے پر وہاں کے گوی بھی تھائی اگا راجا کے گن گاتے نظر آئیں گے۔

اندھرا کا ایک دوسرا مشہور شاعر پوٹانا گزرا ہے اسے تیلگو ادب میں تقریباً وہی حیثیت حاصل ہے جو ہندی ادب میں تلسی داس کو اور بنگالی ادب میں چنڈیدا کو۔

موسیقی اور رقص کے فنون کے علاوہ اندھرا دیس کی ایک خاص چیز عوامی گیت بھی ہیں جو وہاں کے کسان عورت مرد کھیت جوتنے یا دوسرے کاموں میں مشغولیت کی حالت میں گاتے نظر آتے ہیں۔ ان گیتوں میں زیادہ تر عام زندگی سے متعلق واقعات اور تخیلات پائے جاتے ہیں۔

بھگوت سروپ گوئل

آفتابی قوت کا استعمال

قریب تین سال قبل نیشنل فزیکل لیبارٹری نے آفتابی قوت کے استعمال پر تحقیقات شروع کیں۔ گزشتہ سال ایک آفتابی انگیٹھی کی ایجاد عمل میں آئی۔ لیکن بڑے پیمانے پر اور ایک معقول قیمت پر تیاری کے لئے اور تجربات کی ضرورت تھی۔ آخر بمبئی کی مشہور فرم میسرز دیوی دیال میٹل انڈسٹریز نے اس کی تیاری بڑے پیمانے پر شروع کر دی اور اب ایسی انگیٹھی اسّی روپیہ میں بازار میں فروخت ہو رہی ہے۔

آفتابی انگیٹھی میں ایلومینیم کا ایک چمکدار عاکس لگا ہوا ہے جس کا قطر چار فٹ ہے۔ یہ عاکس سورج کی شعاعوں کو ایک برتن پر ڈالتا ہے۔ یہ آفتابی انگیٹھی بجلی کی چار سو واٹ کی انگیٹھی کا کام دیتی ہے اور اس سے تین چار اشخاص کا کھانا بخوبی پک سکتا ہے۔ اس کے استعمال کے لئے زیادہ لاگت درکار نہیں ہے۔ وقتاً فوقتاً جالی کو تبدیل کرنا پڑتا ہے۔ بمبئی میں تجربات کئے گئے ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ چاول اور سبزیاں پکانے کے لئے جس پچیس منٹ کا عرصہ درکار ہے۔ قریب آدھ سیر پانی اُبالنے کے لئے پندرہ منٹ چاہئیں۔ دہلی میں پکانے کے لئے اور بھی کم عرصہ درکار ہے۔ چنانچہ چاول و سبزیاں پندرہ منٹ میں ہی پک کر تیار ہو جاتی ہیں۔ دہلی میں جلد پکنے کی وجہ یہ ہے کہ دہلی میں بمبئی کے مقابلتاً ہوائیں کم تیز ہیں۔ دھواں بھی کم ہے اور نمی بھی اتنی زیادہ نہیں ہے۔ اس انگیٹھی کا استعمال نہایت سیدھا سادہ ہے۔ صرف ہر آدھ گھنٹے کے بعد عاکس کو سورج کی بدلتی سمت کے ساتھ موڑوں کرنا ہوتا ہے۔

آفتابی قوت کا اس طرح استعمال مستقبل کے لئے ایک نہایت خوش آئند پیش قدمی ہے۔ اور ہندوستان کے لئے تو جہاں دھوپ کی افراط ہے یہ ایجاد اور سورج کی شعاعوں کا اس طرح استعمال بہت ہی اہمیت رکھتا ہے۔ آفتابی قوت نہ صرف مفت ہی ملتی ہے بلکہ اس کی افراط بھی ہے معتدل آب و ہوا والے علاقوں میں موسم گرما کے عام مہینے میں ایک ایکڑ زمین جس قدر حرارت حاصل کرتی ہے وہ اسّی ٹن کوئلے کے جلنے سے پیدا شدہ حرارت کے برابر ہے۔ ایک سال میں سورج جتنی حرارت دیتا ہے وہ ۴۰۰،۰۰۰،۰۰۰،۰۰۰،۰۰۰،۰۰۰،۰۰۰ ٹن کوئلے کے جلنے سے میسر ہوتی ہے۔ یا یوں کہئے کہ ہر کیلو سورج ۱۳۰،۰۰۰ ہارس پاور قوت مفت مہیا کر رہا ہے۔ اگر ہم اس قدر قوت کا استعمال کر سکیں تو رہائش وغیرہ کے معیار میں حیرت انگیز اضافہ کر سکتے ہیں۔ قریب ستر سال ہوئے ایڈیسن کے ایک رفیق نے لکھا تھا کہ "اگر ہم ریاستہائے متحدہ امریکہ کے اس علاقے پر جو کہ زراعت کے لئے موزوں نہیں ہے پڑنے والی آفتابی شعاعوں کا استعمال کر سکیں اور ان شعاعوں میں دس فی صدی شعاعیں کارآمد بنا سکیں تب بھی ہم ۱۳۰،۰۰۰،۰۰۰،۰۰۰ کلواٹ قوت حاصل کر سکتے ہیں"۔۔۔ ہندوستان ہی کی مثال لیجئے۔ جودھپور کا رقبہ ہندوستان کے رقبے کا صرف بلم ہے۔ لیکن یہاں پر جتنی آفتابی قوت میسر ہے وہ صرف ہندوستان کے لئے ہی نہیں بلکہ تمام دنیا کے لئے کافی ہے۔

اب بھی ہم تمام آفتابی قوت کو ضائع نہیں کر رہے ہیں۔ اس کا کچھ حصہ کوئلہ، تیل، آبی و ہوائی قوتوں کی صورت میں موجود ہے، اور ہم اُن کا کچھ حد تک استعمال بھی کر رہے ہیں۔ لیکن آفتابی شعاعوں کا بڑا حصہ واپس فضا میں چلا جاتا ہے اور سائنسداں اس کا استعمال کرنے کے لئے کوشاں ہیں۔ آفتابی قوت کے استعمال سے دلچسپی کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ تیل کوئلے کے ذخیرے بڑی تیز رفتار کے ساتھ ختم ہو رہے ہیں اور یہ امر یقینی طور پر بے چینی کا سبب ہے۔

آفتابی قوت کے استعمال کی کوشش کوئی نئی چیز نہیں ہے۔ آج سے قریباً دو ہزار سال قبل ارشمیدس نے بڑے بڑے شیشے بنائے تھے جن کی مدد سے اُس نے سائیراکیوس کے رومن حملہ آوروں کا بحری بیڑہ آتشگیر کر دیا تھا۔

ارشمیدش نے سورج کی شعاعوں کی مدد سے پانی کو گرم کرنے کی کوشش بھی کی تھی۔ روجر بیکن (۱۲۷۱ء) نے بھی اس قسم کے تجربات کئے۔ لیکن اس طرف کامیابی اس صدی میں ہی حاصل ہوئی۔

پہلی جنگ عظیم سے پیشتر مصر میں ایک آفتابی انجن بنایا گیا تھا۔ قریباً ۰۰ء۱ شیشوں کی مدد سے جن کی چوڑائی دو فٹ تین انچ تھی آفتابی شعاعوں کو پکڑ کر ایک سلنڈر پر منعکس کیا جاتا تھا جس میں قریب ۰۰ء۱ گیلن پانی ہوتا تھا۔ اس طرح بھاپ بنائی جاتی تھی۔ کیلیفورنیا میں اس طرح کے آلے کی مدد سے قریباً ۰۰ء۴ گیلن پانی فی منٹ نکالا جاتا تھا۔

واشنگٹن کے سمتھسونین انسٹی ٹیوشن کے ڈاکٹر سی۔ جی۔ ایبٹ نے آفتابی شعاعوں کو ایلومینیم کے عاکسوں کی مدد سے اکٹھا کر کے تیل میں آفتابی قوت کو جمع کیا۔ اس آلہ میں کانچ کی تین نلیاں تھیں جن میں تیل بھرا ہوا تھا۔ ہر ایک نلی چھ فٹ لمبی تھی۔ یہ نلیاں دو اور نلیوں سے ڈھکی ہوئی تھیں اور بیچ کی جگہ میں خلا تھا۔ ایلومینیم کے شیشے شعاعوں کو نلیوں پر ڈالتے تھے جس سے تیل گرم ہو جاتا تھا۔ تیل کی حرارت ایک بوائلر میں بھاپ پیدا کرتی تھی۔

لیکن یہ دیکھا گیا کہ اس قسم کا بڑے سے بڑا آلہ صرف پانچ ہارس پاور قوت پیدا کر سکتا ہے۔

اس سمت میں روسی سائنسدانوں نے حیرت انگیز ترقی کی ہے۔ ۱۹۵۰ء کے قریب یہ اعلان کیا گیا تھا کہ سائنسدان تاشقند میں ایک ایسا آلہ بنا رہے ہیں جس سے ۳۰ء۰۰۰ کلو واٹ قوت پیدا ہوگی۔ بعد ازیں اسٹالن گراڈ میں سائنسدانوں نے سورج کی شعاعوں کو اکٹھا کر کے لوہا پگھلایا۔ یہ تجربہ موسم سرما میں کیا گیا تھا اور اپنی نوعیت کا پہلا تجربہ تھا۔ روسی تجربات ڈاکٹر مولیرو کی نگہبانی میں ہوئے ہیں۔ ڈاکٹر مولیرو نے ڈاکٹر ایبٹ کے شیشوں کا معائنہ کیا ہے اور اُن کی شکل کو بدل کر حیرت انگیز نتائج اخذ کئے ہیں۔ موسم سرما میں ۸۷۵ ف تک کا درجۂ حرارت حاصل کیا جا سکا ہے۔

فرانس نے بھی سورج کی قوت کے استعمال میں بہت ترقی کی ہے۔ مثلاً میوڈن کے مقام پر آفتابی حرارت کے استعمال سے شورے کا تیزاب تیار کیا گیا ہے۔ پائرینیز پہاڑی سلسلے میں مونٹ لوئی کے قلعے کے قریب فرانسیسی سائنسدان فلکس ٹرومبے نے ایک بڑی آفتابی بھٹی بنائی ہے جس میں ۰۰ء۵ ف تک درجۂ حرارت پہنچ جاتا ہے۔ ۷۵ کلوواٹ حرارت پیدا ہوتی ہے جو فی گھنٹہ ۱۳۰ پونڈ لوہا پگھلانے کے لئے کافی ہے۔

دیگر ممالک کی ترقی کو دیکھ کر آپ غالباً یہ سمجھیں گے کہ ہندوستان ابھی اس چیز میں بہت پیچھے ہے۔ یہ بات صحیح ہے۔ لیکن یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ ہندوستان میں تجربات شروع ہوئے صرف تین سال ہوئے ہیں، جبکہ دوسرے ملکوں میں قریب پچاس سال سے کوششیں جاری ہیں۔ پھر بھی ہندوستان کے سائنسدان ایک آفتابی انجمن ایجاد کرنے میں کامیاب ہو گئے ہیں، اور خوبی یہ ہے کہ دوسرے ملکوں کی طرح یہ تجربہ بہ گاہ تک ہی محدود نہیں رہے گی۔ بلکہ گھر گھر میں اس کا استعمال ہو سکے گا۔ اس چیز میں ہندوستان سب سے بازی لے گیا ہے۔

علاوہ ازیں نیشنل فزیکل لیبارٹری میں ابھی تجربات جاری ہیں، اور اب ایک ایسا انجن تیار کیا جا رہا ہے جو آفتابی شعاعوں سے قوت حاصل کرے گا، اور پانی کے نل چلانے اور کھیتی باڑی کے لئے پانی مہیا کرنے کے لئے کارآمد ثابت ہوگا۔

بھارت میں تعلیم کا مستقبل

تعلیم کو مؤثر بنانے کے سلسلے میں یہ امر ضروری ہے کہ تعلیم دینے والے کے دل میں اپنے پیشے کی عظمت موجود ہو اور اعلیٰ عادات و اطوار کا مالک ہو آج کل اس پیشے کے لوگوں کی تنخواہیں قلیل ہیں اور سماج میں اُن کو کوئی وقعت حاصل نہیں لیکن ملک کا ہر بہی خواہ اس امر کی توقع رکھتا ہے کہ اُن کی حالت کو بہتر بنانے اور اس پیشے میں کشش پیدا کرنے کے لئے جلد از جلد اقدامات کئے جائیں۔ کیونکہ غیر مطمئن استاد ملک کے لئے خطرہ ثابت ہو سکتے ہیں۔ تاہم استادوں کو بھی چاہیئے کہ وہ اپنی عادات و اطوار، جوش اور ولولے اور اپنی کارکردگی کی بدولت عوام میں عالی مقام حاصل کریں۔

نئی کتابیں اور رسالے

آبِ حیات کا تنقیدی مطالعہ

از پروفیسر سید مسعود حسن رضوی ادیب ایم اے صدر شعبۂ فارسی اُردو لکھنؤ یونیورسٹی
پبلشرز کتاب نگر دین دیال روڈ لکھنؤ۔ قیمت عمر نی جلد۔ تقطیع ۲۰×۳۰/۱۶ ۔ ضخامت ۹۶ صفحات۔ کتاب مجلد ہے اور سادہ جلد پوشش کی حامل۔

پروفیسر مسعود حسن صاحب کا نام نامی اُردو کی دنیا میں محتاجِ تعارف نہیں۔ آپ علمی و لسانی تحقیق کے کہنہ مشق اُستاد و ماہر ہیں۔ آزاد مصنفِ آبِ حیات کے خلاف معترضوں نے ایک مدت سے طوفان اُٹھا رکھا تھا۔ اُسے محض ایک چرب زبان نثّار کہا جانے لگا تھا۔ فاضل مصنف نے اس مختصر سی کتاب میں آزاد کے معترضوں کی پھیلائی ہوئی غلط فہمیوں کو دُور کیا ہے۔ ایک جگہ موصوف فرماتے ہیں:۔

"جس شخص نے اُردو کی خدمت میں جان کھپا دی۔ اپنی بے نظیر تصنیفوں سے اُردو کو مالا مال کر دیا۔ اُردو ادب و شعر کی اصلاح و ترقی کے راستے دِکھائے۔ جس نے آبِ حیات کی سی پُر از معلومات اور زندۂ جاوید کتاب دی۔ اس کی ساری محنتوں پر بے دروازہ تنقید اور بے بنیاد الزامات سے پانی پھیرنا دنیا احسان فراموشی کی انتہا ہے۔"

ہمیں اُمید کامل ہے کہ ادبی حلقوں میں پروفیسر صاحب کی یہ کاوش سعی مشکور سمجھی جائے گی۔

بال و پر

کنہیا لال کپور۔ پبلشرز لاجپت رائے اینڈ سنز اُردو بازار دہلی۔ قیمت دو روپے آٹھ آنے۔ ضخامت ۱۹۶ صفحات تقطیع ۔ ۲۰×۳۰/۱۶ ، جلد اور جلد پوش عمدہ۔ کاغذ اوسط۔ کتابت و طباعت عمدہ۔

پیش لفظ کو شامل کر لیں تو یہ کتاب پورے بائیس مضامین پر مشتمل ہے یا کرکٹ کی اصلاح میں یہ کہئے کہ یہ کتاب ایک پورا ٹیٹ بیچ ہے۔ کتاب خواجہ احمد عباس کے نام اس مصرعے سے معنون کی گئی ہے ؎ کس چیز کی کمی ہے خواجہ تیری گلی میں

کپور نے پیش لفظ میں تیز و طرار طبیعت کو لازمۂ طنز نگاری قرار دیا ہے۔ اور خود اپنے متعلق عرض کیا ہے کہ "اک دھوپ تھی جو ساتھ گئی آفتاب کے" ہر چند انھوں نے "آفتاب" کی تغیر "لاہور" سے کی ہے۔ لیکن ایسا محسوس ہوتا ہے کہ "لاہور" کو وہ جوانی کا مترادف سمجھتے ہیں۔ ع گیا ہے سانپ نکل اب لکیر پیٹا کر

اس مجموعے کے قریب قریب سبھی مضمون دلچسپ ہیں۔ لیکن کپور کا تعارف خود کپور کے قلم سے ایک بہت ہی اچھا نفسیاتی جائزہ ہے۔

اس نے اپنے جسم کے باب میں لکھا ہے "ان لمبی لمبی ہڈیوں میں زندہ رہنے کی بے پناہ قوت ہے۔ ان کی لپک میں موت کی دعوت نہیں بلکہ زندگی کا ایک مسلّم اور بے باک ڈھب پایا جاتا ہے۔"

ملاقاتیوں کا ذکر آتا ہے تو لکھتا ہے۔

"پھر چھوٹے بڑے ادیب ہوتے ہیں، چھوٹے ادیب کپور کی دلچسپ باتیں سننے کے لئے آتے ہیں۔ بڑے ادیب چاول سیاست گری پر اس سے بحث کرنے کے لئے آتے ہیں۔ رسائل کے ایڈیٹر آتے ہیں جو اپنے پرانے سال ناموں کی ہیبت کا رعب جما کر اس سے مضمون کا وعدہ مانگتے ہیں۔ ادبی کتابوں کے ناشر آتے ہیں جو کپور کی تعریفوں کے پل باندھ کر بغیر رائلٹی کے اس سے کتاب کا مسوّدہ لے جاتے ہیں۔"

کپور میں "نشتریت" ابھی پوری تیزی سے باقی ہے۔ اُس کے مزاج میں ایک سنجیدہ اور وقائی پختگی آگئی ہے۔ اب وہ زندگی کا مطالعہ بڑی سودگی سے کرتا ہے۔ تنقید کی اس آسودگی کا نام ہی مزاح ہے۔

مزاح نگار تشدد و تلخ باتیں بھی کہہ جاتا ہے۔ کپور اس سے مبرّا نہیں لیکن ہمیں ہر بات کو طنز و مزاح کی روشنی میں دیکھنا چاہیئے۔ اُمید ہے یہ مجموعہ اس سے پہلے مجموعوں کی طرح مقبول ہوگا۔

پریڈ گراؤنڈ

مصنف ہنس راج رہبر۔ پبلشرز لاجپت رائے اینڈ سنز اُردو بازار دہلی۔ قیمت فی جلد دو روپے چار آنے۔

ہنس راج رہبر ہندی اور اُردو دونوں زبانوں کے منجھے ہوئے اور مضمن ادیب ہیں۔ آپ کا یہ ناول آپ کے شعور کی بیداری کا مظہر ہے۔ "یہ جگ بیتے گا، ضرور بیتے گا اور تبھی انسان انسان بنے گا۔" ان الفاظ پر ناول ختم ہوتا ہے اور یہی الفاظ اس ناول کی رُوح ہیں۔

امرآتما

جمہوریت کے علم بردار تھامس جیفرسن کی زندگی کے حالات جیتن بنرجی کی تصنیف سے اردو میں امرآتما کے نام سے شائع ہوئے ہیں۔ پبلشرز انڈین یونیورسٹی پبلشرز کشمیری گیٹ دہلی ۶۔ مترجم کیف ایم اے۔ کیف صاحب ایک ذہین نوجوان ہیں۔ ترجمہ بڑی خوش اسلوبی سے کیا گیا ہے۔ کتاب حسین و جمیل چھپی ہے۔ قیمت کتاب پر درج نہیں۔

موصولات

لال کتاب

مشرقی دسکلی کی مثالی کہانیوں کا مجموعہ۔ مترجم ضیاء الحسن موسوی۔ قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے۔ ملنے کا پتہ۔ مرکز ادب بشن روڈ کراچی

دو تین

بنگالی کہانیاں۔ مترجم یونس اختر۔ پبلشرز مہتمم مرکز ادب کراچی۔ قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے

ایک آنسو ایک تبسم

شیخ عقیل کے بارہ مزاحیہ مضامین کا مجموعہ۔ قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے فی جلد پبلشرز مہتمم مرکز ادب بشن روڈ کراچی۔

صبح زنداں

پبلشرز، پردیس بک ڈپو ۹۱۶ یحییٰ پور الہ آباد حسن شہیر کی نظموں اور غزلوں کا مجموعہ۔ قیمت تین روپے فی جلد۔ کتاب بہت حسین و جمیل چھپی ہے۔ تعارف از آلِ احمد سرور۔

ابھرتی کرنیں

معیار میرٹھ کے منتخب افسانے اور ڈرامے۔ مرتبہ نجم الاسلام۔ مکتبہ معیار میرٹھ۔ قیمت فی جلد ڈھائی روپے۔

ماہ و انجم

پبلشرز مکتبہ شانِ ہند دہلی۔ نثار اٹاوی ایم، اے کے کلام کا مجموعہ قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے فی جلد

معرکۂ جنگ

جنگ میرٹھی کے کلام کا مجموعہ۔ قیمت فی جلد دو روپے۔ ملنے کا پتہ۔ بابو تربھی پرشاد ماتھر۔ مکان شاد صاحب۔ کوٹھی جنکشن راجستھان۔

بے گناہ

ماہ نامہ ناول کا شمارہ نمبر ۱۵۔ مصنف پی کلف۔ مترجم کریم شیر خان۔ قیمت عہ ملنے کا پتہ۔ ماہ نامہ ناول مالی اسٹریٹ صدر کراچی ۳

جنکشن بلارا

ماہ نامہ جاسوسی پنجہ۔ دریبہ کلاں دہلی ۶۔ قیمت عہ۔ مدیر۔ دتی ہلوی مصنف اکرم الہ آبادی

ہفتہ میں ناگری لکھاوٹ

پیشتر۔ ہندوستانی پرچار سبھا وردھا۔ مصنف شری یاد جوشی قیمت فی جلد چھ آنے۔ کتاب ٹائپ میں چھپی ہے۔ موضوع اور زمانے کے اعتبار سے بڑی مفید کتاب ہے۔

رسالے

نقوش

افسانہ نمبر۔ ضخامت ۵۰۴ صفحات قیمت پانچ روپے۔ ملنے کا پتہ ادارہ فروغ اردو لاہور۔ ——— آنا اچھا افسانہ نمبر شاید ہی کبھی کسی رسالے کا شائع ہوا ہو ہندوستان اور پاکستان کے قریب قریب سبھی اچھے افسانہ نگاروں نے اس رسالے میں حصہ لیا ہے۔ عصمت چغتائی، غلام عباس، منٹو، بلونت سنگھ، علی عباس حسینی، خواجہ احمد عباس، حیات اللہ انصاری، دیوندر ستیارتھی، کنہیا لال کپور، تسنیم سلیم چھتاری، سہیل عظیم آبادی، احمد ندیم قاسمی، ہاجرہ مسرور، خدیجہ مستور، شوکت تھانوی، اختر اورینوی، ابوالفضل صدیقی اور دیگر افسانہ نگاروں کے تخلیقات اس رسالے میں شامل ہیں۔

عصمت چغتائی، بلونت سنگھ، حیات اللہ انصاری اور شوکت تھانوی کے خاکے بالترتیب اخلاق احمد دہلوی، ڈاکٹر عبادت بریلوی، مکین احسن کلیم اور محمد طفیل نے تحریر کئے ہیں۔ ان میں بلونت سنگھ کا خاکہ بالخصوص قابل مطالعہ ہے۔

آخر میں اردو افسانے میں روایت اور تجربے کے عنوان سے ایک سمپوزیم ہے۔ اس میں وقار عظیم، عبادت بریلوی، منٹو، قاسمی، ہاجرہ، خدیجہ، انتظار حسین، حمید اختر اور شوکت تھانوی نے حصہ لیا ہے۔

تصویروں کے آٹھ صفحے بھی رسالے کی زینت ہیں۔

سال نامہ اردو سوسائٹی (۵۴-۱۹۵۳ء) سینٹ جوسفس کالج بنگلور

بنگلور جیسی دور افتادہ جگہ میں اردو سے دلچسپی کا یہ عالم ہے کہ ایک سو آٹھ

صفحوں پر مشتمل یہ مجلّہ وہاں سے شائع ہُوا ہے۔ مضمون نگار قریب قریب اُسی علاقے کے رہنے والے ہیں۔ جناب عبدالبشیر اردو سوسائٹی کے صدر اور اس مجلّے کی رُوحِ رواں ہیں۔ مجلس ادارہ اور موصوف لائقِ مبارک باد ہیں۔

المجید

مجیدیہ اسلامیہ سائنس کالج الٰہ آباد کے آرگن کا سال نامہ اُردو، انگریزی اور ہندی میں شائع ہُوا ہے۔ اُردو کے لئے ۴۸ صفحات وقف ہیں۔ طلباء کے مضامین ان کی استعداد کے مطابق نہایت اچھے اور سلجھے ہوئے ہیں۔ محمد ریاض الدین احمد صاحب پرنسپل اور سیّد واصف حسین صاحب چیف ایڈیٹر کی یہ مساعی مشکور و داد کی مستحق ہیں۔

رہنمائے تعلیم

رسالہ رہنمائے تعلیم کا گلِ صدرنگ، بمرآب و تاب سے چھپا ہے۔ قیمت فی شمارہ دو روپے، سالانہ چندہ ۵ روپے ۹ آنے۔ سردار صاحب ماسٹر رگبیت سنگھ بی۔ اے سونت جال واقع ہوئے ہیں۔ قریب قریب پچاس سال سے وہ یہ رسالہ نکال رہے ہیں۔ زیرِ نظر شمارہ اچھے مضامین اور نظموں پر مشتمل ہے۔

پنج سالہ پلان

سوالات و جوابات

پلاننگ کمیشن نے جو پنج سالہ پلان تیار کیا ہے وہ ایک ہزار سے زیادہ صفحات پر مشتمل ہے۔ ظاہر ہے کہ اس قدر ضخیم کتاب کے پڑھنے کے لئے بہت وقت اور فرصت درکار ہے۔ "سوالات و جوابات" کے نام سے جو کتاب مرتّب کی گئی ہے وہ ۲۷ صفحات پر مشتمل ہے اور اس میں تمام اہم امور سوال و جواب کی صورت میں بیان کر دئے گئے ہیں۔

قیمت چار آنے

بزنس منیجر پبلیکیشنز ڈویژن اولڈ سیکرٹریٹ دہلی ۸



گلے کی خرابی کو روکئے!

● بار بار گلے کا خراب ہونا، حلق میں سوزش ہونا، تھوک کا حلق میں اٹکنا یوں بھی تکلیف دہ ہے۔ لیکن گلے کی خرابیوں کو معمولی سمجھ کر کبھی نظر انداز نہ کیجئے



سُعالین

کی ایک ٹکیہ منہ میں رکھکر آہستہ آہستہ چوسئے۔ یہ نہ صرف گلے کی خرابیوں کو دُور کرے گی۔ زکام و کھانسی کو تسکین دے گی۔ بلکہ طبیعت کو سکون بخشے گی اور سانس کو خوشگوار بنائے گی۔ قیمت فی شیشی بارہ آنے

حمدرد دواخانہ (وقف) دہلی

Hamdard DAWAKHANA (TRUST) DELHI

رفتارِ زمانہ

گاندھی گیان مندر کا افتتاح

وردھا میں گاندھی گیان مندر کا افتتاح کرتے ہوئے پردھان منتری شری جواہر لال نہرو نے کہا کہ ہمارا یہ وشواس اب زیادہ مضبوط ہو گیا ہے کہ مہاتما گاندھی کے بتائے گئے راستے پر چل کر ہی ہم ترقی کر سکتے ہیں اور اپنے ملک اور دنیا کی خدمت کے لئے آگے بڑھ سکتے ہیں۔

یوم جمہوریہ کے موقع پر صدر کا نشریہ

صدر جمہوریہ ڈاکٹر راجندر پرشاد نے آل انڈیا ریڈیو سے ایک تقریر نشر کرتے ہوئے عوام سے اپیل کی خوش حال اور پُر مسرت بنانے کی اپیل کی۔ صدر جمہوریہ نے اپنے نشریہ میں کہا کہ ہم ہندوستان میں ایک فلاحی ریاست قائم کرنے کا تہیہ کئے ہوئے ہیں۔ اس قسم کی حکومت کا فرض ہے کہ وہ عوام کے معیارِ زندگی کو بلند کرے تاکہ وہ اُن کی بنیادی ضروریات کو پورا کر سکے۔

مہاراجہ بھوٹان کی عزت افزائی

مہاراجہ بھوٹان کے بھارت میں آنے پر راشٹرپتی کی طرف سے اُن کو ایک خاص تمغہ پدم وبھوشن پیش کیا گیا ہے۔ یہ تمغہ صحیح معنوں میں عوام کی خدمت کرنے والوں کے لئے معین کیا گیا ہے اور سب سے پہلے اسے بھوٹان کے مہاراجہ کو دیا گیا ہے۔ سونے کے تمغہ پر ایک طرف کنول کی تصویر اور اُس کے ساتھ پدم وبھوشن کے الفاظ کندہ ہیں۔ دوسری طرف بھارت کے قومی نشان کے ساتھ نیچے 'دیش سیوا' کے الفاظ عبور ہیں۔

مصر میں نازک صورت حال

مصر میں حالات پھر خطرناک صورت اختیار کر رہے ہیں۔ مصر کے صدر جنرل نجیب نے ملک بھر میں ہنگامی حالات کا قانون نافذ کر دیا ہے۔ مسلم برادر ہڈ کے سینکڑوں ممبر گرفتار کئے جا رہے ہیں۔ گرفتاریوں کی تعداد ایک ہزار سے زائد تک پہنچ گئی ہے۔ تمام بڑے بڑے شہروں میں فوج گشت کر رہی ہے اور حالات قابو میں ہیں۔

ریاست جموں و کشمیر کا ہندوستان کے ساتھ الحاق

کشمیر دستور ساز اسمبلی نے بنیادی اصولوں کی کمیٹی اور بنیادی حقوق و شہریت کمیٹی کی مشترکہ طور پر طیار کی ہوئی رپورٹیں منظور کر لی ہیں جن میں ہندوستان کے ساتھ ریاست جموں و کشمیر کے مکمل الحاق کی سفارش کی گئی ہے۔

اس موقعے پر ریاست جموں و کشمیر کے وزیر اعلیٰ بخشی غلام محمد نے کہا کہ یہ دن کشمیر کی تاریخ میں یادگار رہے گا۔ کیونکہ آج اس ریاست کے لوگوں کی دیرینہ تمنائیں پوری ہو رہی ہیں۔ پچھلے ۷ سال کے اندر ریاست کے لوگوں نے کئی بار سنجیدگی سے اس الحاق کی تصدیق کی ہے۔ یہ فیصلہ خوب سوچ سمجھ کر کیا گیا ہے۔ اس کو تو منسوخ کیا جا سکتا ہے اور نہ دنیا کی کوئی طاقت ہندوستان اور کشمیر کے اس تعلق کو بدل سکتی ہے۔

بھودان یگیہ کی کامیابی

آل انڈیا بھارتی سیوا سنگھ کے آفس سیکرٹری نے اعلان کیا ہے کہ گذشتہ پانچ جنوری تک حاصل شدہ اعداد و شمار سے یہ معلوم ہوا ہے کہ آچاریہ ونوبا بھاوے کے بھودان یگیہ میں اب تک چودہ لاکھ سات ہزار تیس ایکڑ زمین مل چکی ہے۔ اُس میں سے چالیس ہزار سات سو بیتالیس ایکڑ زمین غریب کسانوں میں تقسیم بھی کی جا چکی ہے۔ یہ زمین چھ صوبوں کے ۵۵۱ خاندانوں میں تقسیم ہوئی ہے اور سب سے زیادہ زمین صوبہ بہار کے حصے میں آئی ہے۔

خان عبدالغفار خان کی رہائی

خان عبدالغفار خان کی رہائی پر ہندوستان بھر میں مسرت و اطمینان کا اظہار کیا گیا۔ ہندوستان کی تحریکِ آزادی میں خان عبدالغفار خان اور اُن کے ساتھیوں نے جس وفاداری اور بہادری سے کانگریس کا ساتھ دیا۔ اُسے بھارت کے عوام کبھی نہیں بھلا سکتے۔ بھارت کی جنگِ آزادی میں پٹھانوں کی بے مثال قربانی سنہری حرفوں میں لکھی جائے گی۔

لنکا کے وزیر اعظم کا بیان

لنکا کے وزیر اعظم سرجان کوٹلا والانے بمبئی کے ایک خیر مقدمی جلسے میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ اگر ایشیا کے ساٹھ کروڑ عوام متحد ہو جائیں تو وہ تیسری جنگ کو روک سکتے ہیں۔

وزیر اعظم لنکا نے کہا کہ مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ ایشیا کے چار یا پانچ وزرائے اعظم نئی دہلی کے اجلاس میں ایک کانفرنس میں شریک ہونے کے لئے تیار ہو گئے ہیں۔ سرجان نے کہا کہ اس کانفرنس کا مقصد ایک دوسرے کے نقطۂ نظر کو سمجھنا ہے۔ ہم جنگ سے پریشان نہیں ہیں۔ ہمارے سامنے تو اپنے عوام کے کھانے اور کپڑے کے مسائل ہیں۔ ہمیں ان مسائل کو حل کرنے کے لئے متحد ہو جانا چاہیئے۔ جنگ سے دنیا خوش حال نہیں بن سکتی ہے۔ اگر ہم جنگوں پر روپیہ صرف کرنے کے بجائے اس روپیہ کو عوام کی بہبود پر صرف کریں تو یقیناً ایک بہتر دنیا بنا سکتے ہیں۔

لنکا کے ہندوستانیوں کے مسائل پر اظہار خیال کرتے ہوئے سرجان کوٹلا والا نے کہا کہ یہ مسئلہ آپس کی غلط فہمیوں سے پیدا ہوا ہے۔ لنکا ایک چھوٹا سا ملک ہے وہ ساری دنیا کو اپنے یہاں آباد کرنے کی دعوت نہیں دے سکتا۔ لیکن اب یہ مسئلہ دوستانہ طور پر حل ہو گیا ہے اور اب دونوں ملکوں کے عوام دوستانہ فضا میں رہ سکتے ہیں۔ سرجان نے ہندوستان کے وزیر اعظم کو زبردست خراج عقیدت پیش کیا۔

انھوں نے کہا کہ پنڈت نہرو اس صدی کی سب سے بڑی شخصیت ہیں۔

سرجان کوٹلا والا نے کہا کہ آپ کے وزیر اعظم انسانیت کے نقطۂ نظر سے مسائل کو دیکھتے ہیں۔ آپ لوگ یقیناً خوش قسمت ہیں کہ آپ کو اتنا عظیم وزیر اعظم ملا ہے۔

وزیر اعظم لنکا نے بمبئی کے صنعت کاروں کو دعوت دی کہ وہ لنکا میں سرمایہ لگائیں۔ ہم آپ کا اپنے ملک میں فراخ دلی کے ساتھ استقبال کریں گے۔

بھارت کی خوراک کے معاملے میں اطمینان بخش حالت

خوراک کے معاملے میں خود کفیل بننے کے لئے بھارت تیزی سے آگے قدم بڑھا رہا ہے۔ ۱۹۵۲ء میں جہاں فصلیں ملک بھر میں اچھی تھیں وہاں ۱۹۵۳ء میں پوزیشن اس سے بھی بہتر ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اناج کی قیمتوں میں ہر جگہ کمی واقع ہوئی ہے۔ اب حالت یہ ہے کہ موٹے اناج سے ہر پردیش میں کنٹرول اٹھ گیا ہے اور سوراشٹر و مدھیہ بھارت اور اتر پردیش کے گیارہ ضلعوں کو چھوڑ کر چنے پر سے بھی کنٹرول ہٹ گیا ہے۔ چند ماہ پیشتر گندم سے بھی پابندیاں ہٹائی گئیں۔ صرف چاول پر ابھی تک کنٹرول ہے لیکن چاول کی فصل میں بھی نمایاں بہتری ہوئی ہے۔ اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ جہاں ۱۹۵۱ء اور ۱۹۵۲ء میں سات لاکھ ٹن چاول باہر سے منگوائے گئے وہاں ۱۹۵۳ء میں صرف ۴۶ لاکھ ٹن چاول ہی برآمد کئے گئے۔ ۱۹۵۴ء میں دیش کی ضروریات کے لئے موجودہ ذخیرے ہی کافی ہوں گے۔ صرف اسٹاک کو ریزرو رکھنے کے لئے باہر سے چاول کی تھوڑی مقدار برآمد کی جائے گی۔

آل انڈیا کانگریس کے اجلاس میں پردھان منتری کی تقریر

کلیانی میں آل انڈیا کانگریس کا اجلاس اپنی روایتی شان کے ساتھ منعقد ہوا۔ متعدد ریزولیشن جو پاس کئے گئے ان میں سے ایک کو ریا کے متعلق تھا۔ اور دوسرے میں خان عبدالغفار اور دیگر سرخپوش لیڈروں کی رہائی پر مسرت کا اظہار کیا گیا۔ بھارت کی خارجہ پالیسی کی قرارداد پر تقریر کرتے ہوئے پردھان منتری شری جواہر لال نہرو نے اعلان کیا کہ خواہ ہم سے کتنی ہی غلطیاں سرزد ہوئی ہوں لیکن ہم پوری دیانت داری اور وشواس کے ساتھ کہتا ہوں کہ ہمیں کسی سے کوئی خطرہ نہیں۔ ہندوستان کی خارجہ پالیسی وقتی نہیں بلکہ ایک بنیادی چیز ہے جس کو قائم رکھنے کے لئے ہمیں ایٹم بموں تک کی پروا نہیں۔ ہمارے کچھ اصول ہیں جو بنیادی اور آخری ہیں، اور ان میں تبدیلی نہیں کی جا سکتی۔ بھارت اپنے طور پر سوچنے اور اس پر عمل کرنے کے اصولی کو کسی حالت میں قربان نہیں کر سکتا، اور دنیا کی طاقتیں اب اس امر سے آگاہ ہیں۔ ہم کسی ملک سے فوجی معاہدے کے لئے طیار نہیں اور ہماری پالیسی تمام قوموں کے ساتھ دوستی اور پُر امن اشتراک عمل پر مبنی ہے۔

سستے مکانوں کی بین الاقوامی نمائش

نئی دہلی میں سستے مکانوں کی بین الاقوامی نمائش کا افتتاح کرتے ہوئے راشٹرپتی ڈاکٹر راجندر پرشاد نے عمارتیں بنانے کے لئے سستے سامان کی کھوج اور تعمیر کرنے کے نئے طریقوں کو اس ڈھنگ سے مروج کرنے پر زور دیا جس سے سستی سے سستی قیمت پر مکان طیار ہو جائیں اور سامان کی بھی کمی واقع نہ ہو۔ آپ نے فرمایا کہ اس ملک کے اُن مقامات کے لوگ جہاں مکانوں کی کمی نے تشویشناک صورت حال پیدا کر دی ہے اس نمائش اور اس سے متعلقہ گفت و شنید کے نتائج کو پُر امید نگاہوں سے دیکھ رہے ہیں۔ مجھے اُمید ہے کہ ان کوششوں کے نتیجے کے طور پر اس دیش میں مکانوں کی تعمیر کے کام کی حوصلہ افزائی ہوگی اور زیادہ سے زیادہ لوگ اپنے لئے مکان تعمیر کرانے میں کامیاب ہوں گے۔



بلونت کمار ساگر

ہمّت

مصیبت سے تم کو چھڑائے گی ہمّت　　مسرّت کے جلوے دکھائے گی ہمّت
زمانے میں شہرت دلائے گی ہمّت　　جواں مرد تم کو بنائے گی ہمّت
کئے جاؤ ہمّت کئے جاؤ ہمّت

اگر کام کرنے سے گھبراؤ گے تم　　تو کاہل زمانے میں کہلاؤ گے تم
مصیبت میں آفت میں گھر جاؤ گے تم　　گزر جائے گا وقت پچھتاؤ گے تم
کئے جاؤ ہمّت کئے جاؤ ہمّت

اگر بوجھ بھاری اُٹھانا ہے تم کو　　اگر دُور منزل پہ جانا ہے تم کو
اگر کام بگڑا بنانا ہے تم کو　　اگر رَن میں جوہر دکھانا ہے تم کو
کئے جاؤ ہمّت کئے جاؤ ہمّت

ہوا کیا اگر سر پہ آفت کھڑی ہے　　ہوا کیا اگر رنج و غم کی گھڑی ہے
ہوا کیا جو مشکل کوئی آ پڑی ہے　　ہوا کیا جو منزل تمھاری کڑی ہے
کئے جاؤ ہمّت کئے جاؤ ہمّت

راشد حسن قادری

جج کا قرض

دو لڑکے لندن کے ایک مشہور اسکول میں پڑھتے تھے۔ وہ دونوں آپس میں بہت دوست تھے۔ پہلا لڑکا جس کا نام نکولس تھا بہت شرمیلا اور ڈرپوک تھا لیکن دوسرا لڑکا ڈیک نہایت بہادر، دلیر اور جنگجو تھا۔ وہ دونوں ایک ہی درجے میں پڑھتے تھے۔

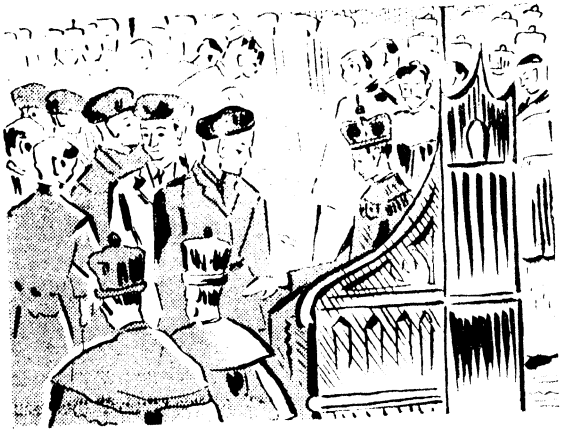
ایک روز ماسٹر صاحب کلاس سے اُٹھ کر کسی کام سے باہر چلے گئے۔ ماسٹر صاحب کا اُٹھنا تھا کہ لڑکوں نے کمرے میں شور وغل مچانا شروع کر دیا۔ کمرے میں ایک طرف پردہ لٹک رہا تھا نکولس نے اس پردے کو پھاڑ دیا اور چپکے سے پھٹی ہوئی جگہ چھپا کر اسے بہت احتیاط سے لٹکا دیا۔ ماسٹر صاحب کے آنے سے پہلے سب لڑکے چُپ چاپ بیٹھ گئے۔ جب ماسٹر صاحب آئے تو سب لڑکوں کو خاموش بیٹھا دیکھ کر انھیں کچھ شُبہ ہوا۔ انھوں نے کمرے میں چاروں طرف نظر ڈالی تو ان کو پردہ نظر آیا۔ ماسٹر صاحب نے پردہ اُٹھایا اور پھٹا ہوا پا کر بہت غُصّے ہوئے اور سب لڑکوں سے ایک ایک کر کے پُوچھنا شروع کیا کہ یہ کس نے پھاڑا ہے مگر کسی نے نہیں بتایا۔ آخر جب نکولس کا نمبر آیا تو چونکہ اس کا قصور تھا اس وجہ سے وہ چُپ ہو گیا اور سر جُھکا لیا۔ اس کی اس حرکت سے ماسٹر صاحب سمجھ گئے کہ اس نے ہی پھاڑا ہے مگر پھر بھی انھوں نے اور لڑکوں سے پُوچھا تو ڈیک فوراً بول اُٹھا کہ میں نے پھاڑا ہے ماسٹر صاحب نے ڈیک کو اسکول کے ہال میں لے جا کر سب لڑکوں کے سامنے سزا دی اور شرمندہ کیا۔



جب اسکول کی چھٹی ہوئی تو سب لڑکوں نے ڈیک کی تعریف کی اور نکولس کو خوب شرمندہ کیا۔ نکولس نے ڈیک کا بہت شُکریہ ادا کیا اور وعدہ کیا کہ میں ضرور کبھی نہ کبھی تمہارے اس احسان کا قرضہ ادا کروں گا۔

اس واقعہ کو چالیس برس گزر گئے اور یہ دونوں دوست جُدا ہو گئے اور ایک کو دوسرے کے بارے میں کچھ بھی نہ معلوم ہو سکا۔ نکولس جو ڈرپوک تھا اور لڑائی

سے نفرت کرتا تھا جج بن گیا اور وَیک جو جنگجو اور بہادر تھا سپاہی ہو گیا۔



ایک مرتبہ انگلستان میں بڑی خانہ جنگی ہوئی جس میں دو فریق ہو گئے ایک تو شاہ انگلستان کے ساتھی اور دوسرے بادشاہ کے مخالف۔ وَیک بادشاہ کے مخالفوں میں تھا۔ اس جنگ میں شاہ کے ساتھیوں کی فتح ہوئی اور باغیوں کو پھانسی کی سزا دی گئی۔ جب حکم سُنانے کا دن آیا تو شاہ انگلستان نے جج نکولس کو لندن سے فیصلے کے لئے بھیجا۔ جج نکولس عدالت میں سُرخ پوشاک پہن کر آیا۔ سُرخ پوشاک جج اُس وقت پہنتے ہیں جب کسی خون کے مقدمے میں موت کا حکم سُنایا جاتا ہے۔ جج کے سامنے ملزموں کو ایک ایک کر کے پیش کیا گیا جب وَیک حاضر ہوا تو نکولس نے اسے فوراً پہچان لیا۔ عدالت کی طرف سے وَیک سے سوال کئے گئے تو اس نے صاف صاف کہہ دیا کہ میں نے بغاوت کی تھی۔ اس کے جواب پر اُسے پھانسی کا حکم دے دیا اور چار دن کے لئے قید خانے میں رکھنے کا حکم دیا گیا۔ عدالت ختم ہونے کے بعد نکولس گھبرایا ہوا سیدھا اپنے کمرے میں گیا اور وہاں جا کر معمولی کپڑے پہن کر تیز سے تیز گھوڑے پر سوار ہو کر لندن کو روانہ ہوا۔ لندن پہنچ کر سیدھا بادشاہ سے ملنے محل میں پہنچا اور اور اس کے کمرے میں گیا تو بادشاہ نے پُوچھا "کیا تم جج نکولس ہو"۔

نکولس نے جواب دیا "جی حضور کا خیال درست ہے"۔

بادشاہ نے پُوچھا "ایسی گھبراہٹ میں کیوں آئے"

نکولس نے کہا "مجھے ایک پُرانا قرض ادا کرنا ہے اس میں آپ سے مدد لینے کی ضرورت ہے"۔

بادشاہ نے پُوچھا "وہ کیسا قرضہ ہے"؟

نکولس نے اسکول کا سارا قصہ پردہ پھٹنے کا سُنا دیا کہ کس طرح وَیک نے اس کی جگہ سزا پائی اور اس نے وعدہ کیا تھا کہ کبھی نہ کبھی جب وہ اس قابل ہو گا تو اس کا بدلہ دے گا۔ بادشاہ نے کہا "اب تو سزا مل چکی ہے"۔ نکولس نے جواب دیا کہ "اگر آپ اسے نہیں چھوڑ سکتے تو اس کے عوض مجھے پھانسی دے دیجئے ورنہ اسے چھوڑ دیجئے"۔ یہ سُن کر بادشاہ نے کہا "اگر ایسا معاملہ ہے تو میں اسے رہا کرتا ہوں"۔ یہ کہہ کر اس نے کاغذ پر معافی نامہ لکھ دیا۔ نکولس اُسے لے کر سیدھا قید خانے میں گیا اور وَیک کی کوٹھڑی میں جا کر اُس کے گلے میں باہیں ڈال دیں اور کہا "دیکھو وَیک یہ معافی نامہ ہے۔ میں نے اپنا قرضہ ادا کر دیا"۔ وَیک رہا کر دیا گیا۔

اعجاز فاطمہ حیدر

واسکوڈی گاما



بچو! تم نے شاید اس سے پہلے بھی پرتگال کے کسی کھوج لگانے والے کا نام سُنا ہو اور ہو سکتا ہے کہ آج میں جس دلیر انسان کے حالات بتانا چاہتی ہوں اس کے بارے میں پہلے ہی تم بہت کچھ سُن چکے ہو۔

سمندروں کے سینے کو چیر کر دور دراز ملکوں کے کھوج لگانے والے کتنے بہادر ہو سکتے ہیں آج ہمارے لئے یہ سوچنا تک دشوار ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ اب آدمی نہ صرف پانی کا سفر آسانی کے ساتھ بڑے بڑے جہازوں پر بیٹھ کر طے کر لیتا ہے بلکہ ہوائی جہاز کی ایجاد کی وجہ سے ہوا ہمیں پروں پر چند گھنٹوں میں دنیا کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک اڑا لے جاتی ہے۔

چار پانچ سو سال پہلے پانی کے طویل سفر کا ارادہ گویا دوسرے معنوں میں مَوت کو دعوت دینے کے برابر تھا لیکن مَوت سے زندگی زیادہ طاقتور اور باہمّت ہے اور جب تک انسان زندہ ہے وہ مَوت کے مقابلے میں ہار نہیں مان سکتا یہ تھا وہ مضبوط خیال جو واسکوڈی گاما کے دل میں بیٹھا ہوا تھا جب وہ ہمارے دیش یعنی ہندوستان کے راستے کا کھوج لگانے کے لئے پرتگال کے ساحل سے اپنے دوسرے ساتھیوں کے کے ساتھ روانہ ہوا دستور کے مطابق ساحل پر اچھے اچھے لباس پہنے ہوئے پادری اور سیکڑوں تماشائی جمع تھے جب یہ قافلہ ساحل پر پہنچا تو ان میں سے ہر ایک نے گھٹنے ٹیک کر ان مذہبی پیشواؤں سے دعائیں لیں۔ سب نے انھیں خدا حافظ کہا اور پھر ان چاروں جہازوں کے بادبان کھول دئے گئے۔ چپّو تیزی سے سمندر کی لہروں پر بل کھانے لگے یہاں تک ــــ کہ یہ چاروں جہاز ساحل پر کھڑے ہوئے مجمع کی نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ یہ ۱۴۹۷ء کی ایک خوشگوار صبح کا واقعہ ہے۔

وہ جہاز آج کے جیسے جنگی اور بڑے جہاز نہ تھے لیکن ان کو اتنی مضبوطی سے بنایا گیا تھا کہ اس دور دراز سفر کو طے کر لینے کی صلاحیت ان میں موجود تھی اور پھر سب سے زیادہ بڑی بات یہ تھی کہ ان جہازوں کے مسافر ارادے کے پکّے تھے اور اپنے مقصد کی دُھن میں اس سے کہیں بڑے سفر کرنے کا حوصلہ ان میں موجود تھا۔

پچاس سال پہلے سے پرتگالی جہاز راں افریقہ کے پچھمی ساحل کے چکّر مار رہے تھے اور آہستہ آہستہ ان کی منزل دکھن کی طرف بڑھ رہی تھی۔ شروع شروع ان میں ہمّت نہ تھی

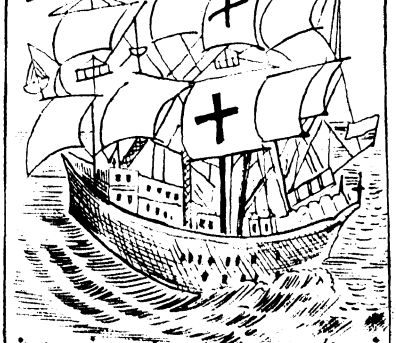
کہ وہ سمندر میں اتنی دُور تک چلے جائیں ۔ جہاں ساحل ان کی نظروں سے اوجھل ہو جائے لیکن جیسا کہ تم کو معلوم ہو گا پرتگالی پیدائشی جہازران ہوتے ہیں اس لئے جلد ہی ان کا حوصلہ اتنا بڑھ گیا کہ وہ لہروں کے سینے پر جان کی بازی لگانا سیکھ گئے ۔

اس زمانے میں یورپ والوں کے لئے ہندوستان ایک سونے کی چڑیا تھا ہمارا ملک ان دنوں ململ اور ریشم کے کپڑے، مسالوں سونے اور بیش بہا جواہرات کے لئے ساری دنیا میں مشہور تھا ترکوں اور یورپ کی قوموں سے دشمنی ہونے کی بناء پر یہ ممکن نہ تھا کہ خشکی کے راستے سے یہ سامان ترکوں کی اجازت کے بغیر مشرق سے مغرب جا سکے ۔ چونکہ اس زمانے میں مشرق کی ساری تجارت مسلمانوں کے ہاتھوں میں تھی اس لئے یورپ کی بہت سی قومیں اسی فکر میں تھیں کہ کسی نہ کسی طرح مشرق تک پہنچنے کے لئے نئے راستے معلوم کئے جائیں تاکہ مشرق سے تجارت براہِ راست کی جا سکے ۔

واسکوڈی گاما سے پہلے پرتگال کے بعض کھوج لگانے والے کیپ آف گڈ ہوپ تک جو افریقہ کے دکھن میں ہے پہنچ چکے تھے ۔ اور انھیں وہ راستہ نظر آنے لگا تھا جس کے ذریعے ہمارے دیش تک پہنچا جا سکتا تھا ۔ اس طرح راستے کا پتہ لگ جانے کے بعد یورپ کی دوسری قوموں کے کھوج لگانے والے چل کھڑے ہوئے اور اس سلسلے میں کولمبس کا نام سب سے زیادہ قابلِ ذکر ہے جو اسپین کے نمائندے کی حیثیت سے اس مہم پر روانہ ہوا تھا ۔ لیکن ہندوستان کے عوض امریکہ پہنچ گیا ۔

اِدھر پرتگال کے بادشاہ نے بھی ایک ایسی مہم بھیجنے کا ارادہ کیا جو بغیر ہندوستان کا پتہ لگائے واپس نہ آئے ۔ واسکوڈی گاما اس وقت چھتیس سال کا ایک تجربہ کار جہازراں تھا بہادر اور لوہے کی طرح مضبوط ارادے والا ۔ اور اسی لئے لوگ جانتے تھے کہ یا تو وہ ہندوستان پہنچ کر دم لے گا یا پھر پرتگال کی سرزمین پر زندہ قدم نہ رکھے گا ۔

جیسے ہی واسکوڈی گاما کیپ وارڈے کے جزیروں سے روانہ ہوا اس کو ایک بڑے زبردست طوفان کا سامنا کرنا پڑا بچتے اس کے کہ وہ ڈر کر واپسی ہو جاتا اس نے اور پکا ارادہ کر لیا کہ وہ سفر جاری رکھے گا ۔ یہ لوگ مہینوں سمندر کے ایک اَن جانے راستے پر چلتے رہے اور آخر کار ان کے جہاز سینٹ ہیلن بے میں داخل ہو گئے ۔ یہاں انہوں نے تازہ خوراک اور پانی حاصل کرنے کے لئے تھوڑا قیام کیا اور روانگی کے تھوڑے ہی عرصے بعد راس اُمید تک پہنچ گئے ۔ خوش قسمتی دیکھئے کہ اس وقت سمندر میں طوفان نہ تھا اور ہوائیں بھی موافق تھیں ۔ تین دن میں واسکوڈی گاما اور اس کے ساتھی موسمبے کے ساحل پر لنگر انداز ہو گئے یہاں اُنہوں نے افریقی باشندوں سے



کچھ کھانے پینے کا سامان چنانچہ ان باشندوں نے نہ صرف خیل سامان دیا بلکہ ان کی بڑی شاندار دعوت بھی کی جس میں افریقی

ناچ کا خاص طور سے انتظام کیا گیا تھا۔

تھوڑے قیام کے بعد سفر کی منزل پھر سامنے آگئی اور واسکوڈی گاما کے بحری بیڑے نے وہ حد پار کر لی جہاں تک اس سے پہلے ایک اور پرتگالی جس کا نام ڈیاز تھا پہنچ چکا تھا۔ اب وہ ایسے سمندر میں سفر کر رہے تھے جہاں ان سے پہلے سفید قوم کا کوئی باشندہ نہ پہنچ سکا تھا۔ راستے میں انھوں نے ایک مرتبہ پھر زمین دیکھی جس کا نام واسکوڈی گاما نے نیٹال رکھا لیکن وہ وہاں رکا نہیں بلکہ اپنی منزل کی طرف بڑھتا رہا اس وقت سمندر میں زبردست طغیانی تھی لیکن یہ جان باز آبی لہروں سے لڑتے رہے یہاں تک کہ خوراک اور پانی کی کمی سے مجبور ہو کر واسکوڈی گاما کو آگے چل کر مشرقی افریقہ کے ایک ساحل پر لنگر انداز ہونا پڑا دریائے لیپوپو کے دہانے پر بسنے والے باشندے نیٹو بڑے مہمان نواز تھے انھوں نے ان لوگوں کی بڑی خاطر مدارات کی۔

ممباسا پر ان کا بحری بیڑہ لنگر انداز ہونا چاہتا تھا لیکن عرب اس بات سے اچھی طرح واقف تھے کہ پرتگالی یہاں کس غرض سے آئے ہیں۔ اس خطے کی ساری تجارت ابھی تک عربوں کے ہاتھوں میں تھی اور وہ اس بات کو کس طرح برداشت کر سکتے تھے کہ کوئی دوسری قوم ان کے مدِمقابل کھڑی ہو جائے اس لئے انہوں نے واسکوڈی گاما کو ان مقامات پر لنگر انداز ہونے کی اجازت نہ دی۔

واسکوڈی گاما چاہتا تھا کہ اسے یہاں سے کوئی رہنما جہاز راں مل جائے جو انھیں ہندوستان کے ساحل مالابار کا پتہ بتا سکے لیکن ممباسا میں اسے کوئی ایسا آدمی نہ مل سکا اور اس کا بحری بیڑہ اُتر کی طرف بڑھتا گیا آخر وہ مالنڈی جزیرے پر پہنچے جہاں کا حکمران ان لوگوں سے بڑی اچھی طرح پیش آیا۔ اس نے ان لوگوں کے اعزاز میں بڑی شاندار دعوت کی اور دونوں طرف سے تحفے دئے گئے۔ یہاں انہوں نے نو روز قیام کیا چلتے وقت وہاں کے حکمراں نے واسکوڈی گاما کو ایک ہندوستانی جہاز راں دیا جس نے انھیں ہندوستان کے شہر کالی کٹ پہنچا دینے کا وعدہ کیا۔



جزیرہ مالنڈی چھوڑنے کے بیس روز بعد اس ہندوستانی جہاز راں نے خوشی بھرے لہجے میں ایک نعرہ بلند کیا گو پرتگالی اس کی زبان نہ سمجھتے تھے لیکن اس نعرے کا مطلب سمجھنے میں انھیں کوئی دقت محسوس نہ ہوئی پھر کیا تھا واسکوڈی گاما اور اس کے تھکن سے چور ساتھی جنھیں اپنا وطن چھوڑے دس مہینے سے زیادہ ہو چکے تھے اس کے چاروں طرف جمع ہو گئے اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگے سامنے منزل تھی یعنی ہندوستان کا ساحل — اب اونچے اونچے پہاڑوں کا ایک لمبا سلسلہ ان کی نظریں دیکھ سکتی تھیں — اور ۲۳ مئی ۱۴۹۸ء کو واسکوڈی گاما کا بحری بیڑہ کالی کٹ کی بندرگاہ پر لنگر انداز ہوا۔

گھنشام سیٹھی

باپو نے کہا اور کیا



گاندھی جی غسل کے وقت صابن کا استعمال نہیں کرتے تھے۔ کبھی انھیں میرا بہن نے ایک کھردرا پتھر بھینٹ دیا تھا۔ اُسی سے جسم رگڑ کر کام چلا لیتے تھے۔ نواکھلی کی یاترا کے دنوں میں ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں جاتے وقت میرا بہن وہ پتھر ایک دفعہ بھول گئیں۔ دوسرے دن غسل کا سامان لگاتے وقت جب بھول کا پتہ چلا، تو انھوں نے گاندھی جی سے کہا۔ سوچ کر وہ بولے ـــــ تم نے غلطی کی ہے، تم خود ہی جاؤ اور اس گاؤں سے اُسے لے آؤ، جہاں کل ٹھہرے تھے۔ ایک بار ایسا کرنے سے پھر ہمیشہ تمھارے حواس بجا رہیں گے۔

دونوں گاؤں کے درمیان ناریل کا ایک ایسا گھنا جنگل پڑتا تھا کہ آدمی راہ بھٹک جائے۔ وہ بڑا بُرا وقت تھا اور راستہ ویران اور اُجاڑ تھا۔ ڈرتے ڈرتے میرا بہن نے پوچھا ـــــ باپو اس گاؤں کے کسی سویم سیوک کو ساتھ لے جاؤں ؟

"کیوں" ؟ گاندھی جی نے سوال کے جواب میں سوال کیا، اور ڈرتی رام کا نام جپتی، ساڑھے نو بجے صبح گھر سے چل کر ایک بجے میرا بہن وہ پتھر لے کر واپس آئیں۔ باپو نے کہا۔ مجھے میرا پچیس برس کا پُرانا ساتھی مل گیا اور تم امتحان میں پاس ہو گئیں۔ ایک چیز گئی، تو دوسری آ جائے گی، یہ سوچ کر کبھی بے پروا نہ ہونا چاہئے اور کام کی ہر ایک چیز کو سنبھال کر رکھنے کی عادت ڈالنی چاہئے۔

گاندھی جی ہندوستان کے وائسرائے لارڈ لنلتھگو سے ہندوستان کی آزادی کے بارے میں گفت و شنید کرنے کے لئے دہلی گئے ہوئے تھے۔ باتیں کرتے کرتے پانچ بج گئے لارڈ لنلتھگو نے چاہا کہ گاندھی جی ایک گھنٹہ اور رُک جائیں۔ مگر باپو یہ کہتے ہوئے اُٹھ گئے کہ ـــــ ابھی چل کر مجھے ایک مریض کو دوا دینی ہے۔

ہندوستان کی آزادی اور ایک آدمی کی بیماری گاندھی جی کی نظر میں دونوں چیزیں ضروری تھیں۔ وہ کسی بھی کام کو چھوٹا نہیں سمجھتے تھے۔

گاندھی جی کو لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے دہلی بُلایا۔ ہوائی جہاز کا انتظام کر دیا گیا تھا۔ لیکن جو سواری کروڑوں

غریبوں کو میسّر نہیں، اس میں گاندھی جی کیوں بیٹھتے ؟ میرا بہن نے باپو کے لئے ریل کا ایک ایسا ڈبہ پسند کیا، جس کے دو حصّے تھے - ایک میں اُنہوں نے کھانے پینے کا انتظام کر لیا اور دوسرے میں گاندھی جی کے آرام کا -

گاندھی جی کے کہنے پر چلتی گاڑی پر سے میرا بہن نے جھانک کر دیکھا تو بھیڑ اتنی تھی کہ لوگ کھڑکیوں کی سلاخوں سے لٹکے ہوئے تھے - دوسرا اسٹیشن آتے ہی گاندھی جی نے اسٹیشن ماسٹر کو بُلا کر کہا - اس ڈبّے کا استعمال اُن لٹکنے والوں کے لئے کر لیجئے - مَیں اسے خالی کر دیتا ہوں -

اسٹیشن ماسٹر، دوسرا ڈبّہ تو جوڑ دیجئے ہی، مگر اس کا بھی استعمال کیجئے -

آرام، اوروں کے لئے زیادہ سے زیادہ اور اپنے لئے کم سے کم، یہی گاندھی جی کا نظریہ اور اصول تھا اور یہ بھی کہ جو آرام کروڑوں غریبوں کو میسّر نہیں اُسے غریبوں کا کوئی نیتا یا سیوک کیسے لے سکتا ہے -

---

گاندھی جی رات کو پیشاب کرنے کے لئے اُٹھتے تو کھڑاؤں پہن کر باہر جاتے تھے - مہادیو ڈیسائی کی نیند کچھ ایسی تھی کہ کھڑاؤں کی کھڑکھڑاہٹ سے وہ جاگ اُٹھتے - گاندھی جی کو یہ پتہ چلا تو وہ چپل پہننے لگے -

ذرا بھی آواز نہ ہو، اس لئے وہ مہادیو ڈیسائی کے پاس سے نہیں، چور کے پیروں دُور کا چکّر کاٹ کر باہر جاتے -

---

لطیفہ - پہلا دوست - تمہارا بچہ بہت سُست رفتار ہے -
دوسرا دوست - مگر ہاتھ چلانے میں بہت تیز ہے -

لطیفے

پہلا آدمی - ذرا حساب کا ایک سوال حل کر دگے ؟
دوسرا آدمی - ہاں کیوں نہیں -
پہلا - اگر تمہارے پاس دس روپے ہوں اور ان میں سے چار مَیں مانگ لوں تو تمہارے پاس باقی کتنے رہے ؟
دوسرا - دس -
پہلا - وہ کیسے ؟
دوسرا - تم ہزار مانگا کرو - مَیں تمہیں کب دیتا ہوں -

مُسافر - "ریلوے اسٹیشن کا کیا لوگے" ؟
ٹیکسی ڈرائیور - "دو روپے" -
مُسافر - "اور سامان" ؟
ٹیکسی ڈرائیور - "مُفت"
مُسافر - "بہت اچھا - تو تم ٹیکسی میں سامان لے چلو - مَیں پیدل آتا ہوں -

---

پہلا آدمی - فرمائیے آپ کو مجھ سے کوئی کام ہے
دوسرا آدمی - جی ہاں - آپ ہی کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں - مجھے پانچ روپے قرض چاہئیں -
پہلا آدمی - لیکن مَیں تو آپ کو جانتا تک نہیں -
دوسرا آدمی - اسی لئے تو آپ کے پاس حاضر ہوا ہوں جو لوگ مجھے جانتے ہیں - وہ مجھے کب قرض دیتے ہیں -

آج کل

جون ۱۹۵۴ء

آٹھ آنے

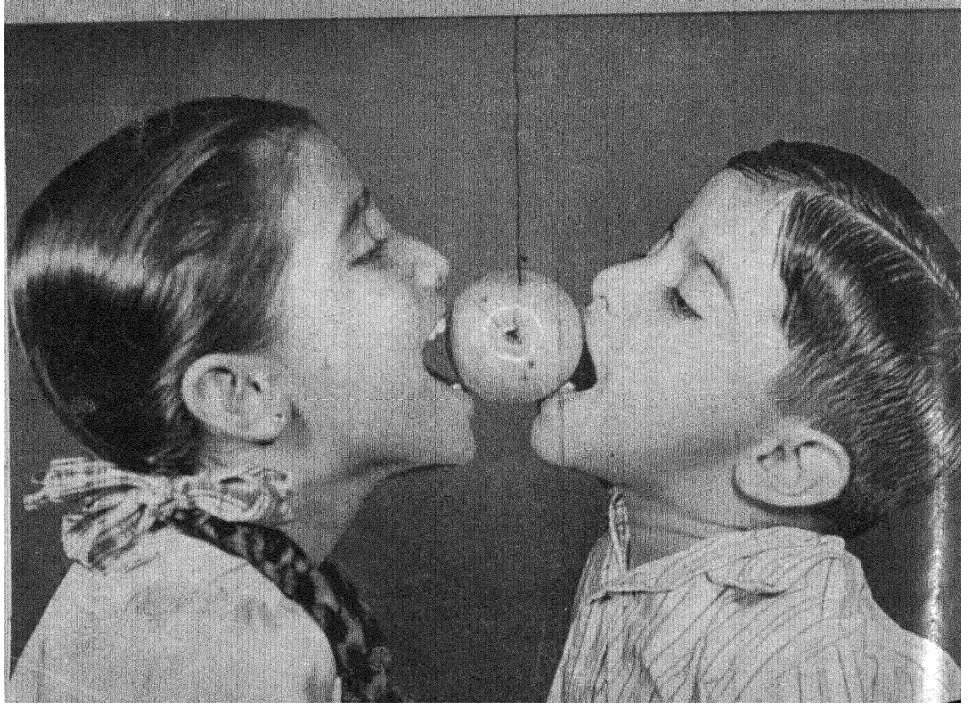
اس شمارے میں

ایک ہی ناؤ میں (افسانہ) — بلونت سنگھ

غزل — شکیل بدایونی

راجستھان کے لوک گیت — حبیب الرحمٰن عزؔ قوی

ترجمۂ جرأتؔ مترجم رباعیاتِ عمر خیام — اطہر حسین جعفری



پھر موسم گرما!

کہیئے ... جسم زیادہ چپچپا اور گندہ لگتا ہے؟

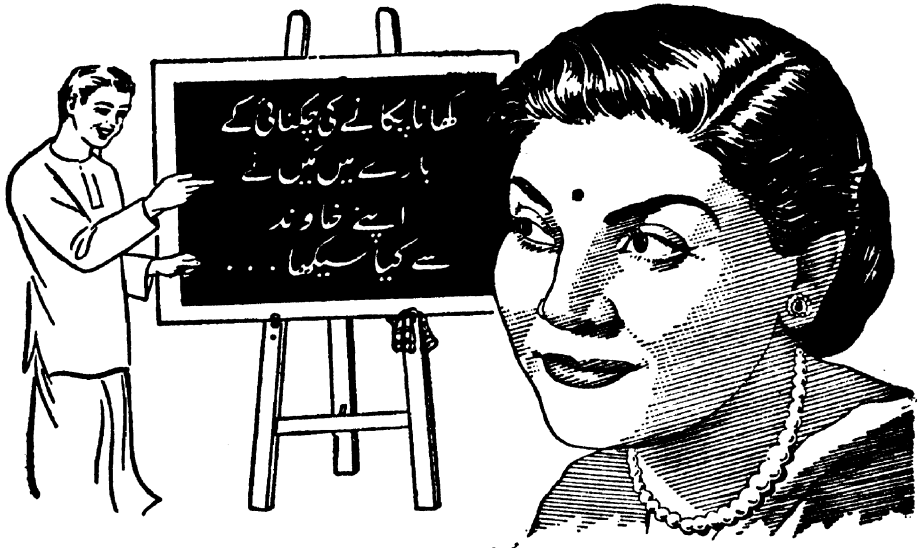


لائف بُوائے صابن

ہر روز کی گندگی کے جراثیم سے آپ کی حفاظت کرتا ہے

L. 247-X52 UD

ہندوستان میں بنا ہوا



خرچ کیلئے جو رقم مجھے ملتی ہے اُس میں گھر چلانا کوئی مذاق نہیں۔ جو چیز دیکھو اتنی مہنگی کہ پیسہ پیسہ گن گن خرچ کرنا پڑتا ہے۔ ایک روز مجھے اتنا کام تھا کہ وہ کہنے لگے، "لاؤ بازار کا سامان آج میں ہی خرید لاتا ہوں۔" جب گھر لوٹ کر آئے تو میری نظر سب سے پہلے دس روپے کے ڈالڈا کے ڈبہ پر پڑی۔ میں تو جل ہی گئی۔

میں ہر بار کھلے ڈبہ سے چکنائی خرید کر کچھ سی میں مرتی رہی اور انہیں دیکھیے کہ دھڑ سے ڈالڈا وناسپتی خرید لائے!

لیکن جب انہوں نے سمجھایا تو میری آنکھیں کھلیں۔ کھانا پکانے کی چکنائیوں کے بارے میں وہ مجھے سمجھانے لگے :-

"ہمارے لاڈلے بچوں کی تندرستی کا خیال رکھنا ہمارا اوّلین فرض ہے۔ کھلے ڈبوں کی قیمتی سے قیمتی چکنائی میں بھی ملاوٹ ہو سکتی ہے، انہیں گندے ہاتھ پڑتے ہیں اور مکھیاں گرتی ہیں۔ اسلئے انہیں بیماری کا خطرہ موجود رہتا ہے۔

"اس خطرے سے بچنے کا ایک ہی راستہ ہے کہ کھانا پکانے کی چکنائی مہر بند ڈبہ میں خریدی جائے، جسمیں بیماری کے جراثیم ہرگز داخل نہیں ہو سکتے۔" جب میں نے پوچھا کہ انہوں نے ڈالڈا وناسپتی ہی کیوں پسند کیا تو اسکا جواب بھی ان کے پاس تیار تھا۔ کہنے لگے :-



"ڈالڈا وناسپتی بنانیوالوں کو بیس سال کا تجربہ ہے۔ وہ ہمیشہ اس بات کا خیال رکھتے ہیں کہ ڈالڈا وناسپتی بنانے میں جو چیز بھی کام آتے وہ بہترین ہو۔ ہر ایک چیز کی پرکھ کی جاتی ہے اور جو بھی اپنے درجہ سے کم ہو اُسے باہر پھینک دیا جاتا ہے۔ ڈالڈا وناسپتی میں اب وٹامن 'اے' اور 'ڈی' بھی شامل ہیں۔ یہ دس، پانچ، دو اور ایک پونڈ کے ہوا روک مہر بند ڈبوں میں دستیاب ہے۔ یہ ہمیشہ تازہ اور خالص ہوتا ہے اور ہر قسم کا کھانا پکانے کیلئے موزوں ہے۔"



اور پھر انہوں نے تاکید کرتے ہوئے یہ بھی کہا، "جو چیز ہمارے پیٹ میں جاتی ہے اُس کے بارے میں ہم لاپرواہی نہیں برت سکتے۔"

اب میں صرف ڈالڈا وناسپتی ہی استعمال کرتی ہوں اور آپکو بھی میرا یہی مشورہ ہے۔

کیا چکنائی روزانہ غذا کیلئے لازمی ہے؟ آج ہی اس پتہ پر مفت صلاح کیلئے لکھئے :-
دی ڈالڈا ایڈوائیزری سروس
پوسٹ بکس نمبر ۳۵۳، بمبئی ۱



ڈبہ خریدتے وقت دیکھ کر ہی ڈبہ خریدیئے

ڈالڈا وناسپتی

کم خرچ — پکانے میں بہتر

HVM 211-XBG UD

دِن بہ دِن
زیادہ ملایم زیادہ
دِلکش جِلد



کیڈِل آمیز رکسونا
آپ کے لئے بھی
یہ کمال کرے گا

اپنی جِلد پر رکسونا کا کیڈِل آمیز جھاگ نرمی
سے ملئے، پھر دھو ڈالئے، آپ محسوس کریں گی کہ
آپ کی جِلد دِن بہ دِن زیادہ نرم و ملایم ہوتی جارہی
ہے اور آپ کا حُسن نکھر رہا ہے۔

رکسونا کیڈِل آمیز واحد صابن

* کیڈِل جِلد کو ملایم اور مقوی کرنے والے
تیلوں کے ایک خاص مرکب کا ملکیتی نام ہے

R.P. 121-X66 UD.

رکسونا پروپرائٹری لمیٹیڈ کیلئے ہندوستان میں بنایا گیا

اُردو کا مقبول عوام مصوّر ماہنامہ

آج کل

دہلی

ایڈیٹر :- جوش ملیح آبادی

اسسٹنٹ ایڈیٹر :- بال مکند عرش ملسیانی

جلد ۱۲ ——— نمبر ۱۱

سالانہ چندہ :- ——— ہندوستان میں :- چھ روپے / پاکستان میں :- چھ روپے (پاک)

غیر ممالک سے ——— نو شلنگ یا ایک ڈالر

فی پرچہ :- ——— ہندوستان میں :- آٹھ آنے / پاکستان میں :- آٹھ آنے (پاک)

جون ۱۹۵۴ء

ترتیب

دلداری	اصغر جمالی	۴
راجستھان کے لوک گیت	حبیب الرحمٰن غزنوی	۵
عالمگیر انجمن صحت اور بھارت	———	۱۱
بھومی دان کی معاشی اہمیت	کیلاش ماہر	۱۲
سنٹرل ٹریکٹر آرگنائزیشن	———	۱۴
فٹز جرلڈ مترجم رباعیات عمر خیام	اطہر حسن جعفری	۱۵
غزلیں	شکیل بدایونی / ابراحسنی گنوری	۲۵
ایک ہی ناؤ میں	بلونت سنگھ	۲۶
سحرالبیان اور مثنوی پوستانِ خیال	ڈاکٹر سیدہ جعفر	۳۱
ڈاکٹر ٹاگ بورن اڈکیسرسن اور ان کی تحقیقات	حبیبہ غازی الدین	۳۵
کمیونٹی پراجیکٹ اڈمنسٹریشن کی دوسری سالانہ رپورٹ	———	۳۷
ڈاک اور تار کے شعبے کی سرگرمیاں	———	۳۹
نئے مطبوعات	ع - م	۴۰
رفتار زمانہ	———	۴۲

بچّوں کا آج کل

کہانی	اشک امرتسری	۴۵
تندرست رہو	دی سدرشن ریڈی	۴۶
دیا سلائی	شارق علوی تھلواروی	۵۰
شہباز اور کوا	عشرت صدیقی	۵۲
لطیفے	———	۵۲

سرورق :- دیکھئے کون جیتے -

پبلیکیشنز ڈویژن پوسٹ بکس ۱۱۰ دہلی

ARVODAYA SAHITYA MANDIR,
HUSAINIALAM ROAD
Hyderabad-Du.

اصغر جمالی

دلداری

فکرِ ناکامیٔ تدبیر عبث ہے تجھ کو
ہمنشیں شکوۂ تقدیر عبث ہے تجھ کو
رسمِ بے ربطیٔ تقریر عبث ہے تجھ کو
مرد ہو کر غمِ دوراں سے گریزاں کیوں ہے؟

اپنے ہی ہاتھوں سے برباد کر گھر اپنا
اس میں نقصان ہے اے دوست ضرر اپنا
لطف تو جب ہے بنا خود ہی مقدر اپنا
مرد ہو کر غمِ دوراں سے گریزاں کیوں ہے؟

ہمنشیں تلخیٔ ایام سے کیوں ہے غم گیں؟
درد کی آخری منزل ہے مسرت آگیں
غم سے خالی تو کوئی دل بھی زمانے میں نہیں
مرد ہو کر غمِ دوراں سے گریزاں کیوں ہے؟

تو بھی زندہ ترے نغمات بھی پائندہ ہیں
تری خاطر مہ و خورشید بھی تابندہ ہیں
تو جواں ہے ترے جذبات ابھی زندہ ہیں
مرد ہو کر غمِ دوراں سے گریزاں کیوں ہے؟

تجھ کو زیبا نہیں دنیا سے جدا ہو جانا
تلخیٔ زیست سے گھبرا کے فنا ہو جانا
درد کا حد سے گذرنا ہے دوا ہو جانا
مرد ہو کر غمِ دوراں سے گریزاں کیوں ہے؟

زندگی دور کھڑی ناز سے اٹھلاتی ہے
صبحِ نو زیست کا پیغام لئے آتی ہے
منزلِ عیش تری سمت بڑھی آتی ہے
مرد ہو کر غمِ دوراں سے گریزاں کیوں ہے؟

جل گیا ایک نشیمن تو یہ ماتم کیسا
ہمنشیں شکوۂ بے مہریٔ عالم کیسا
غم سے خوگر ہوا انسان تو پھر غم کیسا
مرد ہو کر غمِ دوراں سے گریزاں کیوں ہے؟

تا بکے تلخیٔ ایام سے گھبرائے گا؟
یہ زمانہ بھی بہت جلد گذر جائے گا
تو وفا خو ہے تو انعامِ وفا پائے گا
مرد ہو کر غمِ دوراں سے گریزاں کیوں ہے؟

سعیٔ پیہم کبھی ناکام نہیں ہو سکتی
زیست پھر زیست ہے بدنام نہیں ہو سکتی
زندگی موت کا پیغام نہیں ہو سکتی
مرد ہو کر غمِ دوراں سے گریزاں کیوں ہے؟

جمیب الرحمٰن غزنوی

راجستھان کے لوک گیت

عوامی ادب دراصل اُن تخلیقات کا نام نہیں جنہیں چند چوٹی کے شعراء و ادباء فصیح و بلیغ زبان میں عوام کے نام پر جنم دیتے ہیں بلکہ عوامی ادب وہی ہے جو عوام میں زیادہ سے زیادہ مروج ہو جسے عوام سمجھ سکتے ہوں، اُس سے لطف اندوز اور متاثر ہو سکتے ہوں۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ کسی ادب میں عوام کے روزمرہ مسائل کا تذکرہ ہی اُسے عوامی ادب نہیں بنا دیتا۔ بلکہ دیکھا یہ جاتا ہے کہ یہ ادب عوامی زندگی پر کس حد تک منطبق ہوتا ہے، اور عوامی زندگی کے دُھندلے دُھندلے نقوش اور خدوخال کو کس حد تک اُبھار دیتا ہے۔

جہاں تک لوک گیت کا تعلق ہے اپنی سادگی و پُرکاری، معنویت اور تنوع کے اعتبار سے اُسے عوامی ادب میں ایک ممتاز درجہ حاصل ہے۔ یہ گیت بیچ محصور میں دیہات کی عوامی زندگی کی عکاسی کرتے ہیں۔ ان گیتوں کی سادہ زبان اور اُن کی معنویت انھیں عام اصنافِ شعر و سخن سے جُدا اور ممیّز کرتی ہے۔ جہاں تک زبان کی فصاحت و بلاغت کا تعلق ہے ان گیتوں کی زبان کو کسی ایسی ترقی یافتہ زبان کے معیار پر پرکھنا جو علمی یا ادبی زبان تسلیم کی گئی ہو، اصولی طور پر غلط ہے۔ اس دیہاتی زبان کی سلاست و روانی اور اُس کے حسن و تیغ کی جانچ پڑتال تو اُسی زبان کے معیار پر کرنی چاہیے جو ان گیتوں والے علاقے کی عوامی زبان بھی جاتی ہو۔

ورڈزورتھ کا قول ہے کہ: — "وہ زبان جو عام انسانوں کی احتیاج و ضرورتوں اور مسلسل تجربات و احساسات کے ذریعے سے جنم لیتی ہے، اُس زبان کے مقابلے میں زیادہ دیرپا، مستقل اور فلسفیانہ ہوتی ہے جسے ہمارے شعراء استعمال کرتے ہیں —" لوک گیتوں کی زبان فی الحقیقت ایسی ہی عوامی زبان ہوتی ہے۔

زیرِ نظر مقالے میں ہم اُن لوک گیتوں کا تذکرہ کر رہے ہیں جو راجستھان کے کم و بیش تمام علاقوں میں مروج ہیں۔ اور پھر ان گیتوں میں سے بھی سردست ہم اُنھیں گیتوں کو پیش کر رہے ہیں جو شادی بیاہ سے متعلق ہیں۔ ان گیتوں میں آپ کو دیہات کی عوامی زندگی کا عکس نظر آئے گا۔ ایک غیر مرئی لطف و انبساط کے تانے بانے میں بُنی ہوئی انتظار کی صبر آزما گھڑیوں کے بعد دولھا دولھن کے وصال کی کیفیت اس میں آپ ملاحظہ فرمائیں گے۔ دولھن کی مُنہ چڑھی سہیلیوں کی لطیف لمزا، بارات کے ہنگاموں میں سنائی دینے والے ہجر و وصال کے پرسوز نغمے، دیہات کے معصوم و سادہ ماحول میں جنم لینے والی —— ماں کی مامتا، باپ کی شفقت اور بہن بھائیوں کے پُرخلوص پیار کے زیرِ سایہ پروان چڑھنے والی دوشیزہ کی وُہ دبی دبی سسکیاں بھی سنائی دیں گی جو زندگی کی میٹھی اور سہانی یادگاریں چھوڑتے وقت بآسانی ہوتی ہیں۔

ہندوستان میں شادی بیاہ کی رسمیں کئی ایک المیہ اور طربیہ مرقعوں کی حامل ہوتی ہیں۔ لگن منڈپ، چوکی، بارات، سامیہ، پھیرے، سہاگ رات، دولھن کے گھر کا ماحول اور وداع ایسی رسوم کے اردگرد انسانی قلوب و اذہان کو متاثر کرنے والی بے شمار اور متنوع کیفیات منعکس ہوتی ہیں اور جب انھیں کیفیات اور تاثرات کو دیہات کا عوامی شاعر اپنے مخصوص اسالیب اور مخصوص زبان میں پیش کرتا ہے تو سُننے والے جُھوم جُھوم اُٹھتے ہیں۔

ذرا اس کیفیت کا تصوّر کیجیے: — ایک نوجوان لڑکے اور لڑکی کی منگنی ہو چکی ہے۔ دو غیر متعارف ہستیاں اپنے دلوں کی گہرائیوں میں ایک لطیف سی خلش اور اضطراب محسوس کرتی ہیں۔ ایک غیر شعوری جذبے کے تحت پردہ چڑھنے والی جوان انگلیاں اور آرزوئیں دبتی دباتی، سمٹتی سمٹاتی اس طرح باہر آنا چاہتی ہیں گویا چند خطرناک قیدی ہیں جو قید و بند کی صعوبتوں سے تنگ آکر بھاگ نکلنا چاہتے ہیں۔ ایک غیر محسوس اور نامعلوم کشش دو دلوں کو ایک دوسرے کی طرف کھینچتی ہے۔ متبادلہ زندگی کا ایک پیش پا افتادہ تصوّر ان کے صفحۂ ذہن پر مرتسم ہونے لگتا ہے۔ فضا میں لطیف سی موسیقی ابھرنے لگتی ہے، ماحول وفورِ انبساط سے معمور ہو کر جھلکنے لگتا ہے۔ ایک لاانتہا ہی مسرّت، ایک لازوال خوشی اور ایک کیف آگیں خیال چاروں طرف سایہ فگن ہے

ہر جانب سکھ چین اور ہر طرف سکون و اطمینان کا دَور دَورہ ہے۔

دیہات کی پلی دوشیزہ جذبات کے ہجوم سے اُکتا کر اور دل کے تقاضوں سے مجبور ہو کر پنا ہیں کے منصوبے بناتی ہے۔ پھر سولہ سنگھار کر کے جوانی اور دوشیزگی کے بوجھ سے دبے ہوئے جسم کو ایک مرد کی طاقت ور اور توانا باہوں کا خیالی سہارا دیتی ہوئی گھر سے باہر نکلتی ہے۔ فطری شرم راستہ روکتی ہے، حیاء اور عفت قدم تھام لیتی ہیں۔ مگر ایک خوش آئند خیال ہمت بندھاتا ہے۔ خیالات میں قدرے یکسوئی پیدا ہوتی ہے۔ ذہنی اضطراب اور طبعی کش مکش کی گھڑی گذر جاتی ہے۔ وہ شرماتی لجاتی باہر نکلتی ہے۔ دوپہر کا وقت ہے۔ راجستھان کی جھلسا دینے والی گرمی اور لُو اپنے پورے عروج و شباب پر ہے۔ آفتاب کی تمازت آگ برسا رہی ہے۔ گاؤں کے گلی کوچے اس طرح سنسان پڑے ہیں گویا صدیوں پہلے یہاں کوئی آبادی ہوگی۔ چاروں طرف ہُو کا عالم ہے، نہ آدمی نہ آدم زاد!

دوشیزہ ہنوز ایک تنگ گلی کے موڑ پر پہنچی ہی تھی کہ بمصداق ——— دونوں طرف ہے آگ برابر لگی ہوئی" سامنے سے اپنے منگیتر کو آتا دیکھ پاتی ہے۔ معاً قدم ڈگمگانے لگتے ہیں۔ انگ انگ میں ایک خوش گوار کپکپی اس طرح دوڑ جاتی ہے گویا کوئی اسے بڑی طرح گدگدا رہا ہو۔ گھونگھٹ کھنچ کر زیادہ نیچے تک سرک آتا ہے۔ مگر ایک اضطراری کیفیت غیر ارادی طور پر پیش قدمی پر اُکساتی ہے۔ اور وہ اپنے پریتم کی آغوش میں پہنچ جاتی ہے۔ لب بند اور زبان خاموش ہے۔ آنکھوں میں سُرخ ڈورے اور چہرے پر شباب کی رعنائیاں گرم خون کی طرح دَوڑ جاتی ہیں۔ زبان سے کچھ کہا نہیں جاتا، لیکن ایک نامعلوم طاقت اُسے قوتِ گویائی بخشتی ہے اور وہ کہتی ہے:۔

"کھٹے چالیسا ہو نک کھٹے چالیسا ہو!"

"مورا پھول ہزاری گل کھٹے چالیسا ہو!"

(اے میرے من مندر کے دیوتا! اس چلچلاتی دھوپ میں کہاں جا رہے ہو؟ اور اے گل ہزاری کے نین کٹورے! اس وقت کہاں کے ارادے ہیں!)

محبوبہ کی آواز سنتے ہی محبوب کے مُنہ میں بھی زبان آجاتی ہے اور وہ کہتا ہے:۔

(اے دل کی ملکہ! میں تو تمہارے ہی سنہرستانِ ناز و نعم کی لطیف و نکہت بار فضاؤں کے خیال سے لطف اندوز ہوتا ہوا تمہاری ہی بارگاہِ حسن و جمال میں حاضر ہو رہا تھا۔ ذرا اپنی چاند سی صورت تو دکھا دو!"

"تمہارے دیدار کی ناقابل برداشت تشنگی مجھے تمہاری ہی طرف کشاں کشاں لئے جا رہی تھی۔")

محبوب کی والہانہ التجا سن کر وہ گھونگھٹ کو کسی قدر اٹھا دیتی ہے۔ اسی اثنا میں محبوب کے دونوں ہاتھ خود ہی آگے بڑھ کر دوپٹے کا آنچل پرے سرکا دیتے ہیں اور اس طرح باقی ماندہ حجاب خود ہی دُور ہو جاتا ہے۔ اُس کا محبوب ایک چاند سا مکھڑا سامنے دیکھ کر محویت اور استغراق کے عالم میں کھو جاتا ہے، جھکی جھکی اور شرم و حیا کے بوجھل پردوں میں چھپی ہوئی چار ناآشنا نگاہیں اُٹھتی ہیں، آپس میں ٹکراتی ہیں اور پھر نیچے جھک جاتی ہیں۔ ایک لمحے کے بعد پھر اُٹھتی ہیں، ایک دوسرے کے خدوخال کا جائزہ لیتی ہیں، ایک دوسرے کی دلی کیفیت کا چہرے کے نقوش اور اُتار چڑھاؤ سے اندازہ لگاتی ہیں۔ دو جوان دل ——— ایک دوسرے کے سینے میں پرورش پانے والے جذبات اُلفت کو ٹٹول رہے ہیں۔ زبانیں خاموش ہیں۔ مگر نگاہوں کے دو چار تعاوم تمام مراحل طے کر دیتے ہیں۔ دوشیزہ ہر سکوت توڑ کر کہتی ہے:۔

("اے پریتم —— تم میرے لئے کیا لائے ہو۔!"

"تم اپنے سُرخ و سبز رومال میں کون سی چیز میرے لئے چھپا کر لائے ہو ——!")

پریتم فوراً ہی جواب دیتا ہے:۔

("اے جانِ جہاں —— میں تمہارے لئے "ناک کی کیل" لایا ہوں۔"

"ذرا اپنا رُخ روشن تو اُٹھاؤ!"

"دیکھو میں تمہارے لئے کیسی انوکھی کیل لایا ہوں!")

کیل کا نقطہ دینے میں عموماً دو مقصد حل ہوتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ ناک کی کیل سہاگن کا سنگھار ہے۔ گویا یہ نقطہ دے کر اُس کا منگیتر اُس کے سہاگ کی علامت چاہتا ہے۔ اور دوسرا مقصد یہ ہے کہ محبوبہ کی ناک میں کیل پہنانے کے بہانے اُس کا منگیتر اپنی محبوبہ کے جمالِ جہاں آراء سے اپنی آنکھوں کی پیاس بجھا سکتا ہے۔ اس کے لب لعلیں، اس کے موتیوں سے دانت، اس کی ستواں ناک، اس کی تابناک پیشانی، اس کی غزالی آنکھیں، اس کے عارضِ گلگوں اور اُس کی صراحی دار گردن جی بھر کے دیکھنے کا موقع ملتا ہے۔

اب اس پہلی ملاقات میں موضوعِ سخن نئی کروٹ لیتا ہے۔ بات شادی

بیاہ کی چھٹی ہے۔ دونوں اپنے دلوں کی عمیق گہرائیوں میں ایک قسم کی گدگدی محسوس کرتے ہیں۔ منگیتر کہتا ہے :۔

" ونی رانی ! تھارا باپو شانے یوں کے بھیجی "

" گھوڑیا شنگارے ، سامی میلو کے "

جبن سکھ دنڑو آوسی جی "

(" اے محبوبہ — اے میرے دل کی ملکہ ! اپنے پتا جی سے جا کر کہنا۔"

" ایک عمدہ گھوڑا سجا کر میرے استقبال کے لئے بھیجیں "

" جب ایسا سجا یا گھوڑا آئے گا تبھی بندہ اپنے بارا تیوں سمیت تمہارے ہاں پہنچے گا۔)"

دیہاتی دوشیزہ اپنے محبوب کے اس مطالبے پر کسی قدر ناگواری محسوس کرتی ہے۔ اس کی خودداری عجب روح ہوتی ہے۔ تاہم اپنے محبوب کی کبیدگی خاطر اُسے منظور نہیں۔ وہ محبوب کے اس مطالبے کا نہایت دلربایانہ انداز میں جواب دیتی ہے :۔

" نہیں او ونہ گھوڑ لیا ری رتیو — "

" کر پا راؤ دیگا اوسی جی "

" تھونے جو دنہ پر نی جواری ہوں سے "

" کہ ہستی بے نے آوسی جی "

(اے محبوب — ! ہمارے ہاں گھوڑے سجا کر بھیجنے کا رواج مطلق نہیں ہے۔

تمہیں تو پیدل چل کر ہی مجھے بیاہنے آنا پڑے گا۔"

" اگر واقعی تم مجھے بیاہ کرلے جانا چاہتے ہو — !"

تو خواہ ہاتھی پر بیٹھ کر آنا ، مگر جلدی آنا۔")

بہرحال اس طرح برسرراہے یہ راز و نیاز ، چھیڑ چھاڑ اور دل لگی کی باتیں ہو کر ختم ہو جاتی ہیں اور دونوں یادِ ناخی سے تہی ہو جاتے ہیں۔

دن گذرتے جاتے ہیں۔ شادی کا زمانہ قریب آتا جا رہا ہے۔ دولہن کے گھر بیاہ کی تیاریاں بڑے تزک و احتشام سے ہو رہی ہیں۔ مگر اس گھر کے پورے ماحول پر رنج و غم کی چادریں خوشی کے شامیانوں کی طرح تنی ہوئی ہیں یہاں کی ہر تقریب میں مسرت و شادمانی کے پہلو بہ پہلو ایک موہوم سا کرب و اضطراب نظر آ رہا ہے۔ آزاد اور معصوم فضاؤں میں پرورش پا کر جوان ہونے والی دوشیزہ والدین کی شفقت اور بھائی بہنوں کی غمخواری اور دلجوئی سے عنقریب محروم ہو جائے گی۔ اس روح فرسا تصور نے شادی کی کیف آگیں مسرتوں پر غم و اندوہ کا سایہ ڈال دیا ہے۔ گھر میں مہمانوں کی ریل پیل ، محلّے کی عورتوں کا ہنگامہ اور بچوں کا شور و شغب ضرور ہے۔ مگر نئی اُمیدوں اور امنگوں سے کسی قدر تہی دامن اور معرّاہ گیت گائے جا رہے ہیں۔ مگر گانے والیوں کے پُرسوز لہجے سے جو بھی لَے نکلتی ہے غم لے نکلتی ہے۔

اس کے علی الرغم دولھا کا گھر سچی خوشیوں اور پر کیف مسرتوں کا گہوارہ بنا ہوا ہے۔ دولھا جوتشی مہاراج کے پاس جا کر لگن کی شبھ گھڑی نکلواتا ہے۔ اور بھی جوتشی مہاراج دان دکشنا لے کر شادی کے لئے ساعت نکال دیتے ہیں۔ دولھا خوشی خوشی گھر آ کر اپنے کمرے میں بند ہو جاتا ہے اور اپنی منگیتر کو خط لکھتا ہے۔

" اے جانِ جہاں ! یہ نامۂ شوق تم چراغ کی روشنی میں پڑھنا۔"

" یا اگر چراغ جلانا مناسب نہ ہو تو چاند کی روشنی میں پڑھنا۔"

" عنقریب ہی میں تمہیں دولہن سمیت کر اپنے ہاں لے آؤں گا۔"

" جوتشی جی نے لگن کی شبھ گھڑی تجویز کر دی ہے "

" میں تمہیں اپنی آغوش میں اٹھا کر لے آؤں گا۔"

اس خط کے پڑھتے ہی دوشیزہ کے جذبات ایک نئی کروٹ لیتے ہیں۔ ماں باپ کی شفقت ، بھائی بہنوں کی محبت اور اپنے قدیم آبائی مکان کی الفت نے اسے چکرانا شروع کر دیا تھا — یہ بندھن کس طرح ٹوٹ سکیں گے — ؟ یہ خیال رہ رہ کر اسے ستا رہا تھا۔ ماں آنسو بہا رہی ہے ، چھوٹی بہن سسکیاں لے رہی ہے ، بھائی کی محبت بھری آنکھوں سے قطرات اشک ٹپک رہے ہیں۔ یہ معلوم ہو رہا ہے گویا گھر کی ایک ایک چیز رو رہی ہے۔ اور پتا جی ! آہ — وہ کیسے خاموش اور سنجیدہ بن گئے ہیں ! مگر اُن کی آنکھوں میں جھلملاتے ہوئے آنسو گواہی دے رہے ہیں کہ وہ اس وقت بڑے ضبط و تحمل کا ثبوت دے رہے ہیں۔

منمناتے ہوئے بکرے کے بچے ، آنگن میں بندھی ہوئی گائے ، صحن میں خاموش و ساکت کھڑا ہوا جھولا ، کونے میں پڑے ہوئے کنڈے اور آپلے ، قرب و جوار کے ہمسائے اور سہیلیاں ، اُن کے مکانوں کے در و دیوار ، گویا ایک ایک چیز اُس کے گلے سے لپٹ لپٹ کر رو رہی ہے اور نہایت عجز و انکسار سے

کہہ رہی ہے کہ (۔ اری چھوکری ۔ تو اس طرح ہمیں غمزدہ اور آبدیدہ چھوڑ کر چلی جائے گی ؟ یہ بے رُخی اور بے مروتی آخر تجھ میں پہلے تو کبھی نہ تھی ؟ پھر اب کیوں جا رہی ہے ۔ ؟ نہیں نہیں ۔ ہم اس طرح تو تجھے ہرگز نہ جانے دیں گے ۔ بھلا ایسے بھی کوئی بھاگا کرتا ہے ۔ !")

غرضیکہ انھیں تصوّرات میں غلطاں و پیچاں دوشیزہ خط کا جواب لکھتی ہے :۔

" اے جھوٹے محبوب ! جھوٹ کیوں بولتے ہو ۔ !"

" اور اے صداقت شعار سرتاج تم سچ بھی نہ بولنا ۔"

" سسرال کی اَن دیکھی سرزمین میں میرا کون ہے ؟"

" تم جس گھر میں مجھے لے جانا چاہتے ہو ، اُس اجنبی گھر میں میرا پُرسانِ حال کون ہوگا ؟ ۔ کوئی بھی نہیں ۔"

دولھا یہ خط پڑھ کر متفکر ہو جاتا ہے ۔ وہ سوچتا ہے کہ ایسی مایوس کُن بات لکھنے والی محبوبہ کو کس طرح سمجھایا جائے ۔ وہ جانتا ہے کہ اُس کی منگیتر نے جو کچھ بھی لکھا ہے وہ ماں باپ کی جدائی اور بہن بھائی کے پیار سے محرومی کے خیال سے لکھا ہے ۔ اپنے گھر سے جدائی کا صدمہ ایک اندوہناک تصوّر بن کر اس کے دل و دماغ پر مستولی ہو گیا ہے ۔ آج اُسے اپنا مستقبل تاریک اور غیر یقینی نظر آتا ہوگا ۔ اور یہ بات چنداں غیر فطری بھی نہیں ہے ۔ بہرحال ان تمام حالات کو پیشِ نظر رکھ کر وہ اس طرح خط کا جواب لکھتا ہے :۔

" اے درِ دُرخ گو محبوبہ جھوٹ مت بولو ۔"

" اور اے صداقت شعار رفیقۂ حیات ! تم سچ بھی نہ بولنا ۔"

" تم نے یہ کیسے کہہ دیا کہ اس ان دیکھی سرزمین میں تمہارا کوئی بھی نہیں ہوگا ۔"

" اور یہ بھی تم نے کیسے کہہ دیا کہ اس پرائے مُلک میں تمہارا شناسا کوئی بھی نہ ہوگا ۔"

" لیکن اے عزیز از جان ! کیا تم نہیں جانتی کہ اس اجنبی دنیا میں تمہارا پریتم موجود ہے ! "

" اور جسے تم پرایا مکان کہتی ہو ، یہ پرایا نہیں بلکہ تمہارے پریتم کا مکان ہے ۔"

" یہاں آ کر نہ صرف تم اس مکان کی مالکہ بنو گی ، بلکہ اپنے پریتم کے دل کی رانی بھی بنو گی ۔"

" میرے ہوتے ہوئے یہاں کی کسی چیز میں اجنبیت کے کیا معنی ؟"

پریتم کا خط پڑھ کر بھی دوشیزہ کے دل کو تسکین نہ ہوئی ۔ وہ یہاں کے افسردہ ماحول میں اس طرح حل ہوتی جا رہی تھی جس طرح شکر پانی میں حل ہو جاتی ہے ۔

اب دونوں جانب شادی کی تیاریاں قریب قریب مکمل ہو چکی ہیں ۔ شامیانے تن گئے ہیں ۔ چھوٹی موٹی رسوم کے ادا ہونے کا اہتمام بڑی باقاعدگی سے ہو رہا ہے ۔ روزانہ صبح اُٹھ کر عورتیں مانڈنا گانے لگتی ہیں ۔ دولھا کی کلائی پر منڈھوں باندھ دیا گیا ہے ۔ گھر میں اب اس کی دفعت لمحہ بہ لمحہ بڑھتی جا رہی ہے ۔ اس کے کان کی لو کے قریب کاجل کی سیاہ بندی بنا دی گئی ہے تاکہ کسی کی نظر نہ لگ جائے ۔ علی البصیح سب سے پہلی رسم جو ادا کی جاتی ہے وہ یہ ہے ۔ عورتیں گا رہی ہیں ۔

" اٹھو اُٹھو گوراونٹڑا کرو نی دانتنیا "

" جل بھر جا ریٹو دنٹڑا کیر اد اتنیا "

" ایرا ایرا دانتی تھورو نادی رد دیو راوے "

" د اُٹھو اُٹھو ۔ اے حسین دولھا ۔ اُٹھو ! اور مسواک کر لو ۔"

" منہ دھونے کے لئے پانی کی سندر گاگر بھری رکھی ہے اور کیر دکریر کا مسواک بھی تمہارے لئے حاضر ہے ۔"

" اے دولھا راجہ ! یہ مسواک تمہارا نانی بڑی دُور سے تمہارے لئے لایا ہے ۔ !")

اب دولھا کی ماں اپنے پوت کی بلائیں لیتی ہوئی آتی ہے اور کہتی ہے :۔

" اٹھو اُٹھو اے حسین دولھا ۔ تمہارے لئے ناشتہ تیار ہے ۔"

" ٹھنڈی روٹیوں پر مسمّد گھی رکھا ہوا ہے ۔"

" یہ ناشتہ تمہاری ماں تمہیں اپنے ہاتھ سے کھلائے گی ۔"

غرضیکہ صبح سے شام تک دولھا کے آس پاس اسی قسم کی رسومات ادا ہوتی رہتی ہے اور گانے گائے جاتے ہیں ۔

اب دولھا کی بارات نہایت دھوم دھام سے روانہ ہوتی ہے ۔ عورتیں

گا رہی ہیں:-

" دھوم چڑھے، دھرتی پتے رے "

" پڑے رے نہ کاؤ دی ٹھور "

" دنا۔ او تھوری جا نو ہیں رے "

(اے دولھا راجہ! تیری بارات میں مہمانوں کا اس قدر اژدہام ہے، اور سواریوں کی وہ ریل پیل ہے کہ گرد راہ بگولوں کی طرح اُٹھ اُٹھ کر آسمان کا رُخ کرتی ہے۔ زمین گویا اس بھیڑ بھاڑ کے بوجھ تلے دبی جا رہی ہے۔ اس ہنگامے میں شادمانی کی نوبتیں اور خوشی کے نقارے کیا لطف دیتے ہیں۔")

اپنی بارات کے تزک و احتشام کا حال سن کر دولھا کے دل میں خیال پیدا ہوتا ہے کہ کیوں نہ میں بھی ایک نظر بارات کا نظارہ کر لوں:-

" اب دولھا راجہ۔ مڑ مڑ کر بارات کا منظر دیکھ رہا ہے۔"

" اس منظر میں اس نے یہ بھی دیکھا کہ اس کے پتاجی بھی بارات کے ساتھ ہی ہیں۔"

" یہی نہیں بلکہ وہ چلتے چلتے اپنے بیٹے کے لئے گھوڑا بھی سنوارنے جا رہے ہیں۔"

" بیٹے کو بیاہنے کی دیرینہ تمنا آج بر آئی ہے۔"

" آج اُن کی مسرتوں کی کوئی انتہا نہیں رہی۔"

" بیٹا بھی اس منظر کو بار بار مڑ مڑ کر دیکھتا ہے اور پھولا نہیں سماتا۔"

غرضیکہ اسی طرح دوشیزاؤں کے گونجتے ہوئے مست گیتوں میں، بھائی اٹکھیلیوں میں، گھوڑوں کی مستانہ چال اور اونٹوں کی بسک خرامی میں، بیلوں کی گردنوں میں بجنے والی گھنٹیوں کی نغمہ ریز صداؤں میں یہ بارات آگے بڑھتی چلی جا رہی ہے۔

دوسری جانب دولھن کے گھر سہانیا (استقبال) کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ دولھن مکان کی بالائی منزل پر بیٹھی ہوئی بارات کا انتظار کر رہی ہے۔ اس کے قریب ہی اس کے پتاجی خاموش اور دم بخود بیٹھے ہوئے آنے والی روح فرسا گھڑیوں کا تصوّر کر رہے ہیں۔ اسی اثنا میں شور بلند ہوتا ہے۔ بارات آپہنچتی ہے۔ دولھن کچھ دیر کے لئے تمام غم و آلام بھول جاتی ہے۔ اور کھڑکی کی دراڑوں سے بارات کی آمد کا منظر دیکھنے میں محو ہو جاتی ہے۔ بارات کی شان و شوکت دیکھ کر اس کے دل پر بہت اثر ہوتا ہے۔

" اونچی چڑھے ونڑی جو دیو جی "

" جی او کر تیک لایا جانے "

" بابا شانے کے دے یو، کے دے یو جی "

" (اونچی اٹریا پہ چڑھ کر دولھن بارات کو دیکھ رہی ہے)"

" اور پھر اپنے پتاجی سے مخاطب ہو کر کہتی ہے:"

" بابا۔ ذرا ادھر تو دیکھو! "وہ" کتنی بڑی بارات لے کر آئے ہیں!")

اس کے بعد دولھن بارات کا پورا منظر تفصیل وار اپنے پتاجی سے اس طرح بیان کرتی ہے:-

" ہاتھی راہزار لایا، گھیرا لاپچاس لایا جی "

" جی او کر یوں او سے ین یار "

" بیلیا دو سے لایا، دو سے لایا جی "

(" ہزار تو ہاتھی لائے ہیں، اور پچاس گھوڑے لائے ہیں۔"

" اونٹوں کا تو کوئی شمار ہی نہیں "

" گریبل صرف دو ہی لائے ہیں")

یہاں کسی قدر مبالغے سے کام لیا گیا ہے۔ مگر اس قسم کے مبالغے ایسے مواقع اور ایسے ماحول میں چنداں غیر مانوس معلوم نہیں ہوتے ہیں۔ ہزار ہاتھی اور پچاس گھوڑوں کی معیّت میں صرف دو بیلوں کی آمد تعجب انگیز ضرور ہے! اور پھر اونٹوں کا تو کوئی شمار ہی نہیں۔ لیکن یہاں ہمیں یہ نوٹ کر لینا چاہیئے کہ راجستھان کے ریگستانوں میں اونٹوں کی سواری کا عام رواج ہے۔ بار برداری کے لئے بھی زیادہ تر اونٹ ہی مستعمل ہیں۔ اسی طرح گھوڑوں کی بھی وہاں کثرت ہے۔ اور چونکہ راجستھان ریاستی علاقوں پر مشتمل ایک وسیع خطّہ ہے اس لئے ہاتھی بھی وہاں کافی تعداد میں ہوتے ہیں۔ البتہ دو بیل صرف وہی ہوں گے جو دولھن کے لئے رتھ میں جُتے ہوئے ہوں گے۔

بارات دولھن کے گھر جا کر فروکش ہوتی ہے۔ شامیانے میں شادی کی رسوم ادا کی جاتی ہیں۔ اور تقریباً نصف شب سے زیادہ وقت انھیں رسوم کی نذر ہو جاتا ہے۔ اس اثنا میں عورتیں موقع محل اور مختلف رسموں کی مناسبت سے قسم قسم کے گیت گاتی رہتی ہیں۔ آج دولھن کا گھر خوشی کے پیمانے

کی طرح چھلک رہا ہے۔ صبح کے قریب دولھن کے وداع کی تیاریاں ہونے لگتی ہیں۔ باراتی اپنا اپنا سامان باندھ کر اونٹوں پر لاد لیتے ہیں۔ دولھا دولھن کے لئے رتھ سجایا جاتا ہے اور دولھن کو لاکر اس رتھ میں سوار کر دیا جاتا ہے۔ اس موقع پر عموماً حضرت امیر خسروؒ کا "کاہے بیاہی بدیس بابل مورے" والا درد انگیز گیت کچھ اس انداز سے گایا جاتا ہے کہ نہ صرف دولھن والے، بلکہ دولھا کے باراتیوں کی آنکھوں سے بھی سیلاب اُمنڈنے لگتا ہے۔

صبح کی پَو پھٹنے والی ہے۔ شامیانے میں رات بھر جل جل کر تماشہ دیکھنے والی شمعیں خاموش ہو گئی ہیں۔ باراتی واپس جا رہی ہے۔ دولھن کے گھر والے کچھ دُور تک دولھن کے رتھ کے ساتھ ساتھ پیدل چلتے ہیں۔ اس وقت عموماً جو گیت گایا جاتا ہے اس کا مفہوم یہ ہے:۔

"اس ہرے بھرے چمن میں ایک پردیسی طوطا نہ جانے کہاں سے آگیا"

"میں تو اپنی سہیلیوں کے ساتھ کھیل رہی تھی۔"

"شامیانے کے سایے میں بے خبر کھیل رہی تھی"

"کہ بزعم طوطا زبردستی مجھے اپنے ساتھ لے اُڑا۔"

تقریباً اسی قسم کا ایک گجراتی گیت بھی ہے، جو گجرات میں وداع کے موقع پر گایا جاتا ہے:۔

"ایک آویو تو پردیشی پوپٹ"

"بیٹی! رمتا مانڈوا ہیٹھ"

"دھوتا رو، دھوتی بگڑ۔!"

"بہن! میں تو شامیانے تلے کھیل رہی تھی کہ ایک پردیسی طوطا آیا اور دغا باز مجھے فریب دے کر اُڑا۔"

اس گجراتی گیت اور راجستھانی گیت میں لفظی اور معنوی دونوں اعتبار سے یکسانیت پائی جاتی ہے۔ راجستھانی آگے چلتا ہے:۔

"ایک مکار پردیسی آیا۔"

"اور ہماری ایک انمول دوشیزہ کو لے اُڑا۔"

"نہ جانے یہ فریبی کس ملک سے آیا تھا؟"

"آہ — ہماری بیش بہا حسینہ کو لے گیا۔"

جب باراتی گاؤں کی حدود چھوڑ کر جنگل میں پہنچتی ہے۔ اس وقت سرسبز و شاداب جنگل کے دل فریب مناظر گانے والی عورتوں کا موڈ بدل دیتے ہیں۔ اور اب یہ گانا شروع ہوتا ہے:۔

"آم پک گئے ہیں اور املی بھی پک گئی ہے۔"

"اور مہوے کی شاخیں تو پھلوں کے بوجھ سے جھکی جا رہی ہیں۔"

"دولھن کو وداع کرنے کے لئے کوئل بھی اپنے پُرسوز نغمے الاپ رہی ہے۔"

اب موضوع سخن پھر بدلتا ہے۔ جوں جوں فراق کی منزل قریب آتی جا رہی ہے۔ رقت انگیز گیتوں کے تاثرات بھی بڑھتے جا رہے ہیں۔ دولھن کی ایک خاص سہیلی رتھ کے قریب جا کر کہتی ہے:۔

"موں تھونے پوچھوں۔ اے موری باجی!"

"موں تھونے پوچھوں — اے موری گیلڈسی!"

"تھوں اترو دیر و شان راہیت چھوڑے نے سدھ چالی!"

"تھوں اترو بابا شارا ہیت چھوڑے نے سدھ چالی!"

"اے پیاری بہن — اے میری دیوانی سہیلی! میں تجھ سے یہ پوچھتی ہوں کہ:۔"

"تو اپنے بھائی کی بے پایاں محبت اور اپنے بابا جی کی لازوال شفقت چھوڑ کر کہیں جا رہی ہے!")

اسی اثنا میں دولھن کے کانوں میں ماں کی آواز سنائی دیتی ہے۔ اس کی غم نصیب ماں — جس کی آنکھوں کے سامنے گوری کا معصوم بچپن ناچ رہا ہے — دل پر ہاتھ رکھے سسکیاں بھرتی ہوئی کہتی ہے:۔

"میری لاڈلی بیٹی — میرے ہاتھ کی انگشتری کا آبدار نگینہ!"

"تو ہر وقت اور ہر لمحہ میرے ہاتھوں ہی میں رہی ہے۔"

"آج تجھے سسرال جاتے دیکھ کر میرے دل پر جو بیت رہی ہے اس کا اندازہ کون لگا سکتا ہے؟"

"اے سمدھن! میں تم سے التجا کرتی ہوں۔"

"میری لاڈلی پر غصہ نہ کرنا اس کے ساتھ جھگڑا بھی نہ کرنا۔")

اور پھر وہ تمام باراتیوں سے مخاطب ہو کر کہتی ہے:۔

"اے لوگو! میں نے اپنی لاڈلی کو اپنا دودھ پلا پلا کر پروان چڑھایا ہے۔"

"میں نے اسے مٹھائیاں دے دے کر بہلایا ہے۔"

"میں نے اسے پاپڑ دے دے کر سمجھایا ہے۔"

"میں نے اس کے ہاتھوں میں لڈو دے دے کر اسے پیار کیا ہے۔"
"لہٰذا — تم لوگ کسی بات پر اُس سے اُلجھنا نہیں۔"
"اس سے جھگڑا نہ کرنا۔"
"اور اُسے کسی قسم کی تکلیف نہ دینا۔"

دُولھن والوں کے واپس لوٹنے کی منزل آجاتی ہے۔ سب کے چہرے اُداس ہیں۔ ماں باپ اور بھائی بہنوں کا سینہ پھٹا جارہا ہے۔ اُن کی آوازیں گھٹ گئی ہیں۔ بارات رخصت ہوکر آگے بڑھتی ہے اور یہ سب بادلِ ناخواستہ واپس لوٹتے ہیں۔ سب سے آخری شامیانے میں آکر عورتیں رگیت گاتی ہیں

"ابھی زیادہ وقت نہیں گزرا، ابھی زیادہ دیر نہیں ہوئی۔"
"یہ شامیانہ بقعۂ نور بنا ہوا جگمگا رہا تھا۔"
"آہ — وہ شمع کہاں گئی جو اس گھر کی رونق تھی۔"
"دولھن کے پتاجی عالمِ اضطراب میں بار بار پوچھ رہے ہیں کہ میری پیاری بیٹی کہاں گئی۔")

غرضیکہ اسی قسم کے جذبات و تاثرات کو راجستھان کے عوامی شاعروں نے اپنے گیتوں کے تانے بانے میں بُن بُن کر محفوظ کردیا ہے۔ انسان کے مختلف اور متنوع جذبات کا ایسے دل کش پیرایے میں اظہار کرنے والے لوک گیت امتدادِ زمانہ کے باوجود آج تک زندہ ہیں اور ہمیشہ زندہ رہیں گے۔

عالمگیر انجمنِ صحت اور بھارت

عالمگیر انجمنِ صحت ۱۹۴۸ء میں قائم کی گئی اور بھارت اس انجمن کے روزِ قیام سے ہی اس کا رکن چلا آرہا ہے۔ ملیریا پر قابو پانے، نرسنگ، بچوں کی صحت کو بہتر بنانے، تپ دق کی روک تھام وغیرہ سے متعلق اسکیموں کو عملی جامہ پہنانے کے لئے اس انجمن کی طرف سے بھارت کو امداد بہم پہنچائی گئی ہے۔ یہ امداد ٹیکنیکل مشیروں و ماہرین کی خدمات اور بچوں کی بہبود سے متعلق بین الاقوامی ہنگامی فنڈ کی طرف سے ضروری سامان کی شکل میں دی گئی ہے۔ مذکورہ اسکیموں کے سلسلے میں اب تک بھارت کو ۱۹۴۹ء سے ۱۹۵۳ء تک کل اٹھارہ لاکھ ستر ہزار ڈالر کی امداد موصول ہوئی ہے۔ عالمگیر انجمنِ صحت کے ۱۹۵۴ء کے بجٹ میں اس سلسلے میں بھارت کو تین لاکھ پچاس ہزار ڈالر کی امداد مہیا کرنے کی گنجائش رکھی گئی ہے۔

انجمن مذکور کی طرف سے موصول شدہ امداد کا زیادہ حصہ مختلف بیماریوں پر قابو پانے کے لئے صرف کیا گیا ہے۔ ترائی کے علاقے میں ملیریا پر قابو پانے اور تمام ملک میں بی، سی، جی کے ٹیکے لگانے کے مہم کے ذریعے سے تپ دق کی روک تھام کے کامیاب اقدامات کئے گئے ہیں۔ دہلی، پٹنہ اور ٹریونڈرم میں تپ دق کے کلینکوں کے لئے ٹیکنیکل امداد موصول ہوئی ہے۔ دہلی کے کالج آف نرسنگ اور بمبئی، مدراس و کلکتہ کے کئی تربیتی اداروں میں مختلف شعبے قائم کرنے یا ان کے تربیتی انتظامات کو بہتر بنانے کے لئے بھی امداد ملی ہے۔ عالمگیر انجمنِ صحت کلکتہ کی "آل انڈیا انسٹی ٹیوٹ آف ہائجین اینڈ پبلک ہیلتھ" میں زچہ و بچہ کی بہبود سے متعلق تربیتی نصاب کا معیار بلند کرنے کے لئے مدد دے رہی ہے۔ علاوہ ازیں بھارت میں ڈی ڈی ٹی تیار کرنے کے لئے کارخانے کے لئے امداد موصول ہوئی ہے۔

انجمن کے کل بجٹ کا تین فیصدی حصہ بھارت ادا کرتا ہے۔ ۱۹۵۴ء میں بھارت کی طرف سے بارہ لاکھ ستانوے ہزار روپے کی رقم انجمن صحت کے فنڈ میں دی جائے گی اور یہ رقم جلد ہی ادا کردی جائے گی۔ انجمن کے ۱۹۵۵ء کے فنڈ کے لئے بھارت کے ۵۵-۱۹۵۴ء کے بجٹ میں تیرہ لاکھ دو ہزار روپے کی رقم مخصوص کی گئی ہے۔ انجمن صحت کے کئی اعلیٰ عہدوں پر ہندوستانی کام کررہے ہیں۔ مثال کے طور پر ڈاکٹر سی منی دکن پورب ایشیا میں عالمگیر انجمن صحت کے ریجنل ڈائرکٹر کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ دکن پورب ایشیا کے ملکوں میں انجمن کے چار علاقائی نمایندوں میں سے دو ہندوستانی ہیں اسی طرح ڈاکٹر ایس سروپ انجمن کے صدر دفتر میں شعبۂ اعداد و شمار کے افسر اعلیٰ کے عہدے پر متعین ہیں۔

کیلاش ماہر

بھومی دان کی معاشی اہمیت

دنیا کی تواریخ میں کوئی بھی انقلاب اتنی تیزی کے ساتھ عوام تک نہیں پہنچا جتنا کہ آچاریہ ونوبہ بھاوے کا بھومی دان۔ اس اندولن کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں تمام مشرقی روایات کے علاوہ ویدوں کے فلسفے کا عکس بھی نمایاں ہے۔ قدیم ہندوستان کی یہ روایت تھی کہ جب کبھی قوم پر کوئی آفت یا بلائے ناگہانی نازل ہوتی تھی تو اس کو دُور کرنے کے لئے ملک میں جگہ بہ جگہ یگیہ کئے جاتے تھے۔ عوام اپنی قربانیوں کے علاوہ تپسیا بھی کیا کرتے تھے۔ آج کا ہندوستان بھی اسی قسم کی کئی بلاؤں میں مبتلا ہے۔ جیسے غریبی۔ بھوک۔ بے روزگاری وغیرہ وغیرہ۔ یہ وہ پس منظر ہے جس کی بنیاد پر آچاریہ ونوبہ بھاوے نے بھومی دان یگیہ کی ابتدا کی تھی۔

بھومی دان سے قبل مہاتما گاندھی کے دماغ میں بھی یہی خیال پیدا ہوا تھا۔ مگر اس کی تشکیل "سروا ودے" کے روپ میں ہوئی۔ مہاتما گاندھی نے ایک ایسے سماج کا تصوّر کیا تھا جہاں آدمی کسی قسم کی سماجی معاشی اور سیاسی زنجیروں کی گرفت میں نہ ہو۔ علاوہ اس کے نظام میں باہمی امداد کے ساتھ ساتھ عوام میں معاشی برابری بھی ہو۔ دوسرے الفاظ میں بھومی دان اسی سروا ودے سماج کی ایک کڑی ہے۔ اس آندولن کی ابتدا تیلنگانہ سے ہوئی تھی۔ تیلنگانہ حیدرآباد کے پوربی علاقے کا نام ہے۔ جہاں کے لوگوں کی بولی تیلگو ہے اور جن میں بلدہ نلگنڈہ۔ ورنگل۔ کریم نگر، محبوب نگر اور نظام آباد کے اضلاع شامل ہیں۔ سارے ہندوستان میں آج تیلنگانہ کا نام پھیلا ہوا ہے۔ "یہاں" کا اصلی سوال کیا ہے۔ ونوبہ جی کے الفاظ میں "یہاں کچھ لوگوں کے پاس تو ہزاروں ایکڑ زمین ہے اور کچھ کے پاس ایک انچ بھی نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ یہاں لوگوں کی تھوڑی سی تعداد تیلنگانہ کے لاکھوں باشندوں کی محنت کو چوس رہی ہے۔ جس کی وجہ سے غریب اور امیر کے درمیان زمین اور آسمان کا فرق کھڑا ہو گیا ہے۔" اس بیان سے یہ صاف ظاہر ہے کہ کن اثرات کے ماتحت بھومی دان کی بنیاد ڈالی گئی تھی۔ اس حقیقت سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ آج کے معاشی نظام میں آرتھک مساوات اور برابری کی کتنی اہمیت ہے۔ ظاہر ہے کہ کوئی بھی نظام اپنی ہزاروں خوبیوں کے باوجود بھی مفلسی اور بے روزگاری کے بڑھتے ہوئے سیلاب کے آگے نہیں ٹھیر سکتا۔

۱۵۔ اپریل ۱۹۵۱ء کو ونوبہ جی نے تیلنگانہ کے پیدل سفر کا آغاز کیا تھا۔ آچاریہ جی کو اس امر کا قوی احساس ہے کہ ہندوستانی مسائل کی جڑ بنیادی زمین اور زمین سے متعلق درختوں پر ہے اور یہ بڑی حد تک درست بھی ہے۔ کیونکہ ہمارے ملک کا معاشی ڈھانچہ کھیتی باڑی پر مبنی ہے۔ ہندوستان کی اسّی فی صدی آبادی گاؤں میں رہتی ہے اور آبادی کا بہت بڑا حصّہ زمین اور کاشتکاری سے اپنی روزی کماتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قومی تعمیر اور اصلاح کا کوئی پروگرام یا منصوبہ اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتا جب تک اس میں زراعتی مسائل کی طرف پوری پوری توجہ نہ کی جائے۔ معاشی اصلاح کے پروگرام میں زمین کے مسائل کو سلجھانے کی پوری کوشش کی جائے۔ بھومی دان یگیہ اس پروگرام کا سب سے پہلا قدم ہے۔ زمین کا مسئلہ ہمارے ہندوستان کا سب سے اہم مسئلہ ہے۔ مختلف ریاستوں میں زمینداری ختم ہونے کے بعد بھی زمین کے مسائل میں کوئی سہولیت کے آثار نظر نہیں آرہے ہیں۔

گاؤں کے باشندوں کے طرزِ بود و باش کو بلند کرنے کا سوال بھی زمین ہی سے متعلق ہے۔ ہندوستان کے مجموعی رہن سہن کا معیار اس وقت تک بلند نہیں ہو سکتا۔ جب تک کہ دیہات کے باشندوں کی مالی حالت نہ سدھاری جائے۔ مالی حالت کو سدھارنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ کاشتکار جس زمین پر کاشت کرتے ہیں وہ اُن کی اپنی ہی زمین ہونی چاہیئے۔ ہندوستان

میں آج بھی زمین کی مقدار کم نہیں ہے۔ بلکہ جو کچھ بھی زمین ہے وہ آج بھی کچھ چند افراد کی ملکیت ہے۔ باقی کاشتکار یا تو اُدھ بٹائی پر کام کرتے ہیں یا کچھ مزدوری کے عوض زمین کی کاشت کرتے ہیں اور اس طرح زمین کی کاشت کا بہت بڑا حصّہ ان لوگوں کی نذر ہو جاتا ہے جن کا صحیح معنی میں زمین سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ گاؤں کی بے روزگاری اُس وقت تک دور نہیں کی جا سکتی جب تک ہر کاشتکار کو جو کھیتی کا اہل ہے اس کی ضرورت کے مطابق زمین نہیں مل جاتی۔ بھومی دان سے اس مسئلے کو بہت آسانی سے سلجھایا جا سکتا ہے۔ جن زمینداروں کے پاس ان کی ضرورت سے زیادہ زمین ہے وہ اس یگیہ میں زمین دان کر کے ان کسانوں کی مدد کر سکتے ہیں جو بے کاری اور غریبی کا شکار ہیں۔

زمین کے متعلق آچاریہ ونوبھاوے کا یہ خیال ہے کہ زمین ایک خداداد نعمت ہے۔ معاشی نقطۂ نظر سے بھی یہ نظریہ صحیح ہے۔ زمین انسان کو بنا کسی محنت کے عوض فطرت کی طرف سے عطا ہوئی ہے۔ اور ہر انسان کو اس زمین پر مجموعی طور پر حق حاصل ہے۔ یہ کسی فرد خاص کی ملکیت نہیں ہونی چاہیئے۔ بھومی دان کا بھی یہی نظریہ ہے۔ اس لئے وہ لوگ جو اس کے برعکس اپنے حقوق اور قبضہ دکھانے کی کوشش کرتے ہیں اُن کے بیان میں صداقت بہت کم ہے۔ آچاریہ ونوبھاوے نے تیلنگانہ میں ایک بیان دیتے ہوئے کہا تھا "میں دان میں روپیہ نہیں لیتا۔ اصل بات یہ ہے کہ روپیہ نے ہندوستان کو تباہ کر دیا ہے۔ چیزوں کی جو قیمت ہے وہ گھٹتی بڑھتی رہتی ہے۔ کیونکہ روپیہ کی قیمت میں ادل بدل ہوتا رہتا ہے۔ اس کے برخلاف اناج کی قیمت مستقل ہے۔ میں تو لوگوں کو روپیہ کے چنگل سے چھڑانا چاہتا ہوں۔ روپیہ تو محض ایک ذریعہ ہے یہ دان دینے والے کے دل میں گھنٹہ پیدا کر دیتا ہے۔ لیکن زمین دان تو غریبوں کا پیدائشی حق ہے۔ اس لئے میں زمین کی بھیک لیتا ہوں"۔

بھومی دان کا صحیح فلسفہ اور اہمیت سمجھنے کے لئے یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ کچھ مشرقی نظریے پر بھی روشنی ڈالی جائے جو اس اندولن کی پشت پناہ ہے۔ یہ مشرقی فلسفہ ہے کہ انسانی دل کو ہم پیسا اور قربانی کے ذریعے بدل سکتے ہیں۔ ہندوستان میں قربانی سے بڑے بڑے مسائل کے حل کئے گئے ہیں۔ زمین کا دان دینے سے ہر انسان کے دل میں ایک صحت مند نظریہ پیدا ہو جاتا ہے۔ انسان کے دل میں یہ ایک وقت دو خیالات ہمیشہ کارفرما رہتے ہیں۔ ایک جذبہ تو اُسے ہمیشہ بھلائی کی طرف اُبھارتا ہے اور اس کے خلاف دوسرا جذبہ اُسے بھلائی کے خلاف رغبت دلاتا رہتا ہے۔ اور انسان کو غیر صحت مندانہ کاموں کے لئے اُبھارتا رہتا ہے۔ ونگلی جیل میں ایک مرتبہ ونوبھاجی نے کچھ قیدیوں سے فرمایا تھا "مجھے یقین ہے کہ دل بدلتے ہیں۔ زمین دان دینے سے آدمی کے اندر والی بھلائی اور بُرائی میں بھڑنت (مقابلہ) ہو جائے گا، اور پھر اُن کا نظریہ سنبھل جائے گا۔ یہی سائنس اور ہندوستانی فلسفے کے میل کا نتیجہ لازمی طور پر اچھا اور میٹھا ہوگا"۔ مشرقی فلسفے کی بنیاد اہنسا اور دوسروں کے حقوق کی حفاظت پر ہے۔ بھومی دان کے نظریے سے صاف ظاہر ہے کہ اہلِ مشرق اور خصوصاً ہندوستان کے رہنے والے اپنے مسائل کو سلجھانے کے لئے امن اور آشتی کے راستے کس ثابت قدمی کے ساتھ گامزن ہیں۔ اس کے خلاف یورپ کے رہنے والے اپنی سائنس، تہذیب اور تمدن کی ترقی کے باوجود بھی اس سکون سے بے بہرہ ہیں جو اہلِ مشرق کا حصّہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مشرق میں نفاقی قدریں آج بھی اتنی ہی ممتاز ہیں جتنی کہ ہزاروں سال پہلے تھیں اور یہی دوسرے الفاظ میں بھومی دان کا پیغام ہے۔

بھومی دان کی ابتدائی تحریک کے سلسلے میں ونوبھاجی نے پیدل یاترا سے پچاس دن میں لگ بھگ چھ ہزار ایکڑ زمین حاصل کی تھی۔ اس سے قبل بھومی دان کی کامیابی بہت مشکوک نظروں سے دیکھی جاتی تھی۔ آج جب کہ بیس لاکھ ایکڑ سے بھی زیادہ زمین اکٹھی ہو چکی تو مخالفین کو بھی اس تحریک کی اہمیت کا صحیح اندازہ ہو چکا ہے۔ نیچے دیئے ہوئے ہندسوں سے بھومی دان کی اہمیت اور مقبولیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

نام ریاست	مقررہ تعداد	تعداد جو اب تک جمع ہو چکی ہے	
آندھرا	ایک لاکھ ایکڑ	۷۰۹۷	ایکڑ
اُتر پردیش	گیارہ لاکھ "	۵،۱۱،۴،۱۲	"
آسام	ایک لاکھ پچاس ہزار "	۲۸۵۱۴	"
گجرات	پچھتر ہزار "	۱۶۷۶۵	"
تامل ناڈ	ایک لاکھ پچاس ہزار "	۱۴۰۰۰	"
بہار	تیس لاکھ "	۱۱،۱۲،۳۴۳	"
مدھیہ پردیش	ایک لاکھ پچیس ہزار "	۵۱۲۲۱	"

راجستھان	دس لاکھ ایکڑ	۲،۲۰،۰۰۰ ایکڑ
وندھیہ پردیش	چالیس ہزار	۳۴۶۷ "
حیدرآباد	ایک لاکھ پچاس ہزار	۶۶،۵۴۳ "

زمین جمع ہونے تک ہی بھومی دان کا آندولن ختم نہیں ہو جاتا۔ بلکہ اس کے ساتھ جو نہایت اہم سوال ہے وہ زمین کا بٹوارہ ہے۔ جن کسانوں کے پاس زمین نہیں اُن کو زمین بانٹی جائے۔ زمین کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ کھیتی کے وہ تمام ذرائع بہم پہنچائے جائیں جن سے اس زمین کی اوپج بڑھائی جا سکتی ہے۔ اس طرح بھومی دان ایک بہت اہم تحریک کی ابتدا ہے۔ اس تحریک کے ساتھ ساتھ "سمپتی دان" اور "کوپ دان" اندولن کی بھی ابتدا ہو چکی ہے۔ اگر یہ تحریک پورے طور سے کامیاب ہوتی ہے تو دنیا کی معاشیات کی تواریخ کو از سرِ نو ترتیب دینے کی ضرورت ہوگی اور یہ ہندوستان کا عالمی امن کے لئے ایک عظیم کارنامہ ہوگا۔

سنٹرل ٹریکٹر آرگنائزیشن

مرکزی ٹریکٹر آرگنائزیشن دنیا بھر میں بھاری ٹریکٹروں کے سب سے بڑے "بیڑے" کو زرعی اغراض کے لئے استعمال کر رہا ہے اور یہ وزارتِ خوراک و زراعت کا سب سے زیادہ اہم محکمہ ہے جو ملک بھر میں قومی تعمیر کے ایک نہایت مفید کام یعنی زمینوں کو قابلِ زراعت بنانے میں مصروف ہے۔ اس محکمے نے وجود میں آنے کے بعد تھوڑے عرصے میں ہی مدھیہ بھارت میں کانس سے اٹی پڑی دس لاکھ ایکڑ زمین اور اُتر پردیش میں ۳۶ ہزار ایکڑ جنگلات کو صاف کر کے پھر سے قابلِ کاشت بنا کر یہ ثابت کر دیا ہے کہ بھارت سرکار نے جو عظیم کام اس کے سپرد کیا تھا اُس کو اُس نے کامیابی سے تکمیل تک پہنچا دیا ہے۔

یہ امر باعثِ اطمینان ہے کہ نا تجربہ کاری، ضروری فالتو کل پُرزوں کی کمیابی، جھاڑیوں سے اٹی ہوئی زمینوں اور دیگر کئی طرح کی مشکلات کے باوجود یہ محکمہ ۱۹۴۹-۵۰ء سے اپنی کارکردگی میں بتدریج اضافہ کرتا چلا آیا ہے۔ جہاں ۱۹۴۹-۵۰ء میں فی ٹریکٹر ہل رانی کی روزانہ اوسط ۸۲۶ ایکڑ تھی۔ وہاں ۱۹۵۲-۵۳ء میں یہ اوسط ساڑھے بارہ ایکڑ ہو گئی۔ یعنی ۵۴ فی صدی کا اضافہ ہوا جس کی وجہ کارکنوں کو مقررہ رقبہ سے زیادہ زمین کو قابلِ زراعت بنانے پر بونس دینے کی اسکیم ہے۔ بھیلسہ میں جو یونٹ کام کر رہے ہیں اُن کی سنہ ۵۳-۱۹۵۲ء کے مقابلے میں ۹۲ فی صدی زیادہ ہے اور ۴۰ فی صدی زیادہ زمین از سرِ نو قابلِ کاشت بنائی ہے۔ کارکردگی کے لحاظ سے بھیلسہ یونٹوں سے دوسرے درجے پر بھنڈ گڑھ یونٹ ہیں۔ بھیلسہ یونٹوں کے جوانوں کو اس سال کی ٹرافی حاصل کرنے کا فخر حاصل ہوا ہے۔ انھیں یہ محسوس کرنا چاہئے کہ وہ زمینوں کو از سرِ نو قابلِ کاشت بنانے کے سب سے بڑے پروگرام کو پایۂ تکمیل تک پہنچا رہے ہیں اور اس طرح وہ اپنے ہم وطنوں کو خوراک خوراک بہتیا کرنے کے بنیادی مسئلے کو حل کرنے میں اپنا حصّہ ادا کر رہے ہیں۔ پچھلے چند مہینوں میں پارلیمنٹ کے ممبروں کی کئی پارٹیاں مرکزی ٹریکٹر آرگنائزیشن کے کام کا معائنہ کرتی رہی ہیں۔ عالمی بنک کے نمائندوں نے بھی آرگنائزیشن میں کام کرنے والوں کے طریق کار کی بہت سراہنا کی ہے۔

اطہر حسین جعفری

فٹز جیرلڈ مترجم رباعیاتِ عمر خیام

وہ لوگ جو کسی وقت بھی کتب خانے سے باہر قدم نہیں نکالتے کس خوبی سے سارے جہان کی سیر و سیاحت کا لطف اُٹھاتے ہیں۔ یا یوں کہنا چاہیئے کہ ایک بڑی دُوربین کے ذریعے سے بیٹھے بیٹھے دور و دراز ممالک کی سیر کر لیتے ہیں اُن کے دماغ ایک دُوربین عکاسی (فوٹو گرافک کیمرا) کی طرح دنیا کے نقوش ضبط کر لیتے ہیں۔ آوازیں جو اُن کے کانوں میں آتی ہیں ایک بلند آہنگ ریڈیو سے نکلی ہوئی آواز سے بھی زیادہ بلند اور روشن ہوتی ہے۔

اُس شخص کی طرح جسے کبھی کبھی کسی خُردہ فروش کی معمولی چیزوں میں سے ایک بیش قیمت موتی مل جاتا ہے؛ ان لوگوں کو بھی مشرقی ممالک کے آثار ادبی کی کاوش، اور تجسس میں لگے رہتے ہیں اور ملکوں کی قلمی کتابوں کا مطالعہ نہایت شوق اور صبر کے ساتھ کرتے رہتے ہیں کبھی نہ کبھی ایک بیش بہا خزانہ ہاتھ آجاتا ہے۔ اُن کا دماغ کافی انتقادی اور غیر جانبدارانہ ہوتا ہے اور مشرق کے آثار ادبی کا اُس پر وہی اثر ہوتا ہے جو مغرب کے ابر آلودہ آسمان پر سبزہ زار و یابانِ مشرق کا۔ یہ لوگ عموماً بلومسبری کے اطراف میں ٹہلتے ہوئے اور آس پاس کی کتاب فروشی کی دوکانوں کی طرف جو قدیم مختلف رسالوں اور کتابوں سے پٹی پڑی ہوتی ہیں تاکتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اس کے بعد ایک نانِ شیریں کھا کر اور ایک گلاس دودھ پی کر کسی خاموش شہ قلمی کتاب کے مطالعے میں مشغول ہو جاتے ہیں۔ یہ لوگ بآسانی گمراہ نہیں ہو جاتے۔ اُن کا جوش و خروش اُنھیں مغالطے میں مبتلا نہیں کرتا۔ اُن کی آنکھیں اُن لوگوں کی طرح جو خود مشرقی ممالک میں سیاحت کرتے ہیں۔ اور ادبی خزانے مشرق کی راہوں میں تلاش کرتے ہیں۔ گرم ممالک کے تُند و درخشاں رنگوں سے خیرگی اختیار نہیں کرتیں۔ وہ مرد فاضل جو خود اپنے ملک میں رہ کر دور و دراز ممالک کا مطالعہ کرتا ہے سیدھے راستے سے بہت کم منحرف ہوتا ہے۔

ساتھ ہی اس کے اس قسم کے اکثر آدمیوں نے جن میں سے ایک فٹز جیرلڈ Fitzgerald بھی ہے، اس بات کا ثبوت دیا ہے کہ وہ اپنے خاص انداز سے شرق و غرب کو بہم آمیختہ کر سکتے ہیں۔ یہ لوگ ادبی کیمیاگر ہیں اور اُن جواہرات سے جو ٹیوٹونیہ مشرق سے مغرب کے یورپین درباروں کے لئے لے گیا تھا بدرجہا بیش قیمت جواہرات بنا سکتے ہیں لیکن اس میں بھی شک نہیں کہ کچھ مشکوک سوداگر بھی اس کاروبار میں دخیل ہے ہیں بشترک کی نقلی قلمی کتابیں بھی جعلی آسمانی کتابوں کی طرح افراط ہو گئی ہیں۔ رئیسانہ نظر رکھنے والوں کی توجہ مشرقی ممالک کی جانب روز بروز بڑھتی رہی۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اب ہم اُس مقام کے منظر کا نقشہ ناظرینِ مقالہ کے مطالعہ کے لئے پیش کریں جہاں "رباعیاتِ عمر خیام" کا ترجمہ انگریزی میں ہوا تھا۔

فٹز جیرلڈ خود اپنے کہے مکان واقع سفوک (Suffolk) کے متعلق جو صرف دو کمروں پر مشتمل تھا، کہتا ہے "میرے مکان کی کھڑکیاں انگلستان کے خراب ترین قطعاتِ زمین کی جانب کھلتی تھیں" یہ ولایتی شاعر بقولِ خود معروف سیاح رابن کروسو کی سی زندگی بسر کرتا تھا، اور سچ تو یہ ہے کہ اُس مکان میں ہر غیر معمولی بے نظمی و بے ترتیبی حکم فرما تھی۔

شاعر شکسپیئر کا ایک مجسمۂ نیم تنہ کسی طاقچے پر رکھا ہوا، مختلف قسم کی کتابیں کمرے میں اِدھر اُدھر بکھری ہوئی، تختے پر جڑی ہوئی چند تصویریں تپائیوں پر رکھی اوراقِ موسیقی۔ تمباکو پینے کے مختلف قسم کے پائپ مستعد

چڑیاں بیٹوں یا پیا نو بابے پر منتشر پڑی ہوئی۔ کیسے مزہ کی بات ہے کہ وہ قدیم اشیا کے اس عجیب و غریب اختلاط (گڈمڈ) کے درمیان ایک بڑا سا پیالہ بیئر شراب کا بھی موجود۔

بال پریشان۔ خط بڑھا ہوا لباس خانگی (ڈریسنگ گاؤن) جسم پر اور کفش سرپائی (سلیپر) پیروں میں۔ اس شان سے فٹز جیرلڈ اپنے کلبۂ چوبیں میں بیٹھا کرتا تھا۔ کبھی کبھی باغ میں ٹہل لیا کرتا تھا جس وقت پرانی ٹوپی سر پر رکھے، مخمل دار ساٹن کی واسکٹ ڈاٹے۔ ٹوپی کے گرد رومال لپیٹے۔ پیروں میں سلیپر پہنے سیر کے لئے نکلتا تھا تو راستہ چلنے والے اس کی اس ہیئت کذائی کو حیرت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔

اوّل تو گرجے بہت کم جاتا تھا، اور اگر کبھی گیا بھی تو محراب میں لگے کنکرتے کے پھول دیکھا کرتا تھا۔ فٹز جیرلڈ کے ایک دوست نے ۱۸۳۳ء میں اس کے بارے میں لکھا تھا۔ فٹز جیرلڈ کو سب چیزوں میں سوائے گھاس پات اور ہوائے آزاد کے کچھ پسند نہیں۔ آخر اس دنیا میں اس کا انجام کیا ہوگا؟ لیکن درحقیقت وہ بہت خوش تھا اور ساتھ ہی اس کے اپنے غیر عادی اور عجیب اخلاق (نرالے پن) سے واقف بھی تھا۔

اپنے گھر والوں کے بارے میں کہا کرتا تھا "ہم سب کے سب دیوانے ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ میں سمجھتا بھی ہوں کہ میں دیوانہ ہوں۔

فٹز جیرلڈ کے پاس اتنی دولت تھی کہ وہ بغیر کچھ کئے بھی جس طرح چاہتا زندگی بسر کرتا۔ دانش گاہ کیمبرج کی تعلیم نے اس میں ایک گونہ ادبی قوتِ تمیز پیدا کر دی تھی۔ اس کے تمام دوست مثلاً تھیکرے، ٹینی سن، کارلائل وغیرہم اس کی صحبت سے لطف اندوز ہوتے تھے۔ اس سے بھی بڑھ کر یہ بات تھی کہ اس کے خطوط جو بانِ انگریزی کے بہترین کارنامے سمجھے جاتے ہیں جمع کرتے تھے۔

بینائی کمزور ہو جانے کے زمانے میں ایک شخص کو نوکر رکھ لیا تھا جو کتاب پڑھ کر سنایا کرتا تھا۔ سنتے وقت آتش دان کے قریب اونچی ٹوپی پہنے آرام کرسی پر بیٹھ کر پیر ایک چھوٹی تپائی پر رکھے رہا کرتا تھا۔ کبھی کبھی کسی پوشیدہ غرض سے لندن بھی چلا جایا کرتا تھا۔ ممکن ہے کہ کلیسائے ویسٹ منسٹر کے قریب ٹہلنے یا خیابانِ چیرنگ کراس کی کتاب فروشی کی دکانوں پر کتابوں کی تلاش میں یا خیابانِ چین واک میں اپنے قدیم آنجہانی رفیق کارلائل کی یاد میں چند آنسو بہا جاتا ہو۔ فٹز جیرلڈ کی آخری زندگی کی بدنصیبی یہ تھی کہ اس کے بہترین رفقا قضا کر گئے تھے، اسی لئے وہ بالکل تنہا رہ گیا تھا اور پیری نے دوست تلاش کرنے کی اجازت نہ دی تھی۔ فٹز جیرلڈ کی وفات خود اپنی خواہش کے مطابق ناگہانی طور پر ہوئی۔ یعنی ایک دن رات کے وقت کسی دوست کی ملاقات کے لئے جا رہا تھا کہ سکتۂ قلبی کے اثر سے دنیا سے کوچ کر گیا۔

فٹز جیرلڈ کے قیافے سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ کوئی زندہ انسان کی صورت نہیں بلکہ ایک تصویر ہے جس کا رنگ دھوپ کی تیزی کے اثر سے اُڑ گیا ہے۔ اس شخص کو دیوار کے قریب دھوپ میں بیٹھنے کی جتنی رغبت تھی اتنی ہی اپنی شہرت سے نفرت۔ اُسے اپنے دوستوں کی شہرت اور معروفیت کا حال سن کر تکلیف ہوتی تھی۔ مجرمانہ انداز سے تاسف کے ساتھ ان کے حلقۂ شہرت سے دُور بھاگتا تھا، اور سفوک میں اپنے خاموش اور چہل پہل سے دُور خس پوش مکان میں سیدھے سادے دہقانیوں اور ماہی گیروں کے جوار میں زندگی کے دن گزارتا تھا۔

فٹز جیرلڈ کا خوشترین وقت وہ ہوتا تھا جب کسی کشتی میں بیٹھ کر دریا کی سیر کرتا، اور کمال درجے کی خوشی اُس وقت حاصل ہوتی جب وہ جوان رعنا ملاح جوزف فلیچر معروف بہ پوش (Posh) کے ساتھ ناحیۂ براڈز (Broods) کنارے کشتی رانی کرتا۔ وہ مختلف طریقوں سے اس بات کا اظہار کرتا تھا کہ وہ اس دریا نورد کی دوستی کو بلند پایہ ادیبوں کی دوستی سے اچھا سمجھتا ہے۔ خلاصہ یہ کہ فٹز جیرلڈ کی نگاہ میں دوستی کی اہمیت شہرت سے زیادہ تھی۔

ٹینی سن اور کارلائل ایسے اس کے قلبی دوست بھی اس بات کو بخوبی جانتے تھے کہ اس کی دوستی سخت اور مبصرانہ نکتہ چینیوں سے توأم ہوتی ہے۔ جیسا اس امر سے ظاہر ہوگا کہ وہ ان دونوں دوستوں کے نگارشات پر ہمیشہ سخت سے سخت نقد و تبصرہ کیا کرتا تھا۔ لیکن اُن کی شخصیت کے بارے میں کبھی اس بات کو روا نہ رکھتا تھا۔ آخر فٹز جیرلڈ میں وہ کون سا پوشیدہ جذبہ تھا جو بڑے سے بڑے لوگوں سے اقرار کرا لیتا تھا کہ یہ مردِ عجیب بہترین دوست ہے۔ وہ خود اپنے متعلق لکھتا ہے: "میں وہ بادۂ شخص ہوں کہ مجھ ایسے صدہا اشخاص ہر سال دنیا میں پیدا ہوتے رہتے ہیں" ساری عمر میں صرف ایک عورت فٹز جیرلڈ کی شریکِ زندگی رہی، اور

وہ بھی محض تھوڑے زمانے تک۔ یہ امر مشتبہ ہے کہ اُس عورت نے فٹز جیرلڈ کو حقیقی معنی میں پہچانا بھی تھا۔ اُس نے صرف اتنا کیا کہ اُس کو اُس کے نفس کا شناسا بنا دیا۔ اس عورت کے پُرشور تعلق نے ثابت کر دیا کہ فٹز جیرلڈ روحِ عزتِ بیت (تجرد) اور ذوقِ تنہائی کا دارا رہے۔

اس داستان کی شرح نہایت درجہ عجیب اور حیرت انگیز ہے۔ عالمِ بے خیالی میں معلوم ہوتا ہے کہ ایڈہ رڈ فٹز جیرلڈ نے بے سوچے سمجھے زناشوئی کی زندگی اختیار کر لی ہوگی۔ بالکل اُسی شخص کی طرح جو کسی دریا کے پُل کے کنارے کھڑا تھا۔ اتفاق سے ایک خاتون اُس کے قریب سے گزری۔ اس کی تعظیم و تکریم کے طور پر بے خیالی کے عالم میں پیچھے ہٹا اور دریا میں گر گیا۔ چنانچہ اسی بے خیالی مگر شائستگی کے ساتھ فٹز جیرلڈ نے خانہ داری کی زندگی سے دست کشی بھی کر لی۔

اس داستان کی ابتدا اس طور سے ہوئی کہ فٹز جیرلڈ نے اپنے ایک قدیم خامش ادبی دوست برنارڈ بارٹن سے کہا تھا کہ میں فلاں معلمِ مدرسہ کی لڑکی نام میٹی سے شادی کروں گا۔ یہ بات کہ قول مذکور از قسم درخواستِ ازدواج تھا یا نہیں مشتبہ ہے۔ لیکن بہرحال دوسروں نے تو یہی سمجھا، بلکہ خود فٹز جیرلڈ نے اس کا اقبال کیا۔

مان لینا پڑے گا کہ ان دونوں میں سے کوئی بھی شش و باز نہ تھا۔ کیوں کہ اُن کی عمریں پچاس سال کے قریب پہونچ چکی تھیں۔ بہرحال رسم و رسمی بمقام گرینچ ادا ہوئی، اور ہفتۂ عودسی براٹنین میں گزرا۔ اس کے بعد میاں بیوی خیابان گریٹ پورٹ لینڈ کے مکان نمبر ۳۱ میں رہنے لگے۔

زناشوئی کی زندگی کے تھوڑے ہی دن فٹز جیرلڈ کی دل سردی کے لئے کافی تھے۔ بیوی چاہتی تھی کہ وہ اکثر دوسروں کی ملاقات کے لئے جایا کرے۔ اُن کو اپنے یہاں بلایا بھی کرے۔ اور کھانے کے وقت بھی لباس پہنا کرے۔ لیکن یہ بے چارہ مدت دراز سے تنہائی کی زندگی بسر کرنے کا اس درجہ عادی ہو گیا تھا کہ اب اس کے لئے اجتماعی زندگی کا تحمل دشوار تھا۔

خلاصہ یہ کہ لندن میں صرف دو ہفتے کے قیام کے بعد ہی فٹز جیرلڈ نے علیحدگی اختیار کر لی۔ پانچ ہفتے تک ایک دوسرے سے جدا رہے ہوں گے کہ یارمتھ کے قریب گارلسٹن کے مقام پر زناشوئی کی زندگی کی تجدید کا خیال پیدا ہوا۔ چنانچہ پھر شادی ہوئی اور فوراً ہی تلخ تجربے کی بنا پر دائمی علیحدگی کا فیصلہ ہو گیا۔ فٹز جیرلڈ نے اپنی اس بیوی کی گزر بسر کے لئے اچھی خاصی رقم دے دی۔ چنانچہ خانم فٹز جیرلڈ نے بمقام کروائیڈن اقامت اختیار کر لی اور طولانی زندگی گزار کر اپنے شوہر کی وفات سے ۱۵ سال بعد انتقال کیا۔ قطعی جدائی کے بعد فقط ایک بار دونوں کی ملاقات ہوئی اور وہ بھی چند دقیقہ کی۔ دونوں بکمالِ ادب و نزاکت ایک دوسرے سے پیش آئے۔ علیحدگی کا معاملہ نہایت آبرومندانہ طریقے سے انجام پایا تھا۔ لیکن حیرت انگیز طور پر جس کا سمجھ میں آنا ناظرین کے لئے دشوار ہے۔

کیا عجب ہے کہ اس میں زیادہ قصور فٹز جیرلڈ ہی کا ہو۔ کبھی کبھی اُس کے مخبط دماغ پر گہرے حزن و اندوہ کی کیفیت طاری ہو جاتی تھی جس سے اُس کے خطوط، بھول یادداشتیں متعدد غیر مکمل ترجمے بیقرارانہ گردشیں۔ براؤنز کے اطراف میں کشتی رانیاں پُر ہیں۔

درحقیقت فٹز جیرلڈ پوچ اور آئندہ کے متعلق بدبین لوگوں میں سے تھا۔ شاعر ٹی۔ سی الیاٹ کی تحقیق کے بموجب وہ ایک ادبی مجنون تھا۔ اس کی ساری زندگی اور روزانہ کاموں میں ایک احساسِ ناکامی کارفرما تھا۔ اُس کی بیمار روح یہی سمجھتی تھی کہ موت ہمیشہ اس کے درپے رہتی ہے۔

بآسانی کہا جا سکتا ہے کہ عالم دوستی و رفاقت سے خاص تعلق ہی تھا، جس نے فٹز جیرلڈ کو حکیم عمر خیام سے آشنا کرا دیا۔

۱۸۵۶ء میں اتفاق سے اِس براؤنز کے آوارہ گرد شاعر کی شناسائی ایک گیہوں کے تاجر کے بسط سالہ لڑکے سے ہوئی جس کا نام ای۔ بی۔ کاول تھا اور کتب بینی کا بے حد دلدادہ تھا۔ لاطین، سنسکرت اور فارسی اچھی طرح جانتا تھا۔ کاول نے ایک عورت سے جو عمر میں اس سے کئی سال بڑی تھی، شادی کر لی۔ یہ خاتون اُسے اپنی علمی استعداد بڑھانے کا شوق دلایا کرتی تھی۔ یہی خاتون تھی جس نے فٹز جیرلڈ اور دوسرے احباب کی رائے کے خلاف زبردستی اپنے شوہر کو اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے آکسفورڈ یونیورسٹی بھجوایا تھا، اسی کا نتیجہ تھا کہ کاول قابلیت حاصل کر کے ایک ممتاز مستشرق ہو گیا۔ بعد ازاں اُس کا تقرر بطور معلم کلکتہ یونیورسٹی میں ہوا، اور آخر میں کیمبرج یونیورسٹی میں سنسکرت کی پروفیسری کے عہدے پر ممتاز ہو کر انگلستان واپس گیا۔

کاول کا نفوذ فٹز جیرلڈ پر مسلم نظر آتا ہے۔ اُسی کے اثر سے اُس نے اسپانیائی (Spanish) زبان سیکھی اور کالڈرون کے

چھ نمائشی نمونجات کا ترجمہ شروع کیا جن کے متعلق بعض مترجمانِ ادبی کا عقیدہ ہے کہ وہ اس قابل نہ تھے کہ اُن کے ترجمے کی زحمت اُٹھائی جائے۔ مزید براں کاول ہی تھا جس نے فٹز جیرلڈ کو فارسی کی تحصیل پر آمادہ کیا۔ اِدھر کاول غزلیاتِ حافظ کے مطالعے میں مشغول تھا اُدھر فٹز جیرلڈ نے فارسی سے انگریزی کا ترجمہ مکمل کرکے جامی کی داستان سلامان و ابسال کو انگریزی کا جامہ پہنا دیا۔

ایک دن ہاڈلی ین کے کتاب خانہ میں شرقی قلمی نسخوں کے تفحص کے ضمن میں کاول کو اتفاق سے ایک قلمی کتاب ہاتھ آگئی۔ جس کا کاغذ زرد تھا اور مطالب سیاہی مائل ارغوانی رنگ سے لکھے تھے۔ اس کے ہر صفحے کا حاشیہ مطلا تھا۔ کتاب رباعیات عمر خیام تھی۔

اس نسخے کا ہاتھ آنا تھا کہ کاول کے دل میں ایک ہیجانی کیفیت پیدا ہوئی وہ اُس نے فوراً اُس قلمی کتاب کو نقل کرنا شروع کر دیا، اور آکسفورڈ چھوڑنے اور اپنی جدید جگہ پر کام کرنے کے لئے کلکتہ جانے سے پہلے اس نقل کو فٹز جیرلڈ کے پاس بھیج دیا۔ اس خیال سے کہ وہ نہ صرف اس کے فارسی زبان کے مطالعے میں مدد ہوگی۔ بلکہ اس کا ترجمہ انگریزی میں کیا جائے۔

فٹز جیرلڈ نے اس کا مطالعہ شروع کیا اور روزانہ جب تفریح کے لئے نکلتا تو اُسے ساتھ لیجاتا۔ چنانچہ باہتنگی و بکمالِ فراغ بالی اس کا ترجمہ شروع کیا۔ جس نے جلد اقتباس کی شکل اختیار کرلی۔ اُس خط میں جو اُسی دوران میں فٹز جیرلڈ نے کاول کے نام لکھا تھا رباعیات کے ترجمے کے ساتھ اُس کے عشق و شغف کا اظہار بخوبی ہوتا ہے۔ خط میں لکھتا ہے۔

"میں بیڈفورڈ شائر کے قیام کے زمانے میں تقریباً ہر دوسری کتاب کو ہٹا کر رباعیات عمر خیام اُٹھا لیتا اور ایک ایسے پُر از گلہائے لالہ چمن میں جس کی نسیم روح پرور جاروب کشی کرتی تھی بیٹھ کر بے اختیار رباعیات کے مطالعے میں مشغول ہو جاتا تھا۔"

رباعیات کے اُس نسخے میں جو ہاڈلی ین کے کتاب خانے میں موجود ہے ڈیڑھ سو رباعیاں مندرج تھیں۔ جن میں سے بیشتر مطائف و ذکر شراب و نغمہ و زن و حسن، زیست و مرگ پر مشتمل نفیس قطعات کا عطر مجموعہ تھیں۔ ان میں اصلاً پیوستگی و اتصال نہ تھا۔ اور اگر تھا بھی تو بہت کم اور غیر محسوس۔ خیام فلسفۂ کلام حزن آور اور مذہب جبر کا مدعی تھا۔ جو فطری طور پر مترجم کے مذاق کے موافق تھا۔

الغرض فٹز جیرلڈ نے رباعیوں کا انتخاب شروع کیا اور ترتیب میں یہ التزام رکھا کہ رباعیاں رُوح کے طلب حقیقت پر مشتمل ہوں۔ اُس نے ناتمام معنی والی رباعیوں کو تو قطعاً ہی چھانٹ کر الگ کر دیا بلکہ اس بات کے درپے ہوا کہ عطار اور حافظ ایسے دوسرے فارسی شعراء کے افکار رباعیات بھی اُن کے ساتھ شامل کر دی جائیں۔ چنانچہ اس کام کو اُس نے بغیر کسی قسم کے وسواس کے انجام دیا۔ اسی موقع پر ایک مرتبہ کاول کو لکھا تھا: "میرا خیال ہے کہ غزلیات کے ایسے اچھے اشعار کو بھی نہایت خوش اسلوبی سے جمع کر دیا جائے، اور اُن کے نکال لینے کے بعد وہ غزلیں خالی شیشے کی طرح بے مغز و بے معنی رہ جائیں گی۔ آئندہ ملاقات کے موقعے پر اس کام کے اسلوبِ روش کے متعلق گفتگو کی جائے گی۔"

فٹز جیرلڈ انتھک کوشش کے ساتھ ترجمے کی زحمت برداشت کرتا اور رات کے وقت گھنٹوں چراغ کی روشنی میں بیٹھا کام کیا کرتا۔ چنانچہ اسی کی بدولت ضعف باصرہ بڑھاتا رہا۔ کبھی محنت سے اُکتا کر قلم زمین پر ٹپک دیتا اور تھوڑی دیر تک مٹی کے نئے پائپ میں تنباکو بھر کر اُسے بھی جھنجلا کر توڑ ڈالتا اور پھر ترجمہ میں مشغول ہو جاتا۔ اُس کی پالی ہوئی بلی چراغ کی روشنی میں بیٹھی ہوئی غم انگیز نگاہ سے اُسے تاکا کرتی۔ فٹز جیرلڈ کبھی کاغذات کو پھینک پھانک کر دریا کی سمت چلا جاتا، اور سابق الذکر کوش یا، کسی دوسرے ملاح کے ساتھ اپنی کشتی پر بیٹھ کر بُرائوز کے اطراف میں کشتی رانی کرتا یا دریائے شمال (North Sea) میں داخل ہو کر اسی حالت میں دو ایک گھنٹے یا کبھی کبھی دو ایک دن تک دریا ہی میں وقت گزارتا۔ واپسی پر اُس کا چہرہ تمتمہ ہوا کے اثر سے سُرخ اور سمندر کے نمکین پانی کے چھینٹوں سے ڈھکا ہوا ہوتا تھا۔ کشتی سے اُتر کر پتلون کے پائنچے چڑھائے، برہنہ پا، پیر گھسیٹتے گھر آتا۔

غالباً اس کے بڑے عیبوں سے ایک یہ تھا کہ وہ اپنے ابتدائی ترجمے پر اعتماد و قناعت نہ کرتا۔ نظر ثانی اور تصحیح کا وسوسہ اُسے ستاتا رہتا تھا۔ گو اُس کے خطوط سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ایک نہایت اچھا نویسندہ اور اُس کا طرز نگارش آئندہ نسلوں کے لئے خوش آیند تھا۔

لیکن پھر بھی وہ اپنے ابتدائی ترجمے سے مطمئن نہ ہوتا تھا۔ حالانکہ اُس کے بعد والے ترجمے میں وہ لطف باقی نہ رہتا جو اول اور اصلی ترجمے میں ہوتا تھا۔

بعض نقادانِ سخن کا خیال ہے کہ اسی نظرثانی کی بدولت عمر خیام کی رُباعیوں کے ترجمے کی خوبی میں فرق آگیا۔ رُباعیات کا تیسری مرتبہ والا ترجمہ تو اپنی اصلی شکل و معنی سے اور بھی دور ہو گیا ہے۔ لہٰذا جو مطالعہ کرنے والے رُباعیاتِ عمر خیام کی اصلی شکل و معنی سے آگاہ ہونا چاہتے ہیں۔ اُنھیں لازم ہے کہ تینوں مختلف ترجموں کو پڑھیں۔ تب اس کے بعد کوئی قطعی فیصلہ کریں۔ باوجود اس نقص کے فٹز جیرلڈ کے تینوں ترجموں میں رباعیات کی اصلی زیبائی موجود ہے۔ وہ گھڑی جب یہ فیصلہ کر کے کہ اب رباعیات کا ترجمہ مکمل ہو گیا ہے۔ فٹز جیرلڈ نے قلم رکھ دیا تھا بہت اہم مگر غم انگیز تھی۔ شیخص اُن لوگوں میں سے تھا جو بادلِ ناخواستہ ازروئے جبر و اکراہ کسی کام کو کامل سمجھتے ہیں۔

فٹز جیرلڈ جو بذاتِ خود شاعرانہ صفت سے متصف تھا کسی کام کے ادا نہ کر اُس کے ختم پر ترجیح دیتا تھا۔ چنانچہ رباعیات کا ترجمہ ختم ہوتے ہی اس اضطراب میں گرفتار ہو گیا کہ آخر اس کو کیا کیا جائے۔ آیا یہ ترجمہ قابلِ طباعت و اشاعت ہے بھی؟ اُسے خود اس امر کے بارے میں بہتیرے شبہات تھے۔

عین اُسی زمانے میں جبکہ فٹز جیرلڈ اپنے ترجمۂ رباعیات کے متعلق مشغولِ تفکر تھا مُدیر مجلّہ فریزر (Frazer) کا ایک خط اخبار میں شائع کرنے کی غرض سے مضمون (ترجمہ) کی طلبی میں واصل ہوا۔۔۔ فٹز جیرلڈ نے اُس کے جواب میں ترجمے کا قلمی نسخہ روانہ کر دیا۔ لیکن اس میں سے ایسے اشعار حذف کر دیے جنھیں وہ سمجھتا تھا کہ رسالوں کے پڑھنے والوں کے مذاقِ طبع کے موافق نہ ہوں گے۔

یہ واقعہ ۱۸۵۸ء کا ہے جب ایک سال کے بعد بھی انگریزی رُباعیوں کے چھپنے کی نوبت نہ آئی، تو مدیر مذکور سے اُن کی واپسی کا تقاضا کیا۔ اس کے بعد اُن کو خود طبع کرانے کا مصمم ارادہ کر لیا۔ اور اس کام کو ایک مطبع کے مالک کوارچ نام کے سپرد کیا۔ چنانچہ وہ سو پچاس جلدیں قہوہ رنگ کے کاغذ پر طبع ہوئیں۔ اور قیمت فی جلد ۵ شلنگ رکھی گئی۔ لیکن بدقسمتی سے عوام کا کیا ذکر ملکۂ انگلستان کو بھی کتاب پسند نہ آئی اور نہ کسی اور نے اس کی خریداری کی جانب توجہ کی۔ بہرحال فٹز جیرلڈ نے چند جلدیں اپنے لئے رکھ لیں اور تھوڑی سی اپنے دوستوں کو بھیج دیں۔ بنجملہ اُن کے کاول بھی تھا جو مذہبی خیال کا آدمی ہونے کی وجہ سے کتاب کے مطالعے سے مضطرب ہوا۔

فٹز جیرلڈ نے ایک نسخہ تو جارج بارو کے لئے رکھ لیا۔ اور باقی کو ارچ مالکِ مطبع مذکور کے حوالے کر دیا کہ جو چاہے کرے۔ اُس نے جب دیکھا کہ لوگ کتاب کو بجائے پانچ کے ایک شلنگ میں بھی نہیں لیتے تو ساری کتابیں خیابانِ مارٹن کی ایک چھوٹی سی کتاب فروشی کی دوکان پر دے دیں اور قیمت گھٹا کر صرف ایک پینی کر دی۔ روزوٹی کے دو دوستوں نے اس کی چند جلدیں یہ لیں۔ یہ کتاب اُنھیں اس قدر پسند آئی کہ اُنھوں نے اس کا ذکر خود روزٹی سے کیا۔

روزٹی اُس وقت اتفاق سے سوئن برن کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ سوئن برن کو رُباعیات کی ادبی قدر و قیمت کا فوراً اندازہ ہو گیا۔ چنانچہ اُنھوں نے اپنی یادداشت میں لکھا: اس کتاب کے مطالعے کے بعد میں اور روزٹی دونوں نے چھ پنس سے زیادہ رقم اس کتاب کی خریداری میں جس کی قیمت صرف ایک پینی تھی خرچ کی۔ دوسرے دن فکر ہوئی کہ اور چند جلدیں خرید کر اپنے دوستوں کو تحفے کے طور پر دیں۔ لیکن اس مرتبہ کتاب فروش نے ایک جلد کی قیمت بجائے ایک پینی کے دو پنس طلب کی۔۔۔ روزٹی نے اپنے خاص انداز میں مذاق کے طور پر کتاب فروش سے کتاب کی اس غیر معمولی زیادتی پر اعتراض کیا۔ لیکن ہم (سوئن برن) نے چند جلدیں خرید ہی لیں۔ اگر غلطی نہیں کرتا تو ایک ہی ہفتے کے بعد۔ بقیہ کتابیں فی جلد ایک گنی کی قیمت پر فروخت ہوئیں۔ اِس کے بعد کتاب کی اس سے عجیب ترقیت کا بھی کچھ پتہ ہے۔ میں نے پہلا نسخہ جو ایک پینی میں خریدا تھا اُس نے بچا رکھا تھا جو اب بھی میرے پاس موجود ہے۔"

فٹز جیرلڈ نے اپنی پہلی ناکامی کی ایک حکیمانہ وجہ قرار دی ہے۔ چنانچہ اُسی زمانے میں ایک خط میں جو کاول کے نام بھیجا تھا لکھتا ہے: "مجھے خود خبر نہیں کہ میں نے ایسے اشعار کو جن کا کوئی بھی طالب نہ ہو کیوں طبع کرایا۔ اور اب بھی کوئی شخص ایسا نہیں ملتا جسے میں کتاب کا ایک نسخہ دوں۔ لیکن جس وقت کوئی شخص کسی کتاب کی تالیف میں انتہائی کوشش کام میں لاتا ہے

اور اس کے ساتھ ہی یقین رکھتا ہے کہ اُس نے اُن بہت سے لوگوں سے جو اس فن میں کام کرتے ہیں اُس کو بہتر انجام دیا ہے تو چاہے وہ تالیف انتہائی کمال کی حد سے دُور بھی ہو، لیکن وہ اس کی طباعت کو ایک امر ناگزیر سمجھتا ہے۔ باوجود اس کے کہ میرا ترجمہ تحت اللفظی نہیں ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ دنیا میں شاید ہی کسی نے ترجمے میں مجھ سے زیادہ زحمت اٹھائی ہو۔"

اگرچہ اس کے بلند مرتبہ اشعار کو اُس کے زمانِ حیات میں وہ عالمگیر شہرت نصیب نہیں ہوئی جو بعد میں ہوئی لیکن پھر بھی یہ ضرور ہوا کہ فٹز جیرلڈ کو اپنی وفات سے پہلے ہی علم ہو چکا تھا کہ کسی حد تک ضرور اس کو شہرت حاصل ہوئی تھی لیکن اصلی شہرت بتدریج حاصل ہوئی۔ پہلی ناکامی کے نو سال بعد رباعیات کی طبع ثانی جو منتشر ہوئی اُس میں چند جدید رباعیات کا اضافہ تھا اور طبع سیوم، چہارم میں جو فٹز جیرلڈ کے حین حیات میں کامل نظر ثانی کے بعد منتشر ہوئیں چند رباعیاں حذف کر دی گئی تھیں لیکن وہ کتاب فروش جو معاصر زمانے میں فٹز جیرلڈ کے اشعار کی اشاعت میں مشغول ہیں بالکل مطمئن ہیں کہ جس کتاب کو وہ شائع کر رہے ہیں بہترین قیمت پر بکے گی۔ رباعیاتِ خیام کے انگریزی ترجمے کے بعد یورپ کی اور زبانوں میں آٹھ اس کے ترجمے شائع ہوئے ہیں۔ ولایت میں عوام کی دلچسپی کے لئے فٹز جیرلڈ کی انگریزی کی ہر رباعی مع اُسی کی مناسبت سے تصویر کے خوبصورت اور خوش رنگ کارڈ پر شائع ہوئی ہے۔ اس کے علاوہ متعدد ایک سے ایک بہتر اس کے ایڈیشن موجود ہیں۔ منجملہ ان کے خود مجھے ایک فوجی اعلیٰ افسر کے پاس ایک ایسا مجموعہ انگریزی رباعیات کا دیکھنے میں آیا جس کے اوراق کسی سفید دھات کے اور انگریزی کے حروف سنہرے تھے۔ کتاب کا حجم ۵ انچ سے کم ہی ہوگا، اور ایک اسپرنگ دار چاندی کی ڈبیا میں محفوظ تھی۔ کتاب کا سائز ۱½ انچ کے قریب تھا۔

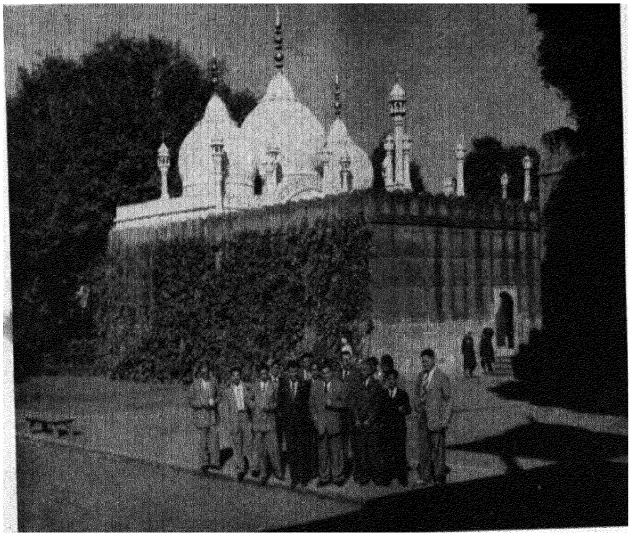
رباعیاتِ خیام کی قدردانی اس سے زیادہ اور کیا ہو سکتی ہے کہ لندن میں عمر خیام کے نام سے ایک کلب قائم ہے جس کے اعضا (ممبران) بڑے بڑے لوگ ہیں۔ یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ کلب مذکور میں ہر سال "یوم خیام" منایا جاتا ہے اور اس موقع پر اظہارِ عقیدت کے طور پر پیش کرنے کے لئے ہوائی جہاز کے ذریعے سے خیام کے مقبرے کے خوشبو گلاب کے پھول منگائے جاتے ہیں۔



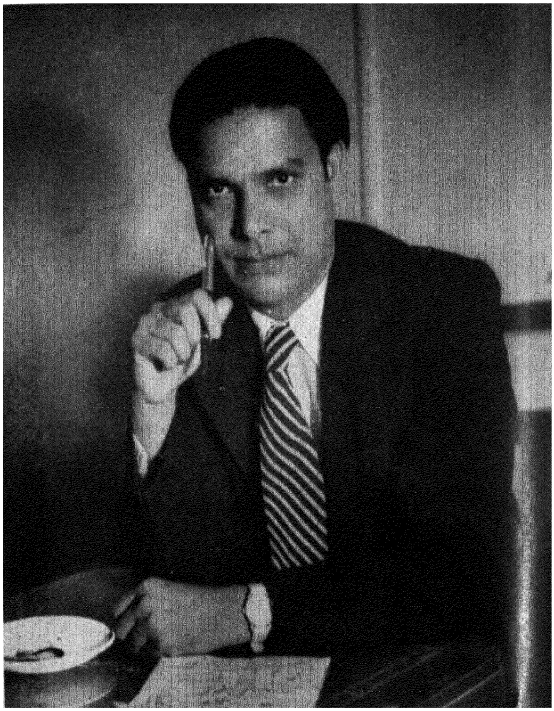
رُوح افزا موسم گرما کا بہتر، تحفہ ہے۔ سخت گرمی میں، جب طبیعت بے ریشان ہو۔ اور طلق سوکھا ہو۔ روح افزا کا ایک گلاس آپ کی تشنگی کو دور کرے گا اور طبیعت میں خنکی، تر و تازگی اور کام کرنے کی خواہش پیدا کریگا

نوٹ۔ کتابچہ مشروب مشرق مفت طلب فرمائیں

ہمدرد دواخانہ (وقف) دہلی



ند مہینے ہوے افغان کلچرل
ڈیلیگیشن ہندوستان آیا تھا۔ اس
ن اراکین نے دھلي کے قابل دید
مقامات کي سیر کي۔
ہوے میں وہ لال قلعے کي سیر کر
رہے ہیں ؛ پس منظر میں موتي
مسجد نظر آ رہی ہے۔

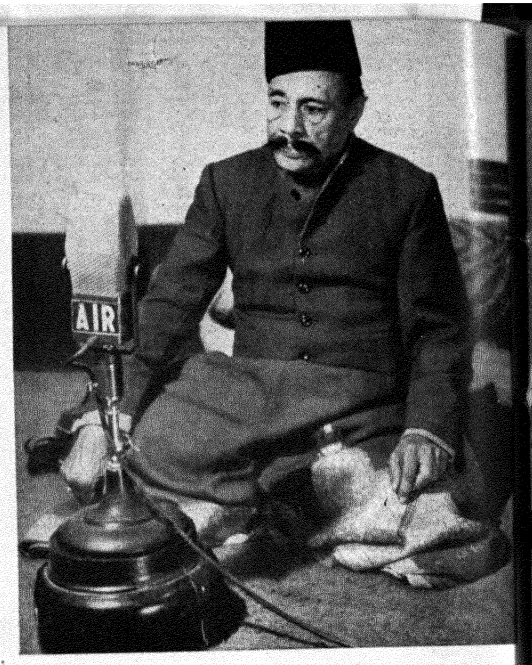


شکیل بدایوني

آپ کي غزل اس شمارے
میں شائع ہو رہي ہے



استاد حیدر حسن



استاد فیاض خاں مرحوم

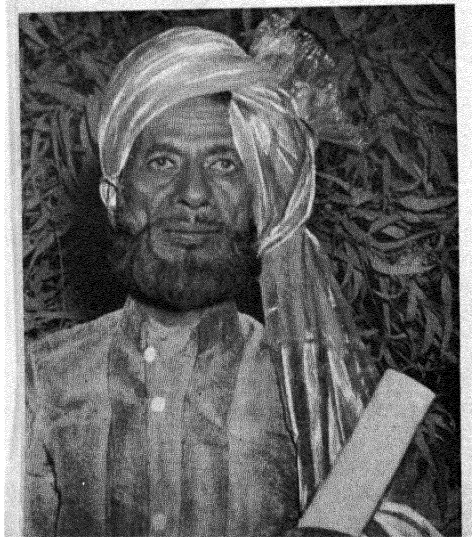


سبٹو لکشمي

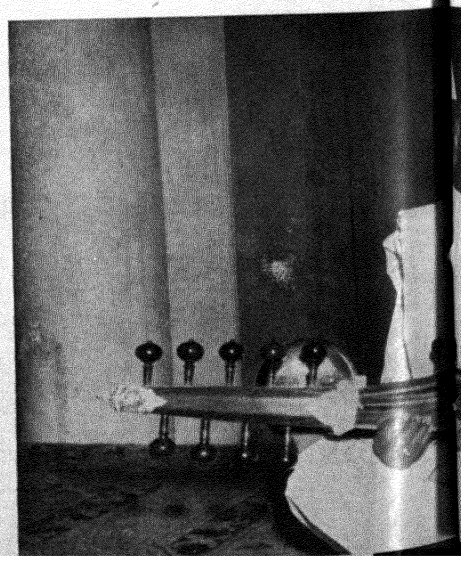


سوریہ کماري

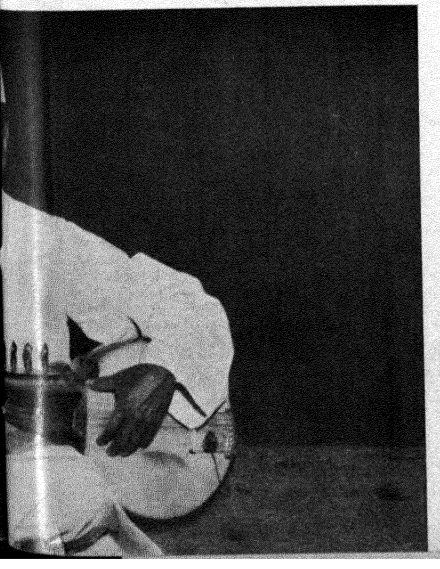
ہندوستانی موسیقی کے مشہور کلاکار



استاد مشتاق حسین



طبلہ

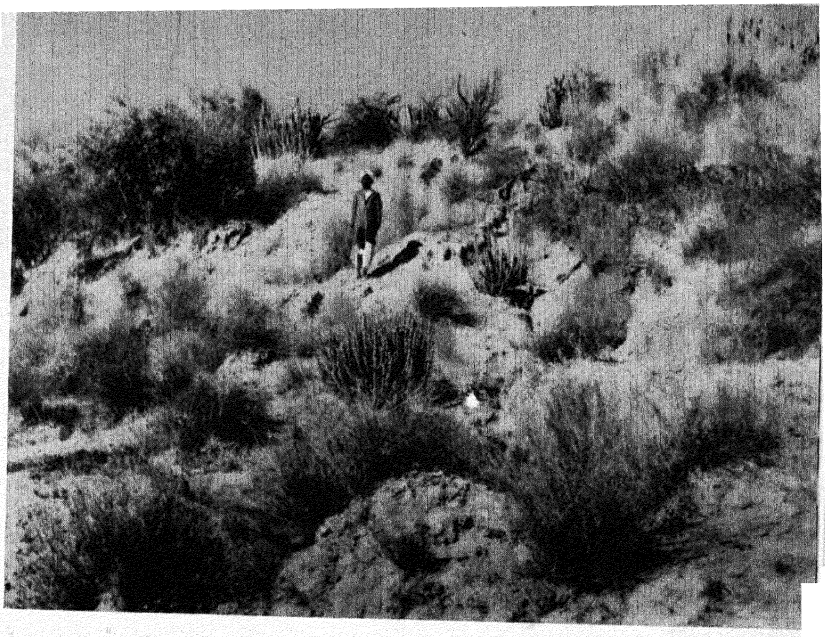


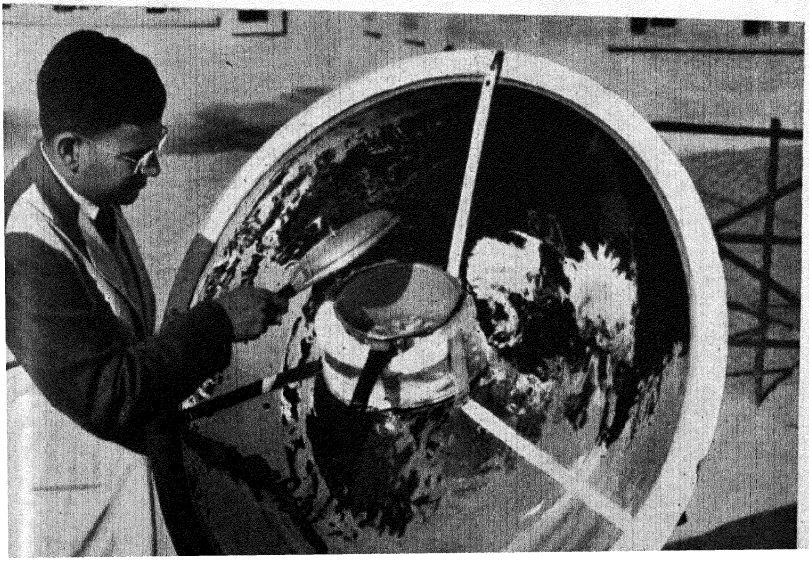


وسنت کماري

ریگستانی جہازیاں

ریگستان آباد علاقے کی طرف بڑھ رہا ہے۔ جھاڑیاں اگر کاٹی جائیں یا مویشیوں کی خوراک نہ بن جائے تو ریگستان کو بڑھنے سے روکتی ہیں۔





دھوپ انگیٹھی

غزلیں

(شکیل بدایونی)

ناصح کو ذوقِ مشغلۂ وعظ و پند ہے
فضلِ خدا سے وہ بھی ترقی پسند ہے

اندر جو جائیے تو وہی جشنِ مے کشی
باہر جو دیکھئے درِ مے خانہ بند ہے

تعمیرِ زندگی ہو کہ تشکیلِ کائنات
ہر حسن، حسنِ یار کا احسان مند ہے

رودادِ شوق سن کے پسیجا نہ اُن کا دل
یہ کہہ کے اُٹھ گئے کہ تخیل بلند ہے

ماحول کی خطا ہے نہ موسم کا ہے قصور
کیسے بہار آئے کہ رستہ ہی بند ہے

اپنے سوا کسی کی بھی دادِ ہنر نہ دی
انساں ہے جس کا نام بڑا خود پسند ہے

دکھلائیے نہ دُور کے پرچم کی رفعتیں
تبلیغ کیجئے کہ محبت بلند ہے

با وصف احترامِ غمِ زندگی شکیل
میں کیا کروں مجھے غمِ جاناں پسند ہے

(ابراحسنی گنوری)

رنگ، اُلفت کہاں جماتی ہے
نبضِ کونین ڈوبی جاتی ہے

روح قالب میں تھرتھراتی ہے
دن گزرتا ہے رات آتی ہے

راہِ اُلفت میں اپنی خودداری
ٹھوکریں ہر قدم پہ کھاتی ہے

خمِ ابروئے دوست کے قرباں
سرکشی سر یہیں جھکاتی ہے

کوئی جس کو سُنے نہ دل کے سوا
یوں بھی آواز اُن کی آتی ہے

عشق سے آتے ہیں اُن کی محفل میں
ناؤ ساحل پہ ڈوبی جاتی ہے

مجھکو مختار جانتا ہے جہاں
کیسی تہمت لگائی جاتی ہے

ناصحوں کو یہ کون سمجھائے
عاشقی آدمی بناتی ہے

ہر کلی مسکرا کے گلشن میں
غمزدوں کی ہنسی اڑاتی ہے

چونک پڑتا ہوں ہر صدا پر یوں
جیسے آواز انھیں کی آتی ہے

عشق میں جرمِ یک تبسم پر
بے کسی مدتوں رُلاتی ہے

فطرتِ عشق آہ فطرتِ عشق
زخم کھا کھا کے مسکراتی ہے

دامنِ تیغ کی ہوا تو بہ
نیند سی مجھکو آئی جاتی ہے

ہر سحر مجھکو عہد میں اُن کے
ابر پیغامِ حشر لاتی ہے

بلونت سنگھ

ایک ہی ناؤ میں

میری آنکھ دیر سے کھُلی، جب کھُلی تو نگاہ اپنے دوست کپور کے اودرکوٹ پر پڑی۔ پہلے تو تعجب ہوا پھر یاد آیا کہ رات جب ہم پان کھانے کے لئے نیچے اُترے تو کپور وہیں سے اپنے گھر کو رخصت ہو گیا تھا۔

اتوار کی صبح تھی یعنی یونیورسٹی میں چھٹی کا دن۔ خواب خرگوش کے مزے لوٹنے کا دن۔ مگر ..... مجھے تو صبح دس بجے کا انگریزی شو دیکھنا تھا غنودگی رفع کرنے کے لئے سگرٹ کی تلاش ہوئی۔ تکیے کے نیچے یا قریب والی تپائی پر کہیں کوئی سگرٹ دکھائی نہیں دیا۔ بجبوراً اُٹھنا پڑا۔ کُرسی کی پشت پر لٹکے ہوئے اوورکوٹ کی جیب میں کسی وزنی شے سے ٹانگ ٹکرائی۔ جیب ٹٹولی تو اندر سے سونے کا سگرٹ کیس نکلا۔ کھولا تو سگرٹ بھی موجود پڑا۔

سگرٹ جلا کر سگرٹ کیس دیکھنا شروع کیا۔ ہمارے یار کپور کی بھی کیا شان ہے۔ سگرٹ کیس بھی اسپیشل آرڈر دے کر بنوایا گیا تھا۔ اور پھر کوٹ ملاحظہ ہو۔ کیسا نفیس کپڑا تھا۔ کس قدر حسین کاٹ اور سلائی۔ چُغہ سے چُغہ بھی پہن کر نکلے تو دیکھنے والوں پر رُعب گھٹ جائے۔ اچھا ہوا جو وہ رات اسے یہیں چھوڑ گیا۔ سردی بھی ہے یار لوگ پہن کر ٹھاٹھ سے سنیما دیکھنے جائیں گے اور واپسی لوٹا دیں گے۔

میں ایک متوسط حیثیت کا طالب علم ہی سہی لیکن رنگ گورا ہے۔ ناک نقشہ اچھا ہے شخصیت بھی معقول ہے کوٹ پہنوں گا تو بس لوگ دیکھتے رہ جائیں گے۔

غنودگی رفع ہوئی تو سردی کی شدّت کے پیشِ نظر غسل کا ارادہ ترک کرتے ہوئے شیو کرنے کی ٹھانی۔ مُنہ ہاتھ دھو کر اُجلی قمیص نکالی اور پھر اوورکوٹ پہن کر بازار میں پنواڑی کے قدِآدم آئینے میں صُورت دیکھی، سچ مچ رُعب ٹپکتا تھا۔

جنوری کا آغاز اور آسمان ابھی بیسیوں دفعہ بادل کی گرج کے ساتھ بجلی چمکی مجھے ڈر لگا کہ کہیں سنیما پہنچنے سے پہلے ہی بارش نہ ہونے لگے۔ لمبے لمبے ڈگ بھرنے شروع کئے۔ لیکن سنیما سے ڈیڑھ فرلانگ ادھر ہی بارش نے آلیا۔ فوراً کناٹ پلیس کے ایک برآمدے میں پناہ لینی پڑی۔ رومال نکال کر کوٹ پر پڑی ہوئی پانی کی بوندوں کو صاف کیا۔

زمین سے آسمان تک دھواں دھار ہو گیا۔ بارش کا تار بندھ گیا۔ طبیعت بدمزہ ہو رہی تھی۔ اتوار کے باعث دکانیں بند تھیں اور برآمدے سنسان۔

چند لمحوں کے بعد دیکھتا ہوں کہ ایک موٹے ستون کی آڑ سے نکل کر ایک خوش پوش انسان میری طرف بڑھا۔ عمر لگ بھگ چھبیس برس چہرہ صفاچٹ۔ ہونٹوں پر مسکراہٹ۔ دوہرا بدن اور ایک نہایت بڑھیا سوٹ زیبِ تن۔

مجھ سے آنکھیں چار ہوتے ہی بولے "فائن ویدر (اچھا موسم ہے)"

"اوس - ویری فائن" میں نے جواب دیا۔

میرے قریب پہنچ کر وہ پتلون کی جیبوں میں ہاتھ ڈال کر کھڑے ہو گئے "خوب پھنسے" یہ کہتے کہتے جھپ سے اُن کے مُنہ کا دہانہ کھلا اور سپید مضبوط دانت نمایاں ہو گئے۔

جواب میں میں نے اپنے منہ کا دہانہ اور بھی زیادہ کشادہ کیا اور دانت بھی زیادہ تعداد میں نمایاں کئے۔

وہ خاصے باتونی واقع ہوئے تھے۔ بلا توقف بولے "کہتے ہیں جب گیدڑ کی موت آتی ہے تو وہ شہر کی طرف بھاگتا ہے۔ یہی مثل مجھ پر صادق آتی ہے۔ موسم اچھا پا کر اور پکچر شروع ہونے میں وقت باقی پا کر موٹر کو لنٹن روڈ پر لے آیا۔ سوچا ٹہلتا ہوا چلا جاؤں۔ ذرا سیر ہی ہو جائے گی۔

اُدھر جہاں آرا کو بھی کسی سہیلی کے پاس فوراً پہنچنا تھا ....."

قطع کلام کر کے اُنھوں نے ایک نظر میری جانب دیکھا اور میرے دل کی کیفیت بھانپ کر بولے ۔

"شہزادی جہاں آرا .... میری اکلوتی بیٹی"۔

یہ کہہ کر وہ بڑی پر تپاک ہنسی ہنسے ... اور تماشہ دیکھئے ادھر میں پھنس گیا ہوں اُدھر مس بلّے ۔ میری سکر بڑی ٹکٹ خرید کر سینما گھر میں کھڑی میرا انتظار کر رہی ہوں گی ... آپ .... کیا آپ بھی ....؟"

"جی .... جی ہاں میں بھی سینما دیکھنے جا رہا تھا"۔

"او کیا تماشہ کیا تماشہ ! ایک ہی بوٹ Boat میں .... ہا ہا"

پھر اجنبی نے مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا "میں اپنا تعارف کروا دوں ۔ میرا نام نواب دوست محمد بارجنگ بہادر ..... آپ !!

اب میری اٹی سٹی گم ہو گئی ۔ میں نے ہا ہا کرتے ہوئے ہاتھ بڑھایا اسی اثنا میں نواب صاحب کی نظر میرے اوورکوٹ پر گڑ گئی — اور بے اختیار بول اُٹھے "بہت عمدہ کپڑا ہے ۔ ڈیری کو سٹلی (Very Costly) کٹ اور سلائی بھی غضب کی ہے ۔ کہاں سے سلایا تھا آپ نے ....."

"او .... ہی ہی ...." مجھے خود معلوم نہیں تھا ۔ جلدی سے کوٹ کی اندر والی پاکٹ پر سلے ہوئے کپڑے کے لیبل کو دیکھ کر جواب دیا "رنگین اینڈ کمپنی کا سلا ہوا ہے"

"ڈیری گڈ"

کچھ اور نہیں سوجھا تو میں نے جیب میں سے سونے کا سگرٹ کیس نکالا جسے دیکھ کر نواب صاحب واقعی مرعوب ہو گئے اور سمجھ گئے کہ میں بھی کوئی معمولی انسان نہیں ہوں ۔ یہ کہے بغیر نہ رہ سکے "آپ کے ذوق کی داد دینا پڑتی ہے .... آپ کی تعریف"؟

میں نے پہلے تو ان کا سوال ہوا میں معلق رہنے دیا ۔ سگرٹ کیس آگے بڑھا کر سگرٹ پیش کیا ۔ اور ذہن پر زور دے کر جواب سوچنے لگا ۔ خرمستی جو سوجھی تو بولا "بندہ کو کنور چندر بھان صورج بنسی کہتے ہیں"

میرا جواب تو خاصہ نامعقول تھا لیکن جب نواب صاحب نے قدرے سر تسلیم خم کرتے ہوئے دہرایا "او کنور چندر بھان صاحب صورج بنسی"

تو میں سمجھ گیا کہ تُکے نے تیر کا کام کیا ہے ۔

اب میں نے حوصلہ کر کے پوچھا "حکومت ہند نے ریاستیں ختم کر دی ہیں آپ ....."

نواب صاحب نے سنجیدگی سے جواب دیا

میری ریاست اپھال کے جنوب میں واقع ہے اور وہ حکومت ہند کی گرفت سے باہر ہے"۔

دل ہی دل میں میں نے اپنے آپ کو شاباش دی کہ اچھا سوال کیا ہے میں نے ۔ لیکن جب نواب صاحب نے جوابی حملہ کیا "اچھا تو آپ کی اسٹیٹ کا کیا حال ہے" تو میرے پاؤں تلے سے زمین سرک گئی ۔ سنبھل کر جواب دیا ۔ میں ایک معقول سی ریاست کے پرنس کا چھوٹا بھائی ہوں"

یہ سن کر نواب صاحب نے مجھے کچھ مشکوک نظروں سے دیکھا تو میرا دل دھک سے ہو کر رہ گیا ۔ لیکن انھوں نے فوراً مسکرا کر میرا ہراس دور کرنے کی کوشش کی ۔ دریافت کیا "سینما شروع ہونے میں کتنی دیر باقی ہے"۔

"ابھی دس منٹ باقی ہیں .... ریٹا ہیورتھ کی پکچر ہے خوب رش لے گی ۔" میں دل ہی دل میں اس خیال سے پریشان ہو رہا تھا کہ ساڑھے دس آنے والے رعایتی ٹکٹ فروخت ہو جائیں گے اور یہ یاد ہی نہیں رہا کہ میں پرنس ہوں ۔

نواب صاحب نے میری ہامی بھری "آپ ٹھیک کہتے ہیں ... کیا حُسن پایا ہے ریٹا نے .... جب جہاں آرا کو لے کر میں سر آغا خاں سے ملنے کے لئے گیا تو اسے دیکھتے ہی اچھل پڑے ۔ میں نے سبب پوچھا تو بولے آپ کی صاحبزادی میری بہو ریٹا ہیورتھ کی چھوٹی بہن دکھائی دیتی ہے ...."

انھوں نے میرے والے سگرٹ کا گہرا کش لگا کر پوچھا یہ کونسا سگرٹ ہے ؟ اور پھر وہ سگرٹ پر لکھے ہوئے نہایت باریک حروف کو پڑھنے کی ناکام کوشش کرنے لگے ۔

میں نے بتایا کہ "یہ کیملز (Camels) سگرٹ ہے ۔ یہ امریکہ کی آر ۔ جے ۔ رینالڈس ٹوبیکو کمپنی (R. J. Reynolds Tobacco Co.) کا تیار کردہ ہے ۔ میرے خیال میں یہ دنیا کا بہترین اور بے ضرر سگرٹ ہے

میں ہمیشہ یہی پیتا ہوں اور دوستوں سے بھی اسی کی سفارش کرتا ہوں"۔

سگرٹ کے بارے میں میری اس قدر اپ ٹو ڈیٹ معلومات کو دیکھ کر نواب صاحب اور مرعوب ہو گئے۔ مجھے دل میں کچھ شرم بھی محسوس ہو رہی تھی کہ خواہ مخواہ ایک بزرگ کو ایسا گھٹیا دھوکا دے رہا ہوں۔

قدرے سکوت کے بعد میں نے بات کا رُخ پلٹتے ہوئے کہا۔ "اگر شہزادی صاحبہ اِدھر سے ہو کر چلی جاتیں تو آپ کو اس قدر زحمت نہ اُٹھانی پڑتی"۔

"جی .... جی ہاں .... وہ .... وہ تو بچاری ادھر ہی سے آ رہی تھی میں نے ہی موٹر کو ادھر موڑ دی۔ ٹہلنے کو من ہو رہا تھا ورنہ وہ بچاری تو میرا بے حد خیال رکھتی ہے .... بھئی کنور صاحب آپ شہزادی سے مل کر بے حد خوش ہوں گے۔ بہت ملنسار اور خوش مزاج لڑکی ہے ... . خیر یہ چھوکری"!

یہ کہہ کر نواب صاحب پھڑک کر ہنسے۔ نازک اندام ہونے کے باوجود وہ شکار خوب کھیل لیتی ہے۔ شکار کو جاتا ہوں تو رائفل لے کر میرے دوش بدوش چلتی ہے۔ ارے بھائی وہ شاعری بھی کرتی ہے حالاں کہ اس کی کل تعلیم و تربیت ولایت میں ہوئی ہے لیکن مادری زبان کو نہیں بھولی۔ بڑا آل راؤنڈ ٹیسٹ پایا ہے اس نے ..... گھڑی دکھایئے .... (جھنجلا کر) مس ملر بھی پریشان ہو رہی ہوگی۔ میری سکرٹری بھی بڑی چارمنگ لڑکی ہے۔ اس کے منگیتر نے اس سے کہا کہ نواب صاحب کی نوکری چھوڑ دو ورنہ میں تم سے شادی نہیں کروں گا۔ لیکن اس وفا کی پتلی نے انکار کر دیا .... واقعی کیسا بلند کریکٹر ہے اس کا ....."

میں سمجھ گیا کہ نواب صاحب بھی ایک گھاگ ہیں۔ دنیا کا نشیب و فراز خوب دیکھے ہوئے ہیں۔ سوچنے لگا کہ اپنے بارے میں کیا باتیں بتاؤں۔ نہ میرے پاس کار، نہ شہزادی جہاں آرا اور نہ سکرٹری۔

انھوں نے خود ہی دریافت کیا "آپ یہاں تفریح کی غرض سے آئے ہیں۔

جی اصل بات یہ ہے" میں نے بے پروائی سے نخلستان میں سے دھواں اڑاتے ہوئے جواب دیا "ہم دہرہ دون بڑے شکار کے لئے جا رہے تھے۔ مجھے سنٹرل گورنمنٹ میں کچھ کام تھا۔ اس لئے میں آج ہی تین چار دن کے لئے رُک گیا میرے ساتھی آگے بڑھ گئے ہیں۔

"آئی سی I See تب تو جہاں آرا سے آپ کی ملاقات ضرور ہو جائے گی۔ عین ممکن ہے وہ بھی شکار کے لئے طیار ہو جائے۔ بات یہ ہے کہ وہ شکار کی بے حد شوقین ہے ...."

یہ بات میری اور زیادہ پریشانی کا باعث بنی۔ لیکن میں موڈ میں آیا ہوا تھا۔ بڑی بے تکلفی سے بولا" اور نواب صاحب یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ شہزادی صاحبہ سے مل کر میں ہی شکار پر جانے کا پروگرام منسوخ کر دوں۔

اس پر نواب خوب ہنسے۔ انھوں نے ایک آنکھ پٹ سے بند کر کے میری جانب پُر معنی نظروں سے دیکھا اور بولے "یو ناٹی بوائے" بارش خاصی دھیمی پڑ گئی۔ میں نے نواب صاحب کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔ آیئے چھوٹی سی دوڑ لگائیں۔ اب تو خبروں کی ریل دکھائی جا رہی ہوگی "او کے بائے"

سینما کی ڈیوڑھی میں پہنچ کر نواب صاحب نے اِدھر اُدھر دیکھا "ایں .... مس ملر کہاں ہیں"؟

پھر انھوں نے گیٹ کیپروں سے مس ملر کے بارے میں دریافت کیا لیکن کچھ پتہ نہ چلا۔ اب ان کی برہمی بڑھنے لگی۔ جیبوں کو چھونے کے انداز سے ظاہر ہوتا تھا کہ ان کے پاس اس وقت روپیہ بھی نہیں ہے میں نے یہ موقعہ غنیمت سمجھا۔ میری جیب میں اتفاق سے دس کا نوٹ بھی تھا نواب صاحب کی خاطر ساڑھے دس آنے کے بجائے اونچے درجے کا ٹکٹ خریدنا پڑا۔

میرے ہاتھ میں دو ٹکٹ دیکھ کر نواب صاحب بدکے" اوہ .... ویٹ؟ دو ٹکٹ؟ آپ نے میرا ٹکٹ بھی خرید لیا .... نہیں .... ایسا نہیں کرنا چاہئے آپ کو"۔

میں نے انھیں شرمندگی سے بچانے کے لئے ان کی پیٹھ پر ہلکی سی تھپکی دیتے ہوئے کہا" کوئی مضائقہ نہیں نواب صاحب! آپ کے ہمارے روپے الگ تو نہیں ہیں"۔

وہ بادلِ نخواستہ چلدیئے میرے ساتھ

"میں نے سمجھا یا نواب صاحب ہو سکتا ہے مس ملر کو بھی بارش کی وجہ سے کہیں رُکنا پڑا ہو اُنھیں غلط فہمی ہوئی ہو۔ سمجھی ہوں آپ ساڑھے بارہ کے شو میں جائیں گے۔ اتوار کے دن ہی تو ساڑھے دس بجے صبح کو شو ہوتا ہے اور تو کسی روز ہوتا نہیں .... باقی رہی شہزادی صاحبہ تو وہ بچے ٹھہریں .... حالاں کہ شہزادی کے ذکر کا محل نہیں تھا پر میں نے موقعہ پیدا کر کے پوچھ لیا" بھلا کیا عمر ہوگی ان کی"؟

نواب صاحب کی خوش مزاجی عود کر آئی بڑی میٹھی آواز میں بولے "اوو .... سولہ برس .... نہیں سولہ برس کی بھی نہیں ہوئی ابھی ساڑھے تین مہینے باقی ہیں .... اوشی از اے سویٹ Sweet چائیلڈ!"

سنیما کے ہال میں پہلی بار صوفے پر بیٹھنے کا اتفاق ہوا۔ اتنے روپوں کا خون ہو جانے کی وجہ سے کوفت تو ہو رہی تھی لیکن نواب صاحب کی صحبت کی خاطر سب کچھ برداشت کرنا پڑا۔

پردۂ سیمیں پر جب ریٹا ہیورتھ رقص کرتی دھوم مچاتی آئی تو نواب صاحب آپے سے باہر ہو گئے۔ بے چینی سے لگے ہاتھوں کو مروڑنے اور انگلیاں چٹخانے۔

"اس کی ٹانگیں ملاحظہ ہوں۔ کس قدر سڈول اور گدرائی ہوئی بھرپور۔ واللہ! کیا بات ہے کیا بات ہے"۔

میں نے جواب دیا" نواب صاحب یہ کیا ہے پیرس کے اسٹیج پر جو رقص ہوتے ہیں ان کے مقابلے میں یہ سب ہیچ ہیں"

"سچ"؟ نواب صاحب نے مُنہ کھول کر میری جانب دیکھا۔

"آپ تو پیرس گئے ہوں گے" میں نے یاد دلایا۔

"گیا کیوں نہیں .... لیکن ہے ہے کنور صاحب! غور فرمایئے نوجوان بیٹی میرے ساتھ ہو اور ہر جگہ میرے ہمراہ جانے پر بضد ہو تو میں بھلا ایسی جگہوں پر کیسے جا سکتا ہوں۔ خود ہی غور فرمایئے۔ یہ کہہ کر نواب صاحب نے بچوں کے سے بھولے پن سے میری جانب دیکھا" آج تو .... سچ پوچھیئے میں خود شہزادی کو غچہ دے کر آیا ہوں"۔

"درست ہے درست ہے" میں نے پیرس کے بارے میں سُنی سُنائی باتوں کو یاد کرنے کے لیئے ذہن پر زور ڈالتے ہوئے کہا۔

"اچھا تو کنور صاحب! ذرا تفصیل سے بتایئے کہ وہاں کیا ہوتا ہے"

"ارے صاحب وہاں زنا صاحبہ کچھ اس انداز سے پیش کی جاتی ہیں کہ ضعیف سے ضعیف آدمی بھی پھڑک اُٹھے۔

"سچ"؟

"جی"

اب تو نواب صاحب کے چہرے پر ہوائیاں اُڑنے لگیں۔ بجائے سنیما کے پردے کی طرف دیکھنے کے میری جانب دیکھنے لگے۔

"آپ کا مطلب .... یعنی کہ .... بالکل ...."؟

"قریب قریب .... بالکل"

"اُف اُف .... بہت مزا آتا ہوگا"

"بس کچھ نہ پوچھیئے وہ فضا' وہ حسن وہ ..."

"اور وہ جوانی ـــ" کا اضافہ کر کے نواب صاحب میرے ہاتھ پر ہاتھ مار کر اور ایک آنکھ بند کر کے ہنسے۔

اب تو وہ خوب کھُل کھیلے۔ اُنھوں نے آپ بیتیاں سُنائیں کچھ میں نے گھڑ گھڑا کر اُنھیں خوش کیا۔ یہاں تک کہ جب پکچر ختم ہوئی تو ہم دونوں کے تعلقات خاصے گہرے ہو گئے تھے۔

گیلری سے اترتے وقت اُنھوں نے کہا" کنور صاحب میری کار آئی ہوگی۔ میں آپ کو رہائش گاہ تک چھوڑ آؤں گا۔

میں دعائیں مانگنے لگا کہ بھگوان کرے ان کی کار نہ آئی ہو میری پرارتھنا قبول ہوئی۔ نواب صاحب نے سراسیمہ ہو کر کہا" کنور صاحب آج تو غضب ہو رہا ہے۔ چندے انتظار کرتے ہیں..."

میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ میرے دولتکدے تک جائیں اور خواہ مخواہ میرا پول کھُل جائے۔ اس لیئے میں نے جلدی سے کہا۔

"کوئی ہرج نہیں نواب صاحب میں آگے سے ٹیکسی لے لوں گا"۔

"آپ ٹھہرے کہاں ہیں"؟

"پٹودی ہاؤس میں"

"اچھا تو کب ملیئے گا پھر"؟

"جب آپ کہیئے"۔ میں نے جواب دیا۔

"آج اتوار ہے .... پیر' منگل ... بُدھ ہاں بُدھ کی شام خالی

ہوگی میری - چائے اکھٹا پئیں گے"

"بہتر۔ کس جگہ"

"بھئی کنور صاحب میں ایک دوست کے وہاں مقیم ہوں ....."

"بہتر ..... میں خود ایک دوست کے وہاں رُکا ہوا ہوں - سچ وہاں ایسی بے تکلفی سے بات چیت نہیں ہو سکے گی - اچھا تو ہیکمنز کے وہاں ملیں گے - ہوٹل میں ہی ٹھیک رہے گا"

"بُوت اچھا" نواب صاحب نے ہاتھ ہلا کر جواب دیا - چلتے چلتے میں نے تاکید کی "اور شہزادی جہاں آرا کو بھی ساتھ لائیے گا"

"ضرور ..... ضرور"

وہاں سے بھاگا تو سیدھے اپنے کمرے میں پہنچ کر دم لیا -

رات بھر شہزادی جہاں آرا کے تبسم ہونٹوں، عطر بیز زلفوں اور بے عیب نوخیز جوانی کے مناظر پیش نظر رہے -

اب نئے کپڑوں کی ضرورت محسوس ہوئی سوچا کم از کم ایک سوٹ تو سردست ایسا طیار ہونا چاہئے کہ شہزادی بھی دیکھے تو پھڑک اُٹھے ایک بار اس فیصلے کے بعد روپے کی فراہمی کا سوال پیدا ہوا - چناں چہ کچھ اُدھار کچھ کتابیں بیچ باچ کر سُوٹ کا بڑھیا کپڑا خریدا اپنے دیرینہ درزی کے پاس پہنچا اور کہا کہ ایک سُوٹ سِلانا ہے مگر ارجنٹ -

"رے صاحب کہیں چار مہینے بعد صورت دکھائی اور وہ بھی ارجنٹ کام لائے ....."

اتنے میں میری نظر سامنے کی کھونٹی پر پڑی وہاں وہی نواب صاحب والا سُوٹ لٹکا ہوا تھا - حیرت ہوئی کہ نواب صاحب بھی یہاں سے کپڑے سلاتے ہیں - میں پوچھے بغیر نہ رہ سکا - اس پر دکان دار نے جواب دیا "جناب آج کل بہت بڑے بڑے لوگ ہم سے سلوانے لگے ہیں - بات یہ ہے کہ آج کل ہمارے یہاں ایک بہت اچھا کٹر آیا ہوا ہے - ایسا کاریگر کہ بس طبیعت صاف ہو جائے گی"

میں خوش ہوا - کپڑا تو بڑھیا تھا ہی - اب کٹنگ اور سلائی کی کسر بھی پوری ہو جائے گی -

دکان دار نے پُکار کر کہا "جُلّے خاں بھئی ذرا ادھر آ کے ناپ لے لو بابو جی کا"

میں نے کہا "بھئی یہ تو اچھا ہوا - بات یہ ہے کہ کل اتفاق سے ایک نواب صاحب سے ملاقات ہو گئی - تھے وہ گھن چکر - مجھ کو راجہ مہاراجہ سمجھ بیٹھے - میں نے انھیں اُن کی بیٹی شہزادی جہاں آرا سمیت پرسوں چائے پر بلایا ہے بس اسی چکر میں ساری پونجی لگا کر یہ سُوٹ سِلوا رہا ہوں ....."

دکاندار کو میری ان باتوں سے زیادہ دلچسپی نہیں تھی میری بات ختم ہوتے ہی بولا "جُلّے خاں آپ کے پیچھے کھڑا ہے ..... میں نے مُڑ کر دیکھا تو جُلّے خاں ..... ارے نواب صاحب ؟ ..... نواب صاحب نیلا کچیلا پاجامہ پہنے اور گلے میں غلیظ فیتہ لٹکائے چُپ چاپ کھڑے تھے - ادھر مارے حیرت کے میرے مُنہ سے آواز تک نہ نکل سکی -

مالک نے کہا "ڈریسنگ روم میں چلے جائیے اطمینان سے ناپ دیجئے"

آگے آگے جُلّے خاں اور پیچھے پیچھے میں ..... دونوں دم بخود -

ڈریسنگ روم کی تنہائی میں پہنچتے ہی جُلّے خاں نے اطمینان سے سر گھما کر مجھے فرشی سلام کیا اور انتہائی سنجیدگی سے ایک آنکھ بند کر کے میری جانب لمحہ بھر دیکھنے کے بعد فرمایا -

"حضور کنور چندر بھان صاحب چندر بنسی"!

میں نے اور بھی زیادہ ادب کے ساتھ سر تسلیم خم کر کے آداب بجا لاتے ہوئے جواب دیا -

"(علیحضرت نواب دوست محمد یار جنگ بہادر"!!

سیدہ جعفر

"سحر البیان" اور مثنوی بوستان خیال"

ایک تقابلی مطالعہ

موجودہ زمانے میں زندگی کی گہما گہمی اور ہماری مصروفیات اس کی اجازت نہیں دیتیں کہ کوئی شاعر بیٹھا مسلسل سینکڑوں اور ہزاروں اشعار کی مثنوی لکھتا جائے اسی لئے آج کل اس کا رواج تقریباً ختم ہوتا جا رہا ہے۔

فرصتِ کار و بارِ شوق کسے
ذوقِ نظارۂ جمال کہاں

گزشتہ چند برس سے اردو مثنویوں کے سرمایے میں کوئی قابلِ لحاظ اضافہ نہیں ہوا البتہ بعض کارنامے جو ابھی تک پردۂ خفا میں تھے بڑی تلاش اور تحقیق کے بعد منظرِ عام پر لائے گئے ہیں ان مثنویوں میں سراج اورنگ آبادی کی تصنیف "بوستانِ خیال" اپنے انفرادی خدوخال اور چند نمایاں خصوصیات کی وجہ سے ایک خاص مقام رکھتی ہے۔ اس مثنوی سے ہم حال تک ناواقف تھے سب سے پہلے مولانا احسن مارہروی نے اسے عوام سے روشناس کرایا پھر پروفیسر عبدالقادر سروری نے اس کا ایک انتخاب "سراج سخن" میں شائع کیا اور بعد کو کلیاتِ سراج" میں انھوں نے اپنے عالمانہ مقالے کے ساتھ چھپوایا۔

سراج اورنگ آبادی کی شاعری کا زمانہ دکن کی معاشرت کا وہ دور تھا جب لوگ مذہب اور تصوف کی طرف بہت زیادہ مائل تھے عملی اور مادی زندگی کے اصولوں پر مابعد الطبیعائی اور تصوری نظریوں کو ترجیح دی جاتی تھی۔ ادب کی جڑیں چونکہ معاشری زندگی میں بہت دور تک پھیلی ہوئی ہوتی ہیں۔ اس لئے ہر کارنامہ اپنے زمانے کے تمدنی رجحانات کا عکس ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ سراج اور ان کے زمانے کی کم و بیش تمام ادبی تخلیقات مذہبی رنگ میں ڈوبی ہوئی ملی ہیں۔ اس کے خلاف "سحر البیان" کی تصنیف کا زمانہ ایرانہ تکلفات اور درباری شان و شوکت سے مرعوبیت کا تھا جو میر حسن کی ذہنی فضا پر پوری طرح چھایا ہوا نظر آتا ہے۔ وہی مسرت کی ترنگ یا وہی رقص و سرور کی محفلیں وہی شادی بیاہ کی دھوم دھام وہی کنیزوں اور غلاموں کی چہل پہل غرض تمام باتیں وہی ہیں جو شاہانہ تمدن کا لازمی جزو سمجھی جاتی ہیں۔ اس زمانے میں بادشاہوں اور رئیسوں کے سوا کون ایسا تھا جس کا ذکر ادب کا موضوع بن سکتا۔ دربار اور اس کے گرد و پیش کے ماحول سے قصہ لیا جاتا اسی میں کردار اور واقعات پیدا کئے جاتے اور اسی فضا میں کہانی ختم ہو جاتی۔ "سحر البیان" کا خاکہ بالکل اسی نوعیت کا ہے اس مثنوی کا قصہ ممکن ہے ٹھیک اسی شکل میں کہیں اور موجود نہ ہو لیکن اس کے اجزا میں کوئی اچنبھا نظر نہیں آتی ہماری زبان اور بہت سی کہانیوں کی طرح اس میں بھی ایک بادشاہ ہے یہ "شہنشاہ گیتی پناہ" ہے اور حشمت و مال و منال" کے علاوہ ایک "کثیر فوج" کا مالک بھی ہے جو "خطا و ختن" اور نہ جانے کتنے ممالک سے خراج لیتا آیا ہے وہی جاگیردارانہ معاشرے کا ادبی اور شعری تخیل ہے اور اس کی تکمیل بھی اسی طرح سے کی گئی ہے۔ وہی بادشاہ جو اردو کی اکثر داستانوں اور بے شمار قصوں میں لامتناہی زمانے سے لاولدی کے غم میں مبتلا ہوتا آیا ہے "سحر البیان" میں بھی موجود ہے وہی کل کا گھوڑا یہاں بھی ہے جو الف لیلے کی کہانیوں میں اپنے کمالات کا کافی مظاہرہ کر چکا ہے اور وہی فوق الفطرت واقعات ہماری حیرت کو اکسانے کے لئے کام میں لائے گئے ہیں جو اردو کی تمام داستانوں کا لازمی جزو ہیں۔ اس طرح "سحر البیان" کی کہانی میں بظاہر کوئی ندرت نہیں لیکن ان فرسودہ عناصر کو میر حسن نے جس ترتیب اور سلیقے کے ساتھ قصے کے چوکھٹے میں جمایا ہے ہمیں اس کی داد دینی پڑتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ مثنوی اپنی معیار پرستی، مثالیت اور مافوق الفطرت اجزا کے باوجود آج بھی ایک پسندیدہ تخلیق سمجھی جاتی ہے

اس کے خلاف "بوستان خیال" کا قصہ اردو کی بہت سی مثنویوں سے بالکل مختلف ہے یہ نہ تو کسی شہزادے، اور شہزادی کے روائتی عشق کا قصہ ہے اور نہ پریوں کی کوئی بناوٹی کہانی بلکہ جناب احسن مارہروی کے الفاظ میں "دل ریش درویش کی داستان ہے" اور یہ درویش اکثر تخمینی علامات میں خود سراج ہی نظر آتے ہیں جنھیں ایک لاابجی کے لڑکے سے محبت ہو گئی تھی بالکل اسی طرح جیسے وائلڈ کو ابوالمعانی سے یا بیسل ہالورڈ (Basil Hall Ward) کو ڈوریان گرے (Dorian Gray) سے۔ یہاں اس بحث میں الجھنا ہمارا مقصد نہیں کہ یہ اخلاقی نقطۂ نظر سے کہاں تک درست ہے لیکن ہم یہ جانتے ہیں کہ ادب میں یہ کوئی انوکھی بات نہیں اور ہمارے اکثر صوفی اس قسم کی محبت کو عشق حقیقی کا زینہ تصور کرتے آئے ہیں۔

جس طرح "بوستان خیال" اور "سحر البیان" کے خاکے مختلف ہیں اسی طرح ان قصوں کو بیان کرنے کا انداز بھی بالکل انفرادی ہے۔ سراج کے پاس سادگی اور دردمندی ہے جو انھیں اپنے ماحول کے سماجی رجحانات سے ملی ہے ان کی ابتدائی زندگی سحر انوردی میں گزری اور لعل کو خانقاہوں میں۔ اس لئے سراج کی طبیعت میں تصنع کا وہ جزو شامل نہ ہو سکا جو رئیسوں اور بادشاہوں کے قرب کا نتیجہ ہوتا ہے۔ اسی طرح میر حسن کی مثنوی میں جو تکلف اور اہتمام پایا جاتا ہے وہ ان کے ماحول کا لحاظ کرتے ہوئے بالکل فطری چیز ہے۔

ہماری زبان کی کم و بیش تمام مثنویوں کے قصے تاریخی ترتیب میں پیش کئے گئے ہیں۔ لیکن سراج نے اس روایتی پیرایہ بیان سے ہٹ کر اپنے لئے ایک نئی راہ نکالی ہے۔ لیکن واقعات کو اس ترتیب سے بیان نہیں کیا ہے جس طرح کہ وہ رونما ہوتے ہیں۔ "بوستان خیال" میں سراج ایکدم اصل قصے کی طرف رجوع نہیں ہوتے بلکہ بہت ہی ڈرامائی انداز سے اپنی آپ بیتی شروع کرتے ہیں۔ لاابجی کے لڑکے کا ابتداء میں کہیں ذکر نہیں کیا ہے (جس سے انہیں محبت ہو گئی تھی) یہاں تک کہ "سردار زادہ صاحب جمال" ایک دن انھیں سیر کے لئے باغ میں لے جاتا ہے اور وہ سرو کو دیکھ کر بے خود ہو جاتے ہیں۔ اس واقعے کے بعد جب سردار زادہ ان کی وارفتگی کا سبب دریافت کرتا ہے تو اصل قصے کی ابتداء ہوتی ہے۔ واقعات بیان کرنے کا یہ طریقہ ہمارے لئے بالکل نیا ہے اور ساتھ ہی ساتھ بہت مؤثر بھی ہے جو اردو کی شاید ہی کسی مثنوی میں موجود ہو۔

روزمرہ زندگی میں یہ بات عام طور پر محسوس کی جاتی ہے کہ انسان کے دل و دماغ کی جو حالت ہوتی ہے اسی میں وہ ساری کائنات کو ڈوبا ہوا پاتا ہے خوشی کے وقت جو پھول شگفتہ اور خوبصورت معلوم ہوتا ہے وہی غم کی کیفیت میں دیکھتا ہوا انگارہ نظر آنے لگتا ہے انسانی احساس کے اس دھوکے کو "مغالطۂ حسی" کہتے ہیں۔ "بوستان خیال" میں جب سراج لاابجی کے لڑکے سے جدا ہو جاتے ہیں تو اس موقع پر انھوں نے اپنے دلی تاثرات کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے۔

کبھی رفع کرنے کو دل کا غبار
اگر عزم ہو سیرِ باغ و بہار
تو گلشن نظر بیچ ہے خار بن
خراشِ جگر ہے رگِ یاسمن
کروں جب خیابانِ گل پر نظر
مجھے یاد آتا ہے چاک جگر
لگی اس طرح غم کی برچھی کی ہول
کہ آنکھوں میں کانٹا ہو ڈوبا ہے پھول
کیا اس قدر بے کلی نے دفور
کہ ہے خندۂ گل قیامت کا صور
ہر اک سرو ہے سانک کی جون انی
چنبیلی کی پنکھڑی ہے ہیرا کنی
غزل خوانیٔ عندلیبان باغ
میرے حق میں ہے داغ بالائے داغ

"سحر البیان" میں جب شہزادہ بینظیر یکایک غائب ہو جاتا ہے تو محل میں کہرام مچ جاتا ہے شاہی باغوں اور محلات پر اداسی چھا جاتی ہے میر حسن نے اس حالت کا نقشہ یوں کھینچا ہے۔

گیا جب کہ وہ سرو اس باغ سے
نظر پھول آنے لگے داغ سے
اکڑنا گئے سرو سب اپنا بھول

اڑانے لگیں قمریاں سر پہ دھول
تبسم کیا حزن سے غنچہ پھول
ہوا غم سے از بس لہو پی کے پھول
اڑا نورِ نرگس کی آنکھوں کا سب
ہوئے بال سنبل کے ماتم کی شب

انسانی ذہن کی ایسی ہی نفسیاتی کیفیت کے متعلق اردو کے ایک شاعر نے کہا تھا ۔ ؎

دل گلستان تھا تو ہر شے سے ٹپکتی تھی بہار
دل بیاباں کیا ہوا عالم بیاباں ہو گیا

"سحر البیان" کی اہمیت کا بڑا سبب میر حسن کی محاکات ہے جو بعد کو ان کے خاندان کی ایک خصوصیت بن گئی ۔ محاکات کی چار قسمیں قرار دی گئی ہیں (۱) وقت سے متعلق جیسے صبح، شام، دوپہر، رات کے مناظر، (۲) زمانے سے متعلق مثلاً مختلف موسموں کے بیانات ۔ (۳) حسینوں کے سراپا یا تذکرہ اور (۴) وہ جس کا تعلق عمرانی زندگی سے ہو جیسے رسم و رواج مختلف محفلیں اور تقریبیں وغیرہ ۔ "مثنوی سحر البیان" کی منظر کشی کے متعلق بہت کچھ کہا جا چکا ہے اور حقیقت بھی یہی ہے کہ میر حسن کی شاعری لفظی تصویری ہوتی ہے ۔ عیش باغ کا ٹین کی جیسی جیتی جاگتی تصویر کھینچی ہے، اس کی مثال اردو ادب میں شاید ہی کہیں ملے چند اشعار ملاحظہ ہوں ۔

وہ پشواز اگری وہ نرگس کا ہار
وہ کمخواب کی بند ہائے ازار
بندھا سر پہ جوڑا پڑی زرد شال
کمر کی لچک اور مٹک کی وہ چال
وہ اٹھی ہوئی چین پشواز کی
وہ مسکی ہوئی چولی انداز کی

"بوستانِ خیال" کے "خوبانِ منتخب" کو ایک نظر دیکھا جائے تو حیرت ہوتی ہے کہ سراج اور میر حسن محاکات میں ایک دوسرے سے اتنے قریب کیسے ہیں ۔ منظر کشی میں سراج تشبیہات اور استعاروں سے وہی کام لیتے ہیں جو ایک مصور مختلف رنگوں سے لیتا ہے وہ ان کے مجموعی آہنگ کے ذریعے واقعات کی ایسی تصویر کھینچ دیتے ہیں جو اصل سے زیادہ دلکش ہوتی ہے ۔ اپنے بیانات میں وہ کہیں مبالغے کو راہ نہیں دیتے اور نہ خلافِ فطرت اپنے تخیل پر تشدد کرتے ہیں تاہم ان کے عکس صاف واضح اور حسین ہوتے ہیں ۔ "خوبانِ منتخب" کی ایک جھلک ملاحظہ ہو ۔

کبھی بر میں نیمہ ہے بابیک تنگ
کبھی ملگجا اور کبھی سبز رنگ
کبھی لٹھ پٹی سر پہ دستار ہے
کبھی خنجری پاؤں شلوار ہے
کبھی شال سر پر نزاکت کی ہے
پچھوڑی کبھی تار پیری کی ہے
کبھی تو سجیں سر پہ دستار سُرخ
کہ حسرت سے مرجائے گلنار سُرخ
زری کا کبھی چیدۂ نو کدار
ہیں بازو میں گجرے گلے بیچ ہار
جو پٹکا نہیں تو نہیں کچھ خلل
کمر میں دوپٹہ سمو سے کا بل

سراج کی جزرس نگاہ نے کسی متعلقہ بات کو چھوڑا نہیں یہی خصوصیت ان کو میر حسن کے قریب لے جاتی ہے ۔ ایک اور موقعے پر سراج اور میر حسن کے بیانات میں قریبی مشابہت نظر آتی ہے ۔ "سحر البیان" میں شہزادہ بے نظیر کو جس باغ میں رکھا جاتا ہے اس کے متعلق کہتے ہیں ۔

چنبیلی کہیں اور کہیں موگرا
کہیں لٹے بیل اور کہیں موتیا
کہیں ارغواں اور کہیں لالہ زار جُدی اپنے موسم میں سب کی بہار
کہیں جعفری اور گیندا کہیں
سماں شب کو دادو دہش کا کہیں
کہیں زرد نسریں کہیں نسترن
عجب رنگ پر ارغوانی چمن

"بوستانِ خیال" میں سردار زادہ سراج کو جس باغ میں سیر کے لئے

لے جاتا ہے، اس کی تصویر اس طرح کھینچی ہے ۔

سمن ارغواں نرگس عنبری
گل و لالہ و سیوتی جعفری
ہر اک سرو پر عشق پیچے کی بیل
خوشی کے گلے کی تھی گویا حمیل
جھکی ڈالیاں بید مجنوں کی تھیں
خم زلف لیلےٰ کے افسوں کی تھیں
طرب بخش کھانا چگنا مور کا
تماشا تھا ہر مور کے شور کا
ہر اک حوض پانی سے لبریز تھا
ہر اک خطۂ باغ گل خیز تھا

یہ دونوں مرقعے ایک دوسرے سے بڑی حد تک ملے جلے نظر آتے ہیں ۔ پھولوں کے اکثر نام بھی دونوں جگہ مشترک ہیں جیسے یاسمن ارغوان، جعفری اور لالہ محاکات کا تمام تر تعلق الفاظ، زبان اور اسالیب کے سانچوں پر ہوتا ہے ۔ میر حسن کے زمانے تک اردو ادب میں اتنے مختلف المعنی اور متنوع الفاظ داخل ہو چکے تھے جن کے ذریعے ہر قسم کے محاکات کو بآسانی پیش کیا جا سکتا تھا لیکن تعجب تو اس پر ہوتا ہے کہ سرآج نے کس طرح اپنے زمانے کے محدود لفظی ذخیرے سے غیر معمولی صناعی دکھائی ہے ۔

ہر اک بات پر دل کو میں خوں کیا
کب اس طرح رنگین یہ مضموں کیا
زلیں عمر کی اس کہانی میں صرف
تو نکلے ہیں ایسے یہ موتی سے حرف
جوانی میں جب ہو گیا ہوں میں پیر
کب ایسے ہوئے ہیں سخن بے نظیر

اس کے برخلاف سرآج کی مثنوی جیسا کہ خود انہوں نے کہا ہے "دو دن کی تصنیف ہے" جس کا مقصد نہ "سخن کا دریا بہانا" ہے اور نہ اپنے "نئی طرز" اور "نئی زبان" کی "داد" لینا ہے ۔ "بوستان خیال" ایک صاحب حال صوفی کے تاثرات کا نتیجہ ہے اور جذب و کیف کے عالم میں لکھی گئی ہے ۔ مثنوی کے اختتام پر وہ لکھتے ہیں ۔

یہ دو دن کی تصنیف ہے حسب حال
زباں پر نکل آیا دل کا ابال
نظر میں نہ لاؤ تم اس کا قصور
کہ ہے درد مندی سے یہ بات دور

اگر سرآج نے "بوستان خیال" کی تصنیف پر اپنی پوری توجہ صرف کی ہوتی تو معلوم نہیں اس مثنوی کا مقام اردو ادب میں کہاں ہوتا ۔

معلومات اور اعداد و شمار

۱ ۔ ہندوستانی صنعت کاروں نے ۱۹۵۳ء میں مال گاڑیوں کے ۶۵۶۴ ڈبے مسافر گاڑیوں کے ۷۸۵ ڈبے اور ۷۳ ریلوے انجن طیار کئے ۔ ۱۹۵۴ء میں مال گاڑیوں کے ۸۸۰۰ ڈبے مسافر گاڑیوں کے ۱۰۵۰ ڈبے اور ۱۱۶ ریلوے انجن طیار کئے جانے کی توقع ہے ۔

۲ ۔ رواں مالی سال کے پہلے نو مہینوں میں ہندوستان سے ۷۰۸۰ بندر برآمد کئے گئے ۔

۳ ۔ ہندوستان کے ساحل سمندر کے ساتھ ساتھ ۱۷۰۰ لائٹ ہاؤس (روشنی کے مینار) ہیں ۔

۴ ۔ ۱۹۵۳ء میں ۲۸۰۶۰ غیر ملکی سیاح ہندوستان آئے اور یہ تعداد پچھلے سال کی نسبت تقریباً ۳۵۰۰ زیادہ ہے ۔

۵ ۔ مرکزی حکومت ہر سال کوڑھ کے کانکنوں کی صحت سے متعلق سہولتیں مہیا کرنے پر ۳۱ لاکھ روپے صرف کرتی ہے ۔

۶ ۔ ۱۹۵۳-۵۴ء کے پہلے نو مہینوں میں ہندوستان نے غیر ملکوں سے ۳۹ کروڑ ۱۶ لاکھ روپے کی مالیت کی ۸۸۲۹۰ ٹن روئی درآمد کی ۔

حبیبہ غازی الدین

ڈاکٹر ٹارج برن اوکسپرسن اور اُن کی تحقیقات

زندگی کی حقیقت کیا ہے؟ یہ ایک ایسا سوال ہے جو ایک معمولی آدمی سے لے کر سائنس داں تک کو حیران کئے دیتا ہے۔ اس ضمن میں سوئیڈن کے اِس طویل القامت ڈاکٹر نے چند اہم حقائق کا انکشاف کیا ہے جس کی وجہ سے معمۂ زندگی بڑی حد تک حل ہو جاتا ہے۔

انھوں نے ایک ایسا آلہ اور طریقہ دریافت کیا ہے جس کی مدد سے ہم زندہ خلیوں (جو حیات کی اکائی کہلاتے ہیں) کے باریک سے باریک حصّوں کا مشاہدہ کر سکتے ہیں، اور یہ پتہ لگا سکتے ہیں کہ اِس کے ایک مکعب سرکے کروڑویں حصّے میں کیا ہو رہا ہے۔ چنانچہ انھوں نے اِس کی مدد سے خلیہ کا ایک ایسا اہم کیمیائی جز دریافت کیا جس کو نیوکلیک ترشے کہتے ہیں۔ اور جس کے متعلق بہت سے ماہرین کا خیال ہے کہ ممکن ہے یہی ترشے خلیہ میں زندگی اور بالیدگی کا باعث ہوں۔

دنیائے سائنس کو سترھویں صدی سے یہ معلوم تھا کہ خلیے ساخت کے اعتبار سے زندہ باختوں کے اہم اجزا ہیں جو "پروٹوپلازم" اور ایک مرکزہ پر مشتمل ہوتے ہیں۔ نیز یہ بھی معلوم تھا کہ خلوی دیوار کے اندر مرکزہ میں پروٹوپلازم کے علاوہ "کروموسٹین" اور "جینس" بھی ہوتے ہیں۔ "جینس" کے فعل کے متعلق یہ بتایا جاتا ہے کہ یہ ایسے باریک ذرّات ہیں جو مزید خلیوں کی بناوٹ کی رفتار کو گھٹاتے یا بڑھاتے ہیں۔ یہ "جینس" جو نباتی اور حیوانی خلیوں میں پائے جاتے ہیں یکساں فعل انجام دیتے ہیں اور پُرکھا کی خصوصیات کا اظہار کرتے ہیں۔

ڈاکٹر کیسپرسن کی تحقیقات کی وجہ سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ مخصوص قسم کے نیوکلیک ترشے انسانوں، پرووں، کیڑوں، بکٹریا، زہریلے مادوں اور تمام جانداروں کے خلیوں میں پائے جاتے ہیں۔ لیکن ان تحقیقات کے باوجود خلیہ کی ساخت اور افعال ابھی ایک سربستہ راز ہیں مثلاً یہ سوالات پیدا ہوتے ہیں کہ "جینس" میں وہ کون سا کیمیائی مادہ ہے جو ایک بچے کے بالوں کو سُرخی یا سیاہی بخشتا ہے۔ بچے کی بالیدگی کے ساتھ خلیوں کی تعداد میں اتنی تیزی سے کیوں اضافہ ہوتا ہے اور پھر اضافہ کا یہ عمل بچے کے بالغ ہونے کے بعد کیوں سست ہو جاتا ہے۔ اور خلیے بعض اوقات غیر معمولی طور پر کیوں بڑھ جاتے ہیں۔ جو آخر کار ناسور کی شکل اختیار کرتے ہیں۔ ان سوالات کا جواب اُسی وقت ممکن ہے۔ جب ہمیں خلیہ میں پوشیدہ اُس شے کا علم ہو جائے جو اِس کو زندگی دیتی ہے۔ چنانچہ ڈاکٹر کیسپرسن کی تحقیقات سے جو نتائج اخذ کئے گئے ہیں اُن سے ان حقائق پر کچھ روشنی پڑ سکتی ہے۔

ڈاکٹر کیسپرسن سوئیڈن میں ۲۵۔ اکتوبر ۱۹۰۰ء میں بمقام مٹالا پیدا ہوئے وہ کارولنسکا انسٹی ٹیوٹ میں ڈاکٹری کی تعلیم حاصل کی۔ ۱۹۳۶ء میں اسٹاک ہوم میں ایم۔ ڈی کی سند حاصل کی۔ اِن کو زمانۂ طالب علمی ہی سے بیوکیمسٹری سے دلچسپی تھی۔ اور وہ ایسے طریقے معلوم کرنے کی دُھن میں تھے جس کی وجہ سے خلیے کے چھوٹے سے چھوٹے جز کو دیکھا جا سکے۔ کافی سوچ بچار کے بعد وہ اِس نتیجے پر پہنچے کہ بالائے بنفشی خوردبین کو جس کو کہ کُھلر نامی ایک جرمن سائنس داں نے ایجاد کیا تھا، اس مقصد کے لئے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ یہ پہلا موقعہ تھا کہ کسی سائنس داں نے اِس خوردبین کو اِس مقصد کے لئے استعمال کرنے کا خیال کیا۔ لیکن اس کے لئے خوردبین میں چند تبدیلیوں کی ضرورت تھی۔ کیوں کہ اِس میں باقاعدہ روشنی کے بجائے بالائے بنفشی شعاعوں سے کام لیا جاتا تھا۔ اور عدسوں کی بجائے اس میں بلوری پتھر استعمال کئے گئے تھے۔ چنانچہ کیسپرسن نے اپنی ضروریات کے لحاظ سے اس میں تبدیلیاں کیں اور اِس کو اِس قابل بنایا کہ زندہ خلیے کے اندرونی پیچیدہ افعال کا مشاہدہ کیا جا سکے اور اس طرح اُن کو عکسی طور پر خلوی تفصیلات مرتب کرنے کا موقعہ ملا۔ خلوی

مادّوں کو اِس طرح اِس سے پہلے کسی نے نہیں دیکھا تھا۔

اِس خوردبینی آلہ کی وجہ "سائیٹوکسٹری" میں دس گنا اضافہ ہوا۔ اور یورپ اور امریکہ میں خلیہ پر تحقیقات کرنے والے اس نئے طریقے سے فائدہ اُٹھانے لگے۔ ڈاکٹر کیپرسن نے بھی اِس سے کما حقہ فائدہ اُٹھایا۔ اُنھوں نے جسم کے ناقابل یقین باریک بافتوں کا امتحان کرکے یہ ثابت کیا کہ تمام انسانی، حیوانی اور نباتی خلیے ایک عام ابتدائی فعل انجام دیتے ہیں۔ یعنی اِن میں "اَمینو ترشوں" کی آمیزش عمل میں آتی ہے جس سے پروٹین تیار ہوتی ہے۔ اِس پروٹین کا ہر قسم کے خلیہ میں تیار ہونا ضروری ہے چاہے وہ خلیہ پودے کا ہو یا پرند کا یا انسان کا۔ کیونکہ جسم کی بافتوں اور اعضاء کا دارو مدار اِسی پروٹین پر ہے۔ کیپرسن کی زیادہ تحقیقات نیوکلیک ترشوں ہی کے بارے میں ہے۔ یہ ترشے جو شکر اور فاسفورک ترشہ کا مرکّب ہیں خلیہ کے مرکز میں پائے جاتے ہیں۔ کیپرسن نے طالب علمی ہی کے زمانے میں جب کہ وہ مدرسہ میں طب کی تعلیم حاصل کر رہے تھے یہ معلوم کر لیا کہ نیوکلیک ترشے مین "جنس" میں ہوتے ہیں۔ اِس کے بعد اُنھوں نے دریافت کیا کہ جب کبھی خلیہ کی تقسیم عمل میں آتی ہے نیوکلیک ترشوں کی مقدار میں اضافہ ہوتا ہے۔ اور اضافے کا یہ عمل خاص طور پر اِنسانی جنین کے نمو کے دوران میں دیکھا جا سکتا ہے۔ غرض اُنھوں نے یہ نظریہ قائم کیا کہ پروٹین کی طیاری کے لئے "نیوکلیک ترشہ" کا ہونا ضروری ہے۔ ساتھ ہی اُنھوں نے یہ ثابت کیا کہ نیوکلیک ترشے "جنس" کے موروثی خواص پر گہرا اثر ڈالتے ہیں۔

میدانِ طب میں بھی کیپرسن نے چند تحقیقات کی ہیں جن میں سرطان پر ان کی تحقیق کافی اہمیت رکھتی ہے۔ اس ضمن میں انھوں نے ثابت کیا ہے کہ "نیوکلیک ترشوں" میں جو تبدیلیاں واقع ہوتی ہیں وہ ناسور کی بناوٹ میں اہمیت رکھتی ہیں۔ نیز اُنھوں نے اور اُن کے ساتھیوں نے Viral Diseases اور نیوکلیک ترشوں کے مابین تعلق معلوم کرنے میں کامیابی حاصل کی۔ حال ہی میں وہ اس امر پر تجربہ کر رہے تھے کہ آیا خاص کیمیائی مادّے اُن غیر معمولی حالات کو جو کہ دماغی مریضوں کے عصبی خلیوں میں پیدا ہو جاتے ہیں روک سکتے ہیں۔

۴۳ سال کے اس ڈاکٹر کو اکثر تنقیدوں کا شکار رہنا پڑتا ہے اور بہت سے ماہرینِ حیاتیات ان کے نظریۂ حیات سے کامل طور پر متفق نہیں ہوتے۔ لیکن پھر بھی وہ یورپ اور امریکہ میں عزّت کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں۔ چنانچہ اِن کو کارولنسکا اِنسٹی ٹیوٹ میں جو ان کی ابتدائی تحقیقات کا مرکز ہے پروفیسری کی جگہ دی گئی۔ ۱۹۴۴ء میں نوبل میڈیکل اِنسٹی ٹیوٹ کے ناظم ہوئے اور ۱۹۴۵ء میں اِسٹاک ہوم میں ان کے لئے ایک شاندار دارالتجربہ تعمیر کیا گیا۔ دو سال بعد وہ ولن برگ لیبارٹری کے ڈائرکٹر ہوئے۔

ڈاکٹر کیپرسن جو بہت زیادہ شرمیلے واقع ہوئے ہیں اپنا زیادہ تر وقت ساتھی سائنس دانوں کے ساتھ گزارتے ہیں اُنھوں نے ۱۹۳۷ء میں "سیوی گنارسن نامی" ایک لیڈی ڈاکٹر سے شادی کی تحقیقاتی کاموں میں ان کے ساتھ ان کی بیوی بھی شریک رہتی ہیں۔ اور یہ دونوں ہفتہ بھر مسلسل کام سے جب تھک جاتے ہیں تو کچھ عرصے کے لئے خود کو مصروف دنیا سے منقطع کر لیتے ہیں اور مکمل آرام لیتے ہیں۔ کیپرسن کو چہل قدمی اور کشتی رانی بہت پسند ہے اور ان کو سوئڈن کے نئے اوپر اور کلاسیکل موسیقی سے بھی دلچسپی ہے۔ ڈاکٹر کیپرسن نے جو ترقی کہ خلیہ کے پوشیدہ راز معلوم کرنے میں حاصل کی وہ اُن کے لئے کاوش مسلسل کا ایک پیام ہے۔ سائنٹیفک تحقیقات کے بارے میں وہ کہتے ہیں کہ "ہم جیسے جیسے مسائل کو حل کرتے ہوئے ان کی باریکیوں پر غور کرتے جاتے ہیں ہمارے لئے نت نئے مسائل پیدا ہوتے جاتے ہیں۔

ریاستوں کی ازسرِنو تشکیل سے متعلق کمیشن کا نیا دفتر

ریاستوں کی ازسرِنو تشکیل سے متعلق کمیشن (اسٹیٹس ری آرگنائزیشن کمیشن) کا صدر دفتر ۱۰ کچہری روڈ، نئی دہلی کو منتقل کر دیا گیا ہے، اور آئندہ کے لئے کمیشن کے ساتھ اسی پتہ پر خط و کتابت کی جانی چاہیئے۔

کمیونٹی پراجیکٹ ایڈمنسٹریشن کی دوسری سالانہ رپورٹ

کمیونٹی پراجیکٹ ایڈمنسٹریشن (اجتماعی ترقی کا انتظامیہ شعبہ) کی طرف سے جو دوسری سالانہ رپورٹ برائے سنہ ۵۴-۱۹۵۳ء شائع کی گئی اُس میں بتایا گیا ہے کہ اگرچہ پہلے پانچ سالہ پلان کے تحت زرعی توسیع کی قومی سروس کے لئے بارہ سو گرام سیوکوں کی ضرورت ہے لیکن اب تک صرف تین ہزار سے زائد کارکن تربیت پا چکے ہیں اور تقریباً ایک ہزار پانچ سو زیر تربیت ہیں۔ ان گرام سیوکوں کو تقریباً ۳۰ہزار دیہات میں تعینات کیا گیا ہے جن کی مجموعی آبادی تین کروڑ چار لاکھ سے زیادہ ہے۔

مذکورہ رپورٹ میں پلان کی مدت کے دوران میں زرعی توسیع کی قومی سروس کے لئے ضروری عملہ کی تعداد ۸۳۸۳ بنائی گئی ہے جن میں پراجیکٹ ایگزیکٹو آفیسر، اہلکار، زرعی گریجویٹ، گرام سیوک، سماجی تعلیم کے آرگنائزر، معلّم، صحت سے متعلقہ عملہ، انجینئر اور اوورسیر وغیرہ شامل ہوں گے۔ دیہی کارکنوں، سماجی تعلیم کے آرگنائزروں اور بلاک ڈویلپمنٹ افسروں وغیرہ کی تربیت کے لئے کورس شروع کئے گئے ہیں۔

گرام سیوک

گرام سیوک کو جو اجتماعی ترقی کے معاملے میں کلیدی حیثیت کا مالک ہوگا خاص طور پر تربیت دی جا رہی ہے۔ "فورڈ فاؤنڈیشن" کی امداد سے وزارت خوراک و زراعت نے ۳۴ تربیتی مراکز قائم کئے ہیں۔ ماسوائے چنسورا (مغربی بنگال) مرکز کے تمام مراکز آج کل کام کر رہے ہیں۔ جنوری ۱۹۵۴ء کے اختتام تک ۳۱۷۰ دیہی کارکنوں اور نگرانی کرنے والے ۵۶۴ افراد کو تربیت دی جا چکی تھی اور ۱۵۸۲ دیہی کارکن اور ۱۶۴ نگرانی کرنے والے عملے کے افراد زیر تربیت تھے۔

گرام سیوکوں کو ایک سال کے لئے زراعت سے متعلق بنیادی تربیت دی جاتی ہے اس کے بعد وہ عملی طور پر توسیعی کام کرتے ہیں۔ چونکہ زراعت سے متعلق تربیت کے لئے موجودہ سہولیات ناکافی تھیں۔ اس لئے اجتماعی ترقی کے شعبہ انتظامیہ نے گزشتہ سال ان میں توسیع کے لئے ایک اسکیم مرتب کی تھی جو تین طریقوں سے بروئے کار لائی جائے گی۔ اولاً اگزرعی توسیع کے ۳۴ تربیتی مراکز میں سے بائیس میں نئے زراعتی شعبوں کا اضافہ کیا جائے گا۔ تاکہ ہر مرکز سالانہ پچاس طلباء کو تربیت دے سکے۔ دوسرے ملک میں بارہ زراعتی اسکولوں میں انتظامات وسیع کئے جائیں گے تاکہ ہر سال ایک اسکول میں ایک صد طلبا کو تربیت دی جا سکے۔ تیسرے، بائیس نئے زراعتی مرکز کھولے جائیں گے جو سال میں سو سو طلبا کو تربیت بہم پہنچا سکیں۔ توقع ہے کہ ان اقدامات سے تین سال کے عرصے میں اجتماعی ترقی اور زرعی توسیع کے سلسلے میں درکار دیہی کارکنوں کو تربیت دی جا سکے گی۔

سماجی تعلیم کے آرگنائزر

پہلے پانچ سالہ پلان کے تحت اجتماعی ترقی کے پراجیکٹوں کے لئے دو ہزار دو سو چالیس سماجی تعلیم کے آرگنائزروں کی ضرورت ہے۔ ان میں سے اب تک تین سو سولہ کو تربیت دی جا چکی ہے۔ جن میں چونسٹھ چیف آرگنائزر بھی شامل ہیں۔ اجتماعی ترقی کے ایک بلاک میں دو سماجی تعلیم کے آرگنائزر تعینات کئے جاتے ہیں جن میں سے ایک لازمی طور پر عورت ہونی چاہیئے۔ چیف آرگنائزر کا فرض منصبی اندازاً تین بلاکوں پر مشتمل ایک پراجیکٹ میں سماجی تعلیم کے کام کی دیکھ بھال کرنا ہے۔ سماجی تعلیم کی تربیت کا کام آج کل الہ آباد گاندھی گرام، حیدرآباد، نیلوکھڑی اور شانتی نکیتن یعنی پانچ مراکز میں ہو رہا ہے۔

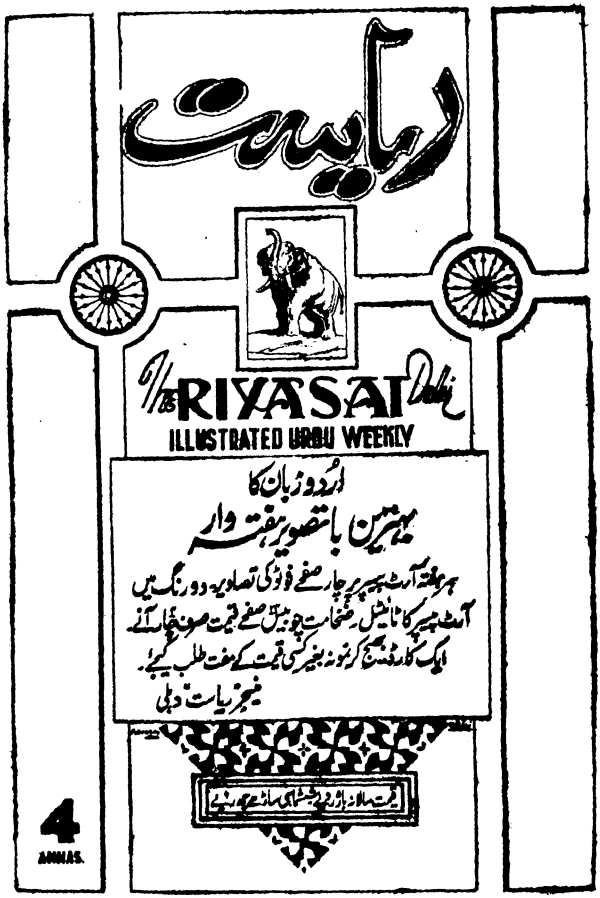
صحت سے متعلقہ عملہ

اجتماعی ترقی کے شعبۂ انتظامیہ کا خیال ہے کہ ضروری تعداد میں ڈاکٹروں، کمپاؤنڈروں، سینیٹری انسپکٹروں وغیرہ کے حصول میں چند اں مشکل پیش نہیں آئے گی لیکن مجموعی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے زنانہ ہیلتھ وزیٹروں اور دائیوں کی تربیت کے لئے موجودہ سہولیات بالکل ناکافی ہیں۔ کل دو ہزار چار سو اسی دائیوں کی ضرورت ہے۔ مذکورہ شعبے نے مرکزی وزارتِ صحت کے مشورے سے زنانہ ہیلتھ وزیٹروں اور دائیوں کی تربیت کے لئے مزید سہولیات فراہم کرنے کی غرض سے اسکیم تیار کرلی ہے، نیز ایک نئی قسم کے امدادی عملے (نرس دائی) کی تربیت کا اہتمام بھی کیا گیا ہے۔ یہ نرس دائیاں کمیونٹی پراجیکٹ کے علاقوں کے زچہ خانوں میں کام کریں گی۔ تربیتی مراکز کے اخراجات پانچ سالہ پلان میں تربیت کی اسکیم کے لئے مخصوص کی گئی۔ پانچ کروڑ روپے کی رقم میں سے پورے کئے جائیں گے۔

بلاک ڈویلپمنٹ افسر

اجتماعی ترقی کے شعبۂ انتظامیہ نے بلاک ڈیولپمنٹ افسروں کی خصوصی تربیت کا انتظام بھی کیا ہے۔ یہ افسر تقریباً سو سو دیہات پر مشتمل ایک ایک پراجیکٹ بلاک کے انچارج ہوں گے۔ ان کی تربیت کے لئے یکم اپریل ۱۹۵۲ء سے نیلوکھیڑی، حیدرآباد اور ہزاری باغ میں تین تربیتی مراکز قائم کئے جا رہے ہیں۔ ان افسروں میں سے بیشتر سبارڈی نیٹ سول سروس سے تعلق رکھتے ہیں۔ تربیت کا کورس چھ ہفتوں میں ختم ہوگا۔ ہر مرکز میں ۲۵ افسروں کے لئے انتظامات ہوں گے۔ تجویز یہ ہے کہ کورس کے اختتام پر تربیتی مراکز کا عملہ متعلقہ پراجیکٹ کے علاقوں میں جاکر پراجیکٹ اسٹاف سے ملے۔ تاکہ وہ انتظامیہ امور کی نگرانی اور لوگوں سے راہ و رسم پیدا کرنے کے طریقوں و تکنیک سے متعلقہ مسائل پر ان سے بحث و تمحیص کر سکیں۔

اس وقت اجتماعی ترقی کے پراجیکٹوں اور توسیعی بلاکوں کے لئے کثیر المقاصد دیہی اور اور دوسروں سے متعلق ایک تربیت کی اسکیم زیرِ غور ہے۔ اس امر کا احساس کیا گیا ہے کہ موجودہ ٹیکنیکل اداروں میں تربیت حاصل کرنے والے اور دیہی و دیہاتی علاقوں میں کام کرنے جانے والے انواع و اقسام کے انجینئرنگ کے کام سے متعلق پوری اہلیت نہیں رکھتے چنانچہ ان تربیت یافتہ اشخاص کو مقامی حالات و ضروریات سے روشناس کرانے کی غرض سے ایک مختصر کورس بنایا جائے گا۔



ڈاک اور تار کے شعبے کی سرگرمیاں

۵۴-۱۹۵۳ء میں شعبۂ ڈاک و تار[1] کی سرگرمیوں کی رپورٹ ممبران پارلیمنٹ میں تقسیم کی گئی ہے۔ رپورٹ میں یہ بتایا گیا ہے کہ زیر نظر سال میں بھارت کے دیہاتی علاقوں میں ڈاک کی سہولتوں کی توسیع کی گئی۔ دوسرے ملکوں کو تار کے ذریعے سے پیغام رسانی کے انتظامات کو مضبوط بنایا گیا ہے۔ تاروں میں ہندی اور بھارت کی دوسری زبانوں کے استعمال میں اضافہ ہوا۔ لوگوں نے پیغامات کی ترسیل کے لئے ڈاک، تار، ٹیلیفون تینوں ذرائع کا مقابلتاً زیادہ استعمال کیا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ زیر نظر سال میں شعبۂ ڈاک و تار کی کارگذاری کے بارے میں شکایات بھی کم موصول ہوئیں۔

شعبہ ڈاک و تار کے کام کی مقدار کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ ۵۳-۱۹۵۲ء میں شعبہ مذکور نے ڈاک کی کل دو ارب ۷۹ کروڑ چالیس لاکھ اشیاء کا انصرام کیا۔ نو کروڑ دس لاکھ رجسٹری شدہ اشیاء مختلف ڈاک خانوں سے ارسال کی گئیں۔ سیونگ بنک کے مختلف اکاؤنٹوں میں مجموعی طور پر ایک کروڑ چوالیس لاکھ روپیہ جمع کیا گیا یا متعلقہ اشخاص کو ادائیگی کی گئی۔ دو ارب سولہ کروڑ دو پے کے پانچ کروڑ چوراسی لاکھ منی آرڈر جاری کئے گئے۔ اس کے علاوہ اس سال کے دوران میں کروڑ نو سے لاکھ تار روانہ کئے گئے اور ٹیلیفون اور تار کے سلسلوں کے ذریعے سے ٹرنک کالوں کی تعداد ایک کروڑ اسی لاکھ رہی۔

یکم اپریل ۱۹۵۳ء سے ۳۱ جنوری ۱۹۵۴ء تک مختلف دیہات میں بارہ سو بیاسی ڈاک خانے کھولے گئے ہیں۔ اس مدت میں شہری علاقوں میں بھی نوے ڈاک خانے کھولے گئے۔ نیز آسام اور تری پورہ کے سرحدی پہاڑی حصوں سکم اور انڈیمان وغیرہ کے پس ماندہ علاقوں میں ڈاک کی سہولتیں بہم پہنچانے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ دیہاتی علاقوں میں مزید ڈاک خانے ہی نہیں کھولے گئے بلکہ ان علاقوں میں ڈاک کی تقسیم اور وہاں سے ڈاک جانے کے انتظامات کو بہتر بنانے کی طرف بھی توجہ دی گئی ہے۔ جہاں کہیں ممکن تھا، لاریوں کے ذریعے سے ڈاک کی آمدورفت کا اہتمام کیا گیا ہے۔

نیروبی اور ٹانگ کانگ سے براہ راست ریڈیو ٹیلیفون سروس شروع کی گئی ہے۔ برطانیہ، انڈونیشیا، مصر، ایران اور جاپان وغیرہ ممالک کے ساتھ پہلے ہی یہ سروس شروع کی جا چکی ہے۔ اب کل ۳۵ غیر ممالک اور بھارت کے درمیان ریڈیو ٹیلیفون قائم ہے۔ جنوری ۱۹۵۳ء میں بلجیم ناروے اور سویڈن کے ساتھ بھی فوٹو ٹیلیگرام سروس قائم کی گئی ہے۔

علاوہ ازیں ٹیلیفون/تار کے ذریعے سے پیغام رسانی کی سہولتوں میں توسیع ہوئی ہے۔ ۴۸ نئے ٹیلیفون ایکسچینج قائم کئے گئے ہیں اور ۶۲ ایکسچینجوں کی توسیع کے ذریعے سے ٹیلیفون کی مزید ۲۱۲۸۵ لائنوں کا اہتمام کیا گیا۔ ۳۱ دسمبر ۱۹۵۳ء میں بھارت میں کل دو لاکھ اٹھارہ ہزار چھ سو تریپن ٹیلیفون استعمال کئے جا رہے تھے۔ گذشتہ سال ۴۱۹ پبلک کال آفس (جہاں سے عام لوگ ٹیلیفون کر سکتے ہیں) کھولے گئے۔ سارے ملک میں اس وقت دو ہزار دو سو اٹھاون پبلک کال آفس کام کر رہے ہیں۔ ۱۹۵۵ء تک تمام ضلع ہیڈ کوارٹروں تک ٹرنک کال کرنے کی سہولتوں کا اہتمام کر دیا جائے گا خواہ اس پر حکومت کو کتنا ہی مالی نقصان اٹھانا پڑے۔

تار سروس میں ہندی اور دوسری ہندوستانی زبانوں کا استعمال بڑھ رہا ہے۔ زیر نظر سال میں مختلف ہندوستانی زبانوں میں ۱۸۳۹ تک بک کئے گئے جبکہ ۱۹۵۲ء میں اس قسم کے صرف سات ہزار آٹھ سو ایک تار بک کئے گئے تھے۔ اس وقت لوگوں کو پانچ سو چوبیس تار گھروں میں ہندوستانی زبانوں میں تار بھیجنے کی سہولتیں حاصل ہیں۔

---

[1] "ڈاک و تار" کی ترکیب درست نہیں لیکن اب ایسا وقت آ گیا ہے کہ اس قسم کی ترکیبوں کو جائز قرار دیا جائے (ادارہ)

نئے مطبوعات

مآل و مشیت حیاتِ انسانی کے دو بنیادی تصورات کی فلسفیانہ تحلیل۔ از ظفر حسین خان۔ کتاب بڑی تقطیع کے ۸۸ صفحات پر مشتمل ہے۔ مصنف بڑے تجربہ کار ماہر تعلیم اور فلسفے سے خاص شغف رکھتے ہیں۔ بقول مصنف "اردو کا دامن فلسفیانہ کاوش کے کسی بدیع و مستقل نتیجہ سے ہنوز تقریباً خالی ہے۔ اس کی ساری کائنات اکثر و بیشتر چند ترجموں یا تلخیصات پر مشتمل ہے۔ مآل و مشیت اسی خلا کا مختصر گوشہ پُر کرنے کی ایک حقیر سعی ہے۔"

ملنے کا پتہ دارالمصنفین اعظم گڑھ۔ قیمت کتاب پر درج نہیں۔

تحقیقی مطالعے ملنے کا پتہ دانش محل امین الدولہ پارک لکھنؤ ڈاکٹر نذیر احمد لکھنؤ یونیورسٹی کے چھ تنقیدی مضامین کا یہ مجموعہ حال ہی میں شائع ہوا ہے۔ قیمت فی جلد دو روپے کتاب فورس لوس کے مخطوطات اور گلزارِ ابراہیم و فرازِ خلیل اچھے مضامین ہیں۔

نئی فکریں سید محمد عقیل کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ۔ پبلشرز خیابان ۱۱۰ سبزی منڈی الہ آباد ۳۔ قیمت ڈیڑھ روپے۔ کتاب مجلد ہے اور ۱۴۸ صفحوں پر مشتمل ہے۔ اس مجموعے کے اکثر مضامین مختلف رسائل میں شائع ہو چکے ہیں۔

نبضِ دوراں ناشر ادارۂ فکر و فن رحیم آباد ضلع لکھنؤ قیمت مجلد عہ۔ افگار شتاق رحیم آبادی کا یہ مجموعۂ کلام حسنِ ظاہر کا بہت اچھا نمونہ ہے۔ نظموں اور غزلوں میں حرارت اور زندگی کے آثار ملتے ہیں۔

پرواز خضنفر نواب دانش عظیم آبادی کا مجموعۂ کلام، مرتب ہوش عظیم آبادی۔ ناشر مکتبۂ ادب پٹنہ قیمت دو روپے۔ کتابت، طباعت، جلد عمدہ۔ ہوش عظیم آبادی اور علامہ جمیل مظہری نے دانش کی شاعری پر تقاریظ لکھی ہیں۔ قصیدۂ لوح و قلم کی تشبیب کے ایک بند ہی سے زورِ کلام کا اندازہ ہو جائے گا۔

لباطِ دہر پہ بیٹھے ہیں مہرہ چینِ ہوس — قدم قدم پہ بچھائے ہوئے کمندِ قمار
بہ ہوش باش کہ عالم فریبِ مطلق ہے — جہاں بہ حلقۂ دام و جہانیاں بہ حصار
بہ انقلابِ مزاج و بہ اختلافِ اثر
نہ مل سکا غمِ ہستی کو ایک دم بھی قرار

عروسِ نیل از سلطانہ آصف فیضی۔ ناشر مکتبۂ جامعہ دہلی۔ قیمت عہ۔ تقطیع ۲۰×۱۳ ضخامت ۱۹۴ صفحات کاغذ، کتابت، طباعت عمدہ۔ کتاب متعدد تصویروں سے بھی مزین ہے۔ پیش لفظ میں محترمہ نے لکھا ہے:۔

"سیرِ شہرِ مصر میں ۱۹۴۹ء سے ۱۹۵۱ء تک ہندوستان کے سفیر رہے۔ اس دو سال کے قلیل عرصے میں باوجود اپنی گوناگوں مصروفیت کے جس کا زیادہ حصہ چائے نوشی، ضیافتوں اور ملنے جلنے میں گزرتا رہا، ایسے قیمتی اور دلچسپ لمحے بھی ہاتھ آئے جن میں مصریوں کے رہن سہن، ان کی سماجی زندگی اور عادات و خصائل کے بھی مطالعے کا موقع ملا۔"

یہ مجموعۂ مضامین چھ دلچسپ مضامین پر مشتمل ہے۔ 'عروسِ نیل' پہلا مضمون ہے۔ یہ آج کل میں چھپ بھی چکا ہے۔ فہیمہ ایک خادمہ کا نام ہے۔ یہ ایک بہت اچھا مطالعہ ہے۔ فلاح عورتوں کے حالات بھی اس مضمون میں ملتے ہیں اور مصری زندگی کی ایک دلچسپ جھلک نظر آتی ہے۔

فرح یعنی شادی، قاہرہ میں رمضان المبارک، حرم شیخ رجب، القاہرہ کی سیر بڑے دلچسپ اور معلومات سے پُر مضمون ہے۔

نثر کا انداز سادہ اور زبان سلیس ہے۔ یہ کتاب مصر سے متعلق سماجی اور اقتصادی اچھے حالات کی حامل ہے اور اردو ادب میں ایک

اچھا اضافہ ہے۔

نئی کہکشاں اختر انصاری اکبرآبادی کے کلام کا مجموعہ مجلد اور خوبصورت جلد پوش، ۴۴ صفحات قیمت جم نے کا پتہ مرکز ادب مشن روڈ کراچی۔

باپ بیٹے ناشر مکتبہ جامعہ دہلی۔ تورگنیف مشہور روسی ناول نگار کے ناول باپ بیٹے کا اردو ترجمہ۔ مترجم انور عظیم۔ ضخامت ۲۰۰ صفحے۔ جلد پوش خوبصورت، کتابت، طباعت، کاغذ اوسط، قیمت فی جلد پانچ روپے۔

طوفان کی کلیاں کرشن چندر کا تازہ ناول۔ یہ ناول بھی شکست کی طرح کشمیر سے متعلق ہے۔ کاغذ کتابت، طباعت، جلد، جلد پوش عمدہ۔ ضخامت ۳۱۸ صفحے۔ قیمت چار روپے چار آنے فی جلد۔

چند ہم عصر مصنف ڈاکٹر مولوی عبدالحق۔ انجمن ترقی اردو پاکستان اردو روڈ کراچی نے یہ کتاب شائع کرکے ادب پر بڑا احسان کیا ہے۔ یہ اس کتاب کا چوتھا ایڈیشن ہے۔ بازار میں یہ قریب قریب نایاب ہو چکی تھی۔ قیمت ۳ روپے آٹھ آنے فی جلد۔

اردو کی ابتدائی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا کام۔ ناشر انجمن ترقی اردو پاکستان اردو روڈ کراچی مصنف ڈاکٹر عبدالحق۔ قیمت ایک روپیہ چودہ آنے۔ یہ کتاب بھی نایاب تھی۔ اس کا تیسرا ایڈیشن چھپا ہے۔ تاریخی اور ادبی دونوں حیثیتوں سے کتاب قابل قدر ہے۔

روایت کی اہمیت۔ شائع کردہ انجمن ترقی اردو پاکستان اردو روڈ کراچی۔ قیمت سات روپے ضخامت بڑی تقطیع کے ۴۷ صفحے۔ یہ کتاب ڈاکٹر عماد بریلوی کے دس تحقیقی اور تنقیدی مقالات کا مجموعہ ہے۔ مضامین کے عنوانات یہ ہیں۔

روایت کی اہمیت، اردو شاعری میں گل و بلبل کے اشارے، دلی کا دبستان شاعری، آب حیات اور آزاد، غالب کی عشقیہ شاعری، مقدمہ شعر و شاعری، داغ کا تغزل اور اس کے سماجی محرکات، حسرت، اردو شاعری میں حب وطن کی روایت، اردو تنقید میں روایت اور تجربے جیسا کہ ظاہر ہے مضامین موضوعاتی طور پر رنگا رنگی کے حامل ہیں لیکن سب کا تعلق آج کل دہلی کسی نہ کسی لحاظ سے روایت سے ضرور ہے۔

لکھائی چھپائی بھی خوبصورت ہے۔ اردو ادب میں یہ کتاب ایک قابل قدر اضافہ ہے۔

شرح دیوان غالب نظم طباطبائی — دیوان غالب کی یہ شرح قریب قریب نایاب تھی۔ انوار بک ڈپو ۳۷ امین آباد پارک لکھنؤ نے اسے شائع کرکے تشنگان ادب کی پیاس بجھائی ہے۔ قیمت فی جلد تین روپے آٹھ آنے

میں انتظار کروں گا کرشن چندر کے افسانوں کا یہ مجموعہ مکتبۂ شاہراہ دہلی نے شائع کیا ہے۔ قیمت دو روپے آٹھ آنے۔ آٹھ افسانے اس مجموعے میں شامل ہیں۔ ان افسانوں میں ہئیت اور موضوع کے بہت جاندار تجربے ہیں۔ یہ افسانے زندگی کے حقائق پر سے نقاب اٹھاتے ہیں۔

حسرت موہانی مصنفہ پرنسپل عبدالشکور۔ شائع کردہ انوار بک ڈپو لکھنؤ۔ یہ اس کتاب کا تیسرا ایڈیشن (مع اضافہ جدید) ہے۔ قیمت دو روپے آٹھ آنے فی جلد

مہاتما گاندھی از محمد حفیظ الدین۔ ناشر مکتبۂ جامعہ لمیٹڈ جامعہ نگر دہلی۔ قیمت بارہ آنے

کتاب حسین و جمیل چھپی ہے۔ بچوں کے لئے بہت ہی مفید ہے زبان صاف اور سلیس ہے۔ کتاب تصویروں سے مزین ہے۔

ہیروئین کی تلاش مصنف محمد مجیب صاحب حامد ملیہ دہلی ناشر مکتبہ جامعہ دہلی۔ اردو میں ڈرامے کا قحط ہے۔ یہ کتاب اس کمی کو کسی حد تک مگر بہ طریق احسن پورا کرتی ہے قیمت فی جلد ۱۰ آنے۔ مکتبۂ جامعہ دہلی سے مل سکتی ہے۔

جواہر پارے (تحفہ یوم جمہوریت) حلیم کالج کانپور کے مشاعرے کی باتصویر یادگار شائع ہوئی ہے۔ اردو کے مشہور شاعر جناب نشور واحدی نے مرتب کی ہے۔ کتاب بڑی دیدہ زیب ہے۔ حلیم کالج کے منتظمین نے بڑے اہتمام سے یہ مشاعرہ یوم جمہوریت کے موقع پر منعقد کیا تھا۔ شعراء میں جناب اقبال سہیل، نوح ناروی، اثر لکھنوی، جگر مرادآبادی، فراق گورکھپوری اور روش صدیقی کے نام قابل ذکر ہیں۔ قیمت کتاب پرچہ نہیں لکھا۔ پتہ:۔ پرنسپل حلیم مسلم کالج کانپور

رفتارِ زمانہ

حکومتِ کشمیر نے بھارت کی تمام اشیا سے چنگی ہٹالی

حکومتِ کشمیر نے اعلان کیا ہے کہ ماسوائے پٹرول کے بھارت سے تمام اشیا کی برآمد اور درآمد پر ۱۳ - اپریل سے چنگی ہٹا دی گئی ہے۔ ریاست میں باہر سے منگوائے جانے والے مال پر وزن کے مطابق آکٹرائے ٹیکس لگایا جائے گا۔ ٹینکوں میں منگائے جانے والے پیٹرول پر بھی چنگی کا اطلاق نہیں ہوگا۔ دوسرے ذرائع سے آنے والے پیٹرول پر چار آنے فی گیلن کے حساب سے چنگی ٹیکس لگایا جائے گا۔

نیپال میں مشاورتی کونسل کا قیام

نیپال کے مہاراجہ تریبھون نے اعلان کیا ہے کہ نیپال میں ۱۰۵ ممبران پر مشتمل ایک مشاورتی کونسل کا قیام عمل میں لایا جائے گا۔ ڈیڑھ ماہ بعد اس کونسل کا افتتاح ہوگا۔ نیپال کی وزارت کے تمام وزیر بھی اس کونسل کے ممبر ہوں گے۔ وزراء کے شامل ہو جانے کے بعد کونسل کے ممبران کی تعداد ۱۱۲ ہو جائے گی۔ نیپال کانگریس کو جو اپوزیشن کی سب سے بڑی پارٹی ہے اس کونسل میں گیارہ نشستیں حاصل ہوں گی۔

غلہ کی پیداوار کے متعلق وزیرِ زراعت کی تقریر

بھارت کے وزیرِ زراعت ڈاکٹر پنجاب راؤ دیش مکھ نے گوہاٹی میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ "مجھے یقین ہے کہ دیش کی زراعتی پیداوار پانچ سے دس سال کے عرصے میں دُگنی ہو جائے گی اور اگر ترقی کی موجودہ رفتار جاری رہی تو چند برسوں تک خوراک کے لئے بھارت کو کسی دوسرے ملک کا مُنہ نہیں دیکھنا پڑے گا۔" آپ نے بتایا کہ موجودہ اُمید افزا حالات میں ہمیں ملک کی بڑھتی ہوئی آبادی سے تشویش نہیں ہونی چاہیئے۔ وزیرِ زراعت نے یہ بھی کہا کہ اب ملک بھر میں جاپانی طریقے سے چاول کی کاشت کی جا رہی ہے اور اس طریقِ کاشت کی کامیابی کا واضح ثبوت یہ ہے کہ چاول کی پیداوار میں نو لاکھ ٹن کا اضافہ ہوا ہے۔

ہائیڈروجن بم پر پابندی کے متعلق نہرو اسکیم

متحدہ اقوام کے اسلحہ بندی کمیشن کے امریکی نمائندے مسٹر ہینری کیبٹ لاج نے اعلان کیا ہے کہ امریکہ ہائیڈروجن بم اور اس قسم کے دوسرے ہتھیاروں پر پابندی لگائے جانے کے متعلق شری نہرو کی اسکیم پر غور کرنے کے لئے طیار ہے۔ امریکی نمائندے نے کمیشن کے سامنے یہ تجویز بھی رکھی ہے کہ چار بڑے ممالک اور کنیڈا پرائیویٹ طور پر نہرو اسکیم پر غور و خوض کریں۔

راشٹرپتی کا کشمیر میں شاندار سواگت

راشٹرپتی ڈاکٹر راجندر پرشاد کی جموں میں آمد پر ریاست جموں اور کشمیر کے لوگوں نے اُن کی راہ میں آنکھیں بچھا دیں۔ ہوائی اڈے سے لے کر صدر ریاست کے محل تک چار میل لمبے راستے کو نہایت شاندار طور پر سجایا گیا تھا، اور ہزاروں لوگ راستے میں اُن کے درشنوں کے لئے موجود تھے۔ راستے بھر میں راشٹرپتی پر پھولوں کی بارش ہوتی رہی۔ ہوائی اڈے پر صدر ریاست یوراج کرن سنگھ، وزیرِ اعلیٰ بخشی غلام محمد شیخ محمد صادق اور سب بڑے بڑے سول اور ملٹری افسر موجود تھے۔ ایک ایڈریس کے جواب میں راشٹرپتی نے اعلان کیا کہ بھارت اور کشمیر کے تعلقات اٹوٹ ہیں اور دنیا کی کوئی طاقت اُن کو ایک دوسرے سے جدا نہیں کر سکتی۔

پانڈیچری کے عوام کا جہادِ آزادی

پانڈیچری کے عوام نے فرانسیسی سامراج کا جُوا اپنے کندھوں پر سے اُتار پھینکنے کے لئے سرد ھڑکی بازی لگا دی ہے۔ کئی دیہات کے لوگوں نے تو اپنی آزادی کا اعلان بھی کر دیا ہے۔ فرانسیسی حکام اگرچہ لوگوں پر بے پناہ مظالم توڑ رہے ہیں لیکن اس سے لوگوں میں اور زیادہ جوش پھیل رہا ہے۔ بھارت کے پردھان منتری شری جواہر لال نہرو نے حکومتِ فرانس کو مشورہ دیا ہے کہ وہ اپنے مقبوضات سے از خود اور پُر امن طور پر دست کش ہو جائے جبکہ فرانس استصوابِ رائے کی آڑ میں ابھی تک ٹال مٹول سے کام لے رہی ہے لیکن امید کی جاتی ہے کہ جلد ہی اُسے یہ مقبوضات خالی کرنے پڑیں گے۔

ترکی اور یوگوسلاویہ میں فوجی معاہدہ

ترکی کی راجدھانی انقرہ میں یوگوسلاویہ کے صدر مارشل ٹیٹو اور

ترکی کے صدر جلال بائر کی گفت وشنید کے نتیجے کے طور پر یہ طے پایا ہے کہ ترکی اور یوگوسلاویہ میں باہمی فوجی امداد کے بارے میں ایک معاہدہ کیا جائے۔ اس معاہدے میں یونان کی شمولیت کا بھی امکان ہے۔ معاہدے کی تفصیلات پر غور اُس وقت ہوگا جب ترکی کے صدر اور وزیر خارجہ یوگوسلاویہ جائیں گے۔

مصر کی سیاسیات میں کش مکش

ان دنوں مصر کی سیاسیات غیر یقینی حالات میں سے گزر رہی ہے۔ شاہ فاروق کی جلاوطنی کے بعد فوجی حکومت قائم ہونے سے یہ امید پیدا ہوگئی تھی کہ ملک میں اب کافی عرصے کے لئے امن اور چین کی بانسری بجے گی اور عوام کی خوش حالی کا ایک نیا دور شروع ہوگا۔ لیکن تھوڑے عرصے کے بعد ہی مصر کے سیاسی سمندر میں جوار بھاٹا آنا شروع ہوگیا اور جنرل نجیب اور کرنل ناصر کے مابین باہمی کش مکش شروع ہوگئی۔ اس سلسلے میں یہ آخری خبر ہے کہ کرنل ناصر نے پھر وزارت عظمیٰ کا عہدہ سنبھال لیا ہے اور صدر جنرل نجیب ہی رہیں گے۔ دیکھا چاہئے کہ یہ نئی صورت حال کب تک قائم رہتی ہے۔

پنڈت نہرو کے ریزولیوشن کی حمایت

سنگدہ اقوام کی اسمبلی کے اسلحہ بندی کمیشن کے اجلاس میں تقریر کرتے ہوئے روسی نمائندے موسیو وشنسکی نے ہائیڈروجن بم کے تجربات کے متعلق بھارت کے وزیر اعظم شری جواہر لال نہرو کے ریزولیوشن کی حمایت کی اور کہا کہ دنیا میں امن کو قائم رکھنے کے لئے یقینی طور پر یہ ایک ٹھوس قدم ہے۔ آپ نے یہ تجویز پیش کی کہ اسلحہ بندی کی سب کمیٹی میں بھارت کو بھی جگہ دی جائے۔

جنوب مشرقی ایشیا ڈیفنس سمجھوتہ پر شری نہرو کا بیان

بھارت پارلیمنٹ میں جنوب مشرقی ایشیا کے ڈیفنس کے اجتماعی سمجھوتے کے بارے میں ایک بیان دیتے ہوئے پردھان منتری شری جواہر لال نہرو نے کہا کہ اس سلسلے میں بھارت کی پالیسی سب ممالک پر اچھی طرح واضح ہے اور امریکی اور برطانوی وزرائے خارجہ کے حالیہ بیانات سے اس میں کسی تبدیلی کی گنجائش نہیں۔ بھارت کی پالیسی جچے تلے اصولوں پر مبنی ہے اور اس پالیسی کا اُدیش یہ ہے کہ مختلف ممالک کے باہمی جھگڑے پُر امن رویے، مفاہمت اور گفت وشنید سے حل کئے جائیں، نہ کہ جھگڑا بڑھایا جائے اور نئے جھگڑے کھڑے کرنے کی دھمکی دی جائے جس کے نتیجے کے طور پر دوسرا فریق یہ محسوس کرے کہ اُسے مرعوب کرنے کے لئے طاقت کا مظاہرہ کیا جا رہا ہے۔

شری نہرو نے کہا کہ ہند چینی میں جنگ ختم کرانے کا مسئلہ بڑی اہمیت رکھتا ہے، اور اس امر کو مدنظر رکھ کر بھارت نے جنیوا کانفرنس کا خیر مقدم کیا تھا اور اُمید کی تھی کہ کانفرنس میں سمجھوتہ کرانے کے لئے باہمی گفت وشنید کے ذریعے جنگ ختم کرانے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی جائے گی۔

عالمی امن کے لئے ڈاکٹر کرشنن کا اظہار خیال

بھارت کے اُپ راشٹرپتی ڈاکٹر رادھا کرشنن نے کل ہند مصنفین کانفرنس میں اپنا صدارتی ایڈریس پڑھتے ہوئے کہا کہ جنگ کرنا کوئی بُرائی کی بات نہیں۔ دنیا کا کوئی ملک اس بات کو پسند نہیں کرے گا کہ ہم سب برباد ہو جائیں اس لئے ہمارا فرض ہے کہ ہم ہلاک ہتھیاروں کے تجربات کی مذمت کریں۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ اس وقت ہم ایک چٹان کے کنارے کھڑے ہیں۔ ہمیں ایٹم اور ہائیڈروجن کا غم اندر ہی اندر کھائے جا رہا ہے۔ ہائیڈروجن بم کے اثرات تو اور بھی زیادہ ہلاک ہیں۔ ہم کو یقین ہے کہ اس کی لامحدود تباہی کی قوت جنگ کے لئے ایک روک کا کام دے سکے گی لیکن ہم دلوں پر خوف ناک اور لامحدود ہیبت طاری کر کے انسان کے سفلی جذبات، خوف، لالچ اور نفرت کو اُبھار رہے ہیں اور یہ چیز انسانیت کے لئے انتہائی نقصان دہ ہے۔

مولانا گل بادشاہ صدر جمعیت العلماء پاکستان صوبہ سرحد کا اظہار خیال

جمعیت العلماء پاکستان صوبہ سرحد کے صدر مولانا گل بادشاہ نے ایک بیان میں کہا ہے کہ اب پاکستان کی دستوری اسمبلی کی حیثیت ختم ہوگئی ہے۔ اس لئے اس کو فوراً توڑ دینا چاہئے۔ اُنہوں نے مزید کہا کہ اگر مشرقی پاکستان کی طرح مغربی پاکستان کے عوام بھی متحد ہو جائیں تو مسلم لیگ جیسی رجعت پسند جماعت کو آئندہ انتخابات میں مکمل شکست کا مُنہ دیکھنا پڑے گا۔ مولانا صاحب نے یہ بھی کہا کہ پاکستان ایک جمہوری ملک ہے اس لئے اس میں خدائی خدمتگاروں پر پابندی لگانا نہایت غلط بات ہے۔

یہ کتابیں پڑھئے

آج ہمارا دیش برق رفتاری سے تعمیر و ترقی کے راستوں پر گامزن ہے۔ آپ اس تعمیر و ترقی کے متعلق اپنی واقفیت میں اضافہ کیجئے اور اس تعمیر و ترقی میں اپنا حصّہ ادا کیجئے۔
مندرجہ ذیل کتابیں اس سلسلے میں آپ کی رہنمائی کر سکتی ہیں۔

پنج سالہ پلان [مختصر تعارف]

اسّی صفحات کی ایک مختصر سی کتاب جس میں پنج سالہ پلان کا سارا خاکہ دے دیا گیا ہے۔ اس کتاب کے مطالعے سے پنج سالہ پلان کی ایک مختصر لیکن مکمل تصویر آپ کے سامنے آ سکتی ہے۔
قیمت آٹھ آنے

نئے ہند کی تعمیر

آج کروروں ہندوستانیوں کی مشترکہ کوششوں سے ایک نیا ہندوستان تعمیر ہو رہا ہے۔ پنڈت نہرو نے قوم کے نام ایک پیغام براڈ کاسٹ کرتے ہوئے کہا تھا۔ "آؤ ہم سب اس کارِ نمایاں میں حصّہ دار بن جائیں۔ جس کا مقصد نئے ہندوستان کی تعمیر ہے۔" اس پمفلٹ میں جو ایک خوبصورت آرٹ پیپر پر بلاک کی تصویروں کے ساتھ شائع ہوا ہے اسی زبردست تعمیر نئے ہندوستان کی جھلکیاں ملتی ہیں۔
قیمت آٹھ آنے

اپنے شہر کے کتب فروشوں سے طلب کیجئے یا براہِ راست اس پتے سے منگوایئے:۔ بزنس منیجر پبلیکیشنز ڈویژن اولڈ سیکرٹریٹ دہلی ۸

آج کل کا سال نامہ ۱۹۵۴ء

ماہ اگست ۱۹۵۴ء کا شمارہ سال نامہ ہوگا۔ رنگین تصاویر، رنگین سرورق کے علاوہ اس میں بلند پایہ افسانہ نگاروں کے افسانے، شعراء کی نظمیں اور مضمون نگاروں کے مضامین ہوں گے۔ اُردو اور دوسری علاقائی زبانوں کے ادب کے نمونے پیش کئے جائیں گے۔ ادب اور ہندوستانی تہذیب سے متعلق دلچسپ مضامین بھی شاملِ اشاعت ہوں گے۔ چند لکھنے والوں کے نام ذیل میں دئے جاتے ہیں:۔

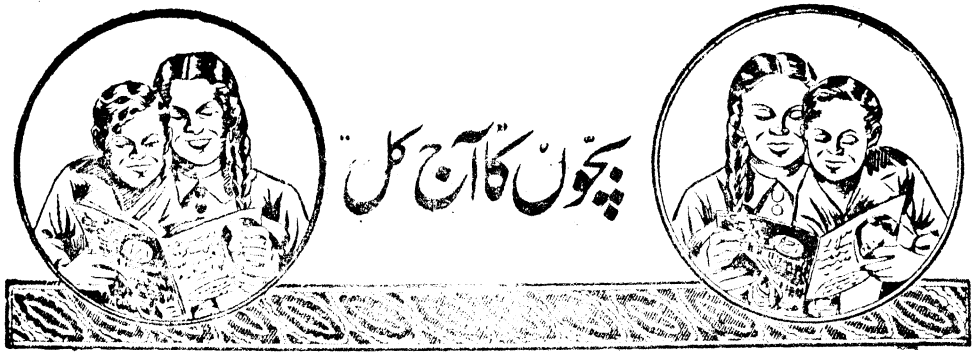
علامہ پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی — سید احتشام حسین — چودھری شیر جنگ — علی سردار جعفری
کرشن چندر — راجندر ناتھ شیدا — علی عباس حسینی

مدیر رسالہ جوش ملیح آبادی کی ایک تازہ اور غیر مطبوعہ نظم خاص طور پر شائع ہو رہی ہے

ایجنٹ حضرات اپنی ضروریات سے جلد مطلع فرمائیں — مشتہرین اس نادر موقعے سے فائدہ اُٹھائیں

قیمت عام شماروں کی طرح صرف آٹھ آنے فی پرچہ

بزنس منیجر پبلیکیشنز ڈویژن گورنمنٹ آف انڈیا اولڈ سیکرٹری ایٹ دہلی ۸



کہانی

اشک امرتسری

آؤ سُنائیں ایک کہانی — ایک تھا راجہ ایک تھی رانی
رانی جیسے پریم کا دھارا — راجہ جیسے دھُوپ اندھیارا
رانی جیسے مورِ چمن میں — راجہ جیسے کالا بن میں
رانی جیسے سُکھ کا آنچل — راجہ جیسے دُکھ کی ہلچل
رانی جیسے رنگ حنائی — راجہ جیسے دشتِ قضائی
رانی جیسے ننھی گڑیا — راجہ جیسے بس کی پُڑیا



رانی کٹیا میں دُکھ جھیلے — راجہ محلوں میں ڈنڑ پیلے
رانی بے چاری دُکھیاری — سب کچھ پاکر سب کچھ ہاری
راجہ محنت سے گھبرائے — کھلے کھیلے حکم چلائے
رانی بوئے اور اُگائے — کاٹے چھانٹے ڈھیر لگائے
راجہ لشکر لے کر آئے — لُوٹے لادے اور لے جائے



سن لی تم نے میری کہانی
کہہ دو کون ہیں راجہ رانی
سمجھا سمجھا اشک میں سمجھا — محنت رانی - دولت راجہ

وی۔ سدرشن ریڈی

تندرست رہو

تم نے اکثر بڑے بوڑھوں کو کہتے سُنا ہوگا کہ "تندرستی ہزار نعمت ہے"۔ اس کا صحیح اندازہ تو اس وقت ہوتا ہے جب ہمیں ڈاکٹر کی کڑوی دوائیں پینی پڑتی ہیں اور کھیل کُود اور تفریح کے لئے باہر نکلنا بند ہو جاتا ہے۔ بیماری کے زمانے میں ہمیں یہ اچھی طرح معلوم ہو جاتا ہے کہ زندگی کا سارا لُطف تندرستی ہی کے ساتھ ہے۔

دنیا میں ایک صحت مند قوم ہی ترقی کر سکتی ہے۔ صحت مند بچے ہی بڑے ہو کر اچھے ڈاکٹر، انجنیر، ادیب، سائنس داں، فلاسفر اور لیڈر بن کر نہ صرف اپنے دیس کی بلکہ سارے جگ کی سیوا کرتے ہیں۔ صحت مند دماغ کے لئے صحت مند جسم ضروری ہے۔ دماغی خوبی جسمانی ترقی کے بنا ناممکن ہے — آج ہم تمھیں تندرستی کے متعلق کچھ موٹی موٹی باتیں بتلائیں گے۔ جن کا جاننا ہمارے لئے نہ صرف ضروری ہے بلکہ فائدہ مند بھی ہے۔ غور سے پڑھو۔ اچھی طرح یاد رکھو اور جہاں تک ہو سکے ان پر عمل کرنے کی کوشش کرو۔

تندرستی اور صحت کے لئے اندرونی اور بیرونی صفائی ضروری ہے یہ تو تم نے سُنا ہی ہوگا کہ ہوا میں چھوٹے چھوٹے کیڑے ہوتے ہیں۔

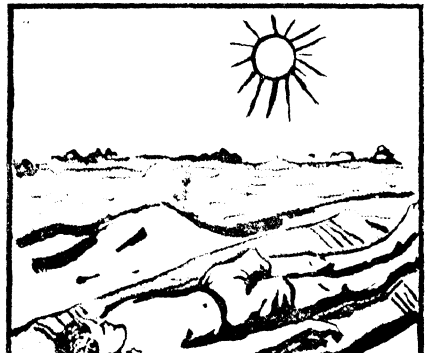


انھیں جراثیم کہتے ہیں۔ یہ اتنے ننھے ننھے ہوتے ہیں کہ ان کو دیکھنا ہماری آنکھوں کے بس میں نہیں ہے۔ یہ اتنے چھوٹے ہوتے ہیں کہ اگر ۲۵ ہزار جراثیم ایک دوسرے سے لگا کر رکھے جائیں تو ان کی لمبائی ایک انچ کے برابر ہوتی ہے۔ انھیں ہم خوردبین سے دیکھ سکتے ہیں۔ خوردبین سے چیزیں اپنی اصلی حالت سے کئی گُنا بڑی نظر آتی ہیں —— ہاں تو جراثیم بعض اچھے ہوتے ہیں اور بعض بُرے۔ اچھے جراثیم ہمارے لئے بعض اچھے اچھے کام کرتے ہیں جیسے دہی کو دہی بناتے ہیں اور انگور، گنے وغیرہ کے رس کو سرکہ میں تبدیل کرتے ہیں۔ بُرے جراثیم انسانوں، جانوروں اور پودوں میں مختلف قسم کی بیماریاں پیدا کرتے ہیں۔ ہیضہ، پلیگ، چیچک وغیرہ انھیں جراثیم کے سبب ہوتا ہے۔ ہر بیماری کے جراثیم الگ الگ ہوتے ہیں۔ بیماری کے جراثیم عام طور پر غلاظت میں چھپے رہتے ہیں۔ یہ مکھیوں پلتے، بڑھتے ہوتے اور بچے پیدا کرتے ہیں اور جب موقع ملے انسانوں، جانوروں اور پودوں پر ہلّہ بول دیتے ہیں۔ ہمارے جسم کے اندر بھی ان جراثیم کا مقابلہ کرنے کے لئے ننھے ننھے سپاہی

ہوتے ہیں - انھیں سفید جیسے کہتے ہیں - جب جراثیم کسی طرح ہمارے جسم میں داخل ہو جاتے ہیں تو ان کا مقابلہ ان سفید جیسوں سے ہوتا ہے سفید جیسے جراثیم کو کھا لیتے ہیں اور اس طرح سب جراثیم جیسوں کے پیٹ میں چلے جاتے ہیں - لیکن کبھی بدقسمتی سے جراثیم بھاری تعداد میں ہلّہ بول دیتے ہیں تو سفید جیسوں کو ہتھیار ڈال دینا پڑتا ہے مگر جب مزید سفید جیسے مدد کے لئے آن پہنچتے ہیں تو جراثیم کو ہار ماننی پڑتی ہے - اگر کبھی جیسوں کو ڈھیٹ جراثیم سے واسطہ پڑے تو پھر جیت بڑی ہی مشکل ہو جاتی ہے -

ہماری بیرونی جلد ہمیں جراثیم کے حملے سے محفوظ رکھتی ہے لیکن مُنہ اور ناک سے گزر کر جراثیم جسم میں داخل ہو ہی جاتے ہیں - پھر بھی ہمارے مُنہ اور ناک کی بناوٹ کچھ ایسی ہے کہ زیادہ جراثیم اندر جانے نہیں پاتے - جب ہم گر پڑتے ہیں یا ہماری جلد کسی اور وجہ سے کٹ پھٹ جاتی ہے تو جراثیم اس زخم میں داخل ہوتے ہیں اور اس کے ذریعے سے جسم میں پہنچ کر خون کو زہریلا کر دیتے ہیں -

دھوپ میں جب ہم باہر جاتے ہیں تو ہمیں پسینہ آ جاتا ہے اور جب یہ پسینہ خشک ہو جاتا ہے تو دُھول اور گرد و غبار کے ذرّے آ کر اس پر جم جاتے ہیں - یہ گرد و غبار کے ذرّے تنہا نہیں ہوتے بلکہ اپنے ساتھ جراثیم کو بھی لاتے ہیں - گھر آنے کے بعد اگر ہم مُنہ ہاتھ پر اچھی طرح نہ دھولیں تو اس گندگی سے بدبُو آنے لگتی ہے - اس گندگی سے صاف ہونے کا آسان طریقہ ہے — صابن اور پانی - ہمیں چاہیئے کہ ہفتے میں کم از کم دو بار نہائیں اور اگر روز نہائیں تو بڑی ہی اچھی بات ہے - نہانے کے لئے صرف ٹھنڈا یا گرم پانی ہی کافی نہیں بلکہ صابن بھی ضروری ہے - چہرہ دھونے کے لئے سوڈے کا صابن مناسب نہیں - اس سے ہمارے چہرے کی جلد نہ صرف لال ہو جاتی ہے بلکہ جلنے بھی لگتی ہے - کھانا کھانے کے بعد دو گھنٹے تک نہیں نہانا چاہیئے ورنہ ہمارے دورانِ خون پر اثر پڑتا ہے جس سے ہمارا ہاضمہ متاثر ہوتا ہے - نہانے کے بعد صاف سُتھرے کپڑے پہننا چاہیئے ہفتے میں کم از کم دو بار کپڑے بدلنا ضروری ہے - اگر ہمارا جسم صاف اور کپڑے صاف سُتھرے ہوں تو ہمیں کبھی اپنے ساتھیوں کے سامنے شرمندہ ہونا نہیں پڑتا - میلے کچیلے کپڑے پہننا صحت کے لیئے ٹھیک نہیں ہے - گندے کپڑوں سے لوگوں کو گھن آتی ہے اور کوئی ہمیں پاس نہیں بٹھاتا - کپڑے موسم کے لحاظ سے پہننا چاہیئے - گرما میں سوتی یا ٹھنڈے کپڑے اور سردیوں میں اُونی' فلالین یا گرم کپڑے پہننا مناسب ہے - سفید' بھورے' نیلے اور بادامی رنگ کے کپڑے ٹھنڈے ہوتے ہیں - ان میں گرمی جذب نہیں ہوتی - سیاہ یا کالے رنگ کے کپڑے اگر بھیگ جائیں تو انھیں فوراً اُتار دینا چاہیئے - کپڑوں پر سیاہی وغیرہ گرا لینا یا ان سے ہاتھ یا ناک صاف کرنا اچھی عادت نہیں ہے - اس سے کپڑے گندے ہو جاتے ہیں - ناک وغیرہ صاف کرنے کے لئے ہمیشہ اپنے ساتھ ایک دستی رکھنی چاہیئے - جب ہم چھینکیں یا



کھانسیں تو رومال مُنہ کے قریب رکھیں تاکہ تھوک کے چھینٹے دوسروں

نہ کریں - دوسروں کا استعمال رومال خود استعمال کرنا یا اپنا استعمال کیا ہوا رومال دوسروں کو دینا صحت کے لئے مضر ہے -

تندرستی کے لئے جسم کے سارے حصّوں کو صاف رکھنا ضروری ہے - بعض لوگ وقت پر ناخن نہیں کاٹتے بلکہ اُنھیں ویسے ہی بڑھنے دیتے ہیں - ناخن اگر کاٹے نہ جائیں تو ان میں میل بھر جاتا ہے اور پھر یہ میل کھانے کے ساتھ ہمارے پیٹ میں پہنچ جاتا ہے - اس کے علاوہ ناخن اگر بڑے ہوں تو انگلیاں بھی خوب صورت نہیں لگتیں - دانتوں سے ناخن کاٹنا بڑی بُری عادت ہے -

اس سے نہ صرف ناخن بدنما ہو جاتے ہیں بلکہ ناخنوں کا میل ہمارے ہونٹوں کو لگتا ہے اور زہریلے جراثیم مُنہ میں داخل ہو جاتے ہیں - پاؤں کے ناخن بھی جوں ہی بڑے ہوں کاٹنا چاہئے ورنہ ٹھوکر کھانے اور گر پڑنے کا ڈر رہتا ہے - پاؤں کی حفاظت کے لئے جُوتے بھی ضروری ہیں - یہ نہ زیادہ تنگ ہوں نہ زیادہ ڈھیلے گھر آکر جب ہم جوتے اُتار دیتے ہیں تو انھیں ایسی جگہ رکھیں جہاں ہوا آسانی سے ان جوتوں میں جا سکے -

بال :- بال زیادہ بڑے نہ رکھنا چاہئے - لانبے بالوں سے ہماری شکل و صورت بھی بھلی نہیں لگتی - بالوں میں تیل ڈالنے اور روزانہ کنگھی کرنے سے نہ صرف بکھرے ہوئے بال جم جاتے ہیں بلکہ چلتے پھرتے وقت جو دُھول اور گرد و غبار کے چھوٹے چھوٹے ذرّے آکر ہمارے بالوں میں جم جاتے ہیں وہ بھی نکل جاتے ہیں - جب ہم بال کٹوانے جائیں تو حجام کے اوزار کو اچھی طرح دیکھ لیں کہ وہ صاف ہیں یا نہیں - بعض حجام اوزار صاف نہیں رکھتے بلکہ ایک آدمی کی حجامت بنانے کے بعد دوسرے آدمی کے لئے وہی اوزار بغیر صاف کئے استعمال کرتے ہیں -

کان :- سننے کے لئے ہمارے پاس دو کان ہیں جو لاؤڈ اسپیکر یا گراموفون کے ساؤنڈ بکس کی طرح کام کرتے ہیں - کان بڑے نازک ہوتے ہیں - اگر ان میں میل جمع ہو جائے تو کان ڈوئی سے نکال لیں یا دواخانہ چلے جائیں - پنسل کی نوک یا کسی اور تیز چیز کو کان میں ڈالنا خطرناک ہے - اس سے کان کے نازک پردے پھٹ جانے کا خطرہ رہتا ہے - اگر کان میں کوئی کیڑا گھس جائے تو تیل ڈال دینا چاہیئے - اس طرح کیڑا باہر نکل آئے گا - کان پر یا کان کے قریب مذاق، دل لگی یا غصّے سے ہرگز گھونسہ یا تھپڑ نہیں مارنا چاہیئے اس سے کان کا نازک پردہ پھٹ جاتا ہے - جس سے ہم بہرے ہو جاتے ہیں - گندی اور غلیظ ہوا میں سانس لینے سے بھی کانوں پر بُرا اثر پڑتا ہے -

دانت :- دانتوں کا فائدہ کیا ہے ؟ یہ تو ہمیں اپنے پوپلے دادا جان سے معلوم ہو گا - اگر ہمارے اگلے دانت نہ ہوں تو ہم ٹھیک طرح سے الفاظ ادا نہیں کر سکتے اور پچھلے دانتوں کے بنا تو ہم اپنی غذا اچھی طرح چبا ہی نہیں سکتے - اچھے دانتوں سے ہم اپنی غذا اچھی



طرح چبا سکتے ہیں اور اچھی طرح چبائی ہوئی غذا اچھی طرح ہضم ہوتی ہے - اور اگر غذا اچھی طرح ہضم ہو تو اس سے ہمارے جسم کو وہ تمام چیزیں مل جاتی ہیں جن سے کہ ہماری صحت بنتی ہے - روزانہ صبح کسی اچھے منجن یا نیم کی کاڑی سے دانتوں اور خاص کر دو دانتوں کی بیچ کی جگہ کو اچھی طرح صاف کرنا ضروری ہے - کھانا کھانے کے بعد کُلّیاں کر کے دانتوں کو اچھی طرح صاف کرنا چاہئے تاکہ کھانے

کے ذرّے جو دانتوں کے بیچ میں رہ جاتے ہیں باہر نکل سکیں۔ ورنہ یہ ذرّے وہیں پڑے پڑے سڑ جائیں گے اور ان میں جراثیم پیدا ہو کر ہمارے دانتوں کا ناش کر دیں گے۔ دانتوں کی حفاظت کے لئے راستہ دیکھ سنبھل کر چلنا بھی ضروری ہے۔ بعض اوقات ٹھوکر لگنے سے ہم مُنہ کے بل گر پڑتے ہیں۔ جس سے دانتوں کے ٹوٹ جانے کا خطرہ رہتا ہے۔

آنکھیں :- آنکھیں بہت بڑی نعمت ہیں۔ اگر ہم قدرت کی اس نعمت سے لاپروائی برتیں تو بہت جلد ہماری آنکھوں میں کوئی نہ کوئی خرابی پیدا ہو جائے گی۔ ہمیں آنکھوں کی حفاظت کا ہمیشہ خیال رکھنا چاہیئے۔ لکھنے پڑھنے وغیرہ کا کام اچھی روشنی میں کرنا چاہیئے۔ ٹمٹماتے چراغ یا دھیمی روشنی میں لکھنے پڑھنے یا کوئی اور باریک کام کرنے سے آنکھوں پر بار پڑتا ہے۔ اسی طرح چکاچوند کرنے والی روشنی سے بھی آنکھوں کو نقصان پہنچتا ہے۔ لکھتے پڑھتے وقت زیادہ جُھکنا ہماری پیٹھ اور آنکھوں دونوں کے لئے نقصان دہ ہے۔ پڑھتے وقت کتاب آنکھوں سے نہ زیادہ دُور رہے نہ زیادہ قریب۔ کتاب آنکھوں سے ایک فٹ کے فاصلے پر رہے تو اچھا ہے۔ لیٹ کر پڑھنے یا کسی چلتی گاڑی میں بیٹھ کر پڑھنے سے بھی آنکھوں پر بُرا اثر پڑتا ہے۔ باریک حروف میں چھپی ہوئی کتاب پڑھنے سے بھی آنکھوں پر بار پڑتا ہے۔ سینما ہال میں پردے سے قریب بیٹھنا یا جس طرف سے روشنی آتی ہے اس طرف بیٹھنا آنکھوں کے لئے مضر ہے۔ پردے سے ہم جتنی دُور بیٹھیں اتنا اچھا ہے۔ خطرناک کھیلوں سے آنکھوں کے پھوٹ جانے کا ڈر لگا رہتا ہے۔ اس لئے ایسے کھیلوں سے ہمیں بچنا چاہیئے جن سے آنکھوں کو خطرہ ہو۔ بعض شریر بچے ایک دوسرے پر پتھر مارتے ہیں۔ ایسا نہیں کرنا چاہیئے کیوں کہ اگر ایک چھوٹا سا کنکر بھی آنکھ میں لگ جائے تو ہم ہمیشہ کے لئے اندھے ہو جاتے ہیں۔ بازار میں بغیر امتحان کی ہوئی جو سستی عینکیں بکتی ہیں۔ ان کے استعمال سے بھی آنکھیں خراب ہو جاتی ہیں۔ محض شوق میں آکر ہمیں ایسی عینکیں نہیں پہننی چاہئیں۔

جب ہماری آنکھوں میں کوئی خرابی ہو تو فوراً کسی تجربہ کار ڈاکٹر کے پاس جا کر مشورہ لیں۔ آنکھوں کے معاملے میں ہرگز ناتجربہ کار لوگوں کی باتیں سُن کر ان کی کہی ہوئی دوائیں نہیں آزمانا چاہیئے۔

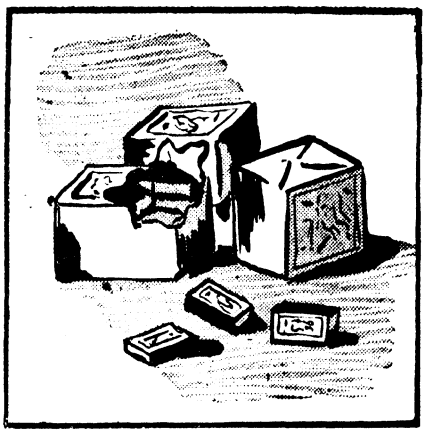




شارق علی تھلواروی

دیا سلائی

زمانہ قدیم میں پتھروں اور خشک لکڑی کے ٹکڑوں کو رگڑ کر ان کے قریب سوکھی ہوئی گھاس پھوس رکھتے تھے تاکہ وہ آگ پکڑ لیں بعد کو لکڑی کی جگہ لوہے اور گندھک کے مرکب نے لے لی جو لوہے پر رگڑا جاتا تھا۔ دیا سلائی کی تاریخ میں یہ پتھر اور لوہے لکڑی کا زمانہ اٹھارویں صدی کے اختتام تک رہا۔ پتھر لوہے اور گندھک میں ڈوبی ہوئی لکڑی کی چھوٹی چھوٹی تیلیاں آگ حاصل کرنے کے لئے عام تھیں۔ پتھر اور لوہے کی رگڑ سے پیدا شدہ چنگاری گندھک سے مل کر آگ پیدا کرتی تھی۔



سب سے پہلے ۱۸۰۶ء میں جینسل نے کیمیائی دیا سلائیاں رائج کیں۔ یہ دیا سلائی لکڑی کی تیلیوں کی نوک کو گندھک میں ڈبو کر اوپر سے پوٹیشیم کلوریٹ اور شکر کے شیرے کی لیپ کرنے سے بنتی تھی۔ اس تیلی کو گندھک کے تیزاب میں ڈبونے سے تیزاب اور تیلی میں لگے ہوئے پوٹیشیم میں کیمیائی عمل ہوتا تھا جس کی وجہ سے تیلی میں لگی ہوئی گندھک اور شکر جل اٹھتے تھے۔

۱۸۰۹ء سے ۱۸۲۳ء تک فاسفورس سے آگ پیدا کرنے کی کوششیں ہوتی رہیں ۱۸۲۳ء ڈوبرینر نامی سائنسدان نے ہائیڈروجن کی اس خاصیت سے کہ وہ آکسیجن گیس کی موجودگی میں جب پلٹینیم سے ملتی ہے تو جلنے لگتی ہے فائدہ اٹھاتے ہوئے ایک لیمپ ایجاد کیا جس کا نام دوبرینر لیمپ ہے۔

۱۸۲۷ء میں جان واکر نے رگڑنے والی دیا سلائی بنائی اس کی تیلیاں اینٹیمنی سلفائیڈ اور پوٹیشیم کلوریٹ میں ڈبوئی جاتی تھیں اس کے بعد انھیں پتھریلے کاغذ پر رگڑ کر آگ پیدا کرتے تھے۔

اس کے بعد فاسفورس کا استعمال شروع ہوا۔ تیلی کو گندھک اور پیرافین میں ڈبونے کے بعد اس پر فاسفورس میگنیز ڈائی آکسائیڈ اور سرخ کا لیپ کرتے تھے۔ سفید فاسفورس کے مضر اثرات کی وجہ سے اس کی جگہ لال فاسفورس اور فاسفورس ٹرائی سلفائیڈ استعمال کیا جانے لگا۔

دیا سلائی کو تین قسموں میں بانٹا جا سکتا ہے

۱۔ رگڑنے والی

۲۔ رگڑنے والی محفوظ سیفٹی دیا سلائی

۳۔ محفوظ سیفٹی دیا سلائی

اب ہم الگ الگ ہر دیا سلائی کی کیمیا پر روشنی ڈالیں گے

رگڑنے والی دیا سلائی :۔

½ انچ تیلی کو پہلے کسی آگ پکڑنے والی چیز جیسے گندھک یا پیرافین میں ڈبوتے ہیں تب تیلی کے ایک سرے کو اینٹیمنی ٹرائی سلفائیڈ، سفید فاسفورس، پوٹیشیم کلوریٹ، لال سیسہ، چاک یا شیشے کے سفوف اور سریش سے بنے ہوئے مرکب کا لیپ کر دیتے ہیں۔ لیپ جب سوکھ جاتا ہے تو اس کے اوپر موم کی ایک ہلکی تہ جما دیتے ہیں تاکہ محفوظ رہے اور معمولی رگڑ سے جل نہ اٹھے۔ سریش اور بالو کے مرکب کو یا کسی دوسری کھردری چیز کو ڈبیہ کی دیواروں پر پوت دیتے ہیں اس پر جب تیلیاں رگڑی جاتی ہیں تو آگ پیدا ہوتی ہے اور تیلی جلنے لگتی ہے۔

رگڑنے والی محفوظ دیا سلائی :۔

فیکٹری میں کام کرنے والے مزدوروں کو اکثر "رگڑنے والی دیا سلائی" بنانے میں سفید فاسفورس کے استعمال سے نقصان پہنچتا ہے۔ انھیں ایک ایسی بیماری ہو جاتی ہے جس میں جبڑے کی ہڈی کو نقصان پہنچتا ہے اسی وجہ سے سفید فاسفورس کا استعمال قانوناً ممنوع قرار دیا گیا اور سیفٹی دیا سلائی میں اس کے عوض فاسفورس ٹرائی سلفائیڈ استعمال کی جانے لگی اور بقیہ چیزیں بالکل "رگڑنے والی دیا سلائی کی رہیں

محفوظ یا سیفٹی دیا سلائی :۔

"رگڑنے والی" اور "رگڑنے والی محفوظ" دیا سلائیوں سے اکثر معمولی رگڑ لگ جانے سے ہی آگ لگنے کے واقعات پیش آئے جس کی وجہ سے ان دیا سلائیوں کو خطرناک سمجھ کر "محفوظ دیا سلائی" کی ایجاد کی گئی۔

اس میں فاسفورس یا اس کے کسی بھی مرکب کو استعمال میں نہیں لاتے اور بقیہ لیپ پہلے کی دیا سلائیوں کی طرح ہی بنا کر تیلیوں پر لگا دیتے ہیں۔ ان تیلیوں کو رگڑنے کے لئے دیا سلائی کی ڈبیہ کی دیواروں پر ۹ حصے فاسفورس، ۲ حصے لوہے اور گندھک کا مرکب یعنی فیرس سلفائیڈ، تین حصے شیشے کے ذرات اور ایک حصہ سریش کا لیپ بنا کر لگاتے ہیں۔ جب تیلی اس پر رگڑی جاتی ہے تو ڈبیہ کے لال فاسفورس میں چنگاری پیدا ہوتی ہے جو تیلی میں لگی ہوئی اینٹیمنی سلفائیڈ میں لگ کر اسے جلاتی ہے اس سے گندھک جلنے لگتا ہے اور لکڑی یعنی تیلی آگ پکڑ لیتی ہے۔

آج کل دیا سلائی بنانے کے لئے اعلیٰ قسم کی مشینیں کام میں لائی جاتی ہیں۔ جن سے لکڑی کی کٹائی سے لے کر ڈبیہ میں تیلیوں کے بھر جانے تک کا کام خود بخود ہو جاتا ہے۔ سنبھل یا آم کی خشک لکڑی کی مناسب لمبائی کی تیلیوں کو مشین میں رکھتے ہیں برابر لمبائی کی تیلیاں کٹتی جاتی ہیں اور ان پر لیپ ہو کر وہ ایک چیمبر میں جاتی ہیں جہاں ان پر سے گرم ہوا گزارتے ہیں جس سے بالکل خشک ہو جائیں۔ اور اس طرح ڈبیوں میں بھر کر یہ ہم تک پہنچتی ہیں۔

نصیحت

جھوٹ مت بولو کہ جھوٹا آدمی ہوتا ہے خوار — کوئی اس کے سچ کا بھی کرتا نہیں پھر اعتبار

آبرو چاہو تو مت کھاؤ کبھی جھوٹی قسم — ورنہ کھو بیٹھو گے آخر کار تم اپنا بھرم

عشرت صدیقی

شہباز اور کوّا

آج سے بہت سال قبل شہباز اور کوّے میں بڑی دوستی تھی۔ ایک مرتبہ شہباز نے کوّے سے کہا۔ دوست تم سینکڑوں سال زندہ رہتے ہو اور میں تھوڑی ہی مُدّت تک جیتا ہوں۔ کیا یہ تعجب کی بات نہیں؟ ذرا یہ بھی تو خیال کرو کہ تم کتنے چھوٹے اور کمزور ہو اور میں کتنا لمبا چوڑا اور قوی ہوں کیا یہ خدا کی سراسر بے انصافی نہیں"؟

کوّا ہنس کر بولا "دوست اس میں تعجب کی کوئی وجہ نہیں۔ یہ تو صاف ظاہر ہے کہ تم زندوں کا خون پیتے ہو اور میں مُردوں کو کھاتا ہوں۔

کوّے کی بات سُن کر شہباز نے سوچا۔ کیوں نہ میں بھی کوّے کی طرح مُردوں کو کھانا شروع کر دوں۔ تاکہ میں بھی اسی کی طرح کافی مدّت تک زندہ رہ سکوں۔ یہ سوچ کر وہ کوّے کے ساتھ ہو لیا۔ دونوں ساتھ ساتھ اُڑتے رہے۔ آخر اُڑتے اُڑتے انہیں ایک گھوڑے کی لاش جنگل میں نظر آئی۔ جس کا گوشت بہت حد تک جنگلی جانور نوچ چکے تھے۔ اب محض ہڈیوں کا ڈھانچہ باقی رہ گیا تھا۔ دونوں نیچے اُتر کر اس پر بیٹھ گئے۔ کوّے نے لاش پر بیٹھ کر چونچ ماری۔ اور خوشی سے چلّا کر بولا۔ "واہ! واہ! کتنا مزیدار گوشت ہے"۔ اور وہ مزے لے لے کر کھانے لگا۔ کوّے کی زبانی اس کی تعریف سُن کر شہباز نے اپنی عادت کے



مطابق جھپٹا مار کر چونچ ماری۔ پھر وہ نفرت سے پر پھڑپھڑا کر بولا۔ بھائی کوّے یہ سڑا گلا گوشت تمھیں کو مُبارک ہو۔ اسے کھا کر لمبی مُدّت تک زندہ رہنے کی بجائے میں صرف ایک بار تازہ خُون پی کر مرجانا پسند کروں گا"۔ اور یہ کہہ کر وہ اُڑ گیا۔

لطیفے

سکاؤٹ ماسٹر۔ اگر تمھیں فوراً ہسپتال پہنچنا ہو تو تم کیا کرو گے؟

سکاؤٹ۔ جناب کھڑکی سے چھلانگ ماروں گا تاکہ مجھے تانگے پر فوراً ہسپتال پہنچایا جائے

اُستاد۔ اکتالیس کے کتنے ہندسے ہوتے ہیں؟

لڑکا۔ پانچ۔

اُستاد۔ وہ کس طرح؟

لڑکا۔ ایک اور چار، پانچ ہی تو ہوتے ہیں۔ (ع۔ ح۔ ظہور)

آقا۔ کیوں بھئی یہ ٹائر کیسے پھٹا؟

ڈرائیور۔ ایک بوتل پہیے تلے آگئی تھی

آقا۔ تو تم اندھے تھے بوتل دیکھ نہ سکے۔

ڈرائیور۔ صاحب بوتل ایک آدمی کی جیب میں تھی۔

آج کل

Osmania University Library

جولائی ۱۹۵۴ء

آٹھ آنے



دِن بہ دِن
زیادہ ملایم زیادہ
دِلکش جِلد



کیڈِل آمیز رکسونا
آپ کے لئے بھی
یہ کمال کرے گا

اپنی جِلد پر رکسونا کا کیڈِل آمیز جھاگ نرمی
سے مَلئے، پھر دھو ڈالئے، آپ محسوس کریں گی کہ
آپ کی جِلد دِن بہ دِن زیادہ نرم و ملایم ہوتی جارہی
ہے اور آپ کا حُسن نکھر رہا ہے۔

رکسونا

کیڈِل آمیز واحد صابن

* کیڈِل جِلد کو ملایم اور مقوی کرنے والے
تیلوں کے ایک خاص مرکب کا مکیتی نام ہے

RP. 121-X62 UD.

رکسونا پروپرائٹری لمیٹیڈ کیلئے ہندوستان میں بنایا گیا

میرا جی چاہا میں رات بھر ناچتی رہوں . . .



پردہ گرتے ہی جب ہال تالیوں سے گونج اٹھا تو میری خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا اور جب ہر کوئی میرے ناچ کی تعریف کرنے لگا تو میرا جی چاہا کہ میں رات بھر ناچتی رہوں۔ جب تالیوں نے پہلے انعام کا اعلان میرے حق میں کیا اور میں اپنا سنہری تمغہ لینے سٹیج پر آئی تو وہ گویا میری خوشی کی معراج تھی۔ سب سے پہلے میرے استاد صاحب نے مجھے مبارک دی۔ بڑے فخر سے انہوں نے میری امّی سے کہا: "آج اسے دیکھ کر کون کہہ سکتا ہے کہ یہ وہی دُبلی پتلی لڑکی ہے، جسے دو برس پہلے میں نے ناچ سکھانا شروع کیا تھا۔" امّی مارے خوشی کے کچھ کہہ نہ سکیں۔

استاد صاحب کا کہنا حرف بہ حرف درست تھا۔ دو برس پہلے میری حالت یہ تھی کہ اگر پندرہ منٹ بھی ناچتی تو تھکاوٹ سے سانس لینا دشوار ہو جاتا۔ آخر کار امّی کو ڈاکٹر سے مشورہ کرنا پڑا۔ ڈاکٹر نے مکمل معائنے کے بعد کہا۔ "گھبرانے کی کوئی بات نہیں، البتہ اسکے کھانے پینے کی طرف توجہ لازمی ہے اسکی غذا باقاعدہ اور متوازن ہونا چاہیے، جس میں وٹامن، پروٹین، کاربوہائیڈریٹ، معدنیات کے علاوہ چکنائیوں کا خاص طور پر خیال رکھا جائے۔ خالص اور تازہ چکنائی ہماری روزانہ خوراک کا ایک اہم جزو ہے کیونکہ ہمیں روزمرہ کے پہلے جو قوت درکار ہے اسے مہیا کرنے میں مدد دیتی ہے۔

اسی دن امّی نے دُکان پر جا کر دُکاندار سے کہا: "مجھے کھانا پکانے کی وہی چکنائی چاہیے جو دو تین دن پہلے آپ نے دی تھی۔ اچھی ہو۔" سُنتے ہی دوکاندار نے ڈالڈا وناسپتی کا ایک ڈبہ اٹھا لایا اور کہنے لگا۔ "اس سے بہتر شے آپکو ملنے سے رہی۔" جب میں نے ڈالڈا میں پکا کھانا شروع کیا تو میری بھوک بڑھ جانے لگی، کیونکہ ڈالڈا وناسپتی ہر قسم کے کھانے کو ازحد لذیذ اور خوش ذائقہ بنا دیتا ہے۔ کچھ دنوں کے بعد تھکاوٹ کا وہ ناگوار احساس بھی جاتا رہا اور کچھ ہی عرصے کے بعد میں تین تین گھنٹے ناچ کی مشق کرنے لگی۔ قوت کھانے کو ڈالڈا وناسپتی سے بہتر کوئی شے نہیں، ڈالڈا وناسپتی میں اب وٹامن 'اے' اور 'ڈی' شامل ہیں۔ اور کیمیات کا آپ یقین رکھئے کہ یہ ہزار درک مہر بند ڈبوں میں ہمیشہ خالص، تازہ اور صحت بخش ہوتا ہے، اور اسمیں کفایت بھی بہت رہتی ہے۔ آپ بھی اپنے گھر میں ڈالڈا وناسپتی استعمال کرنا شروع کر دیجئے اور آج ہی ایک ڈبہ خرید لائیے۔



بہ درخت دیکھ کر ڈبہ خریدیئے

مقوی غذا کی اہمیت
آج ہی مفت صلاح کیلئے اس پتہ پر لکھئے۔
دی ڈالڈا ایڈوائزری سروس
پوسٹ بکس نمبر ۳۵۳، بمبئی ۱

ڈش، پاؤنڈ، ڈبہ اور ایک پونڈ کے ڈبوں میں دستیاب ہے

ڈالڈا وناسپتی

پکانے میں بہتر — کم خرچ

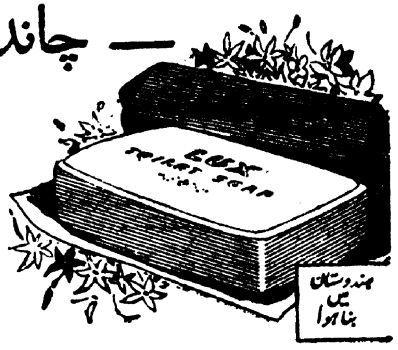
EVM. 816-XMUD

"کتنا سفید — کتنا خالص —

لکس ٹائلیٹ صابن کا جھاگ

کتنا ملایم اور خوشبودار ہے"

— چاند عثمانی



ہندوستان میں بنا ہوا



اس سفید اور خالص صابن کے روزانہ استعمال سے اپنی جلد صاف و اسکی رنگت پر شباب رکھئے۔ چاند عثمانی کہتی ہیں: "جلد ریشم جیسی ملایم اور خوبصورت رکھنے کیلئے لکس ٹائلیٹ صابن کے ملایم خوشبودار جھاگ جیسی کوئی چیز نہیں۔ اس سے آپکا قدرتی حسن نکھر آتا ہے اور اسکی فرحت بخش خوشبو پہ آپ فدا ہو جائیں گی!"

"یہی وجہ ہے کہ اپنی جلد خوبصورت رکھنے کے لئے میں لکس ٹائلیٹ صابن استعمال کرتی ہوں"

خاص اطلاع

نیا بڑا سائز

سراپا حسن کے لئے

آج ہی دستیاب ہے

فلمی ستاروں کا حسن صابن

اُردو کا مقبول عوام مصور ماہنامہ

آج کل

دہلی

ایڈیٹر:- جوش ملیح آبادی

اسسٹنٹ ایڈیٹر:- بال مکند عرش ملسیانی

جلد ۱۲ ——— نمبر ۱۲

سالانہ چندہ:- ہندوستان میں:- چھ رُپے / پاکستان میں:- چھ رُپے

غیر ممالک سے:- ——— نوشلنگ یا ایک ڈالر

فی پرچہ:- ہندوستان میں:- آٹھ آنے / پاکستان میں:- آٹھ آنے

جولائی ۱۹۵۴ء

ترتیب

ہے کہ نہیں	جوش ملسیانی	۴
فن کاروں کی ناداری	ظفر عالمگیر	۵
مولوی محمد یحییٰ تنہا کے خطوط	محمد بشیر الحق دھنوی عظیم آبادی	۱۲
عہدِ نو	علی منظور	۱۵
صنعتِ بیدی	تپش حیدر آبادی	۱۶
روس کے چشم دید حالات	مدن موہن اٹل	۲۲
طلوعِ کل	منور لکھنوی	۲۹
رضیہ	رام پرکاش بینی پوری	۳۰
تلاشِ سحر	بیشم ملیح آبادی	۳۵
ہندوستان اور کوریا	محمد جمیل الدین محمود	۳۶
غنچہ لیں	دعا ڈبائیوی / شفیق جونپوری	۴۳
نئی کتابیں اور رسالے	ع-م	۴۴
قومی پلان کے لئے قرضہ		۴۷
بھارت میں جدید اخبار نویسی کا آغاز		۴۹
رفتارِ زمانہ		۵۰

بچوں کا آج کل

گرمیاں آگئیں	جگن ناتھ آزاد	۵۳
انوکھے دوست	قمر اریاں	۵۴
لطیفے	——	۵۷
کسان کی سوجھ	کہنیا لال	۵۸
چمن چمن کے پھول	نعیم کوثر	۶۰

سرورق ۔ فصل کٹائی کا ناچ

پبلیکیشنز ڈویژن پوسٹ بکس ۲۰۱۱ دہلی

جوش ملیسیانی

ہے کہ نہیں

پوچھتا ہوں کہ تمھیں پاسِ وفا ہے کہ نہیں
کچھ کہو بھی جو کہا میں نے سُنا ہے کہ نہیں

دَیر سے کعبے کو جاتا ہوں یہ مقصد لے کر
دیکھ آؤں کہیں میرا بھی خدا ہے کہ نہیں

کہہ چکا قصّۂ غم ان سے تو پوچھا میں نے
ایک دُکھّے ہوئے دل کی یہ صدا ہے کہ نہیں

آپ نے اور سزاؤں سے تو انکار کیا
بے رُخی میری محبّت کی سزا ہے کہ نہیں

اے صبا تو نے چمن کی تو سُنائی روداد
آشیانے کا بھی کچھ حال بتا ہے کہ نہیں

اس زمانے میں تو رہ زن ہی سے پوچھو یہ بات
بھولے بھٹکوں کا کوئی راہ نما ہے کہ نہیں

تھک گئے ڈھونڈ کر انصاف کو سب فریادی
جس سے پوچھا ہے کہ ہے اس نے کہا ہے کہ نہیں

خوفِ دُنیا کا تو ہوگا مجھے کیا اس سے غرض
میں تو یہ پوچھتا ہوں خوفِ خدا ہے کہ نہیں

چارہ گر ایک نیا روگ ہُوا جاتا ہے
اس مرض کی بھی کتابوں میں دوا ہے کہ نہیں

میرے احباب بھی اب پوچھ رہے ہیں مجھ سے
تجھ کو انعامِ محبّت کا ملا ہے کہ نہیں

غم دئے رنج دئے تم کو خدا نے اے جوش
پھر بھی یہ پوچھ رہے ہو کہ خدا ہے کہ نہیں

ظفر عالمگیر

فن کاروں کی ناداری

عجیب و غریب طرز کا صاحب قلم اسکاٹ ڈسرائیلی علماء کی ناداری کے متعلق لکھتا ہے کہ

قسمت شاذ و نادر ہی قابل افسراد کی ہمرکاب رہی ہے، دوسروں کو اس کے محل تک سیکڑوں راستے مل جاتے ہیں لیکن علماء کے لئے صرف ایک راستہ ہے جو کسی قدر اُلجھا ہوا ہے .....

اس متمدن اور مہذب زمانے میں بھی کئی ہیں جو گمنامی کے اندھیروں میں بسے ہوئے ہیں لیکن ان کی شہرت دُور دُور تک پھیلی ہوئی ہے علمی عالم ہی میں اپنی ہے لیکن ان کی تصانیف کتب فروشوں کو فائدہ پہنچاتی رہیں۔"

ڈسرائیلی نے ایک بڑی تلخ حقیقت کو فاش کیا ہے اور آج بھی جب کہ اس فن کار کو گذرے ایک صدی سے زیادہ مدت گزر چکی اور دنیا نے تہذیب و تمدن کے کئی زینے اور طے کر لئے ہیں یہ حقیقت حال کے دامن سے ناپید نہ ہو سکی کتنے پھول ہیں جو زندگی کے گلستان میں تیز کانٹوں کے درمیان کھلا کر رہ جاتے ہیں۔ کتنے صنم ہیں جو چٹانوں میں دھڑکتے رہ گئے کتنے ماہ پارے تاریکیوں کی آغوش میں دم توڑ گئے۔ ماضی کے ان فن کاروں کی ناداری کی دردناک کہانیں آج ہمارے حوصلے بڑھاتی ہیں اور ہماری امیدوں کے گرتے ہوئے محلوں کا سہارا بن جاتی ہیں۔

غالب — جس کی عظمت کا ستارہ وقت کے ساتھ ساتھ روشن سے روشن تر ہوتا جائے گا، ساری زندگی پھولوں میں نہ بسر کر سکا بلکہ اُسے بھی ناداری کے کانٹوں سے اُلجھ کر بارگاہِ شاہی کو یوں خطاب کرنا پڑا

"آپ کا بندہ اور پھروں ننگا!
آپ کا نوکر اور کھاؤں اُدھار
میری تنخواہ کیجیے ماہ بہ ماہ
تا نہ ہو مجھ کو زندگی دشوار"

اپنے وقت کے بے نظیر انشا پرداز غلام غوث بے خبر کو غالب نے ایک مکتوب لکھتے ہوئے اپنی ناداری پر آنسو بہائے تھے:۔

"قبلہ کبھی آپ کو یہ بھی خیال آتا ہے کہ کوئی ہمارا دوست غالب کہلاتا ہے، وہ کیا کھاتا پیتا ہے اور کیوں کر جیتا ہے؟ پنشن قدیم اکیس مہینے سے بند! اس پنشن کا اجرا پنجاب کے حکام پر مدار ہے سو اُن کا یہ شیوہ اور شعار ہے کہ نہ روپے دیتے ہیں نہ جواب، نہ مہربانی کرتے ہیں نہ خفا ہیں"

اسی ناداری نے غالب کو مجبور کیا تھا کہ رام پور کی خاک چھانیں — محمد رفیع سودا جیسے مسلم الثبوت اُستاد کو ناداری اور قدر دانوں کی کمی کی بنا پر دلی کو خیرباد کہنا پڑا تھا۔ میر تقی میر کے سوا کسی اور شاعر کو یہ فخر نصیب نہ ہو سکا کہ اس کی غزلیں بطور تحفہ ایک شہر سے دوسرے شہر کو مسافر لے کر پھریں۔ لیکن یہی غزل کا شہنشاہ میر ساری عمر پریشاں حال ہی رہا۔ مغرب سے جب شرارے اڈے اور مغل خاندان کے اقتدار کا گلستاں جل اُٹھا تو میر کی زندگی میں خوش حالی کے رہے سہے پھول بھی خاکستر ہو گئے۔ اُردو ادب کے خزانے میں جو موتی میر اپنی یادگار چھوڑ گئے وہ دراصل اُس خدائے غزل کے آنسو ہیں جو حسرتوں اور ناکامیوں کے کچوکے کھا کر مایوس آنکھوں نے زندگی کے کھنڈروں پر بہائے ہیں — میر حسرت لے کر زندہ رہے اور حسرت لے کر چل بسے

"کہیں کیا جو پوچھے کوئی ہم سے میر
جہاں میں تم آئے تھے کیا کر چلے"

عظیم المرتبت شاعر انشا اللہ خاں انشا نے مرشد آباد کو خیرباد کہا اور دلی میں قدم جمائے۔ پھر دلی سے لبسر اُٹھایا اور لکھنؤ میں لا بسایا۔ انشا کی پریشاں حالی نے غریب الوطنی کا روپ دھارا۔ استدراک زمانہ ہی نہیں بلکہ اپنوں کے ہاتھوں اتنے صدمے اُٹھائے کہ پکار اُٹھے۔

"دیکھیرا نے تخت بارِ سبا ری راہ تک اپنی
تجھے اٹھیلیاں سوجھی ہیں ہم بے زار بیٹھے ہیں
بھلا گردش فلک کی چین دیتی ہے کسے انشا
غنیمت ہے کہ ہم صورت یہاں دو چار بیٹھے ہیں"

انشا نے ایک مشاعرے میں اپنی یہ غزل سنائی تھی تو جسم پر میلی کچیلی مرزئی تھی، سر پر میلا سا عمامہ تھا۔ غزل سنانے سے کچھ دیر پہلے انشا جس حال میں آئے اور غزل سنا کر چلے گئے، میاں رنگین کی زبانی یہ سب حال سن کر افسوس کے آنسو بہہ نکلتے ہیں۔

انشا کی زندگی کے اس واقعے کا نفسیاتی تجزیہ کریں تو اندازہ ہوگا کہ ان کی زندگی بلکہ ایک ایک سانس ان کے لئے کس قدر سوہانِ روح تھا۔ اس واقعے کے بعد میاں رنگین ایک بار لکھنؤ گئے، اور انشا کے مکان پر پہنچے، بیان کرتے ہیں:-

"افسوس جس دروازے پر ہاتھی جھومتے تھے وہاں دیکھا کہ خاک اڑتی ہے اور کتے لوٹتے ہیں ..... اندر گیا، دیکھا کہ ایک کونے میں بیٹھے ہیں، تن پر سینہ ہے، دونوں زانوں پر سر دھرا ہے، آگے راکھ کے ڈھیر ہیں، ایک ٹوٹا سا حقہ پاس دکھا ہے، یا تو وہ شان و شکوہ کے جمگھٹ دیکھے تھے یا وہ گرمجوشی اور چہلوں کی ملاقاتیں ہوتی تھیں یہ حالت دیکھی، بے اختیار دل بھر آیا .... میں نے پکارا ... سر اٹھا کر اس نظرِ حسرت سے دیکھا جو کہتی تھی کہ کیا کروں آنکھ میں آنسو نہیں۔" (آبِ حیات صفحہ ۲۷۲)

سعادت یار خاں رنگین کا بیان پڑھ کر یہی اندازہ ہوتا ہے کہ اردو شاعری کے اساتذہ میں جو حال انشا کا ہوا، وہ کسی کا نہ ہوا۔ انشا کے ہم عصروں نے ایسی کروٹ لی کہ ان کا زوال، ان کی حسرت اور ناداری افسانوی رنگ اختیار کر لیتی ہے ـــ کسی اور شاعر کی زندگی نے اتنے ڈرامائی انداز میں ایسی کروٹ نہیں لی۔

انشا کے ہم عصر اور ان کے ہنگامہ پرور حریف مصحفی نے بھی فارغ البال زندگی بسر نہ کی۔ کہا جاتا ہے کہ:-

"عین مشاعرہ کے دن لوگ آتے، آٹھ آنے سے ایک پیسہ تک اور جہاں تک کسی کا شوق مدد کرتا۔ وہ دیتا، یہ غزل نکال کر حوالے کر دیتے، ان کے نام کا قطع کر دیتے.....
سب کو دے دے کر جو کچھ بچتا وہ خود لیتے اور اس میں لون مرچ لگا کر مشاعرہ میں پڑھ دیتے ـــ" بعد میں ـــ "یہ عقدہ کھلا کہ ان کی غزلیں بکتی ہیں، اچھے اچھے شعر تو لوگ مول لے جاتے ہیں جو رہ جاتے ہیں وہ ان کے حصے میں آتے ہیں"۔
(آبِ حیات صفحہ ۲۹۱)

اردو شاعری کے زریں دور کی آخری یادگار امیر مینائی لکھنؤ اجڑنے کے بعد تباہ ہو کر رام پور پہنچے، نواب کلب علی خاں کی دریا دلی اور سرپرستی پائی لیکن نواب صاحب کی وفات کے بعد امیر ایک بار پھر اسی مصیبت کا شکار ہوئے جس مصیبت سے وہ لکھنؤ تباہ ہونے پر دوچار ہوئے تھے۔ حضورِ نظام نے انھیں حیدرآباد بلایا اور امیر نے یہ کہہ کر رختِ سفر باندھا کہ

"اب نہ ٹھہروں جو کرے میری خوشامد بھی وطن
کر پکارا ہے غریب الوطنی نے مجھ کو"

اور حیدرآباد پہنچے تھے کہ یہ سفر عدم کا سفر بن گیا ـــ اور مینائی چل بسے۔ زندگی کی مصیبتوں اور کلفتوں کی بنا پر فانی کے منہ سے چیخ نکلی تھی ؎

"جتنے غم چاہے دیئے جا مجھے لیکن یارب
ہر نئے غم کے لئے تازہ جگر پیدا کر"

جس طرح میر کی شاعری میر کی زندگی کے حالات سے متاثر ہے اسی طرح فانی کی شاعری زندگی کی مصیبتوں سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔ درد بھرے دل سے جو جذبات اٹھے اور الفاظ کا جامہ پہن کر شعر کہلائے۔ وہ فانی کی غم واندوہ کی شکار انماک زندگی کے آئینہ دار ہیں۔ فانی کی زندگی جہاں "وہ رہگذر تھی جسے کوئی نقشِ پا نہ ملا" وہاں فانی کا ہر شعر "آئینہ ہے غم کی جیتی جاگتی تصویر کا۔"

محمد حسین آزاد کو شاعری کے جدید رنگ کا بانی اور ادب کا مجدد سمجھنا بالکل بجا ہے، دہلی کی خدمت نباہی کے بعد ۱۸۵۷ء سے ۱۸۶۴ء تک وہ جہاں گردی کرتے لاہور پہنچے۔ جہاں ان کو سررشتہ تعلیمات میں پندرہ روپیہ ماہوار کی ملازمت مل سکی۔ اردو ادب کے اس محسن کی زندگی کا یہ عالم تھا۔

یہ بات تسلیم کی گئی ہے کہ اکبر الہ آبادی اپنی طرز کے یکتا اور تنہا شاعر

ہیں لیکن اُن کی زندگی کا تقابل جیسی بھی گذری اس کا اندازہ یوں لگایا جاسکتا ہے کہ کسی زمانے میں وہ الہ آباد ریلوے سٹیشن کے مال گودام میں بیس روپے ماہوار کے نوکر تھے اور بعد میں وہ کچہری میں نقل نویسی کرنے لگے تھے۔

دکن کے گم نام لیکن باعظمت شاعر جلال الدین نوفیق کے دیوان کا پیش لفظ شاہد ہے کہ انتقال سے گیارہ مہینے پہلے جب انھوں نے اپنی ملازمت چھوڑی تو اُن کی تنخواہ اسی روپے ماہوار تھی۔

ہندوستان کے کیٹس اور سب سے رومانی شاعر اختر شیرانی کی زندگی بھی ان جھمیلوں میں کٹی۔ اختر شیرانی کی شاعری ہماری ادبی تاریخ کا جہاں لافانی باب ہے وہاں اختر کی زندگی ایک زبردست المیہ ہے، زندگی اس سے بڑھ کر اور کیا المیہ ہوتی کہ اختر کے والد نے سر پر ستی سے ہاتھ اُٹھا لیا تھا اور صرف اس شرط پر مدد پر آمادہ ہوئے تھے کہ اختر شراب نہ پیا کریں گے۔ لیکن اختر جو غیرت سے دائمی درد لے کر اپنے وطن لوٹا تھا۔ اپنی مسلمی کے درد کو کچھ محو ہی کے لئے بغیر شراب کے کیوں کر بھول سکتا تھا؟

حسرت موہانی کا شمار اساتذہ میں ہوتا ہے، یہ بلند پایہ اور عظیم المرتبت شاعر بڑا ہی خوددار واقع ہوا تھا جس نے تمام عمر اپنی حقیقی بہن کے ہاں ایک وقت کھانا کھا لینا گوارا نہ کیا۔ ساری زندگی عسرتوں ہی میں گذار کر چل بسا۔

صاحب زادہ محمد علی خاں عیش جس کی شعری عظمت کے علامہ اقبال تک معترف تھے، ایک ساتھ تین تین روزانہ اخباروں کا کام کیا کرتا تھا۔ نہ کرتا تو اپنی رفیقۂ حیات اور اپنے معصوم بچوں کی زندگی کو کیسے سہارا دے سکتا۔ اس کے دوست اسے مجبور کرتے کہ اسے بخار ہے وہ گھر جا کر آرام لے، لیکن وہ آرام لے تو اس کا کام کون کرے۔ اس کی جوانی ان شدید ناداریوں میں جلتی رہی اور آخر وہ دق میں مبتلا ہو گیا۔ خون تھوکتا اور کراہتا رہا لیکن خاطر خواہ علاج نہ کروا سکا۔ دق کے جراثیم نے اس کی زندگی کو کھوکھلا کر دیا اور موت کے ایک جھونکے پر اس نوجوان شاعر کی زندگی لڑکھڑا گئی۔

اُلجھنوں کو توڑ دیں گے لاکھ اُلجھائے کوئی
اُلجھنوں میں ہم سکون زندگی پاتے نہیں

میکش کا ارادہ مژدہ تکمیل نہ ہوا اور اس کی زندگی ان اُلجھنوں میں اُلجھ کر موت سے جا ملی۔

نذر الاسلام ایشیا کا سب سے بڑا جذباتی شاعر ہے اور بنگلہ شاعری سب کچھ مٹا کر صرف نذر الاسلام کے افکار اپنے دامن میں محفوظ کرلے تو بھی اس کو لافانی عظمت حاصل رہے گی لیکن نذر الاسلام جس حال میں آج زندہ ہیں دُنیا جانتی ہے۔

ایران کا زبردست قصیدہ گو شاعر ظہیر فاریابی نیشاپور سے اصفہان اور اصفہان سے مازندران کی خاک چھانا کیا۔ اگرچہ اس کا بہترین کلام اس نے غریب الوطنی اور ناداری کے اس دور میں پیش کیا لیکن اس کی زندگی پر مصائب و آلام کے بادل منڈلاتے اور برستے رہے

مرا کہ چوں ہنر خویش نیست چنداں سخت
خوشا فسانۂ شیریں و قصۂ فرہاد

ان دنوں ظہیر کے دل و دماغ کی حالت کا اندازہ اس کے اس شعر سے ہوتا ہے

تنگے کہ من از فضل دو جہاں بینم
ہیں جفائے پدر بود وسیلی اُستاد

ایک اور شعر میں وہ زمانے کو جلی کٹی سناجاتا ہے۔

دریں زمانہ چو فریاد رس نمی یابم
مرا رسد کہ رسانم بہ آسماں فریاد

شاعر کی عظمت مسلّم تھی، اس کے دیوان کے متعلق مزب المثل کی مانند یہ شعر مشہور ہو چکا ہے کہ

"دیوانِ ظہیر فاریابی
در کعبہ بُرند اگر بیابی"

لیکن اس کی نجی زندگی کا یہ حال کہ الاماں والحفیظ۔ انھیر حالات نے ایران کے ایک اور زبردست شاعر خاقانی کو بھی آوارہ گردی سکھائی تھی —— فردوسی جیسا لافانی شاعر مارا مارا پھرا کیا۔

ہندوستان اور ایران ہی کا کیا ذکر دُنیا کی ہر ملک کی ادبی تاریخ میں ایسے عظیم فن کار ملتے ہیں جن کی زندگی ناداری کے خونیں پنجوں سے نجات نہ پا سکی۔ انگریزی زبان اور ادب کی تاریخ کی عظیم تر شخصیت شیکسپیئر جس نے انگریزی ادب کو اپنے شہکاروں کی بدولت دنیا کا بہترین ادب بنا دیا، عسرت و افلاس کی آغوش میں پیدا ہوا اور اس کو اس ناداری کے سبب اسکول کی تعلیم تک ابتدائی منازل میں ترک کر دینا پڑی، چند سال

بعد اُس نے اپنے مولود اسٹراٹ فورڈ کو خیرباد کہا اور قسمت آزمائے لندن کی راہ لی۔ جہاں ابتداً وہ اداکاری کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ اور جب وہ اپنی آخری عمر میں لندن سے واپس ہوا تو دولت اس کی عظمت کی گرویدہ بن چکی تھی اور وُہ کافی دولت مند ہو چکا تھا حالانکہ لندن میں وہ تلاش اور ناداری داخل ہوا تھا۔

انگریزی ادب کا دوسرا مایۂ ناز اور عظیم ترین فن کار گولڈاسمتھ ہے جس میں بہت سی خوبیاں یکجا ہو گئیں جن کو ہم شاذ و نادر ہی ایک شخصیت میں پاتے ہیں۔ گولڈاسمتھ ابتداً گلی گلی کوچے کوچے گھوم کر گانے والوں کو اپنی نظمیں ایک کراؤن میں فروخت کر دیا کرتا تھا۔ دنیا سے جاتے ہوئے یہ فن کار وہ ہزار پونڈ قرض چھوڑ گیا جو اسے ادا کرنا چاہیئے تھا۔ مشہور نقاد نے گولڈاسمتھ کے متعلق ایک واقعہ لکھا ہے کہ جب ڈبلیو مرگ پر دم توڑ رہا تھا تو ڈاکٹر نے پوچھا "تمھارے بخار کے اعتبار سے جتنا ہونا چاہیئے اس سے کہیں زیادہ تمھاری نبضوں میں ارتعاش ہے، کیا تمھارے دماغ کو سکون حاصل ہے۔"

اور مصیبت زدہ فن کار نے کہا تھا "نہیں"۔ ڈاکٹر جانسن لکھتے ہیں کہ وہ بخار سے فوت ہُوا لیکن یہ بخار مصائب و آلام کا بخار تھا، وہ بڑی کاوشوں سے حاصل کرتا اور بے طرح صرف کر دیتا۔ لیکن اس کی ان باتوں کو یاد نہیں رکھنا چاہیئے وہ بہت بڑا انسان تھا۔ چنانچہ دوسرے بلند پایہ فلمکار تھیکرے نے کہا ہے کہ "اس کا دل اور اس کا روپیہ رکھنے کا بٹوہ ہر کسی کے لئے تھا۔"

انگریزی ادبی تاریخ میں دوسری المناک کہانی سوئفٹ کی ہے اس فن کار نے جہاں اپنا ایک مقام پیدا کیا اور ادب کی دنیا میں دیرپا عظمت حاصل کی وہاں اس کی زندگی نے افلاس کی آغوش میں پہلی سانس لی، عسرت نے لوریاں دیں اور جھولے جھلائے، اوروں کی دریادلی کے سہارے اس نے چلنا سیکھا اور جب اس نے عملی زندگی کو اپنایا تو یہی بچپن کے ساتھی اس کے رفیق رہے۔ اسی غربت نے جس نے اسے لوریاں دی تھیں مرض الموت میں اس کی تیمارداری بھی کی۔ ایک نقاد نے اس کے متعلق لکھا تھا کہ جب ہم اس کی عظمت کا خیال کرتے ہیں تو اس کی المناک زندگی کے متعلق سوچے بغیر نہیں رہ سکتے۔

سر والٹر اسکاٹ دنیائے ناول کا لافانی فن کار اور زبردست محسن گزرا ہے۔ لیکن اس نے ابتداً ایڈنبرا میں مہینوں ایسی جگہ ملازمت کی تھی۔ جہاں اسے کوئی معاوضہ نہ ملا۔ اس کی زندگی کے آخری چند برس بڑی مصیبت و عسرت میں گذرے۔ حتیٰ کہ اس کے بٹلر کو پہلے سے وگنا کام کرنا پڑتا تھا اور اس کی تنخواہ نصف کر دی گئی تھی۔

مشہور انگریزی فلسفی اور مؤرخ ڈیوڈ ہیوم ایسٹل کے ایک تاجر کے دفتر میں ابتداً معمولی صاحبشی تھا۔ اسکاٹ کی طرح چارلس ڈکنس بھی بڑا ہی عظیم ناول نگار مانا جاتا ہے۔ لیکن اس کا باپ ازحد مقروض تھا اور ڈکنس کو اس بنا پر ایک کارخانے میں کام کرنا پڑتا تھا۔

جان ڈرائیڈن میں بھی گولڈاسمتھ کی طرح ایسی صلاحیتیں یکجا تھیں جو شاذ ہی ایک فن کار میں جمع ہو پاتی ہیں۔ لیکن اس قدر عظمت اور اتنی صلاحیتوں کے مالک نے اپنے دس ہزار اشعار تین سو پونڈ سے بھی کم قیمت پر بیچ ڈالے تھے۔ غالباً وہ ڈاکٹر جانسن ہی تھا جس نے اپنی عزیزہ کی موت پر آخری رسوم ادا کرتے وقت کچھ بھی پاس نہ ہونے کی بنا پر اپنی ایک لافانی تصنیف چند پونڈ میں بیچ ڈالی تھی۔

ولیم کونس ایک عظیم المرتبت شاعر مانا جاتا ہے لیکن اس کی زندگی بچا کے سہارے گذری۔ وہ اس قدر نادار ہو گیا تھا کہ اپنے چچا مارٹن سے اکثر مدد کا مطالبہ کرتا اور وہ انکار کرنے لگتے۔ وہ اپنے کتب فروش دوستی، اور ایسے ہی لوگوں کا مقروض رہا۔ کرنل مارٹن نے انتقال کے بعد قریباً دس ہزار پونڈ کونس کے لئے چھوڑے۔ لیکن اس نے یہ گراں قدر رقم تھوڑی سی مدت میں صرف کر دی اور دوبارہ افلاس کا شکار ہو گیا۔

ولیم ہزلٹ اٹھارویں صدی کا عظیم فن کار گذرا ہے۔ لیکن اپنی زندگی کے تین سال اس نے ایسے بھی گزارے کہ انگلستان میں پیدل گھومتا اور تصاویر پر پینٹ کیا کرتا جس کا اسے پانچ گنی فی تصویر معاوضہ ملتا تھا۔ اس کی کئی ایک تصانیف کے اسے بہت کم دام ملے۔ بنجامن ونٹر سلو اپنے کسی عزیز کی سرپرستی میں چند دن خوب گزارے لیکن مالی پریشانیوں نے اسے پھر مجبور کیا کہ ونٹر سلو کو خیرباد کہے اور لندن میں رہے۔ کارلوٹ نے لکھا ہے کہ "ہزلٹ کو معمولی آمدنی سے زیادہ کچھ اور ساری زندگی حاصل نہ ہو سکا۔"

اسپنسر کو اپنے ہم عصر شعراء کا شہزادہ تسلیم کیا جاتا ہے، وہ غیر معمولی شعری صلاحیتوں کا مالک تھا اور دوسرے شعراء کے مقابلے میں اس کا پلّہ صرف شیکسپیئر سے کم نظر آتا ہے لیکن اس کی دردناک زندگی کے حالات سنگدل کو بھی آبدیدہ کر دیتے ہیں۔

تالیف و ترتیب کے زبردست ماہر سیموئیل پرکاس کو اپنی ایک تصنیف کی بنا پر قید خانے میں زندگی کے دن گذارنا پڑے۔

جارج کمالک سائیڈن ہام نے افلاطون پر گراں قدر کام کیا ہے اور اسی علمی و ادبی خدمت کے لئے اس نے ساری زندگی وقف کر دی تھی۔ اپنی زندگی کے ایک دور میں وہ سپاہی تھا اور اس نے ایک خیرات خانے میں وفات پائی۔ اس کی دردناک موت کا یہ اثر پڑا کہ "مصیبت زدہ مصنفین کے لئے ادبی فنڈ" کی بنا پڑی۔

جین آسٹن انگریزی ناول نگاروں کی اوّلین صف میں نمایاں مقام رکھتی ہے۔ لیکن اس کا پہلا ناول "پرائیڈ اینڈ پریجوڈس" سترہ سال تک شائع نہ ہو سکا، اس کا دوسرا ناول "نارتھنگر ایبے" کے لئے ایک ناشر نے دس پونڈ دیئے تھے۔ یہ ناول ۱۸۱۸ء میں ناشر نے خریدا اور ۱۸۱۸ء میں شائع کیا جبکہ اس کی مصنفہ دنیا سے کوچ کر چکی تھی۔ "سنس اینڈ سنسیبلٹی" کے آسٹن کو ۱۵۰ پونڈ ہی مل سکے، اس نے کئی ایک ناول لکھے اور شائع ہوئے لیکن ۱۱، تمام ناولوں کی قیمت اس عظیم ناول نگار خاتون کو سات سو پونڈ سے زیادہ نہ مل سکی۔

ونجلس فرانس کا انتہائی سلیقہ مند فن کار گذرا ہے۔ موت کے بعد اس کا ترکہ صرف اس کے بیش بہا مسودے تھے اور کوئی چیز نہ تھی جس کو قدرے قیمتی کہا جا سکے۔ اس کے قرض دینے والوں کے لئے سوائے اپنی لاش کے اس نے کچھ بھی نہ چھوڑا۔ اس کے پاس کچھ تھا بھی کہ قرض کے بار سے بچ کر عدم کا سفر اختیار کر سکتا۔

ڈورائیڈ نہ صرف عظیم شاعر تھا بلکہ ڈرامہ نگار بھی۔ ملکہ کرسچینا خاص کا شاہکار "سیکومولی" ایک دن میں مسلسل تین بار پڑھا کر سنا تھا، جس کی تخلیقات کے چرچے محلوں میں تھے وہ فن کار معمولی سے دیہات کی ایک مجرد بستی میں زندگی بسر کرتا تھا۔ اس کے ایک ہم عصر نے لکھا ہے:۔

"وہ محرما کے دن تھے اور دن بڑا سہانا تھا، ہم لوگ اس سے ملنے گئے۔ وہ شہر سے کچھ فاصلے پر رہتا تھا۔ اس نے ہمارا پُرمسرت استقبال کیا، اپنے منصوبوں کی باتیں کیں اور اپنی کئی ایک تصانیف بتلائیں۔ لیکن سب سے زیادہ دلچسپ بات تو یہ ہے کہ اس نے اپنے افلاس کا انکشاف ہو جانے کے اندیشے کی بنا پر ڈرتے ڈرتے ہماری خاطر مدارات بھی کی۔ ہم لوگ ایک بڑے جنگلی بلوط کے سائے میں بیٹھے۔ دسترخوان گھاس پر بچھایا گیا۔ اس کی بیوی نے تازہ پانی کے ساتھ بادامی روٹی اور دودھ پیش کیا۔ اس نے ہمارا پُرمسرت استقبال کیا تھا لیکن ہم اس عظیم شخصیت سے معذرت فراق کے جواب بوڑھا ہو چکا تھا، جس کے آنسو سوکھ چکے تھے اور جو قسمت کا اس قدر ستایا ہوا تھا۔"

ژیرین فرانسیسی ڈرامہ نگار تھا جو ایلے کھا کرتا تھا، لوئی چہاردہم نے ایک بار اس سے سوال کیا کہ آدبی دنیا میں کون سی بات نئی اور تازہ ترین ہے۔" ریسین نے کہا کہ اس نے کارنیل کے مکان میں ایک المناک منظر دیکھا ہے۔ کارنیل اب دوا نے سے محروم ہو کر دم توڑ رہا تھا۔ شاہ لوئی کچھ دیر چپ رہا اور دم توڑتے ہوئے شاعر کو امداد روانہ کی۔

بیومونٹ فرانسیسی شاعر اور نقاد تھا اور پارلیمنٹ میں فنشی کے عہدے پر مامور تھا۔

لی سیج فرانسیسی ناول نگار اور ڈرامہ نگار گزرا ہے۔ جس کا ڈرامہ "ٹرکیرٹ" نہ صرف اس کا شاہکار بلکہ فرانسیسی ادب کے بہترین طربیہ ڈراموں میں شمار کیا جاتا ہے۔ اس نے مقبول ترین ناول لکھے لیکن وہ ایک چھوٹی سی مجرد بستی میں رہا کرتا تھا۔

لے ٹس اپنی تاریخ روم کی بنا پر غیر معمولی شہرت کا مالک ہے۔ قانون دانوں اور مجسٹریٹوں پر اس کے مضامین قابلِ ذکر ہیں۔ لیکن اس کی ساری زندگی ناداری اور عسرت میں گزری۔

زی لنڈر جرمنی کا ایک مایۂ ناز عالم گزرا ہے جس کے یونانی سے لاطینی ترجمے بہت زیادہ قدر و قیمت رکھتے ہیں۔ اس مصنف نے اپنی تصانیف کا ایک حصہ ایک وقت کے کھانے کے لئے فروخت کر دیا تھا۔

نطشے دنیا کا ایک عظیم فلسفی اور مصنف گزرا ہے جو اپنے فلسفہ و نفسیات

کی بنا پر بدنام ہے۔ اُس کا یہ فلسفۂ نفرت ہی اس کی مصیبت زدہ اور دُکھ بھری زندگی کا آئینہ دار ہے۔

کرنٹس جسے ڈسرائیلی اسپین کا لافانی فن کار کہتا ہے۔ ناول نگار، ڈرامہ نگار اور شاعر تھا۔ اسے فوجی ملازمت میں بیلیور دشواریوں سے دوچار ہونا پڑا۔ اس کے باپ کا انتقال ہوگیا اور اس کی ذمہ داریاں کرونسٹس کے دوش پر آپڑیں۔ روڈگرو نے اس فن کار سے معاہدہ کیا کہ وہ چھ ڈرامے لکھے اور ہر ڈرامے کا ۵۰ ڈوکٹ معاوضہ دیا جائے گا۔ لیکن یہ معاوضہ (تقریباً ۲۱ پونڈ) اس صورت میں دیا جائے گا جبکہ روڈگرو ان کو اسپین کے بہترین ڈرامے محسوس کرے۔ "نویلاس اگزمپلیرس" اس کا ایسا ناول ہے جو اس کو فرانسیسی ناول نگاروں میں اعلیٰ مقام عطا کرتا ہے۔ اور اس کا "ڈان کوسٹ" ایسا ناول ہے جو اسے ہر زمانے کا عظیم ترین فن کار تسلیم کرنے پر مجبور کرتا ہے لیکن اس فن کار کی حسرت کا یہ حال تھا کہ وہ اپنے کھانے تک کا محتاج تھا۔

کامین پرتگال کا اکیلا ایسا فن کار ہے جس پر یہ سرزمین جس قدر فخر کرے بجا ہے۔ بلکہ یہ فخر و غرور کی حد تک قابلِ برداشت ہے کامین رزمیہ شاعر بھی ہے اور غزل گو بھی۔ یورپ کے سولھویں صدی کے عظیم لائرکس شعراء میں اس کا شمار ہوتا ہے، اتنا ہی نہیں بلکہ ساری دنیا کے عظیم شاعروں میں اسے شمار کیا جاتا ہے۔ لیکن اس شاعر نے لسبن کے ایک اسپتال میں اس عالم میں وفات پائی کہ زندگی کی احتیاجات کے لئے اس کے پاس کچھ نہ تھا۔ دنیا نے افسوس کے آنسو بہائے کہ اس قدر عظیم تخصیت کو کس قدر صلہ ملا۔ کفن تک کے لئے اس کے پاس کپڑے کا ٹکڑا نہ تھا۔ اس شاعر کی وفات کی تاریخ اور دن حتیٰ کہ مہینے تک کا کسی کو علم نہیں۔ اس گم نامی کے عالم میں اس نے زندگی بسر کی، حالانکہ اس کی نظمیں دنیا کے شعری ادب کا لافانی سرمایہ تسلیم کی جاتی ہیں۔

وٹمل کو ولندیزی شیکسپیئر کہا جاتا ہے اس نے مقبول ایلیے بھی لکھے۔ وہ معمولی سا ایک کلرک تھا۔ نوے سال کی عمر میں اس نے وفات پائی اور عسرت و ناداری کے پنجوں سے نجات پائی۔

ٹیسو بھی ایک عظیم شخصیت ہے اور دنیائے علم و ادب میں اس کی عظمت مسلم رہی۔ لیکن اس فن کار کا یہ عالم تھا کہ وہ اپنی بی بی کی آنکھوں کی روشنی میں اپنی نظمیں لکھا کرتا تھا۔ اس کے گھر کو چراغ تک نصیب نہ تھا۔

ایریاسٹو اطالوی شاعر گزرا ہے، اس کی سالانہ آمدنی ۴۸ کراؤن تھی۔ کسی نے اسے چھوٹا سا گھر بنوا دیا تھا جس میں زینت و آسائش کے سامان کے عوض شاعر کی ناداری کی قسم کھانے والی چند ٹوٹی پھوٹی چیزیں تھیں۔ کسی نے کہا کہ جس نے تحریر سے الفاظ کے شاندار محل کھڑے کئے ہوں، اس کے لئے یہ مکان رہنے کے قابل نہیں۔ تو اس نے جواب دیا کہ تھیقہ کی عمارت اور الفاظ کے محل ایک سی چیز نہیں۔"

کارڈینل بیمبو دولیونہ صرف سیاست دان تھا بلکہ اطالیہ میں ادب کا زبردست سرپرست اور محسن گزرا ہے۔ اس کو اپنی آخری عمر میں قرض ادا کرنے کے لئے اپنا محل فروخت کرنا پڑا۔ اور اس دنیا سے جاتے ہوئے سوائے حسرت و عظمت کے کچھ اور نہ چھوڑ گیا۔

یان نوگوچی کی شاعری پر جاپان کے باشندے سدا فخر کریں گے۔ اوروں کی امداد پر اس نے تعلیم پائی۔ وہ امریکہ گیا لیکن غریبی اور افلاس نے اس کا بُرا حال کیا۔ پھر لندن گیا جہاں اس کی قیام گاہ اس کی غریبی۔ ناداری کا زبانِ حال سے اظہار کرتی تھی۔

اوہنری اس صدی کا وہ عظیم افسانہ نگار ہے جس نے کلاسیکل ادب میں گراں بہا اضافہ کیا۔ اس کی ہر دلعزیزی اور مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ اس کے افسانے عظیم ترین فن کاروں اور بستیوں سے موٹر چلانے والوں اور معمولی معمولی پیشہ وروں تک پڑھے اور پسند کئے جاتے۔ وہ افسانے میں ایک نئی طرز کا ماہر تھا جس کی نظیر نہیں ملتی۔ ابتداً وہ اپنے چچا کی ادویہ کی دکان میں منشی ہوا۔ وہاں سے چلا تو جنرل لینڈ آفس میں ملازمت کی۔ وہ بھی راس نہ آئی۔ پھر نیشنل بنک میں ایک معمولی ملازمت کی وہاں غبن کا الزام لگا اور وہ فرار ہوگیا۔ لیکن یہ فرار اسے بچا نہ سکا اور پانچ سال جیل خانے میں گزارے۔ اسے اپنی ابتدائی کہانیوں کی قیمت خاطر خواہ نہ ملی۔ ایک کہانی کی قیمت اسے صرف سترہ ڈالر اور دوسری کہانی کی کوئی ۳۶ ڈالر ملی۔ بعد میں نیویارک کا "ورلڈ" اسے سو سو ڈالر دینے لگا۔ ایڈیٹر اسے پیشگی قیمت ادا کرتے اور وہ ان کے لئے لکھتا۔ لیکن جب پیسوں کی ضرورت پڑتی تو وہی کہانیاں دوسروں کو فروخت کر دیتا۔ اس نے ایک بار کسی خاتون کو کہانی لکھ کر دی کہ کہیں دے آئے۔ وہ خاتون کہانی لے کر جب ایک ایڈیٹر کے پاس پہنچیں تو اس نے کہا کہ "مجھے ان سے

چار کہانیاں لیتی ہیں جو کی قیمت میں ادا کر چکا ہوں۔" وہ کئی ایک کے پاس گئی اور ہر کسی نے یہی کہا کہ قیمت پیشگی دی جا چکی ہے اور کہانی نہ ملی۔ خاتون نے تنگ آکر ادھیڑی کو خون کیا تو اس نے کہا: "فکر مت کرو۔ اس کہانی کے متعلق میں نے ابھی ابھی "ہیرالڈ" سے بات چیت کر لی ہے۔"

ابو یوسف اسحاق کندی عرب کا سب سے پہلا اور دنیا کا زبردست فلسفی گزرا ہے۔ اس نے آخری عمر میں دنیا سے رشتے توڑ لئے تھے اور صرف ان معاشی اور نظام کی بنا پر ہی اس نے تارک الدنیا ہونا گوارا کیا جو خلیفہ متوکل نے اس پر ڈھائے تھے۔

ارسطو ثانی کا لقب پانے والے فلسفی فارابی کا یہ حال تھا کہ:-

"وہ دمشق میں کسی باغ کا نگہبان تھا اور ہمیشہ فلسفے کے مطالعے میں منہمک رہتا تھا، وہ اس قدر مفلس تھا کہ رات کو چوکیدار کی قندیل کی روشنی میں پڑھا کرتا (عیون الانباء جلد دوم صفحہ ۱۳۴)

کلیانت رواقی فلسفی تھا وہ بہشتی تھا اور پانی بھرا کرتا اور اشنا کے باغات میں درختوں کو پانی دیا کرتا تھا۔

اسپنوزا کی عظمت سے کون انکار کرتا ہے لیکن اس کی زندگی کا سہارا گھڑی سازی کا فن تھا۔

ابن سینا نہایت ذکی اور بلند پایہ مصنفین اور فلاسفروں میں سے ہیں لیکن ان کی تقریباً ساری عمر صعوبتوں اور تکالیف میں گزری۔ اعلیٰ عہدوں پر مامور رہے۔ لیکن گردشِ دوراں بار بار ان کو اپنا شکار بناتی ہے۔

ابن رشد عرب کا سب سے بڑا فلسفی گزرا ہے لیکن اس کی آخری عمر میں اس کی ہنستی کاتی ہوئی زندگی خلیفہ کے عتاب کی نذر ہو گئی تھی۔

ابن رشد گوڈ اسمتھ یا افشا اللہ خاں ہی نہیں بلکہ دنیا کے کئی ایک عظیم فن کاروں، شعراء اور علماء کے حالات ہماری ادبی تاریخ کے زبردست ایسے ہیں جن کو پڑھ کر غالب کی بات یاد آ جاتی ہے اور دماغ سوچنے لگتا ہے کہ

موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

آج کل کا سال نامہ ۱۹۵۴ء

ماہ اگست ۱۹۵۴ء کا شمارہ سال نامہ ہوگا۔ رنگین تصاویر، رنگین سرورق کے علاوہ اس میں بلند پایہ افسانہ نگاروں کے افسانے، شعراء کی نظمیں اور مضمون نگاروں کے مضامین ہوں گے۔ اردو اور دوسری علاقائی زبانوں کے ادب کے نونے پیش کئے جائیں گے۔ ادب اور ہندوستانی تہذیب سے متعلق دلچسپ مضامین بھی شاملِ اشاعت ہوں گے۔ چند لکھنے والوں کے نام ذیل میں دئے جاتے ہیں

علامہ نپڈت برج موہن دتاتریہ کیفی — سید احتشام حسین — چودھری شیر جنگ — علی سردار جعفری
کرشن چندر — راجندر ناتھ شیدا — علی عباس حسینی

مدیر رسالہ جوش ملیح آبادی کی ایک تازہ اور غیر مطبوعہ نظم خاص طور پر شائع ہو رہی ہے

ایجنٹ حضرات اپنی ضروریات سے جلد مطلع فرمائیں — قارئین پرچہ خریدنے کا ابھی سے انتظام کر لیں

قیمت عام شماروں کی طرح صرف آٹھ آنے فی پرچہ

بزنس منیجر پبلیکیشنز ڈویژن گورنمنٹ آف انڈیا اولڈ سیکرٹریٹ دہلی ۸

محمد بشیر الحق دسنوی غلیم آبادی

مولوی محمد یحییٰ تنہا کے خطوط

(۱)

غازی آباد ۱۷ مارچ ۱۹۳۵ء

مکرمی! اسلام علیکم

گرامی نامہ مورخہ ۱۲ مارچ ۱۹۳۵ء موصول ہوا۔ ممنون فرمایا۔ دورِ سوم کے نثارانِ اُردو بہت کثرت سے ہیں۔ جن میں اصحاب کا ذکر اس دور میں کیا گیا ہے وہ بالنظر بابتہ ماہ اکتوبر و نومبر ۱۹۳۴ء کے مطالعے سے معلوم ہو سکتا ہے۔ تاہم آپ کے ارشاد کی تعمیل میں یہ عرض کر دینا ضروری ہے کہ بڑے بڑے نامی گرامی ادیبانِ اُردو کا ذکر کیا گیا ہے اور اُن اصحاب کو چھوڑ دیا گیا ہے جو صدر نشینانِ بزم اردو کی برابر جگہ نہیں پا سکتے۔ اگر حیاناً ان کا ذکر آبھی گیا ہے تو وہ ان بزرگوں کے حاشیہ نشین ہیں۔ مثلاً نواب محسن الملک، مولوی عزیز مرزا اور مولوی سید کرامت حسین وغیرہم حاشیہ نشینوں میں ہیں۔ اور سرسید، آزاد، شبلی، حالی، مولوی چراغ علی، نذیر احمد، ذکاء اللہ، سید علی بلگرامی، سرشار اور شرر صدر نشینانِ بزم اردو ہیں۔ اب اگر کوئی نام ایسا باقی رہا ہو جو سرسید وغیرہ کے ہم پلہ ہو تو آپ ضرور تحریر فرمائیں ورنہ دوسرے درجے کے نثارانِ اُردو کی سوانح عمری درج کرنے کے لئے میری کتاب میں کافی جگہ نہیں ہے۔ انھیں دس بزرگوں کے حالات میں تقریباً پانسو صفحات پُر ہو گئے ہیں۔

سرشار کے حالات اسی مضمون سے لئے گئے ہیں جس کا آپنے حوالہ دیا ہے۔ جلد اوّل میں اس امر کی شکایت کی گئی ہے کہ یہ حالات بھی در اصل ناکافی ہیں۔ نوطرز مرصع کا جو پتہ آپ نے دیا ہے اُس کا شکریہ ادا کرتا ہوں لیکن سکرٹری صاحب ممکن ہے کتب خانے سے کتاب کو علیحدہ نہ کریں۔ اور میں کتاب بغیر دیکھے اس کا اقتباس چھاپنے معذور رہوں گا۔ تاہم دوسرے ایڈیشن پر کوشش ضرور کی جائے گی۔ کہ کتاب مذکور کا حوالہ دیا جائے۔

مجھے اگر خواب و خیال کے دوسرے نسخے کا پتہ لگ سکا تو ضرور آپ کو اطلاع دوں گا۔ اگرچہ زیادہ کامیابی کی اُمید نہیں ہے۔ مولانا صہبائی کا زمانہ اگر غدر سے پیشتر ہے تو اُن کی نثر کا نمونہ اور اُن کے حالات دوسرے ایڈیشن میں درج ہو سکیں گے اور میں ان کو دورِ دوم میں ہی جگہ دے سکتا ہوں۔ والسلام مع الکرام

نیازمند، محمد یحییٰ تنہا

استدراک۔

۱ اس وقت میں اپنے وطن اور کتب خانے سے بہت دُور رانچی میں ہوں، ٹھیک یاد نہیں کہ تنہا صاحب کی کتاب سیر المصنفین جلد اوّل طبع اوّل ۱۹۳۵ء میں شائع ہو چکی تھی جس کو دیکھ کر میں نے ان سے خط و کتابت شروع کی تھی۔

۲ پنڈت برج نرائن چکبست لکھنوی نے رسالہ زمانہ کان پور ماہ مئی ۱۹۰۵ء میں ایک بہت ہی اچھا مضمون پنڈت رتن ناتھ سرشار مرحوم کے متعلق لکھا تھا۔ خط میں اسی مضمون کا حوالہ ہے۔

۳ نوطرز مرصع مصنفہ محمد عوض زریں کا ایک نسخہ میرے پاس تھا جس کے متعلق میں نے لکھا تھا تنہا صاحب کو محمد عطا حسین خاں تحسین کی تصنیف سے جو نوطرز مرصع ہے۔ اس کی ضرورت تھی۔ اُس وقت تحسین کی تصنیف نوطرز مرصع دستیاب نہ ہو سکی تھی۔ اب اس کے نسخے دستیاب ہوتے ہیں۔ کتب خانۂ مشرقیہ بانکی پور اور کتب خانۂ جامع مسجد بمبئی میں اس کے نسخے موجود ہیں۔

۴ میر محمدی اثر دہلوی کی مثنوی "خواب و خیال" کا ایک قلمی نسخہ

مجھے مکرمی مولوی علی کریم صاحب عرف میاں ساکن موضع تیناء اتفاقاً پاتے پور ضلع مظفر پور کی عنایت سے سنہ ۱۵-۱۹۱۴ء میں دستیاب ہوا تھا۔ میں نے اس نسخے کو سنہ ۱۷-۱۹۱۶ء میں علامہ سید سلیمان ندوی کے ملاحظہ کے لئے دار المصنفین اعظم گڈھ بھیج دیا تھا۔ اُس وقت سید نجیب اشرف ندوی صاحب دار المصنفین میں بطور رفیق کام کرتے تھے۔ اس مثنوی کی دستیابی کا ذکر خیر معارف اعظم گڈھ کے کسی شمارے میں آگیا تھا اور ڈاکٹر عبد الحق صاحب سکریٹری انجمن ترقی اردو کی خواہش پر سید نجیب اشرف صاحب نے اس نسخے کو ان کے پاس بھیج دیا تھا۔ مولوی عبد الحق صاحب کو اسی زمانے میں اس مثنوی کا ایک اور نسخہ مل گیا تو دونوں نسخوں کے مقابلے سے انجمن ترقی اردو نے ایک نسخہ طیار کیا جو بعد میں انجمن کی طرف سے ٹائپ میں شائع ہوا تھا۔ حال ہی میں انجمن ترقی اردو پاکستان نے اس مثنوی کا دوسرا ایڈیشن شائع کیا ہے۔

۵ آپ کا نام امام بخش اور صہبائی تخلص تھا۔ آپ کے والد کا اسم گرامی مولانا محمد بخش تھا، جو تھانیسر سے دلی آئے۔ اور کوچہ چیلاں میں رہ پڑے۔ آپ نے علامہ عبد اللہ خاں علوی سے عربی اور فارسی پڑھی تھی اور دہلی میں فارسی کے بہت بڑے ادیب تصوّر کئے جاتے تھے۔ آپ قدیم دہلی کالج میں فارسی کے مدرّس اوّل تھے اور کئی کتابوں کے مصنّف تھے۔ آپ کی اردو تصانیف میں ترجمہ حدائق البلاغت ہے جو صرف کہنے کو ترجمہ ہے ورنہ اصل میں فن بلاغت کو اردو میں منتقل کیا ہے۔ "اردو صرف و نحو و قواعد" بھی آپ کی تصنیف سے ہے۔ سر سید احمد خاں نے آثار الصنادید طبع اوّل کی ترتیب میں آپ سے کافی مدد لی تھی۔ گلستانِ سخن مصنفہ مرزا قادر بخش صابر گویا گانی کی تصنیف میں بھی آپ کا بڑا دخل ہے۔ اس کا مقدمہ بالخصوص آپ کا لکھا ہوا ہے۔ غدر ۱۸۵۷ء میں آپ کو انگریزوں نے گولی سے شہید کیا۔

(۲)

غازی آباد ۱۳ مئی ۱۹۵۵ء

مکرمی السلام علیکم۔ بجواب گرامی نامہ مورخہ ۱۲ اپریل ۵۵ء

عرض ہے کہ منشی سید احمد صاحب مصنّف فرہنگ آصفیہ منشی سجاد حسین صاحب ایڈیٹر اودھ پنچ، مولوی محمد علی صاحب اشہری کے حالات درج کتاب کئے گئے ہیں۔ مولوی اسمٰعیل صاحب میرٹھی کے حالات اب تک دستیاب نہیں ہوئے۔ باوجودیکہ اُن کے صاحبزادگان سے بے حد اصرار کے ساتھ کہا گیا۔ اگر مل گئے درج کتاب ہو جائیں گے۔ سید اکبر حسین جج الٰہ آباد کا کوئی نثری کلام میری نظر سے نہیں گذرا۔ آپ اُن کی کسی نثری تصنیف کا حوالہ دیں تو میں اُس کو دیکھنے کی کوشش کروں۔ مولوی فخر الدین صاحب بخن دہلوی کا ذکر دورِ دوم میں مناسب تھا۔ آئندہ ایڈیشن میں اس کا لحاظ کیا جائے گا۔ فہیم دہلوی بھی غالباً دوسرے دور ہی میں آئیں گے۔ باقی جن اصحاب کا آپ نے ذکر کیا ہے ان جیسے اور بے شمار بزرگ ہیں۔ البتہ مولوی امام بخش صہبائی اور حکیم احسن اللہ خاں صاحب کو دورِ دوم میں انشاء اللہ ضرور جگہ دی جائے گی۔ لیکن ان کی تصنیف سے مطلع کیا جائے کہ کہاں سے مل سکتی ہیں۔

میں بے حد ممنون ہوں کہ آپ نے ہدایت الاسلام اور نوطرز مرصع کے نمونے عنایت کرنے کا وعدہ کیا ہے۔ نوطرز مرصع کے متعلق یہ خیال رکھئے کہ وہ محمد عوض زریں کی تصنیف سے نہ ہو۔ کیونکہ ایسی ایک کتاب میرے پاس آگئی ہے جس کا میں نمونہ لے چکا ہوں، اور آئندہ ایڈیشن میں شائع کردوں گا۔ محمد عطا حسین خاں تحسین کی تصنیف سے جو نوطرز مرصع آپ کو دستیاب ہو اُس کا نمونہ عنایت فرمایا جائے اور کس سنہ میں کتاب لکھی گئی اور کیا سبب تالیف ہے، اور خود مصنّف کے اگر حالات درج ہوں تو وہ بھی تحریر فرمائیے۔ کتاب کے آخر میں اگر قطعہ تاریخ درج ہو وہ بھی لکھئے۔

اس بات کے لئے کہ دورِ اول اور دورِ دوم میں نظر انتخاب نہیں ڈالی گئی۔ اور جملہ مصنّفین درج کتاب کئے گئے ہیں اور دورِ سوم میں کیوں انتخاب مدنظر رکھا گیا، ایک بڑی بحث کی ضرورت ہے تاہم میں یہ عرض کروں گا کہ پہلے دو دور کے تمام و کمال حالات ہماری دسترس سے باہر ہیں اور جس قدر حالات مل جائیں ان سب کا درج کیا جانا ضروری ہے۔ کچھ عرصہ کے بعد

اگر ان دو دوروں میں بھی انتخاب کو پیشِ نظر رکھا جائے تو مضائقہ نہیں۔ دورِ سوم کے مصنفین کی تعداد بہت ہے اور میرا مقصد کوئی انسائیکلوپیڈیا لکھنا نہیں ہے۔ ضرور نظرِ انتخاب ڈالنے کی ضرورت ہے۔ مولوی ذکاء اللہ اگر ۳۴ کتابوں کے مصنف ہوتے ہوئے بھی زمرۂ مصنفین میں شمار نہ کئے جائیں تو ظلم ہے۔ ان کی کتاب تاریخ ہندوستان بے حد قابلِ قدر ہے۔ اب تک اردو میں ایسی کوئی جامع کتاب تاریخ ہندوستان پر موجود نہیں ہے۔ سید علی بلگرامی بے شک مترجم تھے لیکن اُن کے ترجمے تصنیف کے درجے تک پہنچے ہوئے ہیں۔ مولوی چراغ علی بیرسٹر نزدیک جا بہ مصنفین سے ایک بات میں بڑھے ہوئے ہیں۔ جو تلاش، تحقیق اور متانت اور معاملہ فہمی ان کے یہاں ہے دوسرے کے یہاں تلاش کرنا بے سود ہے۔ جس مضمون پر انھوں نے قلم اُٹھایا ہے دوسرا ان کے بعد آج تک کچھ اضافہ نہیں کر سکا۔ اس سے زیادہ مصنف کی اور کیا تعریف ہو سکتی ہے۔ بہر حال یہ ایک خاکہ ہے۔ کتاب چھپنے کے بعد سب لوگوں کی رائے کا انتظار ہوگا۔ اس وقت زیادہ بہتر طریقے پر معلوم ہو جائے گا کہ میں نے کہاں کہاں غلطی کی ہے اور کہاں کہاں صحیح طریقہ اختیار کیا ہے۔ میں بوجہ عدیم الفرصتی اب تک کتاب لکھنے کے لئے نہیں دے سکا۔ جون کے مہینے میں شاید یہ موقع مل جائے۔ (نیازمند محمد یحییٰ تنہا)

استدراک

لہ مولوی محمد یحییٰ صاحب تنہا نے جو حضرت اشہری کا نام محمد علی لکھا ہے صحیح نہیں ہے۔ اُن کا اسم گرامی امجد علی تھا۔

لہ مولوی محمد اسمٰعیل صاحب میرٹھی کے کلیات میں ان کی مفصل سوانح عمری درج ہے۔ مالک رام صاحب نے جو اپنے مضمون "تلامذۂ غالب" میں مولوی محمد اسمٰعیل کو "تذکرۂ غوثیہ" کا مصنف لکھا ہے یہ صحیح نہیں ہے۔ تذکرۂ غوثیہ حضرت غوث علی شاہؒ کے خلیفہ حضرت گل حسن شاہ صاحب کی تصنیف سے ہے۔ مالک رام صاحب کا مضمون کئی نمبروں میں سہ ماہی رسالہ "اردو ادب" علی گڈھ میں شائع ہوا تھا۔ یہ رسالہ انجمن ترقی اردو (ہند) کی طرف سے آل احمد صاحب سرور کی ادارت میں نکلتا ہے۔

لہ حضرت اکبر الہ آبادی نے بلنٹ کی انگریزی کتاب "فیوچر آف اسلام" کا ترجمہ کیا تھا اور وہ شائع بھی ہو گئی تھی۔ اس کے علاوہ اُن کا ایک مضمون "ندوے کی تصنیف" کے عنوان سے رسالہ مخزن لاہور سلسلۂ قدیم میں بھی شائع ہوا تھا۔ یہ مضمون بھی کسی انگریزی مضمون کا ترجمہ ہی تھا۔ حضرت موصوف کے خطوط کے کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔

لہ مولوی فخر الدین حسین دہلوی نے "فسانۂ عجائب" کے جواب میں "سروشِ سخن" لکھی ہے۔ سخن کا دیوان بھی عرصہ ہوا چھپا تھا۔

لہ نظیر دہلوی کی بھی ایک کتاب ہے جس میں اُنھوں نے اپنے اور غدر ۱۸۵۷ء کے حالات لکھے ہیں۔ اس وقت کتاب کا نام بھول رہا ہوں۔

معلومات اور اعداد و شمار

۱۔ ہندوستان میں ۱۹۵۳ء میں رات کی فضائی سروسوں کے ذریعے روزانہ آٹھ ہزار سات سو اٹھارہ پونڈ ڈاک اور تین ہزار ایک سو سات پونڈ مال و اسباب کی باربرداری ہوتی رہی۔ نیز ۶۷ مسافروں نے روزانہ سفر کیا۔

۲۔ آج کل ہندوستان میں ایک ہزار ہر پینتیس ٹیلی پرنٹر کام کر رہے ہیں۔

۳۔ ہندوستان میں شیشے کی چادروں کی تیاری میں بہت سرعت سے ترقی ہوئی۔ چنانچہ ۱۹۵۲ء میں چورانوے لاکھ مربع فٹ چادریں تیار ہوئیں جب کہ ۱۹۵۳ء میں ان چادروں کی تعداد دو کروڑ چار لاکھ مربع فٹ ہو گئی۔

۴۔ اس سال کے آغاز میں ہندوستان کی ریل گاڑیوں سے ۵۶ ریسٹورنٹ یا ڈائننگ کاریں وابستہ تھیں۔

علی منظور

عہدِ نو

فکرِ نو طرزِ نو

اعلان ہو جدّت کا سرنامۂ خمخانہ
مے خوار پڑھیں فرفر "مبہم" خطِ پیمانہ

لے پیرِ مغاں اپنی آگے نہ بڑھائے خود
جب تک نہ کرے اس کی تائید کوئی بخود

رندوں میں نظر آئے وہ یکدلیٔ خوش کن
لے لے کے اثر جس سے سب گائیں انھیں کے گُن

"نوطرز" بتوں سے ہو آراستِ بُت خانہ
بے سُود روا جوں سے بُتگر بھی ہو بے گانہ

"اصنامِ رواں" دعوت دیں ایسی پرستش کی
جس میں نہ ہو گنجائش "خود ساختہ" نازش کی

انوارِ تجدّد سے خوش جلوہ پجاری ہوں
پارینہ روایت کے ادراک سے عاری ہوں

تھی جہل کے برقع میں "بجلی" کی قدامت جب
بے پردہ نشینوں میں بجلی کی ہے جدّت اب

اب قہر صفت بجلی بیگانۂ رحمت ہے
یہ بات ہے افسانہ یا صاف حقیقت ہے؟

اندازہ وہ کیسا تھا؟ نے الحال ہے ڈھب کیسا؟
مٹی کا دیا ویسا! بجلی کا چراغ ایسا!!

چلتے نہیں کیوں "چھکڑے"؟ کیا تھک گئے بیچارے؟
ہیں قہقہہ زن ان پر کس شان سے "طیارے"؟

ہتھ ہتھ کے چھدکتی ہیں کیا سانڈنیاں اب بھی
سڑکوں پہ لبوں نے کیا ان کی بھی جگہ رکھی؟

رتھ رینگ چکی صدیوں اب دوڑتی ہیں ریلیں
درماندہ سواری سے یہ برق سیر کھیلیں؟!

آثارِ کہن کیا ہیں؟ عبرت کے نمونے ہیں
"تاباں" نہیں، مدھم ہیں دل کش نہیں سُونے ہیں

آثارِ کہن کی حد ہر آن جو ہیں تکتہ
یہ نغمۂ طرب میرا ہرگز نہ پنپ سکتا

فی الحال میں جن کو بھی ہم ولولہ پاؤں گا
اُن حوصلہ مندوں کو جوش اپنا دکھاؤں گا

زیبا ہے مجھے اپنا اندازِ سخنگوئی
پروا نہ کروں بالکل خوش ہو کہ خفا کوئی

ہیں سر پہ جگہ دے کر ماضی کی "بیاضوں" کو
برتوں گا نئے ڈھب سے موجودہ تقاضوں کو

حاضر پہ بھلا کیونکر غایب کا پڑے پرتو
فرسودہ تفکر سے شاداب ہو فکرِ نو؟!

تپش حیدرآبادی

صنعتِ بیدری

حیدرآباد دکن کے ایک قدیم پایۂ تخت محمدآباد بیدر کی بیدری صنعت کی کہانی بڑی دلچسپ ہے۔

بیدر حیدرآباد سے ۲ ۱ میل دور ہے جو آٹھویں نویں صدی میں بیدر شاہانِ بہمنیہ اور بریدیہ کا پایۂ تخت تھا۔ یہ اب ایک معمولی قصبہ رہ گیا ہے جس کی آبادی پندرہ بیس ہزار سے زائد نہیں ضلع کا مستقر ہے۔ البتہ اب یہ دکن کا مشہور ہوائی اڈہ ہے۔

یہاں صنعتِ بیدری قدیم زمانے سے ہے۔ اگر یہ مبالغہ سمجھا جائے تو بیدری اشیاء کا وجود ڈھائی سو سال سے کم نہیں جس کی تفصیل ہم سطور ذیل میں پیش کریں گے۔ بیدر میں اس کے علاوہ ایک اور صنعت بھی زور شور سے جاری تھی جس کا اب کوئی نام و نشان نہیں اور شاید سرکاری رپورٹوں میں بھی تذکرہ نہ ہو۔ وہ یہاں کے چمڑے کے زبردست کارخانے تھے، اور یہ کارخانہ دار نہایت متمول تھے۔ جن کے قدیم وضع کے عالی شان مکانات موجود ہیں، اور یہ محلہ نری گران کہلاتا ہے۔ اب اس محلے پر ایسی اُداسی برستی ہے کہ لوگ وہاں رہنا پسند نہیں کرتے۔ نری گروں کے چند خاندان موجود ہیں جو اب مفلوک الحال ہیں۔ بیان کیا جاتا ہے کہ اس صنعت چرم سازی کو مدراس کے چمڑے کے کارخانوں کی مسابقت نے تباہ و برباد کر ڈالی۔

دوسری صنعت یہاں کی بیدری فرشی جوتے ہیں، جو نہایت مضبوط، ہلکے، کسی قدر دہلی اور پنجابی وضع سے ملتے جلتے ہیں۔ ان جوتوں کا کمال یہ ہے کہ باوجود مضبوطی اور پائیداری کے نہایت ہلکے ہوتے ہیں۔ بہترین جوتے کا وزن چار یا پانچ تولے سے زائد نہیں ہوتا۔ کہا جاتا ہے کہ چمار ان جوتوں کے تلے آٹھ آٹھ روز تک کوٹتے ہیں۔ یہاں کا ایک مشہور چمار مولیا اب بھی زندہ ہے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ اُن چماروں کے بعض قدیم خاندان اب بھی ہیں جن کے پاس سلاطین بیدر کی تانبے کے پترکی سند تھی، جو شاہی جوتے بنایا کرتے تھے۔ افسوس تو یہ ہے کہ یہ صنعت بھی تباہ حال ہے۔

بیدری مصنوعات

مختصر الفاظ میں بیدری مصنوعات جست اور تانبے کے مرکب سے ڈھالی جاتی ہیں اور ان پر چاندی اور سونے کے تاروں سے سیاہ زمین پر پھول پتے کی منبت کاری ہوتی ہے۔

تاریخی پس منظر

بیان کیا جاتا ہے کہ بیدری صنعت بھی ہندو اور مسلم قدیم کلچر کی یادگار ہے۔ یہ بھی روایت ہے کہ اس کا موجد ایک گوسائیں تھا، جو اُس زمانے میں جب کہ یورپ جست کی دھات کو پگھلانا نہیں جانتا تھا ہندوستان کا یہ سادھو کیمیا گر جست اور تانبے کی دھات کو پگھلا کر معمولی چیزیں ڈھال لیا کرتا تھا۔ ہندوستان کے سادھو اور گوسائیں تو بڑے کیمیا گر اور جڑی بوٹیوں کے ماہر ہوتے ہیں۔ دکن کے کاکتیا خاندان کے راجہ پرتاپ رُد کے لئے اس کے گلدان استعمال کرتے تھے۔ ابتدا میں ان میں صفائی اور خوبصورتی نہ تھی۔ اس کے بعد آخری بہمنی دور (۹۳۴ھ/۱۵۳۰ء) اور بریدی و عادل شاہی دور (۱۶۸۶ء) میں مسلمان حکمرانوں نے دمشق، عراق اور ایران وغیرہ اسلامی حکومتوں کے صنعتی نمونوں کو پیش نظر رکھ کر اس میں بہت سی تبدیلیاں کیں۔ دمشق میں لوہے پر اس قسم کا کام ہوتا تھا۔ اور فرنچ زبان میں اس کو Damasquiner کہتے ہیں۔ جس کے معنی ہیں لوہے اور فولاد وغیرہ اشیاء پر سونے چاندی کا کام، اور اسی کا مرادف لاطینی Damacenus (دمشقی کام)

مگر دکن کے ماہرین نے اس میں یہ جدت کی کہ جست اور تانبے کا مرکب تیار کیا، اور یہ وہ مرکب ہے جس پر بقول مسٹر ای۔ ایل رہیڈ جدید ماہر سائنس، نقش و نگار کا کام بآسانی اور اچھی طرح ہو سکتا ہے۔ (دیکھو کتاب فلزیات مؤلفہ رہیڈ۔ ترجمہ عبدالمتین میکانیکل انجینئر) بیدری صنعت کے مستند قدیم تاریخی حالات کا پتہ چلانا دشوار ہے۔ آثار قدیمہ میں اس کا کوئی قدیم تاریخی نمونہ موجود نہیں ہے۔ تاہم اس قدر تصدیق ہوتی ہے یہ صنعت آج سے ڈھائی تین سو برس قبل زور شور سے چل رہی تھی۔ جس کے کارخانے نہ صرف بیدر میں بلکہ اورنگ آباد اور شمالی ہند میں بمقام لکھنؤ، پورنیا، مرشد آباد، وغیرہ میں قائم تھے جہاں اسلامی حکومتیں قائم تھیں۔ نواب آصف جاہ اوّل (وفات ۱۱۶۱ھ) کے زمانے کے ایک امیر نواب زین العابدین خاں المتخلص بہ دیوان نائطی، داماد نواب علی دوست خاں والی ارکاٹ نے جن کو نفیس اشیا کے جمع کرنے کا بہت شوق تھا، اپنی انشاء الموسوم بہ "عرضہ دیوان" میں ایک دوست کو لکھا ہے کہ اُن کے پاس ایک بیدری حقہ یا ڈبیہ اورنگشت اورنگ آباد سے تازہ تیار ہو کر تحفۃً آیا ہے۔ اور یہ خط قبل ۱۱۴۶ھ کا ہے۔ دوسری بیدری صنعت جو یہاں قابل ذکر معلوم ہوتی ہے وہ چوگان بیدری ہے جس کو ہمارے یہاں کے مشہور پروفیسر آغا حیدر حسن ہلوی نے نمائش بزم تاریخ جامعہ عثمانیہ منعقدہ ۱۹۳۰ء میں دوسری نفیس اشیا کے ساتھ پیش فرمایا تھا۔

ہمارا خیال ہے کہ یہ بیدری صنعت کے چوگان بیدر کے ترک سلاطین بریدیہ استعمال کرتے ہوں گے۔ جس کی تائید اس سے ہوتی ہے کہ بیدر میں مقبرہ علی برید ثانی (۹۸۶ھ) سے متصل ایک قدیم بازی گاہ چوگان بازی ہے جس کا نام "رن کھمب" ہے۔ اگر یہ میدان قدیم دوستوں چوگان بازی بقول بعض محققین مقدس مقام کے حدود ہوتے تو ہماری ناقص رائے میں اس پر اس کا ہندو مسلم مرکب نام "رن کھمب" یعنی لڑائی کا میدان یا تماشہ گاہ نہ ہوتا۔ (بیدر از غلام یزدانی مطبوعہ لندن)

بیدری مصنوعات، نہ صرف بیدر بلکہ لکھنؤ، پورنیا اور مرشد آباد سے ہندوستان کی مشہور نمائش گاہوں میں آج سے ستر سال تک بھیجی گئی تھیں۔ چنانچہ کلکتہ کی نمائش ۱۸۸۳ء میں حکومت حیدرآباد نے بھی ایک تپائی قیمتی ۱۹۵ روپے اور ایک بڑا اگالدان قیمتی ۱۳۵ روپے وغیرہ روانہ کی تھیں۔ (دیکھو بیدر گائڈ مرتبہ فرامرز جنگ مطبوعہ)

بیدری صنعت یورپین ماہرین سائنس جنہوں نے تحقیق معادن کے سلسلے میں دکن کا دورہ کیا ہے۔ مثلاً ڈاکٹر ہیبن (۱۸۱۲ء-۱۸۰۹ء) ڈاکٹر ہوائی سے ۱۸۲۵ء ڈاکٹر ہوائی سے ۱۸۲۹ء کپتان نیوبولڈ ۱۸۴۶ء-۱۸۳۶ء۔ ڈاکٹر بی۔ ہیاملٹن۔ ڈاکٹر اسمتھ کی آنکھوں کو خیرہ کرتی رہی ہیں (بیدر گائڈ) اور حال میں ہمارے استاد مسٹر ای۔ ای اسپنسر سابق پروفیسر جامعہ عثمانیہ نے تو ان کی نہایت ہی غیر معمولی تعریف کی ہے۔

نواب فرامرز جنگ (فرامرز رحمی) صوبہ بیدار بیدر، اپنے بیدر گائڈ مرتبہ ۱۸۹۲ء یعنی آج سے ساٹھ سال قبل لکھتے ہیں کہ اس صنعت کا پایۂ تخت اودھ، شہر لکھنؤ میں بڑا فروغ تھا۔ اس وقت زوال پذیر ہو گئی ہے۔ چنانچہ اودھ گزیٹیر میں اس کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ مگر اپریل گزیٹیر جلد ۱۶ مطبوعہ ۱۹۰۸ء میں لکھا ہے کہ اس صنعت بیدری کی لکھنؤ میں حوصلہ افزائی کی جا رہی ہے۔ یورپی بازاروں میں اس صنعت کی نکاسی کے لئے ہندوستان میں سب سے پہلے محکمۂ زراعت و حرفت صوبہ جات شمالی و مغربی نے کیا تھا، اور ملبورن کی نمائش کی وجہ سے ہندوستانی ظروف سازی نے مغربی بازاروں میں بلند مقام حاصل کر لیا تھا اور شملہ، کلکتہ، جے پور کی نمائش گاہوں میں بیدری مصنوعات کثرت سے فروخت ہوئیں جس کا ذکر شاید سررشتۂ صنعت کی حالیہ رپورٹوں میں نہیں ہے۔ البتہ مولوی محمود مرزا اسسٹنٹ افسر نے اپنی نشری تقریر میں فرمایا تھا کہ اس بیدری کام سے ملتا جلتا کام ایک زمانے میں سیالکوٹ، پورنیا، کشمیر، بھاگل پور میں بھی ہوتا تھا۔ مگر اس میں وہ نفاست نہیں ہوتی تھی جو خاص بیدر میں ہوتی تھی۔ مگر ایسی صنعتوں کی ترقی کے متعلق حکومت کی کم و بیش توجہ رہی ہے۔ چنانچہ بیدر آرٹ اسکول آج سے غالباً پچیس سال پیشتر قائم ہوا اور اب بھی موجود ہے۔ جہاں سے میسرز

طالب علم اس فن سے واقف ہو کر نکلے۔ اور اس صنعت کو ترقی دینے کی فکر میں ہیں۔ مگر بوجہ مفلسی و معاشی پستی اور ناقدریٔ اہل وطن، جیسا کہ چاہیئے ترقی نہیں ہوئی ہے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ اب اس کا تعلق انڈسٹریل ٹرسٹ فنڈ سے کر دیا گیا ہے۔ ایسی چار انجمنیں ہیں اور ہر انجمن کے ساٹھ رکن ہیں۔ اور بیدری مصنوعات اب تک دنیا کی ۴۶ نمائش گاہوں میں بھیجی جا چکی ہیں۔ جن میں قابل ذکر سڈنی، ٹورنٹو، لندن اور میلان کی نمائش گاہیں ہیں۔ اور آج سے ۱۵ سال قبل امپیریل انسٹیٹیوٹ لندن کی نمائشی گیلریز میں خاص طور پر "حیدرآباد کورٹ" کے نام سے ایک جداگانہ شعبہ قائم ہو چکا تھا۔

بیدری مصنوعات، ہمارے ملک کے مشہور اور ہر دلعزیز وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو کو بھی بہت مرغوب ہیں۔ یوں تو امریکن تجار اُن کی اپنے ملک میں درآمد کرتے رہتے ہیں۔ مگر حال ہی میں ایک امریکی تاجر نے چار ہزار ایش ٹرے خریدے ہیں۔ اسی طرح اگر اس صنعت کی حوصلہ افزائی ہوتی رہے اور تمام ملک ہندوستان میں اس کے کارخانے قائم کر دیئے جائیں اور اس فن کے ماہروں کی تعداد میں کثیر اضافہ ہو جائے تو بہت ممکن ہے کہ اس صنعت کی موجودہ ڈیڑھ لاکھ روپے کی آمدنی مراد آبادی ظروف کی طرح کروڑوں تک پہنچ جائے۔

اگر اس صنعت کا وجود ہندو کا کتیا دور سے تسلیم کیا جائے تو اس کی ایجاد کا زمانہ وسط تیرھویں صدی عیسوی ہے۔ اور بہمنی دور وسط چودھویں صدی یعنی کاکتیاؤں کے ایک صدی بعد شروع ہوتا ہے۔ ہم یہاں معدنی نقطۂ نظر سے اس پر کچھ روشنی ڈالتے ہیں۔

خطۂ دکن اپنی معدنیات میں قبل تاریخ زمانہ سے مشہور رہا۔ چنانچہ تعلقۂ آرمور ضلع نظام آباد (دکن) میں موضع کونا سمدرم کا فولاد اپنی قوت کے لحاظ سے اس قدر پائدار اور اعلیٰ قسم کا مشہور تھا کہ دمشقی تلواریں اس سے بنائی جاتی تھیں، اور ایرانی تجار اس کو ہندوستانی "ووز" کہتے تھے۔ اور عجائب خانہ حیدرآباد کی یادداشت میں جو فولادی تلواروں کے حصے میں آویزاں ہے یہ لکھا ہے کہ دکن کے فولاد کے اجزا مصر کے مشہور اہرام مصری میں بھی استعمال کئے گئے ہیں۔ بہرحال فولاد کی کانیں مشہور سنگارینی کے کوئلے کی کانوں کے مضافات۔ کلیانی (بیدر)، وقار آباد، کلور، کوہ انتت گیری، ماربی وغیرہ میں پائی جاتی ہیں۔

حجری اور آہنی دور کے درمیانی زمانہ مسی دور کی تانبے کی تلواریں بمقام راجن کلور (ضلع راچور) برآمد ہو چکے ہیں اور قدیم تانبے کی کانوں کے برآمدی آثار بھی بمقام چنترال (ضلع نلگنڈہ دکن) ورنگل، راچور، گدوال، تنگی تعلقہ شورا پور اور کوہ پرمانند (دکن) موجود ہیں، جس سے ظاہر ہے کہ قدیم زمانے میں تانبا دکن کی کانوں سے کثرت سے نکالا جاتا تھا اور ہندوستانی کان کنی کے بڑے ماہر تھے۔ صنعت بیدری کا اہم جزو تانبا، دکن ہی کی کانوں سے فراہم ہوتا تھا۔ مگر اس کا اہم جزو جست ہے، اب سوال یہ ہے کہ کیا جست کی کانیں بھی دکن میں موجود تھیں جس کا کوئی حوالہ ہم کو سررشتۂ معدنیات کی رپورٹ مرتبۂ خورشید مرزا صاحب ناظم معدنیات میں نہیں ملا۔ مگر انسائیکلو پیڈیا برطانیکا میں لکھا ہے کہ ایک دھات جو دراصل جست تھی اس کا ذکر ایک ماہر معدنیات لباویس نے ۱۵۹۷ء یعنی اواخر سولھویں صدی عیسوی میں کیا تھا جو ہندوستان سے متعلق تھا۔ خالص جست کی دریافت کا سہرا کس کے سر ہے پتہ نہیں چلتا۔ مگر انگلستان میں جست پگھلانے کا طریقہ ۱۷۳۰ء یعنی اٹھارھویں صدی کے نصف اول میں رائج ہوا، اور پہلا کارخانہ بمقام لیگ ۱۸۰۶ء میں قائم کیا گیا، اور جست کی کانیں جرمنی، آسٹریا ہنگری، بلجیم، ممالک متحدہ امریکہ اور انگلستان میں موجود ہیں۔ گویا جست کی دھات کی برآمد یورپ میں اٹھارھویں صدی عیسوی سے ہے۔ مگر ہندوستان میں جست کی کانوں کا وجود بقول مسٹر جے کاگن براؤن مؤلف "ہندوستان کی معدنی دولت" چودھویں صدی یعنی بہمنی دور کے زمانہ سے ہے۔ چنانچہ جست کی کانیں، راجپوتانہ میں بمقام ریاست اودے پور، زاور، وغیرہ موجود تھیں۔ ممکن ہے کہ قدیم زمانہ یعنی بہمنی اور بریدی دور میں اس دھات کی درآمد راجپوتانہ سے ہوا کرتی ہو۔ یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ سب سے پہلے اس دھات کا استعمال ایک ماہر معدنیات اور مشہور طبیب پراسیلسس جرمن (۱۴۹۰ء-۱۵۴۱ء)

نے کیا جس کو وہ نصف دھات کہتا ہے۔ اور یہ حکیم بھی نصف اقول سولھویں صدی عیسوی کا ہے۔

غرض بقول مسٹر کاگن براؤن جست کی دریافت اور برآمدگی دکن میں چودھویں صدی عیسوی سے ہے، تو دکن والے اس دھات کو انگلستان کے ماہرین (سنہ ۱۷۳۰ء) سے دو صدی قبل پگھلانا جانتے تھے۔ اور جست اور تانبے کی مرکب دھات سے مصنوعات بنانے کے ماہر تھے۔

محکمۂ صنعت و حرفت حیدرآباد کا خیال ہے کہ بیدری صنعت سولھویں صدی کے شروع میں اسلامی سلاطین کے زمانے میں عروج کو پہنچی۔ چنانچہ اس صنعت میں ایرانی مصوّری کے آثار اور ظروف کی تشکل ہیئت مثلاً صراحی، شمعدان، آفتابہ، حقّے، گلدان، چوگان وغیرہ ملتے ہیں۔ اور فولادی اشیاء پر منبّت کاری اسلامی قدیم تمدّن کی یادگار ہے۔ چنانچہ دمشق اس صنعت کی وجہ سے مشہور تھا۔ اور جست اور تانبے کی مخلوط دھات کی مصنوعات ہر دمشقی کام کا سہرا دکنی کاریگروں کے سر ہے۔ اور لکھنؤ میں بزمانۂ سلاطین اودھ ۱۸۵۶ء۔۱۷۷۷ء اس صنعت بیدری میں اس قدر اضافہ ہوا کہ منبّت کاری کے ساتھ ساتھ مچھلی کی علامت کو بھی جو شاہانِ دہلی کے عطا کردہ اعزاز ماہی مراتب سے متعلق تھی منقوش کرنا فنون لطیفہ اور علامات شاہی میں نمایاں کرنا باعثِ فخر سمجھنے لگے۔ (بیدر کا تذکرہ از فرار مرجنگ) اور دمشقی پھول پتّے کا کام ہوتا تھا (دیکھو امپیریل گزیٹیر جلد ۱۷ صفحہ ۱۹۸) اور بطور تحائف یورپین سیاحوں کو بطور تحفہ بیدری اشیاء عطا کی جاتی تھیں۔ اور ہماری ریاست حیدرآباد کی جانب سے بیدری خوبصورت اشیاء کا تحفہ ۱۸۷۵ء میں پرنس آف ویلز کی خدمت میں آج سے ۸۰ سال قبل پیش کیا گیا تھا۔ (امپیریل گزیٹیر جلد ۱۷)

مرکّب دھات کا طریقہ اور تناسب، مختلف مقامات میں

بیدر شریف میں:۔ بقول کپتان نیو بالڈ۔ اس مرکّب دھات کا تناسب، ایک حصّہ تانبا، اور ۱۶ حصّے جست اور بقول ڈاکٹر اسمتھ ایک حصّہ تانبا اور چار حصّہ جست تھا۔

لکھنؤ میں حسبِ معمول تانبے اور جست کے علاوہ برادۂ فولاد بھی ملایا کرتے تھے جس کا تناسب یہ تھا، تانبا ۴ اونس۔ فولاد ۴ اونس۔ اور جست ۱۲ اونس ہوتا تھا۔

پورنیا میں اس دھات کا تناسب ۹ حصّہ تانبا اور ۱۷۶ حصّہ جست۔

مرشد آباد میں: معمولی دھاتوں کے علاوہ یہاں قلعی اس کا اہم جزو رکھا گیا تھا۔

بقول ڈاکٹر بی، ہاملٹن ۶۰ ۳۳ ۱۳ گرین جست، ۶۰ ۴ گرین تانبا ۴ ۴ گرین سیسہ بھی تھا۔

ڈاکٹر بین کہتے ہیں کہ میں نے دیکھا ہے کہ بیدری کاریگر بوقت واحد اس مرکّب دھات میں ۱۶ اونس تانبا، ۴ اونس سیسہ اور ۲ اونس قلعی کو پگھلا کر اور مخلوط ہونے کے بعد اس میں ہر تین اونس اس مخلوط دھات میں ۱۶ اونس جست ملا کر اور پگھلا کر ایک کر لیتے ہیں

بہرحال ہر مقام میں اس مرکّب دھات کے تناسب میں کوئی سخت قواعد کی پابندی نہیں کی جاتی ہے۔

تقسیم عمل۔ صنعت بیدری میں ایک سہولت یہ بھی ہے کہ تقسیم کار کے ذریعے یہ کام انجام دیا جا سکتا ہے۔ مثلاً ڈھالنے والے۔ نقاش، پچی اور جلا دینے والے۔

مرشد آباد میں ابتدا ۱۷ ویں صدی میں گویا آج سے ڈیڑھ سو سال قبل الٰہی بخش نامی کاریگر نے اس صنعت کو وہاں رائج کیا۔ اس کے بعد اس کے شاگرد مچھن اور اس کے بیٹے منّا لال نے اس صنعت میں بہت سی ترمیم اور ترقی کی اور غدر سے قبل ۱۸۵۷ء تک اُن کا کارخانہ خوب چلتا رہا۔ اس کارخانے کے بعد یہ صنعت مسلمانوں کے ہاتھ میں آ گئی۔

پورنیا ——— میں اس صنعت کے ماہر کسار ذات کے اشخاص تھے۔ جو ان ظروف کو ڈھالتے اور اس کو سوہن سے گھس کر ہموار کر لیا کرتے تھے۔ اور کاریگروں کے ہاتھ ان کو فروخت کر دیا کرتے تھے۔ کساروں کے علاوہ اس صنعت کو سنار، دھنک، مزدور پیشہ اور کلال نیز مسلمان بھی انجام دیتے تھے۔

لکھنؤ میں یہ صنعت مسلمان کاریگروں کے ہاتھ میں تھی۔ البتہ

کسار سانچے بناتے اور ڈھلائی کر دیا کرتے تھے اور بقیہ کام مسلمان کاریگر کر لیا کرتے تھے۔

بیدر میں یہ صنعت لگایت فرقے کے ہندوؤں کے ہاتھ میں بھی رہی اور مسلمانوں کے ہاتھ میں بھی۔ بیدر میں آج سے تیس چالیس سال قبل ایک شخص رامنا اس صنعت کا بڑا ماہر تھا۔ اس وقت تقدس حسین سجاد پاشا بیدری اور مولوی معین الدین یا محی الدین مدرس آرٹ اسکول جواب شاید کراچی میں ہیں، وغیرہ اس کے بڑے ماہر ہیں۔ گلزار دکن فیکٹری اور تاج دکن فیکٹری نیز دو چار بیدر فیکٹریاں پسپا بیدری ورکز اور روحی ورکز خوب کام کر رہی ہیں۔ جن میں ساٹھ ستر کاریگر کام کرتے ہیں، جن کی اوسط مزدوری ماہانہ چالیس پچاس روپیہ سے زائد نہیں۔ مگر سررشتۂ صنعت و حرفت حکومت حیدرآباد کی خاص توجہ کی وجہ سے ان کی اجرت اور کارکردگی میں اضافہ ہو گیا ہے۔ چار صنعتی ہائے امداد باہمی قائم کر دی گئی ہیں۔ ہر انجمن میں ساٹھ کاریگر رکن انجمن ہیں۔ گویا اس طرح ڈھائی سو کاریگر شریک ہیں۔ اور یہ کاریگر ماہانہ سات ہزار روپے کا مال تیار کرتے ہیں۔ گویا ہر کاریگر ۳۰ روپے قیمت کا مال تیار کرتا ہے۔ جو ہماری رائے میں اطمینان بخش نہیں ہے۔ تاہم حکومت ہر قسم کی سہولت پیدا کر رہی ہے۔ سترہ ہزار کی مشینری خریدنے کی منظوری دی گئی ہے۔ تاکہ چاندی سونے کے تار بنانے اور ظروف کی جلاسازی میں سہولت ہو۔ اور نئے نئے نمونے کے ظروف ڈھالنے اور ان کو خوبصورت اور سبک بنانے اور موجودہ زمانے کے مذاق کے موافق بنانے کی کوشش جاری ہے۔ امریکہ اور یورپ میں اس کی مانگ بڑھ رہی ہے۔ چنانچہ ایک امریکی تاجر نے چار ہزار اشیاء ٹرے اسی ماہ میں خریدے ہیں۔

بناوٹ کی ترکیب۔ اس کے مختلف مرکبات کے متعلق ہم نے سطور بالا میں صراحت کر دی ہے۔ اس کا معمولی طریقۂ کار یہ ہے کہ مقررہ اور تلنبے کی ایک معینہ مقدار کی آمیزش سے ایک مخلوط دھات تیار کی جاتی ہے۔ اس کے بعد ظروف مختلف سانچوں میں ڈھال لئے جاتے ہیں۔ اور ان کو سوہن سے گھس کر صاف اور سڈول کر لیا جاتا ہے۔ اس کے بعد کوئلہ اور میٹھا تیل اس پر ملا جاتا ہے اور نیلے تھوتھے کو کیمیائی طریقے سے تر کر کے ان پر کندہ کاری کی جاتی ہے۔ اور خالص چاندی یا سونے کے تار ان میں جڑے جاتے ہیں۔ پھر ان ظروف کو ہلکا ہلکا گرم کر کے ان پر بیدر کی خاص مٹی سے جلا کی جاتی ہے جس سے جلد سیاہ ہو جاتی ہے۔ سیاہ زمین پر چاندی کے پھول پتے خوب نکھرتے ہیں۔ یہ جو کہا جاتا ہے کہ بیدر کے قلعہ کی مٹی سے اس مخلوط دھات کا رنگ بدل جاتا ہے۔ کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ بقول مؤلف سائیکلو پیڈیا برٹانیکا، جست اور سیسہ کی رنگ کی تبدیلی مٹی پر منحصر ہے اور یہ خاص مٹی کوئی نایاب نہیں ہے۔

مراد آبادی ظروف میں بھی مٹی ان کو جلا دینے میں استعمال ہوتی ہے۔ اس لئے یہ کہنا کہ اس ظروف سازی کے لئے سرزمین بیدر ہی مخصوص ہے، صحیح نہیں معلوم ہوتا۔ بلکہ ہندوستان میں اس صنعت کے کارخانے ہر جگہ قائم ہو سکتے ہیں۔

ڈرائنگ اور خاکوں کے لحاظ سے اس کی مختلف قسمیں ہیں۔

(۱) آفتابی کام۔ اس میں زمین چاندی کی اور پھول پتے جست کے ہوتے ہیں۔

(۲) پرداش کاری۔ چاندی کے پھول پتے بنا کر اس میں نقش و نگار کرتے ہیں۔

(۳) منبت کاری۔ اس میں چاندی کے پھول پتے زمین پر ابھرے ہوئے ہوتے ہیں۔ مگر اس کی کیاری میں محبت زیادہ اور لاگت بھی بڑھ جاتی ہے۔ غالباً یہ کام "زربلند" کہلاتا ہے جو لکھنؤ میں زیادہ مستعمل تھا۔ دیکھو (بیدر کا ٹڈ فرامز جنگ)

(۴) پھول جھڑی کا کام یعنی باریک تار کشی کا کام۔

(۵) لالہ کا کام۔ قدیم ڈیزائن میں تھا جس کا رواج اب کم ہے۔

(۶) جنگلہ کا کام۔ اس میں ہر قسم کے پھول پتے بنائے جاتے ہیں۔

ان کے علاوہ بیدر کے بابر پور نیا (جاگل پور) میں سب سے بہترین کام

(۷) گھر کی کہلاتا تھا۔ جس میں نقوش گہرے اور منبت کاری اچھی ہوتی تھی۔

(۸) کرنا بیدری ایک معمولی اور سادہ قسم کا کام بھی پورنیا میں کیا

جاتا تھا۔

(۹) زربلند لکھنوی۔ اس میں نقوش اُبھرے ہوئے ہوتے تھے۔ جو تنجاور (جنوبی ہند) کے تانبے اور برنجی ظروف کی نقل ہے جس میں چاندی کے نقوش سُرخ یا زرد تانبے پیتل کے زمین پر بنائے جاتے تھے۔ "زربلند" کا طریقہ وہی ہے جو مولی بیدری صنعت کا ہے۔ مگر اس میں نقوش سطح سے اُبھرے ہوئے ہوتے تھے جس سے زیبِ آرائش مقصود تھی۔ لکھنو میں یہ کام بجائے اصلی چاندی سونے کے جھوٹا کام بھی ہوتا تھا۔ (دیکھو بیدر کا نڈفرامرز جنگ)

برخلاف شہر بیدر کے، جہاں ان ظروف پر پھول پتے، نباتات کے نقوش ہوتے تھے۔ شمالی ہند میں رسم و رواج کا بھی ان میں اثر تھا۔ چنانچہ پورنیا میں زیورات صنعت بیدری مینی طرز کے ہوتے تھے۔ جن کے متعلق مسٹر جارج برڈوڈ کا خیال ہے کہ یہ پورنیا کے مضافات میں سکم اور بھوٹان کا اثر تھا۔

لکھنؤ میں پھول پتوں کے علاوہ مچھلی کا نمونہ، اسلامی شرفاً ورؤسا کے مذاق کی وجہ سے تھا۔ جن کو ماہی مراتب کا اعزاز سلاطین دہلی نے عطا کیا تھا۔

خاص بیدر میں، ان ظروف پر بعض مناظر بھی منقوش ہوتے تھے۔ مثلاً آفتابہ کے ظرف پر سمندر لہر کے نشان۔ مرغ سیہ تہ نشان۔ سمندر لہر و مرغان آبی۔ تارکشی کے کام میں جس کے قدیم نمونے پروفیسر آغا حیدر حسن صاحب دہلوی کے پاس موجود ہیں اور یہ نمائش بزم تاریخ سنہ ۱۹۳۰ء/۱۳۴۸ھ میں رکھے گئے تھے۔

غرض یہ تو اپنے اپنے مذاق پر منحصر ہے اور صنّاع سینکڑوں ڈیزائن اور جدتیں پیدا کرسکتے ہیں۔

موجودہ زمانے کے مذاق کے لحاظ سے سررشتۂ صنعت و حرفت کے حسب ہدایت بجائے بڑے بڑے وزنی اُگالدان اور حقّوں، اور سیلا بچیوں کے مختلف وضع قطع کے سگریٹ کیس۔ ایش ٹرے، ہاتھ اور گلے کے بٹن، ساڑی پن۔ آئینہ سنگھار۔ برش، چوڑیاں، نکلیس، پاندان۔ کاغذ کاٹنے کی چھریاں، پیپر ویٹ وغیرہ سینکڑوں اشیا ایسی تیار کی جاسکتی ہیں جن کی کھپت مختلف ممالک کے بازاروں میں ہوسکتی ہے۔

آج کل صنعت بیدری کے اہم ادارے حیدرآباد کا آرٹ انڈسٹریز کو جو اس صنعت بیدری سے ڈیڑھ لاکھ سالانہ کی آمدنی ہو رہی ہے اس میں معتدبہ اضافہ ہوسکتا ہے بشرطیکہ حکومت لاکھوں کا سرمایہ فراہم کرے۔ اور کم از کم بڑے بڑے شہروں میں ملکی صنعتوں کے کالج قائم کئے جائیں جس سے ملکی صنعت کو فروغ، قدیم فن کاری کا احیاء اور ملک کے بیروزگاروں کو کچھ کام فراہم ہوسکتا ہے۔

پھٹے پُرانے اوراق کو قابلِ استعمال حالت میں رکھنے کیلئے نئے طریقے کی دریافت

بھارت میں قدیم دستاویزات کے تحفظ سے متعلق شعبے نے ان دستاویزات کے پھٹے پُرانے اوراق کو پھر سے قابلِ استعمال حالت میں لانے کے لئے ایک نیا طریقہ دریافت کیا ہے۔ اس طریقے کی خاص خوبی یہ ہے کہ اس کے لئے کسی ٹیکنیکل سامان کی ضرورت پیش نہیں آتی اور انفرادی طور پر بھی چھوٹے پیمانے پر اس طریقے پر عمل کیا جاسکتا ہے۔ مشین کے ذریعے پھٹے اوراق کی بحالی کے کام میں یہ مشکل پیش آتی ہے کہ پرانے باریک اوراق کو تین سو ڈگری فارن ہائٹ تک کا درجہ حرارت اور فی مربع انچ تین سو سے ایک ہزار پونڈ تک کا دباؤ برداشت کرنا پڑتا ہے جس سے ان اوراق کو نقصان پہنچ سکتا ہے۔ نئے طریقے کے مطابق ان اوراق کو شیشے کی نرم سطح پر رکھ کر ایسے طریقے سے کیمیائی عمل کیا جاتا ہے کہ حریری (باریک) کاغذ ان پر اچھی طرح جم جاتا ہے اور اس باریک کاغذ میں سے دستاویزات کے اصل اوراق کے تمام حروف بآسانی پڑھے جاسکتے ہیں۔ انڈین آرکیوز کے آئندہ شمارے جلد ۷، نمبر ۲ میں اس عمل کی تفصیلات شائع کی جائیں گی۔

رُوس کے چشم دید حالات

چند ماہ ہوئے مجھے چوتھی بار سوویٹ یونین جانے کا اتفاق ہوا۔ اس بار اُس کے وسط ایشیائی حصّوں یعنی ازبکستان، تاژکستان اور قزاقستان بھی گیا اور کاتی وقت وہاں کے گذشتہ اور موجودہ حالات جاننے میں صرف کیا۔ وہاں کے اخلاقی، تعلیمی اور مالی وغیرہ حالات کا بالتفصیل بیان طولانی ہوگا۔ اس لئے مختصراً چند باتوں کا ذکر کرتا ہوں۔

حالات موجودہ کا صحیح اندازہ لگانے کے لئے ضروری ہے کہ حالات زمانۂ گزشتہ بھی پیشِ نظر ہوں۔ اس لئے ان حالات کو تین حصّوں میں تقسیم کرتا ہوں۔

(۱) سلطنت زار روس قائم ہونے سے پیشتر۔

(۲) دوران سلطنت زار روس یعنی تقریباً ۱۸۶۶ء سے ۱۹۱۷ء تک۔

(۳) بعد انقلاب عظیم۔ یعنی سلطنت زار روس ختم ہونے کے بعد ۱۹۱۷ء سے آج تک۔

پہلی حالت میں تینوں حصّوں میں فیوڈل سسٹم یعنی جاگیر داری سی تھی۔ باشندے مسلمان تھے اور آج بھی ہیں۔ مُلّاؤں کا زور تھا اور انھیں کے زیر اثر تھے۔ ان میں قازقستان والے خانہ بدوش تھے۔ اس لئے رواج پردہ کم تھا۔ بقیہ دونوں حصّوں میں سخت پردہ تھا۔ تعلیم زبانِ عربی میں دی جاتی تھی۔ عموماً قرآن شریف حفظ کر پڑھائی جاتی۔ معدودے چند امراء کے لڑکے اُستادوں سے گھروں پر پڑھتے اور درمیانی اوپری طبقہ کے مکتبوں میں سمرقند و بخارا میں دارالعلوم تھے جن میں اُمراء کے لڑکے تعلیم پاتے۔ عوام اور غرباء کے لئے کوئی انتظامِ تعلیم نہ تھا۔ لڑکیوں کو تعلیم قطعی نہ دی جاتی۔ ان کی شادی مرضیٔ والدین پر منحصر تھی۔ روپیہ اور مویشیوں کے معاوضے میں نکاح کر دیا جاتا۔ وہ وراثت سے محروم تھیں۔ کسی قسم کی جائداد پر کوئی حق نہ تھا۔ بیوہ ہو جانے پر شوہر کے بھائی کی بیوی بنا دی جاتیں۔ اگر اُس کی منظور نظر نہ ہوتیں تو ان کی حیثیت مالکہ اور خادمہ کے درمیان ہو جاتی۔ حکومت سے محروم گھر کا کام کاج کرتیں۔ روٹی کپڑا مل جاتا۔

حفظانِ صحت کا بھی کوئی انتظام نہ تھا۔ معدودے چند حکیم ہوتے۔ بعض بہت قابل اور مشہور بھی ہوتے۔ لیکن کمی زر کے باعث صرف شرفا یا امراء ہی اُن سے مستفید ہوتے۔ عوام کا علاج مُلّاجی کرتے جو عموماً گنڈے، تعویذ، جھاڑ پھونک وغیرہ سے کام لیتے اور کچھ ادویہ بھی استعمال کراتے۔ مریض کی صحت یابی سے مُلّاجی کی شہرت ہو جاتی۔ حسبِ حیثیت نذرانہ و شکرانہ بھی ملتا۔ اگر مریض مر جاتا تو مُلّاجی گردن خم کرتے۔ افسردہ شکل بناتے۔ ڈاڑھی پر ہاتھ پھیرتے اور سوئے آسمان نگاہ اُٹھا کر افسوسناک لہجے میں غمگین آواز سے فرماتے۔

"میں نے تو کوشش میں کوئی کمی نہیں کی۔ مگر اُسے ایسا ہی منظور تھا۔ مشیتِ ایزدی میں کیا چارہ۔ صبر کرو۔ اللہ اجر دے گا۔ رسم ادا کرو۔ میں بھی مرحوم کے حق میں دعا کرتا ہوں۔ اللہ اُسے غریقِ رحمت کرے۔" اور اس صورت میں بھی کچھ نہ کچھ مُلّاجی لے مرتے۔ جیمچک۔ ہیضہ۔ ملیریا۔ ٹائیفائڈ و دیگر وبائی بیماریوں کا دور دورہ رہتا اور عوام ان کا شکار ہوتے۔ غریبوں کے لئے نہ حسبِ ضرورت مکان تھے۔ نہ کھانے اور کپڑے کا انتظام۔

سلطنت زار قائم ہونے پر اخلاق میں قدرے ترقی ہوئی۔ روسیوں نے کاروبار شروع کیا۔ درمیانی طبقہ کے کچھ لوگوں نے بحیثیت اُن کے کارکن یا خود بخود اُن کا مال فروخت کر کے اپنی مالی حالت کسی قدر سنبھال لی۔ روپیہ کھینچ کر باہر جانے لگا۔ عوام اور مستورات کی حالت بدستور رہی۔

حفظانِ صحت کے سلسلے میں عوام کے لئے کچھ انتظام نہ ہوا۔ البتہ فوجوں اور افسروں کے لئے جو ہسپتال قائم ہوئے اُن سے معمولی سے چندہ امراکو یہ فائدہ ہوا کہ فیس دے کر ڈاکٹری علاج کرا سکتے تھے۔

بعد انقلابِ عظیم اُور ترقی تیزی کے ساتھ شروع ہوا۔ صنعت و حرفت، زراعت، تعلیم و حفظانِ صحت کے محکمے قائم ہوئے۔ صنعت و حرفت کے کارخانے بنائے گئے۔ روپیہ باہر جانا بند ہوا۔ عوام کا اخلاق اور مالی حالت سنبھلنے لگی۔ کپاس کی پیداوار بھی بڑھی اور بنولہ نکال کر جو باہر بھیج دی جاتی تھی اُس سے وہیں کارخانوں میں کپڑا تیار ہونے لگا۔ اون اور ریشم کی پیداوار بھی بڑھی۔ اونی و ریشمی کپڑے بھی وہیں کارخانوں میں بُنے جانے لگے۔ ان کارخانوں میں مشینوں سے ہر قسم کا بہت عمدہ کپڑا تیار ہونے لگا، اور باشندگان کو کپڑوں کی تکلیف جاتی رہی۔ جو ضرورت سے زائد ہوتا باہر بھیج دیا جاتا۔ کواپریٹو سوسائٹیاں بنائی گئیں۔ کاشتکاری کے یک جائی فارم قائم ہوئے۔ اسی طرح مویشیوں۔ بھیڑوں۔ بکریوں اور مرغیوں کے یک جائی فارم بھی بنے۔ میووں اور ترکاریوں کی پیداوار بھی بڑھی۔ ہر قسم کی غذا باشندگان کی ضرورت سے زائد پیدا ہونے لگی۔ کھانے اور کپڑے کی تکلیف جاتی رہی۔ مالی حالت بھی بہتر ہوگئی۔ رہنے کے لئے حسبِ ضرورت مکان بھی بن گئے۔ اب کوئی شخص ایسا نظر نہ آئے گا جسے بظاہر کسی قسم کی مالی تکلیف ہو۔ ضرورت سے زائد ہر چیز باہر بھیج کر اُس کے دام آجاتے ہیں۔

تعلیم کے لئے ہر قسم کے اسکول اور دارالعلوم کھُل گئے ہیں۔ جن میں ہر قسم کی صنعت و حرفت، کاشتکاری۔ دستکاری، مشینیں۔ اسلحہ۔ ہوائی جہاز وغیرہ بنانا۔ انجینیری۔ ڈاکٹری۔ جراحی وغیرہ سبھی سکھایا جاتا ہے اور ہر قسم کے ماہر نوجوان ہر سال تیار ہوتے جاتے ہیں۔

پردہ ٹوٹ گیا۔ عورتوں اور مردوں کے حقوق مساوی کر دئے گئے۔ لڑکوں کے ساتھ ساتھ لڑکیوں کو بھی ہر قسم کی تعلیم ملنے لگی۔ سات سال تک ساری سوویٹ یونین میں تعلیم مفت اور لازمی ہے۔ اس سال سے خاص شہروں میں دس سال کے لئے لازمی اور مفت ہوگئی ہے۔ اور جلد ہی کُل سوویٹ یونین میں دس سال کے لئے لازمی اور مفت ہو جائے گی۔

شروع میں لڑکیوں کو پردہ توڑنے اور تعلیم حاصل کرنے کے لئے سخت مصائب کا سامنا کرنا پڑا۔ ملاؤں کے زیرِ اثر والدین، پردہ توڑنے اور تعلیم حاصل کرنے کے سخت خلاف تھے۔ وہ لڑکیاں جو پردہ توڑنے اور حصولِ تعلیم کے لئے بضد ہوتیں اُنھیں ہر طرح سمجھایا جاتا اور اگر نہ مانتیں تو دھمکایا جاتا۔ اس پر بھی اگر اپنی ضد پر اڑی رہتیں تو ملا جی کا وعظ سنوایا جاتا۔ پھر بھی نہ مانتیں تو کم سنی ہی میں شادی کر دی جاتی یا ملّا صاحب کے ۔۔۔۔ مُرید ان کے اشارے پر لڑکی کو اس عالمِ فانی سے عالمِ جاودانی کوچ نہ کر دیتے۔ کچھ لڑکیوں نے خود مجھ سے بیان کیا، اُنھیں پردہ توڑنے اور تعلیم حاصل کرنے میں انتہائی دقتوں اور مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ اگر وہ گھر سے بھاگ کر اپنے کسی انقلاب پسند عزیز کی پناہ میں نہ جاتیں تو ہرگز اپنے ارادوں میں کامیاب نہ ہوتیں۔

تعلیمی سلسلے میں یہ انتظام بھی سوویٹ یونین نے کیا ہے کہ ہر ضلع کے باشندگان کا ذریعۂ تعلیم اُن کی مادری زبان ہے۔ اب مردوں کے دوش بدوش عورتیں بھی اُستانیاں، پروفیسر، ڈاکٹر، انجینیر، سائنس داں، حاکم۔ افسر۔ وزیر۔ ممبر کونسل حتیٰ کہ یونین کی سب سے بڑی کونسل کی ممبر بھی ہیں۔

حفظانِ صحت کے محکمے نے کافی اسپتال کھول دئے ہیں۔ چھوٹے مقامات میں بھی بچہ جننے کا انتظام ہے۔ حاملہ ہونے پر عورت پانچ ماہ تک ہر مہینے ڈاکٹری امتحان کراتی ہے اور چھٹے مہینے سے ہر پندرھویں دن۔ اگر پہلی بار حاملہ ہوئی ہے تو ڈاکٹر برابر نباہ کرتا رہتا ہے کہ کیا احتیاط برتے۔ تاکہ وہ خود اور بچہ دونوں تندرست رہیں۔ اور وضعِ حمل کے وقت بھی تکلیف نہ ہو۔ وضعِ حمل سے پانچ ہفتہ پیشتر اور چھ ہفتہ بعد تک عورت کام نہیں کرتی۔ ان دنوں کی تنخواہ یا مزدوری اُسے پوری ملتی ہے۔ ہونے والی ماں مناسب وقت پر ہسپتال چلی جاتی ہے اور بعد فراغت وقتِ مقررہ ہسپتال میں گذار کر بچے کے ساتھ گھر واپس آتی ہے۔ بسلسلۂ ولادت عام طور پر نہ اب بچے ہی ضائع ہوتے ہیں نہ ماؤں کی تندرستی بگڑتی ہے۔

دبائی اور چھوت کی بیماریوں کا یہ حال ہے کہ ہیضہ اور ٹائیفائڈ اب بہت کم ہو گئے ہیں اور چیچک۔ پلیگ۔ ہیضہ وغیرہ نیست و نابود ہیں۔ اشیائے خوردنی کا پہلے ہی ڈاکٹری معائنہ کر لیا جاتا ہے اور کوئی مضرِ صحت چیز بازاروں یا ہوٹلوں میں نظر نہیں آتی۔ شہر و قصبات وغیرہ میں صفائی کا انتظام معقول ہے۔

اگر دیہات کا ڈاکٹر کسی مریض کے علاج کے لئے کسی ماہر ڈاکٹر کی ضرورت

سمجھتا ہے تو فوراً محکمہ متعلقہ کو شہر میں فون کرتا ہے کہ فلاں مقام پر فلاں شخص ایسے مرض میں مبتلا ہے کہ اس کا داخلہ ہسپتال میں ضروری ہے۔ اطلاع پاتے ہی وہاں سے ڈاکٹر۔ نرس و دیگر ضروری ملازمان ہوائی جہاز سے روانہ ہو کر مریض کو بہ حفاظت و بہ آرام لاکر داخل ہسپتال کر دیتے ہیں۔ بعد صحت اگر معالج ضروری سمجھتا ہے تو مریض کو کسی ایسے مقام پر بھیج دیتا ہے۔ جہاں کچھ عرصہ رہ کر وہ اپنی کھوئی ہوئی قوت حاصل کرلے۔

ہر فرد و راہ ملازم کا سال میں کم از کم ایک بار ڈاکٹری امتحان ہوتا ہے۔ کوئلے وغیرہ کی کانوں میں کام کرنے والوں کا ہر مہینے ایکس رے ہوتا ہے۔ اگر ڈاکٹر کی رائے میں کسی کو آرام کی ضرورت ہے تو وقت مقررہ کے لئے وہ آرام گاہ بھیج دیا جاتا ہے۔ یہ طاقت حاصل کرنے اور آرام گاہوں کی عمارتیں نہایت پُر فضا مقامات پر تھری آب و ہوا میں بنی ہوئی ہیں۔ ان کی آرائش و زیبائش اور ان کا انتظام دُنیا کے مالدار ترین لوگوں کے محلات سے بدرجہا بہتر ہے۔ حسب ضرورت وقت گزار کر جب ان جگہوں سے کوئی شخص نکلتا ہے تو اگر ڈاکٹر مناسب سمجھتا ہے اس بات کی رپورٹ کر دیتا ہے کہ اُسے پھر اس کام پر نہ لگایا جائے جو اُس کے لئے مضر صحت ہوگا، اور ایسی صورت میں اُسے دوسرے کام پر تعینات کر دیا جاتا ہے۔ اس تمام معالجہ وغیرہ کا صرفہ یونین برداشت کرتی ہے۔

ضروریات کی اشیاء روز بروز سستی ہوتی جاتی ہیں۔ مزدوری بڑھتی جاتی ہے اور ٹیکس بھی کم ہوتے جاتے ہیں۔ لوگ فارغ البال نظر آتے ہیں۔ ملازمین اپنے کو عوام کا خدمت گذار سمجھتے ہیں۔ اور اپنے فرائض کی انجام دہی محنت۔ تن دہی، ایمان داری اور پوری قابلیت سے کرتے ہیں بچے بچے کے دل میں حُبِّ وطن اور برادرانِ وطن سے محبت و ہمدردی کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔ لوگ مہمان نواز ہیں اور غیر ملکی آدمیوں سے برادرانہ محبت و ہمدردی سے پیش آتے ہیں۔

ریلوے میں رشوت ستانی سے متعلق تحقیقاتی کمیٹی کے فرائض

ریلوے میں رشوت ستانی سے متعلق تحقیقاتی کمیٹی کے صدر آچاریہ جے۔ بی کرپلانی نے کمیٹی کے فرائض اور دائرۂ عمل کے بارے میں ایک بیان دیا ہے جس کا خلاصہ درج ذیل کیا جاتا ہے۔

"ریلوے کو پیشن انکوائری کمیٹی کے صدر کی حیثیت میں مجھے متعدد خطوط موصول ہوئے ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ لوگ اس کمیٹی کے فرائض اور دائرۂ عمل کے بارے میں غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔ بعض اشخاص نے رشوت سے متعلق اپنے انفرادی معاملات میرے سامنے رکھے ہیں، اور دادرسی کے لئے درخواست کی ہے۔ اسی طرح ریلوے ملازمین نے تحقیقات کی غرض سے معروضہ بداعمالیوں، خویش پروری اور ناجائز رعایتوں کے بارے میں اپنی ذاتی شکایات سے مجھے مطلع کیا ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شکایت کنندگان کو اس امر کا احساس نہیں کہ کمیٹی ایسے معاملات کی تفتیش کر کے کسی قسم کا فیصلہ صادر کرنے کی مجاز نہیں ہے۔ کمیٹی کے سپرد صرف مندرجہ ذیل امور کی تحقیقات ہے۔ (۱) پبلک سے برتاؤ کے سلسلے میں ریلوے ملازمین کی بداعمالیاں۔ (۲) متعلقہ عملے کے ہتھکنڈے (۳) بداعمالیوں کے اسباب (۴) پبلک کی ذمہ داری (۵) قواعد و ضوابط میں خامیاں جن کی وجہ سے بداعمالیوں کی گنجائش ہے اور (۶) اس بدعت کو کلیتاً ختم کرنے کے لئے انتظامیہ اور قانونی اقدامات کی تجاویز ——— ظاہر ہے کہ کمیٹی کو صرف اس قدر اختیار حاصل ہے کہ مناسب اقدامات تجویز کرے۔ لیکن ان پر عمل کرنا حکومت کا کام ہے۔ سوال نامے کے جواب میں یا شہادت کے دوران میں پیش کی گئی مختلف مثالوں کو کمیٹی محض اپنے فرائض سے متعلق صحیح نتائج پر پہنچنے کے لئے مواد کے طور پر استعمال کر سکتی ہے۔ شکایات دور کرانے کے لئے کمیٹی کی بجائے متعلقہ حکام یا پولیس سے رجوع کیا جانا چاہیئے۔ تاہم رشوت ستانی، خویش پروری وغیرہ کے انفرادی معاملات سے کمیٹی کو آگاہ کرنا لازمی ہے۔ تاکہ ریلوے میں پائی جانے والی بداعمالیوں کی حد اور نوعیت کا اندازہ لگایا جا سکے۔ کمیٹی جن اشخاص کو شہادت کے لئے منتخب کرے گی۔ اگر وہ چاہیں تو ان کو بند کمرے میں شہادت دینے کا موقع دیا جائے گا۔

منوّر لکھنوی

طُلوعِ کُل

شبھو ناتھ شیش کی ایک نظم سرودے सरोदय کا منظوم عکس

نقابِ ظلمت سرک رہی ہے تجلّیاں مسکرا رہی ہیں
چہک اٹھیں مست ہو کے چڑیاں دمِ سحر گیت گا رہی ہیں
تبسّمِ دل رُبا کی لذّت شکر سی ہر دل میں گھولتی ہے
دمِ سحر مسکرا کے آنکھیں کلی کی جب بھی کھولتی ہے
تجلّیِ روحِ نو کا جلوہ شریکِ انوارِ مہر و مہ ہے
ہزار ہا تابشوں کا عالم لباسِ ذرّیں میں تہ بہ تہ ہے
حصارِ دل میں بھرا ہُوا اک محبّتوں کا محیطِ اعظم
وہ اس کی موجوں میں بے کلی سے تمام تر جُنبشوں کا عالم
ہوائیں مستانہ چل رہی ہیں لطیف جھونکوں میں کیف مل ہے
زمانہ بیدار ہو رہا ہے یہی تو وقتِ طلوعِ کُل ہے
خمار آلودگی میں آنکھیں دُھلی ہیں کرنوں کے آبِ زر سے
ہے یہ جو سبزے کی لہلہاہٹ کھلی ہیں اس کے حسیں اثر سے
جو عالمِ خواب کے تھے اجزا شمیمِ گُل سے نکھر رہے ہیں
حقیقتیں گونجنے لگی ہیں ازل کے گیسو سنور رہے ہیں
صدائیں وجد و کی وجد آور فلک پہ لہرا رہی ہیں کیا کیا
نوائیں آسا وری کی دل کش عروج پہ آ رہی ہیں کیا کیا
وہ سارے[1] ماپا دھا سا ماپا گائے کے زمانے میں شور غل ہے
نہ کیوں ہوں بچے جے کے لب پہ قرنے یہی تو وقتِ طلوعِ کل ہے

مہورت بیدار برمھ[2] کی ہے نظر کشادہ ہے سادھنا کی
نفس نفس نیند سے ہے فارغ ہے موج ایسی ہی کچھ ہوا کی
زمین سے کہہ رہی ہیں کرنیں حکایتِ لطیفِ آسمانی
کہیں تھے کیوں کہیں رُکے کیوں کہ یہ فسانہ ہے جاودانی
اُمنڈ کے آتے ہیں قمریوں سے زمیں پہ ہشیاریوں کے نغمے
سکوت ٹوٹا ہے چہچہاتے ہیں جہاں پہ بیداریوں کے نغمے
تراوشِ نغمہ ہو رہی ہے حسین دل کے حزیں کنول پر
ہزار دلداگانِ نزہت نثار اس احسریں کنول پر
شریکِ نیرنگیٔ تماشا تشفّیِ کمالِ کُل ہے
یہی تو وقتِ طلوعِ کُل ہے یہی تو وقتِ طلوعِ کل ہے
پڑے ہو کس سوچ میں تم آخر یہ غور کیا ہے یہ فکر کیا ہے
کشادہ ہو جائے بابِ مژگاں زمانہ بیدار ہو رہا ہے
نوید دیتی ہے تم کو فطرت جمالِ اپنا خود آ کے دیکھو
یہ سب ہے جلوہ گری تمہاری نظر ذرا تو اُٹھا کے دیکھو
ہو تم تو امرت کی رَو سے پیدا دوام کے راحتِ جگر ہو
تمھیں سے تشکیلِ دَورِ نو ہے تم اس کے معمارِ مقتدر ہو
جو دل کا دربند ہے وہ کھولو صدا یہ آوازۂ دُہل ہے
کھلی ہیں ارض و سما کی آنکھیں یہی تو وقتِ طلوعِ کُل ہے

---

[1] سرگم کے کچھ بول جو اصل مصنّف نے اپنی نظم میں ضبط کئے ہیں۔
[2] برمھ مہورت میں نے اپنی ایک نظم طلوعِ سحر میں جو میری مطبوعہ کائناتِ دل میں شامل ہے، اردو میں اس کا ترجمہ لمحاتِ یزدانی کیا ہے۔

رام برکش بینی پوری

(ہندی سے ترجمہ)

رضیہ

کانوں میں چاندی کی بالیاں، گلے میں چاندی کی ہیکل، ہاتھوں میں چاندی کے کنگن، پیروں میں چاندی کے پازیب — پوری آستین کی بوٹے دار قمیض پہنے، کالی ساڑھی کے آنچل کو گلے میں لپیٹے، گورے چہرے پر لٹکتے ہوئے کچھ بالوں کو سنبھالنے میں پریشان، وہ چھوٹی سی لڑکی، جو اس دن میرے سامنے آکر کھڑی ہوگئی تھی — اپنے بچپن کی اس رضیہ کی یاد تازہ ہوگئی، جب میں ابھی اس دن اچانک اس کے گاؤں میں جا پہنچا۔

ہاں یہ میرے بچپن کی بات ہے۔ میں قصائی خانے سے رسّی تڑا کر بھاگے ہوئے بچھڑے کی طرح اچھلتا ہوا ابھی ابھی اسکول سے آیا تھا اور برآمدے کی چوکی پر اپنا بستہ، سلیٹ پٹک کر خالہ سے چھٹ میں پکے ٹھکوے لے کر کترکتر کر کھاتا ہوا ڈھینکی پر جھولا جھولنے کا مزا پورا کرنا چاہ رہا تھا کہ ادھر سے آواز آئی — ہوا کا کھانا مت چھو دینا — اور اسی آواز کے ساتھ میں نے دیکھا، یہ عجیب روپ رنگ کی لڑکی مجھ سے دو تین گز آگے کھڑی ہوگئی۔

میرے لئے یہ روپ رنگ سچ مچ عجیب تھا۔ کھٹیک ہندوؤں کی بستی ہے میری اور مجھے بیلے ہاٹ میں بھی زیادہ نہیں جانے دیا جاتا۔ کیونکہ سُنا ہے بچپن میں میں ایک بیلے میں کھو گیا تھا۔ مجھے کوئی اوگھڑ لئے جا رہا تھا کہ گاؤں کی ایک لڑکی کی نظر پڑی اور میری نجات ہوئی۔ میں باپ ماں کا اکلوتا جو ہوں۔ اس لئے بہن کے اس اکلوتے یتیم بچے کو خالہ اپنی آنکھوں میں سمو کر رکھتی۔ میرے گاؤں میں بھی لڑکیوں کی کمی نہیں، لیکن نہ اُن کا یہ لباس، نہ یہ روپ رنگ۔ میرے گاؤں کی لڑکیاں کانوں میں بالیاں کہاں ڈالتیں، اور پوری آستین کی قمیض پہننے بھی انہیں کبھی نہیں دیکھا۔ اور گورے تو بلے ہیں، مگر اس کی آنکھوں میں جو ایک عجیب قسم کا نیلاپن دیکھتا وہ کہاں؟ اور سارے چہرے کی کاٹ بھی کچھ نرالی ضرور — تبھی تو میں اُسے ایک ٹک گھورنے لگا۔

یہ بولی تھی رضیہ کی ماں، جسے اکثر ہی اپنے گاؤں میں چوڑیوں کی ٹوکریاں لے کر آتے دیکھتا آیا تھا۔ وہ میرے آنگن میں چوڑیوں کا بازار پسار کر بیٹھی تھی اور کتنی بہو بیٹیاں اُسے گھیرے ہوئے تھیں۔ منہ سے مول تول کرتی اور ہاتھ سے خریداروں کے ہاتھ میں چوڑیاں چڑھاتی وہ مسودے پٹائے جا رہی تھی۔ اب تک اسے اکیلے ہی آتے جاتے دیکھا تھا۔ ہاں کبھی کبھی اس کے پیچھے کوئی مرد ہوتا جو چوڑیوں کی ٹوکری ڈھوتا۔ یہ بچی آج پہلی بار آئی تھی اور نہ جانے کس طفلانہ تجسس نے اسے میری طرف کھینچ لیا تھا۔ شاید وہ یہ بھی نہیں جانتی تھی کہ کس کے ہاتھ کا کھانا کسی کے نزدیک پہنچنے ہی سے چھوجاتا ہے! ماں جب اچانک چیخ اٹھی، وہ ٹھٹکی سہمی — اس کے پیر تو وہیں بندھ گئے — لیکن اس میں شک نہیں کہ اسی ٹھٹک نے اسے میرے بہت قریب پہنچا دیا۔

میری خالہ جھٹ اٹھیں، گھر میں گئیں اور دو ٹھکوے اور ایک کسار لا کر انھوں نے اس کے ہاتھوں میں رکھ دئے۔ وہ لیتی نہیں تھی۔ مگر اپنی ماں کے اصرار پر ہاتھ میں لے تو لیا، لیکن منہ سے نہیں لگایا۔ میں نے کہا کھاؤ نہ، کیا تمھارے گھر میں یہ سب نہیں بنتے؟ چھٹہ کا برت نہیں ہوتا؟ کتنے سارے سوالات، لیکن سب کا جواب "نا" میں ہی اور وہ بھی منہ سے نہیں ذرا سا گردن ہلا کر! اور گردن ہلاتے ہی چہرے پر بکھرے بالوں کی جو لٹیں ہل پل اٹھتیں، وہ انھیں گھبرا کر سنبھالنے لگتی۔

رضیہ، چوڑیہارن! وہ اسی گاؤں کی رہنے والی تھی۔ بچپن میں اسی گاؤں میں رہی، اور جوانی میں بھی۔ کیونکہ مسلمانوں کے یہاں دستور ہے نہ

کہ گاؤں میں بھی شادی ہو جاتی ہے — اور یہ اچھا ہوا — کیونکہ بہت دنوں تک اکثر ہی اس سے اپنے گاؤں میں ملاقات ہو جایا کرتی تھی۔

میں پڑھنے پڑھنے بڑھتا گیا۔ بڑھنے پر پڑھنے کے لئے شہروں میں جانا پڑا۔ چھٹیوں میں جب تب آتا۔ ادھر رضیہ پڑھ تو نہیں سکی، ہاں بڑھنے میں مجھ سے پیچھے نہیں رہی۔ کچھ دنوں تک اپنی ماں کے پیچھے پیچھے گھومتی پھری۔ ابھی اس کے سر پر چوڑیوں کی ٹوکریاں تو نہیں پڑیں، لیکن خریداروں کے ہاتھوں میں چوڑیاں پہنانے کا فن وہ جان گئی تھی۔ اس کے ہاتھ ملائم تھے — بہت ملائم۔ نئی بہوؤں کی یہی رائے تھی۔ نئی بہوئیں اُسی کے ہاتھ سے چوڑیاں پہننا پسند کرتیں۔ اس کی ماں اس سے خوش ہی ہوئی۔ جب تک رضیہ چوڑیاں پہناتی، وہ نئے نئے گاہک پھنساتی۔

رضیہ بڑھتی گئی۔ جب جب ملاقات ہوتی میں پاتا اس کے جسم میں نئی نئی ترقیاں ہو رہی ہیں۔ جسم میں بھی اور طور طریقہ میں بھی۔ پہلی ملاقات کے بعد پایا تھا کہ وہ کچھ باتونی ہو گئی ہے۔ مجھے دیکھتے ہی دوڑ کر قریب آ جاتی۔ سوال پر سوال کرتی۔ عجیب اوٹ پٹانگ سوالات! دیکھئے تو یہ نئی بالیاں آپ کو پسند ہیں؟ کیا شہروں میں ایسی بالیاں پہنی جاتی ہیں؟ میری ماں شہر سے چوڑیاں لاتی ہے، میں نے کہا ہے، وہ اس بار مجھے بھی لے چلے۔ آپ کس طرف رہتے ہیں وہاں؟ کیا ملاقات ہو سکے گی؟ وہ بکے جاتی، میں سنتا جاتا شاید جواب کی ضرورت وہ بھی نہیں محسوس کرتی۔

پھر کچھ دنوں کے بعد پایا، وہ اب کچھ شرمیلی سی ہو گئی ہے۔ میرے نزدیک آنے سے پہلے وہ اِدھر اُدھر دیکھتی اور جب کچھ باتیں کرتی تو ایسی چوکنی سی، کہ کوئی دیکھ نہ لے، سُن نہ لے۔ ایک دن جب وہ اسی طرح باتیں کر رہی تھی کہ میری بھابی نے کہا — رضیہ دیکھنا بھیا کو پھسلا نہ لینا"۔ وہ ان کی طرف دیکھ کر ہنس تو پڑی، لیکن میں نے پایا اس کے دونوں گال لال ہو گئے ہیں اور ان نیلی آنکھوں کے کونے مجھے کم نظر آئے۔ میں نے تب سے دھیان دیا، جب ہم لوگ کہیں ملتے ہیں۔ بہت سی آنکھیں ہم پر نیزوں کی نوکیں تانیں رہتی ہیں۔

رضیہ بڑھتی گئی، پچھپن سے گزر کر نوجوانی کی سرحد میں داخل ہوئی، اور اب شباب کے پھول اس کے جسم پر کھلنے لگے ہیں اب بھی وہ ماں کے ساتھ ہی آتی ہے۔ مگر پہلے وہ ماں کے ساتھ سایہ کی طرح پھرتی تھی۔ اب اس کی خود ایک آزاد شخصیت ہے اور اب خود اس کا سایہ بننے کے لئے کتنوں کے دِلوں میں کسمساہٹ ہے۔ جب وہ بہنوں کو چوڑیاں پہناتی ہوتی ہے کتنے بھائی تماشہ دیکھنے کو وہاں اکھٹا ہو جاتے ہیں۔ کیوں؟ بہنوں کے لئے جو ایک فطری برادرانہ الفت ہوتی ہے وہ یا رضیہ کے اندر جو ایک مقناطیسی کشش ہے وہ انہیں کھینچ لاتی ہے۔ جب وہ بہوؤں کے ہاتھوں میں چوڑیاں ڈالتی ہوتی ہے، شوہر دُور کھڑے کنکھیوں سے دیکھتے ہوتے ہیں۔ کیا؟ اپنی نئی نویلی کی نازک کلائیوں کو — یا ان کلائیوں پر کھیلتی ہوئی رضیہ کی پتلی انگلیوں کو؟ اور جیسے رضیہ کو اس میں لطف ملتا ہے۔ شوہروں کے ساتھ چہلیں کرنے سے بھی وہ باز نہیں آتی — "بابو بڑی مہین چوڑیاں ہیں، ذرا دیکھئے گا، کہیں چمک نہ جائیں"۔ شوہر بھلگتے ہیں۔ بہوئیں کھلکھلاتی ہیں، رضیہ قہقہہ لگاتی ہے۔

اب وہ اپنے کام میں ماہر ہوتی جاتی ہے۔

ہاں رضیہ اپنے کام میں بھی ماہر ہوتی جاتی ہے۔ چوڑی ہاروں کے کام کے لئے صرف یہی نہیں چاہئے کہ اس کے پاس رنگ برنگ کی چوڑیاں ہوں — سستی، دیرپا، نئے نئے فیشن کی — بلکہ یہ کام چوڑیوں کے ساتھ چوڑی ہاروں میں بناؤ سنگار، روپ رنگ، ناز و ادا بھی کھوجنا ہے، جو چوڑی پہننے والیوں کو ہی نہیں، اُن کو بھی موہ سکے، جن کی جیب سے چوڑیوں کے لئے پیسے نکلتے ہیں کامیاب چوڑی ہارن وُہی ہے۔ یہ رضیہ کی ماں بھی کسی زمانے میں کیا کچھ کم رہی ہو گی۔ کھنڈر کہتا ہے، عمارت شاندار تھی۔

جوں جوں شہر میں رہنا بڑھتا گیا، رضیہ سے ملنا جُلنا شاذ و نادر ہوتا گیا، اور ایک دن وہ بھی آیا جب بہت دنوں پر اسے اپنے گاؤں میں دیکھا۔ پایا اس کے پیچھے ایک نوجوان

چوڑیوں کا ٹوکرا سر پر لئے ہے۔ مجھے دیکھتے ہی وہ سہمی، سکڑی، اور میں نے سمجھ لیا، یہ اُس کا شوہر ہے۔ لیکن پھر بھی انجان بن کر پوچھ ہی لیا

"اس مزدور کو کہاں سے اُٹھا لائی ہے رے؟"

"اسی سے پوچھئے، ساتھ لگ گیا تو کیا کروں"

نوجوان مسکرایا، رضیہ بھی ہنسی، بولی —

"یہ میرا خاوند ہے مالک"!

خاوند! بچپن کی اُس پہلی ملاقات میں اُس کی ماں نے دل لگی دل لگی میں جو کہہ دیا تھا، نہ جانے وہ بات کہاں سوئی پڑی تھی؟ اچانک وہ جاگی ——— اور میری پیشانی پر اُس دن شکن ضرور پڑ گئی ہوگی، مجھے یقین ہے۔ اور ایک دن وہ بھی آیا جب میں بھی خاوند بنا۔ میری رانی کو سہاگ کی چوڑیاں پہنانے اس دن بھی رضیہ آئی اور اُس دن میرے آنگن میں کتنی دھوم مچائی اس شوخ نے: "یہ لوں گی، وہ لوں گی اور یہ منھ مانگی چیزیں نہیں ملیں تو وہ لوں گی کہ دلہن تاپتی رہ جائے گی۔

"ہٹ ہٹ تو بوا جی کو لے جائے گی تو پھر تیرا حسن کیا کرے گا بھابی نے کہا۔

"یہ بھی تاپتا رہے گا دلہن"! کہہ کر رضیہ نے قہقہہ لگایا، اور دوڑ کر حسن سے لپٹ گئی۔ "اوہو میرے راجا کچھ دو سراغ سمجھنا۔ حسن بھی ہنس پڑا۔ رضیہ اپنی داستانِ محبت سنانے لگی — کس طرح حسن اس کے پیچھے پڑا، کس طرح جھنجھٹیں پیدا ہوئیں، پھر کس طرح شادی ہوئی اور وہ آج بھی کس طرح سایہ بنا اُس کے پیچھے گھومتا ہے۔ نہ جانے کونسا ڈر لگا رہتا ہے اِسے، اور پھر میری رانی کی کلائی پکڑ کر بولی "مالک بھی تمہارے پیچھے اِسی طرح سائے کی طرح ڈولتے رہیں دلہن"! سارا آنگن ہنسی سے بھر گیا تھا، اور اُسی ہنسی میں رضیہ کے کانوں کی بالیوں نے عجیب چمک بھر دی تھی —— مجھے ایسا ہی لگا تھا۔

زندگی کا رتھ گھڑ درے راستے پر بڑھتا گیا —— میرا بھی، رضیہ کا بھی۔ اِس کا پتہ اُس دن چلا جب بہت دنوں کے بعد اُس سے اچانک پٹنہ میں ملاقات ہوگی۔ یہ اچانک بات تو تھی، کیا اِسے ملاقات کہا جائے؟

میں اب زیادہ تر گھر سے دور دور ہی رہتا کبھی ایک آدھ دن کے لئے گھر گیا تو شام کو گیا، صبح کو بھاگا۔ طرح طرح کی ذمہ داریاں، طرح طرح کے جنجال! اِن دنوں پٹنے میں تھا، یوں کہئے پٹنہ سٹی میں۔ ایک چھوٹے سے اخبار میں تھا۔ پیر، باورچی، بہشتی، کی طرح۔ یوں تو لوگ سمجھتے کہ میں ایڈیٹر ہی ہوں۔ اُن دنوں نہ اتنے اخبار تھے، نہ اتنے ایڈیٹر، اس لئے میری بڑی قدر ہے، یہ میں تب جانتا جب کبھی دفتر سے نکلتا، دیکھتا، لوگ میری طرف انگلیاں اُٹھا کر سرگوشیاں کر رہے ہیں۔ لوگوں کا مجھ پر یہ دھیان! مجھے ہمیشہ اپنے حفظِ مراتب کا خیال رکھنا پڑتا۔

ایک دن میں چوک کے ایک مشہور پان والے کی دوکان پہ پان کھا رہا تھا۔ میرے ساتھ میرے چند مداح نوجوان تھے، ایک دو بزرگ بھی آکر کھڑے ہو گئے۔ ہم پان کھا رہے تھے اور خوش گپیاں چل رہی تھی کہ اتنے میں ایک بچہ آیا اور بولا، "ودعورت آپ کو بُلا رہی ہے"

عورت! بلا رہی ہے؟ چوک پر! میں چونک پڑا۔ نوجوانوں میں تھوڑی ہلچل! بزرگوں کے چہرے پر کھیلتا ہوا پُراسرار تبسم، بھی مجھ سے چھپا نہیں رہا۔ عورت! کون؟ میرے چہرے پر غصہ تھا، وہ لڑکا سٹ پٹا کر بھاگ گیا!۔

پان کھا کر جب لوگ اِدھر اُدھر چلے، اچانک پاتا ہوں۔ میرے پیر اُسی طرف اُٹھ رہے ہیں، جس طرف اُسی بچے نے انگلیوں سے اشارہ کیا تھا۔ تھوڑی دُور آگے بڑھنے پر پیچھے مڑ کر دیکھا، شناسا ساؤں میں سے کوئی دیکھ تو نہیں رہا ہے۔ مگر اس چوک کی شام کی رومانی فضا میں کسی کو کسی کی طرف دیکھنے کی کہاں فرصت۔ میں آگے بڑھتا گیا اور اُس مقام پر پہنچا، جس سے پورب وہ پیپل کا پیڑ ہے۔ وہاں پہنچ ہی رہا تھا کہ دیکھا، کہ پیڑ کے نیچے چبوترے کی طرف سے ایک عورت بڑھی آ رہی ہے۔ نزدیک پہونچ کر وہ کہہ اُٹھی "مالک سلام"

دھک سے لگا! لیکن پہچاننے میں دیر نہیں لگی —— اُس نے جوں ہی سر اُٹھایا، چاندی کی بالیاں جو چمک اُٹھیں!

"رضیہ! یہاں کیسے؟" میرے منھ سے نکل پڑا۔

"سودا سلف کرنے آئی ہوں، مالک" —— اب تو نئے قسم کے لوگ ہو گئے نہ؟ اب لاہ کی چوڑیاں کہاں کسی کو بھاتی ہیں۔ نئے لوگ نئی چوڑیاں۔ ساز سنگار کی کچھ اور چیزیں بھی لے جاتی ہوں — پوڈر، کلپ، کیا کیا چیزیں نہ! نیا زمانہ! دلہنوں کے نئے نئے مزاج ....." پھر ذرا رُک کر

بولی ـــــ سنا تھا آپ یہیں رہتے ہیں، کہاں رہتے ہیں مالک؟ میں تو اکثر آیا کرتی ہوں ـــــ اور جب تک یہ پوچھوں کہ اکیلی ہو یا ـــــ کہ ایک ادھیڑ عمر کے آدمی نے آکر سلام کیا۔ یہ حسن تھا، لانبی لانبی داڑھیاں، پانچ گز کا لانبا آدمی ـــــ لانبا اور سٹنڈا بھی۔ "دیکھئے مالک یہ آج بھی میرا پیچھا نہیں چھوڑتا" یہ کہہ کر رضیہ ہنس پڑی۔ اب رضیہ وہ نہیں تھی، مگر اُس کی ہنسی وہی تھی ـــــ وہی ہنسی، وہی چہل۔ اِدھر اُدھر کی بہت سی باتیں کرتی رہی اور نہ جانے کب تک جاری رکھتی کہ مجھے یاد آیا، میں وہاں کھڑا ہوں، اور اب میں کون ہوں؟ کوئی دیکھ لے تو!

مگر وہ فرصت دے تب نہ؟ جب میں نے جانے کی بات کی، حسن کی طرف دیکھ کر بولی، "کیا دیکھتے ہو، ذرا پان بھی تو مالک کو کھلاؤ۔ کتنی بار ٹھونس ٹھونس کر پیٹ بھر چکے ہو، بابو کے گھر؟"

حسن کالایا پان کھا کر جب میں چلنے کو تیار ہوا، وہ پوچھنے لگی میرا ڈیرہ کہاں ہے؟ میں بڑے پس و پیش میں پڑا ـــــ "ڈریئے مت مالک، اکیلے نہیں آؤں گی۔ یہ بھی رہیں گے، کیوں، میرے راجہ" ـــــ یہ کہہ کر وہ حسن سے لپٹ پڑی۔ "پگلی، پگلی، یہ شہر ہے شہر" یوں حسن نے ہنستے ہوئے اُس سے بازو چھڑائے اور بولا "بابو، ہاں سچ مچ والی ہوگئی، لیکن اس کا بھینا نہیں گیا۔"

اور دوسرے دن پاتا ہوں، رضیہ میری قیام گاہ پر حاضر ہے! "مالک یہ چوڑیاں رانی کے لئے" ـــــ کہہ کر میرے ہاتھوں میں چوڑیاں رکھ دیں۔ میں نے کہا، تم تو گھر پر جاتی ہی ہو، لیتی جانا، وہیں دینا۔ "نہیں مالک، ایک بار اپنے ہاتھ سے بھی پہنا دیکھئے" وہ کھلکھلا پڑی، اور جب میں نے کہا ـــــ "اب اس عمر میں؟" تو وہ حسن کی طرف دیکھ کر بولی، "بوجھئے، اس سے، آج تک مجھے یہی چوڑیاں پہناتا ہے یا نہیں؟ اور جب حسن کچھ شرمایا، وہ بولی "گھاگ ہے مالک گھاگ، کیسا مسخرہ بنا رہا ہے اِس وقت، لیکن جب ہاتھوں میں ہاتھ لیتا ہے"۔۔۔۔۔۔ زور سے ہنس پڑی، اتنے زور سے کہ میں چونک کر چاروں طرف دیکھنے لگا۔

ہاں، تو اچانک اُس کے گاؤں میں پہنچ گیا۔ چناؤ کا چکر جہاں نہ لے جائے، جس گھاٹ کا پانی نہ پلا دے۔ ناک میں پیٹرول کے دھوئیں کی بُو، کان میں سائیں سائیں کی آواز، چہرے پر گرد و غبار، ـــــ پریشان، بدحواس۔ لیکن اُس گاؤں میں جوں ہی میری جیپ داخل ہوئی میرا دل ایک خاص قسم کے جذبے سے بھر گیا۔

یہ رضیہ کا گاؤں ہے، یہاں رضیہ رہتی تھی۔ مگر کیا آج میں یہاں یہ بھی پوچھ سکتا ہوں کہ یہاں کوئی رضیہ نام کی پنہاری رہتی تھی یا ہے؟ حسن کا نام لینے میں بھی شرم لگتی تھی۔ میں وہاں نیتا بن کر گیا تھا۔ میرے نام کی جے کاریں ہو رہی تھیں، کچھ لوگ مجھے گھیرے کھڑے تھے جس کے دروازے پر جاکر میں پان کھا آؤں گا، وہ اپنے کو خوش قسمت سمجھے گا، جس سے دو باتیں کر لوں گا، وہ بذاتِ خود گفتگو کا ایک موضوع بن جائے گا۔ اس وقت مجھے کچھ بلندی پر ہی رہنا چاہیئے۔

جیپ سے اُتر کر لوگوں سے باتیں کر رہا تھا۔ یا یوں کہئے تخیل کے پٹڑ پر کھڑے ہو کر ایک آنے والے سنہرے دور کا پیام لوگوں کو سنا رہا تھا۔ لیکن دماغ میں کچھ گتھیاں اُلجھی تھیں۔ زبان حسبِ عادت اپنا کام کئے جا رہی تھی، مگر دل اندر ہی اندر دوسرا ہی تانا بانا بُن رہا تھا۔ دونوں میں کوئی اتحاد نہ تھا، لیکن اس میں سے کسی ایک کے تشغل میں رخنہ بھی نہیں ڈالا جا سکتا تھا کہ اچانک۔ لو، یہ کیا؟ وہ سامنے رضیہ چلی آ رہی ہے۔

رضیہ! وہ سچی! ارے رضیہ پھر سچی ہوگئی؟ کانوں میں وہی بالیاں، گورے چہرے پر وہی نیلی آنکھیں، وہی پوری آستین کی قمیص، وہی بالوں کی کچھ لٹیں جنھیں سنبھالتی بڑھی آ رہی ہے ـــــ درمیان میں چالیس پینتالیس سال کا وقفہ ـــــ ارے میں خواب تو نہیں دیکھ رہا ہوں؟ دن کے وقت خواب؟ وہ آتی ہے، سخت بھیڑ میں گھس کر میرے پاس پہنچتی ہے، سلام کرتی ہے، اور میرا ہاتھ پکڑ کر کہتی ہے "چلئے مالک میرے گھر"

میں مبہوت، کچھ سوجھ نہیں رہا، کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا، لوگ مسکرا رہے ہیں! نیتا جی، آج آپ کی فلمی محل کر رہی۔ نہیں! یہ خواب ہے، کہ کانوں میں آواز آئی، کوئی کہہ رہا ہے، کیسی شوخ لڑکی! اور وہ سر ابولتا ہے ـــــ ٹھیک اپنی دادی جیسی۔ اور تیسرے نے میرے ہوش کی داد دی ـــــ "یہ رضیہ کی پوتی ہے بابو جی، بیچاری بیمار پڑی ہے، آپ کا ذکر اکثر کیا کرتی ہے، بڑی تعریف کرتی ہے، بابو جی فرصت ہو تو ذرا دیکھ لیجئے، نہ جانے بیچاری جیتی ہے یا۔۔۔۔۔۔۔"

میں رضیہ کے آنگن میں کھڑا ہوں۔ یہ چھوٹے چھوٹے صاف ستھرے کمرے، یہ لیپا پوتا ہوا صاف آنگن، بھری پوری گرہستی، محنت اور دیانت کی دیہی ہمن چل بسا ہے۔ مگر اپنے پیچھے تین ہمن چھوڑ گیا ہے۔ بڑا بیٹا کلکتے میں کماتا ہے، منجھلا خاندانی کام میں لگا ہے، چھوٹا شہر میں پڑھ رہا ہے۔ یہ بچی بڑے بیٹے کی بیٹی! دادا کا سر پوتے میں، دادی کا چہرہ پوتی میں، ہو بہو، رضیہ۔ دوسری رضیہ! یہ دوسری رضیہ میری انگلی پکڑے پکار رہی ہے: "دادی، او دادی، کمرے سے نکل، مالک دادا آ گئے۔" لیکن پہلی وہ رضیہ نکل نہیں رہی، کیسے نکلے؟ بیماری کے میلے کچیلے کپڑوں میں میرے سامنے کیوں کر آئے؟

رضیہ نے اپنی پوتی کو بھیج تو دیا، مگر اسے یقین نہ ہوا کہ موٹر پر آنے والے نیتا اس کے گھر تک آنے کی تکلیف گوارا کر سکیں گے، اور جب سنا، میں آ رہا ہوں، تو بہوؤں سے کہا، ذرا میرے کپڑے تو بدل دو ——— مالک سے کتنے دنوں میں ملاقات ہو رہی ہے نہ؟ اس کی دونوں بہوویں اسے سہارا دے کر آنگن میں لے آئیں! رضیہ ——— ہاں، میرے سامنے رضیہ کھڑی تھی۔ دُبلی پتلی، روکھی، سُوکھی ——— لیکن جب نزدیک آ کر اس نے "مالک سلام" کہا، اس کے چہرے سے ایک پل کے لئے جھریاں کہاں چلی گئیں، جنھوں نے اس کے چہرے کو مکڑے کا جالا بنا رکھا تھا۔ میں نے دیکھا، اس کا چہرہ اچانک بجلی کے بلب کی طرح چمک اٹھا اور چمک اٹھیں وہ نیلی آنکھیں جو حلقوں میں گھس گئی تھیں ——— اور ارے چمک اٹھی ہیں آج پھر وہ چاندی کی بالیاں، اور دیکھو، اپنے کو پوتر کر لو، اس کے چہرے پر پھر اچانک بکھر کر چمک رہی ہیں وہ لٹیں، جنھیں وقت نے دھو پونچھ کر سفید چمکیلا بنا دیا ہے۔ (مترجم رضا نقوی)

راجپوتانے کے ریگستان کو سبزہ زار میں تبدیل کیا جا رہا ہے

پاکستان کے صوبہ سندھ کی ریت اڑ اڑ کر ہندوستان میں چلی آتی ہے اور سندھ کا ریگستان بھی ہندوستان کی جانب بڑی تیزی سے ہندوستان کی جانب بڑھتی تیزی سے قدم بڑھاتا چلا آ رہا ہے۔ چنانچہ ان دونوں کے انسداد کے سلسلے میں بہاول پور اور جیسلمیر کی سرحد پر چالیس میل لمبا پانچ میل چوڑا ایک سبزہ زار قائم کیا جا رہا ہے جو چار سو میل لمبے اور پانچ میل چوڑے اس سبز قطعے کا ایک حصہ ہوگا جو ہندوستان اور پاکستان کی مغربی سرحد کی حدِ فاصل ہوگی۔

ریگستان کو خبگلات میں تبدیل کرنے کے سلسلے میں مرکزی حکومت کی طرف سے جودھپور، جھجھنو، سردار شہر اور بالی کے مقامات پر پودگیاریاں قائم ہیں جہاں راجپوتانے کے ریگستان میں مختلف قسم کے پودوں کی نشوونما کے متعلق تجربات کئے جا رہے ہیں۔

ریتیلے علاقوں کو خبگلات میں تبدیل کرنے کا کام ایک ہزار ایکڑ رقبے کے ۹ بلاکوں میں سے چار بلاکوں میں جاری ہے۔ ان بلاکوں کی زمینیں مختلف نوعیت کی ہیں۔ ان بلاکوں کی زمینوں میں ۹ فٹ لمبے اور ۹ فٹ گہرے گڑھے کھود دیے گئے ہیں جن میں پودوں کی تین قطاریں لگائی جاتی ہیں۔ پہلی گڑھے کی چوٹی پر، دوسری وسط میں اور تیسری تہہ میں لگائی جاتی ہے۔ چنانچہ پودوں کی ایسی بہت سی اقسام پائی جاتی ہیں جو گرم موسم میں بھی سرسبز رہتے ہیں۔ چند ماہ گزرے جودھپور، پالی سڑک کے دو میل کے ٹکڑے پر پودے لگائے گئے تھے۔ اس سال پالانی اور لیشن نوکے درمیان ریل کی سڑک کی ریت کو بستہ کرنے کا کام شروع کیا گیا ہے۔

اس ریسرچ اسٹیشن کے عملے کا فرقہ ہے کہ "تند طوفان کو بالکل ٹھنڈا کر دو"۔ علاوہ ازیں یہ عملہ لوگوں کو درختوں سے چارہ کاٹنے، کھیتوں کی باڑ لگانے اور دیگر امور سے متعلق معلومات بہم پہنچاتا ہے۔

پانی کی فراہمی کے سلسلے میں ریسرچ اسٹیشن نے چند آزمائشی اسکیمیں جاری کر رکھی ہیں اور اس سلسلے کے متعدد منصوبے زیرِ غور ہیں۔ بہرحال جیسلمیر پروجیکٹ، بھاکڑا، ناگل پروجیکٹ اور اس سلسلے کے دیگر پروجیکٹ جب پایۂ تکمیل کو پہنچ جائیں گے تو ریگستان کے لئے بھی پانی فراہم ہو جائے گا اور ریگستان پر فتح حاصل ہو جائے گی۔

تلاشِ سحر

اُٹھو کہ شب میں جمالِ سحر تلاش کریں
بہجومِ خار میں گُل ہائے تر تلاش کریں

لوائے ابر میں ڈھونڈیں فروغِ ماہ و نجوم
ردائے خاک میں لعل و گہر تلاش کریں

حریمِ ذہن کے سب جھلملا رہے ہیں چراغ
چلو تجلّیِ شمس و قمر تلاش کریں

ربابِ وقت پہ چھیڑیں ترانۂ ابدی
دیارِ مرگ میں عمرِ خضر تلاش کریں

سکونِ شبنم و یخ کی فتادگی تا چند
اُٹھو تلاطمِ برق و شرر تلاش کریں

پھر آؤ طنطنۂ خسروی کی ڈالیں طرح
پھر آؤ تابشِ تاج و کمر تلاش کریں

توہّمات کی افسردہ وادیوں میں شمیمؔ
دماغِ گرم و دلِ مُعتبر تلاش کریں

محمد حمید الدین محمود

ہندوستان اور کوریا

ہماری خارجی پالیسی اپنے تمام پہلوؤں کے ساتھ کسی اور عالمی تنازعے میں اس حسن و خوبی سے اجاگر نہیں ہوئی جتنی کہ مسئلہ کوریا میں، جس کے آغاز سے اختتام تک ہند کا پیہم تعلق رہا۔ اس میں جو مختلف جوڑ پیدا ہوئے ان میں ہماری خارجی پالیسی کے وہ اٹھلے اصول جن پر اس کی بنیاد ہے۔ یکے بعد دیگرے اپنی عملی پاکیزگی دکھلانے لگے۔ اور دنیا کے آگے جنگ عالمگیر کے بعد پہلی مرتبہ جانداریغیر جانبداریت کا مظاہرہ ہوا۔ ہند کا رویہ اس مسئلے کی پوری حیات کے دوران میں ایک ایسے آزمائشی تجربے کا مقام رکھتا ہے جس کی کامیابی پر ہماری خارجی پالیسی کی برقراری و استواری منحصر تھی۔ ہندوستان کا ایقان تھا کہ دو متضاد نظریات اور نظام ہائے زندگی اپنی اپنی جگہ پر اسی دنیا میں اپنا پر امن وجود برقرار رکھ سکتے ہیں اور ان میں تصادم ناگزیر نہیں تاوقتیکہ عالمی اقتدار کے حصول کی خواہش ان میں بیدار نہیں ہو جاتی۔ کوریا کی جنگ ہندوستان کے اس یقین کو مستحکم کرتی ہے۔ دو ملکوں کے پس پردہ دو بلاکوں کی یہ جنگ جو روس کے اشارے پر شمالی کوریا کے جنوبی کوریا پر حملے کے ساتھ شروع ہوئی اور جس میں اقوام متحدہ کے نام پر امریکی مفاد کے تحفظ کے لئے ایشیائیوں کے خون کی ندیاں بہائی گئیں، دو فریقوں کا تصادم ہی نہیں بلکہ دو نظریات کی کشمکش اور دو اصولوں کا ٹکراؤ تھی اور جس طرح کہ اس کا آغاز بلاوجہ تھا اسی طرح اس کا اختتام بے نتیجہ رہا۔ گویا جنگ بازوں نے پانی کو جوش دیا اس امید میں کہ کوئی ٹھوس شے ہاتھ لگے۔ لیکن وائے افسوس کہ سارا پانی بھاپ بن کر اڑ گیا اور باقی کچھ نہ بچا اور ہند کے اس تصور کی واقعیت دنیا پر آشکارا ہوئی کہ جنگ کسی مسئلے کا حل نہیں ہو سکتی۔ بین الاقوامی سیاسیات میں نووارد ہونے کے باوجود ہماری یہ بالغ نظری دنیا کی امن پسند اقوام کے لئے مشعل راہ ہے۔ ہماری اصول پرستی اور غیر جانبداریت فریقین پر گراں گزرتی تھی لیکن اس کے باوجود معاہدۂ صلح کی حقیقی اساس ہندوستانی تجاویز ہی تھیں اور سب سے بڑھ کر ہندوستان کلاین۔ین۔آر۔سی کا صدر اور کسٹوڈین فورس بنا دیا جانا ہندوستان کی بین الاقوامی پوزیشن کا ہی مظہر نہیں بلکہ وہ ہند کی واقعیت پسندی کے مغرب کی جانب سے اعتراف کی نشاندہی کرتا ہے۔ بہرحال مسئلہ کوریا کے آغاز اور مختلف نشیب و فراز سے گزر کر اسکے اختتام تک ہند کی وابستگی کا جائزہ لینے سے بلاکوں کی سیاست کو سمجھنے ہی میں مدد نہیں ملتی بلکہ بین الاقوامی تعطل کی دوری کی نئی راہ بھی کھلتی ہے۔

پس منظر - کوریا کی تاریخ مظہر ہے کہ وہ کسی دم بھی آزاد نہیں رہا۔ روحانی، معاشی و سیاسی اعتبار سے وہ چین یا جاپان کے تحت رہا۔ البتہ ان تمام صدیوں میں جو چیز اُسے حاصل رہی وہ اس کی وحدت تھی جو دوسری عالمی جنگ کے ساتھ منقسم ہو گئی اور جس کے بعد وہ اس خونیں آشام جنگ کی آماجگاہ بنا جو اگر روکی نہ جاتی تو سارے کرۂ ارض کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی کوریائی عوام آزادی کے طلبگار تو تھے لیکن ۱۹۱۰ء کے بعد سے جبکہ اقوام عالم نے کوریا پر جاپانی تسلط کو تسلیم کر لیا۔ جتنی بھی انقلابی پورشیں ہوئیں وہ سب کی سب کچل دی گئیں۔ وجہ یہ کہ فطرتاً کوئی غلام ملک کے باشندے آزادی کا مشترکہ مقصد رکھنے کے باوجود متحدہ طریق کار پر راضی نہیں ہوتے ۱۹۴۷ء سے پہلے ہندوستان اور ۱۹۱۷ء سے پہلے روس میں یہی صورتحال تھی بعینہٖ ۱۹۴۶ء سے قبل کوریا میں بارہ سیاسی جماعتیں بغیر کسی مشترکہ لائحہ عمل کے اپنی اپنی راہ پر گامزن تھیں حتیٰ کہ ۲ر دسمبر ۱۹۴۶ء کو شمال سے روسی افواج اور جنوب سے امریکی افواج بڑھتے بڑھتے ایک دوسرے کے مقابل آکر رُک گئیں۔ اور یہی سرحد ۳۸ ویں خط متوازی کے نام سے مشہور ہوئی جس کی حقیقت صرف اتنی تھی کہ وہ شمال میں قابض روسی افواج اور جنوب میں مسلط

امریکی افواج کے درمیان حد بندی ہے۔ اس کے ساتھ کوریا کی تقسیم کی بابت کبھی کچھ نہیں کہا گیا۔ لیکن عملاً کوریا دو منطقوں میں تقسیم ہو چکا تھا۔ اور یکم دسمبر ۱۹۴۸ء کو قاہرہ میں ۲۵ جولائی ۱۹۴۵ء کو پوسٹڈم میں اور ۱۹۴۵ء میں ماسکو میں کئے ہوئے اعلانات اور معاہدات کو بالائے طاق رکھ دیا گیا جن میں متحدین یعنی امریکہ، برطانیہ، روس اور چین نے عہد کیا تھا کہ موزوں اور مناسب وقت پر کوریا کو آزاد اور خود مختار جمہوریہ بنا دیا جائے گا۔ اس طرح اس کی آزادی کے ساتھ اس کی وحدت بھی دم توڑ گئی۔

۱۷ ستمبر ۱۹۴۷ء کو امریکہ نے اس مسئلہ کو صیانتی مجلس سے رجوع کیا۔ جس نے اسے جنرل اسمبلی کے آگے بڑھا دیا۔ اسمبلی نے ایک کمیشن مقرر کیا جس کے ذمے یہ مشن سونپ دیا گیا کہ وہ کوریا کے دونوں حصوں کا دورہ کر کے رپورٹ پیش کرے اور متحدہ کوریا کی عارضی حکومت کے لئے انتخابات کا اہتمام کرے۔ اس میں ہندوستان، آسٹریلیا، کینیڈا، چین، ال سلاڈور، فرانس، فلپائن، شام اور یوکرین شامل تھے۔ ہند کا اس سلسلے سے یہ پہلا تعلق تھا۔ کمیشن شمال کا دورہ نہ کر سکا۔ ۱۰ مئی کو دو سو دکنی کوریائی قومی اسمبلی کی ایک سو نشستوں کے لئے جنوبی کوریا کے طول و عرض میں انتخابات ہوئے۔ ۱۹۴۸ء میں سیول میں نئی جنوبی کوریائی حکومت کا افتتاح عمل میں آیا۔ اس سے بہت پہلے ہی شمالی کوریا میں روسی فوج کانڈ کے بموجب عوامی جمہوریہ کوریا کا قیام عمل میں لایا جا چکا تھا۔ تاہم دونوں سمتوں میں نام نہاد عوامی حکومتوں کی تنصیب کے بعد قابض افواج کا انخلا شروع ہو گیا اور نومبر ۱۹۴۹ء کے اواخر تک سرزمین کوریا پر ایک بھی غیر ملکی سپاہی نہ تھا ــــ لیکن جو چنگاریاں سلگ چکی تھیں وہ رفتہ رفتہ پھیلتی جا رہی تھیں اور سرحدوں پر کبھی کبھار چند شعلے بلند ہوتے اور دب جاتے اور ایک گہرا دھواں چھا جاتا گویا کہ یہ آتش فشاں ایک بڑے دھماکے کے لئے اندر ہی اندر پک رہا تھا۔

آغاز جنگ اور اس کے بعد ۔ کمیشن کو مستقلاً کوریا میں رہنے اور تازہ ترین تبدیلیوں سے اقوام متحدہ کو آگاہ کرواتے رہنے کی ہدایت کی گئی تھی۔ ۲۵ جون ۱۹۵۰ء کو کمیشن نے گیارہ صفحات پر مشتمل رپورٹ میں خبر دی کہ شمالی کوریا نے ۳۸ ویں خط متوازی کو عبور کر کے جنوبی کوریا پر ہلہ بول دیا ہے۔ جو تمام شہادتوں کی روشنی میں ایک منظم جارحانہ اقدام ہے جسے پوری تیاریوں کے ساتھ پلان کے مطابق انتہائی راز میں روبہ عمل لایا گیا۔ اس طرح "صبح کی سی خاموشی کی سرزمین" (کوریا کا قدیم نام) میں آتشیں جنگ کے شعلے بھڑک اٹھے۔

ہندوستانی مندوب سر بی۔ این راؤ کی صدارت میں صیانتی مجلس کا فوری اجلاس ہوا۔ اس طرح کوریائی تنازعے کے نئے موڑ سے براہ راست طور پر وابستہ ہو گیا۔ ایک امریکی قرارداد Complaint of Aggression upon the Republic of Korea. کے عنوان سے پیش ہوئی۔ جس کی ہند، مصر، ناروے، چین، ایکواڈور، کیوبا، فرانس، برطانیہ اور امریکہ نے تائید کی اور یوگوسلاویہ نے مخالفت۔ روس غیر حاضر تھا اس کی رو سے حملے کو "امن شکن" قرار دیتے ہوئے جارحانہ کارروائیوں کی فوری موقوفی کا مطالبہ کیا گیا اور رکن اقوام سے اپیل کی گئی کہ جارحانہ اقدام کی پسپائی کے لئے اقوام متحدہ کی دفاعی اعانت کریں۔ اقوام متحدہ کی درخواست پر امریکہ نے کمان قبول کر لی اور ۲۷ جون کو اپنی بری، بحری اور ہوائی افواج کو کوچ کا حکم دیا۔

ہند نے کوریا میں جارحانہ اقدام کو "اقدام" گردانا اور سر بی۔ این راؤ کی تشریح کے مطابق بین الاقوامی تنازعات کی پیسوئی کے لئے کسی حملہ آور کوشش کی ہند مخالفت کرتا ہے۔ جارحانہ اقدام کی موقوفی اور امن کی بحالی اس مسئلے کے پُرامن تصفیے کی لوازم ہیں۔ اس قرارداد کی قبولیت کے معنی ہند کی تمام اقوام سے دوستانہ تعلقات رکھنے کی پالیسی میں تبدیلی کے نہیں ہو سکتے۔ "یہ ہماری پالیسی کا حقیقت پسندانہ پہلو لئے ہوئے ہے کوریا کی جنگ کے آغاز کے ساتھ ہی پنڈت نہرو نے اسٹالن اور ٹرومین کے نام مکتوبات لکھے جن کے ذریعے اس تنازعے کے پُرامن حل کی ناکام کوشش کی گئی۔ اقوام متحدہ کی متعدد اپیلوں کے باوجود ہم نے اپنی افواج کوریا نہیں بھیجیں کیونکہ ہم اس قسم کی کسی جنگ میں اُلجھنا نہیں چاہتے تھے لیکن ہم نے اپنی ایمبولنس یونٹ کوریا بھیجی گویا جنگ سے نفرت کرنے کے باوجود مجروحین کی تیمارداری کے انسانی فریضے کی ادائیگی کو ہند مقدم رکھتا ہے۔ میکارتھر کی رپورٹ کے ایک ایک جملے میں ہماری فرض شناسی اور انسان دوستی کی ستائش اور اس کا اعتراف کیا گیا۔ تین سو افراد پر مشتمل اس یونٹ کی کارکردگی کا اندازہ اس ایثار و جاں نثاری کی

لافانی مثال سے ہو سکتا ہے جس میں کرنل نائر نے اپنی جان کی بازی لگا دی۔

قدیم صورت حال کو لوٹانے اور امن کی بازیابی کے لئے شمالی کوریا سے ہم نے جداگانہ اپیل کی لیکن بڑھتا ہوا سیلاب رُک نہ سکتا تھا۔ تین دن میں سیول غرق ہو گیا دوسرے ہفتے ٹاجُون سقوط ہو گیا اور دیکھتے کے دیکھتے کمیونسٹ افواج نے پوسان کا جو جنوبی کوریا کی آخری جنوبی بندرگاہ تھی محاصرہ کر لیا۔

یکم اگست ۱۹۵۰ء کو روس عبوری مجلس کے صدر کی حیثیت سے واپس آیا اور جیکب ملک نے دو قراردادیں پر مشتمل ایجنڈا پیش کیا۔ (۱) چینی عوامی جمہوریہ کا تسلیم کیا جانا۔ (۲) جمہوریہ کوریا پر حملہ کی شکایت۔ ۴ اگست کو سر بی۔ این راؤ نے غیر رسمی طور پر تجویز کی کہ کونسل کے غیر مستقل اراکین کی ایک کمیٹی کی تشکیل دی جائے جو تنازعے کے پُر امن تصفیے کی تمام صورتوں پر غور کر کے تاریخ مقررہ تک اپنی سفارشات پیش کر دے' اور اس کمیٹی کو اختیار حاصل ہو کہ وہ جس کو چاہے طلب کر سکے۔ سرکاری طور پر یہ تجویز پیش نہیں کی گئی۔ اسی دوران میں کمیونسٹوں نے اتحادی کمان پر الزام لگایا کہ شہری آبادیوں پر اور اندرون چین امریکی ہوائیہ نے بمباری کی۔ ۳۱ اگست کو امریکہ نے اپنی ایک قرارداد کے ذریعے سوویٹ انڈین مشن کے قیام کی سفارش کی تاکہ وہ اس ضمن میں تحقیقات کر کے ان کی توثیق کرے۔ ہند اور یوگوسلاویہ غیر جانبدار رہے۔ چین نے رائے دہی سے احتراز کیا۔ اور روس نے حق تنسیخ (ویٹو) کا استعمال کر کے اس کو سرے ہی سے ختم کر دیا۔

۸ دسمبر ۱۹۵۰ء کو میکارتھر نے اپنی جنگی ذہانت کو کام میں لا کر کمیونسٹوں کو بجائے پوسان سے دھکیلنے کی کوشش کرنے کے ان کی پشت میں وار کرتے ہوئے شمالی کوریا کی بندرگاہ انچان پر فوجیں اتاریں۔ اب اتحادی جنوب سے بھی آگے بڑھنے لگے حتیٰ کہ ۳۸ واں خط متوازی آن پہنچا ہند نے اقوام متحدہ کو متنبہ کیا کہ وہ ۳۸ ویں خط متوازی کو عبور کر کے جنگ کو طوالت نہ دے کیونکہ اس کا کام جارحانہ اقدام کی مدافعت کرنا تھا نہ کہ تازہ تر اقدام کا ارتکاب۔ ہند کی اس بروقت وارننگ سے پہلو بچا کر کوریا میں امن کے امکانات کو خود اقوام متحدہ نے مسدود کر دیا۔ کیونکہ اس کے بعد چین نے بھی اقوام متحدہ کی غیر دانشمندانہ تقلید کی اور نتیجتاً ایک نیا مسئلہ (سیران جنگ کا) ابھرا جو بالآخر کوریا میں امن کی راہ میں آخری رکاوٹ ثابت ہوا۔ ہندوستان جب کسی مسئلے میں دلچسپی لیتا ہے تو ان قوموں کو خاطر میں نہیں لاتا جو اس میں شریک ہیں بلکہ اُسے وہ اصول عزیز ہوتے ہیں جن کی وہاں آزمائش ہے۔ اس لئے وہ مرعوب یا جانبدار ہو کر کسی مسئلے کو نہیں جانچتا اور شاید اس لئے کسی فریق کو محض خوش کرنے کا خیال بھی اس کے دل میں گھر نہ کر سکا۔ یہ پہلا موقعہ نہ تھا جو ہند نے اقوام متحدہ کی مخالفت کی۔ دولت مشترکہ میں رہنے کے باوجود ہندوستان نے برطانیہ سے مختلف رویہ اختیار کیا۔ امریکہ سے خوشگوار دوستی اور فنی تعاون کے باوجود وہ امریکہ کی مخالفت سے نہیں ہچکچایا۔ مثلاً قیدیوں اور عورتوں سے اتحادی کمان کے نازیبا سلوک' شہری آبادیوں پر امریکی بمباری اندرون چین ہوائی حملوں' جوہری بم گرانے کے ارادوں اور جراثیمی جنگ' اعلیٰ امریکی عہدیداروں کی کارستانیوں کی ہند نے مخالفت و مذمت کی اور پورے شد و مد کے ساتھ کی۔ جب ۱۸ رجون کو سنگمن ری نے ۲۵ ہزار مخالف کمیونسٹ قیدیوں کو رہا کر دیا تو ہند نے واشنگٹن کو ایک نوٹ بھیجا جس میں اس کی مذمت کرتے ہوئے خبردار کر دیا گیا کہ چین بھی معاہدہ کی خلاف ورزی کرتے ہوئے صلح کو ناممکن بنا دے گا۔ چین سے قدیم ثقافتی تعلقات اور چین کے لئے اپنی پرجوش وکالت کو فراموش کرتے ہوئے ہم نے چین پر کڑی نکتہ چینی کی۔ المختصر ہم نے اپنے تقاضوں کو پورا کرنے کی کوشش کی۔

بہرحال ۶ نومبر ۱۹۵۰ء تک اتحادی افواج شمالی کوریا کی آخری سرحد یعنی دریائے یالو تک پہنچ چکے تھے۔ اسی تاریخ کو صرف یالو پر جہیب ترین بمباری کی گئی بلکہ اندرون مانچوریا دھنگو لیا امریکی ہوائیہ نے ہم پر سائے کیونکہ میکارتھر اور دیگر فوجی عہدیدار کوریا کے بہانے کمیونسٹ چین کو ختم کرنے کے خواہاں تھے۔ لیکن ایسا کر کے اقوام متحدہ نے چین کو دعوت جنگ دی یہ اقدام خود اقوام متحدہ کی اپنی منظور کی ہوئی قرارداد کے برعکس تھا جس میں بتلایا گیا تھا کہ یہ اقوام متحدہ کی حکمت عملی رہی ہے کہ کوریا کے سافٹ کی چینی سرحدیں محفوظ رہیں اور کوئی ایسا قدم نہ اٹھایا جائے جس سے کوریا کی جنگ دوسرے حصوں تک پھیل جائے۔ اتحادیوں کا وہ اقدام بذات خود جارحانہ تھا اور ہندوستان نے پہلے ہی خبردار کیا تھا کہ

اس طرح کی کارروائیوں سے چین کو بھی بہانہ مل جائے گا جس نے پہلے ہی سے شمالی کوریا کی حمایت کا کھلا اعلان کر دیا تھا۔

نومبر کے اواسط میں آخر کار چین نے مسلح مداخلت کی یکم فروری ۱۹۵۱ء کو جنرل اسمبلی نے چین کو "اقدامی" قرار دیا۔ ہند نے اس کی سخت مخالفت کی اور واضح کیا کہ چین نے پہلے ہی آگاہ کر رکھا تھا کہ وہ اپنی سرحدوں کے ساتھ کسی قسم کی آتش باری کو برداشت نہیں کر سکتا۔ ۱۸ مئی ۱۹۵۱ء کو اسی اسمبلی نے ایک اور امریکی قرارداد منظور کی جس میں چین کی بحری ناکہ بندی کی سفارش کی گئی تھی اور مفاجاتی اہمیت کی خام اشیا کی چین کو ترسیل پر امتناع عائد کیا گیا تھا۔ کرسمس کے قریب تک دس لاکھ چینی افواج اقوام متحدہ کی افواج کو ۳۸ ویں خط متوازی کی طرف دھکیلتے ہوئے آگے بڑھ رہی تھیں حتیٰ کہ ۲۵ دسمبر ۱۹۵۰ء کو صدر ٹرومین نے کرسمس کے موقع پر پیام دیتے ہوئے سارا کیا دعویٰ کی کہ اتحادی افواج نے کامیابی سے شمالی کوریا کا کامل تخلیہ کیا اس موقعہ پر ہندوستان نے پھر چین کو ہدایت کی کہ وہ اس خط کو عبور نہ کرے۔ لیکن اقوام متحدہ کی قائم کردہ منشا کی روشنی میں چین ایسا کرنے سے قاصر تھا۔ یہ امر دیگر کوریائی جنگ کا ایک خاص پہلو ہے جو یہ اشارہ کرتا ہے کہ جاپان کا کوریا میں منشا جنگی مشق کرنا ہے اور بس۔

۱۱ اپریل ۱۹۵۱ء کو صدر ٹرومین نے اقوام متحدہ سے مشورہ کئے بنا میکارتھر کو اتحادی افواج کی کمانداری سے برطرف کر کے جنرل میتھیو ریڈ وے کو ان کی جگہ مامور کیا۔ افراد کی اس تبدیلی کے ساتھ ساتھ جنگ کا رنگ بھی بدلتا گیا حتیٰ کہ اتحادی افواج نے کمیونسٹوں کو پھر ۳۸ ویں خط متوازی کے اس پار بھگا دیا اور خود بھی اُن کے پیچھے بھاگنے لگے۔ اس دوران میں امریکہ کو جو کثیر جانی نقصانات ہوئے اُن سے عاجز آ کر امریکہ نے اندرونِ چین تباہ کاریاں مچانی شروع کر دیں اور حتیٰ کہ جوہری بم کے استعمال کی دھمکی دی جس کی مخالفت پنڈت نہرو نے پوری شدت کے ساتھ کی۔ خان لیاقت علی خان اور لوئی سینٹ لارنس نے بھی امریکہ کو متنبہ کیا کہ ایشیا ہی میں دوسری دفعہ جوہری بم کا استعمال ایشیائیوں کو امریکہ اور اقوام متحدہ سے بدگمان کر دے گا۔ اور امریکہ کو اپنے ارادے سے توبہ کر لینی پڑی۔

التوائے جنگ کی کوششیں۔ ہندوستان نے موقعہ بہ موقعہ اپنی اس خواہش کا علی الاعلان اظہار کیا کہ حتی الامکان گفت و شنید کے ذریعے سے ہی مسئلے کا کوئی پرامن حل نکالا جائے۔ کوریا میں بدقسمتی سے جنگ کا آغاز ہو چکا تھا اس لئے ہند نے اپنی تمام کاوشیں التوائے جنگ پر مرکوز کر دیں۔

۱۴ دسمبر ۱۹۵۰ء کو ہند نے بارہ عرب ایشیائی ملکوں یعنی پاکستان، مصر، انڈونیشیا، برما، ایران، عراق، فلپائن، شام، لبنان، یمن، سعودی عربیہ اور افغانستان کے ہمراہ ایک قرارداد پیش کی جس میں ایک ایسے سہ رکنی گروپ کی تشکیل کی تجویز کی گئی جس میں خود صدر اسمبلی بھی شامل ہو اور جو التوائے جنگ کی اساس کی چھان بین کرے۔ یہ گروپ مجلس کے ساتھ اسمبلی کے آگے اپنی سفارشات پیش کرے۔ یہ قرارداد ۵۴ بمقابلہ ۵، ایک غیر جانبدار سے منظور کر لی گئی۔ اس سہ رکنی گروپ میں صدر جنرل اسمبلی مسٹر نصر اللہ انتظام کے ساتھ سر بی۔ این راؤ اور مسٹر ہیرسن بھی شریک تھے ۲ جنوری کو کمیشن نے اپنی ناکامی کا اعتراف کر لیا اور ۱۱ جنوری ۱۹۵۱ء کو اپنی پانچ نکاتی سفارشات پیش کر دیں۔

۲۴ جنوری ۱۹۵۱ء کو نہرو حکومت نے اپنی قرارداد کو تھوڑے سے ردوبدل کے ساتھ پیش کیا جس میں سات دولی (Powers) کمیٹی کی تشکیل کی سفارش کی گئی۔ ۲۹ جنوری ۱۹۵۱ء کو دوسری مرحلہ قرارداد میں تجویز کی گئی کہ مجوزہ سات دولی کانفرنس میں سب سے پہلے جنگ بندی اور اس سے متعلقہ امور پر اتفاق کرے اور بعد میں دوسری پیش قدمیاں کی جائیں۔ اس کے ساتھ ہی سر بی۔ این راؤ نے آگاہ کیا کہ پیکنگ کی مذمت کرتے ہوئے کوئی بھی قرارداد پاس کر لی گئی تو جنگ بندی کی امید معدوم ہو جائیگی۔ یہ قرارداد رد کر دی گئی۔

اس کے بعد مسٹر جیکب ملک نے نشر گاہ اقوام متحدہ سے اپیل کرتے ہوئے کہا کہ فریقین ۳۸ ویں خط کے ساتھ جنگ بندی کی گفت و شنید شروع کر دیں۔ چنانچہ ۱۰ جولائی کو کیانگ سن صلح کی گفت و شنید کا آغاز ہوا۔ ۲۳ اگست ۱۹۵۱ء کو شمالی کوریا نے اسے منقطع کر دیا اور پھر ۲۵ اکتوبر ۱۹۵۱ء کو پان من جوم میں اس کی تجدید عمل میں آئی۔

اسیرانِ جنگ کا مسئلہ۔ کوریا میں صلح کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ جنگی قیدیوں کا مسئلہ تھا۔ کمیونسٹ چاہتے تھے کہ جملہ قیدیوں کا غیر مشروط تبادلہ ہو یعنی پورے کے پورے قیدی بلا کسی خصوصی کارروائی کے

ایک دوسرے کے حوالے کر دئے جائیں۔ لیکن اتحادی اس کے مخالف تھے چنانچہ گفتگوئے صلح میں اسی کے باعث تعطل پیدا ہوتا۔ اور جب یہ حل ہو گیا تو معاہدۂ جنگ بندی بھی طے پا گیا۔ اسی گتھی کو سلجھانے میں ہندوستان نے جو حصہ لیا وہ اسی کا حق تھا کیونکہ اس منزل پر اسے ہر دو جانب سے لعن طعن کیا گیا لیکن اس کے باوجود ہندوستان ہی نے ایک ایسی راہ دکھائی کہ دونوں اس کے ہو گئے۔

ابتداً پیرو اور میکسیکو نے اپنی قرار دادیں پیش کیں جو پاس نہ ہو سکیں ۲۶ نومبر کو ہندوستان نے اپنی قرار داد پیش کی جس کی رُو سے جنیوا کنونشن کے مطابق قیدیوں کے تبادلے میں مزاحم ہونے یا اسے متاثر کرنے کے لئے کسی قسم کے قوت کے استعمال کی ممانعت کر دی گئی تھی۔ فریقین کی طرف سے رہا کئے جانے والے قیدیوں کو کمیشن کی حراست میں رکھا جائے گا قرار داد کی رو سے قیدیوں کا یہ تبادلہ معینہ تعداد میں متعینہ مقامات پر اور متفقہ غرفوجی منطقے میں عمل میں آئے گا۔ مجوزہ کمیشن (Neutral Nations Repatriation Commission. غیر جانبدار اقوام کا تبادلہ کمیشن) سویڈن، سوئٹزرلینڈ، چیکوسلواکیہ اور پولینڈ پر مشتمل ہو گا یا پھر ان چار ملکوں کے نمائندوں سے تشکیل پائے گا جنھوں نے کوریا کی جنگی کارروائیوں میں حصّہ نہ لیا ہو ہر فریق دو کو نامزد کرے گا۔ صدا نتی مجلس کے مستقل اراکین یعنی امریکہ، برطانیہ، فرانس، چین اور روس میں سے کسی کو بھی نامزد نہیں کیا جا سکے گا۔ کمیشن اپنی پہلی نشست میں اور جنگ بندی سے پہلے ایک ایمپائر مقرر کرے گا جو ہر وقت موجود رہے گا اور ساتھ ہی کمیشن کی صدارت بھی کرے گا اس وقت تک جب تک کہ اس کی مخالفت نہ ہو۔ اگر اس کے تقرر میں تین ہفتوں کے اندر اتفاق نہ ہو سکا تو معاملہ مجلس عمومی (جنرل اسمبلی) کے آگے بڑھا دیا جائے گا۔ معاہدہ صلح کے نوے دنوں بعد بھی جو قیدی ان تجاویز کے مطابق تبادلے پر رضامند نہ ہوئے ہوں، انھیں کمیشن اپنی حراست میں لے گا اور ان کے بارے میں سفارشات پیش کرے گا۔ اس کے بعد اُن کو پولٹیکل کانفرنس جس کے انعقاد کی ان تجاویز میں سفارش کی گئی ہے کے حوالے کیا جائے گا۔ تیس دنوں بعد بھی جن قیدیوں کا تبادلہ نہ ہو سکا ان کی نگہداشت خود کمیشن کرے گا اور ان تمام معاملات میں بین الاقوامی قانون کی سختی سے پیروی کی جائے گی۔

اسی ضمن میں ایک علیحدہ امریکی قرارداد اور ہندوستانی قرارداد میں روسی ترمیمات دونوں رد کر دی گئیں۔ یکم دسمبر کو اسمبلی میں یہ ہندوستانی قرارداد ۵۴ بمقابلہ ۵ ایک غیر جانبدار سے منظور کر لی گئی۔ اتنی بڑی اکثریت اس کے قبل بہت ہی کم قراردادوں کو نصیب ہوئی ہے۔ ۵ دسمبر کو سٹریسن نے کوریا میں تعمیری اور دیرپا امن کے لئے "کی مرخی کے ساتھ ہندوستانی تجاویز پیکنگ بھیج دیں۔ اس قرارداد پر روس تقریباً چراغ پا ہو گیا چنانچہ روسی مندوب مسٹر اینڈری وشنسکی نے انھیں "لاقانونی" لغو اور بے معنی" کا خطاب دیا اور "ایک ریپر اسٹامپ سے تعبیر کیا جس کا نوری جواب مسٹر کرشنا مینن نے یوں دیا (It would require a great stamp to stamp us.

۱۷ دسمبر کو چینی اور شمالی کوریائی حکومتوں نے اسے انھیں "غیر قانونی ناجائز اور نامعقول" کہہ کر رد کر دیا۔ امریکی مندوب مسٹر ہنری کیبٹ لاج نے انھیں تجاویز پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ یہ تلخ حقیقت ہے کہ کوریا میں کل ہی امن قائم ہو سکتا ہے اگر کمیونسٹ ہندوستانی تجاویز کی مخالفت سے دستبردار ہو جائیں۔ آزاد دنیا نے تہیہ کر لیا ہے کہ وہ اس ہندوستانی قرارداد سے وابستہ اور اس انسانی اصول پر قائم رہے گی کہ کوئی قیدی رضی کے خلاف گھر لوٹنے پر مجبور نہ کیا جائے"۔

۲۲ فروری کو جنرل مارک کلارک نے چینی شمالی کوریائی کمانڈروں کے نام اپنے مکتوب میں زخمی و بیمار قیدیوں کے تبادلے کے لئے گفت و شنید کی پیشکش کی جس کے بعد ۱۱ اپریل کو پان من جوم میں ایک راضی نامہ ہوا۔ اور ۲۰ اپریل کو ایک ہزار کمیونسٹ قیدیوں کے پہلے جتھے کا پانچسو اتحادی قیدیوں سے تبادلہ کیا گیا۔ ۲۶ اپریل کو گفتگوئے صلح کی تجدید ہوئی۔ ۳ مئی کو ۶۶۷۰ زخمی و بیمار چینی اسیران جنگ کی اتحادی کمان کی طرف سے واپسی مکمل ہوئی۔

۷ مئی کو چین اور شمالی کوریا نے آٹھ نکاتی تجاویز میں کہا کہ تبادلے کے خواہاں تمام قیدیوں کو معاہدۂ صلح کے دو ماہ بعد حراست سے رہا کر کے ایک دوسرے کے حوالے کیا۔ اور جو نا رضامند ہوں ان کا تبادلہ بین الآرسی پر چھوڑ دیا جائے جس میں سویڈن۔ سوئٹزرلینڈ، چیکوسلواکیہ، پولینڈ اور ہندوستان کے مساوی التعداد نمائندے شامل ہوں گے۔ کمیشن کا ہر رکن قیدیوں کے کنٹرول کے لئے مسلح افواج کی مساوی تعداد فراہم کرے گا۔ اور قیدیوں کو سمجھانے اور منانے کا کام صرف مقامی ممالک یعنی شمالی و جنوبی کوریا

کی طرف سے کیا جائے گا۔ کسٹوڈین فورس کی حراست کے چار ماہ بعد بھی جو قیدی تبادلہ نہ چاہیں انھیں کانفرنس کے حوالے کیا جائے گا۔

۱۳ مئی کو اتحادی کمان نے ان میں کچھ اس طرح کی ترمیم چاہی کہ کمیشن صرف غیر کوریائی اسیرانِ جنگ کو اپنی حراست میں رکھے' کوریائی قومیت کے تبادلہ نہ چاہنے والے قیدی شہری مرتبے پر رہا کر دئے جائیں گے لیکن انھیں اجازت ہوگی کہ وہ جب چاہیں تبادلے کی خواہش ظاہر کریں' مسلح افواج اور کارکنان کا عملہ صرف ہندوستان فراہم کرے گا اور ہندوستانی نمائندہ صدر کمیشن ہوگا اور ایگزیکٹو ایجنٹ کسٹوڈین آرگنائزیشن بھی۔ قیدیوں کو سمجھانے کا کام ساٹھ دنوں تک جاری رکھا جاسکے گا۔

شمالی کوریائی اور چینی حکومتوں نے ان ترمیم تجاویز کو بالکل مسترد کر دیا۔ اس کے بعد بھی گفت و شنید جاری رہی اور بالآخر ۸ رجون ۱۹۵۳ء کو اسیرانِ جنگ کے تبادلے کے معاہدے پر دستخط ہوئے جس کی رُو سے طے پایا کہ دو ماہ بعد جانبین بغیر کسی رکاوٹ کے براہِ راست تبادلہ کریں اُن قیدیوں کا جو اس پر مصر ہوں اور ان کو جتھوں کی شکل میں ۲½ میل چوڑے غیر فوجی منطقے میں پان من جوم کے مقام پر اس فریق کے حوالے کریں جس سے وہ بوقت گرفتاری متعلق تھے۔ معاہدے پر دستخط کے ۷۲ گھنٹوں کے اندر غیر فوجی منطقے کا مکمل تخلیہ کر دیا جائے گا۔ معاہدے کے نفاذ کے ساٹھ دنوں کے اندر وہ قیدی جو اپنے وطن نہیں لوٹنے کمیشن کے حوالے کر دئے جائیں گے۔ اور قومی نمائندوں کی جانب سے نوّے دنوں تک قیدیوں کے آگے توضیحات پیش کی جاسکیں گی۔ مسلح افواج اور کارکنان کا عملہ صرف ہندسر براہ کرے گا جس کا نمائندہ صدر کمیشن اور ایگزیکٹو ایجنٹ کسٹوڈین آرگنائزیشن ہوگا۔ توضیحات کی معینہ مدّت یعنی نوّے دنوں کے خاتمے پر کمیشن اپنی کسٹوڈی کے قیدیوں کے تبادلے کو پولٹیکل کانفرنس کے سپرد کرے گا۔ اس کے بعد بھی وطن لوٹنے پر تیار نہ ہونے والوں کو کمیشن شہری مرتبے پر رہائی کر دے گا۔ ان میں سے جو کسی بھی غیر جانبدار ملک کو جانا چاہیں انھیں کمیشن اور انڈین ریڈ کراس سوسائٹی مدد اور سہولت بہم پہنچائے گی۔ یہ کام تیس دنوں تک جاری رہے گا جس کے بعد کمیشن کی تحلیل کر دی جائے گی۔

اس گرہ کے کھلتے ہی سب رکاوٹیں زائل ہوگئیں اور ۲۷ رجولائی کو پان من جوم میں پیر کے روز صبح کے ٹھیک دس بج کر ایک منٹ پر لفٹننٹ جنرل ولیم کے ہیرلسن نے اتحادی کمان کی طرف سے اور لفٹننٹ جنرل نام ال نے شمالی کوریائی کمیونسٹوں اور چینی رضا کاروں کی جانب سے معاہدۂ صلح پر اپنے دستخط ثبت کئے جس کے ساتھ تین سال ایک مہینہ ایک دن کی خونین جنگ اختتام کو پہنچی اور روت کے سائے میں سکون نے پرورش پائی۔

کوریا میں آتشیں جنگ کے خاتمے کے ساتھ ہندوستان کے سر نئی ذمے داریاں جو بلا شبہ پہلے سے بھی زیادہ آزمائشی تھیں آن پڑیں۔ ہند نے کوریا میں امن کے لوٹانے میں ہاتھ بٹایا لیکن اس کو دیر پا و بنانے کی ذمے داری بالکلیہ اسی کے دوش پر پڑی۔ ہند کا یہ بین آرمی کا صدر اور کسٹوڈین فورس بنا دیا جانا ہماری اہمیت' خوش خلقی اور غیر جانبداریت کے سب سے عُریاں مظاہرے کا طالب تھا۔ جس کی نزاکت کا یہ عالم تھا کہ ہماری خفیف سی لغزش بھی افسانہ بن جاتی۔ اور کئی دفعہ ایسی کوششیں کی گئیں جن کا مقصود ہند کو جانبدار یا کمیونسٹوں کا طرفدار بنا کر اپنی ذمہ داریوں سے فرار پر اسے مجبور کرنا تھا۔ ہندوستانی افسروں پر سنگباری اور قیدیوں پر ہندوستانی کسٹوڈین فوج کی آتش باری کو رنگ آمیزی سے پیش کر کے امریکیوں نے ہند کے موقف اور اس کے بے داغ کارنامہ کو ٹھیس پہنچانے کی کوشش کی۔ لیکن میجر جنرل تھورات' آر کے نہرو اور جنرل تھیا کے تدبر اور فرض شناسی نے ہندوستانیوں کے قومی کردار پر کسی قسم کا حرف نہ آنے دیا۔ ذمے داریوں سے ہندوستانیوں کے کنارہ کش ہونے کی امید رکھنے والوں نے اور ساری دنیا نے آخر کار آرتھر ڈین اور جارج ڈی ایلن کے ہم زبان ہو کر تسلیم کر لیا کہ "ہندوستانی افواج کوریا میں ایک عظیم مسلک نہایت ہی خوش اسلوبی و اہلیت کے ساتھ انجام دے رہی ہیں"۔ وہ ہزاروں قیدی جو ہندوستانی افواج کے زیر نگہداشت رہے اپنے ساتھ وطن لوٹتے ہوئے ہندوستانیوں کی خوش خلقی و اعلیٰ کارکردگی کی مثالوں کو بطور تحفہ لے جائیں گے۔ کیونکہ ہندوستان نے ان سے ان کے قیدی ہونے کے باوجود ایسا سلوک کیا جیسا ایک آزاد قوم کو زیب دیتا ہے۔ ہندوستان نے اپنے فرائض کو پوری خوش اسلوبی کے ساتھ انجام دیتے ہوئے ۲۳ رجنوری کی آدھی رات کو اپنی حراست میں قید ساڑھے بائیس ہزار اسیرانِ جنگ کو شہری مرتبے پر رہا کر دیا۔ کمیشن ۲۳ رفروری کو تحلیل کر دیا گیا۔

اب ان کے تبادلے پر پولیٹبکل کانفرنس میں غور ہوگا جو معاہدۂ صلح کی دفعہ ۱۴ کے مطابق منعقد ہوگی۔ اس میں ہندوستان کی غیر جانبدار قوم کی حیثیت سے شمولیت کو امریکی مخالفت نے ناممکن بنا دیا تو مسٹر ایٹلی سے لے کر مسٹر مالنکوف تک سبھی نے اس کی مذمت کرتے ہوئے اعتراف کیا کہ ایسا کر کے امریکہ نے کانفرنس کی کامیابی کو مشکوک کر دیا ہے۔ مسٹر ڈلز نے اُسے ہماری غیر جانبداریت کا معاوضہ گردانا۔ جو کچھ بھی ہو عالمی رائے کے دباؤ سے مجبور ہو کر امریکہ کو بالآخر "فقان" کو پانچ کی کانفرنس کے اختتامی مراحل میں ہند کو بطور ناظر شریک کر لیا جائے کیونکہ بقول ایک برطانوی رکن پارلیمان "کسی بھی ایشیائی یا مشرقی تنازعے کا حل ہندوستان کی دلچسپی کے بغیر ممکن نہیں"۔ ہندوستان کی آزادی خود آزادیٔ ایشیا کی تحریک کا ایک باب ہے کیونکہ اس کے بعد ہی برما، سیلون، انڈونیشیا، عوامی جمہوریہ چین اور جاپان آزاد ہوئے جنوب مشرقی ایشیا اور شمال مغربی افریقہ میں انقلابی جد و جہد نے شباب حاصل کیا۔ اس لئے کوریا سے ہند کا تعلق خاطر لازمی اور فطری امر تھا۔ یہ قدرے تعجب خیز ہے کہ کوریائی تنازعے کے ابتدائی مراحل میں ہند، مصر اور یوگوسلاویہ میں وسیع ہم خیالی کے نشانات ملتے ہیں لیکن بعد میں چل کر یوگوسلاوی کا رویہ کرخت اور کمیونسٹ جانبداریت سے معمور نظر آتا ہے جبکہ مصر کا رویہ ایک خفگی کا نتیجہ ہے مسٹر صلاح الدین پاشا نے کہا تھا "میری حکومت کی ہدایات مجھے بروقت ملتیں تو میں ۲۶ جون کی قرارداد پر غیر جانبدار رہتا کیونکہ اصلاً کوریائی تنازعہ مغرب اور مشرقی ملکوں کے درمیان وسیع اختلاف خیال کی قبیلہ شکل تھا اور ثانیاً جارحانہ اقدام کے کئی اور واقعات کو نسل کے آگے آئے تو اس نے کچھ نہیں کیا جیسا کہ اب کر رہی ہے"۔ یہ دونوں اگرچہ جانداز مخالفتیں تھیں لیکن ہند کی آواز میں غیر محسوس طور پر گم ہو گئیں کیونکہ ہند کا رویہ معتدل تھا جس کے اجزائے ترکیبی معقولیت اور اصول پرستی تھے۔ اس لئے دنیا نے رفتہ رفتہ ہند کی آواز کی اہمیت کو جانا۔ وہ ممالک جو ہند کی پالیسی کی فوری افادیت کی کھوج میں اس کے حقیقی مسلک کو نہ سمجھ سکے آج اسے ایک معجزہ سمجھ رہے ہیں لیکن ناآشنا ہیں کہ ہند کی خارجی پالیسی کا معمار معجزوں پر ایمان نہیں رکھتا، اور نہ ہی وہ فوری نتائج کا قائل ہے بلکہ اس کے پیش نظر تدریجی ارتقا ہے جس کا پہلا قدم خود آزادیٔ ہند تھی۔

ہماری اس عظیم الشان کامیابی میں جہاں ہماری اصول پرستی اور غیر جانبداری کو دخل ہے وہیں جواہر لال کی شخصیت اس میں لازمی عنصر کے طور پر شریک ہے بلکہ اس کا محور ہے کیونکہ اس خارجی پالیسی کو بنانا اثر کرنا کسی اور کے بس کی بات نہیں۔ جواہر لال کی جد و جہد سے جو ان کی زندگی کا ایک حصہ ہے جو ایشیائی آزادی و اتحاد کے لئے وقف ہے۔ جنگ کے بھڑکتے ہوئے شعلے دب گئے لیکن اس موقع پر سر بی این راؤ، آنجہانی اور مسٹر کرشنا مینن کو فراموش نہیں کیا جا سکتا جو نہرو کے بہترین ترجمان ثابت ہوئے جنہوں نے نہرو کے پیام کو اقوام متحدہ کے اسٹیج سے ساری دنیا کے آگے پیش کیا اور ملکارا ؎

کھول آنکھ، زمیں دیکھ، فلک دیکھ، فضا دیکھ
مشرق سے اُبھرتے ہوئے سورج کو ذرا دیکھ

معلومات اور اعداد و شمار

۱۔ ۱۹۵۳ء میں بمبئی کی بندرگاہ میں کل ۲۸۱۹ جہاز لنگر انداز ہوئے۔ گویا روزانہ اوسط تقریباً آٹھ جہاز تھی۔

۲۔ بھارت میں اب تک چینی کی زیادہ سے زیادہ پیداوار فی ایکڑ ایک سو اٹھائیس ٹن ہے لیکن اوسط پیداوار صرف بارہ ٹن فی ایکڑ ہے اس کے مقابلے میں انڈونیشیا میں اوسط پیداوار فی ایکڑ ساڑھے پینتیس ٹن ہے۔

۳۔ بھارت میں ریلوں کے اپنے ایک سو اکیاون ہائی، مڈل اور پرائمری اسکول ہیں۔ ریلوں کے لحاظ سے ان کی تعداد یوں ہے۔ پورب ریلوے کے ۵۵۔ دکنی ریلوے اور بمبئی ریلوے کے پچیس پچیس مرکزی ریلوے کے اکیس اور اتر ریلوے اور پورب ریلوے کے آٹھ آٹھ۔ چترنجن میں ریلوے انجنوں کے کارخانے میں ۳ اسکول ہیں۔

۴۔ بھارت کے محکمہ موسمیات نے ۱۹۵۳ء میں کسانوں کی اطلاع کے لئے موسم سے متعلق پانچ ہزار آٹھ سو چالیس بلیٹن شائع کئے جن میں سے تقریباً نوّے فیصدی صحیح ثابت ہوئے یہ بلیٹن ملک کے مختلف ریڈیو اسٹیشنوں سے نشر کئے گئے۔

غزلیں

(دھاڑ بائیوی)

بجتسّ سے جھلک محبوب کی دیکھی نہیں جاتی
دکھا دیتی ہے قسمت ہی کبھی دیکھی نہیں جاتی

مسلّم تیری ایک ایک بات لیکن کیا کروں زاہد
کہ مجھ سے بندِ شیشے میں پری دیکھی نہیں جاتی

محبت ایک نعمت ہے جسے قدرت عطا کر دے
کہ اس میں کمستری و دیر تری دیکھی نہیں جاتی

قیامت کل کی آتی آج آجائے تو راضی ہوں
خدا شاہد ہے فرقت کی گھڑی دیکھی نہیں جاتی

محبت میں اجل کو آہ سے بہتر سمجھتا ہوں
مگر توہینِ رسمِ عاشقی دیکھی نہیں جاتی

ڈراتا ہوں اس قدر ناکامیٔ اُمید سے اپنی
وہ اب خوش ہیں مگر اُن کی خوشی دیکھی نہیں جاتی

الٰہی شکوۂ بیداد سے میں باز آتا ہوں
کہ مجھ سے تو نگاہِ ملتجی دیکھی نہیں جاتی

چلا ہے طور پہ دل ہی کو دیکھ اے دیکھنے والے
کہ تجھ سے سامنے کی چیز بھی دیکھی نہیں جاتی

یہ کہہ کر داورِ محشر نے مجھ کو اے دعا بخشا
کہ اس کم بخت کی تر دامنی دیکھی نہیں جاتی

(شفیق جونپوری)

جس قدر چلتا ہوں میں اے ہمتِ دل آج کل
دُور ہوتی جاتی ہے اتنی ہی منزل آج کل

کس قدر بے کیف ہے ساقی کی محفل آج کل
شیشہ و ساغر ہیں یا ٹوٹے ہوئے دل آج کل

ہر صدا میرے لئے اک درد کی آواز ہے
گیت گاتے ہیں کہ روتے ہیں عنادل آج کل

جیسے صحرا کی اُداسی قافلہ جانے کے بعد
کھو گئی ہے رونقِ بازارِ محفل آج کل

منکشف تھا جس پہ اک اک ذرۂ ہستی کا راز
ہے وہی ہُشیار دنیا بھر سے غافل آج کل

درہم و برہم ہے رندوں کا نظامِ مے کشی
دورِ صہبا ہے مگر بے میرِ محفل آج کل

عشق کی قسمت میں پہلے سے اسیری تھی مگر
حُسن بھی ہوتا ہے پابندِ سلاسل آج کل

سُرخیٔ افسانۂ دیر و حرم بدلی گئی
چھڑ گئی ہے تازہ بحثِ حق و باطل آج کل

بے خبر یہ دور ہے طاقت کے استعمال کا
بیچ تو یہ ہے کوئی قاتل ہے نہ بسمل آج کل

نغمۂ چنگ و رباب و لحنِ مطرب تا کجا
آمری فرمایئے ہے سننے کے قابل آج کل

دیکھ اے گردوں وہ جاتا ہے شفیق تیز گام
تیرے سیارے ہیں جس کی گردِ منزل آج کل

نئی کتابیں اور رسالے

دیوان صفی صفی مرحوم کا یہ دیوان ممتاز حسین صاحب جونپوری نے مرتب کرکے شائع کیا ہے۔ مرتب نے بڑی جانفشانی اور ذاتی ایثار کو بروئے کار لاکر یہ کام سرانجام دیا ہے۔ صفی نے اردو شاعری کی خدمت ایک طویل مدت تک کی۔ اس دیوان کے شروع میں فاضل مرتب، جناب اثر لکھنوی، سید کلب عباس، جناب اختر علی نہری، سید احتشام حسین اور سید شہنشاہ حسین کے مبسوط و مربوط مقدمات شامل ہیں۔ صفی کے ساتھ اردو شاعری، ذاتی وجاہت، اخلاص اور وضعداری کا ایک دور ختم ہو گیا۔ ان کی زندگی علمی فضیلت اور ملی خدمت کا ایک عہد تھی۔ ان کے سرچشمۂ فیض سے عزیز لکھنوی اور ان کے تلامذہ اثر و جوش نے فیض پایا۔ ان کے فکرِ سخن کی مدت قریب قریب ۷۰ سال ہے۔ زمانے کے ساتھ ساتھ صفی نے اپنے رنگ شاعری کو تبدیل کیا۔ یہ ان کے ترقی پسند مزاج پر دال ہے۔

ہمیں امید ہے کہ یہ مجموعہ اہلِ ادب میں مقبول ہوگا۔ قیمت فی جلد دو روپے۔ ملنے کا پتہ

جناب ممتاز حسین جونپوری، قومی گھر نادان محل روڈ لکھنؤ

خلاصۂ فسانۂ آزاد مرتبہ سید ابو تمیم فرید آبادی۔ ناشر کتب خانہ انجمن ترقی اردو۔ جامع مسجد دہلی ۶ قیمت تین روپے فی جلد۔ ضخامت ۲۸۸ صفحات۔ تقطیع $\frac{20 \times 30}{16}$ کاغذ کتابت، طباعت، جلد، جلد پوش اوسط جیسا کہ کتاب کے نام سے ظاہر ہے یہ کتاب فسانۂ آزاد ایسی ضخیم کتاب کا خلاصہ ہے۔ اس میں اصل کتاب کی بہترین عبارت، دلچسپ واقعات کو اور اس زمانے کی زندگی کے نادر حالات کو لے لیا ہے۔ اور غیر ضروری حصّوں کو چھوڑ دیا ہے۔

انتخاب کلام رازیزدانی مرتبہ عابد رضا بیدار۔ ضخامت ۴۸ صفحات۔ ملنے کا پتہ آزاد کتاب گھر دہلی۔ قیمت بارہ آنے

زبورِ عرفان اختر مالیگانوی کے کلام کا مجموعہ۔ ناشر انجمن آئینۂ ادب مالیگاؤں۔ قیمت مجلد ایک روپیہ بارہ آنے غیر مجلد ایک روپیہ آٹھ آنے۔ مصنف کی تصویر بھی شامل کتاب ہے۔ ضخامت ۱۴۴ صفحات تقطیع $\frac{20 \times 30}{16}$

پیاری نظمیں مصنف اخگر مشتاق۔ ناشر ادارۂ فکر و فن رحیم آباد لکھنؤ۔ قیمت پانچ آنے۔ ۳۲ صفحوں کے اس کتابچے میں بچّوں کے لئے دلچسپ نظمیں شامل ہیں۔

نورتن مصنف پنڈت رلارام رتن پنڈوروی۔ ناشر کتب خانہ انجمن ترقی اردو جامع مسجد دہلی۔ قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے یہ مجموعہ نو ادبی اور تنقیدی مضامین پر مشتمل ہے جن کے عنوانات یہ ہیں ہماری تعلیم میں مادری زبان کا درجہ، اردو کا سب سے بڑا مصنف۔ قدیم ہندی ڈرامہ، اردو ڈرامہ، رباعی، تاریخ اردو مثنوی، قصۂ چہار درویش ادب جدید۔ مضامین محنت اور کاوش سے لکھے گئے ہیں۔

تنقیدی اصول اور نظریے ناشر انوار بک ڈپو ایجوکیشنل پبلشرز لکھنؤ۔ مصنف حامد اللہ افسر قیمت دو روپے آٹھ آنے۔ مصنف اردو کے پرانے استاد اور مصنف ہیں۔ تنقید کے موضوع پر آپ کی یہ کتاب ادب میں ایک بہت اچھا اضافہ ہے۔ تمہید، ادب اور فنون لطیفہ، تنقید یونان قدیم میں، تنقید ہند قدیم میں، تنقید زمانہ مابعد میں، شاعری بت تراشی اور مصوری جمالیات اور فنونِ لطیفہ، اصول تنقید کی تشکیل، تنقید کا مقصد اور

عل، ادب کا مطالعہ، اردو کے چند اصنافِ سخن پر ایک نظر، نیا ادب، ان موضوعات پر سیر حاصل روشنی ڈالی گئی ہے ۔

پرنا اور دوسرے افسانے محترمہ آصفہ نجیب صاحبہ نے آٹھ افسانوں کا مجموعہ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ جامعہ نگر دہلی نے شائع کیا ہے قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے فی جلد یہ افسانے چند نفسیاتی مطالعے ہیں جنہیں پڑھ کر انسانی زندگی سے محبت اور ہمدردی پیدا ہوتی ہے ۔ زبان نہایت سلیس اور سادہ ہے ۔

شعر و سخن (ہندی) حصّہ دوم مصنف ایودھیا پرشاد گوئلیا ۔ ملنے کا پتہ بھارتیہ گیان پیٹھ کاشی (بنارس) قیمت تین روپے ضخامت ۲۴۳ صفحات ۔ کتاب مجلد ہے اور نہایت ہی حسین و جمیل چھپی ہے ۔ سرورق نہایت ہی خوبصورت اور جاذب نظر ہے ۔ گوئلیا صاحب اس سے قبل بھی ہندی میں اردو شعر و شاعری سے متعلق دو مستند کتابیں شائع فرما چکے ہیں ۔ اسی سلسلے کی تیسری اور چوتھی کتاب بھی غالباً منظرِ عام پر آنے والی ہے ۔ شعر و سخن کے چار حصوں کے ساتھ ساتھ ہی "شاعری کے نئے دور اور شاعری کے نئے موڑ" پریس میں ہیں ۔ زیر تبصرہ کتاب میں غزل سے متعلق مختلف نقطہ ہائے نظر سے بحث کی گئی ہے اور لکھنؤ اسکول کے مندرجہ ذیل شعراء کے حالات اور کلام کا جائزہ لیا گیا ہے ۔ "نظم طباطبائی، صفی، نظر، ثاقب، آرزو، امید بیٹھوی، ریاض جلیل، دل شاہجہانپوری، حفیظ جونپوری، سرشار لکھنوی، شوق بہنہ، ناطق لکھنوی، عزیز لکھنوی، اثر لکھنوی مصنف کی یہ کوشش اردو اور ہندی داں زبانوں کے حلقوں میں تحسین کی نظر سے دیکھی جائے گی ۔

ناشر گورنمنٹ اوری اینٹل مینوسکرپٹس لائبریری مدراس

جامع الاشیاء ۔۔۔ ۸ ۔ ۱۳
تحقیق البحران ۔۔۔ ۸ ۔ ۱
طبِ فریدی ۔۔۔ ۴ ۔ ۸
سفینۃ النجات ۔۔۔ ۱۰۰ ۔ ۱

یہ چاروں کتابیں قدیم فارسی مسودات کی تصحیح کے بعد شائع ہوئی ہیں ۔ تمام کتابیں ٹائپ میں چھپی ہیں اور مجلد ہیں ۔ مدراس گورنمنٹ کا یہ اقدام نہایت ہی مستحسن اور قابل قدر ہے ۔ ان کتابوں کی اشاعت کے لئے لائبریری کے جنرل ایڈیٹر مسٹر ٹی چندر سیکھرن قابل مبارک باد ہیں ۔

جامع الاشیاء (فارسی) علم الاشیاء سے متعلق یہ کتاب بڑی نادر ہے ۔ حکیم باقر حسین عرف رضا صاحب جو نورُ خراسانی کے نام سے مشہور ہیں اس کتاب کے مصنف ہیں ۔ یہ کتاب محمد علی خاں بہادر عظیم جاہ والی کرناٹک کے زمانے میں عظیم نواز خاں بہادر معتمد جنگ مفتی بادر الدولہ کے ایماء سے لکھی گئی ۔ اس کتاب میں ملک کرناٹک کے اکثر نباتات و حیوانات پر مفید اور مفصل معلومات فراہم کئے گئے ہیں ۔ کتاب ادبی حیثیت سے بھی قابل قدر ہے ۔ بڑی تقطیع کے ۴۷۲ صفحوں پر مشتمل ہے اور ٹائپ میں چھپی ہے حکیم عبدالقادر احمد صاحب فاضل کمیل الطب کالج لکھنؤ نے اسے مرتب و مدوّن کیا ہے

تحقیق البحران (فارسی) بحران ایک طبی اصطلاح ہے جس سے مراد وہ تغیر عظیم ہے جو حالتِ مرض میں پیدا ہوتا ہے ۔ اطباء کے لئے مسائل بحران کا جاننا نہایت ضروری ہے ۔ اس موضوع پر یہ ایک جامع رسالہ ہے ۔ حکیم احمد اللہ خاں دہلوی نے جو مشہور و معروف درباری حکیم گزرے ہیں اسے تصنیف کیا اور نواب امیر الہند والا جاہ محمد علی خان بہادر والی کرناٹک کی خدمت میں پیش کیا یہ رسالہ سات مضمون پر مشتمل ہے ۔ اس کتاب کو بھی حکیم عبدالقادر احمد صاحب نے مرتب کیا ہے ۔

طبِ فریدی (فارسی) کتاب ہذا میں ہر مرض کا علاج مفرد ادویہ سے بتایا گیا ہے اور جہاں مرکبات کا ذکر آیا ہے صرف دو چار دواؤں سے کام لیا ہے ۔ مصنف کا نام فریدالدین ہے ۔ مسودے پر "یا امام حسین" اور "محمد علی حسن خان تاج الامراء" دو مہریں ثبت ہیں ۔ تاریخ تصنیف کتاب پر درج نہیں اس کتاب کے مرتب بھی حکیم عبدالقادر صاحب ہیں ۔

سفینۃ النجات (فارسی) فنِ جہاز رانی کے متعلق یہ نواب غلام غوث خاں بہادر والی کرناٹک کا ایک مختصر اور جامع رسالہ ہے ۔ نواب موصوف نے اس رسالے کو چار ابواب اور ہر ایک باب کو کئی حصّوں میں تقسیم کیا ہے ۔ فن کی مناسبت سے

باب کا نام سبلابہ اور فصل کا نام موج رکھا ہے۔ رحیم احمد صاحب فاروقی نے اس کتاب کو مرتب و مدون کیا ہے۔ یہ کتاب بہت دلچسپ اور ادبی پہلو سے قابلِ قدر ہے۔

علوی تصوّرات

سیّد اختر علی تہری ہمارے مشہور و معروف مفکر ادیبوں میں سے ہیں۔ آپ کی کتاب مذہبی تصوّرات پر مدیر کا ایک مفصل نوٹ کچھ مدت ہوئی آج کل میں شائع ہو چکا ہے۔ اب علوی تصوّرات سرفراز قومی پریس لکھنؤ کی طرف سے شائع ہوئی ہے۔ یہ کتاب تہری صاحب کے ان عالمانہ اور حکیمانہ مقالات کا مجموعہ ہے جو موصوف نے مختلف جرائد کے رجب اور محرم نمبروں کے لئے وقتاً فوقتاً لکھے ہیں۔

آغاز میں حضرت علی کے باب میں چار مبسوط مضامین ہیں۔ ان مقالوں میں خدا کا وجود۔ اس کی توحید اس کے صفات کی نوعیت وغیرہ کے جدید مہمات عقائد معقول طریقے سے سمٹ آئے ہیں تعارف کے ایک اقتباس سے کتاب کی نوعیت اور قدر و منزلت کا اندازہ ہو جائے گا۔

ان مضامین میں موضوع روایتوں کا انبار نہیں ہے۔ ذاکری کے خوش کن نکتے نہیں ہیں سستی جذباتیت کو خوش کرنے والے لطیفے بھی نہیں ہیں۔ عقیدت کی سوت سے پھوٹنے والی شاعری بھی نہیں ہے۔ فاضل تہری مذہب کے بازار میں اس قسم کا مال و متاع لے جانا فطرتاً ناپسند کرتے ہیں۔ البتہ اس مجموعے میں قارئین کرام کو وہ سب کچھ ملے گا جس سے عقیدت کی آنکھوں میں دانش و بینش کا نور پیدا ہو سکتا ہے۔

یہ کتاب نہایت شستہ اور مدلل نثر کے جواہر سے مالا مال ہے ضخامت ۱۱۲ صفحے قیمت ایک روپیہ چار آنے۔ ملنے کا پتہ سرفراز قومی پریس لکھنؤ۔

بھودان تحریک کا خاکہ

مصنف محمد حسین انصاری تیاگی انصاری منزل بھدوہی ضلع بنارس

سلیس اور سادہ زبان میں ۲۴ صفحوں کا یہ رسالہ ونوبا بھاوے جی کی تحریک پر مختصر سی روشنی ڈالتا ہے۔ رسالے کے آخر میں تیاگی جی کے نام گاندھی جی کے تین اردو خطوں کے چربے بھی شائع کئے گئے ہیں جو بہت دلچسپ ہیں۔ قیمت چار آنے۔

رسالے

محمد حسن کالج میگزین
جون پور

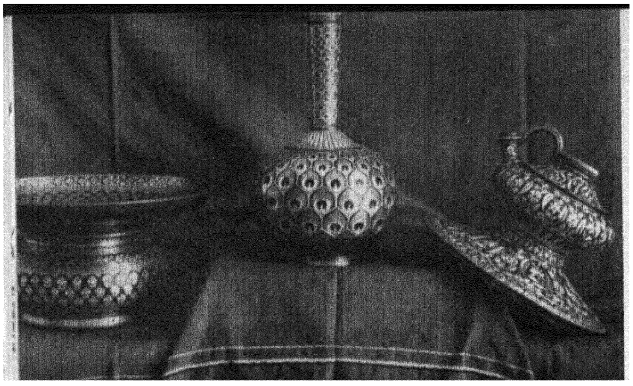
سہیل نمبر

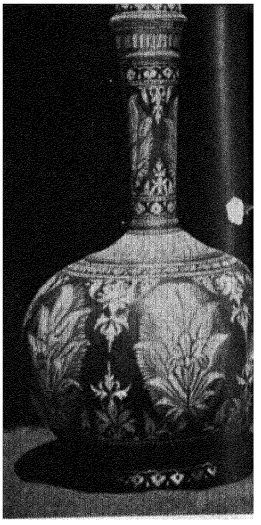
محمد حسن کالج جون پور کے پرنسپل جناب نیاز احمد صدیقی مخلص انسانوں کی دنیا میں ایک نادر ہستی ہیں۔ آپ نے اپنی زندگی تعلیم اور انسانیت کی اشاعت میں گزاری ہے۔ محمد حسن کالج کی موجودہ ہر دل عزیزی آپ کی ذات بابرکات کی مرہون ہے۔ ہو نہیں سکتا تھا کہ آپ کے کالج کا میگزین شائع ہو اور وہ اپنے ایک دوسرے محسن جناب اقبال احمد سہیل کو نظر انداز کرے۔ سہیل صاحب ہمارے شعر و ادب کی کشتی کے پرانے ناخداؤں میں سے ہیں۔ اردو یا علی گڑھ کا ذکر آئے تو ذکر سہیل ناگزیر ہے۔ اس نمبر میں سہیل صاحب کے اردو فارسی کلام کا انتخاب اور اس پر معقول تبصرے شائع ہیں۔ لکھنے والوں میں مولانا سید سلیمان ندوی، ڈاکٹر ذاکر حسین خاں، شاہ معین الدین احمد ندوی، پروفیسر رشید احمد صدیقی اور پروفیسر آل احمد سرور۔ گویا سب کے سب اردو ادب کے مستند معمار ہیں۔ کلام سہیل کے باب میں کچھ کہنا سورج کو چراغ دکھانا ہے۔ تغزل کے دو رُخ ان کے دو شعروں میں ملاحظہ فرمائیے ؎

خدا رکھے شباب آیا تو انداز حجاب آیا — لب نازک سے ہاں بھی اب نکلتی ہے نہیں ہو کر
مزاذ دتِ نظر خوگر ہے نظر کی بلندی کا — کروں کیوں ان سے جلوے کا تقاضا دشمنِ جاں ہو کر

عرض نیاز میں خود پرنسپل صاحب نیاز صدیقی فرماتے ہیں۔

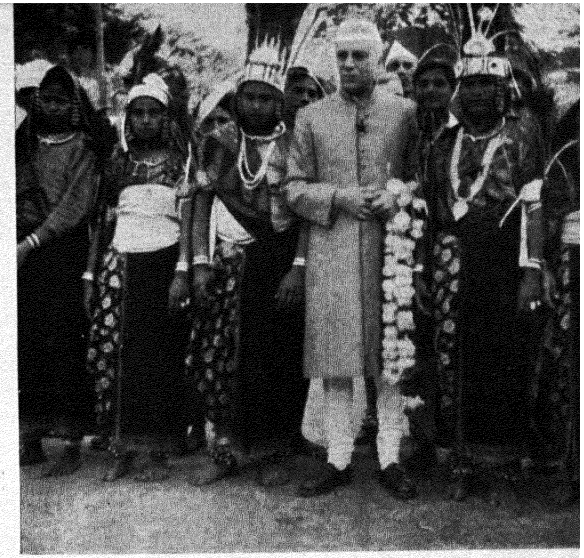
"محمد حسن کالج جون پور نے اپنی دشواریوں کے باوجود جون پور کی قدیم علمی روایات کے مطابق سہیل نمبر شائع کر کے ایک بڑی ادبی خدمت انجام دی ہے۔ مولانا سہیل کا آبائی وطن جونپور رہی ہے۔ اس لئے جونپور اس واسطے کو بھی نہ بھول سکا۔ ہمیں امید ہے کہ یہ نمبر ملک بھر میں مقبول ہوگا۔"





بیدری صنعت ' حیدرآباد دکن ' کے نمونے





کی ناگا عورتیں - پنڈت نہرو تصویر میں ان کے ہمراہ کھڑے ہیں



نوالہ) کے کچھ کلاکار

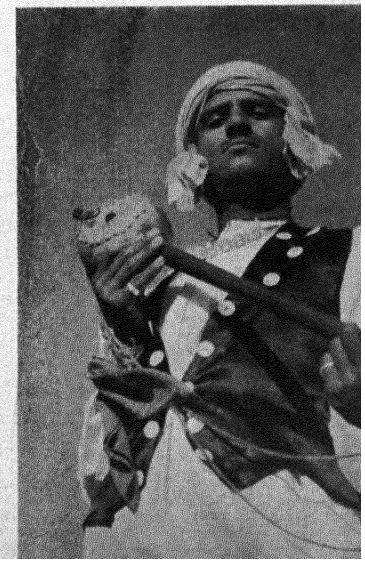
جنوری ۱۹۵٤ منعقد شدہ لوک ناچ اتسو

میں بننے والے فن کار



حیدرآباد کی ایک بنجارہ عورت

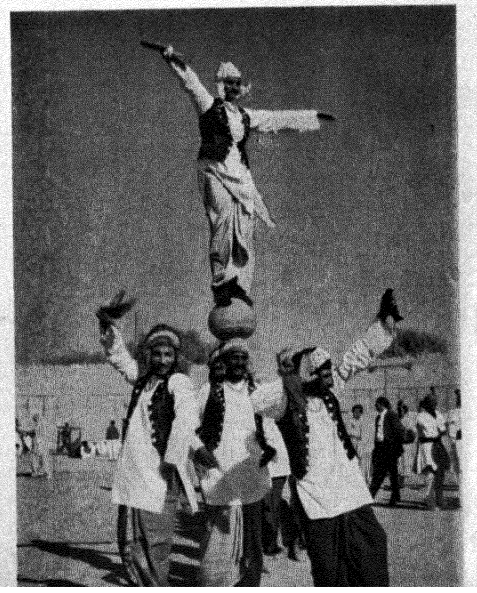
ایک تارہ بجانے والا



منی پور کے کلاکار

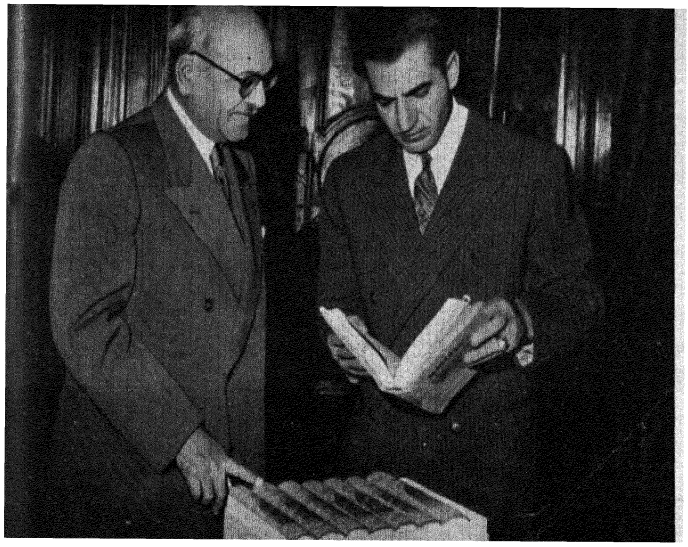


بھنگڑہ ناچ (پیپسو)

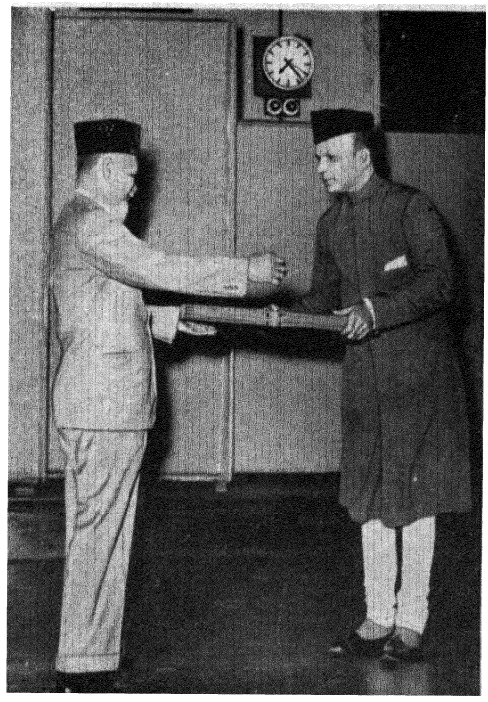


الغوزے بجانے والا





ایران میں ہندوستان کے سفیر ڈاکٹر تارا چند نے حال ہی میں مہاتما گاندھی کے سوانح بعنوان "مہاتما" کا ایک سیٹ اور گاندھی جی کے خود نوشت سوانح بعنوان "تجربی آتم کتھا" شاہ ایران کی خدمت میں پیش کئے۔
تصویر میں شاہ ایران "مہاتما" کی ایک جلد کو ملاحظہ فرما رہے ہیں



انڈونیشیا میں ہندوستان کے سفیر شری بی۔ ایف۔ ایچ۔ بی۔ طیب جی انڈونیشیا کے وزیر اطلاعات ڈاکٹر آیف ایل۔ توبنگ کی خدمت میں ان تقریروں کے ریکارڈوں کا سیٹ پیش کر رہے ہیں جو ۱۹۴۹ میں دہلی میں منعقد شدہ انڈونیشین کانفرنس میں کی گئی تھیں۔

قومی پلان کے لئے قرضہ

حال ہی میں پردھان منتری نے قومی پلان کے قرضے میں روپیہ لگانے کے لئے عوام سے اپیل کرتے ہوئے کہا تھا کہ ملک کے لوگوں کو نئے بھارت کی تعمیر کے اس کار عظیم میں شریک ہونا چاہیئے تب سے زندگی کے ہر شعبے کے لوگوں مثلاً ایڈیٹروں اور اخبار پڑھنے والے کارخانے دار اور مزدور - اساتذہ اور طلباء دکان دار اور کسان میں اس قرضے کا چرچا ہے -

عوام کے مختلف طبقوں سے اس قرضے کے بارے میں جب آراء پوچھی گئیں تو مندرجہ ذیل جوابات ملے -

اخبار کا ایڈیٹر ہندوستان ٹائمز کے منیجنگ ایڈیٹر شری دیویداس گاندھی نے کہا

"قومی پلان کے لئے قرضے کا اعلان نہایت موزوں وقت پر کیا گیا ہے - میں اس کی بے انتہا نفسیاتی اہمیت کے پیش نظر اسے خوش آمدید کہتا ہوں - اخبارات نے اس کی پُرزور حمایت کی ہے - ملک کو اپنی آزادی اور وقار کے لئے ہمیشہ ثابت قدمی اور اتحاد سے کام لینا ہوگا - اس سلسلے میں یہ قرضہ ایک اچھی مشق ہے - اس کے لئے ہم اپنی بعض موجودہ ضرورتوں کو ملتوی کرکے اپنا مستقبل بنا سکتے ہیں - ہم اپنی بچت کی جو رقم اس میں لگائینگے اس سے ہمارا ملک جلد از جلد زیادہ مستحکم اور خوشحال ہوگا اور اس قرضے میں روپیہ لگانا نہ صرف باعث فخر ہے بلکہ منافع بخش ہے -

کارخانے دار دہلی کلاتھ اینڈ جنرل ملز کے چیئرمین مسٹر شری رام نے جو قومی پلان سے متعلق قرضے کے سرٹیفکیٹ خریدنے کے لئے ہر ماہ پراویڈنٹ فنڈ سے پونے دو لاکھ روپے کی رقم استعمال کرنا چاہتے ہیں کہا -

میں سمجھتا ہوں کہ بادی النظر میں اس قرضے کی شرائط معقول ہیں - مجھے یقین ہے کہ انشورنس کمپنیاں پراویڈنٹ فنڈ بنک اور دیگر ایسے ادارے آزادانہ اس میں رقمیں لگائیں گے - میری رائے میں ملک کے ہر شخص پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ اس قرضے کو کامیاب بنانے میں مدد دے -

کارخانے کا مزدور ایک چالیس سالہ مستری لیکھراج نے اس قرضے کی خبر ریڈیو پر سننے کے بعد جو کہا اس کا خلاصہ درج ذیل ہے -

"سچ تو یہ ہے کہ ہم نے اپنے ملک کی مدد کے لئے کوئی زیادہ کام نہیں کیا - ہم چاہتے ہیں کہ حکومت ہمارے لئے زیادہ بڑے مکان بنائے اور ہمیں مزید سہولتیں مہیا کرے لیکن ہم خود حکومت کو اس کے عوض کچھ نہیں دیتے اب ملک کی خاطر کچھ کرنے کا ایک بڑا اچھا موقع پیدا ہوا ہے - میں مانتا ہوں کہ ایک مزدور کے لئے یہ مشکل ہے کہ وہ ایک سو روپے کے قرضے کا سرٹیفکیٹ خریدے لیکن بھارت کی خاطر ہمیں کفایت شعاری اختیار کرنا چاہیئے - آؤ آج ہم اپنے بچوں اور پوتوں اور پوتیوں کے لئے ایثار کریں - اس قرضے میں ٹھوس نفع ہے - ہر چھ ماہ کے بعد ہمیں سود کی ایک خاص رقم ملے گی -

شادی شدہ عورت ایک فوجی افسر کی بیوی اور دہلی مانٹسری اسکول کی استانی مسز سوشیلا جنیجہ نے کہا -

یہ قرضہ ایک اچھی تجویز ہے - ہم عورتوں کو اپنے ماہانہ اخراجات سے کچھ نہ کچھ بچانا چاہیئے تاکہ ہم اس قرضے میں کچھ رقم لگا سکیں اس سے قرضے کی میعاد ختم ہو جانے کے بعد ایک خاص رقم ہی نہیں ملے گی بلکہ

یہ خوشی بھی ہوگی کہ میں انڈیا لمیٹیڈ فرم کی ایک حصہ دار بھی ہوں۔ دونوں لحاظ سے مجھے اس میں فائدہ ہوگا۔

معلّم جامعہ ملیہ کے پرنسپل ایم مجیب نے کہا۔

اس قرضے کے بارے میں کوئی اختلاف رائے نہیں ہوسکتا ہر شخص کو اپنی ترقی کے مطابق اس میں شریک ہونا چاہیئے۔ ہمارے قومی پلان کا انحصار قومی بچتوں پر ہے۔ اگر ہم ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھے رہیں اور ایسی اسکیموں میں فیاضی سے روپیہ نہ لگائیں تو ہم کس طرح ترقی کر سکتے ہیں۔ اس قرضے میں رقم لگاتے ہوئے ہم براہ راست اس مہم میں شریک ہوں گے آؤ ہم سب اس سلسلے میں جو کچھ کر سکتے ہیں کریں"۔

لیڈی آرٹسٹ ترپوینی کلاشکم کی طالبہ مس سمن ماتھر نے جوشیلے لہجے میں کہا۔

ملک کی خوشحالی کو قریب تر لانے کے لئے یہ ہم سب کے لئے ایک اچھا موقع ہے ہم اپنا پہلا پانچ سالہ پلان مکمل کرنے کے بعد دوسرا پلان شروع کریں گے اور پھر تیسرا اور اس وقت تک یہ مہم جاری رکھیں گے جب تک کہ ملک سے بھوک اور افلاس دور نہیں ہو جاتے ہم طلبا اور طالبات کو ہر گاؤں اور ہر گھر میں یہ سندیش پہنچانا چاہیئے

سرکاری کلرک وزارت بحالیات کے کسٹوڈین آفس کے اپر ڈویژن کلرک سردار تیجا سنگھ نے کہا۔

اس قرضے میں ہم سب کے لئے یہ پیغام ہے کہ مشکلات سہنے کے لئے ہمیں تیار رہنا چاہیئے اور ملک کی ترقی کے لئے جتنی رقم ہو سکے سرکار کو قرض دینی چاہیئے۔ اگر ہم نے ملک کے استحکام اور آزادی کے لئے کوئی مدد نہ دی تو ہم کو تباہی فرض کے مرتکب ہوں گے۔ اس قرضے کے ذریعے ہم نہ صرف کفایت شعاری کی عادت ڈال سکتے ہیں بلکہ مستقبل اپنا تحفظ بھی کر سکتے ہیں۔

کسان دہلی کے نزدیک سرائے جولنا کے ایک کسان بھولا نے شہر میں رہنے والے اپنے ایک بھائی سے قرضے کے بارے میں سن کر کہا۔

یہ قرضہ بروقت ہے آج کل ہم اپنی فصلوں کی قیمتیں وصول کر رہے ہیں اور ہم یقیناً اس نیک کام کے لئے کچھ رقم مخصوص کر سکتے ہیں۔ سرکار نے ہمارے لئے بہتر بیج اور کھاد مہیا کئے ہیں اور ہمیں جلد ہی اپنے کھیتوں کے لئے اور زیادہ پانی ملے گا۔ سرکار کو قرضہ دینے سے ہم اپنے ہی گاؤں اور گھروں کی اصلاح کا سامان کریں گے۔

پچھلے سال میں نے پانچ سو روپے کے نیشنل سیونگز سرٹیفیکیٹ خریدے تھے اور اس سال میں اور زیادہ خریدنے کا ارادہ رکھتا ہوں کیونکہ مجھے کالکا جی کی اپنی اس زمین کی قیمت ملنے کی توقع ہے جو سرکار نے مجھ سے لی ہے۔

محنت کشوں کی آبادکاری کا پروگرام

جن نئی بنجر زمینوں کو قابل کاشت بنایا گیا ہے ان پر بے زمین محنت کشوں کو مستقل طور پر آباد کرنے کے لئے بھارت سرکار کی مرتب کردہ اسکیم پر عمل شروع کر دیا گیا ہے۔ چنانچہ ریاست بھوپال میں دس ہزار ایکڑ کے مرکزی فارم پر چودہ دیہات کے ڈیڑھ سو محنت کشوں کے پہلے گروپ کو آباد کیا جا رہا ہے حال ہی میں جب مرکزی وزیر زراعت ڈاکٹر پنجاب راؤ دیش مکھ بھوپال تشریف لے گئے تو ان دیہاتیوں کو ان کے سامنے پیش کیا گیا۔ وزیر زراعت نے انہیں کہا کہ وقتاً فوقتاً ان کے کام کا جائزہ لیا جاتا رہے گا اور جن محنت کشوں کا کام تسلی بخش ثابت نہیں ہوگا انہیں علیحدہ کر دیا جائے گا ان کا بنیادی مدعا ان اہل محنت کشوں کا انتخاب کرنا ہے جو کھیتی باڑی کے کام پر جمے رہنا چاہتے ہوں اور بالآخر بہترین کاشتکار ثابت ہوں۔

بھارت میں جدید اخبار نویسی کا آغاز

نیشنل آرکیوز آف انڈیا (قدیم دستاویزات کے تحفظ سے متعلق شعبہ) نے بھارت میں اخبارات کی ترقی کی مختصر تاریخ کے نام سے ایک پمفلٹ شائع کیا ہے۔ شعبۂ مذکور کے قبضے میں جو پرانے ریکارڈ موجود ہیں، لوگوں کو اُن کی قدر و قیمت سے آگاہ کرنے کے لئے مختلف موضوعات پر پمفلٹ شائع کرنے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ اور یہ پمفلٹ اس سلسلے کی پہلی اشاعت ہے۔ اخبارات کے علاوہ تعلیمی ترقی، ذرائع نقل و حمل کی ترقی، لوکل سیلف گورنمنٹ، مزدار عیان سے متعلقہ قوانین اور بھارت میں ٹیکوں کی ترقی وغیرہ موضوعات پر بھی اسی قسم کے پمفلٹ شائع کئے جائیں گے۔

زیر نظر پمفلٹ میں اس امر پر روشنی ڈالی گئی ہے کہ شروع شروع میں بھارت کے اخبارات کو کن کن مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ اور اس زمانے کی حکومت کی سختیوں کے باوجود وہ کس طرح رائے عامہ کے مؤثر اظہار کے لئے موزوں مقام حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے۔ درحقیقت اٹھارویں صدی کے آخری چوتھائی حصے کے آغاز سے پیشتر بھارت میں صحیح معنوں میں کوئی بھی اخبار وجود میں نہیں آیا تھا۔ تاہم بھارت میں خبروں کی ترسیل کے لئے قدیم مدت سے ستونوں اور پتھروں پر کندہ کاری سے کام لیا جاتا رہا ہے۔ جیسا کہ مہاراجہ اشوک کے زمانے میں، مغلوں کے زمانے میں صوبائی راجدھانیوں میں معلومات فراہم کرنے کا خفیہ شعبہ کام کیا کرتا تھا۔ یہ شعبہ لوگوں سے میل جول کے ذریعے سے اور افواہوں کی بنا پر ضروری خبروں کا ایک گزٹ سالانہ بادشاہ کو بھیج دیتا تھا۔ چنانچہ بجا طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ بھارت میں اخبار نویسی کی بنیاد ان یورپی باشندوں نے رکھی جو شروع شروع میں قسمت آزمائی کے لئے بھارت آئے تھے۔ ان دنوں کمپنی کی حکومت کا مرکز کلکتہ تھا۔ اپنی تجارتی اہمیت کے باعث یہ شہر ان لوگوں کی سرگرمیوں کا مرکز بن گیا تھا۔ شروع شروع میں ان یورپی باشندوں نے یہاں سے جو اخبارات شائع کئے ان کا بڑا مقصد یورپینوں اور اینگلو انڈین لوگوں کے لئے دلچسپی کا مواد مہیا کرنا تھا۔ "بنگال گزٹ" یا کلکتہ جنرل ایڈورٹائزر کے نام سے پہلا اخبار ۱۷۸۰ء میں جیمز آگسٹس نے شائع کرنا شروع کیا اور اس میں زیادہ تر کلکتہ میں رہنے والے انگریزوں کی دلچسپی کی خبریں شائع کی جاتی تھیں بدازاں سر ہیسٹنگز کی ہتک عزت کی بنا پر اس اخبار کے ایڈیٹر کو گرفتار کر لیا گیا اور ۱۷۸۲ء میں اس کی اشاعت بند ہو گئی۔

لارڈ ولیم بنٹنگ کے عہد میں اخبارات نے تیز رفتاری سے ترقی کی۔ کلکتے کے بعض سرکردہ انگریز و ہندوستانی شہریوں نے ۶ فروری ۱۸۲۵ء کو گورنر جنرل کو ایک عرضداشت پیش کی جس میں جان آدم کے نافذ کردہ بعض قوانین کو منسوخ کرنے کا مطالبہ کیا گیا۔ دوارکا ناتھ ٹیگور اور رسک لال ملک بھی عرضداشت پیش کرنے والوں میں شامل تھے۔ اور حکومت کے سیکرٹری نے انھیں تسلی بخش صورت حال کی جلد از جلد اصلاح کرنے کا یقین دلایا۔

انگریزی اخبارات اور حکام کی کشمکش کے دوران میں ملکی زبانوں کے اخبارات کا جنم بھی ہوا۔ سب سے پہلے ۱۷۹۶ء میں مدراس میں تامل زبان میں خبریں شائع کرنے کی کوشش کی گئی۔ سماجی اصلاحات کے مشہور موید رام موہن رائے بہت حد تک بنگالی میں بھارتی زبانوں کے اخبارات کی اشاعت کے ذمہ دار تھے۔ ۱۸۲۱ء میں کلکتہ سے پہلا بنگالی اخبار "سمبد کامودی" شائع ہونا شروع ہوا جس کی ادارت اور دیگر انتظامیہ امور صرف بنگالیوں کے ہاتھوں میں تھے۔ رام موہن رائے اس اخبار کے نہ صرف ایڈیٹر ہی تھے بلکہ اس کے بانیوں میں سے بھی تھے۔ ہندی کا پہلا ہفتہ وار اخبار مارچ ۱۸۲۶ء میں کلکتے سے شائع ہونا شروع ہوا۔

رفتارِ زمانہ

بھارت کے ساتھ کشمیر کا الحاق

بھارت کے راشٹرپتی ڈاکٹر راجندر پرشاد نے اپنے ایک فرمان میں بھارت اور کشمیر کے الحاق پر مکمل طور سے مہرِ تصدیق ثبت کر دی ہے۔ اس فرمان کے تحت سپریم کورٹ کو ریاست جموں اور کشمیر میں بھی وہی اختیارات حاصل ہوں گے جو بھارت کے دوسرے صوبوں میں حاصل ہیں۔ ریاست کے تمام دیوانی اور فوجداری مقدمات کی اپیلوں کی سماعت کے اختیارات اُسے حاصل ہوں گے اور بھارت کے دیگر قوانین کا اطلاق پورے طور سے ریاست کے تمام حصّوں پر ہوگا۔ اس کے ساتھ ہی ریاست کی اسمبلی کو کچھ خاص اختیارات بھی دے گئے ہیں۔ ریاست کی آئین ساز اسمبلی کو یہ اختیار دیا گیا ہے کہ وہ غیر منقولہ جائداد کے حصول، ریاست میں آباد ہونے اور ریاستی حکومت کے تحت ملازمت اختیار کرنے کے بارے میں ریاست کے مستقل باشندوں کے تحفظ کے لئے قوانین بنا سکے۔ راشٹرپتی کے اس فرمان کا بھارت اور ریاست جموں و کشمیر کے تمام حلقوں میں پرجوش خیر مقدم کیا گیا ہے۔

ڈاکٹر مصدق کو سزائے قید

تہران کی فوجی عدالت نے ایران کے سابق وزیر اعظم ڈاکٹر مصدق کی تین سالہ قید تنہائی کی تصدیق کر دی ہے۔ عدالت میں اپنی صفائی پیش کرتے ہوئے ڈاکٹر مصدق نے کہا کہ میں کسی سزا کو قبول نہیں کروں گا اور آخری دم تک اپنے مقدّمے کی پیروی کرتا رہوں گا۔ کیوں کہ میں سمجھتا ہوں کہ عدالت میں میری شکست صرف میری ہی نہیں ساری ایرانی قوم کی شکست ہے۔

شریمتی پنڈت کی پریس کانفرنس

شریمتی وجے لکشمی پنڈت نے رنگون جاتے ہوئے ڈمڈم کے ہوائی اڈے پر پریس نمائندگان کے سوالات کا جواب دیتے ہوئے کہا کہ ہر امن پسند شخص کو یہ امید رکھنی چاہیئے کہ جنیوا کانفرنس ضرور کامیاب ہوگی۔ اگرچہ کانفرنس میں کوئی معجزہ نہیں ہو سکتا۔ لیکن اس امر کا امکان ضرور ہے کہ مشکلات کا کچھ حل نکل آئے۔ چین کا ذکر کرتے ہوئے شریمتی پنڈت نے کہا کہ اگرچہ اس وقت چین کی عوامی حکومت کے اقوامِ متحدہ کی سبھا کے ممبر بننے کا کوئی امکان نہیں لیکن دنیا سے کشیدگی کو دُور کرنے کے لئے اسے ممبر بنایا جانا نہایت ضروری ہے۔

پاک امریکہ پیکٹ

کراچی میں امریکہ اور پاکستان کے مابین اس معاہدے پر دستخط ہو گئے ہیں جن کے تحت امریکہ پاکستان کو فوجی ہتھیار مہیا کرے گا۔ اور فوجوں کو تربیت دینے میں اس کی امداد کرے گا۔ معاہدے پر پاکستان کی طرف سے وزیر خارجہ محمد ظفر اللہ اور امریکہ کی طرف سے امریکی سفیر ہوراس ہیلڈرتھ نے دستخط کئے۔

بھارت اور ترکی کے دوستانہ تعلقات

ترکی کی وزارت خارجہ کے افسروں نے ایک بیان میں کہا ہے کہ ترکی پاکستان اور بھارت کے جھگڑوں میں بالکل غیر جانبدار رہے گا۔ ری پبلکن اپوزیشن پارٹی کے اخبار نے اپنے ایک ایڈیٹوریل مضمون میں پاکستان کو صاف الفاظ میں بتا دیا ہے کہ وہ کشمیر کے جھگڑے میں ترکی سے کسی قسم کی امداد کی امید نہ رکھے۔ اخبار مذکور نے مزید لکھا ہے کہ بھارت اور ترکی میں باہمی دوستانہ تعلقات ہیں۔

انیتا بوس کے لئے فنڈ

کانگریس ورکنگ کمیٹی کی میٹنگ میں کانگریس پریذیڈنٹ شری جواہر لال نہرو نے بتایا کہ نیتا جی سبھاش چندر بوس کی لڑکی انیتا بوس کو آزاد ہند فوج آرمی کے فنڈ سے دو لاکھ روپیہ دیا جا رہا ہے۔ اس روپیہ کے لئے ایک ٹرسٹ قائم کیا جائے گا اور اس رقم کے سُود سے انیتا بوس کی تربیت اور تعلیم کا انتظام کیا جائے گا ٹرسٹ میں شری نہرو اور شری بی سی رائے شامل ہوں گے۔

بھارت اور جنیوا کانفرنس

مسٹر کوسٹا مینن کی جنیوا میں آمد کو انگلینڈ کے سیاسی حلقوں میں خاص اہمیت دی جا رہی ہے۔ سیاسی مدبروں کا خیال ہے کہ مسٹر مینن شری نہرو کی طرف سے ہند چینی کے مسئلے کو سلجھانے کے لئے کچھ تازہ تجاویز لا رہے ہیں اور شاید اس ناامیدی کی فضا میں بھارت کی تجاویز کوئی مفید حل تلاش کر سکیں۔ جہاں تک بھارت کا تعلق ہے وہ اس سلسلے میں فیصلہ کرانے کے لئے اپنی پوری کوشش صرف کرے گا۔ چنانچہ مسٹر مینن تمام ممالک کے بڑے لیڈروں سے اس کے متعلق بات چیت کر رہے ہیں۔

نئی شوگر فیکٹریاں

وزیر زراعت ڈاکٹر پنجاب راؤ دیشمکھ نے لوک سبھا میں ایک سوال کے جواب میں بتایا کہ بھارت میں کھانڈ کی پیداوار میں اضافے کے لئے گنے کی پیداوار بڑھانے کے سلسلے میں پیداشی افزائش اور ساڑھے چار لاکھ ٹن سالانہ پیداوار کی صلاحیت کی نئی شوگر فیکٹریاں قائم کرنے کے اقدامات کئے جائیں گے۔

۵۵-۱۹۵۴ء اور ۵۶-۱۹۵۵ء میں کھانڈ کے نئے کارخانے کھولنے کے بارے میں وزیر موصوف نے بتایا کہ بیکار پڑی ہوئی مشینری یا غیر موزوں مقامات پر واقع کارخانوں کی مشینری کو دوسرے مقامات کو منتقل کر کے سات نئے کارخانے قائم کرنے کی منظوری دی گئی ہے۔ علاوہ ازیں غیر ممالک سے تمام متعلقہ مشینری درآمد کر کے ایک نیا کارخانہ قائم کرنے کی منظوری بھی دی گئی ہے۔

نکاسی جائدادوں کے بارے میں وزیر بجالیات کا اعلان

کونسل آف سٹیٹس میں مرکزی وزیر بجالیات شری اجیت پرشاد جین نے نکاسی جائدادوں کے متعلق پاکستان کے ساتھ حالیہ گفت وشنید کے بارے میں کہا کہ بھارت سرکار نے حکومت پاکستان کو مطلع کر دیا ہے کہ بھارت میں نکاسی جائدادوں کے مستقبل کے تصفیے کے بارے میں اب مزید تاخیر کی گنجائش نہیں رہی۔

وزیر بجالیات نے اعلان کیا ہے کہ بھارت سرکار نکاسی جائدادوں کے مالکوں کے حقوق اور ملکیت خود حاصل کر کے ان جائدادوں کو بے گھر لوگوں کو جو دی معاوضہ دینے کے لئے استعمال کرنے کا ارادہ رکھتی ہے۔ البتہ معاوضے کی آخری قسط کی ادائیگی پاکستان کے ساتھ کسی تسلی بخش سمجھوتہ ہو جانے تک ملتوی رہے گی۔

انڈونیشی صحافیوں کا وفد بھارت میں

حال ہی میں بھارت سرکار کی دعوت پر انڈونیشی صحافیوں کے وفد نے بھارت کا دورہ کیا۔ اس کی لیڈر مسز ہیرادتی ڈاشہ نے اپنی منشوی تقریر میں کہا کہ اس دورے میں ہمیں جیتنی کورڈ باشندوں کے اس ملک کی وسعت اور اس کے مسائل کو سمجھنے کا موقع ملا ہے۔

پنجاب سے لے کر بمبئی، بنگلور، مدراس، کلکتہ اور صنعتی صنعتی مراکز مثلاً جمشید پور میں ریلوے انجن تیار کرنے کے کارخانہ اور سندری میں کھاد تیار کرنے کے کارخانہ کو دیکھنے کا موقع بھی ملا ہے۔ قدرتی طور پر ہم تاریخی عمارت تاج محل آگرہ کو دیکھنے بھی گئے۔ لیکن یہ تو عہد گزشتہ کی داستان ہے اور بھارت اب بھی جدید لائنوں پر ترقی کی راہ پر گامزن ہے اور نہرو اور بھاکڑا کے معائنہ کرنے کے بعد ہمیں ان عظیم کوششوں کا احساس ہوا جو اس وقت بھارت کے لوگوں کا معیار زندگی بلند کرنے کے لئے جاری ہیں۔ نہرو کا بھاکڑا مکمل ہو جانے پر دسیع پیمانے پر بجلی کی قوت پیدا ہوگی اور آبپاشی کی سہولتوں میں بڑی توسیع ہوگی۔ دریائے ستلج کے پانی کو تابو میں کر لیا جائے گا اور خشک موسم میں اس سے فائدہ اٹھایا جائے گا۔ اس سے فصلوں کی پیداوار بڑھے گی اور کسان زیادہ خوشحال ہو جائیں گے۔ یہ ایک عظیم منصوبہ ہے جس پر ۱۹۴۸ء میں عمل شروع کیا گیا تھا اور یہ آئندہ پانچ سال کی مدت میں پایۂ تکمیل کو پہنچ جائے گا۔ بھاکڑا کا بند مکمل ہونے پر بھارت بجا طور پر اس امر پر فخر کر سکے گا کہ یہ بند دنیا میں امریکہ کے بولڈر ڈیم سے دوسرے درجے پر ہوگا۔

پنجاب پلان کا بنیادی مقصد عام لوگوں کا معیار زندگی بلند کرنا ہے۔ یہ پلان لوگوں کے سامنے افلاس بیماری اور پس ماندگی کو ختم کرنے کے لئے ایک واضح نشانہ پیش کرتا ہے۔ اس پلان کو کامیابی سے عملی جامہ پہنائے جانے کی صورت میں ۱۹۵۶ء میں بھارت میں اناج کی پیداوار ۹۰ لاکھ ٹن تک بڑھ جائے گی۔ اسی طرح اسی دوران بھارت میں کپاس کی پیداوار میں ۶۵ فیصدی اضافہ ہوگا۔ ایک کروڑ نوے لاکھ ایکڑ مزید رقبہ زمین کے لئے آبپاشی کی سہولتیں میسر آئیں گی اور دس لاکھ کلو واٹ سے مزید بجلی تیار کی جانے لگے گی۔ پلان کو جمہوری نظریے کی بنیادوں پر عملی جامہ پہنایا جا رہا ہے۔ بھارت کے لوگ کسی قسم کے دباؤ کے بغیر اپنے مستقبل کو شاندار بنانے کے لئے کام کر رہے ہیں ٭

یہ کتابیں پڑھئے

آج ہمارا دیش برق رفتاری سے تعمیر و ترقی کے راستوں پر گامزن ہے۔ آپ اس تعمیر و ترقی کے متعلق اپنی واقفیت میں اضافہ کیجئے اور اس تعمیر و ترقی میں اپنا حصہ ادا کیجئے۔ مندرجہ ذیل کتابیں اس سلسلے میں آپ کی رہنمائی کر سکتی ہیں

نئے ہند کی تعمیر

آج کروڑوں ہندوستانیوں کی مشترکہ کوششوں سے ایک نیا ہندوستان تعمیر ہو رہا ہے۔ پردھان منتری نے قوم کے نام ایک پیغام براڈ کاسٹ کرتے ہوئے کہا تھا:—

"آؤ۔ ہم سب اس کارِ نمایاں میں حصہ دار بن جائیں جس کا مقصد نئے ہندوستان کی تعمیر ہے۔"

اس پمفلٹ میں جو ایک خوبصورت آرٹ پیپر پر بلاک کی تصویروں کے ساتھ شائع ہوا ہے۔ اسی زریں تعمیر نئے ہندوستان کی جھلکیاں ملتی ہیں

قیمت آٹھ آنے

پنج سالہ پلان — سوالات و جوابات

پلاننگ کمیشن نے جو پنج سالہ پلان تیار کیا ہے وہ ایک ہزار سے زیادہ صفحات پر مشتمل ہے۔ ظاہر ہے کہ اس قدر ضخیم کتاب کے پڑھنے کے لئے بہت وقت اور فرصت درکار ہے۔ سوالات و جوابات کے نام سے جو کتاب مرتب کی گئی ہے ۲۰۷ صفحات پر مشتمل ہے اور اس میں تمام امور سوال و جواب کی صورت میں بیان کر دئے گئے ہیں۔ قیمت چار آنے

اپنے شہر کے کتب فروشوں سے طلب کیجئے

یا براہِ راست اس پتے سے منگوائیے

بزنس منیجر پبلیکیشنز ڈویژن

اولڈ سیکرٹریٹ دہلی ۸

کشمیر

(باتصویر تمدنی ماہانہ انگریزی رسالہ)

کشمیر ایک ماہانہ رسالہ ہے جس میں کشمیر کی زندگی اور اس کے مسائل سے بحث کی جاتی ہے۔ اس رسالے میں جو کیمیرے کی تصاویر معمورں کی بنائی ہوئی تصاویر اور خاکوں سے مزین ہوتا ہے، دنیا کو کشمیر اس کے عوام، اس کی خوبصورتی، لوگوں کے پیشے، رسم و رواج اور ان کے رہنے سہنے کے طریقے سے واقفیت بہم پہنچائی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ اس میگزین کشمیر کی شہرہ آفاق صنعت و حرفت کے متعلق بھی مضامین شائع کئے جاتے ہیں۔

کشمیریوں کے لئے اس رسالے میں ملک اور دنیا میں رونما ہونے والے ہر روز کے واقعات اور مسائل سے بحث موجود ہوتی ہے۔ اور یہ رسالہ اس سرزمین کی دلکشی اور عظمت پر پوری طرح روشنی ڈالتا ہے۔

قیمت ایک کاپی -/۸/-

سالانہ قیمت ۵/-/-

ملک بھر کے تمام اچھے بک اسٹالوں سے مل سکتا ہے

یا

براہِ راست مندرجہ ذیل پتے سے طلب فرمائیں

پبلیکیشنز ڈویژن منسٹری آف انفارمیشن اینڈ براڈ کاسٹنگ

اولڈ سیکرٹریٹ دہلی ۸



گرمیاں آگئیں

جگن ناتھ آزاد

ذرّے ذرّے پہ بجلی سی برسا گئیں
جس کو بھی چھو لیا اس کو گرما گئیں
گرمیاں آگئیں
گرمیاں آگئیں

دھوپ میں گھر سے باہر نہ جائے کوئی
جان کر لو کا جھونکا نہ کھائے کوئی
گرمیاں آگئیں
گرمیاں آگئیں

میز بھی گرم ہے کھاٹ بھی گرم ہے
فرش بھی گرم ہے ٹاٹ بھی گرم ہے
گرمیاں آگئیں
گرمیاں آگئیں

گرم پانی ہے کوئی پیئے کس طرح
اور نہ پانی پیئے تو جیئے کس طرح
گرمیاں آگئیں
گرمیاں آگئیں

لیجئے گھر میں باہر سے برف آ گئی
سارے بچّوں میں پیدا ہوئی کھلبلی
گرمیاں آگئیں
گرمیاں آگئیں

برف والی کٹوری جو مُنہ سے لگی
سچ یہ ہے جان میں جان ہی آگئی
گرمیاں آگئیں
گرمیاں آگئیں

قمر ارمان

انوکھے دوست



بہت دن پہلے کی بات ہے - ایک گاؤں میں ایک جولاہا اور دو پٹھان رہتے تھے - تینوں میں بڑی دوستی تھی -

ایک روز دونوں پٹھان دوست بندوق لے کر شکار کو نکلے راستے میں ان کے تیسرے دوست جولاہے سے ملاقات ہوگئی - پٹھان دوست نے کہا - "تم بھی شکار کو چلو"!

وہ کسی کام سے کہیں جا رہا تھا - اس لئے اس نے ٹالنا چاہا اور بولا - "مجھے ایک ضروری کام ہے خان صاحب کسی اور دن چلوں گا"۔

"نہیں نہیں، تم کو چلنا ہوگا" - دونو پٹھان ضد کرنے لگے -

جولاہے کو ایک بات سوجھی وہ پھر بولا "بھائی صاحب ہمارے پاس بندوق بھی تو نہیں ہم جا بھی کیسے سکتے ہیں"۔

"اوہ! اچھا - یہ کہنا ہوا ایک پٹھان گھر کی طرف دوڑا ام ابھی بندوق لاتا ہے"۔

اور جولاہا اس کا کوئی بھی جواب نہ دے سکا - چپ چاپ کھڑا رہا ہے - اور جب پٹھان بندوق لے کر آیا تو بولا - تم اُمارا دوست ہو کر ہم سے الگ رہنا مانگتا ہے - تم اُمارا بھائی ہے ہم اکیلے شکار میں جائے گا اور تم گاؤں میں گھومے گا - ام نہیں برداشت کرنے سکتا"۔

بندوق لے کر تینوں دوست جنگل کی طرف چل پڑے اب تینوں کے پاس بندوق تھی -

جنگل کے قریب پہنچ کر تینوں دوستوں نے ایک جگہ بیٹھ کر کچھ دیر آرام کیا - پھر شکار کی تلاش میں نکل پڑے - مگر دن بھر مارے مارے پھرتے رہے اُنھیں ایک بھی شکار نہ ملا - شام ہوتے ہی تینوں گاؤں کی طرف لوٹے -

راستے میں ایک تالاب تھا - اس کے کنارے بہت سے بگلے بیٹھے ہوئے تھے - بگلوں کو دیکھ کر خان نے کہا - دوست اُمارا قسمت اچھا ہے - نہیں تو گھر جانے پر اُمارا بیوی کہتا" - پٹھان ہو کر خالی ہاتھ لوٹا تمھیں شرم نہیں آتی -

"ٹھیک ہے" - دوسرے پٹھان نے کہا -

پھر تینوں نے تین بگلوں پر نشانہ لیا - اور ایک ہی ساتھ فائر کر دیا - تین بگلے ہاتھ لگے - بگلوں کو لے کر خوشی خوشی گاؤں کی طرف چلے -

راستے ہی میں جولاہے کا مکان پڑتا تھا - پٹھان نے گاؤں میں داخل ہوتے ہی کہا - دوست اب شکار کا بٹوارہ ہو جانا چاہئے

"ٹھیک ہے" - دوسرے پٹھان نے بھی ہامی بھری -

"تو پھر بانٹ دو" — جولاہے نے کہا۔

"دوست تم ہی بانٹ دو" — پٹھان نے کہا — اور تینوں بگلوں کو اس کی طرف بڑھا دیا۔ "نہیں نہیں خان تم ہی بانٹ دو" — اُسے ڈر لگ رہا تھا کہ کہیں جھگڑا نہ ہو جائے۔

"تم کیا بولتا ہے؟ تم ہمارا دوست ہے ہمارا بھائی ہے تم کو بانٹنا ہوگا — دوسرا خان اکڑ گیا۔

"اچھا خان میں ہی بانٹ دیتا ہوں" — جولاہا اپنے دروازے میں بیٹھ گیا۔ اور اس نے شکار کا بٹوارہ شروع کر دیا۔

اس نے ایک بگلا خان کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا "دو پٹھان اور ایک بگلا کتنا ہوا خان"؟

"تین ہوا" — پٹھان بولا۔ اور اس نے بگلا جولاہے کے ہاتھ سے لے لیا۔

"اور دو بگلے اور ایک جولاہا کتنا ہوا خان"؟ تین ہی ہوا۔ دوسرا پٹھان بولا —

اور جولاہا دو بگلے لے کر اپنے گھر کے اندر چلا گیا۔ اور دونوں پٹھان ایک بگلا لے کر اپنے گھر چلے گئے۔ وہ بہت خوش تھے وہ خالی ہاتھ گھر نہیں لوٹے

گھر پہنچ کر پٹھان نے شکار بیوی کے حوالے کیا۔ وہ ایک بگلا دیکھ کر چھلا اٹھی اور بگڑ کر بولی۔

"جولاہے نے تمھیں بے وقوف بنایا ہے۔ تم دو پٹھان ہو کر ایک بگلا لائے اور جولاہا دو بگلے لے گیا"۔

پٹھان جولاہے کی چالاکی سمجھ گیا۔ غصّے میں اُس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ جھٹ ننگی تلوار لے کر گھر سے نکل پڑا۔ اور جولاہے کے دروازے پر جا کر گرجا"۔

تم نے ہمیں بے وقوف بنایا۔ حصّہ بانٹنے میں بے ایمانی کی اَم تم سے لڑے گا۔

جولاہا گھر سے باہر نکلا اور خان کو تلوار لئے دیکھ کر بولا۔ ہم بھی لڑنے میں تم سے کم نہیں خان، ہم بھی تم سے لڑے گا۔ مگر تم پہلے اپنے گھر جا کر سب کو مار آؤ تاکہ ہمارے مرجانے پر کوئی رونے والا نہ ہو پھر ہم لوگ خوب دل کھول کر لڑیں گے۔

خان نے سوچا جولاہا ٹھیک ہی کہہ رہا ہے۔ وہ دوڑا ہوا گھر گیا۔ اور سب کا کام تمام کرنے کے بعد پھر جولاہے کے یہاں آیا۔ اور بولا۔ دوست اَم کام کر کے آگیا اور اب آؤ لڑائی ہوگی۔



جولاہا بڑا چالاک تھا۔ وہ بولا "بھائی یہ لڑائی آخر کس لئے ہے ایک بگلے ہی کے لئے نا؟"

"ہاں — پٹھان بولا — تم نے ایک بگلا زیادہ لیا ہے"۔

"تو پھر تم ایک بگلا لے لو"

"ٹھیک ہے دے دو" — پٹھان نے کہا۔

جولاہے نے ایک بگلا لا کر پٹھان کے حوالے کر دیا اور بولا ہم تمھارا دوست ہے خان ہم تم سے لڑنا نہیں چاہتا۔ تم بھی ہمارا بھائی ہے اور بھائی سے بھائی نہیں لڑتا"

تم ٹھیک کہتا ہے — اَم جانتا تھا کہ تم دوست سے

نہیں لڑے گا۔ تم ہمارا بھائی ہے اور بھائی سے بھائی کہیں لڑتا ہے؟ — جب بھائی بھائی ہی لڑے گا تو دُنیا کا کاروبار کیسے چلے گا؟ — خان خوش تھا کہ اس کے دوست نے ایک شکار اُسے بغیر لڑے ہی لوٹا دیا۔

"تم مجھے بہت ہی پیارا ہے خان" — جولاہا بولا"۔ ہم دوست سے اپنے بھائی سے لڑنا نہیں چاہتا — نہیں تو ہم بھی لڑنے میں تم سے کم نہیں ہے خان —"

ٹھیک ہے ٹھیک ہے — خان خوشی سے پھولا نہیں سما رہا تھا — تم ہمارا بھائی جو ہے تم ہم سے لڑنے میں کم کیسے ہو سکتا ہے، آخر تم پٹھان کا بھائی جو ہے پٹھان کا دوست جو ٹھہرا۔ تم حُقّہ نہیں پیئے گا؟ جولاہا کچھ سوچ کر بولا — تم بہت تھک گیا ہے"۔

"اوہ! بھائی" — خان خوش ہو کر جولاہے کے گلے سے لگ گیا اور بولا — ام ضرور پیئے گا — بھائی اَم ضرور پیئے گا۔ تم سمجھتا ہے اَم تم سے خفا ہے۔ نہیں نہیں دوست اَم تم سے بہت خوش ہے"۔



جولاہا حُقّہ چڑھا کر لے آیا۔ پھر دونوں نے مل کر حُقّہ پیا اور پی چکنے کے بعد خان بگلا لے کر اپنے گھر چلا گیا۔ اور دروازے ہی سے چلاتا ہوا گھر میں داخل ہوا —

"ہمارا دوست بہت ہی اچھا ہے ایمان دار ہے — اَم کو ایک شکار واپس کر دیا۔ ہمارا خاطر کیا حُقّہ پلایا۔ اَم سے لڑا نہیں" مگر گھر کے آنگن میں پہنچتے ہی اس کی ساری خوشی یک لخت غائب ہو گئی۔ اس کی بیوی خون میں لت پت پڑی تھی۔

اُسے اپنے آپ پر بڑا ہی غصّہ آیا۔ چونکہ اس نے ناحق اپنی بیوی کو قتل کر دیا تھا۔ جبکہ اس کے دوست نے بغیر لڑے ہی اس کا حصّہ شکار اسے دے دیا تھا۔ مگر اب اب اس سے کیا ہو سکتا تھا۔

وہ دوڑا ہوا اپنے دوست کے پاس پہنچا اور سارا قصّہ کہہ سُنایا۔ جولاہے نے اُسے بہت بُرا بھلا کہا۔ اور پھر تینوں دوستوں نے مل کر اس کی مٹّی منزل کی۔

اور ایک ہفتے بعد تینوں دوست شکار کو نکلے۔ شکار میں چار پرندے ہاتھ لگے۔ تیتر، مور۔ کبوتر اور کوّا۔

جب جولاہے کے گھر کے قریب تینوں پہنچے تو خان نے کہا "بانٹ دو بھائی شکار کو —"

جولاہے نے پہلے تو انکار کیا مگر پھر بانٹنے بیٹھ گیا۔ اس نے تیتر کی ٹانگ پکڑی اور گھر کے اندر زور سے پھینکتے ہوئے بولا "تیتر گھر کے بھیتر"۔

"ٹھیک ہے! — ایک پٹھان بولا۔

اور جولاہے نے مور کو پکڑ کر اپنی بغل میں دبا لیا —

خان دیکھ رہا تھا۔ اس نے پوچھا "یہ کیا؟

"خان مور بغل کا چور!"

ٹھیک ہے ٹھیک ہے! — دوسرا پٹھان بولا۔

جولاہے نے ایک ہاتھ سے کبوتر کی ٹانگ پکڑی اور دوسرے

ہاتھ سے کوّے کو - کوّے کو خان کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا -

"کوّا تو لے — کبوتر مور —" اور وہ گھر کے اندر چلا گیا -

خان اس کا مطلب کچھ نہ سمجھ سکا اور کوّے کو لے کر گھر چلا آیا - ابھی اُسے آئے ہوئے تھوڑا ہی وقفہ ہوا تھا کہ جولاہا ہانپتا ہوا اس کے قریب آیا اور بولا —

"خان ہمارا بیوی کنویں میں گر گیا ہے —"

"تو اَم کیا کرے گا" خان کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا -

"چلو اُس کو کنویں سے باہر نکالا جائے —"

"مرنے دو — اَم تم برابر ہو جائے گا —" خان ہنسا -

"دوست پر مصیبت پڑی ہے اور تم ہنس رہے ہو خان"

"اَم ہنس رہا ہے؟ —" خان نے تعجب سے اُس کا مُنہ دیکھا اور بولا — نہیں تو چلو جلدی کرو — شاید وہ ابھی تک زندہ ہو" اُس نے خان کا بازو پکڑا اور خان اُٹھ کھڑا ہوا پھر تینوں وہاں سے جولاہے کے گھر کی طرف دوڑے -

خان کو کنویں میں اُترنے کی مہارت تھی - اس نے پہنچتے ہی جلدی سے ایک مضبوط سی رسّی کنویں میں لٹکا دی اور تیزی سے اُس کے سہارے کنویں میں اُتر گیا - پانی میں ایک زور کا دھماکا ہوا اور خان کنویں کی تہ میں چلا گیا - ایک منٹ تک سکون رہا پھر نکلنے کی آواز ہوئی -

"خان اندر ہی چلّایا — اَم تم برابر ہو گیا دوست، تمہارا بیوی مر گیا ہے - اور اب وہ تینوں جب بھی شکار لاتے ہیں - خود سے پکا کر کھاتے ہیں"۔

نصیحت

پُرانے دوستوں کو نئے دوستوں کی وجہ سے ترک نہ کرو -

لطیفے

ماں - (امر) رات میں نے الماری میں دو بسکٹ رکھے تھے - ایک کیسے رہ گیا -

امر - (ماتا جی!) اس لئے کہ رات اندھیرا بہت تھا - دوسرا مجھے نظر نہیں آیا -

---

ایک رئیس سوئے ہوئے تھے کہ یکایک بندوق کی آواز سے آنکھ کھل گئی - دیکھا تو خدمتگار بندوق لئے کھڑا ہے پوچھا کیا ماجرا ہے؟ جواب دیا - حضور! ایک چڑیا برآمدے میں بیٹھی تھی - میں نے سمجھا کہ چیں چیں کر کے حضور کو جگا دے گی اس لئے میں نے اس کو بندوق سے مار دیا انعام عطا ہو

مسافر (ملاح سے) کشتی ڈگمگا رہی ہے - میرے اوسان خطا ہوئے جاتے ہیں - تم بتاؤ کچھ خطرہ تو نہیں -

ملّاح (متانت سے) خطرے کی کوئی بات نہیں - میری کشتی بیمہ شدہ ہے -

---

کوئی بڑا افسر ایک دفعہ پاگل خانے کے معائنے کے لئے گیا - وہاں سے اس نے ٹیلیفون کرنے کی بڑی کوشش کی - مگر وہ کامیاب نہ ہوا چنانچہ اس نے ٹیلیفون اپریٹر سے کہا - تمہیں معلوم نہیں کہ میں کون ہوں"؟

"جی نہیں" جواب ملا - "میں صرف اتنا جاننا چاہتا ہوں کہ آپ کہاں سے بول رہے ہیں"۔

کنہیالال

کِسان کی سُوجھ

بہت پُرانے زمانے کی بات ہے کہ اٹلی کے ایک گاؤں میں ایک خدا پرست کسان رہتا تھا۔ وہ دن بھر اپنے کھیتوں کو جوت کر اپنی گزر بسر کرتا تھا۔ ایک روز وہ اپنے کھیت میں کام کر رہا تھا۔ اسی اثنا میں اٹلی کا حکمراں گھوڑے پر سوار وہاں سے نکلا۔ اس کے ہمراہ اور کوئی درباری نہ تھا۔

کسان کو کام کرتے دیکھ کر بادشاہ نے کہا: "کسان جی تم ہر روز کتنا کماتے ہو؟"

کسان نے جواب دیا۔ "سرکار میں ہر روز چار آنے کماتا ہوں"۔ بادشاہ نے پھر پُوچھا۔ اِن چار آنوں کو تم کس طرح خرچ کرتے ہو؟

کسان نے جواب دیا۔ "سرکار ایک آنے سے میں کھانا کھاتا ہوں۔ دُوسرا اُدھار دیتا ہوں۔ تیسرا اُچکا دیتا ہوں اور چوتھا آنہ کنوئیں میں ڈال دیتا ہوں"۔

بادشاہ نے اس کا مطلب نہ سمجھا اور معلوم کیا کہ اس کے کیا معنی ہیں۔ اس پر کسان نے کہا۔ "بادشاہ سلامت پہلے آنے سے میں اپنا اور اپنی بیوی کا پیٹ پالتا ہوں۔ دُوسرے آنے سے میں اپنے بال بچّوں کی ضروریات زندگی پوری کرتا ہوں۔ اور مجھے ایسی امید ہے کہ جب میں بوڑھا ہو جاؤں گا تو وہ میری خبر گیری کریں گے۔ تیسرا آنہ میں اپنے والد بزرگوار پر صرف کرتا ہوں یعنی جو کچھ ان کا قرضہ مجھ پر ہے اس کو چُکا دیتا ہوں۔ اور چوتھا آنہ میں خیرات میں دیتا ہوں جس کے لئے مجھے یہ کوئی امید نہیں کہ پھل کیا ملے گا۔



کسان کے اس جواب سے بادشاہ بہت خوش ہوئے اس نے کسان سے کہا۔ اچھا بھائی تم ایک بات کرنا کہ جب تک تم میرا مُنہ سو بار نہ دیکھو تب تک اپنی اس بات کا مطلب کسی سے نہ کہنا"۔ کسان نے وعدہ کیا اور بادشاہ گھوڑے پر سوار ہو کر راج محل کی طرف چل دیا۔ وہاں پہنچ کر بادشاہ نے اپنے تمام وزیروں کو بُلایا یعنی دربار لگایا اور کہا۔ "وزیرو! ہماری سلطنت میں ایک ایسا کسان ہے جو ہر روز صرف چار آنے کماتا ہے۔ اس میں سے پہلا آنہ وہ کھاتا ہے، دوسرا اُدھار دیتا ہے۔ تیسرا

چُکا دیتا ہے اور چوتھا کنوئیں میں ڈال دیتا ہے۔ کہئے اس کے کیا مطلب ہوتے ہیں"۔

وزیروں نے بہت سر کھپایا لیکن کچھ بھی سمجھ نہ پائے۔ ان وزیروں میں ایک وزیر کو یہ پتہ تھا کہ کل بادشاہ سلامت ایک کسان سے بات کر رہا تھا۔ جب دربار برخواست ہوا تو وہ چپکے سے اسی کسان کے پاس آیا اور اس سے ان باتوں کے جواب بتانے کی عرض کی۔

وزیر کی بات سُن کر کسان نے کہا "مجھے افسوس ہے کہ میں ان باتوں کے جواب آپ کو نہیں بتا سکتا"۔

وزیر نے پوچھا "بھلا کیوں"؟

کسان نے جواب دیا "اس لئے کہ میں وعدہ کر چکا ہوں"

وزیر نے پھر سوال کیا "کیسا وعدہ اور کس کے ساتھ"؟

کسان نے کہا "کس سے وعدہ کرنا تھا۔ بادشاہ سلامت سے اور کس سے۔ اُن سے میں وعدہ کر چکا ہوں کہ جب تک میں سَو بار اُن کا چہرہ نہ دیکھ لوں تب تک اپنی بات کا مطلب کسی سے نہ کہوں گا"۔

وزیر کچھ دیر کے بعد پھر بولا "تو یہ بات ہے"۔ اس کے بعد اس نے اپنی جیب سے ۱۰۰ روپے نکالے اور کسان کو دئے اور کہا "لو دیکھ لو سَو بار بادشاہ کا چہرہ"۔

کسان نے روپے لئے اور وزیر سے اپنی بات کا مطلب کہہ دیا۔ وزیر کی باچھیں کھل گئیں اس نے دوسرے دن جا کر دربار میں کسان کی باتوں کا مطلب بتا دیا۔ بادشاہ نے جب یہ جواب سُنا حیران بھی ہوا اور اُسے غصّہ بھی آیا۔ اُس نے دربار برخاست کیا اور شام کو کسان کے پاس پہنچ گیا اور کسان سے پوچھا "ابے او کسان! تُو نے اپنا وعدہ کیوں وفا نہ کیا"؟

کسان بولا "سرکار عرض ہے۔ میں نے وعدہ وفا کیا ہے اور میں بے ایمان نہیں ہوں"؟

بادشاہ کو اور بھی حیرانی ہوئی اور پوچھا "وہ کیسے"؟

کسان نے جیب میں سے سو روپے نکال کر دکھائے اور کہا۔ لیجئے سرکار کیا میں غلط کہتا تھا۔ میں نے اِن کے ذریعے سے آپ کا چہرہ سَو بار دیکھا ہے"۔

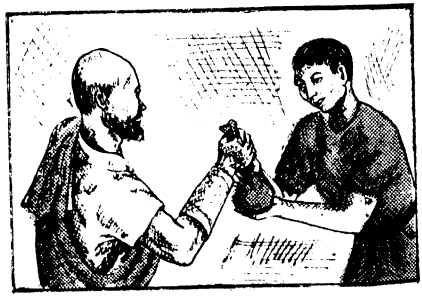
بادشاہ ایسا جواب سُن کر کسان کی عقل کی داد دے کر بولا۔ تم بڑے عقل مند ہو اور میں تمھاری اس بات پر بہت خوش ہوں"۔ اس کے بعد بادشاہ نے ۱۰۰ روپے کی ایک اور رقم کسان کو بطور انعام دے دی اور اس طرح ایک کسان کی عقل کی تعریف کی۔ دیکھئے کسان نے اپنی عقل کے بھروسے کتنا فائدہ اٹھایا۔

لطیفہ

بچّہ۔ (ٹیلیفون پر) آج میرا لڑکا بیمار ہے۔ وہ مدرسے نہیں آسکتا۔

ماسٹر۔ (آواز پہچان کر) اور یہ ٹیلیفون پر کون بول رہا ہے؟

بچّہ۔ (گھبرا کر) ماسٹر صاحب! ٹیلیفون پر میرے پتاجی بول رہے ہیں۔



نعیم کوثر

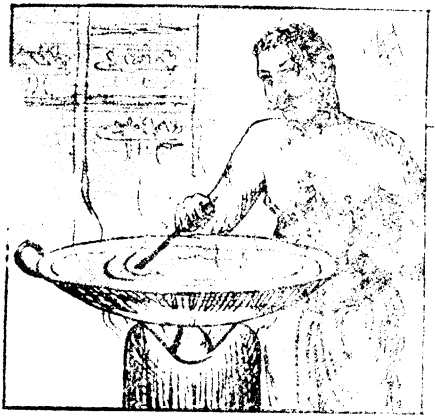
چمن چمن کے پھول

بٹو مہاراج

ایک گاؤں تھا - اچھی خاصی آبادی تھی - اس گاؤں میں ایک حلوائی رہتا تھا - جس کا نام تھا بٹو —

بٹو تھا تو غریب لیکن دودھ بیچتے بیچتے اچھا خاصا امیر ہو گیا تھا — وہ دودھ میں آدھا پانی ملاتا تھا - ایک دن اس نے سوچا کہ میرے پاس ایک ہزار روپیہ جمع ہو گیا ہے کیوں نہ کچھ بھینسیں اور خرید لوں تاکہ کاروبار بڑھ جائے - یہ سوچ کر اُس نے دوسرے گاؤں جا کر بھینسیں خریدنے کی ٹھانی چنانچہ ایک ہزار روپے لے کر وہ گاؤں سے چل دیا - دوپہر کو وہ ایک ندی کے پاس پہنچا - اور سوچا کہ گرمی بہت ہے کیوں نہ نہالوں — بس کپڑے اُتار اور روپوں کی تھیلی بھی اس میں لپیٹ کر کنارے پر رکھی اور ندی میں کود پڑا -

ایک بندر نے کنارے پر جو کپڑے رکھے دیکھے تو دوڑا تھیلی میں روپوں کے بجائے مٹھائی سمجھی اور اُسے لے کر ایک درخت پر چڑھ گیا - جب بٹو مہاراج نہا دھو کر باہر آئے تو دیکھا کہ بندر تھیلی لئے درخت پر چڑھا ہے اور روپے نکال نکال کر ایک تو ندی میں ڈال رہا ہے اور ایک کنارے پر - اب تو بٹو بہت گھبرایا - اس نے بہت کوشش کی کہ کسی طرح بندر سے تھیلی حاصل کر لی جائے تاکہ وہ روپے جو بندر پانی میں ڈال رہا تھا ضائع ہونے سے بچ جائیں - لیکن وہ ناکام رہا -



اتفاق سے ایک سادھو کا وہاں سے گزر ہوا - بٹو فوراً چلا اُٹھا - اے مہاراج مجھے اس مصیبت سے نجات دلائیے ساری محنت سے کمائی ہوئی دولت پانی میں جا رہی ہے - سادھو بولا - تم کیا کرتے ہو ؟ سچ سچ بتاؤ اپنا دھندا' ایمانداری سے بھی کرتے ہو کہ نہیں ؟

مہاراج حلوائی ہوں ! بٹو بولا دُودھ بیچتا ہوں جس میں آدھا پانی ہوتا ہے ....

بس بس ! سادھو جاتے ہوئے بولا بندر ٹھیک کر رہا ہے دُودھ کا دُودھ اور پانی کا پانی ہی تو کر رہا ہے - بات بٹو کے سمجھ میں آ گئی اس نے کنارے پر پڑے ہوئے روپے گنے تو وہ پورے پانچ سو تھے — اس نے سوچا اتنی محنت کی اور پانچ سو کا دودھ ایک ہزار میں بیچا اور اس پر بھی پانچ سو ہی ملے — آیندہ اگر ایمان داری سے کاروبار کرو تو بھگوان ضرور زیادہ نفع دے گا — ایمان داری ہوئے پانچ سو روپے بے ایمانی سے حاصل کئے پانچ ہزار روپے سے اچھے اور قیمتی ہیں —

آپ کو ہر روز گندگی کے
جراثیم سے بیماری کا خطرہ
رہتا ہے۔



لائف بُوائے سے ان جراثیم کو
اپنے جسم سے دھو کر ہر روز
اپنی حفاظت کیجیے۔



لائف بُوائے کا "محافظ
جھاگ" آپ کی تندرستی
کی حفاظت کرتا ہے۔



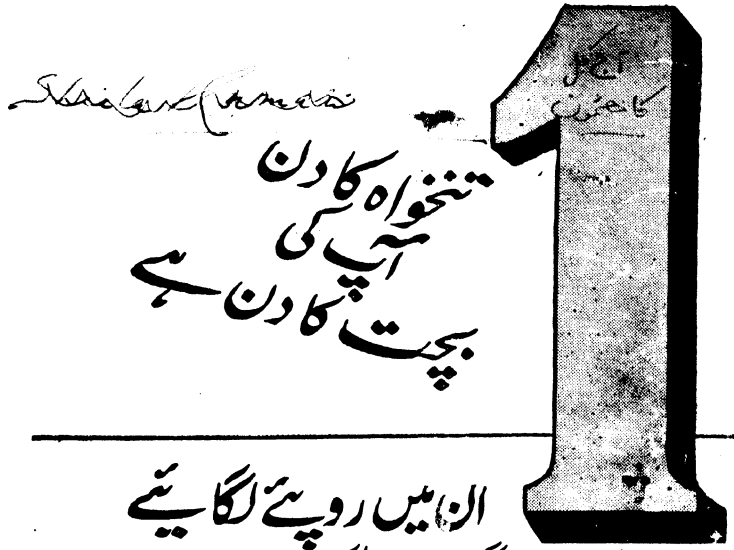
لائف بُوائے صابن

ہر روز کی گندگی کے جراثیم سے آپ کی
حفاظت کرتا ہے



ہندوستان میں بنا ہوا

L. 248-X52 UD



ان میں روپئے لگائیے

۱۲ سالہ نیشنل سیونگز سرٹیفکٹس
وصولی پر ۱۶ر۴ فیصدی سالانہ منافع

۱۰ سالہ ٹریزری سیونگز ڈیپازٹس
سالانہ ۵ر۳ فیصدی منافع کی ادائیگی

پوسٹ آفس سیونگز بینک ڈیپازٹس
۱۰ ہزار تک جمع شدہ روپئے پر ۲ فیصدی سالانہ منافع
(جوائنٹ اکاؤنٹس کی حالت میں ۲۰ ہزار روپے تک)

۱۰ سالہ نیشنل پلان سرٹیفکٹس
وصولی پر ۵ر۴ فیصدی سالانہ منافع

ان تمام حالتوں میں منافع
ہندوستانی انکم ٹیکس سے مستثنیٰ ہے

AC 558

آپ کے لئے فائدہ
قوم کے لئے خوشحالی

Published by the Director, Publications Division, and printed by the Production Officer, United Press, Government of India, Old Secretariat, Delhi.

D—509